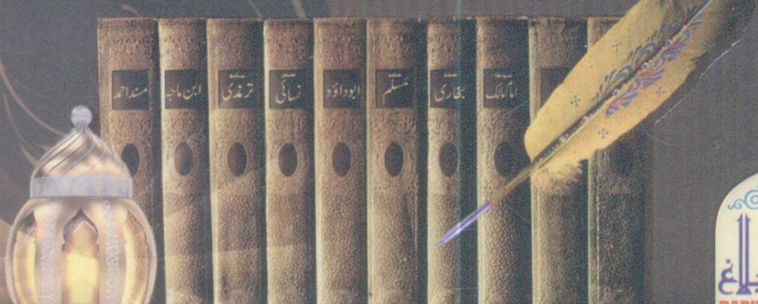
تذکرۃ المحدثین

آسمان علم کے روشن ستاروں اور گلستان حدیث کے
مہکتے گلابوں کا روح پرور دلآویز
اور ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

تالیف: ضیاء الدین اصلاحی

تقریظ: فضیلۃ الشیخ ابوالحسن مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ تعالیٰ



دار الابلاغ
DARULIBLAGH

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دارالابلاغ
DARULIBLAGH

کتاب وسنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ

تذکرۃ المحدثین

جلد اول

تالیف .... ضیاء الدین اصلاحی

اعداد .... محمد طاہر نقاش

اشاعت اول .... مئی 2014ء

پاکستان میں ہماری کتب مندرجہ ذیل اداروں سے مل سکتی ہیں

لاہور۔ ابلاغ (جیل روڈ 35717842 گلبرگ 35717842 ماڈل ٹاؤن 35942233)
راولپنڈی۔ تجلیات طیبہ کشمیری بازار 5535168، ادارالفکر اسلامی 0321-5216287 مکتبہ عائشہ 0321-5075075
اسلام آباد۔ المسعود اسلامک مکس 2261356 ابلاغ 2281420 دارالسلام شوروم 0321-5370378
العہدی انٹرنیشنل 4434615, 0321-8014008 ۔ کراچی۔ فضلی سنز 32212991 علمی کتب خانہ 32628939
فیصل آباد۔ مکتبہ اسلامیہ بیرون امین پور بازار، 631204۔ مکتبہ اہلحدیث امین پور بازار 0300-6628021
پشاور۔ معراج کتب خانہ 214720۔ واہ کینٹ ابلاغ 051-4541148

دارالابلاغ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
رحمن مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
0300-4453358, 042-37361428

ضروری نوٹ: اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور انسانی بساط وطاقت کے مطابق ہم نے اس کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ خاص طور پر عربی عبارات میں تصحیح اغلاط میں پوری طرح احتیاط کی ہے۔ لیکن پھر بھی بشری تقاضے کے تحت اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو از راہ کرم مطلع فرمائیں۔ آئندہ ایڈیشن میں اس کا ازالہ کر دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ (ادارہ)

تذکرۃ المحدثین

آسمان علم کے روشن ستاروں اور گلستان حدیث کے
مہکتے گلابوں کا روح پرور دلآویز
اور ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

جلد اول

ضیاء الدین اصلاحی



دار الابلاغ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز لاہور پاکستان
فون: 0300-4453358

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ

کے نام سے شروع کرتا ہوں
جو بڑا ہی مہربان
نہایت رحم کرنیوالا ہے

فہرست مضامین

حصہ اول

حصہ دوم

1

امام عبدالباقی بن قانع

2

امام سعید بن السکن

3
امام ابوبکر شافعی

4
امام ابن حبان

5

امام ابوبکر آجری

6

امام ابوالقاسم طبرانی

9
امام ابوالحسن دارقطنی

10

امام ابوسلیمان حمد خطابی

11
امام ابن جمیع

12
امام ابوعبداللہ حاکم

13
امام ابو القاسم تمام رازی

14

امام ابو بکر بن مردویہ الکبیر اصبہانی

15

امام ابو بکر احمد بن محمد برقانی خوارزمی

16

امام ابونعیم اصفہانی

17
امام ابو محمد حسن خلال

18
امام ابو عبداللہ قضاعی

☆......☆......☆

انتساب

دین اسلام کے ہر داعی و مبلغ
کے نام

- کہ جو اشاعت دین میں سرگرم عمل ہے
- محدثین سے محبت کرتا ہے
- طلبِ علم حدیث کے لیے سرگرم، سرگرداں اور کوشاں ہے
- دنیا میں ہر سو علم حدیث کے فروغ کی خواہش رکھتا ہے
- اور حدیث رسول، فرمانِ رسول اور حکم رسول کا بول بالا اس کی زندگی کا محور و مرکز اور مقصد ہے۔

مالک کائنات سے دعا ہے کہ

- قال اللّٰہ اور قال الرسول کے دلنواز ترانوں میں اس کی صبحیں اور شامیں گزریں۔ آمین یارب العالمین

خُطبہ مسنونہ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِيْنُهُ، وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلاَ هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيْكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ

أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلاَلَةٌ وَكُلَّ ضَلاَلَةٍ فِي النَّارِ

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ○ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ○ لا يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ○

---

① ((مسلم' الجمعة' باب تخفيف الصلوة و الخطبة' حديث ٨٦٨ و ٨٦٧، والنسائي' ٣٢٧٨))

② ((رواه الاربعة واحمد والدارمي و روى البغوي في شرح السنة مشكوٰة مع تعليقات الالباني' النكاح' باب اعلان النكاح... وقال الالباني حديث صحيح.))

تنبیہات:

- صحیح مسلم' سنن نسائی اور مسند احمد میں ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں خطبہ کا آغاز ((ان الحمدلله)) سے ہے لہذا ((الحمدلله)) کی بجائے ((ان الحمدلله)) کہنا چاہیے۔
- یہاں ((نومن به ونتوكل عليه)) کے الفاظ صحیح احادیث میں موجود نہیں ہیں۔
- یہ خطبہ نکاح' جمعہ اور عام وعظ وارشاد یا درس وتدریس کے موقع پر پڑھا جاتا ہے۔ اسی خطبہ حاجت کہتے ہیں اسے پڑھ کر آدمی اپنی حاجت وضرورت بیان کرے۔

”بلاشبہ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ ہم اسی کی تعریف کرتے، اسی سے مدد مانگتے اور اسی سے بخشش طلب کرتے ہیں۔ اپنے نفس کی شرارتوں اور اپنے برے اعمال سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ جسے اللہ راہ دکھائے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ دھتکار دے اسے کوئی راہ راست پر نہیں لاسکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے، وہ اکیلا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔“

”حمد وصلوۃ کے بعد! یقیناً تمام باتوں سے بہتر بات اللہ کی کتاب اور تمام طریقوں سے بہتر طریقہ محمد ﷺ کا ہے اور تمام امور میں سے برے کام (دین میں) خود ساختہ (بدعت والے) کام ہیں، ہر بدعت گمراہی اور ہر گمراہی کا انجام جہنم ہے۔“

”اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں اس حال میں موت آئے کہ تم مسلمان ہو۔ لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، (پھر) اس سے اس کی بیوی کو بنایا اور (پھر) ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیں اور انہیں (زمین پر) پھیلا دیا۔ اللہ سے ڈرتے رہو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قطع رحمی سے (بچو)۔ یقیناً اللہ تم پر نگران ہے۔ اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو اور سیدھی (سچی اور کھری) بات کہو۔ اللہ تمہارے اعمال سنوار دے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی، یقیناً اس نے عظیم کامیابی حاصل کر لی۔“

حرف تمنا

ہیروں و جواہرات کی دریافت

قارئین محترم! محدثین کرام کی حیاتِ مبارکہ اور ان کے علمی کارناموں پر لکھی گئی ایک محقق کی کتاب ''تذکرۃ المحدثین'' کو دارالابلاغ کی ٹیم نے مولانا اشرف جاوید صاحب آف فیصل آباد کی معاونت سے تحقیق کے بعد مکمل کیا تھا۔ میں جب میں اسے شائع کر کے منظر عام پر لانے کے لیے تحقیقی نظروں سے دیکھتا، اور جائزہ لیتا تو مجھے اس میں بڑی حد تک تشنگی محسوس ہوتی۔ میں نے اس میں حک و اضافہ کے لیے مولانا اسلم گھلوی اور قاری ذکاء اللہ صاحب آف لاچپت روڈ شاہدرہ لاہور کی خدمات حاصل کرنے کے لیے ان سے رابطہ کیا...... لیکن وہ اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر اسے مکمل نہ کر سکے۔ تحقیق و ریسرچ کا کام ابھی جاری تھا کہ مجھے علم ہوا کہ اس موضوع پر محقق دوراں مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے بہت عمدہ تحقیقی کام کیا ہے۔ میں اس کی جستجو اور تلاش میں لگ گیا۔

اس تحقیقی کام کو حاصل کرنے کے لیے میں نے بیرون ممالک رابطے کیے۔ جدہ اور ریاض سعودی عرب میں بھی احباب سے اسے حاصل کرنے کے لیے رابطے کیے لیکن ناکامی ہوئی۔ آخر اپنے دو جاننے والوں کی ڈیوٹی لگائی جو پندرہ دن کے ٹور پر بیرون ملک جا رہے تھے۔ انہوں نے کافی بھاگ دوڑ اور محنت شاقہ سے تلاش بسیار کے بعد محدثین کی حیات مبارکہ اور ان کی علم حدیث کے لیے خدمات اور عظیم کارناموں پر مشتمل یہ کام مرتب شدہ شکل میں حاصل کر لیا۔ فللّٰہ الحمد. میں اسے دیکھ کر اس قدر مسرور و مسحور ہوا کہ مت پوچھئے۔ اس سے پہلے آج تک میں نے ہیروں اور جواہرات کو اس قدر نفاست اور قرینے سے ایک تاج میں جڑے ہوئے جگمگاتے نہ دیکھا تھا۔ میں اسے ترتیب و تہذیب نو کے بعد طباعت کے مراحل سے گزار کر اب آپ کی خدمت میں پیش کر سکا ہوں۔ امید ہے اس عظیم تصنیف کی پیشکش پر آپ خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے۔ اللہ کریم ہمیں ان رجال عظیم کی سیرت کی ضیا پاشیوں سے اپنی زندگیوں کو منور کرنے کی توفیق بخشے، آمین۔

محدثین کے حالات زندگی اور ان کی پاکیزہ و مثالی سیرت و کردار اور روشن عظیم کارناموں اور تلاش علم کی جستجو پر مبنی داستانوں پر مشتمل یہ برصغیر کی مفصل و جامع کتاب ہے۔ اب تک اس موضوع پر شائع ہونے والی اور لکھی جانے والی کتب میں اسے ایک بلند مقام حاصل ہے۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ کتاب متقدمین و متاخرین محدثین کرام کی سیرت کے مہکتے علمی گوشے اور ان کی حیات مبارکہ کی تفصیلات بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ خاص طور پر اس کا تیسرا حصہ پاک و ہند کے محدثین ان کی خدمات، کارناموں اور دعوتی و علمی سرگرمیوں کی تفصیلات پر مبنی ہے، اس سے قبل یہ مفید علمی معلومات ہم تک نہ پہنچ سکی تھیں۔ اس کا مقدمہ برصغیر کے مشہور سکالر جناب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے اور اس موضوع کی افادیت کو اجاگر کیا ہے۔

اس کتاب کے تین حصے ہیں:

① حصہ اول: ...... اس میں دوسری صدی کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالاتِ زندگی، سوانح اور ان کی خدمات حدیث کی ایمان افروز اور روح پرور تفصیل بیان کی گئی ہے۔

② حصہ دوم: ...... اس میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات و سوانح اور ان کی علمی و حدیثی خدمات کی دلآویز و روح پرور تفصیل بیان کی گئی ہے۔

③ حصہ سوم: ...... اس میں چھٹی صدی ہجری سے خانوادہ شیخ عبدالحق دہلوی تک کے ممتاز اور صاحب تصانیف ہندوستانی محدثین کرام کے حالات و سوانح اور ان کی علمی و دینی اور محدثانہ خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے مجاہد اور صوفی دو متضاد شخصیات ہیں یعنی مجاہد کبھی صوفی نہیں ہوسکتا اور صوفی کبھی مجاہد نہیں بن سکتا۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محدث کبھی صوفی نہیں ہوسکتا اور صوفی کبھی محدث نہیں بن سکتا۔ لیکن اس کتاب میں تذکرۃ المحدثین کی تیسری جلد چونکہ ہندوستانی محدثین پر مرتب کی گئی ہے۔ اس لیے اس میں اس خطے کے خاص مزاج کے مطابق ایسے علماء کا تذکرہ بھی کیا گیا جو تصوف کی طرف مائل تھے۔ یوں ان کی زندگی کی

تصویر کو مکمل طور پر قارئین کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ ایسا نہیں کہ ان کی زندگی کے ایک گوشہ کو زیر بحث نہ لا کر قارئین کو کسی بھی پہلو سے لاعلم رکھا گیا ہو۔ البتہ مرتب کرنے والے حضرات چونکہ حنفی المسلک ہیں اس لیے کہیں کہیں وہ اس کی نشاندہی ہو جاتی ہے، وہ اپنا جھکاؤ اسی کی طرف رکھتے ہوئے اس مسلک کا دفاع کرتے ہیں اور اس مسلک کے مؤقف کو فوقیت دیتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر کتاب کے حصہ سوم میں شیخ علی متقی اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے ابواب میں ایسی جھلک ہمیں نظر آتی ہے۔

یہ کتاب ہر اسلامی لائبریری، ہر مدرسہ و تعلیمی ادارہ کی اوّلین اور بنیادی ضرورت ثابت ہوگی۔ حدیث رسول مقبول اور علم حدیث سے شغف و دلچسپی رکھنے والے متلاشیان علم کے لیے یہ ایک گرانقدر تحفہ اور مینارہ نور ثابت ہوگی۔ اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ کتاب کی تیاری میں کام کرنے والے تمام حضرات کو دنیا اور آخرت میں دونوں جگہ اعلیٰ وارفع درجات عطا فرمائے اور اپنے آخری رسول کی شفاعت کا مستحق بنائے۔ آمین

خاص طور پر اس کے مصنف و مرتب جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور ان کے معاون و محرک علماء کی ٹیم کو اللہ کریم اپنی رضا کا سرٹیفکیٹ عطا کر کے ان کی اس کاوش کو قبولیت کا درجہ بخش کر ان کے لیے توشۂ آخرت بنائے۔ آمین یارب العالمین

اب آپ آسمان علم کے ان ماہتابوں، آفتابوں، روشن ستاروں...... اور گلستان حدیث کے مہکتے گلابوں کا روح پرور ایمان افروز تحقیقی تذکرہ پڑھیں اور ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں کہ ہم حدیث پر مزید نشر و اشاعت کا کام کر سکیں۔ یوں اپنے اور آپ کے دامن کو سعادتوں و کامیابیوں کے چمکتے دمکتے موتیوں سے بھر سکیں۔ ان شاء اللہ

خادمِ کتاب وسنت

محمد طاہر نقاش

۲۲ فروری ۲۰۱۴ء، لاہور

گلستان حدیث کے مہکتے گلاب

کیا ہی شاندار اور قابل رشک زندگیاں تھیں ان جلیل القدر اور قسمت کے دھنی انسانوں کی!...... کہ جنھوں نے اپنی زندگی کا محور و مرکز حدیث رسول مقبول ﷺ کو بنائے رکھا۔ ان کی صبحیں اور شامیں قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ کی دلنواز صداؤں میں بسر ہوتیں۔ رسول اللہ سے عملی محبت کا ثبوت یہ ہوتا کہ ان کو آپ کے فرامین بمعہ سند سینکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں حفظ ہوتے۔ دنیا ان کے حافظے سے انگشت بدنداں تھی، وہ حدیث رسول کی تلاش و جستجو میں قریہ قریہ بستی بستی چلے پھرتے، جہاں سے حدیث رسول اور فرمانِ رسول، حکم رسول ملتا تحقیق تفتیش کے بعد اسے محفوظ کر لیتے اور امت محمدیہ تک آپ کے فرامین پہنچانے کا بندوبست کرتے۔ یوں جستجوئے حدیث میں ان کی زندگیاں گزر جاتیں اور وہ امت محمد کے ہاتھوں میں فرامین رسول کا گرانقدر مجموعہ دے کر اگلے جہان جا پہنچتے۔ ان کی زندگیوں کا لمحہ لمحہ اس شعر کا مصداق ہوتا:

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم ‌ ‌ ‌ ‌ الا حدیث یار راتکرار می کنیم

گلشن حدیث کے ان مہکتے گلابوں کی خوشبو سے امت محمدیہ کے ہر ہر فرد کی سانسیں مہکی ہوئی ہیں۔ ان رجال عظیم کی زندگیاں کیسے اور کن عظیم کاموں میں گزاریں۔ انہوں نے آقائے دو جہاں سے عملی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے خدمتِ حدیث کے لیے کیسے کیسے کارہائے نماں انجام دیے۔ محدثین کرام کی زندگیوں کے روشن مگر پردہ اخفا میں سنہرے گوشوں کو آشکار کرنے اور آپ کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، آج ہی اس کا مطالعہ کریں۔ تاکہ حدیث رسول ﷺ فرمان رسول اور حکم رسول کی اہمیت، فضیلت اور محبت آپ کے دل و دماغ میں راسخ ہو، آپ اپنی نسل کو بھی اس روشن شاہراہِ حیات پر چلانے کی منصوبہ بندی کر کے اپنی آخرت کی یقینی کامیابی کا سامان کر سکیں۔

خادمِ کتاب و سُنّت

محمد طاہر نقاش

۲۲ فروری ۲۰۱۴ء لاہور

نَضَّرَ اللّٰهُ اَمْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِیْثًا فَبَلَّغَهٗ (حدیث)

تذکرۃ المحدثین

حصہ اول

اس میں دوسری صدی کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالاتِ زندگی، سوانح اور ان کی خدماتِ حدیث کی روح پرور تفصیل بیان کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

کلام مجید اگر چہ ایک واضح اور کھلی ہوئی کتاب ہے، اس میں کوئی غموض وخفا نہیں ہے لیکن اس میں اس کی تعلیمات کی پوری تفصیل اور تمام جزئیات کا احاطہ نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے بہت سے احکام مجمل یا کلیات کی شکل میں ہیں جن کی وضاحت وتشریح اور کلیات سے جزئیات کی تفریع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل سے فرمائی، آپ کا کام محض کلام الٰہی کو لوگوں تک پہنچا دینا نہیں تھا، بلکہ اس کی تبیین وتشریح بھی تھی۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (نحل: ٦)

اور ہم نے تمہاری طرف نصیحت (قرآن مجید) اتاری تاکہ لوگوں کے لیے جو اتارا گیا ہے اس کو ان سے کھول کر بیان کرو شاید وہ اس پر غور وفکر کریں۔

ایک دوسری آیت میں ہے:

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (نحل: ٨)

اور ہم نے تم پر اس لیے کتاب اتاری ہے تاکہ تم ان کے لیے ان چیزوں کی وضاحت کرو جس میں انھوں نے اختلاف کیا اور اس کو ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت ورحمت بنا کر اتارا۔

یہ تبیین وتشریح آپ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اس فہم یا ملکۂ نبوت کی رہنمائی سے کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپ میں ودیعت کیا تھا۔

إِنَّآ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرَاكَ اللّٰهُ۔ (نساء:١٦)	اور ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ تم لوگوں کے درمیان جس طرح تم کو خدا نے سمجھایا ہے اس طرح فیصلہ کرو۔

اس ''اراءت'' سے مراد فہم نبوت ہے، اس آیت میں اگرچہ صرف فیصلہ کا ذکر ہے لیکن اس میں آپ کے تمام احکام داخل ہیں، اس لیے کہ آپ جو تعلیم اور جو حکم دیں گے وہ ایک طرح کا فیصلہ ہی ہوگا۔

آپ جو کچھ بھی کہتے تھے، یا جو حکم بھی دیتے تھے، وہ درحقیقت ایک قسم کی وحی ہوتی تھی جس کو اصطلاح میں وحی خفی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحىٰ۔ (نجم:١)	رسول اپنی خواہش سے کچھ بھی نہیں کہتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔

اس لیے آپ کے تمام احکام واجب التعمیل ہیں، اس فہم نبوت اور وحی سے مستنبط احکام کو قرآن مجید نے حکمت سے تعبیر کیا ہے۔

وَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۔ (نساء:١٧)	اور تم پر کتاب وحکمت اتاری اور تم کو وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے اور یہ تم پر خدا کا بڑا فضل تھا۔

مسلمانوں پر خدا نے یہ احسان جتایا ہے:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ	اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم پر
وَمَا اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ	کتاب وحکمت اتاری جس کے ذریعہ
وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ.	وہ تم کو نصیحت کرتا ہے۔
(بقرۃ:۲۹)	

دوسری آیت میں ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيِّيْنَ	وہی اللہ ہے جس نے ان پڑھ لوگوں
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ	میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ	ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے
وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ	اور ان کو پاک وصاف کرتا ہے
لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ.	اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور اس
(سورہ جمعہ:۱)	سے پہلے وہ گمراہی میں مبتلا تھے۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ صرف آیات قرآنی کی تلاوت وتبلیغ نہیں بلکہ مسلمانوں کی تعلیم وتزکیہ بھی تھا اور آپ ان کو کتاب اللہ کے ساتھ حکمت کی تعلیم بھی دیتے تھے، یہ حکمت اگرچہ قرآن مجید اور وحی خفی سے ماخوذ ہے مگر اس سے الگ چیز ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال ہیں، اس لیے کتاب کے ساتھ وہ بھی مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہیں، آپ کی ذات اور آپ کا ہر قول وفعل مسلمانوں کے لیے نمونہ عمل تھا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ	لوگو! تمہارے لیے رسول کے اندر اچھا
اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (احزاب:۳)	نمونہ ہے۔

اسی لیے قرآن مجید میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول کی اطاعت کی بھی تاکید ہے اور بہت سی آیات میں اطیعوا اللہ کے ساتھ ساتھ اطیعوا الرسول کا بھی

حکم ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (آل عمران:۱۳۲)	اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ۔ (محمد:۳۰)	مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔
وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۔ (مائدہ:۹۲)	اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ڈرو، پھر اگر تم روگردانی کرو گے تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف پوری تبلیغ ہے، (یعنی اس کو منوانے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہے)
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ۔ (انفال:۲۰)	اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو، حالاں کہ تم سنتے ہو۔

یہ ظاہر ہے کہ اطاعت نام ہے کسی حکم کی تعمیل یا کسی عمل کی تقلید کا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم دیں اس کی تعمیل اور جس چیز پر عمل کریں اس پر عمل کیا جائے، اسی کا نام حدیث وسنت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت رسول کے اتباع پر موقوف ہے اور اس کا صلہ بندوں سے اللہ کی محبت اور مغفرت ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ	آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے

وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (آل عمران:۴)	محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

رسول کی اطاعت عین خدا کی اطاعت اور رسول کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من اطاعنی فقد اطاع الله ومن عصانی فقد عصی الله۔(۱)	جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی

اطاعت کے ان احکام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ تمام اقوال وافعال داخل ہیں جو آپ نے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ارشاد فرمائے یا ان پر عمل کیا، اس لیے کتاب اللہ کے بعد ان کی حیثیت بھی قانون کی ہے اور وہ مسلمانوں کے لیے کتاب اللہ ہی کی طرح واجب العمل ہیں، کلام مجید میں ارشاد ہے:

وَمَاكَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَامُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْراً أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (احزاب:۵)	اور کسی مسلمان مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ان کے کسی معاملہ میں فیصلہ کردے تو اس میں اس کو چون وچرا کا اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں ہے۔

''امر'' میں آپ کے تمام احکام داخل ہیں جس کی وضاحت احادیث سے ہوتی ہے، مسلم میں ہے:

(۱) مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامیر فی غیر المعصیۃ وتحریمھا فی المعصیۃ۔

مانهيتكم عنه فاجتنبوه وماامرتكم به فافعلوه۔ (١)	میں جس چیز سے تم کو منع کردوں اس سے رک جاؤ اور جس چیز کا حکم دوں اس کو اختیار کرو۔

ایک دوسری حدیث میں اس سے زیادہ واضح الفاظ میں ہے:

''وہ زمانہ قریب ہے کہ کسی آدمی سے جب وہ اپنے پر تکلف تخت پر تکیہ لگائے بیٹھا ہوگا، میری کوئی حدیث بیان کی جائے گی تو وہ کہے گا کہ ہمارے درمیان اللہ عزوجل کی کتاب موجود ہے، ہم اس میں جو چیز حلال پائیں گے اس کو حلال سمجھیں گے اور جو چیز حرام پائیں گے اس کو حرام سمجھیں گے، ایسے لوگوں کو آگاہ ہونا چاہیے کہ جس کو اللہ کے رسول نے حرام کیا ہے وہ بھی خدا کی حرام کی ہوئی چیز کی طرح حرام ہے۔'' (سنن ابن ماجہ ص ۳)

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے اقوال واعمال مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہیں، اور جس طرح قرآن مجید کے اوامر ونواہی کا ماننا ان کے لئے ضروری ہے اسی طرح رسول کے اوامر ونواہی کا بھی، اسی کا نام حدیث وسنت ہے، قول رسول کا نام حدیث ہے اور عمل متواتر کا سنت اور کلام مجید کے بعد اسی حدیث وسنت کا درجہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تركت فيكم الثقلين كتاب الله وسنتي'' ''میں نے تمہارے لیے دو بھاری چیزیں چھوڑی ہیں کتاب اللہ اور اپنی سنت، بلکہ اپنی سنت کے ساتھ خلفائے راشدین کی سنت پر بھی عمل کا حکم دیا ہے، ''عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين'' جن کی زندگی اتباع سنت کا نمونہ تھی۔

درحقیقت اسلام کی پوری عمارت قرآن مجید اور احادیث نبوی پر قائم ہے، وہ

(١) مسلم ج ۲ کتاب الفضائل باب توقیرہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

کلام مجید کی تفسیر بھی ہے، اُس کے اجمال کی تفصیل بھی، اس کے کلی احکام سے جزئیات کی تفریع بھی اور اسلام کے قرن اول کی تاریخ بھی، اس کے بغیر اسلام کی تعلیم اور اس کی ابتدائی تاریخ کے بہت سے اوراق سادہ رہ جاتے ہیں، اسلام کے ارکان اربعہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی احکام بھی نہیں معلوم ہو سکتے ہیں اور نہ اس کو حدیث کی مدد کے بغیر ادا کیا جا سکتا ہے، ان کے صرف کلی احکام قرآن مجید میں ہیں، اس کی تفصیل حدیث وسنت سے معلوم ہوتی ہے، یہی حال اکثر اوامر ونواہی اور حلال وحرام کا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، اسلام کا ظہور، اس کی تبلیغ، اس کی راہ کی صعوبتیں، غزوات، اسلام کا غلبہ واقتدار، حکومت الٰہیہ کا قیام، اس کا نظام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ کی سیرت معلوم کرنے کا ذریعہ صرف حدیث ہے، اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو اسلام کی بہت سی تعلیمات اور تاریخ اسلام کے بہت سے گوشے مخفی رہ جائیں گے اس لیے احادیث نبویؐ اسلام اور اسلامی تاریخ کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں اور اس پر ان کی عمارت قائم ہے، اس لیے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی روایت واشاعت کا حکم دیا ہے اور مبلغ حدیث کے لیے دعا فرمائی ہے:

نضر الله امرأ سمع منا حديثا فحفظه حتى يبلغه فرب حامل فقه الى من هو افقه منه ورب حامل فقه ليس بفقيه.

(ابوداؤد ج ۲ کتاب العلم باب فضل نشر العلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا اس شخص کو سرسبز وشاداب رکھے جس نے ہم سے ایک حدیث سنی، اس کو محفوظ رکھا اور اس کو دوسروں تک پہنچایا، کیوں کہ بسا اوقات علم کا حامل اس کو ایسے شخص تک پہنچاتا ہے جو اس سے زیادہ سمجھ دار ہوتا ہے اور وہ خود سمجھدار نہیں ہوتا۔

آپ نے حدیثوں کی کتابت کا بھی حکم دیا ہے، بعض لوگوں کے لیے حدیثیں

لکھوائی ہیں، "حدثوا عنی ولا حرج"۔ "اکتبوا لابی شاہ" حجۃ الوداع میں آپ نے جو خطبہ دیا تھا جو اسلام کے بہت سے اساسی احکام پر مشتمل ہے، اس کو دوسروں تک پہنچانے کا عام حکم دیا تھا، چنانچہ حدیث کی اُن تمام کتابوں میں جن میں اس خطبہ کا ذکر ہے آپ کا ارشاد "فلیبلغ الشاھد الغائب" (۱) بھی ہے، یعنی جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ اُن لوگوں تک اُن احکام کو پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں، اسی کا نام روایتِ حدیث ہے۔

اس لیے عہدِ رسالت سے لے کر بعد کے ہر دور میں حدیث نبوی ﷺ کی نقل و روایت کا سلسلہ جاری رہا، یہ حدیثیں پوری دنیائے اسلام میں بکھری ہوئی تھیں، محدثینِ کرام کا یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس زمانہ میں جب کہ سفر کی سہولتیں نہ تھیں اور سفر ہم معنی سفر سمجھا جاتا تھا اور نہ نشر و اشاعت کے موجودہ سامان تھے، تعلیم بھی محدود تھی، دنیائے اسلام کا چپہ چپہ چھان کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال یعنی حدیث و سنت کو تحقیق و صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ جمع و مرتب کیا، ان کے ردّ و قبول اور صحت و سقم کے جانچنے اور رواۃ کی جرح و تعدیل کے اصول بنائے، اصولِ حدیث کا مستقل فن ایجاد کیا، ہزاروں راویانِ حدیث کے حالات نہایت صحت و تحقیق کے ساتھ قلمبند کیے جو مسلمانوں کا بڑا قابلِ فخر کارنامہ ہے۔

اس لیے صاحبِ تصنیف محدثین کے حالات میں ایک کتاب کی تالیف عرصہ سے دار المصنفین کے پیشِ نظر تھی، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار المصنفین کے قیام سے بھی پہلے امام بخاری اور امام مالک کے حالات الندوہ میں لکھ چکے تھے، امام مالک کے حالات بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیے، مولانا عبد السلام صاحب مرحوم نے امام مسلم کے حالات اور راقم نے امام ترمذی کے حالات لکھے تھے، سید صاحبؒ کی خواہش تھی کہ اس سلسلہ کو مکمل کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے، مگر اس وقت یہ کام نہ ہو سکا، اب اس

(۱) اس قسم کے اور بھی ارشادات حدیث کی کتابوں میں ہیں، ہم نے صرف مثالاً چند نقل کیے ہیں۔

زمانہ میں جب کہ موجودہ دور کے مجتہدین حدیث سے آزادی کے لیے اس کے پورے ذخیرہ کو مشکوک اور ناقابل اعتبار قرار دینے کی مہم میں لگے ہوئے ہیں، محدثین کرام کے حالات کو شائع کرنے کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہوئی تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ انھوں نے کس جانکاہ محنت سے اور کتنی تحقیق واحتیاط کے ساتھ حدیثوں کو جمع ومرتب کیا اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق وصحت کے مادی وعقلی معیار کے اعتبار سے بھی دنیا کا کوئی علمی ذخیرہ حدیث کی کتابوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

یہ کتاب دو جلدوں میں ہوگی، پہلی جلد میں امام مالکؒ سے لے کر امام طحاویؒ تک، یعنی دوسری صدی ہجری سے لے کر چوتھی صدی کے شروع تک (جو تدوین حدیث کا سب سے اہم دور ہے) کے محدثین اور ان کی تصانیف کے حالات ہیں، دوسری جلد میں اس کے بعد کے محدثین کے حالات ہوں گے۔

اس حصہ میں امام بخاریؒ کے حالات سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قلم کے ہیں، امام مالکؒ کے حالات حیات امام مالکؒ کی تلخیص ہے، امام مسلمؒ کے حالات مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم کے اور امام ترمذی کے راقم کے تحریر کردہ ہیں، باقی محدثین کے حالات مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی نے لکھے ہیں، اس طرح یہ کتاب صاحب تصنیف محدثین کرام کا تذکرہ بھی ہے، تدوین حدیث کی تاریخ بھی اور حدیث کی موجودہ کتابوں پر نقد وتبصرہ بھی، اللہ تعالیٰ اس کو نافع بنائے۔

معین الدین احمد ندوی
دارالمصنفین اعظم گڑھ
۱۵/ مارچ ۱۹۶۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام مالکؒ

(المتوفی ۱۷۹ھ/۷۹۵ء)

نام ونسب وولادت: مالک نام، ابوعبداللہ کنیت، امام دارالہجرۃ لقب تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے: مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن حارث بن عمر بن حارث بن غیمان بن جثیل بن عمرو ابن حارث ذی اصبح۔(۱)

امام مالکؒ خالص عرب خاندان سے تھے جو جاہلیت اور اسلام دونوں میں معزز تھا، بزرگوں کا وطن یمن تھا مگر اسلام کے بعد مدینۃ النبی میں سکونت اختیار کر لی تھی، نسباً یمن کے آخری خاندان شاہی یعنی حمیر کی شاخ ''اصبح'' سے تعلق رکھتے تھے' امام کے مورث اعلیٰ حارث اس خاندان کے شیخ تھے' اسی لئے ذی اصبح کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ کے خاندان میں سب سے پہلے آپ کے پردادا ابوعامر عہد نبویؐ میں مشرف بہ اسلام ہوئے، امام مالکؒ کے دادا مالک بن ابی عامر جلیل القدر تابعی اور صحاح کے رواۃ میں داخل ہیں، حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان کو یک گونہ اختصاص تھا، چنانچہ جن سربکف جوانمردوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ان کی لاش کو دشمنوں کے نرغہ سے اٹھا کر دفن کرنے کی خطرناک خدمت انجام دی تھی ان میں ایک یہ بھی تھے، فن روایت وحدیث

(۱) کتاب الانساب سمعانی' ورق ۱۴۱۔

میں ان کو حضرت عمرؓ، عثمانؓ، طلحہؓ، عقیلؓ بن ابی طالب، ابو ہریرہؓ، ام المومنین حضرت عائشہؓ و دیگر صحابہ کبار رضی اللہ عنہم سے شرف تلمذ حاصل تھا، مدینہ کے مشہور فقیہ سلیمان بن یسار اور خود مالک کے بیٹوں نے اور دوسروں نے مالک سے حدیث روایت کی ہے، موطا میں بھی ان کی روایات ہیں، امام نسائی نے ان کی توثیق کی ہے، ۱۰۴ھ میں وفات پائی۔

مالک بن ابی عامر کے تین بیٹے تھے، انس امام مالک کے والد بزرگوار، ربیع اور ابوسہیل نافع، ابوسہیل نافع ایک بلند پایہ محدث تھے، ثقات تابعین اور ارکانِ حدیث میں ان کا شمار ہے، امام مالکؒ نے مؤطا میں ان سے روایت کی ہے۔

امام کے عم محترم ربیع اور والد ماجد انس بھی اپنے خاندان کی علمی وراثت سے محروم نہ تھے تاہم اس فن میں کوئی مخصوص پایہ نہیں رکھتے تھے اور نہ مؤطا میں امام نے ان سے کوئی روایت کی ہے۔(۱)

امام مالکؒ کی صحیح تاریخ ولادت (۹۳ھ) ہے، کیونکہ یہ تاریخ امام کے شاگرد خاص یحییٰ ابن بکیر سے سند کے ساتھ مروی ہے، جو مدتوں امام کی صحبت میں رہے ہیں۔(۲)

تعلیم و تربیت: امام نے ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم کی آغوش میں پایا، خود ان کا گھر اور گھر سے باہر پورا شہر علماء و فضلاء کا مخزن تھا، آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد سینکڑوں صحابہ دور دراز مقامات میں نکل گئے تھے لیکن معدن سونا نکلنے کے بعد بھی معدن ہے، تمام اکابر صحابہؓ جو علومِ شریعت کے امین اور قرآن وسنت کے خزینہ دار تھے، اسی مقدس شہر میں سکونت پذیر تھے، عہد نبویؐ اور اس کے بعد بھی ۲۴، ۲۵ برس تک پوری حکومتِ اسلامیہ کا یہ مرکز تھا، یہیں سے احکام و فتاویٰ فقہائے صحابہ کی مجلس میں طے ہو کر تمام دنیائے اسلام میں پھیلتے تھے۔

(۱) تزئین الممالک، ابن خلکان ج ۲ص ۲۰۰، اسعاف المبطاء برجال المؤطا ص ۳۳ تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ص ۱۸۸، کتاب الانساب سمعانی ورق ۳۱ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۱۹۲۔

مدینہ کے فقہائے صحابہ: حضرت ابوبکرؓ صدیق، عمرؓ فاروق اور حضرت عائشہؓ جو اسرارِ شریعت کے راز داں تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ جن سے بڑھ کر آنحضرت ﷺ کے اعمال وسنن کا متبع اور واقف کار کوئی دوسرا نہ تھا، حضرت ابن عباسؓ جو حبر الامۃ تھے، حضرت ابو ہریرہؓ جن سے بڑھ کر حدیث کا کوئی دوسرا راوی نہیں، حضرت زید بن ثابتؓ جو کاتبِ وحی تھے، ان سب کی درسگاہیں اسی شہر میں آباد تھیں۔

تابعین مدینہ: تلامذۂ صحابہ میں سے جن کو اصطلاح میں تابعین کہتے ہیں، قاسم بن محمد، عروہ بن زبیرؒ نافع، عبداللہ بن دینار، سالم بن عبداللہ، خارجہ بن زید، سعید بن مسیّب، ہشام بن عروہ، محمد بن منکدر، عبیداللہ بن عتبہ بن مسعود، محمد بن مسلم بن شہاب زہری، عامر بن عبداللہ، جعفر صادق، ربیعہ رای، ابو سہیل نافع بن مالک اور سلیمان بن یسار وغیرہ وہ بزرگان اسلام ہیں جن کے فضل وکمال کے آغوش میں اسلام کے علم دین نے نشو ونما پائی ہے، اسی مدینۃ النبی کے لعل وگہر تھے۔

فقہائے سبعہ: ان میں سے ابوبکر بن حارث (۹۴ھ) خارجہ بن زید (۹۹ھ) قاسم بن محمد (۱۰۱ھ) سعید بن مسیّب (۱۰۱ھ) عبداللہ بن عتبہ (۱۰۲ھ) سالم بن عبداللہ (۱۰۶ھ) سلیمان بن یسار (۱۰۷ھ) مدینہ کے فقہائے سبعہ کہلاتے ہیں، صحابہ کے بعد تمام فتاویٰ، مسائل اور مقدمات وقضایا انہی کے فیصلہ سے طے پاتے تھے، ان کی مجلس اجتماعی اس عہد کی سب سے بڑی عدالت العالیہ تھی، فقہ مدینہ جس کا ذکر آگے آئے گا ان ہی فقہائے سبعہ کی علمی مجلسوں کے نتائج بحث ہیں۔

شیوخ مالک: امام مالک نے جب آنکھ کھولی تو مدینہ باغ وبہار تھا، چند کے سوا تمام بزرگوار درس وافتاء میں مشغول تھے، امام نے ان میں سے اکثر سے استفادہ کیا اور اس طرح مدینہ کا جو علم متفرق سینوں میں پراگندہ تھا وہ ایک سینہ میں مجتمع ہوگیا اسی لئے امام دارالہجرۃ آپ کا لقب ہوا، امام کے شیوخ کی یوں تعداد تو بہت ہے، اسماء الرجال کی کتابوں میں ہے

کہ (روی عن خلق کثیر) یعنی انھوں نے بہت سے لوگوں سے روایتیں کی ہیں۔

امام کے شیوخ اعزہ: خود امام کا گھر علم حدیث کا مرجع تھا، آپ کے دادا، چچا اور والد محدث تھے، امام کے دادا جو ثقات رواۃ میں ہیں، امام کے ہوش تک زندہ تھے لیکن ان سے بلا واسطہ امام نے فیض حاصل نہیں کیا، ابو سہیل نافع امام کے ایک چچا روایت و حدیث کے شیخ تھے، امام زہری وغیرہ کے استاذ ہیں، امام نے بھی ان سے حدیثیں سیکھی ہیں، آپ کے والد انس اور دوسرے چچا ربیع دونوں اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں لیکن ان سے کوئی روایت امام نے موطا میں نہیں نقل کی ہے۔

امام نے غالباً لڑکپن سے طلب علم شروع کی، خود ان کی زبانی مروی ہے ''میں نافع کے پاس آتا تھا تو ایک کم سن لڑکا تھا، میرے ساتھ ایک غلام ہوتا تھا، نافع اتر کر آتے تھے تو مجھ سے حدیث بیان کرتے تھے۔''(۱)

اس وقت تک تعلیم کا نصاب نہایت سادہ تھا یعنی قرآن مجید، حدیث اور فقہ۔

امام مالک نے قرآن مجید کی قرأت وسند مدینہ کے امام القراء ابورديم نافع بن عبدالرحمن متوفی ۱۶۹ھ سے حاصل کی،(۲) جن کی قرأت پر آج تمام دنیائے اسلام کی قرأت کی بنیاد ہے، قرآن مجید کی تعلیم ہمیشہ مسلمانوں میں لڑکپن میں ہوتی ہے، عجب نہیں کہ اس کا یہی زمانہ ہو۔

علم حدیث: علم حدیث کی تعلیم بھی بچپن ہی سے شروع ہوئی جیسا کہ گذشتہ روایت سے ثابت ہوتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام کے سب سے پہلے شیخ الحدیث حضرت نافع ہیں یا ممکن ہے آپ کے چچا ابو سہیل ہوں لیکن یہ محض قیاس ہے اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔

نافع: نافع حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام اور حدیث و روایت میں ان کے شاگرد

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۸ ترجمہ نافع (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰ و جلد ۳ ص ۵۱۔

تھے، حضرت نافع نے کامل تیس سال حضرت ابن عمرؓ کی خدمت کی ہے، ان کے علاوہ اور متعدد صحابہ حضرت عائشہؓ، ام سلمہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ وغیرہ سے بھی روایت کی ہے، امام اوزاعی، امام زہری، ایوب سختیانی، ابن جریج، امام مالک جیسے ائمہ حدیث ان سے شرف تلمذ رکھتے تھے، نافع کی جلالت قدر کا اس سے اندازہ ہوگا کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو خود مجتہد و ناقد فن تھے، نافع کو اہل مصر کی تعلیم کے لئے بھیجا تھا، ۱۱۷ھ میں نافع نے وفات پائی۔(۱)

نافع جب تک زندہ رہے، امام مالک ان کے حلقۂ درس سے استفادہ کرتے رہے، وہ ان سے پوچھتے تھے کہ ''ان مسائل میں حضرت ابن عمرؓ نے کیا فرمایا ہے'' نافع ان کے اقوال بیان کرتے تھے، شاگرد کو استاد کے علم و فضل پر اتنا غرور تھا کہ فرماتے ہیں کہ ''جب میں ابن عمرؓ کی حدیث نافع کی زبان سے سن لیتا ہوں تو پھر اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ کسی اور سے بھی اس کی تائید سنوں'' شاگرد و استاد کے شرف و قبول کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ روایت مالک عن نافع عن ابن عمرؓ کو دنیا سلسلۃ الذہب یعنی ''طلائی زنجیر'' کہہ کر پکارتی ہے۔(۲)

نافع کے علاوہ امام نے مدینہ کے دوسرے شیوخ کبار سے بھی حدیث سیکھی، جن میں ممتاز نام یہ ہیں: محمد بن شہاب زہری، جعفر صادق بن محمد، محمد بن منکدر، محمد بن یحییٰ انصاری، ابوحازم، یحییٰ بن سعید۔

شیوخ کی تعداد: امام مالک نے مؤطا میں جن شیوخ سے روایت کی ہے ان کی مجموعی تعداد شاہ ولی اللہ صاحب نے مسوی کے مقدمہ میں پچھتر (۷۵) بتائی ہے لیکن اسعاف المبطاء برجال المؤطا سے میری تحقیق کے مطابق شیوخ کی تعداد چورانوے (۹۴) ہے لیکن یہ تعداد مؤطا کی احادیث و آثار کی ہے، ورنہ اصل میں امام مالک کی احادیث صحیحہ و غیر صحیحہ کی تعداد دس

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۷ و ۸۸ (۲) ابن خلکان ج ۳ ص ۵۰۔

ہزار ہے، اس لحاظ سے اگر شیوخ کی تلاش کی جائے تو موجودہ تعداد سے بہت زیادہ بڑھ جائے گی، امام مسلم نے امام مالک کے شیوخ کے حال میں ایک مستقل کتاب لکھی تھی لیکن اب وہ ناپید ہے۔

غیر مدنی شیوخ: امام مالک کے اساتذہ میں بعض غیر مدنی شیوخ کے نام بھی ملتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک ایسے چھ اشخاص ہیں، جیسا کہ مقدمہ مسوی میں لکھا ہے لیکن درحقیقت نو شخص ہیں، ایک شام کے ابراہیم بن ابی عبلہ مقدسی، دو مکہ معظمہ کے محمد بن مسلم ابوالزبیر مکی اور حمید بن قیس اعرج مکی، دو خراسان کے عطاء بن ابی مسلم خراسانی اور زیادہ بن سعد خراسانی، دو جزیرہ کے عبدالکریم بن مالک جزری اور زید بن انیسہ جزری اور دو بصرہ کے ایوب سختیانی بصری اور حمید بن ابی حمید الطویل بصری، امام نے ان ممالک کا کبھی سفر نہیں کیا اس لیے ان بزرگوں سے اخذ واستفادہ کا موقع مدینہ ہی میں ملا ہوگا، کیوں کہ حج وزیارت کی غرض سے اکثر بزرگانِ علم کا سال میں ایک بار اور کبھی کبھی کئی کئی بار مدینہ میں آنا ہوتا تھا۔

علم فقہ: امام مالک نے فقہ کی تعلیم گو نافع وغیرہ شیوخ سے بھی پائی لیکن ابوعثمان ربیعۃ الرای سے خاص طور سے اس کی تحصیل کی، ربیعہ مدینہ کے کبار تابعین میں تھے، حضرت انس رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابۂ کرام کے دامنِ تربیت میں تعلیم پائی تھی، امام مالک، یحییٰ انصاری، شعبہ، اوزاعی، حسن بصری، لیث مصری وغیرہم جو اس طبقہ کے اکابر رجال واعیان علم ہیں ان کے شاگرد ہیں، ربیعہ کے ساتھ امام مالک کا اختصاص اس درجہ تھا کہ تاریخ ورجال میں ''شیخ مالک'' ان کے نام کا جزء ہوگیا ہے، ربیعہ اجتہاد واستنباط وتفریع ورائے میں اس قدر معروف تھے کہ ''رائی'' ان کا لقب ہوگیا، امام ابن حنبل ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن شیبہ کا قول ہے کہ وہ ''ثقہ'' ثبت اور مدینہ کے مفتیوں میں سے ایک تھے، خطیب نے لکھا ہے ''وہ فقیہ، عالم اور فقہ وحدیث دونوں کے حافظ تھے۔''

ربیعہ رائی خاص مسجد نبویؐ میں درس دیتے تھے، قرن اول کا مدینہ جو سینکڑوں محدثین وفقہا کا مخزن تھا، اس میں فتویٰ دینا ایک خاص لیاقت وقابلیت کا کام تھا، ربیعہ رائے اس وصف سے متصف اور ان اکابر فقہائے محدثین میں تھے جن کو مدینۃ الرسول کے مفتی ہونے کی سعادت حاصل تھی، دولت عباسیہ کے پہلے فرماں روا سفاح نے قاضی دارالخلافت کا عہدہ ان کے سپرد کیا، حکومت عباسیہ کا پہلا پایہ تخت انبار تھا یہیں ۱۳۶ھ میں انھوں نے وفات پائی۔

امام مالک کے شیوخ واساتذہ کی یہ تعداد اس زمانہ کے کثرتِ شیوخ کے مذاق کے لحاظ سے نہایت کم ہے اور عجب نہیں کہ اس پر ان لوگوں کو جو تعداد کو افضلیت کا معیار جانتے ہیں تعجب ہوا، لیکن درحقیقت اس میں بھی امام مالک کے لئے ایک مزیت خاص مضمر ہے۔

امام مالکؒ کا انتخاب شیوخ: صحابہ کے بعد تابعین کا دور شروع ہوا، یہ دور ثانی یا قرن ثانی گو عمومیت اور اکثریت کے لحاظ سے خیر وبرکت کا عہد اور صدق وطہارت کا دور تھا تاہم زمانہ کا کوئی دور کبھی ایسا نہیں گذرا ہے اور نہ گذر سکتا ہے، جب مجمع انسانی فاسد عنصر سے بالکل خالی ہو زمانہ کے خیر یا شر ہونے کا فیصلہ صرف نسبتاً ہو سکتا ہے، صحابہ کا قرن اول اپنے ماقبل ومابعد کی نسبت سے خیر القرون تھا تاہم وہ ماعز اور زن مخزومیہ وغیرہ کے وجود سے خالی نہ تھا، گو یہ ہستیاں بھی قرون مابعد کے اخیار وابرار سے شرف صحبت، قوت ایمان، اعتراف قصور وخشیت الٰہی اور توبہ وندامت میں بدر جہا بہتر تھیں، عفی اللہ عنہم۔

صحابہ کے بعد تابعین کا زمانہ بھی اپنے مابعد کے لحاظ سے برکات کا مجمع اور کمالات کا منبع تھا، تاہم وہ .... انسانی طبقات کے جو اقسام ہیں اُن سے یکسر پاک بھی نہ تھا، بہتیرے لوگ قصداً جھوٹ بولتے تھے، بہتیرے اپنے غایت زہد وسادہ دلی سے ہو بولنے والے کو سچا سمجھ کر بلا تامل اس کی بات نقل کرتے تھے، اس طرح نادانستہ کذب

بیانی میں مبتلا ہو جاتے تھے، سینکڑوں غیر فقیہ راوی ایسے تھے جو اپنی روایات کا خود محل و مفہوم نہیں سمجھتے تھے، کچھ ایسے تھے جو فن کی عدم ممارست کے سبب سے جید وردی میں تمیز نہیں کر سکتے تھے لیکن چوں کہ اس زمانہ کی آب و ہوا میں روایت حدیث اور اشاعت قول نبوی کا مذاق پھیلا ہوا تھا اور یہی عزو شرف کا ذریعہ تھا، اس لیے اہل فضل اور مستحقین علم کے پہلو بہ پہلو نا اہل اور غیر مستحقین بھی اپنی مسند بچھاتے پھرتے تھے، باہر کے ناواقف آفاقی جن میں زیادہ تر عراقی تھے، ہر چمکدار چیز کو سیم خالص سمجھ کر اور ہر ڈھیر سے بلا تمیز ایک خروارہ اٹھاتے پھرتے تھے اور اس بار گراں کے ساتھ جب گھر لوٹتے تھے تو اپنے کو سب سے بڑے ڈھیر کا مالک سمجھ کر خوش ہوتے تھے۔

امام مالک کا مدینہ وطن تھا، بچپن سے علما میں تربیت پائی، ایک ایک صاحب حدیث سے برسوں ملاقاتیں رہیں، ہر ایک سرمایہ دار کی متاع کے ایک ایک ذرہ سے واقف تھے اور یہ غیر ممکن ہے کہ نا اہلوں کی نا اہلیت خود اپنے ارباب وطن سے مخفی رہے۔

خصوصیات شیوخ مالک: امام مالک نے صرف ان ہی اساتذۂ فن سے استفادہ کیا جو اہلیت و استحقاق کے مسند نشیں تھے اور صرف ان شیوخ کے حلقۂ درس میں بیٹھے جو صدق وطہارت میں معروف اور حفظ و فقہ میں ممتاز تھے، امام ممدوح ہمیشہ تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ میں کبھی کسی غیر فقیہ (سفیہ) کی مجلس میں نہیں بیٹھا، امام ابن حنبل فرماتے ہیں کہ ''یہ مخصوص نعمت تھی جو صرف حضرت امام مالک کے حصہ میں آئی۔'' امام صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''اس صحن مسجد (نبوی) میں ان ستونوں کے پاس میں نے ستر شیوخ کو پایا جو قال اللہ قال الرسول کہا کرتے تھے لیکن ان میں سے ایک کے پاس بھی میں نہیں بیٹھا۔'' کبھی فرماتے ''مدینہ میں بیسیوں اشخاص تھے جن سے لوگ حدیث سیکھتے تھے لیکن میں نے کبھی ان سے اخذ علم نہیں کیا، یہ چند قسم کے لوگ تھے، بعض نادانستہ جھوٹ بولتے تھے، بعض مغز سخن سے ناواقف تھے، بعض پورے جاہل تھے، ابن وہب جو امام صاحب کے نامور

شاگرد ہیں نقل کرتے ہیں کہ امام صاحب نے فرمایا کہ مدینہ میں ایسے لوگ تھے کہ اگر بارش کی دعا مانگی جاتی تو ان کی برکت سے آسمان سے پانی برس پڑتا" اور بہت سی احادیث اور مسائل کی ان کو سماعت بھی حاصل تھی لیکن میں نے ان سے استفادہ نہیں کیا کیوں کہ وہ صرف متقی اور زاہد تھے اور حدیث و روایت اور فتویٰ کا کام صرف زہد و اتقا اور سادگی سے نہیں چل سکتا، اس کے لیے اتقا و پرہیز گاری کے ساتھ علم و فہم اور پختگی کی حاجت ہے، وہ یہ جانتا ہو کہ اس کے منھ سے کیا نکل رہا ہے اور کل قیامت کے دن یہ معاملہ کہاں تک پہنچے گا، جس زہد کے ساتھ پختگی اور دانائی نہ ہو وہ اس راہ میں مفید نہیں اور نہ وہ حجت ہے اور نہ ایسے لوگوں سے اخذ علم کرنا چاہیے۔" امام مالک کے بھانجے اسماعیل بن ابی اویس روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں مالک کو کہتے سنا ہے کہ "یہ علم حدیث دین ہے پہلے دیکھ لو کہ کس سے حاصل کرتے ہو، میں نے ان ستونوں کے پاس ستر آدمیوں کو قال رسول اللہ قال رسول اللہ کہتے سنا لیکن میں نے ان سے ایک حرف نہیں سیکھا، حالانکہ ان میں سے ہر شخص ایسا تھا کہ اگر خزانہ بھی ان کے سپرد کیا جاتا تو ان کی ایمان داری اور دیانت کے شیشہ میں بال نہ آتا لیکن وہ اس فن کے آدمی نہ تھے۔" مطرف بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے امام کی زبان سے ان کا قول سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ "میں نے اس شہر میں بہت سے نیک و صالح لوگوں کو پایا لیکن ان سے میں نے حدیث نہیں سنی۔" لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ "جو وہ کہتے تھے وہ سمجھتے نہ تھے۔"(۱)

امام صاحب نے اہل عراق سے کیوں روایت نہیں کی: امام کے شیوخ میں کوئی عراقی نہیں ہے، ابو مصعب جو امام کے شاگرد اور مشہور محدث ہیں، بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اہلِ عراق سے کیوں روایت نہیں کی؟ جواب میں فرمایا کہ "کیا میں ایسے لوگوں سے روایت کروں جن کو میں نے دیکھا ہے کہ یہاں آکر ان

(۱) مقدمہ اسعاف ص ۲، ۳، ۴، ۵۔

لوگوں سے حدیث سیکھتے ہیں جن پر وثوق نہیں کیا جا سکتا" ابو مصعب کا بیان ہے کہ "میں نے کہا کہ وہ اپنے شہر میں بھی ایسے ہی لوگوں سے روایت کرتے ہیں" اسی قسم کا سوال ایک بار امام مالک سے شعیب بن حرب نے کیا کہ آپ لوگ اہل عراق سے کیوں نہیں روایت کرتے، امام صاحب نے کیا معقول جواب دیا، فرمایا کہ "ہمارے بزرگوں نے ان کے بزرگوں سے روایت نہیں کی اس لیے ہمارے پچھلوں نے بھی ان کے پچھلوں سے روایت نہیں کی۔(۱)

امام مالک جب کسی غیر مدنی شیخ سے اخذِ حدیث کرنا چاہتے تھے تو پہلے اس کو پوری طرح جانچ لیتے تھے، امام کا کوئی شیخ اگر عراقی کہا جا سکتا ہے تو وہ بصرہ کے ایوب سختیانی مشہور تابعی المتوفی ۱۳۱ھ ہیں جن کی نسبت ابن سعد کہتے ہیں "كان حجة ثقة ثبتا في الحديث جامعا كثير العلم" اور جن کو شعبہ نے سید الفقہاء کا خطاب دیا ہے اور جن کا نام رجال میں احد الائمۃ الاعلام کے وصف کے ساتھ لیا جاتا ہے، امام مالک فرماتے ہیں کہ مکہ میں حج کے موقع پر ان کو دو سال میں نے دیکھا لیکن ان سے کوئی حدیث نہیں لکھی، تیسرے سال دیکھا کہ وہ صحن زمزم میں بیٹھے ہیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی لیا جاتا تو وہ اتنا روتے کہ مجھ کو رحم آتا تھا، جب یہ حال دیکھا تو ان کی حدیث لکھی۔(۲)

اپنے دادا اور بعض فقہائے سبعہ سے کیوں نہیں روایت کی: امام جب سن رشد کو پہنچے اُس وقت آپ کے دادا مالک بن ابی عامر زندہ تھے، ان کی وفات کے وقت امام کی عمر ۱۲، ۱۳ سال کی تھی، فقہائے سبعہ میں سے سالم بن عبداللہ نے ۱۰۶ھ میں وفات پائی، جب کہ امام کی عمر ۱۶ برس کی تھی، سلیمان بن یسار نے ۱۰۷ھ میں انتقال کیا، اس وقت امام ۱۷ سال کے تھے تاہم امام صاحب نے ان بزرگوں سے بلا واسطہ کوئی روایت نہیں کی، اس کا سبب خود

(۱) مقدمہ اسعاف ص ۲،۳ (۲) مقدمہ اسعاف ص ۳ تا ۵۔

انھوں نے بیان فرمادیا ہے کہ "مدینہ میں بعض ایسے لوگوں کا زمانہ میں نے پایا ہے جو ۱۰۰ اور ۱۰۵ برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے لیکن ایسے بوڑھوں کی روایت نہیں لی جاتی ہے اور اگر کوئی لے تو عیب شمار کیا جائے گا۔" اور یہ بالکل سچ ہے کیوں کہ عمر کی طوالت کا حفظ وعقل کے ضعف پر جو اثر پڑتا ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔

امام مالک کے اس احتیاط وتمیز ونقد کا یہ اثر تھا کہ امام مالک جس شیخ سے روایت کرتے تھے وہ ثقاہت وعدالت وحفظ میں نشان سمجھا جاتا تھا، یحییٰ بن معین جو مبصرین فن حدیث کے امام ہیں فرماتے ہیں کہ "ہم لوگ امام کے آگے کیا ہیں؟ ہم لوگ تو اُن کے نقش قدم پر چلتے ہیں، جب کسی شیخ کا نام آتا ہے تو دیکھتے ہیں کہ امام مالک نے اس سے لیا ہے یا نہیں، اگر نہیں لیا ہے تو چھوڑ دیتے ہیں۔" امام احمد بن حنبل سے کسی نے ایک راوی کی نسبت پوچھا انھوں نے فرمایا کہ "میرے نزدیک وہ اچھا ہے کیوں کہ امام مالک نے اس سے روایت کی ہے۔" (۱)

اساتذہ آپ کے معترف تھے: امام مالک فطرتاً قوی الحافظہ تھے، خود فرمایا کرتے تھے کہ کوئی چیز میرے خزانۂ دماغ میں آکر پھر نہ نکلتی (۲) اور خود دوسروں کو بھی اس کا اعتراف تھا، ابوقلابہ کہتے ہیں كان مالك احفظ اهل زمانه (۳) ایک بار استاذ ربیعہ کی معیت میں امام زہری کی مجلس میں حاضر ہوئے، امام زہری نے اُس دن چالیس سے زیادہ حدیثوں کا املا کرایا۔ دوسرے دن پھر مجلس منعقد ہوئی تو امام مالک اپنے استاذ کے ساتھ پھر حاضر ہوئے، امام زہری نے کہا کتاب لاؤ، میں اس سے حدیث بیان کروں، کل جو میں نے بیان کیا تھا اس سے تم کو کیا فائدہ ہوا، ربیعہ نے کہا اس مجلس میں ایک شخص ہے جو کل کی تمام حدیثیں زبانی سنادے گا، زہری نے پوچھا وہ کون ہے؟ ربیعہ نے کہا ابن ابی عامر، زہری

(۱) ان تمام اقوال کے لیے دیکھئے مقدمہ اسعاف (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۸، ۱۸۹ (۳) تزیین الممالک ص ۹ مصر۔

نے سنانے کا اشارہ کیا، امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے چالیس حدیثیں سنا دیں، زہری نے تعجب سے کہا میرا خیال تھا کہ یہ حدیثیں میرے سوا کسی کو یاد نہیں ہیں۔(۱)

شوقِ علم اور فراغ قلب بہت کم مجتمع ہوئے ہیں، امام مالک کے فقر کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ چھت کی کڑیاں فروخت کر کے ضرورتیں پوری کیں لیکن دست طلب کوتاہ نہیں کیا۔(۲) اسی لیے آپ فرماتے تھے کہ "اس علم میں کسی شخص کو اس وقت تک کمال حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مبتلائے فقر نہ ہو اور اس پر بھی طلب علم کو ترجیح دے(۳) امام مالک طلب علم کے لیے بجز موسم حج کے مدینہ سے باہر نہیں نکلے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کو طلب علم کے لیے محنت نہیں اٹھانی پڑی، ابن سعد نے امام مالک سے بیک واسطہ روایت کی ہے کہ نافع سے حدیث سیکھنے کا وقت ٹھیک دوپہر کو مقرر تھا، دوپہر کی دھوپ میں بلا سایہ شہر سے باہر بقیع میں جاتا تھا، جہاں ان کا مسکن تھا، مدینہ کے ایک فقیہ ابن ہرمز تھے، ان کے گھر صبح کو آتا تھا تو رات کو جاتا تھا۔(۴)

مجلس درس: اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امام صاحب کی لیاقت واستحقاق کا اعتراف عام طور سے کیا جارہا تھا اور امام کے شیوخ کی موجودگی میں امام کے مستفیدین کا الگ حلقہ قائم ہو چکا تھا(۵) شیخ الفقہ ربیعہ متوفی ۱۳۶ھ زندہ تھے کہ امام مالک فقہ وفتویٰ کے مرجع بن گئے،(۶) اور ربیعہ کی وفات کے بعد تو متفقہ طور سے فقہ ورائے واجتہاد کے امام تسلیم کر لیے گئے، ابن ربیعہ نے جو مصر کے ایک شیخ حدیث ہیں، شیخ مدینہ ابو الاسود نعیم بن عروہ بن زبیر سے پوچھا کہ "ربیعہ کے بعد مدینہ میں فقہ واجتہاد کا امام کون ہے؟" انھوں نے جواب دیا کہ نوجوان اصبحی(۷) یعنی (مالک بن انس اصبحی)

---

(۱) تزیین الممالک ص ۹ مصر ص ۱۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۱۸۸ (۳) تزیین ونقلا عن الحلیۃ لابی نعیم ص ۱۵ مصر (۴) طبقات ابن سعد (۵) تزیین الممالک ص ۱۰ (۶) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰ (۷) تزیین الممالک ص ۹۔

مجلس مالک: فن حدیث میں امام صاحب کے خاص شیخ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے غلام نافع تھے، حضرت ابن عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ساٹھ برس تک حدیث و فقہ وفتویٰ وارشاد کے مرکز رہے ہیں، حضرت نافع کامل تیس برس تک سفر وحضر اور خلوت وجلوت میں ہمیشہ حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ رہے اور ان کے بعد ان کی مجلسِ درس میں ان کے جانشیں ہوئے، ۱۱۷ھ میں وفات پائی، امام مالک کم ازکم بارہ برس حضرت نافع کے درس میں رہے۔

حضرت نافع کی وفات کے بعد امام مالک ان کے جانشیں ہوئے، شعبہ جو کوفہ کے رأس المحدثین تھے، بیان کرتے ہیں کہ ''نافع کی وفات کے ایک سال بعد مدینہ آیا تو دیکھا کہ مالک ایک حلقہ کے صدر نشین ہیں۔''(۱) اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب نے ۱۱۷ھ میں اپنی مجلسِ درس مستقل قائم کی۔

مجلس کی تہذیب: امام صاحب کی مجلس درس ہمیشہ پر تکلف فرش اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ رہتی تھی، وسط مجلس میں شہ نشین تھی، جس پر امام صاحب املائے حدیث کے وقت رونق افروز ہوتے تھے، جابجا شرکائے مجلس کے لیے پنکھے پڑے رہتے تھے، جب حدیث کا درس ہوتا تو انگیٹھی میں عود اور لوبان جلائی جاتی، صفائی ونزاہت کا یہ عالم تھا کہ فرش پر ایک تنکا بھی بارِ خاطر ہوتا تھا، جب حدیثِ نبویؐ کے املا کا وقت آتا، پہلے وضو یا غسل کر کے عمدہ اور بیش قیمت پوشاک زیب تن فرماتے، بالوں میں کنگھی کرتے، خوشبو لگاتے، اس اہتمام کے بعد مجلس علمی کی صدارت کے لیے باہر تشریف لاتے۔(۲)

سب لوگ سرنگوں خاموش مؤدب بیٹھتے تھے، یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ بھی جب امام کی مجلس درس میں آکر شریک ہوئے تو وہ بھی اسی طرح مؤدب ہوکر بیٹھے،(۳) اس وقت

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۱ص ۱۸۸ (۲) تزئین الممالک ص۱۳و۱۶وبستان المحدثین ص۳۰۲ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج۱ص۱۸۹۔

امام صاحب کی ہر ادا سے شکوہ اور وقار کا اظہار ہوتا تھا، پوری مجلس پر ایک مقدس سکوت طاری رہتا تھا، امام شافعی فرماتے ہیں کہ ''ہم لوگ کتاب کے ورق بھی اس ڈر سے نہیں الٹتے تھے کہ کھڑ کھڑاہٹ کی آواز نہ ہو۔''(۱) جاہ وجلال اور شان وشکوہ سے کاشانۂ امامت پر بارگاہ شاہی کا دھوکہ ہوتا تھا، طلبہ کا ہجوم، مستفتیوں کا ازدحام، امرا کا ورود، علما کی تشریف آوری، سیاحوں کا گذر، حاضرین کی مودب نشست، مکان کے پھاٹک پر سواریوں کا انبوہ دیکھنے والوں پر رعب طاری کر دیتا تھا، اسی موقع پر ایک شاعر کا گذر ہوا تو بے اختیار اس کی زبان سے یہ دو شعر نکل گئے۔ (۲)

يدع الجواب فما يراجع هيبة   والسائلون نواكس الاذقان

اگر امام جواب نہیں دیتے تو ہیبت سے پھر پوچھا نہیں جا سکتا، پوچھنے والے سر نیچے کئے رہتے ہیں۔

ادب الوقار وعز سلطان التقى   فهو المهاب وليس ذا سلطان

وقار کا ادب اور سلطان تقویٰ کا جاہ وجلال ہے، لوگ اس سے ڈرتے ہیں حالانکہ یہ صاحب حکومت نہیں ہے۔

امام مالک صاحبِ حکومت نہ تھے لیکن صاحبِ حکومت اس آستانہ پر آکر جھکتے تھے، امام شافعی نے اپنی تعلیم کے لئے والیٔ مدینہ کو بہ غرض سفارش جب درِ امامت پر لانا چاہا تو اس نے کہا ''میرا کہاں وہاں گذر۔''

حدیث کا املا مسجد نبوی یا مجلس درس سے باہر نہیں کرتے تھے، خلیفہ مہدی اور ہارون دونوں نے خیمۂ خلافت میں املا کی خواہش کی لیکن امام نے انکار کر دیا، جلدی میں یا کسی کام کی مصروفیت میں یا راہ چلتے ہوئے حدیث نہیں بیان فرماتے تھے کہ خلاف ادب ہے، درحقیقت سماع وفہم حدیث کے لئے اطمینان اور حضورِ قلب چاہیے جو ان موقعوں پر

(۱) توالی التاسیس بمناقب ابن ادریس بن حجر (۲) تزئین ص ۱۷۔

عموماً مفقود ہوتے ہیں، ان کی مجلس میں زور زور سے بولنا بھی خلاف ادب تھا، ایک بار خلیفہ منصور امام سے مسجد میں مناظرہ کر رہا تھا اور اس کی آواز نہایت بلند ہو رہی تھی، امام نے ڈانٹ کر یہ آیت پڑھی۔(۱)

لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ۔ (حجرات:۲)

پیغمبر کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو۔

آپ کا معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک مصلیٰ پر اوراد وظائف میں مشغول رہتے، طلوع کے بعد لوگ آنا شروع ہوتے، امام صاحب ان کی طرف متوجہ ہو کر خیریت پوچھتے، مجلس کی یہ ترتیب تھی کہ قریب تر اچھے، مستعد اور صاحب فہم طلبہ کو جگہ دیتے، پھر علی قدر مراتب لوگ آ آ کر بیٹھتے جاتے، درس شروع کرنے سے پہلے فرما دیتے کہ "مشہور اور صاحب فہم لوگ قریب بیٹھیں، املا آہستہ اور سکون کے ساتھ کرتے، ایک حدیث ختم ہو جاتی تو دوسری حدیث شروع کرتے"

طریقۂ درس: مختلف شیوخ کی مجلسوں میں درس کا طرز مختلف تھا، اکثر شیوخ کا دستور تھا کہ وہ خود کسی بلند مقام پر بیٹھ جاتے یا کھڑے ہو جاتے، طلبہ ترتیب کے ساتھ آگے پیچھے قلم دوات لے کر بیٹھ جاتے، شیخ زبانی یا اپنا جزء حدیث ہاتھ میں لے کر اس سے املا کرتا، طلبہ لکھتے جاتے تھے، مجلس درس میں اگر غیر معمولی اجتماع ہوتا تو تھوڑی تھوڑی دور پر مستملی کھڑے ہو کر شیخ کے الفاظ آگے کو پہنچاتے، امام مالک بھی کبھی کبھی اس طریقہ سے درس دیتے تھے، ابن علیہ جو ایک اچھے شاگرد تھے، امام کے مستملی تھے۔

لیکن مدینہ کے اکثر شیوخ کا دستور یہ تھا کہ وہ اپنی احادیث وفتاوی وتعلیقات کو پہلے قلم بند کر لیتے، یا کسی مستعد اور صاحب فہم شاگرد کو لکھنے پر مامور کرتے، یہ لکھے ہوئے اجزا کاتب کے ہاتھ میں ہوتے اور وہ مجلس میں اس کو پڑھتا، شیخ جا بجا اس کے مطالب کی

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰ وتہذیب الاسماء قسم اول ج ۲ ص ۷۷۔

تشریح کرتا جاتا، اگر کاتب سے غلطی ہوگئی ہوتی تو اس کی تصحیح کر دیتا، امام صاحب کے کاتب کا نام ابن حبیب تھا، جن کا شمار محدثین کبار میں ہے، کبھی معن بن عیسیٰ یا دوسرے تلامذہ پڑھتے، یہی سبب ہے کہ امام کے بعض تلامذہ مثلاً یحییٰ جن کی روایت بخاری میں ہے بجائے حدثنا مالک واخبرنا مالک کے قراءۃً علی مالک کہتے ہیں۔

امام صاحب اس اصول کی شدت سے پابندی کرتے تھے، یحییٰ بن سلام اسی بات پر ناراض ہوکر مجلس سے اٹھ گئے کہ ''خود نہیں پڑھتے، شاگردوں سے پڑھواتے ہیں'' یحییٰ بن سلام تو خیر ایک ادنیٰ شاگرد تھے، خود خلیفۂ وقت ہارون نے امین ومامون کے لیے درخواست کی کہ امام پڑھیں اور یہ سنیں تو امام نے شیوخ مدینہ کا نام گنا کر فرمایا کہ ''ہمارے شہر کے شیوخ کا یہی دستور تھا،''(۱) کیا عجیب بات ہے کہ جس بات کے لیے لوگوں کو اس قدر اصرار تھا وہی آج ایک مدت سے تمام مدارس اسلامیہ کا دستور عام ہے۔

اس طریقہ کی خوبی: شیوخِ مدینہ کا یہ طریقہ متعدد وجوہ سے زیادہ محتاط اور بہتر ہے، مجمع عام میں جب کوئی شخص بولنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو عجلت، کثرت ازدحام اور کبھی مرعوبیت کے سبب سے اس میں مسامحت ہوسکتی ہے، بخلاف اس کے اگر پہلے سے لکھ لیا جائے تو فراغِ خاطر، اطمینان قلب اور فرصتِ فکر ومراجعت کے سبب سے صحت وحفظ ووثوق کے ذرائع زیادہ ہیں، محدث کا خود قراءت نہ کرنا اس لیے زیادہ مناسب ہے کہ وہ دوبارہ سن کر اپنے مسودہ کی تصحیح کرسکے کیوں کہ خود پڑھنے میں اکثر دیکھا گیا کہ زبان ونظر اپنی یاد کی بنا پر غلط لکھے ہوئے کو بھی صحیح پڑھتی ہے، دوسرا اجنبی شخص ہر سطر پر بار بار ٹھہرتا ہے، اس طرح معلم کو ہر مرتبہ غلطی پر تنبیہ ہوتی ہے، لیکن اس سے بھی بڑی مصلحت اس میں یہ ہے کہ اکثر فقہائے محدثین احادیث وآثار کے ساتھ اپنی ذاتی تحقیق ورائے یا کسی لغت کی شرح بھی بیان کرتے جاتے تھے، چنانچہ امام زہری کا یہی طرز تھا لیکن اس طرز میں ایک

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۱۹۰، ۱۹۱

بڑی خرابی یہ ہے کہ اکثر طلبہ اصل اور اضافہ میں تمیز نہیں کر سکتے تھے اور متن حدیث اور شیخ کے کلام میں ان کو اشتباہ ہوتا تھا، امام مالک کا طرز نہایت محفوظ تھا کہ اصل تو کاتب پڑھتا تھا اور اضافہ خود اپنی زبان مبارک سے ادا کرتے تھے، اس طرح ہر طالب علم کو اصل و اضافہ وادراج میں فرق معلوم ہو جاتا تھا۔

مجلس درس کی شہرت: ایک تو مدینہ خود اسلام کا گہوارہ اور نسلاً بعد نسلٍ علم دین کا مرکز تھا، دوسرے امام ہمام کا خاندان ابتداء سے علم کے ساتھ ایک خاص نسبت رکھتا تھا، ان اضافی اوصاف کے ساتھ خود ذاتی جوہر نے وہ پروبال نکالے کہ پوری دنیائے اسلام مشرق سے مغرب تک امام کے آوازۂ شہرت سے معمور ہوگئی اور امام کی درس گاہ مرز وبوم کے اختلاف وبوقلمونی کا مظہر بن گئی، ایک طرف سیستان دوسری صدی کی مملکت اسلام کا مشرقی گوشہ اور دوسری طرف قرطبہ دنیائے اسلام کا مغربی گوشہ، دونوں کے ڈانڈے مدینۃ الرسول میں آ کر مل گئے، ممالک عرب، ممالک شام، ممالک عراق، ممالک عجم، ممالک ترکستان، ممالک مصر، ممالک افریقہ، ممالک اندلس، وایشیائے کوچک، الغرض ایشیا، افریقہ اور یورپ تینوں براعظموں سے طالبان علم کے قافلے مسلسل مدینہ کا رخ کرنے لگے، اس طرح پیغمبر عالم علیہ الصلاۃ والسلام کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

عن ابی هريرة عن النبی صلی الله عليه وسلم يوشك ان يضرب النّاس اكباد الابل فلا يجدون احدا اعلم من عالم المدينة. (ترمذی ابواب العلم باب ماجاء فی عالم اہل المدینۃ)	ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب لوگ طلب علم کے لیے اونٹ ہنکائیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے زیادہ بڑا عالم وہ کسی کو نہ پائیں گے۔

☆☆☆

تلامذہ و مستفیدین

محدث ذہبی لکھتے ہیں کہ "امام مالک سے اتنے لوگوں نے روایت کی ہے جن کا شمار تقریباً ناممکن ہے،(۱) ان کے تلامذہ میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو دوسرے علماء کی مجلس سے فضل وکمال کی سند حاصل کر چکے تھے، بلکہ خود امام کے شیوخ بھی امام کے احسان علمی کے بار سے سبکدوش نہ تھے۔(۲) خود امام مالکؒ فرماتے تھے کہ "بہت کم ایسے لوگ ہیں جن سے میں نے سیکھا ہو اور آخر میں ان کو خود مجھ سے پوچھنے کی حاجت نہ پڑی ہو۔" (۳)

تلامذہ کی خصوصیات: امام کو اپنے تلامذہ و مستفیدین کی حیثیت سے بھی متعدد خصوصیات حاصل ہیں، جس کثرت، جس رتبہ اور جتنے طبقات کے لوگ امام کے حلقۂ فیض میں داخل ہیں وہ محدثین وفقہاء میں سے کسی کو بھی نصیب نہیں وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

۱- کثرت تعداد کے لحاظ سے امام مالک کے تلامذہ کی تعداد ۱۳۰۰ ہے، فربری کی روایت کے مطابق امام بخاری کے شاگردوں کی تعداد ۹۰۰۰۰ ہے لیکن ان کا تیرہ سو ۱۳۰۰ منتخب روزگار تلامذہ سے کوئی مقابلہ نہیں، ان میں سے چند (۴ یا ۵) کے سوا ہر ایک اس فن کا نکتہ داں اور بلند پایہ محدث ہے۔

۲- امام بخاری کے نوے ہزار رواۃ میں سے ایک مخصوص تعداد کے سوا باقی کے حالات مجہول و مستور اور نام بنام غیر معلوم ہیں لیکن امام مالک کے تمام رواۃ و تلامذہ نام بنام

(۱) تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۱۸۷ حیدر آباد دکن (۲) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۵ و ۶ (ذکر مالک بن انس) (۳) تزئین الممالک نقلاً عن فضائل مالک لابن محمد الزہرانی ص ۴۰۔

معلوم ومشہور ہیں، ابوبکر خطیب بغدادی، ابن بشکوال اندلسی، قاضی عیاض، شمس الدین دمشقی حافظ سیوطی نے ان کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے رسائل میں جمع کر دیئے ہیں۔

۳- دوسرے عام محدثین کے تلامذہ کی دنیا جغرافی حیثیت سے اس قدر وسیع نہیں جس قدر امام مالک کی ہے، ابوحنیفہ کے تلامذہ تمام عجم وعرب میں پھیلے ہوئے تھے لیکن افریقہ واندلس ان سے بے نیاز رہے، امام اوزاعی کا علم اندلس میں پھیلا لیکن عجمی ممالک ان سے مستفید نہ ہوئے، لیکن امام مالک کے علم ومعارف نے دنیائے اسلام کے کسی گوشہ کو بھی اپنی غلامی سے آزاد نہ چھوڑا۔

۴- لیکن محض تلامذہ کی کثرت اور جغرافی وسعت اس قدر مایہ فخر نہیں ہے، جس قدر ان کا علوئے رتبۂ رفعت کمال اور کثرت فضل ہے، امام مالک اپنے ہمسروں میں اس حیثیت سے جس قدر ممتاز ہیں، اس کو محض عطیۂ الٰہی سمجھنا چاہیے جو صرف عالم مدینہ کے لئے مقدر تھا، ان کے حلقۂ تلامذہ ومستفیدین میں ان کے شیوخ بھی شامل ہیں اور دوسرے ایسے ائمہ کبار وارباب فن بھی، جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی اقلیم مستقل کا فرماں روا ہے۔

۵- اس سے بھی زیادہ عجیب شے یہ ہے کہ امام کا حلقۂ افادہ اتنے مختلف النوع طبقوں پر مشتمل ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ یہ مختلف سمتوں اور جہات کے خطوط کیونکر ایک ہی مرکز کی طرف رجوع ہوئے، مثلاً خلفائے اسلام، امرائے بلاد، تابعین، ائمہ محدثین، ائمہ مجتہدین، فقہاء، قضاۃ، زہاد وصوفیائے کرام، ادباء وشعراء، مورخین، مفسرین اور فلاسفہ سب آپ کے حلقۂ مستفیدین میں داخل تھے۔

اس عہد کے بعد کے تمام محدثین کبار بلا استثناء بیک واسطہ یا بدو واسطہ امام مالک کے تلمذ سے مشرف ہیں۔ مسانید وصحاح کے مصنفین میں امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، ابوداؤد ونسائی، صرف ایک واسطہ سے امام کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہیں اور اس پر ان کو ناز وفخر ہے، یہ فخر آٹھویں صدی تک باقی رہا، چنانچہ محدث کبیر شمس الدین

ذہبی فخر یہ لکھتے ہیں کہ ''میں سات واسطوں سے امام کا شاگرد ہوں۔(۱) امام نووی کو بھی ساتویں صدی میں امام سے قرب نسبت پر ناز ہے، مقدمہ شرح مسلم میں اپنے استاد کے حال میں لکھتے ہیں ''ایک کتاب کی سند مجھ کو کتب بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی سب سے بہتر ملی اور وہ امام مالک کی موطا ہے جو ان تمام محدثین کے شیخ تھے۔(۲)

فقہ وفتاویٰ

فقہ مالک: امام مالکؒ کے فقہ وفتاویٰ کی بنیاد فقہ مدینہ پر ہے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے مصفیٰ کے مقدمہ میں لکھا ہے:

> ''امام مالک بنائے فقہ بر حدیث آنحضرتؐ نہادہ است کہ مسند باشد یا مرسل ثقاۃ، بعدازاں قضایائے حضرت عمرؓ عمل او بعدازاں برفتاوائے سائر صحابہ وفقہائے مدینہ کہ سعید بن مسیب وغیرہ، بن زبیر، قاسم وسالم وسلیمان بن یسار وابوسلمہ وابوبکر بن عبدالرحمٰن وابوبکر بن عمرو وعمر بن عبدالعزیز (۳)

موطا کے طرز استدلال اور احادیث وآثار کا جس نے بغور مطالعہ کیا ہے، وہ یقیناً اس کی تائید کرے گا کہ امام مالک کی فقہ وفتاویٰ کی یہی وہ بنیاد واصول ہیں جن پر امام مالک فقہی فتاویٰ کا جواب دیتے تھے۔

امام مالک کے فضل وکمال کا تمام شیوخ مدینہ کو اعتراف تھا، اس کے باوجود انھوں نے اس قدر احتیاط کی کہ جب تک ستر ۷۰ علمائے عظام نے امام صاحب کی قابلیت واستحقاق کا فتویٰ نہ دیا، انھوں نے اس مرتبۂ عالی پر قدم رکھنے کی ہمت نہ کی، آپ کا معمول تھا کہ جب کسی فتویٰ کا جواب ارشاد فرماتے تو پہلے ماشاء اللہ لاحول ولا قوۃ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۸۷ (۲) مقدمہ صحیح مسلم ص ۶ مصر (۳) مقدمہ مصفیٰ ص ۱۱۔

الا باللہ کہتے۔(۱)

حکومت کا اعلان: نہ صرف مدینہ وحجاز بلکہ تمام اطراف ملک سے سائلین کا ازدحام رہتا تھا، موسم حج میں جب پوری دنیائے اسلام عرصۂ عرفات میں جمع اور سارے علمائے دین کوفہ، بصرہ، خراسان وغیرہ سے سمٹ کر حرم مکہ میں جمع ہو جاتے تھے تو حکومت کی طرف سے اعلان ہوتا تھا کہ ''امام مالک اور ابن ابی ذئب کے سوا اور کوئی فتویٰ نہ دے۔''(۲)

حکومت کے مقابلہ میں آزادی فتویٰ، طلاق مکرہ: حکومت کی اس تعظیم وتکریم کا اثر شاید دوسروں پر یہ ہوتا کہ وہ کم از کم مختلف فیہ مسائل میں اپنی رائے کے خلاف حکومت کے منشاء کی تعلیم کرتے لیکن امام صاحب اپنی حریت رائے اور اعلان حق میں اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اگر کسی کو زبردستی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کیا جائے اور وہ ڈر کر محض جبر سے طلاق دیدے تو امام ابوحنیفہ اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک طلاق واقع ہو جائے گی لیکن امام مالک اور اکثر اصحاب حدیث اس کے قائل ہیں کہ طلاق واقع نہ ہوگی، والیِ مدینہ جعفر بن سلیمان عباسی نے جو خلیفہ منصور کا چچازاد بھائی بھی تھا امام کو حکم دیا کہ وہ یہ فتویٰ نہ دیں لیکن امام صاحب نے علی الاعلان اپنی رائے کا اظہار کیا اور آخر اس کے لئے کوڑوں کی سزا تک گوارا کی۔

لاادری: اس سے بھی زیادہ شدید موقع اعلان حق کا اپنے نفس کے مقابلہ میں ہوتا ہے، مفتی کے لئے جس قدر پہلی قسم کی حریت کی حاجت ہے اس سے زیادہ دوسری قسم کی حریت کی ضرورت ہے لیکن امام صاحب جس طرح پہلی منزل میں مستقیم تھے، دوسری منزل میں بھی درماندہ نہ تھے، امام صاحب سے جب کوئی فتویٰ پوچھا جاتا اور اس وقت اس جزیہ پر اطلاع نہ ہوتی تو نہایت کشادہ پیشانی کے ساتھ فرماتے تھے کہ لاادری میں نہیں جانتا، امام کے شاگرد ابن وہب کہتے ہیں کہ اگر میں امام مالک کی لاادری لکھا کرتا تو کتنی تختیاں

---

(۱) تزئین الممالک عن ابن نعیم ص ۸ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۱ (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰۔

بھر جاتیں۔(۱)

ممالک بعیدہ کے استفتا سے احتراز: چنانچہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دور کے شہروں سے جو مستفتی آتے تھے امام صاحب ان کو بھی ایسا ہی جواب دیتے تھے، ابن عبدالبر کی روایت ہے کہ ایک شخص نہایت دور دراز مسافت سے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے ایک مسئلہ پوچھا، امام صاحب نے فرمایا کہ ''میں اس کو اچھی طرح نہیں جانتا'' سائل نے کہا کہ ''میں چھ مہینے کی راہ طے کر کے صرف اس مسئلہ کی خاطر حاضر ہوا ہوں جن لوگوں نے مجھ کو بھیجا ہے میں ان کو جا کر کیا جواب دوں گا، امام صاحب نے فرمایا کہ کہہ دینا کہ ''مالک نے کہا کہ میں نہیں جواب دے سکتا۔''(۲)

امام صاحب کی یہ احتیاط درحقیقت شدتِ تقویٰ اور ایک نہایت دقیق نکتہ پر مبنی تھی، مفتی کی حالت یہ ہے کہ آج وہ ایک مسئلہ کی نسبت ایک رائے رکھتا ہے، دوسرے دن اس سے صحیح تر صورت اس کے خیال میں آتی ہے، ایسے موقع پر شہر اور اس کے قرب وجوار میں مستفتی کو اپنی غلطی کی اطلاع دے سکتا ہے لیکن اس زمانہ میں جب وسائلِ سفر آسان نہ تھے، دور کے مقامات میں تصحیح وتغلیط کی اطلاع مشکل تھی، امام صاحب کے ایک مصری دوست نے حیرت سے امام صاحب سے پوچھا کی آپ ان بیماروں کو جو کوسوں سے مصائب سفر ومصارف برداشت کر کے آتے ہیں کیوں واپس کر دیتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا یہ صحیح ہے کہ مصری مصر سے، شامی شام سے، عراقی عراق سے آتے ہیں اور پوچھتے ہیں، مگر میں نے جو جواب آج دیا ہے اس کے بجائے اگر کل مجھ کو کچھ اور جواب معلوم ہوا اس وقت کیا ہوگا'' حضرت لیث مصری نے جب امام کا یہ قول سنا تو رو پڑے کہ مالک لیث سے قوی تر ہیں اور لیث ان سے کمزور تر۔(۳)

(۱) تزئین الممالک ص ۱۴ عن ابی نعیم (۲)۔ جامع بیان العلم ابن عبدالبر ص ۱۲۵ مصر (۳) تزئین الممالک عن ابی نعیم ص ۱۴۔

رائے پوچھنے پر زجر: فتووں کے جواب میں اکثر فرماتے تھے کہ قال رسول اللہ کذا، سائل نے کہا آپ کی رائے کیا ہے؟ آپ نے جواب میں یہ آیت پڑھی (۱) فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ. جب کسی مسئلہ قیاسی کو بیان فرماتے تو پہلے یہ آیت پڑھتے إِنْ نَظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ.

جواب میں کاوش فکر: مسائل وفتاویٰ کا جواب ہمیشہ نہایت دقت نظر اور کاوش فکر سے دیتے تھے، ابن ابی اویس کہتے ہیں کہ ایک بار امام صاحب نے فرمایا کہ کبھی کبھی ایسا مسئلہ پیش آجاتا ہے، کہ خواب وخور حرام ہو جاتا ہے، ابن ابی اویس نے کہا آپ کی بات تو لوگوں کو نقش فی الحجر کی طرح تسلیم ہوتی ہے، پھر آپ کیوں یہ مشقت برداشت کرتے ہیں، امام کس نکتہ سنجی کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ ''ابن ابی اویس! اس حال میں تو مجھ کو اور بھی کاوش کرنی چاہئے۔'' (۲)

انصاف پسندی: اگر کسی مسئلہ میں غلطی ہو جاتی اور کوئی شخص اس کی اصلاح کرتا تو فوراً تسلیم کر لیتے تھے، ایک شخص نے پوچھا کیا وضو میں پاؤں کی انگلیوں میں تخلیل کرنی چاہئے؟ امام نے فرمایا لیس ذالک علی الناس، ابن وہب امام کے شاگرد بیٹھے تھے، مجلس کے بعد انھوں نے کہا کہ تخلیل کی ایک حدیث میرے پاس ہے، امام نے حدیث سن کر فرمایا کہ حدیث حسن اور اس کے بعد پھر ہمیشہ فتویٰ اس کے موافق دیا۔ (۳)

امام مالک تقریباً ساٹھ برس مستقل فقہ وفتاویٰ میں مصروف رہے، امام کے تلامذہ نے ان کے مسائل فقہیہ کو مدون بھی کیا ہے، سب سے پہلی کتاب اسد بن فرات قاضی افریقہ کی ''اسدیہ'' ہے اور سب سے ضخیم ابن قاسم متوفی (۱۹۱ھ) کی المدونہ ہے جو خود امام

(۱) تزئین الممالک عن ابی نعیم ص۱۴ (۲) مناقب مالک للزواوی ص۳۹ عن سعید بن میتب (۳) الزواوی ص۲۷۔

کی زندگی میں مدون ہو رہی تھی، مدونہ مصر میں چھپ گئی ہے، تیسری کتاب ابن وہب مصری متوفیٰ (۱۹۷ھ) کی کتاب المجالسات عن مالک ہے، ان کتابوں میں امام کے ہزاروں مسائل وفتاویٰ مدون ہیں، ابن قاسم مصنف مدونہ کے متعلق مشہور ہے کہ ان کو امام کے چالیس ہزار مسائل زبانی یاد تھے۔

اہل علم کا اعتراف

امام مالک ارباب رائے میں داخل ہیں، محدثین نے ارباب رائے کا کم اعتراف کیا ہے لیکن اس کے باوجود امام صاحب محدثین میں وہی درجہ رکھتے ہیں جو صاحب فن اپنے اتباع اور مقلدین میں رکھتا ہے یحییٰ بن معین جو حدیث ورجال کے ناقد ہیں کہتے ہیں "مالک اقلیم حدیث کے بادشاہ ہیں" محدث کبیر سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ "ہم لوگ مالک کے سامنے کیا چیز ہیں؟ ہم تو ان کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہیں، اگر امام مالک نے کسی شیخ سے روایت کی ہے تو اس سے کرتے ہیں ورنہ چھوڑ دیتے ہیں" عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے، کہ "روئے زمین پر مالک سے بڑھ کر حدیث کا کوئی امانت دار نہیں۔"

امام شافعی فرمایا کرتے تھے "علماء میں امام مالک ستارہ ہیں" محدث ابن نہیک کا قول ہے کہ "صحت حدیث میں میں مالک پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔" امام ابن حنبل سے ایک شخص نے پوچھا کہ "اگر کسی کی حدیث وہ زبانی یاد کرنی چاہے تو کس کی کرے؟" جواب دیا کہ "مالک بن انس کی۔" ابن مہدی سے جو نہایت مشہور محدث ہیں ایک شخص نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ مالک ابوحنیفہ سے زیادہ فقیہ ہیں" انھوں نے فرمایا "میں نے یہ تو نہیں کہا، لیکن یہ کہتا ہوں کہ مالک ابوحنیفہ کے استاد (حماد) سے بھی زیادہ فقیہ ہیں۔"

سفیان بن عیینہ باایں ہمہ علم وفضل، حلال وحرام اور حدیث معمول کا املاء امام مالک کے حلقہ میں بیٹھ کر سنتے اور وہاں سے اٹھ کر اپنے مستفیدین کے حلقہ میں بیٹھتے تھے

سفیان ثوری جو مجتہد مستقل ہیں وہ مناسک حج میں امام کی پیروی کرتے تھے، ابن معین جو نقد حدیث میں امام ہیں، فرماتے ہیں "مالک خدا کی طرف سے خلق پر ایک حجت تھے۔" ابن معین کا دوسرا قول ہے کہ "اصحاب زہری میں مالک سے بڑھ کر کوئی اثبت نہیں" یحییٰ بن سعید القطان جو امام حدیث ہیں فرماتے ہیں کہ "مالک اس امت کے لئے رحمت تھے" ابن ابی حازم نے ناقد حدیث درآوردی سے پوچھا کہ "اس خدائے کعبہ کی قسم! مالک سے بڑا کوئی عالم تم نے دیکھا؟" جواب دیا کہ "خدایا نہیں۔"

عام حالات

اب ہم مجلس درس واستفادہ سے اٹھ کر دربار شاہی میں آتے ہیں، امام صاحب ۹۳ھ میں پیدا ہوئے تھے جب کہ ولید سریر آرائے خلافت تھا لیکن پچیس برس کے بعد ۱۱۷ھ میں جب امام تعلیم سے فارغ ہو کر شہرت عام حاصل کر رہے تھے تو خلافت امویہ کا دم بازواپسیں تھا (۱۳۳ھ) میں خلافت عباسیہ کے نام سے تاریخ کا نیا باب شروع ہوا۔

خلافت عباسیہ کا پہلا تاج دار ابوالعباس سفاح تھا، اس کے بعد اس کا بھائی ابوجعفر منصور خلیفہ ہوا، اس انقلاب سے پہلے وہ مدینہ کی درس گاہ کا ایک طالب علم اور امام مالک کے طبقہ کا ایک شریک صحبت تھا۔

خلافت کے بعد منصور نے (۱۴۰ھ میں) پہلا حج کیا اور مکہ معظمہ کے بعد مدینہ منورہ آیا، شہر کے شرفا اور علما اس کے استقبال کے لئے نکلے، سفیان ثوری، سلیمان خواص اور امام مالک بھی اس لئے اس سے ملنے کے لیے آئے کہ کل تک وہ علم حدیث کی مجلسوں میں ان کے ساتھ برابر کا شریک تھا، دیکھیں اب وہ کس حال میں ہے؟ دربار میں حجاز کے تمام علما اور فقہا موجود تھے، منصور نے امام صاحب کی طرف خطاب کر کے کہا "اے ابوعبداللہ! میں اختلافات سے گھبرا گیا ہوں عراق میں تو کچھ نہیں ہے، شام میں صرف جہاد کا شوق ہے، کوئی

بڑا علم نہیں، جو کچھ ہے وہ حجاز میں ہے اور حجاز کے علما کے سرخیل آپ ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی اس تصنیف مؤطا کو خانہ کعبہ میں آویزاں کر دوں کہ لوگ اسی کی طرف رجوع کریں اور تمام اطراف ملک میں اس کی نقلیں بھیجوں تا کہ اسی کے مطابق لوگ فتویٰ دیں۔" بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے ایک ایسی کتاب کی تالیف کی خواہش ظاہر کی جو ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور ابن عمرؓ کے اصول فقہ کے بین بین اور معتدل ہو، اس کے بعد امام صاحب نے مؤطا تالیف کی۔

جاہ پسند علما کے لئے یہ طلائی موقع تھا لیکن امام صاحب کے قدم کو اس موقع پر لغزش نہ ہوئی، انھوں نے فرمایا کہ "صحابہ تمام اطراف ملک میں پھیل گئے تھے، ان کے فتاویٰ اور احکام اپنے اپنے مقام میں وراثۃً ان کے فقہا و علما تک پہنچے ہیں اور ہر جگہ وہی مقبول ہیں، ایسی حالت میں ایک شخص کی رائے و عقل پر جو صحت و غلطی دونوں کر سکتا ہے، تمام ملک کو مجبور کرنا مناسب نہیں" منصور نے کہا "اگر آپ مجھ سے متفق ہوتے تو میں یہی کرتا" (۱) ایک بار اس نے پوچھا کہ "اے عبداللہ! تم سے بھی زیادہ کوئی عالم ہے؟ امام نے فرمایا "ہاں" پوچھا "وہ کون ہے؟" فرمایا "ان کا نام یاد نہیں" منصور نے کہا "میں نبوامیہ کے زمانہ میں طلب علم کر چکا ہوں سب کو جانتا ہوں۔" (۲)

امام مالک کے فضل و کمال کا اعتراف منصور نے نہ صرف امام کے سامنے کیا بلکہ پیٹھ پیچھے بھی کرتا تھا، ایک بار ان کی عدم موجوگی میں فرمایا کہ "سفیان ثوری اور امام مالک ابن انس کے سوا کوئی نہیں جس کا ادب کیا جائے۔"

نئے تاج دار امویوں کے استیصال اور بیخ کنی میں لگے ہوئے تھے اور منصور نے احتیاط یا سوء ظن کی بناء پر فاطمی و علوی سادات کی بیخ کنی شروع کر دی، آخر تنگ آ کر ان ہی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۹، کتاب الامامۃ ابن قتیبہ ج ۲ ص ۱۷۱، مناقب مالک للزواوی ص ۲۴ (۲) مناقب زدادی ص ۲۴۔

سادات میں سے ۱۴۵ھ میں محمد نفس زکیہ نے مدینہ میں علم بغاوت بلند کر دیا، اکثر لوگوں نے ان کا ساتھ دیا لیکن تقدیر ساتھ نہ تھی، بڑی بہادری سے میدان جنگ میں لڑے مگر مارے گئے، ان کے بعد ان کے بھائی ابراہیم اس ساز و سامان سے نکلے کہ منصور بد حواس ہو گیا، چند مہینوں کے بعد ابراہیم کی شہادت پر جنگ کا خاتمہ ہو گیا، منصور نے اپنے عم زاد بھائی جعفر کو مدینہ کا والی مقرر کیا۔

امام مالک منصور کی نوازشوں کے باوجود ان تمام کوششوں میں حق کے ساتھ تھے، امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ "خلافت نفس زکیہ کا حق ہے" لوگوں نے پوچھا کہ "ہم منصورؒ کی بیعت پر حلف اٹھا چکے ہیں"، امام صاحب نے فرمایا "منصور نے جبراً بیعت لی ہے(۱) اور جو کام جبراً کرایا جائے شرع میں اس کا اعتبار نہیں، حدیث میں ہے کہ اگر جبراً طلاق کسی سے دلائی جائے تو واقع نہ ہوگی۔"

طلاق مکرہ کا فتویٰ: جعفر نے مدینہ پہنچ کر نئے سرے سے لوگوں سے بیعت لی، امام مالک کو کہلا بھیجا کہ آیندہ طلاق جبری کے عدم اعتبار کا فتویٰ نہ دیں کہ لوگوں کو بیعت جبری کی بے اعتباری و عدم صحت کے لئے سند ہاتھ آئے لیکن امام صاحب نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور بدستور جبری معاملہ کے عدم صحت کا فتویٰ دیتے رہے، جعفر نے غضبناک ہو کر حکم دیا کہ ان کو ستر ۷۰ کوڑے مارے جائیں، چنانچہ امام دارالہجرۃ محکمۂ امارت میں گنہگاروں کی طرح لائے گئے، کپڑے اتارے گئے اور شانۂ امامت پر دست ظلم نے ستر ۷۰ کوڑے پورے کئے، تمام پیٹھ لہولہان ہو گئی، دونوں ہاتھ مونڈھے سے اتر گئے، اس پر بھی جعفر کی تسلی نہ ہوئی تو حکم دیا کہ اونٹ پر بیٹھا کر شہر میں ان کی تشہیر کی جائے، امام صاحب بایں حال زار بازاروں اور گلیوں سے گذر رہے تھے اور زبان صداقت نشان بآواز بلند کہہ رہی تھی "جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے جو نہیں جانتا ہے وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں، فتویٰ دیتا

(۱) ان واقعات کے لئے دیکھو کتاب الامامۃ ج ۲ ص ۲۸۲، ابن خلدون ج ۳ ص ۱۹۰۔

ہوں کہ ''طلاق جبری درست نہیں۔'' (۱)

اس کے بعد اسی طرح خون آلودہ کپڑوں میں مسجد نبوی میں تشریف لائے، پشت مبارک سے خون صاف کیا اور دو رکعت نماز پڑھ کر لوگوں سے فرمایا کہ ''سعید بن مسیب کو جب کوڑے مارے گئے تھے تو انھوں نے بھی مسجد میں آکر نماز پڑھی تھی'' (۲) یہ تعزیر گو تحقیر کے لئے تھی لیکن اس نے امام کی عزت ووقار کے پایہ کو اور بلند کر دیا، یہ واقعہ (۱۴۷ھ) کا ہے۔ (۳)

منصور کی لاعلمی اور ندامت: جعفر والیِ مدینہ کی یہ حرکت منصور کو پسند نہ آئی اور فوراً اس کو معزول کر کے بذلت تمام گدھے پر سوار کر کے بغداد طلب کیا اور امام مالک کو معذرت کا خط لکھا۔

دوسرے سال ۱۵۸ھ میں جب کہ تمام حجاز وعراق میں سکون ہو چکا تو حج کے ارادہ سے منصور حجاز آیا امام مالک ملنے کو آئے اور بعض روایتوں میں ہے کہ حج سے پہلے خود امام کو بغداد بلا بھیجا اور نہایت تعظیم سے ملا اور بوثوق کہا کہ ''نہ میں نے تعزیر کی اجازت دی اور نہ مجھے اس کا علم ہوا، امام صاحب نے فرمایا کہ ''ہاں آپ کو اطلاع نہ ہوگی'' منصور نے خلعت پیش کیا، قاعدہ تھا کی خلعت کے کپڑے درباری کے کندھے پر رکھ دیئے جاتے تھے، حاجب نے یہی عام طریقہ امام صاحب کے ساتھ برتنا چاہا، امام صاحب پیچھے ہٹ گئے، منصور نے حاجب کو ڈانٹا کہ اس خلعت کو آپ کے فرودگاہ میں پہنچا دو۔''

منصور کو ایک بار معلوم ہوا کہ علما میری حکومت سے ناراض ہیں تو اس نے خلاف وقت شب کو ابن ابی ذئب وابن سمعان اور امام مالک کو طلب کیا، امام صاحب واقعہ سمجھ گئے، زندگی سے ناامید ہو کر، غسل فرما کر، کفن کے کپڑے پہن کر اور حنوط مل کر دربار میں

(۱) طبقات ابن سعد ترجمۂ مالک، مناقب للزواوی (۲) تزئین نقلا عن الخطیب روایۃ عن ابی وہب ص ۱۲
(۳) کتاب الانساب سمعانی ترجمہ ''اصبحی''۔

آئے، منصور نے کہا اے گروہ فقہا! مجھ کو ایک خبر معلوم ہوئی ہے جس کا افسوس ہے تمہارا فرض تھا کہ پہلے تم لوگ میری اطاعت کرتے اور مجھ کو برا کہنے سے باز رہتے، پھر اگر مجھ میں کچھ عیب تھا تو مجھ کو نصیحت کرتے، امام صاحب نے فرمایا کہ امیر المومنین خدا کا ارشاد ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَآءَكُمْ	مسلمانو! اگر کوئی فاسق تم کو کچھ خبر دے
فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا اَنْ	تو اس کی تحقیق کرلو، ایسا نہ ہو کہ
تُصِیْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ	نادانستگی میں بے گناہوں کو ستاؤ، پھر
فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَافَعَلْتُمْ	اپنے کیے پر تم کو ندامت ہو۔
نٰدِمِیْنَ۔ (حجرات:۱)	

منصور نے کہا، اچھا بتاؤ کہ میں تمہارے نزدیک کیسا ہوں؟ امام نے فرمایا مجھے اس کے جواب دینے سے معاف کرو، منصور نے ابن سمعان کی طرف رخ کیا، وہ بولے ''امیر امومنین آپ سب سے بہتر ہیں، حج کرتے ہیں، جہاد کرتے ہیں، مظلوموں کی امداد کرتے ہیں، اسلام کی پشت پناہ ہیں، عادل ہیں، اب منصور نے ابن ابی ذئب سے پوچھا کہ تم مجھ کو کیسا سمجھتے ہو، ابن ابی ذئب نے نہایت دلیری سے کہا کہ ''تم بدترین مخلوق ہو، مسلمانوں کی تمام دولت اپنی شان وشوکت میں صرف کرتے ہو، غریبوں کو ہلاک اور امیروں کو پریشان کرڈالا، بتاؤ کل تم خدا کے سامنے کیا جواب دو گے؟'' منصور نے کہا'' تم دیکھتے ہو کہ تمہارے سامنے یہ کیا چیز ہے'' ابن ابی ذئب نے کہا'' ہاں ننگی تلواریں دیکھتا ہوں لیکن آج کی موت کل کی موت سے بہتر ہے۔''

تھوڑی دیر کے بعد ابن سمعان اور ابن لبی ذئب چلے گئے لیکن امام تشریف فرما رہے، منصور نے کہا'' مجھے آپ کے کپڑوں سے حنوط کی بو آتی ہے،'' امام صاحب نے فرمایا اس بے وقت کی طلبی سے میں اپنی زندگی سے مایوس ہو کر آیا تھا، منصور نے کہا'' سبحان

اللہ ابوعبداللہ کیا میں خود اپنے ہاتھ سے اسلام کا ستون گراؤں گا۔" (۱)

۱۵۸ھ میں منصور نے انتقال کیا اور محمد المہدی اس کا جانشین ہوا اور ۱۶۰ھ میں حج کے ارادہ سے عازم حجالہ ہوا، حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ آیا، شہر کے قریب پہنچا تو شرفا وعلمائے شہر نے استقبال کیا جن میں امام مالک بھی تھے، مہدی نے امام کو سلام کر کے سینہ سے لگالیا، اس سال حجاز میں سخت قحط تھا، موقع پا کر امام نے فرمایا "امیر المومنین اس وقت آپ جس شہر میں جا رہے ہیں وہاں مہاجرین وانصار کی اولاد آباد ہے، وہ روضۂ نبوی کے ہمسایہ ہیں" مہدی امام کا مقصد سمجھ گیا اور ۲۵ لاکھ درہم امام کے پاس بھیج دیئے کہ تقسیم کرا دیجیے، امام نے رقم اپنے معتمد تلامذہ کے حوالہ کی کہ حسب حاجت لوگوں میں تقسیم کر دیں۔ (۲)

ایک مرتبہ تین ہزار دینار اپنے صاحب اعظم ربیع کے ہاتھ امام کی خدمت میں بھیجے اور خواہش ظاہر کی کہ آپ بغداد میرے ساتھ چلیں، امام صاحب نے قاصد سے کہا تھیلیاں اب تک سربستہ اسی طرح پڑی ہیں، جی چاہے لے جاؤ لیکن مالک مدینہ نہیں چھوڑ سکتا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے المدینة خیرلهم لوکانوا یعلمون۔ (۳)

ایک مرتبہ مہدی نے سواری بھیجی کہ اس پر سوار ہو کر بارگاہ خلافت میں آئیں، امام نے سواری واپس کر دی کہ میں مدینہ میں سوار ہو کر نہیں نکلتا کیونکہ ان گلیوں میں رسول اللہ چلتے پھرتے تھے، پیادہ آئے بیمار تھے، اس لئے بعض مشاہیر علمائے مدینہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے، مہدی نے کہا سبحان اللہ، اگر میں خود یہ خدمت ان سے لینا چاہتا تو شاید ان میں سے کوئی قبول نہ کرتا، مغیرہ نے کہا "امیر المومنین! مالک جس سے ٹیک لگا کر بیٹھیں وہ اس کے لئے شرف ہے۔" (۴)

---

(۱) کتاب الامامہ والسیاستہ ج ۲ ص ۲۷۶ مصر (۲) کتاب الامامۃ وسیاستہ ج ۲ ص ۲۹۰ ومناقب مالک للزواوی ص ۲۷ (۳) تذکرۂ ذہبی ج ۱ ص ۱۸۹ (۴) زواوی عن ابی مصعب ص ۲۸۔

مہدی نے اسی سفر میں مؤطا کی سماعت کی بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ مہدی ہی کے لیے امام نے مؤطا لکھی گو یہ صحیح نہیں، مہدی نے موسیٰ وہارون اپنے دونوں بیٹوں کو حکم دیا کہ امام سے مؤطا سنیں، شہزادوں نے امام کو بلا بھیجا، امام صاحب نے فرمایا ''علم بیش قیمت شے ہے، اس کے پاس خود شائقین آتے ہیں'' اس جواب پر مہدی کی اجازت سے دونوں شہزادے خود مجلس درس میں حاضر ہوئے، شہزادوں کے اتالیق نے کہا پڑھ کر سنائیے، امام صاحب نے فرمایا کہ ہمارے علما کا دستور یہ ہے کہ طلبہ پڑھیں، شیوخ سنیں، مہدی کو اس کی اطلاع دی گئی تو اس نے کہا ان علما کی اقتدا کرو اور تم خود پڑھو، چنانچہ شہزادوں نے خود پڑھا اور امام نے سماعت کی۔(۱)

۱۷۰ھ میں ہارون رشید خلیفہ ہوا، خلافت کے پہلے ہی سال حج وزیارت کے لیے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ حاضر ہوا، لوگ پیادہ استقبال وتہنیت کے لئے نکلے، امام صاحب بھی محمل میں سوار ہو کر آئے، ہارون رشید نے ان کو دیکھ کر بڑی مسرت ظاہر کی اور کہا آپ کی تصنیفات پہنچیں، میں نے خاندان کے نوجوانوں کو ان کے مطالعہ تاکید کی ہے لیکن اس کا کیا سبب ہے کہ میں نے ان میں ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ کی روایتیں نہیں پائیں' امام نے فرمایا امیر المومنین! یہ دونوں بزرگوار ہمارے شہر میں نہ تھے۔

۱۷۴ھ میں ہارون رشید اپنے دونوں شہزادوں امین ومامون کو لے کر حج کے لیے آیا اور مؤطا کے املا کے لیے امام کو سراپردۂ خلافت میں طلب کیا، امام صاحب نے انکار کیا اور خود مؤطا کے بغیر تشریف لائے، ہارون رشید نے شکایت کی، امام صاحب نے فرمایا ''علم تیرے گھر سے نکلا ہے، خواہ اس کو ذلیل کر، خواہ عزت دے، یہ سن کر ہارون رشید متاثر ہوا، اور امین اور مامون کو لے کر مجلس درس میں حاضر ہوا، وہاں طلبہ کا ہجوم تھا، ہارون رشید نے امام سے کہا اس بھیڑ کو الگ کر دیجئے'' امام نے فرمایا شخصی فائدہ کے لیے عام افادہ کا خون

(۱) تزئین الممالک ص ۴۵۔

نہیں کیا جاسکتا۔" ہارون رشید مسند پر بیٹھ گیا، امام نے فرمایا امیر المومنین "تواضع پسندیدہ ہے۔" یہ سن کر ہارون نیچے اتر گیا، اور امام سے درخواست کی کہ آپ قرأت کیجئے امام نے فرمایا خلاف عادت ہے،" اور معن بن عیسیٰ کو جو ایک مستعد طالب علم تھے اور آگے چل کر بڑے بڑے محدثین کے استاد ہوئے اشارہ کیا، انھوں نے قرأت شروع کی، اور ہارون نے مع شہزادوں کے سماعت کی۔

اس سفر میں شام وعراق وحجاز کے کل علما کے ساتھ تھے، قاضی ابو یوسف بھی اس مجمع میں شریک تھے، ہارون رشید نے ان سب علما کی ایک علمی مجلس منعقد کی، امام صاحب مسند تدریس پر رونق افروز ہوئے موطا کا املا شروع ہوا، ہر مسئلہ کے اختتام پر فقہا ومحدثین سکوت کی زبان سے صحت کا اعتراف کرتے جاتے تھے، فقہی معلومات کا ایک دریا تھا جو زبان امامت سے امنڈ امنڈ کر سواحل قلوب تک پہنچ رہا تھا۔

ہارون رشید کے نام امام مالک کا ایک رسالہ بھی ہے جس میں امام نے ہارون کو نصائح کیے ہیں اور آداب وسنن کی تعلیم دی ہے، رسالہ مصر میں ۱۳۲۲ھ میں چھپ گیا ہے اور لاہور میں اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

وفات

آخر عمر میں اتنے ضعیف وناتواں ہو گئے تھے کہ مسجد نبوی کی حاضری، جماعت میں شرکت اور غم وشادی کی تقریبوں میں آنا جانا بند ہو گیا تھا، لوگ اعتراض کرتے تو فرماتے کہ "ہر شخص اپنا ہر عذر نہیں بیان کر سکتا" معن بن عیسیٰ م ۱۹۸ھ جو امام کے عزیز ترین شاگرد تھے امام کے خادم تھے، امام صاحب انہی کے سہارے چلتے تھے لیکن اس ضعف وناتوانی کے عالم میں بھی درس وافتا کی خدمت جاری تھی، یحییٰ بن یحییٰ اندلسی مصمودی امام اندلس جب دوسری بار مصر سے لوٹ کر مدونہ کی سند لینے کے لئے آئے تو امام صاحب بستر مرض الموت پر تھے۔

اتوار کے روز بیمار پڑے اور تقریباً تین ہفتہ بیمار رہے، مرض کی شدت میں کوئی تخفیف نہ ہوئی، لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب وقت آخر ہے، مدینہ کے تمام علما و امرا آخری دیدار کے لئے جمع ہو گئے، یحییٰ اندلسی کا بیان ہے کہ مجھے تو اپنی محرومی کا رونا تھا ہی، وہ لوگ بھی جو مدتوں امام کی ملازمت کا شرف حاصل کر چکے تھے وہ بھی روتے تھے، تلامذہ کے علاوہ حدیث وفقہ کے ایک سو ساٹھ علما مؤدب باچشم گریاں آس پاس بیٹھے تھے۔

نبض کی حرکت آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، قعنبی جو امام کے اخص تلامذہ میں تھے، وہ اس وقت حاضر ہوئے، اور گریہ کا سبب دریافت کیا، فرمایا کہ قعنبی! میں نہ روؤں تو کون روئے، اے کاش! مجھ کو میرے ہر قیاسی فتویٰ کے بدلہ ایک کوڑا مارا جاتا اور میں فتویٰ نہ دیتا۔" گریہ جاری تھا اور لب متحرک تھے کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

امام صاحب بروایت صحیحہ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱ ربیع الاول ۱۷۹ھ کو انتقال فرمایا، ۸۶ برس کی عمر پائی، ۱۱۷ھ میں مسند درس پر قدم رکھا اور ۶۲ برس تک علم و دین کی خدمت میں مصروف رہے۔

جنازہ میں ایک خلقت کا ہجوم تھا، والیِ مدینہ عبداللہ بن محمد ہاشمی خود پیادہ شریک تھا، اور نعش اٹھانے والوں میں داخل تھا، جنۃ البقیع جس کی خاک میں اسلام کے ارکان عظام واعلام کرام مدفون ہیں امام مدینہ کا جسد مبارک بھی اسی خاک کو سپرد ہوا۔ (۱)

دور دراز شہروں اور ملکوں کے علما کو جب امام کی وفات کی خبر پہنچی تو ہر جگہ ماتم کیا گیا، کوفہ میں سفیان بن عیینہ کو جب معلوم ہوا تو ان پر سکوت طاری ہو گیا اور جب بولے تو یہ بولے کہ "روئے زمین پر مالک نے اپنی مثال نہیں چھوڑی" حماد بن زید نے کہا "خدا اُن پر رحم کرے، مذہب میں ان کا بڑا مقام تھا۔"

(۱) ان بیانات کے لئے ملاحظہ ہو ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۱ تزئین الممالک ص ۴۱۔

امام کی تاریخ پیدائش ووفات پر ایک بزرگ نے یہ قطعہ کہا ہے

فخر الأئمة مالك   نعم الامام لسالك

مالک اماموں کے فخر ہیں۔ پیرو کے لیے بہترین پیشوا ہیں

مولده "نجم هدى"   وفاتة فاز مالك (۱)

ان کی تاریخ پیدائش ہدایت کا ستارہ ہے۔اوران کی تاریخ وفات یہ ہے

کہ مالک کامیاب ہے۔

اخلاق وعادات اور ذاتی حالات

طاعتِ الٰہی: امام کا شمار عبادِ زمانہ میں تھا،(۲) درس وافتاء سے جو وقت بچتا وہ زیادہ تر عبادت اور تلاوت میں صرف ہوتا، امام کی خواہر محترمہ سے کسی نے پوچھا کہ امام مالک گھر میں کیا کرتے تھے، جواب دیا ان کے دو کام تھے،''المصحف والتلاوۃ''(۳) امام صاحب کی صاحبزادی سے منقول ہے کہ امام جمعہ کی شب عبادت وطاعت میں مشغول رہتے تھے، امام صاحب کے بھانجے ابن ابی یونس سے روایت ہے کہ امام مہینہ کی پہلی تاریخ کو شب زندہ دار رہتے تھے۔(۴)

حب رسول: حضرت سرور کائنات ﷺ کا بے حد ادب کرتے تھے، جب نام مبارک زبان پر آتا چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا، لوگ پوچھتے تو فرماتے کہ ہم نے جن مقدس بزرگوں کی زیارت کی ہے، ان کی حالت مجھ سے بھی بڑھ کر تھی۔(۵)

مسجد نبوی میں جس کے ایک حجرہ میں روضۂ انور ہے، شور وغل ناپسند فرماتے کہ یہ آستانۂ نبوت۔ بے گستاخی ہے، کلام نبویؐ اس وقت تک زبان پر نہیں آتا جب تک وضو یا

(۱) بستان المحدثین ص۳ (۲) کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر عباد ص۲۶۰ (۳) مناقب مالک للزواوی ص۳۲ (۴) تزئین الممالک ص۱۸ (۵) مناقب مالک للزواوی ص۳۳۔

غسل فرما کر باادب بیٹھ نہ لیتے، امام کے اصطبل میں کثرت سے گھوڑے اور خچر تھے، مگر کبھی مدینہ کی گلیوں میں سوار ہو کر نہ نکلے، لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ "مجھے شرم آتی ہے کہ جو سرزمین قدوم نبوی سے مشرف ہوئی ہے اس کو میں جانوروں کے سموں سے روندوں (۱) ذات نبوی کی محبت اور حدیث نبوی کے شغل و انہماک کے سبب سے کوئی شب ایسی نہ گذرتی جس میں عالم رویا میں زیارت نبوی کا شرف حاصل نہ ہوتا۔ (۲)

حب مدینہ: امام کو مدینہ سے غایت درجہ محبت تھی، بجز سفر حج کبھی مدینہ سے باہر نہیں نکلے، منصور نے بغداد کی سکونت کے لئے درخواست کی، پذیرانہ ہوئی، مہدی نے تین ہزار دینار بھیجے اور کہلا بھیجا کہ بغداد کا عزم کیجئے، فرمایا "اشرفیاں علی حالہا رکھی ہیں، جی چاہے تو لے جاؤ مگر مالک سے مدینہ نہیں چھوٹ سکتا۔ (۳) انتہائے محبت یہ ہے کہ جمہور اسلام کے خلاف امام مکہ معظمہ پر مدینہ منورہ کو فضیلت دیتے ہیں۔ (۴)

فیاضی: امام مالک طبعاً فیاض تھے، ایک بار امام شافعی کو لے کر اصطبل کا ملاحظہ کر رہے تھے، امام شافعی نے بعض گھوڑوں کی تعریف کی، امام صاحب نے تمام اصطبل ان کی نذر کر دیا، (۵) ہر سال امام شافعی کو گیارہ ہزار دینار مرحمت فرماتے تھے۔

مہمان نوازی: مہمان نوازی عربوں کا خاصہ اور ایک مومن کا فرض ہے لیکن امام صاحب کا اخلاق میزبانی اس سے بھی زیادہ تھا، امام شافعی جو طالب علم کی حیثیت سے ان کے گھر میں ٹھہرتے تھے، امام ان کے لئے خود اپنے ہاتھوں سے خوان اٹھا کر لاتے تھے، صبح کی نماز کے لیے اپنے ہاتھ سے پانی لا کر رکھتے تھے، باوجود وقار کے رخصت کے وقت خود بازار تک جا کر سواری کر دی اور روپے کی ایک تھیلی زادِ راہ کے لئے عنایت کی۔ (۶)

---

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰ و بستان المحدثین ص ۷ (۲) تزئین عن ابی نعیم والخطیب ص ۱۲ (۳) تذکرہ ذہبی ج ۱ ص ۱۹۰ (۴) اعلام علماء الاعلام لعبد الکریم بن محب اللہ المکی ص ۳ قلمی کتب خانہ بانکی پور (۵) توالی التاسیس معالی ابن ادریس لابن حجر (۶) مرات الاوراق ابن حجہ حموی ج ۱ ص ۲۰۰۔

صبر واستقلال: استقلال وضبط کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ موزہ میں بچھو تھا، امام مالک نے بے خبری میں اس کو پہن لیا، اور مجلس درس میں آکر بیٹھ گئے، بچھو نے مسلسل سترہ بار ڈنک مارا لیکن آداب مجلس کے خیال سے امام نے پہلو تک نہ بدلا، چہرہ کا رنگ بار بار متغیر ہو رہا تھا، اختتام درس کے بعد عبداللہ بن مبارک نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ موزہ میں بچھو ہے۔ (۱)

حلم وعفو: خودداری وجلالت شان کے ساتھ حلم وعفو جو ایک گراں قدر جوہر ہے، اکثر جمع نہیں ہوتا لیکن امام میں یہ دونوں صفتیں مجتمع تھیں، ایک طرف تو منصور ورشید جیسے قہار سلاطین کو ڈانٹ دیتے ہیں، دوسری طرف آپ کے شانۂ مبارک پر ذلیل ہاتھوں سے کوڑا مارا جاتا ہے تو آپ انگیز کرتے ہیں اور منصور جب مجرم کی سزا کا ذکر کرتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے معاف کیا۔ (۲)

حق گوئی وآزادی: امام صاحب خلفا کے دربار میں آمد ورفت رکھتے تھے، بعض لوگوں کو اس پر اعتراض تھا، امام صاحب نے فرمایا کہ ''اگر نہ جاؤں تو حق گوئی کا موقع کہاں ملے''؟ (۳) امام مالک کو اس لئے کوڑے مارے گئے کہ حق کے اظہار میں انھوں نے حکومت کی پروانہ کی، ایک بار منصور نے مسجد نبوی میں زور وشور سے مناظرہ شروع کیا، امام نے فرمایا کہ ادب ملحوظ رہے، **لَاتَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ**، عباسیوں کے مقابلہ میں محمد نفس زکیہ نے جب علم بلند کیا تو آپ نے علی الاعلان فتویٰ دیا کہ خلافت محمد نفس زکیہ کا حق ہے، عباسیوں نے زبردستی بیعت لی ہے۔

خودداری: علم کی شان یہ ہے کہ اس کی جلالت ملحوظ رکھی جائے تا کہ لوگوں میں اہل علم کا وقار قائم رہے اور ان میں اکتساب علم کا ذوق پیدا ہو، امام مالک نے اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، اوپر گذر چکا ہے کہ امام صاحب مجلس درس میں بڑے وقار ومتانت اور خودداری کے ساتھ

---

(۱) بستان المحدثین ص ۶ و ۷ (۲) کتاب الامامۃ ابن قتیبہ ج ۲ ص ۲۸۶ (۳) مناقب مالک للزواوی ص ۳۱۔

بیٹھتے تھے، لوگ اعتراض کرتے تو فرماتے کہ اریدان اجل العلم یعنی" میں چاہتا ہوں کہ علم کی شان بڑھاؤں" بڑے بڑے امرا اور حکام آستانۂ امامت پر حاضر ہوتے ہوئے کانپتے تھے، رشید نے اپنے خیمہ میں املائے حدیث کے لئے بلایا تو فرمایا "لوگ علم کے پاس آتے ہیں، لوگوں کے پاس علم نہیں جاتا" رشید خود آیا تو مسند درس پر بیٹھنا چاہا، فرمایا تواضع محبوب ہے، رشید نے کہا آپ پڑھئے فرمایا اپنی یہ عادت نہیں۔ (۱)

منصور کے دربار کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی دربار میں آتا تو خلیفہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا، امام نے کبھی یہ ذلت گوارا نہ کی۔

انصاف پسندی: لیکن اس خودداری اور اس اظہار حق سے زیادہ گراں قیمت اور مشکل الحصول شے انصاف پسندی ہے، وہ بھی اپنے نفس کے مقابلہ میں امام صاحب کا یہ حال تھا کہ جس مسئلہ پر عبور نہ ہوتا تو بمتانت فرمادیتے کہ "مجھے نہیں معلوم" آپ کے ایک شاگرد کا قول ہے کہ میں امام کے "نہیں معلوم" کو لکھا کرتا تو تختیاں بھر جاتیں۔

ابن القاسم امام کے ایک شاگرد نے کہا کہ مصر کے علما بیع وشرا کے مسائل میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، امام مالک نے پوچھا، انھوں نے کس سے ان کی تعلیم پائی، ابن القاسم نے کہا کہ آپ سے، فرمایا کہ مجھے تو خود ان میں دخل نہیں۔ (۲)

اہل علم کی عزت: خلیفہ ہارون رشید مجلس درس میں آیا تو اس کو مسند سے نیچے اتر کر بیٹھنا پڑا لیکن ایک بار امام ابوحنیفہ تشریف لائے تو امام نے اس قدر تعظیم کی کہ ان کے لیے اپنی چادر فرش پر بچھائی، وہ اٹھ گئے تو طلبہ سے کہا کہ یہ عراق کے ابوحنیفہ ہیں، جو اس ستون کو سونا ثابت کرنا چاہیں کرسکتے ہیں، اس کے بعد کوفہ کے محدث سفیان آئے تو ان کی بھی تعظیم کی لیکن اس سے کم، ان کے چلے جانے کے بعد فرمایا کہ لوگوں کی علیٰ قدر مراتب عزت کرنی چاہیے۔

---

(۱) مناقب مالک للزواوی ص ۲۹ (۲) مختصر جامع بیان العلم لابن عبدالبر ص ۱۲۵۔

عبدالرحمن بن قاسم آپ کے شاگرد تھے لیکن جب ان کو خط لکھتے تھے تو ''فقیہ مصر'' لکھا کرتے تھے، ایک بار آپ کے نامور شاگرد قعنبی محدث مدینہ آرہے تھے، تو امام صاحب اپنے تلامذہ کو لے کر خود بنفس نفیس ان کے استقبال کے لئے شہر سے باہر نکل آئے۔(۱)

حلیہ: رنگ سرخ وسپید، قد بلند وبالا، بدن بھاری، پیشانی کشادہ، آنکھیں بڑی، ناک اونچی، داڑھی بڑی اور گھنی، سر میں قدرتا بال نہ تھے، مونچھوں کو بہت چھوٹی کرانا ناپسند کرتے تھے، خضاب کا استعمال کبھی نہیں کیا۔

پوشاک: مزاج میں صفائی اور نزاہت غایت درجہ تھی، ہمیشہ نفیس اور بیش قیمت پوشاک زیب بدن فرماتے تھے، بعض لوگ اس پر ٹوکتے تو فرماتے کہ میں اس شہر (مدینہ) کے جس عالم سے ملا اس کو خوش پوشاک پایا، امام صاحب کو اپنے کپڑوں کا خاص اہتمام تھا، عدن کے کپڑے اس زمانہ میں مشہور اور بیش قیمت ہوتے تھے، وہاں سے اپنے لئے کپڑے منگواتے تھے، کبھی کبھی مرو کے بنے ہوئے کپڑے بھی استعمال کرتے۔(۲)

خوشبو کا استعمال ہمیشہ کرتے تھے، عود کی انگیٹھیاں جلتی رہتی تھیں، کپڑے خوشبو سے بسے رہتے تھے، جس گلی سے ایک بار نکل جاتے، دیر تک اس میں خوشبو پھیلی رہتی اور اکثر فرماتے کہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ خدا نے جس کو نعمت دی ہو اس کے آثار اس پر نہ ظاہر ہوں، کبھی کبھی طیلسان کا بھی استعمال کرتے جو اس زمانہ میں علما کی نشانی تھی، عمامہ جب زیب سر فرماتے تو شملہ گلے میں لپیٹ کر دائیں یا بائیں شانہ پر ڈال لیتے، ہاتھ میں ایک چاندی کی انگوٹھی تھی، جس کے سیاہ پتھر کے نگینہ پر حسبنا الله ونعم الوكيل نقش تھا۔

امام مالک کا یہ شرف کیا کم ہے کہ مدینہ مطہرہ کی خاک پاک جسم مبارک کا عنصر تھی لیکن اس سے بھی زیادہ شرف یہ ہے کہ مسکن وہ تھا جو حضرت عبداللہ بن مسعود کا مکان تھا اور

(۱) تذکرۃ ذہبی ج ۱ص ۱۵۱ (۲) ابن ندیم مطبوعہ یورپ ص ۲۸۰ و مرآۃ الجنان ج ۱ص ۳۷۳ و ۳۷۴ و بستان المحدثین ص ۳۔

مجلس ونشست گاہ وہ تھی جو حضرت عمر فاروقؓ کا دولت خانہ تھا، یہیں اکثر املائے حدیث کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، اس بنا پر امام مالک نہ صرف علوم ومعارف فاروقی کے وارث تھے، بلکہ ان کی مادی جائداد کا بھی خدا نے انھیں وارث بنایا تھا۔

تصنیفات

اس عہد میمون میں تصنیف وتالیف کی ابتدا ہو چکی تھی، امام کے دست مبارک سے جو کتابیں ترتیب پائی ہیں یا ان کی طرف منسوب ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- مؤطا کی نسبت مفصل بحث آگے آئے گی، مؤطا اور ان کی دوسری تصنیفات میں پہلا امتیاز یہ ہے کہ مؤطا کی روایت امام کے تلامذہ نے کی ہے اور بقیہ رسائل وکتب صرف بعض تلامذہ کی روایت سے ثابت ہیں۔

۲- رسالۃ مالک الی الرشید: یہ خلیفہ ہارون رشید کے نام خط کے طور پر ۲۲ صفحہ کا ایک رسالہ ہے جس میں امام نے خلیفہ کو ہر قسم کے دینی ودنیاوی واخلاقی نصائح کیے ہیں۔

بعض علماء نے اس بناء پر اس کی نسبت امام صاحب کی طرف کرنے سے انکار کیا کہ اس میں بعض ضعیف ومنکر حدیثیں ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ اخلاقیات میں محدثین اس قدر احتیاط نہیں کرتے تھے، ابن ندیم نے الفہرست میں اس کا ذکر کیا ہے، یہ رسالہ چھپ گیا ہے اور لاہور میں کسی شخص نے اس کا اردو ترجمہ بھی چھاپا ہے۔

۳- احکام القرآن: یہ خود امام کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور ماہر علوم قرآن علامہ ابو محمد مکی بن ابی طالب اندلسی متوفی (۴۳۷ھ) کی تالیف ہے امام مالک سے جو احکام قرآن یعنی آیات احکامیہ کی تفسیریں مروی ہیں ان کو علامۂ موصوف نے اس میں یکجا کر دیا ہے، اسی لئے اس کا پورا نام کتاب الماثور عن مالک فی احکام

القرآن ہے۔(۱)

۴- المدونۃ الکبریٰ: فقہ مالکی کی ضخیم کتاب ہے، بعض لوگ اس کو خود امام کی تصنیف بتاتے ہیں حالانکہ عبدالرحمٰن بن قاسم متوفی ۱۹۱ھ امام کے ایک شاگرد کی تصنیف ہے، البتہ اس لحاظ سے امام کی تصنیف کہنا درست ہے کہ یہ کتاب درحقیقت ان کے ''ملفوظات فقہیہ'' کا مجموعہ ہے، ابن قاسم نے امام کے زمانہ میں مدینہ سے واپس آ کر امام کے مجتہدات واقوال کو ایک کتاب کی صورت میں مدون کرنا شروع کیا تھا اور شاید اسی زمانہ میں ختم بھی ہوگئی تھی کیونکہ یحییٰ بن یحییٰ مضمودی دوسری بار مصر سے مدونۂ ابن قاسم کو خود امام سے سننے کے لئے آئے تھے لیکن افسوس کہ امام اس وقت بستر مرض پر تھے۔(۲) مصر میں مدونہ چھپ گئی ہے اور ہر جگہ ملتی ہے۔

۵- رسالۃ مالك الی ابن مطرف: غسان بن محمد بن مطرف کے نام ''فتویٰ'' کی بحث پر ایک رسالہ ہے۔

۶- رسالۃ مالك الی ابن وھب. امام کے شاگرد رشید ابن وہب کے نام سے مسئلہ قضا وقدر پر ایک مشہور رسالہ ہے، قاضی عیاض نے اس رسالہ کی تعریف کی اور لکھا ہے، وھو من خیار الکتب فی ھذا الباب الدال علی سعة علمه بھذا الشان.

۷- کتاب الاقضیه: بعض قاضیوں کے لئے امام نے یہ رسالہ لکھا، غالباً اس میں عہدۂ قضا کے متعلق اصول وہدایات ہوں گے۔

۸- کتاب المناسك: ابوجعفر زہری امام کے ایک دوست کا بیان ہے کہ یہ امام مالک کی سب سے بڑی تصنیف تھی جس میں حج کے احکام ومسائل تھے۔

۹- تفسیر غریب القرآن: اس کی روایت خالد بن عبدالرحمٰن مخزومی نے

(۱) تزئین الممالک ص۴۰، ۴۱۔ (۲) ابن خلکان ترجمہ ابن قاسم۔

امام سے کی ہے۔

۱۰- کتاب المجالسات عن مالك. ابن وہب امام کے تلمیذ رشید نے امام کی مجالس میں حدیث و آثار و اخلاق کے جو متفرق فوائد و نکات سنے ان کو اس میں جمع کیا ہے، حافظ سیوطی نے یہ رسالہ دیکھا تھا۔

۱۱- تفسیر القرآن: قرآن مجید کی تفسیر بروایت احادیث مسندہ ہے، حافظ سیوطی نے اس کو دیکھا تھا اور اس کی تعریف کی ہے لیکن یہ مشکوک ہے کہ آیا یہ خود امام کی تالیف ہے، یا کسی شاگرد نے امام سے اس کی تعلیق کی ہے۔

۱۲- کتاب المسائل: ان رسائل و کتب کے علاوہ امام کی اور بھی تصنیفات تھیں، محدث خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ ابو العباس سفاح کے سامنے بہت سے منتشر اوراق پڑے تھے جس کی نسبت اس نے کہا کہ یہ امام صاحب کے ستر ہزار مسائل کا مجموعہ ہے۔(۱)

موطا

امام کی اصلی تصنیف ''موطا'' ہے جو قرآن پاک کے بعد کتب خانۂ اسلام کی دوسری کتاب ہے، اول کلام خدا ہے اور ثانی کلام رسول اللہ۔

۱۳۲ھ میں خلافت امویہ مٹ کر خلافت عباسیہ قائم ہوتی ہے اسی کے پس و پیش عہد میں سینکڑوں مجموعہ ہائے حدیث مدون ہوئے، موطا کی تالیف کا بھی یہی زمانہ ہے۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد اکثر صحابہ تعلیم و ارشاد اور جہاد و غزا کی نیت سے بلاد مفتوحہ میں پھیل گئے تھے لیکن صحابہ کا گروہ عظیم جن میں اکابر و اجلہ فقہا داخل تھے، مدینہ ہی میں رہا، امام مالک کا عہد وہ ہے جب احادیث و روایات تمام بلاد اسلامیہ میں

(۱) تزئین الممالک ص ۴۰، ۴۱۔

منتشر تھیں، اس لحاظ سے ان کے عصر میں جن ملکوں میں مجموعہ ہائے حدیث کی تدوین ہوئی وہ اپنے اپنے حدود ملکی کے اندر محدود تھے مرکز نبوت اور مہبط وحی مدینہ میں جو علوم نبوی کا سب سے بڑا گنجینہ تھا حدیثوں کی جمع و ترتیب، جس خوش بخت کی قسمت میں تھی وہ امام مالک ہیں۔(۱)

مؤطا: مؤطا علوم مدینہ کا مجموعہ ہے، جہاں زر و جواہر کی اصلی کان تھی، تمام اکابر صحابہ و اعاظم تابعین کا مسکن یہی شہر مبارک تھا، اس لئے یہ صحیفۂ مقدس انھی بزرگوں کی روایات و فتاویٰ پر مبنی ہے، اس بنا پر یہ صحیفہ حقیقت میں صحیح ترین، موثق ترین اور کامل ترین احکام اسلامیہ کا مجموعہ ہے۔(۲)

تالیف مؤطا: یہ ظاہر ہے کہ امام مالک ہمیشہ مدینہ ہی میں قیام فرما رہے، اس لئے تالیف کا مقام معلوم ہے لیکن صحیح زمانہ متعین نہیں، ۱۳۰ھ سے زوال بنی امیہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے اس سے پہلے تصنیف و تالیف کا شغل عام نہ تھا، ۱۴۴ھ میں منصور نے آخری حج کیا ہے، اس وقت مؤطا متداول و مشہور ہو چکی تھی۔(۳) اس لئے اس کا زمانہ تالیف ان دونوں کا درمیانی زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک روایت ہے کہ امام مالک نے منصور ہی کے حکم سے موطا کی تالیف شروع کی تھی، اس کی فرمایش تھی کہ اس مجموعۂ احکام میں نہ ابن عمر کی سختیاں ہوں نہ ابن عباسؓ کی رخصتیں اور عباسی مسعود کے شواذ۔(۴)

امام صاحب جب موطاء کی تالیف میں مشغول ہوئے اور اس کی خبر دوسرے لوگوں کو پہنچی تو مدینہ کے علما بھی اپنی اپنی احادیث کا مجموعہ تیار کرنے لگے، لوگوں نے امام سے جا کر

---

(۱) ان معلومات کے لئے مقدمہ فتح الباری ملاحظہ ہو(۲) مقدمہ مسوی شاہ ولی اللہ صاحب و کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷۵ (۳) ایضاً جامع بیان العلم ابن البرص ۶۷ (۴) کتاب الامامۃ والسیاسۃ ذکر منصور ج ۲ ص ۱۴۰ و ۱۴۱۔

عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ "صرف حسن نیت کو بقا ہے" یہ پیشین گوئی کس قدر صحیح ثابت ہوئی، چنانچہ مؤطائے امام مالک کے سوا کوئی مؤطا دنیا میں معلوم و باقی نہیں رہی، بعض لوگوں نے رشک کا انتقام دوسری طرح لیا، محمد بن اسحق صاحب سیر و مغازی نے کہا "مالک کی کتابیں میرے پاس لاؤ، میں ان کے عیوب دکھاؤں، مالک کی کتابوں کا ناقد تو میں ہوں۔" (۱)

امام مالک نے تصنیف سے فارغ ہو کر اس کو شیوخ حدیث کی خدمت میں پیش کیا، سب نے بہ غایت پسند کیا، عام اہل مدینہ کے لئے وہ دن عجیب مسرت کا تھا، جب ان کے مجموعہ فضائل میں ایک اور فضیلت کا اضافہ ہو رہا تھا، سعدون نام کا ایک شاعر مؤطا کی تعریف میں کہتا ہے: (۲)

فبادر مؤطا مالك قبل فوته　　　فما بعده ان فات للحق مطلب

مالک کی مؤطا کو جلد لو، کھونے نہ پائے، اگر یہ کھوئی تو حق کی جستجو کی پھر جگہ نہیں

ودع للمؤطا كل علم تريده　　　فان المؤطا الشمس والغير كوكب

اور مؤطا کے لیے ہر اس علم کو جس کو چاہتے ہو چھوڑ دو کہ مؤطا آفتاب ہے

اور اس کے علاوہ دوسری کتابیں ستارہ ہیں۔

وجہ تسمیہ: مؤطا کے لغوی معنی "روندا ہوا" یا "چلا ہوا" کے ہیں شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے "روندے ہوئے یا چلے ہوئے" مجازی معنی یہ ہیں کہ "جس پر عام ائمہ اور علما اور اکابر چلے ہوں اور جس کو ان سب کی رایوں نے روندا اور پامال کیا ہو یعنی سب نے اس کے متعلق گفتگو کی ہو اور اس سے اتفاق کیا ہو" اس طرح گویا اس کے معنی "متفق" اور "مطابق" کے ہیں، چونکہ تمام شیوخ حدیث نے اس سے اتفاق و مطابقت کی، اس لئے اس کا نام مؤطا مشہور ہو گیا۔ (۳) میرے نزدیک اس سے زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ "مؤطا اس راستہ کو کہتے

---

(۱) تہذیب الکمال "مالک بن انس (۲) بستان المحدثین ذکر امام مالک ص۹ (۳) مقدمہ مسوی شاہ ولی اللہ صاحبؒ ۶۔

ہیں جس پر لوگ بکثرت گذرتے ہوں'' سنت کے معنی بھی راستہ کے ہیں یہ وہ راستہ ہے جس پر آنحضرت ﷺ گذرے، مؤطا وہ پامال راستہ ہے جس پر آنحضرت ﷺ کے بعد تمام صحابہ گذرے، غرض مؤطا کا لفظ اپنی حقیقت کا آپ مفسر ہے کہ ان مسائل پر مشتمل ہے جن پر صحابہ کا عمل رہا ہے اور جمہور سلف جن پر چلے ہیں۔

تعداد مرویات: ابتداءً مؤطا میں دس ہزار حدیثیں تھیں لیکن امام کے خامۂ صحت پسند نے تقریباً آٹھ ہزار حدیثیں قلم زد کردیں، باقی ۱۷۲۰ ہیں جن میں سے مسند اور مرفوع ۶۰۰ ہیں، مرسل ۲۳۵، موقوف ۶۱۳، تابعین کے اقوال وفتاوی ۲۸۵، بلاغات مالک ۷۵۔(۱)

موضوع: مؤطا کا موضوع صرف احکام فقہیہ ہیں، اس لئے وہ سینکڑوں ابواب وفصول جو بخاری ومسلم اور ترمذی وغیرہ میں نظر آتے ہیں مؤطا ان سے خالی ہے، کیونکہ فقہیات سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے اس بنا پر محدثین کی اصطلاح کے مطابق اس کو ''کتاب السنن'' کہنا چاہئے۔

مؤطا اور دیگر فقہائے مجتہدین کے مجموعہ ہائے حدیث: چاروں مجتہدین فقہا میں سے ہر ایک کے انتساب سے ایک مجموعۂ حدیث موجود ہے لیکن امام مالک کے سوا کسی امام مجتہد کے قلم سے علم حدیث کی کوئی تصنیف ظاہر نہیں ہوئی و ذالك فضل اللّٰه يوتيه من يشاء مسند ابی حنیفہ کے نام سے متعدد کتابیں موجود ہیں مگر دراصل یہ تمام کتابیں امام ابوحنیفہ کے سینکڑوں برس بعد امام ممدوح کے تلامذہ کی تصنیفات اور غیر معروف مسانید سے لے کر محمد بن یعقوب اور حسین بن محمد بن خسرو وغیرہ نے تالیف کی ہیں اور ان کو مسند ابی حنیفہ امام اعظم کے نام سے موسوم کردیا ہے۔

مسند امام شافعی کی حقیقت یہ ہے کہ امام شافعی نے اپنی تصنیفات میں بر سبیل استدلال جو حدیثیں روایت کی ہیں، ابوجعفر بن محمد بن مطر نیشاپوری اور ابوالعباس نام ایک شافعی نے ان کو یکجا کردیا ہے، مسند احمد بن حنبل کی تالیف یقیناً امام احمد نے شروع کی تھی

(۱) مقدمہ مسوی شاہ ولی اللہ صاحب ص ۶۔

لیکن وہ ابھی مسودہ تھا کہ امام موصوف نے وفات پائی، اس کی تبییض وترتیب بعد کو امام احمد کے صاحبزادہ عبداللہ نے کی، جو افسوس ہے کہ اس میدان کے مرد نہ تھے، اسی لئے اس میں مدنی اور عراقی مسندوں میں تخلیط ہے اور صحیح احادیث کا التزام نہیں، گو خود امام ابن حنبل کو اس کا دعویٰ تھا۔

مؤطا اور اس کی معاصر کتابیں: مؤطا سے قبل اور خود اس کے زمانہ میں بیسیوں مسانید اور مؤطائیں لوگوں نے لکھیں، جن میں سے بعض اب تک باقی ہیں لیکن اور مؤطاؤں اور مؤطائے امام مالک کے موازنہ سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ مؤطا اور ان کتابوں میں وہی نسبت ہے جو صحیح بخاری کو مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن بیہقی سے ہے خود ان کتابوں کا فقدان اور عدم شہرت اس کی سب سے بڑی دلیل ہے، تین خاص وجوہ سے مؤطا کا امتیاز بالکل روشن ہو جاتا ہے۔

۱- مؤطا سے پہلے جو حدیث کی کتابیں لکھی گئیں ان کا مبنیٰ زیادہ تر صحابہ وتابعین کے آثار وفتاویٰ تھے، امام مالک نے مؤطا میں احادیث صحاح ومسند یا منقطع ومرسل کو مبنائے اول اور آثار وفتاوی کو مبنائے ثانی قرار دیا۔

۲- دوسرا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ ان میں صحت کا التزام نہیں کیا گیا تھا اور مؤطا میں صرف اسی حدیث یا فتویٰ نے جگہ پائی ہے جس کو صحت کا شرف حاصل تھا۔

۳- تیسری بات یہ کہ مؤطا مدینہ میں تالیف ہوئی ہے اور اس کے رواۃ حجازی ہیں اور دیگر مسانید اور مؤطائیں کوفہ بصرہ، واسط، شام، یمن، خراسان اور رے وغیرہ میں لکھی گئیں اس لیے ان کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہے اور اس پر تمام علمائے حدیث کا اتفاق ہے کہ حجاز کی حدیثیں صحت، قوت اور جودت اسناد میں سب پر فائق ہیں۔

طبقات کتب حدیث میں موطا کا درجہ: علمائے حدیث نے کتب حدیث کو چار مختلف طبقات میں منقسم کیا ہے، طبقۂ اولیٰ میں وہ تصانیف ہیں جن کے مصنفین حدیث کے امام

اور فن کے نقاد تھے اور جن کی تصنیفات صحت، جودت، اسناد اور قبول محدثین کے لحاظ سے سب سے مقدم ہیں اور جن کے رجال حفظ، ثبوت، وثوق، شہرت میں معروف ہیں اس طبقہ میں مؤطا، بخاری اور مسلم داخل ہیں۔

طبقہ اولیٰ میں مؤطا کا درجہ: عام علما تو اس کو مسلم بلکہ ترمذی کے بھی بعد جگہ دیتے ہیں لیکن محققین قدما اور عموماً متاخرین میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز صاحب اس کو بخاری سے بھی مقدم سمجھتے ہیں اور خود میں بھی بدءِ طلب حدیث سے یہی اعتقاد جازم رکھتا ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ مؤطا میں مرسل، موقوف اور منقطع حدیثیں ہیں، جو صحیح کے لئے قادح ہیں لیکن ان کا ارسال، وقف اور انقطاع مؤطا کی روایت کے لحاظ سے درست ہے مگر حقیقت کے رو سے یہ تمام مراسیل وموقوفات ومنقطعات، متصل، مرفوع ومسند ہیں اور خود ان کا رفع واتصال واسناد، امام بخاری وامام مسلم وترمذی وغیرہ نے کیا ہے۔ اس بنا پر درحقیقت مؤطا میں کوئی مرسل، موقوف یا منقطع حدیث نہیں، اس میں جو حدیث بھی ہے اس پر (الا ماشاء اللہ) بخاری ومسلم وترمذی وغیرہ کی مہر تصدیق لگی ہوئی ہے، اس سے مؤطا کی صحت کے درجہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱- مؤطا کو سب سے بڑا شرف یہ بھی حاصل ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں کلام اللہ کے بعد جو کتاب آئی وہ کلام الرسول کا یہی اصح ترین مجموعہ تھا، ظاہر ہوئی، کشف الظنون میں ہے ''سب سے پہلی کتاب جو اسلام میں لکھی گئی ہے وہ مؤطا ہے۔''(۱) قاضی ابوبکر ابن عربی م ۵۴۶ھ مؤطا کی شرح میں لکھتے ہیں یہ ''پہلی کتاب ہے جو شریعت اسلامیہ میں لکھی گئی ہے'' حضرت سفیان کہتے ہیں ''سب سے پہلے مالک نے صحیح تالیف کی۔''

۲- باوجود نقشِ اول ہونے کے بھی اس کے بعد کی کتابیں اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتیں، جس کے متعلق ائمہ مجتہدین اور علمائے حدیث کی قوی شہادتیں موجود ہیں،

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۵۷۲۔

امام شافعی م ۲۰۴ھ فرماتے ہیں" روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد کوئی کتاب مؤطا امام مالک سے زیادہ صحیح نہیں ہے" ابوبکر ابن عربی فرماتے ہیں" یہ اسلام کی سب سے پہلی کتاب ہے اور سب سے پچھلی بھی، کیونکہ پھر اس کے مثل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی"

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کتاب الام میں امام شافعی اور کتاب الآثار میں امام محمد کی جو نقاہت ہے وہ مؤطا ہی کے صدقہ میں ہے۔

۳- امام مالک سے مؤطا کی روایت کرنے والے جس پایہ کے لوگ ہیں وہ بخاری اور مسلم کے نہیں ہیں اس لئے خواص وعوام کی نقل و روایت میں جو فرق ہے وہ یقیناً مؤطا اور دیگر کتب کے نقل و روایت میں ہے۔

۴- رسول اللہ ﷺ اور مؤلفین حدیث میں جتنے واسطے کم ہوں گے اسی قدر اس کی تالیفات زیادہ معتبر اور مستند ہوں گی، بخاری و مسلم کی روایتیں عموماً پانچ چھ واسطوں سے مروی ہیں، مؤطا کی حدیثیں تین چار واسطوں سے زیادہ کی نہیں ہیں، امام بخاری کو اپنی بیس ثلاثیات پر ناز ہے اور مؤطا کی بنیاد ہی ثلاثیات پر ہے اس کے علاوہ اس میں چالیس ثنائیات ہیں۔

مؤطا کے نسخے: موطا امام مالک صاحب سے تیس مختلف طریقوں سے مروی ہے جن میں مشہور ۱۶ نسخے ہیں، ان میں سے معتبر اور باوثوق گیارہ اور باوثوق تر چار ہیں، یعنی یحیٰ ابن بکیر، ابومصعب اور ابن وہب کے نسخے لیکن متداول ترین اور مشہور ترین یحیٰ کی روایت والا نسخہ ہے، کتاب کی مشہور ترتیب یہ ہے: اول کتاب الجنائز، پھر کتاب الصلوۃ، پھر کتاب الزکوۃ، پھر کتاب الصیام، اس کے بعد تمام نسخے کتاب الحج تک متفق ہیں، کتاب الحج کے بعد سے پھر مختلف الترتیب ہیں (۱) اس قسم کا اختلاف بخاری و مسلم سب میں ہے۔

شروح وتعلیقات: کسی تصنیف کے قبول وہردلعزیزی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کو شارحین، معلقین ومحشین کی ایک بڑی جماعت ہاتھ آئے اور اس میں کمیت سے زیادہ

---

(۱) بستان المحدثین ص ۱۰، ۱۱۔

اصل چیز کیفیت ہو، مؤطا ان دونوں خصوصیات کے لحاظ سے خوش قسمت ہے، تقریباً پچیس علمائے کبار نے اس کی شرح وتعلیق اور دیگر خدمات انجام دی ہیں، قدما میں ابن حبیب مالکی متوفی ۲۳۹ھ، امام ابوسلیمان خطابی م ۳۸۸ھ، ابن رشیق قیروانی م ۴۵۶ھ، محدث ابن عبدالبر، م ۴۶۳ھ، امام باجی اندلسی متوفی ۴۷۴ھ، قاضی عیاض متوفی ۵۴۴ھ، قاضی ابوبکر بن عربی متوفی ۵۴۶ھ اور متاخرین میں حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ علامہ زرقانی مصری م ۱۱۲۲ھ، شاہ ولی اللہ دہلوی م ۱۱۷۶ھ وغیرہ داخل ہیں۔

امام خطابی، حافظ سیوطی، ابن عبدالبر، ابن حزم، ابوالولید باجی نے بحذف فتاوی صرف مؤطا کی احادیث کی تلخیص کی ہے، حافظ سیوطی نے رجال مؤطا کو علاحدہ کیا ہے، احمد بن عمران، اخفش بصری اور قاضی عیاض نے مؤطا کے لغات حل کیے ہیں، باجی اور دارقطنی نے مؤطا کے اختلاف نسخ پر بحث کی ہے، ابوالحسن علی بن محمد قابسی نے مؤطا کی صرف متصل الاسناد حدیثیں جمع کی ہیں، ابن بشکوال اور خطیب بغدادی نے صرف ان لوگوں کے حالات لکھے ہیں جنھوں نے امام سے مؤطا کی روایت کی ہے، غرض مؤطا کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد ستر ۷۰ کے قریب ہے۔

مؤطا کا ایک اور امتیاز: سلاطین اور خلفائے اسلام میں سینکڑوں ایسے گذرے ہیں جو صاحب سیف وقلم تھے جن کے نام سے تخت ومنبر دونوں عزت پاتے تھے لیکن کسی کے متعلق یہ ذکر نہیں ہے کہ اس نے طلب علم واخذ سند کے لیے کوئی سفر کیا ہو کیوں کہ خود ان کا دربار اساتذہ کا مرکز اور علما کا مرجع ہوتا تھا، تنہا امام مالک کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ ان کی کتاب مؤطا کے لیے مہدی، ہادی، رشید، مامون، اور امین جیسے مشاہیر خلفائے اسلام نے عراق سے حجاز تک کا سفر کیا اور آخر میں چھٹی صدی میں بزرگ ترین سلاطین اسلام صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس نے قاہرہ سے اسکندریہ تک صرف اسی کی خاطر سفر گوارا کیا۔(۱)

(۱) تزئین الممالک ص ۴۶۔ ☆

امام ابوداؤد طیالسی

(متوفی ۲۰۴ھ)

نام ونسب: سلیمان نام، ابوداؤد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: سلیمان بن داؤد بن جارود (۱)

ولادت: وہ باتفاق ۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے، علامہ سمعانی نے ربیع الاول کا مہینہ بھی لکھا ہے۔

خاندان ووطن: آبائی وطن فارس ہے، بصرہ میں مستقل بودوباش اختیار کر لی تھی، اصلاً غلام زادہ تھے، ان کے والدین قبیلہ قریش کے موالی تھے، فارسی، بصری، قرشی اور طیالسی کی نسبتوں سے منسوب کئے جاتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور نسبت طیالسی ہے، جو طیالسہ کی جانب ہے، طیالسہ، طیلسیان کی جمع ہے، یہ ایک قسم کی چادر ہوتی تھی، جس کو اہل عرب عماموں کے اوپر اوڑھتے تھے، اس نسبت سے جو لوگ منسوب ہیں ان میں ابوداؤد سب سے زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں۔ (۲)

طیلسان فارسی زبان کا لفظ ہے، اصمعی کے نزدیک وہ اصل میں تالشان (تالسان) تھا اور معرب ہوکر طیلسان ہوگیا ہے، (۳) اس نسبت سے منسوب ہونے کا سبب نہیں معلوم ہوسکا۔

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۴، خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۵۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۲۲ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۷۵ (۳) لسان العرب ج ۷ ص ۴۳۱۔

اساتذہ وشیوخ: حافظ ابوداؤد طیالسی کو دوسری صدی ہجری کا مبارک زمانہ ملا جو علم وفضل اور خیر و برکت کے لحاظ سے خیر القرون میں شمار کیا جاتا ہے اس لیے ان کو مقدس اور برگزیدہ علمائے اسلام کی صحبت میسر آئی اور بڑے بڑے محدث علما سے استفادہ کا موقع ملا، ان کے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک ہزار شیوخ سے حدیثیں لکھیں، ان میں ابن عون اور ان کے مرتبہ کے متعدد لوگ تھے، بعض مشہور شیوخ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابان بن یزید عطار، ابراہیم بن سعد، ایمن بن نابل، جریر بن حازم، جریر بن عبدالحمید، حبیب بن یزید، حرب بن شداد، حماد بن درہم، حماد بن سلمہ، زائدہ بن قدامہ، زہیر بن معاویہ، سفیان بن سعید ثوری، شعبہ بن حجاج، عبدالرحمٰن بن ابی الزناد، عبداللہ بن عون، عبدالعزیز بن ماجشون، قرۃ بن خالد، ابوعوانہ وضاح بن عبداللہ، ورقاء، ہشام بن عبداللہ دستوائی، ہمام بن یحییٰ اور یزید بن ابراہیم وغیرہ۔(۱)

تلامذہ: جس طرح انھوں نے بیشمار مشائخ سے اکتساب فیض کیا تھا، اسی طرح ان کے دامن سے بھی بکثرت طلبہ اور محدثین وابستہ ہوئے، ان میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں:

احمد بن ابراہیم دورقی، احمد بن حنبل، اسحاق بن منصور کوسج، ابوبکر بن ابی شیبہ ابومسعود رازی، ابن فرات، بکار بن قتیبہ ثقفی، حجاج بن یوسف الشاعر، عباس دوری، عبداللہ بن محمد مسندی، عثمان بن ابی شیبہ، علی بن مدینی، علی بن مسلم طوسی، عمرو بن علی فلاس، محمد بن ابوبکر مقدمی، محمد بن بشار بندار، محمد بن رافع، محمد بن سعد کاتب واقدی، محمد بن غیلان، ہارون حمال، یعقوب بن ابراہیم دورقی اور یونس بن حبیب اصبہانی وغیرہ۔(۲)

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۴، ۲۵ و کتاب الانساب ورق ۳۷۵ و تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۶ (۲) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۴، ۲۵ و کتاب الانساب ورق ۳۷۵ و تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۶۔

آپ کے استاذ جریر بن عبدالحمید نے بھی آپ سے روایت کی ہے،(۱) مؤلفین صحاح اور امام طیالسی کے زمانہ میں کافی تفاوت ہے اس لیے ان میں سے تین نے آپ سے بالواسطہ روایت کی ہے، حافظ ابن حجر نے امام بخاری (۲) اور مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے امام ترمذی کے سلسلۂ رواۃ میں ان کا نام گنایا ہے،(۳) شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوداؤد سجستانی کے متعلق لکھا ہے کہ غالبًا وہ ان سے بیک واسطہ روایت کرتے ہیں۔(۴)

رحلت وسفر: ابوداؤد کے مشائخ کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے حدیث کی طلب وجستجو کے لیے مختلف مقامات کا سفر کیا ہوگا لیکن کتابوں میں صرف بغداد اور اصبہان کے سفر کا ذکر کیا ہے۔

فضل وکمال: حدیث کے علاوہ ان کے دوسرے علمی کمالات پردۂ خفا میں ہیں اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کن کن علوم وفنون میں جامعیت رکھتے تھے، صرف فن حدیث میں ان کی مہارت وژرف نگاہی کا حال معلوم ہوتا ہے جس نے ان کو مرتبۂ امامت پر فائز کیا۔

حفظ وضبط: ان کا حافظہ غیر معمولی تھا، علمائے فن اور ان کے معاصرین نے اس کا اعتراف کیا ہے، بعض علما کا بیان ہے کہ ''ان کو ۳۰ ہزار اور بعض نے کہا ہے کہ ۴۰ ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں'' یونس بن حبیب اصبہانی فرماتے ہیں کہ انھوں نے اصبہان میں ایک لاکھ حدیثیں محض اپنی یادداشت سے املا کرائیں، عمرو بن علی فلاس کہتے ہیں کہ ''محدثین کے زمرہ میں مجھ کو کوئی شخص ابوداؤد سے بڑا حافظ نظر نہیں آیا، میں نے ان کو خود یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں ۳۰ ہزار حدیثیں زبانی بیان کرتا ہوں'' علی بن مدینی کا بیان ہے کہ میری نظر سے کوئی ان سے زیادہ حدیثوں کا حافظ نہیں گذرا، محمد بن بشار کا قول ہے کہ ''جتنی حدیثیں ابوداؤد سے

(۱) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۴ وتہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۳ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۲۲۸ (۳) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۲۷۲، ۳۲۰ (۴) بستان المحدثین ص ۳۲۔

لکھی گئیں اتنی کسی اور محدث سے نہیں لکھی گئیں، صالح بن احمد عجلی ان کو کثیر الحفظ بتاتے ہیں، ابن عدی کا بیان ہے کہ ''بصرہ میں ابوداؤد طیالسی اپنے زمانے میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے اور اس وصف میں وہ اپنے معاصرین میں فائق و برتر تھے'' ہشیم بن خارجہ نے امام احمد سے دریافت کیا کہ ''ابوداؤد اور ابوعبیدہ حداد میں کس کو آپ زیادہ پسند کرتے ہیں'' فرمایا ابوداؤد: حافظہ کے لحاظ سے فائق ہیں اور ابوعبیدہ زیادہ تر کتابوں سے روایت کرتے ہیں، اس لیے غلطی بہت کم کرتے ہیں'' وکیع کا بیان ہے کہ ''طویل حدیثوں کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں (۱) رہا'' شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں ''ابوداؤد طویل حدیثوں کو اچھی طرح محفوظ کرتے تھے اور اس وصف میں اپنے معاصرین سے ممتاز تھے۔''

عدالت وثقاہت: ثقاہت میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا، علمائے جرح وتعدیل نے ان کی توثیق کی ہے، عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں ''وہ لوگوں میں سب سے زیادہ سچے تھے'' (۲) ابوالمنذر نعمان کا ارشاد ہے کہ ''وہ ثقہ اور معتبر تھے'' ابن معین سے شعبہ کے تلامذہ کے متعلق دریافت کیا گیا کہ ابوداؤد طیالسی اور حرمی میں آپ کے نزدیک کون زیادہ بہتر ہے تو انھوں نے فرمایا کہ ابوداؤد صدوق ہیں، اس لیے وہ مجھ کو زیادہ پسند ہیں، صالح بن احمد عجلی اور خطیب بغدادی نے ان کو ثقہ وثابت بتایا ہے، عمرو بن علی نے ان کو ثقہ ومعتبر کہا ہے، ابن عدی عمرو کی رائے کی تصدیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ میرے اور دوسروں کے نزدیک متیقظ اور ثابت تھے، ابوحاتم ان کو صدوق محدث قرار دیتے ہیں، ابومسعود رازی نے امام احمد سے ان کے بارے میں سوال کیا تو ارشاد ہوا کہ وہ ثقہ اور صدوق تھے، امام نسائی کا

(۱) العبر ج۱ص۳۴۴ وکتاب الانساب ورق ۳۷۵، تاریخ بغداد ج۹ص ۲۶ وتذکرۃ الحفاظ ج۱ص ۱۲۲ ومیزان الاعتدال ج۱ص ۴۱۳، تہذیب التہذیب ج۴ص۱۸۴ (۲) تاریخ بغداد ج۹ص ۲۸ وتہذیب التہذیب ج۴ص۱۸۳، کتاب الانساب ورق ۳۷۵ ومیزان الاعتدال ج۹ص ۴۱۳ وطبقات ابن سعد قسم دوم ج۷ص۵۱۔

ارشاد ہے کہ "ابوداؤد ثقہ اور لوگوں میں سب سے زیادہ سچے تھے، ابن حبان نے بھی ان کو ثقات میں شامل کیا ہے اور محمد بن سعد صاحب طبقات لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، (۱) شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن معین وابن المدینی وفلاس ووکیع ودیگر علمائے رجال او رالتعدیل وتوثیق مفرط نمودہ اند۔ (۲)

معرفت حدیث: وہ حدیثوں کے صرف ناقل وحافظ ہی نہ تھے بلکہ ان کی پرکھ میں بھی مہارت رکھتے تھے، نبدار کا بیان ہے کہ وہ حفظ اور معرفت حدیث کے لحاظ سے نہایت برتر تھے۔

وکیع جیسے نامور محدث حدیث میں ان کی غیر معمولی واقفیت اور تمیز کی بنا پر ان کو جبل العلم کہتے تھے، یحییٰ بن معین ان کو عبدالرحمٰن بن مہدی سے بھی زیادہ صاحب علم اور حدیثوں کا واقف کار بتاتے ہیں، ان کے استاذ شعبہ کو ان کے علم وتمیز پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنی عدم موجودگی میں ان کو مسندِ درس پر رونق افروز ہونے کی اجازت دے دیتے تھے، ابوحاتم کا بیان ہے کہ معرفت حدیث میں ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ وہ شعبہ سے مذاکرہ کر سکتے تھے، اس سلسلہ میں ابوداؤد کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ بعض محدثین اور شیوخ کی روایات کا ان سے زیادہ کوئی واقف کار نہ تھا، عثمان بری کے متعلق وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میرے سینہ میں ان کی ۱۲ ہزار حدیثیں محفوظ ہیں، مشہور محدث شعبہ کی روایتوں کے لیے تو وہ سند کی حیثیت رکھتے تھے، احمد بن سعید دارمی نے امام احمد سے سوال کیا کہ شعبہ کی حدیثیں کس سے قلم بند کی جائیں تو انھوں نے فرمایا کہ جب تک ابوداؤد زندہ ہیں ہمارا خیال ہے کہ ان ہی سے نقل وروایت کی جائے، ابومسعود رازی کا بیان ہے کہ شعبہ کی روایتوں کے معاملہ میں ابوداؤد سے زیادہ کوئی واقف کار مجھ کو نہیں ملا، (۳) حضرت شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ "واز محدثان آنجا مثل شعبہ وہشام دستوائی وابن عون وغیرہم روایات

(۱) طبقات ابن سعد قسم دوم ج ۷ ص ۵۱ (۲) بستان المحدثین ص ۲۱ (۳) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۷، ۲۸، ۲۹ وخلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۵۱۔

بسیار دارد۔(۱)

اخلاق و عادات: ابوداؤد طیالسی کے اخلاق و عادات اور اعمال و عبادات وغیرہ کی تفصیل نہیں معلوم ہو سکی، بعض واقعات سے ضمناً ان کے بعض اوصاف کا پتہ چلتا ہے، مثلاً اصبہان میں ایک لاکھ حدیثیں املا کرانے کے بعد جب ان کو اپنی بعض غلطیوں کا پتہ چلا تو انھوں نے ان کو تسلیم کر لیا اور اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت کی کہ وہ بھی ان کی تصحیح کر لیں۔

امام احمد نے بھی ان کی اس خوبی کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے تھے۔

وفات: مشہور روایت کے مطابق ۷۲ سال کی عمر میں ۲۰۴ھ میں ان کا انتقال ہوا، بعض لوگوں نے صفر اور بعض نے ربیع الاول ۲۰۴ھ کا مہینہ بتایا ہے، ۲۰۳ھ اور ۲۱۴ھ بھی سنہ وفات بتایا جاتا ہے لیکن یہ غلط ہے، اس زمانہ کے حاکم بصرہ یحییٰ بن عبداللہ بن عمر نے نماز جنازہ پڑھائی''(۲)

مسند طیالسی: مسانید کے جو مجموعے مشہور و متداول ہیں، ان میں ایک ابوداؤد طیالسی کی مسند بھی ہے، اس کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ وہ دوسرے مسانید کے مقابلہ میں قدیم ہے، بعض علما نے اس کو سب سے قدیم مسند بتایا ہے(۳) حاکم صاحب مستدرک فرماتے ہیں کہ ''علمائے اسلام میں عبیداللہ موسیٰ اور ابوداؤد طیالسی نے سب سے پہلے تراجم رجال پر مسانید مرتب کیے۔''(۴) لیکن علمائے محققین کی ایک جماعت کو اس رائے سے اتفاق نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ ''عام مصنفین مسانید کے مقابلہ میں ابوداؤد کا زمانہ قدیم ہے، اس لیے لوگوں نے ان کی مسند کو بھی سب سے قدیم سمجھ لیا، حالانکہ اس کی جمع و ترتیب ان کے بعد بعض متاخرین خراسانی حفاظ نے کی ہے،(۵) بہر حال اس کی قدامت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، گو بعض مشہور کتب حدیث کی طرح ان کی مسند کو زیادہ شہرت نصیب نہیں ہوئی

(۱) بستان المحدثین ص ۳۱۔ (۲) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۹ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۴۳۱، والرسالۃ المستطرفہ ص ۵۲ (۴) المدخل فی اصول الحدیث ص ۴۔ (۵) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۴۳۱۔

لیکن اس کو مسانید میں یک گونہ خصوصیت حاصل ہے شاہ ولی اللہ صاحب نے کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔(۱)

ترتیب وتبویب: یہ مسند گیارہ اجزا پر مشتمل ہے، اس کی ترتیب میں بڑی حد تک مسانید کے عام اصول کا لحاظ رکھا گیا ہے، یعنی صحابہؓ کے شرف وتقدم اور سبقت فی الاسلام کے لحاظ سے روایتیں نقل کی گئی ہیں، پہلے خلفائے راشدین، عشرۂ مبشرہ اور کبار صحابہؓ کی حدیثیں ہیں، چھٹے جز کے آخر سے صحابیات کی مرویات کا سلسلہ شروع ہو کر ساتویں جز میں ختم ہوتا ہے، سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ اور اس کے بعد حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ کی روایات ہیں، ہر صحابی کی حدیثیں الگ الگ عنوان سے ہیں، بعض صحابہ کی حدیثیں دو جگہ بھی نقل ہوگئی ہیں، بعض مقامات پر ایک صحابی کی روایتوں میں دوسرے صحابی کی روایتیں بھی خلط ملط ہوگئی ہیں، مسند کی باقاعدہ جمع وترتیب کا کام بعض اہل خراسان نے کیا اور زیادہ تر روایتیں یوسف بن حبیب کے واسطہ سے مروی ہیں۔(۲)

خصوصیات: ۱-اس کی سب سے اہم خصوصیت اس کی قدامت ہے۔

۲-مسند کی اکثر روایتیں دوسری مشہور کتب حدیث میں موجود ہیں۔

۳-کہیں کہیں آثار صحابہ بھی نقل کیے گئے ہیں۔

۴-حدیث کی کتابوں کے عام خصوصیات مثلاً رواۃ کے ناموں کے متعلق مختلف قسم کی وضاحتیں، کثرتِ طرق، تعددِ اسناد، اختلاف الفاظ ومعانی یا خاص اضافہ وکمی کا ذکر، روایتوں کے باہمی فرق، رواۃ کے سہو ونسیان، روایات کے درجہ وحیثیت کی تشریح، دو روایتوں کے درمیان ترجیح، روایات کی تصویب وتخطیہ، ان کے یا راویوں کے متعلق اپنے یا شیوخ کے شک وتردد کا اظہار، مشکل الفاظ، روایات کے ابہام اور مفہوم کی وضاحت اور ان کے بعض خاص پہلوؤں اور نکتوں کی تشریح وغیرہ اس میں بھی موجود ہیں۔

یہ مسند پہلی مرتبہ مطبع دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوئی

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ ج۱ص ۱۰۷ (۲) کشف الظنون ج ۲ص ۱۴۴۱۔

ہے، صفحات کی تعداد ۳۹۲ ہے، ارکان دائرہ نے حاشیے میں متعدد کتب حدیث خصوصاً مسند احمد، سنن ترمذی اور سنن ابی داؤد سے اس کی حدیثوں کی مطابقت یا اختلاف کو دکھایا ہے اور کہیں کہیں لغات اور بلاد واماکن وغیرہ کی بھی مختصر تشریح کی ہے، خاتمہ میں مسند کے قدیم نسخہ سے اس نسخہ کے اختلاف کا مقابلہ کیا گیا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ ساتویں صدی ہجری سے قبل کا خدابخش خاں لائبریری میں موجود ہے، شیخ عبدالرحمٰن بنا ساخاتی نے مسند احمد کی طرح اس کو بھی فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے، اسی کے ساتھ موصوف نے اس کی .... ''المحمود علی منحۃ المعبود'' کے نام سے تصحیح و تعلیق لکھی ہے، اصل و تعلیق دو جلدوں میں مطبع میمنہ مصر سے شائع ہوئی ہے۔

بعض اعتراضات اور ان کا جواب: ابوداؤد طیالسی پر سہو وخطا اور تدلیس کے اعتراضات بھی ملتے ہیں۔

۱- خطا: ابوحاتم، ابراہیم جوہری، ابن سعد اور علامہ ذہبی وغیرہ نے ان کی بھول چوک اور خطا ونسیان کا ذکر کیا ہے، مگر ان سے ابوداؤد کے حفظ وضبط، علم وفضل اور ثقاہت میں فرق نہیں آتا، خطا ونسیان تو بشریت کا خاصہ ہے، جس سے کوئی محدث بھی بری نہیں، چنانچہ ان پر جن لوگوں نے اعتراض کیا ہے وہ بھی ان کو ثقہ اور ضابط مانتے ہیں، فلاس کا بیان ہے کہ ''میں جانتا ہوں کہ علامت منافق والی حدیث میں کسی نے ان کی متابعت نہیں کی ہے تاہم اس کے باوجود وہ ثقہ وضابط ہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ محدثین اور علمائے فن کے نزدیک سہو وخطا کرنے والا متروک الحدیث نہیں سمجھا جاتا، ائمہ صحاح کی کتابوں میں بھی ایسے رواۃ کی روایتیں موجود ہیں، اس لیے یہ الزام خواہ صحیح ہو یا غلط، اس سے ابوداؤد کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا، یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ابوداؤد طیالسی کے حافظہ میں حدیثوں کا بڑا ذخیرہ محفوظ تھا اور وہ اپنی

(۱) تہذیب التہذیب ج۴ ص۱۸۶۔

یادداشت سے حدیثیں بیان کرتے تھے، اس لیے ان سے بھول چوک کا ہو جانا تعجب انگیز نہیں ہے، ابن عدی کہتے ہیں کہ ''جو شخص محض یادداشت سے ۴۰ ہزار حدیثیں بیان کرے اس سے بعض روایتوں میں اس طرح کے سہو خطا کا ہو جانا کہ جس روایت کو دوسرے موقوفاً بیان کرتے ہوں وہ اس کو مرفوعاً یا جس کو لوگ مرسلاً بیان کرتے ہوں وہ اس کو موصولاً بیان کر دے، بعید اور تعجب خیز نہیں کیوں کہ اس کا تمام تر دارومدار حافظہ پر ہوتا ہے، باقی ابوداؤد نہ صرف میرے بلکہ دوسرے لوگوں کے نزدیک بھی متیقظ اور ثابت ہیں، (۱) امام احمد سے ایک مرتبہ کسی نے ان کی غلطیوں کا ذکر کیا تو فرمایا ان کی غلطی کو غلطی نہیں کہنا چاہیے، خطا کا الزام اس وقت ان پر درست ہوسکتا ہے جب ان سے ان کی غلطی کا تذکرہ کیا جائے اور وہ متنبہ نہ ہوں لیکن ان کا یہ حال ہے کہ ان سے جس وقت ان کی غلطی کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ فوراً متنبہ ہو جاتے اور سمجھ لیتے ہیں، (۲) دوسرے مورخین اور ائمہ تعدیل نے بھی اس قسم کی توجیہ بیان کی ہے۔

۲- تدلیس: دوسرا اعتراض تدلیس کا ہے، یعنی وہ ایک راوی کی روایت کو دوسرے کی طرف منسوب کر دیتے تھے، محمد بن منہال فرماتے ہیں ''ابوداؤد نے ہم سے ابن عون کے واسطہ سے ۲۰ سے کچھ زیادہ حدیثیں بیان کیں، مگر ان میں سے ایک کے علاوہ جس کو میں نہیں جانتا تھا باقی حدیثیں یزید بن زریع کی تھیں۔ (۳)

حافظ ابن حجر نے دو اور واقعے نقل کیے ہیں، ان میں سے ایک ان ہی محمد بن منہال کے واسطہ سے اور دوسرا امام دارقطنی کی کتاب الجرح والتعدیل سے ماخوذ ہے، ان تینوں واقعات سے خود ظاہر ہے کہ ابوداؤد نے غلطی سے روایت کا انتساب اصل راوی کے بجائے دوسرے کی جانب کر دیا ہے، خود حافظ ابن حجر نے جو ان واقعات کے ناقل ہیں،

(۱) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۶ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۴۱۳ (۲) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۶ (۳) ایضاً ص ۲۵ و تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۴۔

انھیں تحریف وتدلیس کے بجائے سہو ونسیان پر محمول کرنے کی کوشش کی ہے اور بجز ایک قلیل جماعت کے جمہور کا متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ تدلیس میں کوئی عیب نہیں ہے" سفیان ثوری جیسے بزرگ جو امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے ہیں اور بہت سے اہل کوفہ بھی تدلیس کرتے تھے، ابن صلاح لکھتے ہیں:

''صحیح یہ ہے کہ مدلس جس چیز کو لفظ محتمل سے روایت کرے اور سماع واتصال کی وضاحت نہ کرے تو اس کا حکم مرسل اور اس کی قسموں جیسا ہے لیکن جس روایت کو ایسے الفاظ سے بیان کیا جائے جن سے اتصال کی صراحت ہوتی ہے جیسے سمعت، حدثنا، اخبرنا وغیرہ تو وہ مقبول اور قابل حجت ہے، صحیحین وغیرہ کتب معتبرہ میں بھی اس قسم کی بے شمار روایتیں ہیں، جیسے قتادہ، اعمش، سفیانین اور ہشام بن بشیر وغیرہ کے واسطہ سے اور یہ اس بنا پر کہ تدلیس دراصل کذب نہیں بلکہ ایک طرح کا ابہام ہے جو لفظ محتمل کی بنا پر ہوتا ہے۔''(۱)

☆☆☆

(۱) مقدمۂ ابن صلاح ص ۳۵۔

امام عبدالرزاق بن ہمام

(متوفی ۲۱۱ھ)

نام ونسب: عبدالرزاق نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عبدالرزاق بن ہمام بن نافع۔

ولادت، وطن اور خاندان: یمن کے مشہور شہر اور پایہ تخت صنعا میں ۱۲۶ھ میں پیدا ہوئے، قبیلۂ حمیر سے ولا کا تعلق تھا، صنعانی حمیری کی نسبتوں سے زیادہ مشہور اور یمنی بھی کہے جاتے تھے۔ (۱)

اساتذہ: بلند پایہ محدثین اور کبار ائمہ فن میں ابن جریج، امام اوزاعی، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن ابی سبرۃ، امام مالک، معتمر بن سلیمان، معمر بن راشد ازدی اور ہیثم بن بشر واسطی وغیرہ سے اعزہ و متعلقین میں اپنے والد ہمام اور چچا وہب سے اور دوسرے علما ومشائخ میں ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ، اسماعیل بن عیاش، ایمن بن نابل، ثور بن یزید کلاعی، جعفر بن سلیمان، داؤد بن قیس فرار، زکریا بن اسحاق مکی، سعید بن بشیر، سعید بن عبدالعزیز، عبدالرحمٰن بن زید اسلم، عبدالعزیز بن ابی زیاد عبداللہ بن زیاد بن سمعان، عبداللہ بن عمر عمری اور ابو معشر، نجیح سندی وغیرہ سے شرف تلمذ حاصل ہے، معمر ازدی سے خاص تعلق تھا، سات آٹھ سال تک مستقل ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ (۲)

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں خود ان کے بعض شیوخ ابن عیینہ اور معتمر بن سلیمان معاصرین

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۵۴۳، ۵۴۴، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۳، مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۵۲، تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۳۱۴، بستان المحدثین ص ۴۸ (۲) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۳۱۱۔

واقران میں ابواسامہ حماد بن سلمہ اور وکیع ، ائمہ اسلام اور ناقدین حدیث میں امام احمد، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی، محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن معین اور دوسرے مشہور لوگوں میں ابراہیم بن موسیٰ، ابومسعود رازی، احمد بن صالح، احمد بن منصور رمادی، احمد بن یوسف سلمی، اسحاق بن ابراہیم دبری، اسحاق بن ابراہیم سعدی، اسحاق بن منصور کوسج، حجاج بن شاعر، حسن بن علی خلال، زہیر بن حرب، سلمہ بن شبیب، عبد بن حمید، عبداللہ بن محمد مسندی، عبدالرحمٰن بن بشر، عمرو الناقد، محمد بن رافع، محمد بن مہران حمال، یحییٰ بن جعفر بیکندی اور یحییٰ ابن موسیٰ وغیرہ شامل ہیں۔(۱)

رحلت وسفر: مورخین نے تجارت کے لیے شام اور حج وزیارت کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے جانے کا ذکر کیا ہے،(۲) مگر حدیث کی طلب وجستجو کے لیے سفر کی تصریح نہیں کی ہے، ان کے مشائخ کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے مشہور اور اہم مراکز کا سفر ضرور کیا ہوگا۔

مقبولیت ومرجعیت: ان کے فضل وکمال اور علمی عظمت نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کے علاوہ کسی اور شخص کے پاس اس قدر زیادہ لوگ سفر کر کے نہیں آئے، اکثر علمائے اسلام ان کی بارگاہ کمال میں حاضر ہوئے تھے۔(۳) مورخ یافعی نے ان کو المرتحل الیہ من الآفاق یعنی وہ شخص جس کے پاس لوگ مختلف اطراف واکناف سے آتے تھے، لکھا ہے۔(۴)

اعتراف کمال: علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے ان کو مخزن علم بتایا ہے، ایک مرتبہ امام احمد سے پوچھا گیا کہ ان سے زیادہ بہتر اور برتر محدث کا آپ کو علم ہے؟ فرمایا نہیں ان کے معاصر ہشام کو اعتراف تھا کہ ''ہم لوگوں میں سب سے زیادہ صاحب علم عبدالرزاق ہیں۔(۵)

(۱) تہذیب التہذیب ج۶ ص۳۱۱ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۳۳۴ (۳) تاریخ ابن خلکان ج۱ ص۵۴۳ وکتاب الانساب ورق ۳۵۵، تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۳۳۴ (۴) مرآۃ الجنان ج۲ ص۵۲ (۵) مرآۃ الجنان ج۲ ص۵۳ و۱۱۱و۱۱۲۔

حفظ وضبط: ابراہیم بن عباد دیری کا بیان ہے کہ عبدالرزاق کو ۱۷ ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں، ہشام بن یوسف فرماتے ہیں ''ہم لوگوں میں سب سے بہتر حافظ ان کا تھا۔''

ثقاہت: ان کی ثقاہت پر علما کا اتفاق ہے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ بے شمار اہل حدیث نے ان کو ثقہ اور متقن کہا ہے، ابوحاتم فرماتے ہیں کہ ''عبدالرزاق کی حدیثیں لکھے جانے اور احتجاج کے لائق ہیں'' ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ ان کی حدیثیں ثابت اور معتبر ہیں، ابن حبان یعقوب بن شیبہ آجری، عجلی اور بزار وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، اور ذہلی وغیرہ نے ان کو احادیث کے معاملہ میں بڑا متیقظ قرار دیا ہے، امام احمد سے ابن جریج کے شاگردوں میں ان کے اور برسانی کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا عبدالرزاق زیادہ ثقہ اور معتبر ہیں، مشہور محدث معمر کی حدیثوں کے سب سے بڑے حافظ اور سب سے زیادہ مستند راوی یہی تھے، یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ معمر کی حدیثوں کے لئے عبدالرزاق سے زیادہ بہتر اور معتبر کوئی نہیں، امام احمد کے نزدیک معمر کی عبدالرزاق کے واسطہ سے مروی حدیثیں بصریوں کے توسط سے مروی روایات سے زیادہ بہتر ہیں اور جب ان کی کسی حدیث کے متعلق ان کے تلامذہ مختلف الرائے ہوتے تھے تو عبدالرزاق کی روایت کو قبول کرتے تھے۔ (۱)

پیشہ: عبدالرزاق تجارت پیشہ تھے، اور بسلسلۂ تجارت شام جایا کرتے تھے۔

شعروسخن: شعروسخن کا ذوق تھا، اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

فذاك زمان لعبنا به   وهذا زمان بنا يلعب

ترجمہ: ایک وہ زمانہ تھا جس سے ہم کھیلتے تھے اور اب یہ زمانہ ہے جو ہم سے کھیل کررہا ہے۔

وفات: ۸۵ سال کی عمر میں جبکہ ہوش وحواس بجا نہیں رہتے تھے ۲۱۱ھ میں وفات پائی، ابن

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۴، تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۴، ۳۱۶ بستان المحدثین ص ۴۸۔

سعد کے بیان کے مطابق شوال کا مہینہ تھا۔

تصنیفات

حافظ عبدالرزاق متعدد کتابوں کے جامع ومصنف بھی تھے، مگر ان میں سے اکثر معدوم ونایاب ہیں، بعض کے نام یہ ہیں: ۱- جامع یا سنن عبدالرزاق، اس کی اکثر حدیثوں کی صحاح میں تخریج کی گئی ہے، ۲- کتاب السنن فی الفقہ، ۳- کتاب المغازی، ۴- تفسیر میں بھی ایک کتاب لکھی تھی، ۵- مصنف، عبدالرزاق کی سب سے زیادہ اہم اور مشہور کتاب ہے، اس کو فقہی ابواب پر مرتب کیا گیا ہے، اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ مصنف کے جو مجموعے موجود ہیں ان میں مصنف ابن ابی شیبہ کے بعد سب سے مشہور یہی ہے اور قدامت کے لحاظ سے یہ اس پر بھی فوقیت رکھتی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اکثر روایتیں ثلاثی ہیں، مصنف عبدالرزاق ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، جرمنی اور حجاز کے کتب خانوں میں اس کے مکمل اور ناقص نسخے موجود ہیں۔

عبدالرزاق پر نقد وجرح: بعض علمائے جرح وتعدیل نے عبدالرزاق پر نقد وجرح بھی کی ہے:

۱- شیعیت: ان کی جانب شیعیت کی نسبت کی جاتی ہے لیکن اس کے متعلق ان کا خود بیان ہے کہ ''مجھے اس بات پر کبھی شرح صدر نہیں ہوا کہ جناب امیر کو شیخین سے افضل قرار دوں'' سلمہ بن شبیب ان کا قول نقل کرتے ہیں کہ ''حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ اور عثمانؓ پر خدا کی رحمت ہو، جس شخص کے دل میں ان بزرگوں کی محبت نہ ہو وہ مومن نہیں، مجھ کو اپنے اعمال میں سب سے زیادہ بھروسہ ان حضرات کی محبت ہی پر ہے'' ابوالازہر فرماتے ہیں کہ

''عبدالرزاق نے بتایا کہ وہ شیخین کی تفضیل کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ خود حضرت علیؓ سے بھی یہی ثابت ہے، وہ اپنے کو شیخین سے افضل اور بہتر کہنے سے منع کرتے تھے، جناب امیر کی شان میں اس سے بڑی اور کیا گستاخی ہوگی کہ ان سے محبت رکھنے کے باوجود ان کے عقیدہ ومسلک کی مخالفت کی جائے، جس چیز کو ان کی شیعیت سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ بعض اکابر کی طرح وہ بھی حضرت علیؓ اور اہل بیت کے بڑے گرویدہ تھے لیکن دوسرے صحابہؓ کے مراتب ودرجات کو اہل سنت ہی کی طرح مانتے تھے، اس لیے ان کے معاصرین اور تلامذہ تک کو ان کی شیعیت کا علم نہ تھا، امام احمد سے ان کے صاحبزادہ عبداللہ نے اس کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میرے کانوں نے ان سے اس طرح کی کوئی بات نہیں سنی ہے، ان کے بارے میں مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہے کہ وہ احادیث سے بڑا شغف رکھتے تھے'' حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان پر شیعیت کا اعتراض کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کی حقیقت صرف اس قدر تھی کہ وہ حضرت علیؓ سے بڑی محبت اور ان کے قاتل سے سخت نفرت کرتے تھے، علمائے جرح وتعدیل نے متفقہ طور پر ان کی توثیق کی ہے اور ان کی روایات کو تسلیم کیا ہے، کتب صحاح میں ان کی روایات اس کا ثبوت ہیں۔

۲-سوء حفظ وفتور عقل: دوسری جرح یہ ہے کہ ضعیفی میں ان کی بصارت زائل ہوگئی تھی اور سوء حفظ اور فتور عقل میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن یہ علت محض آخری دور کی حدیثوں کے لیے قادح اور مانع ہوسکتی ہے اس کے پہلے کی روایات کے ثبوت واعتبار میں اس سے فرق نہیں آتا بلکہ بعض علما نے بڑھاپے کی صرف ان ہی روایتوں کو کمزور کہا ہے جن کو وہ یادداشت سے بیان کرتے تھے۔

بعض اور بھی اعتراضات کیے گئے ہیں لیکن حافظ ابن حجر اور علامہ ذہبی نے ان کو سراسر مہمل اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔

☆☆☆

امام اسد بن موسیٰ

(متوفی ۲۱۲ھ)

نام ونسب: اسد نام اور اسد السنۃ لقب تھا، شجرۂ نسب یہ ہے: اسد بن موسیٰ بن ابراہیم بن ولید بن عبدالملک بن مروان بن حکم۔(۱)

ولادت، وطن، خاندان: ۱۳۲ھ میں اموی حکومت کے زوال وانقراض کے سال مصر میں پیدا ہوئے، خاندان بنوامیہ سے نسبی تعلق تھا، اس لیے اموی اور مصری کہلاتے ہیں۔(۲)

اساتذہ وشیوخ: ان کو جن نامور محدثین اور اکابر فضلا سے شرف تلمذ حاصل ہے اُن کے نام حسب ذیل ہیں:

ابن ابی ذئب، حماد بن سلمہ، روح، شعبہ، شیبان، عبدالعزیز بن ماجشون، لیث بن سعد، محمد بن طلحہ، مسعودی، معاویہ بن صالح اور یونس بن ابی اسحاق وغیرہ۔

تلامذہ: بعض نامور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن صالح مصری، رحیم، ربیع بن سلمان مرادی، عبدالملک بن حبیب، محمد بن عبدالرحیم برقی، مقدام بن داؤد عینی، ابویزید یوسف قراطیسی۔(۳)

طلب حدیث کے لیے سفر: طلب حدیث کے لیے ان کے رحلت وسفر کا ذکر بھی ملتا ہے، علامہ ذہبی وابن حماد حنبلی لکھتے ہیں، رحل فی طلب الحدیث، انھوں نے حدیث کی طلب کے

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۱ص ۳۶۸ (۲) ایضاً وحسن المحاضرہ ج۱ص ۱۴۵ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج۱ص ۳۶۸ تہذیب التہذیب ج۱ص ۲۶۰۔

لیے سفر کیا۔ (العبر ج ا ص ۳۶۱)

حفظ و ثقاہت: اپنے زمانہ صاحب کمال محدثین اور ثقہ و ضابط حفاظ میں شمار کیے جاتے ہیں، علمائے رجال نے الحافظ کے لقب سے ان کا تذکرہ کیا ہے، امام بخاریؒ نے ان کو مشہور الحدیث کہا ہے اور ان کی روایتوں سے استشہاد کیا ہے، اسی طرح امام ابوداؤد اور امام نسائی نے بھی استدلال کیا ہے، امام نسائی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، ابن یونس، ابن قانع، عجلی اور بزار وغیرہ نے بھی ان کی توثیق کی ہے، ابن حبان نے ثقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے، خلیلی لکھتے ہیں ''مصری صالح'' یعنی اسد ابن موسیٰ مصری حدیثوں کے لیے صالح و معتبر تھے، (۱) ابن حماد نے لکھا ہے کہ ''احد الثقات الاکیاس، یعنی وہ ثقہ اور دانشمند لوگوں میں سے ایک تھے۔ (۲)

اتباع سنت: سنت سے خاص شغف تھا، عجلی نے صاحب سنہ کہا ہے، (۳) اسی لیے اسد السنہ کہلاتے تھے۔

وفات: ۸۰ سال کی عمر میں اپنے وطن مصر میں ۲۱۲ھ میں انتقال کیا۔ (۴)

اولاد: حافظ ابن حجر نے سعید نام ایک فرزند کا ذکر کیا ہے، تابعین کے فضائل و مناقب میں ان کی ایک کتاب دو جلدوں میں تھی اس میں انھوں نے اپنے والد اور اس طبقہ کے دوسرے محدثین سے بکثرت روایات کی ہیں۔ (۵)

تصنیفات: اسد السنہ صاحب تصنیفات تھے، (۶) لیکن ان کی تصانیف میں صرف مسند اور کتاب الزہد کا ذکر ملتا ہے، بعض علمائے اسلام نے اس کو سب سے قدیم مسند بتایا ہے، یہ رائے درست ہو یا نہ ہو اتنا مسلم ہے کہ مصر میں سب سے پہلے یہی مسند مرتب کی گئی،

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ا ص ۲۶۰ (۲) شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۷ (۳) تہذیب التہذیب ج ا ص ۲۶۰ (۴) خلاصہ تہذیب تہذیب الکمال (۵) تہذیب التہذیب ج ا ص ۲۶۰ (۶) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۳۶۸۔

علامہ ابن عدی کا بیان ہے کہ مصر میں سب سے پہلے اسد السنہ نے مسند مرتب کی جو یحییٰ بن عبدالحمید حمانی اور مسدد ابن مسرہد بصری سے قدیم العہد تھے، (۱) اس لیے یہ قدیم ترین مسانید میں ہے اوراس کی اہمیت کا سبب اس کی قدامت ہی ہے۔

ایک اعتراض کا جواب: اسد السنہ پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، مثلاً علامہ ابن حزم نے ان کو منکر الحدیث اور ضعیف قرار دیا ہے، ابن یونس نے لکھا ہے کہ وہ منکر حدیثیں بیان کرتے تھے لیکن ان اقوال کی حیثیت شواذ ونوادر کی ہے جو علمائے فن اور ائمہ جرح وتعدیل کی عام توثیق کے مقابلہ میں قابل اعتنا نہیں، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ مجھے ان کے کسی عیب کا حال معلوم نہیں سوائے اس کے کہ ابن حزم نے ان کو ضعیف بتایا ہے لیکن یہ تضعیف مردود اور ناقابل تسلیم ہے، (۲) وہ اور حافظ ابن حجر دونوں لکھتے ہیں۔ واحسب الآفة من غیرہ (۳) یعنی ان کی روایتوں میں جو ضعف وسقم نظر آتا ہے وہ بعد کے دوسرے رواۃ کی وجہ سے ہے۔

☆☆☆

---

(۱) الرسالۃ المستطرفہ ص۵۳، (۲) میزان الاعتدال ج۱ص۹۷، (۳) ایضاً وتہذیب التہذیب ج۱ص۲۶۰۔

امام عبیداللہ بن موسیٰ عبسی

(متوفی ۲۱۳ھ)

نام ونسب: عبیداللہ نام، ابومحمد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، عبیداللہ بن موسیٰ بن ابی المختار باذام(۱)

ولادت وخاندان ووطن: ۱۲۸ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے، قبیلہ عبس کے مولیٰ تھے،(۲) اس لئے کوفی اور عبسی کہلاتے ہیں لیکن علامہ سمعانی کا بیان ہے:

العبسی ..... الی عبس بن بغیض بن ریث بن غطفان ..... عدنان وھی القبیلة المشھورہ التی ینسب الیھا العبسیون بالکوفة۔(۳)	عبسی عبس بن بغیض ..... عدنان کی طرف نسبت ہے اور یہ وہ مشہور قبیلہ ہے جس کی طرف کوفہ کے عبسی منسوب ہیں۔

سید مرتضیٰ زبیدی فرماتے ہیں:

عبس محلة بالکوفة قد نزلھا بنو عبس ومنھا العبسیون المحدثون ومن الضوابط ان من کان من اھل الکوفة فھو	عبس کوفہ میں ایک محلّہ ہے جہاں بنوعبس آکر اترے تھے اور ان ہی میں سے عبسی محدثین ہیں اور یہ قاعدہ کلیہ میں سے ہے کہ جو راوی اہل کوفہ میں

(۱) تقریب التہذیب ص ۱۷۱ وتہذیب التہذیب ج ۷ ص ۵۰ (۲) خلاصہ تذہیب ص ۲۵۳ وتہذیب ج ۷ ص ۵۰ (۳) کتاب الانساب ورق ۳۸۲۔

بالموحدة منسوب الیٰ هذه المحلة۔ (۱) سے ہوتا ہے، وہ بائے موحدہ کے ساتھ اسی محلّہ کی طرف منسوب ہے۔

ان بیانات سے عبیداللہ بن موسیٰ کا عرب نژاد ہونا اور قبیلہ عبس سے ولا کے بجائے نسبی تعلق ظاہر ہوتا ہے،

اساتذہ: ان کے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابن ادم محاربی، ابن جریج، اسرائیل بن یونس، اسماعیل بن ابی خالد، الاعمش، امام اوزاعی، ایمن بن نایل، حسن بن صالح، حنظلہ بن ابی سفیان، زکریا بن ابی زائدہ، سفیان ثوری، شیبان، عبدالعزیز بن سیاہ، عثمان بن اسود، محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، معروف بن خربوذ، موسیٰ بن عبیدہ ربذی، ہارون بن سلیمان فرا، ہشام بن عروہ، یونس بن ابی اسحاق وغیرہ (۲)

تلامذہ: ان کے تلامذہ اور منتسبین کی تعداد بے شمار ہے چند نام یہ ہیں:

ابراہیم بن دینار بغدادی، ابوبکر بن ابی شیبہ، ابوحاتم، ابوسعید اشج، احمد بن ابراہیم دورقی، احمد بن ابی سرح رازی، احمد بن حنبل، اسحٰق بن منصور، اسحاق بن راہویہ، حجاج بن شاعر، حسین علی بن اسود، دارمی، سفیان بن عیینہ، عباس بن عبدالعظیم منذری، عباس دوری عبداللہ بن صباح عطار، عبداللہ بن محمد مسندی، عثمان بن ابی شیبہ، قاسم بن زکریا، محمد بن حسین بن اشکاب، محمد بن سعد کاتب واقدی، محمد بن سلیمان باغندی کبیر، محمد بن عبداللہ بن نمیر، محمد بن یحییٰ ذہلی، محمود بن غیلان، وکیع بن جراح، یحییٰ بن معین، یعقوب سفیان وغیرہ۔ (۳)

خالد بن حمید مہری عمر میں عبیداللہ بن موسیٰ سے بڑے تھے، اس کے باوجود انھوں نے ان سے احادیث روایت کی ہیں، ائمۂ صحاح نے بالواسطہ ان سے حدیثیں بیان کی ہیں، (۴)

---

(۱) تاج العروس ج۴ص۱۸۴ (۲) التہذیب ج۷ص۵۱ (۳) ایضاً ص۵۱ (۴) تہذیب التہذیب ج۵ص۵۱،۵۲۔

حفظ وثقاہت: علمائے فن نے ان کا ''الحافظ'' کہہ کر تعارف کرایا ہے، ابن معین، ابن عدی اور عجلی وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، ابن حبان وابن شاہین نے ثقات میں تذکرہ کیا ہے، ابو حاتم اور ابن سعد ثقہ، صدوق اور حسن الحدیث بتاتے ہیں، ابوداؤد نے ان کو جائز الحدیث اور ابن قانع نے صالح الحدیث کہا ہے، اسرائیل کے مرویات کے سب سے زیادہ معتبر راوی یہی سمجھے جاتے تھے۔(۱)

حدیث میں درجہ: علم حدیث میں ان کا مقام نہایت بلند تھا، علمائے فن کو ان کی اس خصوصیت کا اعتراف ہے، ان کے پاس احادیث کا نہایت وافر ذخیرہ تھا، علامہ ابن سعد نے انھیں کثیر الحدیث لکھا ہے۔

قرأت وتفسیر اور فقہ: وہ حدیث کے علاوہ فن قرأت، تفسیر اور فقہ میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے، حمزۃ، علی بن صالح اور عیسیٰ بن عمر سے علم قرأت کی تحصیل کی تھی اور لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے، علوم قرآنی میں مہارت کی وجہ سے صاحب قرآن کہلاتے تھے۔ عجلی کا بیان ہے کہ ''عالما بالقرآن رأسا فیه (قرآنی علوم کے ماہر ممتاز عالم تھے) اور فقہ میں بھی یک گونہ امتیاز رکھتے تھے، صاحب مرأۃ الجنان کا بیان ہے:

کان اماماً فی الفقه والحدیث والقرآن: یعنی عبیداللہ فقہ، حدیث اور قرآن سے متعلقہ علوم کے امام تھے۔

زہد وعبادت: علم وفضل کی طرح زہد وتقویٰ اور تدین میں بھی ممتاز تھے یافعی لکھتے ہیں، موصوفاً بالعبادة والصلاح (۲) (یعنی وہ عبادت وصلاح سے متصف تھے) علامہ ذہبی کا بیان ہے، کان ذا زهد وعبادة واتقان (۳) (یعنی وہ زاہد، عبادت گذار اور صاحب دیانت تھے)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۵۱، ۵۲ وطبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۷۹ ومیزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۷۰

(۲) مرأۃ الجنان ج ۲ ص ۵۷ وتہذیب التہذیب ج ۷ ص ۵۳، ۵۲ (۳) میزان الاعتدال ج ۲ ص ۷۰۔

وقار: مورخین نے لکھا ہے کہ وہ شرم وحیا کی وجہ سے ہمیشہ نگاہیں نیچی رکھے اور سر جھکائے رہتے تھے، ان کو کبھی ہنسی مذاق کی بات کرتے نہیں دیکھا گیا، نہایت باوقار طریقہ پر رہتے تھے۔(۱)

عقیدہ ومسلک: بعض لوگوں نے ان کو شیعہ لکھا ہے مگر شیعیت اس زمانہ میں تفضیلیت سمجھی جاتی تھی۔

وفات: مامون کے عہد خلافت میں شوال کے آخر یا شروع ذیقعدہ ۲۱۳ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔(۲)

تصنیفات: عبیداللہ کی تصنیفات میں صرف مسند کا پتہ چلتا ہے، اس کی اہمیت کا سبب بھی قدامت ہے، بعض علمائے اسلام نے سب سے قدیم مسند اسی کو قرار دیا ہے لیکن عام لوگوں کا خیال ہے کہ کوفہ میں سب سے پہلے یہی مسند لکھی گئی (۳) علمائے محدثین نے اس کی قدامت کی وجہ سے اس کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ایک شبہ کا جواب: بعض ائمہ جرح وتعدیل نے شیعیت کی وجہ سے ان کی تضعیف کی ہے، امام احمد اور بعض دوسرے علماء نے ان کو صاحب تخلیط اور منکر الحدیث قرار دیا ہے، عثمان بن ابی شیبہ ان کی ثقاہت وصداقت کے معترف ہونے کے باوجود کہتے ہیں کہ وہ سفیان ثوری کی حدیثوں میں قبیح قسم کا اضطراب کرتے تھے لیکن مجموعی طور پر ان کی توثیق کی گئی ہے، علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ "وہ امام بخاری کے شیوخ میں ہیں اور بذات خود نہایت ثقہ بزرگ تھے، البتہ شیعیت سے متہم کیے جاتے تھے" ائمہ صحاح کا ان سے روایت کرنا ان کے ضبط وثقاہت کا بڑا ثبوت ہے۔

---

(۱) میزان الاعتدال ج۲ص۷۰ وتہذیب التہذیب ج۷ص۵۲ وطبقات ابن سعد ج۶ص۲۷۹ (۲) ایضاً (۳) الرسالۃ المستطرفہ ص۵۳۔

امام عبداللہ بن زبیر حمیدی

(متوفی ۲۱۹ھ)

نام ونسب: عبداللہ نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ بن زبیر بن عیسیٰ ابن عبیداللہ۔

خاندان ووطن: ان کا خاندان عربی النسل اور وطن مکہ معظمہ تھا، وہ حمیدی، اسدی، زبیری، قریشی، اور مکی کی نسبتوں سے مشہور ہیں، سب سے مشہور نسبت قریش کے مشہور قبیلہ اسد کے ایک معزز فرد حمید کی جانب ہے۔(۱) سن ولادت کا پتہ نہیں چلتا۔

اساتذہ: حمیدی کے بعض مشہور شیوخ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابراہیم بن سعد، بشر بن بکر تینسی، سفیان بن عیینہ، عبدالعزیز بن حازم، فضیل ابن عیاض، محمد بن ادریس شافعی، مروان بن معاویہ، مسلم بن خالد وکیع اور ولید بن مسلم وغیرہ۔ ان بزرگوں میں سفیان بن عیینہ اور امام شافعیؒ سے ان کو بڑا خاص تعلق تھا، ۱۹، ۲۰ سال تک سفیان کی خدمت میں رہنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا، ان کی دس ہزار حدیثیں حمیدی کو زبانی یاد تھیں، ان کے مرویات کے سب سے زیادہ معتبر اور قابل وثوق راوی سمجھے جاتے تھے، امام شافعیؒ کی صحبت میں بھی ایک عرصہ تک رہے، ان کے ہمراہ مصر تشریف لے گئے اور فقہ کی تکمیل وتخریج کی۔

تلامذہ: حمیدی کے اکثر تلامذہ فن حدیث کے ممتاز ماہرین تھے، بعض کے نام یہ ہیں:

احمد بن ازہر نیشاپوری، اسماعیل بن عبداللہ سمویہ، بشر بن موسیٰ، سلمہ بن شبیب،

(۱) کتاب الانساب ورق ۳۲۔

ابوزرعہ عبیداللہ بن عبدالکریم رازی، عبیداللہ بن فضالہ نسائی، محمد بن احمد قرشی، ابوبکر محمد بن ادریس، ابوحاتم محمد بن ادریس، محمد بن اسماعیل بخاری، محمد بن سنجر، محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم برقی، محمد بن یحییٰ ذہلی، ابوالعباس محمد بن یونس کدیمی، محمد بن یونس نسائی، ہارون حمال، یعقوب بن شیبہ، یعقوب بن سفیان اور یوسف بن موسیٰ قطان، امام بخاری ان کے خاص فیض یافتہ لوگوں میں تھے، اپنی صحیح میں ۷۵ حدیثیں ان کے واسطہ سے روایت کی ہیں۔(۱)

فضل وکمال: ان کے علم وفضل اور امامت پر محدثین اور ارباب فن کا اتفاق ہے، امام احمد اور امام بخاری نے ان کو امام کہا ہے، اسحاق بن راہویہ کا بیان ہے کہ ”ابوعبیدہ، شافعی اور حمیدی ہمارے زمانہ میں امام ہیں، صاحب شذرات لکھتے ہیں کہ وہ مکہ کے مشہور عالم ومحدث اور امام حجت تھے، ذہبی فرماتے ہیں کہ ”حمیدی مشہور اور کبار ائمہ دین میں تھے، ان کا خود بیان ہے کہ عراق میں احمد، خراسان میں اسحاق اور حجاز میں مجھ سے سبقت لے جانے والا کوئی دوسرا نہیں۔

ضبط وثقاہت: ان کی قوتِ حافظہ اور ثقاہت بہت مسلم ہے، امام شافعی کو ان کے غیر معمولی حافظہ کا اعتراف تھا، مورخین نے ان کو کثیر الحدیث لکھا ہے یعنی ان کے علم وحفظ میں احادیث کا وافر ذخیرہ اور وسیع سرمایہ محفوظ تھا، ابن سعد، حبان، حاکم اور ابوحاتم وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے،(۲) امام بخاری کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ ان کی روایت ملنے کے بعد وہ دوسروں کی مرویات کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

فقہ واجتہاد: فقہ وافتا میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا، امام شافعی سے اس کی تحصیل کی تھی اور امام بخاری حدیث کی طرح فقہ میں بھی ان کے شاگرد تھے اور ان سے اس کی تحصیل کی تھی، مکہ کے فقیہ ومفتی کی حیثیت سے حمیدی کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، مصر سے واپسی کے

---

(۱) فتح الباری ص۱۱ (۲) طبقات الشافعیہ ج۱ص ۲۶۳، ۲۶۴ وتہذیب التہذیب ج۵ص ۲۱۶ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۲، ۳۔

بعد وہ یہاں فقہ وافتا کا کام عمر بھر انجام دیتے رہے، صاحب مستدرک لکھتے ہیں وہ مکہ کے مشہور عالم ومحدث اور مفتی تھے، حدیث وفقہ میں ان کا وہی درجہ اور مرتبہ تھا جو امام احمد کا عراق میں تھا۔

زہد وورع: ورع وتقویٰ اور دیانت وپاکبازی میں بھی ممتاز تھے، ابن عدی نے ان کی نیکی اور پاکبازی کا ذکر کیا ہے، ابن حبان نے ان کو صاحب دین وفضیلت لکھا ہے۔

اتباع سنت: اتباع سنت میں بڑا اہتمام تھا، ابن حبان نے ان کو صاحب سنت بتایا ہے۔ (۱) احادیث وآثار سے شدت تمسک کی بناء پر وہ اہل رائے کو ناپسند کرتے تھے، اس کا اندازہ ان کے رسالہ اصول السنہ سے ہوتا ہے۔

عقیدہ ومسلک: عقیدہ وعمل کے لحاظ سے وہ محدثین اور سلف کے مسلک پر عامل تھے، رسالۂ اصول السنہ سے ان کے بعض عقائد واعمال کے متعلق ان کا نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے۔

ایمان: قول وعمل دونوں کا نام ہے، اس میں کمی وبیشی ہوتی ہے، سفیان بن عیینہ کے سامنے ان کے بھائی ابراہیم نے کہا کہ ''ایمان کم نہیں ہوتا'' تو وہ غضبناک ہو گئے اور فرمایا کہ تم بچے ہو، ان مسائل کے بارے میں لب کشائی نہ کرو، ایمان کم بھی ہوتا ہے اور سلب بھی ہو جاتا ہے'' ایمان وعمل کا اعتبار نیت پر موقوف ہے۔

تقدیر: تقدیر کے خیر وشر ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ جو کچھ ہوا ہے اس کا ہونا ضروری تھا اور نہ ہونا ناممکن تھا اور جو کچھ نہیں ہوا ہے اس کا نہ ہونا ممکن نہیں تھا۔

قرآن اللہ کا کلام ہے جو لوگ اس کو مخلوق کہتے وہ مبتدع اور سلف صالحین کے مسلک سے منحرف ہیں۔

رؤیت: موت کے بعد مومنین دیدار الٰہی سے مشرف ہوں گے۔

صفات الٰہی: قرآن کی وہ آیتیں جن میں اللہ کے یدویمین اور استواوتمکن وغیرہ کا ذکر ہے،

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۱۶ وحسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۴۶۔

یا اس قسم کی جو حدیثیں ہیں ان کے مجرد بیان پر اکتفا اور توقف کرنا چاہیے، نہ ان میں کسی اضافہ کا ہم کو حق ہے اور نہ تشریح وتفسیر کا، اس قسم کی آیات واحادیث میں بحث وکلام کرنے والے اہل باطل اور فرقہ جہمیہ ومعطلہ میں شامل ہیں۔

مرتکبین کبائر: کبائر کے مرتکبین کو کافر سمجھنا خوارج کا عقیدہ ہے، گناہ کرنے سے انسان کافر نہیں ہوتا۔

احترام صحابہؓ: مسلمانوں کو صحابۂ کرام کے لیے دعا واستغفار کرنا چاہیے، قرآن مجید میں ہے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ	اے رب بخش دے ہم کو اور ہمارے
سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ	بھائیوں کو جو ہم سے پہلے داخل ہوئے
فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	ایمان میں اور نہ رکھ ہمارے دلوں میں
(الحشر:ع۱)	بیر ایمان والوں کا۔

اگر کوئی شخص ایک صحابی کو بھی برا بھلا کہے تو وہ جادۂ سنت سے منحرف ہے۔(۱)

وفات: اپنے وطنِ مکہ میں ربیع الاول ۲۱۹ھ میں وفات پائی، ۲۲۰ھ بھی سنہ وفات بتایا جاتا ہے۔

تصنیفات: رسالہ اصول السنہ کے علاوہ حمیدی کی دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ کتاب الرد علی النعمان، ۲۔ کتاب التفسیر۔ (۲)

۳۔ مسند: حمیدی کی یہ سب سے زیادہ مشہور کتاب ہے جو گیارہ اجزا اور ۱۲۹۳ حدیثوں پر مشتمل ہے۔ (۳) اس کے رواۃ میں بشر بن موسیٰ اسدی بڑے ثقہ اور نامور محدث تھے، بعض صحابہؓ کے مرویات اس میں شامل نہیں ہو سکے، اس کی اہم خصوصیات

---

(۱) اصول السنہ بر خاتمہ مسند حمیدی مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ج ۲ ص ۵۴۶ تا ۵۴۸ (۲) مقدمہ مسند ج ۱ ص بحوالہ جرح وتعدیل ج اول ق ۱ ص ۴۰ (۳) الرسالۃ المستطرفہ ص ۵۷۔

حسب ذیل ہیں۔

۱- اس کا شمار قدیم ترین کتب مسانید میں شامل ہوتا ہے اور اغلب یہ ہے کہ مکہ میں سب سے پہلے یہی مسند مرتب کی گئی تھی۔

۲- اکثر روایات مرفوع ہیں، موقوف روایتیں کم ہیں۔

۳- صحابہ و تابعین کے آثار کا حصہ بھی اس میں شامل ہے۔

۴- احادیث کے نقل و روایت ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایک ماہر فن کی طرح ان کے متعلق مختلف النوع معلومات بھی درج ہیں۔

مسند کے مخطوطے دار العلوم دیوبند، حیدرآباد کے مکتبہ سعیدیہ و جامعہ عثمانیہ اور دمشق کے دار الکتب الظاہریہ میں موجود تھے، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے ان نسخوں کی مدد سے مسند کو پہلی مرتبہ ۱۹۶۳ء میں تصحیح و تحشیہ کے بعد دو جلدوں میں شائع کیا ہے، خاتمہ پر رسالہ اصول السنہ بھی دیدیا ہے، حواشی میں مشکل الفاظ کی تشریح، اختلاف نسخ اور مختلف کتب حدیث سے اس کی حدیثوں کے باہمی اختلاف و مطابقت وغیرہ کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

حافظ ابن حجر نے مطالب عالیہ میں مسند کے زوائد بیان کئے ہیں۔(۱)

☆☆☆

(۱) مقدمہ مسند حمیدی ص ۲، ۳، ۴، ۹، ۲۰، ۲۱۔

امام سعید بن منصور

(متوفی ۲۲۷ھ)

نام ونسب: سعید نام اور ابو عثمان کنیت تھی، سلسلہ نسب یہ ہے: سعید بن منصور ابن شعبہ۔

وطن: سعید کا سنہ ولادت نہیں معلوم ہو سکا اور وطن کے متعلق بھی اختلاف ہے، ایک روایت کے مطابق وہ جوز جان میں پیدا ہوئے اور بلخ میں نشو ونما پائی، زیادہ مشہور روایت یہ ہے کہ ان کا وطن مرو تھا اور بلخ میں بود وباش اختیار کر لی تھی، طالقان کو بھی ان کا مولد بتایا جاتا ہے، اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ مرو، طالقان اور جوز جان سب بلخ ہی کے قرب ونواح میں تھوڑے سے فاصلہ پر واقع تھے، بلخ جو بعد میں ان کی مستقل قیام گاہ بن گیا تھا خراسان کا مشہور ومردم خیز شہر اور ایک عرصہ تک اس کا پایہ تخت رہا ہے، ان مقامات کی نسبت سے وہ مروزی، طالقانی، بلخی اور خراسانی مشہور ہیں۔(۱)

اساتذہ: سعد بن منصور نے نہایت مقدس علمائے اسلام اور برگزیدہ محدثین سے کسب فیض کیا تھا، مشہور محدث اسماعیل بن علیہ کے مرویات کے سب سے بڑے ناقل ہونے کی وجہ سے ان کے راویہ کہلاتے تھے، امام مالک سے انھوں نے موطا کے علاوہ بہت سی حدیثوں کا سماع کیا تھا، لیث بن سعد اور سفیان بن عیینہ سے بھی ان کو روایت کرنے کا شرف حاصل ہے، دوسرے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵، تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹ خلاصہ تذھیب تہذیب الکمال ص ۱۴۳ کتاب الانساب ورق ۸۹، بستان المحدثین ص ۴۸۔

ابوقدامہ حارث بن عبیدہ، حماد بن زید، داؤد بن عبدالرحمٰن بن ابی الزناد، ابولاحوص سلام بن سلیم، شریک بن عبداللہ، ابوشہاب عبدربہ بن قانع، عبدالعزیز بن ابی حازم، مسلمہ بن دینار، عبیداللہ بن ایاد، فلیح بن سلیمان، مہدی بن میمون، ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن، ہشیم بن بشیر اور ابوعوانہ وضاح بن عبداللہ بزاز وغیرہ۔

تلامذہ: اساتذہ کی طرح ان کے تلامذہ میں بھی نامور علما و محدثین شامل ہیں، امام احمد، امام مسلم اور ابوداؤد اُن کے حلقہ فیض میں داخل تھے، صحاح کی دوسری کتابوں میں بھی سعید کے مرویات بالواسطہ شامل کیے گئے ہیں، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوثور ابراہیم بن خالد کلبی، ابوبکر اثرم، ابوشعیب حرانی احمد بن خلید حلبی، بشر بن موسیٰ، حرب بن اسماعیل کرمانی، حسن بن محمد زعفرانی، عباس بن عبداللہ سندی، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، ابوزرعہ عبدالرحمٰن بن عمرو دمشقی، ابوزرعہ عبیداللہ بن کریم رازی، عمر بن منصور نسائی، ابوحاتم محمد بن ادریس، محمد بن علی بن میمون رقی، ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن موسیٰ وغیرہ۔ (۱)

رحلت وسفر: حدیث کی طلب وجستجو میں ان کے کثرت سفر کو مزی نے وکان حافظا جوالاً اور علامہ ابن حجر نے طاف البلاد کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔ (۲)

عظمت: سعید بن منصور کی علمی عظمت کا اندازہ ان کے اساتذہ اور تلامذہ کے ناموں سے ظاہر ہے، امام احمدؒ ان کے بڑے قدرداں اور مداح تھے اور ہمیشہ عزت واحترام کے ساتھ ان کا ذکر کرتے تھے، محمد بن عبدالرحیم جب ان کی روایت بیان کرتے تو تعریف کرتے اور کہتے حدثنا سعید وکان ثبتا۔ (۳)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹، خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۴۳ کتاب الانساب ورق ۸۹، بستان المحدثین ص ۴۸ (۲) خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۴۳ و تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹ (۳) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹۔

حفظ وثقاہت: علمائے فن ان کے حفظ وثقاہت کے بھی معترف تھے، یحیٰی بن حسان دوسرے محدثین کے مقابلہ میں ان کی فضیلت اور حفظ وضبط کے بڑے قائل تھے، حرب کرمانی کا بیان ہے کہ "سعید نے ہم کو دس ہزار حدیثیں زبانی املا کرائیں، امام احمد ان کو سچا اور صاحب فضل وکمال بتاتے ہیں، ابوحاتم، ابن حبان، ابن نمیر، ابن خراش، ابن قانع اور مسلمہ بن قاسم وغیرہ نے ان کی توثیق وتعدیل کی ہے، خلیلی کہتے ہیں کہ ان کی ثقاہت پر اتفاق ہے، حافظ ذہبی نے ان کو الحافظ الثقة اور الحافظ الامام الحجة لکھا ہے، ابن عماد کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور مشہور محدثین میں تھے۔ (۱)

وفات: آخر عمر میں انھوں نے مکہ معظمہ میں مستقل قیام کرلیا تھا اور یہیں تقریباً ۸۹ سال کی عمر میں مشہور اور صحیح روایت کے مطابق ۲۲۷ھ میں وفات پائی۔ (۲)

تصنیفات: سعید بن منصور صاحب تصانیف تھے (۳) مگر ان کی کتابیں معدوم ہیں، صرف ایک کتاب سنن کا ذکر ملتا ہے لیکن یہ بھی طبع نہیں ہوئی ہے، سنن کو انھوں نے آخر عمر میں مکہ معظمہ کے زمانہ قیام میں مرتب کیا تھا (۴) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بڑی چھان بین محنت واحتیاط اور حذف وترمیم کے بعد مرتب کی گئی تھی، اس لئے نہایت مستند اور معتبر ہوگی، احمد بن مخدہ اور محمد بن علی بن صائغ نے اس کی روایت کی ہے، اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اکثر روایتیں ثلاثی ہیں (۵) اور اہمیت کا حال یہ ہے کہ (جمع فیہ ما تجمع غیرہ) سنن ابی سعید میں جو کچھ اکٹھا کیا گیا، دوسرے مجموعہ احادیث ان سے خالی ہیں، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵، تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹، ۹۰ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۳۹۱ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۶۲ (۲) طبقات ابن سعد قسم اول جزء ۵ ص ۳۶۷، العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۳۹۹ (۳) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۹۰ (۴) الرسالۃ المستطرفہ ص ۳۱ (۵) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹، بستان المحدثین ص ۴۷۔

صاحب السنن المشھورۃ التی لایشارکه فیھاالا القلیل (۱) — وہ اس مشہور سنن کے مصنف ہیں جو بے نظیر اور عدیم المثال ہے۔

نقد وجرح: سعید بن منصور کے متعلق علامہ ذہبی نے یعقوب فسوی سے روایت کی ہے کہ ''وہ اپنی غلطی جان لینے کے بعد بھی اس سے رجوع نہیں کرتے تھے لیکن ان کی عام مدح وتوصیف کے متعلق اتنے کثرت سے اقوال منقول ہیں کہ ان کے مقابلہ میں اگر فسوی کا قول صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں اور اس سے سعید کے مرتبہ وعظمت میں کوئی فرق نہیں آتا، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''ایسا وہ اس لیے کرتے تھے کہ ان کو اپنی کتاب کی صداقت وصحت پر پورا اعتماد اور وثوق تھا۔'' (۲)

☆☆☆

(۱) خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۴۳ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۹۹ (۲) میزان الاعتدال ج ۱ ص ۳۹۱ وتقریب التہذیب ص ۹۴۔

امام محمد بن صباح دُولابی

(متوفی ۲۲۷ھ)

نام ونسب: نام محمد، ابوجعفر کنیت، بزاز لقب اور والد کا نام صباح ہے، اس سے زیادہ نسب نامہ کی تفصیل نہیں معلوم ہوسکی۔

ولادت: مورخین اور علمائے طبقات ورجال نے ان کے سنہ ولادت کی تصریح نہیں کی ہے لیکن ان کی وفات ۲۲۷ھ میں ہوئی اور خطیب نے لکھا ہے کہ اس وقت ستر ۷۰ سال سے زیادہ عمر تھی، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ وفات کے وقت ۷۷ سال کے تھے،(۱) اس اعتبار سے وہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

خاندان: ان کے خاندان کا قبیلہ مزنیہ سے ولاء کا تعلق تھا،(۲) اسی بنا پر مزنی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

وطن: ان کی نسبت دولابی کے متعلق اختلاف ہے، بعض لوگوں کے نزدیک دولاب رے کے ایک گاؤں کا نام ہے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے(۳) علامہ سمعانی کا خیال ہے کہ دولاب رہٹ اور چرخی کو کہتے ہیں جو شخص اس کا پیشہ کرتا ہو یا جس کے پاس چرخی ہو اسے دولابی کہا جاتا ہے، ابوجعفر محمد بن صباح کو بھی اسی بنا پر دولابی کہا جاتا ہے،(۴) یاقوت حموی کے نزدیک دولاب نام کے متعدد مقامات تھے، ابوجعفر دولابی کا تعلق دولاب مبارک سے تھا جو بغداد کے مشرقی جانب واقع ہے،(۵) آخر میں انھوں نے بغداد میں سکونت اختیار

(۱) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۷ ومیزان الاعتدال ج ۳ ص ۷۴ وتہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۳۱

(۲) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۵ وتہذیب ج ۹ ص ۲۲۹ (۳) میزان ج ۳ ص ۷۴ وتہذیب ج ۹ ص ۲۳۰

(۴) کتاب الانساب ورق ۲۳۴ (۵) معجم البلدان ج ۴ ص ۱۰۳۔

کر لی تھی۔(۱)

اساتذہ: ابوجعفر دولابی نے نہایت برگزیدہ اور جلیل القدر محدثین سے احادیث کی روایت کی ہے، بعض شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن سعد، ابن ابی عبیدہ حداد، اسماعیل بن جعفر، اسماعیل بن زکریا خلقانی، اسماعیل بن علیہ، حفص بن غیاث، خالد بن عبداللہ واسطی، سعید بن محمد وراق، سفیان بن عیینہ، قاضی شریک بن عبداللہ، عبدالرحمٰن بن ابی الزناد، عبداللہ بن مبارک، عمر بن یونس یمامی، ابوقطن عمرو بن ہشیم، فضل بن موسیٰ سینانی، ہشیم بن بشیر، ولید بن ابی ثور، ولید بن مسلم، یزید بن ہارون، یوسف بن یعقوب، ماجشون وغیرہ۔

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں بھی ممتاز محدثین شامل ہیں، چند کے نام یہ ہیں:

ابراہیم حربی، ابراہیم بن ہانی، ابراہیم بن یعقوب جوز جانی، ابن ابی خشیمہ، ابن ابی الدنیا، ابوحاتم رازی، ابوزرعہ دمشقی، ابوزرعہ رازی، ابوقدامہ سرخسی، احمد بن حنبل، ابویعلی احمد بن علی موصلی، احمد بن محمد بن صباح، احمد بن منصور رمادی، احمد بن یحییٰ حلوانی، اسماعیل سمویہ، حسن بن علی خلال، حسن بن محمد صباح زعفرانی، داؤد بن سلیمان دقاق، عبداللہ بن حنبل عبدالملک بن عبدالحمید میمونی، عثمان بن سعید دارمی، عیسیٰ بن عبداللہ طیالسی، فضل بن سہل اعرج، ابوالعلا محمد بن احمد جعفر، محمد بن بشیر بن مطر، محمد بن غالب تمتام، محمد بن یحییٰ حرانی، محمد بن یحییٰ ذہلی، یحییٰ بن معین وغیرہ۔(۲)

ائمہ صحاح اور اصحاب سنن میں، امام بخاری، امام مسلم اور ابوداؤد نے راہ راست اور دوسرے ائمہ نے امام بخاری کے واسطے سے ان سے روایت کی ہے، صحیح بخاری میں ۱۲ اور صحیح مسلم میں ۲۰ حدیثیں ان کے واسطہ سے مروی ہیں۔(۳)

---

(۱) تاریخ بغداد ج۵ ص۳۶۵، ص۳۶۶ وتہذیب التہذیب ج۹ ص۲۲۹وص۲۳۰ (۲) تاریخ بغداد ج۵ ص۳۶۵، ۳۶۶ وتہذیب التہذیب ج۹ ص۲۲۹، ۲۳۰ (۳) تہذیب التہذیب ج۹ ص۲۳۰، ۲۳۱۔

حفظ وثقاہت: علمائے فن نے باتفاق ان کو ثقہ وضابط قرار دیا ہے، امام احمد فرماتے تھے کہ وہ ہمارے شیخ اور نہایت ثقہ بزرگ ہیں، ابن معین کا بیان ہے کہ دولابی ثقہ ومامون تھے، احمد عجلی نے ان کو ثقہ، ابوحاتم نے ثقہ، قابل حجت اور مستند کہا ہے اور ابن حبان نے ثقات میں شامل کیا ہے، تمام جب ان کے واسطہ سے حدیث بیان کرتے تو کہتے، ہم سے محمد بن صباح دولابی نے جو ثقہ ومامون تھے، روایت کی ہے، یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ، صاحب حدیث اور ہشیم کے مرویات کے سب سے زیادہ ممتاز عالم تھے، سلمہ نے ان کو ثقہ اور مشہور محدث اور ذہبی نے ثقہ وحجت قرار دیا ہے۔(۱)

زہد وتقویٰ: تدین وتقویٰ اور زہد وصلاح میں بھی نہایت ممتاز تھے، علامہ ابن عدی فرماتے ہیں کہ وہ بڑے صالح اور نیک بزرگ تھے۔(۲)

عزت واحترام: علمی ودینی حیثیت سے ان کی شخصیت اتنی ممتاز تھی کہ علما وصلحا ہر طبقہ میں یکساں مقبول تھے، امام احمد ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔(۳)

وفات: تقریباً ۷۷ سال کی عمر میں بغداد میں محرم ۲۲۷ھ میں انتقال کیا۔(۴)

اولاد: مورخین نے ان کے ایک صاحبزادے احمد کا ضمناً تذکرہ کیا ہے، جو بڑے صاحب کمال محدث تھے۔(۵)

تصنیفات: ان کی تصنیفات میں ایک مجموعہ سنن کا مورخین اور علمائے طبقات ورجال نے ذکر کیا ہے(۶)، ذہبی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنن واحکام سے متعلقہ روایات کا یہ ایک(۷) مختصر مگر منتخب اور مستند مجموعہ تھا۔

---

(۱) ایضاً وتاریخ بغداد ج۵ص۳۶۶ومیزان الاعتدال ج۳ص۴۷ (۲) تہذیب ج۹ص۲۳۱ (۳) ایضاً ص۲۳۰ (۴) تہذیب ص۲۳۱ ومیزان ج۳ص۴۷وتاریخ بغداد ج۵ص۳۶۶، ۳۶۷ (۵) کتاب الانساب ورق ۲۳۴...............وتاریخ بغداد ج۵ص۳۶۶ (۶) البدایہ والنہایہ ج۱۰ص۲۹۹ (۷) العبر ج۱ص۳۹۹۔

امام یحییٰ بن عبدالحمید حمانی

(متوفی ۲۲۸ھ)

نام ونسب: یحییٰ نام ابوزکریا کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: یحییٰ بن عبدالحمید بن عبدالرحمٰن ابن میمون بن عبدالحمید۔(۱)

حافظ ابن حجر نے عبدالرحمٰن اور آخری عبدالحمید کے بجائے عبداللہ اور عبدالرحمٰن لکھا ہے(۲) یحییٰ کے والد بھی اکابر محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں، اور ان کے پردادا میمون کا لقب کشمین تھا۔(۳)

خاندان ووطن: قبیلہ حمان سے نسبی تعلق رکھتے تھے، یہ قبیلہ کوفہ میں آباد ہوگیا تھا جو یحییٰ کا وطن ہے اسی لئے وہ کوفی اور حمانی کی نسبتوں سے مشہور ہیں۔

پیدائش: ان کے سنہ ولادت کی تعیین وتصریح کتابوں میں نہیں ہے، قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۵ھ اور ۱۶۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔

اساتذہ: اپنے والد ماجد عبدالحمید کے علاوہ انھوں نے جن نامور محدثین سے اکتساب فیض کیا تھا ان کے نام حسب ذیل ہیں:

ابراہیم بن سعد، ابواسرائیل ملائی، ابوبکر بن عیاش، ابوخالد الاحمر، ابوعوانہ، ابومعاویہ

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۶۷ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۴۳ (۳) تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۶۷ ومقدمہ فتح الباری ص ۴۱۵۔

ضریر جریر بن عبدالحمید، جعفر بن سلیمان، حکیم بن ظہیر، حماد بن زید، خالد بن عبداللہ، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن بلال، شریک بن عبداللہ، عبدالرحمٰن بن زید، عبدالرحمٰن بن غسیل، عبداللہ بن مبارک، عبدالواحد بن زیاد، قیس بن ربیع، ہشام، وکیع اور یحییٰ بن یمان وغیرہ۔

تلامذہ: ان کے حلقہ فیض سے جو اہم اور جلیل القدر محدثین وابستہ تھے، ان کے نام یہ ہیں:

ابوبکر بن ابی الدنیا، ابوحاتم، ابوقلابہ قاشی، ابویعلی موصلی، احمد بن یحییٰ حلوانی، حمدان بن علی وراق، عبداللہ بن احمد دورقی، عبداللہ بن محمد بغوی، عثمان بن خرزاذ، علی بن عبدالعزیز بغوی، قسیم ابن عباد ترمذی، محمد بن ابراہیم بوشنجی، محمد بن ایوب، محمد بن حسین وداعی، محمد بن عبید بن ابی الاسد، موسیٰ بن اسحاق انصاری اور موسیٰ بن ہارون وغیرہ۔ (۱)

سفر: طلب حدیث کے لئے ان کے سفر وسیاحت کا بھی ذکر ملتا ہے، خطیب نے بغداد جانے کی تصریح کی ہے۔

حدیث میں درجہ: وہ بلند پایہ اور نامور محدث تھے، ان کے اساتذہ میں سفیان بن عیینہ وغیرہ ان کے علم وفضل اور حدیث میں کمال کے معترف تھے، علامہ ذہبی اور خطیب نے احد ارکان الحدیث اور احد المحدثین کے الفاظ سے ان کا تعارف کرایا ہے۔ (۲)

حافظہ: ان کی قوت حفظ غیر معمولی تھی، ائمہ فن نے الحافظ، الحافظ الکبیر وکان من اعیالی الحفاظ (۳) وغیرہ الفاظ سے انھیں موسوم کیا ہے، ابن معین کا بیان ہے کہ کوفہ میں ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں تھا، شریک کے مرویات خاص طور پر انھیں حفظ تھے، ایک روایت کے مطابق ان کی سات ہزار حدیثوں کا ذخیرہ یحییٰ حمانی کے پاس تھا۔

ثقاہت: اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، ابن عدی فرماتے ہیں لا بأس به یعنی ان

(۱) کتاب الانساب ص ۱۷۵ و تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۶۷، ۱۶۸ و تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۴۳ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۶۸ والعبر ج ۱ ص ۴۰۴، (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱ و خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۴۲۵۔

کی روایات میں کوئی مضائقہ نہیں، ابن معین نے ان کی ثقاہت کا اعتراف کیا ہے ایک دفعہ فرمایا کہ وہ صدوق تھے، محض حسد کی وجہ سے ان میں کلام کیا گیا ہے لیکن امام نسائی نے انھیں ضعیف اور امام احمد ابن مدینی، ذہلی اور علامہ ابن سعد وغیرہ ائمہ نے ان پر جرح بھی کی ہے (۱) لیکن ان کی اکثریت ان کو ثقہ اور حجت مانتی ہے، امام بخاری تک نے اپنی صحیح میں فضائل قرآن کے ابواب میں ان کے واسطہ سے ایک روایت نقل کی ہے۔ (۲)

وفات: مشہور روایت کے مطابق ان کا انتقال رمضان ۲۲۸ھ میں ہوا (۳) لیکن ابن سعد کا بیان ہے کہ ۲۳۰ھ میں وفات پائی۔ (۴)

تصنیفات: ان کی ایک تصنیف مسند کا پتہ چلتا ہے، جو بہت ضخیم تھی (۵) ابن عدی لکھتے ہیں:

ولـه مسـندصالح ولم ار شيئاً	مسند حمانی نہایت عمدہ اور بہتر ہے
منكرًافي مسنده (٦)	مجھے اس کے اندر کوئی منکر حدیث نظر نہیں آئی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کوفہ میں سب سے پہلے یہی مسند مرتب کی گئی، جو صحیح نہیں معلوم ہوتا، عبید اللہ ابن موسیٰ بھی صاحب مسند ہیں، ان کے اور حمانی کے سنہ وفات میں کم از کم پندرہ سال کا تفاوت ہے، اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ انھوں نے حمانی سے پہلے مسند مرتب کی ہوگی لیکن مسند حمانی کی قدامت بھی مسلم ہے۔

☆☆☆

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۴۴ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۹۶ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۱۵ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱ و خلاصہ تذہیب ص ۴۲۵، تہذیب ج ۱۱ ص ۲۴۸ (۴) طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۸۷ (۵) کتاب الانساب ورق ۱۷۵ (۶) خلاصہ تذہیب ص ۴۲۵ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۹۶۔

امام مسدد بن مسرہد

(متوفی ۲۲۸ھ)

نام ونسب: ابوالحسن کنیت، مسدد لقب اور عبدالملک نام تھا، نسب نامہ یہ ہے، مسدد بن مسرہد ابن مسربل بن ماسک بن حرو بن یزید بن شعیب بن صلیب بن مالک بن اسد بن شریک۔

دوسرا نسب نامہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے: مسدد بن مسرہد بن مسربل بن مغربل بن مرعبل ابن مطربل بن ارندل بن سرندل بن عرندل بن ماسک بن مستورد۔ (۱)

علامہ سمعانی نے دونوں نسب نامے نقل کر کے پہلے کو صحیح بتایا ہے۔ (۲)

ولادت وخاندان: نسبی تعلق عرب کے مشہور قبیلہ بنو اسد سے اور وطن بصرہ ہے، اسی لئے اسدی اور بصری کہلاتے ہیں، (۳) سنہ ولادت کی مورخین اور علمائے طبقات نے کوئی تصریح نہیں کی ہے، اس لئے اس کی تعیین دشوار ہے، قیاس ہے کہ ۱۵۵ھ یا اس سے کچھ پہلے یا بعد میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

اساتذہ وشیوخ: ان کے بعض اکابر شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوالاحوص، ابوعوانہ اسمٰعیل بن علیہ، باذام بن عمرو، جراح بن ملیح جعفر بن سلیمان، بشر بن مفضل، جویریہ بن اسماء، حماد بن زید، حمید بن اسود، خالد بن حارث، خالد بن عبداللہ واسطی، عبداللہ بن یحییٰ بن ابی کثیر عبدالواحد بن زیاد، عبدالوارث بن سعید، عیسیٰ بن یونس، فضیل بن عیاض، قطان، محمد بن جابر سحیمی، معتمر بن سلیمان، مہدی بن میمون

(۱) شذرات الذہب ج ۲ ص ۶۶ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۲ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۰۷،

وکیع، ہشیم، یزید بن زریع اور یوسف بن ماجشون وغیرہ۔(۱)

تلامذہ: بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن یعقوب جوزجانی، ابوحاتم رازی، ابوخلیفہ جمحی، ابوزرعہ رازی، احمد بن محمد بن مدریہ، قاضی اسمٰعیل بن اسحٰق، حسن بن احمد کرہانی، حماد بن اسحٰق، محمد بن سعید وندانی، معاذ بن مثنی، یعقوب بن شیبہ، قاضی یوسف بن یعقوب وغیرہ۔

ائمہ صحاح میں امام بخاری نے بلاواسطہ اور امام ترمذی نے بالواسطہ اور امام ابوداؤد نے دونوں طریقوں پر ان سے روایت کی ہے۔(۲)

حدیث میں امتیاز: مسدد بن مسرہد کے اساتذہ وتلامذہ کی عظمت سے خود ان کے مقام ومرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے، ان کا اپنے زمانہ کے اکابر فضلا، اور بصرہ کے نہایت مشہور اور جلیل القدر محدثین میں شمار ہوتا ہے۔(۳)

حافظہ: ان کا حافظہ نہایت قوی تھا، محدثین میں وہ ''الحافظ'' کے لقب سے مشہور تھے، عجلی کا بیان ہے کہ ان کی یادداشت اتنی اچھی تھی کہ جب وہ املا کرانے لگتے تو اتنی زیادہ حدیثیں بیان کرتے کہ ہم لوگ لکھتے لکھتے گھبرا جاتے تھے،(۴) ذہبی نے الحافظ الحجة اور ابن عماد نے احد الحفاظ الثقات "لکھا ہے۔(۵)

ثقاہت: ان کی عدالت وثقاہت پر علمائے فن کا اتفاق ہے یحیٰی بن معین روایت کرتے ہیں کہ یحیٰی بن سعید قطان فرماتے تھے کہ ''اگر میں مسدد سے ملتا تو ضرور ان سے حدیثیں نقل و روایت کرتا، بلاشبہ وہ اس کے اہل تھے، ان کا پایہ نہایت بلند اور وہ بڑے ثقہ تھے، ابوحاتم فرماتے ہیں کہ ان کی وہ حدیثیں جو قطان عبداللہ بن عمر کے واسطے سے روایت کرتے ہیں، دنانیر کے مانند ہیں، گویا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو سن رہے ہو۔(۶)

(۱) تہذیب التہذیب ج۱۰ص۱۰۷، (۲) ایضاص۱۰۷، ۱۰۸، (۳) کتاب الانساب ورق ۳۲ (۴) تہذیب التہذیب ج۱۰ص۱۰۸، (۵) تذکرۃ الحفاظ ج۲ص۵ وشذرات الذہب ج۲ص۶۶ (۶) تہذیب التہذیب ج۱۰ص۱۰۸، ۱۰۹۔

امام احمد جیسے بزرگ ان کی عظمت وثقاہت کے مداح ومعترف تھے، ان کے شاگرد رشید میمونی کا بیان ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ مسدد کی اللہ مغفرت کرے کیا ہی عمدہ اور بہتر شیخ تھے، ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ امام احمد نے مجھ سے کہا کہ مسدد سے جو حدیثیں میں بیان کرتا ہوں وہ صحیح اور درست ہیں، اس لئے تم کو ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے، ابن معین، ابوحاتم ابن قلغ عجلی اور امام نسائی وغیرہ ائمہ جرح نے ان کی توثیق کی ہے اور ابن حبان نے ثقات میں تذکرہ کیا ہے، جعفر بن عثمان نے یحییٰ بن معین سے دریافت کیا کہ بصرہ کے کس شخص کی حدیثیں لکھی جائیں تو فرمایا مسدد سے، لاریب وہ ثقہ اور مستند تھے۔ (۱)

وفات: رمضان المبارک ۲۲۸ھ میں جب کہ بوڑھے ہو چکے تھے انتقال کیا۔ (۲)

تصانیف: ان کی تصنیفات میں صرف مسند کا ذکر ملتا ہے، علامہ ذہبی نے اس کے بعض حصوں کا سماع کیا تھا، (۳) یہ مقطوع وموقوف ہر قسم کی روایتوں کا مجموعہ تھا، امام دارقطنی نے سب سے پہلی مسند اسی کو قرار دیا ہے اور ابن عدی کا بیان ہے کہ بصرہ میں مسند لکھنے کا شرف سب سے پہلے مسدد ہی کو حاصل ہوا، (۴) اس مسند کی اہمیت اس کی قدامت کی وجہ سے ہے، تمام اصحاب تراجم وفہرست نے اس کا ذکر کیا ہے اس سے بھی اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

☆☆☆

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۹ وطبقات ابن سعد قسم دوم جز ہفتم ص ۵۷، (۲) العبر ج ۱ ص ۴۰۴ وتذکرہ ج ۲ ص ۹ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۶۶ (۳) العبر ج ۱ ص ۴۰۴ اور الرسالۃ المستطرفہ ص ۵۳۔ (۴) تقریب التہذیب ص ۳۴۴ وتہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۰۹۔

امام نعیم بن حماد خزاعی

(متوفی ۲۲۸ھ)

نام ونسب: نعیم نام ابوعبداللہ کنیت، اورنسب نامہ یہ ہے: نعیم بن حماد بن معاویہ بن حارث بن ہمام بن سلمہ بن مالک۔ (۱)

خاندان ووطن: ان کا قبیلہ خزاعہ سے خاندانی اور خراسان کے مشہور شہر مرو سے وطنی تعلق تھا لیکن مصر میں مستقل بودوباش اختیار کرلی تھی اس لئے خزاعی، مروزی اور مصری کی نسبتوں سے منسوب کیے جاتے ہیں۔

اساتذہ وشیوخ: انھوں نے جن نامور علمائے اسلام سے استفادہ کیا تھا، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

ابراہیم بن سعد، ابراہیم بن طہمان، ابوبکر عیاش، ابوحمزہ عسکری، ابوداؤد طیالسی بقیہ بن ولید، جریر بن عبدالحمید، حفص بن غیاث، خارجہ بن مصعب، زبید بن سعد، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن مبارک، عبدالوہاب ثقفی، عیسیٰ بن عبید کندی، فضل بن موسیٰ سنیانی، فضل بن عیاض، نوح ابن ابی مریم، معتمر بن سلیمان اور ہشیم وغیرہ، روح بن عبادہ سے ۵۰ ہزار حدیثوں کا سماع کیا تھا۔ (۲)

تلامذہ: ان کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن جوزجانی، ابوالاحوص عکبری، ابوبکر صنعانی، ابوحاتم رازی، ابواسماعیل ترمذی، احمد بن منصور رمادی، احمد بن یوسف سلمی، اسماعیل سمویہ، بکر بن سہل، میاطی، حمزہ بن محمد بن عیسیٰ بغدادی، علی بن داؤد قنطری، عصام بن رواد بن جراح، عبداللہ بن عبدالرحمن

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۰۶ وتہذیب ج ۱۰ ص ۴۵۸ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۵۸۔

دارمی، محمد بن عوف طائی، محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن معین وغیرہ۔

صحاح ستہ کے مصنفین کے متعلق حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

امام بخاری نے صرف ایک دو موقع پر ان سے روایت کی ہے لیکن اکثر مواقع پر تعلیق کی ہے، امام مسلم نے مقدمہ میں ایک جگہ ان کی روایت لی ہے، بقیہ ائمہ سنن میں امام نسائی کے علاوہ سب نے ان سے بالواسطہ روایتیں کی ہیں۔(۱)

طلب حدیث کے لئے سفر: مورخین لکھتے ہیں کہ طلب الحدیث طلبا کثیرا بالعراق و الحجاز یعنی عراق وحجاز میں نہایت دلچسپی اور انہماک سے حدیث کی تحصیل وتکمیل کی، عراق وحجاز میں ایک عرصہ تک قیام کرنے کے بعد مصر تشریف لائے اور ۴۰ سال کے لگ بھگ وہاں رہے۔(۲)

حفظ وثقاہت: حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان کے لئے مشہور وممتاز تھے، یحییٰ بن معین، امام احمد، عجلی، ابن عدی، اور ابو حاتم وغیرہ متعدد اکابر محدثین اور ائمہ جرح وتعدیل نے ان کی توثیق کی ہے، بعض ائمہ فن نے ان کے وہم وخطا کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اس سے ان کی عدالت وثقاہت میں فرق نہیں آتا، ابن معین وغیرہ کا بھی یہی خیال ہے۔(۳)

فقہ: حدیث کی طرح ان کو فقہ سے بھی بڑی مناسبت تھی اور علم فرائض کے ماہر تھے اسی لئے فرائضی بھی کہلاتے تھے، مورخین نے فقیه عارف بالفرائض اور من اعلم الناس بالفرائض کہہ کر اس کا اعتراف کیا ہے۔

علم وفضل: ان کے علم وفضل کے بھی تمام علماء معترف تھے، علامہ ذہبی وغیرہ نے ان کے متعلق احد علماء العصر (یکتائے روزگار) اور کان من اوعية العلم (خزانہ) علم لکھا ہے۔(۴)

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۵۸ (۲) ایضاً ص ۴۶۲، تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۱۳ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۳۸ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۶۰ تا ۴۶۳ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۰ و ۲۴۱

(۴) تہذیب ج ۱۰ ص ۴۶۳ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۰ و ۲۴۱۔

دینی حمیت: نعیم بن حماد بڑے متبع سنت اور دیندار بزرگ تھے، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ وہ ان لوگوں میں تھے جو سنتوں کے معاملہ میں نہایت متشدد و متصلب تھے اور اہل بدعت واہوا سے سخت متنفر اور بیزار رہتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے وہ خود بھی جہمیہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن ابو عصمہ کے فیض صحبت سے جن کے یہ کاتب تھے اور جو جہمیت سے سخت متنفر تھے ان کو بھی جہمیہ اور اہل اہوا سے سخت تنفر ہو گیا تھا۔(۱)

قید و بند: امام نعیم کی دینی حمیت اور غیرت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ ان سے خلق قرآن کا عقیدہ جبراً قبول کرنے کے لئے کہا گیا لیکن انھوں نے اصحاب دعوت و عزیمت کی طرح اس کو ماننے سے انکار کر دیا، اس کے نتیجہ میں ان کو قید و بند کی مشقت سے دوچار ہونا پڑا اور وہ مصر سے قید کر کے عراق لائے گئے اور بغداد یا سامرا میں قید خانہ میں انتقال کیا۔(۲)

وفات: ۱۳ جمادی الاولی ۲۲۸ھ کو انتقال کیا، ۲۲۷ھ کی بھی روایت کی گئی ہے۔(۳)

تصنیفات: وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں وله المصنفات في السنن وغيرها، (۴) ان کی تصنیفات میں دو کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔

۱- الفتن والملهم: یہ بڑی اہم، مشہور اور اپنے موضوع پر نہایت قدیم کتاب ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔(۵)

۲- مسند: اس کو قدامت کی بنا پر بڑی اہمیت حاصل ہے، ایک عرصہ تک یہ اہل علم میں متداول رہ چکی ہے، بعض علما سب سے قدیم مسند اسی کو بتاتے ہیں، امام احمد فرماتے ہیں ہمارے علم کے مطابق کتب مسند میں سب سے پہلی تصنیف نعیم کی ہے، خطیب نے لکھا ہے کہ مسند کے سب سے پہلے جامع و مرتب یہی تھے۔(۶)

---

(۱) تہذیب ج ۱۰ ص ۴۶۳ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۰ و ۲۴۱ (۲) ایضاً و طبقات ابن سعد ق ۲ ج ۷ ص ۲۰۶ (۳) ایضاً (۴) البدایہ ج ۱۰ ص ۳۰۲ (۵) ضحی الاسلام ج ۲ ص ۱۲۶ (۶) تہذیب ج ۱۰ ص ۴۵۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۔

امام عبداللہ بن محمد جعفی

(متوفی ۲۲۶ھ)

نام ونسب: عبداللہ نام، ابوجعفر کنیت اور مسندی لقب تھا، سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن جعفر بن یمان بن اخنس بن حنیس۔(۱)

خاندان ووطن: ماوراء النہر کا مشہور شہر بخارا جو امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری اور دوسرے اکابر محدثین کا مولد ومسکن ہے، ابوجعفر جعفی بھی اسی خاک کے نامور محدث تھے، جعفی بن سعد مذحجی کے مولی تھے اسی نسبت سے جعفی کہلائے، (۲) مسندی اس لئے کہلاتے تھے کہ مرسل اور منقطع حدیثوں کے بجائے ان کو مسند اور متصل حدیثوں کی تلاش رہتی تھی۔(۳)

اساتذہ: ابوجعفر مسندی کے بعض اساتذہ وشیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوداؤد، ابوعامر عقدی، اسحاق بن ازرق، حرمی بن عمارہ، خلیل بن احمد مزنی، سفیان بن عیینہ، عبدالرزاق، فضیل بن عیاض، مروان بن معاویہ، معتمر بن سلیمان، یحییٰ بن آدم وغیرہ۔

تلامذہ: چند مشہور تلامذہ یہ ہیں:

---

(۱) کتاب الانساب ورق ۵۳۱ وتہذیب التہذیب ج ۶ ص ۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵۷ وحاشیۃ العبر ج ۱ ص ۴۰۵ بحوالہ انساب (۳) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۹-۱۰ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵۷ وکتاب الانساب ورق ۵۳۱۔

ابو حاتم رازی، ابوزرعہ رازی، احمد بن سیار، حمدون بن عمارہ بزار، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، عبیداللہ بن واصل، محمد بن احمد بن ہارون مصیصی، محمد بن نصر مروزی محمد بن یحییٰ ذہلی وغیرہ۔

ان کی محدثانہ عظمت اس سے ظاہر ہے کہ امام بخاری اور ان کے واسطہ سے امام ترمذی نے ان سے روایتیں نقل کی ہیں، امام بخاری کی صحیح میں ان کے واسطہ سے ۴۴ حدیثیں درج ہیں۔(۱)

رحلت وسفر: مورخین اور علمائے طبقات نے احادیث کی طلب وجستجو کے لئے ان کے سفر وسیاحت کا بھی ذکر کیا ہے، حافظ ذہبی نے یمن جانے کی تصریح کی ہے۔

حفظ وثقاہت: محدثین اور علمائے فن نے ان کو ثقہ اور معتبر حافظ ومحدث قرار دیا ہے، ابن عماد نے الثبت، حافظ ذہبی نے الحافظ الحجة اور علامہ ابن حجر نے ثقہ وحافظ کہہ کر ان کا تعارف کرایا ہے(۲) احمد بن یسار فرماتے ہیں کہ وہ صاحب سنت اور ضبط واتقان اور صدق وعدالت کے لئے مشہور تھے، ابوحاتم نے صدوق اور ابن حبان نے ثقہ ومتقن کہا ہے اور علامہ خلیلی کا خیال ہے کہ ان کی ثقاہت واعتبار پر اتفاق ہے۔(۳)

اعتراف: اہل علم اور محدثین نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے، علامہ سمعانی نے عالم بخارئی اور دوسرے علماء نے امام حدیث لکھا ہے حاکم کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں بخارئی کے استاد اور ماوراء النہر کے امام تھے، حسن بن شجاع نے ایک بار امام بخاری کی ایک حدیث سے ناواقفیت دیکھ کر حیرت سے فرمایا کہ آپ خزانۂ حدیث یعنی ابوجعفر مسندی کے پاس جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس حدیث سے ناوقف ہیں۔(۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۵ ۷ وشذرات الذہب ج ۲ص ۶۷ (۲) شذرات الذہب ج ۲ص ۶۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۵ ۷ وتقریب التہذیب ص ۱۴۱ (۳) تہذیب ج ۶ ص ۹-۱۰ وتذکرہ ج ۲ص ۷۶ (۴) تذکرہ ج ۲ص ۷۶ کتاب الانساب ورق ۱۳۱۔

وفات: ان کی وفات ان کے وطن بخارا میں ذیقعدہ ۲۲۹ھ میں ہوئی۔(۱)

حلیہ: خوش قامت اور موزوں اندام تھے، بڑھاپے کی وجہ سے سر اور ڈاڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے۔(۲)

تصنیفات: ان کی تصنیفات میں ایک مسند کا ذکر ملتا ہے ماوراء النہر میں سب سے پہلے ان ہی کو مسند کی جمع وتدوین کی سعادت حاصل ہوئی، حاکم کا بیان ہے کہ انھیں مسندی کہے جانے کا سبب یہ ہے کہ ماوراء النہر میں صحابہ کے ناموں کی ترتیب پر سب سے پہلے انہی نے احادیث جمع کی تھیں،(۳) یہ مسند بھی اپنی صحت وقدامت کی وجہ سے مشہور اور اہم سمجھی جاتی ہے۔

☆☆☆

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ٦ وتہذیب التہذیب ج ٦ ص ۹ (۲) تہذیب التہذیب ج ٦ ص ۹ (۳) ایضاً ص ۱۰۔

امام ابوبکر بن ابی شیبہ

(متوفی ۲۳۵ھ)

نام ونسب: عبداللہ نام، ابوبکر کنیت، اور نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ محمد بن ابی شیبہ ابراہیم بن عثمان بن خواستی۔

ولادت، خاندان اور وطن: ابن ابی شیبہ ۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے ان کا وطن واسط ہے اور وہ قبیلہ بنو عبس کے مولیٰ تھے، ان کا خاندان علمی حیثیت سے ممتاز تھا، ان کے دادا ابوشیبہ جن کے نام کی نسبت سے وہ مشہور ہوئے، ایک صاحب علم بزرگ تھے اور ۲۳ سال تک منصور کے زمانہ میں واسط میں منصب قضا پر فائز رہے، ابوشیبہ کے فرزند محمد کو بھی علم وفن سے اشتغال تھا، وہ فارس کے قاضی تھے، ان کے تین صاحبزادے عبداللہ عثمان، اور قاسم اکابر محدثین میں شمار کیے جاتے ہیں، ابوبکر کا خاندان بعد میں کوفہ میں آباد ہو گیا تھا، اس لیے بعض لوگوں نے ان کو یہیں کا باشندہ بتایا ہے، کوفی، واسطی اور عبسی ان کی مشہور نسبتیں ہیں۔(۱)

اساتذہ اور شیوخ: ابوبکر نے جن نامور محدثین سے اکتساب فیض کیا تھا، ان میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں:

ابن ابی زائدہ، ابن شریح، ابوبکر بن عیاش، اسمٰعیل بن علیہ، اسمٰعیل بن عیاش،

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ص ۶۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۲۰، تہذیب ج ۶ص ۲ وکتاب الانساب ورق ۳۸۲ وبستان المحدثین ص ۴۹۔

جریر بن عبدالحمید، حفص ابن غیاث، ابواسامہ حماد بن سلمہ، خلف بن خلیفہ، سفیان بن عیینہ، ابوالاحوص سلام بن سلیم، ابوخالد الاحمر سلیمان بن حیان، شریک بن عبداللہ نخعی، عباد بن عوام، عبدالاعلیٰ ابن عبدالاعلیٰ، عبداللہ بن ادریس، عبدالرحمٰن بن محمد محاربی، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن مبارک، عبداللہ بن نمیر، عمر بن عبید، ابونعیم فضل بن وکین، محمد بن بشر عبدی، محمد بن حازم، محمد بن فضیل، ابومعاویہ، مروان بن معاویہ، معتمر بن سلیمان، وکیع بن جراح، ہشیم بن بشیر، یحییٰ بن سعید قطان، یزید بن مقدام، یزید بن ہارون وغیرہ۔

تلامذہ: نامور فقہا ومحدثین میں امام احمد بن حنبل، ابوزرعہ، ابوحاتم اور بقی بن مخلد کے علاوہ صحاح ستہ کے مصنفین میں امام بخاری، مسلم اور ابن ماجہ کو براہ راست اور امام نسائی کو بالواسطہ روایت کرنے کا فخر حاصل ہے، دوسرے مشہور علما میں ابراہیم بن اسحٰق حربی، ابوبکر احمد بن ابی عاصم النبیل، جعفر فریابی، حسن بن علی معمری، زکریا نساجی، عباس بن محمد دوری، عبداللہ بن احمد بن حنبل، عبداللہ بن احمد اہوازی، ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بغوی، عثمان بن خرزاذ، محمد بن ابراہیم مربع، محمد بن اسحاق صاغانی، محمد بن سعد، محمد بن عبدوس بن کامل، محمد بن عبیداللہ منادی، محمد بن عثمان بن ابی شیبہ، محمد بن محمد باغندی، موسیٰ بن اسحاق انصاری، ہشیم بن خلف دوری، یعقوب بن شیبہ اور یوسف بن یعقوب نیشاپوری وغیرہ۔

رحلت وسفر: ان کے بعض مشائخ کے علاوہ اکثر کا وطن کوفہ اور واسط ہے لیکن دوسرے مراکز حدیث کے محدثین سے بھی انھوں نے استفادہ کیا ہے، چنانچہ بغداد میں ان کے قیام اور درس وتدریس کی تصریح بہت سے مورخین نے کی ہے۔(۱)

اعتراف کمال: ابن ابی شیبہ کے معاصر علما اور نامور محدثین کو ان کے علم وفضل اور فن حدیث میں تبحر اور جامعیت کا اعتراف ہے، ابوعبید قاسم بن سلام فرماتے ہیں کہ علم حدیث چار آدمیوں پر تمام ہوگیا، ابوبکر بن ابی شیبہ، حسن ادا، خوش سلیقگی اور حفظ ومذاکرہ میں امام

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۶۶ وتہذیب التہذیب ج ۶ ص ۳۰۲۔

احمد، فقہ و معرفت حدیث میں یحییٰ بن معین جامعیت اور کثرت روایت میں اور علی بن مدینی حدیث کے مخارج وعلل سے واقفیت میں یکتائے روزگار تھے، امام احمد کا ارشاد ہے کہ ابوبکر بن ابی شیبہ میرے نزدیک اپنے بھائی عثمان سے افضل وبرتر ہیں، آپ کے صاحبزادہ عبداللہ نے عرض کیا کہ ابن معین عثمان کو فائق سمجھتے ہیں فرمایا لیکن میں ابوبکر ہی کو زیادہ پسند کرتا ہوں، (۱) علامہ ذہبی نے عدیم النظیر ،الامام، احد الاعلام، اور حافظ ابن کثیر نے احد الاعلام وائمۃ الاسلام وغیرہ القاب سے ان کا ذکر کیا ہے، (۲) شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ''وہ حدیث کے امام تھے۔'' (۳)

حفظ وضبط: ان کے حفظ وضبط کا علما نے اعتراف کیا ہے، عمرو بن علی فلاس فرماتے ہیں کہ ''میں نے ان سے بڑا حافظ حدیث نہیں دیکھا، صالح محمد جزرہ کا بیان ہے کہ ''مذاکرے کے وقت ابن ابی شیبہ سے بہتر یادداشت کسی کی نہیں تھی، حافظ ابوزرعہ کہتے ہیں کہ ''ان سے بڑا حافظ حدیث میں نے نہیں پایا، احمد بن حمید سے کوفہ کے سب سے بڑے حافظ حدیث کے بارے میں سوال کیا گیا، تو انھوں نے جواب دیا کہ ابوبکر بن ابی شیبہ، ابن حبان لکھتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں منقطع روایتوں کے سب سے بڑے حافظ یہی تھے۔

ثقاہت: امام احمد ان کو صدوق، عجلی، ابوحاتم، ابن خراش اور ابن قانع ثقہ وثابت، اور خطیب وابن حبان نے متقن کہا ہے، علامہ ابن ناصرالدین اور حافظ ذہبی نے ثقۃ التحریر لکھا ہے، ابن معین سے دریافت کیا گیا کہ کوفہ کے کس آدمی سے حدیث بیان کی جائے، فرمایا ابوشیبہ کے دونوں بیٹوں ابوبکر اور عثمان سے ایک مرتبہ ابن معین سے ان کے شریک سے سماع کا حال دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ ہمارے نزدیک سچے ہیں، اگر وہ شریک کے بجائے کسی اور متقدم سے بھی سماع کا دعویٰ کرتے تو ہم اس کو بھی مان لیتے، میں نے خود ان سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا، کہ آپ نے شریک سے کب سماع کیا ہے؟ فرمایا کہ چودہ سال کی

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴، ۳، ۲۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰ (۳) بستان المحدثین ص ۴۹۔

عمر میں جب میرا حافظہ اِس وقت سے زیادہ اچھا اور بہتر تھا۔(۱)

وفات: ابن ابی شیبہ نے تقریباً چوہتر سال کی عمر میں ۸محرم الحرام۲۳۵ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔(۲)

تصنیفات: تصنیفی حیثیت سے ابن ابی شیبہ باکمال مصنف تھے، ابوعبیدہ کا بیان ہے کہ "احسنهم وضعا للكتاب ابن ابی شيبة (۳) مصنفین اور تذکرہ نگاروں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی متعدد تصنیفات تھیں لیکن وہ سب معدوم اور نایاب ہیں، ابن ندیم نے ان کی حسب ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے:

۱-کتاب السنن فی الفقہ، ۲-کتاب التفسیر، ۳-کتاب التاریخ، ۴-کتاب الفتن، ۵-کتاب صفین، ۶-کتاب الجمل، ۷-کتاب الفتوح، ۸-کتاب المسند۔(۴)

لیکن عام مؤرخین ان کی چار کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، مسند، تفسیر، کتاب الاحکام اور مصنف، آخری دونوں کتابوں کا ابن ندیم نے ذکر نہیں کیا ہے، اس طرح ابن ابی شیبہ کی معلوم کتابوں کی تعداد دس ہو جاتی ہے، مسند کے متعلق ملا چلپی نے لکھا ہے کہ "وہ ایک بڑی اور ضخیم کتاب ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ: ابوبکر بن ابی شیبہ کی سب سے مشہور کتاب مصنف ہے، اس کی بدولت ان کو لازوال شہرت نصیب ہوئی، یہ حدیث کی اہم اور بلند پایہ کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور، اہم، جامع اور مبسوط یہی کتاب ہے، مصنف عبدالرزاق اس کے مقابلہ میں قدیم ضرور ہے لیکن یہ اُس سے زیادہ ضخیم اور جامع ہے۔(۵)

ترتیب: محدثین کے طریقہ کے مطابق اس کو سندوں کے ساتھ فقہی کتابوں کی طرح ابواب

---

(۱) بستان المحدثین ص۴۹ (۲) تاریخ بغداد ج۱۰ص۸۱والعبر ج۱ص۴۲۱ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۲۰ (۴) والفہرست ص۳۸ (۵) کشف الظنون ج۲ص۴۳۰، ۴۵۱۔

وکتب پر مرتب کیا گیا ہے، اس کی ابتدا کتاب الطہارۃ سے ہوتی ہے، یہ کئی اجزا پر مشتمل ہے۔

اہمیت: حافظ ابن کثیر نے اس کے متعلق تحریر فرمایا کہ "ابوبکر بن ابی شیبہ لاجواب اور عدیم المثال مصنف کے مرتب ہیں، ان سے پہلے اور بعد کسی زمانہ میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی، شاہ ولی اللہ دہلوی نے حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں اس کا شمار کیا ہے، حافظ ابن حزم اندلسی نے اس کو مؤطا سے بھی بالاتر بتایا ہے۔(۱)

یہ رائے مبالغہ سے خالی نہیں لیکن اس سے مصنف کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

خصوصیات: اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اکثر مرویات صحاح ستہ کی کتابوں میں موجود ہیں، امام بخاری نے تیس اور امام مسلم نے ۱۵۴۰ روایات کی تخریج کی ہے سنن ابی داؤد میں بکثرت اور سنن ابن ماجہ میں غالباً سب سے زیادہ اسی سے حدیثیں لی گئی ہیں۔(۲)

۲- احکام ومسائل کا اس سے زیادہ جامع اور مستند کوئی مجموعہ نہیں ہے، (۳) اس میں وہی روایتیں شامل کی گئی ہیں جن سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے۔

۳- نقل احادیث غیر جانبدارانہ ہے، اہل حجاز اور اہل عراق سب کے مرویات بلا ترجیح وتنقید ذکر کئے گئے ہیں۔

۴- اس میں مرفوع ومتصل روایات کے ساتھ مرسل، منقطع اور موقوف حدیثیں بھی ہیں اور صحابہ کے آثار، تابعین کے فتاوے اور فقہا وغیرہ کے آرا واقوال بھی بیان کئے گئے ہیں، اس سے ہر حدیث کے متعلق سلف کے تعامل اور ائمہ کے اتفاق واختلاف کا پتہ چل جاتا ہے۔

مصنف کا ایک باب هذا ما خالف به ابو حنيفة الاثر الذي جاء عن

(۱) البدایہ والنہایہ، ج ۱۰ ص ۳۱۵ وحجۃ اللہ البالغہ ج اص ۱۰۵ وتذکرہ ج ۲ ص ۳۴۷ (۲) تہذیب ج ۶ ص ۴ وامام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۴۵ (۳) النکت الطریفہ ص ۳۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے امام ابوحنیفہؒ کے رد میں بھی ہے، اس کے جواب میں زاہد الکوثری نے النکت الطریفة فی التحدث عن ردہ ابن ابی شیبة علیٰ ابی حنیفة کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جو قاہرہ کے مطبع انوار سے ۱۳۶۵ھ میں شائع ہوا ہے اور دو سو ستر صفحے پر مشتمل ہے لیکن علامہ کوثری نے اعتراف کیا ہے کہ اس رد کے باوجود مصنف ابن ابی شیبہ کا اہل عراق پر بڑا احسان ہے کیوں کہ ان کے فقہی دلائل کے لیے سب سے زیادہ جامع اور مستند ماخذ یہی ہے۔"

مصنف کے قلمی نسخے، جرمنی، مدینہ منورہ کے مکتبہ محمودیہ اور خدیویہ مصر وغیرہ میں موجود ہیں،(۱) ہندوستان میں مکتبہ سندیہ، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی اور بعض دیگر کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں،(۲) اس کے بعض اجزا ملتان سے شائع ہوئے ہیں، چوتھا جزء ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں کتاب الزکوٰۃ، کتاب الجنائز، کتاب الایمان والنذور والکفارات شامل ہیں۔

☆☆☆

---

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵؛ والرسالۃ المستطرفۃ ص ۳۶، فہرست کتب خانہ خدیویہ ج ۱ ص ۴۲۴

(۲) تذکرۃ النوادر ص ۳۶ بحوالہ مکتوبات شاہ احسان اللہ سندی، فہرست کتب خانہ آصفیہ ج ۱ ص ۶۲۲۔

امام اسحٰق بن راہویہ

(متوفی ۲۳۸ھ)

نام ونسب: اسحٰق نام، ابو یعقوب کنیت اور ابن راہویہ لقب تھا، شجرۂ نسب یہ ہے: اسحٰق بن ابراہیم بن مخلد بن ابراہیم بن مطر بن عبید اللہ بن غالب بن عبد الوارث بن عبید اللہ بن عطیہ بن مرہ بن کعب ابن ہمام بن اسد بن مرہ بن حنظلہ بن مالک بن زید بن منات بن تمیم۔

اسحٰق کے والد ابراہیم بطن مادر ہی میں تھے کہ ان کی والدہ نے مکہ معظمہ کا سفر کیا، اسی سفر میں کسی مقام پر ان کی ولادت ہوئی، اس لئے اہل مرو انہیں راہوی یا راہویہ یعنی راستہ والا کہتے تھے، اسحٰق کا بیان ہے کہ میرے والد کو جب لوگ راہویہ کہتے تھے تو ان کو ناگوار ہوتا تھا لیکن مجھے ابن راہویہ کہا جاتا ہے تو کوئی ناگواری نہیں ہوتی۔ (۱)

ولادت: ابن راہویہ بروایت صحیح ۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے، ۱۶۶ھ اور ۱۶۳ھ کی روایتیں بھی کی گئی ہیں۔ (۲)

خاندان ووطن: ان کا وطن خراسان کا مشہور شہر مرو تھا لیکن انھوں نے نیشاپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، (۳) اس لئے مروزی اور نیشاپوری کہلاتے تھے، تمیمی اور حنظلی کی نسبتوں سے ان کا عربی النسل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۷، ۳۴۸، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۰۹، ۴۱۰، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۳، تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۳، تہذیب ج ۱ ص ۲۱۶ (۲) ایضاً، (۳) الانتقاء لابن عبدالبر ص ۱۰۸۔

اساتذہ: ان کے مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابواسامہ، ابوبکر، بن عیاش، ابومعاویہ، اسباط بن محمد، اسماعیل بن علیہ، بشر بن مفضل، بقیہ بن ولید، جریر بن عبدالحمید رازی، حاتم بن اسمٰعیل، حفص بن غیاث، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن نافع عبدی، سوید بن عبدالعزیز، شعیب بن اسحٰق، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبدالرزاق بن ہمام، عبدالعزیز دراوردی، عبداللہ بن مبارک، عبداللہ بن وہب، عبدہ بن سلیمان، عبدالوہاب ثقفی، عتاب بن بشیر جزری، عمر بن ہارون، عیسٰی بن یونس، غندر، فضیل بن عیاض، محمد بن بکر برسانی، محمد بن سلمہ حرانی، معاذ بن ہشام، معتمر بن سلیمان نضر بن شمیل، وکیع بن جراح، ولید بن مسلم اور یحیٰی بن قاضح وغیرہ۔

تلامذہ: ابن راہویہ کے تلامذہ کے مختلف طبقے ہیں، ۱- ان کے بعض اساتذہ بقیہ بن ولید، محمد بن یحیٰی ذہلی اور یحیٰی بن آدم وغیرہ، ۲- اور معاصرین میں احمد بن حنبل، اسحاق بن منصور کوسج، محمد بن رافع اور یحیٰی بن معین، ۳- اور عزیزوں میں فرزند محمد نے بھی استفادہ کیا ہے اور صحاح ستہ کے مصنفین میں امام ابن ماجہ کے علاوہ سب کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے، بعض اور ممتاز تلامذہ اور منتسبین کے نام حسب ذیل ہیں:

ابراہیم بن ابی طالب، احمد بن سلمہ، اسحاق بن ابراہیم نیشاپوری، جعفر فریابی، حسن بن سفیان، زکریا سجری، ابوالعباس سراج، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، عبداللہ بن محمد بن شیرویہ، محمد بن افلح، محمد بن نصر مروزی اور موسٰی بن ہارون وغیرہ۔(۱)

طلب حدیث کے لیے سفر: علامہ ابن عساکر اور حافظ ابن حجر نے آپ کے کثرت سفر (فطاف البلاد طلب الحدیث)(حدیث کی طلب وتحصیل کے لیے مختلف شہروں میں پھرے) کہہ کر ذکر کیا ہے اور خطیب نے لکھا ہے کہ حجاز، عراق، یمن اور شام وغیرہ مراکز حدیث

(۱) تاریخ بغداد ج ٦ ص ۳۴۵ تا ۳۴۷، ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۰ وطبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۲ و ۲۳۳، تہذیب ج ۱ ص ۲۱۷۔

کا سفر کیا اور بغداد کئی بار تشریف لائے، عراق کا سفر ۲۳ سال کی عمر میں ۱۸۴ھ میں کیا تھا۔(۱)

علم وفضل کا اعتراف: اسحاق بن راہویہ بلند پایہ علمائے اسلام میں تھے، معاصرین علما اور اساطین فن نے ان کے فضل وکمال اور علمی عظمت و بلند پائیگی کا اعتراف کیا ہے۔

امام احمد بن حنبل جو ان کے بڑے مداح اور قدرداں تھے، فرماتے ہیں، خراسان وعراق میں ان کا کوئی ہمسر نہیں، بغداد کے اس پل کو ان سے زیادہ عظیم و برتر کسی آدمی نے عبور نہیں کیا، گو بعض مسائل میں ہمارا اور ان کا اختلاف ہے اور اہل علم کے درمیان تو اختلافات ہوا ہی کرتے ہیں'' ایک مرتبہ اسحاق کے صاحبزادے محمد ان کی خدمت میں حصول علم کے لئے حاضر ہوئے تو ارشاد ہوا کہ تمہارا اپنے والد سے وابستہ رہنا زیادہ مفید اور بہتر ہے ان سے زیادہ پر عظمت آدمی تمہاری آنکھوں نے نہ دیکھا ہوگا، امام احمد ان کی عظمت کے اس حد تک قائل تھے کہ اگر ان کے سامنے کوئی انھیں ابن راہویہ کہتا تو ناگواری کا اظہار کرتے اور فرماتے کہ اسحاق بن ابراہیم حنظلی کہا کرو۔

محمد اسلم کہتے ہیں کہ اگر امام ثوری زندہ ہوتے تو اسحاق کے علم وفضل سے بے نیاز نہیں رہتے، احمد بن سعید رباطی کا قول ہے کہ اور ابن عیینہ اور حماد بھی ان کے محتاج ہوتے، محمد بن یحییٰ صفار نے سنا تو کہا کہ اگر حسن بصری زندہ ہوتے تو اکثر چیزوں میں ان کو اسحاق کی جانب رجوع کرنا پڑتا، ابن خزیمہ کا بیان ہے کہ اگر وہ تابعین کے زمانہ میں ہوتے تو وہ لوگ بھی ان کے علم وفضل کے معترف ہوتے، نعیم بن حماد فرماتے ہیں کہ اگر کوئی خراسانی اسحاق بن راہویہ کے علم وکمال میں کلام یا نکتہ چینی کرے تو اسے متہم فی الدین سمجھو، سعید بن ذویب فرماتے ہیں کہ روئے زمین پر اسحاق کے مانند میں نے کوئی آدمی نہیں دیکھا، ابو یحییٰ شعرانی کا بیان ہے کہ علمی مذاکرہ کے وقت وہ یکتا اور یگانہ معلوم ہوتے تھے۔

---

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۰۹ وتہذیب ج ۱ ص ۲۱۷ وتاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۵ تا ۳۴۷ وطبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۳۔

یحییٰ بن یحییٰ کا بیان ہے کہ خراسان میں علم کے دو خزانے تھے، ایک محمد بن سلام بیکندی کے پاس، دوسرا اسحاق بن راہویہ کے پاس ہے، حسین بن منصور بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں یحییٰ اور اسحاق کے ہمراہ ایک شخص کی عیادت کرنے گیا، جب ہم لوگ اس کے گھر کے پاس پہنچے تو اسحاق پیچھے ہو گئے اور یحییٰ سے کہا پہلے آپ داخل ہوں کیونکہ آپ ہم سے عمر میں بڑے ہیں، انھوں نے کہا بیشک میں عمر میں بڑا ہوں لیکن علم وفضل میں آپ فائق ہیں اس لئے پہلے آپ ہی چلیں، حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں "وہ جلیل القدر علمائے اسلام اور نامور محدثین وحفاظ عالم میں تھے۔(۱)

شرف امامت: اسحاق بن راہویہ کا شمار ان ائمہ میں ہوتا ہے جو صاحب مذہب، فقیہ ومجتہد تھے مگر اب ان کا فقہی اور اجتہادی مذہب مٹ چکا ہے لیکن ایک زمانہ میں یہ بھی مسلمانوں کا معمول بہ مسلک رہا ہے، امام احمد اور امام نسائی ان کے متعلق فرماتے ہیں، امام من ائمة المسلمین یعنی مسلمانوں کے ایک امام یہ بھی ہیں، ایک مرتبہ امام احمد سے ان کے بارہ میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ مسلمانوں کے امام ہیں، ہمارے نزدیک شافعی، حمیدی اور اسحاق تینوں امام ہیں، محمد بن یحییٰ ذہلی کا بیان ہے کہ ایک دن بغداد کے مقام رصافہ میں ائمہ محدثین امام احمد اور یحییٰ بن معین وغیرہ جمع تھے لیکن مجلس صدارت پر اسحاق بن راہویہ رونق افروز تھے اور وہی اس مجلس کے خطیب بھی تھے، محمد بن نصر فرماتے ہیں وہ ہمارے اور ہمارے مشائخ کے شیخ وبزرگ تھے، فضل شعرانی کہتے ہیں وہ بلاشک وشبہ خراسان کے امام تھے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں احد الاعلام وعلماء الاسلام، علامہ ابن سبکی تحریر فرماتے ہیں احد أئمة الدین واعلام المسلمین وھداۃ المومنین دوسرے مورخین نے بھی ان کو احد أئمة الاسلام احد أئمة المسلمین وعلما من اعلام

(۱) تاریخ بغداد ج۶ ص ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، تاریخ ابن عساکر ج۲ ص ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، تہذیب التہذیب ج۱ ص ۲۱۸، ۲۱۹، طبقات الشافعیہ ج۱ ص ۲۳۴، ۲۳۵، انتقاء ص ۱۰۸۔

الدین امام مشرق اور عالم نیشاپور وغیرہ لکھا ہے۔(۱)

علم حدیث میں کمال وامتیاز: علم حدیث سے ان کو خاص تعلق تھا اور وہ اکابر محدثین اور نامور حفاظ میں شمار کیے جاتے ہیں، خلیلی کا بیان ہے کہ وہ ''شہنشاہ حدیث تھے'' حدیثوں کے نشر واشاعت، درس ومذاکرہ، حفظ وضبط اور حزم واحتیاط کے لئے ان کی ذات بڑی اہمیت اور شہرت رکھتی ہے، ذیل میں ان کی ان خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حفظ وضبط: اسحاق بن راہویہ کا حافظہ غیر معمولی اور یادداشت حیرت انگیز تھی، ابن حبان، خطیب بغدادی اور ابن عساکر وغیرہ نے حافظہ میں ان کی جامعیت کا اعتراف کیا ہے، علامہ ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ اگر اسحاق تابعین کے عہد میں ہوتے تو وہ لوگ بھی ان کے حافظہ کے معترف ہوتے، قتیبہ بن سعید کا بیان ہے کہ خراسان کے نامور حفاظ میں اسحاق بن راہویہ اور ان کے بعد امام دارمی اور امام بخاری تھے، ابویحییٰ شعرانی کہتے ہیں کہ میں نے ان کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی، وہ ہمیشہ یادداشت سے حدیثیں بیان کرتے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ میں نے کبھی کوئی چیز قلمبند نہیں کی جب بھی مجھ سے کوئی حدیث بیان کی گئی میں نے اسے یاد کرلیا، میں نے کسی محدث سے کوئی حدیث کبھی دوبارہ بیان کرنے کے لئے نہیں کہا، یہ کہنے کے بعد انھوں نے پوچھا کیا تم لوگوں کو اس پر تعجب ہے؟ لوگوں نے کہا جی ہاں؟ یہ حیرت کی بات ہی ہے، انھوں نے کہا جس چیز کو میں ایک مرتبہ سن لیتا ہوں وہ مجھے یاد ہو جاتی ہے، ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں ہر وقت میری نگاہ کے سامنے رہتی ہیں اور میں ان کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ وہ کتاب میں کس جگہ ہیں؟ ابوداؤد خفاف کی روایت کے مطابق انھوں نے ایک لاکھ حدیثوں کے متعلق کہا کہ وہ میری نظر کے سامنے ہیں، میں ان کا تذکرہ کرسکتا ہوں ایک دفعہ انھوں نے گیارہ ہزار حدیثیں زبانی املا کرائیں اور پھر جب

(۱) حوالۂ مذکورہ اختلاف صفحات وتاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۲ والبدایہ ج ۱۰ ص ۳۱۷ میزان الاعتدال ج ۱ ص ۸۶ والعبر ج ۱ ص ۴۴۶ ومرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۲۱ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۸۹۔

دوبارہ کتاب سے ان کی قرأت کی تو ایک لفظ کی بھی کمی یا بیشی نہیں نکلی، احمد بن سلمہ کہتے ہیں کہ انھوں نے پوری مسند کا زبانی املا کرایا، ابوحاتم رازی نے ابوزرعہ سے اسحاق بن راہویہ کے حفظِ اسانید ومتون کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں دیکھا گیا، احمد بن سلمہ نے ابوحاتم کو بتایا کہ انھوں نے یادداشت سے اپنی تفسیر کا املا کرایا ہے تو ابوحاتم نے کہا یہ اور زیادہ حیرت انگیز بات ہے کیوں کہ مسند حدیثوں کا ضبط تفسیر کے اسناد والفاظ کے ضبط کے مقابلہ میں آسان ہے، امیر خراسان عبداللہ بن طاہر نے ایک مرتبہ ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، انھوں نے فرمایا کہ اس کے متعلق سنت یہ ہے اور یہی اہل سنت کا قول ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کی رائے اس سے مختلف ہے، ابراہیم بن ابی صالح وہاں موجود تھے بولے امیر المومنین اسحاق غلط کہتے ہیں، امام ابوحنیفہ کا مسلک اس سے مختلف نہیں ہے، انھوں نے جواب دیا کہ مجھ کو یہ مسئلہ یاد ہے، فلاں کتاب کا فلاں جز لائیے، کتاب لائی گئی اور ابن طاہر نے اس کو الٹنا شروع کیا تو اسحاق نے کہا امیر المومنین گیارہویں ورق کی نویں سطر میں ملاحظہ فرمایئے، چنانچہ اس کے اندر وہ مسئلہ اسحاق کے بیان کے عین مطابق نکلا، امیر نے کہا ہم کو معلوم تھا کہ آپ کو مسائل ازبر ہیں لیکن حافظہ کا یہ مشاہدہ ہمارے لیے یقیناً حیرت انگیز ہے۔(۱)

صدق وثقاہت: اس غیر معمولی حفظ کے ساتھ اسی درجہ کا صدق اور ثقاہت بھی تھی، ابوحاتم فرماتے ہیں کہ کثیر الحفظ ہونے کے باوجود اسحاق کا ضبط واتقان اور غلطیوں سے محفوظ ومصوَن رہنا حیرت انگیز ہے، خطیب بغدادی وغیرہ لکھتے ہیں کہ وہ حفظ وثقاہت دونوں کے جامع تھے، ذہبی نے ان کو ثقہ وحجت بتایا ہے اور ابن حبان نے ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے، امام نسائی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ ومامون تھے، امام دارمی کا بیان ہے کہ اسحاق

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۵۰ تا ۳۵۴، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۳و۴۱۴، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۴، ۲۳۵، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۱۷، میزان الاعتدال ج ۱ ص ۸۷ا، ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۳۔

اپنے صدق کی وجہ سے اہل مغرب ومشرق کے سردار بن گئے تھے، امام احمد کو ان کے صدق وثقاہت پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک دفعہ انھوں نے ان سے کوئی حدیث پوچھی، جب اسحاق نے اسے بیان کیا تو ایک شخص نے اعتراضا کہا کہ وکیع نے یہی روایت اس سے مختلف طریقہ پر بیان کی ہے، امام احمد نے برافروختہ ہوکر کہا خاموش رہو، جب ابویعقوب جو امیر المومنین فی الحدیث ہیں کوئی روایت بیان کریں تو اسے بلا تامل قبول کرلینا چاہیے۔(۱)

حزم واحتیاط: اس حفظ کے ساتھ اتنے محتاط تھے کہ بچپن میں انھوں نے عبداللہ بن مبارک سے حدیثیں سنی تھیں مگر ان کو روایت نہیں کرتے تھے کہ احتیاط کے خلاف ہے۔(۲)

حفاظت واشاعت حدیث: ان کی ذات سے حدیث نبوی کی بڑی اشاعت اور سنت نبوی کا بڑا احیا ہوا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ" اسحاق بن راہویہ نے سنتوں کا دفاع اور مخالفین حدیث کا قلع قمع کیا" وہب بن جریر کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ اسحاق، صدقہ اور یعمر کو ان کے اسلامی خدمات کا صلہ عطا فرمائے، ان لوگوں نے مشرق کی سرزمین میں حدیثوں کی اشاعت اور سنت نبوی کا احیا کیا۔

فقہ واجتہاد: حدیث کی طرح فقہ واجتہاد کے بھی ماہر تھے، ابواسحاق شیرازی، حاکم صاحب مستدرک اور خطیب نے ان کو فقہ واجتہاد میں جامع اور اکابر فقہا میں شمار کیا ہے، حافظ ابن کثیر نے احد المجتہدین من الانام اور ابن حبان نے نامور وممتاز فقہا میں ان کا شمار کیا ہے، ایک مرتبہ امام احمد ابن حنبل سے ان کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ اسحاق کے مانند کون ہوسکتا ہے، ایسے ہی لوگوں سے مسائل دریافت کرنا چاہیے، ہم لوگ بھی ان سے فتوے پوچھتے ہیں۔(۳)

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۵۰ تا ۳۵۳۔ تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۲، ۴۱۳، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۴ وتہذیب ج ۱ ص ۲۱۷ (۲) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۵، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۰ (۳) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۱، ۴۱۲، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۱۷۔

غرض فقہی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا اور وہ مسلمہ امام اور صاحب مذہب فقہا میں ہیں اور متعدد علما نے ان کا محدث کے بجائے فقیہ و مجتہد ہی کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، کتب خلاف میں ان کے اقوال و فتاویٰ اور فقہی و اجتہادی تخریجات موجود ہیں، ابن رشد مالکی نے اپنی کتاب بدایۃ المجتہد میں اکثر امام احمد کے ساتھ اسحاق کے اقوال بھی نقل کیے ہیں، ایک زمانہ تک مسلمانوں میں اسحاق کا مذہب رائج رہا۔

ابن راہویہ کے فقہی اصول اور بنیادیں: فقہ و حدیث میں امام احمد بن حنبل اور اسحاق کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے، دونوں بزرگوں کی فقہ و اجتہاد کا دار و مدار حدیث پر ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے رسالۂ الانصاف میں لکھا ہے کہ ان کے مسائل کی بنیاد احادیث اور اقوال صحابہؓ پر زیادہ ہے، ابو حاتم سے پوچھا گیا کہ آپ کا میلان ان دونوں کی جانب زیادہ ہے، فرمایا مجھے ان سے زیادہ پر عظمت شخص نظر نہیں آتا، ان دونوں نے احادیث قلمبند کیں، ان کا مذاکرہ کیا اور ان پر تصنیفات کیں، علامہ ابن حجر لکھتے ہیں وفرع علی السنن یعنی ان کی فقہی تفریعات سنن و احادیث پر مبنی ہوتی ہیں لیکن امام احمد کے برخلاف ان کا میلان امام مالک کی طرف زیادہ ہے جن کا اصل ماخذ اہل مدینہ کے اقوال ہوتے ہیں اور امام احمد زیادہ تر آثار و روایات پر اعتماد کرتے ہیں۔

فقہ و اجتہاد میں ان کے کمال کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے امام شافعی جیسے عظیم المرتبت امام و مجتہد سے دو مرتبہ مناظرہ کیا اور صالح بن احمد روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مناظرہ کے موقع پر میرے والد بھی موجود تھے، ان کا بیان ہے کہ اسحاق امام شافعی کے مقابلہ میں غالب نظر آ رہے تھے۔(۱)

پہلا مناظرہ: پہلی مرتبہ جب وہ امام احمد کے اصرار پر امام شافعی سے ملے تو انھوں نے مکہ کے مکانات کو کرایہ پر دیے جانے کے متعلق ان سے مناظرہ کیا اور اسحاق کرایہ پر دینا جائز

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۶۲، ۴۱۱ و تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۱۹، تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۵۱۔

نہیں سمجھتے تھے اور امام شافعی جائز سمجھتے تھے، ان کا استدلال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ. (حشر، ع ۱)	واسطے ان مفلسوں، وطن چھوڑنے والوں کے جو نکالے ہوئے آئے ہیں اپنے گھروں سے۔

من دیار کی نسبت مالکوں کی طرف کی گئی ہے یا غیر مالکوں کی طرف، فتح مکہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من أغلق بابه فهو آمن ومن دخل دار ابی سفيان فهو آمن.	جس نے اپنا دروازہ بند کرلیا اور جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگیا اس کو امان ہے۔

یہاں دار و باب کی نسبت جس کی جانب کی گئی ہے کیا وہ اس کا مالک تھا یا نہیں؟ حضرت عمرؓ نے قید خانہ کے لیے جو مکان خریدا تھا، وہ اس کے مالک یا غیر مالک سے خریدا تھا؟ اسی طرح رسول کریمؐ نے فرمایا:

وهل ترك لنا عقيل من دار	یعنی کیا عقیل نے ہمارے لیے کوئی گھر چھوڑا ہے۔

اسحاق کی دلیل یہ تھی کہ ان کی رائے کی تائید بعض تابعین سے منقول ہے، امام شافعی کا جواب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کسی شخص کی رائے حجت نہیں ہوسکتی، اسحاق کی دوسری دلیل یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "سَوَآءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ" یعنی مسجد حرام میں مکہ کے باشندوں اور باہر کے لوگوں دونوں کا برابر حق ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک یہ حکم مسجد حرام کے ساتھ خاص تھا، امام شافعیؒ کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مکہ کی زمین لوگوں کے لئے مباح ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، لم يترك لنا عقيل مسكنا کے بجائے یہ فرماتے کہ جو جگہ ہم کو مل جائے یا جس شخص کے گھر میں بھی

ہم لوگ اتر پڑیں وہ گھر اور جگہ ہمارے لیے مباح ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ کی زمین لوگوں کی ملکیت بن سکتی ہے، اس لیے اس کو کرایہ پر بھی دیا جا سکتا ہے، آخر میں اسحاق کو امام شافعیؒ کی اصابتِ رائے کا اعتراف کرنا پڑا اور وہ شافعیؒ کی عظمت اور علم وفضل کے معترف ہو گئے اور جب کبھی ان کا ذکر کرتے تو تعریف وتوصیف کرتے اور اپنی بات پر نادم بھی ہوتے۔

دوسرا مناظرہ: دوسرے مناظرہ میں امام احمد بھی شریک تھے اور غالباً اسی کے متعلق ان سے روایت ہے کہ اس میں امام شافعیؒ کے مقابلہ میں اسحاق کی رائے وزنی معلوم ہوتی تھی، چنانچہ وہ اس مسئلہ میں اسحاق کے ہم نوا بھی ہو گئے تھے، اس مناظرہ کا موضوع بحث مردار کی کھال تھی، امام کے نزدیک وہ دباغت کے بعد پاک ہو جاتی ہے، اسحاق نے دلیل طلب کی تو انھوں نے حضرت میمونہ کی یہ حدیث بیان کی ان النبیؐ مرّ بشاة میتة فقال هلا انتفعتم بجلدها (آپؐ نے ایک مردہ بکری دیکھ کر فرمایا کہ کیوں نہیں تم لوگوں نے اس کی کھال سے فائدہ اٹھایا) اسحاق نے اس کے جواب میں ابن حکیم کی یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یہ لکھایا کہ لا تنتفعوا من المیتة باهاب ولا عصب (یعنی مردار کے غیر مدبوغ اور مدبوغ کسی قسم کے چمڑے سے انتفاع نہ کرو) اور یہ تحریر آپ کی وفات سے صرف ایک ماہ پہلے کی ہے، اس لیے میمونہ کی روایت اس سے منسوخ ہو جاتی ہے، امام شافعیؒ نے فرمایا کہ میں تو سماعی حدیث بیان کرتا ہوں اور آپ تحریر کا تذکرہ کرتے ہیں، اسحاق نے جواب دیا کہ رسول اللہؐ نے قیصر وکسریٰ کے نام جو خطوط لکھے تھے وہ تحریری تھے اور اللہ کے یہاں ان کے خلاف حجت ہوں گے، اس جواب پر امام شافعیؒ خاموش ہو گئے۔

مذہب ومسلک: اسحاق بن راہویہ خود صاحب مذہب مجتہد تھے، اس لیے چاروں مشہور اجتہادی مذاہب میں وہ کسی مذہب سے وابستہ نہ تھے، البتہ امام دارقطنی نے ان کو امام شافعی

کے راویوں میں اور امام بیہقی نے ان کے اصحاب میں ذکر کیا ہے، اسی طرح ابن خلکان نے لکھا ہے کہ مناظرہ کے بعد جب ان کو امام شافعی کے علم وفضل کا اندازہ ہوا تو وہ ان کے اصحاب میں داخل ہو گئے اور ان کی کتابوں کو مہیا کر کے نقل کیا،(۱) لیکن ان آرا واقوال سے ان کا شافعی المذہب ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ صرف امام شافعی سے تلمذ اور تعلق ظاہر ہوتا ہے، علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں ''امام شافعی سے ان کا صرف اس حد تک تعلق ثابت ہے کہ اسحاق نے ان کی کتابیں لکھیں اور ان کی صحبت میں رہے لیکن امام ابوثور کی طرح ان کے بھی مختارات واجتہادات ہیں، البتہ ان کا رجحان امام احمد کی طرح حدیث واتباع سلف کی جانب زیادہ تھا۔''(۲)

عقیدہ وکلام: اسحاق بن راہویہ اتباع سنت اور طریقۂ سلف کی پیروی میں نہایت متشدد تھے، اس لیے کلام وعقائد کے غیر ضروری مسائل میں بحث وتدقیق اور غور وخوض ناپسند کرتے تھے، ان کے زمانہ میں خلق قرآن کا معرکۃ الآرا مسئلہ پیش آیا، گو انھوں نے امام احمد کی طرح اس میں اولوالعزمی اور ثابت قدمی نہیں دکھائی مگر وہ بھی قرآن کو خدا کا کلام اور غیر مخلوق سمجھتے تھے، احمد بن سعید رباطی کا شعر ہے۔

لم یجعل القرآن خلقا کما   قد قاله زندیق ناق (۳)

ترجمہ: اسحاق بن راہویہ نے فاسق اور زندیق شخص کی طرح قرآن کو خدا کی مخلوق قرار نہیں دیا۔

زہد واتقا: امام ابن راہویہ کے زہد واتقا کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ وہ حدیث وفقہ اور حفظ وصدق کی طرح ورع وتقویٰ کے بھی جامع تھے، محمد بن اسلم طوسی نے ان کی وفات کے وقت فرمایا ''میں نے ان سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۲ (۲) الانتقاء ص ۱۰۸ (۳) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۱۲، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۲۵۔

(اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ) یعنی اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔(۱)

وفات: مشہور روایت کے مطابق انھوں نے ۷۷ سال کی عمر میں بروز یکشنبہ ۱۴ یا ۱۵ شعبان ۲۳۸ھ کو انتقال کیا، ۲۳۷ھ بھی روایت کی گئی ہے، ایک شاعر کے مرثیہ کا شعر ہے:

یا هدة ما هددنا ليلة الاحد في نصف شعبان لاتنسى مدى الابد

ترجمہ: جس سانحہ عظیم سے ہم لوگ اتوار کی رات میں ۱۵ر شعبان کو دوچار ہوئے،
اس کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

آپ کی قبر زیارت گاہ خلائق ہے، بعض بزرگوں نے آپ کی بخشش ومغفرت کے خواب بھی دیکھے(۲)

اولاد: آپ کی اولاد میں تین صاحبزادوں کا نام ضمناً ملتا ہے، ۱-ابوالحسن علی، ۲-محمد، ۳-یعقوب۔(۳)

تصنیفات: علمائے طبقات وتراجم نے ان کو صاحب تصانیف کثیرہ لکھا ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب ضائع ہوگئیں جن تصنیفات کے نام معلوم ہوسکے ہیں وہ یہ ہیں:

۱- کتاب السنن فی الفقہ: (۴) اس کے نام سے موضوع ظاہر ہے۔

۲- کتاب التفسیر: علامہ سیوطی نے عہد تابعین کے بعد کی جن تفسیروں کو اہم اور اقوال صحابہ وتابعین کی جامع قرار دیا ہے ان میں سفیان بن عیینہ اور وکیع بن جراح وغیرہ کی تفسیروں کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے (۵) اس کو وہ خود باقاعدہ مرتب ومکمل بھی کرچکے تھے اور اس کا املا بھی کرایا تھا۔

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۵ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۲ (۲) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۵۵ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۴ (۳) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۷ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۰ وطبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۳ (۴) الفہرست ص ۳۲۱ (۵) الاتقان ج ۲ ص ۱۹۰۔

۳- مسند: یہ ان کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف اور ۶ جلدوں پر مشتمل ہے،(۱) حاکم نیشاپوری نے دوسرے دور کی مسانید میں امام احمد کی مسند کے ساتھ اس کا نام بھی گنایا گیا ہے۔(۲) اس کی ترتیب وتکمیل سے بھی وہ اپنی زندگی میں فارغ ہو چکے تھے اور اپنے شاگردوں کو زبانی اور پڑھ کر اس کا املا بھی کرایا تھا، علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

واسحاق یخرّج امثل ماورد عن ذالك الصحابي فيما ذكره الرازي۔ (۳)	ابوزرعہ رازی کا بیان ہے کہ اسحاق ان ہی روایتوں کی تخریج کرتے تھے جو اس صحابی کی سب سے بہتر اور اچھی روایت ہوتی تھی۔

اس مسند کا ایک قلمی نسخہ علامہ سیوطی کے قلم کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے، علامہ ذہبی نے اس کے رجال کے نقد میں ایک مستقل کتاب لکھی تھی، اس کو بھی سیوطی نے اس نسخہ کے حاشیے میں درج کیا ہے۔(۴)

☆☆☆

(۱) تاریخ ابن خلکان ج۱ص۱۱۳ (۲) المدخل فی اصول الحدیث ص۴ (۳) تدریب الراوی ص۵۷ (۴) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص۱۶۵۔

امام احمد بن حنبلؒ

(متوفی ۲۴۱ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابوعبداللہ کنیت، شیخ الاسلام اور امام السنہ القاب، شیبانی، ذہلی، بصری، مروزی اور بغدادی نسبتیں ہیں، سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال بن اسد بن ادریس بن عبداللہ بن حیان بن عبداللہ بن انس بن عوف بن قاسط بن مازن بن شیبان۔

خاندان: امام احمد خالص عربی النسل تھے، ان کا خاندانی سلسلہ بنی شیبان سے جو قبیلۂ عدنان کی شاخ سے ملتا ہے، یہ خاندان اپنی شجاعت، دلیری اور غیرت وحمیت کے لیے ہمیشہ سے مشہور تھا، آپ کے دادا حنبل امویوں کے عہد میں سرخس کے گورنر اور والد محمد ایک بہادر سپاہی تھے جن کا ۳۰ سال کی عمر ہی میں جب کہ امام احمد صرف ۳ سال کے تھے انتقال ہوگیا، آپ کی والدہ ماجدہ نے پرورش و پرداخت کی۔

دنیوی وجاہت کی طرح علمی حیثیت سے بھی یہ خاندان بہت ممتاز تھا اور اس میں متعدد علما وفضلا، مقررین، شعرا اور ماہرین انساب گذرے ہیں۔(۱)

ولادت: امام احمد ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے بعض مورخین نے تصریح کی ہے کہ ربیع الاول کا مہینہ تھا۔(۲)

مقام پیدائش: امام صاحب شکم مادر ہی میں تھے کہ ان کی والدہ مرو سے بغداد تشریف

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۸، ۲۹ و تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۲ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸۔

لے آئیں، یہیں امام صاحب کی ولادت ہوئی، ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ مرو میں پیدا ہوئے تھے اور شیر خوارگی کے زمانہ میں بغداد آئے۔(۱)

وطن: آپ کا خاندان ایک عرصہ تک بصرہ میں آباد رہا، آپ کے دادا خراسان تشریف لائے یہاں روز اور مروشاہجہاں نام کے دوشہر قریب ہی قریب آباد تھے، امام صاحب کا تعلق دوسرے مرد سے تھا جو ہر زمانہ میں اکابر علما وفضلا کا گہوارہ رہا ہے (۲) لیکن امام صاحب کی نشو ونما بغداد میں ہوئی اور یہیں آپ کی عمر کا اکثر حصہ بسر ہوا، اس لیے اسی کو آپ کا اصلی وطن سمجھا جاتا ہے۔

ابتدائی تعلیم: امام صاحب کی تعلیم کا سلسلہ بچپن ہی میں شروع ہو گیا تھا، ۴ سال کی عمر میں انھوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، سات سال کی عمر میں حدیث پڑھنا شروع کر دی اور ۱۵، ۱۶ سال کے سن میں اس کی باقاعدہ طلب وتکمیل میں مصروف ہو گئے۔

رحلت وسفر: امام صاحب عرصہ تک بغداد ہی میں رہ کر وہاں کے مشائخ سے سماع کرتے رہے اس کے بعد انھوں نے دوسرے مشہور مراکز حدیث کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن، شام اور جزیرہ وغیرہ کا رُخ کیا۔(۳)

شیوخ واساتذہ: امام احمد نے آنکھیں کھولیں تو بغداد علما وفضلا کا مرکز اور دینی علوم کا گہوارہ بنا ہوا تھا، اس لیے شروع میں وہ یہیں کے مشائخ اکابر کے دامن فیض سے وابستہ رہے، بغداد میں ان کی نظر سب سے پہلے مشہور محدث حافظ ہشیم بن بشیر واسطی (م ۱۸۳ھ) پر پڑی جو حضرت عبداللہ ابن عباس وابن عمر رضی اللہ عنہما کی مرویات کے متبحر عالم تھے چار سال تک اسی خرمن علم کی خوشہ چینی کرتے رہے، جب یہ آفتاب غروب ہو گیا تو دوسرے اساتذۂ فن کی جانب متوجہ ہوئے، بچپن میں امام ابو یوسف کے درس میں بھی شریک ہوئے

---

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸ (۲) معجم البلدان ج ۸ ص ۳۵ (۳) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۲ وتہذیب الاسما نووی ج ۱ ص ۱۱۔

تھے، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن داؤد طیالسی، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن نمیر، وکیع بن جراح اور یحییٰ بن سعید وغیرہ جیسے اکابر محدثین اور ائمہ وقت سے بھی ان کو استفادہ کا موقع ملا، (۱) امام احمد کے اساتذہ میں سب سے زیادہ ممتاز اور باکمال شخصیت امام شافعیؒ کی ہے، ان سے ان کے بڑے مراسم اور گوناگوں تعلقات تھے، فقہ کے علاوہ حدیث وانساب کا علم بھی ان سے حاصل کیا تھا، امام شافعی جب تک بغداد میں رہے وہ ان کے حلقۂ درس سے وابستہ رہے، جب مصر تشریف لے گئے تو امام احمد نے بھی وہاں جانا چاہا مگر عسرت وناداری کی بنا پر اس کا موقع نہیں ملا، امام احمد کو امام شافعیؒ کی ذات سے بڑی عقیدت اور شیفتگی تھی، اور وہ ان کا ہمیشہ بڑا احترام کرتے تھے، امام شافعیؒ سوار ہوتے تو یہ ان کے پیچھے پیچھے پیدل، ان سے سوال کرتے جاتے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ میں نے تیس سال سے کوئی ایسی نماز نہیں پڑھی جس میں امام شافعیؒ کے لیے دعا نہ کی ہو، (۲) شفیق استاذ کو بھی اپنے لائق شاگرد سے بڑی محبت اور ان کے علم وفضل اور دیانت وتقویٰ پر بڑا اعتماد تھا، ان سے روایت بھی کرتے تھے، امام احمد کا خود بیان ہے کہ امام شافعی نے جتنا استفادہ ہم سے کیا اتنا ہم اُن سے نہیں کر سکے، عبداللہ بن احمد کا بیان ہے کہ امام شافعی کی کتاب میں حدثنی الثقه یا اخبرنی الثقه سے میرے والد ہی مراد ہیں، امام شافعی فتویٰ دیتے تو ان سے بھی مشورہ لیتے تھے، فرط تعلق کی بنا پر اکثر ان کے گھر بھی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ (۳)

تلامذہ: امام احمد کے تلامذہ کے مختلف طبقے ہیں، آپ کے اساتذہ میں حسن بن موسیٰ اشیب، زیاد بن ایوب، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبدالرزاق بن ہمام، محمد بن ادریس شافعی، وکیع بن جراح، ہشام بن عبدالملک طیالسی، یحییٰ بن آدم اور یزید بن ہارون وغیرہ نے آپ سے استفادہ کیا ہے، خلف (۴) ابن ہشام داؤد بن عمرو ضبی اور قتیبہ بن سعید ثقفی نے عمر میں

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۶ (۲) ایضاً (۳) احمد بن حنبل ص ۲۹۔ (۴) حافظ ابن حجر نے ان کو بھی امام احمد کا استاذ بتایا ہے، تہذیب ج ۳ ص ۱۵۶۔

بڑے ہونے کے باوجود آپ سے روایت کی ہے، ہم عصروں میں احمد بن ابی الحواری، حسین بن منصور، عبدالرحمن بن ابراہیم، عبیداللہ بن سعید سرخسی، علی بن عبداللہ مدینی، محمد بن رافع قشیری، محمد بن یحییٰ بن ابی سمینہ اور یحییٰ بن معین وغیرہ کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے، اعزہ میں آپ کے چچیرے بھائی حنبل بن اسحاق اور صاحبزادگان صالح اور عبداللہ کو آپ سے روایت کرنے کا فخر حاصل ہے، صحاح ستہ کے مصنفین میں امام بخاری، (۱) مسلم اور ابوداؤد بلا واسطہ اور امام ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ بالواسطہ آپ کے شاگرد ہیں، عام تلامذہ کی تعداد جن میں سے اکثر امام وقت سمجھے جاتے تھے بے شمار ہے۔

اہل علم کا اعتراف اور شہادتیں: امام احمد کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کے متعلق ان کے اساتذہ، معاصرین اور تلامذہ کے بکثرت اقوال طبقات وتراجم کی کتابوں میں موجود ہیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ''بغداد کو جب میں نے چھوڑا تو وہاں امام احمد سے زیادہ صاحب علم وفضل اور متدین ومتورع کوئی شخص نہیں تھا'' امام ابوثور فرماتے ہیں کہ ''وہ سفیان ثوری سے بڑے عالم وفقیہ اور ہمارے شیخ وامام ہیں'' یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ ''میں نے ان سے بہتر آدمی نہیں دیکھا، ان کی توصیف وتعریف میں مبالغہ برا نہیں۔'' علی بن مدینی سے جب کہا گیا کہ ''امام احمد کا اس زمانہ مین وہی حال ہے جو سعید بن میسب کا ان کے زمانہ میں تھا۔'' تو انھوں نے فرمایا کہ ''نہیں سعید بن میسب کے زمانہ میں ان کی طرح کے لوگ موجود تھے مگر موجودہ دور میں امام احمد کی کوئی مثال نہیں، ابوعبید فرماتے

(۱) محمد بن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے امام احمد سے کتاب المغازی کے آخر میں مسند بریدہ کے اندر احمد بن حسن ترمذی کے واسطہ سے ایک حدیث کی روایت کی ہے، کتاب الصدقات میں محمد بن عبداللہ انصاری سے روایت کرنے کے بعد لکھا ہے کہ وزادنی احمد بن حنبل عن محمد بن عبداللہ انصاری اور کتاب النکاح میں حدثنا واخبرنا کے بجائے قال لنا احمد بن حنبل تحریر کیا ہے (کتاب الجمع فی رجال الصحیحین ص۵)

ہیں کہ حدیث وسنت میں نہ امام احمد سے بڑا کوئی عالم ہے اور نہ علمائے اسلام میں ان کا کوئی مقابل۔(۱)

امام صاحب کے مشہور شاگرد ابراہیم حربی فرماتے ہیں کہ ''ان کو اللہ نے سلف وخلف کے علوم کا مخزن بنایا تھا، علی بن مدینی کا ارشاد ہے کہ ''وہ ہمارے اور اللہ کے درمیان حجت ہیں، جب کسی مسئلہ میں مجھ کو ان کا فتویٰ مل جاتا ہے تو میں بے تکلف اس پر عمل کرتا ہوں، ابونصر بن ماکولا کہتے ہیں کہ ''ان کو صحابہؓ وتابعین کے مذاہب سے سب سے زیادہ واقفیت تھی۔

امام احمد کی عظمت اس سے بھی ظاہر ہے کہ علمائے امت نے ان کی مدح وتوصیف کو تقویٰ ودیانت کا ثبوت اور ذم وتنقیص کو ایمان کے منافی اور نفاق کی علامت قرار دیا ہے، سفیان بن وکیع فرماتے ہیں کہ ''امام احمد کی عیب جوئی کرنے والا فاسق وفاجر ہے،'' احمد دورقی کا بیان ہے کہ ''امام احمد کی مذمت کرنے والے کو بے دین سمجھنا چاہیے'' ابوحاتم اور قتیبہ ارشادفرماتے ہیں کہ ''امام سے محبت وعقیدت رکھنے والا متبع سنت اور غیر مبتدع ہے ابن اعین نے ان دوشعروں میں یہی حقیقت بیان کی ہے:

اضحی ابن حنبل محنة مامونة — وبحب احمد يعرف المتنسك

واذا رأيت لاحمد متنقصا — فاعلم بان ستوره ستهتك (۲)

ترجمہ: احمد کی ذات ایک بہترین کسوٹی ہے، ان کی محبت دینداری کی علامت ہے، اگر کوئی شخص ان کی مذمت کرتا ہے تو یقین مانو اس کی قلعی کھل کر رہے گی۔

فضل وکمال: امام احمد بڑے بلند پایہ محدث اوران تمام اوصاف وکمالات سے متصف تھے

---

(۱) طبقات الشافعیہ سبکی ج۱ص۲۰۰ وطبقات الفقہا شیرازی ص۷۵، تاریخ ابن عساکر ج۲ص۳۳۹، ۴۲ وتاریخ بغداد ج۴ص۴۱۴ والبدایہ ج۱۰ص۳۳۶ (۲) صفۃ الصفوۃ ج۲ص۱۹۱ وتہذیب الاسماء ج۱ ص۱۱۲، ۱۱۱ وتاریخ ابن عساکر ج۲ص۳۴ والبدایہ ج۱ص۳۴۲ وتاریخ بغداد ج۴ص۴۲۰۔

جو ایک امام حدیث میں ہونے چاہئیں۔

حافظہ: ان کی قوت حافظہ کا کمال اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے چار سال کی عمر مین قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ ان کے پاس بارہ گٹھروں کے بقدر کتابیں تھیں اور وہ سب ان کو زبانی یاد تھیں، علی بن مدینیؒ فرماتے تھے کہ ''ان سے بہتر کسی کا حافظہ نہیں تھا، احمد بن سعید دارمی کہتے ہیں ''امام احمد کی طرح باوجودے کہ وہ کمسن تھے کسی کو حدیثیں یاد نہیں تھیں، ابوزرعہ فرماتے تھے کہ ''ہمارے مشائخ میں ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں تھا، ان کو لاکھوں حدیثیں یاد تھیں۔''

عدالت وثقاہت: ان کی توثیق پر ائمہ فن کا اتفاق ہے، عجلی کا بیان ہے کہ ''وہ حدیث میں ثقہ وضابط تھے'' ابن سعد لکھتے ہیں کہ ''وہ ثقہ وثابت اور صدوق تھے'' امام نسائی ان کو ثقہ ومعتمد قرار دیتے ہیں، حافظ ابن حجر نے ان کو متقن کہا ہے، ابن حبان نے ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ''بغداد کی عجیب چیزوں میں ایک یہ نوجوان بھی تھا کمسنی کی وجہ سے جس کے بال بھی سیاہ نہیں ہوئے تھے مگر جب وہ حدثنا کہتا تھا تو ہر طرف سے صدوق کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ (۱)

نقد وتمیز: وہ حدیثوں کے معتبر ناقل وحافظ ہی نہ تھے بلکہ روایتوں میں امتیاز میں بھی پورا ملکہ رکھتے تھے، ابوحاتم فرماتے ہیں کہ امام احمد کو صحیح اور سقیم روایتوں کی معرفت میں بڑا کمال اور خاص امتیاز حاصل تھا'' ابوعبید کا بیان ہے کہ ''وہ حدیث ورجال میں سب سے بہتر مہارت اور اچھی پرکھ رکھتے تھے، امام شافعیؒ کو ان کی بصیرت پر اس درجہ اعتماد تھا کہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''جب کوئی روایت تمہارے معیار پر صحیح وثابت اتر جائے تو مجھے بھی بتلا دو میں

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۱، تہذیب الاسماء ص ۱۱۱، طبقات سبکی ج ۱ ص ۲۰۰، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۴، ۳۰، ۳۱، تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۹، ۴۱۵، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۷۴، ۷۵، طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۹۲۔

اس کو بے تکلف قبول کرلوں گا، عمر بن احمد ناقد کا بیان ہے کہ "حدیث میں احمد کی موافقت کے بعد مجھ کو دوسروں کی مخالفت کی پرواہ نہیں ہوتی۔" (۱)

مسندِ درس: چالیس سال کی عمر میں درس وتدریس کی مسند پر رونق افروز ہوئے، آپ کی مجلس درس بڑی باوقار، سنجیدہ اور شائستہ ہوتی تھی، لوگ ہمہ تن گوش رہتے اور مذاق ومزاح کا ایک کلمہ بھی زبان پر نہ لاتے، ابوعبید بیان کرتے ہیں کہ "میں امام ابو یوسف، محمد بن حسن شیبانی، یحیٰ بن سعید اور عبدالرحمٰن بن مہدی وغیرہ باکمال محدثین وفقہا کے درس میں شریک رہا ہوں لیکن امام احمد کی طرح مجھ پر کسی کی ہیبت ودہشت طاری نہیں ہوئی، ان کی مجلس نہایت بارعب اور پروقار ہوتی تھی" درس میں حاضرین اور شرکا کا جم غفیر ہوتا تھا، علمائے سیر کا بیان ہے کہ پانچ پانچ ہزار کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے تھے۔ (۲)

مرجعیت ومقبولیت: شہرت وناموری اور امامت وسیادت سے کنارہ کش رہنے کے باوجود عالم اسلام کا کوئی گوشہ بھی آپ کے آوازۂ شہرت سے خالی نہ تھا، حافظ بن کثیر لکھتے ہیں کہ عنفوانِ شباب ہی میں ان کو پوری شہرت حاصل ہوگئی تھی اور بڑھاپے میں تو ہر جگہ ان کا نام روشن ہوگیا تھا۔ (۳) آپ کے دروازے پر طلبہ کا ہجوم رہتا تھا، جب قید کئے گئے تو عالم اسلام میں کہرام مچ گیا، بیمار ہوئے تو مزاج پرسی کے لیے لوگوں کا ایک جم غفیر ہر وقت موجود رہتا، جنازہ میں شرکت کرنے والے بے شمار تھے، وہ عوام وخواص ہر طبقہ میں یکساں مقبول اور ہر دل عزیز تھے، ادریس بن عبدالکریم مقری فرماتے ہیں کہ اکابر علما وفقہا اور نامور محدثین بھی ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور سلام کرنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے، عوامی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ ایک شخص کے سوال پر اس کو کوئی چیز دی تو دوسرے شخص نے اسے بقیمت خریدنا چاہا، مگر پہلے شخص نے یہ کہہ کر دینے سے انکار کر دیا کہ "مجھ کو بھی

(۱) تہذیب الاسما واللغات ج ۱ قسم اول ص ۱۱۱ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۴ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۷ (۲) صفۃ الصفوہ ج ۲ ص ۱۹۲ (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۷۔

تمہاری طرح اس سے برکت کی امید ہے" حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ "امامت وسیادت آپ کے نام کا جز ہوگئی تھی۔"(۱)

عبادات واعمال

نماز: نماز با جماعت ادا کرتے تھے، آپ کا ارشاد ہے کہ اذان سے پہلے ہی نماز کے لئے تیار ہو جانا چاہیے، جماعت کا اس قدر اہتمام تھا کہ جب خلق قرآن کے انکار کے جرم میں آپ کو کوڑے لگائے گئے اور بدن لہولہان ہو گیا اس وقت بھی ابن ساعہ کی اقتدا میں نماز ادا کی، انھوں نے اعتراض کیا کہ خون سے لت پت ہونے کے باوجود آپ نے نماز پڑھی؟ جواب دیا کہ (قد صلی عمرؓ وجرحه یثب دماً) یعنی قاتلانہ حملہ میں حضرت عمرؓ کا جسم بھی لہولہان ہو گیا تھا مگر انھوں نے اسی حالت میں نماز ادا کی تھی، نمازوں میں استغراق ومحویت اور خشوع وخضوع کا یہ حال تھا کہ بقول عبدالرزاق ان کی نمازوں سے سلف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

نوافل: آپ کے صاحبزادہ عبداللہ کا بیان ہے کہ میرے والد روز وشب میں تین سو رکعتیں نفل پڑھتے تھے، ابتلاء کے بعد ضعف کی وجہ سے ۱۵۰ رکعتیں کر دی تھیں۔

تہجد: عشاء کے بعد تھوڑی دیر تک آرام فرماتے پھر ساری رات نماز اور یاد الٰہی میں گذارتے بچپن ہی سے یہ معمول بن گیا تھا اور کبھی اس میں فرق نہ آنے دیتے، ابوبکر مروزی فرماتے ہیں کہ چار مہینے میں نے ان کے ساتھ قیام کیا، اس عرصہ میں کبھی انھوں نے تہجد ترک نہیں کیا۔(۲)

تلاوت: تلاوت قرآن سے بڑا شغف تھا، شب میں قیام اور دن کا اکثر حصہ تلاوت قرآن

---

(۱) مجموعۃ الرسائل ص ۵ (۲) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۲، ۱۹۶، ۱۹۷، وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۱، ۳۶، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۵۔

میں بسر ہوتا، ہر ساتویں دن اور ایک روایت کے مطابق ہر روز ایک قرآن ختم کرتے تھے۔

دعا و استغفار: خدا سے دعا و استغفار اور تضرع وگریہ زاری بھی معمولات میں داخل تھے، بڑے مستجاب الدعوات تھے، آپ کی دعاؤں میں برکت وتاثیر دیکھ کر اکثر لوگ آپ سے دعا کی فرمائش کرتے تھے، ایک دفعہ آپ کے ایک پڑوسی نے اپنی اپاہج ماں کے لئے دعا کی درخواست کی تو امام صاحب سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ ہم تو خود تم لوگوں کی دعاؤں کے زیادہ محتاج ہیں، وہ آدمی اپنے گھر واپس لوٹ رہا تھا تو امام صاحب کی خادمہ نے راستہ میں آ کر اس کو بتایا کہ تمہاری واپسی کے بعد سے وہ برابر تمہاری ماں کے لئے دعا کر رہے ہیں، اس نے آ کر اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو خود اس کی ماں نے دروازہ کھولا اور بتایا کہ اب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی ہوں۔(۱)

صدقہ وخیرات: غربت وناداری کے باوجود طبیعت میں بڑی فیاضی تھی، جہاں تک ہوسکتا غریبوں کی امداد فرماتے، امرا وسلاطین کے تحائف قبول نہ فرماتے، اگر کبھی مجبوراً قبول بھی کرنا پڑتا تو اس کو محتاجوں اور ضرورتمندوں میں تقسیم کر دیتے۔

روزہ: روزوں کے اہتمام کا یہ حال تھا کہ قید خانہ میں سحری اور افطار کا انتظام نہ ہونے کے باوجود پانی کے چند گھونٹ پی کر روزہ رکھتے، ایک دن جب معتصم باللہ کے جلاد کوڑے لگا رہے تھے تو کچھ ستو لائے اور کہا کہ اس ضعف ونقاہت کی حالت میں روزہ رکھنا ٹھیک نہیں ہے مگر آپ نے ان کی درخواست قبول نہ کی، فرض کے علاوہ مسنون اور مستحب روزے بھی اکثر رکھتے تھے، متوکل نے امام صاحب کے علاج کے لئے ابن ماسویہ طبیب کو بھیجا تو اس نے بتایا کہ امیر المومنین انھیں کوئی بیماری نہیں، ان کی کمزوری اور بیماری کی وجہ کم خوری اور نمازوں کی زیادتی ہے۔

حج: پانچ مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، تین دفعہ ناداری کی وجہ سے پا پیادہ تشریف

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۲، ۱۹۷، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۵، ۳۶۔

لے گئے، تیسری اور چوتھی مرتبہ مجاورت بھی کی۔(۱)

آخرت کا استحضار: آخرت کے تصور اور مواخذۂ الٰہی سے ان کا دل ہر وقت لرزہ براندام رہتا تھا، ان کی مجلسوں کا موضوع گفتگو یہی تھا، علی بن مدینی کو تاکید کی کہ ''ہمیشہ آخرت کو پیش نظر رکھو۔''

دنیا سے بے رغبتی: امام صاحب کی مجلس میں دنیا اور اس کے مزخرفات کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا، اگر کوئی اس قسم کا تذکرہ کرتا تو آپ خاموش رہتے، مامون، معتصم، واثق اور متوکل ہر ایک نے مال ودولت کا انبار آپ کے قدموں پر نچھاور کرنا چاہا مگر آپ نے دنیا کے چند خزف ریزوں کی خاطر دین کا سودا نہیں کیا، آپ کے سامنے ابن ابی شیبہ، عبدالاعلیٰ اور دوسرے محدثین کے عیش وعشرت کا ذکر کیا جاتا تو فرماتے کہ دنیا چند روزہ ہے، اس سے کوئی بڑی مراد حاصل نہیں ہوسکتی، کل آخرت میں جو کامیاب ہوگا کامیابی اسی کی ہے، ایک مرتبہ مامون نے محدثین میں زر وجواہر تقسیم کرنے کے لئے بھیجا تو آپ کے علاوہ کسی نے لینے سے انکار نہیں کیا، فرماتے تھے کہ مجھے سب سے زیادہ اس دن آرام ملتا ہے جس دن میرے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی۔(۲)

اتباع سنت اور محبت رسول: امام کی زندگی کا مشن ہی سنت کی تائید وحمایت اور بدعات کا ابطال تھا، خلاف سنت کاموں کو دیکھ کر سخت برہم ہوتے تھے، اور سنت کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ نشست وبرخاست کو ناپسند کرتے تھے، خود کبھی قصداً سنت ترک نہیں کی اور جب اپنے کسی عمل کے خلاف سنت ہونے کا علم ہوجاتا تو فوراً اس سے باز آجاتے تھے، مرض الموت میں شدت الم کے باوجود کراہنا اس لئے پسند نہیں کیا کہ وہ خلاف

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۵، ۳۳۹، وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۰ و ۳۵ وصفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۷ وتہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۱۲ (۲) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۲ و ۲۱۱ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۸، ۳۹، والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸ و ۳۲۹۔

سنت ہے، اکثر دعا فرماتے تھے **امتنا علی الاسلام والسنۃ** (اے اللہ اسلام اور سنت پر ہمارا خاتمہ کر)

رسول کی ظاہری عقیدت ومحبت سے بھی آپ کا دل معمور تھا، قید خانہ میں آپ کو تین بال دیے گئے اور بتایا گیا کہ یہ موئے مبارک ہیں، آپ نے ان کو حرز جان بنائے رکھا اور انتقال کے وقت وصیت کی کہ قبر میں ان کو میری دونوں آنکھوں اور زبان پر رکھ دیا جائے۔(۱)

جاہ ومنصب سے گریز: آپ کی استغنا وبے نیازی نے کبھی کسی منصب واعزاز کو قبول کرنا گوارا نہیں کیا، خلفا وسلاطین نے مقرب بارگاہ بنانا اور انعام واکرام سے نوازنا چاہا مگر آپ نے ہمیشہ رد فرما دیا، امام شافعیؒ نے خلیفہ ہارون سے یمن کی بدنظمی کا ذکر کر کے ایک مناسب اور بہتر قاضی کے تقرر کی فرمائش کی، خلیفہ نے کہا آپ کے حلقہ میں جو موزوں شخص ہو اس کا انتخاب کر کے مجھے مطلع کیجئے، امام شافعیؒ کی نگاہِ انتخاب امام احمد پر پڑی، جب ان سے اس کا ذکر کیا تو امام احمد نے جواب دیا کہ میں تو آپ کے پاس طلب علم کے لئے حاضر ہوتا ہوں اور آپ مجھ کو عہدۂ قضا قبول کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں، اگر آپ کے پاس علم کی دولت نہ ہوتی تو اب میں آپ سے رسم وراہ ترک کر دیتا، امام شافعیؒ یہ سن کر نہایت نادم اور پشیمان ہوئے۔(۲)

امرا وسلاطین سے بے تعلقی: امرا وسلاطین سے ہمیشہ بے تعلق رہے، خلفا نے آپ کے سامنے مختلف قسم کی پیشکشیں کیں مگر انھوں نے ان کو ٹھکرا دیا، امیر المومنین عبد اللہ ابن طاہر نے اپنے حاجب سے سلام کہلایا اور ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا امام صاحب نے فرمایا کہ یہ مجھے پسند نہیں ہے اور امیر سے مجھ کو توقع ہے کہ وہ ایک ناگوار کام کی مجھ کو زحمت نہ دیں گے، ابن

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۲، ۲۰۱ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۸، ۳۹، والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸، ۳۲۹ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۱ و البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸۔

طاہر کا خود بیان ہے کہ ''میں دو آدمیوں (یحییٰ اور احمد) کو نہایت عزیز رکھتا ہوں لیکن دونوں نہ کبھی میرے یہاں آئے اور نہ دوسرے امرا کے قریب پھٹکے ہیں'' آپ کے چچا اسحاق نے آپ سے کہا کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کے لیے امرا کے یہاں جایا کریں اور اسحاق بن راہویہ کو مثال میں پیش کیا آپ نے جواب دیا کہ عم محترم! آپ اسحاق کے طرز عمل کو پیش کرتے ہیں، اگر میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں ان کو بھی ضرور منع کروں گا، سلاطین وامرا کی صحبت فتنہ ہے، جب ہم ان سے دور اپنے کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تو قریب ہونے کے بعد کیا حال ہوگا، متوکل اپنے پیش رؤوں کی غلطیوں کی تلافی کے لیے ہر وقت آپ کی دلجوئی کی فکر میں رہتا، روزانہ قاصد بھیج کر خیریت دریافت کرتا، معاملات سلطنت اور مہمات امور میں مشورے طلب کرتا، مال ودولت اور انعام واکرام سے مالا مال کرنا چاہتا مگر اس کا یہ التفات امام صاحب پر سخت بار ہوتا، آپ رو کر فرماتے سلمت من هؤلاء حتى اذا كان فى آخر عمري بليت بهم (۱) (زندگی بھر میں ان لوگوں کی آزمائشوں سے محفوظ رہا لیکن آخر عمر میں ان کے فتنوں سے دوچار ہو رہا ہوں) کبھی ارشاد فرماتے هذا امر اشد علیّ من ذلك (یہ نوازشات کا معاملہ تو میرے لیے اس ابتلا وآزمائش سے بھی زیادہ سخت اور شاق ہے) ان کے ہدایا وتحائف سے بھی سخت پرہیز تھا، ایک مرتبہ خلیفہ نے امیر بغداد عبداللہ بن اسحاق کو خط لکھا کہ امام صاحب کو کسی طرح دربار میں لائے، امام صاحب نے ضعف ونقاہت کا عذر کیا، متوکل کو معلوم ہوا تو اس نے لکھا کہ میں آپ کی دید اور قربت کا مشتاق اور دعا وبرکت کا خواستگار ہوں، اس لیے امام صاحب کو مجبوراً اس کے لشکر گاہ میں قیام کرنا پڑا، خلیفہ روزانہ آپ کے لیے پرتکلف کھانے اور انواع واقسام کے میوہ جات بھجواتا مگر آپ نے کبھی ان کو تناول نہیں فرمایا، ۸ روز تک مسلسل

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۲۰۱ وطبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۰۳ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۶ و۴۰ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸، ۳۳۹ واحمد بن حنبل والمحنہ ص ۱۴۶۔

روزے رکھتے رہے، سولہ دنوں تک وہاں قیام رہا اس مدت میں صرف ستو پر اکتفا فرماتے رہے، خلیفہ نے خلعت اور اپنی خاص سواری بھیج کر بلا بھیجا، آپ نے اس خیال سے کہ واپسی کی اجازت مل جائے گی، جانا منظور کر لیا لیکن ایک ٹٹو پر سوار ہو کر تشریف لے گئے، خادم نے ایک بیش قیمت جوڑا پہنایا، چند دنوں کے بعد واپسی کی اجازت ملی تو شاہی خلعت وہیں چھوڑ دی اور فرمایا کہ اس کو بیچ کر اس کی قیمت غربا و مساکین میں تقسیم کر دی جائے، اس کے باوجود عرصہ تک اس واقعہ سے متاثر اور اس کی اذیت محسوس کرتے رہے، اپنے اعزہ و متعلقین کو بھی امرا کے یہاں آمد و رفت اور ان کے ہدیے قبول کرنے سے منع فرماتے تھے، بعض اعزہ کے یہاں آمد و رفت بھی اس لیے ترک کر دی تھی کہ وہ سلاطین کے یہاں نشست و برخاست رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ خلیفہ نے آپ کے اہل و عیال کے لیے چار ہزار درہم بھجوائے، امام صاحب نے انکار کرنا چاہا تو خلیفہ نے کہلایا کہ یہ تو اہل و عیال کے لیے ہے، امام صاحب سن کر خاموش ہو گئے لیکن متعلقین کو ملامت اور ان کے سامنے دنیوی زندگی کی بے ثباتی اور آخرت کی حیاتِ سرمدی کا ذکر فرماتے رہے، ان لوگوں نے عرض کیا کہ حدیث میں ہے کہ اس مال کو لینے میں کوئی قباحت نہیں جو بلا طلب مل جائے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ بھی امرا کے تحائف قبول فرماتے تھے، آپ نے فرمایا کہ اس میں اور ان بزرگوں کے معاملہ میں بڑا فرق ہے اگر مجھ کو بھی معلوم ہو جائے کہ یہ مال ظلم و جور سے حاصل نہیں کیا گیا ہے تو لینے میں تامل نہ ہوگا۔

ایک دفعہ تین روز کا فاقہ تھا، اپنے کسی شاگرد سے آٹا قرض لیا، گھر والوں نے بھوک کی شدت کا خیال کر کے فوراً روٹی پکا کر حاضر کر دی، دریافت فرمایا کہ اس قدر جلد کس طرح روٹی پک گئی بتایا گیا کہ صالح کے یہاں آگ جل رہی تھی وہیں پکا لی گئی، صالح امرا و سلاطین کے تحفے قبول کرتے تھے، اس لیے آپ نے ان کے چولھے پر پکی ہوئی روٹیاں

کھانے سے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ صالح کے گھر میں جانے کا دروازہ بند کر دیا جائے۔

متوکل نے امام صاحب کے اخراجات کے لیے یعقوب بن قوصرہ کے ہاتھ دس ہزار درہم بھجوائے، امام صاحب نے لینے میں لیت ولعل کیا، یعقوب نے کہا کہ اگر آپ اسے قبول نہیں فرماتے تو خلیفہ کو آپ سے بدگمانی ہوگی اور روپے رکھ کر چلے گئے، رات کے آخری پہر میں امام صاحب نے اپنے بیوی، بچوں اور دوسرے متعلقین کو اکٹھا کر کے فرمایا کہ ان روپیوں کی وجہ سے مجھے رات بھر نیند نہیں آئی، اس لیے ان کو ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے، چنانچہ ان لوگوں نے اسی وقت بصرہ و بغداد کے محتاج اور ضرورت مند محدثین کی ایک فہرست تیار کی اور صبح ہوتے ہی ساری رقم تقسیم کر دی گئی۔(۱)

خودداری: احباب اور مخلصین سے بھی کسی قسم کا انتفاع خودداری کے منافی سمجھتے تھے، حسن بن عبدالعزیز نے ایک مرتبہ ایک ہزار دینار کی تین تھیلیاں بھیجیں اور کہلایا کہ ''یہ حلال وطیب مال ہے اس کو قبول فرمائیے اور اہل وعیال کو اس سے فائدہ اٹھانے دیجئے، امام صاحب نے واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ ''ہم کو اس کی ضرورت نہیں، بحمداللہ ہم آرام وراحت سے ہیں، عبدالرزاق کے سامنے امام احمد کا ذکر کیا گیا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور فرمایا کہ ایک دفعہ وہ میرے پاس آئے مجھے معلوم تھا کہ ان کے پاس خرچ نہیں ہے، اس لیے میں نے خلوت میں لے جا کر دس دینار نذر پیش کی، مسکرا کر فرمایا، میں نہایت آرام سے ہوں، آپ نے ناحق زحمت گوارا کی، اگر میں اور لوگوں سے اس قسم کی رقمیں لیتا ہوتا تو اس کے قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا۔(۲)

انکسار وتواضع: طبعاً بڑے متواضع اور منکسر المزاج تھے، خاندانی نجابت، علمی برتری، مذہبی عظمت اور غیر معمولی شہرت ومقبولیت کے باوجود اُن میں کبروغرور کا شائبہ بھی نہ تھا،

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۶ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۸ تا ۳۴۰ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۶ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۸، ۳۴۰، ایضاً باختلاف صفحات وصفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۳۔

یحیٰ ابن معین فرماتے ہیں کہ میرا اوران کا پچاس سال سے سابقہ ہے مگر انھوں نے اپنے خیر وصلاح اور خاندانی وجاہت پر فخر وبرتری کا اظہار نہیں کیا، ایک شخص نے کہا آپ عربی النسل ہیں، ارشاد ہوا کہ ''ہم مسکین اور فقیر لوگ ہیں، محمد بن حسن فرماتے ہیں کہ جب وہ راستہ چلتے تو کوئی آگے پیچھے نہ ہوتا، اس کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے، ابوعوانہ کے درس میں شریک ہونے کے لیے گئے تو لوگوں نے ممتاز جگہ پر بیٹھانے کی کوشش کی، آپ نے کہا میں شیخ کے سامنے بیٹھوں گا، ہم کو معلمین کے سامنے تواضع سے پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے، اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، صالح کا بیان ہے کہ میرے والد کبھی دوسروں سے وضو کا پانی تک نہیں لانے کے لیے کہتے تھے بلکہ خود ہی کنویں سے پانی نکال کر وضو کرتے تھے۔ فوران وفات سے دو دن پہلے عیادت کے لیے حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ کے غلام نے آپ کو پنکھا جھلنا چاہا آپ نے روک دیا، حافظ ابن کثیر فرماتے ہین کہ امام احمد پر خدا کی رحمت ہو، نہایت متواضع اور خلیق بزرگ تھے۔ (۱)

شرافت وحسن خلق: امام احمد شرافت اور حسن خلق کا پیکر تھے، کبھی کسی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی، اگر کوئی شخص آپ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تو آپ اس کا اور بہتر بدلہ چکانے کی فکر کرتے، کوئی ناگوار خاطر بات کہتا تو خندہ پیشانی سے اس کو انگیز کر لیتے، زبان پر شکایت یا ملامت کا لفظ نہیں آنے دیتے، طالب علمی کے زمانہ میں مکہ تشریف لے گئے اور ابن ساعہ کے مکان میں قیام کیا، اتفاقاً ایک دن ان کے کپڑے اور جملہ سامان چوری ہو گیا، قیام گاہ پر واپس آئے تو ابن ساعہ کی والدہ نے اس کی خبر کی، آپ خاموش رہے اور صرف اس قدر فرمایا کہ میری تختیاں کیا ہوئیں جن پر میں حدیثیں لکھتا تھا۔ (۲)

وقار ومتانت: طبیعت میں وقار تھا اس لیے عام لوگوں سے ملنا جلنا، خواص کے یہاں

(۱) ایضاً باختلاف صفحات وتاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۴ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۷۔

آمدورفت، بازاروں میں چلنا پھرنا ناپسند تھا، لطف وتفریح کے کاموں سے اس لیے پرہیز کرتے تھے کہ اس سے علم کی عظمت ختم ہو جاتی ہے، اگر کبھی متوکل کے دربار میں حاضر ہونا پڑا تو علم کی آن بان اور شان وشکوہ میں فرق نہ آنے دیا۔(۱)

آپ کی متانت پر مزاح بھی بار ہوتا تھا اس لئے آپ کے اساتذہ بھی اس کا لحاظ کرتے تھے، ایک دن یزید بن ہارون نے اپنے شاگردوں کے سامنے مزاح کی کوئی بات کہی، بعد میں ان کو معلوم ہوا کہ امام احمد بھی موجود تھے تو سخت شرمندہ ہوئے اور سر پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ اگر تم لوگوں نے بتادیا ہوتا کہ وہ موجود ہیں تو میں مذاق نہ کرتا، ایک روز اسماعیل بن علیہ کے شاگرد کسی بات پر ہنسے تو وہ سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ امام احمد کی موجودگی میں تم لوگ ہنسی مذاق اور بے شرمی کی باتیں کرتے ہو۔

خلوت پسندی: خلوت پسند تھے اژدہام اور ہنگامہ آرائی کو سخت ناپسند کرتے تھے، جنازہ، جماعت اور عیادت کے علاوہ گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے مگر ان کے فضل وکمال نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنادیا تھا، اس لیے ہر وقت طلبہ اور شائقین علم کا ہجوم رہتا تھا۔

نظافت وپاکیزگی: طبیعت نظافت پسند تھی، گندگی سے سخت نفرت تھی، اکثر باوضو رہتے، ہمیشہ صاف ستھرے کپڑوں میں نظر آتے رہے۔(۲)

ذریعہ معاش: امام صاحب کی آمدنی کا اصل ذریعہ صرف ایک آبائی جائداد تھی جس سے کل سترہ درہم ماہوار کرایہ ملتا تھا، اسی میں تنگی ترشی سے بسر کرتے اور خدا کا شکر بجالاتے، اتنی حقیر آمدنی اہل وعیال کے خرچ کے لیے بالکل ناکافی تھی، اس لیے اکثر گھر میں فاقہ ہوتا تھا، کئی کئی دن تک چولھا جلنے کی نوبت نہ آتی، مگر فقر وفاقہ کا اثر کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے اور کسی کا تحفہ اور ہدیہ قبول کرتے، ایک مرتبہ آپ کی والدہ کے پاس کپڑا نہ تھا، ایک صاحب نے

(۱) العبر ج۱ص ۴۳۵ (۲) تاریخ بغداد ج۴ص ۱۱۶ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۰، ۳۵، صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۰۔

ہدیہ کرنا چاہا تو منظور نہیں کیا، آپ کے احباب آپ کی حالت دیکھ کر آپ کی خدمت کرنا چاہتے، مگر انکار کر دیتے، آپ کے صاحبزادہ صالح کا بیان ہے کہ وہ اکثر لوگوں کی پیش کش مسترد کر دیتے اور ہمیشہ یہی فرماتے کہ الحمد للہ ہم لوگ آرام وعافیت سے ہیں، حالانکہ گھر میں ایک حبہ بھی نہیں ہوتا تھا، محنت ومزدوری کر لینا پسند تھا مگر کسی کے سامنے دست طلب دراز کرنا گوارا نہ تھا، ایک مرتبہ یمن میں تھے تو کپڑے چوری ہو گئے، کئی دن گھر سے نہ نکلے، جب لوگوں کو تلاش ہوئی اور حال معلوم ہوا تو کچھ روپیوں کا انتظام کیا گیا مگر آپ نے صرف ایک دینار قبول کیا اور اس کے معاوضہ میں ایک تحریر لکھی، بعض اوقات ازار بند بن کر فروخت کر کے اخراجات پورے کرتے تھے، گھر میں پھٹا پرانا بوریا تھا اسی پر بیٹھتے تھے، انتقال کے وقت گھر میں چند چیتھڑوں کے علاوہ کچھ نہیں نکلا۔

غذا: غذا بہت سادہ اور معمولی تھی، خشک روٹی کا ٹکڑا پانی سے تر کر کے نمک سے کھایا کرتے، پھلوں میں خربوزے سے شوق تھا، اکثر سرکہ کا ستعمال کرتے، ایک درہم کی چربی مہینہ بھر کے لیے کافی ہوتی، آخر عمر میں چربی کھانا بھی چھوڑ دیا تھا، بیماری کے دنوں میں بھی نمک، سرکہ، اچار اور روٹی آپ کی خوراک تھی، ایک مرتبہ روزہ سے تھے، شام کو گھر سے افطار آیا، امیر بغداد نے کہا ذرا میں بھی دیکھوں، دیکھا تو چند روٹیاں اور کھیرا نکلا، اس نے کہا یہی سادگی اور قناعت تو آپ کو ہماری دعوتیں قبول کرنے نہیں دیتی، متوکل کے یہاں سے پر تکلف کھانا آتا مگر آپ ستو پر قناعت کرتے، اس نے ایک دفعہ دس ہزار درہم بھجوائے، امام صاحب نے سب صدقہ کر دیا، علی بن جہم نے کہا امیر المومنین ان کو مال ودولت سے کیا سروکار، ان کے لیے تو ایک نان جویں کافی ہے، خلیفہ نے کہا تم صحیح کہتے ہو۔ (۱)

لباس: آپ کا عام لباس قمیص اور ازار تھا، سر پر عمامہ بھی باندھتے تھے، موٹا جھوٹا مگر سفید اور صاف ستھرا کپڑا زیب تن فرماتے تھے۔

---

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۸، ۳۹ وصفۃ الصفوہ ج ۲ ص ۱۹۰۔

حلیہ: رنگ ملیح مائل بہ سپیدی تھا، مگر چہرہ نہایت خوبصورت اور بارونق تھا، قد ایک روایت کے مطابق لانبا اور دوسری روایت کے مطابق میانہ اور درمیانی تھا، آخر میں داڑھی کے چند بال سفید ہو گئے اس لیے حنا کا خضاب لگاتے تھے۔(۱)

ابتلاء اور آزمائش

عباسی خلفا کے دور میں عجمی روح کی کارفرمائی اور یونانی منطق وفلسفہ کے اثرات نے عربوں کے سادہ مذاق طبیعت کو بدل دیا اور وہ سادہ اور سہل دین حنیف پر عقیدہ رکھنے کے بجائے لایعنی موشگافیوں اور فلسفہ وکلام کے غیر ضروری مباحث میں الجھ کو مختلف گروہوں میں بٹ گئے، ان میں فرقہ معتزلہ زیادہ مشہور اور ممتاز ہے، اس نے دین کی حفاظت وخدمت کا کام بھی انجام دیا لیکن اس کی بدولت مذہب میں نئے نئے اور بے بنیاد مسائل بھی پیدا ہو گئے، اس لئے محدثین جن کا مقصدِ زندگی احیائے سنت اور رد بدعت تھا، معتزلہ کے عقائد وافکار کے خلاف صف آرا ہو گئے، معتزلہ کے ان مسائل میں خلقِ قرآن کا مسئلہ بھی تھا۔

ہارون رشید کے زمانہ تک اس عقیدہ کو ماننے والے بہت تھوڑے لوگ تھے اور وہ بھی اپنے عقیدہ کا اعلان نہیں کرتے تھے، بشر مریسی کے متعلق جب خلیفہ کو معلوم ہوا کہ وہ اس عقیدہ کا قائل ہے تو اس نے قسم کھائی کہ اگر یہ شخص مجھ کو مل گیا تو میں اسے نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالوں گا۔(۲)

---

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۹، ۳۰، تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸ (۲) احمد ابن حنبل والمحنۃ ص ۴۸، ۴۹۔

اس کے بعد مامون خلیفہ ہوا، وہ بڑا علم وادب نواز اور علما وشعرا کا قدرداں تھا، بچپن ہی میں اس کو برامکہ کی صحبت میسر آئی، فلسفہ کے مطالعہ اور مختلف زبانوں کی تعلیم اور غیر قوموں کے علما کی صحبت ومعاشرت کے اثر سے وہ عقل پرست اور آزاد خیال ہوگیا، اس لیے ہارون رشید کے زمانہ میں جو معتزلہ گوشہ گیر تھے وہ اس کے زمانہ میں کھل کر میدان میں آگئے اور رفتہ رفتہ اس کے دربار سے وابستہ ہوگئے، مامون کی تائید وسرپرستی نے معتزلہ کے اثر ورسوخ کو بہت بڑھا دیا اور انھوں نے بزور شمشیر لوگوں سے خلق قرآن کا اقرار کرانا چاہا، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے محدثین وفقہا کی ایک جماعت جس کے سربراہ امام احمد ابن حنبل تھے، آگے بڑھی، معتزلہ کی قیادت احمد بن ابی داؤد (م ۲۴۰ھ) کے ہاتھ میں تھی جو نہایت فاضل ولائق شخص تھا، شروع میں مامون کو اس مسلک کی جبری تبلیغ واشاعت میں تامل تھا(۱) بلکہ باقاعدہ اس کے اظہار میں بھی پس وپیش تھا،(۲) لیکن احمد بن ابی داؤد کی حکمت وفراست نے اس کو اس پر آمادہ کرلیا اور ۲۱۸ھ میں اس نے اعلان کیا کہ جو لوگ خلق قرآن کا اقرار نہ کریں گے انھیں سخت سزا دی جائے گی۔

اس مسئلہ میں اس کو اتنی ضد پیدا ہوگئی کہ اسی زمانہ میں اس کو رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے طرسوس جانا پڑا تو وہاں سے والیٔ بغداد اسحاق بن ابراہیم کو تاکیدی خطوط لکھے کہ لوگوں سے زبردستی اس عقیدہ کا اقرار کرایا جائے اور ممالک اسلامیہ کے تمام علما وفقہا اور مذہبی رہنماؤں سے اس مسئلہ میں ان کی رائیں دریافت کرکے مجھ کو مطلع کیا جائے، اس حکم کی تکمیل میں امام صاحب بھی طلب کیے گئے اور ان سے خلق قرآن کے متعلق سوال کیا گیا، آپ اسحاق کے ردوکد کے باوجود صرف یہی فرماتے رہے کہ "قرآن خدا کا کلام ہے، میں اس کو مخلوق نہیں کہہ سکتا۔"

اسحاق نے امام احمد اور دوسرے علما کے بیانات قلمبند کرکے مامون کے پاس بھیج

(۱) حیوۃ الحیوان دمیری ج ۱ ص ۱۵ (۲) احمد بن حنبل والمحنۃ ص ۵۳، ۵۴۔

دیے، مامون نے اس کے جواب پر یہ حقارت آمیز تنقید کی تھی اور امام احمد کے بارے میں لکھا تھا کہ ''ان کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا امیر المومنین نے اسے پڑھا، احمد کو بتادو کہ امیر المومنین اس کے مفہوم ومنشا سے پورے طور پر واقف ہیں، اس مسئلہ میں ان کے جاہلانہ عقیدہ سے مطلع ہوئے اس کا خمیازہ بہرحال ان کو بھگتنا پڑے گا۔''

خط کے آخر میں یہ حکم بھی تھا کہ ''بشر بن ولید اور ابراہیم بن مہدی کو توقتل کردو اور باقی لوگوں میں جن کو اپنی رائے پر اصرار ہو پابہ زنجیر میرے پاس بھیج دو، میں خود ان لوگوں کی موت وحیات کا فیصلہ کردوں گا'' یہ فرمان جب مجمع عام میں پڑھ کر سنایا گیا تو اس کی ہیبت نے بڑے بڑے لوگوں کے عزم کو متزلزل کردیا اور وہ مامون کے ہم زبان ہوگئے، علامہ قواریری اور سجادہ نے کسی قدر استقلال دکھایا مگر جب پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں تو دوسرے دن سجادہ اور تیسرے دن قواریری نے بھی اپنی رائے سے رجوع کرلیا اور صرف امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح آخر وقت تک ثابت قدم رہے، اس لیے ان کو مامون کے پاس پابجولاں بھیج دیا گیا مگر ابھی یہ لوگ رقہ ہی میں تھے کہ مامون کے انتقال کی خبر آگئی۔ (۱)

مامون مرتے وقت ہونے والے خلیفہ کو وصیت کرگیا تھا کہ وہ عقیدۂ خلق قرآن کا لوگوں سے اقرار کرائے اور قاضی احمد بن ابی دُواد کو اپنے دربار سے وابستہ رکھے اور جملہ معاملات میں ان کے رائے ومشورہ پر عمل کرے، معتصم باللہ نے اس وصیت پر پورا پورا عمل کیا اور اس معاملہ میں اپنے پیشرو سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوا۔

امام احمد مامون کی وفات کے بعد طرسوس سے قید وبند کی حالت میں بغداد لائے گئے، راستہ میں ان کے رفیق محمد بن نوح کا انتقال ہوگیا امام صاحب نے ان کی تجہیز وتکفین کی اور نماز جنازہ پڑھائی (۲) اور وہ اکیلے رمضان کے مہینہ میں بغداد پہنچے اور پیروی

(۱) ملخص از تاریخ طبری ج ۱۱ ص ۱۱۲، ۱۳۳ (۲) طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۰۹ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۲۔

میں کئی بھاری بیڑیاں پہنا کر داخلِ زنداں کیے گئے اور پھر سزا کے لیے معتصم باللہ کے سامنے پیش کیے گئے، اس موقع پر لوگوں نے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی اور کہا آپ کے ساتھیوں میں سے تو کسی شخص نے عزیمت کی یہ راہ اختیار نہیں کی، آخر آپ کیوں اس قدر جوش وہمت سے کام لے رہے ہیں؟ تو آپ نے جواب میں صرف اس قدر فرمایا کہ لِلّٰہ اس قسم کی باتیں کرنے کے بجائے کتاب اللہ اور سنتِ نبوی سے کوئی ثبوت پیش کرو، ان دو چیزوں کے علاوہ میں کسی اور بات کا قائل نہیں، بعض لوگوں نے رخصت اور تقیہ کی حدیثیں پیش کیں، فرمایا لیکن حدیث خباب کے بارے میں کیا کہتے ہو، جس میں ہے کہ ''تم سے پہلے لوگوں کو آروں سے چیر دیا جاتا تھا مگر وہ لوگ اپنے دین سے روگردانی کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے'' آپ کے چچا اسحاق بھی آپ کی رہائی کے لیے کوشاں تھے، انھوں نے امام احمد سے کہا ''تمہارے ساتھی تو اقرار کر کے چھوٹ گئے اور تم قید وبند کی مشقت جھیل رہے ہو، آپ نے فرمایا چچا جان'' جاہل لوگ تو خیر ناواقف ہی ہیں لیکن جب علما تقیہ کا سہارا لیں تو آخر حق کس طرح واضح ہوگا'' اسحاق کا بیان ہے کہ انھوں نے مجھ کو بالکل لاجواب کر دیا۔(۱)

معتصم باللہ کو اس مسئلہ سے اتنی دلچسپی اس لئے تھی کہ اول تو مامون کی وصیت تھی، دوسرے احمد بن ابی دُواد برابر اس کو سختی کرنے پر ابھارتے رہتے تھے، ورنہ وہ امام صاحب کے معاملہ میں نرم تھا، اس نے بار بار آپ کو سمجھانے کی کوشش کی اور یہاں تک کہا کہ احمد میں تم پر اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ شفیق اور مہربان ہوں، اگر تم ذرا بھی اقرار پر آمادہ ہو جاؤ تو تمہیں رہا کر دوں گا اور خود اپنے ہاتھوں سے تمہاری ان بیڑیوں کو کھول دوں گا(۲) ایک مرتبہ وہ امام صاحب کی گفتگو سے متاثر ہو گیا اور اس کی سختی میں بہت کمی آگئی، مگر ابوداؤد نے یہ کہہ کر پھر ورغلایا کہ اگر آپ نے ان کو سزا نہ دی تو لوگ کہیں گے کہ مامون کے مسلک سے

(۱) احمد بن حنبل والمحنۃ ص۸۹ (۲) طبقات الشافعیہ ج۱ ص۲۱۲و۲۱۳۔

دستبردار ہو گئے اور .... نے آپ کو زیر کر لیا، یہ سن کر پھر امام صاحب سے بگڑ گیا، امام صاحب کی سزا کی تفصیل خود ان کی زبان سے سننے کے قابل ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جب میں معتصم کے قریب گیا تو سلام کرنے کے بعد کچھ دیر خاموش رہا، پھر عرض کیا، امیر المومنین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس چیز کی تعلیم دی ہے، اس نے کہا لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ کے اقرار وشہادت کی، میں نے عرض کیا کہ ''میں تو اس کی شہادت دیتا ہوں'' پھر حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت بیان کی جس میں وفد عبدالقیس کا ایمان کے متعلق سوال اور رسول اللہ کا جواب مذکور ہے، میری گفتگو کے بعد اس نے ابن ابی دواد سے کچھ باتیں کیں اور مجھ سے کہا اگر تمہارا معاملہ میرے پیش رو خلیفہ کے زمانہ سے نہ چلا آتا تو میں تم سے تعرض نہ کرتا، اس کے بعد عبدالرحمٰن کو مجھ سے بحث ومناظرہ کرنے کا حکم دیا، جس کا سلسلہ تین دن تک جاری رہا، میرے دلائل اور براہین کے سامنے سب کو عاجز اور خاموش ہو جانا پڑا، مگر وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آتے، بغداد کے گورنر اسحاق بن ابراہیم نے کہا، امیر المومنین یہ گمراہ اور کافر ہے، اس کو رہا کرنا دانشمندی کے خلاف ہے، خلیفہ نے غضبناک ہو کر کہا تم پر خدا کی لعنت ہو، مجھ کو امید تھی کہ تم میری بات مان لوگے، اب اس نے میرے جسم کے کپڑے اتارنے اور مجھ کو گھسیٹنے کا حکم دیا اور جلادوں کو طلب کیا، میں نے عرض کیا، امیر المومنین خدا سے ڈریے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لایحل دم امرء مسلم یشهد ان لآالٰه الّاالّٰله الا باحدی الثلاث.	بجز تین صورتوں کے کسی حال میں بھی کسی مسلمان کا جو لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرتا ہو خون بہانا جائز نہیں۔

دوسری حدیث میں نے یہ پڑھی:

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لاالٰه الااللّٰه فاذا	مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے تا آنکہ وہ لا الٰہ نہ کہہ دیں، جب

قالوها عصموا منی دمائهم واموالهم۔	انھوں نے لا الٰہ اِلا اللہ کہہ دیا تو ان کی جان و مال محفوظ ہو گیا۔

اس لیے آپ میرے خون کو کیسے حلال سمجھ رہے ہیں، میں نے تو حلال کرنے والے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے، امیر المومنین جس طرح اس وقت میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں، اسی طرح آپ کو بھی خدا کے سامنے کھڑا ہونا ہے، میرا خیال تھا کہ اب وہ باز آ جائیں گے لیکن لوگ برابر ان کو اکساتے اور مجھ کو کافر اور گمراہ بتاتے رہے، معتصم نے ان کی باتوں سے متاثر ہو کر جلادوں کو مجھے کوڑے مارنے کا حکم دیا، اس حکم پر ہر جلاد دو کوڑے پوری قوت سے لگاتا، اس طرح مجھ کو بہت سے کوڑے لگائے گئے، ہر کوڑے پر مجھے غشی طاری ہو جاتی تھی، جب کوڑے لگانا بند کر دیا جاتا تو ہوش میں آ جاتا اور دیکھتا کہ معتصم میرے پاس موجود ہے اور کہہ رہا ہے، احمد کیوں نہیں لوگوں کی بات مان لیتے، دوسرے حاضرین کہتے کہ خلیفہ تم سے درخواست کر رہے ہیں اور تم ان کی بات بھی ٹھکرا رہے ہو مگر میں کسی بات پر دھیان نہ دیتا، میرا اصرار صرف اس قدر تھا کہ:

اعطونی شیئا من کتاب الله او سنة رسوله حتی اقول به۔	میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اس کے رسول کی سنت سے کوئی دلیل لادو تب ہی میں تمہاری بات مان سکتا ہوں۔

اس پر مجھ کو زدوکوب کیا جاتا، آخر میں مار کی شدت سے میرے ہوش وحواس بجا نہ رہے اور تکلیف کا احساس تک ختم ہو گیا، اس سے خلیفہ خوفزدہ ہو گیا اور اس نے رہائی کا فرمان جاری کر دیا اور پورے اَسّی کوڑے زور و قوت سے لگائے جانے کے بعد مین ۲۵ رمضان کو رہا کر دیا گیا۔(۱)

حافظ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ امام صاحب کو جب سزا دینے کے لیے لایا گیا

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۴ و طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۱۱ تا ۲۱۳۔

تو بغداد میں ایک کہرام مچ گیا تھا اور جب پہلا کوڑا لگایا گیا تو آپ نے بسم اللہ کہا، دوسری مرتبہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہا، تیسری بار فرمایا القرآن کلام اللہ غیر مخلوق اور چوتھی مرتبہ یہ آیت تلاوت کی، لَنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا، محمد بن اسماعیل روایت کرتے ہیں کہ ایک نوجوان کو میں نے یہ کہتے سنا کہ احمد کو ۸۰ کوڑے جتنے زور سے لگائے گئے تھے اگر کسی ہاتھی کو بھی اتنے زور سے مارا جاتا تو وہ چیخ اٹھتا۔(۱)

رہائی کے وقت بھی ابن ابی دواد نے مزاحمت کی مگر اس کا بس نہ چلا معتصم باللہ نے ایک بہترین خلعت اور سواری دے کر روانہ کیا، آپ کے ہمراہ جم غفیر تھا، گھر آنے کے بعد آپ نے خلعت فروخت کر کے اس کی قیمت غربا و مساکین میں تقسیم کر دی۔(۲)

رہائی کے بعد معتصم باللہ کو امام صاحب کے ساتھ اتنی سختی برتنے پر ندامت ہوئی، اسحاق کو تاکید کی کہ امام صاحب کی خیریت سے برابر مطلع کرتا رہے، وہ ہر روز آپ کے گھر جا کر مزاج پرسی کرتا تھا، خلیفہ کی طرف سے طبی امداد بھی بہم پہنچائی گئی، جب امام صاحب صحت یاب ہو گئے تو وہ بہت خوش ہوا اور سارے مسلمانوں میں بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔(۳)

ابتلا کے بعد امام صاحب بہت کمزور ہو گئے، پشت پر ضرب کے جو نشانات پڑ گئے تھے، وہ ہمیشہ باقی رہے، کلائی میں ایسا کاری زخم لگا تھا کہ عمر بھر اس کی تکلیف محسوس کرتے رہے، آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''اللہ ابوالہیثم کی مغفرت کرے'' آپ کے فرزند عبداللہ نے دریافت کیا یہ کون شخص ہے؟ فرمایا جب مجھ کو کوڑے لگانے کے لئے جلادوں کے درمیان کھڑا کیا گیا تو ایک نوجوان نے پیچھے سے میرا دامن کھینچا اور کہا مجھ کو جانتے ہو؟ میں نے کہا نہیں، اس نے بتایا کہ میں مشہور عیار و شاطر ڈاکو ابوالہیثم ہوں، مجھے دنیا کے چند معمولی خزف ریزوں کے لئے مختلف وقتوں میں اٹھارہ ہزار کوڑے لگائے گئے مگر

---

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۸ (۲) احمد والمحنۃ ص ۱۴۳ (۳) ایضاً۔

میں اپنے شیطانی اعمال سے باز نہیں آیا، تم کو خدا کی راہ میں مارا جائے گا اس لئے تمہارے دل میں راہ حق سے انحراف کا خیال بھی نہیں آنا چاہئے مجھ پر اس بات کا بڑا اثر ہوا اور اس سے بڑی تقویت حاصل ہوئی اب بھی جب ضرب کی شدت محسوس ہوتی ہے تو اس شخص کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔(۱)

امام احمد نے سوائے ابن ابی دواد کے ان تمام لوگوں کو جنھوں نے آپ کے ساتھ یہ ظالمانہ برتاؤ کیا تھا، معاف کر دیا، ابن ابی دواد کے بارے میں فرماتے تھے کہ اگر وہ اس فتنہ کا داعی ومحرک نہ ہوتا اور اپنی بدعتوں سے باز آجاتا تو اسے بھی معاف کر دیتا، واثق باللہ نے عفوخواہی کی تو ارشار فرمایا کہ رسول اللہ کے خاندان سے تمہاری قرابت وتعلق کی بنا پر میں نے اول روز ہی تمہیں معاف کر دیا تھا۔(۲)

معتصم باللہ کے بعد واثق باللہ خلیفہ ہوا، یہ بھی اس مسئلہ میں بڑا سخت تھا، اس نے بہت سے محدثین اور علمائے حق کو قید وبند اور قتل کی سزائیں دیں، مشہور صاحب عزیمت بزرگ احمد بن نصر خزاعی کو تختۂ دار پر چڑھایا لیکن امام احمد کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی، البتہ ان کو جلاوطن کر دیا، امام صاحب اس کے زمانۂ خلافت بھر روپوش رہے، جمعہ وجماعت کے لئے بھی باہر نہیں نکلتے تھے۔(۳)

اس کے بعد متوکل خلیفہ ہوا، اس نے ان تمام عقائد وخیالات کو جو کتاب وسنت کے خلاف تھے بالکل روک دیا، امام صاحب کو ابتلا سے نجات دلوائی اور ان کے اعزاز واکرام کا فرمان جاری کیا اور یہ اعلان بھی کرا دیا کہ قرآن مخلوق نہیں ہے، اس کی خلافت سے معتزلہ کے زور وقوت کا خاتمہ اور ان کا اثر کم ہو گیا۔(۴)

یہ فتنہ ۲۱۸ھ سے ۲۳۴ھ تک یعنی سولہ سال رہا اور امام احمد نے ۲۸ یا ۳۰ مہینے قید

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۸ (۲) ایضاً (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۵ (۴) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۵، الطبقات الکبریٰ شعرانی ج ۱ ص ۴۷۔

وبند اور مشقت ومحن میں گذارے۔(۱)

اس عظیم ابتلا سے جو امام احمد کی ہمت وعزیمت کا غیر معمولی نمونہ ہے، ان کی شہرت ومقبولیت میں بڑا اضافہ ہوگیا، امام صاحب کے دوسرے اوصاف وکمالات میں تو اور لوگ بھی شریک وسہیم تھے لیکن راہ حق میں یہ ثابت قدمی اور اولوالعزمی انھیں کا طغرائے امتیاز ہے، علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں ''امام احمد کی ذات گرامی صبر وابتلا اور استقامت علی الحق کے لیے ضرب المثل ہے، تین جابر وقاہر بادشاہوں کے ظلم واستبداد اور غیر معمولی مشکلات وشدائد کے باوجود ان کی استقامت وعزیمت میں فرق نہ آیا، اور نہ وہ کتمانِ حق اور اخفائے علم کے مرتکب ہوئے اور نہ رخصتوں اور تقیہ کا سہارا لیا بلکہ ہر حال میں انھوں نے اپنے کو سنت نبوی اور آثار صحابہ سے وابستہ رکھا اور دین کی اشاعت اور بدعات کا استیصال کرتے رہے، یہ وہ مخصوص فضل وکمال ہے جس میں امام صاحب کا کوئی معاصر صاحب علم ان کا شریک نہیں''(۲)

اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں'' کہ اللہ نے اسلام کو دو آدمیوں کے ذریعہ اعزاز وغلبہ عطا کیا، امت میں ان دونوں کی کوئی مثال نہیں، یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ جنھوں نے فتنۂ ارتداد کے موقع پر اس کا مقابلہ اور اسلام کی مدافعت کی، دوسرے امام احمد جو فتنۂ خلق قرآن کے زمانہ میں پیش پیش رہے۔

بعض بزرگوں نے آپ کی وفات کے بعد خواب دیکھا کہ آپ اس حق گوئی اور صبر واستقلال کی بنا پر خدا کے خاص فضل وانعام سے نوازے گئے۔(۳)

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج۱۰ص۳۳۶ (۲) مجموعۃ الرسائل ص۵ (۳) تاریخ بغداد ج۴ص۴۱۷ و۴۱۸ و۴۲۳، البدایہ والنہایہ ج۱۰ص۳۳۲،۳۴۲ وطبقات الشافعیہ ج۱ص۲۰۴،۲۰۲ و ابن خلکان ج۱ص۲۸ وتاریخ ابن عساکر ج۲ص۴۲ وتہذیب الاسماء ج اقسم اص۱۵۔

علالت ووفات

۲؍ربیع الاول بروز چہارشنبہ کو شدید بخار میں مبتلا ہوئے، ۹؍دن تک علالت کا سلسلہ جاری رہا، بیماری کے زمانہ میں عیادت کرنے والوں کا بڑا ہجوم رہتا تھا، مسجدیں بھر جاتیں تھیں، سڑکوں اور گلیوں میں لوگوں کا اتنا مجمع ہوتا تھا کہ آمدورفت کے راستے بند اور خرید وفروخت دشوار ہوگئی تھی، لوگوں کو جب موقع ملتا تو جوق در جوق حاضر ہوکر سلام عرض کرتے، خلیفہ کو اس اژدہام کی خبر ہوئی تو اس نے گلیوں کے صدر دروازوں پر وقائع نگار متعین کردیے جو لوگوں کو امام صاحب کے حال سے مطلع کرتے تھے، راستہ بند ہوجانے کی وجہ سے زائرین چھپ کر دیواریں پھاند کر امام صاحب کی زیارت کرتے، آخری روز ایک بزرگ داخل ہوئے اور فرمایا احمد خدا کے حضور حاضر ہونے کو یاد کرو تو بے اختیار چیخ نکلی اور آنسو رخسار پر ٹپک پڑے، بھرائی ہوئی آواز میں بچوں کو بلوایا اور ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور انگلیوں میں خلال کرانے کے لیے کہا، وضو کرتے وقت برابر اللہ کو یاد کرتے رہے، وضو کرنے کے بعد روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی، اس سے پہلے ایک موثر وصیت بھی کی تھی۔

تاریخ وفات ۱۲؍ربیع الاول ۲۴۱ھ ہے، اس وقت ۷۷ سال کی عمر تھی، ابن خلکان نے ۱۷؍ربیع الاول اور مورخین نے رجب اور ربیع الآخر کا مہینہ بھی لکھا ہے، وفات کی خبر مشتہر ہوتے ہی صف ماتم بچھ گئی، گلیوں اور سڑکوں پر صرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے جو درد وغم کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

محمد بن طاہر امیر بغداد نے اپنے بچوں اور حاجب کے ہمراہ کفن بھجوایا مگر امام صاحب کے متعلقین نے اس کو لینے سے انکار کیا اور کہا کہ امیر نے جب زندگی میں ان کو ناگوار کاموں سے معاف رکھا تو موت کے بعد بھی معاف رکھیں۔

جنازہ میں اتنا بڑا مجمع تھا کہ صحرائے ابی قیراط سے جہاں جنازہ رکھا گیا تھا سوق رقیق اور قطیعہ کے پل تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے، محمد بن طاہر نے نماز کے بعد شرکا کا تخمینہ لگایا تو تقریباً آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں تھیں، ان کے علاوہ بے شمار آدمی سڑکوں، راستوں اور چھتوں وغیرہ پر تھے، عبدالوہاب وراق کا بیان ہے،.......... کہ جاہلیت اور اسلام کسی زمانہ میں اتنے زیادہ آدمی کسی کے جنازہ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔(۱)

امام کے فرزند عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا تھا کہ اہل بدعت اور ہمارے درمیان وجہ امتیاز جنازہ ہے، اللہ نے ان کی بات صحیح کر دی، بلاشبہ وہ امام سنت تھے، آپ کے سب سے بڑے حریف احمد بن ابی دواد کی جو قاضی القضاۃ بھی تھے، موت کی ایک شخص کو بھی پرواہ نہیں ہوئی، صرف حکومت کے ارکان اور وابستگان کی ایک محدود جماعت جنازہ میں شریک ہوئی۔

تجہیز و تکفین کے دن مسجد رصافہ میں جن لوگوں نے عصر کی نماز ادا کی تھی، ان کی تعداد بھی ۲۰ ہزار سے زیادہ تھی حاضرین کی زیادتی کی وجہ سے جنازہ کی نماز کئی بار ہوئی، اور عصر سے پہلے جسد مبارک کو قبر میں نہ رکھا جا سکا، تدفین کے بعد بھی نماز جنازہ کا سلسلہ جاری رہا، امیر بغداد محمد بن عبداللہ بن طاہر نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

باب حرب کے مقبرہ میں امام صاحب کو دفن کیا گیا، وفات کے بعد بھی ایک عرصہ تک لوگ قبر پر آتے اور کئی دنوں تک نماز جنازہ پڑھتے رہے، مزار مبارک اب تک زیارت گاہ خلائق ہے۔

امام صاحب کی وفات اور مغفرت کے متعلق بعض کرامتیں اور خواب بیان کیے جاتے ہیں، متعدد لوگوں نے آپ کی مغفرت اور عالم آخرت میں آپ کے اعزاز و اکرام کے خواب دیکھے۔

---

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۲۰۰ و ۲۰۱ و تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۲۲ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۵ و ۴۶۔

ازواج واولاد

امام احمد نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں، پہلی بیوی عباسہ بنت فضل کے بطن سے بڑے صاحبزادہ صالح تولد ہوئے، ان کی وفات کے بعد ریحانہ سے شادی کی، ان کے بطن سے عبداللہ پیدا ہوئے، جب ریحانہ کا بھی انتقال ہوگیا تو ایک لونڈی کو خرید کر عقد میں داخل کیا، ان سے ۴ لڑکے حسن، حسین، محمد اور سعید اور ایک لڑکی زینب پیدا ہوئیں۔

ابوالفضل صالح: یہ امام صاحب کے سب سے بڑے فرزند اور ۲۰۳ھ میں پیدا ہوئے، کم سنی میں گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی وجہ سے ان کو امام صاحب سے نقل وروایت کا زیادہ موقع نہیں ملا، تاہم ان کے واسطے سے امام صاحب کی حدیثوں کا بڑا حصہ مروی ہے اور وہ فقہ حنبلی کے ناقلین میں بھی شمار کیے جاتے ہیں، آخر عمر میں اصبہان کے قاضی مقرر کیے گئے، جب عہدۂ قضا پر مامور کیے گئے تو رو پڑے اور فرمایا کہ مجھے میرے والد یاد آگئے، اس لیے رو پڑا، وہ مجھ کو اس حالت میں دیکھنا پسند نہیں کرتے لیکن خدا شاہد ہے کہ میں نے قرضوں کی زیادتی اور اپنے والد کے اہل وعیال کی کفالت ہی کے خیال سے یہ منصب قبول کیا، رمضان ۲۶۶ھ میں وفات پائی۔(۱)

ابوعبدالرحمٰن عبداللہ: یہ نہایت ثقہ وضابط اور بڑے بلند پایہ محدث تھے،(۲) ان کو امام احمد کے علاوہ بھی متعدد کبار محدثین سے روایت کرنے کا فخر حاصل ہے، امام احمد صاحب کی روایتیں سب سے زیادہ انھیں کے واسطہ سے مروی ہیں، انھوں نے امام کی اکثر کتابوں کی بھی روایت کی ہے یکشنبہ ۲۲ ر جمادی الاولیٰ ۲۹۰ھ کو انتقال کیا، آپ کے بھتیجے زہیر بن صالح نے جنازہ کی نماز پڑھائی، میت میں ایک بڑے مجمع نے شرکت کی، وفات سے پہلے

(۱) مقدمہ ثلاثیات مسند احمد ص ۱۴، ۱۵ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۹ (۲) الفہرست ابن ندیم ص ۳۲۲۔

دریافت کیا گیا کہ آپ کس جگہ دفن ہونا پسند کریں گے، فرمایا مجھے معتبر طریقے سے معلوم ہوا ہے کہ قطیعہ میں کوئی پیغمبر مدفون ہیں اس لیے اپنے والد کے مقابلہ میں پیغمبر کے قرب و جوار میں دفن ہونا مجھ کو زیادہ پسند ہے۔(۱)

سعید امام صاحب کی وفات سے ۵۰ روز قبل پیدا ہوئے تھے، بعد میں کوفہ کے گورنر بھی مقرر ہوئے، محمد امام کی بیماری کے زمانہ میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے۔(۲)

کلام وعقائد

امام احمد فقیہ و مجتہد ہونے کے باوجود عملی اور اعتقادی مسائل میں فقہا اور متکلمین کی طرح زیادہ تحقیق و تدقیق نہیں کرتے تھے بلکہ محدثین کے مسلک کے مطابق جو کچھ ظواہر حدیث سے ثابت ہوتا تھا اسی پر عمل کرتے اور اعتقاد رکھتے تھے، اس لیے جب ان سے اس قسم کے سوالات کیے جاتے تو وہ خاموش رہتے اور ان میں غور و تفتیش کو بدعت بتاتے، ایک شخص نے کرابیسی سے قرآن کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا وہ اللہ کا کلام اور غیر مخلوق ہے، اس نے پوچھا متکلم اور قاری قرآن کے جن الفاظ کو پڑھتا اور ادا کرتا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کرابیسی نے کہا قاری کی قرأت اور متکلم کا قول مخلوق ہے، امام احمد سے اس کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے کہا اس طرح غیر ضروری سوالات اور مباحث میں غور و خوض اور ان کی بحث و تفتیش بدعت اور سکوت افضل ہے،(۳) ایک دفعہ الفاظ قرآن کے بارے میں آپ سے تین بار سوال کیا گیا آپ دو مرتبہ خاموش رہے تیسری مرتبہ امام بخاریؒ نے جواب دیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں، البتہ بندوں کے افعال مخلوق ہیں

(۱) مقدمہ ثلاثیات، مسند احمد ص ۱۵ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۲۹ (۲) مقدمہ ثلاثیات، مسند احمد ص ۱۵، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۴۱ (۳) احمد بن حنبل والمحنہ ص ۳۳۔

لیکن اس طرح کے مسائل میں پڑنا بدعت اور خلافِ سنت ہے۔(۱)

گو امام احمد اس قسم کے مسائل عام مسلمانوں کے سامنے بیان کرنا پسند نہیں کرتے تھے تاہم اقتضاء ضرورت کی بنا پر ان سے اس طرح کے مسائل میں جو آرا منقول ہیں، ان میں بھی احتیاط پوری طرح ملحوظ ہے مثلاً:

صفات الٰہی اور قرآن: قرآن کے بارے میں امام صاحب کی رائے گذر چکی ہے ایک مرتبہ متوکل کو اس مسئلہ کے متعلق جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا ''سلف صالحین قرآن کو کلام اللہ اور غیر مخلوق مانتے تھے اور یہی ہمارا بھی مسلک ہے، میں صاحب کلام نہیں اور نہ اس معاملہ میں کسی قسم کی بحث وتفتیش کو پسند کرتا ہوں، کتاب اللہ سنت نبوی اور صحابۂ کرام وتابعین عظام سے جو کچھ ثابت ومنقول ہے اس سے زیادہ کدوکاوش کو میں معیوب سمجھتا ہوں۔(۲)

وہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ان صفتوں سے جو قرآن وحدیث میں بیان ہوئی ہیں متصف مانتے ہیں لیکن ان کی ماہیت وحقیقت پر بحث وگفتگو کو ناپسند اور ان کی دوراز کار تاویل کو بدعت سمجھتے تھے، ان کے نزدیک جس طرح اللہ قدیم ہے، اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں اور کلام بھی خدا کی ایک صفت ہے اس لیے وہ قدیم ہے۔

تشبیہ اور جسمیت: وہ اللہ کی تشبیہ اور جسمیت کے قائل نہیں ہیں اسی لیے (وَجَـآءَ رَبُّكَ) سے وَجَآءَ ثَوَابُ رَبِّكَ مراد لیتے ہیں۔(۳)

رؤیت باری: عام اہل سنت والجماعت کی طرح امام احمد بھی عالم آخرت میں مومنین کے لیے اللہ کی رؤیت اور دیدار کے قائل ہیں، اس کے ثبوت میں متعدد قرآنی آیات واحادیث موجود ہیں، امام صاحب صہیب رومی کی ایک روایت سے بھی استدلال کرتے تھے جس میں لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ الآية میں وَزِيَادَةٌ کی تفسیر رؤیت

---

(۱) احمد بن حنبل والمحنہ ص ۳۵ (۲) ایضا ص ۱۵۹ (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۷۔

سے کی گئی ہے۔(۱)

ایمان واسلام: امام احمد کے نزدیک ایمان قول وعمل دونوں سے عبارت ہے اور اس میں کمی بیشی ہوسکتی ہے(۲) ان کا قول ہے کہ کارِ خیر سے ایمان میں اضافہ اور معاصی سے اس میں کمی ہوجاتی ہے، برے کاموں کے ارتکاب سے ایمان سلب ہوجاتا ہے لیکن اسلام باقی رہتا ہے، اسلام اس وقت ختم ہوتا ہے جب آدمی خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرتا یا فرائض میں کسی فرض کو تمرد کی وجہ سے ترک کردیتا ہے، غفلت اور کوتاہی سے اگر کوئی شخص فرض بجانہ لائے تو یہ خدا کی مرضی پر موقوف ہے کہ اسے عذاب دے یا معاف کردے۔(۳)

مرتکبین کبائر: مرتکب کبائر کو کافر نہیں سمجھتے تھے، آپ کا قول ہے کہ ''اہل توحید میں سے کوئی شخص کافر نہیں ہوسکتا خواہ وہ کبائر کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو۔(۴)

لیکن وہ تارک صلوٰۃ کو کافر سمجھتے تھے، اس بارے میں ان کا امام شافعیؒ سے ایک مناظرہ بھی ہوا تھا۔

مسئلہ خلافت: حضرت علیؓ کی ذات سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے تھے لیکن عام صحابہ کی عظمت وبرتری کے بھی قائل تھے، خلفائے ثلاثہ اور حضرت امیر معاویہؓ وغیرہ کسی صحابی کو سب وشتم کرنا ان کے نزدیک معصیت ہے، خلافت کے معاملہ میں ان کا وہی نقطۂ نظر ہے جو عام اہل سنت والجماعت کا ہے، امام صاحب اس کی تائید میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت پیش کرتے تھے:

ماراٰہ المسلمون حسنا فھو	جس چیز کو جملہ مسلمان بہتر خیال کریں
عند اللہ حسن ومارأوہ	وہ اللہ کے نزدیک بہتر ہے اور جس کو
سیئاً فھو عنداللہ سیئ	سب برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی
	برا ہے۔

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ص ۳۲۷ (۲) ایضاً (۳) المناقب ابن جوزی ص ۲۱۷ (۴) ایضاً۔

فرماتے تھے کہ تمام صحابہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو رسول اللہ کا خلیفہ منتخب کیا اس سے ان کی فضیلت و بزرگی خود ہی ثابت ہو جاتی ہے، عمر بن عثمان حمصی نے خلافت کے متعلق آپ کی رائے دریافت کی تو فرمایا، پہلے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ ہیں، اس کے بعد حضرت عمرؓ پھر حضرت عثمانؓ اور سب سے آخری خلیفہ حضرت علیؓ ہیں، جو لوگ حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر ترجیح دیتے ہیں وہ درحقیقت ان اجلہ صحابہ اور اہل شوریٰ پر نکتہ چینی کرتے ہیں جنھوں نے حضرت عثمانؓ کو مقدم قرار دیا تھا۔(۱)

فقہ واجتہاد (۲)

کیا امام احمد فقیہ اور صاحب مذہب نہیں تھے: امام احمد کا شمار ان چار مشہور ائمہ اسلام اور فقہا مجتہدین میں ہوتا ہے جن کے اجتہادی مذاہب پر چوتھی صدی سے اب تک مسلمان عمل کرتے چلے آرہے ہیں لیکن بعض متقدمین علما کو ان کے فقیہ اور صاحبِ مذہب ہونے میں کلام ہے، علامہ ابن جریر فرماتے ہیں:

انما ھو رجل حدیث لا رجل فقه. (۳) — وہ صرف محدث ہیں، فقیہ نہیں۔

علامہ ابن عبدالبر نے الانتقا میں محض ائمہ ثلاثہ کا تذکرہ کیا ہے، ابن قتیبہ نے ان کو فقہا کے زمرہ میں شامل نہیں کیا ہے، بشاری مقدسی نے ان کو فقہا کے بجائے اصحاب

(۱) البدایہ والنہایہ ج۱۰ص ۳۲۸ (۲) امام احمد کے حالات اور کارناموں پر موجودہ زمانہ کے مشہور مصری عالم ڈاکٹر ابوزہرہ نے نہایت عمدہ کتاب تالیف کی ہے اور اردو میں اس کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں اس کتاب کا یہ حصہ بڑا اہم اور نہایت بیش قیمت ہے، ہم نے بھی یہاں اس سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔(۳) ضحیٰ الاسلام ج۲ص ۲۳۵۔

حدیث میں شامل کیا ہے(۱) مگر ان کے سوا اکثر علما متقدمین نے ان کو بلند پایہ فقیہ و مجتہد بھی مانا ہے اور امامِ فقہ و صاحبِ مذہب بھی تسلیم کیا ہے، امام شافعی تک نے ان کو فقہ و اجتہاد میں امام بتایا ہے،(۲) اور متاخرین تو امام احمد کو محدث کے بجائے فقیہ ہی کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں، ساتویں صدی کے مشہور عالم دمیری نے اصحاب المذہب المتبوعہ میں ان کے مذہب کا ذکر کیا ہے(۳) اور اسی صدی کے مشہور مورخ علامہ ابن خلدون کا بیان ہے۔

وقد صار اهل الاسلام اليوم على تقليد هؤلاء الأيمة الاربعة. (۴)	اب مسلمان ان ہی چار اماموں کی تقلید کرتے ہیں۔

علامہ شہرستانی نے مسلمانوں کے اجتہادی مذاہب میں اس مذہب کو بھی شامل کیا ہے(۵)، صاحب مفتاح السعادۃ لکھتے ہیں ''امام احمد ان مجتہدین میں ہیں جن کے اقوال و آرا پر عمل کیا جاتا ہے اور جن کا مذہب اکثر شہروں میں مروج ہے''(۶) صاحب کشف الظنون تحریر فرماتے ہیں ''مشہور مذاہب جن کی صحت مسلم ہے چار ہیں اور وہ امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد کی جانب منسوب ہیں''(۷) شاہ ولی اللہ صاحب رسالۂ الانصاف میں محدثین فقہا کے متعلق تحریر فرماتے ہیں ''ان لوگوں نے گذشتہ ائمہ فقہ کی تقلید پر اکتفاء کرنے کے بجائے خود اصول و قوانین متعین کئے ......ان لوگوں میں بھی غیر معمولی فضل و کمال، فقہی بصیرت اور حدیث اور اس کے مراتب و درجات سے واقفیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ نمایاں امام احمد ہیں''(۸) اور عقد الجید میں فقہ اسلامی کے مذاہب اربعہ میں اس مسلک کو بھی شامل کیا ہے۔

(۱) احسن التقاسیم ص ۳۷ (۲) مختصر صفۃ الصفوہ ص ۲۲۱ (۳) حیاۃ الحیوان ج ۱ ص ۸۱ (۴) مقدمہ ابن خلدون ص ۳۹۱ (۵) الملل والنحل شہرستانی برحاشیہ الملل ابن حزم ج ۲ ص ۴۵ (۶) مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۹۸ (۷) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰۲ (۸) الانصاف فی بیان سبب الخلاف ص ۱۳۔

علامہ شبلیؒ عہد مامون کے اہل کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اور خصوصاً امام شافعیؒ اور امام احمد کا تو وہ پایہ ہے کہ اسلامی دنیا کے بڑے بڑے حصوں میں انھیں کے اجتہادی مسائل پر گیارہ سو برس سے آج تک مذہبی قانون بنے ہوئے ہیں۔"(۱)

غرض ساتویں صدی بلکہ اس کے پہلے سے اسلامی فقہ وقانون اور اس کی تاریخ وتدوین کے سلسلہ میں امام احمد کا ایک امام فقہ اور صاحب مذہب کی حیثیت سے ذکر ہوتا چلا آرہا ہے، اس لیے جس طرح ان کا فقیہ ومجتہد ہونا مسلم ہے اسی طرح صاحب مذہب اور امامِ فقہ ہونا بھی بلا ریب ثابت ہے۔

متقدمین کا امام صاحب کو فقیہ وصاحب مذہب کی حیثیت سے تذکرہ نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ آپ کے تفقہ واجتہاد کے قائل نہیں تھے، بلکہ اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ امام صاحب پر حدیث کا اثر زیادہ غالب تھا، اس لیے ان بزرگوں نے ان کے نمایاں وصف وامتیاز کے اعتبار سے ان کو فقیہ کے بجائے صرف محدث ہی کہا اور لکھا۔

افتا کے شرائط: امام احمد کے نزدیک علوم قرآن، اسانید صحیحہ، سنن نبوی اور متقدم علما کے اقوال سے پوری واقفیت کے علاوہ مفتی کے اندر مندرجہ ذیل اوصاف پائے جانے ضروری ہیں:

۱-اس کی نیت خالص ہو، ۲-علم، حلم، وقار اور سکینت سے متصف ہو، ۳-علم میں کامل اور صاحب غلبہ واختیار ہو تاکہ جرأت کے ساتھ اپنے فیصلوں کو نافذ کر سکے، ۴-بذات خود مکتفی اور مستغنی ہو یعنی دوسروں کا محتاج ودست نگر نہ ہو، ۵-لوگوں کے حالات اور ذہنی کیفیات سے باخبر ہو(۲)

فقہ حنبلی کے اصول: حافظ ابن قیم نے امام احمد کے تفقہ واجتہاد کے حسب ذیل اصول بیان کئے ہیں۔

۱-نصوص: فقہ حنبلی میں سب سے اہم اور مقدم چیز یہی ہے، اس میں کتاب و

---

(۱) المامون ج ۲ ص ۱۸ (۲) اعلام الموقعین ج ۳ ص ۲۲۸، ۲۲۴۔

سنت دونوں شامل ہیں اس اصل کے ہوتے ہوئے کسی اور چیز کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ فتاوائے صحابہ: امام احمد کے نزدیک نصوص کے بعد اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ صحابہ کے اقوال وفتاوئی ہیں اور وہ ان کو کتاب وسنت کے بعد ہر چیز پر مقدم قرار دیتے ہیں، اگر کسی مسئلہ میں صحابہ سے مختلف اقوال منقول ہوں تو اس قول کو ترجیح دی جائے گی جو کتاب وسنت سے قریب تر ہو، اگر اس کا اندازہ نہ ہو سکے تو صرف اختلاف صحابہ کو ذکر کر کے خاموشی اختیار کر لی جائے گی اور کسی کو ترجیح نہ دیا جائے گا(۱) دوسرا اصول یہ ہے کہ افضل صحابی کا قول مرجح سمجھا جائے گا، مثلاً:

صحابہ میں اختلاف کی صورت میں خلفا کا قول مرجح مانا جائے گا، یا ایک جانب شیخین ہوں اور دوسری طرف دوسرے خلفا تو شیخین کے قول کو اختیار کیا جائے گا، اسی طرح حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ میں اختلاف کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ کی رائے پر عمل کیا جائے گا، ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر ایک ہی درجہ اور مرتبہ کے صحابہ کے درمیان اختلاف ہو تو ایک کا قول دوسرے کے لیے حجت نہ ہوگا، امام صاحب سے اس کی بھی روایت کی گئی ہے کہ وہ اختلاف صحابہ کی صورت میں ان سب کے اقوال پر عمل کرنے کو بہتر سمجھتے تھے اور اپنی رائے سے کسی صحابی کے قول کو مرجوح قرار دینا پسند نہیں کرتے۔(۲)

بعض لوگ امام صاحب پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ فتاوائے صحابہ کے مقابلہ میں نصوص کی بھی پرواہ نہیں کرتے، علامہ ابن قیم ان لوگوں کے جواب میں لکھتے ہیں:

امام احمد نص کی موجودگی میں اسی کے مطابق فتوئی دیتے تھے اور اس کے مخالف ہر چیز کو رد فرمادیتے تھے مثلاً حضرت عمرؓ کے برخلاف انھوں نے مبتوتہ کے متعلق فاطمہ بنت قیس کی حدیث اور جنبی کے تیمم کے بارے میں عمار بن یاسرؓ کی حدیث کو صحیح قرار دیا اور حضرت ابن عباسؓ اور ایک روایت کے مطابق حضرت علیؓ کے ایک فتوئی کو جو سبیعہ اسلمی

(۱) اعلام الموقعین ج ۱ص ۳۴ (۲) ایضاً ج ۳ ص ۳۷۸۔

کی حدیثِ صحیح کے خلاف قرار فرما دیا۔(۱)

۳-ضعیف ومرسل روایات: تیسرا ماخذ ضعیف ومرسل روایات کو بتاتے ہیں، اسحاق بن ابراہیم ہانی نے ان سے چند مسائل دریافت کئے جن کے متعلق بعض مرسل روایتیں موجود تھیں لیکن صحابہ وتابعین سے بروایت صحیح وباتصال ان کے خلاف فتویٰ موجود تھا تو فرمایا کہ ''صحابہ سے جو کچھ باتصال ثابت ہے وہ مجھ کو زیادہ پسند ہے اور قیاس ورائے پر ان کو ترجیح دی جائے گی، آپ کے صاحبزادے عبداللہ نے دریافت فرمایا کہ صحیح وصالح اور ضعیف وسقیم روایتوں میں امتیاز نہ کرنے والے محدث اور فقیہ وصاحب رائے میں کس کے فتویٰ پر عمل کیا جائے گا، فرمایا ''میرے نزدیک رائے کے مقابلہ میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے''۔

یہ واضح رہے کہ ضعیف سے منکر، باطل اور ایسی حدیثیں مراد نہیں ہیں جن کے راوی متہم ہوں، دوسرے فقہا نے بھی اس اصول کو ایک حد تک اختیار کیا ہے، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے علاوہ امام اعظمؒ نے بھی قہقہہ اور نبیذِ تمر سے وضو کئے جانے کے متعلق ضعیف حدیثوں کو قیاس پر ترجیح دیا ہے۔

۴-قیاس: سب سے آخری چیز قیاس ہے، اور امام صاحب محض ضرورت کے وقت اس کی اجازت اور ممکن حد تک اس سے پرہیز کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، اپنے ایک شاگرد کو تاکید کی کہ

ایاك ان تتكلم فی مسئلة	جس مسئلہ میں اثر موجود نہ ہو اس میں
لیس لك فیها اثر (۲)	بحث وکلام نہ کرو۔

لیکن ظاہر یہ کی طرح وہ قیاس کے منکر نہیں ہیں، ان کا قول ہے کہ ''کوئی شخص قیاس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا'' البتہ وہ اہل عراق کی طرح قیاس میں زیادہ توسع کے قائل نہ تھے۔

(۱) اعلام الموقعین ج۱ص۳۲ (۲) ایضاً ج۱ص۳۱و۳۲۔

ان اصول اربعہ کے علاوہ بھی بعض چیزوں کا امام احمد لحاظ کرتے تھے مثلاً اقوال تابعین، استصحاب، مصالح، سد ذرائع اور اجماع وغیرہ، ان کی تفصیل حنابلہ کی کتابوں میں موجود ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اجماع کے منکر تھے لیکن علمائے حنابلہ نے اس کی جو تشریح کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بعض شرطوں کے ساتھ اجماع کے قائل تھے۔

فقہ حنبلی کی خصوصیات: ۱- فقہ حنبل کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس کا دارومدار تمام تر حدیث وروایت اور نقل واثر پر ہے، امام صاحب مقدور بھر احادیث سے انحراف اور بے تعلقی پسند نہیں کرتے تھے اور احادیث وآثار پر وسعت نظر کی بنا پر ان کو رائے وقیاس سے بہت کم کام بھی لینا پڑتا تھا، عبدالوہاب وراق کا بیان ہے کہ امام احمدؒ نے ستر ہزار مسائل کا اخبرنا وحدثنا کہہ کر جواب دیا(۱) اس خصوصیت کی وجہ سے اول تو امام صاحب غیر وقوع پذیر مسائل کے بارہ میں فتویٰ دینے سے احتراز فرماتے تھے، دوسرے فقہی تفریعات وتخریجات پر ان کے فتوے مبنی نہیں ہوتے تھے، اس لئے اس فقہ کو تمام تر احکام شرعی پر مبنی کہا جاسکتا ہے۔

۲- حیل ومخارج کا جو دراصل مذہبی قیود اور بندشوں سے بچنے کے ذرائع ہیں حنبلی فقہ میں وجود نہیں ہے۔

۳- بعض حیثیتوں سے فقہ حنبلی میں بڑی وسعت اور لچک بھی پائی جاتی ہے کیونکہ امام صاحب کے نزدیک عبادات اور ان مسائل ومعاملات کو چھوڑ کر جن کی حلت وحرمت کی تصریح موجود ہے، اشیا کی اصل اباحت ہے، اس اصل کو تسلیم کر لینے کے نتیجہ میں حنبلی فقہ کے اندر بڑی لچک اور کشادگی پیدا ہوگئی ہے، اس لئے اگر ایک جانب نصوص شرعیہ سے شدتِ تمسک کی بنا پر اس مذہب میں فقہی استنباط کا دائرہ محدود ہوگیا ہے تو دوسری جانب حرام کرنے والی متعدد پابندیوں کو ختم کر کے اس نے بڑی سہولت بھی پیدا کر دی ہے۔

---

(۱) ترجمہ احمد بن حنبل از ابو زہرہ ص ۲۳۰۔

۴۔ حنبلی مذہب نے اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہونے دیا اور ہر دور میں حنابلہ کے اندر ائمہ و مجتہدین موجود رہے۔

فقہ حنبلی کے رواۃ و ناقلین: امام احمد نے اپنے اقوال وفتاویٰ خود منضبط نہیں کئے بلکہ وہ دوسروں کو بھی ان کے جمع و تدوین سے منع کرتے تھے، مگر بعض ضرورتوں کی بنا پر اس کی اجازت بھی ان سے ثابت ہے اس لئے آپ کی زندگی میں آپ کے مذہب کا چرچا تو ہو گیا تھا مگر وہ آپ کے انتقال کے بعد مرتب و مدون کیا گیا، آپ سے براہ راست علوم کی تحصیل و تکمیل کرنے والے حسب ذیل حضرات ہیں۔

ابوبکر احمد بن اثر، احمد بن محمد بن حجاج مروزی، عبدالملک بن عبدالحمید، صالح بن احمد، عبداللہ بن احمد، حرب بن اسماعیل اور ابراہیم بن اسحاق حربی۔

لیکن فقہ حنبلی کے اصل جامع خلال ہیں۔(۱)

خلال: امام احمد کے اقوال و فتاوے کے اصل جامع و مرتب ابوبکر احمد بن محمد بن خلال (م ۳۱۱ھ) ہیں، انھوں نے ۲۰ سے زائد جلدوں میں امام احمد کے فتوے جمع کئے ان کو امام صاحب سے براہ راست کسب فیض کا موقع نہیں ملا لیکن مذہب میں ان کا درجہ بلند ہے، یہ فقہ حنبلی کے جامع و ناقل ہی نہ تھے بلکہ اس کے ناشر بھی ہیں۔

ابوالقاسم خرقی: عمر بن حسین خرقی (م ۳۳۴ھ) بھی کبار حنابلہ میں ہیں، انھوں نے خلال کی کتابوں کی تلخیص اور ان میں اضافہ کیا، ان کی کتاب ''المختصر'' حنبلی مذہب کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہے اس کی متعدد شرحوں میں موفق الدین مقدسی کی شرح المغنی زیادہ مشہور اور اہم ہے۔

غلام الخلال: ابوبکر عبدالعزیز بن جعفر (م ۳۶۳ھ) خلال کے مشہور شاگردوں میں تھے، اس لئے ان کو غلام الخلال کہا جاتا تھا، (۲) انھوں نے بھی خلال کی کتابوں کی تلخیص اور ان

(۱) اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۱ (۲) شذرات الذہب ج ۳ ص ۴۵۔

میں اضافہ کا کام انجام دیا۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ اوران کے شاگرد حافظ ابن قیم بھی اس مذہب کے بڑے اہم رکن اور شارح سمجھے جاتے ہیں۔

اسلامی ملکوں میں اس مذہب کی اشاعت: اس مذہب کی اشاعت بغداد سے ہوئی، شروع میں اس کو وہاں غلبہ بھی حاصل تھا، پھر بصرہ اور عراق میں پہنچا، ساتویں صدی میں مصر کے حدود میں داخل ہوا اور قاضی عبداللہ بن محمد حجادی نے جو ۷۳۸ھ میں عہدۂ قضا پر متمکن تھے اس کی مصر میں عام نشرواشاعت کی، اندلس میں تیسری صدی ہی میں یہ حنبلی مذہب داخل ہو چکا تھا، بقی بن مخلد (۲۰۱،۲۷۶) وہاں سے بغداد آئے اور امام صاحب سے براہ راست اس کی تحصیل کی اور اندلس واپس جاکر جامع قرطبہ میں اس مذہب کا درس دینا شروع کیا، بشاری مقدسی نے اقلیم اقور، جرجان، رحاب، ماوراء النہر اور سوس وغیرہ میں بھی اس کے (۱) وجود کا ذکر کیا ہے۔

اس زمانہ میں آل سعود کا جو مملکت عربیہ کے سربراہ ہیں یہی مذہب ہے اور سارے بلاد نجد وحجاز میں یہ سرکاری مذہب کی حیثیت سے مروج ہے۔

مذہب حنبلی کے متعلق بعض شکوک واعتراضات: امام احمد کے مذہب ومسلک پر جو شکوک عائد کیے جاتے ہیں ان کی مختصر وضاحت ذیل میں درج کی جاتی ہے:

اتباع سنت: حنبلی مذہب کے متبعین ہر زمانہ میں کم رہے اور مذاہب ثلاثہ کے مقابلہ میں اس کو زیادہ فروغ نہیں نصیب ہو سکا خود حنابلہ کو بھی اس کا اعتراف ہے، ان کا ایک شاعر معترضین کے جواب میں کہتا ہے:

يقولون لي قد قلّ تبعة احمد　　　وكل قليل في الانام ضئيل

(۱) احسن التقاسیم ص ۱۲۶ الدیباج المذہب ص ۱۳ ومقدمہ ابن خلدون ص ۴۹۱ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۲۰۵۔

فقلت لهم مهلا غلطتم بزعمكم　　الم تعلموا ان الكرام قليل

وماضرّنا انا قليل وجارنا　　عزيز وجار الاكثرين ذليل (۱)

''لوگ کہتے ہیں کہ امام احمد کے متبعین کی تعداد کم ہے اور جو گروہ کم ہوتا ہے اس کو حقیر سمجھا جاتا ہے، میں نے ان لوگوں کو جواب دیا کہ تم توقف سے کام لو، تمہاری رائے صحیح نہیں ہے کیوں کہ شرفا کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے، ہمیں اپنی قلت تعداد کا غم نہیں اور نہ اس سے ہم کو نقصان پہنچ سکتا ہے، اس لیے کہ ہمارے پڑوسی غالب اور مقتدر لوگ ہیں جب کہ ان لوگوں کے جن کی تعداد زیادہ ہے، پڑوسی ذلیل وخوار ہیں۔''

اس جواب میں شاعرانہ تعلی اور مبالغہ زیادہ ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ تعداد کی قلت وکثرت فیصلہ کن نہیں ہوا کرتی یہاں تک کہ میدانِ کارزار میں بھی صرف کثرت تعداد موثر نہیں ثابت ہوتی اس لیے نہ تو اس کو حق وانصاف کا معیار بنایا جاسکتا ہے اور نہ وہ فی نفسہ فخر ومباہات کی کوئی چیز ہے، علامہ ابن خلدون نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ ''اس مذہب کو فقہی بصیرت اور اجتہادی شان سے کم سروکار ہے'' مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے کیوں کہ عام لوگ نہ تو کسی چیز کو اس کی صحت یا خوبیوں کی بنا پر قبول کرتے ہیں اور نہ غور وفکر کے بعد اس کو اختیار کرتے ہیں، ان کا ردوقبول عموماً پروپیگنڈہ، وقتی سیاست اور بعض اجتماعی عوامل واثرات کا نتیجہ ہوتا ہے، ذیل میں اس کے چند وجوہ درج کیے جاتے ہیں:

۱۔حقیقت یہ ہے کہ یہ مذہب شاہانہ سرپرستی سے اکثر محروم رہا کیوں کہ امام احمد اپنے زہد وتقویٰ کی بنا پر کبھی دنیوی اعزاز ووجاہت کے طالب نہیں ہوتے بلکہ وہ ہمیشہ امرا وسلاطین کے درباروں سے کنارہ کش رہے، ان کے پیرو بھی ان کی تقلید میں جاہ ومنصب اور سلاطین کے دربار سے بے تعلق رہے، یہ چیز حنبلی مذہب کے ارتقا واشتہار میں بڑی حد تک مانع ثابت ہوئی۔

(۱) اتحاف النبلا ص ۱۸۴ بحوالہ ریحانۃ الاولیا، خفاجی۔

۲- مذاہب اربعہ میں یہ سب سے متاخر ہے اس کی داغ بیل پڑنے سے پہلے ہی دوسرے مذاہب عوام میں مشہور و مقبول اور مختلف ملکوں میں پھیل چکے تھے، ان کی شہرت کے سامنے اس وقت کے دوسرے اجتہادی مذاہب کا جو بعد میں بالکل معدوم ہو گئے چراغ ٹمٹمانے لگا تھا، ان حالات میں کسی نئے مذہب کا لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر لینا حیرت انگیز ہے، اس حیثیت سے حنبلی مذہب کا یہ بڑا کمال ہے کہ اس نے مذاہب ثلاثہ کی شہرت و ہمہ گیری کے باوجود نہ صرف اپنے کو باقی رکھا بلکہ ایک حد تک خود بھی عوامی اور ہمہ گیری مذہب بن گیا۔

۳- امام احمد اپنی فقہ و افتا کی نقل و تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے اور انھوں نے شروع میں بڑی سختی کے ساتھ لوگوں کو اس کی ممانعت کر دی تھی، اس بنا پر بھی ان کے مذہب کی ترقی و اشاعت میں رکاوٹ پیش آئی۔

گو حنبلی مذہب کے متبعین کی تعداد ہمیشہ کم رہی تاہم وہ خواص کا مرکزِ توجہ رہا ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحب فرماتے ہیں:

> ''چنداں مجتہدین کہ در طریقہ او برخاستند در ہیچ مذہب معلوم نیست
> واگر ہیچ کسے نباشد مگر ابن تیمیہ و ابن قیم او برائے موازنہ با تمام علمائے زماں و اہل
> سلوک جہاں کفایت است۔''(۱)

شیخ ابوزہرہ بھی اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''بیشک خواص کا جہاں تک تعلق ہے ان کی کثرت یہیں ملے گی اور اس مذہب کے لیے صرف ابن تیمیہ اور ابن قیم کا وجود کافی ہے۔''(۲)

کثرت و تعدد اقوال: فقہ حنبلی پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس میں اختلاف روایات اور کثرتِ اقوال بہت ہیں بلکہ بعض مسائل میں متضاد اقوال تک منقول ہیں حالانکہ کثرت

---

(۱) تقصار جیود الاحرار ص۹۴ (۲) احمد بن حنبل ترجمہ اردو ص۴۷۳۔

وتعدد اقوال سے کوئی مذہب بھی خالی نہیں اور اس کو ائمہ کی حق پرستی اور اخلاص کا ثبوت سمجھا جاتا ہے، امام صاحب سے ایک ہی مسئلہ میں کثرتِ اقوال کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے زہد واتقا کی وجہ سے کوئی بات علم وثبوت کے بغیر نہیں فرماتے تھے لیکن لوگوں کے اصرار اور کثرت سوال سے مجبور ہو کر بعض اوقات تردد کی حالت میں ان کو فتویٰ دینا پڑ جاتا تھا، اس لیے جب اس کے خلاف صحیح قول معلوم ہو جاتا تو وہ فوراً اپنے قول سے رجوع کر لیتے تھے، اسی طرح صحیح حدیث اور مستند اثرِ صحابی نہ پا کر وہ ضعیف ومرسل روایت کے مطابق بھی فتویٰ دیتے تھے مگر بعد میں جب صحیح روایت اور قولِ صحابی سامنے آتا تو اپنے پہلے فتویٰ سے رجوع فرما لیتے، اس رجوع کی جن لوگوں کو اطلاع ہو جاتی تھی وہ اس کے اور جن کو اطلاع نہیں ہوتی وہ پہلے ہی قول کے مطابق امام صاحبؒ کا مسلک بیان کرتے تھے۔

۲۔ بعض مسائل میں خود روایات اور اقوال صحابہ بھی مختلف ہوتے ہیں جو اگر قوت وصحت کے لحاظ سے یکساں ہوتے اور ان میں ترجیح کی کوئی خاص وجہ نہ معلوم ہوتی تو عام فقہا کے برخلاف امام صاحبؒ خود بھی مسئلہ کو دو قولوں پر چھوڑ دیتے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے روادار نہ ہوتے۔

قیاس سے عدم تعلق: بعض لوگوں کے نزدیک اس مذہب کو قیاس سے بہت کم سروکار ہے، اس غلط فہمی کی اصل وجہ تو یہی ہے کہ امام صاحب نصوص، آثار، اخبارِ آحاد، مراسیل اور ضعیف روایات بلکہ تابعین اور ائمہ عظام کے اقوال کی موجودگی میں بھی قیاس کرنے کے شدید مخالف تھے اور وہ شدتِ احتیاط وتورع کی بنا پر فرضی اور تقدیری مسائل میں بھی بلاضرورت قیاس کرنے کو ناپسند اور احتیاط وتقویٰ کے منافی سمجھتے تھے، اس لیے عام مذاہب فقہ کے مقابلہ میں اس حیثیت سے اس کو واقعی قیاس سے زیادہ سروکار نہیں ہے، کیوں کہ امام احمد کے نزدیک کسی حدیث کو چاہے وہ خبر واحد ہی کیوں نہ ہو قیاس سے رد نہیں کیا جا سکتا، ان کا اور ان کے متبعین کا خیال ہے کہ قیاس صحیح، حدیث کے معارض نہیں ہو سکتا ہے، علامہ ابن

تیمیہ نے رسالۃ القیاس فی الشرع الاسلامی میں متعدد ایسے مسائل پر جنھیں خلاف قیاس کہا جاتا ہے حالانکہ وہ احادیث سے ثابت ہیں، بحث کر کے دکھایا ہے کہ وہ عین قیاس کے مطابق ہیں، حافظ ابن قیم کی کتابوں میں بھی اس پر مفصل بحثیں موجود ہیں۔

تشدد اور مذہب حنبلی: بعض مسائل میں حنبلی مذہب کی سخت گیری اور تشدد کو بھی مورد طعن بنایا جاتا ہے لیکن اصل میں اس کا سبب یہ ہے کہ امام صاحب اتباع سنت کے جذبہ سے سرشار تھے اس لیے نہ تو وہ دین وشریعت کے خلاف کوئی بات کہنے سننے کے روادار ہوتے تھے اور نہ کسی حال میں احادیث وآثار صحابہ سے دستبردار ہونے کو پسند کرتے تھے، جن چیزوں کو معمولی سمجھا جاتا ہے، ان میں بھی وہ بڑی سختی اور پوری احتیاط برتتے تھے، عام حنابلہ نے بھی آپ کے اتباع میں اس سختی اور شدت کو روا رکھا، بلکہ بعض لوگ تو زہد وتقشف میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے عوام پر بھی سختی کا دروازہ کھول دیا جس کے نتیجہ میں ایک زمانہ میں بڑی شورش اور ہیجان برپا ہو گیا تھا، علامہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں ۳۲۳ھ کے واقعات میں اس کا تذکرہ کیا ہے لیکن حنابلہ کی اس سختی اور شدت کا امام صاحب سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے کیوں کہ وہ زیادہ تر اپنی ہی ذات تک سختی کو روا رکھتے تھے اود کمال زہد کی وجہ سے عبادت اور مشروعات میں اپنی طرح دوسروں کے لیے بھی پسند فرماتے تھے کہ وہ احتیاط اور تورع کو اپنا شعار بنائیں، ظاہر ہے ان امور میں اعتدال کے ساتھ شدت وتصلب اختیار کرنا مذموم نہیں ہے، البتہ عام لوگ اعتدال وتوازن کو برقرار نہ رکھنے کی وجہ سے افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔

لیکن عبادات اور محظورات سے قطع نظر عقود وشروط اور غیر منصوص امور کی حلت واباحت میں امام صاحب بڑے روادار اور توسع پسند تھے اور دوسرے فقہا کی طرح ان کے یہاں ان چیزوں میں زیادہ شدت اور تنگی نہیں پائی جاتی۔

تصنیفات

امام صاحب کی جانب کئی تصنیفات منسوب ہیں جن میں چند کے علاوہ سب ناپید ہیں۔

۱- **کتاب الصلوٰۃ:** یہ مختصر رسالہ پہلی مرتبہ ہندوستان سے ۴۲ صفحات میں ۱۳۱۱ھ میں امام احمد کے ایک مکتوب کے ساتھ جو مسدد بن مسربل کے نام ہے شائع ہوا تھا، دوسری مرتبہ ۱۳۴۷ھ میں علامہ ابن قیم کے رسالہ کتاب الصلوٰۃ واحکام تارکیھا کے ساتھ مطبع محمد علی صبیح مصر میں چھپا، اس میں مسنون اور صحیح طریقہ نماز کی ضاحت کی گئی ہے اور متابعت امام کی اہمیت بیان کی گئی ہے رکوع وسجود اور دوسرے ارکان میں امام پر مقتدی کے سبقت کرنے کے متعلق جو ممانعت اور وعیدیں حدیثوں میں مذکور ہیں ان کو جمع کر کے ان کی تشریح کی گئی ہے۔

۲- **کتاب الزہد:** مسند کے بعد امام صاحب کی یہ دوسری اہم کتاب ہے، علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں "جن لوگوں نے زہد ورقاق کے متعلق حدیثیں جمع کی ہیں ان میں عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد بڑی اہم ہے لیکن اس میں کمزور اور واہی روایتیں بھی ہیں سب سے عمدہ امام احمد کی کتاب ہے، جس کی ترتیب ناموں پر ہے" حافظ ابن کثیر بیان کرتے ہیں "اس موضوع پر متقدمین اور متاخرین علما میں سے کسی کی کتاب بھی اس کے ہم پایہ نہیں ہے" علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ "یہ مسند کے ثلث کے بقدر ہے اور اس کی متعدد حدیثیں اور آثار مسند احمد میں نہیں ہیں" اس کا ایک قلمی نسخہ برلین میں ہے، امام احمد کی کتاب الزہد کا ایک حصہ مختصر کتاب الزہد کے نام سے حجاز سے شائع ہو گیا ہے" آپ کے صاحبزادے عبداللہ نے اس کے زوائد تحریر کئے تھے۔(۱)

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷۹، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۹ وتعجیل المنفعۃ ص ۸ والرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۸

۳- کتاب التفسیر:

۴- کتاب السنۃ: اس کا مخطوطہ برلین میں موجود ہے(۱) اور غالباً طبع بھی ہو چکی ہے دوسری کتابوں اور رسائل کے نام یہ ہیں، ۵- کتاب طاعۃ الرسول، ۶- کتاب الایمان، ۷- کتاب الاعتقاد، ۸- کتاب الناسخ والمنسوخ، ۹- المقدم والموخر فی کتاب اللہ، ۱۰- کتاب الفرائض، ۱۱- کتاب الفضائل، ۱۲- فضائل الصحابہ، ۱۳- فضائل ابوبکر، ۱۴- فضائل حسنین، ۱۵- مناقب علی، ۱۶- کتاب المسائل، ۱۷- کتاب المناسک، ۱۸- کتاب العلل، ۱۹- کتاب التاریخ، ۲۰- کتاب الاشربہ، ۲۱- کتاب الرد علی الجہمیہ، ۲۲- کتاب الرد علیٰ من ادعی تناقض القرآن، ۲۳ کتاب الرد علی الزنادقہ۔(۲)

ان مستقل تصنیفات کے علاوہ امام صاحب کے فتاویٰ اور مسائل کو بھی خلال نے جامع کبیر میں جمع کیا ہے۔

مسند احمد بن حنبل: امام صاحب کی سب سے مشہور اور حدیث کی اہم ترین کتاب ہے، امام صاحب سے پہلے بھی اس طرح کی کتابیں لکھی گئیں اور بعد میں بھی لیکن کسی مجموعۂ مسانید کو اس قدر شہرت ومقبولیت اور اعتبار و استناد نصیب نہیں ہوا، اس میں عام کتب مسانید کی طرح صحابہ کی ترتیب پر حدیثیں مرتب کی گئی ہیں، ترتیب میں زیادہ تر سبقت فی الاسلام کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن اس اصول کا ہر جگہ التزام نہیں کیا ہے، شاہ عبدالعزیزؒ صاحب فرماتے ہیں کہ ترتیب میں بہت سی غلطیاں ہوگئی ہیں مثلاً مدنیوں کی روایت شامیوں میں اور شامیوں کی مدنیوں میں شامل کردی گئی ہیں۔(۳)

مسند کے اجزا اور حدیثوں کی تعداد: مسند احمد تقریباً ۲۷ اجزا پر مشتمل اور سات سو صحابہ کی حدیثوں کا مجموعہ ہے جن کی تعداد عام طور سے تیس اور چالیس ہزار بتائی جاتی ہے، شاہ عبدالعزیزؒ صاحب فرماتے ہیں کہ مسند کی اصل روایات تو تیس ہزار ہیں باقی دس ہزار

(۱) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۲۴۱ (۲) الفہرست (۳) بستان المحدثین ص ۳۰۔

کے قریب زوائد عبداللہ ہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ مکررات کے ساتھ چالیس ہزار اور حذف مکررات کے بعد تیس ہزار حدیثیں ہیں۔(۱)

مسند کے مرویات کی قسمیں: مسند کی حدیثوں کی چھ قسمیں ہیں:

۱- وہ حدیثیں جن کو امام صاحب کے فرزند عبداللہ ان کے حوالے سے بیان کرتے ہیں یہی اصل مسند احمد ہے، اس قسم کی روایتیں ۳-۴ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔

۲- وہ روایتیں جو عبداللہ نے آپ سے اور آپ کے علاوہ دوسرے محدثین سے روایت کی ہیں، اس طرح کی روایات بہت کم ہیں۔

۳- وہ حدیثیں جن کو عبداللہ نے آپ کے بجائے دوسرے شیوخ سے نقل کیا ہے، اس طرح کی حدیثوں کو زوائد عبداللہ کہتے ہیں، ان کی تعداد پہلی قسم سے کم مگر اور قسموں سے زیادہ ہے۔

۴- وہ روایتیں جن کو عبداللہ نے امام صاحب سے تو سنا لیکن آپ کے سامنے ان کی قرأت نہیں کی تھی، اس قسم کی روایتیں بھی بہت کم ہیں۔

۵- ایسی حدیثیں جن کو انھوں نے نہ تو امام صاحب سے سنا اور نہ آپ کے سامنے پڑھا بلکہ آپ کی کتاب یا کسی تحریر سے ان کو نقل کیا ہے، اس قسم کی حدیثیں بھی کم ہیں۔

۶- ابوبکر قطیعی کے زیادات جن کو انھوں نے عبداللہ اور امام احمد کے بجائے کسی اور محدث سے روایت کیا ہے، اس طرح کی روایتیں بہت کم ہیں۔(۲)

امام صاحب کے مسند اور زوائد کا فرق بیان کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ "زوائد میں ضعیف اور موضوع روایتیں بھی شامل ہوگئی ہیں جن کو ناواقف لوگ امام احمد ہی کی جانب منسوب کرتے ہیں"۔

مسند کی تالیف میں احتیاط: امام صاحب نے مسند کی ترتیب وتالیف میں غیر معمولی احتیاط

(۱) بستان المحدثین ص ۲۹، ۳۰ (۲) الفتح الربانی ص ۸۔

سے کام لیا ہے ان کا خود بیان ہے کہ انھوں نے اس کو ساڑھے سات لاکھ سے زائد حدیثوں سے منتخب و مرتب کیا تھا، علماء فن کا بیان ہے کہ انھوں نے مسند کی تدوین میں صحیح احادیث کی تخریج اپنے اوپر لازم کرلی تھی، ابوموسیٰ مدینی کا بیان ہے کہ امام احمد نے مسند میں ان ہی لوگوں سے روایتیں نقل کی ہیں جن کی صداقت و دیانت مسلم تھی مطعون لوگوں کی روایات نقل کرنے سے پرہیز کیا ہے، امام احمد صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو لوگوں کے لئے امام و حجت بنایا ہے تاکہ اختلاف کے وقت وہ اس کی جانب رجوع کرسکیں، اگر اس میں ان کو کوئی حدیث مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ کسی ایسی حدیث کو صحیح نہ تسلیم کریں جو اس میں موجود نہ ہو۔(۱)

امام صاحب کی احتیاط کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ مسند کے مسودہ میں کانٹ چھانٹ اور حذف و ترمیم کرتے رہتے تھے اور اپنے بے نظیر حافظہ کے باوجود وہ محض اپنی یادداشت سے کوئی حدیث بیان کرنا احتیاط کے خلاف سمجھتے تھے، علی بن مدینی کا بیان ہے کہ ''ہمارے رفقا میں امام احمد سے بڑا کوئی حافظ نہ تھا لیکن وہ کتاب سے حدیثیں بیان کرتے تھے اور ہم کو بھی تاکید کرتے تھے کہ جب حدیثیں بیان کریں تو کتاب کو پیش نظر رکھیں'' ابراہیم بن خالد بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ امام احمد کی مجلسوں میں حدیثیں یاد کرتے اور ان پر بحث و مذاکرہ کرتے لیکن ان کو قلمبند کرنا چاہتے تو وہ جھپٹ کر کتاب لاتے اور فرماتے کہ کتاب بہترین یادداشت ہے۔''

فرط احتیاط کی بنا پر کوئی ایسی حدیث نہیں بیان کرتے جو صرف ایک ہی سند سے مذکور ہوتا آنکہ اس کی نظیر نہ مل جائے، احادیثِ فضائل وغیرہ میں کچھ نرمی گوارہ بھی کرلیتے تھے لیکن احکام و حدود کی روایتوں میں ذرا بھی تساہل گوارا نہیں تھا، فرماتے ہیں ''فضائل

(۱) طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۱۸ و معجم المصنفین ج ۲ ص ۳۳۴، ۳۳۵ و کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۱ و حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۷۔

اعمال اوران کی ترغیب وجزاوغیرہ سے متعلق اگر کوئی حدیث ہم کو معلوم ہوتی ہے تو اس میں زیادہ شدت سے کام نہیں لیتے لیکن حدود، کفارات اور فرائض وغیرہ سے متعلق روایتوں میں بڑی چھان بین اور پوری سختی اور احتیاط برتتے ہیں۔''(۱)

مسند کی اہمیت اور کتب حدیث میں اس کا درجہ: گو محدثین کے نزدیک مسانید کا درجہ سنن سے کم تر ہے لیکن مسند احمد کی حیثیت عام مسانید سے مختلف ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کو دوسرے درجہ کی کتابوں یعنی سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور مجتبی النسائی کے لگ بھگ اور تیسرے درجہ کی کتابوں سے جس میں عام جوامع ومسانید شامل ہیں، اس کو اہم اور ممتاز قرار دیا ہے'' حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''مسند احمد کی حدیثوں کی نوعیت عام کتب مسانید سے مختلف ہے، ابوالحسن علی بن احمد ہیثمی لکھتے ہیں کہ ''وہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح اور بہتر ہے۔''(۲)

مسند احمد کا شمار ان اہم اور امہات کتب میں ہوتا ہے جن پر ملت اسلامیہ کا ہمیشہ اعتماد واعتبار رہا ہے اور جن سے محدثین نے ہر زمانہ میں اخذ واستفادہ کیا ہے، علامہ سبکی فرماتے ہیں ''وہ اس امت کی اساسی اور بنیادی کتابوں میں ہے'' ابوموسیٰ مدینی کا بیان ہے کہ ''مسند ایک اہم اصل اور محدثین کے لیے قابل وثوق مرجع ہے'' مسند کے بارہ میں عام فیصلہ یہ ہے کہ ''کتب صحاح ستہ بشمول مؤطا امام مالک اور مسند احمد اصل دارومدار اور اعتماد کی چیزیں اور روز روشن کی طرح نمایاں اور مشہور ہیں''

صحت وجودت کے لحاظ سے بھی مسند کی اہمیت کم نہیں ہے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں ''مسند کے زوائدِ صحیحین، ترمذی اور ابوداؤد کے زوائدِ صحیحین کے مقابلہ میں کم ضعیف ہیں، اس کی ہر روایت مقبول اور ضعیف روایتیں بھی حسن سے قریب تر ہیں'' احمد عبدالرحمن

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۲ وتہذیب الاسماء واللغات ج ا قسم اول ص ۱۱۱، الطبقات الکبریٰ شعرانی ج ا ص ۴۶ شذرات الذہب ج ا ص ۹۸ (۲) التنقیح فی اصول الحدیث ص ۴۰، حجۃ اللہ البالغۃ ج ا ص ۱۰۷، تدریب الراوی ص ۵۷۔

بنا ساعاتی نے لکھا ہے کہ ''امام احمد کا قابلِ تعریف کارنامہ اور امت پر زبردست احسان یہ ہے کہ انھوں نے لوگوں کے لیے مسند جیسی مشہور کتاب کی تخریج کی جس کی اہمیت کا ہر زمانہ کے محدثین نے اعتراف کیا اور کہا ہے کہ وہ صحیحین کے بعد تمام کتب احادیث میں سب سے زیادہ صحیح حدیثوں کی جامع ہے۔''(۱)

خصوصیات: ۱- مسند احمد کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت تو یہی ہے کہ وہ حدیث کی اہم معتبر اور صحیح کتابوں میں ہے۔

۲- مسند سے بڑا اور ضخیم کوئی مجموعہ حدیث نہیں، حافظ ابن کثیر، ابوبکر ہیثمی اور علامہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ اس سے زیادہ حدیثیں کسی کتاب میں نہیں ہیں۔

۳- احادیث کے دوسرے مجموعوں میں جو روایات متفرق طور پر پائی جاتی ہیں، ان کا اکثر حصہ اس میں موجود ہے، اس لحاظ سے وہ حدیث کی سب سے زیادہ جامع کتاب ہے، ایک مرتبہ ابوالحسن یونینی سے دریافت کیا گیا کہ ان کو صحاح ستہ زبانی یاد ہیں، انھوں نے کہا یاد بھی ہیں اور نہیں بھی، لوگوں نے پوچھا یہ کیسے؟ فرمایا کہ مجھ کو مسند احمد بن حنبل یاد ہے جس میں چند کے علاوہ صحاح کی تمام حدیثوں کی اصل موجود ہے اس اعتبار سے گویا میں ان کا بھی حافظ ہوں، بعض علما کا بیان ہے کہ ''اگر کسی کو تمام کتابوں کی جامع کوئی ایسی کتاب مطلوب ہو جس کا مصنف بھی عظیم و برتر ہو تو اسے مسند احمد کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ (۲)

۴- مسند کا تصنیفی حسن، اخبار و روایات کا تناسب اور بہتر انتخاب بھی اس کی ایک خصوصیت ہے، اہل نظر اور مبصرین کا خیال ہے کہ وضع و تالیف کے لحاظ سے وہ بے مثال کتاب ہے، علامہ ابن حجر نے علامہ ابن صلاح کا جواب دیتے ہوئے مسند کی اس خصوصیت کا تذکرہ کیا ہے اور ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حسن بیان و سیاق کے لحاظ سے کوئی کتاب اس کے برابر نہیں۔

---

(۱) الفتح الربانی ص ۱۸/۷ (۲) حواشی سعدی ص ۱۵ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۹۰۔

۵-مسند میں تین سو ثلاثی حدیثیں ہیں۔

٦-عام کتابوں کی جملہ خصوصیات بھی اس میں موجود ہیں۔

زمانۂ تصنیف: امام صاحب مسند کی جمع وتدوین میں اسی وقت سے مصروف ہوگئے تھے، جب انھوں نے علم حدیث کی طلب وتکمیل شروع کی تھی اور عمر بھر اس میں مشغول اور حذف واضافہ کرتے رہے، صاحب المنہج نے لکھا ہے کہ ۱۸۰ھ میں مسند کی تالیف شروع کردی تھی اور شمس الدین جزری فرماتے ہیں کہ باقاعدہ تکمیل سے پہلے ہی انتقال فرماگئے تھے۔"(۱)

تہذیب وتنقیح: مسند کو امام صاحب نے مسودہ کی صورت میں چھوڑا تھا اس لیے آپ کے بعد آپ کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ نے اس میں بعض اضافے کرکے اس کی باقاعدہ تہذیب وتنقیح کی، علامہ شمس الدین جزری کا بیان ہے "امام احمد نے مسند کو جمع کرنا شروع کیا اور اس کو الگ الگ ورقوں میں لکھ کر جدا جدا جز میں تقسیم کیا مگر اس کی تکمیل سے پہلے ہی انتقال فرماگئے۔ البتہ آخر عمر میں انھوں نے اپنی اولاد اور گھر والوں کو جمع کرکے اس کو سنادیا تھا، آپ کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادے نے اس کو مرتب کیا اور مسند کی روایات کے مشابہ ومماثل مسموعات بھی اس میں شامل کردیے" مسند کا موجودہ متداول نسخہ عبداللہ ہی کا مرتب کیا ہوا ہے لیکن اس کی فروگذاشتوں کی بنا پر بعض لوگوں نے اس کو ازسرنو مرتب کیا، اصفہان کے بعض محدثین نے اس کو ابواب پر ترتیب دیا تھا مگر یہ نسخہ معدوم ہے، حافظ ناصر الدین نے بھی ابواب پر مرتب کیا تھا مگر دمشق میں حادثۂ تیمور کے وقت ان کا نسخہ ضائع ہوگیا، ابوبکر محمد بن عبداللہ بن محی الدین صامت نے حروف معجم پر مرتب کیا تھا۔(۲) حال میں مصر کے ایک فاضل احمد عبدالرحمٰن البنا ساعاتی نے الفتح الربانی کے نام سے اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے حاشیہ پر ان ہی کے قلم سے بلوغ الامانی کے نام سے اس کی شرح بھی ہے،

---

(۱) احمد بن حنبل لابی زہرہ بحوالہ المنہج جزاول (۲) بستان المحدثین ص ۲۹، وبلوغ الامانی ص ۲۰ وابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۱۰ بحوالہ المصعد الاحمد۔

اس کی ۵ جلدیں ۱۳۵۵ھ میں شائع ہوئی تھیں اس میں مکررات کو حذف کر دیا گیا ہے، ربوہ سے بھی ابھی حال ہی میں ایک جلد شرح و تعلیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

شروح وحواشی: مسند کے شروح، تعلیقات اور مختصرات کے نام یہ ہیں:

۱۔**شرح مسند:** یہ علامہ ابوالحسن بن عبدالہادی سندی (م ۱۱۳۸ھ) کی ضخیم شرح ہے۔

۲۔**الدر المنتقد:** یہ مسند کا مختصر اور شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن (م ۸۰۵ھ) اور شیخ زین الدین عمر بن احمد شماع جلسی کی تالیف ہے۔

۳۔**عقود الزبرجد:** یہ تعلیق علامہ سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے حروف معجم پر مرتب کی ہے۔

۴۔**غرائب مسند:** ابوعمر محمد بن عبدالواحد (م ۳۴۵ھ) کی تالیف ہے۔

مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ابوالحسن علی بن ابوبکر ہیثمی (م ۸۰۷ھ) نے اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے جو ۶ جلدوں پر مشتمل اور امام احمد، بزار، ابویعلی موصلی کے مسانید اور طبرانی کے معاجم ثلاثہ کی ان حدیثوں کا مجموعہ ہے جو صحاح میں شامل نہیں ہیں، اس کے بعض اجزاء کے قلمی نسخے دارالکتب المصریہ میں موجود ہیں، نواب صدیق حسن خاں صاحب نے ایک جز ۱۳۰۸ھ میں ۲۸۸ صفحات میں ایک مقدمہ کے ساتھ دہلی سے شائع کیا تھا۔

۶۔**جامع المسانید:** اس کو علامہ ابن کثیر نے ۸ جلدوں میں مرتب کیا ہے اور اس میں مسند احمد، مسند بزار، مسند ابویعلی، طبرانی کی معجم کبیر اور صحاح کی حدیثیں شامل کی ہیں، اس کے دو قلمی نسخے دارالکتب المصریہ اور کوبرلی وغیرہ میں ہیں۔

۷۔**جامع المسانید والالقاب بالخص الاسانید:** اس میں علامہ ابن جوزی نے صحیحین، ترمذی اور مسند احمد کی حدیثیں ۷ جلدوں میں مسانید پر مرتب کی ہیں۔

۸۔**اطراف المسند المعتلی باطراف المسند الحنبلی:** یہ حافظ ابن حجر کی تالیف اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

۹۔**جمع الفوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد:** صحاح کے علاوہ احمد، دارمی، ابویعلی،

بزار کے مسانید اور طبرانی کے معاجم ثلاثہ کی روایتوں پر مشتمل ہے اور ابو عبداللہ محمد بن سلیمان مغربی متوفی ۱۰۹۴ھ کی تالیف ہے۔

۱۰- منتقی الاخبار فی الاحکام: شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے کتب صحاح اور مسند احمد کی حدیثوں کا اس میں انتخاب کیا ہے، علامہ شوکانی نے نیل الاوطار کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے۔(۱)

۱۱- ثلاثیات مسند: محب الدین وضیاء الدین مقدسی نے اس میں مسند کی ثلاثی روایتوں کی تخریج کی ہے، شمس الدین سفارینی حنبلی نے اس کی شرح لکھی ہے، اصل اور شرح پہلی مرتبہ مکتب اسلامی دمشق سے ۱۳۸۰ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

۱۲- فہرست رجال مسند: مولانا نجم الدین اور مولانا نورالحق نے رجال مسند کی ایک مفصل اور جامع فہرست اردو میں مرتب کی ہے جو رسالہ اورینٹل کالج لاہور میں چھپ چکی ہے۔

مسند پر بعض اعتراضات: مسند پر اعتراضات بھی کئے گئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- مسند میں مکررات ہیں لیکن درحقیقت یہ کوئی عیب نہیں بلکہ ایک طرح کی خوبی ہے کیونکہ تکرار کا مقصد کثرت اسناد، تعدد طرق، اختلاف متن اور متابعات وغیرہ کو ظاہر کرنا ہے، محدثین ایک ہی حدیث کو ایک صحابی سے متعدد طرق اور مختلف الفاظ کے ساتھ صرف اس لئے روایت کرتے ہیں کہ احادیث کا استقصا و احاطہ بھی ہو جائے اور وہ محفوظ و مدون بھی ہو جائیں اسی لئے صحیحین اور جملہ کتب معتبرہ میں بھی بکثرت مکرارت پاتے جاتے ہیں اور مسانید میں صحابہ کے ناموں کی ترتیب پر حدیثیں نقل کئے جانے کی وجہ سے تکرار ناگزیر بھی ہے۔

---

(۱) کشف الظنون ج دوم صفحات ۴۳۱، ۴۳۲، ۱۲۶، ۱۵۶، ۳۸۵، حصہ اول ص ۳۸۵ و بلوغ الامانی ص ۲۰ و بستان المحدثین ص ۲۲، الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۱۴، ۱۲۹، ۱۴۴، مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۴۰، مفتاح السنۃ ص ۱۱۱ و ۱۱۳ و معجم المطبوعات ج ۲ کالم ۱۹۰۳، فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۲۳۔

۲- بعض صحیح روایتیں مسند میں نہیں ہیں، یعنی ایسی متعدد حدیثیں جو صحیحین اور کتب معتبرہ میں پائی جاتی ہیں مسند میں نہیں ہیں، حالانکہ امام صاحب کا دعویٰ ہے کہ اس میں جملہ صحیح احادیث درج ہیں، اگر اس دعویٰ کی نسبت امام صاحب کی جانب صحیح ہے تو غالباً اس زمانہ مین وضع حدیث کے عام فتنہ کے پیش نظر آپ نے ایسا فرمایا ہوگا تا کہ لوگ غلط روایتوں اور وضعی حدیثوں سے محتاط رہیں، دوسرے امام صاحب نے اپنے مقدور بھر مسند میں صحت کا پورا اہتمام ملحوظ رکھا تھا، اس لیے ان کے علم ویقین مین ان کا یہ دعویٰ بالکل صحیح تھا لیکن اس سے یہ ضروری نہیں ہے کہ مسند حقیقتاً تمام صحیح حدیثوں کی جامع ہو، تیسرے اکثر صحیح حدیثوں کی اصل فی الواقع اس میں موجود ہے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ ''امام صاحب کا ارشاد غالب احوال کے لحاظ سے ہے ورنہ صحیحین، سنن اور اجزا وغیرہ میں بہت سی قوی حدیثیں ایسی ہیں جو مسند میں نہیں ہیں، شمس الدین جزری کا بیان ہے کہ اس سے مقصود حدیثوں کی اصل ہے اور یہ بالکل درست ہے اس لیے کہ غالباً کوئی حدیث ایسی نہیں ملے گی جس کی اصل مسند میں موجود نہ ہو، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ ''امام صاحب کی مراد ان حدیثوں سے ہے جو شہرت وتواتر کے درجہ تک نہیں پہنچی ہیں ورنہ بہت سی مشہور اور صحیح حدیثیں ان کی مسند میں نہیں ہیں۔(۱)

۳- ضعیف حدیثیں: ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ مسند میں ضعیف روایات بھی ہیں، محققین علما نے اس کو تسلیم کیا ہے اس لیے جو لوگ مطلقاً مسند کی صحت کے مدعی ہیں ان کا خیال درست نہیں، اس کا بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ امام صاحب عمر بھر مسند کے مسودہ میں ترمیم فرماتے رہے، وہ ضعیف وغریب روایتیں متابعت، تعدد طرق اور دوسری روایتوں کی تائید کے لیے نقل کرتے تھے، اس لیے مسند ضعیف روایتوں سے خالی نہیں لیکن اتنے ضخیم مجموعہ میں اگر کچھ ضعیف حدیثیں شامل بھی ہوں تو ان سے اس کی صحت وشہرت

(۱) ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۰۹ بحوالہ المصعد الاحمد ص ۳۱، بستان المحدثین ص ۳۰۔

میں فرق نہیں آتا، مجموعی طور پر وہ ایک مستند اور اہم کتاب ہے، ضعیف وغریب روایتوں سے حدیث کی کون کتاب خالی ہے، ابن تیمیہ جیسے شخص کو یہ تسلیم ہے کہ "صحیحین کی بعض حدیثوں میں اس قسم کے الفاظ آگئے ہیں جو ضعف سے خالی نہیں۔"(۱)

۴۔موضوع حدیثیں: مسند میں بعض موضوع حدیثیں بھی بتائی جاتی ہیں لیکن عام علمائے فن نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے، ابن حجر نے القول المسدد میں اور سیوطی نے الذیل الممہد میں ان تمام روایتوں کا جن کو موضوع بتایا جاتا ہے پوری تحقیق سے جائزہ لیا ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

"ایک جماعت کا دعویٰ ہے کہ مسند میں موضوع روایتیں بھی ہیں ابوالفضل عراقی نے موضوعات ابن حوزی کے تتبع سے نو حدیثوں کو موضوع بتایا ہے، میں نے جب ابن جوزی کے بیان کا مطالعہ کیا تو موضوعات کی تعداد بیس نظر آئی لیکن تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں سے اکثر حدیثیں صحیح ہیں اور ان کو موضوع قرار دینے کا فیصلہ درست نہیں، البتہ چند روایتوں کے بارے میں اس قسم کا شبہ ضرور ہوتا ہے لیکن غالب اور قوی احتمال ان کے بارے میں بھی مدافعت ہی کا ہے۔(۲)

بعض علما نے جن میں ابن تیمیہ بھی شامل ہیں، یہ تفریق کی ہے کہ عبداللہ اور قطیعی کے زوائد میں موضوع روایتیں ضرور ہیں لیکن مسند کا وہ حصہ جو امام صاحب کی طرف منسوب ہے، موضوع حدیثوں سے خالی ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگیا کہ جمہور علما کے نزدیک مسند احمد بن حنبل میں موضوع حدیثیں نہیں پائی جاتیں۔

☆☆☆

---

(۱) منہاج السنۃ ج ۴ ص ۶۴۳ (۲) تعجیل المنفعۃ ص ۶۔

امام محمد بن یحییٰ عدنی

(متوفی ۲۴۳ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوعبداللہ کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: محمد یحییٰ بن ابوعمر۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابوعمران کے والد کی کنیت تھی (۱) مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔(۲)

وطن: ان کے آباء واجداد کا اصل وطن عدن ہے لیکن انھوں نے مکہ میں مستقل بود وباش اختیار کرلی تھی، (۳) علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ان کی پیدائش اور نشو ونما بھی یہیں ہوئی تھی، (۴) اسی وجہ سے عدنی اور مکی کہلاتے ہیں، خاندان اور سنہ ولادت کا حال نہیں معلوم ہوسکا۔

اساتذہ: انھوں نے جن برگزیدہ وبلند پایہ محدثین سے کسب فیض کیا تھا ان میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں:

داؤد بن عجلان، سفیان بن عیینہ، عبدالرحیم بن زید عمی، عبدالرزاق، عبدالعزیز دراوردی، عبدالعزیز بن عبدالصمد عمی، عبداللہ بن معاذ صنعانی، عبدالمجید بن ابی رواد، عبدالوہاب ثقفی، فرج بن سعید بن علقمہ ماربی، فضیل بن عیاض، محمد بن یحییٰ بن قیس مازنی، مروان بن معاویہ، معن بن عیسی، ولید بن مسلم، ہشام بن سلیمان، یحییٰ بن سلیم طائفی، یحییٰ بن عیسی الملی، یزید بن ہارون، یعقوب بن جعفر بن ابی کثیر اور اپنے والد یحییٰ بن ابوعمر

(۱) تقریب التہذیب ص ۲۲۷ (۲) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۸ (۳) ایضاً وخلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال ص ۳۶۶ (۴) کتاب الانساب ورق ۳۸۶۔

وغیرہ سے۔

سفیان بن عیینہ کے خاص تلامذہ میں تھے، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ والازم ابن عیینہ، پہلی مرتبہ ۱۸ سال کی عمر میں ان کے درس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔(۱)

تلامذہ: محمد بن یحییٰ عدنی کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مؤلفین صحاح میں امام مسلم، امام ترمذی اور ابن ماجہ نے ان سے بلاواسطہ اور امام نسائی نے بالواسطہ روایتیں کی ہیں، امام بخاری نے بھی ان سے ایک حدیث تعلیقاً بیان کی ہے، دوسرے ممتاز تلاذہ کے نام یہ ہیں.

ابو حاتم، ابوذرعہ دمشقی، ابوذرعہ رازی، احمد بن عمرو خلال مکی، اسحاق بن ابراہیم بن اسماعیل نسفی، اسحاق بن احمد بن نافع خزاعی، بقی بن مخلد، زکریا بن یحییٰ سجزی، عبداللہ بن صالح بخاریؒ، عبداللہ بن محمد بن شیرویہ، عثمان بن خرزاذ، علی بن عبداللہ عصاریی، ابوالولید محمد بن عبداللہ ازرقی، مفضل بن محمد جندی، نعیم ازدی، ہارون بن یوسف شطوی، ہلال بن علاء اور ان کے فرزند عبداللہ بن محمد وغیرہ۔(۲)

حفظ وثقاہت: حافظہ میں امتیاز کی وجہ سے الحافظ کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، عبدالرحمٰن بن محمد حاتم اپنے والد کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ صالح الحدیث اور صدوق تھے، امام احمد نے بھی ان کو معتبر قرار دیا ہے، مسلمہ کا بیان ہے کہ لا بأس بہ یعنی عدنی میں کوئی عیب نہ تھا، امام مسلم نے ان کو صدوق وحجت اور ابن حبان وابن اثیر نے ان کو ثقہ بتایا ہے۔(۳)

فضل وکمال: ان کے کمال کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اکثر اصحاب صحاح نے ان کی

(۱) تہذیب التہذیب ج۹ ص۵۱۸، ۵۱۹ وتقریب التہذیب ص۳۲۷ (۲) ایضاً وتذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۸۴ وکتاب الانساب ورق۳۸۶ (۳) تہذیب التہذیب ج۹ ص۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰ وخلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال ص۳۶۴ وتذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۸۴ وکتاب الانساب ورق ۳۸۶

روایتوں کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، امام مسلم نے اپنی صحیح میں ان کے واسطے سے ۲۱۶ حدیثیں ذکر کی ہیں، امام احمد کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ جب ان سے رواۃ مکہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ مکہ کے لوگوں میں ابن ابی عمر سے روایتیں کرو، علمائے طبقات کا بیان ہے کہ وصار شیخ الحرم فی زمانه یعنی وہ اپنے زمانہ میں شیخ الحرم تھے۔(۱)

عبادت وتقویٰ: علم وفضل کے ساتھ بڑے عابد وزاہد اور نہایت صالح ومتدین تھے، اکثر طواف کعبہ میں مشغول رہتے، (۲) تمام مورخین نے ان کے زہد وصلاح کا ذکر کیا ہے۔

حج: حج بیت اللہ سے ۷۷ مرتبہ مشرف ہونے کی سعادت میسر آئی، ان کا خود بیان ہے کہ ۷۰ مرتبہ پیدل چل کر میں نے حج کیا تھا۔(۳)

وفات: عدنی نے بڑی طویل عمر پائی اور ذی الحجہ ۲۴۳ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔(۴)

اولاد: علمائے سیر نے ان کے تلامذہ کے تذکرہ میں ان کے ایک فرزند عبداللہ کا ذکر کیا ہے، اسی لیے ان کی کنیت ابو عبداللہ ہے

تصنیفات: عدنی کی تصنیفات میں صرف مسند کا پتہ چلتا ہے، اس کے راوی ان کے مشہور شاگرد اسحاق بن احمد بن نافع خزاعیؒ تھے، اس مسند کو ایک زمانہ میں بڑی شہرت تھی اور وہ اصبہان وغیرہ میں متداول رہ چکی ہے۔(۵)

☆☆☆

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۴ وتہذیب ج ۹ ص ۵۱۹، ۵۲۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۴ (۳) ایضا وتہذیب ج ۹ ص ۵۱۹، (۴) ایضاً وخلاصۃ تذہیب ص ۳۶۴ (۵) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۹ وکتاب الانساب ورق ۳۸۶۔

امام عبد بن حمید

(متوفی ۲۴۹ھ)

نام ونسب: عبدالحمید نام، ابومحمد کنیت، ایک ضعیف روایت یہ بھی ہے کہ عبدالمجید نام تھا۔ نسب نامہ یہ ہے: عبدالحمید بن حمید بن نصر، عام طور سے وہ عبدالحمید کے بجائے صرف عبد بن حمید کہے جاتے تھے۔(۱)

وطن: وطن کش یا کس ہے اور اسی کی نسبت سے وہ کشی یا کسی مشہور ہیں، کش جرجان کے قریب اس سے ۹ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں کا نام ہے، محمد بن طاہر مقدسی نے لکھا ہے کہ کس کش کی تعریب ہے لیکن ابن ماکولا کا بیان ہے کہ کش غلط ہے، جب میں بخارئی اور سمرقند گیا تو وہاں کے لوگ اس کو کس کہتے تھے، یہ سمرقند کے قریب ایک شہر کا نام ہے، عبد بن حمید اسی کی جانب منسوب ہیں، بعض لوگوں نے کش کو اصبہان کا گاؤں بتایا ہے۔(۲)

اساتذہ: عبد بن حمید کے اساتذہ اور شیوخ میں بلند پایہ محدثین اور مقدس بزرگ شامل ہیں، اس کا اندازہ اس فہرست سے ہوگا۔

احمد بن اسحاق حضرمی، جعفر بن عون، حسن اشیب، حسین بن علی جعفی، روح بن عبادہ، سعید بن عامر، عارم، عبدالرزاق، عبدالصمد بن عبدالوارث، عبداللہ بن بکر سہمی، عبیداللہ بن موسیٰ، علی بن عاصم، عمر بن یونس یمامی، محمد بن بشر عبدی، محمد بن بکر برسانی، مسلم بن ابراہیم، مصعب بن مقدام یحییٰ بن آدم، یزید بن ہارون، یعقوب بن ابراہیم، یعلی بن

(۱) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۵۵ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۱۲۱ وبستان المحدثین ص ۳۲ (۲) معجم البلدان ج ۷ ص ۲۵۴ وکتاب الانساب مقدسی ص ۱۲۹۔

عبید، یونس بن محمد مؤدب، ابن ابی فدیک، ابو اسامہ، ابوداؤد حضرمی، ابوداؤد طیالسی، ابو عامر عقدی، ابو عاصم، ابوالنضر، ابونعیم، ابوالولید طیالسی وغیرہ۔ (۱)

تلامذہ: ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی وسیع ہے، ان میں سے اکثر کا شمار اجلہ محدثین اور ائمہ فن میں ہے، بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں: ابراہیم بن خریم شاسی، بکر بن مرزبان، سلیمان بن اسرائیل خجندی، سہل بن شاذویہ، شاہ بن جعفر، ابومعاذ عباس بن ادریس ملقب بخرک، عمر بن بجیر، عمر بن محمد اور آپ کے صاحبزادے محمد بن عبد وغیرہ۔

صحاح ستہ کے مصنفین میں امام مسلم اور امام ترمذی نے اپنی اپنی کتابوں میں ان سے روایتیں لی ہیں اور امام بخاری نے دلائل النبوۃ میں بطریق تعلیق ان کی روایت نقل کی ہے۔ (۲)

طلب حدیث کی ابتدا اور سفر: آغاز شباب کے بعد ان کو تحصیل علم کا خیال اور حدیث کی طلب وجستجو کا شوق پیدا ہوا اور اس کے لیے مختلف ملکوں اور شہروں کا سفر کیا، گو اس کی تصریح نہیں ملتی کہ کن کن شہروں اور ملکوں میں گئے لیکن ان کے اساتذہ مختلف ملکوں اور شہروں سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کا سفر کیا ہوگا۔

فضل وکمال: عبد بن حمید نامور محدثین میں تھے، ان کی عظمت کے لیے اتنا کافی ہے کہ ائمہ صحاح تک نے ان سے اپنی کتابوں میں روایتیں نقل کی ہیں، اصحاب طبقات وتراجم کا بیان ہے کہ وہ فن حدیث کے امام تھے۔ (۳)

حفظ وثقاہت: ان کے حفظ وضبط اور ثقاہت پر علما کا اتفاق ہے، علامہ ذہبی نے ان کو احفظ اور ائمہ ثقات میں بتایا ہے، ابن حبان فرماتے ہیں کہ وہ ان علمائے ثقات میں تھے جنھوں نے جمع وتصنیف کا کام کیا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور حافظ تھے، ابن عماد حنبلی کا بیان ہے

(۱) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۵۵، ۴۵۶ (۲) ایضا ص ۴۵۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۵ وبستان المحدثین ص ۳۲ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۵ وبستان المحدثین ص ۳۲۔

کہ وہ ثقہ وثابت تھے،(۱) شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ''خیلے ثقہ ومعتبر''۔

وفات: مشہور اور صحیح روایت کے مطابق ۲۴۹ھ میں اپنے وطن کش میں انتقال کیا، شاہ عبدالعزیزؒ صاحب نے ۲۴۳ھ سنہ وفات تحریر کیا ہے، بعض لوگوں کا بیان ہے کہ دمشق میں وفات پائی لیکن عام محققین کے نزدیک ان کا دمشق میں جانا ہی ثابت نہیں ہے۔

تصنیفات: عبد بن حمید کی متعدد تصنیفات ہیں مگر صرف دو کتابوں کا علمائے سیر وطبقات نے ذکر کیا ہے۔

تفسیر: ابن کثیر کے بیان صاحب التفسیر الحافل سے اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''دیار عرب میں یہ تفسیر مشہور ومتداول تھی'' اس کے راوی ابن خریم ہیں، حافظ ابن حجر کی نظر سے اس کا ایک جز گذرا تھا۔ (۲)

مسند: ان کی دوسری اہم کتاب مسند ہے، مسند میں ان کی دو کتابیں کبیر وصغیر تھیں، مسند صغیر دراصل کبیر کا انتخاب اور ایک جلد پر مشتمل ہے، اس میں بعض مشاہیر صحابہ کی حدیثیں درج نہیں ہیں، عبد بن حمید کے شاگرد ابراہیم بن خریم نے اس کی ان سے روایت کی ہے، اس کی ابتدا مسند ابی بکر سے ہوتی ہے، (۳) یہ مسند ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے لیکن اس کے مخطوطے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، جرمنی کے مکتبہ جامع قردیین، ایاصوفیہ، کوپرویلو وغیرہ کے علاوہ ہندوستان کے مکتبہ سندیہ اور نیشنل پبلک لائبریری بانکی پور اور دائرۃ المعارف العثمانیہ میں بھی اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ (۴)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ٦ ص ۴۵٦ وتقریب التہذیب ص ۱۴۴ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۴ وبستان المحدثین ص ۴۴ وتہذیب التہذیب ج ٦ ص ۴۵٦ (۳) بستان المحدثین ص ۴۲ والرسالۃ المستطرفہ ص ۵۷ وتہذیب التہذیب ج ٦ ص ۴۵٦ (۴) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۲۵، فوائد جامعہ برعجالہ نافعہ ص ۵۷، تذکرۃ النوادر ص ۳۷، ۳۸ ومفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۲۱۔

امام اسحاق بن بہلول

(متوفی ۲۵۲ھ)

نام ونسب: اسحاق نام، ابو یعقوب کنیت، نسب نامہ یہ ہے: اسحاق بن بہلول بن حسان بن سنان۔(۱)

وطن، ولادت اور خاندان: ان کا وطن قدیم اور مشہور شہر انبار ہے جو دریائے فرات کے کنارے بغداد سے ۱۰ فرسنگ کے فاصلہ پر واقع ہے، یہیں وہ ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے، ان کا خاندانی تعلق قبیلہ تنوخ سے ہے، اسی نسبت سے تنوخی اور انباری مشہور ہوئے۔(۲)

اساتذہ: اسحاق کو جن نامور محدثین سے شرف تلمذ حاصل ہے ان کے نام یہ ہیں:

ابن ابی فدیک، ابواسامہ، ابوبحر بکراوی، ابوداؤد حفری، ابوعاصم نبیل، ابوعامر عقدی، ابوعبدالرحمٰن مقری، ابومعاویہ ضریر، ابونعیم، ابویحییٰ حمانی، اسحاق بن یوسف ازرق، اسماعیل بن علیہ، ابوضرہ انس بن عیاض، جعفر بن عون، حسین جعفی، سعید بن سالم قداح، سفیان بن عیینہ، شعیب بن حرب، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن داؤد خریبی، عبداللہ بن نمیر، عفان بن مسلم، علی بن عاصم، ابوقطن عمر بن ہشیم، عبیداللہ بن موسیٰ، غندر، قبیصہ بن عقبہ، محمد بن عبید، محمد بن قاسم ازدی، معاویہ بن ہشام، وکیع بن جراح، وہب بن جریر، ابوالنضر ہاشم بن قاسم، یحییٰ بن آدم، یحییٰ بن سعید قطان، یعلی بن عبید اور ان کے والد بہلول وغیرہ۔(۳)

تلامذہ: مشہور تلامذہ حسب ذیل ہیں:

ابراہیم حربی، ابوبکر بن ابی الدنیا، قاضی ابوعبداللہ محاملی، عبداللہ بن محمد بن ناجیہ، قاسم بن زکریا مطرز، محمد بن عبدالرحیم صاعقہ، محمد بن موسیٰ نہرتیری، یحییٰ بن صاعد اور دونوں

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶ (۲) ایضاً ص ۳۶۹ (۳) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶۔

صاحبزادے احمد، بہلول اور پوتے یوسف بن یعقوب، جعفر فریابی وغیرہ۔(۱)

رحلت وسفر: انھوں نے علم کی جستجو اور حدیث کی طلب وتکمیل کے لئے بغداد، کوفہ، بصرہ، مدینہ اور مکہ کا سفر کیا۔(۲)

حفظ وضبط: حفظ وضبط اور صدق وثقاہت میں بڑے ممتاز تھے اسی لئے علمائے فن نے ان کو الحافظ کہا ہے، ابن صاعد کا بیان ہے کہ تقریباً ۵۰ ہزار حدیثیں انھوں نے زبانی بیان کیں مگر کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی، خطیب اور حافظ ذہبی لکھتے ہیں وکان ثقہ (یعنی وہ ثقہ ومعتبر تھے) عبدالرحمٰن نے اپنے والد ابوحاتم سے ان کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا وہ صدوق تھے۔(۳)

نقد وتمیز: حفظ وثقاہت کی طرح ان کو صحیح وغلط روایات میں امتیاز کا بھی ملکہ تھا، ذہبی نے ان کو الناقد لکھا ہے۔(۴)

فقہ: فقہ میں بھی ممتاز تھے اور اس میں کتابیں بھی لکھی ہیں، اس کی تحصیل وتکمیل حسن بن زیاد لولوئی اور امام ابویوسف کے ممتاز ترین شاگرد ہثیم بن موسیٰ سے کی تھی مگر وہ فقہائے مقلدین میں نہ تھے بلکہ مجتہد تھے اور بعض مسائل میں عام فقہا سے منفرد رائے رکھتے تھے، خطیب کا بیان ہے:

وله مذاهب اختارها ينفرد بها. (۵)	بعض مسائل میں ان کے مختارات وتفردات پائے جاتے ہیں۔

قرأت: قرأت کے فن سے بھی دلچسپی تھی اور اس میں بھی انھوں نے کتاب لکھی تھی۔

لغت، نحو وعربیت: حدیث وفقہ کے علاوہ ان کو لغت، نحو اور شعر وادب میں بھی دستگاہ

(۱) تاریخ بغداد ج۶ ص۳۶۶، ۳۶۷، وتذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۱۰۰ (۲) تاریخ بغداد ج۶ ص۳۶۶ (۳) ایضاً ص۳۶۸، والعبر ج۲ ص۳ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۱۰۰ وتاریخ بغداد ج۶ ص۳۶۶ (۵) تاریخ بغداد ج۶ ص۳۶۶، ۳۶۷۔

حاصل تھی۔(۱)

امامت: ان علوم میں کمال کی بنا پر ان کا شمار ائمہ فن میں ہوتا تھا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں وکان من کبار الأیمة (یعنی وہ اکابر ائمہ(۲) میں تھے)

اخلاق وعادات: بڑے فیاض وسیر چشم تھے، ان کی آمدنی وافر تھی مگر خود بقدر کفاف پر زندگی بسر کرتے تھے اور آمدنی کا بڑا حصہ غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کر دیتے تھے۔(۳)

وفات: اسحاق نے طویل عمر پائی ۸۸ سال کی عمر میں اپنے وطن انبار میں ماہ ذوالحجہ ۲۵۲ھ میں انتقال کیا، امیر انبار ریحونہ بن قیس شیبانی نے نماز جنازہ پڑھائی۔(۴)

اولاد: علمائے سیر نے ان کے تین صاحبزادوں احمد، بہلول یعقوب اور ایک پوتے یوسف بن یعقوب کا ذکر کیا ہے۔

آمدنی: ان کی زندگی اطمینان وفراغت سے بسر ہوتی تھی، ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ متوکل نے میرے والد کو طلب کر کے ان سے سماع کیا اور اتنی زمین عطا کی جس کی پیداوار سے ۱۲ ہزار سالانہ آمدنی ہوتی تھی، اس کے علاوہ پانچ ہزار درہم سالانہ مزید دفتر شاہی سے ملتا تھا۔(۵)

تصنیفات: وہ کثیر التصانیف تھے، فقہ، حدیث اور قرأت کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی ان کی تصنیفات تھیں، خطیب کا بیان ہے صنف فی غیر ذلك من انواع العلم لیکن وہ سب معدوم ہیں، جن کتابوں کا ذکر ملتا ہے وہ یہ ہیں:

۱- قرأت میں ایک کتاب کا تذکرہ کیا جاتا ہے لیکن اس کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔

۲- فقہ میں ان کی کتاب کا نام المتضاد تھا۔

۳- حدیث میں ایک ضخیم مسند لکھی تھی۔(۶)

(۱-۲) تاریخ بغداد ج۶ ص ۳۶۶، ۳۶۷ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۱۰۰ والعبر ج۲ ص۳ (۴) تاریخ بغداد ج۶ ص ۳۶۵ (۵) ایضاً وتذکرہ ج۲ ص۱۰۰ (۶) ایضاً۔

امام ابو محمد عبداللہ دارمی

(متوفی ۲۵۵ھ)

نام ونسب: عبداللہ نام، ابو محمد کنیت، سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن عبدالرحمن بن فضل بن بہرام بن عبدالصمد خزرجی نے بہرام کے بجائے مہران لکھا ہے۔(۱)

ولادت، خاندان، وطن: ۱۸۱ھ میں خراسان کے مشہور شہر سمرقند میں پیدا ہوئے، قبیلہ تمیم کی ایک شاخ دارم سے نسبی تعلق تھا، اس کی نسبت سے سمرقندی، تمیمی اور دارمی کہلائے، آخری نسبت سے جو دارم بن مالک کی جانب زیادہ مشہور ہوئے۔(۲)

اساتذہ: امام دارمی کو جن نامور علماء ومشائخ سے استفادہ کا موقع میسّر آیا ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

احمد بن اسحاق حضرمی، اسود بن عامر شاذان، اشہل بن حاتم، ابوصالح کاتب، لیث بن سعد ابوبکر حنفی، ابوالمغیرہ حمصی، ابوعاصم، ابونعیم، جعفر بن عون، حبان بن ہلال، ابوالیمان حکم بن نافع بہرانی، حیوۃ بن شریح، زکریا بن عدی، سعید بن عامر ضبعی، عبدالصمد بن عبدالوارث، عبداللہ بن موسیٰ، ابوعلی عبیداللہ بن عبدالمجید حنفی، عثمان بن عمر بن فارس، محمد بن مبارک صوری، محمد بن یوسف فریابی، مروان بن محمد، نضر بن شمیل، وہب بن جریر، ابوالنضر ہاشم بن قاسم، یحییٰ بن حسان تنیسی، یزید بن ہارون اور یعلی بن عبید وغیرہ۔(۳)

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں بڑے نامور محدثین اور ائمہ فن شامل ہیں، ابن ماجہ کے علاوہ

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ وتہذیب ج ۵ ص ۲۹۴ وخلاصہ تذہیب ص ۲۰۴ (۲) ایضاً وکتاب الانساب ورق ۲۱۸ (۳) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ وکتاب الانساب ورق ۲۱۸ وتہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۴۔

دوسرے تمام ائمہ صحاح کو ان سے تلمذ کا فخر حاصل ہے، امام مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے اپنی کتابوں میں ان کے مرویات درج کئے ہیں، مشہور محدثین اور علمائے نقد و جرح میں محمد بن یحییٰ ذہلی، ابوزرعہ، ابوحاتم اور امام احمد کے فرزند عبداللہ نے بھی ان سے روایت کی ہے، بعض اور ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں:

بقی بن مخلد، بندار بن بشار، جعفر بن محمد فریابی، حسن بن صباح بزار، حفص بن احمد بن فارس رجاء، بن مرجی، صالح بن محمد جزرہ، عبداللہ بن واصل بخاری، عمر بن بجیر، عمر بن محمد بجیری، عیسیٰ بن عمر سمرقندی، محمد بن عبدوس بن کامل، سراج اور مطین وغیرہ۔ (۱)

طلب حدیث کے لئے سفر: امام دارمی نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق حدیث کی طلب و تکمیل کے لئے شام، بغداد، مصر، عراق، خراسان اور مکہ و مدینہ کا سفر کیا، خطیب اور دوسرے مورخین نے ان کے سفر و رحلت کی کثرت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ایک تھے جو حدیث کے لئے بہت زیادہ سفر کیا کرتے تھے، بعض علمائے رجال نے لکھا ہے کہ رحل وطوف یعنی طلب حدیث کے لئے سفر کیا اور ملکوں کی خاک چھانی، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں" صاحب رحلت واسفارست، اکثر بلاد اسلام راگشتہ وعلم حدیث را از بلدان بعیدہ جمع کردہ۔ (۲)

حفظ وضبط: قدرت نے ان کو حفظ وضبط کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا، ائمہ فن کے اعترافات ملاحظہ ہوں:

عبداللہ بن نمیر جیسے بلند پایہ محدث کا بیان ہے کہ" دارمی حافظہ کے لحاظ سے ہم پر فوقیت رکھتے تھے رجاء بن جابر مرجی کا بیان ہے کہ میں نے احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی اور شاذکوفی وغیرہ ائمہ حدیث میں سے کسی کو عبداللہ سے بڑا حافظ نہیں پایا،

(۱) تہذیب التہذیب ج۵ ص۲۹۵ (۲) العبر ج۲ ص۸ ومرأۃ الجنان ج۲ ص۱۶۱، شذرات الذہب ج۲ ص۱۳۰، بستان المحدثین۔

امام احمد سے ان کے فرزند عبداللہ نے حفاظ حدیث کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے چند نوجوانان خراسان کا جن میں دارمی کا نام بھی تھا، ذکر کیا، عبداللہ اپنے والد سے یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ ''حفظ جن چار آدمیوں پر تمام ہوگیا، ان میں ایک یہ بھی تھے'' عثمان بن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ ''ان کے ضبط کے متعلق جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ فائق تھے'' محمد بن ابراہیم شیرازی کا بیان ہے کہ ''دارمی کا حافظہ ضرب المثل ہے'' ابوعبداللہ حکم فرماتے ہیں کہ ''وہ مشہور و برگزیدہ حفاظ حدیث میں تھے'' ابن حبان لکھتے ہیں کہ ''وہ ان لوگوں میں تھے جنھوں نے حدیثیں حفظ وجمع کیں'' امام نووی تحریر فرماتے ہیں کہ ''دارمی اپنے زمانہ کے ان مشہور حفاظ میں تھے جن کے بہت کم لوگ فضل وکمال اور حفظ وضبط میں ہمسر تھے، خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ ''وہ ان علمائے اسلام اور حفاظ حدیث میں سے ایک ہیں جو احادیث کے حفظ وجمع کے لئے مشہور ہیں'' بندار فرماتے ہیں، حفاظ دنیا چار ہیں ان میں سمرقند کے امام دارمی بھی شامل ہیں۔ (۱)

ثقاہت: ان کی ثقاہت وعدالت کے بھی علمائے فن اور ارباب کمال معترف ہیں، ابوحاتم رازی کا بیان کہ ''وہ سب سے زیادہ ثقہ وثابت تھے'' امام احمد کو ماورائے ثقاہت اور خطیب صاحب صدق وثقاہت بتاتے ہیں، ابن حبان نے ان کو حفاظ متقنین میں اور ابوحاتم نے ثقہ وصدوق لوگوں میں شامل کیا ہے۔ (۲)

معرفت ودرایت: وہ احادیث کی معرفت وتمیز کے لئے مشہور تھے روایت کی طرح درایت میں بھی ان کا مقام نہایت بلند تھا، رجا بن جابر مرجی فرماتے ہیں کہ ''میں نے ان سے بڑا کسی کو حدیث سے واقفیت رکھنے والا نہیں دیکھا، احمد بن یسار کہتے ہیں کہ حدیث میں ان کی

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ وتہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵، ۲۹۶ وتدریب الراوی ص ۲۷۶، ۲۷۷ ومقدمہ مسند دارمی ص ۷ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۰ وتہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۵۶۔

واقفیت غیر معمولی اور نظر بڑی وسیع اور گہری تھی، عثمان بن ابی شیبہ ان کے حافظہ کی طرح ان کی معرفت وبصیرت کے بھی معترف تھے، ابو منصور شیرانی کا بیان ہے کہ ان کی درایت ضرب المثل تھی، علم حدیث میں ان کی واقفیت اور تمیز کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے امام احمد کے سامنے ابن المنذر کی تعریف کی تو انھوں نے فرمایا کہ مجھ کو ان سے کوئی واقفیت نہیں مگر حیرت ہے کہ تم لوگوں کو عبداللہ بن عبدالرحمٰن کا علم نہیں، پھر تین مرتبہ تاکید کے ساتھ فرمایا کہ (علیك بذاك السید) یعنی تم کو اس سردار کے حلقۂ فیض سے وابستہ رہنا ضروری اور لازم ہے، ایک اور شخص نے امام احمد سے حمانی کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے ارشاد فرمایا کہ دارمی کے قول کی بنا پر ہم ان کو متروک الحدیث سمجھتے ہیں، عبداللہ بن مبارک مخرمی کا بیان ہے کہ ''اے اہل خراسان جب تک یہ تمہارے درمیان موجود ہیں تم کو کسی اور سے اشتغال رکھنے کی ضرورت نہیں۔''(۱)

فقہ وتفسیر: امام دارمی کو دوسرے اسلامی علوم وفنون میں بھی دستگاہ حاصل تھی، فقہ وتفسیر سے ان کی مناسبت اور تعلق کا اکثر علمائے رجال نے ذکر کیا ہے، حافظ ابن حجر ان کو باکمال مفسر اور صاحب علم فقیہ قرار دیتے ہیں،(۲) ان فنون میں انھوں نے کتابیں بھی لکھی تھیں اور فقہ میں ان کے مجتہدانہ کمالات کا ثبوت ان کی سنن سے بھی ملتا ہے۔

عقل ودانش: اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت ودانائی اور عقل وفراست سے بھی خاص طور پر بہرہ ور کیا تھا خطیب اور دوسرے مورخین کا بیان ہے کہ وكان علىٰ غاية العقل ونهاية الفضل یعنی وہ نہایت عاقل وفاضل شخص تھے، بعض علمائے رجال لکھتے ہیں کہ ''وہ اپنی متانت اور دانشمندی کے لیے مشہور تھے۔(۳)

عبادت وتقویٰ: امام دارمی علم وعمل دونوں کے جامع تھے اور زہد وتقویٰ کے لحاظ سے بھی

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۱، ۳۲ وتہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵ (۲) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵

(۳) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱٦۔

ان کا مرتبہ نہایت بلند تھا، ان کو عبادت واطاعت الٰہی میں بڑا انہاک تھا، عبداللہ بن نمیر فرماتے ہیں کہ ''وہ ورع وتقویٰ کے اعتبار سے ہم سب پر فوقیت رکھتے تھے'' خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ ''وہ زہد واتقا سے متصف تھے'' ابو منصور شیرازی کا بیان ہے کہ ''ان کی ذات زہد وتقویٰ اور دیانت وعبادت کے لئے ضرب المثل تھی'' عثمان بن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے ان کی عصمت اور پاکیزگیِ نفس کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس سے زیادہ عظیم اور برتر تھے'' (۱)

جاہ ومنصب اور دنیا طلبی سے پرہیز: دنیاوی عیش وتنعم سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے، قناعت اور سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے، امام احمد فرماتے ہیں کہ ''میرے سامنے کفر پیش کیا گیا میں نے اس کو ٹھکرا دیا، دارمی کے سامنے دنیا پیش کی گئی اور وہ اس کی جانب مائل اور متوجہ نہ ہوئے'' دنیوی جاہ منصب سے بے نیازی کا یہ حال تھا کہ ان کو سمرقند کا محکمہ قضا پیش کیا گیا تو قبول کرنے سے انکار کردیا، پھر سلطان کے اصرار پر چند دنوں کے لئے قبول کرلیا مگر بہت جلد اس سے سبکدوش ہوگئے۔ (۲)

سنت وحدیث کی مدافعت: انھوں نے حدیث کی خدمت واشاعت اور اس کی حمایت ومدافعت بھی کی اور مخالفین حدیث کا مقابلہ کر کے ان کا زور توڑ دیا، احادیث کے متعلق شکوک واعتراضات کا جواب اور کذب ودروغ کی آمیزشوں سے ان کو پاک کر کے عوام وخواص سب کے دلوں میں ان کی اہمیت وعظمت اور رسول کی محبت بٹھا دی، اس طرح مختلف حیثیتوں سے انھوں نے علم حدیث وآثار کو فروغ بخشا، علمائے رجال لکھتے ہیں ''اپنے وطن سمرقند میں حدیث وسنت کا بول بالا کر کے لوگوں کو اس کی جانب مائل اور مخالفین حدیث کا قلع قمع کردیا'' (۳)

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ وتہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۱ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ (۳) خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۲۰۴۔

فقہی مذہب ومسلک: کتابوں میں ان کے فقہی مذہب کی تصریح موجود نہیں ہے لیکن قیاس اور ان کی سنن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام محدثین کی طرح وہ کسی ایک امام کے مسلک سے وابستہ نہ تھے بلکہ اپنے اجتہاد وتفقہ کے مطابق حدیث وقرآن کی پیروی کرتے تھے۔

فضل وامامت: ان گوناگوں کمالات نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنادیا تھا اور وہ ائمہ مسلمین میں شمار کئے جاتے ہیں، معاصرین علما نے بھی ان کی اس حیثیت کو تسلیم کیا ہے، امام احمد ان کو امام وسید کے لقب سے موسوم کرتے تھے، ابوسعید اشج کا بیان ہے کہ ''وہ ہمارے امام ہیں'' ابوحاتم فرماتے ہیں کہ ''دارمی اپنے زمانہ کے ائمہ میں تھے'' ابوحامد بن شرقی کا خیال ہے کہ ''خراسان میں ۱۵ ائمہ حدیث پیدا ہوئے، ان میں ایک یہ بھی تھے۔''(۱)

وفات: مشہور روایت کے مطابق تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں اپنے وطن سمرقند میں انھوں نے ۸ رذی الحجہ ۲۵۵ھ پنجشنبہ کے دن بعد نماز عصر انتقال کیا اور عرفہ کے دن جمعہ کو تجہیز وتکفین ہوئی لیکن بعض مورخین کا بیان ہے کہ انتقال عرفہ کے دن اور تجہیز وتکفین نحر کے دن انجام پائی، امام بخاری کو جب وفات کی خبر ہوئی تو فرط غم سے سر جھکا کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور یہ شعر پڑھا:

ان تبق تفجع بالاحبة كلهم   وفناء نفسك لاابالك افجع

اگر تو زندہ ہوتا تو احباب کی مفارقت کے صدمے برداشت کرتا، تیرا صفحہ ہستی سے معدوم ہونا سب سے زیادہ دردناک سانحہ ہے۔

---

(۱) خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۲۰۴ وتاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۱ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ وتہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵۔

تصنیفات

امام دارمی کی جانب حسب ذیل تصنیفات منسوب ہیں:

۱- کتاب التفسیر

۲- الجامع یا کتاب الجامع: خیر الدین زرکلی نے اس کا نام الجامع الصحیح لکھا ہے اور اس کو مطبوعہ بتایا ہے،(۱) غالب گمان ہے کہ یہ فقہ و احکام کی کتاب ہے۔

مولانا سید ابوالوزیر احمد حسن صاحب نے حاشیہ مشکوٰۃ میں امام دارمی کی رد جہمیت میں بھی کچھ کتابیں بتائی ہیں (۲) لیکن ان کے نام نہیں تحریر کیے ہیں''

اسی طرح علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ ''علمائے سیر نے ان کی تصنیفات میں جامع، مسند تفسیر اور ان کے علاوہ کتابوں کا ذکر کیا ہے مگر غالباً موجود صرف دو کتابیں ہیں۔ (۳)

۳- سنن دارمی: یہ ان کی سب سے مشہور اور اہم کتاب ہے، صحاح ستہ کے بعد حدیث کی جو کتابیں زیادہ اہم اور مستند سمجھی جاتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے، شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی فرماتے ہیں'' کتاب اوازاحسن کتب حدیث است'' (۴) اس کی اہمیت کی بنا پر محدثین اور علمائے فن نے اس کی حدیثوں کو قابل احتجاج اور لائق استدلال خیال کیا ہے، مشکوٰۃ میں جو منتخب کتابوں کی حدیثوں کا منتخب مجموعہ ہے، صحاح اور دوسری معتبر کتابوں کی طرح اس کی احادیث بھی شامل ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کی صحت و اسناد کی بنا پر اس کو صحاح ستہ میں بھی شامل کیا گیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔

کتب و ابواب کی تعداد: سنن دارمی ۳۵ فصول (کتب) اور ایک ہزار چار سو آٹھ ابواب

---

(۱) اعلام ج ۲ ص ۵۶۳۔ (۲) حاشیہ تنقیح الرواۃ دیباچہ مشکوٰۃ ص ۶ (۳) تدریب الراوی ص ۵۷ (۴) اکمال شرح مشکوٰۃ ص ۱۲۔

پر مشتمل ہے۔

ترتیب: عام کتب حدیث وسنن کے برعکس اس کی ابتدا "باب ماکان علیه الناس قبل مبعث النبی صلی الله علیه وسلم من الجهل والضلالة" سے ہوتی ہے، اس فصل کے مختلف ابواب میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اوصاف وخصائص کو جو کتب قدیمہ میں مذکور ہیں اور آپ کے معجزات، فضائل ومحامد، اتباع سنت اور علم کی اہمیت وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد عام کتب سنن کی طرح طہارت اور نماز وغیرہ کے جملہ ابواب اور آخر میں وصایا اور فضائل قرآن کے ابواب ہیں۔

خصوصیات: ۱- اس میں ۱۵ ثلاثی حدیثیں ہیں یہ تعداد بظاہر تو کم معلوم ہوتی ہے لیکن سنن کی کمیت اور دوسری کتابوں کے لحاظ سے کم نہیں ہے، اسی لیے بعض علمائے فن کا بیان ہے کہ "اس کی ثلاثیات بخاری کی ثلاثیات سے زیادہ ہیں اور رباعیات بکثرت ہیں۔(۱)

۲- اس کی ایک اہم خصوصیت صحت کا التزام اور علوئے اسناد بھی ہے، علمائے رجال کا بیان ہے وله اسانید عالية یعنی دارمی کی سندیں نہایت عالی اور بلند پایہ ہیں۔(۲) علمائے جرح وتعدیل نے تصریح کی ہے کہ اس کے اکثر رجال ثقہ اور بیشتر حدیثیں صحیح وثابت ہیں، علامہ ابن حجر نے اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کو سنن ابن ماجہ سے بھی زیادہ اہم اور فائق بتایا ہے۔(۳)

۳- یہ اگرچہ حدیث کی کتاب ہے لیکن اس میں فقہی مسائل ومباحث اور ان کے متعلق فقہا کے اختلافات ودلائل بھی بیان کیے گئے ہیں اور مختلف اقوال میں تطبیق وتوجیہ یا مرجح ومختار مسلک کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

۴- احادیث کی طرح صحابہ وتابعین کے آثار وفتاویٰ بھی نقل کیے گئے ہیں، بلکہ

(۱) الرسالة المستطرفہ ص ۲۹ ومقدمہ مشکوۃ ص ۱۵ ومقدمہ دارمی ص ۷ (۲) الرسالة المستطرفہ ص ۲۹ (۳) مقدمہ دارمی ص ۷۔

بعض بعض ابواب میں صرف صحابہ وتابعین کے اقوال وآثار ہی مذکور ہیں۔

۵- عام خصوصیات اور جملہ فنی خوبیوں سے بھی یہ کتاب آراستہ ہے، مثلاً روایات کے مفہوم ومنشا کی وضاحت، ابہام کی تشریح، دقیق الفاظ اور مشکل لغات کا حل، رواۃ کے ناموں کی مختلف حیثیتوں سے وضاحت، بلاد واماکن کی تحقیق، تعدد طرق واسناد وروایات اور ان کے الفاظ کا فرق واختلاف اور متابعات وغیرہ کی تفصیل مسند، مرفوع اور منقطع وموقوف کی توضیح، خطا، شک، تردد اور اشتباہ کی تصریح، روایات اور رواۃ کے متعلق مختلف قسم کی وضاحتیں، اساتذہ کی وضاحت وتشریح، راوی کے سماع وعدم سماع اور لقا وعدم لقا کا ذکر، احادیث کی تصویب، ان کے درمیان ترجیح واسباب ترجیح اور ان کے نسخ وعدم نسخ وغیرہ کی تفصیل موجود ہے۔

سنن یا مسند دارمی: اس کتاب کو سنن اور مسند دونوں کہا جاتا ہے، اس لیے اس کی مختصر وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

مسند میں صحابہ کے ناموں کی ترتیب پر حدیثیں درج ہوتی ہیں اور سنن کی ترتیب فقہی ابواب پر ہوتی ہے، ایمانیات اور کتاب الطہارۃ سے لے کر وصایا تک کی حدیثیں ابواب کے ماتحت نقل کی جاتی ہیں، اس تعریف کی رو سے دارمی کا شمار سنن ہی میں ہونا چاہیے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں ''کہا جاتا ہے کہ مسند دارمی مسند نہیں ہے بلکہ اس کی ترتیب ابواب پر ہے۔''(۱) صاحب شرح الفیہ کا بیان ہے کہ ''ابن صلاح نے اس کو مسانید شمار کیا ہے حالانکہ یہ ان کا وہم ہے کیوں کہ اس کی ترتیب مسانید کے بجائے ابواب پر ہے''(۲) شاہ عبدالعزیز صاحب ارقام فرماتے ہیں:

> ''وایں کتاب برخلاف اصطلاح محدثین مشہور بمسند گشتہ حالانکہ مرتب برابواب است نہ برصحابہ، پس باید کہ آنرا سنن دارمی گوید۔(۳)

(۱) تدریب الراوی ص ۵۷ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۳ (۳) بستان المحدثین ص ۴۳۔

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی اصل حیثیت سنن کی ہے تاہم ابن صلاح کے قول کو اس قدر شہرت ہوئی کہ اب وہ سنن کے بجائے مسند ہی کے نام سے زیادہ مشہور ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ”کتاب السنن جو مسند دارمی کے نام سے موسوم کی جاتی ہے مرتبہ میں عام سنن سے کم تر نہیں ہے“(۱) اس کا سبب یہ ہے کہ مسند کا اطلاق کبھی ان کتابوں پر بھی کیا جاتا ہے جن کی ترتیب صحابہ کے ناموں کے بجائے فقہی ابواب پر ہوتی ہے لیکن ان کی سندیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی اور مذکور ہوتی ہیں، اسی لیے امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول الله وسننه وایامه رکھا ہے اور امام مسلم نے بھی صحیح مسلم کو مسند کے نام سے تعبیر کیا ہے،(۲) اس لحاظ سے سنن دارمی کو بھی مسند کہا جاسکتا ہے، عراقی کا بیان ہے کہ ”یہ مسند کے نام سے مشہور ہے، جیسا کہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا نام بھی مسند رکھا ہے کیوں کہ اس کی احادیث کی سندیں رسول اللہ تک مذکور ہیں“(۳) یہاں ایک اور شبہ پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دیتے ہوئے مولانا عبدالحلیم چشتی لکھتے ہیں ”اسی طرح سنن دارمی کو مسند دارمیؒ کے نام سے ذکر کرتے ہیں حالانکہ اس میں تمام حدیثیں مرفوع نہیں ہیں، مرسل، منقطع اور معضل سب ہی کچھ ہیں مگر مرفوعات کا ذخیرہ زیادہ ہے، اس لیے اس کو بھی مسند کہہ دیتے ہیں۔“(۴)

اس تفصیل سے ثابت ہوگیا کہ اگرچہ دارمی کی تصنیف اپنی نوعیت اور ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے سنن میں شامل ہے لیکن وہ مسند کے نام سے بھی مشہور ہے اور اس کو مسند کہنا غلط نہیں ہے۔

کیا سنن دارمی صحاح ستہ میں شامل ہے؟: جمہور علمائے اسلام کے نزدیک صحاح کی

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ص ۱۳۳۴ (۲) فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۱۵۸ (۳) تدریب الراوی ص ۵۷

(۴) فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۱۸۵۔

چھٹی کتاب سنن ابن ماجہ ہے لیکن بعض لوگوں نے مؤطا امام مالک کو اور بعض نے دارمی کو صحاح کی چھٹی کتاب قرار دیا ہے، مغلطائی کی یہی رائے ہے، ان لوگوں کے دلائل یہ ہیں کہ دارمی کی سنن صحت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی سنن پر فوقیت رکھتی ہے، اس کی سندیں عالی، رجال ثقہ وقوی، رباعیات بکثرت اور شاذ ومنکر روایات بہت کم ہیں، علاوہ ازیں امام دارمی کا زمانہ قدیم ہے اور فضل وکمال کے لحاظ سے ان کا مرتبہ زیادہ ہے۔

لیکن بایں ہمہ جمہور کے قول کے مقابلہ میں یہ قول مرجوح سمجھا جائے گا۔

ایک شبہہ کا ازالہ: مسند دارمی کے متعلق یہ جو کہا جاتا ہے کہ ''وہ مرسل، موقوف، منقطع اور معضل روایات پر مشتمل ہے، تو دراصل یہ امام بخاری کی صحیح کے مقابلہ میں ہے جیسا کہ عراقی کے پورے بیان سے اس کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

''یہ مسند کے نام سے مشہور ہے، جس طرح امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام المسند الجامع رکھا ہے لیکن (بخاری کے مقابلہ میں) دارمی کے اندر مرسل، منقطع اور معضل روایتیں زیادہ ہیں'' (۱) اور اس قول سے دارمی کی شہرت واہمیت میں بھی فرق نہیں آتا کیوں کہ اس کی صحت، علوئے اسناد وغیرہ کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے، باقی وقف، ارسال اور انقطاع وغیرہ تو حقیقت میں امام دارمی کے حزم واحتیاط کی دلیل ہے اور مؤطا امام مالک جیسی معتبر اور اہم کتاب میں تو اسی قسم کی روایتوں کی زیادتی ہے۔

سنن دارمی کا ایک قلمی نسخہ ۷۳۵ھ کا لکھا ہوا ۲۵۵/ اوراق پر مشتمل کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے، (۲) ۱۲۸۶ھ میں نواب صدیق حسن خاں صاحب حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو ان کو وہاں شاہ ولی اللہ صاحب کے ذخیرۂ کتب میں اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوا اور انھوں نے اس کو نقل کر ڈالا، اسی نقل کو ۱۲۹۳ھ میں مولانا عبدالرشید بن محمد شاہ کشمیری نے دو اور نسخوں سے جن میں سے ایک ۸۰۰ھ کا لکھا ہوا تھا اور ا

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۳ (۲) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۲۱۔

س کی تصحیح صاحب حصن حصین علامہ جزری نے کی تھی مقابلہ وتصحیح کے بعد مختصر حواشی کے ساتھ مطبع نظامی کانپور سے شائع کیا۔

مولانا عبدالرشید صاحب نے حواشی میں دوسرے نسخوں سے اس کا فرق بھی ظاہر کیا ہے اور مشکل الفاظ، اعراب، اسماورجال اور بلاد واماکن کی مختصر تشریح اور حدیث کے معنی ومفہوم کی مختصر وضاحت بھی کی ہے اور اس کے شروع میں ایک مقدمہ کے اندر سنت وحدیث کی اہمیت، محدثین کی عظمت، کتب حدیث کے اقسام اور امام دارمی کے حالات وسوانح اوران کی سنن کے مقام ومرتبہ وغیرہ سے بحث کی ہے۔

سنن دارمی کی ثلاثیات کو الگ سے بھی مرتب کیا گیا ہے، حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:

''کتاب ثلاثیات دارمی ....ان پندرہ حدیثوں پر مشتمل ہے جو ان کی مسند میں بیان ہوئی ہیں۔(۱)

☆☆☆

(۱) کشف الظنون ج اول ص ۳۵۵۔

امام بخاریؒ

(متوفی ۲۵۶ھ)

نام ونسب اورابتدائی حالات: سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ، ان کا اصلی نام محمد اور کنیت ابو عبداللہ ہے، ان کے جداعلی بردزبہ فارس کے رہنے والے اور مذہباً مجوسی تھے۔

امام صاحب کے جدامجد مغیرہ پہلے شخص ہیں، جو اس خاندان میں مشرف بہ اسلام ہوئے، اس زمانہ کا قاعدہ تھا کہ جس شخص کے ہاتھ پر اسلام لاتے تھے، اسی کی نسبت سے نومسلم مشہور ہو جاتے تھے، مغیرہ چونکہ امیر بخارا یمان جعفی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے، اس لئے جعفی مشہور ہوگئے، اور یہ لقب نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا ہوا امام صاحب تک پہنچا، اس بنا پر امام صاحب جعفی کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔(۱)

امام صاحب کے دادا ابراہیم کا حال کچھ نہیں معلوم ہوسکا لیکن ان کے والد اسماعیل چوتھے طبقہ کے معتبر محدثین میں شمار کیے جاتے ہیں، اسماعیل کی ثقاہت اور مرتبہ کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام مالک اور حماد جیسے محدثین کی انھوں نے شاگردی کی اور ابن مبارک جیسے شیوخ کی صحبت میں مدتوں رہے، اہل عراق نے اکثر حدیثیں ان سے روایت کی ہیں، خود امام بخاری نے تاریخ کبیر میں ان کے حالات لکھے ہیں اور اپنے بزرگ والد کے فضل وکمال پر فخر کیا ہے۔(۲)

---

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۸ و کتاب الانساب ورق ۱۳۲ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۸۔

امام صاحب کے نام سے زیادہ ان کی وطنیت مشہور ہے، اس لئے اس قدر ہر شخص جانتا ہے کہ ان کا اصلی وطن بخارا ہے، بخارا قدیم جغرافیہ میں اقلیم پنجم کے صوبہ ماوراء النہر کا ایک جلیل القدر شہر سمجھا جاتا تھا (۱) لیکن جدید جغرافیہ کے رو سے ایشیائی ترکستان میں واقع ہے اس کی پشت پر سمرقند، داہنی طرف تاشقند، بائیں طرف صحرائے کراکورم اور سامنے صحرائے قزل خورم ہے، دوسری صدی کے اواخر میں (جب بخارا کو امام صاحب کی پیدائش کا شرف حاصل ہوا) خلفائے عباسیہ کے زیر حکومت تھا اور مقامی انتظام کے لیے دربار خلافت کی طرف سے ایک گورنر رہا کرتا تھا۔

شوال کی تیرہویں تاریخ تھی اور جمعہ کا دن تھا، جب ۱۹۴ھ میں امام بخاری پیدا ہوئے ابھی کھیل کود کے دن ختم نہیں ہوئے تھے کہ ان کے والد اسماعیل ان کو یتیمی کا داغ دے کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے، ان کی والدہ جن کی تنہا سرپرستی اور توجہ پر ان کی آئندہ ترقی کا دارومدار تھا، ان کو اور ان کے بڑے بھائی احمد کو لے کر بخارا سے مکہ معظمہ چلی آئیں، وہیں انھوں نے نشوونما پائی اور ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ (۲)

امام صاحب کی تحصیل علم کا زمانہ بچپن ہی سے شروع ہوتا ہے، ابتدائی تعلیم میں علم فقہ پر توجہ کی اور امام وکیع اور امام ابن مبارک جیسے اساتذہ فن کی تصنیفات کا مطالعہ کیا، پندرہ برس کی عمر میں فقہ کی تعلیم سے فارغ ہو گئے تو اس مقدس فن کی جانب متوجہ ہوئے، (۳) جس کی پریشان اور پراگندہ حالت ان کی آئندہ توجہ اور سرپرستی کا انتظار کر رہی تھی، اگرچہ اس تفصیل کا حال نہیں معلوم ہوتا کہ امام صاحب نے کن مشائخ سے فن حدیث کو حاصل کیا لیکن اس قدر مسلم ہے کہ ان کا فضل وکمال اسحاق بن راہویہ اور علی بن المدینی کے فیضان تعلیم کا زیادہ ممنون ہے۔

(۱) معجم البلدان ج ۲ ص ۸۱ و ۸۲ و تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۳۳۲ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۸ (۳) ایضاً ص ۴۷۹ و طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۲ ص ۴ و ۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۴۔

ان بزرگوں کے علاوہ اور جن مشائخ کا تاریخوں میں پتہ چلتا ہے، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے شیوخ میں مختلف درجہ اور مختلف طبقے کی جماعتیں شامل تھیں، مثلاً:

۱- تبع تابعین جیسے محمد بن عبداللہ انصاری، ابو عاصم النبیل۔

۲- تبع تابعین کے معاصر، مگر کسی ثقہ تابعی سے انھوں نے حدیث کی روایت نہیں کی، جیسے آدم ابن ایاس۔

۳- تبع تابعین سے جن لوگوں کو اخذ حدیث کا موقع ملا، جیسے قتیبہ بن سعید، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی، یحییٰ بن معین۔ (۱)

۴- ہم درس طلبہ جیسے محمد بن یحییٰ ذہلی، ابوحاتم رازی، محمد بن عبدالرحیم صاعقہ۔

۵- امام صاحب کے معاصرین جیسے عبداللہ بن حماد آملی، عبداللہ بن ابی العاص خوارزمی (۲)

امام صاحب کے شوق علم کا یہ حال تھا کہ بغداد، بصرہ، خراسان، کوفہ، خوارزم، حجاز اور شام میں اس وقت کوئی محدث ایسا نہ تھا، جس سے امام صاحب نے کچھ نہ کچھ اخذ نہ کیا ہو، (۳) ان کے تمام شیوخ کی مجموعی تعداد ایک ہزار اسّی ہے جس میں پہلے قسم کے محدثین کا حصہ زیادہ ہے۔ (۴)

امام صاحب فطرۃً نہایت قوی الحافظہ تھے، فطرت کی اس فیاضی سے انھوں نے فن حدیث کی تحصیل میں بہت فائدہ اٹھایا، استاذ سے جو حدیث سنتے فوراً زبانی یاد کر لیتے، ابتدا میں کتابت حدیث کے سخت خلاف تھے، ان کا قول تھا کہ:

”کتابت سے انسان کی فطری قابلیت کم ہوجاتی ہے اور محض کتابوں پر

(۱) امام مسلم نیشاپوری نے بھی ان لوگوں سے روایت کی ہے (۲) مقدمہ فتح الباری ۴۷۹، ۴۸۰ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۴ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳ (۴) مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۹۔

اعتماد کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔"(۱)

لیکن آگے چل کر جب ضروریات زمانہ متقاضی ہوئے تو ان کو اپنی رائے بدلنی پڑی۔

امام صاحب کی شہرت: امام صاحب کے فضل وکمال کی شہرت، اس سے پہلے کہ وہ فارغ التحصیل ہوں دور دور تک پہنچ چکی تھی، حفظ حدیث میں ان کا پایہ اس قدر بلند تھا کہ بڑے بڑے محدثین مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، اس لئے ان کی تیزی ذہن اور قوت حافظہ کا عام طور پر اعتراف کیا جاتا تھا، ان کے زمانہ کے وہ علما جن کے گرد وپیش ایک بڑی جماعت تلامذہ کی رہتی تھی اور جو فضل وکمال کے لحاظ سے خود امام فن کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے کسی مجموعۂ حدیث کو امام صاحب صحیح تسلیم کرتے، تو فخریہ لہجہ میں کہتے کہ:

"ہماری ان حدیثوں کو محمد بن اسماعیل بخاری نے صحیح تسلیم کیا"(۲)

یعنی ان احادیث کی صحت میں اب کس کو کلام ہو سکتا ہے، جب امام بخاری جیسے نقاد نے صحیح قرار دیا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس شہرت نے وہ ترقی کی کہ دور دور سے لوگ سمع حدیث کی غرض سے حاضر ہونے لگے، ائمہ حدیث درس دیتے ہوئے امام صاحب کو اپنی مسند خاص پر جگہ دیتے اور امام احمد بن حنبل جیسے بزرگ کہتے ہیں کہ "خراسان کی سرزمین نے محمد بن اسماعیل جیسا شخص پیدا نہیں کیا"(۳)

یوسف بن موسیٰ مروروزی نے بصرہ میں امام صاحب کی وسعت علم اور شہرت کا پر اثر منظر دیکھا تھا، ان کا بیان ہے کہ ایک دن کسی شخص کو گلیوں میں پکارتے ہوئے سنا کہ "اے قدردانان علم! ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل آج کل بصرہ میں تشریف فرما ہیں، جو شخص ان کی زیارت کا مشتاق ہو، جامع مسجد میں حاضر ہو" یہ آواز سنتے ہی جامع مسجد میں حاضر ہوا، مسجد میں اس وقت بہت سے علما جمع تھے، ایک ادھیڑ عمر کا شخص ستون کی آڑ میں نماز پڑھ

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۷ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۳، ۴۸۴ (۳) تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۱۔

رہا تھا، معلوم ہوا کہ امام محمد بن اسماعیل بخاری یہی ہیں، نماز سے فارغ ہو کر علما کی طرف متوجہ ہوئے، حاضرین نے درخواست کی، آج حدیث کے متعلق خطبہ دیں، امام صاحب نے منظور فرمایا، شہر میں اعلان کر دیا گیا کہ فلاں وقت امام صاحب بیان فرمائیں گے، جوق جوق مسجد میں جمع ہونے لگے، جب حاضرین کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی تو امام صاحب کھڑے ہوئے اور یوں بیان کرنا شروع کیا، کہ اے علمائے بصرہ! آج میں تمہارے سامنے وہ حدیث پیش کروں گا جن کے راوی تمہارے شہر بصرہ کے رہنے والے ہیں، مگر تم کو ان کی خبر نہیں'' اس کے بعد انھوں نے جتنی حدیثیں بیان کیں، سب کے رواۃ اہل بصرہ تھے۔(۱)

امام صاحب کی اس وسعت معلومات اور معرفت حدیث کو دیکھ کر اکثر علما کہا کرتے تھے کہ:

انما هو آية من آيات الله	امام بخاری خدا کی نشانیوں میں سے
تمشي على وجه الارض	ایک نشانی ہے جو زمین پر چلتی پھرتی
ماخلق الاللحديث۔(۲)	نظر آتی ہے، خدا نے ان کو صرف
	حدیث ہی کے لیے پیدا کیا۔

تحصیل علم کے لئے مختلف مقامات کا سفر: امام صاحب نے تحصیل علم اور زیارت علما کے لئے دور دراز مقامات کے سفر کیے، مصر و شام میں استفادۂ حدیث کی غرض سے دوبارہ گئے، حجاز میں متواتر چھ سال تک قیام کیا، کوفہ و بغداد میں جو علما کا مسکن تھا، بار بار آیا کیے، بصرہ میں چار بار گئے اور بعض مرتبہ پانچ پانچ برس تک قیام کیا، ایام حج میں مکہ معظمہ چلے جاتے اور فراغت کے بعد پھر بصرہ چلے آتے۔(۳) ان تمام سفروں میں نیشاپور کا سفر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۵، ۱۶ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۵ والبدایہ ج ۱۱ ص ۲۶ و تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۵ (۳) مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۹ و تاریخ بغداد ج ۲ ص ۴ و ۵۔

نیشاپور کا سفر: نیشاپور اس زمانے میں علم حدیث کا مرکز تھا، مسلم بن حجاج صاحب صحیح مسلم اور ان کے استاذ امام محمد بن یحییٰ ذہلی جیسے محدث اسی کی خاک سے اٹھے تھے اور ان کے علم وفضل نے نیشاپور کو دور دور تک مشہور کر دیا تھا، ایسی حالت میں امام صاحب کا نیشاپور جانا اور بڑے بڑے اساتذہ کی موجودگی میں اپنے فضل وکمال کا سکہ بٹھانا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔

امام صاحب جس شان سے نیشاپور میں داخل ہوئے اور جس جوش سے ان کا خیر مقدم کیا گیا، اس کی تصویر خود امام مسلم ان مختصر لفظوں میں کھینچی ہے:

''امام بخاری جب نیشاپور میں تشریف لائے تو اس دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا گیا کہ والیان ملک اور سلاطین کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔''(۱)

امام صاحب نیشاپور پہنچ کر درس وتدریس حدیث میں لگ گئے، علمائے شہر اکثر اوقات حاضر ہوا کرتے اور امام صاحب کی معلومات حدیث سے مستفیض ہوتے، خود امام مسلم کا یہ حال تھا کہ امام صاحب کی روزانہ مجلس کبھی ان سے خالی نہیں ہوتی تھی، ایک دن امام صاحب کی جامعیت اور تبحر علمی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بے اختیار پیشانی کا بوسہ لے لیا اور جوش میں آ کر کہا کہ:

دعنی اقبل رجلیك یاامیر المومنین فی الحدیث۔	اے ملک حدیث کے بادشاہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں قدم بوسی کا شرف حاصل کروں۔

امام محمد بن یحییٰ ذہلی اس پایہ کے شخص تھے کہ امام مسلم کے استاذ اور نیشاپور کے مسلم محدث تھے، انھوں نے اپنے تمام شاگردوں کو حکم دیدیا تھا کہ امام صاحب کی مجلس میں حاضر ہوا کریں خود امام صاحب کی شہرت اور فضل وکمال نے اس طرح لوگوں کو گرویدہ کہ امام ذہلی جیسے بزرگوں کی مجلسیں بے رونق ہوگئیں۔(۲)

(۱) مقدمہ فتح الباری ص۴۹۱ (۲) ایضاو تاریخ بغداد ج۲ ص۳۰ وطبقات الشافعیہ ج۲ ص۱۱۔

ایک دن امام ذہلی نے اپنے مجلس میں فرمایا کہ ''میں کل محمد بن اسماعیل بخاری کی ملاقات کو جاؤں گا جس شخص کا جی چاہے میرے ساتھ چلے'' ساتھ ہی امام ذہلی کو یہ خیال ہوا کہ امام بخاری کی بدولت میری درسگاہ میں جو بے رونقی چھا گئی ہے، اس کا اثر میرے طلبہ پر بھی پڑا ہے، اس لیے میرے ساتھیوں میں سے کوئی طالب علم ایسی بات نہ پوچھ بیٹھے، جس کی بدولت مجھ میں اور محمد بن اسماعیل میں رنجش ہو جائے اور غیر اقوام کو اہل سنت کے اختلاف پر ہنسی اڑانے کا موقع ہاتھ آ جائے، اس لیے اپنے ہمراہیوں کو تاکید کر دی کہ امام بخاری سے اختلافی مسائل کے متعلق کوئی سوال نہ کیا جائے۔(۱)

دوسرے دن امام ذہلی اپنی جماعت کے ساتھ امام صاحب کے یہاں پہنچے، اتفاقاً وہی صورت پیش آ گئی جس کا انھیں خوف تھا، ایک شخص نے اٹھ کر امام صاحب سے سوال کیا کہ یا ابا عبداللہ! قرآن کے جو الفاظ ہماری زبان سے نکلتے ہیں، کیا وہ مخلوق ہیں؟ اس کے اصلی الفاظ یہ تھے ''لفظی بالقرآن مخلوق'' امام صاحب ساکت رہے، پھر اس شخص نے دوبارہ سوال کیا، امام صاحب نے مجبور ہو کر جواب دیا کہ:

القرآن کلام الله غیر مخلوق	قرآن کلام الٰہی اور غیر مخلوق ہے، اور
ولفظی بالقرآن الفاظنا	جو الفاظ ہماری زبانوں سے نکلتے ہیں وہ
والفاظنا من افعالنا وافعالنا	ہمارے الفاظ ہیں اور ہمارے الفاظ
مخلوقة.(۲)	ہماری زبان کی ایک حرکت ہے اس لئے
	ہمارا ایک فعل ہے اور افعال مخلوق ہیں۔

امام صاحب نے ان مختصر لفظوں میں درحقیقت اس بحث کا فیصلہ کر دیا تھا، ظاہر ہے کہ اگر قرآن کا مفہوم نفس کلام سے ہے، تو کلام خدا کی ایک صفت ہے، اور خدا کی صفت کیوں کر مخلوق ہو سکتی ہے؟ اگر وہ الفاظ مراد ہیں جو ہماری حادث زبانوں سے نکلتے ہیں، تو

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۱ (۲) ایضاً۔

چونکہ وہ مخلوق کا ایک فعل ہے، لہذا ان کے مخلوق ہونے میں کلام نہیں۔

لیکن اس دقیق جواب کو عوام نہ سمجھ سکے، اس لئے اس واقعہ کو اس قدر بڑھایا اور شہرت دی کہ امام صاحب کی عام ہردلعزیزی میں فرق آ گیا مگر جو لوگ دقیقہ رس اور نکتہ سنج تھے، وہ اس جواب کی تہ کو پہنچ گئے اور پیشتر سے زیادہ وقعت کرنے لگے، انہی لوگوں میں ایک شخص امام مسلم بھی تھے، ان کو جب معلوم ہوا کہ امام ذہبی بھی اس جواب کی بدولت امام صاحب کے مخالف ہو گئے اور انھوں نے اپنی مجلس میں منادی کرادی کہ ''جو شخص لفظی بالقرآن مخلوق کا قائل ہو وہ ہماری مجلس میں شریک نہ ہو'' تو سخت برآشفتہ ہوئے اور وہ تمام نوشتے اونٹوں پر لدوا کر واپس کر دیے جن میں امام ذہبی کی تقریریں قلمبند کی تھیں۔(۱)

جب یہ اختلاف ایک نازک حد تک پہنچ گیا تو امام صاحب نیشاپور کو خیرباد کہہ کر اپنے وطن مالوف بخارا کو روانہ ہوئے، اہل بخارا کو جب اطلاع ہوئی کہ ان کا ہم وطن کمال اور شہرت کے خلعت سے آراستہ ہو کر پھر اپنے وطن مالوف کی طرف واپس آ رہا ہے تو جوشِ مسرت میں استقبال کے لئے بڑھے، شہر سے دو کوس کے فاصلہ پر امرائے شہر نے خیر مقدم کیا اور درہم و دینار نثار کرتے ہوئے شہر میں لائے،(۲) اللہ اکبر! ایک وہ زمانہ تھا جب بے باپ کا ایک یتیم بچہ حسرت و یاس کی گود میں بخارا سے نکلا تھا اور ایک یہ زمانہ ہے، جب وہی یتیم بچہ امام حدیث ہو کر امرائے شہر کے غول میں خراماں خراماں اسی بخارا میں داخل ہو رہا ہے۔

جلاوطنی اور انتقال: بخارا میں امام صاحب نے ایک مدت تک آرام و راحت سے زندگی بسر کی لیکن آخر میں اپنی غیور اور خوددار طبیعت کی بدولت مصیبت میں مبتلا ہو گئے، شاہ بخارا نے حکم دیا کہ بخارا سے فوراً نکل جائیں۔

امام صاحب کے بعض رشتہ دار سمرقند کے ایک چھوٹے سے قریہ خرتنگ میں رہتے

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۱، ۴۹۲، (۲) ایضاً ص ۴۹۳۔

تھے، امام صاحب بخارا سے نکل کر وہیں چلے آئے اور آخر عمر تک وہیں رہے، جلا وطنی کا انھیں سخت افسوس تھا، وفورِ غم میں بے اختیارانہ زبان سے نکل جاتا، کہ الٰہی باوجود وسعت کے زمین میرے لئے تنگ ہوگئی ہے، اس لئے اب مجھ کو اٹھا لے۔(۱)

عجیب اتفاق ہے کہ یہ دعا ایسی مقبول ہوئی کہ تھوڑے ہی دنوں میں خدا نے دنیا سے اٹھا لیا، (۲) ۲۵۶ھ میں .... شب کو نماز کے بعد انتقال ہوا، شوال کے مہینے میں تیرھویں تاریخ کو پیدا ہوئے اور شوال ہی کی چاندرات میں دوشنبہ کو وفات پائی اور عید کے دن ظہر کی نماز کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی۔

دوسرے دن جب یہ خبر مشہور ہوئی تو سمرقند مں ایک تہلکہ مچ گیا، اس دھوم دھام سے جنازہ اٹھایا گیا کہ سارا سمرقند مشایعت میں ساتھ ساتھ تھا، اور بڑے بڑے علما اور امرا باچشم پرنم نمازِ جنازہ میں شریک تھے، نماز ظہر کے بعد جنازہ دفن کیا گیا اور آسمان حدیث کا یہ منور آفتاب سرزمین سمرقند میں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

ایک شاعر نے اختصار کے ساتھ امام صاحب کا سال ولادت، سال وفات اور سن عمر کو ذیل کے دو شعروں میں یوں نظم کیا ہے، جو بہت دلچسپ ہے:

کان البخاری حافظا ومحدثا   جمع الصحیح مکمل التحریر
میلاده صدق و مدة عمره   فیها حمید وانقضی فی نور(۳)

امام صاحب کا حلیہ یہ تھا، جسم دبلا، پتلا، قد میانہ، رنگ گندمی۔(۴)

عام اخلاق وعادات، وجہِ معاش اور تصنیفات

خودداری: امام صاحب کی مقدس زندگی میں بعض ایسی شائستہ خصوصیات پائی جاتی ہیں، جن سے بڑے بڑے نامور لوگوں کا اخلاقی دامن خالی ہے، ان کی طبیعت سخت درجہ غیور،

(۱) تاریخ بغداد ج ۲ ص ۳۴ ومقدمہ فتح الباری ص ۴۹۳ وتہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۲ (۲) ایضاً (۳) بستان المحدثین ص ۱۳ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۵ وتہذیب ج ۹ ص ۴۸۔

خود دار اور بے تکلف تھی، ان کے واقعات زندگی کے آخری حصہ میں تم پڑھ آئے ہو کہ امیر بخارا نے جلا وطن کر دیا تھا مگر کس لئے؟ صرف اس لئے انھوں نے علم کی عظمت کے آگے ایک دنیادار کی عزت کا لحاظ نہیں کیا، امیر بخارا کی خواہش تھی کہ امام صاحب اس کے دربار میں حاضر ہو کر صحیح بخاری اور تاریخ کبیر سنائیں، امام صاحب نے اس خواہش کو رد کر دیا کہ میں علم کو ذلیل کرنا نہیں چاہتا. کہ سلاطین کے آستانے پر لے جا کر پیش کش کروں، اگر امیر کو سچا شوق ہے، تو میری مجلس میں آ کر شریک ہو، امیر بخارا کی درخواست تھی کہ وہ قصر شاہی میں آ کر شہزادوں کو تعلیم دیں، امام صاحب نے فرمایا کہ میں امیر کے لڑکوں کو کوئی خصوصیت نہیں دے سکتا، میری مجلس عام ہے، جس کا جی چاہے آ کر شریک ہو، امیر بخارا کو یہ استغنا ناگوار گذرا، حکم دے دیا کہ ہمارے شہر سے نکل جاؤ، امام صاحب نے اپنے وطن سے نکلنا منظور کر لیا مگر علم کی ذلت گوارا نہ کی، (۱) خودداری کا خیال اس درجہ تھا کہ خود ان کا قول ہے:

> ''میں نے اپنے استاذ علی بن مدینی کے سوا اور کسی کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا نہ سمجھا۔'' (۲)

سادگی وقناعت: امام صاحب نے عمر بھر کبھی اس امر کی کوشش نہیں کی کہ عام علما کی طرح کسی امیر یا بادشاہ کی فیاضی سے فائدہ اٹھائیں، کئی مرتبہ اس قسم کے مواقع ہاتھ آئے مگر انھوں نے وظیفہ قبول نہیں کیا، اپنے پدر بزرگوار کی میراث میں جو کچھ ملا، اس پر آخری عمر تک قناعت کی، اس زمانے میں تجارت کی اس خاص صورت کو کہ ایک شخص اپنا روپیہ صرف کرے اور دوسرا اپنی محنت اور مشترکہ تجارت سمجھی جائے، مضاربت کہتے تھے، امام صاحب اسی طریقہ کی تجارت میں اپنے روپے لگا دیتے اور اسی کی قلیل آمدنی سے ضروریات زندگی پوری کرتے۔ (۳)

(۱) مقدمہ فتح الباری ص۴۹۴ (۲) مقدمہ فتح الباری ص۴۸۴ وتہذیب ج۹ص۵۰ (۳) مقدمہ فتح الباری ص۴۸۰۔

انکساری: بہت کم لوگ ہوں گے، جن کو زندگی میں ایسی لاانتہا شہرت نصیب ہوئی ہوگی، جس کو خود ان کی آنکھوں نے دیکھا تھا، باوجود اس کے انھیں معمولی سے معمولی شخص سے بھی کسی نامعلوم امر کو دریافت کرنے میں عار نہیں آتا تھا، ان کے اساتذہ کی طول طویل فہرست میں بعض ان لوگوں کے نام نظر آتے ہیں، جو ان کے ہم عمر یا ہم سبق تھے۔(۱)

رواداری و بے تعصبی: امام صاحب کا ایک بے نظیر وصف ان کی بے تعصبی ہے، جب ہم ان کے مجموعہ احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو بہت سی ایسی حدیثیں پاتے ہیں جن کے راوی مذہب اہل سنت کے خلاف تھے، امام صاحب نے ان سے روایت کرنے میں کچھ تامل نہیں کیا، اگرچہ خود ان کے مذہب سے اختلاف رکھتے تھے۔

ورزش: امام صاحب کو جسمانی ورزش کا بہت شوق تھا، سواری اور تیراندازی میں اس درجہ مہارت تھی کہ ان کا نشانہ بہت کم غلط ہوتا تھا۔(۲)

صفائی: امام صاحب کوئی دنیادار آدمی نہیں تھے، ان کی زندگی بالکل سیدھی سادھی اور خالص علمی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی صفائی کا اس درجہ خیال رہتا تھا کہ فرش پر ایک تنکے کا پڑا رہنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، اثنائے درس میں ایک شخص نے اپنی ڈاڑھی سے ایک تنکا نکال کر فرش پر ڈال دیا، امام صاحب کی جب نظر پڑی تو چپکے سے اٹھے اور تنکے کو اٹھا کر باہر صحن میں ڈال دیا۔(۳)

امام صاحب کا حلقہ درس نہایت وسیع تھا، اسلامی دنیا کے ہر حصہ سے طلبہ کی جماعت جوق جوق آکر شریک ہوتی اور بڑے بڑے پایہ کے اشخاص حلقہ تلامذہ میں شامل ہوتے، ان کی مجلس درس کبھی مسجد میں اور کبھی ان کے خاص مکان پر منعقد ہوتی تھی، ان کے شاگردوں میں حافظ ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، ابوعبدالرحمٰن نسائی، مسلم بن حجاج جیسے جید

---

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۰ وتہذیب ج ۹ ص ۴۷ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۱ (۳) مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۲۔

محدث نظر آتے تھے جو حدیث کے ارکان ستہ کے تین جلیل القدر رکن ہیں، ابن خزیمہ، محمد بن نصر مزوری، صالح بن محمد جو آگے چل کر خود بڑے پایہ کے مصنف ہوئے، امام صاحب کے عام شاگردوں میں داخل ہیں۔(۱)

امام صاحب کو زمانہ تحصیل علم ہی میں تصنیف وتالیف کا شوق ہوا اور آخر عمر تک قائم رہا، ان کی ابھی اٹھارہ برس کی عمر تھی، جب ایک کتاب قضایائے صحابہ وتابعین نامی لکھی (۲) اور بڑے بڑے مسن مشائخ کو متحیر کر دیا۔

تاریخ کبیر مدینہ منورہ کی چاندنی راتوں میں لکھی جب آسمان کی منور اور قدرتی قندیل نے دنیا کے مصنوعی چراغوں سے مستغنی کر دیا تھا۔(۳)

صحیح بخاری کا مفصل ذکر مستقل عنوان سے آگے آرہا ہے لیکن اس کے علاوہ دیگر تصنیفات کی مجمل فہرست یہ ہے:

۱- تاریخ کبیر، ۲- تاریخ اوسط، ۳- تاریخ صغیر، ۴- خلق افعال عباد، ۵- رسالہ رفع الیدین، ۶- قرأت فاتحہ خلف الامام، ۷- الادب المفرد، ۸- سیر الوالدین، ۹- کتاب الضعفاء، ۱۰- الجامع الکبیر، ۱۱- التفسیر الکبیر، ۱۲- کتاب الاشربہ، ۱۳- کتاب الھبہ، ۱۴- کتاب المبسوط، ۱۵- کتاب الکنی، ۱۶- کتاب العلل، ۱۷- کتاب الفوائد، ۱۸- کتاب المناقب، ۱۹- اسامی الصحابہ، ۲۰- کتاب الواحد، ۲۱- قضایا الصحابہ۔

جامع صحیح بخاری

ہجرت کی پہلی صدی تک احادیث کی تدوین نہیں ہوئی، صحابہ کا خیال تھا کہ اگر آثار نبوی مرتب کیے جائیں تو ممکن ہے کہ آگے چل کر ایک زمانہ ایسا آئے کہ کلام الٰہی اور کلام نبوی میں کوئی امتیاز نہ رہے اور لوگ غلطی میں پڑ جائیں، علاوہ اس کے ابھی اہل عرب

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۳ (۲) تاریخ بغداد ج ۲ ص ۷ (۳) ایضاً۔

اس قدر متمدن نہیں ہوئے تھے کہ کتابت اور جمع وتصنیف کا عام رواج ہوتا، دوسری صدی میں جب علوم وفنون کی اشاعت اور تدوین کی بنیادیں پڑیں اور کتابت کا عام رواج ہوا تو جمع حدیث پر بھی لوگوں کو توجہ ہوئی، امام مالک نے مؤطا میں اہل حجاز کی حدیثیں جمع کیں، ابن جریج نے مکہ معظمہ میں، امام اوزاعی نے شام میں، سفیان ثوری نے کوفہ میں اور ابوسلمہ حماد نے بصرہ میں احادیث کے مجموعے ترتیب دیے، عبیداللہ بن موسیٰ کوفی اور نعیم بن حماد وغیرہ نے مسندیں مرتب کیں اور دوسری صدی کے اختتام تک بیسوں مجموعے تیار ہوگئے۔(۱)

تیسری صدی میں امام بخاری کو جمع حدیث پر توجہ ہوئی، کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک احادیث کے بے شمار مجموعے مرتب ہو چکے تھے، اس لئے امام صاحب نے اگر ان سے چھانٹ کر ایک مجموعہ تیار کر لیا، تو یہ کوئی اہم کام نہ تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ امام صاحب سے پیشتر اگرچہ متعدد مجموعے مرتب ہو چکے تھے مگر ان کی حالت کیا تھی اور امام صاحب نے جو مجموعہ تیار کیا ہے، اس کی حالت کیا ہے، اس پہلو سے اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو کہ صحیح بخاری کی اصلی خصوصیت کیا ہے؟ اور امام صاحب کا یہ کام کس قدر اہم اور کس درجہ دشوار تھا، ہم اس مضمون میں اسی حیثیت سے صحیح بخاری پر نظر ڈالنی چاہتے ہیں۔

صحیح بخاری کا اصلی نام احادیث اور ابواب وغیرہ کی تعداد: صحیح بخاری کا اصلی نام یہ ہے: ''الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ وسننہ وایامہ'' حقیقت یہ ہے کہ ایک حدیث کے مجموعے کے لیے اس سے زیادہ مناسب جامع اور واقعی نام نہیں ہوسکتا۔

صحیح بخاری میں تقریباً دس ہزار حدیثیں ہیں جو چھ لاکھ حدیثوں سے منتخب کر کے درج کی گئیں، (۲) ۱۶۰ کتاب ہیں اور تین ہزار چار سو پچاس ابواب ہیں، ان تمام شیوخ کی تعداد جن سے صحیح بخاری کی حدیثیں لی گئی ہیں، دوسونواسی ہے، تیرہ سو چالیس مشائخ

(۱) ملخص از مقدمہ فتح الباری ص۴، ۵ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۶۵، ۴۷۰۔

ایسے ہیں جن سے مسلم نے روایت نہیں کی صرف امام بخاری نے روایت کی ہے۔

ثلاثیات اس حدیث کو کہتے ہیں جو صرف تین راویوں کے واسطہ سے امام صاحب تک پہنچی ہے، صحیح بخاری میں اس قسم کی بائیس حدیثیں ہیں جن پر امام صاحب کو فخر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بجا فخر ہے۔

صحیح بخاری کی خصوصیات: امام صاحب جمع حدیث پر متوجہ ہوئے، تو بے انتہا مشکلات کا سامنا ہوا، انھوں نے دیکھا کہ جس قدر کتابیں مرتب ہوئی ہیں، وہ محض احادیث کا ایک مجموعہ ہیں، جن میں نہ صحت کا التزام کیا گیا ہے، نہ علت وضعف سے بحث کی گئی ہے، اس قسم کے مجموعوں کا تیار کر لینا کوئی مشکل اور اہم کام نہ تھا، مشکل یہ تھا کہ ایک صحیح اور اصح مجموعہ تیار کیا جائے، صحت کے علاوہ ترتیب کے لحاظ سے بھی منتظم اور مرتب ہو، صحیح آثار کی غیر صحیح آثار سے تمیز کی جائے، التزام ہو کہ حتی المقدور اعلیٰ اقسام کی حدیثیں اس میں درج کی جائیں۔

امام بخاری پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس التزام اور صحت سے حدیث کا ایک مجموعہ تیار کیا، اس لحاظ سے یہ جس قدر اہم تھا اسی قدر دشوار تھا، امام صاحب نے نہایت کوشش اور جانکاہی سے اول لاکھوں حدیثیں جمع کیں، پھر نہایت دقت نظر سے ان پر نقادانہ نظر ڈالی، اصول وقواعد کے ساتھ ان میں سے دس ہزار حدیثیں منتخب کیں اور ترتیب وار ایک جلد میں جمع کیا۔

امام بخاری نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے پہلا کام یہ کیا کہ حدیث کے درجے مقرر کیے اور ان کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا، صحت اور سند کے لحاظ سے کوشش کی کہ مستفیض، متواتر، حسن حدیثیں جمع کی جائیں، ان سے دوسرے درجہ پر صحیح حدیثوں کو لیا جائے مگر صحیح سے نیچے درجہ کی حدیثیں جیسے مطلق حسن، وغیرہ کو صحیح بخاری میں جگہ نہ دی جائے، (۱) اگرچہ

(۱) جس حدیث کو کم از کم تین جلیل القدر صحابیوں نے الگ الگ طریقوں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ التزام مسلم اور صحاح اربعہ میں بھی پایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مؤطا امام مالک بھی اس خصوصیت میں شریک ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس خوبی اور عمدگی سے امام صاحب نے اس التزام کو نبھایا ہے، اس کی نظیر کوئی مجموعہ پیش نہیں کرسکتا، یہی وجہ ہے کہ اصح الکتب کے خطاب سے یہ کتاب سرفراز ہوئی۔

بخاری اور مسلم: حدیث کی چھ صحیح کتابوں میں خصوصیت کے ساتھ دو کتابیں زیادہ صحیح، مستند اور قابل اعتماد تسلیم کی گئی ہیں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم ان دونوں کتابوں کی نسبتاً زیادہ صحت میں کسی کو کلام نہیں لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ صحیحین میں اصح کون ہے، عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ ان دونوں کتابوں میں صحیح ترین کتاب جامع صحیح بخاری ہے لیکن بعض اہل مغرب کو اس میں کلام ہے، ان کا خیال ہے کہ مسلم بخاری سے زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہے لیکن یہ خیال کسی صورت صحیح نہیں ہوسکتا، بخاری کو مسلم پر فضیلت ہے اور اکثر حیثیتوں سے ترجیح حاصل ہے، سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ وجوہ ترجیح کیا کیا ہوسکتے ہیں۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) سے روایت کیا ہو اور اس کے رواۃ میں روز بروز ترقی ہوتی گئی ہو، تو اس حدیث کو مستفیض کہتے ہیں، حدیث کی یہ اعلیٰ قسم ہے، اگر تین سے زیادہ مگر مشہور اصحاب سے مروی ہو تو اس کو متواتر کہتے ہیں انما الأعمال بالنیات ایک مشہور حدیث ہے جس کے اول راوی صرف حضرت عمرؓ ہیں، ان سے علقمہ نے روایت کی اور علقمہ سے صرف محمد بن ابراہیم نے محمد سے فقط یحییٰ بن سعید نے اور یحییٰ سے بے شمار لوگوں نے روایتیں کیں، لہٰذا یہ حدیث متواتر ہے، متواتر کے بعد تیسرے درجہ پر حدیث حسن ہے، حسن اس حدیث کو کہتے ہیں جو مختلف طریقوں سے مروی ہو اور ہر طریق کی حدیث کا مضمون دوسرے طریق کی حدیث کی تائید کرتا ہو اگر ایک ہی طریق سے مروی ہو تو اس کو غریب مطلق کہتے ہیں، جن کی دو قسمیں ہیں، صحیح اور مطلق، حسن صحیح وہ حدیث ہے جس کے بعض یا کل طریقوں کے تمام راوی ثقہ، عادل، غیر مجروح، غیر منکر اور نیز راوی اول کوئی مشہور صحابی و ساتھ ہی سلسلۂ روایت میں اتصال ہو۔ مطلق حسن وہ حدیث ہے جس میں یہ بعض شرائط نہ پائی جائیں۔

صحیح بخاری اور مسلم کا مقابلہ چند حیثیتوں سے کیا جا سکتا ہے، حسن ترتیب، احادیث اور ترجمہ کا تناسب، عدم شذوذ، اعلال، قوتِ رواۃ، استنباط مسائل، اتصال اسناد، زبان، صحت حدیث، پہلی دو حیثیتوں کو چھوڑ کر باقی ہر حیثیت سے بخاری کو مسلم پر فضیلت حاصل ہے، بخاری میں سوءِ ترتیب اور بعض موقعوں میں عدم مناسبت حدیث و ترجمہ باب کا عیب ضرور ہے مگر اس سے کتاب کی حقیقی خوبیوں پر پردہ نہیں پڑ سکتا، صحیح بخاری اس رنگ اور التزام کی پہلی تصنیف ہے، امام صاحب کے سامنے اس قسم کا کوئی نمونہ نہیں تھا، مسلم نقش ثانی ہے، صحیح بخاری نے اس کے لیے راستہ صاف کر دیا تھا، ایک اعلیٰ درجہ کا نمونہ پیش نظر تھا، اس لیے اگر ترتیب وغیرہ میں نسبتاً چند نقص پائے جاتے ہیں تو ان کی بنا پر امام صاحب پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، اس قسم کی فروگذاشتوں کا ایک ایسی کتاب میں جس کے لیے پہلے سے کوئی نمونہ نہ رہا ہو، رہ جانا کوئی مستبعد نہیں ہے اور اس لحاظ سے امام صاحب کی معذوری ظاہر ہے۔

صحیح مسلم کے مقابلہ میں صحیح بخاری کی خوبیاں بے شمار ہیں لیکن جن حیثیتوں کو ہم نے پیش کیا ہے ان کو پیش نظر رکھ کر اگر دیکھا جائے، تو سات خصوصیتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو صرف بخاری کا حصہ ہیں، مسلم کو ان میں شرکت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

۱- امام بخاری کا اصلی مقصود اگرچہ احادیث صحیحہ کی تدوین ہے، مگر ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ترتیب احادیث میں فقہی فوائد کو بھی ملحوظ رکھا اسی لیے صحیح بخاری کی ترتیب فقہی ابواب اور مسائل کے موافق رکھی گئی ہے اور بعض ایسے باب پائے جاتے ہیں جن کو مسائل قرار دے کر ان کے جواز یا عدم جواز میں قرآن مجید کی آیات پیش کی ہیں، کہیں کہیں معلقات اور مرفوعات سے حلت اور حرمت پر استدلال کیا ہے اور ان کے متعلق اگر حدیثیں ملی ہیں تو ان کو بھی پیش کر دیا، مثلاً صحیح بخاری کی ابتدا میں، الایمان یزداد وینقص کو ایک مسئلہ فرض کر کے لِیَزدادُوا ایماناً اور لیطمئن قلبی وغیرہ آیات

اور اقوال صحابہؓ سے زیادت ونقص ایمان کو ثابت کیا ہے، اس خصوصیت کی بدولت صحیح بخاری تحقیق مسائل کا بھی ایک عمدہ ذریعہ ہے، برخلاف مسلم کے کہ اس کی اصلی غرض صرف احادیث صحیح کو ابواب فقہیہ کی حیثیت سے مرتب کرنا ہے، اس لیے مسائل کی تحقیقات کے حصہ سے بالکل خالی ہے۔

۲- ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاری احادیث سے اس زمانہ کی معاشرت کا پتہ لگاتے ہیں اور معمولی واقعات سے نہایت مفید نتائج نکال کر ہر نتیجہ کو الگ الگ بابوں میں درج کرتے ہیں، مثلاً ایک حدیث ہے کہ بریرہ کو جو حضرت عائشہؓ کی لونڈی تھی، کسی نے کچھ گوشت صدقہ کے طور پر دیا، حضرت عائشہؓ نے وہ گوشت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہہ کر نہیں دیا کہ ”یہ گوشت صدقہ کا ہے اور آپ صدقہ نہیں کھاتے“ آنحضرت نے فرمایا کہ ”بریرہ کے لیے بیشک صدقہ ہے لیکن اگر بریرہ مجھے دے تو میرے لیے ہدیہ ہے۔“

امام مسلم نے اس حدیث کو باب الصدقہ میں درج کیا ہے، مگر امام بخاری نے اس ایک حدیث سے متعدد نتائج پیدا کیے ہیں اور مختلف بابوں میں نقل کیا ہے، ایک موقع پر یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ جن لوگوں پر صدقہ حرام ہے، ان کی لونڈیوں کو صدقہ دینا جائز ہے، کیونکہ ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لونڈیوں نے صدقہ لیا اور آنحضرتؐ مانع نہیں ہوئے، ایک اور موقع پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ اگر کسی شخص کو صدقہ دیا جائے اور وہ کسی ایسے شخص کو وہ چیز ہدیہ کے طور پر دے، جس پر صدقہ حرام ہے تو اس کا قبول کرنا جائز ہے۔

۳- ایک باریک فرق صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں یہ ہے کہ جب کسی ایک شیخ کے شاگردوں سے یہ دونوں بزرگ روایت کرتے ہیں تو اس میں شک نہیں کہ ان کے شرط کے مطابق ان میں عدل، ثقاہت، قوتِ حافظہ، سلامتی ذہن، تقویٰ یہ تمام شرطیں ضرور پائی جاتی ہیں لیکن چونکہ تمام شرطیں ہر راوی میں برابر درجہ کی نہیں ہوسکتیں، کوئی عادل ہے، کوئی زیادہ عادل ہے، کوئی بہت زیادہ عادل ہے، اس لئے امام بخاری جس احتیاط اور دقت نظر کے

ساتھ ان سے روایت کرتے ہیں، وہ امام مسلم میں نہیں پائی جاتی، امام زہری کے تلامذہ کے پانچ طبقے ہیں، اگرچہ سب کے سب معتبر رواۃ میں سے ہیں لیکن اوصاف کی کمی اور زیادتی کے لحاظ سے ان کے مدارج باہم متفاوت ہیں، امام بخاری اول طبقہ سے اصولاً اور دوسرے طبقہ سے ضمناً روایت کرتے ہیں، مگر امام مسلم دوسرے طبقہ سے اصولاً اور تیسرے طبقہ سے ضمناً اور پہلے طبقہ سے کبھی کبھی روایت کرتے ہیں، اسماء الرجال کے ماہرین کو اس کا پتہ آسانی سے لگ سکتا ہے۔

۴- بخاری کی قدر ومنزلت کا اندازہ مسلم کے مقابلہ میں اس حیثیت سے بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے رواۃ کی تعداد جن سے امام صاحب نے صحیح میں روایت کی ہے ۴۳۰ سے کچھ زائد ہے، اس تعداد میں سے صرف ۸۰ راوی ایسے ہیں جن میں علما نے کلام کیا ہے لیکن مسلم کے خاص راوی ۶۲۰ ہیں، ان میں ۱۶۰ راویوں کو علما نے ضعیف قرار دیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام صاحب کے کمزور راویوں سے مسلم کی ضعیف رواۃ کی تعداد بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ بخاری کے ضعیف رواۃ زیادہ تر بخاری کے شیوخ میں سے ہیں، جن سے امام صاحب کی مدتوں صحبت رہی، ان کے حالات اور خیالات سے اطلاع حاصل کی، اس لئے قیاس اس امر کو تسلیم نہیں کرتا کہ امام بخاری جیسے نقاد مدتوں کی صحبت پر ان کے ضعف سے واقف نہ ہوئے ہوں اور روایت حدیث میں تامل نہ کیا ہو، اس بنا پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان راویوں کو ضعیف قرار دینا صحیح نہیں، برخلاف امام مسلم کے کہ ان کے ضعیف راوی اکثر قدما میں سے ہیں، جن کی تنقید کا نہ ان کو موقع مل سکتا تھا، نہ ان کے حالات کی کافی اطلاع تھی، اس لئے اس صورت میں ان کے ضعف سے بے خبر رہنا زیادہ قرین قیاس ہے۔

۵- علما نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی تمام حدیثوں میں سے ۲۱۰ حدیثوں کو ضعیف

قرار دیا ہے، ان میں سے صرف اسّی بلکہ اس سے بھی کم ضعیف حدیثیں بخاری کی ہیں اور ۱۳۰ حدیثیں صحیح مسلم کی۔

۶- بخاری و مسلم میں ایک بڑا نازک اور باریک فرق، ادبی حیثیت کا بھی ہے، ایک ہی حدیث کے مضمون کو دونوں کتابوں میں دیکھیے، بخاری کی طرز ادا، نشست الفاظ، سلاست بیان، جس قدر پسندیدہ اور اعلیٰ ہوگی، اس کی نظیر مسلم میں کم ملے گی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب نے اس زبان کو پیش نظر رکھا، جو عہد رسالت یا اس سے قریب تر زمانے میں مستعمل تھی، یعنی امام صاحب نے معانی حدیث کے ساتھ الفاظ حدیث کا بھی اوروں سے زیادہ خیال رکھا۔

۷- امام مسلم حدیث معنعن کے (۱) اتصال اسناد کے لئے راوی اور مروی عنہ (۲) کی صرف ہم عصری کافی سمجھتے ہیں، بشرطیکہ راوی مدلس (۳) مشہور نہ ہو، چنانچہ صحیح کے مقدمہ میں انھوں نے خود تصریح کردی ہے لیکن امام بخاری سلسلہ روایت کے اتصال کے لئے صرف معاصرت کو کافی نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک مدلس مشہور نہ ہونے کے ساتھ دونوں کی ملاقات بھی ضروری ہے، چنانچہ امام صاحب نے تاریخ کبیر میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے، ہم اس موقع پر اس اختلاف کے نتیجہ کو دکھلانا کافی سمجھتے ہیں۔

امام صاحب چونکہ ملاقات کو شرط قرار دیتے ہیں، اس لئے ایسی حدیث معنعن کو جس کے راوی اور مروی عنہ کی باہم ملاقات ثابت نہ ہوئی ہو، اگر چہ راوی مدلس مشہور نہ ہو، متصل الاسناد تسلیم نہیں کرتے اور اس بنا پر اس کو صحیح بھی نہیں قرار دیتے، کیونکہ صحیح ہونے کے لئے بالاجمال اتصال اسناد کی ضرورت ہے، مگر امام مسلم متصل مان کر صحیح احادیث درج

---

(۱) معنعن: اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی اسناد عن فلاں عن فلاں کے ساتھ بیان کی گئی ہو۔ (۲) یعنی جس سے روایت کی جائے۔ (۳) مدلس: اس راوی کو کہتے ہیں جو روایت میں اپنے شیخ کا نام درمیان سے چھوڑ دے۔

کر دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صحت اور احتیاط کے لحاظ سے جس قدر صحیح بخاری کا اصول تنقید موافق عقل ہے، اسی قدر مسلم کا اصول، قرائن صحیح اور قواعد احتیاط سے دور ہے۔

امام صاحب اس پہلو پر غور کرتے ہیں کہ صرف معاصرت کیوں کر روایت حدیث کے لئے ہم کو اطمینان دلا سکتی ہے، جب کہ ممکن ہے کہ ایک ہی زمانے میں دو شخص ہوں، مگر ان کی باہمی ملاقات نہ ہوئی ہو اور ایک تیسرے شخص کی وساطت سے کوئی حدیث ایک شخص تک پہنچ گئی ہو، یہ سچ ہے کہ راوی مدلس مشہور نہیں ہے لیکن مدلس نہ ہونا اس امر کے لئے کافی دلیل نہیں ہو سکتی کہ بغیر کسی واسطہ کے بذاتہ راوی نے مروی عنہ سے سماعت حدیث کی ہے، صرف ایک یہی اختلاف اس امر کے لئے کافی ہے کہ مسلم کے مقابلہ میں امام بخاری جمع حدیث میں کس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں اور جو اصول تنقید قائم کئے ہیں، وہ کس درجہ مطابق عقل اور قیاس صحیح کے موید ہیں۔

ہم نے یہاں صحیح بخاری کی سات ایسی خصوصیتیں دکھلائی ہیں جو صحیح مسلم کے مقابلہ میں قابل توجہ ہیں، اصح الکتب بعد کتاب اللہ کے خطاب سے تمام کتابیں محروم رہیں، مگر صحیح بخاری کی صحت احتیاط، قوت رواۃ، اتصال اسناد، اور اسی قسم کی بے نظیر خوبیوں نے خود کو اس معزز خطاب کا مستحق ثابت کیا، علما نے اس استحقاق کو بجا تسلیم کیا اور کلام اللہ کے بعد جگہ دی۔

امام صاحب نے اس کا بڑا حصہ مدینہ منورہ میں لکھا ہے، ترتیب سے پہلے تمام ضروری عنوان لکھ لئے تھے، ہر عنوان کے نیچے حدیثیں درج کرتے جاتے تھے، جس عنوان کے متعلق کوئی حدیث نہ ملتی، تو اس کو چھوڑ کر دوسرے بابوں کی ترتیب پر متوجہ ہو جاتے، چنانچہ صحیح بخاری میں بعض عنوان ایسے پائے جاتے ہیں، جن کے متعلق کوئی حدیث درج نہیں ہوئی۔

صحیح بخاری جب مرتب ہوگئی، تو امام صاحب نے اپنے استاد علی بن المدینی اور

امام احمد بن حنبل جیسے اکابر محدثین کی خدمت میں اس غرض سے پیش کیا کہ ان بزرگوں کی نظر ثانی سے مزین ہو جائے لیکن امام صاحب کی احتیاط اور تنقید نے صحیح کو اس درجہ اصح مرتب کیا تھا، کہ صرف چار حدیثوں کو انھوں نے اس قابل بتایا کہ صحیح سے خارج کر دی جائیں، اگرچہ وہ چار حدیثیں بھی دراصل صحیح ہیں۔

صحیح بخاری کی شرحین: صحیح بخاری کو جو حسن قبول حاصل ہوا، اس کی ایک ادنیٰ دلیل یہ ہے کہ شارحین کی جتنی بڑی اور جس درجہ کی جماعت اس کو نصیب ہوئی، شاید کسی کتاب کو ملی ہو، نامعلوم شرحوں کو چھوڑ کر کشف الظنون سے ان ۵۳ شرحوں کا پتہ لگتا ہے، جو امام ابو سلیمان خطابی صاحب معالم السنن، علامہ ابن حجر عسقلانی، علامہ بدرالدین احمد عینی، امام فخرالدین یحییٰ نووی اور حافظ جلال الدین سیوطی جیسے اکابر علما اور محدثین کے قلموں سے نکلی ہیں۔(۱)

☆☆☆

---

(۱) حضرت سید صاحبؒ نے طوالت کی وجہ سے ان شرحوں کے نام تحریر نہیں فرمائے، حقیقت یہ کہ بخاری کے شروح وحواشی کی تعداد بہت زیادہ ہے، عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی اس کی شرحیں لکھی گئی ہیں اور ترجمے کئے گئے ہیں، مولانا عبدالسلام مبارکپوری مرحوم نے سیرت البخاری میں ۱۴۳ شرحوں کے نام لکھے ہیں لیکن یہ تعداد بھی مکمل نہیں۔(ض)

امام ابومسعود رازی

(متوفی ۲۵۸ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابومسعود کنیت، اورنسب نامہ یہ ہے: احمد بن فرات بن خالد۔

وطن، خاندان وولادت: آخری عمر میں اصبہان میں سکونت اختیار کرلی لیکن اصلی وطن رے ہے، اسی لیے رازی کہلاتے تھے، ضبی کی نسبت سے جو قبیلہ مضر کے ایک شخص ضبہ بن رد کی جانب ہے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عربی النسل تھے، (۱) ان کے سن ولادت کا پتہ نہیں چلتا۔

اساتذہ وشیوخ: ان کے چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابن ابی فدیک، ابوداؤد طیالسی، ابوصالح کاتب لیث، ابوعامر عقدی، ابویمان حمصی، ازہر بن سمان، جعفر بن عون حسین بن علی جعفی، ابواسامہ حماد بن اسامہ، شبابہ بن سوار، عبداللہ بن نمیر، عبدالرزاق بن ہمام، محمد بن عبداللہ بن ابی جعفر رازی، محمد بن عبید، محمد بن یوسف فریابی، یعلی بن عبید، یزید بن ہارون وغیرہ۔ (۲)

تلامذہ: ابومسعود رازی کے بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں؛

ابن ابی عاصم، امام ابوداؤد، جعفر فریابی، عبدالرحمٰن بن یحییٰ بن مندہ، عبداللہ بن جعفر بن احمد، ابوخلیفہ عبداللہ بن خلیفہ بصری، محمد بن عبدالرحمٰن بن مندہ۔ (۳)

(۱) کتاب الانساب ورق ۲۴۳ و ۳۶۱ واللباب ج۱ ص ۴۵۰ وج ۲ ص ۷۱ (۲) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۴۳ وتہذیب ج۱ ص ۶۶ (۳) تہذیب التہذیب ج۱ ص ۶۶۔

رحلت وسفر: حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ۱۲ سال کی عمر میں انھوں نے حدیث کی تحریر وکتابت شروع کردی تھی، اس کے بعد انھوں مختلف ملکوں اور دور دراز کے مقامات کا سفر کیا، ان کے کثرت اسفار کا اندازہ ذہبی کے ان الفاظ واکثر الترحال فی لقی الرجال (محدثین سے ملاقات کے لئے انھوں نے بہت سارے سفر کیے) اور "طوف النواحی" وغیرہ سے کیا جاسکتا ہے، خطیب بغدادی نے بصرہ، کوفہ، حجاز، یمن، شام، جزیرہ اور بغداد وغیرہ جانے کا ذکر کیا ہے، بغداد امام احمد کی زندگی میں گئے تھے اور وہاں کے نامور علما سے مذاکرہ کیا تھا۔(۱)

حفظ وثقاہت: ابو مسعود کے حافظہ کی جودت کا علما نے اعتراف کیا ہے، خطیب بغدادی لکھتے ہیں احد حفاظ الحدیث ومن کبار الأیمة فیه (وہ اکابر حفاظ اور ائمہ محدثین میں تھے) امام احمد فرماتے ہیں کہ "اس آسمان کے نیچے احادیث نبوی کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں" ابوبکر بن شیبہ کا ارشاد ہے کہ میرے نزدیک جو تین آدمی سب سے بڑے حافظ حدیث ہیں، ان میں ابو مسعود بھی ہیں، ابوالشیخ کا بیان ہے کہ وہ حفاظ کبار میں تھے، ابونعیم کا بیان ہے کہ وہ ائمہ حفاظ میں تھے، ابوبکر اعین اور امام احمد سے مروی ہے کہ مسند روایتوں کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں۔

یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کمسن کو ان سے زیادہ بہتر یادداشت والا نہیں دیکھا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ۱۸ سال کی عمر ہی میں ان کے حافظہ کی شہرت ہوگئی تھی، ان کے حفظ وضبط کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب وہ مصر تشریف لے گئے تو لوگوں سے کہا کہ مصریوں کی حدیثیں سنو، چنانچہ وہاں کے ہر ہر شیخ کی حدیثیں بیان کرنا شروع کیا حالانکہ ابھی یہاں کے علما سے ملاقات بھی نہیں کی تھی۔

ان کے صدق وثقاہت کا بھی ائمہ محدثین کو اعتراف ہے، امام ذہبی اور حافظ ابن

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۴ و ۱۲۵ والعبر ج ۲ ص ۱۶ وتاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۴۳۔

حجر نے ان کو ثقہ، حافظ اور حجت کہا ہے، علامہ ابن حبان نے بھی ان کی ثقاہت اور ان کے حفظ وضبط، مذاکرہ واستحضار اور جمع وتصنیف احادیث کا ذکر کیا ہے، ابوعروبہ کا بیان ہے کہ وہ حافظہ میں ابوبکر بن ابی شیبہ اور تثبت میں احمد بن سلیمان رہاوی کے ہم پایہ تھے، ابراہیم بن ادرمہ فرماتے ہیں کہ اس وقت تین ہی حفاظ رہ گئے ہیں، ان میں بھی ابومسعود احسن الحدیث ہیں، امام احمد سے بھی ان کی توثیق منقول ہے، ایک مرتبہ فرمایا کہ تم لوگ ان سے حدیثیں لکھو وہ صدوق ہیں، خلیلی اور حاکم نے ان کو ثقہ کہا ہے۔ (۱)

فضل وکمال: ابومسعود رازی کے فضل وکمال اور حدیث میں امتیاز وتبحر کے متعلق کتابوں میں بہت سے علمائے فن اور ماہرین حدیث کے اعترافات موجود ہیں، امام احمد ان کی بڑی تعظیم وتوقیر اور ہمیشہ مدح وتوصیف کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے، جب یحیٰی بن معین اور امام احمد کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور احادیث کا بحث ومذاکرہ شروع ہوتا تو یہ حدیثیں بیان کرتے تھے اور امام احمد خاموشی سے سنتے تھے، ایک دفعہ پانچ آدمیوں نے پانچ حدیثیں بیان کیں جب انھوں نے چھٹی حدیث بیان کی تو امام بہت مسرور ہوئے کیوں کہ ان کو اس کا علم نہ تھا، علی بن مدینی ان کو علمائے راسخین میں بتاتے ہیں اور حجاج بن شاعر کہتے ہیں کہ میں نے اس فن میں ان سے زیادہ ماہر اور صاحب کمال آدمی نہیں دیکھا، مورخین اور اصحاب سیر نے احد الاعلام محدثِ اصبہان اور من کبار الائمہ وغیرہ لکھا ہے۔ (۲)

احادیث کی حمایت: ان کے زمانہ میں احادیث کی مخالفت ووضع کا فتنہ بپا تھا، اس لیے ائمہ محدثین کی طرح یہ بھی اس کی مخالفت اور احادیث کی حفاظت ونصرت کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔ (۳)

زہد واتقا: خطیب نے لکھا ہے کہ وہ نیک اور صاحب خیر لوگوں میں تھے اور ابن حبان کا

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۴۳ وتہذیب ج ۱ ص ۶۶ و ۶۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۵ وخلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۱ (۲) ایضاً (۳) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۷۔

بیان ہے کہ سنن وآداب نبوی کے اتباع وتمسک کا بڑا التزام رکھتے تھے۔(۱)

وفات: شعبان ۲۵۸ھ میں انتقال کیا۔(۲)

تصنیفات: ابومسعود رازی کثیر التصانیف تھے مگر ان کی تصنیفات دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہیں اور نہ ان کا کوئی ذکر ملتا ہے، صرف تفسیر وحدیث کی کتابوں کا علمائے سیر نے ذکر کیا ہے، تفسیر کی کتاب کا بھی نام نہیں معلوم ہوسکا۔

مسند: اس کا سب نے تذکرہ کیا ہے(۳) مگر نام کے علاوہ اور کچھ نہیں معلوم، بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جمع وتالیف میں انھوں نے بڑی چھان بین اور نہایت حزم واحتیاط سے کام لیا تھا، ابومسعود کا خود بیان ہے کہ میرے استاذ عبدالرزاق ایک ایک حدیث کا مجھ سے ۵۰۰ مرتبہ تکرار کرتے تھے، ایک اور موقعہ پر فرمایا کہ میں نے ایک ہزار سات سو پچاس اشخاص سے حدیثیں سنیں اور لاکھوں حدیثیں تحریر کیں لیکن اپنی تصنیف میں صرف ۳۱۰ شیوخ کی روایتیں شامل کی ہیں جن کی تعداد پانچ ہزار ہے۔(۴)

☆☆☆

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۷ وتاریخ بغداد ج ۴ ص ۲۴۳ (۲) ایضاً (۳) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۶، العبر ج ۲ ص ۱۶ ومرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۹۹ (۴) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۶، ۶۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۵ الرسالۃ المستطرفہ ص ۷۳۔

امام مسلم

(متوفی ۲۶۱ھ)

نام ونسب اور ابتدائی حالات: سلسلۂ نسب یہ ہے: مسلم بن حجاج بن مسلم بن ورد بن کوشاد، ان کا اصلی نام مسلم اور ابوالحسین کنیت اور عساکر الدین لقب ہے،(۱) مولد ومسکن کے لحاظ سے اگر چہ ان کے مایہ خمیر میں عجم کی خاک کا عنصر بھی شامل ہے لیکن دراصل ان کا سلسلۂ نسب عرب کے مشہور قبیلہ بنی قشیر سے ملتا ہے، اسی بنا پر ان کو قشیری بھی کہتے ہیں۔(۲)

امام مسلم تیسری صدی کے اوائل یعنی ۲۰۶ھ میں خراسان کے مشہور شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے،(۳) یہ وہ مبارک زمانہ تھا، جس میں علم حدیث نے صحابہؓ اور تابعین کے مقدس سینوں سے نکل کر مستقل فن کا قالب اختیار کر لیا تھا اور ہزاروں مجتہد اور امام پیدا ہو گئے تھے، اس لئے عام طور پر علم حدیث کا غلغلہ بلند تھا اور اس کے ساتھ خوش قسمتی سے امام صاحب کی ولادت نیشاپور جیسے شہر میں ہوئی تھی جو اس زمانہ میں محدثین کا پایہ تخت تھا، اس لحاظ سے لازمی طور پر امام صاحب نے بھی اس مقدس فن کی طرف ایسے مناسب وقت میں توجہ کی جو ہر قسم کے علمی نشو ونما کا اصلی زمانہ تھا، چنانچہ(۴) اگر سال ولادت کے متعلق عام روایتوں کا اعتبار کیا جائے تو انھوں نے بارہ برس کی عمر میں حدیث کی سماعت شروع کر دی تھی، محدثین کے گروہ میں اگر چہ بہت سے ایسے بزرگ ہیں، جنھوں نے پانچ ہی

(۱) بستان المحدثین ص۱۰۴ (۲) کتاب الانساب ورق ۴۵۴و۴۵۳ (۳) تاریخ ابن خلکان ج۲ ص۳۵۷وتہذیب الاسماء واللغات ص۹۱ جلد دوم قسم اول (۴) امام صاحب (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

سات برس کی عمر میں حدیث کی سماعت شروع کر دی تھی اور یہ واقعہ ان کے کارناموں میں غیر معمولی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، خود امام بخاری کی سماعت کا ابتدائی زمانہ ۲۰۵ھ سے شروع ہوتا ہے، (۱) جس میں ان کا سن دس برس سے زائد نہ تھا لیکن درحقیقت یہ فخر ومباہات کا ذریعہ نہیں ہوسکتا کیونکہ بالکل کم سنی کے زمانہ میں کوئی شخص ایسے عظیم الشان فن کا پورے طور پر متحمل نہیں ہوسکتا، امام صاحب کو بھی اس زمانہ کی حالت اور نیشاپور کی علمی وسعت کے لحاظ سے اس قسم کے مواقع حاصل تھے، تاہم انھوں نے علم حدیث کی سماعت کو اس زمانے پر موقوف رکھا جو ہر قسم کی اہلیت کا زمانہ ہوتا ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے اس فن کے نشیب وفراز اور اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر اس میدان میں قدم رکھا لیکن افسوس ہے کہ امام صاحب کی طالب علمی کے حالات اس قدر کم معلوم ہیں کہ اس کا پتہ بھی نہیں چل سکتا کہ انھوں نے سب سے پہلے کس کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا مگر انھوں نے جس سرگرمی کے ساتھ اس مقدس فن کی طرف توجہ کی، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ میں اگرچہ خود خراسان اور نیشاپور میں، اسحاق بن راہویہ اور امام ذہلی جیسے اساتذۂ فن موجود تھے، تاہم امام صاحب نے ان بزرگوں کو چھوڑ کر ان تمام مقامات کی خاک چھانی، جہاں جہاں علم حدیث کا جلوہ نظر آتا تھا، رے کے محدثین میں سے محمد بن مہران حمال اور

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) کے سال ولادت کے متعلق اگرچہ عام تذکرے متفق اللفظ ہیں تاہم علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا سال ولادت ۲۰۴ھ بتایا ہے اور ان کے سماعت حدیث کی ابتدا ۲۱۸ھ میں قرار دی ہے، اس لحاظ سے ان کی سماعت کا زمانہ ۱۴ برس کی عمر سے شروع ہوتا ہے، اس سے اگرچہ ہمارے قیاس کی اور زیادہ تائید ہوتی ہے لیکن ہم نے سال ولادت کے متعلق ابن خلکان کا زیادہ اعتبار کیا ہے کیوں کہ انھوں نے بطور خود زیادہ تحقیق سے کام لیا ہے، اس کے علاوہ ذہبی کے الفاظ بھی ضعف پر دلالت کرتے ہیں، حافظ ابن حجر، علامہ ابن کثیر اور بعض مورخین نے بھی ۲۰۴ھ کی روایت کی ہے اور شاہ عبدالعزیز نے ان دونوں کے علاوہ ۲۰۲ھ کی بھی روایت کی ہے ص (۱۰۶) (۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۴۔

ابوغسان وغیرہ سے سماعت کی، عراق میں امام احمد بن حنبل اور ابوعبداللہ بن مسلمہ قعنبی سے فائدہ اٹھایا، حجاز میں سعید بن منصور اور ابومصعب سے روایتیں حاصل کیں، مصر میں عمرو بن سواد اور حرملہ بن یحییٰ جو امام شافعیؒ کے ممتاز شاگرد تھے کے خرمن فیض کی خوشہ چینی کی، (۱) بغداد میں آخر عمر تک سفر کا سلسلہ قائم رکھا، چنانچہ ۲۵۹ھ میں بغداد کا سفر امام صاحب کا آخری سفر تھا۔ (۲) کیوں کہ اس کے بعد موت نے دو برس سے زیادہ جینے کا موقع نہیں دیا، بغداد میں یحییٰ بن صاعد اور محمد بن مخلد سے استفادہ کیا، احمد بن سلمہ کی رفاقت میں بصرہ اور بلخ کا بھی سفر کیا (۳) امام بخاری سے بھی ان کے نیشاپور کے سفر میں بہت کچھ فائدہ اٹھایا، (۴) ان بزرگوں کے علاوہ احمد بن یونس یربوعی، اسماعیل بن ابی اویس، عون بن سلام، اسحاق بن راہویہ، یحییٰ بن یحییٰ نیشاپوری، قتیبہ بن سعید، علی بن جند، محمد بن رمح، ابراہیم بن منذر، ابوبکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ، وغیرہ سے بھی استفادہ کیا۔ (۵)

امام صاحب کی شہرت: امام صاحب کے زمانہ میں علم حدیث کے عام مذاق اور مذہبی احساس کے باہمی اختلاط نے اگرچہ سیکڑوں ہزاروں ائمہ فن پیدا کر دیئے تھے، جن کی شہرت اور فضیلت کا عموماً اعتراف کیا جاتا تھا اور جن میں اکثر بزرگوں کو امام صاحب کی استادی کا بھی شرف حاصل تھا، تاہم امام صاحب کی فطری قابلیت اور قوت حافظہ نے ان تمام بزرگوں کو اپنے فضل وکمال کا معترف بنا لیا، یہاں تک کہ وہ محدثین بھی جو امام صاحب کے ہم درجہ

(۱) مقدمہ صحیح مسلم للنووی (۲) ابن خلکان نے اس سفر کا ذکر ان کے اساتذہ اور تحصیل علم کے ضمن میں کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بغداد کا سفر بھی اسی غرض سے ہوا تھا اگرچہ اس کی خود تصریح نہیں کی، خطیب نے بھی سفر بغداد کا اسی طور پر ذکر کیا ہے مگر ان کے یہاں یہ لفظ بھی ملتا ہے ''حدث بہا'' ج ۱۳ ص ۱۰۱، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب سے بغداد کے لوگوں نے بھی کسب فیض کیا تھا (۳) تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۲۱۰ و تذکرہ احمد بن سلمہ (۴) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ و تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۵۲۷ (۵) تہذیب الاسماء جلد ۲ قسم اول ص ۹۱۔

اور فن حدیث کے امام تھے، ان سے روایت کرنے میں مطلق دریغ نہیں کرتے تھے، چنانچہ ابوحاتم رازی، موسیٰ بن ہارون، احمد بن سلمہ، ابوعیسیٰ ترمذی، یحییٰ بن صاعد، ابوعوانہ اسفرائینی، اسی قسم کے بزرگ ہیں، ان بزرگوں میں احمد بن سلمہ وہ بزرگ ہیں جو بصرہ اور بلخ کے سفر میں امام صاحب کے رفیق اور ۱۵ برس تک صحیح مسلم کی ترتیب میں شریک رہ چکے ہیں، امام صاحب کی طباعی اور ذہانت نے خود ان کے اساتذہ کو اس قدر گرویدہ بنالیا تھا کہ اسحاق بن راہویہ جیسے امام فن ان مختصر الفاظ میں ان کے فضل وکمال کی نسبت پیشین گوئی کرتے تھے:

ای رجل یکون هذا؟	خدا جانے یہ کس بلا کا شخص ہوگا۔

امام صاحب کی تنقید اور حقیقت شناسی کا اس قدر شہرہ تھا کہ ابوزرعہ اور ابوحاتم جیسے اداشناس بزرگ ان کو معرفت حدیث میں اس زمانے کے تمام مشائخ پر ترجیح دیتے تھے، (۱) اسحاق کوسج خود امام صاحب سے خطاب کر کے فرماتے تھے:

لن نعدم الخیر مابقاك الله للمسلمین۔ (۲)	جب تک خدا آپ کو مسلمانوں کے لئے زندہ رکھے گا بھلائی ہمارے ہاتھ سے نہ جانے پائے گی۔

ابوقریش نے ان کو دنیا بھر کے حفاظ اربعہ میں شمار کیا ہے۔ (۳)

غرض کہ امام صاحب کی مقبولیت اور شہرت اس درجہ کو پہنچ گئی کہ اہل مغرب نے ان کے نام کو امام بخاری جیسے مسلّم امام کے نام سے بھی اونچا اچھالا۔

وفات: امام صاحب کے واقعات زندگی میں ان کی وفات کا واقعہ جس قدر افسوس ناک ہے، اس سے زیادہ حیرت انگیز اور قابل لحاظ ہے، کیونکہ اس سے امام صاحب کی علمی شیفتگی کا

(۱) ایضاً و بستان المحدثین ص ۱۰۴ و تہذیب الاسماء قسم اول جز ۲ ص ۹۱ و تاریخ بغداد ج ۱۳ و مقدمہ نووی ص ۱۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۶۵ و تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۲۷ (۳) تذکرۃ ذہبی ج ۲ ص ۱۲۶ وتہذیب ج ۱۰ ص ۱۲۸۔

پتہ چلتا ہے، اصل واقعہ یہ ہے کہ عین مجلس حدیث میں لوگوں نے امام صاحب سے ایک حدیث پوچھی، سوءِ اتفاق سے امام صاحب کو وہ حدیث یاد نہ تھی، اس لئے مکان پر آ کر اپنے مجموعہ حدیث میں اس کی جستجو شروع کی، اس چھان بین میں اس قدر محو ہوئے کہ سامنے خرما کا ایک ڈھیر رکھا ہوا تھا، اس سے نکال نکال کر کھاتے جاتے تھے لیکن حدیث کی فکر میں اس کی مطلق ان کو خبر نہیں ہوئی کہ اس بے خودی کی حالت میں کتنے خرمے کھا گئے، یہی واقعہ ان کی موت کا سبب ہوا۔(۱)

عام طور پر تذکرہ نویسوں نے اگرچہ اس واقعہ سے نفیًا یا اثباتًا کچھ تعرض نہیں کیا، لیکن اس قسم کے واقعے عقلاً ممکن بلکہ واقع ہوتے رہتے ہیں، اس لئے اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں، بہر حال امام صاحب نے ۲۵ / رجب ۲۶۱ ھ کو یکشنبہ کے دن نیشاپور میں بوقت شام ۵۵ برس کی عمر میں (۲) وفات پائی، دوشنبہ کے دن جنازہ اٹھایا گیا اور نیشاپور کے باہر ایک مقام مصراباد میں سپرد خاک کر دیے گئے۔(۳)

اخلاق وعادات: امام صاحب نہایت پاکیزہ خو اور انصاف پسند تھے، اس زمانہ میں اگرچہ عام طور پر مسلمانوں کی اخلاقی حالت نہایت مہذب اور شائستہ تھی تاہم جس طرح اس زمانے کے اہلِ کمال میں باہم ان بن رہتی ہے، اسی طرح اُس زمانہ کے مقدس اصحاب بھی اس سے خالی نہ تھے، اسی بنا پر رجال کی کتابوں میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ باہم معاصرین کی جرح وقدح قابل قبول نہیں کیوں کہ وہ لوگ ایک دوسرے کی نسبت رشک وحسد سے بہت کچھ برا بھلا کہہ دیا کرتے تھے، یہ محض معمولی درجہ کے لوگوں کا شیوہ نہ تھا بلکہ یحیٰی بن معین جیسے مقدس اصحاب بھی اس زمرہ میں شامل ہیں مگر امام صاحب کا دامن ہمیشہ اس قسم

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ وتہذیب ج ۱۰ ص ۱۲۷ (۲) صحیح روایت کے مطابق امام صاحب کی عمر انتقال کے وقت ۵۵ سال تھی مگر بعض مورخین نے جن میں ابن کثیر بھی شامل ہیں ۵۷ سال عمر بتائی ہے

(۳) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۲۷۔

کے دھبوں سے پاک رہا اور انھوں نے ہمیشہ نہایت فیاضی سے اس کا عملی ثبوت دیا، نیشاپور کے سفر میں امام بخاری کی مجلس میں ضرور آتے تھے اور ان سے استفادہ کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ان کے تبحر علمی سے متاثر ہو کر نہایت بے خودی کی حالت میں پکار اٹھے، دعنی اقبل رجلیك یاامیر المومنین فی الحدیث (۱) یعنی اے ملک حدیث کے بادشاہ! مجھ کو قدم بوسی کی اجازت دیجئے، اسی طرح اپنی کتاب مسلم کو خود ابوزرعہ رازی کی خدمت میں پیش کیا، وہ جن حدیثوں کو صحیح بتاتے تھے، ان کو بعینہ قائم رکھتے تھے اور جن حدیثوں پر نکتہ چینی کرتے تھے، ان کو بے تکلف چھوڑتے جاتے تھے (۲) لیکن ان کا حقیقی وصف، ان کی آزادی اور حق گوئی ہے اور اس کی وقعت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب مسلمانوں کی عام حالت کا اندازہ کیا جائے، آج تو مسلمانوں کا رواں رواں تقلید کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے لیکن اس زمانے میں بھی قرون اولیٰ کے بعد ہی سے بے جا طرف داری اور ناجائز رعایت کا مادہ پیدا ہو گیا تھا اور امتداد زمانہ کے ساتھ روز بروز اس کو ترقی ہوتی جاتی تھی لیکن امام صاحب پر اس کا بالکل اثر نہ پڑ سکا وہ اس قدر حق پرست تھے کہ اس کے مقابلہ میں اپنے اساتذہ کا بھی خیال نہیں کرتے تھے، چنانچہ جب امام بخاری نے نیشاپور کا سفر کیا اور سوء اتفاق سے ایک جزئی سوال، یعنی مسئلہ خلق قرآن کے متعلق عوام اور عوام کے ساتھ امام ذہلی جیسے نکتہ سنج محدث بھی امام صاحب کے مخالف ہو گئے اور اس مخالفت کا یہ اثر ہوا کہ امام ذہلی نے اپنی مجلسِ حدیث میں عام اعلان کر دیا۔

الا من قال باللفظ فلایحل له ان یحضر مجلسنا۔	خبردار جو شخص قرآن مجید کے الفاظ کو مخلوق کہے گا اس کو ہماری مجلس میں آنا حرام ہے۔

(۱) خطیب اور ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں دعنی حتی اقبل رجلیك یااستاذ الاستاذین وسیدالمحدثین وطبیب الحدیث فی علله دیکھو تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ و البدایہ ج ۱۱ ص ۳۴ (۲) مقدمہ مسلم نووی ص ۲۶۔

اس موقع پر امام صاحب نے اپنی اسی حق پرستی سے کام لیا، وہ امام بخاری کی رائے کو صحیح سمجھتے تھے، اس لیے ایک حق بات پر امام ذہلی کے شاگردانہ تعلق کو بالکل بھلا دیا اور سر مجلس اپنی چادر تان کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی مجلس کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا اور گھر پر جا کر ان کی تقریروں کے تمام نوشتے اونٹوں پر لدوا کر بھجوا دیے۔(۱)

امام بخاری کی یہ تائید اور حمایت بھی ایک خاص مسئلہ بھی تھی، ورنہ عام طور پر وہ امام بخاری کے بھی ہم زبان نہیں، چنانچہ معنعن روایتوں میں امام بخاری ہم عصری کے ساتھ راوی اور مروی عنہ میں ملاقات کی جو ایک ضروری شرط قرار دیتے ہیں، امام صاحب اس کے سخت مخالف ہیں، چنانچہ صحیح مسلم کے مقدمہ میں جہاں اس مسئلہ کی بحث کی ہے، اس کو پڑھ کر سخت حیرت ہوتی ہے، یا تو یہ حال تھا کہ ایک جزئی مسئلہ پر امام ذہلی کے قدیم شاگردانہ تعلق کو چھوڑ کر امام بخاری کے ہم خیال بن گئے اور اپنی عمر کی کمائی (یعنی امام ذہلی کے مجموعۂ حدیث) کی بھی کچھ پروا نہ کی یا خود امام بخاری کی تردید ان الفاظ میں کرتے ہیں:

وقد تكلم بعض منتحلي	یعنی ہمارے زمانہ کے بعض مدعیان
الحديث من اهل عصرنا في	حدیث اسانید کی صحت اور سقم کے
تصحيح الاسانيد وسقمها	متعلق ایک ایسے قول کے قائل ہوئے
بقول لوضربنا عن حكايته	ہیں کہ اگر ہم اس کے ذکر اور اس کی
وذكر فساده لكان رأيا متينًا	تردید سے اعراض کرتے تو اچھا
ومذهبًا صحيحًا اذا	ہوتا کیوں کہ مردود اقوال سے اعراض
الاعراض عن القول المطرح	کرنا ہی مناسب ہے۔
احرى (۲)	

کہاں یہ خوش اعتقادی کہ ان کے فضل و کمال سے متاثر ہو کر نہایت جوش کے

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ و تاریخ ابن خلکان ص ۵۲۷ (۲) مقدمہ مسلم مصر ص ۱۲۷، ۱۲۸۔

ساتھ فرماتے تھے۔

دعني اقبّل رجليك يا امير المومنين في الحديث .	یعنی اے علم حدیث کے بادشاہ مجھ کو قدم بوسی کی اجازت دیجئے۔

کہاں یہ کیفیت کہ ان ہی کا ذکر اس بے پروائی کے ساتھ کرتے ہیں۔

زعم القائل الذي افتتحنا الكلام على الحكاية عن قوله والاخبار عن سوء رويته۔(۱)	ہم نے جس قائل کے قول اور اس کی غلط فہمی کا ذکر کیا ہے وہ گمان کرتا ہے ....

الغرض ان کی حق پسند روش، ان کو تقلید، تعصب اور بے جا طرف داری کا مطلق خوگر نہیں ہونے دیتی تھی، اس لیے وہ اسی شاہراہ پر چلتے تھے جس کی طرف ان کا حق پرست دل رہ نمائی کرتا تھا۔(۲)

تصنیفات وتالیفات: امام صاحب کو تصنیف وتالیف کا فطری شوق تھا، صحیح مسلم کو جس تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھا اس کا ذکر ایک مستقل عنوان سے آگے آئے گا لیکن اس

(۱) مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۲۹۔ (۲) اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عموماً محدثین کا گروہ اگر چہ کسی امام کا مقلد نہ تھا اور نہ اس کو ہونا چاہیے تھا تاہم اُن میں کسی بزرگ کا مذہب، کسی خاص امام سے زیادہ ملتا جلتا تھا تو ان کو تقلید پرست لوگ اس امام کی طرف منسوب کر دیتے تھے، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

وكان صاحب الحديث ايضاً قد ينتسب الىٰ احدالمذاهب لكثرة موافقته به كالنسائي والبيهقي ينسبان الى الشافعي غالباً اسی بنا پر یا اور کسی وجہ سے صاحب کشف الظنون نے امام صاحب کو ایک ضمنی تذکرے میں امام شافعی کی طرف منسوب کر دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بجائے خود ایک مستقل امام تھے اور ہر مسئلہ کے متعلق اپنی آزادانہ رائے رکھتے تھے اس لیے ان کو کسی مجتہد کی طرف منسوب کرنا ان کی تحقیر ہے۔

کے علاوہ اور بھی نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں جن کے موضوع اور اجمالی حالت کا اندازہ خود ان کے نام کی فہرست سے ہوگا:

۱-مسند کبیر، ۲-الاسماء (الکنی)، ۳-جامع کبیر، ۴-کتاب العلل، ۵-کتاب التمیز، ۶-کتاب الوحدان، ۷-کتاب الافراد، ۸-کتاب الاقران، ۹-کتاب سوالات لاحمد بن حنبل، ۱۰-کتاب حدیث عمرو بن شعیب، ۱۱-کتاب الانتفاع باھب السباع، ۱۲-کتاب مشائخ مالک، ۱۳-کتاب مشائخ ثوری، ۱۴-کتاب مشائخ شعبہ، ۱۵-کتاب من لیس لہ الا راد واحد، ۱۶-کتاب المخضر مین، ۱۷-کتاب اولاد الصحابہ، ۱۸-کتاب اوہام المحدثین، ۱۹-کتاب الطبقات، ۲۰-کتاب افراد الشامیین۔

صحیح مسلم

امام صاحب نے اگرچہ جیسا کہ ہم ابھی لکھ آئے ہیں، علم حدیث کے متعلق خاص خاص موضوع پر نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں لیکن ان کو صحیح مسلم کی شہرت اور مقبولیت نے اس طرح دبالیا ہے کہ آج کوئی شخص ان کا نام بھی نہیں جانتا، امام صاحب کی تصنیفات سے قطع نظر کرکے، حدیث کی عام کتابوں کا بھی قریب قریب یہی حال ہے، خود صحیح بخاری کو اگرچہ ائمہ فن نے متعدد حیثیتوں سے مسلم پر ترجیح دی ہے، تاہم مسلم کو یہ شرف قبول حاصل ہے کہ ہمیشہ بخاری کے ساتھ ساتھ اس کا بھی نام لیا جاتا ہے، اس لئے ہم مسلم کی ان خصوصیات کو دکھانا چاہتے ہیں، جنھوں نے اس کو اس قدر شہرت دی ہے۔

اس سلسلہ میں جو چیز سب سے زیادہ قابل ذکر ہے وہ اس کتاب کا مقدمہ ہے، کیوں کہ اس سے ایک طرف جرح وتعدیل اور اصول حدیث کے متعلق نہایت مہتم بالشان نکتے معلوم ہوتے ہیں اور دوسری طرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب نے جس زمانے میں

اس کو مرتب کیا، اس میں کس قدر موضوع حدیثیں پیدا ہوگئی تھیں، اس لئے ایسی حالت میں ایسی صحیح کتاب کا مرتب کرنا کس قدر دشوار اور اہم تھا، اس بنا پر ہم سب سے پہلے اسی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

مقدمہ مسلم: مذہب اگر چہ دنیا کی تمام قوموں کو عزیز ہے، تاہم مسلمانوں نے اس کو جس عزت کی نگاہ سے دیکھا، دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ علمی حیثیت سے مسلمانوں نے سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ کی وہ یہی مذہبی علوم وفنون تھے، ان میں نحو، ادب، تفسیر، اصول فقہ اگر چہ سب کے سب بالذات یا بالواسطہ مذہبی علوم ہیں اور اس لئے مسلمانوں نے ان سب میں کمال پیدا کیا، تاہم ان میں علم حدیث چونکہ مذہب کا سب سے زیادہ ضروری عنصر تھا، اس لئے یہ مقدس فن ایک مدت تک عام طور پر مسلمانوں کے دل ودماغ کا جولانگاہ رہا، اس عام مذاق نے اگر چہ نہایت مفید نتائج پیدا کئے، تاہم چونکہ مذہبی حیثیت سے یہ گروہ نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اس لئے نااہل اور خود غرض لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس فن کو محض نام ونمود کا ذریعہ قرار دے کر موضوع اور غیر معتبر روایتوں کا ایک طوفان اٹھا دیا، چنانچہ خود امام صاحب اپنے مقدمہ میں ضعیف راویوں کا استقصا کر کے لکھتے ہیں:

ولا احسب كثيرًا ممن يعرج	ہمارا خیال ہے ان مجہول الاسناد اور
من الناس على ما وصفنا من	ضعیف روایتوں پر جن کو ہم نے بیان
هذه الاحاديث الضعاف	کر دیا ہے، ان کے ضعف کے ظاہر
والاسانيد المجهولة ويعتد	ہونے کے بعد بجز ان لوگوں کے جن کو
بروايتها بعد معرفته	عوام کے نزدیک کثرت سے حدیثیں
وبمافيها من التوهن	بیان کرنے کا شوق ہوتا ہے، تا کہ یہ
والضعف الا ان الذى يحمله	کہا جائے کہ فلاں نے کس کثرت
عن روايتها والاعتداد بها	سے حدیثیں جمع کی ہیں، اکثر لوگ
ارادة التكثير بذلك عند	اعتبار نہ کریں گے لیکن جو لوگ علم

العوام ولان يقال ماالكثر	حدیث میں یہ مسلک اختیار کرتے
ماجمع فلان من الحديث	ہیں، ان کو اس فن میں ذرا بھی دخل نہیں
والف من العدو ومن ذهب في	اور ان کو بجائے عالم کے جاہل کہنا
العلم هذا المذهب ومسلك هذا	اچھا ہے۔
الطريق فلانصيب له فيه	
وكان بان يكنى جاهلا اولىٰ	
من ان ينسب الىٰ العلم.	
(ص ۱۲۷)	

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ اس زمانے میں محض شہرت کے لئے ہر قسم کی رطب ویابس حدیثوں کے روایت کرنے کا مذاق پیدا ہو چلا تھا لیکن ان خود غرض لوگوں سے گذر کے جو دفتر غیر معتبر اور موضوع حدیثوں کی روایت میں شہرت عام رکھتا تھا، وہ متقشف زاہدوں اور مسجد نشینوں کا مقدس فرقہ تھا، چنانچہ اس زمانہ کے نکتہ سنج لوگ، ان بزرگوں کو جس نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کا اندازہ ذیل کی روایتوں سے ہوگا:

حدثني محمدٌ بن ابى عتاب	مجھ سے محمد بن ابی عتاب اور ان سے
قال اخبرني عفان عن محمد	عفان اور ان سے محمد بن یحییٰ بن سعید
بن يحيىٰ بن سعيد القطان	بن قطان اور ان سے ان کے باپ
عن ابيه قال لم نر الصالحين	نے حدیث بیان کی کہ ہم حدیث میں
في شئ اكذب منهم في	صالحین سے زیادہ جھوٹا کسی کو نہیں
الحديث قال ابن ابى عتاب	دیکھتے، دوسری روایت میں ہے کہ ابن
فلقيت ابامحمدٌ بن يحىٰ بن	ابی عتاب کا بیان ہے کہ میں نے محمد بن
سعيدالقطان فسالتهٔ عنه	یحییٰ بن سعید بن قطان سے ملاقات کی

فقال عن ابیه لم تر اهل الخیر فی شئ اکذب منهم فی الحدیث قال مسلم یقول یجری الکذب علی لسانهم ولا یتعمدون الکذب (ص۹۴، ۹۵)

اور اس حدیث کو پوچھا تو انھوں نے اپنے باپ کے ذریعہ سے بیان کیا کہ تم حدیث میں اہل خیر سے زیادہ جھوٹا نہ پاؤ گے، امام مسلم کا بیان ہے کہ ان کے قول کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ جھوٹ بول جاتے ہیں مگر اس کا قصد نہیں کرتے۔

حدثنا الحلوانی قال سمعت عفان قال حدثت حماد بن سلمة عن صالح المری بحدیث عن ثابت فقال کذب وحدثت هماما عن صالح المری بحدیث فقال کذب۔ (مقدمہ مسلم ص۱۱۰، ۱۱۱)

حلوانی نے ہم سے روایت کی کہ میں نے عفان سے سنا کہ انھوں نے حماد بن سلمہ کے پاس صالح مری کے ذریعہ سے ثابت سے ایک روایت بیان کی، انھوں نے کہا کہ صالح جھوٹ کہتا ہے، اسی طرح ان کا بیان ہے کہ میں نے صالح مری کے ذریعہ سے ہمام کے پاس ایک حدیث بیان کی، انھوں نے فرمایا کہ وہ جھوٹ کہتا ہے۔

حالانکہ صالح مری اتنے بڑے زاہد، خدا ترس اور رقیق القلب تھے جن کی نسبت شارح نووی نے یہ الفاظ لکھے ہیں:

وکان صالح رحمه الله حسن الصوت بالقرآن وقد مات

صالح رحمہ اللہ نہایت خوش الحانی سے قرآن پڑھتے تھے، یہاں تک کہ بہت

بعض من سمع قرأته وكان	سے لوگ ان کی قرأت سن کر مر گئے، وہ
شديد الخوف من الله تعالیٰ	خدا کا سخت خوف کرتے تھے اور اکثر
كثيرا البكاء قال عفان ابن	روتے رہتے تھے، عفان بن مسلم کا
مسلم كان صالح اذا اخذ في	بیان ہے کہ جب وہ قصے بیان کرتے
قصصه كانه رجل مذعور	تھے تو اس خوف زدہ آدمی کی طرح
يفزعك امره من حزنه وكثرة	معلوم ہوتے تھے جو اپنے کثرت خوف
بكائه كانه ثكلى	سے تم کو بھی خوف ودہشت میں مبتلا کر
(حاشیہ مقدمہ مسلم ص۱۱۱)	دے گا اور ان کی نوحہ زاری سے معلوم
	ہوتا تھا کہ گویا وہ ایک عورت ہیں جو
	اپنے لڑکے کا ماتم کر رہی ہے۔

صالح مری کی طرح اور بھی بہت سے بزرگ تھے جو مذہب کے سخت پابند تھے لیکن احادیث میں بہت کچھ طمع سازی کیا کرتے تھے۔

حدثني محمدبن عبدالله بن	مجھ سے محمد بن عبداللہ بن قہزاد مروزی
قهزاد من اهل مرو قال	نے روایت کی کہ مجھ کو علی بن حسین بن
اخبرني علي بن حسين بن	واقد نے خبر دی کہ عبداللہ بن مبارک
واقد قال قال عبدالله بن	فرماتے تھے کہ میں نے سفیان ثوری
المبارك قلت سفيان الثوری	سے کہا کہ آپ تو عباد بن کثیر کا حال
ان عباد بن كثير من تعرف	خوب جانتے ہیں، جب وہ حدیث
حاله واذا حدث جاء	بیان کرتے ہیں تو قیامت ڈھاتے
بامر عظيم فترى ان اقول	ہیں، تو کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں
للناس لاتاخذواعنه قال	کہ میں لوگوں سے کہہ دوں کہ ان کی

سفيان بلى قال عبدالله فكنت اذا كنت في مجلس ذكر فيه عبادٌ اثنيت عليه في دينه واقول، لاتاخذوا عنه۔
(مقدمہ مسلم ص۹۴)

حدیثیں نہ قبول کرو، انھوں نے کہا ہاں، عبداللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ اس کے بعد جب کسی مجلس میں عباد کا ذکر آتا تھا تو میں ان کے تدین کی تعریف کرتا تھا لیکن اسی کے ساتھ ہی لوگوں سے یہ بھی کہتا تھا کہ ان کی حدیثیں قبول نہ کرو۔

حدثنا محمد حدثنا عبدالله بن عثمان قال قال ابى قال عبدالله بن المبارك انتهيت الىٰ شعبة فقال هذاعباد بن كثير فاحذروه۔
(مقدمہ صحیح مسلم ص۹۴)

ہم سے محمد اور ان سے عبداللہ بن عثمان نے حدیث بیان کی کہ ان کے باپ نے کہا کہ ہم سے عبداللہ بن مبارک نے فرمایا کہ میں شعبہ کے پاس گیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ عباد بن کثیر ہے اس سے بچتے رہو۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض محدثین نے صاف صاف تصریح کر دی ہے کہ یہ لوگ اس فن میں اہلیت نہیں رکھتے تھے۔

حدثني احمد بن ابراهيم قال حدثني سليمان بن الحرب عن حماد بن زيد قال ذكرفرقد عند ايوب فقال ان فرقداً ليس صاحب حديث۔ (مقدمہ مسلم ص۱۲۲)

ہم سے احمد بن ابراہیم اور ان سے سلیمان بن حرب اور ان سے حماد بن زید نے روایت کی کہ ایوب کے یہاں فرقد کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ فرقد اہل حدیث نہیں۔

حالانکہ فرقد تابعی اور بہت بڑے عابد شخص تھے، چنانچہ شارح نووی کہتے ہیں:

التابعی العابد لایحتج بحدیثه عند اهل الحدیث لکونه لیس صفته کما قدمنا فی قوله لم نرالصالحین فی شئ اکذب منهم فی الحدیث۔ (حاشیہ مقدمہ ص ۱۲۲)	یعنی فرقد تابعی اور عابد شخص تھے، اہل حدیث کے نزدیک ان کی حدیثوں کا اس بناپر اعتبار نہیں کیا جاتا کہ یہ ان کا فن نہیں تھا، جیسا کہ ہم نے لم نر الصالحین فی شیء اکذب منهم فی الحدیث کے ذکر میں بیان کیا۔

اس موقع پر یہ بات یادرکھنے کے قابل ہے کہ چوں کہ یہ تمام بزرگ نہایت خداترس، متقشف اور عبادت گذار ہوتے تھے، اس لیے محدثین نے ان کی دروغ گوئی اور ضعیف روایت کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہ لوگ اہل فن نہ تھے، چنانچہ پہلی حدیث میں خود امام صاحب نے تصریح کردی ہے کہ یہ لوگ عمداً جھوٹ نہیں بولتے تھے، چنانچہ شارح نووی اس قول کی شرح میں لکھتے ہیں:

معناه ماقاله مسلم انه یجری الکذب علی السنتهم ولایتعمدون ذلك لکونهم لایعانون صناعة اهل الحدیث فیقع الخطا فی روایاتهم ولایعرفونه ویروون الکذب ولایعلمون انه کذب۔ (حاشیہ مقدمہ ص ۹۴)	یعنی مسلم نے جو یہ کہا ہے کہ وہ لوگ یوں ہی جھوٹ بول جاتے ہیں لیکن اس کا قصد نہیں کرتے، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ صاحب فن نہ تھے، اس لیے ان کی روایتوں میں غلطی واقع ہوجاتی ہے لیکن وہ لوگ اس کو نہیں جانتے جھوٹ روایت کردیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ یہ جھوٹ ہے۔

اس وجہ کی صحت میں کوئی شبہہ نہیں لیکن ہم کلیۃً اس سے اتفاق نہیں کرسکتے

کیوں کہ جس طرح اس زمانے کے عام واعظ، مریدین کو خوش اور مجلس وعظ کے گرمانے کے لیے نہایت عجیب وغریب حدیثیں بیان کر جاتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں کی نسبت بھی اس قسم کا خیال پیدا ہوسکتا ہے، بہرحال واقعہ جو کچھ ہو لیکن ان بزرگوں کی یہ تمام خانہ براندازیاں چوں کہ مذہب اور مذہب کے ساتھ زہد کے پردے میں تھیں، اس لیے عام طور پر کوئی شورش نہیں پیدا ہوئی خیر، اس بنا پر محدثین کے گروہ میں زیادہ تر شور وغل اس وقت ہوا جب عقائد کے متعلق مبتدعانہ خیالات ظاہر ہوئے، اسلام میں اختلافی مسائل کی بنیاد اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہی پڑ گئی تھی لیکن بدعت کا آغاز صحابہؓ کے آخری زمانہ میں ہوا، چنانچہ معبد جہنی، غیلان دمشقی، یونس اسواری نے اسی زمانہ میں قضاوقدر کا انکار کیا (۱) تابعین کے زمانے میں اس قسم کے اور بھی بہت سے گمراہ پیدا ہوئے، چنانچہ جعد بن درہم نے بنی امیہ کے زمانے میں ایک عجیب وغریب خیال ظاہر کیا، اس نے صراحۃً دعویٰ کیا کہ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا اور نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا (۲) اس جرم پر اس کو خالد بن عبداللہ قسری نے جو ہشام بن عبدالملک کی طرف سے عراق کا گورنر تھا، عیداضحیٰ کے دن عجیب شان سے قتل کیا، پہلے اس نے ایک عام اعلان کیا کہ میں آج خدا کی راہ میں قربانی کرنا چاہتا ہوں، جس کو شریک ہونا ہو شریک ہو، اس طور پر اس نے مسلمانوں کے مجمع عام میں قربانی کی، (۳) اس کے بعد اس کا عام مذاق پیدا ہوگیا اور نہایت کثرت سے لوگوں نے محدثین کے خلاف اپنے خیالات ظاہر کرنا شروع کیے، جہم بن صفوان نے جس کی طرف فرقۂ جہمیہ منسوب ہے، نصر بن سیار کے زمانے میں

(۱) ملل ونحل شہرستانی ص ۳۱ برحاشیہ ملل ابن حزم جلد اول مطبعہ ادبیہ مصر طبع اول ۱۳۱۷ھ وشرح مواقف ج ۲ ص ۴۷۹ (۲) میزان الاعتدال ذہبی جلد ا ص ۱۸۵ مطبعہ سعادت مصر ۱۳۲۵ھ (۳) اس کا واقعہ نہایت مشہور ہے، اسی کی طرف علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے فقتل علی ذلك بالعراق یوم النحر والقصة مشهورة میزان الاعتدال جلد اول ص ۱۸۵

ترمذ میں اپنی بدعت کی اشاعت کی، وہ جبریہ اعتقاد رکھتا تھا، اس لیے بندے کو مجبور محض قرار دیتا تھا، اس جرم پر سالم بن احوز المازنی نے اس کو بنی امیہ کے آخری زمانے میں مرو میں قتل کر ڈالا، (۱) تقریباً اسی زمانے میں بصرہ میں واصل بن عطا الغزال جو حسن بصری کا شاگرد تھا اور اس کے شاگرد عمرو بن عبید نے اعتزال کی بنیاد قائم کی، مقاتل بن سلیمان مفسر نے خراسان میں خدا کے لیے ہر قسم کے صفات ثابت کیے اور جسمیت کا قائل ہوا، ان سب کے بعد سجستان میں ابوعبداللہ بن کرام نے چند مذاہب سے کچھ مسائل اخذ کر کے ایک جدید مذہب قائم کیا اور اس کو ایک کتاب کے ذریعہ سے خراسان وغیرہ میں رواج (۲) عام دیا، اس کا خیال تھا کہ ایمان محض قول باللسان کا نام ہے، اس لحاظ سے اگر کوئی شخص دل میں کفر کا اعتقاد رکھے اور زبان سے خدا اور شریعت کا اقرار کرے تو وہ مومن ہے، اس بنا پر نیشاپور میں آٹھ سال تک قید رہا، اس کے بعد بیت المقدس چلا گیا اور شام میں ۲۵۵ھ میں وفات پائی اور اس کے مقلدین واصحاب نے اس کی قبر پر اعتکاف کیا (۳) اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فرقے پیدا ہو گئے تھے لیکن ہم کو جہاں تک معلوم ہے، ان گمراہ سازوں میں روایتوں کے گڑھنے میں صرف عمرو بن عبید، مقاتل بن سلیمان اور کرامیہ مشہور ہیں، جہم بن صفوان کے متعلق تو علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں صاف تصریح کر دی ہے:

وما علمته روی شیئا ولکنه زرع شرا عظیما (جلد اول ص ۱۹۷)	ہمارے خیال میں اس نے کوئی روایت نہیں کی، البتہ بہت بڑی برائی کا بیج بو گیا۔

اسی طرح غیلان دمشقی، یونس اسواری، جعد بن درہم وغیرہ کا بھی رواۃ حدیث میں شمار نہیں، کرامیہ عموماً ترغیب وترہیب کے متعلق وضع احادیث کو جائز رکھتے تھے اور بعض

(۱) ملل ونحل شہرستانی جلد اول ص ۱۰۹ (۲) ملل ونحل شہرستانی جلد اول ص ۱۴۵ و ۱۴۴ (۳) میزان الاعتدال ذہبی ج ۳ ص ۱۲۷۔

ریا کار زاہد بھی اس خیال میں انہی کے ہمزبان تھے، ان کا یہ دعویٰ محض زبانی نہ تھا، بلکہ اس کو استدلال سے بھی ثابت کرتے تھے، مثلاً ایک روایت میں ہے:

مَنْ كذب على متعمدًا ليضل به فليتبوّأ مقعده من النار.	یعنی گمراہ سازی کے لئے جو میری طرف جھوٹ باتیں منسوب کرتا ہے اس کو جہنم میں اپنا ٹھکانا بنالینا چاہئے۔

اور چونکہ ترغیب وترہیب کے لئے جھوٹ بولنا گمراہ سازی میں داخل نہیں اس لئے اس کا مرتکب، شرعی مجرم نہیں قرار پا سکتا، اسی طرح بعض کا یہ بھی خیال تھا کہ چونکہ اس دروغ مصلحت آمیز سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی نقصان نہیں ہوتا (۱) اس لئے اس پر من كذب على (۲) کا حکم نہیں جاری ہوسکتا لیکن اس کا مجرم صرف کرامیہ اور زہاد کو قرار دینا خلاف انصاف ہے، خود ہمارے علما بھی اس قسم کی حدیثوں میں بہت کچھ سہل نگاری کرتے ہیں، (۳) مقاتل بن سلیمان کا وضع حدیث میں جو پایہ تھا، اس کا اندازہ میزان الاعتدال کی اس عبارت سے ہوسکتا ہے:

عن النسائى قال والكذابون المعروفون بوضع الحديث ابن ابى يحيىٰ بالمدينة والواقدى ببغداد ومقاتل بن سليمان بخراسان ومحمد بن سعيد الشامى	یعنی امام نسائی نے فرمایا کہ مدینہ میں ابن ابی یحییٰ بغداد میں واقدی، خراسان میں مقاتل بن سلیمان اور شام میں محمد بن سعید نہایت جھوٹے اور وضع حدیث میں مشہور ہیں۔

(جلد۳ص۲۴)

---

(۱) نووی حاشیہ مقدمہ مسلم ص۷۰ (۲) مطلب یہ کہ علیٰ ضرر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اس لئے جب ترغیب وترہیب سے شرعی فائدے حاصل ہوتے ہیں، تو اس قسم کے جھوٹ بولنے میں کیا حرج ہے (۳) حاشیہ نووی مطبوعہ ہند ص۲۱۔

معتزلہ کا گروہ چونکہ زیادہ تر عقلیات کا شیفتہ تھا، اس لئے روایتوں سے بہت کم اعتنا رکھتا تھا لیکن اس گروہ میں صرف عمرو بن عبید ننگ خاندان ہے، اس کو حسن بصری کی صحبت کا شرف حاصل تھا، اس لئے اکثر روایتوں کو غلط طور پر ان کی طرف منسوب کر دیتا تھا اور اسی کے ساتھ بعض اس قسم کی روایتیں بھی بیان کرتا تھا، جس سے معتزلہ کے مذہب کی تائید ہوتی تھی:

حدثني عمرو بن علي ابو حفص قال سمعت معاذ بن معاذ يقول قلت لعوف بن جميلة ان عمرو بن عبيد حدثنا عن الحسن ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال من حمل علينا السلاح فليس منا قال كذب والله عمرو ولكنه اراد ان يحوزها الى قوله الخبيث. (مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۰۹)	مجھ سے عمرو بن علی حفص نے روایت کی کہ میں نے معاذ بن معاذ سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے عوف بن جمیلہ سے کہا کہ ہم سے عمرو بن عبید نے حسن بصری سے روایت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم سے نہیں، انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم عمرو جھوٹ کہتا ہے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس روایت کو اپنے مردود قول کی طرف الٹ پھیر کر لائے۔

اس حدیث کی صحت میں کوئی کلام نہیں لیکن چونکہ عمرو بن عبید نے اس کو غلط طور پر حسن بصری کی طرف منسوب کر دیا تھا، اس لئے عوف بن جمیلہ نے اس کو مردود قرار دیا، کیونکہ عمرو بن عبید کو اس حدیث سے معتزلہ کے ایک خیال کی تائید منظور تھی، معتزلہ کا مذہب ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب دائرۂ ایمان سے نکل کر ہمیشہ کے لئے جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے، وہ لوگ اس قسم کے مجرم کو فاسق کا خطاب دیتے ہیں، چنانچہ عمرو بن عبید کو اس حدیث کے

ظاہری معنی سے اسی خیال کی تائید کرنا منظور تھی، اس کے علاوہ عمرو بن عبید میں یہ کمال بھی تھا کہ خفیف تغیر وتبدل سے احادیث کے اصلی معنی بدل دیا کرتا تھا:

حدثنی حجاج بن الشاعر قال حدثنا سلیمان بن حرب حدثنا ابن زید یعنی حماد قال قیل لایوب ان عمرو بن عبید روی عن الحسن قال لا یجلد السکران من النبیذ فقال کذب انما سمعت الحسن یقول یجلد السکران من النبیذ. (مقدمہ مسلم ص ۱۱۰)	مجھ سے حجاج بن شاعر اور ان سے سلیمان بن حرب اور ان سے ابن زید یعنی حماد نے بیان کیا کہ ایوب سے کہا گیا کہ عمرو بن عبید نے حسن بصری سے روایت کی ہے کہ تاڑی سے نشہ کرنے والے شخص کو کوڑے نہیں مارے جائیں گے، انھوں نے فرمایا کہ وہ جھوٹ کہتا ہے، میں نے تو ان سے سنا ہے کہ ایسے شخص کو کوڑا مارا جائے گا۔

اس روایت میں عمرو بن عبید نے صرف لفظ ''لا'' کے بڑھا دینے سے ایسا عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا، مختصر یہ کہ اعتزال کی وجہ سے عمرو بن عبید روایت حدیث میں سخت بدنام تھا:

حدثنی حجاج قال نا سلیمان بن حرب قال سمعت سلام بن ابی مطیع یقول بلغ ایوب انی آتی عملاً فاقبل علی یوماً فقال ارأیت رجلاً لاتأمنه علی دینه کیف تأمنه	مجھ سے حجاج اور ان سے سلیمان بن حرب نے بیان کیا، کہ میں نے سلام بن ابی مطیع کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایوب کو معلوم ہوا کہ میں عمرو کے پاس آمد ورفت رکھتا ہوں، تو وہ میرے پاس آئے اور فرمایا کہ تمہیں جس شخص

علی الحدیث۔	کے مذہب پر اعتماد نہیں اس کی
(مقدمہ صحیح مسلم ص۱۱۰)	حدیثوں پر کیوں کر اعتماد کرتے ہو۔

اسی سلسلہ میں محمد بن سعید مصلوب اور عبداللہ بن مسعود ابوجعفر المدنی بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، محمد بن سعید مصلوب کو وضع حدیث میں جو جرأت اور بے باکی تھی، اس کا اندازہ شارح نووی کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے:

قال خالد بن یزید سمعته یقول اذا کان کلام حسن لم اربأسا ان اجعل له اسناداً۔	یعنی خالد بن یزید کا بیان ہے کہ میں نے خود اس کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب کوئی اچھا کلام مل جاتا ہے تو مجھے اس کے لئے اسناد گڑھنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا۔

اسی ضعف روایت کی وجہ سے مدلسین نے اس کے سیکڑوں نام بدلے ہیں، تاکہ انھیں مصنوعی ناموں کے پردے میں اس کا عیب چھپ جائے، اس کے ساتھ یہ مذہبی حیثیت سے بھی مہتم تھا، چنانچہ احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ اس کو زندقہ کی تہمت میں ابوجعفر نے قتل کر ڈالا، (۱) عبداللہ بن مسور اگرچہ مذہبی حیثیت سے بدنام نہ تھا، تاہم وضع حدیث میں وہ بھی محمد بن سعید کا ہم خیال تھا:

حدثنا عثمان بن ابی شیبة قال نا جریر عن رقبة ان اباجعفر الهاشمی المدنی کان یضع احادیث کلام حق ولیست احادیث النبی ﷺ	ہم سے عثمان بن ابی شیبہ نے اور ان سے جریر نے رقبہ کے ذریعہ سے روایت کی کہ ابوجعفر ہاشمی مدنی اچھے کلام کو حدیث کے قالب میں ڈھال کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت

(۱) نووی ص ۵٦۔

وکان یرویھامن النبی ﷺ.	کرتا تھا، حالانکہ وہ آنحضرتؐ کا کلام
(مقدمہ مسلم ص ۱۰۸،۱۰۷)	نہیں ہوتا تھا۔

اسی طرح عبدالقدوس شامی بھی عام طور پر کذاب خیال کیا جاتا تھا۔

حدثنی احمدؒ بن یوسف	مجھ سے احمد بن یوسف ازدی نے
الازدی قال سمعت عبد	بیان کیا، کہ میں نے عبدالرزاق
الرزاق یقول مارأیت ابن	سے سنا کہ ابن مبارک کسی شخص کو
المبارک یفصح یقوله کذاب	کذاب نہیں کہتے تھے، لیکن میں
الالعبد القدوس فانی سمعت	نے ان کو عبدالقدوس کو کذاب کہتے
یقول له کذاب۔	ہوئے سنا۔

(مقدمہ مسلم ص ۱۱۷)

اس فرقہ مبتدعہ میں روافض کا بھی شمار ہے، بلکہ اہل حدیث زیادہ تر اسی گروہ سے نالاں ہیں، کیونکہ یہی لوگ زیادہ تر اپنے مذہب کی تائید میں موضوع اور غلط حدیثیں روایت کرتے تھے، چنانچہ اسی بنا پر امام شافعیؒ ان کی حدیثوں کو مطلقاً دائرۂ اعتبار سے خارج سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کو عام طور پر اہل بدعت کی روایتوں کے قبول کرنے میں اس قدر تشدد نہیں:

حدثنی سلمة بن شبیب قال	مجھ سے سلمہ بن شبیب اوران سے
نا الحمیدی قال نا سفیان	حمیدی اوران سے ابوسفیان نے بیان
قال کان الناس یحملون عن	کیا کہ قبل اس کے کہ جابر اپنا خیال
جابر قبل ان مایظھر ما اظھر	ظاہر کرے، لوگ اس سے حدیثیں
فلما اظھر مااظھر اتھمه الناس	روایت کرتے تھے لیکن جب اس نے
فی حدیثه وترکه بعض	اپنا خیال ظاہر کیا تو لوگ اس کو متہم
الناس فقیل له وما اظھر	کرتے تھے بلکہ بعض لوگوں نے اس

قال الایمان بالرجعة۔ (۱)	کو بالکل متروک الحدیث قرار دیا، پھر ان سے پوچھا گیا کہ اس نے کیا خیال ظاہر کیا، فرمایا ایمان بالرجعۃ۔
حدثنی حسن الحلوانی قال نا ابویحییٰ الحمانی قال ناقبیصة واخوه انهما سمعا الجراح بن مليح يقول سمعت جابر بن يزيد عندی سبعون الف حديث عن ابی جعفرعن النبی ﷺ كلها۔	مجھ سے حسن حلوانی اوران سے ابویحییٰ حمانی اوران سے قبیصہ اوران کے بھائی نے روایت کی کہ ہم دونوں نے جراح بن ملیح سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے خود جابر بن یزید سے یہ سنا کہ میرے پاس ۷۰ ہزار حدیثیں ہیں جوکل کی کل آنحضرتؐ سے ابوجعفر کے ذریعہ سے مروی ہیں۔

لیکن بایں ہمہ ہم کو اس گروہ کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس نے علم حدیث کے متعلق قدما کی رائے میں ایک نہایت مفید انقلاب پیدا کر دیا، چنانچہ اس کے پہلے اسناد کا اس قدر التزام نہ تھا، یا تھا تو کم از کم اس کے متعلق اس قدر تشدد سے کام نہیں لیا جاتا تھا لیکن جب بدعت نے زیادہ زور پکڑا تو محدثین نے اس کی طرف خاص توجہ کی اور اس کو لوازم مذہب سے قرار دیا۔

حدثنا ابوجعفر محمد بن الصباح قال ثنا اسماعيل بن زكريا عن عاصم الاحول عن	ہم سے ابوجعفر محمد بن صباح اور ان سے اسماعیل بن زکریا اور ان سے عاصم احول نے ابن سیرین سے

(۱) روافض کا خیال ہے کہ حضرت علی بادلوں کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں، چنانچہ جب وہ آسمان سے پکاریں گے تو ہم ان کی اولاد کے ساتھ خروج کریں گے۔

ابن سیرین قال لم یکونوا یسئلون عن الاسناد فلما وقعت الفتنة قالوا سموا لنا رجالکم فینظر الیٰ اهل السنة فیوخذ حدیثهم وینظر الیٰ اهل البدع فلا یوخذ حدیثهم۔
(مقدمہ صحیح مسلم ص ۸۴)

روایت کی کہ لوگوں سے پہلے اسناد نہیں پوچھے جاتے تھے لیکن جب فتنہ پھیلا تو لوگ کہنے لگے کہ ہم کو اپنے راویوں کے نام بتاؤ تا کہ اہل سنت کو دیکھ کر حدیثیں قبول کی جائیں اور اہل بدعت کی حدیثیں نہ لی جائیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اسی گروہ کی برکت سے احادیث کی تالیف وتدوین کا سلسلہ قائم ہوا کیوں کہ عمرو بن عبید، جہم بن صفوان، واصل بن عطا، مقاتل بن سلیمان کے ظہور کا زمانہ وہ پرآشوب زمانہ تھا جس میں ملکی انقلاب کا حشر برپا تھا، حوادثِ زمانہ نے بنوامیہ کا دفتر الٹ کر بنی عباس کو صاحب تخت وتاج قرار دیا تھا، علماومحدثین بھی اس قیامت خیز انقلاب سے محفوظ نہ تھے، خراسانی لشکر نے سیکڑوں اہل علم کو تہ تیغ کر دیا تھا، اس لیے خوف تھا کہ ملکی تغیر کے ساتھ، ان خانہ براندازوں کے خیالات سے اسلام کے اصلی عقائد میں کہیں انقلاب نہ پیدا ہو جائے، اس بنا پر علما نے تدوین کتب کی طرف توجہ کی اور علوم شریعت صحابہ اور تابعین کے مقدس سینوں سے نکل کر منظر عام پر آ گئے، یہ سچ ہے کہ اس ذریعہ سے مسلمانوں کا اصلی جوہر قوت حافظہ مٹ گیا لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ آج ہمارے پاس جو کچھ بچا کھچا سرمایہ رہ گیا ہے، وہ انہیں کوششوں کا نتیجہ ہے۔

بہر حال یہاں تک جو بحث تھی، اس کا تعلق ایک خاص گروہ کے ساتھ تھا لیکن ایک عام بات جس کا تعلق ہر گروہ اور ہر شخص کے ساتھ ہوسکتا ہے، یہ ہے کہ کثرت روایت سے احتراز کیا جائے اور اسی کے ساتھ ہر شخص کے فہم ودرایت کے موافق روایتیں کی جائیں

اور عموماً ہر کس و ناکس سے روایتوں کے قبول کرنے میں سختی اور احتیاط سے کام لیا جائے چنانچہ صحابہ اور تابعین میں جو لوگ نکتہ سنج اور حقیقت شناس تھے، وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے۔

حدثنا یحییٰ بن یحییٰ قال نا هشیم عن سلیمان التیمی عن ابی عثمان النهدی قال قال عمر بن الخطاب بحسب المرء من الکذب او یحدث بکل ماسمع۔ (مقدمہ مسلم ص ۴،۷۵،۷)

ہم سے یحییٰ بن یحییٰ نے روایت کی کہ ہم کو ہشیم نے سلیمان تیمی سے اور ان سے عثمان نہدی نے خبر دی کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب فرماتے تھے کہ آدمی کے لیے یہی جھوٹ بہت ہے کہ جو کچھ سنے اس کو روایت کر دے۔

حدثنی ابو الطاهر احمد بن عمرو بن عبدالله بن عمرو بن سرج قال نا ابن وهب قال قال لی مالك اعلم انه لیس یسلم رجل حدث بکل ماسمع ولا یکون اماما وهو یحدث بکل ماسمع۔ (مقدمہ صحیح مسلم ص ۷۵)

ہم سے ابوطاہر احمد بن عمرو بن عبداللہ بن عمرو بن سرج نے روایت کی کہ ہم کو ابن وہب نے خبر دی کہ مجھ سے امام مالک نے فرمایا کہ تم خوب سمجھ لو کہ جو شخص جو کچھ سنتا ہے اور اس کی روایت کرتا ہے وہ خطا سے نہیں بچ سکتا اور وہ شخص امام نہیں ہو سکتا۔

حدثنی ابو الطاهر وحرملة بن یحییٰ قالا نا ابن وهب قال اخبرنی یونس عن ابن شهاب عن عبیدالله بن

ہم سے ابوالطاہر اور حرملہ بن یحییٰ نے روایت کی کہ ہم دونوں کو ابن وہب نے خبر دی کہ ہم سے یونس نے اور ان سے ابن شہاب نے اور ان سے

عبدالله بن عتبة ان عبدالله بن مسعود قال ما انت بمحدث قوماً حديثاً لاتبلغه عقولهم الاكان لبعضهم فتنة.
(مقدمہ مسلم ص ٧٦)

عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ نے روایت کی کہ عبداللہ بن مسعود فرماتے تھے کہ جب تم کسی قوم کے مبلغ عقل سے باہر حدیث بیان کرو گے تو وہ یقیناً ان میں سے بعض کے لیے فتنہ وفساد ہوگی۔

حدثني الفضل بن سهل قال حدثني عفان بن مسلم قال نا همام قال قدم علينا ابوداؤد الاعمىٰ فجعل يقول ثنا البراء وثنا زيدبن ارقم فذكرنا ذلك لقتادة فقال كذب ماسمع منهم انما كان ذلك سأل يتكفف الناس زمن الطاعون الجارف.
(مقدمہ مسلم ص ١٠٤)

مجھ سے فضل بن سہل نے بیان کیا کہ مجھ سے عفان بن مسلم نے روایت کی کہ ہم کو ہمام نے خبر دی کہ میرے پاس ابوداؤد اعمیٰ آئے اور کہنے لگے کہ مجھ سے براء نے حدیث بیان کی اور زید بن ارقم نے حدیث بیان کی تو میں نے اس کا ذکر قتادہ کے سامنے کیا انھوں نے کہا وہ جھوٹ کہتا ہے، اس نے ان میں سے کسی سے نہیں سنا، وہ تو طاعون جارف کے زمانے میں لوگوں سے بھیک مانگا کرتا تھا۔

اور درحقیقت قدما کے یہ اقوال بالکل دوراندیشی پر مبنی ہیں، کیوں کہ عادۃ ہر شخص جھوٹی سچی باتیں سنا کرتا ہے، اس لیے کثرت روایت سے کوئی شخص جھوٹ سے نہیں بچ سکتا، اسی طرح بہت سی حدیثیں عام لوگوں کے دائرہ عقل سے خارج ہوتی ہیں، اس لیے ان کے سامنے اس قسم کی حدیثوں کے بیان کرنے میں نہایت دقیق اور خطرناک غلطیوں کا احتمال ہے۔

ان ہی عام غلطیوں میں تدلیس اور واقعہ تاریخی کے خلاف روایتیں بھی ہیں

تدلیس کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اکثر لوگ روایت حدیث میں مجہول اور ضعیف ہوتے تھے، اس لیے اکثر رواۃ ان کے عیوب کی پردہ پوشی کے لیے ان کے نام کو کنیت اور کنیت کو نام سے بدل کر روایات کیا کرتے تھے تاکہ وہ لوگ جس نام اور کنیت کے ساتھ ضعیف مشہور ہیں، ان میں التباس اور اشتباہ پیدا ہو جائے، اسی طرح بہت سے لوگ واقعہ تاریخی کے خلاف روایتیں کیا کرتے تھے۔

حدثنا اسحاق بن ابراهيم الحنظلي قال سمعت بعض اصحاب عبدالله قال قال ابن المبارك نعم الرجل بقية لولا انه يكني الاسامي ويسمیٰ الكنى كان دهرا يحدث عن ابی سعيدالوحاظی فاذا هو عبدالقدوس۔ (مقدمہ مسلم ص ۱۷)	ہم سے اسحاق بن ابراہیم حنظلی نے روایت کی کہ میں نے عبداللہ بن مبارک کے بعض اصحاب سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ بقیہ کیا اچھا آدمی تھا اگر وہ ناموں کو کنیت اور کنیت کو ناموں سے نہ بدلتا، ایک زمانے تک وہ ابوسعید وحاظی سے روایت کرتا تھا آخر وہ عبدالقدوس نکلا۔
حدثنی عبدالله بن عبدالرحمن الدارمی قال سمعت ابانعيم وذكر المعلى بن عرفان فقال قال حدثنا ابووائل قال خرج علينا ابن مسعود بصفين فقال ابونعيم اتراه بعث بعدالموت۔	ہم سے عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی نے روایت کی کہ ہم نے ابونعیم سے معلیٰ بن عرفان کا ذکر سنا وہ فرماتے تھے کہ معلیٰ نے ہم سے ابووائل کی سند سے روایت کی کہ ہم پر حضرت ابن مسعود نے جنگ صفین میں چڑھائی کی راوی کا بیان ہے کہ ابونعیم نے اس سے

(مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۱۷، ۱۱۸) کہا کہ کیا تمہارے نزدیک وہ قبر سے اٹھ کر آئے تھے۔

مطلب یہ کہ معلّی نے ابووائل کی طرف اس حدیث کی غلط نسبت کی کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ نے حضرت عثمانؓ کی خلافت ختم ہونے سے تین برس پہلے ۳۲یا ۳۳ھ میں وفات پائی اور جنگ صفین حضرت علیؓ کے زمانے میں واقع ہوئی، اس لئے ابووائل جیسے ثقہ اور ضابط شخص ایسی خلاف عقل حدیث کیوں کر روایت کر سکتے تھے، ان تحقیقات کے بعد امام صاحب نے معنعن حدیث کی بحث چھیڑی ہے اور نہایت سختی کے ساتھ امام بخاری کے مذہب کو باطل کیا ہے، معنعن روایتوں کے متعلق محدثین کی رائیں نہایت مختلف ہیں، امام بخاری کا مذہب یہ ہے کہ راوی اور مروی عنہ میں ملاقات ثابت ہونی چاہیے، متاخرین نے اس سے بھی زیادہ سختی سے کام لیا ہے، چنانچہ قابسی کے نزدیک مطلق لقا بھی کافی نہیں بلکہ اچھی طرح ملاقات کرنی چاہیے، ابوالمظفر سمعانی نے امتداد صحبت کی قید لگائی، ابوعمرو الدانی المقری نے ان تمام شرائط پر اس شرط کا بھی اضافہ کیا ہے کہ دونوں میں روایت بھی ثابت ہو لیکن امام مسلم کے نزدیک صرف راوی اور مروی عنہ کی ہم عصری اور امکان ملاقات صحت روایت کے لیے کافی ہوسکتا ہے بشرطیکہ راوی مدلس نہ ہو۔(۱)

اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے،(۲) ان کا استدلال یہ ہے کہ ثبوت لقا کے بعد معنعن روایت عموماً متصل الاسناد سمجھی جاتی ہے، حالانکہ اس صورت میں ارسال کا احتمال قائم رہتا ہے، فرض کرو زید نے عمرو سے عمرو نے بکر سے روایت کی، زید اور عمر میں لقا بھی ثابت ہے، زید ثقہ بھی ہے لیکن پھر بھی یہ احتمال باقی ہے کہ زید اور عمرو کے درمیان میں کوئی واسطہ ہو، مگر صحت روایت پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا، اسی طرح امکان لقا کی صورت میں راوی کے غیر مدلس اور ثقہ ثابت ہونے کے بعد ارسال اور انقطاع کا شبہہ قابل

(۱) مقدمہ مسلم نووی ص ۳۲ و تدریب الراوی ص ۴۷ (۲) ایضاً۔

اعتبار نہیں لیکن درحقیقت امام صاحب کا یہ مذہب صحیح نہیں، کیونکہ راوی ثقہ اور غیر مدلس ہے اور لقا بھی ثابت ہے تو اس صورت میں ظن غالب ہے کہ وہ بلا واسطہ روایت کرتا ہے، کیونکہ ثقہ اور غیر مدلس راویوں کے حالات کے تتبع سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس طور پر حدیثیں اسی وقت روایت کرتے تھے، جب بذات خود سن لیتے تھے لیکن عدم لقا کی صورت میں اس قسم کا غلبہ ظن نہیں پیدا ہوسکتا، اب اس تحقیق کے بعد ہم مسلم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

صحیح مسلم اور اس کی خصوصیات: اوپر گذر چکا ہے کہ امام صاحب نے جس زمانے میں صحیح مسلم کو مرتب کیا، اس میں موضوع، ضعیف، غلط ہر قسم کی حدیثیں موجود تھیں، اس بنا پر انھوں نے صحیح کے مقدمہ میں احادیث کی تین قسمیں اور راویوں کے تین طبقے قرار دیئے ہیں۔

۱- وہ حدیثیں جو بالکل صحیح ہوں، اور ان کے رواۃ عموماً متقن، حافظ، ضابط اور ثقہ تسلیم کیئے گئے ہوں۔

۲- وہ حدیثیں جن کے رواۃ کو یا اعتبار ثقاہت اور حفظ واتقان پہلے قسم کے راویوں سے کم درجہ رکھتے ہوں۔

۳- وہ حدیثیں جن کے رواۃ کو عموماً یا اکثر محدثین نے مردود قرار دیا ہو۔

امام صاحب نے تصریح کی ہے، کہ میں پہلی قسم کی حدیثوں کے بعد دوسری قسم کی روایتوں کو درج کروں گا لیکن مجھ کو تیسری قسم کی حدیثوں سے کچھ تعلق نہیں (۱) اس تصریح کے موافق طبقہ ثالثہ کی روایتوں کے متعلق تو کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا تھا، البتہ اس مسئلہ میں اہل علم نہایت مختلف الرائے ہیں کہ صحیح مسلم میں دوسرے طبقہ کی حدیثیں درج ہوئیں یا نہیں۔

حافظ ابوعبداللہ حاکم اور حافظ ابوبکر بیہقی کا خیال ہے کہ امام صاحب کو موت نے دوسرے طبقے کی حدیثوں کے تخریج کا موقع نہیں دیا، اس لیے صحیح مسلم میں صرف طبقۂ اول

(۱) مقدمہ مسلم ص ۴۸ تا ۵۰۔

کی حدیثیں درج ہوسکیں، امام ابوسفیان کا (جو خود امام صاحب کے ہم صحبت ہیں، بیان ہے کہ امام صاحب نے ہر طبقہ کے لیے الگ الگ کتابیں مرتب کیں اور ان میں بالاستقلال ہر طبقہ کی روایتیں جمع کیں، چنانچہ انھیں کتابوں میں سے ایک صحیح مسلم بھی ہے۔

لیکن قاضی عیاض کی تحقیق یہ ہے کہ صحیح مسلم میں دونوں طبقہ کی حدیثیں موجود ہیں، البتہ فرق یہ ہے کہ دوسرے قسم کی حدیثیں متابعۃً یا شواہداً درج کی گئی ہیں، اسی طرح ان ابواب میں بھی اس قسم کی حدیثیں آ گئی ہیں، جن میں پہلے طبقہ کی حدیثیں دستیاب نہ ہوسکیں، اسی طور پر ان راویوں کی روایتوں سے بھی تعرض کیا گیا ہے، جن کو بعض بعض محدثین نے معتبر اور بعض نے غیر معتبر قرار دیا ہے یا یہ کہ ان کے رواۃ متہم بالبدعہ ہیں، جیسا کہ خود امام بخاریؒ نے کیا ہے، اس تحقیق کے موافق صحیح مسلم میں بجز ان حدیثوں کے جن کے رواۃ کو عموماً اکثر محدثین نے مردود قرار دیا ہے، ہر قسم کی روایتیں درج ہیں۔(۱)

بہر حال صحیح یعنی قسم اول کی حدیثوں میں امام صاحب کی شرط یہ ہے کہ حدیث متصل الاسناد ہو، شروع سے اخیر تک ثقہ راویوں کے ذریعہ سے مروی ہو، شذوذ وعلۃ سے خالی ہو، اس میں امام صاحب کی خصوصیت نہیں، بلکہ عموماً محدثین کے نزدیک جب کسی حدیث میں یہ تمام شروط پائے جاتے ہیں تو وہ صحیح تسلیم کی جاتی ہے، البتہ اختلاف اس وقت ہوتا ہے، جب ان شرائط میں سے کوئی شرط موجود نہ ہو، اور ان میں باہم اس شرط کے اشتراط میں اختلاف زیادہ ہو، زیادہ تر اختلاف ان روایتوں میں ہوتا ہے، جن میں ایک فریق کے نزدیک صحیح کے تمام شرائط موجود ہوں اور دوسرے کے نزدیک معدوم، مثلاً امام بخاری کے نزدیک ابوزبیر مکی، سہیل بن ابی صالح، حماد بن سلمہ وغیرہ میں صحیح کے تمام شرائط موجود نہیں، اس لئے وہ ان سے روایت نہیں کرتے، اس کے بخلاف یہ لوگ امام مسلم کے نزدیک قابل اعتبار ہیں، اسی طرح عکرمہ عمرو بن مرزوق سے امام بخاری روایت کرتے ہیں لیکن امام مسلم

(۱) مقدمہ نووی ص ۳۴ تا ۳۵۔

ان کو قابل روایت نہیں قرار دیتے، اس بنا پر امام مسلم نے امام بخاری کے چار سو چونتیس راویوں سے اور امام بخاری نے امام مسلم کے چھ سو پچیس راویوں سے روایت نہیں کی۔(۱)

اس موقع پر اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بخاری کو قوت اسناد کے لحاظ سے مسلم پر ترجیح ہے، تاہم مسلم میں بھی چند خصوصیتیں ایسی پائی جاتی ہیں، جو امام بخاری کے مقابل میں مرجحانہ حیثیت سے پیش کی جاتی ہیں، چنانچہ ہم ان کو ایک خاص ترتیب سے درج کرتے ہیں۔

۱۔حسن ترتیب: صحیح مسلم کو جن حیثیتوں سے ایک بے نظیر تصنیف کا خطاب دیا گیا ہے، ان میں ایک عام وصف اس کتاب کی طرز ادا اور حسن ترتیب ہے،(۲) امام بخاری نے اگرچہ روایتوں کی تنقید میں نہایت احتیاط اور نکتہ سنجی سے کام لیا ہے تاہم چونکہ وہ متون حدیث سے ایک خاص نتیجہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، اس لئے ان احادیث کو متعدد طریقوں سے مختلف بابوں میں درج کرتے ہیں، بلکہ اکثر احادیث کو ان ابواب میں درج کر دیتے ہیں جو بظاہر ان کے بالکل مناسب نہیں ہوتے، اس لحاظ سے بخاری میں اس قدر سوء ترتیبی پیدا ہوگئی ہے کہ متاخرین کے ایک گروہ نے بخاری کی ان روایتوں کا کلیۃً انکار کر دیا، جو نامناسب ابواب میں درج تھیں، کیوں کہ ابواب کے عدم تناسب اور غیر موزونی سے ان کی طرف خیال بھی مائل نہیں ہو سکتا تھا، اس کے بخلاف امام مسلم ہر حدیث کو ایک خاص اور مناسب باب میں درج کرتے ہیں، اور اسی کے ساتھ طرق مختلفہ اور اسانید کی تشریح اور رواۃ کے خاص خاص الفاظ کی طرف بھی اشارہ کرتے جاتے ہیں، اس لئے مسلم میں حسن ترتیب کے ساتھ احادیث کی تحقیق اور تفتیش کا موقع بھی نہایت آسانی سے مل سکتا ہے۔(۳)

۲۔امام بخاری چونکہ فقہی مسائل کے استنباط کی غرض سے احادیث پر مجتہدانہ نظر ڈالتے ہیں، اس لئے اسناد کے متصل ہونے کا بہت کم خیال رکھتے ہیں، چنانچہ بخاری میں

(۱) نووی ص ۱۵، ۱۶ (۲) ایضاً ص ۱۱ (۳) ایضاً ص ۱۴، ۱۵۔

غیر مسند روایتیں اور تعلیقات کی کثرت اسی کا نتیجہ ہے،(۱) اسی طرح وہ اجتہاد کے موقعوں پر اکثر ان احادیث کی طرف جو پہلے گذر چکی ہیں، نہایت خفیف اشارہ کرتے جاتے ہیں، اس بنا پر اس طریقہ سے اگر چہ ان کی دقت نظر اور اجتہادی قوت کا پتہ چلتا ہے اور وہ حدیثیں بھی درحقیقت متصل الاسناد اور صحیح ہوتی ہیں تاہم بظاہر ان کے متعلق بہت سے خدشے پیدا ہو جاتے ہیں، چنانچہ ابن حزم ظاہری نے حرمت ملاہی کا اسی بنا پر انکار کر دیا کہ بخاری میں اس کے متعلق جو حدیث مروی ہے، وہ منقطع یعنی معلق ہے لیکن امام مسلم نے چوں کہ احادیث کو محض محدثانہ حیثیت سے دیکھا ہے، اس لیے مسلم میں یہ ظاہری فروگذاشت بہت کم نظر آتی ہے، چنانچہ تحقیقی رائے کے مطابق اس میں صرف بارہ جگہ تعلیقات یعنی منقطع روایتیں پائی جاتی ہیں۔

۳- امام بخاری اہل شام سے جو روایتیں کرتے ہیں ان کے نام اور کنیت میں اکثر ان کو اشتباہ ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ نام اور کنیت کے لحاظ سے ان کو مختلف موقعوں پر دو شخص سمجھ جاتے ہیں لیکن امام مسلم کو کسی موقع پر اس قسم کا دھوکا نہیں ہوا، اس سے امام صاحب کی قوت ممیزہ اور وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔

۴- امام بخاری کی حدیثوں میں تقدیم و تاخیر، حذف اور اسقاط کی وجہ سے اکثر تعقید اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں لیکن مسلم کی نشست الفاظ میں کہیں اس قسم کی تعقید نہیں پائی جاتی، یہ سچ ہے کہ بخاری کی دوسری روایتوں کی اعانت سے تعقید کی یہ گرہ کھل جاتی ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلم کا طرز ادا بخاری کی بہ نسبت زیادہ صاف ہے، واضح اور قریب الفہم ہے، ان خصوصیتوں کے علاوہ امام صاحب نے عموماً صحیح مسلم میں حزم اور احتیاط کے جو پہلو اختیار کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- محدثین کی درسگاہ میں عموماً درس و تدریس کے دو طریقے معین تھے، ایک تو یہ

(۱) مقدمہ نووی ص ۱۶۔

کہ اساتذہ خود حدیثوں کو پڑھتے تھے اور ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی کرتے جاتے تھے، دوسرے یہ کہ اساتذہ اپنے مجموعہ حدیث کو خود شاگرد کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، وہ اس کو پڑھتا تھا اور شیخ کو محض تشریح مطلب کی زحمت گوارا کرنی پڑتی تھی، ان دونوں طریقوں سے اگرچہ احادیث کی صحت اور قطعیت پر مساویانہ اثر پڑتا ہے، تاہم راویانہ حیثیت سے یہ بحث آپڑتی ہے کہ دوسری قسم کی حدیثوں کو "حدثنا" کے ساتھ روایت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ امام بخاری امام زہری، یحییٰ بن سعید قطان وغیرہ کے نزدیک اس لفظ کے ساتھ روایت کر سکتے ہیں لیکن محدثین کا ایک بہت بڑا گروہ جن میں امام شافعیؒ، امام اوزاعیؒ، امام نسائی جیسے اکابرِ فن داخل ہیں، ان دونوں قسموں میں تفریق کرتا ہے اور دوسری قسم کی روایتوں کو صرف "اخبرنا" سے جائز رکھتا ہے، امام مسلم بھی انہی بزرگوں کے ہم خیال ہیں (۱) اس لیے ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ یہ طریقہ کس قدر حزم، احتیاط اور دوراندیشی پر مبنی ہے۔

اس مسئلہ کو طے کرنے کے لیے سب سے پہلے لفظ "حدیث اور خبر" کی حقیقت پر غور کرنا چاہیے، خبر ایک عام لفظ ہے کیوں کہ اس کے لیے بالذات یا بواسطہ محض اظہار واقعہ کی ضرورت ہے، اس کے بخلاف حدیث (گفتگو) ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا وجود بغیر اپنی زبان کے ہو ہی نہیں سکتا اور اگر کسی دوسرے ذریعہ سے ہو تو وہ محض ترجمانی یا اخبار ہوگا، اس بنا پر صرف انہی حدیثوں کو "حدثنا" سے روایت کر سکتے ہیں جن کو شیخ نے خاص اپنی زبان سے بیان کیا ہو، (۲)

۲- اکثر روایتوں میں راویوں کے الفاظ، متن حدیث کے بعض حروف اور رواۃ کے اوصاف اور نام ونسب میں اختلاف ہو جاتا ہے، اس لیے امام صاحب نہایت احتیاط کے ساتھ ہر ایک کی تفصیل کر دیتے ہیں، جن سے متعدد نتائج پیدا ہوتے ہیں، اولاً تو خود امام صاحب کی وسعت نظر اور صداقت کا پتہ چلتا ہے، دوسرے یہ کہ اختلاف لفظ کی وجہ سے

(۱) مقدمہ نووی ص ۲۱ (۲) ایضاً ص ۲۲۔

بعض موقعوں پر معنوی اختلاف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔(۱)

۳- محدثین کے زمانے میں علم حدیث کی وسعت نے بعض ایسے مجموعے پیدا کر دیے تھے جن میں صرف ایک ہی روایت اور ایک ہی اسناد سے تمام حدیثیں مروی ہوتی تھیں، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس قسم کے مجموعوں سے متعدد روایتیں کی جائیں تو بوقت روایت ہر حدیث کے لیے تجدید اسناد کی ضرورت ہوگی یا احادیث کے متحد الاسناد ہونے کی وجہ سے بعد کی، دوسری حدیثیں اسی پہلی اسناد پر محمول کر دی جائیں گی، وکیع بن جراح اور یحییٰ بن معین کے نزدیک تجدید اسناد کی کوئی ضرورت نہیں لیکن استاذ ابو اسحاق اسفرائینی جو اصول حدیث کے بہت بڑے امام ہیں، اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور ہر حدیث کو بقید اسناد روایت کرنا ضروری سمجھتے ہیں، امام مسلم بھی انھیں کے ہم زبان ہیں اور اپنی خاص روایتوں میں اس کی تفریق کر دیتے ہیں، چنانچہ صحیفۂ ابن ہمام سے جو روایتیں کی ہیں، اسی اصول پر کی ہیں (۲) اب غور کرنا چاہیے کہ امام صاحب کا یہ طرزِ عمل، کس قدر دور اندیشی پر مبنی ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تجدید اسناد سے راوی کی احتیاط اور دیانت کا ٹھیک پتہ چل جاتا ہے لیکن اس سے قطع نظر کر کے اگر عام طور پر اس طریقہ سے سہل انگاری کی جائے تو آئندہ چل کر رواۃ کی بے احتیاطی سے اکثر حدیثوں میں اختلاط پیدا ہو جائے، اس لیے صداقت اور تورع کے علاوہ امام صاحب کا یہ اصول بالکل عقل کے موافق ہے۔

۴- امام صاحب احادیث کی روایت میں اس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں کہ لغزش کا گمان بھی نہیں ہو سکتا، چنانچہ سلسلۂ روایت میں ایک موقع پر سلیمان بن بلال اور یحییٰ بن سعید کا نام آ گیا ہے لیکن چوں کہ امام صاحب نے اپنے شیخ سے ان راویوں کا نام بقید نسب نہیں سنا تھا، اس لیے سلسلۂ روایت میں ان کے نسب کا ذکر اس تصریح کے ساتھ کیا

(۱) مقدمہ نووی ص ۲۲ (۲) ایضاً۔

ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خود امام صاحب کا ذاتی اضافہ ہے، اس سے امام صاحب کی صداقت اور دیانت کا پتہ چلتا ہے۔(۱)

صحیح مسلم کا طریق روایت: ان اصول وشرائط ہی کے لحاظ سے صحیح مسلم ایک بے نظیر اور مستند تصنیف نہیں بلکہ جن ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے، ان میں بھی وہی قطعیت اور قوت پائی جاتی ہے جو اس کتاب کے لیے موزوں تھی، عام طور پر جن بزرگوں کی متصل الاسناد روایتوں کے ذریعہ سے اس کتاب نے شہرت پائی ہے ان کے نام یہ ہیں: ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن سفیان، ابواحمد محمد بن عیسیٰ الجلودی، ابوالحسین عبدالغافر فارسی، ابوعبداللہ محمد بن الفضل فراوی، امام فقیہ الحرمین ابوالفتح منصور بن عبدالمنعم فراری، ابواسحاق ابراہیم بن ابی حفص، عمرو بن مفر الواسطی، ان بزرگوں میں سب سے پہلے امام ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن سفیان نے خود امام مسلم سے روایت کی اس کے بعد علی سبیل الترتیب یہ مبارک سلسلہ امام ابواسحاق واسطی تک پہنچا، چنانچہ شیخ محی الدین نووی شارح مسلم نے جامع دمشق میں انہی سے پوری کتاب کی سماعت کی، ان بزرگوں میں فضل وکمال اور ثقاہت کے علاوہ جو بات خاص لحاظ کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ یہ تمام اصحاب نیشاپوری اور سن رسیدہ ہیں، ان میں اگرچہ امام ابواسحاق ابراہیم، واسطی ہیں لیکن چوں کہ انھوں نے ایک مدت تک نیشاپور میں اقامت کی ہے، اس لیے یہ بھی درحقیقت اسی سلسلہ میں داخل ہیں، طرق روایت کی اس خصوصیت نے مسلم کو اور بھی قطعی اور یقینی بنادیا ہے لیکن اس کے علاوہ اہل مغرب کے نزدیک یہ کتاب ابی محمد بن علی القلانسی کی روایت سے بھی مشہور ہے، ابومحمد قلانسی سے ابوبکر احمد بن یحییٰ کے توسط سے ابی العلا عبدالوہاب بن عیسیٰ نے روایت کی تھی، چنانچہ ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ نے مصر میں ان سے اس کتاب کی سماعت کی اور اس کو خاص اپنی روایت کے ذریعہ سے مغرب میں پہنچایا، مگر مغرب کے سوا یہ طریقۂ روایت عام طور پر نہ پھیل سکا، اس

(۱) مقدمہ نووی ص ۲۳۔

لیے تمام تر دارومدار ابواسحاق ابراہیم بن سفیان کی روایت پر آجاتا ہے۔(۱)

مسلم کے شروح وغیرہ: صحیح مسلم کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بھی ہوسکتا ہے کہ تعلیقات اور شروح کے علاوہ اہل علم کے ایک بہت بڑے گروہ نے جن میں وہ اصحاب بھی شامل ہیں، جنھوں نے مسلم کے اکثر شیوخ کی آنکھیں دیکھی تھیں، مسلم کے طرز پر نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں اور مسلم کی احادیث کو خاص اپنی اسانید سے جمع کیا، ان کتابوں میں اگرچہ مسلم کی خصوصیتیں نہ پیدا ہوسکیں، تاہم چوں کہ اسی پیمانہ پر لکھی گئی تھیں، اس لیے صحت اور قطعیت کی جھلک ان میں بھی نظر آتی ہے اور اسی کے ساتھ چوں کہ وہ لوگ اپنی خاص خاص اسانید سے روایتیں کرتے ہیں، اس لیے روایت کے متعدد طرق پیدا ہوجاتے ہیں اور اس ذریعہ سے علو اسناد کے ساتھ احادیث میں نہایت قوت آجاتی ہے، چنانچہ ان میں چند کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱- تخریج ابی جعفر احمد بن حمدان بن علی النیشا فوری المتوفی ۳۱۱ھ

۲- تخریج ابی نصر محمد بن محمد الطوسی الشافعی المتوفی ۳۴۴ھ

۳- مسند الصحیح لابی بکر محمد بن محمد بن رجا النیشا فوری الاسفرائینی المتوفی ۲۸۶ھ

۴- مختصر المسند الصحیح علی مسلم للحافظ ابی عوانہ یعقوب بن اسحاق الاسفرائینی المتوفی ۳۱۶ھ

۵- تخریج ابی حامد احمد بن محمد الشاذکی الفقیہ الشافعی الہروی المتوفی ۳۰۵ھ

۶- مسند صحیح لابی بکر محمد بن عبداللہ الجوزقی النیشا فوری الشافعی المتوفی ۳۸۸ھ

۷- المسند المستخرج علی کتاب مسلم للحافظ ابی نعیم احمد بن عبداللہ الاصبہانی المتوفی ۴۳۰ھ

۸- المخرج علی صحیح مسلم لابی الولید حسان بن محمد القرشی الفقیہ الشافعی ۳۴۹ھ(۲)

---

(۱) مقدمہ نووی ص ۱۱ (۲) مقدمہ نووی ص ۲۲ و ۲۷۔

شروح کی تعداد ان کتابوں سے بھی زیادہ ہے اور ان میں بعض شرحیں قاضی عیاض اور امام جلال الدین سیوطی جیسے ائمہ فن کے قلم سے نکلی ہیں لیکن آج کل عام طور پر شیخ محی الدین نووی کی شرح زیادہ مشہور اور عام طور پر متداول ہے، شروح کی کثرت کے ساتھ شراح کے سلسلے مین شافعی، مالکی، حنفی، غرض ہر مذہب کے لوگ داخل ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ ہر فرقہ بلا تخصیصِ مذہب مسلم کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔(۱)

مسلم پر اعتراضات: اہل فن نے تنقیدی حیثیت سے مسلم پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں، وہ اگر چہ اس کی خوبیوں کے مقابل میں اس قدر کم وقعت اور بے حقیقت ہیں کہ ان کی طرف خیال بھی نہیں مائل ہوسکتا تاہم چوں کہ اس سے اس امر کا اندازہ ہوگا کہ مسلم کی صحت اور خصوصیات کے مقابل میں جب اس زمانہ میں اس سے زیادہ نہ ہوسکا، تو اب اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا، اس لیے ہم خاص طور پر ان کا ذکر کرتے ہیں۔

مسلم پر ایک عام اعتراض جس میں امام بخاری بھی شامل ہیں، یہ ہے کہ امام مسلم اور بخاری نے بہت سی حدیثوں کو چھوڑ دیا جن کے راویوں کی سند سے وہ خود صحیحین میں روایت کرتے ہیں، یہاں تک کہ اکثر ان حدیثوں سے بھی اعراض کر گئے ہیں، جن کو صحابہ کی ایک جماعت نے خود آنحضرت ﷺ سے روایت کی تھی اور صحابہ کے بعد وہ حدیثیں نہایت صحیح طور پر مروی ہوئیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ صحیفہ ابن ہمام کو یہ دونوں بزرگ بالاتفاق صحیح تسلیم کرتے ہیں لیکن روایتوں میں خاص خاص حدیثیں منتخب کر لیتے ہیں، حالانکہ صحت اور قطعیت میں وہ تمام مساوی ہیں، اس لحاظ سے بخاری اور مسلم کو احادیث صحیحہ کا کامل مجموعہ نہیں کہا جاسکتا، اس کے علاوہ مسلم نے ضعفا اور طبقہ ثانیہ کے رواۃ سے بھی روایتیں کی ہیں، حالانکہ صحیح مسلم میں طبقۂ اولیٰ کی روایتوں کا التزام کیا گیا ہے۔(۲)

امام ابوالحسن دارقطنی نے خاص اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا

(۱) اس سلسلہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کی فتح الملہم بھی قابل ذکر ہے (۲) مقدمہ نووی ص ۲۴۔

نام الاستدراکات والتتبع ہے، اس میں انھوں نے استقرا کر کے صحیحین کی ان روایتوں کی تعداد دو سو بتائی ہے(۱) لیکن یہ اعتراضات درحقیقت محض عامیانہ اعتراضات ہیں کیوں کہ بخاری اور مسلم کو اگر احادیث صحیحہ کا مجموعہ تسلیم کیا گیا ہے تو صرف اس بنا پر تسلیم کیا گیا ہے کہ ان میں جو حدیثیں درج ہیں وہ تمام صحیح اور منقح ہیں، اس لیے اگر بہت سی صحیح حدیثیں، ان کتابوں میں نہ درج ہو سکیں تو ان پر کوئی الزام نہیں آ سکتا کیوں کہ ان میں تمام صحیح حدیثوں کا حصر مقصود نہیں، اسی طرح مسلم پر ضعف رواۃ اور عدم صحت کا الزام بھی نہیں دیا جا سکتا، کیوں کہ انھوں نے اس قسم کی روایتوں کو متابعات اور شواہد کے سلسلہ میں قوت اسناد کے لیے درج کر دیا ہے، اس لیے اس ذریعہ سے اصل حدیث پر کوئی حرف نہیں آ سکتا اور اس کے ساتھ اکثر راویوں کا ضعف امام صاحب کی روایت کے بعد ظاہر ہوا ہے، چنانچہ احمد بن عبدالرحمٰن بن وہب اسی قسم کے راوی ہیں، اس لیے اس ضعف کا اثر خود امام صاحب کی روایت پر نہیں پڑ سکتا۔

ان اعتراضات سے قطع نظر کر کے جوبات خاص لحاظ کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ معنعن روایتوں کے متعلق اگرچہ امام صاحب کا مذہب صحیح نہیں، تاہم اس کا اثر خود ان کی کتاب پر کچھ نہیں پڑ سکتا، کیوں کہ طرق روایت کی کثرت سے صحیح مسلم میں کوئی ایسی حدیث نہیں مل سکتی جس میں اس غلط اصول پر عمل کیا گیا ہو، چنانچہ نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

وان کنا لانحکم علی مسلم بعملہ فی صحیحہ بھذا المذھب لکونہ یجمع طرقاً کثیرۃ یتعذر معھا وجود ھذا الحکم الذی جوزہ۔(۲)

بہر حال ان معمولی اعتراضات کی بنا پر مسلم کی صحت، تنقید اور احتیاط کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

---

(۱) مقدمہ نووی ص ۲۷ (۲) مقدمہ نووی ص ۱۴۔

امام ابن ماجہ رحمہ اللہ

(متوفی ۲۷۳ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوعبداللہ کنیت، ابن ماجہ لقب اور سلسلۂ نسب یہ ہے؛ محمد بن یزید بن عبداللہ۔(۱)

ماجہ کو بعض لوگوں نے آپ کے دادا اور بعض نے آپ کی ماں کا نام بتایا ہے لیکن علمائے محققین کے نزدیک آپ کے والد کا لقب تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

"ماجہ لقب پدر ابوعبداللہ است نہ لقب جداو نہ نام مادر او۔"

قزوین کے مشہور مورخ خلیلی کا بیان ہے کہ "ماجہ یزید کا عرف تھا" اور محدث رافعی لکھتے ہیں "ان کا نام محمد بن یزید ہے اور ماجہ یزید کا لقب ....اور ان کا شجرۂ نسب اس طرح بھی بیان کیا جاتا ہے "محمد بن یزید بن ماجہ" مگر پہلی بات زیادہ ثابت ہے۔"(۲)

ولادت: ان کا خود بیان ہے کہ میں ۲۰۹ھ میں پیدا ہوا۔(۳)

خاندان ووطن: ماجہ سے جو دراصل ماہ یا ماہچہ کا معرب ہے، ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابن ماجہ عجمی نژاد تھے لیکن عرب کے مشہور قبیلہ ربیعہ سے ان کا رشتہ مُوالات تھا، اس لیے ربعی اور مولیٰ ربیعہ کہلاتے ہیں، عراق، عجم وایران کے مشہور اور مردم خیز شہر قزوین کو آپ کے وطن

(۱)بستان المحدثین ص۱۱۲ (۲) عجالۂ نافعہ مع فوائد جامعہ ص۲۳ والبدایہ والنہایہ ج۱۱ ص۵۲ وتہذیب ج ۹ ص۵۳۲ (۳)وفیات الاعیان ابن خلکان ج۲ ص۲۸۴ وشروط الائمۃ الستہ ص۹۔

ہونے کا فخر حاصل ہے، اس نسبت سے آپ قزوینی کہے جاتے ہیں۔(۱)

اساتذہ اور شیوخ: ان کے شیوخ کی تعداد بکثرت ہے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تین سو سے زیادہ شیوخ سے استفادہ کیا تھا، امام مالک اور لیث کے تلامذہ سے بھی آپ کو روایت کرنے کا شرف حاصل ہے، حافظ ابوالقاسم علی بن حسن متوفی ۵۷۱ھ نے ائمہ صحاح کے شیوخ پر ایک مستقل رسالہ تحریر کیا تھا، اس میں ابن ماجہ کے اساتذہ کا بھی ذکر ہے، چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں۔

ابراہیم بن منذر حزامی م ۲۳۶ھ، ابوبکر بن ابی شیبہ م ۲۳۵ھ، جبارہ بن مغلس م ۲۴۱ھ، حمدون بن عمارہ بغدادی، داؤد بن رشید م ۲۳۹ھ، سہل بن اسحاق بن ابراہیم واسطی، عبداللہ بن محمد معروف بحافظ ابوبکر بن ابی الدنیا بغدادی، عبداللہ بن معاویہ م ۲۴۳ھ، علی بن حسن جرثمی، علی بن سعید نسائی، محمد بن احمد جوز جانی، محمد بن رمح م ۲۴۲ھ، محمد بن سعید بغدادی، محمد بن عبداللہ بن نمیر م ۲۳۴ھ، ابوجعفر محمد بن ہارون بغدادی اور ہشام بن عماد م ۲۴۵ھ۔(۲)

تلامذہ: ابن ماجہ کے بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن دینار جرشی، احمد بن ابراہیم قزوینی، ابوالطیب احمد بن روح شعرانی، احمد بن محمد مدنی، اسحاق بن محمد قزوینی، جعفر بن ادریس، ابوبکر حامد ابہری، حسین بن علی، سعدون، سلیمان بن یزید قزوینی، ابوالحسن علی بن ابراہیم قطان قزوینی، علی بن سعید غدالی، محمد بن عیسیٰ صفار۔(۳)

رحلت وسفر: امام ابن ماجہ کے زمانہ میں محدثین اطراف عالم میں پھیلے ہوئے تھے، اس لیے انھوں نے حصول حدیث کے لئے مختلف ملکوں کا سفر کیا، خراسان، عراق، حجاز، مصر، شام،

(۱) وفیات الاعیان ج ۴ ص ۲۷۹ و المنتظم ابن جوزی ج ۵ ص ۹۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۰ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ (۳) ایضاً۔

بصرہ، کوفہ، مکہ، رے اور بغداد وغیرہ کی تصریح کتابوں میں موجود ہے، شروع میں اکیس، بائیس سال کی عمر تک اپنے وطن قزوین ہی میں جو خود علم وفن کا گہوارہ اور علما ومحدثین کا بڑا مرکز تھا، حدیث اور دوسرے علوم کی تکمیل فرماتے رہے، ۲۳۰ھ میں علم کی تلاش وجستجو میں اپنے وطن سے باہر نکلے۔(۱)

حدیث میں امتیاز: انھوں نے جب آنکھیں کھولیں تو اس وقت ہر طرف حدیث کے درس وتدریس اور اس کی کتابت وتحریر کا کام سرگرمی سے جاری تھا اور اسی کی طلب تکمیل کو فضیلت وکمال کا اصلی معیار خیال کیا جاتا تھا، اس لئے ان کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بھی یہی فن بنا اور اکابر حفاظ ومحدثین کی کثرت کے باوجود انھوں نے اس میں اتنا امتیاز وکمال اور ایسی شہرت حاصل کی کہ ان کی علمی جلالت کا سکہ بیٹھ گیا اور بڑے بڑے ائمہ فن ان کی عظمت وبرتری کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے، اس کا اندازہ درج ذیل اقوال سے ہوتا ہے۔

اعتراف کمال: حافظ ابویعلی خلیل فرماتے ہیں، وہ ایک بلند پایہ معتبر اور لائق حجت محدث تھے، ان کی عظمت وثقاہت پر اتفاق ہے، ان کو فن حدیث سے پوری واقفیت تھی اور وہ اس کے جلیل القدر حافظ تھے، ابوالقاسم رافعی فرماتے ہیں، کہ ''ائمہ مسلمین میں ابن ماجہ بھی ایک بڑے معتبر امام ہیں، ان کی قبولیت پر سب کا اتفاق ہے'' علامہ ابن جوزی تحریر فرماتے ہیں ''وہ حدیث وتاریخ اور تفسیر کے ممتاز ماہر تھے'' علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں ''وہ فن حدیث کے امام اور اس کے متعلقات پر بڑا عبور رکھتے تھے'' علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ''ابن ماجہ عظیم الشان حافظ وضابط صادق القول اور وسیع العلم تھے'' علامہ ابن اثیر قمطراز ہیں کہ وہ ذی عقل، صاحب علم اور امام حدیث تھے، جمال الدین تغری بردی لکھتے ہیں ''ابن ماجہ امام، حافظ، حجت اور ناقد حدیث تھے...... ان کو متعدد فنون میں مہارت حاصل تھی'' ابن ناصر الدین،

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۰ وتہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ وخلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۳۴۔

ارشاد فرماتے ہیں "مشہور علمائے اسلام میں ایک ابن ماجہ بھی ہیں.......... وہ حدیثوں کے حافظ اور اس میں نہایت معتبر اور بلند پایہ شخص تھے" حافظ ابن حجر عسقلانی کا بیان ہے کہ "وہ صاحب سنن، حافظ حدیث اور امام فن تھے"(۱)

ان اقوال سے ان کے محدثانہ کمال وعظمت کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

فقہی مسلک: ان کے فقہی مسلک کے بارے میں یقینی طور سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی، گمان غالب یہ ہے کہ وہ بھی عام محدثین کی طرح کسی خاص مذہب فقہ سے وابستہ نہ رہے ہوں گے، البتہ اہل عراق کے مقابلہ میں ان کا رجحان اہل حجاز کی طرف زیادہ تھا، اس کا اندازہ ان کی سنن سے بھی ہوتا ہے، اسی بنا پر بعض علما ان کو حنبلی اور شافعی کہہ دیتے ہیں جو صحیح نہیں ہے، علامہ ابن طاہر جزائری فرماتے ہیں "ابن ماجہ وغیرہ علمائے حدیث ائمہ مجتہدین میں سے کسی کے مقلد نہیں تھے، البتہ فقہا محدثین امام شافعی، احمد اور اسحاق بن راہویہ وغیرہ کے قول کی طرف میلان رکھتے تھے"۔(۲)

اعمال واخلاق: امام ابن ماجہ کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں، اس لئے ان کے اعمال واخلاق کے بارہ میں کوئی تفصیل نہیں بیان کی جا سکتی، حافظ ابن کثیر نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ "وہ علم وفضل کی طرح تدین وتقویٰ اور زہد وصلاح کے بھی جامع تھے، احکام شریعت کی شدت سے پابندی کرتے تھے، اور اصول وفروع میں پورے طور پر متبع سنت تھے، اس پر خود ان کی سنن شاہد ہے"۔(۳)

متعلقین اور اہل خاندان: ان کے خاندانی حالات اور ازواج واولاد کی بھی تفصیل نہیں ملتی، صرف ان کے ایک صاحبزادے عبداللہ اور دو بھائیوں ابوبکر، اور ابوعبداللہ کا محمد بن

(۱) وفیات الاعیان خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱، المنتظم فی اخبار الملوک والامم ج ۵ ص ۹۰ کامل ابن اثیر مطبوعہ لیڈن ج ۷ ص ۲۹۸ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۱۶۴ وغیرہ (۲) توجیہ النظر ص ۱۸۵ (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲۔

طاہر نے ان کی وفات اور تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے۔(۱)

وفات: امام ابن ماجہ نے دوشنبہ ۲۲ رمضان المبارک ۲۷۳ھ کو ۶۴ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا دوسرے دن سہ شنبہ کو تجہیز و تکفین ہوئی،(۲) ایک روایت یہ بھی ہے کہ ۲۷۵ھ میں وفات پائی، ان کے سانحہ وفات پر بعض شعرا نے نہایت پر درد مرثیے کہے، محمد بن اسود قزوینی کے مرثیہ کا پہلا شعر یہ ہے:

لقد اوهى دعائم عرش علم وضعضع ركنه فقد ابن ماجه

ترجمہ: ابن ماجہ کی وفات سے علم کے پایہ تخت کے ستون ڈھ گئے۔

یحییٰ بن زکریا طرائفی کہتا ہے:

ايا قبر ابن ماجة غثت قطرا ملثا بالغداة وبالعشى (۳)

ترجمہ: اے ابن ماجہ کی قبر تو صبح و شام بارانِ رحمت سے سیراب ہو۔

تصنیفات: ابن ماجہ کی علمی و تصنیفی یادگاروں میں تین اہم اور مشہور تصنیفات ہیں۔

تفسیر: اس کی اہمیت کا اندازہ علامہ ابن کثیر کے اس بیان سے ہوتا ہے:

ولابن ماجة تفسير حافل۔ یعنی ابن ماجہ کی ایک ضخیم و جامع تفسیر ہے۔

علامہ سیوطی نے دور صحابہ و تابعین کے بعد کی تفسیروں کا تذکرہ کرنے کے بعد تفسیر ابن جریر کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک اہم ماثوری و منقولی تفسیر اور ابن جریر کی طرح اس میں بھی احادیث و آثارِ صحابہ و تابعین کو بالاسناد نقل کیا گیا تھا۔

تاریخ: ان کو تاریخ میں بھی درک تھا اور تاریخ میں بھی کوئی کتاب لکھی تھی، ابن خلکان نے تاریخ ملیح اور حافظ ابن کثیرؒ نے تاریخ کامل کے وصف سے اس کا ذکر کیا ہے، حافظ ابوزرعہ

(۱) شروط الائمۃ الستہ ص ۹ (۲) ایضاً (۳) تہذیب ج ۹ ص ۵۳۱۔

فرماتے ہیں کہ ''میری نظر سے قزوین میں ابن ماجہ کی تاریخ گذری تھی، یہ دراصل عہد صحابہ سے لے کر مصنف کے زمانہ تک کی تاریخ اور بلاد اسلامیہ اور راویان حدیث کے حالات پر مشتمل ہے''(۱) اس سے اس تاریخ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، مگر افسوس ہے کہ یہ دستبرد زمانہ سے معدوم ہوگئی۔

سنن: ابن ماجہ کا سب سے بڑا علمی و تصنیفی اور دینی کارنامہ ان کی ممتاز اور شہرۂ آفاق تصنیف سنن ہے، اس کی بدولت ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، موجودہ کتب حدیث میں یہ ایک اہم اور متداول کتاب خیال کی جاتی ہے اور اکثر مدارس کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

ترتیب وتعداد احادیث: عام کتب سنن کی طرح اس میں بھی ایمانیات سے وصایا تک کے جملہ ابواب فقہی ترتیب کے مطابق درج ہیں اور یہ ۳۲ کتب، ۱۵۰۰ ابواب اور چار ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے۔(۲)

رواۃ: رافعی کا بیان ہے کہ ابن ماجہ سے ان کے جن تلامذہ نے سنن کی روایت کی ہے ان میں چار اشخاص زیادہ مشہور ہیں:

۱-ابوالحسن قطان، ۲-سلیمان بن یزید، ۳-ابوجعفر محمد بن عیسیٰ، ۴-ابوبکر حامد ابہری۔ حافظ ابن حجر نے اس فہرست میں دو ناموں کا اور اضافہ کیا ہے سعدون، ابراہیم بن دینار (۳) ان تمام رواۃ میں حافظ ابوالحسن قطان کی روایت کو زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''ابوالحسن قطان کہ صاحب روایت سنن اوست از جملہ شاگردان رشید اوست۔''(۴)

سنن کا جو نسخہ ابوالحسن سے مروی ہے اس کی بہت سی روایتیں خود ان کی سند سے

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲ وشروط الائمہ الستہ ص ۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۰ وبستان المحدثین ص ۱۱۲ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲ (۳) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۲ (۴) بستان المحدثین ص ۱۱۲۔

بھی منقول ہیں۔

اہمیت: سنن ابن ماجہ، حدیث کی ان چھ مشہور اور معتبر کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جو صحاح ستہ کہلاتی ہیں، علمائے فن کو اعتراف ہے کہ "یہ اسلامیات کی عظیم ترین اور حدیث کی امہات کتب میں ہے" حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ "سنن سے ابن ماجہ کے علمی تبحر اور کثرت معلومات کا پتہ چلتا ہے" حافظ ابوزرعہ جیسے باکمال محدث کا ارشاد ہے کہ "اگر یہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی تو حدیث کی سب یا اکثر کتابیں بالکل معطل ہو جائیں گی" حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ "یہ نہایت جامع وجید کتاب اور بے شمار ابواب وغرائب پر مشتمل ہے" سنن ابن ماجہ کی اس عظمت واہمیت کی بنا پر اس کو ہر زمانہ میں نہایت مستند اور قابل حجت خیال کیا گیا ہے، رافعی فرماتے ہیں "محدثین نے اس کو صحیحین اور سنن ابی داؤد وسنن نسائی کے ساتھ شامل کیا ہے اور اس کے مرویات کو حجت ومستند قرار دیا ہے۔" (۱)

خصوصیات: سنن ابن ماجہ کو صحاح میں آخری درجہ پر رکھا گیا ہے تاہم اس میں بھی بعض اہم خصوصیات پائے جاتے ہیں۔

۱- اس میں بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جن سے صحاح ستہ کی دوسری کتابیں خالی ہیں، علمائے فن نے اس کی اسی خصوصیت کی بنا پر اس کو صحاح میں شامل کیا ہے۔ (۲)

۲- حسن ترتیب وتبویب کے لحاظ سے تمام کتب حدیث اور صحاح میں اس کو امتیاز حاصل ہے، یعنی جس خوبی کے ساتھ احادیث کو ابواب کے اندر بلا تکرار، اختصار کے ساتھ اس میں نقل کیا گیا ہے، دوسری کتابیں اس سے خالی ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

> "فی الواقع از حسن ترتیب وسرد احادیث بے تکرار آنچہ کہ ایں کتاب دارد ہیچ از کتب ندارد۔" (۳)

---

(۱) شذرات ج ۲ ص ۱۶۴ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۲ وتذکرہ ج ۲ ص ۲۱۰ وتہذیب ج ۲ ص ۵۳۱ (۳) بستان ص ۱۱۲۔

اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''اس مفید ترین کتاب کی تبویب فقہی اعتبار سے نہایت عمدہ ہے۔''

۳- عدم تکرار اور اختصار کے باوجود سنن کی ابن ماجہ نہایت جامع کتاب ہے اور دوسری کتابوں کی بہ نسبت زیادہ مسائل و معلومات پر مشتمل ہے، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں، ابن ماجہ کی کتاب سنن، و احکام کی حیثیت سے بہت عمدہ اور جامع ہے، غالباً اسی خوبی کی بنا پر حافظ ابوزرعہ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس کے سامنے حدیث کے دوسرے جوامع اور مصنفات بے کار ہو جائیں گے، ان کا یہ خیال بڑی حد تک صحیح ثابت ہوا، چنانچہ حدیث کی بہت سی کتابیں جو صحت و جودت کے لحاظ سے اس سے زیادہ اہم اور بلند پایہ ہیں لیکن ان کو اس کے جیسی شہرت و مقبولیت نہیں حاصل ہو سکی، حضرت شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ ''اگر کسی شخص کو بہت زیادہ متون پر مشتمل کتاب کی تلاش ہو تو اس کو سنن ابن ماجہ کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس وصف میں وہ دوسری کتب حدیث سے منفرد و ممتاز ہے'' (۱)

۴- سنن ابن ماجہ میں ۵ ثلاثی روایتیں ہیں، اس خصوصیت میں اس کو صحیح بخاری کے سوا تمام کتب صحاح پر فوقیت حاصل ہے۔

۵- کتب حدیث کی عام خصوصیت یعنی متعدد اور گوناگوں تشریحات اور حدیثوں کے متعلق مختلف قسم کی وضاحتیں اس میں بھی موجود ہیں بعض حدیثوں کے بارے میں اس قسم کی تصریح بھی ہے کہ ''یہ فلاں شہر والوں کی حدیث ہے۔''

کیا سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل نہیں ہے؟: اگر چہ جمہور اور متاخرین علما کے نزدیک یہ صحاح ستہ میں شامل ہے تاہم بعض لوگوں نے اس کے بجائے مؤطا امام مالک اور سنن دارمی کو یہ درجہ دیا ہے، اس لیے اس مسئلہ کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے:

شروع میں صرف صحیحین اور سنن ابی داؤد و سنن نسائی کو حدیث کی اہم ترین

(۱) حواشی سعدی ص ۱۵۔

کتابیں خیال کیا جاتا تھا، حافظ ابن السکن اور حافظ ابن مندہ وغیرہ سے اس کی تصریح منقول ہے،(۱) اس کے بعد حافظ ابو طاہر سلفی نے جامع ترمذی کو بھی ان کتابوں میں شامل کرلیا، ساتویں صدی ہجری کے نامور محدثین میں علامہ ابن صلاح اور علامہ نووی نے بھی ان ہی پانچوں مصنفین کی وفیات ذکر کی ہیں لیکن غالباً پہلی مرتبہ محمد بن طاہر مقدسی م ۵۰۷ھ نے جو شروط الائمۃ الستۃ اور اطراف الکتب الستۃ کے مصنف ہیں، امام ابن ماجہ کو بھی مصنفین صحاح کے زمرہ میں شامل کرلیا اور حافظ عبدالغنی مقدسی م ۶۰۰ھ نے پانچوں کتابوں کی طرح اس کے رجال کو بھی مدون کیا، ان کے بعد جمہور متاخرین کے نزدیک یہ روایت چل نکلی، علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ ''ابن طاہر کے بعد مصنفینِ اطراف و رجال نے ان کی متابعت کی'' (۲) اسی بنا پر ساتویں صدی ہجری کے نامور محدث نووی کے متعلق جنھوں نے ابن ماجہ کی سنن کو نظر انداز کر دیا تھا حیرت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں (۳) ''مصنف نے سنن ابن ماجہ کو صحاح میں داخل نہیں کیا حالاں کہ خود ان کے عہد میں اور اس کے بعد کا چھ اہم اور بنیادی کتابوں میں شمار ہونا شہرت پذیر ہو چکا تھا'' اس سلسلہ میں دوسرے علما اور ائمہ فن کے اقوال یہ ہیں:

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ''صحاح ستہ کی ایک کتاب سنن ابن ماجہ بھی ہے'' ابن عماد نے بھی اس قول کو نقل کیا ہے، علامہ ابن ناصر الدین فرماتے ہیں ''ابن ماجہ کی سنن اسلامیات کی بنیادی کتابوں میں ہے'' علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں ''ابن ماجہ اُس سنن کے مصنف ہیں جو صحاح ستہ میں شامل ہے۔'' ابوالقاسم رافعی فرماتے ہیں ''محدثین نے سنن ابن ماجہ کو صحیحین اور سنن ابی داؤد و سنن نسائی کے ساتھ شامل کیا ہے'' صاحب مرآۃ الجنان لکھتے ہیں '' کہ ان کی کتاب ان چھ کتابوں میں سے ایک ہے جس کو بنیادی کتب اور امہات فن میں شمار کیا جاتا ہے'' حافظ عبدالقادر قرشی کا بیان ہے کہ ''جب محدثین کسی روایت کے

(۱) شروط الائمۃ الستۃ ص ۸ (۲) تدریب الراوی ص ۳۰ (۳) ایضاً۔

متعلق رواۃ الائمۃ الستۃ کہتے ہیں تو اس سے امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کو مراد لیتے ہیں'' حافظ سخاوی لکھتے ہیں ''علما نے سنن ابن ماجہ کو موطا پر اس لیے مقدم اور صحاح میں شامل کیا ہے کہ اس میں کتب خمسہ سے بہت سی روایتیں زیادہ ہیں'' شارح سندی ارشاد فرماتے ہیں'' عام متاخرین اس بات کے حق میں ہیں کہ ان کی سنن صحاح کی چھٹی کتاب ہے'' شاہ عبدالعزیز صاحب رقمطراز ہیں کہ ''ابن ماجہ جن مفید اور نفع بخش کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں یہ سنن بھی ہے جو صحاح ستہ میں ہے'' نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں'' شاہ عبدالحق صاحب دہلوی کا بیان ہے کہ ''ابن ماجہ کی سنن کا شمار ان اہم ترین اسلامی وحدیثی کتابوں میں ہوتا ہے جن کو اصول ستہ، کتب ستہ اور صحاح ستہ کہا جاتا ہے، میں اس میں امہات ستہ کا اضافہ کرتا ہوں اور جب محدثین رواہ الجماعۃ کہتے ہیں تو اس سے یہی چھ اشخاص مراد ہوتے ہیں اور جب رواہ الاربعہ کہتے ہیں تو ان کی مراد شیخین کے بجائے، امام ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ سے ہوتی ہے۔(۱) دوسرے علماءِ تراجم وفہرست نے بھی اس کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے۔(۲)

لیکن علما کی ایک جماعت کو موطا کو صحاح کی چھٹی کتاب ماننے پر اصرار ہے، رزین بن معاویہ عبدری م ۵۲۵ھ نے کتاب التجرید للصحاح والسنن میں کتب خمسہ اور موطا امام مالک کی روایتیں درج کی ہیں، ابن اثیر جزری م ۶۰۶ھ نے بھی اپنی کتاب جامع الاصول میں اسی کی تقلید کی ہے، حافظ ابوجعفر بن زبیر غرناطی کہتے ہیں'' ان سب میں بہتر وہ کتابیں ہیں جن کے اعتماد پر مسلمانوں کا اتفاق ہے اور یہی کتب خمسہ اور موطا ہے جو تصنیف میں ان پر مقدم اور مرتبہ میں کمتر نہیں، عبدالغنی نابلسی کا بیان ہے کہ اہل

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۶۴ والباعث الحثیث ص ۹۰ ومرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۸۸ ومقدمہ شرح سندی باب ذکر الدیلم وفضل قزوین فتح المغیث ص ۳۳ وبستان المحدثین ص ۱۱۲ والحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۱۱۰۔ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۴ و اعلام ج ۳ ص ۱۰۰۲۔

مشرق کے نزدیک چھٹی کتاب سنن ابن ماجہ اور اہل مغرب کے نزدیک امام مالک کی موطا ہے۔(۱)

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنن ابن ماجہ کے مقابلہ میں موطا کے ماننے والوں کی تعداد بہت کم ہے، اس لیے یہ قول مرجوح سمجھا جائے گا لیکن جہاں تک موطا کی صحت وجودت اور اہمیت وعظمت کا سوال ہے، اس میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں، وہ حدیث کی طرح فقہ، آثار اور فتاوائے صحابہ وتابعین سب کا مجموعہ ہے اور مرفوع، موقوف، مرسل ومسند ہر قسم کی روایتوں پر مشتمل ہے، اس لیے اس کی موجودہ شکل وصورت میں اس کا حدیث کی مروج ومتداول کتابوں سے مقابلہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس کا جو مقام ومرتبہ ہے اس میں حدیث کی کوئی کتاب بھی اس کی ہمسری نہیں کرسکتی، اس کی قدامت، عظمت اور صحت کی وجہ سے اکثر محققین علمانے صحیحین پر بھی اس کو فوقیت دی ہے، خطیب کے نزدیک وہ تمام جوامع ومسانید سے بڑھ کر ہے،(۲) شاہ ولی اللہ صاحب کا بھی یہی خیال ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحب فرماتے ہیں ''شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی اور ان لوگوں کے نزدیک جو ان کے ہمنوا ہیں، حدیث وفقہ میں صحیح ترین کتاب موطا ہے، پھر بخاری پھر مسلم، شاہ صاحب نے شرح موطا یعنی مصفیٰ کے شروع مین روئے زمین کی تمام کتابوں پر موطا کی ترجیح کے سلسلہ میں بڑی لمبی بحث کی ہے اور یہی صحیح ہے۔''(۳)

سنن ابن ماجہ کو موطا پر مقدم کرنے کی وجہ اس کی مزید افادیت ہے جو بہت سی زائد حدیثوں کے درج کرنے سے اس میں پیدا ہوگئی ہے، ورنہ صحت وقوت کے اعتبار سے سنن ابن ماجہ کیا صحاح ستہ کی کوئی کتاب بھی موطا کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جاسکتی۔

رہا سنن دارمی کا معاملہ تو اس کے قائل صرف حافظ صلاح الدین خلیل علائی

---

(۱) بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۲۴ (۲) تدریب الراوی ص ۳۶ (۳) مسک الختام شرح بلوغ المرام ص ۱۸۔

م ۷۱۶ھ ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ ''اس میں ضعیف رواۃ اور شاذ ومنکر روایتیں بہت کم ہیں، اس لیے سنن ابن ماجہ کے بجائے اس کو صحاح کی چھٹی کتاب قرار دینا بہتر ہے۔''(۱) حافظ ابن حجر کی جانب بھی اس قسم کا قول منسوب کیا جاتا ہے، مگر ان سے اس کے برعکس باتیں بھی منقول ہیں، محمد بن اسماعیل امیر یمانی کا بیان ہے کہ وہ مؤطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شامل کرتے تھے، اس کے علاوہ شارح سنن علاؤالدین مغلطائی پر جن کے قول پر علامہ خلیل علائی کی رائے کی بنیاد ہے، ابن حجر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''دارمی کو مغلطائی سے پہلے کسی نے صحاح میں شامل نہیں کیا اور وہ بھی اس بنیاد پر کہ انھوں نے حافظ منذری کے قلم سے یہی لکھا دیکھا تھا۔''(۲) حافظ ابن حجر کے ان مختلف اقوال کی بنا پر ان کو علائی کا موید نہیں کہا جا سکتا لیکن علائی کے قول کا دارومدار مغلطائی کے ایک خیال پر مبنی ہے، جس کے متعلق محمد امیر یمانی لکھتے ہیں کہ علائی کو مغلطائی کے قول سے مغالطہ ہوا ہے حالاں کہ مغلطائی کے قول میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ وہ سنن دارمی کو صحاح ستہ میں داخل کرتے تھے، بلکہ اصلی احتمال یہ ہے کہ انھوں نے اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے کہ اس کے رجال وروایات اکثر وبیشتر صحیح ہیں، سنن ابن ماجہ پر اس کو مقدم اور اہم قرار دیا ہے۔''(۳)

بہر حال سنن دارمی کو خواہ صحت وقوت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی سنن پر فوقیت کیوں نہ حاصل ہو لیکن تنہا اس خصوصیت کی بنا پر اس کو ابن ماجہ کی جگہ صحاح ستہ میں نہیں رکھا جا سکتا اور نہ علائی کے ایک منفرد خیال کی وجہ سے جمہور کی رائے کو مسترد کیا جا سکتا ہے۔

صحاح ستہ میں سنن ابن ماجہ کا درجہ: ان بیانات سے اتنا تو واضح ہو گیا کہ ابن ماجہ کی سنن صحاح ستہ میں شامل ہے لیکن اس کا مرتبہ پانچوں سے کمتر ہے، شارح سندی کہتے ہیں ''وہ کتب خمسہ سے کمتر ہے'' ابن وزیر یمانی کا بیان ہے کہ اس کا درجہ سنن نسائی وسنن ابی داؤد کے بعد ہے لیکن یہ ترجیح مجموعی حیثیت سے ہے، یعنی اس میں دوسری کتابوں کے مقابلہ میں

(۱) مقدمہ سنن دارمی ص ۷ (۲) تدریب الراوی ص ۵۷۔ (۳) ماتمس الیہ الحاجۃ ص ۳۶ و ۳۷۔

ضعیف روایتیں زیادہ ہیں مگر کتب خمسہ کی ہر روایت صحت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی ہر روایت پر فوقیت نہیں رکھتی، بعض علما کا بیان ہے کہ ابن ماجہ کی بعض روایتیں صحیح بخاری کی بعض حدیثوں سے بھی اصح ہیں۔(۱)

سنن ابن ماجہ کی ضعیف ومنکر روایتیں: امام ابن ماجہ کی احتیاط اور کوشش کے باوجود سنن میں ضعیف روایتیں بھی شامل ہوگئی ہیں مگر علمائے فن کے ایک گروہ کے نزدیک ان کی تعداد بہت کم ہے، چنانچہ ابوزرعہ رازی کا بیان ہے کہ ''مجھے اس میں بہت کم ایسی حدیثیں ملیں جن میں کسی قسم کا شک یا خرابی ہو، دس سے کچھ زیادہ روایتیں ایسی ہوں گی، ان کی دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے تیس سے کم حدیثوں کو ضعیف الاسناد قرار دیا، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ سنن ابن ماجہ کی تھوڑی حدیثوں کے سوا سب بہتر اور عمدہ ہیں۔''(۲)

مگر حافظ ابن حجر کہتے ہیں ''اس میں ضعیف روایتیں بہت زیادہ ہیں۔'' علامہ ذہبی، حافظ ابوزرعہ کے مذکورہ بالا قول پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۳۰ سے ان کی مراد ساقط الاسناد حدیثیں ہوں گی، ورنہ جن حدیثوں سے حجت قائم نہیں ہوتی، ان کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے، شاید ایک ہزار کے قریب ہوں، اسی طرح علامہ سیوطی نے لکھا ہے، ابن طاہر نے ابوزرعہ سے جو روایت کی ہے وہ صحیح نہیں ہے، اس کی سند منقطع ہے، اگر اس کو محفوظ تسلیم کیا جائے تو غالباً اس سے ابوزرعہ کی مراد ساقط الاعتبار روایتیں ہوں گی، یا ان کی نظر سے اس وقت تک اس کتاب کا تھوڑا حصہ گذرا تھا، ورنہ ابوزرعہ نے سنن ابن ماجہ کی بہت ساری روایتوں کو منکر، باطل اور ساقط بتایا ہے۔''

ان اقوال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابن ماجہ میں بھی دوسری کتابوں کی طرح ضعیف روایات ہیں اور ان کی تعداد کتب خمسہ کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ ہے، اسی لیے اس کا

---

(۱) توضیح الافکار ج۱ ص۲۲۲و۲۲۳ بحوالہ امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص۲۴۲ (۲) شروط الائمۃ الستۃ ص۹ وتذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۱۰ اوالبدایہ والنہایہ ج۱۱ ص۵۲۔

درجہ ان کے مقابلہ میں کمتر سمجھا جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس سے اس کی اہمیت اور عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا، کیوں کہ کسی کتاب کا صحاح ستہ میں ہونا اس کی تمام روایتوں کی صحت واستناد کا ثبوت نہیں ہے بلکہ مجموعی حیثیت کے اعتبار سے ان کو صحاح میں شامل کیا گیا ہے، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں ''ان چاروں کتابوں (ترمذی، ابوداود، نسائی اور ابن ماجہ) میں حدیث کی جملہ اقسام، یعنی صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی روایتیں پائی جاتی ہیں اور ان کو صحاح کا نام علی وجہ التغلیب دیا جاتا ہے۔''(۱)

۲- محدثین اور علماء رجال نے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ سنن کے اندر منکر، واہی اور موضوع روایتیں بھی ہیں، صرف حافظ ابن حجر کی رائے ہے کہ اس کی منکر حدیثوں کی تعداد زیادہ ہے، ورنہ سیوطی اور ذہبی کے گذشتہ بیانوں سے ظاہر ہے کہ ساقط الاعتبار روایتوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، حافظ ذہبی نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سنن ابن ماجہ بہترین کتاب ہے، کاش اس کو چند واہی حدیثیں جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے خراب نہ کردیتیں، علامہ ابن جوزی نے ۳۴ حدیثوں کو موضوع قرار دیا ہے، مولانا عبدالرشید نعمانی نے ان سب کو اور آٹھ مزید روایات یعنی کل ۴۲ حدیثیں نقل کر کے ان پر فنی حیثیت سے بحث کی ہے۔(۲)

اس تفصیل سے اگرچہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سنن میں منکر روایتیں بھی ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور نہ اتنے بڑے ذخیرہ میں چند منکر وواہی روایات کا پایا جانا کوئی خاص عیب ہے۔

۳- اس سلسلہ کی آخری مگر اہم بحث یہ ہے کہ ''ابن ماجہ کے تفردات ضعیف

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ وتوضیح الافکار ص ۲۳۳ بحوالہ امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۳۹ ومقدمہ زہر الربی علی المجتبیٰ ص ۸ وحواشی سعدی ص ۱۵ (۲) تہذیب ج ۹ ص ۵۳۱، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۰ ماتمس الیہ الحاجہ ص ۳۸، ۴۵۔

ہیں۔'' حافظ ابن حجر نے ابوالحجاج مزی۔ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ''ابن ماجہ کی وہ سب روایتیں ضعیف ہیں جن میں وہ ائمہ خمسہ سے منفرد ہیں لیکن حافظ ابن حجر کو خود اس اصول وکلیہ سے اتفاق نہیں ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''اگر چہ سنن ابن ماجہ میں ضعیف ومنکر روایتیں زیادہ ہیں لیکن میرے استقصا وتتبع کے مطابق ان کے تفردات کے بارے میں مطلقاً یہ حکم لگانا درست نہیں ہے..... مزی کے قول کو رجال پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے، حدیثوں پر اس کا اطلاق صحیح نہیں ہے، کیوں کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جن روایتوں میں ابن ماجہ منفرد ہیں ان میں صحیح وحسن ہر قسم کی حدیثیں ہیں'' (۱) شارح سندی کا بیان ہے کہ ''سنن ابن ماجہ میں صحاح خمسہ پر زوائد بہت ہیں اور مشہور یہ ہے کہ ان کے تفردات ضعیف ہوا کرتے ہیں حالانکہ یہ کلیہ صحیح نہیں ہے'' مولانا عبدالرشید نعمانی نے حافظ ابن حجر کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رجال کے متعلق بھی کلی طور پر یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا اور اس کی چند مثالیں دے کر تردید کی ہے۔ (۲)

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ضعیف اور بعض منکر روایتوں کے باوجود سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل ہے اور جن حدیثوں میں انھوں نے ائمہ خمسہ سے تفرد کیا ہے ان میں صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں۔

شروح وتعلیقات: سنن ابن ماجہ کے ساتھ علمانے بڑا اعتنا کیا اور اس کے متعدد حواشی وشروح لکھے جن کی تعداد نسائی کے شروح وحواشی سے زیادہ ہے۔

۱۔ شرح سنن ابن ماجہ: سب سے پہلے علاؤالدین مغلطائی بن قلیج م ۷۶۲ھ نے سنن ابن ماجہ کی ایک جامع شرح لکھنا شروع کی تھی، مگر وہ اس کو مکمل نہ کر سکے، یہ نامکمل شرح پانچ جلدوں میں ہے، (۳) اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ ٹونک میں موجود ہے۔ (۴)

(۱) تہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ (۲) ما تمس الیہ الحاجہ ص ۳۸ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۴ (۴) امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۴۵۔

۲- ماتمس الیہ الحاجۃ علیٰ سنن ابن ماجہ: شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن م ۸۰۴ھ نے سنن کی ان حدیثوں کی جو کتب خمسہ میں نہیں ہیں، ۸ جلدوں میں ایک مفصل شرح لکھی۔

۳- شرح سنن ابن ماجہ: ابن رجب زبیری کی یہ شرح نایاب ہے، شیخ ابوالحسن سندی نے اپنے حواشی میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۴- الدیباجۃ فی شرح سنن ابن ماجہ: شیخ کمال الدین محمد بن موسیٰ دمیری م ۸۰۸ھ نے ۵ جلدوں میں شرح لکھی مگر تسوید و تبییض سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔

۵- شرح سنن ابن ماجہ: ابن سبط عجمی یہ برہان الدین ابراہیم بن محمد حلبی م ۸۴۱ھ کی سنن پر یہ ایک لطیف تعلیق ہے۔

۶- مصباح الزجاجۃ: علامہ جلال الدین سیوطی م ۹۱۱ھ کا مختصر حاشیہ جو نہایت مقبول و متداول اور سنن کے ساتھ طبع ہو چکا ہے، مصر سے اس کا اختصار بھی شائع ہوا ہے۔

۷- شرح سنن ابن ماجہ: ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندی م ۱۱۳۸ھ نے صحاح کی دوسری کتابوں کی طرح اس کا بھی حاشیہ لکھا جو سنن کے ساتھ چھپ کر بہت مقبول ہوا، اس میں مشکل اور غریب الفاظ اور اعراب کی وضاحت کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے۔(۱)

۹- شرح انجاح الحاجۃ: شیخ عبدالغنی بن ابوسعید مجددی دہلوی م ۱۲۹۵ھ کی یہ مختصر مگر جامع شرح ہے اور سنن کے ساتھ حاشیہ پر دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

۱۰- حاشیہ بر سنن ابن ماجہ: مولانا فخر الحسن گنگوہی نے اس تعلیق کے اندر علامہ سیوطی اور مولانا مجددی دونوں شرحوں کو مفید اضافہ کے ساتھ جمع کیا ہے جو کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔

۱۱- مفتاح الحاجۃ: یہ شیخ محمد علوی کا حاشیہ ہے جو اصح المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔

۱۲- رفع العجاجۃ عن سنن ابن ماجہ: مشہور عالم اور مترجم حدیث مولانا وحید الزماں

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۴ و الضوء اللامع ج ۱ ص ۱۴۱۔

وقار نواز جنگ نے سنن ابن ماجہ کا اردو ترجمہ اور اس کی مختصر شرح اردو میں لکھی ہے، جو متوسط تقطیع کی تین ضخیم جلدوں میں مطبع صدیقی لاہور سے ۱۳۱۰ھ میں چھپ چکی ہے۔

شرحوں اور حواشی کے علاوہ سنن کے زوائد، رجال اور اس کی دوسری حیثیتوں پر بھی کام کیے گئے ہیں۔

۱۳- المجرد فی اسماء رجال ابن ماجہ: علامہ ذہبی نے اس میں ابن ماجہ کے اُن رواۃ کا تذکرہ کیا ہے، جن سے صحیحین میں کوئی روایت درج نہیں ہے، اس کا قلمی نسخہ دمشق کے کتب خانہ ظاہریہ میں بیس ورقوں میں موجود ہے۔

۱۴- زوائد ابن ماجہ: یہ حافظ شہاب الدین بوصیری م ۸۴۰ھ کی تالیف ہے، اس میں ہر روایت کے اسناد کی قوت وضعف کو بیان کیا گیا ہے، یہ کتاب اگرچہ ناپید ہے لیکن علامہ سندی نے اپنی شرح میں اس کی اہم اور ضروری باتیں نقل کر دی ہیں۔

۱۵- ماتمس الیہ الحاجہ لمن یطالع سنن ابن ماجہ: یہ دونوں مفید کتابیں مولانا عبدالرشید نعمانی .... ابن ماجہ اور علم حدیث .... نے عربی اور اردو میں لکھی ہیں، ان میں ابن ماجہ کے حالات وسوانح اور سنن پر مبسوط تبصرہ کے علاوہ، حدیث کی حجیت، تاریخ وتدوین اور ائمہ اربعہ اور مصنفین صحاح کے شرائط اور امام ابن ماجہ کے عہد تک کے بعض اکابر محدثین کا مختصر تذکرہ بھی ہے۔

☆☆☆

امام ابوداؤد سجستانی

(متوفی ۲۷۵ھ)

نام ونسب: سلیمان نام، ابوداؤد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد بن عمرو بن عمران۔(۱)

بعض مورخین سے نسب نامہ میں معمولی اختلاف بھی منقول ہے۔

امام کے جد اعلیٰ عمران کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے اور اسی میں ان کی شہادت ہوئی۔(۲)

ولادت وخاندان: امام ابوداؤد کا خود بیان ہے کہ وہ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے تھے،(۳) اور مشہور قبیلہ ازد سے ان کا نسبی تعلق تھا، اس لیے ازدی کہلاتے ہیں۔

وطن: خراسان کے مشہور علاقہ سجستان (سیستان) کو امام صاحب کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے لیکن بعض لوگوں نے بصرہ کے ایک گاؤں سجستان یا سجستانہ کو آپ کا وطن بتایا ہے جو صحیح نہیں، محمد بن طاہر مقدسی لکھتے ہیں ''میں نے محمد بن نصر، قل ھو اللہ خاں سے سنا کہ امام ابوداؤد کا وطن بصرہ کا ایک گاؤں سجستان ہے جو خراسان کے سجستان سے الگ ہے، اسی طرح کی ایک اور روایت بھی ہے لیکن ابن نصر کا یہ بھی بیان ہے کہ انھوں نے جب بصرہ

(۱) تاریخ بغداد ج۹ ص۵۵ و کتاب الانساب تا ورق ۲۹۲ و تاریخ ابن خلکان ج۱ ص۲۸۱ (۲) کتاب الانساب ورق ۲۹۲ و تہذیب التہذیب ج۴ ص۱۶۹ (۳) تاریخ بغداد ج۹ ص۵۶۔

والوں سے اس کی تحقیق کی تو پتہ چلا کہ وہاں کے لوگ اس نام کے کسی گاؤں سے واقف نہیں، یہ روایات ناقابل اعتماد ہیں، دوسرے معتبر علما وحفاظ حدیث میں سے بھی کسی نے اس طرح کی تصریح نہیں کی ہے کہ ان کا وطن مشہور سجستان کے علاوہ کسی اور جگہ ہے۔(۱) علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ''سجستان کی جانب نسبت ہے جو کابل کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔'' (۲) شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں ''ابن خلکان کو انساب میں مہارت اور تاریخ دانی میں کمال کے باوجود اس نسبت کے متعلق غلط فہمی ہوگئی ہے اور بقول صاحب طبقات علامہ تاج الدین سبکی یہ وہم ہے، صحیح یہ ہے کہ یہ نسبت سیستان (سجستان) کی جانب ہے جو ایک مشہور ملک اور سندھ وہرات کے درمیان قندھار کے قریب واقع ہے، چشت بھی جو بزرگان چشت کا مسکن ہے، اسی ملک کے اندر ہے اور قدیم زمانہ میں اس ملک کا پایہ تخت بست تھا۔(۳)

مگر علامہ ابن خلکان بھی جمہور کے قول کو راجح سمجھتے ہیں، ان کا بیان یہ ہے ''سجستانی ..... کی نسبت مشہور شہر سجستان کی جانب ہے لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بصرہ کے ایک گاؤں سجستان یا سجستانہ کی جانب منسوب ہے، واللہ اعلم۔

علامہ ذہبی نے بھی دونوں اقوال ذکر کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں ''ابوداؤد کا وطن سجستان ہے جو مکران اور سندھ کے اطراف وجوانب اور ہران کے مقابل میں واقع ہے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا تعلق بصرہ کے ایک گاؤں سجستان سے تھا۔''(۴)

اس غلط فہمی کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ امام صاحب نے آخر عمر میں بصرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اس لیے بعض لوگوں نے ان کا اصلی وطن بھی اس کے قرب وجوار ہی کے علاقہ کو سمجھ لیا۔

---

(۱) کتاب الانساب مقدسی ص ۱۰۹ (۲) کتاب الانساب سمعانی ورق ۲۹۲ (۳) بستان المحدثین ص ۱۰۷ والحطہ ص ۱۲۵ (۴) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۸۳ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۷۰۔

اساتذہ وشیوخ: حافظ ابن حجر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے اساتذہ کی تعداد تین سو کے قریب ہے، ان میں امام احمد بن حنبل، اسحاق بن رواہویہ اور ابوثور جیسے بلند پایہ فقہائے محدثین اور یحییٰ بن معین، ہشام بن عبدالملک طیالسی، ابوبکر بن ابی شیبہ اور عثمان بن ابی شیبہ جیسے نامور ناقدینِ فن اور ائمہ محدثین شامل ہیں، چند اور مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

حیوۃ بن شریح، خلف بن ہشام بغدادی، ربیع بن نافع حلبی، زہر بن حرب، سعید بن سلیمان بزار واسطی، سعید بن منصور، سلیمان بن حرب، سلیمان بن عبدالرحمٰن دمشقی، شجاع بن مخلد، صفوان بن صالح دمشقی، عبداللہ بن رجاء بصری، عبداللہ بن محمد نفیلی دمشقی، عمرو بن عون ہزار واسطی، ابورجاء قتیبہ بن سعید، محمد بن بشار بندار بصری، محمد بن صباح بزار دولابی، محمد بن منہال، مسدد بن مسرہد، ہشام بن خالد ازرق دمشقی، ہناد بن عمرو اور ابومحمد وہب بن بقیہ وغیرہ۔(۱)

تلامذہ: امام صاحب کے تلامذہ کا حلقہ بھی بڑا وسیع ہے، سنن کے رواۃ میں ابوعمرو احمد بن علی حسن بصری، ابوعلی محمد بن احمد بن عمرو لؤلؤی، ابوالطیب احمد بن ابراہیم اشنائی، ابوسعید احمد بن محمد بن زیاد اعرابی، ابوبکر محمد بن عبدالرزاق بن داسہ ابوالحسن علی بن حسن بن عبدانصاری، ابوعیسیٰ اسحاق بن موسیٰ بن سعید رملی اور ابواسامہ محمد بن عبدالملک بن یزید رواس۔

دوسری کتابوں کے رواۃ میں: ابوعبداللہ محمد بن احمد بصری، ابوبکر احمد بن سلیمان بخارا، اسماعیل بن محمد صفار، ابوعبید محمد بن علی بن عثمان آجری اور دوسرے مشہور علما میں آپ کے صاحبزادے ابوبکر بن ابی داؤد، ابوعوانہ، یعقوب بن اسحاق الفرائینی، حرب بن اسماعیل کرمانی، زکریا ساجی، ابوبکر احمد بن محمد خلال اور احمد بن محمد بن یٰسین ہروی وغیرہ۔

صحاح ستہ کے مصنفین میں امام ترمذی اور امام نسائی کو بھی آپ سے تلمذ حاصل

(۱) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۷۲، ۱۶۹، ۱۷۰ و مقدمہ غایۃ المقصود ص ۶،۵۔

ہے اور امام احمد نے بھی جو ان کے اساتذہ میں تھے، ایک حدیث ان سے روایت کی ہے،(۱) امام ابوداؤد کے تلامذہ میں چار اشخاص زیادہ مشہور و ممتاز ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''و چہار کس از جملہ شاگردان او خیلے سرآمد محدثین شدند اول پسرش ابوبکر بن ابی داؤد، دوم لولوی، سوم ابن الاعرابی، چہارم ابن داستہ۔(۲)

سماع حدیث کے لیے سفر: ابوداؤد نے اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق حصولِ حدیث کے لیے مختلف مقامات کا سفر کیا، وہ سجستان میں پیدا ہوئے لیکن بصرہ کو مسکن بنایا جو اس زمانہ میں علم وفن اور محدثین وفقہا کا بہت بڑا مرکز تھا، کئی بار بغداد تشریف لے گئے، حجاز، عراق، خراسان، مصر، شام، جزیرہ نیشاپور، مرو اور اصبہان وغیرہ کے محدثین کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر ان سے استفادہ کیا۔(۳)

حفظ وضبط: ان کا حافظہ نہایت قوی اور ذہن بڑا رسا تھا، محمد بن یٰسین ہروی فرماتے ہیں ''حفاظ حدیث میں ابوداؤد بھی ایک مشہور حافظ ہیں'' ابوحاتم کا بیان ہے کہ ''وہ حفظ کے اعتبار سے دنیا کے اماموں میں ایک امام تھے'' محمد بن مخلد فرماتے ہیں کہ ابوداؤد ہزاروں حدیثوں کا مذاکرہ کرتے تھے، اور جب انھوں نے سنن مرتب کی تو تمام اہل زمانہ ان کے حفظ وتقدم کے معترف ہو گئے، امام نووی فرماتے ہیں کہ جمہور علمائے اسلام کو ان کے کمال حفظ کا اعتراف ہے۔(۴)

جرح وتعدیل: حفظ وضبط اور ثقاہت وعدالت کی طرح جرح وتعدیل میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا اور صحیح وسقیم، قوی وضعیف، مشہور ومنکر اور حسن وشاذ ہر قسم کی روایتوں کے

(۱) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۷۲ و ۱۶۹ و ۱۷۰ و مقدمہ غایۃ المقصود ص ۵، ۶ (۲) بستان المحدثین ص ۱۰۷ (۳) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۶ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۴، ۵۵ (۴) تہذیب ج ۴ ص ۱۷۲ وتہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۲۴۔

پرکھنے میں ان کو پورا ملکہ حاصل تھا، ان کی قوتِ تمیز، نقد ونظر اور ثقاہت وعدالت پر اساطین فن کا اتفاق ہے، محمد بن یٰسین ہروی فرماتے ہیں کہ ''وہ احادیث نبوی کے حافظ وواقف کار بھی تھے اور ان کی اسناد وعلل کے ماہر بھی'' ابوعبداللہ بن مندہ کا بیان ہے کہ ''احادیث کی تخریج، معلول وثابت اور غلط وصحیح میں تمیز کرنے والے چار آدمی ہیں، امام بخاری اور امام مسلم اور ان کے بعد ابوداؤد اور نسائی'' حافظ ابن جوزی جیسے سخت گیر کو بھی علل حدیث میں ان کی معرفت کا اعتراف ہے'' ابوحاتم فرماتے ہیں کہ ''وہ احادیث میں نہایت معتبر ومتقن اور امام تھے۔''(۱)

حدیث میں کمال: ابوداؤد اس دور میں پیدا ہوئے تھے، جب دنیائے اسلام نامور محدثین سے معمور تھی، اس زمانہ میں انھوں نے اس فن میں اتنا کمال پیدا کیا کہ ائمہ حدیث اور اساطین فن میں ان کو امتیازی درجہ حاصل ہوگیا اور سب نے ان کی جلالتِ قدر کا اعتراف کیا، ابراہیم حربی کہتے ہیں کہ ''فن حدیث ان کے لیے اس طرح آسان ہوگیا تھا، جس طرح حضرت داؤدؑ کے لیے لوہا نرم اور موم بن گیا تھا، موسیٰ بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ ''وہ دنیا میں تحصیل حدیث اور عقبیٰ میں جنت کے لیے پیدا کیے گئے تھے، میں نے ان سے زیادہ افضل وبرتر کوئی آدمی نہیں دیکھا'' احمد بن محمد بن یٰسین ہروی نے ان کو فرسان حدیث میں شمار کیا ہے، حاکم صاحب مستدرک کی رائے ہے کہ ''وہ اپنے دور میں امام المحدثین تھے'' امام نووی فرماتے ہیں کہ ''علمائے اسلام ابوداؤد کی مدح وتوصیف ان کے وفورِ علم حدیث میں فہم صائب اور ذہن رسا پر متفق ہیں'' محمد بن مخلد کہتے ہیں کہ ابوداؤد کے معاصرین اور اہل زمانہ ان کی امامت فن کے معترف تھے۔''(۲)

فقہ واجتہاد: اگرچہ امام ابوداؤد کی شہرت محدث کی حیثیت سے زیادہ ہے لیکن فقہ واجتہاد

(۱) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۷۰ و ۱۷۲ و المنتظم ج ۵ ص ۵۷ (۲) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۸ و ابن خلکان ج ۱ ص ۳۸۲، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۶۹ و تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۴۴۔

میں بھی ان کو بڑی بصیرت حاصل تھی اور حدیث کی طرح فقہ میں بھی ان کی نظر وسیع اور گہری تھی، ابو حاتم ان کو امام فقہ قرار دیتے ہیں، صاحب شذرات اور یافعی نے لکھا ہے کہ ''وہ حدیث وفقہ دونوں میں ممتاز اور بلند حیثیت رکھتے تھے'' بعض علما کا بیان ہے کہ اصحاب صحاح میں امام بخاری کے بعد اجتہاد وتفقہ کے لحاظ سے ابوداؤد کا مرتبہ سب سے بلند ہے'' ان پر فقہی ذوق اتنا غالب تھا کہ تمام ارباب صحاح ستہ میں صرف ان ہی کو ابواسحاق شیرازی نے طبقات الفقہا میں شامل کیا ہے، اسی فقہی ذوق کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب میں صرف احکام ومسائل کے متعلق حدیثیں درج کی ہیں۔

تفسیر و دیگر علوم: تفسیر کے بھی عالم تھے، اس موضوع پر انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی، حدیث، فقہ وتفسیر کے علاوہ دوسرے علوم سے بھی ان کو پوری واقفیت تھی، ابوبکر خلال کا بیان ہے کہ ''ابوداؤد اپنے زمانہ کے صاحب فضیلت اور پیش رو امام تھے، علوم کی تخریج ومعرفت اور ان کے مواقع ومقامات کی واقفیت وآگاہی میں ان کا کوئی ہم سر نہ تھا۔

فقہی مذہب: ابواسحاق شیرازی نے طبقات الفقہا میں ابوداؤد کو حنابلہ میں شمار کیا ہے، ان کے حنبلی ہونے کا ایک قوی قرینہ یہ ہے کہ وہ امام احمد کے خاص شاگرد اور متعدد مسائل میں ان کے ہمنوا تھے لیکن بعض لوگوں نے ان کو شافعی المذہب قرار دیا ہے۔(۱)

تدین وتقویٰ: علم وفن کی طرح وہ زہد وتقویٰ کے بھی امام تھے، ابوحاتم کا بیان ہے کہ وہ فقہ وعلم، حفظ وضبط اور عبادت وتقویٰ ہر اعتبار سے دنیا کے اماموں میں ایک امام تھے، یٰسین ہروی فرماتے ہیں کہ ''وہ بے مثال عالم وحافظ ہونے کے علاوہ عبادت وریاضت، عفت وپاکدامانی، خیر وصلاح اور ورع وتقویٰ میں بھی منفرد خصوصیات کے مالک تھے'' (۲) آداب شریعت کی پابندی اور سنت نبوی کے اتباع کا خاص اہتمام تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

---

(۱) اتحاف النبلاص ۲۵۶ (۲) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۷۲۔

''درحفظ حدیث واتقان روایت وعبادت وتقویٰ وصلاح واحتیاط درجہ عالی داشت''۔ (۱)

علامہ ابن کثیر کا بیان ہے:

وکان فی اعلیٰ درجة البنك والعفاف والصلاح والورع۔(۲)

دنیوی جاہ وحشمت سے بے زاری: امام صاحب کو دنیا اور اس کے لذائذ ومرغوبات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، امرا وسلاطین کے دربار سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور دنیاوی جاہ وحشمت اور اعزاز واکرام کی کبھی طلب نہیں کی، خلفا کی وجاہت کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں تھا اور وہ ان کو عام لوگوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور نہ ان کے ساتھ کوئی امتیاز برتتے تھے، ان کے خادم ابوبکر بن جابر کا بیان ہے کہ ''میں امام صاحب کے ساتھ بغداد میں مقیم تھا، ایک دن جب وہ مغرب کی نماز پڑھ کر گھر میں داخل ہوئے تو کچھ دیر کے بعد دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی، میں نے دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ امیر ابواحمد موفق امام صاحب سے ملنے کے خواہش مند ہیں، میں نے اطلاع کی، آپ نے ان کو اندر بلوالیا اور پوچھا کہ کیسے زحمت فرمائی؟ انھوں نے کہا کہ میں تین درخواستیں لے کر حاضر ہوا ہوں، ایک تو یہ کہ آپ بصرہ میں مستقل قیام فرمائیں تاکہ مختلف مقامات کے طالبانِ حدیث آپ سے استفادہ کرسکیں، دوسرے میرے بچوں کو سنن کی تعلیم دیں، تیسرے روایت اور درسِ حدیث کے حلقہ میں میرے بچوں کے لیے مخصوص نشست کا انتظام فرمادیں، امام صاحب نے فرمایا کہ پہلی دونوں باتیں مناسب ہیں لیکن تیسری بات ناممکن ہے، علم کے معاملہ میں شریف ووضیع، اعلیٰ وادنیٰ سب برابر ہیں، اس لیے کوئی امتیاز نہیں برتا جاسکتا، چنانچہ امیر کے لڑکے بھی عام لوگوں کی طرح حلقۂ درس میں شریک ہوکر سماع حدیث کرتے۔ (۳)

وفات واولاد: بہتر سال کی عمر میں بروز جمعہ ۱۶/شوال ۲۷۵ھ کو امام صاحب نے عالم

(۱) بستان المحدثین ص ۱۰۸ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۵ (۳) دیباچہ غایۃ المقصود۔

آخرت کا سفر اختیار کیا، عباس بن عبدالواحد نے جنازہ کی نماز پڑھائی، (۱) اولاد میں ایک صاحبزادہ ابوبکر عبداللہ کا جو آپ کے شاگرد اور نامور محدث تھے ذکر ملتا ہے۔

تصنیفات: امام صاحب کی جن تصنیفات کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

۱- کتاب الرد علی اہل القدر: اس کے راوی ابوعبداللہ بصری ہیں۔

۲- کتاب الناسخ والمنسوخ: ابوبکر نجار اس کے راوی ہیں۔

۳- کتاب المسائل: ابوعبید آجری نے اس کی روایت کی ہے اور اس میں ان کے وہ سوالات درج ہیں جو انھوں نے اپنے استاذ امام احمد سے کیے تھے۔ (۲)

۴- مسند مالک: اسماعیل بن محمد صفار اس کے راوی ہیں۔

۵- کتاب المراسیل: یہ رسالہ ۱۳۱۰ھ میں مطبع علمی سے شائع ہوا ہے اور ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ (۳)

۶ و ۷- کتاب المصابیح و کتاب المصاحف: صاحب کشف الظنون نے ان دونوں کو امام صاحب کے صاحبزادہ ابوبکر عبداللہ کی تصنیف بتایا ہے لیکن ابن ندیم نے امام صاحب کی تصنیفات میں ان کو شمار کیا ہے۔ (۴)

۸- کتاب البعث والنشور، ۹- کتاب التفسیر، ۱۰- کتاب نظم القرآن، ۱۱- کتاب فضائل القرآن، ۱۲- کتاب شریعۃ التفسیر، ۱۳- کتاب شریعۃ المقاریٔ، ۱۴- سنن ابی داؤد، یہ امام صاحب کی سب سے مشہور و مقبول اور فن حدیث کی بڑی اہم اور مستند کتاب ہے، اس کا مفصل تعارف درج ذیل ہے۔

سنن ابی داؤد: یہ چار ہزار آٹھ سو منتخب حدیثوں پر مشتمل ہے، امام صاحب نے اس کی ترتیب وتالیف کا کام ۲۴۱ھ سے پہلے بغداد میں انجام دیا، (۵) سنن ابی داؤد سے پہلے

(۱) اتحاف النبلاء ص ۲۵۷ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۹۰ (۳) معجم المطبوعات کالم ۳۱۰ (۴) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۰۱ و ۴۴۵ والفہرست ص ۳۲۴ (۵) معالم السنن ج ۱ ص ۶ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۴۸ وتاریخ بغداد ص ۵۶۔

حدیث کی جو کتابیں لکھی گئیں ان کا تعلق جوامع اور مسانید سے ہے، یعنی ان میں سنن، احکام، تفسیر، قصص، اخبار، مواعظ، وآداب ہر قسم کی روایتیں ہیں لیکن امام ابوداؤد نے اپنی راہ سب سے الگ نکالی، تمام محدثین میں .... ان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے صرف سنن و احکام کی روایات اپنے مجموعہ میں درج کی ہیں، اہل مکہ کے نام اپنے رسالہ میں تحریر فرماتے ہیں ''میں نے سنن میں صرف احکامی روایات جمع کی ہیں، زہد اور فضائلِ اعمال وغیرہ کی حدیثیں اس میں شامل نہیں ہیں، اس کی جملہ چار ہزار حدیثیں احکام و مسائل سے متعلق ہیں۔''(۱)

سنن کی اہمیت: سنن ابی داؤد کا شمار حدیث کی امہات کتب اور صحاح ستہ میں ہوتا ہے، اکثر علمائے اسلام نے صحیحین کے بعد تمام کتب حدیث میں اس کو سب سے اہم بتایا ہے، اس کتاب کو مرتب کرنے کے بعد جب اس کو امام احمد کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کو بہت پسند کیا اور اس کی تعریف کی، زکریا ساجی کا بیان ہے کہ قرآن مجید، اسلام کی اصل بنیاد اور سنن ابوداؤد اس کا ستون ہے، ابن الاعرابی فرماتے ہیں ''مصحف یعنی کتاب اللہ اور سنن ابوداؤد کے بعد کسی اور چیز سے واقفیت کی ضرورت نہیں'' محمد بن مخلد کہتے ہیں کہ ''ابوداؤد نے سنن مرتب کرنے کے بعد جب لوگوں کے سامنے اس کو بیان کیا تو محدثین نے اس کو مصحف کی طرح قابل اتباع سمجھا'' امام خطابی فرماتے ہیں ''سنن ابوداؤد ایک عمدہ اور نفیس کتاب ہے، علوم دینیہ میں ایسی بے نظیر کتاب نہیں لکھی گئی، تمام لوگوں میں اسے حسن قبول حاصل ہوا اور وہ اہل علم اور فقہا کے مختلف طبقات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے، اس میں ہر ایک کی آسودگی کا سامان موجود ہے اور عراق، مصر، بلاد مغرب اور اکثر ملکوں کے لوگوں کا اس پر اعتماد و دار و مدار ہے، علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں ''ابوداؤد کبار محدثین اور ماہرین فن علما میں تھے اور ان کی سنن جیسی کتاب کسی 'ور نے نہیں لکھی'' حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں ''سنن ابی داؤد علما کے درمیان مشہور و متداول اور مقبول تصنیف خیال کی جاتی ہے، ابوالعلا محسن کا بیان

(۱) رسالۃ ابی داؤد الی اہل مکہ ص ۸۔

ہے کہ انھوں نے خواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

من اراد ان یستمسك بالسنن	سنن کی اتباع کی آرزو رکھنے والوں کو
فلیقرأ سنن ابی داؤد.	سنن ابی داؤد کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

امام ابوداؤد خود فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ کے بعد اس کتاب سے زیادہ کسی اور چیز کا علم ضروری نہیں، اگر کسی شخص کو ان دونوں کے علاوہ کسی اور چیز سے واقفیت نہ ہو تو اس کو کوئی نقصان نہ ہوگا۔(۱)

خصوصیات: ۱- سنن ابی داؤد کی سب سے اہم خصوصیت اور اس کا امتیاز یہ ہے کہ وہ صرف احکام و مسائل سے متعلق روایات واخبار پر مشتمل ہے، امام ابوداؤد سے پہلے اس قسم کی حدیث کی کتابیں لکھنے کا رواج نہ تھا، امام نووی کا بیان ہے کہ اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر وہ ائمہ حدیث اور علمائے آثار کی توجہات کا مرکز بن گئی اور گو اس تخصیص کی بنا پر وہ احادیث کے بہت سے ابواب سے خالی ہے لیکن فقہی احادیث کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے، وہ صحاح ستہ کی کسی اور کتاب میں نہیں، حافظ ابوجعفر بن زبیر غرناطی متوفی ۷۰۸ھ نے صحاح ستہ کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

ولابی داؤد فی حصر	اور فقہی حدیثوں کے حصر واستیعاب
احادیث الاحکام واستیعابها	کے سلسلہ میں ابوداؤد کو جو خصوصیت
لیس لغیره.(۲)	حاصل ہے وہ دوسرے مصنفین کو نہیں۔

احکام و مسائل میں اس کی جامعیت کی بنا پر علمائے امت نے کتاب اللہ کے بعد دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کی تعلیم کو زیادہ ضروری قرار دیا ہے اور اسی خصوصیت کی

(۱) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۶، ابن خلکان ج ۱ ص ۳۸۲ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۵ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۹ ومقدمہ معالم السنن ج ۱ ص ۹۷۸ وتہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۷۱، صفۃ الصفوۃ ج ۵ ص ۵۱ (۲) کتاب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۲۷، تدریب الراوی ص ۷۶۔

وجہ سے وہ فقہا و مجتہدین کا معتمد علیہ ماخذ رہی ہے، زاہد الکوثری لکھتے ہیں ''حلال وحرام کے متعلق احکامی احادیث کے لیے یہ نہایت مفید اور نفع بخش کتاب ہے'' بعض علمائے اصول کا بیان ہے کہ ''مجتہدین کے لیے اس کی احادیث سے واقفیت کافی ہے'' ابوبکر جصاص کی احکام و مسائل کے متعلق جملہ کتابوں (احکام القرآن، جامع کبیر، شرح مختصر طحاوی اور شرح مختصر کرخی وغیرہ) کا خاص ماخذ و مرجع یہی کتاب ہے۔(۱)

۲۔ فقہ و استنباطِ احکام و مسائل کے لحاظ سے بھی یہ بڑی بلند پایہ کتاب ہے کیونکہ امام ابوداؤد کا درجہ فقہ و اجتہاد میں بھی نہایت بلند تھا۔

۳۔ امام ترمذی کی طرح ابوداؤد کی بھی اکثر و بیشتر روایتیں علما و ائمہ مجتہدین، فقہاءِ امصار، صحابہ و تابعین اور تبع تابعین وغیرہ کی معمول بہا ہیں، خصوصاً امام مالک، سفیان ثوری اور امام اوزاعی وغیرہ محدثین اور فقہا کے مسالک و مذاہب کے لیے تو وہ اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، علامہ خطابی کا بیان ہے کہ ''وہ فقہا و مجتہدین کے اختلاف کے درمیان حکم اور حجت ہے اور عراق، مصر، بلادِ مغرب اور دیگر ممالک کے لوگوں کا اس پر دارو مدار ہے''۔(۲)

۴۔ سنن میں صحیح الاسناد، قوی، متصل اور مرفوع حدیثوں کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، اس کی صحت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ امام صاحب نے پہلے پانچ لاکھ حدیثیں جمع کی تھیں، پھر ان میں کل چار ہزار آٹھ سو حدیثیں منتخب کیں، اس سلسلہ میں خود لکھتے ہیں ''سنن میں چار ہزار آٹھ سو حدیثیں شامل ہیں، جو سب صحیح یا قریب قریب صحیح ہیں، میں نے اپنے علم و یقین بھر صحیح بلکہ اصح روایتیں نقل کرنے کی کوشش کی ہے اور ہمیشہ ان حدیثوں کو ترجیح دی ہے جو سند کے اعتبار سے بلند اور اعلیٰ درجہ کی ہیں، مرسل حدیثیں اس وقت نقل کرتا ہوں جب مسند اور متصل روایتیں نہیں ملتیں کیوں کہ مراسیل بھی ائمہ متقدمین، مالک،

---

(۱) دیباچہ رسالہ أبی داؤد ص ۲ (۲) مقدمہ معالم السنن ص ۲۔

ثوری اور اوزاعی وغیرہ کے نزدیک لائق حجت اور قابل استناد ہیں، البتہ امام شافعی اور امام احمد کو ان کی حجیت میں کلام ہے، میرے نزدیک مسند و متصل روایات کے نہ ہونے کی صورت میں وہ معتبر و مستند ہیں لیکن ان کی طرح ان کو قوی نہیں سمجھتا، میں نے اس میں کوئی ایسی حدیث نہیں درج کی جس کے متروک اور ساقط ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہو۔ اسی طرح متروک الاحادیث راویوں سے روایت کرنے میں بھی پرہیز کیا ہے، منکر اور ضعیف الاسناد روایتوں کو میں قابل اعتنا ہی نہیں سمجھتا لیکن صحیح روایتوں کے نہ ہونے کی صورت میں ان کو ان کے ضعف اور وجوہِ نکارت کی تصریح کے بعد نقل کیا ہے، جن غیر صحیح الاسناد روایتوں کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے، وہ قابل احتجاج اور صالح سمجھی جائیں گی، اسی طرح غریب اور شاذ روایات کے بجائے مشہور اور معمول بہ روایتیں جمع کرنے پر خاص دھیان دیا ہے۔(۱)

۵- امام ابوداؤد کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی سند اور ایک ہی متن میں متعدد اسانید اور مختلف متون کو جمع کر دیتے ہیں اور ہر حدیث کے الفاظ کو علاحدہ علاحدہ بیان کرتے ہیں۔

۶- روایتوں کے تکرار سے حدیث کی کوئی کتاب خالی نہیں لیکن امام ابوداؤد نے حتی الامکان تکرار سے احتراز، کثرت طرق کو نظر انداز اور طویل حدیثوں کو مختصر کر دیا ہے، تکرار سے اسی وقت کام لیا ہے، جب روایت میں کوئی خاص اور نئی بات نظر آئی ہے۔

۷- نقلِ روایات میں استقصا و جامعیت کے علاوہ اس میں حسنِ ترتیب و تالیف کی بھی شان پائی جاتی ہے، علامہ خطابی فرماتے ہیں:

الا ان کتاب ابی داؤد احسن رصفا یعنی ابوداؤد کی سنن ترتیب وحسنِ تالیف کے لحاظ سے سب میں عمدہ ہے، پڑھنے والوں کے مذاق وطبیعت کے لحاظ ہی کی وجہ سے

(۱) رسالہ ابی داؤد سجستانی ص ۷۔

انھوں نے تکرار، کثرت طرق اور طول بیان سے پرہیز کیا ہے۔

۸- سنن ابی داؤد میں ایک ثلاثی روایت بھی ہے۔

۹- رواۃ کے ناموں، کنیتوں اور القاب کے اجمال وابہام کی تفصیل وتوضیح، ان کی ثقاہت وعدم ثقاہت کی نشاندہی اور روایات کے حسن وقبح اور صحت وسقم وغیرہ کی وضاحت بھی کی ہے۔

سنن ابی داؤد کی چار حدیثیں: امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ میرے اس منتخب مجموعۂ احادیث میں صرف چار حدیثیں انسان کو دین پر عمل کرنے کے لیے کافی ہیں اور وہ یہ ہیں، انما الاعمال بالنیات، من حسن اسلام المرء ترکہ مالایعنیہ، لا یکون المومن مومنا حتی یرضیٰ لاخیہ مایرضاہ لنفسہ اور الحلال بین والحرام بین وبینھما مشتبھات۔

امام صاحب کی اس تصریح میں بڑی بصیرت وحکمت پوشیدہ ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''ایک مجتہد ومرشد کو شریعت کے کلی قاعدوں اور مہمات امور سے واقف ہونے کے بعد جزئی مسائل اور واقعات میں ان کے سوا کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیوں کہ پہلی حدیث عبادات کی صحت ودرستگی، دوسری عمر عزیز کے اوقات کی حفاظت، تیسری پڑوسیوں، قرابتداروں، متعارف لوگوں اور دوسرے متعلقین وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی کے لیے اور چوتھی ان تمام شکوک وشبہات کے ازالہ کے لیے کافی ہے جو علما کے اختلافات ودلائل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ (۱)

سنن کے متداول نسخے اور ان کے رواۃ: امام ابوداؤد سے ان کے سات تلامذہ نے سنن کی روایت کی ہے لیکن ان میں چار تلامذہ زیادہ مشہور ہیں اور ان کی نسبت سے ہر زمانہ میں سنن کے چار نسخے مشہور ومتداول رہے ہیں۔ (۲)

۱-نسخۂ لؤلؤی: یعنی ابوعلی محمد بن احمد بن عمرو لؤلؤی کا نسخہ جو ہندوستان اور بلاد مشرق میں رائج

---

(۱) بستان المحدثین ص ۱۰۷ (۲) مقدمہ معالم السنن۔

ومقبول ہے اور سب زیادہ مستند ومعتبر سمجھا جاتا ہے کیوں کہ امام صاحب نے آخر عمر یعنی ۲۷۵ھ میں اس کا املا کرایا تھا، اس کے بعد ان کی وفات ہوگئی تھی، اس لیے یہ گویا آخری نسخہ ہے۔

۲۔نسخۂ ابن داسہ: یعنی حافظ ابوبکر محمد بن بکر تمار، بصری کا نسخہ، یہ بلاد مغرب میں مشہور ومقبول تھا، اس میں اور لولوی کے نسخے میں بڑی یکسانیت ہے، کہیں کہیں محض تقدیم وتاخیر کا جزوی اختلاف ہے، کمی بیشی کا کوئی فرق نہیں، بعض علما کے نزدیک سب سے زیادہ کامل اور جامع یہی نسخہ ہے، مشہور شارحِ سنن علامہ خطابی کے پیش نظر یہی تھا، انھوں نے ابن داسہ سے براہ راست تحصیل علم اور روایت کی تھی۔

۳۔نسخۂ رملی: یعنی حافظ ابوعیسیٰ اسحاق بن موسیٰ بن سعید آملی کا نسخہ، یہ تقریباً ابن داسہ کے نسخہ سے ملتا جلتا ہے، آملی ابوداود کے وراق تھے۔

۴۔نسخۂ ابن اعرابی: اس میں اور دوسرے نسخوں میں بڑا فرق واختلاف ہے اور ان کے مقابلہ میں اس میں کمی بھی ہے، کتاب الفتن والملاحم، کتاب الحروف، کتاب الخاتم وغیرہ مکمل اور کتاب اللباس کا نصف حصہ اور کتاب الوضوء، کتاب الصلوٰۃ اور کتاب النکاح کے بھی بیشتر حصے اس میں درج نہیں ہیں۔(۱)

شروح وتعلیقات: سنن ابی داود کی اہمیت اور افادیت کی بنا پر ہر زمانہ کے علما نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، اس کے مختصرات مرتب کیے، اس کی شرحیں اور حواشی لکھے، جن میں اہم مباحث ومشکلات کا حل رواۃ اور غریب الفاظ وغیرہ کی تحقیقات کی گئی ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

معالم السنن: مشہور محدث امام ابوسلیمان حمد بن محمد خطابی (م ۳۸۸ھ) کی شرح جو سب سے قدیم اور مشہور اور سب میں ممتاز ہے، اس کو مطبعہ علمیہ حلب نے ۱۳۵۱ھ میں نہایت اہتمام سے شائع کیا۔

---

(۱) مقدمہ غایۃ المقصود ص ۷ مقدمہ معالم السنن ص ۲۳۔

شرح قطب الدین: قطب الدین ابوبکر بن احمد بن دعین یمنی شافعی م۷۵۲ھ نے اس کی چار ضخیم جلدوں میں شرح لکھی تھی، مگر نایاب ہے۔

تلخیص منذری: ابومحمد زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی مصری م۶۵۶ھ نے سنن ابی داؤد کا اختصار کیا تھا اور اس کا نام مجتبیٰ رکھا، غایۃ المقصود کے ساتھ اس کو بھی شائع کیا گیا ہے۔

شرح نووی: مشہور محدث اور باکمال شارح حدیث ابوزکریا محی الدین یحییٰ ابن شرف نووی م۶۷۶ھ نے بھی اس کی شرح لکھنا شروع کی تھی مگر مکمل نہیں کر سکے۔(۱)

شرح ابن قیم: حجۃ الاسلام شمس الدین محمد بن ابوبکر قیم جوزی م۷۵۱ھ نے منذری کی تہذیب کے مطابق ابوداؤد کی شرح وتہذیب کی تھی جو نہایت بلند پایہ اور مفید کتاب ہے، اس میں اس کے مشکلات سے تعرض اور معلول احادیث پر فاضلانہ بحثیں کی گئی ہیں، یہ کتاب شائع ہو چکی ہے، غایۃ المقصود کی پہلی جلد کے ساتھ یہ بھی شامل ہے:

شرح مغلطائی: یہ حافظ علاؤالدین مغلطائی بن قلیج م۷۶۲ھ کی ناتمام شرح ہے۔

انتحاء السنن یا عجالۃ العالم: ابومحمود شہاب الدین احمد بن محمد مقدسی م۷۶۵ھ نے خطابی کی معالم السنن کی تلخیص کی اور اس کا نام انتحاء السنن واقتفاء السنن رکھا، بعض لوگوں نے اس کا نام عجالۃ العالم من کتاب العالم بتایا ہے، مکتبہ آستانہ سے چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

شرح ابن ملقن: شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن شافعی م۸۰۴ھ نے زوائد علی الصحیحین کے نام سے دو جلدوں میں ابوداؤد کی ان روایتوں کی شرح کی ہے جو صحیحین میں نہیں ہیں۔

شرح عراقی: ابوزرعہ ولی الدین احمد بن عبدالرحیم زین الدین عراقی م۸۲۶ھ نے بھی اس کی ایک ناتمام شرح لکھی جو ابتدا سے سجدۂ سہو تک سات جلدوں میں ہے، ایک اور جلد میں صیام، حج اور جہاد وغیرہ ابواب کی بھی شرح ہے، اگر یہ شرح مکمل ہوتی تو تقریباً چالیس

---

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص۶۲۔

جلدوں پر مشتمل ہوتی۔

شرح ابن رسلان: ابو العباس احمد بن حسین رملی مقدسی معروف بہ ابن رسلان م ۸۴۴ھ نے سنن ابوداود کی بڑی مکمل اور جامع شرح لکھی تھی، جو سخاوی کے بیان کے مطابق ۱۱ جلدوں میں ہے لیکن علامہ حسین بن محسن انصاری کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ شرح عرب ممالک میں آٹھ ضخیم جلدوں میں دیکھی ہے جو نہایت مفید اور عمدہ مطالب پر مشتمل ہے، مولانا شمس الحق مرحوم لکھتے ہیں کہ میں نے اس کا ایک حصہ دیکھا تو ہے، اس سے اندازہ ہوا کہ وہ نہایت عمدہ شرح ہے، زاہد الکوثری کا بیان ہے کہ وہ ابوداود کی نہایت عمدہ شرحوں میں ہے اور کتب خانہ آستانہ میں اس کی چار جلدیں پائی جاتی ہیں، ابن رسلان حافظ ابن حجر کے ارشد تلامذہ میں تھے، اس لیے انھوں نے اس شرح میں ان کے اقوال وآرا بھی نقل کیے ہیں۔

شرح عینی: علامہ بدر الدین عینی م ۸۵۵ھ کی شرح جو صرف ایک جزء پر مشتمل ہے۔

شرح سیوطی: علامہ جلال الدین سیوطی م ۹۱۱ھ نے مرقاۃ الصعود الٰی سنن ابی داود کے نام سے شرح لکھی۔

شرح سندی: علامہ ابو الحسن سندی م ۱۱۳۹ھ نے دیگر کتب صحاح کی طرح فتح الودود علیٰ سنن ابی داود کے نام سے اس کا بھی حاشیہ لکھا تھا جو نہایت مشہور اور مقبول ہے، صاحب کشف الظنون نے اس کو شرح لطیف کہا ہے۔ (۱)

غایۃ المقصود: مولانا شمس الحق عظیم آبادی مرحوم نے ۳۲ جلدوں میں سنن ابی داود کی ایک نہایت مبسوط و جامع اور مفصل شرح لکھی، اس کی صرف ایک ہی جلد دہلی کے مطبع انصاری سے شائع ہوئی ہے، یہ نہایت عمدہ شرح ہے، اس کے شروع میں ایک طویل مقدمہ بھی ہے جس میں ابوداود اور سنن کے متعلق بڑے مفید معلومات درج ہیں، اس کی اہمیت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے اس بیان سے ظاہر ہوتی ہے ''میں نے شیخ ابو الطیب شمس الحق کی شرح

---

(۱) کشف الظنون ومقدمہ غایۃ المقصود ص ۷ تا ۱۰ واتحاف النبلاء ص ۹۰ و ۹۱۔

غایۃ المقصود کا ایک حصہ دیکھا، وہ سنن ابوداؤد کے اسرار وغوامض کے کشف واظہار کے لیے کافی ہے، واللہ یہ خوب شرح ہے، مصنف نے اس میں پوری کاوش کی ہے اور تلاش وجستجو کا حق ادا کردیا ہے(۱) اس شرح کے ساتھ ابن قیم کی شرح اور......کی تلخیص بھی شامل ہے۔

عون المعبود: یہ بھی مولانا شمس الحق ہی کی شرح ہے اور سنن ابی داؤد کے متن کے ساتھ ۴ جلدوں میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی ہے، یہ دراصل غایۃ المقصود کا خلاصہ ہے۔

عام طور سے اس کے مؤلف اور شارح مولانا شمس الحق ڈیانوی سمجھے جاتے ہیں لیکن شرح کی جلد اول کے خطبہ اور اسی جلد کے خاتمہ اور دوسری جلد کے خاتمہ میں مولانا کے چھوٹے بھائی مولانا شرف الحق صاحب نے اس کو اپنی تصنیف بتایا ہے، مگر خود مولانا شمس الحق صاحب نے چوتھی جلد کے خاتمہ وآغاز اور تیسری جلد کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ ان کی تصنیف ہے، مولانا خلیل احمد سہارن پوری اور صاحب معجم المطبوعات نے اس کو مولانا اشرف ہی کی تصنیف قرار دیا ہے،(۲) مگر مولانا تلطف حسین صاحب نے جو مولانا شمس الحق صاحب کے ہم عصر و ہم سبق اور عون المعبود کے ناشر بھی ہیں لکھا ہے کہ ”مولانا شمس الحق صاحب کو شرح ابی داؤد لکھنے کا مبارک خیال مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی کی ترغیب سے ہوا، انھوں نے سنن کے گیارہ نسخے جمع کیے اور ان کا مقابلہ کرکے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور اسی کو اصل قرار دیا، مزی کی تحفۃ الاشراف، منذری کی تلخیص اور امام خطابی کی معالم السنن اور ابن اثیر کی جامع الاصول وغیرہ کو بھی پیش نظر رکھ کر غایۃ المقصود کی تالیف وترتیب شروع کی مگر بعض وجوہ سے اسی درمیان میں ایک مختصر شرح لکھنے کا خیال بھی ان کو ہوا تو عون المعبود کی تالیف شروع کی اور چند ممتاز علما کو اس کام میں معاون بنایا، جنھوں نے متن کی تصحیح اور شرح کی تالیف میں ان کا ہاتھ بٹایا اور مولانا نے ان سب سے ان کی استعداد کے مطابق کام لیا، ان علما کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

---

(۱) مقدمہ بذل المجہود ج اول ص ا۔ (۲) ایضاً ومعجم المطبوعات کالم ص ۳۱۰۔

۱- مولانا ابوعبدالرحمٰن شرف الحق محمد اشرف ڈیانوی جو شارح کے چھوٹے بھائی تھے، ۲- شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی، ۳- مولانا ابو عبداللہ محمد ادریس ڈیانوی جو شارح کے صاحبزادے ہیں، ۴- مولانا عبدالجبار بن نور احمد ڈیانوی جو مصنف کے ماموں زاد بھائی تھے۔ (۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام حضرات بھی عون المعبود کی تالیف میں کسی نہ کسی حیثیت سے مصنف مولانا شمس الحق کے شریک تھے اور بقول مولانا تلطف حسین ''یہ تمام لوگ شارح عون المعبود مولانا شمس الحق صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے اور شب و روز اس خدمت کو انجام دیتے جو مولانا ان کے سپرد کرتے (۲) لیکن اصل شارح مولانا شمس الحق ہی تھے، البتہ چند اور علما نے ترتیب و تالیف میں ان کی اعانت کی تھی، مگر اس اعانت کی بنا پر ان کی جانب اس شرح کو منسوب کرنا صحیح نہیں ہے، یہ عام قاعدہ ہے کہ اساتذہ و شیوخ اپنے شاگردوں سے مواد و معلومات اکٹھا اور مآخذ و حوالے تلاش کراتے اور تصنیف و تالیف کے سلسلہ کے بعض امور ان کے سپرد کرتے ہیں بلکہ بعض ابواب و فصول بھی ان سے لکھا کر ان میں حسب منشا معمولی یا غیر معمولی ترمیم کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اصل کتاب اساتذہ ہی کی جانب منسوب کی جاتی ہے اور اس کو معیوب نہیں خیال کیا جاتا، اس لیے مولانا شرف صاحب کو اس کا مصنف و شارح قرار دینا غلط ہے، وہ صرف اس علمی بورڈ کے ایک رکن تھے، مولانا شمس الحق نے ان کی دلدہی کی وجہ سے کچھ اجزا ان کی جانب منسوب ہو جانے کو ناپسند نہیں کیا۔

التعلیق المحمود: اس کو شیخ فخر الحسن گنگوہی نے مرتب کیا ہے۔

---

(۱) خاتمہ عون المعبود جلد رابع ص ۵۵۳، اس جماعت میں اور بھی بعض حضرات شامل تھے، مولوی ابویحییٰ امام خاں نوشہروی نے اس فہرست میں قاضی یوسف حسین خان پوری ہزاروی اور مولوی محمد شاہجہان پوری کے نام بھی تحریر کیے ہیں (تراجم علمائے اہل حدیث ص ۴۰۲) (۲) خاتمہ عون المعبود جلد رابع ص ۵۵۳۔

الہدی المحمود لترجمۃ سنن ابی داؤد: مشہور مترجم حدیث وقار نواز جنگ مولانا وحید الزماں ابن مسیح الزماں م ۱۹۲۰ء نے دو ضخیم جلدوں میں ایک شرح لکھی جو سنن کے اردو ترجمہ اور تشریحی فوائد پر مشتمل اور چھپ چکی ہے، صاحب شرح کے حالات میں مولانا عبدالحلیم چشتی نے ایک جامع کتاب لکھی ہے جو مکتبہ نور محمد آرام باغ کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

بذل المجہود فی حل ابی داؤد: مشہور حنفی عالم ومحدث مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری کی شرح جو پانچ جلدوں پر مشتمل اور شائع ہو چکی ہے، یہ شرح مفید علمی وفنی مطالب پر مشتمل ہے۔

المنہل المورد: یہ مفید ومختصر شرح حال ہی میں حجاز سے شائع ہوئی ہے لیکن ہماری نظر سے نہیں گذری۔

ایک اعتراض کا جواب: بعض علمائے جرح وتعدیل نے سنن ابی داؤد میں موضوع روایتوں کی بھی نشاندہی کی ہے، علامہ ابن جوزی کے نزدیک اس قسم کی حدیثوں کی تعداد نو ۹ ہے لیکن علمائے محققین نے اس اعتراض کو تسلیم نہیں کیا ہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

> ''سنن ابی داؤد کی اعلیٰ ومستند ترین روایتیں وہ ہیں جن کی شیخین نے تخریج کی ہے اس قسم کی حدیثیں نصف کتاب پر مشتمل ہیں، اس کے بعد ان روایتوں کا نمبر ہے جن کی شیخین میں سے کسی ایک نے تخریج کی ہے، تیسرا درجہ ان روایتوں کا ہے جن کی گو صحیحین میں تخریج نہیں کی گئی ہے تاہم وہ علت وشذوذ سے پاک اور سنداً قوی وجید ہیں، اس کے بعد وہ روایتیں ہیں جو صحیح الاسناد اور صالح سمجھی جاتی ہیں اور دو تین طرق سے مروی ہونے کی بنا پر علما نے ان کو قبول کیا ہے، بعض ایسی روایات بھی ہیں جو رواۃ کے سوء حفظ کی بنا پر ضعیف ہیں اور ان کے بارے میں ابوداؤد نے سکوت اختیار کیا ہے، بعض احادیث باعتبار رواۃ ضعیف ہیں مگر ابوداؤد نے ان کے ضعف کی تصریح کر دی ہے لیکن بعض اوقات وہ

ضعف کے متعلق اس لیے خاموش رہتے ہیں کہ نکارت کا پہلو بہت واضح اور نمایاں ہوتا ہے۔"(۱)

امام خطابی تحریر فرماتے ہیں:

"محدثین کے نزدیک حدیث کی تین قسمیں ہیں ۱۔صحیح، ۲۔حسن، ۳۔سقیم، امام ابوداؤد کی کتاب صحیح اور حسن دونوں قسموں کی جامع اور سقیم کی مختلف بڑی اور اہم قسموں مثلاً موضوع، مقلوب اور مجہول وغیرہ سے یکسر خالی ہے، اگر شاذ و نادر سقیم کی معمولی اور چھوٹی قسموں کی روایتیں درج ہوگئی ہیں تو امام صاحب اس کی حقیقت و نوعیت بیان کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گئے ہیں"(۲)

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنن ابی داؤد موضوع روایتوں سے پاک ہے، البتہ ضعیف و مرسل روایتوں کے پائے جانے کا خود امام صاحب نے اپنے رسالہ میں ذکر و اعتراف کیا ہے لیکن اس سے اس کی اہمیت، شہرت، وثوق اور اعتبار و استناد میں کوئی فرق نہیں آتا۔

امام صاحب کا یہ بیان کہ "مالم یذکر فیه شيء فهو صالح" یعنی جن روایتوں کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے، وہ صالح ہیں، علمائے فن کی بحث و نظر کا خاص موضوع رہا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عام طور سے علما نے اس طرح کی حدیثوں کو صحیح و حسن تسلیم کیا ہے لیکن مکمل استقصا و تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی بعض حدیثیں ضعیف بھی ہیں۔ واللہ اعلم۔

---

(۱) سیر النبلاء (۲) شرح معالم السنن ج۱ ص۶۔

امام بقی بن مخلد قرطبیؒ

(متوفی ۲۷۶ھ)

نام ونسب: بقی نام، ابو عبد الرحمٰن کنیت اور شیخ الاسلام لقب تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے: بقی بن مخلد بن یزید۔

ولادت ووطن: اندلس کے مشہور شہر اور اسلامی علوم وفنون اور تہذیب وثقافت کے مرکز قرطبہ میں ۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔(۱)

اساتذہ وشیوخ: بقی بن مخلد نے تقریباً تین سو اساتذہ سے کسب فیض کیا تھا، ان کا شمار امام احمد کے خاص اور مایۂ ناز شاگردوں میں ہوتا ہے، ان کے اکثر شیوخ کو امام مالک، سفیان بن عیینہ، امام شافعی اور حماد بن زید وغیرہ جلیل القدر محدثین اور فقہا سے شرف تلمذ حاصل تھا، چند ممتاز مشائخ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن محمد شافعی، ابراہیم بن منذر حزامی، ابوثور، ابومصعب زہری، احمد بن ابراہیم دورقی، ابوطاہر احمد بن سرح، بکار بن عبداللہ، حارث بن مسکین، خلیفہ بن خیاط، دحیم، ابوخیثمہ زہیر بن حرب، زہر بن حماد، سحنون بن سعید، سلمہ بن شعیب، صفوان بن صالح، ابوبکر عبداللہ بن ابی شیبہ، عبداللہ بن ذکوان، عون بن یوسف، محمد بن بشار بندار، محمد بن عبداللہ بن نمیر، محمد بن عبید بن حسان، محمد بن عیسیٰ اعشیٰ، محمد بن عمر عدنی، محمد بن محمد مصطفیٰ حمصی، ہارون بن عبداللہ حمال، یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر، یحییٰ بن عبدالحمید حمانی، یحییٰ بن یحییٰ لیثی وغیرہ(۲)

---

(۱) تاریخ ابن عساکر ج۳ ص ۲۷۷ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۷۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۴ وتاریخ العلماء والرواۃ الاندلس لابن الفرضی ص ۱۰۹۔

تلامذہ: ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، بعض کے نام حسب ذیل ہیں:

''احمد بن بقی، احمد بن عبداللہ اموی، اسلم بن عبدالعزیز، حسن بن سعید (یا سعد) عبداللہ بن یونس قیری مرادی، (۱) محمد بن عمر لبابہ، محمد بن وزیر وغیرہ۔

طلب علم کے لیے سفر: انھوں نے علم کی تحصیل و تکمیل کے لیے مغرب و مشرق کے اکثر شہروں کا سفر کیا تھا، مورخین نے ان کو ذو رحلۃ واسعۃ (یعنی کثیر الاسفار بتایا ہے) ابن مندہ اور حمیدی کا بیان ہے کہ ''رحلت اور طلب حدیث کے لیے ان کے سفر مشہور ہیں''

علم کی طلب و تحصیل میں تن آسانی کو ناپسند کرتے تھے، اپنے شاگردوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ طالب علم بنتے ہو؟ اس طرح بھی علم کی طلب کی جاتی ہے کہ جب تم فارغ ہوتے ہو اور تم کو کوئی ضرورت نہیں ہوتی تو حصول علم کے لیے نکلتے ہو، میں نے ایسے جانباز اور شوقین طالب علم دیکھے ہیں جن کے پاس کھانے کے لیے درخت کے پتوں کے سوا کچھ نہ تھا اور انھوں نے کاغذ خریدنے کے لیے اپنے پائجامے تک بیچ دیے۔

حدیث میں درجہ و مرتبہ: امام بقی نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق علم حدیث کی جانب زیادہ توجہ کی اور اس میں اتنا کمال پیدا کیا کہ ان کا شمار اکابر محدثین میں ہوتا ہے، مورخین اور علمائے سیر نے لکھا ہے کہ بالغ فی الجمع والروایۃ یعنی حدیث کی روایت و تحریر میں ان کو بڑا انہماک تھا، حفظ و ضبط اور صدق و ثقاہت میں بھی ممتاز تھے، علامہ ذہبی نے ان کو ثقہ حجت اور ثبت اور حافظ ابن عساکر نے الحافظ اور حمیدی نے من الحفاظ المحدثین لکھا ہے، حدیث کے ضبط و نقل میں ان کی احتیاط اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ ان کو کم سنی میں سفیان ثوریؒ کے بعض تلامذہ سے ملاقات و استفادہ کا موقع ملا تھا مگر ان سے روایت کرنے سے احتراز کیا۔(۲)

تفقہ و اجتہاد: فقہ و اجتہاد میں بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے، کسی خاص امام یا مذہب کے پابند نہ

(۱) یہ امام بقی کے بڑے ممتاز شاگرد اور ان کے راویہ کہلاتے تھے، بقی کی کتابوں کی نشر و اشاعت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۴ و تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۷۹۔

تھے بلکہ خود فقیہ و مجتہد اور صاحب اختیارات تھے، حافظ ذہبی اور علامہ ابن عساکر وغیرہ نے لکھا ہے وکان مجتهدا متخيرا لايقلد احدا، (۱) یعنی وہ مجتہد، صاحب اختیارات اور کسی امام کے مقلد نہ تھے۔

علوم کی اشاعت: ایک بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ممالک مشرق سے واپسی کے بعد اندلس کی سرزمین کو احادیث و روایات کی نشر و اشاعت سے معمور کر دیا، حافظ ابن عساکر وغیرہ کا بیان ہے:

رجع الى الاندلس فملأها علما جما۔	یعنی اندلس واپس آکر اس کو علوم سے مملو کر دیا۔

متعدد اہم اور امہات کتب کو اندلس میں متعارف کرایا، مورخین کا بیان ہے:

كتب المصنفات الكبار وادخلها الاندلس ونشربها علم الحديث۔ (۲)	وہ بڑی اور بلند پایہ کتابوں کو نقل کر کے اندلس لائے اور یہاں علم کی اشاعت کی۔

ابن الفرضی نے تصریح کی ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الفقہ (الام) امام شافعی، کتاب التاریخ و کتاب الطبقات لخلیفہ بن خیاط اور سیر عمر بن عبدالعزیز کو وہی اندلس لائے اور اہل اندلس کو اس سے متعارف کرایا۔ (۳)

علم و فضل کا اعتراف: محدثین اور ارباب کمال نے امام بقی کے دینی و علمی کمالات کا اعتراف کیا ہے، علامہ ذہبی نے ان کو امام، قدوہ، احدالائمۃ الاعلام، عدیم المثال اور یکتائے روزگار لکھا ہے، احمد بن ابی خیثمہ فرماتے ہیں کہ ''جس شہر میں بقی جلوہ فرما ہوں، وہاں کے کسی آدمی کو ہم لوگوں کے پاس آنے کی کیا ضرورت؟'' علامہ ابن حزم لکھتے ہیں کہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۶۰۴ و تاریخ ابن عساکر ج۳ ص۳۷۹ (۲) تاریخ ابن عساکر ج۳ ص۳۷۹

(۳) تاریخ العلماء والرواۃ للاندلس ص۱۰۸ و ۱۰۹۔

''وہ امام احمد کے مخصوص اور ارشد تلامذہ میں تھے اور امام بخاری، مسلم اور نسائی کے ہمسر ومثیل تھے'' طاہر بن عبدالعزیز کا بیان ہے کہ میں نے مسند بقی کا ایک جز محمد بن اسماعیل صائغ کو دکھایا تو انھوں نے فرمایا کہ ''یہ شخص بحر علم کا شناور ہے'' وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ''عراق سے واپسی کے بعد میں اپنے محترم استاذ یحییٰ بن بکیر کی خدمت میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو انھوں نے مجھے اپنے پہلو میں بٹھایا اور مجھ سے سات حدیثیں سنیں۔ (۱)

بعض فقہا کی مخالفت: دوسرے ارباب کمال کی طرح ان کو بھی علما وفقہا کی ایک جماعت کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، وہ بڑے متبع سنت تھے، اس لیے مجتہدین اور فقہا کی تقلید کے بجائے براہ راست احادیث وآثار کی پیروی کرتے تھے، اس زمانہ میں اندلس میں فقہ مالکی کا غلبہ تھا، اس لیے عموماً لوگوں کو مؤطا اور اہل مدینہ کی حدیثوں سے زیادہ واقفیت تھی اور اس کے مقابلہ میں اہل عراق کے متعلق یہ بدگمانی تھی کہ وہ قلیل الاحادیث ہیں، چنانچہ بقی نے جب مصنف ابن ابی شیبہ کا جس کو وہ لائے تھے درس دینا اور احادیث کی نشر واشاعت شروع کی تو فقہا کی ایک جماعت مسائل میں اختلاف کو برداشت نہ کر سکی اور بقی کی مخالفت شروع کر دی، عوام کو بھی ان کے خلاف بھڑکا دیا، ان کو مخالفت کے اس طوفان سے مجبور ہو کر درس وتدریس کا مشغلہ ترک کر دینا پڑا، جب فرمانروائے اندلس محمد بن عبدالرحمٰن بن حکم اموی کو جو خود بھی صاحب علم اور علم وفن اور علما کا بڑا قدر شناس تھا، اس ہنگامہ کی خبر ہوئی تو اس نے شیخ الاسلام اور ان کے مخالفین کو طلب کیا اور مصنف ابن ابی شیبہ کو منگا کر خود اس کا مطالعہ کیا اور اس قدر پسند کیا کہ اپنے کتب خانہ کے لیے اس کی نقل فراہم کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ ہمارا کتب خانہ ایسی اہم کتاب سے خالی نہ ہونا چاہیے اور شیخ الاسلام سے کہا کہ آپ علم کی نشر واشاعت جاری رکھیں اور احادیث رسول کا جو ذخیرہ آپ کے پاس ہے اس سے لوگوں کو فیض یاب فرمائیں اور مخالفین کو بھی تنبیہ کی کہ ان سے آئندہ کسی قسم کا تعرض نہ کریں۔ (۲)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۲۰۴ و ۲۰۵ وتاریخ ابن عساکر ج ۳ص ۲۷۹ وتاریخ العلماء والرواۃ ص ۱۰۸ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۳ص ۲۷۸۔

زہد وتقویٰ: زہد وورع میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، مورخین اور علمائے سیر نے ان کو متدین، زاہد اور صاحب تقویٰ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ائمہ محدثین اور زہاد صالحین میں تھے۔

نماز: شب بیدار اور نوافل وتہجد کے پابند تھے، یافعی نے متبتل اور ذہبی نے عابد ومتہجد لکھا ہے۔

تلاوت قرآن: تلاوت قرآن سے اتنا شغف تھا کہ ہر رات کو تہجد کی نماز میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے۔

روزہ: رمضان کے علاوہ بھی اکثر مسلسل روزے رکھتے تھے لیکن جمعہ کو افطار کرتے تھے۔

حج بیت اللہ: تیس یا پینتیس مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے دوبار بلاد مشرق تشریف لے گئے، پہلی مرتبہ بیس اور دوسری دفعہ چودہ سال تک وہاں مقیم رہے، دونوں مرتبہ ان کا معمول تھا کہ وہ سال بھر مختلف شہروں کے علمائے فن اور محدثین کی خدمت میں حاضر ہو کر علم وفن کی تحصیل کرتے تھے اور حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ چلے جاتے اور حج وزیارت سے شرف اندوز ہوتے تھے۔

جہاد: ان میں جہاد کا بھی جذبہ تھا، چنانچہ کئی جنگوں میں شریک ہوئے۔

دعا کی برکت: مستجاب الدعوات تھے اکثر لوگ ان کی دعا کی برکت وتاثیر کی وجہ سے ان سے دعا کی فرمائش کرتے تھے۔

اخلاق وعادات: بڑے ستودہ صفات، متواضع اور خلیق تھے، لوگوں کے درد وغم میں شریک رہتے، ان کی حاجت روائی کرتے، مریضوں کی عیادت اور جنازوں میں شرکت معمول تھا، ہر نیک کام سے رغبت تھی، کبھی کسی سائل کو واپس نہ کرتے، اگر کچھ نہ ہوتا تو کپڑے تک دے دیتے۔

حق پسندی: بڑے حق پسند اور حق گو تھے سچی بات کہنے میں کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے۔(۱)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۴ و ۲۰۵ وتاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۸۔

وفات: مشہور اور صحیح روایت کے مطابق انھوں نے سہ شنبہ ۲۹ر جمادی الاخریٰ ۲۷۶ھ کو اندلس میں وفات پائی، امام دارقطنی نے ۲۷۳ھ کی بھی روایت کی ہے لیکن یہ ضعیف ہے، محمد بن یزید نے نماز جنازہ پڑھائی اور بنوعباس کی جانب منسوب ایک قبرستان میں دفن کیے گئے۔(۱)

حلیہ: دراز قد تھے، داڑھی گھنی تھی، بالوں میں خضاب لگاتے تھے۔(۲)

تصنیفات: علامہ بقی کثیر التصانیف اور صاحب کمال مصنف تھے، ابن عساکر نے لکھا ہے، انھوں نے نہایت عمدہ کتابیں لکھیں جو ان کی جامعیت، دقت نظر، کثرت مطالعہ اور وسعت معلومات پر شاہد ہیں، ان کی تصنیفات بے نظیر اور اسلام کی اہم اور بنیادی کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں'' (۳) مگر افسوس ہے کہ بہت سے قدما کی طرح ان کی کتابیں بھی ناپید ہوگئیں جن کتابوں کے نام معلوم ہوسکے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- فتاوائے صحابہؓ و تابعینؒ و من دونہم۔

۲- کتاب التفسیر: اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ علامہ ذہبی و یافعی نے اس کو جلیل القدر بتایا ہے، علامہ ابن حزم کے خیال میں یہ لاجواب اور عدیم المثال تفسیر تھی، وہ اس کو تفسیر ابن جریر پر بھی ترجیح دیتے تھے۔

۳- ان کی تصنیفات میں مسند کبیر سب سے اہم اور عظیم الشان تصنیف ہے، جو ایک ہزار تین سے زیادہ صحابہؓ کی حدیثوں پر مشتمل ہے، حافظ ابن جوزی اور علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ سولہ سو سے زیادہ صحابہؓ کی حدیثیں اس میں درج تھیں، اس کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے، اس لیے اس کو مصنف و مسند دونوں کہا جاتا ہے، ابن حزم کے حسبٌ ذیل بیان سے اس کی اہمیت اور صحت و اعتبار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

---

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۹ و تاریخ العلماء الاندلس ص ۱۰۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۴ (۳) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۹۔

''اس کتاب کو انھوں نے صحابہ کے ناموں پر مرتب کیا ہے، اس میں ایک ہزار تین سو سے زیادہ کی روایات ہیں، ہر صحابی کی حدیث کو فقہ واحکام کے ابواب وعنوانات کے تحت نقل کیا گیا ہے، اس اعتبار سے یہ مسند بھی ہے اور مصنف بھی، میرے علم میں اس مرتبہ واہمیت کی اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، انھوں نے اپنی ثقاہت، ضبط، اتقان، حدیث میں جامعیت اور جودتِ شیوخ کے باوجود ایک سو چوراسی راویوں سے اس کی روایت کی ہے جو قریب قریب سب مشہور اور بلند پایہ محدث ہیں۔''(۱)

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ''ابن حزم نے اس کو مسند احمد بن حنبل پر ترجیح دی ہے، جو میرے خیال میں محل نظر ہے، مسند ابن حنبل اس سے بھی زیادہ جامع وجید کتاب ہے۔''(۲)

☆☆☆

---

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۷۹ و کشف الظنون ج ۲ ص ۱۶۳۱ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۶۔

امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ

(متوفی ۲۷۹ھ)

نام ونسب: امام موصوف نسباً قبیلۂ بنی سلیم سے تعلق رکھتے تھے، محمد نام، ابو عیسیٰ کنیت ہے اور نسب نامہ یہ ہے:

محمد بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک، سلمی ترمذی بوغی، علامہ سمعانی نے ضحاک کے بجائے شداد لکھا ہے۔(۱)

وطن: خراسان اور ماوراء النہر کا خطہ ہمیشہ سے علم وفن اور ارباب کمال کا مرکز رہا ہے، تاریخ اسلام کے بہت سے نامور علما اسی خاک سے اٹھے، امام ابو عیسیٰ ترمذی بھی اسی مردم خیز سرزمین کے ایک فرزند تھے، صنعانیان کے مشہور شہر ترمذ کو آپ کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے، ترمذ کا لفظ ترمذ، تَرمذ، تُرمذ تینوں طریقوں سے ہے لیکن عام طور پر ترمذ ہی مشہور ہے، یاقوت نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے،(۲) یہ شہر دریائے جیحون کے مشرقی کنارے پر بلخ کے محاذ میں کسی زمانہ میں بڑا آباد اور بارونق شہر تھا، یہاں بڑے بڑے ارباب کمال پیدا ہوئے، سمعانی اور یاقوت نے بعض کے مختصر حالات لکھے ہیں، بوغی ایک قریہ بوغ کی جانب نسبت ہے، جو ترمذ سے چھ فرسخ کی مسافت پر ہے، بعض روایتوں کے مطابق امام ترمذی اسی میں آسودۂ خواب ہیں۔(۳)

(۱) دیکھو کتاب الانساب نسبت ترمذی ورق ۱۰۶ (۲) معجم البلدان ج ۲ ص ۳۸۲ ذکر ترمذ (۳) ابن خلکان ج ۲ ص ۳۸۳۔

پیدائش: امام موصوف ۲۰۹ھ میں ترمذ میں پیدا ہوئے، اس کی تفصیل نہیں ملتی کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی لیکن اس زمانہ میں خراسان اور ماوراء النہر کا علاقہ علم وفن کا مرکز بن چکا تھا اور امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث کی مسندِ علم بچھ چکی تھی اور دور دور کے تشنگان علم یہاں کھچ کھچ کر آتے تھے، اس سے قیاس یہی ہے کہ امام ترمذی نے ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی ہوگی۔

سماع حدیث کے لیے سفر: اسلام کی تعلیمات اور علم دین کی بنیاد کتاب اللہ کے بعد حدیث نبوی پر ہے، اس کے بغیر دین کا صحیح اور پورا علم نہیں ہوسکتا، اس لیے ہر دور میں مسلمانوں نے اس کی جانب بڑا اعتنا کیا، خصوصاً ابتدائی چند صدیوں میں اس کی اشاعت وحفاظت کا اتنا اہتمام کیا جس کی مثال دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کرسکتی، نفس حدیث کے متعلق بہت سے علوم ایجاد ہوگئے، حجاز، عراق، خراسان، ماوراء النہر، شام ومصر ومغرب وغیرہ دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں مرکز حدیث قائم ہوگئے تھے، حجاز کے بعد عراق وخراسان کو اس باب میں ایک خاص امتیاز حاصل رہا ہے، اکثر بڑے بڑے محدثین یہیں پیدا ہوئے، اس لیے ان مقامات میں حدیث کا ذوق وشوق عام تھا، امام بخاری کے علم وشہرت نے اس شوق کو اور بڑھایا، اسی ماحول میں امام ترمذی کا نشو ونما ہوا، خود ان کے وطن میں امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث پیدا ہوچکے تھے، اس لیے امام ترمذی کو بھی حدیث نبوی کا شوق دامن گیر ہوا، چنانچہ انھوں نے خراسان اور ماوراء النہر کے علاوہ سماع حدیث کے لیے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں کا سفر کیا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں طاف البلاد وسمع خلقاً من الخراسانيين والعراقيين والحجاز. (۲) یعنی انھوں نے متعدد شہروں کا سفر کیا اور خراسان وعراق اور حجاز کے ارباب کمال سے سماع کیا۔

اساتذہ: ان کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، ان کے ناموں پر نظر ڈالنے سے اندازہ

ابن خلکان ج ۲ ص ۴۸۳ (۲) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۷۔

ہوتا ہے کہ انھوں نے اس دور کے ہر خرمن حدیث سے خوشہ چینی کی، ان میں امام بخاری ومسلم کے شیوخ بھی ہیں، ان سب کا استقصا دشوار ہے، سمعانی اور ذہبی نے بعض ممتاز شیوخ کے نام لکھے ہیں، امام بخاری، مسلم، علی بن حجر مروزی، ہناد بن سری، ابوکریب، محمد بن العلا، محمد بن موسیٰ الزمن، محمد بن بشار، عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی، قتیبہ بن سعید، ابومصعب، ابراہیم بن عبداللہ ہروی، اسماعیل بن موسیٰ، سوید بن نصر، محمد بن عبدالملک، عبداللہ بن معاویہ جمحی، وغیرہ (۱) یہ تمام شیوخ اپنے عہد کے جلیل القدر محدث تھے، اکثر اصحاب صحاح نے ان سے استفادہ کیا ہے، ان کے مختصر حالات یہ ہیں:

۱- ابوالحسن علی بن حجر بن ایاس سعدی مروزی بڑے متبحر عالم اور اکابر حفاظ حدیث میں تھے، شعر وادب کا بھی ذوق رکھتے تھے، حدیث کے علاوہ قرآن کے بڑے عالم تھے، ذہبی نے ان کی کتاب احکام القرآن کا ذکر کیا ہے ۲۴۴ھ میں وفات پائی۔ (۲)

۲- ابوالسری ہناد بن سری تمیمی، بڑے عابد ومرتاض محدث تھے، ذہبی انھیں قدوہ، زاہد اور شیخ الکوفہ لکھتے ہیں، ساری عمر علائق دنیوی سے آزاد ہوکر، عبادت وریاضت میں بسر کی، زہد وعبادت کی وجہ سے کوفہ کے راہب کہلاتے تھے، امام احمد لوگوں کو ان کی جانب رجوع کرنے کا مشورہ دیتے تھے، زہد پر ایک کتاب بھی لکھی تھی، ۲۴۳ھ میں وفات پائی (۳)

۳- ابوکریب محمد بن العلا بڑے جلیل القدر حافظ تھے، کوفہ میں ان کا کوئی مقابل نہ تھا، حفظ حدیث میں وہ اپنے شیوخ سے بھی زیادہ معتبر مانے جاتے تھے، انھوں نے کوفہ میں تین لاکھ حدیثوں کی اشاعت کی، ان کے ایک شاگرد موسیٰ بن اسحاق نے ان سے ایک لاکھ حدیثیں سنی تھیں، ۲۴۸ھ میں وفات پائی۔ (۴)

۴- ابوبکر محمد بن بشار بن عثمان عبدلی، بصرہ کے بڑے حافظ حدیث تھے، ان کے

---

(۱) کتاب الانساب نسبت ترمذی وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۷ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۶ (۳) ایضا ص ۹ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۰۔

تلامذہ کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، ان کی روایات میں بعض محدثین نے کلام کیا ہے لیکن ان کا درجہ اس سے ظاہر ہے کہ بخاری ومسلم ان سے حدیثیں لیتے تھے، ۲۵۲ھ میں وفات پائی۔(۱)

۵- ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن تمیمی، دارمی، سمرقند کے جلیل القدر عالم اور حافظ حدیث تھے، ان کی علمی جلالت اور حفظ حدیث پر محدثین کا اتفاق ہے، امام احمد بن حنبل انھیں امام حدیث کہتے تھے، فقہ وتفسیر میں بھی کمال حاصل تھا، زہد وورع میں بھی ممتاز تھے، محمد بن ابراہیم کا بیان ہے کہ وہ عقل ودیانت کے انتہائی درجہ پر تھے، ان کا علم حفظ ودرایت اور زہد وعبادت ضرب المثل تھا، سمرقند میں انہی کی ذات سے حدیث وآثار کی اشاعت ہوئی، وہ مفسر کامل اور فقیہ عالم تھے، فن حدیث وتفسیر مین ان کی تصانیف ہیں، ابن حبان لکھتے ہیں کہ وہ حافظ ومتقن اور زاہد ومتورع تھے، انھوں نے حفظ کے ساتھ حدیثوں کو جمع کیا، ان کو سمجھا، اس پر کتاب لکھی، سنت کو پھیلایا، اس کی حفاظت کی، اس کی دعوت دی، اس کے مخالفوں کو مٹایا، خطیب لکھتے ہیں کہ انھوں نے حدیث کی تلاش میں بڑے طویل سفر کیے، وہ حفظ واتقان، صدق وورع، زہد وعبادت تمام کمالات کے جامع تھے، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی سب نے ان سے فیض حاصل کیا ہے، دنیاوی وجاہت سے بھاگتے تھے، ایک مرتبہ اصرار سے مجبور ہوکر عہدۂ قضا قبول کرلیا تھا لیکن پھر ایک ہی فیصلہ کے بعد مستعفی ہوگئے، ۲۵۵ھ میں وفات پائی۔(۲)

۶- ابورجا قتیبہ بن سعید بلخی بغلانی، خراسان کے نامور حافظ حدیث تھے، حافظ ذہبی انھیں شیخ الحفاظ اور محدث خراسان لکھتے ہیں، ان کے حفظ پر محدثین کا اتفاق ہے، دولت علم کے ساتھ دولت دنیا سے بھی بہرہ ور تھے، ۲۴۰ھ میں وفات پائی۔(۳)

۷- ابومصعب احمد بن ابی بکر زہری امام مالک کے شاگرد رشید اور مدینہ منورہ

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۷۰ وا ۷ (۲) تہذیب ج ۵ ص ۲۹۶ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۳۔

کے مشہور محدث، فقیہ اور قاضی تھے، فقہ میں ان کا پایہ بلند تھا، ذہبی انھیں امام الفقہ لکھتے ہیں، اہل مدینہ کے مذاہب پر بڑی وسیع نظر تھی، ابن حجر نے سنہ وفات ۲۴۲ھ اور ذہبی نے ۲۹۹ھ لکھا ہے۔(۱)

۸- ابو اسحاق ابراہیم بن عبدالرحمٰن ہروی، اصل وطن ہرات تھا لیکن بغداد میں متوطن ہو گئے تھے، ہرات کے ممتاز حفاظ میں تھے۔(۲)

۹- ابو محمد اسماعیل بن موسیٰ فزاری کوفہ کے محدث تھے، ان کے تشیع کی وجہ سے بعض محدثین نے ان کی روایات میں کلام کیا ہے لیکن ابن حبان نے ثقات میں لکھا ہے اور بخاری، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے ان سے روایت کی ہے، ۲۴۵ھ میں وفات پائی۔(۳)

۱۰- ابوبکر محمد بن عبدالملک، امام احمد بن حنبل کے خاص اصحاب میں ہیں، بغداد کے محدث تھے، طلب حدیث میں بڑے طویل سفر کیے، تمام اصحاب سنن نے ان سے روایتیں لی ہیں ۲۵۸ھ میں وفات پائی۔(۴)

۱۱- ابو جعفر عبداللہ بن معاویہ جمحی بصرہ کے محدث تھے، ابن حبان نے ثقات میں لکھا ہے، اصحاب صحاح میں ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ کے شیخ تھے ۲۴۳ھ میں وفات پائی (۵)

حافظہ: امام ترمذی کے لیے قدرت کی جانب سے حفظ کے تمام سامان فراہم ہو گئے تھے، ایک طرف شیوخ میں ایسے اکابر محدثین سے استفادہ کا موقع ملا، دوسری طرف حافظہ نہایت قوی تھا اس کا ایک حیرت انگیز واقعہ رجال کی تقریباً سب کتابوں میں موجود ہے کہ انھوں نے ایک شیخ سے ایک جزو کے بقدر حدیثیں قلم بند کیں، اتفاق سے تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کو پھر ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا، انھوں نے شیخ مذکور سے دوبارہ سماع حدیث کی

---

(۱) تہذیب ج ۱ ص ۳۰ و تذکرہ ج ۲ ص ۲۷ (۲) تہذیب تذکرۂ ابراہیم (۳) تہذیب ج ۱ ص ۳۳۵ و ۳۳۶ (۴) تذکرہ ج ۲ ص ۱۳۳ (۵) تہذیب ج ۶ ص ۳۸۔

درخواست کی، شیخ نے سنانا شروع کی، امام ترمذی کے ہاتھ میں ایک سادہ بیاض تھی، شیخ کو شبہ ہوا کہ اس میں وہ حدیثیں لکھی ہوئی ہیں، ابوعیسیٰ امتحاناً ایسا کررہے ہیں، اس لیے ان کو ناگوار ہوا، ابوعیسیٰ نے یہ غلط فہمی دور کرکے کہا کہ مجھے آپ کی حدیثیں حفظ ہیں اور اسی وقت کل حدیثیں سنادیں، شیخ نے کہا معلوم ہوتا ہے تم نے میرے پاس آنے سے پہلے ان کو حفظ کرلیا تھا، ابوعیسیٰ نے کہا نہیں، اگر آپ کو شبہ ہو تو دوسری حدیثیں سنا کر امتحان کرلیجیے، شیخ نے امتحاناً چالیس غریب حدیثیں سنائیں، ابوعیسیٰ نے صرف ایک مرتبہ سن کر اسی وقت چالیسوں حدیثیں دہرادیں، یہ غیر معمولی حافظہ دیکھ کر شیخ کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا۔(۱)

اعتراف کمال: یوں تو امام ترمذی نے بہت سے شیوخ سے استفادہ کیا تھا لیکن جس سے ان کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا، وہ امام بخاری ہیں، وہ امام بخاریؒ کے خاص تلامذہ میں تھے، ان کے فیض اور امام ترمذی کے حافظہ، ذوق وشوق اور تلاش وجستجو نے ان کو اس عہد کا امام بنادیا، ان کے علم وکمال پر تمام محدثین اور علما کا اتفاق ہے، ابن حبان لکھتے ہیں کہ امام ترمذی ان لوگوں میں تھے جنھوں نے حدیثوں کا ذخیرہ جمع کیا، اس پر تصنیف کی اور انھیں حفظ کیا، حافظ ذہبی اور ابن حجر دونوں ان کو امام حدیث لکھتے ہیں، امام بخاری کے بعد خراسان میں ان سے بڑا کوئی محدث نہ تھا، "مات البخاری ولم یخلف بخراسان مثل ابی عیسی فی العلم والورع" وہ امام بخاری کے خلیفہ شمار کئے جاتے تھے، خود امام بخاری کو لائق شاگرد پر ناز تھا اور انھوں نے ان الفاظ میں ان کے کمال علم کی سند عطا کی تھی کہ تم نے مجھ سے جتنا فائدہ حاصل کیا، اس سے زیادہ میں نے تم سے حاصل کیا،(۲) اس سند کے بعد امام ترمذی کے لیے اور کسی سند کی ضرورت نہیں رہ جاتی، امام بخاری نے ان سے ایک حدیث روایت کی ہے۔

تلامذہ: ان کے علمی کمالات نے ان کی ذات کو طالبان حدیث کا مرجع بنادیا تھا، ان کے

(۱) بستان ص ۱۲۱ (۲) تہذیب ج ۹ ص ۳۸۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۸ وبستان المحدثین ص ۱۲۱۔

تلامذہ میں خراسان اور ترکستان کے علاوہ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے آدمیوں کے نام ملتے ہیں، چند ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابو حامد احمد بن عبداللہ بن داؤد مروزی، ہیثم بن کلیب الشامی، محمد بن محبوب، ابوالعباس محبوبی مروزی، احمد بن یوسف نسفی ، ابوالحارث اسد بن حمدویہ، داؤد بن نصر بن سہل بزدوی، عبد بن محمد بن محمود نسفی، محمود بن نمیر، محمد بن محمود، محمد بن مکی بن نوح، ابوجعفر محمد بن سفیان بن النظر، محمد بن المنذر وغیرہ۔(۱)

تفسیر: حدیث امام ترمذی کا خاص فن تھا، اس کے علاوہ تفسیر میں پورا درک اور فقہ میں کمال رکھتے تھے، ترمذی میں انھوں نے ابواب تفسیر کے تحت میں آیات قرآنی کے متعلق جو احادیث نبوی اور آثار صحابہ جمع کیے ہیں ان سے تفسیر کے متعلق ان کے علم ونظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

فقہ: حفظ حدیث کے ساتھ وہ مجتہد فقیہ تھے، ان کے تفقہ پر جامع ترمذی شاہد ہے، ترمذی کا خاص امتیاز یہی ہے کہ وہ محض احادیث کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ فقہی اجتہاد کی کتاب بھی ہے، اس میں امام ترمذی نے مختلف ائمہ کے فقہی مذاہب، ان کے استنباطات اور دلائل کو جمع کر دیا ہے اور جا بجا اس پر تنقید بھی کرتے گئے ہیں، مزید بحث آئندہ آئے گی۔

عملی زندگی: امام ترمذی میں جس درجہ کا علم تھا، اسی درجہ کا عمل اور زہد وتقویٰ بھی تھا، وہ زہد وورع میں بھی امام بخاری کے جانشین تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

مات البخاری ولم یخلف بخراسان مثل ابی عیسیٰ فی العلم والحفظ والورع والزھد۔(۲)

خشیت الٰہی: ان کا دل خشیت الٰہی سے اتنا لبریز تھا کہ ہر وقت رویا کرتے تھے اور روتے روتے آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی (۳) لیکن دل کی آنکھیں روشن ہوگئی تھیں، بعض

(۱) تہذیب التہذیب ج۹ ص۳۸۷ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۲۰۸ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۲۰۸

روایتوں میں ہے کہ وہ پیدائشی نابینا تھے لیکن یہ صحیح روایتوں کے خلاف ہے اور یوں بھی خلاف قیاس ہے، اس لیے کہ ایک نابینا کا ایسے زمانہ میں جب کہ سفر کی سہولتیں نہ تھیں ساری دنیائے اسلام کی خاک چھاننا عقل سے بعید ہے اور طلب حدیث کے لیے امام ترمذی کی سیاحت مسلم ہے۔

امام ترمذی کا مذہب: امام ترمذی کا زمانہ ائمہ اربعہ کے بعد ہے لیکن وہ ان میں سے کسی کے مقلد نہ تھے بلکہ خود مجتہد تھے، بعض مسائل میں امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کی تائید سے بعضوں کو یہ گمان ہوا کہ وہ شافعی یا حنبلی تھے لیکن اس سے ان کی تقلید کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے، انھوں نے بعض مسائل میں ان کی مخالفت بھی کی ہے، مثلاً گرمی کی شدت میں نماز ظہر کی تاخیر کے مسئلہ میں ان کی رائے امام شافعی کے خلاف ہے، وہ اپنی تحقیق سے جو رائے دیتے تھے، کبھی کسی کے موافق پڑ جاتی تھی اور کبھی مخالف، اس لیے کسی امام کی تائید سے ان کو اس کا مقلد سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

ایک التباس کا ازالہ: امام ابوعیسیٰ ترمذی کے علاوہ دو اور محدثین ترمذی کی نسبت سے مشہور ہیں، ایک ابوعبداللہ محمد بن علی المعروف بحکیم الترمذی، دوسرے ابوالحسن احمد بن حسن ترمذی، یہ دونوں صاحب تصنیف ہیں، حدیث میں حکیم ترمذی کی نوادر الاصول مشہور کتاب ہے لیکن یہ بہت غیر معتبر ہے، اس لیے نام سے دھوکا نہ کھانا چاہیے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

"حکیم ترمذی ابوعیسیٰ ترمذی کے علاوہ دوسرے شخص ہیں، حکیم ترمذی کی نوادر الاصول کی اکثر حدیثیں غیر معتبر ہیں، ناواقف حکیم ترمذی کو ابوعیسیٰ ترمذی سمجھ کر ان کی غیر معتبر حدیثیں امام ترمذی کی جانب منسوب کر دیتے ہیں، ان دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے (۱) ابوالحسن ترمذی البتہ بڑے پایہ کے محدث ہیں امام احمد بن حنبل کے اصحاب میں

(۱) بستان المحدثین ص ۶۸۔

تھے، بخاری، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ نے ان سے روایتیں کی ہیں، ۲۴۰ھ میں وفات پائی۔(۱)

وفات: مشہور روایت کے مطابق امام ترمذی نے ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔(۲)

تصانیف: مورخین کے اجمالی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ترمذی کی بہت سی تصانیف تھیں لیکن ان کی تین تصانیف کا علم ہے، جامع یا سنن ترمذی، شمائل ترمذی اور کتاب العلل، ابن ندیم نے تین کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، ان میں دو تو ترمذی اور کتاب العلل ہیں لیکن تیسری کا نام اس نے کتاب التاریخ لکھا ہے۔(۳)

جامع ترمذی سے پہلے کی کتب حدیث: امام ترمذی سے بہت پہلے مسلمانوں میں نہ صرف حفظ وطلب حدیث بلکہ اس کی تدوین کا بھی شوق پیدا ہو گیا تھا اور محدثین کی یادداشتوں کے علاوہ باقاعدہ مرتب ومبوب کتابیں مرتب ہو چکی تھیں، خود ترمذی کے زمانہ میں بھی حدیث کی مختلف قسموں کے مجموعے مرتب ہوئے، ان میں اولیت کا سہرا امام دار الہجرۃ امام مالک کے سر ہے۔

موطا کے علاوہ اس وقت تک حدیث کی جو کتابیں تالیف ہو چکی تھیں، اُن میں سے بعض قابل ذکر کتابوں کے نام یہ ہیں:

مسند ابوداؤد طیالسی المتوفی ۲۰۴ھ، مصنف عبدالرزاق بن ہمام المتوفی ۲۱۱ھ، مسند عبداللہ بن زبیر حمیدی المتوفی ۲۱۹ھ، سنن سعید بن منصور المتوفی ۲۲۷ھ، مصنف عبداللہ بن محمد المعروف بہ مصنف ابن ابی شیبہ المتوفی ۲۳۵ھ، مسند عبداللہ بن حمید الکشی المتوفی ۲۴۰ھ، مسند احمد بن حنبل المتوفی ۲۴۱ھ، مسند عبداللہ بن عبدالرحمٰن تمیمی دارمی المتوفی ۲۵۵ھ، صحیح محمد بن اسماعیل بخاری المتوفی ۲۵۶ھ، صحیح مسلم بن حجاج المتوفی ۲۶۱ھ، سنن ابن ماجہ المتوفی ۲۷۳ھ، سنن ابی داؤد المتوفی ۲۷۵ھ، مسند یحییٰ بن عبدالحمید حمانی المتوفی ۲۲۸ھ، مسند

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۱۱۷ (۲) اتحاف النبلاء ص ۳۸۷ (۳) فہرست ابن ندیم ص ۳۲۵۔

نعیم بن حماد خزاعی المتوفی ۲۲۸ھ، مسند مسدد بن مسرہد المتوفی ۲۲۸ھ، مسند اسحاق بن راہویہ المتوفی ۲۳۸ھ۔(۱)

ان کے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام ترمذی سے پہلے کتنے راہ رواس دشوار گذار منزل سے گذر چکے تھے، گوان میں سے زیادہ تر مؤطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو حسن قبول کا درجہ حاصل ہوا لیکن اعتبار اور استناد سے بعض اور کتابیں بھی محروم نہ رہیں، ان کی موجودگی میں حدیث کی کسی اور کتاب کی تالیف کا خیال اور اس کا حسن قبول پانا اور بھی دشوار تھا، اس لیے امام ترمذی نے گذشتہ کتابوں سے الگ اپنی راہ نکالی اور اپنی کتاب میں ایسی خصوصیات پیدا کیں جن سے گذشتہ کتابیں خالی تھیں، اس سے نہ صرف یہ کتاب اپنی ماسبق کتابوں سے ممتاز ہوگئی، بلکہ فائدہ کے لحاظ سے بھی سب سے بڑھ گئی، اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

جامع ترمذی: تمام فنون خصوصاً فن حدیث میں کمیت سے زیادہ اس کی کیفیت نقص وکمال کا معیار ہے، یعنی روایت اور درایت کے اصول کے اعتبار سے صحیح حدیثوں کا مختصر مجموعہ معلل حدیثوں کے ضخیم مجموعوں سے کہیں بہتر ہے، اسی معیار سے ہم کو جامع ترمذی کا جائزہ لینا چاہیے، ترمذی کا درجۂ صحت اس سے ظاہر ہے کہ امت نے اس کو صحاح کا درجہ دیا اور ترتیب میں اس کو صحیحین کے بعد ہی جگہ ملی۔

حدیث کی صحت وعدم صحت کا مدار دو چیزوں پر ہے، رواۃ کی حیثیت اور سلسلۂ سند کی کیفیت، اصول حدیث کے رو سے رواۃ کے بارے میں سب اصحاب صحاح کے بنیادی شرائط تقریباً یکساں ہیں، یعنی راوی کا اسلام، فہم وفراست، صداقت، عدم تدلیس، عدالت مع جملہ شرائط حفظ، ضبط، تیقظ، عدم وہم، سلامت ذہن اور صحت عقیدہ سب کے نزدیک ضروری شرائط ہیں۔(۲) پھر ان اوصاف میں کمی وزیادتی کے اعتبار سے رواۃ کے

(۱) ان کتابوں کی تفصیل کے لیے دیکھو بستان المحدثین شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ (۲) اصحاب ستہ کے شرائط بہت سی کتابوں میں ہیں، ہمارے پیش نظر ابو بکر حازمی کی شروط الائمۃ الخمسہ ہے۔

مدارج قائم ہو جاتے ہیں اور ان مدارج اور سند کی حیثیت اور اس کے اقسام کے اعتبار سے حدیث کی صحت و عدم صحت اور نقص و کمال سے اختلاف شروع ہو جاتا ہے، مثلاً امام بخاری اور مسلم عموماً وہی حدیثیں قبول کرتے ہیں جن کے راویوں کی ثقاہت و عدالت متفق علیہ ہو، جرح و تعدیل کے رو سے بالکل مامون و مصئون ہوں، سند نقائص سے پاک ہو، بلکہ حاکم نے صحیحین کے شرائط میں ایک روایت کے لیے ان اوصاف کے دو راویوں کے ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن یہ شرط کلیہ کی صورت میں صحیح نہیں ہے کیوں کہ امام بخاری کی تمام روایتیں اس شرط کے مطابق نہیں ہیں، البتہ اس کا بڑا حصہ اسی قسم کا ہے۔

امام ترمذی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ روایت کسی نہ کسی امام یا محدث کی معمول بہا ہونا چاہیے، خواہ راوی اور سند اصول حدیث کے رو سے یکسر نقائص سے پاک نہ ہو، چنانچہ وہ چوتھے طبقہ تک کے راویوں کی روایتیں قبول کر لیتے ہیں اور صحیح، مسلسل اور مرفوع روایتوں کے ساتھ ضعیف، مرسل، منقطع اور مضطرب روایتوں کو بھی رد نہیں کرتے لیکن عموماً اس قسم کی روایتوں کو وہ شواہد اور متابعات کی حیثیت سے لیتے ہیں یعنی ایک صحیح روایت کے ساتھ اس کی تائید میں دوسری معلل روایت قبول کرتے ہیں لیکن وہ ہر روایت کا عیب و ہنر اور نقص و کمال بھی ظاہر کر دیتے ہیں، اس لیے پڑھنے والے کو اس کی حیثیت اور درجہ کا علم ہو جاتا ہے، یہ خصوصیت ترمذی کے علاوہ صحاح کی اور کسی کتاب میں نہیں ہے۔

جامع ترمذی کی خصوصیات: گو صحاح میں ترتیب کے لحاظ سے ترمذی کا درجہ صحیحین کے بعد ہے لیکن اس کی خصوصیات کی وجہ سے اس کا افادہ صحاح کی تمام کتابوں سے زیادہ عام ہے، شیخ الاسلام اسماعیل ہروی لکھتے ہیں کہ ترمذی بخاری اور مسلم سے زیادہ فائدہ بخش ہے، ان دونوں کتابوں سے صرف صاحب کمال اور صاحب نظر فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ترمذی نے احادیث کی ضروری شرح بھی کر دی ہے، اس لیے اس سے محدثین اور فقہا وغیرہ ہر طبقہ کے

لوگ مستفید ہو سکتے ہیں،(۱) ترمذی کی یہ خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱- اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تمام حدیثیں کسی نہ کسی امام، محدث، یا فقیہ کی معمول بہا ہیں، یعنی ہر روایت کسی نہ کسی صاحب علم کے نزدیک صحیح، اسقام سے پاک، لائق حجت اور قابل عمل ہے، صرف دو حدیثیں اس سے مستثنیٰ ہیں، ایک یہ کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر خوف وخطر یا سفر اور بارش کی رخصت کے مدینہ میں ظہر اور عصر کی نمازیں ایک ساتھ پڑھیں۔'' دوسری یہ کہ ''جب کوئی شراب پیئے تو اس کے کوڑے لگاؤ، تین مرتبہ سزا کے بعد بھی اگر باز نہ آئے تو قتل کر دو۔''(۲)

۲- دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف اس میں روایات کی تکرار بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے، دوسری طرف ایک مسئلہ کے متعلق مختلف روایتوں کی جانب اشارہ بھی کر دیا ہے، مثلاً ایک روایت نقل کرنے کے بعد لکھ دیتے ہیں کہ اس باب میں فلاں فلاں راویوں سے بھی حدیث مروی ہے اور اس روایت کے متن میں جو کمی یا زیادتی ہوتی ہے اس کو بھی ظاہر کر دیتے ہیں۔

۳- تیسری خصوصیت یہ ہے کہ جرح وتعدیل کے رو سے جس روایت یا سند میں جو عیب وہنر ہوتا ہے، اس کو ظاہر کر دیتے ہیں، مثلاً یہ حدیث صحیح ہے، حسن ہے، ضعیف ہے، مضطرب ہے، مرسل ہے، منقطع ہے، غیر محفوظ ہے، سند قوی نہیں ہے، فلاں راوی متکلم فیہ ہے، اس کے حفظ میں کلام ہے، یا نسیان ہے، وغیر ذالک، جس سے پڑھنے والے کو اس کی حیثیت اور درجہ کا علم ہو جاتا ہے۔

۴- چوتھی یہ کہ فقہی حدیثوں میں فقہا کے مذاہب، ان کے استنباطات دلائل اور ان کے اختلافات اور اس پر اپنی رائے بھی ظاہر کر دیتے ہیں مثلاً اس حدیث سے فلاں امام نے احتجاج واستدلال کیا ہے، اس میں یہ اختلاف ہے، یا اس کا استدلال صحیح نہیں ہے،

(۱) مقدمہ احوذی (۲) کتاب العلل ص ۷۴۶۔

اس سے ائمہ کے مذاہب اور ان کے اختلافات کا بھی علم ہو جاتا ہے، اس خصوصیت نے ترمذی سے فقہی استفادہ کو بہت آسان کر دیا ہے۔

۵- پانچویں یہ کہ رواۃ کے ناموں، کنیتوں اور القاب کے اجمال کی تفصیل کر دی ہے۔

اس کی ان خصوصیات نے ترمذی کی افادی حیثیت کو بھی بڑھا دیا ہے، ابن اثیر جزری لکھتے ہیں کہ حسن ترتیب مکررات کی کمی اور فائدہ کی زیادتی کے لحاظ سے ترمذی حدیث کی بہترین کتابوں میں ہے، اس کے علاوہ اور کسی کتاب میں مختلف مذاہب، ان کے وجوہ استدلال اور حسن وغریب حدیث کے اقسام کی تفصیل نہیں ہے۔''(۱)

شمائل ترمذی کے محشی شیخ ابراہیم بن محمد شافعی باجوری کہتے ہیں کہ امام ترمذی کی جامع تمہارے لیے کافی ہے، وہ تمام حدیثی اور فقہی فوائد اور سلف وخلف کے مذاہب کی جامع، مجتہد کے لیے کافی اور مقلد کو دوسری کتابوں سے بے نیاز کرنے والی ہے۔(۲)

شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک جامع ترمذی، بخاری، مسلم اور ابوداؤد تینوں کی بعض اچھی خصوصیات کی جامع ہے اور اس میں ان سے زیادہ مفید باتیں ہیں، چنانچہ وہ بخاری، مسلم اور ابوداؤد کی خصوصیات بتانے کے بعد لکھتے ہیں:

''چوتھے ابوعیسیٰ ترمذی ہیں، انھوں نے بخاری، مسلم اور ابوداؤد کی بعض خصوصیات کو اپنی کتاب میں جمع کر دیا ہے، شیخین کے طریقہ پر متون اور اسناد کے ابہام کی تفصیل کر دی ہے اور ابوداؤد کے طریقہ پر ان احادیث کو جمع کر دیا ہے جن پر کسی کا عمل ہے اور ان تینوں پر یہ اضافہ ہے کہ صحابہ اور مختلف ملکوں کے فقہا کے مذاہب کا بھی ذکر کر کے اپنی کتاب کو جامع بنا دیا ہے، طرق حدیث کا نہایت لطیف اختصار کیا ہے، اس طرح کہ ایک حدیث نقل کر کے دوسرے طرق کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور ہر حدیث کے عیب وہنر کو ظاہر کر دیا ہے کہ صحیح یا حسن یا ضعیف یا منکر ہے اور وجہ ضعف بھی بتا دی ہے تا کہ طالب کو قابل

(۱) جامع الاصول و...... ص ۱۰۳ (۲) مواہب لدنیہ ص ۷۔

اعتبار اور نا قابل اعتبار حدیث سے واقفیت ہو جائے، جس کا نام بتانے کی ضرورت تھی، اس کا نام لے لیا ہے جس کی کنیت کی ضرورت تھی، اس کی کنیت بتادی ہے، غرض انھوں نے صاحب علم کے لیے کوئی چیز مخفی نہیں چھوڑی ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جامع ترمذی مجتہد کے لیے کافی اور مقلد کے لیے دوسری کتابوں سے بے نیاز کرنے والی ہے،(۱) شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رقمطراز ہیں کہ ''یہ جامع ترمذی حدیث کی بہترین کتابوں میں ہے بلکہ بعضے وجوہ اور حیثیات سے حدیث کی تمام کتابوں سے بہتر ہے، ایک ترتیب وعدم تکرار کی حیثیت سے دوسرے فقہا کے مذاہب اور ان کے استدلال کے ذکر کی حیثیت سے، تیسرے حدیث کے اقسام صحیح، حسن، ضعیف، غریب اور معلل بعلل کے ذکر کی حیثیت سے، چوتھے رواۃ کے نام، ان کے القاب اور کنیتوں اور علم رجال کے متعلق دوسرے فوائد کی حیثیت سے۔(۲)

ابن حزم کی تنقید: امام ترمذی کی علمی جلالت اور جامع ترمذی کی مذکورہ بالا خصوصیات کے باوجود اس پر بعض محدثین نے تنقید بھی کی ہے، ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز امام ابن حزم کا امام ترمذی کو مجہول لکھنا ہے لیکن ان کے اس بیان کو بالاتفاق محدثین نے رد کیا ہے اور اس کو امام ترمذی سے ابن حزم کی ناواقفیت کا نتیجہ قرار دیا ہے، چنانچہ حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں:

''حافظ العلم ابوعیسیٰ ترمذی کی ثقاہت متفق علیہ ہے اور ان کے بارے میں ابومحمد بن حزم کا یہ قول کہ وہ مجہول ہیں، نا قابل توجہ ہے، درحقیقت ابن حزم ان سے اور ان کی کتاب جامع اور علل سے واقف ہی نہ تھے۔''(۳)

حافظ ابن حجر امام ترمذی کے کمالات لکھنے کے بعد فرماتے ہیں:

''ابومحمد بن حزم نے ترمذیؒ مجہول لکھ کر اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے، وہ غالبًا

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ج۱ص۱۲۱ (۲) بستان المحدثین ص۱۲۱ (۳) میزان الاعتدال ج۳ص۱۱۷۔

ترمذی سے واقف ہی نہ تھے اور نہ ان کو ان کے حفظ اور تصانیف کی خبر تھی، ابن حزم نے اس قسم کے الفاظ بعض اور مشہور ثقات حفاظ مثلاً امام ابوالقاسم بغوی، اسماعیل بن محمد الصفار اور ابوالعباس الاصم وغیرہ کے متعلق بھی استعمال کئے ہیں، یہ البتہ تعجب انگیز امر ہے کہ حافظ ابن الفرضی نے اپنی کتاب ''المؤتلف والمختلف'' میں ترمذی کے رتبہ کے مطابق ان کا تذکرہ کیا ہے، اس پر ابن حزم کی نظر کیسے نہیں پڑی۔''(۱)

موضوعات ابن جوزی اور جامع ترمذی: اس سلسلہ میں دوسری چیز یہ ہے کہ ابن جوزی نے موضوعات میں ترمذی کی ۲۳ روایتوں کو موضوع شمار کیا ہے لیکن محدثین نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے، اس بارے میں ابن جوزی کا تشدد مشہور ہے، جس طرح حاکم حدیث کی تحسین کرنے میں غیر محتاط ہیں، اسی طرح ابن جوزی موضوع کہہ دینے میں متشدد ہیں اور ان دونوں کا یہ تشدد و تساہل مشہور ہے، ابن جوزی نے ترمذی کے علاوہ صحاح کی بعض اور کتابوں بلکہ صحیح مسلم تک کی بعض روایات کو موضوع کہہ دیا ہے، محدثین نے ان کے اس تشدد پر بحث کی ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ:

''ابن جوزی کی موضوعات میں زیادہ تر موضوع حدیثیں ہیں اور قابل تنقید حدیثوں کے مقابلہ میں ناقابل تنقید حدیثیں بہت کم ہیں، پھر بھی اس میں ایک خرابی یہ ہے کہ ابن جوزی بعض ان حدیثوں کو بھی جو موضوع نہیں ہیں، موضوع گمان کر لیتے ہیں جس طرح حاکم میں یہ نقص ہے کہ وہ غیر صحیح حدیث کو بھی صحیح کہہ دیتے ہیں، ان دونوں کے اس تشدد و تساہل کی وجہ سے ان کی کتابوں سے ماہر فن کے علاوہ دوسرا فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اس لیے کہ ان کی ہر نقل کردہ حدیث میں اس تساہل اور بے احتیاطی کا امکان رہتا ہے'' حافظ سیوطی نے القول الحسن فی الذب عن السنن میں ثابت کیا ہے کہ ترمذی کی روایتیں موضوع نہیں ہیں۔(۲)

(۱) تہذیب التہذیب ج۹ ص ۳۸۸ (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۸۰۔

ایک اعتراض واشکال اور اس کا جواب: امام ترمذی پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انھوں نے جامع ترمذی کی روایات کی تحسین وتصحیح میں تساہل سے کام لیا ہے اور وہ ایک ہی حدیث کو حسن صحیح، حسن غریب اور حسن صحیح غریب تک کہہ دیتے ہیں، حالانکہ کسی ایک حدیث میں ایک ساتھ ان تینوں اوصاف یا ان میں سے کسی دو کا اجتماع نہیں ہوسکتا، محدثین نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں۔

درحقیقت یہ اعتراض اور اشکال اس لیے پیش آتا ہے کہ حدیث، حسن، صحیح اور غریب کے ایک متعین معنی ایک خاص تعریف اور ایک قسم کو معیار قرار دے کر اس پر ترمذی کے حسن، صحیح اور غریب کو منطبق کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے اگر ان حدیثوں کے جملہ مراتب ودرجات ان کے اقسام ان کی مختلف نوعیتوں اور اس بارے میں محدثین کے اختلافات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ اشکال پیدا نہیں ہوسکتا، اولاً ترمذی خود مجتہد تھے، انھوں نے ان اصطلاحوں کے مروجہ معنی کو بجنسہٖ قبول نہیں کیا تھا بلکہ ان کی بعض اصطلاحوں کا مفہوم عام اصطلاحوں سے مختلف تھا، مثلاً حسن کی مشہور تعریف یہ ہے کہ جس کا مخرج معلوم ہو اور اس کے رجال مشہور ہوں، (۱) لیکن ترمذی کے نزدیک حسن وہ ہے جس کا کوئی راوی کذب سے متہم نہ ہو اور روایت شاذ نہ ہو (۲) اور جیسا کہ شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے مقدمہ شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ یہ بھی حسن کی محض ایک قسم کی تعریف ہے، (۳) نیز امام ترمذی نے خود اس کی تصریح کردی ہے کہ جس حدیث کو انھوں نے حسن کہا ہے، اس سے عام محدثین کی اصطلاح نہیں بلکہ ان کا حسن مراد ہے۔ (۴)

اسی طریقہ سے حدیث کی صحت کے بہت سے مدارج اور اس کی مختلف نوعیتیں ہیں اور اس کے لحاظ سے صحیح کی بہت سی قسمیں ہوجاتی ہیں، ابن صلاح لکھتے ہیں کہ ”حدیث

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۳ (۲) کتاب العلل ص ۶۵۳ مطبع العلوم دہلی (۳) مقدمہ تحفۃ الاحوذی (۴) کتاب العلل ص ۶۵۴۔

صحیح وہ ہے جس کی سند شروع سے آخر تک مسلسل ہو، اس کے تمام راوی عادل وضابط ہوں اور روایت شاذ ومعلل نہ ہو، ایسی حدیث بالاتفاق تمام محدثین کے نزدیک صحیح ہے، یعنی یہ صحت کا اعلیٰ درجہ ہے، پھر کسی حدیث میں ان اوصاف کے پائے جانے یا نہ پائے جانے کے اختلاف کی بنا پر صحت کے لیے کسی امام یا محدث کے نزدیک ان شرائط میں سے کسی شرط کے ضروری نہ ہونے کی بنا پر اس حدیث کی صحت وعدم صحت میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، جیسے مرسل حدیث جن ائمہ کے نزدیک حجت ہے، ان کے نزدیک وہ حدیث صحیح میں شامل ہے اور جن کے نزدیک حجت نہیں ہے، ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے، پھر جب محدثین کسی حدیث کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے نزدیک صحت کے شرائط اس میں موجود ہیں، یہ ضروری نہیں ہے کہ واقع میں بھی ایسا ہی ہو...... اسی طریقہ سے جب کسی حدیث کے متعلق محدثین ہ کہتے ہیں کہ وہ صحیح نہیں ہے تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ وہ جھوٹی ہے کیوں کہ ایسی بعض حدیثیں بھی درحقیقت سچی ہوتی ہیں بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی سند ان کے نزدیک صحت کے شرائط کے مطابق ہے.......... پھر صحیح حدیث کی دو قسمیں ہیں، متفق علیہ اور مختلف فیہ، پھر اس کی قسمیں مشہور اور غریب ہیں پھر کسی حدیث میں صحت کے شرائط کے تمکن کے لحاظ سے صحت کے درجات میں فرق پیدا ہو جاتا ہے یعنی جس کمال کے ساتھ یہ شرائط پائے جائیں گے، اسی قدر صحت کا درجہ بڑھ جائے گا اور اس میں جتنی کمی ہوگی اسی اعتبار سے صحت میں فرق پیدا ہو جائے گا، اس لحاظ سے صحیح حدیث کی بے شمار قسمیں ہو جاتی ہیں۔(۱)

اسی طرح صحیح اور حسن کی دو قسمیں ہیں، صحیح لذاتہٖ اور حسن لذاتہٖ اور صحیح لغیرہ اور حسن لغیرہ، صحیح لذاتہٖ اور حسن لذاتہ کی تعریف تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی، صحیح لغیرہ وہ ہے جس میں صحیح لذاتہ کے تمام شرائط تو نہ پائے جاتے ہوں لیکن کثرت طرق نے اس کمی کو پورا

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ۶۔

کردیا ہو، حسن لغیرہ وہ حدیث ہے جس میں ضعف ہو لیکن تعدد طرق نے اس ضعف کو دور کردیا ہو، اسی طرح سے غرابت کی دو قسمیں ہیں، متن کی غربت اور سند کی غرابت، یعنی سند میں کوئی راوی منفرد ہوگیا ہو یا کسی حدیث کے اصل متن میں عام روایات کے خلاف کوئی جزوی کمی یا زیادتی یا تغیر ہو۔

ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھنے کے بعد حسن، صحیح اور غریب کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا، مثلاً ایک ہی حدیث میں ایک محدث کے نزدیک حسن یا صحیح کے جملہ شرائط پائے جاتے ہیں، اس لیے اس کے نزدیک وہ حسن یا صحیح ہوگی اور دوسرے کے نزدیک نہیں پائے جاتے، اس لیے اس کے نزدیک نہ حسن ہوگی نہ صحیح، ایک کے نزدیک حسن کے شرائط پائے جاتے ہیں دوسرے کے نزدیک صحیح کے، اس لیے ایک کے نزدیک حسن ہوگی دوسرے کے نزدیک صحیح ہوگی۔

اسی طریقہ سے ایک ہی حدیث ایک کے نزدیک حسن ہوسکتی ہے اور دوسرے کے نزدیک صحیح، جس کو امام ترمذی نے حسن صحیح سے تعبیر کیا ہے بلکہ ایک شخص کے نزدیک ایک ہی حدیث حسن لذاتہ اور صحیح لغیرہ ہوسکتی ہے، یا ایک حدیث دو سندوں سے مروی ہے، ایک سند کے اعتبار سے حسن ہے، دوسری متن کے اعتبار سے صحیح، پھر صحیح کے بہت سے مدارج ہیں، ان مدارج کے اعتبار سے صحیح کے ادنیٰ درجہ کا اجتماع حسن کے اعلیٰ درجہ کے ساتھ ہوسکتا ہے اور اس لحاظ سے کہ صحیح کے اعلیٰ شرائط کے تحت میں حسن کے ادنیٰ شرائط خود بخود آ جاتے ہیں، ہر صحیح حدیث حسن کہی جاسکتی ہے اور متقدمین کے یہاں صحیح حدیث پر حسن کا اطلاق ملتا ہے، اس کے علاوہ حسن اور صحیح کے اجتماع کی محدثین نے اور صورتیں بھی نقل کی ہیں۔

اسی طریقہ سے غرابت اور حسن میں بھی کوئی تضاد نہیں ہے، ممکن ہے ایک حدیث سند کے اعتبار سے غریب ہو اور متن کے اعتبار سے حسن اور ترمذی کی مراد یہی ہے، اسی طریقہ سے صحت اور غرابت کا اجتماع بھی ہوسکتا ہے، شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے

مقدمۂ مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ صحت اور غرابت کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں ہے۔(۱)

غرض صحیح حسن اور غریب کے جملہ اقسام و مدارج اور اختلاف کو پیش نظر رکھنے کے بعد ان کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا، اسی سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ترمذی نے حدیثوں کی تحسین و تصحیح میں بھی تساہل سے کام نہیں لیا ہے بلکہ وہ کسی نہ کسی پہلو سے حسن و صحیح ہوتی ہے۔

یوں تو کتاب اللہ کے علاوہ کسی کتاب کے متعلق قطعی صحت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، بخاری و مسلم تک خردہ گیری سے محفوظ نہیں ہیں، ایسی حالت میں ترمذی کیوں محفوظ رہتی لیکن مجموعی حیثیت سے سلف سے لے کر خلف تک اس کی صحت مسلمہ چلی آتی ہے جس کا ثبوت صحاح ستہ میں اس کا شمار ہوتا ہے، پھر صحاح میں بھی صحیحین کے بعد ہی اس کو جگہ ملی، ملا کاتب چلپی لکھتے ہیں "هو ثالث الكتب لستة فى الحديث" (۲) اور ائمہ حدیث اس کو احادیث حسن کی بنیاد قرار دیتے ہیں، ابن صلاح لکھتے ہیں "کتاب ابی عیسیٰ اصل فی معرفۃ الحدیث الحسن" (۳) یعنی امام ترمذی کی کتاب حدیث حسن کی معرفت کے لیے اصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ترمذی کے متعلق اوپر بہت سے اکابر علما و محدثین کی رائیں گذر چکی ہیں، یہاں تک ان کے اعادے کی ضرورت نہیں، خود ترمذی کے زمانہ میں عراق، خراسان اور حجاز کے علما و محدثین سے اس کو حسن قبول کی سند مل چکی ہے، امام ترمذی کا بیان ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے بعد میں نے اس کو حجاز، عراق اور خراسان کے علما کے سامنے اظہار رائے کے لیے پیش کیا، ان سب نے اس کو پسند کیا اور اہل نظر نے اس کو یہ سند عطا کی کہ من كان فى بيته هذا الكتاب فكانما فى بيته نبى يتكلم یعنی جس کے گھر میں یہ کتاب موجود

(۱) تحفۃ الاحوذی بحوالہ مقدمہ مشکوٰۃ ص۲۰۰ (۲) کشف الظنون ج۱ ص۵۷۴ (۳) مقدمہ ابن صلاح ص۱۳۔

ہو، اس کے گھر میں گویا نبی بول رہا ہے،(۱) اہل علم شعرا نے اس کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے بستان المحدثین اور حطہ میں یہ قصائد نقل کیے ہیں۔(۲)

شروحِ ترمذی: ترمذی کی اہمیت اور اس کی فائدہ رسانی کی وجہ سے علما محدثین نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا، اس کی شرحیں لکھیں، حواشی لکھے، مختصرات مرتب کیے، اس کے مشکلات حل کیے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر معلومات کا بیش قیمت ذخیرہ فراہم کر دیا۔

صاحب کشف الظنون نے اس کی آٹھ شرحوں کا ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ سب سے پہلی اور قدیم شرح حافظ ابوبکر محمد بن عبداللہ شبیلی المعروف بہ ابن العربی المتوفی ۵۴۶ھ کی عارضۃ الاحوذی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے بستان المحدثین میں اس کا مستقل تذکرہ کیا ہے،(۳) اس کا ایک حصہ مجموعہ شروح اربعہ کے ساتھ چھپ گیا ہے،(۴) اور کامل نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۲۔ دوسری حافظ ابوالفتح محمد بن محمد بن سید الناس یعمری شافعی المتوفی ۷۳۴ھ کی شرح، یہ بڑی ضخیم ہے، شارح نے اس میں حدیث کے علاوہ اور بھی بہت سے مباحث شامل کر دیے ہیں، دو ثلث کی یہ شرح دس جلدوں میں آئی ہے اور مصنف کے قلم سے تمام نہ ہو سکی، ان کے بعد حافظ زین الدین عبدالرحیم بن حسین العراقی المتوفی ۸۰۶ھ نے پوری کی، اس کا مکمل نسخہ بھی مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں ہے۔

۳۔ تیسری صحیحین اور ابوداؤد پر ترمذی کے زوائد کی سراج الدین عمر بن علی الملقن

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۸ (۲) حطہ ص ۴۰۴ و بستان المحدثین ص ۱۲۲ (۳) بستان المحدثین ص ۱۳۷ (۴) نواب محمد علی خاں مرحوم والی ٹونک کے فرزند نواب زادہ محمد عبدالوہاب خاں صاحب ترمذی کی چار شرحوں عارضۃ الاحوذی قوت المغتذی سیوطی اور ابوطیب سندھی اور سراج احمد سرہندی کی شرحوں کو مجموعہ شروح اربعہ کے نام سے چھپوایا تھا غالباً اس کی ایک ہی جلد چھپ سکی۔

المتوفی ۸۰۴ھ کی شرح ہے۔

۴- چوتھی سراج الدین عمر بن رسلان بلقینی شافعی المتوفی ۸۰۵ھ کی شرح العرف الشذی یہ بھی تمام نہ ہو سکی، صرف ایک ٹکڑے کی شرح ہے۔

۵- پانچویں حافظ زین الدین عبدالرحمٰن بن احمد بن نقیب حنبلی المتوفی .... کی شرح بیس جلدوں میں تھی، کسی ہنگامے میں ضائع ہوگئی، اب اس کا نام صرف کتابوں میں ملتا ہے۔

۶- چھٹی حافظ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کی شرح القوت المغتذی، اس کا ایک حصہ شروح اربعہ کے ساتھ چھپا ہے۔

۷- ساتویں حافظ زین الدین عبدالرحمٰن بن احمد بن رجب حنبلی المتوفی ۷۹۵ھ کی شرح، اس کا اور کچھ حال نہیں معلوم۔

۸- آٹھویں شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندی مدنی المتوفی ۱۱۳۸ھ کی شرح، شیخ مذکور نے اس کو مدینہ طیبہ میں لکھا تھا، کشف الظنون نے اسے بڑی لطیف شرح لکھا ہے۔(۱)

ملا کاتب چلپی نے صرف ان آٹھ شروح کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان کے علاوہ اور شرحیں بھی ہیں، مثلاً

۹- نویں شیخ سراج احمد سرہندی کی فارسی شرح، اس کا بھی ایک حصہ شروح اربعہ میں چھپا ہے۔

۱۰- دسویں حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ کی اللباب فی مایقول الترمذی فی الباب، امام ترمذی نے فی الباب عن فلاں کہہ کر جن روایتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، اس میں اس کی تفصیل مع جرح وتعدیل ہے، اس کا نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۱۱- گیارہویں ابوطیب سندھی المتوفی ۱۱۰۹ھ کی شرح، یہ بھی شروح اربعہ میں ہے۔

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷۵۔

۱۲- بارہویں حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اپنی ایک شرح کا حوالہ دیا ہے۔

۱۳- تیرہویں مولانا شمس الحق مرحوم عظیم آبادی کی ہدایۃ اللوزعی بنکات الترمذی۔

۱۴- چودہویں الکوکب الدری مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، یہ جامع ترمذی پر مولانا کے افادات ہیں، جسے مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی مرحوم نے مرتب کیا تھا اور مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم نے شائع کیا ہے۔

۱۵- پندرہویں العرف الشذی کے نام سے مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری کے افادات کو ان کے ایک شاگرد نے جمع کیا ہے۔

۱۶- سولہویں مولانا عبدالرحمٰن مرحوم مبارکپوری کی التحفۃ الاحوذی، یہ چھپ گئی ہے، اس کا مقدمہ خاص طور سے اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے، کاتب سطور نے اس مضمون میں اس سے استفادہ کیا ہے۔

۱۷- مولانا اصغر حسین صاحب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے حنفی نقطۂ نظر طلبہ کے استفادہ کے لیے نزول الثوی کے نام سے ترمذی کی احادیث کے متعلق مختلف قسم کے سوالات اوران کے جوابات لکھے ہیں، اس کا ایک حصہ چھپ گیا ہے۔

مختصرات ترمذی: شرحوں کے علاوہ ترمذی کے مختصرات بھی کیے گئے، کشف الظنون میں تین مختصروں کا حال لکھا ہے، ایک نجم الدین محمد بن عقیل الیاسی شافعی المتوفی ۷۲۹ھ کا، دوسرا نجم الدین سلیمان بن عبدالقوی الطوفی حنبلی المتوفی ۷۱۰ھ کا، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے، (۱) اسی سے حافظ صلاح الدین خلیل بن کلیدی علائی نے ترمذی کی سو حدیثوں کا انتخاب کیا ہے۔

تجرید ترمذی: ابوالفضل محمد تاج الدین بن عبدالمحسن المعروف بہ قلعی نے ترمذی کی تجرید

(۱) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج اول ص ۳۱۱۔

بھی کی، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں ہے۔(۱)

حواشی: ان مستقل کتابوں کے علاوہ ترمذی پر بہت سے حواشی بھی لکھے گئے، ہندوستان کی مطبوعہ ترمذی میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری کا حاشیہ زیادہ شائع ہے۔

شمائل ترمذی: اس مضمون کا اصل مقصد جامع پر تبصرہ تھا اور امام ترمذی کی باقی دونوں کتابیں یعنی شمائل اور کتاب العلل موضوع سے خارج ہیں لیکن شمائل کی اہمیت کی وجہ سے اس کا بھی مختصر تذکرہ مناسب معلوم ہوا۔

جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہیں، اسی طرح آپ کے اخلاق مبارک، اعمال، طور طریقے، طبعی امور، آپ کی زندگی کا ہر پہلو اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے حالات جستہ جستہ حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں لیکن امام ترمذی سے پہلے خاص اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہ تھی، یہ سعادت سب سے پہلے امام ترمذی کے حصہ میں آئی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیۂ مبارک، لباس، ساز و سامان، عادات و خصائل، رفتار و گفتار، نشست و برخاست، اخلاق اور معمولات کے متعلق جتنی روایتیں امام ترمذی کو پہنچیں، انھوں نے ان کو شمائل میں جمع کر دیا ہے، گو یہ کتاب مختصر ہے لیکن ایسی جامع ہے کہ اس میں اخلاق نبوی کا پورا مرقع نظر آ جاتا ہے، شمائل ترمذی کے بعد اس موضوع پر اور کتابیں لکھی گئیں لیکن اولیت کا سہرا امام ترمذی کے سر رہا، کشف الظنون میں شمائل ترمذی کے علاوہ دو اور کتابوں کا نام ملتا ہے، ایک ابو العباس جعفر بن محمد المستغفری المتوفی ۴۳۲ھ کی ''شمائل النبی'' دوسری ابو الحسن علی بن محمد بن ابراہیم فزاری المعروف بہ ابن المقری غرناطی المتوفی ۵۵۲ھ کی ''شمائل بالنور الساطع الکامل'' (۲) اس کے علاوہ ایک اور کتاب ''شمائل محمدی'' شیخ عبد الرسول بن عبد الصمد کی ہے (۳)

(۱) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج اول ص ۲۷۹ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۶۷ (۳) فہرست کتب خانہ رام پور ص ۹۳۔

لیکن جو حسن قبول شمائل کو حاصل ہوا وہ کسی کے حصہ میں نہ آیا۔

اس کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ جامع ترمذی کی طرح علما و محدثین نے اس کی بھی بہت سی شرحیں اور حواشی لکھے، بعض شرحوں اور ان کے شارحین کے نام یہ ہیں:

۱- اشرف الوسائل فی شرح الشمائل، حافظ ابن حجر مکی المتوفی ۹۷۳ھ، یہ شرح حرم محترم میں رمضان کے مقدس مہینے میں لکھی گئی تھی۔ (۱)

۲- شرح شمائل مصلح الدین محمد بن صلاح بن جمال اللاری المتوفی ۹۷۹ھ یہ شرح عربی میں ہے، اس کے علاوہ انھوں نے فارسی میں بھی ایک شرح لکھی ہے۔

۳- زہر الخمائل علی الشمائل حافظ جلال الدین سیوطی۔

۴- جمع الوسائل، نور الدین علی بن سلطان محمد القاری المعروف بہ ملا علی قاری المتوفی ۱۰۱۶ھ شیخ محمد بن عمر بن حمزہ انطا کی نے تہذیب الشمائل کے نام سے اس کی تہذیب کر کے اس کو سلطان بایزید کی خدمت میں پیش کیا تھا، (۲) یہ شرح قسطنطنیہ میں ۱۲۹۰ھ میں چھپ چکی ہے۔

۵- شرح شمائل مولانا عصام الدین ابراہیم بن محمد اسفرائینی المتوفی ۹۴۳ھ (۳)

۶- شرح شمائل مولی محمد حنفی، یہ شرح ۹۲۶ھ میں لکھی گئی۔ (۴)

۷- شرح شمائل حافظ زین الدین محمد المعروف بہ عبد الرؤف بن تاج العارفین مناوی المتوفی ۱۰۳۱ھ یہ شرح مولانا عصام الدین اسفرائینی اور ابن حجر مکی کی شرحوں کا

---

(۱) اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیوہ مصر اور کتب خانہ رامپور میں موجود ہے، فہرست کتب خانہ خدیویہ ج ۴ ر ۳۵۹ و فہرست کتب خانہ رام پور ص ۶۵ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۶۷، اس کا قلمی نسخہ مصر کے شاہی کتب خانہ میں ہے، ملاحظہ ہو فہرست کتب عربی کتب خانہ خدیویہ ج ۱ ص ۳۲۷ (۳) اس کا قلمی نسخہ مصر اور پٹنہ لائبریری میں ہے، فہرست کتب خانہ خدیویہ ج ۱ ص ۳۲۷ و مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۱۷۱ (۴) اس کا قلمی نسخہ پٹنہ اور رامپور کے کتب خانوں میں ہے، مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۱۷۱ و فہرست رامپور ج ۱ ص ۹۰۔

خلاصہ ہے اور کچھ مزید اضافے بھی ہیں، خواجہ اسحاق آفندی المتوفی ۱۱۲۰ھ نے ترکی میں اس کا ترجمہ کیا اور مصطفیٰ بن حسین حلبی المعروف بہ مظلوم زادہ نے اسے ترکی میں نظم کیا، (۱) یہ شرح مصر اور قسطنطنیہ کے مطبعوں سے شائع ہو چکی ہے، (معجم المطبوعات کالم ۱۷۹۹)۔

کشف الظنون میں صرف ان شرحوں کا تذکرہ ہے لیکن ان کے علاوہ اور بھی بعض شرحیں ہیں جن کے نام یہ ہیں:

۸- الفوائد الجلیلۃ البہیہ شیخ محمد بن قاسم بن محمد احمد بن جسوس، شارح بارہویں صدی کے آخر کے ممتاز علما میں تھے، (۲) یہ مطبع بولاق میں ۱۲۹۶ھ میں چھپ گئی ہے۔

۹- مواہب محمد یہ شیخ سلیمان بن منصور عجیلی شافعی المتوفی ۱۲۰۴ھ، اس کے قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ اور پٹنہ لائبریری میں ہیں۔ (۳)

۱۰- شرح شمائل شاہ میرک بخاری۔ (۴)

۱۱- اس فخر و منزلت سے ہندوستان بھی محروم نہ رہا اور یہ سعادت و شرف بھی اسی خاندان کے حصہ میں آیا، جس کے فیض سے ہندوستان میں حدیث کا سرچشمہ جاری ہوا، یعنی شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خلف الصدق مولانا نورالحق شارح بخاری و مسلم نے شمائل ترمذی کی بھی ایک شرح لکھی، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ رام پور میں ہے۔ (۵)

۱۲- شرح حسن آفندی ۱۲۵۴ھ میں بولاق میں چھپی ہے (معجم المطبوعات کالم ۷۵۵)

۱۳- خصائل نبوی ترجمۂ اردو شمائل ترمذی مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۶۷، اس کے قلمی نسخے مصر اور پٹنہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، ملاحظہ ہو فہرست مصر ج اول ص ۳۶۰ و مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۲۷۱ (۲) فہرست کتب خانہ مصر ج ۱ ص ۳۸۲ (۳) ایضاً ص ۴۳۶ و مفتاح الکنوز ج ۲ ص ۵۳۴ (۴) مفتاح الکنوز ج ۱ ص ۲۷۱ (۵) فہرست رام پور ص ۹۰۔

مظاہر العلوم، ترجمہ کے ساتھ احادیث کے متعلق مختلف قسم کے مفید معلومات اور مشکلات کا حل بھی ہے، یہ ترجمہ چھپ گیا ہے۔

شرحوں کے علاوہ شمائل کے متعدد حواشی بھی لکھے گئے، دو مشہور حواشی اور محشی کے نام یہ ہیں:

۱- مواہب لدنیہ شیخ ابراہیم بن محمد باجوری المتوفی ۱۲۷۶ھ یہ حاشیہ سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہوا اور عام طور سے متداول ہے۔

۲- حاشیہ ابو الضیاء نور الدین علی بن علی شبر الملی شافعی المتوفی ۱۰۸۷ھ حاشیہ شمائل اور ابن حجر مکی کی شرح شمائل دونوں پر ہے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں ہے (۱)

کتاب العلل: امام ترمذی کی تیسری کتاب کتاب العلل ہے، یہ علل حدیث پر ایک مختصر لیکن مفید رسالہ ہے، حدیث کی صحت اور اس کے اسقام کی جانچ کے لیے جرح وتعدیل کے اصول وقواعد اور مستقل فنون ہیں لیکن بعض حدیثوں میں ایسے مخفی عیوب ہوتے ہیں جن کا علم ان اصولوں اور فنون سے نہیں ہوتا اور ایک روایت اصول وقواعد کے اعتبار سے بالکل صحیح ہوتی ہے لیکن اس میں کوئی ایسی مخفی علت ہوتی ہے جس اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا، اس کے لیے حدیث پر بڑی وسیع اور دقیق نظر کی ضرورت ہے، ان عیوب کے معلوم کرنے کے لیے علل الحدیث ہے، حاکم لکھتے ہیں:

علوم حدیث میں ایک علم حدیث کی علتوں کے جاننے کا علم ہے، یہ صحیح، سقیم اور جرح وتعدیل کے علاوہ ایک مستقل علم ہے..... حدیث مختلف وجوہ سے معلل ہو جاتی ہے جس میں جرح وتعدیل کو کوئی دخل نہیں ہوتا، اس لیے کہ مجروح حدیث تو سرے سے ساقط اور نا قابل اعتبار ہے، اکثر ثقات کی حدیثوں میں ایسی علت ہوتی ہے جو ان کی نظر سے مخفی رہتی ہے اور حدیث معلل ہو جاتی ہے، اس کے علم کا ذریعہ صرف حفظ، فہم اور معرفۃ حدیث

---

(۱) فہرست عربی کتب خانہ خدیویہ ص ۳۳۲۔

ہے۔(۱)

حاکم نے اس کی مثالیں بھی دی ہیں، یہ ایسا دقیق علم ہے کہ اس کے لیے بڑی وسعت ودقت نظر کی ضرورت ہے، اس لیے بہت کم محدثین نے علل حدیث پر لکھا ہے جن لوگوں نے لکھنے کی ہمت کی، ان میں ایک امام ترمذی ہیں، ان کا یہ رسالہ جامع ترمذی کے آخر میں لگا ہوا ہے۔

☆☆☆

(۱) معرفۃ علوم الحدیث حاکم ص ۱۱۲۔

امام حارث بن ابی اسامہ رحمہ اللہ

(متوفی ۲۸۲ھ)

نام ونسب: ابو محمد کنیت، حارث نام اور سلسلہ نسب یہ ہے: حارث بن محمد بن ابو اسامہ بن یزید بن عدی بن سائب بن شماس بن حنظلہ بن عامر بن حارث بن مرۃ بن مالک بن حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ بن تمیم۔(۱)

اپنے دادا کی نسبت سے مشہور ہو کر ...... حارث بن ابو اسامہ کہلاتے ہیں، ابو اسامہ کا اصل نام داہر تھا۔(۲)

خاندان: حارث عرب نژاد اور مشہور قبیلہ بنی تمیم سے تعلق رکھتے تھے،(۳) اسی لیے تمیمی کہے جاتے تھے۔

پیدائش اور وطن: ان کا وطن بغداد ہے(۴) اور غالباً وہ یہیں ماہ شوال ۱۸۶ھ میں پیدا ہوئے،(۵) وطن کی نسبت سے بغدادی بھی کہلاتے تھے۔

اساتذہ وشیوخ: حارث بن ابی اسامہ کو جن اکابر محدثین اور علمائے اسلام سے استفادہ کا موقع ملا، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

اسحاق بن عیسیٰ بن طباع، اسود بن عامر شاذان، حسن بن موسیٰ اشیب، روح بن

(۱) تاریخ بغداد ج۸ص۲۱۹ (۲) بستان المحدثین ص۳۲ (۳) ایضاً (۴) ایضاً (۵) تاریخ بغداد ج۸ ص۲۱۸ وتذکرۃ الحفاظ ج۲ص۱۹۴ والمنتظم ابن جوزی ج۵ص۱۵۵۔

عبادہ، عبداللہ بن بکر، عبدالوہاب بن عطا، عبیداللہ بن موسیٰ عبسی، عفان بن مسلم، علی بن عاصم، محمد بن عمرو اقدی، محمد بن کناسہ، ابوالنضر ہاشم بن قاسم، ہوزہ بن خلیفہ، یزید بن ہارون، ابوبدر سکونی، ابوعاصم نبیل وغیرہ۔

تلامذہ: بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں:

احمد بن سلیمان نجاد، احمد عثمان بن آدمی، احمد بن معروف خشاب، اسماعیل بن علی خطبی، جعفر خلدی، عبدالصمد بن علی طستی، محمد بن احمد حکیمی، ابوجعفر محمد بن جریر طبری، محمد بن خلف بن مرزبان، محمد بن خلف وکیع، محمد بن مخلد عطار، ابوبکر بن ابی الدنیا، ابوبکر بن خلاد، ابوبکر شافعی، ابوعمرو بن سماک۔ (۱)

طلب حدیث کے لیے سفر: گو ان کے سفر و سیاحت کی تصریح نہیں ملتی لیکن ان کے اساتذہ اور شیوخ کا تعلق مختلف ملکوں سے تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے علم حدیث کی تلاش و جستجو میں مختلف ملکوں اور شہروں کا سفر کیا تھا۔

حافظہ: تذکرہ نگاروں نے ان کو الحافظ کہا ہے، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے خصوصیت کے ساتھ ان کے حافظہ کا تذکرہ کیا ہے۔

ثقاہت: بیشتر محدثین اور علمائے جرح وتعدیل نے ان کی توثیق کی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ''ابوحاتم ابن حبان، ابراہیم حربی اور امام دارقطنی اور اسی پایہ کے دوسرے اکابر محدثین اور علمائے محققین نے ان کی توثیق کی ہے'' (۲) امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ وہ صدوق تھے، برقانی نے ان سے حارث کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ ان کے مرویات کو صحاح میں شامل کرو، ابراہیم حربی سے سوال کیا گیا کہ وہ معاوضہ لیتے ہیں، ایسی صورت میں کیا ان سے حدیثیں سنی جاسکتی ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ ہاں سنو وہ ثقہ ہیں، ابن حبان نے ان کو ثقات میں شامل کیا ہے، ابوالعباس بناتی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، احمد بن کامل

(۱) تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۸ و ۲۱۴ (۲) بستان المحدثین ص ۳۳۔

کا بیان ہے کہ حارث ثقہ اور معتبر ہیں، ابن جوزی بھی ان کو ثقہ لکھتے ہیں، علامہ ذہبی نے تذکرہ، میزان اور عبر میں ان کی ثقاہت کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی بعض سندیں نہایت عالی ہیں اور ان کے متعلق خواہ مخواہ بلا دلیل و حجت شک و تردد کیا جاتا ہے، (۱)

کثرت روایت و معرفت حدیث: حارث کے حافظہ میں احادیث کا وافر ذخیرہ محفوظ تھا، ان کو کثیر الروایات اور کثیر الحدیث شمار کیا جاتا تھا، ابوالعباس بناتی کا بیان ہے راویۃ الاخبار کثیر الحدیث نیز وہ حدیثوں کے معاملہ میں بڑے واقف کار اور ان کی اچھی پرکھ رکھتے تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کان حافظا عارفا بالحدیث (۲)

عسرت و تنگدستی: ان کی زندگی بڑی عسرت اور تنگدستی کی تھی، کثیر العیالی کی بنا پر اکثر زیر بار رہتے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ ''میرے چھ لڑکیاں تھیں، ناداری کی وجہ سے ان کی شادی نہیں کرسکتا اور غیروں میں شادی کرنے کو غیرت گوارا نہیں کرتی، بعض لوگوں نے شادی کا پیغام بھیجا لیکن وہ بھی میری ہی طرح فقیر اور محتاج تھے، ایسے لوگوں سے شادی کرکے مجھے اور بھی زیادہ زیر بار ہونا پڑتا، عسرت ہی کی بنا پر وہ تعلیم حدیث کا معاوضہ لینے پر مجبور تھے۔

خودداری: اس عسرت و تنگدستی کے باوجود اپنے فقر وفاقہ کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ (۳)

وفات: چھیانوے سال کی طویل عمر میں ۲۸۲ھ کو شب عرفہ میں انتقال کیا اور عرفہ کے دن چاشت کے وقت سپرد خاک کیے گئے۔ (۴)

مسند: ان کی تصنیفات میں صرف ایک مسند کا ذکر ملتا ہے، اس میں صحابہؓ کے بجائے شیوخ کی ترتیب پر حدیثیں لکھی گئی ہیں، اس قسم کی کتابوں کو اصطلاحاً معجم کہا جاتا ہے لیکن جس

(۱) میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۰۵، بستان المحدثین ج ۲ ص ۱۵۷ وتذکرہ ج ۲ ص ۱۹۴ (۲) لسان ومیزان حوالۂ مذکور (۳) بستان المحدثین ص ۳۳ (۴) تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۹۔

طرح بعض اور کتابیں بھی محدثین کی اصطلاح کے برخلاف مسند کہلاتی ہیں، اسی طرح یہ کتاب بھی معجم کے بجائے مسند کے نام سے مشہور ہے۔(۱)

یہ سند طبع نہیں ہوئی، اس کا نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے، احمد بن ابوبکر بوصیری متوفی ۸۴۰ھ نے ''اتحاف الخیرۃ بزوائد المسانید العشرۃ'' میں اس کی ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جو صحاح ستہ میں نہیں ہیں۔(۲)

حارث پر طعن وجرح: حدیث کی تعلیم کا معاوضہ لینے کی بنا پر بعض محدثین نے ان پر نقد کیا ہے اور ان کو مجروح، ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے نزدیک تعلیم حدیث کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے اور ایسے شخص کی حدیثیں نا قابل قبول ہیں لیکن یہ اصول علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، اس کے بارے میں جواز وعدم جواز دونوں قسم کی رائیں ملتی ہیں، علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ:

''امام احمد، اسحاق بن راہویہ اور ابوحاتم رازی کے نزدیک اس شخص کی حدیث قبول نہیں کی جائے گی جو حدیث بیان کرنے کا معاوضہ لیتا ہو لیکن امام بخاری کے استاذ ابونعیم فضل بن دکین اور علی بن عبدالعزیز بغوی اور بعض دوسرے علما نے اس کی اجازت دی ہے، ابواسحاق شیرازی کا فتویٰ یہ ہے کہ جو لوگ حدیث کی تعلیم وتدریس کی وجہ سے اپنے متعلقین کی کفالت اور ان کی معیشت کا انتظام نہ کرسکیں، ان کے لیے اجرت ومعاوضہ لینا جائز ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ یتیم کے مال میں سے ضرورت مند اولیا اور سرپرستوں کو بقدر کفاف لینے کی اجازت دی گئی ہے۔''(۳)

خطیب نے دونوں قسم کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

''جو لوگ معاوضہ نہ لینے کے قائل ہیں ان کا مقصد راوی کو طعن اور سوء ظن سے منزہ قرار دینا ہے کیوں کہ معاوضہ لینے کے بعد آدمی میں نرمی اور مداہنت پیدا ہو جاتی ہے

(۱) بستان المحدثین ۳۲،۳۳ (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۴۴،۱۶۴ (۳) تدریب الراوی ص ۱۲۴۔

لیکن درحقیقت ان لوگوں کے نزدیک بھی محض مکروہ تنزیہی ہے، حرام وناجائز نہیں اور اکثر سلف اس باب میں رخصت کے قائل ہیں۔ (۱)

اس لیے دونوں پہلو برابر ہیں خصوصاً جو لوگ تنگدستی کی بنا پر معاوضہ لینے پر مجبور ہیں ان کے لیے پوری گنجائش موجود ہے اور اس سے ان کی ثقاہت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، اس لیے امام حارث رحمہ اللہ پر محض اس بنا پر تنقید نہیں کی جا سکتی۔

☆☆☆

(۱) کتاب الکفایۃ ص ۱۵۴۔

اما احمد بن ابی عاصم نبیل

(متوفی ۲۸۷ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، احمد بن عمرو بن ابو عاصم ضحاک بن مخلد۔ (۱)

ولادت: مورخین کے بیان کے مطابق وفات کے وقت اُن کی عمر ۹۰ سال تھی (۲) اس اعتبار سے وہ ۱۹۷ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

خاندان ووطن: عراق کے مشہور علمی مرکز بصرہ کو ان کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے لیکن انھوں نے اصبہان میں بودوباش اختیار کرلی تھی، قبیلۂ شیبان سے ان کا نسبی تعلق ہے، اُن کے جد امجد ابو عاصم ضحاک کا جو النبیل کے لقب سے مشہور اور نامور محدث وفقیہ تھے، امام ابوحنیفہؒ کے ممتاز اصحاب میں شمار ہوتا ہے، بخاری جیسے امام حدیث ان کے دامن فیض سے وابستہ تھے، ابن ابی عاصم کے نانا ابوسلمہ موسیٰ بن اسماعیل بھی بلند پایہ محدث تھے اور ان سے ان کو روایت کرنے کا شرف بھی حاصل ہے۔

اساتذہ: اپنے نانا کے علاوہ امام بخاری، ابوالولید طیالسی، ہدبہ بن خالد اور ہشام بن عمار جیسے نامور علما اور اکابر محدثین سے روایت حدیث کی ہے۔

تلامذہ: مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن بندار، احمد بن معید سمسار، ابومحمد بن حبان، ابواحمد غسال، عبدالرحمٰن بن محمد بن سنان، محمد بن احمد کسائی، وغیرہ۔

---

(۱) العبر فی خبر من غبر جلد ۲ ص ۷۹، البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۸۴۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۴۔

سفر: علم کی تلاش وجستجو خصوصاً حدیث کی طلب کے لیے مختلف بلاد کا سفر کیا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ولهٗ الرحلة الواسعة۔

حفظ وثقاہت: حدیث میں آپ کا پایہ اتنا بلند تھا کہ امام وحافظ حدیث کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، تمام علمائے فن کو اُن کے ضبط وحفظ، عدالت وثقاہت کا اعتراف ہے، ابن ابی حاتم نے صدوق اور ابن اعرابی نے حدیث ومسائل فقہ کا بڑا حافظ بتایا ہے، یادداشت کی قوت کا یہ حال تھا کہ ۵۰ ہزار سے زیادہ حدیثیں وہ زبانی بیان کرتے تھے، (۱)

فقہ: فقہ واجتہاد میں بھی ممتاز درجہ رکھتے تھے، علمائے طبقات نے فقہ میں اُن کے کمال کا اعتراف کیا ہے، ابن اعرابی کا بیان ہے کہ شفیق بلخی کے ایک ہزار مسائل ان کو زبانی یاد تھے۔

منصب قضا: اُن کے فقیہ ومجتہد ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ امام احمد کے صاحبزادے صالح کے بعد اصبہان کے قاضی مقرر کیے گئے اور سولہ سال تک اس منصب پر فائز رہے۔ (۲)

مذہب ومسلک: ابونعیم اور بعض دوسرے علمائے طبقات نے ان کو ظاہری المذہب بتایا ہے (۳) لیکن صاحب شذرات نے اُن کی ایک کتاب الرد علی داؤد الظاہری کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں ممکن ہے وہ ظاہری رہے ہوں لیکن بعد میں اس مسلک سے رجوع کرلیا ہوگا اور شوافع اور دوسرے اصحاب حدیث کی طرح ظواہر حدیث پر عمل اور اُن سے احکام ومسائل کا استنباط کرتے ہوں گے۔

زہد وورع: علم کے ساتھ عمل کی دولت سے بھی سرفراز تھے، اصحاب طبقات وتراجم نے اُن کے زہد وورع اور تدین وتقویٰ کا بھی ذکر کیا ہے، اُن کو تصوف اور صوفیا سے بھی تعلق تھا اور بزرگانِ دین کی خدمت میں استفادہ واصلاح کے لیے جاتے تھے، ابوتراب نخشبی سے خاص تعلق تھا، اُن کی بعض کرامتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔

اتباع سنت واجتناب بدعت: بڑے متبع سنت تھے اور مبتدعین کو سخت ناپسند کرتے تھے،

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۴ (۲) ایضاً (۳) ایضاً۔

فرماتے تھے "مجھے پسند نہیں کہ میری مجلس میں کوئی مبتدع، مفتری، فحش گو، لعن وطعن کرنے والا، امام شافعی اور محدثین کے مسلک سے منحرف وبیزار شخص شریک ہو" (۱)

اعتراف کمال: محدثین ان کے کمالات کے معترف تھے، علامہ ذہبی نے ان کو صاحب مناقب اور کبیر القدر لکھا ہے، ابن عماد فرماتے ہیں:

جمع بين العلم والفهم والحفظ	وہ علم وفہم، حفظ واتقان، حدیث، زہد
والزهد والعبادة والفقه.	وعبادت اور فقہ واجتہاد کے جامع تھے۔

وفات: امام ابن عاصمؒ نے ربیع الآخر ۲۸۷ھ میں انتقال کیا۔ (۲)

تصانیف: وہ کثیر التصانیف تھے، زنگیوں کی شورش کے زمانہ میں اُن کی اکثر کتابیں ضائع ہوگئیں، حسب ذیل تصانیف کے نام کتابوں میں ملتے ہیں:

۱- الرد على داؤد الظاهري: نام سے معلوم ہوتا ہے کہ امام داؤد ظاہری کے رد میں ہے۔

۲- كتاب السنة: یہ مسئلہ صفات کے متعلق احادیث کا ایک اہم مجموعہ تھا، اس کی تالیف کا انداز علمائے سلف کی کتابوں کے مطابق تھا۔ (۳)

۳- مسند: یہ ضخیم اور اہم مسند، پچاس ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے، (۴) تمام قابل ذکر علماء مصنفین نے اس کا تذکرہ کیا ہے، حافظ منذری کے قلم کا لکھا ہوا اس کا ایک مکمل نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ (۵)

۴- كتاب الديات: دیت وقصاص کے متعلق روایات کا یہ مجموعہ ۱۳۲۳ھ میں مصر سے ۸۴ صفحے میں شائع ہوا ہے۔

---

(۱) البدایہ ج ۱۱ ص ۸۴ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۴ (۳) البدایہ ج ۱۱ ص ۸۴۔ (۴) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۳ (۵) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵۔

امام ابوبکر بزارؒ

(متوفی ۲۹۲ھ)

نام ونسب: ابوبکر کنیت، بزار لقب، اور احمد نام ہے، سلسلۂ نسب صرف دادا تک معلوم ہے، یعنی احمد بن عمرو بن عبدالخالق۔

بعض اہل لغت کا بیان ہے کہ بزار تیلی کو کہتے ہیں لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''کسے را گویند کہ تخم فروشی کند و آں کس را در لغت ہندی پنساری نامند''(۱)

یعنی بزار تخم فروش کو کہا جاتا ہے جسے ہندوستانی زبان میں پنساری کہتے ہیں۔

خاندان ووطن: قبیلۂ ازد کی ایک شاخ عتیک سے آپ کا خاندانی اور بصرہ سے وطنی تعلق تھا، اسی نسبت سے عتکی اور بصری مشہور ہوئے۔(۲)

اساتذہ: بزار کے بعض اساتذہ کے نام یہ ہیں، ابراہیم بن سعید جوہری، اسماعیل بن سیف بندار، حسن بن علی بن راشد واسطی، عبدالاعلیٰ بن حماد، عبداللہ بن معاویہ جمحی، عبدالرحمٰن بن فضیل بن موفق، عمر بن موسیٰ، فلاس، محمد بن یحییٰ بن فیاض رمانی، ہدبہ بن خالد۔

تلامذہ: ان کے بعض تلامذہ اور مستفیدین کے نام درج ذیل ہیں:

ابواحمد عسال، ابوبکر بن سلم، ابوبکر بن مہندس، ابوالشیخ، ابوالقاسم طبرانی، ابوالحسن

(۱) لباب ج ۱ ص ۱۱۸ و تاج العروس ج ۳ ص ۴۱، و بستان المحدثین، ص ۳۴۔ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۸۴، و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۶۔

علی بن محمد مصری، حسن بن رشیق، عبدالباقی بن قانع، عبداللہ بن حسن، محمد بن ایوب بن صموت، محمد بن عباس بن نجیح۔

رحلت وسفر: ابتدائی تعلیم کے زمانہ کے سفر کا حال معلوم نہیں ہوتا، البتہ اس کا تذکرہ ملتا ہے کہ آخری زمانہ میں انھوں نے احادیث کی نشر واشاعت کے لیے بغداد، اصفہان اور شام وغیرہ کے سفر کیے اور ایک عرصہ تک ان مقامات پر قیام کر کے یہاں کے طلبہ اور شائقین کو حدیث کی تعلیم دیتے رہے۔(۱)

حفظ وثقاہت: محدثین نے اُن کے فضل وکمال اور حفظ وثقاہت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

ابوالشیخ فرماتے ہیں کہ:

> ''حفاظ دنیا میں ایک وہ بھی تھے اور علی بن مدینی کے بعد کوئی شخص ان سے زیادہ حدیثوں کا جاننے والا نہیں گذرا، بغداد کے حفاظ ومحدثین ان کے گرد جمع ہوکر ان سے روایتیں قلمبند کرتے تھے۔(۲)

ابن قطان کا بیان ہے کہ ''وہ لوگوں میں حدیثوں کے سب سے بڑے حافظ تھے،'' ابن یونس اور خطیب بغدادی نے بھی اُن کے حافظہ کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، ابویوسف یعقوب بن مبارک فرماتے ہیں کہ ما رأیت انبل من البزار ولا احفظ خطیب ذہبی اور صاحب مغنی نے اُن کو ثقہ وصدوق قرار دیا ہے اور امام دارقطنی نے اُن کی توصیف وستائش بھی کی ہے اور اُن کو ثقہ بھی بتایا ہے، ابوعوانہ نے اپنی صحیح میں اُن سے حدیث نقل کی ہے۔(۳)

وفات: بزار نے ۲۹۲ھ میں شام کے مشہور شہر رملہ میں جہاں وہ حدیث کی تعلیم واشاعت

(۱) تاریخ بغداد جلد۴ ص۳۳۴ وتذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۲۶ (۲) بستان المحدثین ص۳۴ (۳) لسان المیزان جلد۱ ص۲۳۸ ومیزان الاعتدال ج۱ ص۵۹ وتاریخ بغداد جلد۴ ص۳۳۴۔

کے لیے تشریف لے گئے تھے، انتقال کیا، ابن قانع نے ۲۹۱ھ سنہ وفات بتایا ہے، (۱) مگر پہلا قول صحیح ہے۔

اولاد: اُن کے ایک فرزند ابوالعباس محمد کا ذکر ملتا ہے جو نامور محدث تھے اور امام دارقطنی اور احمد بن عوف جیسے مشاہیرفن نے ان سے کسبِ فیض کیا تھا۔ (۲)

مسند: فن حدیث میں بزار کے کمال کا ثبوت مسند کی جمع وتالیف ہے، مسند میں اُن کی دو کتابیں تھیں، المسند الکبیر المعلل اس کا نام البحر الزاخر بھی ہے اور دوسری مسند صغیر، کبیر میں حدیثوں کے علل اور مخفی اسباب قادحہ کے متعلق بھی بحث وکلام کیا گیا ہے، اسی لیے اس کو کتب معلل میں شمار کیا جاتا ہے، محدثین کی اصطلاح میں معلل وہ کتابیں کہلاتی ہیں جن میں مصنف ان مخفی اسباب وعلل کو بیان کرتا ہے جو صحت حدیث کے لیے موجب قدح ہیں، عراقی کا بیان ہے کہ بزار نے صحیح وغلط روایتوں سے کم اور رواۃ حدیث کے تفرد وعدم متابعت سے زیادہ تعرض کیا ہے۔ (۳)

حافظ ابن حجر نے اس کے ان زوائد کی جو کتب ستہ اور مسند احمد میں نہیں پائے جاتے، اپنے استاذ ابوالحسن ہیثمی کی کتاب سے تلخیص کی ہے، مسند کا ایک جامع ومکمل اور صحیح نسخہ حافظ ہیثمی کے قلم کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے، یہی نسخہ حافظ ابن حجر کے استعمال میں رہا ہے۔ (۴)

بزار پر غلطی کا الزام: محدثین کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ بزار روایت حدیث میں غلطی کر جاتے تھے، امام دارقطنی اور حاکم کا بیان ہے کہ وہ متن واسناد دونوں میں غلطی کرتے ہیں، امام نسائی نے بھی ان پر جرح کی ہے اور بعض لوگوں نے اُن کے تفرد اور عدم متابعت کا بھی ذکر کیا ہے (۵) لیکن ان اعتراضات سے اُن کے فضل وکمال میں کوئی فرق

---

(۱) لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۳۸ ومیزان الاعتدال ج ۱ ص ۵۹ وتاریخ بغداد جلد ۴ ص ۳۳۴ (۲) تاج العروس ج ۳ ص ۴ (۳) بستان المحدثین ص ۳۴ (۴) مقدمہ تحفۃ الاحوذی۔ (۵) (اگلے صفحہ پر)

نہیں آتا، حافظ ابن حجر نے بزار کے بعض تفردات ذکر کر کے ان کا جواب دیا ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اکثر میں وہ منفرد نہیں ہیں، دوسرے ان کے ثقہ و ثابت ہونے میں کسی کو کلام نہیں، خود ان ائمہ سے بھی جنھوں نے اُن کی تضعیف کی ہے، توثیق منقول ہے، امام دار قطنی فرماتے ہیں کہ ''وہ ثقہ ہیں اور ان سے غلطی بھی سرزد ہوتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ عموماً اپنے حافظہ اور یادداشت پر اعتماد کرتے تھے اور روایت بیان کرتے وقت صحیح نسخہ کو پیش نظر نہیں رکھتے تھے۔

اور مجرد غلطی راوی کے متروک و ساقط الروایت ہونے کی دلیل نہیں، اس پر پہلے مفصل بحث گذر چکی ہے۔

☆☆☆

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) (۵) لسان المیزان ج اص ۲۳۸ و میزان الاعتدال ج اص ۵۹۔

امام ابو مسلم کشیؒ

(متوفی ۲۹۲ھ)

نام ونسب: ابراہیم نام، ابو مسلم کنیت، نسب نامہ یہ ہے، ابراہیم بن عبداللہ بن مسلم بن ماعز،(۱) خطیب نے ماعز کے بعد مہاجر اور سمعانی نے کش لکھا ہے۔(۲)

ولادت: خطیب نے لکھا ہے کہ ''بیان کیا گیا ہے کہ وہ ۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے''(۳) لیکن ذہبی نے اُن کی عمر ۱۰۰ سال کے لگ بھگ بتائی ہے اور اُن کا سنہ وفات ۲۹۲ھ ہے، اس لحاظ سے اُن کی پیدائش ۲۰۰ھ سے پہلے ہوئی ہوگی۔(۴)

خاندان ووطن: وہ بصری اور کشی کی نسبتوں سے زیادہ مشہور ہیں، بعض کا خیال ہے کہ بصرہ کے باشندہ تھے لیکن مقدسی کا بیان ہے کہ وہ بصرہ میں معماری کا کام کرتے تھے، اس لیے ان کو بصری کہا جاتا ہے، دوسری نسبت کش کی جانب ہے جو جرجان کے ایک گاؤں کا نام ہے لیکن سمعانی نے اُن کے جد اعلیٰ کا نام کش لکھا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کش فارسی لفظ کج (گچ) کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کے معنی چونے کے ہیں اور چوں کہ وہ بصرہ میں معماری کا کام کرتے تھے اور اکثر ھات الکج (چونا لاؤ) کہا کرتے تھے، اس لیے کجی لقب پڑ گیا تھا، محمد بن طاہر مقدسی اور علامہ ابن ندیم نے اسی کو ترجیح دی ہے، ابن ندیم لکھتے ہیں کہ اُن کے باپ بصرہ میں منتقل ہو گئے تھے اور یہ وہاں معماری کرتے تھے اور اکثر مزدوروں

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۵ (۲) تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۱۲۰ وکتاب الانساب ورق ۴۷۶ (۳) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۲۱ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۶۔

سے کج کج کہا کرتے تھے، اس لیے اُن کو کجی کہا جاتا ہے'' حافظ ابوموسیٰ کے نزدیک کج خوزستان کے ایک گاؤں کا نام ہے جس کو زیر کج کہا جاتا ہے، ابومسلم اسی کی جانب منسوب ہیں، علامہ سمعانی نے ان کی ایک نسبت لیثی بھی بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نسبی تعلق بنولیث سے تھا۔(۱)

اساتذہ وشیوخ: امام ابومسلم کشی نے جن نامور علماومحدثین سے کسبِ فیض کیا تھا، ان کے نام یہ ہیں:

ابوعاصم نبیل، ابوالولید طیالسی، بدل بن محبر، حجاج بن نصیر فساطیطی، سلیمان بن حرب، عبداللہ بن رجاء غدانی، عبداللہ بن مسلم قعنبی، عبدالرحمٰن بن حماد شعثی، عبدالملک بن قریب اصمعی، عمرو بن مرزوق، محمد بن عبداللہ انصاری، محمد بن عرعرہ، مسلم بن ابراہیم، معاذ بن عبداللہ عوذی وغیرہ۔

تلامذہ: ان سے جن لوگوں نے استفادہ کیا ہے، ان کی تعداد بے شمار ہے، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر شافعی، ابوبکر مالک بن قطیعی، ابوسہیل بن زیاد، ابوعمر بن سماک، ابوالقاسم بغوی، ابومحمد بن ماسی، احمد بن سلیمان نجاد، اسماعیل خطبی، اسماعیل بن محمد صفار، جعفر خالدی، حبیب فزار۔ عبدالباقی بن قانع، فاروق خطابی، محمد بن جعفر آدمی اور خود اُن کے صاحبزادے ابوالحسن محمد بن ابراہیم کشی وغیرہ۔(۲)

سفر: اُن کے صرف بغداد جانے اور وہاں حدیثیں بیان کرنے کا ذکر ملتا ہے۔

حفظ وثقاہت: امام ابومسلم کے علم وفضل، حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان پر علمائے فن کا اتفاق ہے، علمائے طبقات وسیر نے ان کو الحافظ کان محدثاً حافظا اورمن

(۱) کتاب الانساب ورق ۴۷۶، معجم البلدان ج ۴ ص ۲۵۴، الفہرست ص ۳۲۴ والرسالۃ المستطرفہ ص ۳۱

(۲) تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۱۲۱ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۵۔

حفاظ الحدیث لکھا ہے، موسیٰ بن ہارون اور امام دار قطنی نے ان کو ثقہ صدوق قرار دیا ہے، محمد بن علی صوری کا بیان ہے کہ میں نے حافظ عبدالغنی بن سعید سے ابو مسلم کجی کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ ثقہ اور نہایت ذکی تھے، علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ وہ عالم، ثقہ اور جلیل القدر محدث تھے، ابن ندیم لکھتے ہیں کہ وہ ان اجلۂ محدثین میں تھے جن کی سندیں نہایت عالی ہوتی ہیں، علامہ سمعانی رقم طراز ہیں کہ وہ ثقہ اور اکابر محدثین میں تھے اور انھوں نے بے شمار حدیثیں بیان کیں، خطیب کا بیان ہے کہ وہ صاحب علم و فضل اور امین تھے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں، وہ احادیث کے واقف کار اور بقیۃ الشیوخ میں تھے، ابن عماد لکھتے ہیں، وہ صاحب سنن اور مسند وقت تھے۔ (۱)

مرجعیت و مقبولیت: ابو مسلم کے علم و فضل نے اُن کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا، ان کے درس میں ہزاروں اشخاص شریک ہوتے تھے، مورخین کا بیان ہے کہ جب وہ بغداد تشریف لائے تو تشنگانِ علم کا جم غفیر اُن کے گرد اکٹھا ہو گیا تھا، غسان کے میدان میں جو بغداد کا سب سے وسیع اور کشادہ مقام تھا، جب اُن کی مجلسِ درس آراستہ ہوئی تو سامعین کا بڑا اژدحام تھا، حاضرین کا تخمینہ ۴۰-۵۰ ہزار لگایا گیا۔ (۲)

امارت و شکوہ اور جود و سخاوت: اللہ تعالیٰ نے علم و فضل اور عزت و شہرت کے ساتھ مال و دولت اور جاہ و حشمت سے بھی نوازا تھا، طبعاً بڑے فیاض تھے، مورخین نے اُن اوصاف و کمالات کے ذکر میں، انھیں صاحب حشمت، کبیر الشان، ذی جاہ اور سخی و فیاض بتایا ہے، جب انھوں نے اپنی سنن کی جمع و تالیف کا کام ختم کر کے لوگوں کے سامنے اس کو پہلی مرتبہ پیش کیا اور پڑھا تو ایک ہزار درہم فقرا و مساکین میں تقسیم کیے اور محدثین و ائمہ فن کے علاوہ

---

(۱) تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۱۲۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۵ و الفہرست ص ۳۲۴ و کتاب الانساب ورق ۴۷۶ و شذرات الذہب جلد ۲ ص ۲۱۰ (۲) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۲۱ و ۱۲۲ و البدایہ ج ۱۱ ص ۹۹ و تذکرہ ج ۲ ص ۱۹۶۔

دوسرے اعیان وعمائد کی ایک پر تکلف دعوت کی اور اس میں تقریباً ایک ہزار دینار صرف کیے، خطیب کا بیان ہے کہ:

انھوں نے نذر مانی تھی کہ جب حدیث بیان کرنا شروع کریں گے تو دس ہزار دینار صدقہ کریں گے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب جب وہ دس ہزار حدیثیں بیان کر لیتے تو کچھ نہ کچھ صدقہ ضرور کرتے، جب پہلی مرتبہ حدیث بیان کی تو خود بھی صدقہ وخیرات کیا اور اپنے شریک تجارت کو بغداد خط لکھا کہ تم ساری کھجوریں صدقہ کر دو، اور اگر فروخت کر چکے ہو تو اُن کی قیمت غریبوں میں تقسیم کر دو۔(۱)

پیشہ: شروع میں وہ معماری کا کام کرتے تھے، پھر تجارت کرنے لگے تھے اور بصرہ سے بغداد کھجوریں بھیجتے تھے، وہاں اُن کی طرف سے ایک وکیل تھا جو ان کو فروخت کرتا تھا، ابومسلم بعض سرکاری مناصب پر بھی فائز رہے، اسی لیے مشہور شاعر بحتری نے اُن کی شان میں مدحیہ اشعار کہے ہیں۔(۲)

وفات: تقریباً ایک سو سال کی عمر میں ۲۳ محرم الحرام ۲۹۲ھ بروز یکشنبہ بغداد میں انتقال کیا اور وہاں سے ان کی لاش بصرہ لائی گئی اور یہیں تجہیز وتکفین ہوئی۔(۳)

تصنیفات: علامہ ابن ندیم نے ان کی دو کتابوں السنن والمسند کا ذکر کیا ہے، ان میں سنن زیادہ مشہور ہے، اس کی اکثر حدیثیں ثلاثی ہیں اور قلمی نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں پایا جاتا ہے۔(۴)

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۲۱ و ۱۲۲ والبدایہ ج ۱۱ ص ۹۹ وتذکرہ ج ۲ ص ۱۹۶ (۲) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۲۲

(۳) ایضاً ص ۱۲۴ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۶ (۴) الفہرست ص ۳۲۴ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۶۔

امام محمد بن نصر مروزی

(متوفی ۲۹۴ھ)

نام ونسب: نام محمد، ابوعبداللہ کنیت، شیخ الاسلام لقب، نسب نامہ کتابوں میں مذکور نہیں ہے۔

ولادت، خاندان وطن: ان کی زبانی منقول ہے کہ "میں بغداد میں پیدا ہوا، میرے والد مروزی تھے، میری نشو ونما نیشاپور میں ہوئی اور اب سمرقند میں رہتا ہوں۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا آبائی وطن خراسان کا مشہور شہر مرو ہے، اسی لیے وہ مروزی کی نسبت سے مشہور ہیں لیکن انھوں نے سمرقند میں بود وباش اختیار کر لی تھی۔(۱)

اساتذہ: محمد بن نصر کو جن اکابر محدثین سے استفادہ کا موقع ملا، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن منذر خزامی، ابوقدامہ سرخسی، اسحٰق بن راہویہ، ربیع بن سلیمان، سعید بن عمر اشعثی، شیبان بن فروخ، صدقہ بن فضل، عبدان بن عثمان مروزی، عبیداللہ بن معاذ عنبری، علی بن بحر قطان، علی بن حجر، عمرو بن زرارہ، محمد بن بشار بندار، محمد بن عبداللہ بن نمیر، محمد بن عبدالملک بن ابی الشوارب، ہدیہ بن خالد، ہشام بن عمار، یحیٰی بن یحیٰی نیساپوری، یزید بن صالح، یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ۔

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۵، تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۸۹۔

تلامذہ: ان کے چند تلامذہ اور منتسبین کے نام یہ ہیں:

ابو حامد بن شرقی، ابو العباس سراج، ابو عبداللہ بن اخزم۔ ابو علی عبداللہ ابن محمد بن علی بلخی، عثمان بن جعفر لبان، محمد بن منذر سکر، محمد بن یعقوب بن اخزم اور عزیزوں میں ان کے صاحبزادہ اسماعیل بن محمد کو ان سے روایت کرنے کا موقع ملا۔ (۱)

رحلت وسفر: ان کو علم وفن سے فطری ذوق تھا اور ہمیشہ علمی مسائل پر بحث وگفتگو کرتے تھے، عبداللہ بن محمد ثقفی کا بیان ہے کہ ''میرے دادا جوان کے ساتھ چار سال رہے، بیان کرتے ہیں کہ میں نے انھیں غیر علمی باتیں کرتے نہیں دیکھا، اس شوق کی تکمیل کے لیے انھوں نے طلب علم کے لیے مختلف شہروں کا سفر کیا، خطیب لکھتے ہیں: ''رحل الی سائر الامصار فی طلب العلم'' علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ انھوں نے طلب علم کے لیے مختلف شہروں کا سفر کیا اور خراسان، عراق، حجاز، شام ومصر کے علما سے استفادہ کیا۔ (۲)

حدیث میں درجہ: حدیث میں ان کی جلالت قدر کا اندازہ ان بیانات سے ہوگا، علامہ ذہبی نے ان کو برع فی ھذا الشان اور رأسا فی الحدیث لکھا ہے، حاکم کا بیان ہے کہ ''وہ حدیث کے بحر زخار تھے'' اکابر علمائے جرح وتعدیل نے ان کے ضبط وثقاہت اور حفظ واتقان کا اعتراف کیا ہے، حافظ ابن حجر نے ان کو الحافظ، الثقہ اور ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ اُن جامعین ومصنفین حدیث میں تھے جو مرتبۂ امامت پر فائز تھے، ابو محمد بن حزم کا بیان ہے کہ وہ سنن کے جامع وضابط صاحب علم اور احادیث کے مطالب کے حافظ اور مدافع تھے۔ (۳)

فقہ وخلافیات: فقہ وخلافیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، ان کے سوانح نگاروں نے ان کے نام کے ساتھ الفقیہ احدائمۃ الفقہا اور رأسا فی الفقہ وغیرہ لکھا ہے۔

---

(۱) تہذیب التہذیب ج۹ ص۴۸۹ وطبقات الشافعیہ ج۲ ص۲۱ (۲) تاریخ بغداد ج۳ ص۳۱۶ والمنتظم ج۶ ص۶۴ (۳) تاریخ بغداد ج۳ ص۳۱۶ وتذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۲۲۴ والمنتظم ج۶ ص۶۴۔

وہ نیشاپور کے مفتی سمجھے جاتے تھے، محمد بن یحییٰ سے جب کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو وہ اس کو ابوعبداللہ مروزی کے پاس بھیج دیتے، خطیب بغدادی تحریر فرماتے ہیں کہ ان کو صحابہ اور مابعد کے علما کے اختلافات سے بڑی واقفیت تھی، ابومحمد بن حزم کا بیان ہے کہ وہ اجماع اور خلافیات کے بڑے عالم تھے۔(۱)

مذہب ومسلک: امام شافعیؒ سے ان کو بڑا تعلق تھا، ان کے نامور تلامذہ سے فقہ کی تحصیل کی تھی اور اسی مسلک فقہ سے وابستہ تھے، ابن عماد کا بیان ہے کہ ان کے زمانہ کے شوافع میں کوئی شخص ان کا ہمسر نہیں تھا۔(۲)

مقبولیت: ان کو بڑی مقبولیت حاصل تھی، عوام وخواص وامراء وحکام سب ان کا بڑا احترام کرتے تھے، امیر اسماعیل بن احمد کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ احتراماً کھڑا ہو جاتا تھا۔(۳)

امامت: علمائے طبقات وتراجم نے ابوعبداللہ مروزی کو ائمہ مسلمین میں شمار کیا ہے اور احد الاعلام، احد اعلام الامة، احد ائمة الاسلام اور الامام الجلیل وغیرہ القاب سے موسوم کیا ہے، سلیمانی اور ابوبکر ضبعی نے ان کو امام بتایا ہے، محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم کا جو ان کے استاذ الفقہ تھے، بیان ہے کہ جب وہ مصر میں ہم لوگوں کے درمیان مرتبۂ امامت پر فائز ہیں تو خراسان میں کسی کو ان کی امامت میں کلام ہو سکتا ہے، ابوبکر احمد ابن اسحاق کا بیان ہے کہ میں نے دو ائمہ مسلمین دیکھے، ابوحاکم رازی اور ابوعبداللہ مروزی(۴)

زہد وعبادت: زہد وتقویٰ میں بھی ان کا درجہ بہت بلند تھا، علمی اشغال سے جو وقت بچتا، اس کو عبادت اور یاد الٰہی میں صرف کرتے تھے، نمازیں بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ

(۱) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۴ والمنتظم ج ۶ ص ۶۴ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱

(۲) شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۱۷ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۵ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۵ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱ و۲۲ وتاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۷ وتہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۹۰۔

پڑھتے تھے، ابوبکر ضبعی کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بہتر کسی کی نماز نہیں دیکھی، ابن اخرم فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ان کی نماز کا حسن اور خشوع وخضوع دیکھ کر سخت متعجب ہوتے تھے، استغراق ومحویت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ نماز میں بھڑ نے ڈنک مار دیا اور جسم سے خون جاری ہوگیا، مگر انھوں نے کوئی حرکت اور جنبش نہیں کی، وہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوجاتے تو ایک بے حس وحرکت لکڑی کی طرح معلوم ہوتے تھے،(۱) اس انہماک کی وجہ سے ان کا شمار اکابر صلحا اور مشہور عباد وزہاد میں ہوتا تھا (۲) ان کی بعض کرامتیں بھی بیان کی جاتی ہیں۔

ذریعہ معاش اور جودوسخا: ان کی مستقل آمدنی بارہ ہزار سالانہ تھی، چار ہزار اسماعیل بن احمد امیر خراسان اور اسی قدر اس کے بھائی اسحاق اور اہل سمرقند کی جانب سے ان کو وظیفہ ملتا تھا لیکن اُن کے مزاج میں بڑی سخاوت وفیاضی تھی، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

وقد كان من اكرم الناس واسخاهم نفسا۔(۳) وہ بڑے کریم اور سخی تھے۔

اس لیے یہ کل رقم محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کردیتے تھے اور جو کچھ بچتا اسی معمولی رقم میں گذر بسر کرلیتے، جب ناگہانی ضرورت کے لیے کچھ پس انداز کرنے کے لیے کہا جاتا تو کوئی توجہ نہ کرتے، اپنے ایک شریک کو مضاربت پر اپنا مال تجارت کے لیے بھی دیتے تھے۔(۴)

اولاد: عرصہ تک لاولد رہے، آخری عمر میں اولاد کی آرزو بہت بڑھ گئی تھی، اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے جو قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ایک صالح فرزند عطا کیا جب بچہ

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۵ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱و۲۲ وتاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۷ وتہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۹۰ (۲) صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۱۲۳ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱ (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۰۲ (۴) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۷ و ۳۱۸ وتذکرہ ج ۲ ص ۲۲۵ ۔

کے تولد کی ان کو اطلاع ہوئی تو بے ساختہ ان کی زبان سے دعائے ابراہیمی نکل گئی، الحمدُ لِلّٰهِ الذِي وهب لي على الكبر اسماعيل اس بچہ کا انھوں نے اسماعیل ہی نام بھی رکھا۔(۱)

حلیہ: صورت نہایت حسین اور چہرہ گلاب کی طرح شاداب اور شگفتہ تھا، سپید داڑھی نے چہرہ کو اور زیادہ پُرنور بنا دیا تھا۔

وفات: محرم ۲۹۴ھ میں سمرقند میں وفات پائی۔(۲)

تصنیفات: انھوں نے متعدد کتابیں تالیف کیں، خطیب کا بیان ہے کہ "صاحب التصانيفِ الكثيرة و الكتب الجمة" یعنی وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، ان کی کتابیں بڑی مفید اور بیش قیمت تھیں، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وصنف الكتب المفيدة الحافلة النافقة یعنی نہایت مفید کتابیں لکھیں۔

ان کی جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

مسند: یہ ان کی سب سے اہم اور مشہور کتاب ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں عبدالقادر بن عبدالعزیز کے قلم کا لکھا ہوا ہے ۲۶۸، اوراق میں موجود ہے، سنہ کتابت ۲۵۶ھ ہے، اس کے شروع میں ایک باب نماز کا بھی ہے، اس کا عنوان ہے باب فی تعظيم قدر الصلوٰة وتفضيلها علىٰ سائر الاعمال۔ (۳) جو بجائے خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، بعض علما نے اس کا مستقل تصنیف کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں "وصنّف كتاباً عظيماً في الصلوٰة" (۴) (نماز پر ایک مہتم بالشان کتاب لکھی)

کتاب القسامۃ: مروزی کی یہ دوسری اہم تصنیف ہے، ابوبکر صیرفی اس کے

(۱) المنتظم ج ۶ ص ۶۴ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۵، ۲۲۶ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۲ (۳) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۲۰ (۴) البدایہ ج ۱۱ ص ۱۰۲۔

بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اگر انھوں نے صرف یہی کتاب لکھی ہوتی تو بھی ان کے ایک بڑے اور عظیم فقیہ ہونے کے لیے کافی تھی۔''(۱)

علامہ ابن سبکی نے ان کی ایک اور کتاب کا ذکر کیا ہے، اس میں امام ابوحنیفہؒ نے حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے مسلک سے جن باتوں میں اختلاف کیا ہے اس کا ذکر ہے۔(۲)

قیام اللیل اور کتاب رفع الیدین کے نام سے بھی دو رسالے لکھے تھے، جو طبع ہو چکے ہیں۔(۳)

☆☆☆

(۱) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۶ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱ (۳) خاتمہ سیرۃ الامام البخاری ص ۲۶۔

امام ابو محمد ابن جارودؒ

(متوفی ۲۹۹ھ)

نام ونسب: عبداللہ نام، ابو محمد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ بن علی بن جارود۔

وطن: سنہ ولادت اور خاندانی حالات معلوم نہیں ہو سکے، وطن نیشاپور ہے، مکہ میں مجاورت اختیار کر لی تھی۔

اساتذہ: چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوسعید بن اشج، احمد بن ازہر، احمد بن یوسف سلمی، اسحاق کوسج، بحر بن نصر، زیاد بن ایوب، عبداللہ بن ہاشم طوسی، عبدالرحمٰن بن بشر، علی بن خشرم، محمد بن ابی عبدالرحمٰن مقری، محمد بن آدم، محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم، محمد بن عثمان بن کرامہ، محمد بن یحییٰ، یعقوب بن ابراہیم دورقی وغیرہ۔

تلامذہ: حافظ ذہبی نے اُن کے چار تلامذہ ابو حامد بن شرقی، دعلج سنجری، محمد بن نافع مکی اور یحییٰ بن منصور کا نام تحریر کیا ہے۔

ضبط واتقان: اوران کے علم وفضل کے بارے میں لکھتے ہیں:

ھو الحافظ الامام الناقد	وہ حدیث کے حافظ، امام، ناقد ......
کان من	.... ثقہ
العلماء المتقنین المجوّدین۔	وضابط اور جید علمائے اسلام میں تھے

وفات: ان کا سنہ وفات ۳۰۷ھ ہے۔(۱)

تصنیفات: ابن جارود کی کتاب "المنتقی" احکام و سنن سے متعلق روایات واحادیث کا ایک منتخب و مختار مجموعہ ہے جو ایک جلد میں اور تقریباً آٹھ سو حدیثوں پر مشتمل ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''یہ کتاب گویا صحیح ابن خزیمہ پر مستخرج ہے لیکن اس میں صرف اس کے اصول احادیث پر اکتفا کیا گیا ہے، اسی لیے اس کا نام منتقی ہے۔''(۲)

صاحب الرسالۃ المستطرفہ کتانی فرماتے ہیں کہ:

''اس کے استقصا سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بہت کم حدیثوں میں صحیحین سے تفرد کیا گیا ہے۔''(۳)

ابن حزم کا بیان ہے کہ:

''صحیحین کے بعد ابن سکن، ابن جارود اور ابن اصبغ کی کتابوں کا درجہ ہے، اس کے بعد ابوداؤد و نسائی کی کتابوں کا نمبر آتا ہے۔''(۴)

منتقی ابن جارود پہلی مرتبہ حیدر آباد دکن سے ۵۰۴ صفحات میں شائع ہوئی ہے، شروع میں جن چھ طرق سے اس کی روایت کی گئی ہے، ان کا ذکر ہے، حواشی مختصر مگر مفید مطالب پر مشتمل ہیں، ہر حدیث کے سامنے حاشیہ میں اس کے ماخذ حروف تہجی کے ذریعہ ظاہر کیے گئے ہیں، مثلاً (ط) سے موطا، (حم) سے مسند احمد، (خ) سے بخاری، اور (م) سے مسلم وغیرہ۔

ابوعمر واندلسی نے المرتقی فی شرح المنتقی کے نام سے اس کی شرح لکھی تھی۔(۵)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۶ (۲) بستان المحدثین ص ۸۵ (۳) الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۳ (۴) تدریب الراوی ص ۳۲ (۵) الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۳۔

امام ابوعبدالرحمٰن نسائی رحمہ اللہ

(متوفی ۳۰۳ھ)

نام ونسب: احمد نام اور ابوعبدالرحمٰن کنیت تھی، سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر بن دینار۔(۱)

پیدائش: عام مؤرخین کے بیان کے مطابق امام نسائیؒ ۲۱۴ھ یا ۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے لیکن بعض نے سنہ پیدائش ۲۲۵ھ لکھا ہے(۲) جو صحیح نہیں ہے۔

وطن: امام نسائی نے بعد میں مصر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی لیکن ان کی پیدائش اور نشوونما خراسان کے مشہور شہر نساء میں ہوئی۔(۳) قدیم زمانہ میں نساء علم وفن اور ارباب کمال کا مرکز رہ چکا ہے اور اس کی خاک سے بہت سے نامور علما وفضلا پیدا ہوئے، اسی کی نسبت سے وہ نسائی کہلاتے ہیں، نسوی سے بھی اسی کی جانب نسبت ہے، مگر وہ زیادہ مشہور نہیں، نساء خراسان میں ہے، اس لیے امام صاحب کو خراسانی بھی کہا جاتا ہے۔(۴)

اساتذہ اور شیوخ: امام نسائی کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے، بعض مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابویزید جرمی، احمد بن عبدہ، اسحاق بن راہویہ، حسین بن منصور، حمید بن سعدہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۲ وتہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۲ وطبقات الشافعیہ سبکی ج ۲ ص ۸۳ (۲) حسن المحاضرہ سیوطی ج ۱ ص ۱۴۷ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۲۴۰ (۳) کتاب الانساب ورق ۵۵۹ (۴) ایضاً ووفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۶۔

سوید بن منصور، ابوالحسن علی بن حجر بن ایاس، علی بن حشرم، عمران بن موسیٰ، عمرو بن زرارہ عیسیٰ بن حماد، ابورجا قتیبہ بن سعید بلخی، مجاہد بن موسیٰ، محمد بن بشار، محمد بن رافع، ابوکریب محمد بن علاء، محمد بن نصر مروزی، ہشام بن عمار اور یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ افاضل اور اساطین حدیث سے احادیث نبوی کا سماع کیا اور احمد بن نصر نیشاپوری اور ابوشعیب سوسی سے فن قرأت کی تحصیل کی۔

ائمہ صحاح میں امام بخاری اور امام ابوداؤد سے بھی ان کو شرف تلمذ حاصل ہے،(۱)

تلامذہ: ان کے تلامذہ کے ناموں کا استقصا دشوار ہے، بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن محمد بن صالح، ابوبشر دولابی، ابوعلی حسین محمد نیشاپوری، ابوالقاسم طبرانی، ابوالقاسم حمزہ بن محمد کتمانی، ابوعلی حسن بن خضر سیوطی، ابوبکر احمد بن اسحاق السنی، محمد بن معاویہ، حسن بن رشیق، ابوالحسن محمد بن عبداللہ حیویہ، محمد بن قاسم اندلسی، ابوبکر احمد بن محمد، ابوعوانہ، ابوجعفر طحاوی، ابوبکر احمد بن حداد، ابوجعفر عقیلی، ابوعلی محمد بن ہارون اور آپ کے صاحبزادے عبدالکریم وغیرہ، ان میں سے اکثر حضرات نے آپ کی کتاب سنن کی روایت کی ہے۔(۲)

تعلیم و تحصیل حدیث کے لیے سفر: امام نسائی کی ابتدائی تعلیم کے حالات نہیں ملے، مگر اتنا معلوم ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق انھوں نے مختلف ملکوں اور شہروں کا سفر کیا تھا، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ''دور دراز شہروں میں جا کر سماع حدیث میں مصروف رہے اور ان ائمہ فن اور مشائخ کبار سے ملے جن سے بالمشافہ انھوں نے روایت کی ہے۔'' علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ ''رحال فی البلاد'' یعنی مختلف ملکوں کا سفر کیا، تذکرہ و طبقات کی کتابوں

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۳ و تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۷ والحطہ ص ۱۲۷ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۷ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۴۔

میں ان کے حجاز، عراق، مصر، شام، جزائر اور خراسان جانے اور وہاں کے ائمہ کمال سے استفادہ کرنے کی تصریح ملتی ہے، امام صاحب کا خود بیان ہے کہ ''وہ پندرہ سال کی عمر میں قتیبہ کی خدمت میں حدیث سیکھنے کی غرض سے بغداد گئے اور ایک سال دو ماہ تک وہاں قیام کیا۔''(۱)

علم حدیث میں امتیاز: علم حدیث کی تاریخ میں تیسری صدی ہجری کا زمانہ بڑی اہمیت اور خاص امتیاز رکھتا ہے، اس زمانہ میں ہر گھر میں علم حدیث کا چرچا تھا اور اسلامی ملکوں کا ہر بڑا شہر اس کا مرکز تھا، اس دور سے زیادہ بڑے محدثین اور کسی دور میں بھی نہیں پیدا ہوئے، امام نسائی بھی اسی دور کمال میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے قدرتی طور پر ان کی توجہ کا مرکز علم حدیث ہی قرار پایا اور اس میں ان کو جو تبحر اور کمال حاصل ہوا وہ ان کے دوسرے معاصرین کے حصہ میں نہیں آیا، امام دارقطنی کا بیان ہے کہ ''امام نسائی اپنے دور کے تمام علمائے حدیث میں یکتا اور سب سے زیادہ افضل و برتر تھے۔''

حفظ وثقاہت: قدرت نے امام صاحب کو حفظ کی غیر معمولی قوت عطا کی تھی، ابن یونس صاحب تاریخ مصر کا بیان ہے کہ وہ احادیث کے ایک نامور حافظ تھے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ ''میں نے اپنے استاذ علامہ ذہبی سے دریافت کیا کہ حافظ کے لحاظ سے امام مسلم اور امام نسائی میں کون بڑھا ہوا تھا، انھوں نے نسائی کا نام لیا، میں نے اپنے والد سے اس کو بیان کیا تو انھوں نے بھی اس کی تائید کی، سیوطی نے الحافظ، احد الحفاظ المتقنین کے القاب سے ان کا ذکر کیا ہے، ان کی ثقاہت واتقان پر بھی اتفاق ہے، ابن یونس کہتے ہیں ''وہ نہایت ثقہ وثابت تھے''(۲)

جرح وتعدیل: وہ فن جرح وتعدیل کے بھی ماہر تھے، ان کا شمار مشہور نقادان حدیث میں

(۱) تہذیب ج۱ ص ۳۷ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۴ والبدایہ والنہایہ ج۱ ص ۱۲۳ وحسن المحاضرہ ج۱ ص ۱۴۷ (۲) ایضاً۔

ہے، اس لحاظ سے بعض محدثین نے ان کو امام بخاری و امام مسلم سے بھی فائق قرار دیا ہے، حافظ حدیث ابوعلی کا بیان ہے ''رجال کے باب میں امام نسائی کے شرائط امام مسلم سے بھی زیادہ سخت تھے'' ابن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ ''میں نے سعد بن علی زنجانی سے ایک شخص کے متعلق استفسار کیا تو انھوں نے اس کی توثیق کی، میں نے کہا امام نسائی تو تضعیف کرتے ہیں، یہ سن کر انھوں نے کہا ''صاحبزادے ابوعبدالرحمٰن کی رجال کے بارے میں امام بخاری اور امام مسلم سے بھی زیادہ سخت شرطیں ہیں، احادیث کے سقم وصحت میں ان کی بصیرت ومعرفت کے بارے میں دارقطنی اور حاکم کی رائے یہ ہے کہ ''وہ اپنے معاصرین میں صحیح وسقیم روایات وآثار اور رجال کی معرفت وتمیز میں سب سے زیادہ واقف کار تھے'' ابوبکر حداد کثیر الحدیث ہونے کے باوجود امام نسائی کے علاوہ اور کسی سے روایت نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ میرے اور خدا کے درمیان حجت ہیں، مامون مصری کا بیان ہے کہ ''جب ہم طرسوس آئے اور حفاظ حدیث کی خدمت میں حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان سب نے امام نسائی کے انتخاب کے مطابق حدیثیں لکھی ہیں۔'' (۱)

فقہ وتفسیر: امام نسائی کا اصلی فن علم حدیث ہے لیکن دوسرے علوم دینیہ میں بھی ان کو درک تھا، قرأت وتفسیر میں ان کو پوری دستگاہ حاصل تھی اور فقہ وفقہی احکام کے استنباط میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا، امام دارقطنی اور حاکم صاحب مستدرک کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں مصر کے سب سے بڑے فقیہ تھے'' ابن یونس اور دوسرے علما نے بھی ان کے فقیہ ومجتہد ہونے کا اعتراف کیا ہے، ان کی سنن سے بھی ان کے اس کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

عہدۂ قضا: فقہ واجتہاد میں ان کے کمال کی بنا پر حمص کے قضا و لایت کا منصب ان کو تفویض کیا گیا تھا۔

---

(۱) تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۸ والبدایۃ ج ۱۱ ص ۱۲۳ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۴ (۲) بستان المحدثین ص ۱۱۱ والحطہ ص ۱۲۷۔

زہد وتقویٰ اور عبادت: امام نسائی کی عملی زندگی بھی نہایت پاکیزہ تھی، ان کا دل خشیت الٰہی سے لبریز قلب ذکر الٰہی سے معمور اور دماغ فکر عقبیٰ میں مصروف رہتا تھا، وہ بڑے عبادت گذار، متبع سنت اور صاحب ورع وتقویٰ تھے، رد بدعات واحیاء سنت ان کا خاص مشن اور نصب العین تھا، رات ودن کا بڑا حصہ خدا کی عبادت اور ذکر وفکر میں گذرتا تھا، تہجد کے پابند تھے، صوم داؤدی کے مطابق ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے، حج بھی اکثر کرتے تھے، جہاد کا ولولہ بھی تھا، ایک مرتبہ امیر مصر کے ساتھ جہاد میں نکلے تو اتنی شجاعت وبہادری دکھائی کہ لوگوں کو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوگئی۔(۱)

اخلاقی کمالات: صبر ورضا، ضبط وتحمل، شجاعت وبہادری اور عزم واستقلال وغیرہ اخلاقی فضائل سے بھی آراستہ تھے، طبیعت میں بڑا استغنا اور بے نیازی تھی، کبھی عزت نفس کا سودا نہیں کیا، امیر مصر کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے لیکن اس کی مجلس اور ہمنشینی سے ہمیشہ دور رہے، ایک مرتبہ اہل شام نے ان سے امیر معاویہؓ کے فضائل بیان کرنے کا مطالبہ کیا، انھوں نے انکار کردیا، ان کے انکار پر ان کو بے دردی کے ساتھ پیٹا گیا، انھوں نے اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا، مگر ان کے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا، احمد بن نصر کا بیان ہے کہ ''امام نسائی کی طرح کون صبر کرسکتا ہے، حالانکہ ان کے پاس امیر معاویہؓ کی فضیلت میں ابن لہیعہ کی حدیث موجود تھی لیکن انھوں نے اس کو نہیں بیان کیا، کیوں کہ وہ ابن لہیعہ کو ضعیف سمجھتے تھے۔(۲)

امامت وتقدم: ان کمالات کی بنا پر دوسرے اصحاب علم وکمال آپ کو مسلمانوں کا امام ومقتدا مانتے تھے، ابن عدی کا بیان ہے کہ میں نے منصور فقیہ اور احمد بن محمد طحاوی کی زبانی سنا کہ ''وہ مسلمانوں کے اماموں میں سے ایک ہیں'' حافظ ابوالحسین محمد بن مظفر فرماتے ہیں کہ ''میرے کانوں نے اپنے مصری اساتذہ کی زبان سے امام نسائی کے فضل ومرتبت اور امامت

(۱) تہذیب ج ۱ص ۳۸ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۲۶۸ والبدایہ ج ۱۱ص ۱۲۳ (۲) ایضاً۔

وتقدم کا اعتراف کرتے ہوئے سنا" محمد بن سعد باوردی فرماتے ہیں کہ "وہ مسلمانوں کے اماموں میں تھے، میں نے چار ائمہ حدیث دیکھے، ان میں سے ایک مصر کے امام نسائی بھی تھے۔"(۱)

فقہی مذہب: علامہ ابن سبکی نے طبقات شافعیہ میں ان کا ذکر کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب اور نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی ان کو شافعی بتایا ہے لیکن بعض حنابلہ نے ان کو حنبلی قرار دیا ہے، ہمارے خیال میں وہ کسی خاص فقہی مسلک کے پابند نہ تھے، بلکہ وہ خود فقیہ و مجتہد تھے اور جزئیات مسائل میں محدثین کی طرح ظواہر احادیث کے مطابق عمل کرتے تھے اور جن ائمہ کے مسلک کو کتاب وسنت سے زیادہ قریب پاتے تھے اسی کی تائید فرماتے تھے"۔

عقیدہ: امام نسائی اعتقاد میں اہل سنت والجماعت کے ہمنوا تھے لیکن ان پر شیعیت کا الزام لگایا جاتا ہے، عام مؤرخین اور اصحاب سیر نے اس الزام کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، اس کی شہرت غالباً ابن خلکان کے ایک بیان سے ہوئی ہے بعض دوسرے مورخین نے بھی ابن خلکان ہی کی روایت کو ماخذ بنایا ہے، اس لیے ان کے بیان کا جائزہ لیا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

قال محمد بن اسحاق	محمد بن اسحاق اصبہانی فرماتے ہیں کہ
الاصبهاني سمعت مشائخنا	میں نے مصر میں اپنے استادوں سے
بمصر يذكرون ان ابا	سنا کہ ابوعبدالرحمٰن نسائی آخر عمر میں مصر
عبدالرحمن فارق مصر في	چھوڑ کر دمشق چلے گئے وہاں ان سے
آخر عمره وخرج الى دمشق	حضرت معاویہؓ اور ان کے فضائل کے
فسئل عن معاوية وماروى	متعلق روایات کے بارے میں پوچھا
في فضائله فقال اما يرضىٰ	گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ کیا

(۱) تہذیب ج ۱ ص ۳۸ و تذکرۃ ج ۲ ص ۲۶۸ و البدایہ ج ۱۱ ص ۱۲۳۔

معاویة ان یخرج رأسا برأس حتی یفضل وفی روایة اخریٰ ماعرف له فضیلة الا لااشبع اللہ بطنه وکان یتشیع فمازالوا یدفعون فی حضنه حتی اخرجوه من المسجد وفی روایة اخری یدفعون فی خصیه۔ (۱)

معاویہؓ کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ سربسر نجات پا جائیں، ان کے فضائل کہاں ہیں جو بیان کیے جائیں، ایک دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے جواب دیا کہ میں ان کی کوئی فضیلت اس کے علاوہ نہیں جانتا کہ ''اللہ اس کو شکم سیر نہ کرے، ان میں شیعیت تھی لوگوں نے یہ جواب سن کر ان کی کمر اور کوکھ میں مارنا شروع کیا اور مسجد سے نکال دیا، دوسری روایت میں ہے کہ ان کے خصیتین میں مارنا شروع کیا تھا،

اس روایت کی صحت محل نظر ہے، متقدمین علما میں سے کسی نے اس کو قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے اور نہ اس کی سند مسلسل ہے، ابن خلکان اور امام نسائی کے درمیان کئی صدیوں کا فرق ہے، امام نسائی کا انتقال ۳۰۳ھ میں ہوا ہے اور ابن خلکان کا ۶۸۱ھ یعنی دونوں کے درمیان تقریباً چار صدیوں کا فرق ہے، ایسی حالت میں امام نسائی کے بارے میں ابن خلکان کی روایت بغیر کسی سند کے کیسے قبول کی جاسکتی ہے، اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ امام نسائی حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، یا ان کو ان کے فضائل کی روایات کا علم نہ تھا اور حضرت علیؓ کے مقابلہ میں حضرت امیر معاویہؓ کے فضائل کا انکار شیعیت نہیں ہے، بہت سے اکابر کا یہ مسلک رہا ہے، پھر ابن خلکان نے "کان شیعیا" نہیں بلکہ "کان یتشیع" لکھا ہے، یعنی ان میں شیعیت کا اثر تھا۔

(۱) وفیات الاعیان ج ۱ص ۳۵و۳۶۔

اس روایت کی صحت کی صورت میں واقعہ کی شکل یہ معلوم ہوتی ہے کہ شام بنی امیہ کا مرکزِ حکومت رہ چکا تھا اور وہ حضرت امیر معاویہؓ کا سب سے سنگین قلعہ تھا، یہاں کے تمام قبائل حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ان کے حامی ومداح تھے، اس لیے بنی امیہ کی حکومت مٹنے کے بعد بھی مدتوں یہ اثر قائم رہا اور حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے اختلافات کی صدائے بازگشت یہاں صدیوں گونجتی رہی، امام نسائی کے زمانہ میں بھی یہی صورتِ حال رہی ہوگی، جیسا کہ خود اہل شام کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے، اس لیے امام موصوف نے اس کی اصلاح اور حضرت علیؓ سے شامیوں کا سوءظن دور کرنے کے لیے یہ جواب دیا ہوگا مگر اہل شام کے دل ودماغ پر حضرت امیر معاویہؓ کا اتنا اثر تھا کہ وہ آمادۂ پیکار ہوگئے اور امام صاحب کی توہین میں بھی باک نہیں کیا اور ان پر شیعیت کا الزام لگا دیا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''امام نسائی کی موت کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ حضرت علیؓ کے مناقب لکھ کر فارغ ہوئے تو چاہا کہ جامع دمشق میں لوگوں کے سامنے اس کتاب کو بیان کریں تاکہ وہاں کے لوگ جو بنی امیہ کی مدت مدید تک شام میں سلطنت کے باعث نواصب کے مذہب کی طرف مائل ہوگئے ہیں، ہدایت یافتہ ہوجائیں، اس کتاب کا تھوڑا ہی حصہ بیان کیا تھا کہ ایک شخص نے پوچھا کہ امیر المومنین معاویہؓ کے فضائل بھی آپ نے کچھ تحریر کیا ہے، امام نسائی نے کہا معاویہؓ کے لیے تو اتنا بس ہے کہ انھیں سر بسر نجات مل جائے، ان کے فضائل ہی کہاں ہیں بعض کہتے ہیں کہ آپ نے یہ بات بھی فرمائی تھی کہ میرے نزدیک ان کے مناقب میں کوئی صحیح روایت ثابت نہیں سوائے الالا اشبع اللہ بطنہ کے (یہیں سے) عوام الناس نے ان پر تشیع کا الزام جڑ دیا...... اور چند ضربیں ان کے خصیتین میں لگیں جن کی وجہ سے وہ نیم جان ہوگئے۔''(۱)

(۱) بستان المحدثین ص ۱۱۱۔

ابن کثیر کا طرز بیان اس سے کسی قدر مختلف ہے، مگر ان کا دارومدار بھی ابن خلکان ہی کی روایت پر ہے، لکھتے ہیں:

وقد قيل عنه: انه كان ينسب اليه من التشيع۔(۱)	ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی جانب کچھ شیعیت بھی منسوب ہے

اس کے بعد انھوں نے وہی ابن خلکان والی روایت نقل کی ہے مگر ''قیل'' کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ انتساب والزام ابن کثیر کے نزدیک مشکوک اور مشتبہ ہے، پھر ''کان ینسب الیه'' میں صیغۂ مجہول کا استعمال بھی یہی بتاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ راوی کے نزدیک بھی یہ الزام مشتبہ ہے اور ''شئ من التشيع'' سے جس تقلیل کا اظہار ہوتا ہے وہ بھی قابل غور ہے۔

ان باتوں سے قطع نظر امام نسائی کے شیعہ نہ ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ حضرت علیؓ سے فرط عقیدت کے باوجود دوسرے صحابہؓ کے فضائل وکمالات کے بھی قائل تھے اور مسائل میں ان کے عمل سے استفادہ کرتے تھے، شیعہ سب سے زیادہ شیخین (حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) کو مطعون کرتے ہیں مگر امام نسائی ان کے آرا واقوال سے حجت واستدلال کرتے ہیں، کتاب البیوع میں ابن ابی اوفی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ''ہم رسول اللہ اور ابوبکرؓ وعمرؓ کے زمانہ میں، گیہوں، جو اور کھجور کی بیع سلم ان لوگوں سے کرتے تھے، جن کے متعلق ہم کو معلوم نہیں کہ یہ چیزیں ان کے پاس ہوتی تھیں یا نہیں، (۲) ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں ''ابوبکر وعمر نے یہ فیصلہ کیا۔'' (۳) ایک اور مقام پر یہ فرماتے ہیں کہ اس چیز کا ابوبکرؓ وعمرؓ اور عثمان رضی اللہ عنہم نے فیصلہ کیا ہے، (۴) خلفائے راشدین میں اسی ترتیب کے وہ بھی قائل تھے جو اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے، چنانچہ باب امامۃ اہل العلم والفضل میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو

(۱) البدایہ ج ۱۱ص ۱۲۳ (۲) سنن نسائی ج ۲ص ۲۲۶ (۳) ایضاً ص ۲۳۲ (۴) ایضاً ۲۳۳۔

انصار نے کہا ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک تم لوگوں (مہاجرین) میں سے، حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ کیا تم لوگوں کو نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ نماز پڑھائیں، ایسی صورت میں کون شخص یہ پسند کرے گا کہ وہ امامت اور خلافت میں ان سے سبقت لے جائے، انھوں نے جواب دیا کہ ہم ابوبکرؓ پر اپنے کو ترجیح دینے سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔(۱)

یہ مثالیں ان کی شیعیت کی تردید کے لیے کافی ہیں، البتہ دو باتیں قابل بحث ہیں، ایک حضرت علیؓ کی محبت وعقیدت میں غلو، دوسرے حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق سخت الفاظ کا استعمال، پہلے کا جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی محبت میں کوئی ایسا غلو ناپسندیدہ نہیں ہے جو شریعت کے خلاف نہ ہو، بلکہ اہل بیت کی محبت تو جزو ایمان ہے، امام شافعیؒ اور امام احمد کا بھی یہی مسلک تھا، امام احمد کی حضرت علیؓ سے عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے شیخ ابوزہرہ مصری تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس معاملہ میں ان کا وہی مسلک تھا جو ان کے استاذ امام شافعی کا تھا، امام شافعیؒ حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب میں روایت کرتے تھے اور ان سے بڑی عقیدت ومحبت رکھتے تھے لیکن حضرت ابوبکرؓ کے مقابلہ میں جب تفضیل کا سوال آتا تھا تو وہ حضرت ابوبکرؓ کو سب پر ترجیح دیتے تھے، ان کا قول ہے کہ ''معاملہ ہمارے جذبات کا تابع نہیں ہے۔''(۲)

امام شافعی ہی کی جانب یہ شعر بھی منسوب ہے:

ان کان رفضا حب آل محمدٍ   فلیشھد الثقلان انی رافض

(ترجمہ) اگر اہل بیت سے محبت کرنا شیعیت ہے تو جن وانس دونوں گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔

---

(۱) سنن نسائی ج۱ ص۷۹ (۲) احمد بن حنبل ترجمہ رئیس احمد جعفری ص۲۴۳۔

حضرت امیر معاویہؓ کی شان میں امام نسائی کے الفاظ اور سخت ہیں، وہ بہرحال صحابی ہیں اور ان کے فضائل میں بھی روایتیں ہیں ورا گر نہ بھی ہوتیں تو صحابیت کے عموم میں جو روایتیں ہیں ان کے بھی رو سے ان کی فضیلت مسلم ہے لیکن امام نسائی کے قول کی یہ توجیہ ہوسکتی ہے

۱- حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کی فضیلت مسلم ہے، ان کو کسی حیثیت سے بھی حضرت علیؓ کے ہم پایہ قرار نہیں دیا جا سکتا، یہ جمہور امت کا متفقہ فیصلہ ہے، امام نسائی نے شام کے لوگوں کو اس کے برخلاف دیکھا، اس لیے جناب امیرؓ کے فضائل ومناقب بیان کرنے میں غلو سے کام لیا، ایسے حالات میں قدرتی طور پر تشدد اور غلو پیدا ہی ہو جاتا ہے، اس سلسلہ میں حضرت معاویہؓ کی شان میں ان سے بعض نامناسب الفاظ بھی نکل گئے۔

۲- امام نسائی کو حضرت علیؓ سے غیر معمولی محبت وعقیدت تھی مگر جب وہ شام گئے تو وہاں ان کے خلاف سوءظن کی عام فضا دیکھ کر ان کے فضائل ومناقب بیان کرنا شروع کر دیتے جو بنی امیہ کے حامیوں کو ناگوار معلوم ہوئے اور انھوں نے امام نسائی سے امیر معاویہ کے فضائل بیان کرنے کی فرمائش کی، امام صاحب نے یہ سمجھا کہ جناب امیرؓ سے بدگمانی کا اصل سبب حضرت امیر معاویہؓ سے فرط عقیدت اور غیر معمولی شیفتگی ہے اس کو دور کرنے کے لیے انھوں نے ان کی شان میں مذکور بالا باتیں کہہ دیں، جن سے ان کا منشا امیر معاویہؓ کی مذمت نہ تھا بلکہ حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب کا پوری طرح اظہار اور امیر معاویہؓ کے مقابلہ میں ان کی اہمیت وعظمت کا اثبات میں تھا۔

۳- حافظ ابن حجر وغیرہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نسائی کے نزدیک حضرت امیر معاویہؓ کے فضائل میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں اس لیے انھوں نے لوگوں کے مطالبہ پر بھی ایسی کوئی حدیث نہیں بیان کی مگر جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو ان کو غصہ آ گیا اور ان کی زبان سے بعض سخت الفاظ نکل گئے لیکن غیظ وغضب کی حالت میں جو باتیں منہ

سے نکل جاتی ہیں، ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

غذا اور لباس: امام نسائی بڑے خوش خوراک و خوش لباس تھے، رنگین اور قیمتی کپڑے پہنتے تھے اور کھانا نہایت پرتکلف کھاتے تھے، مرغ خرید کر پالتے تھے، جب خوب فربہ ہو جاتے ذبح کراتے روزانہ مرغ کھانے کے بعد نبیذ حلال پیتے تھے،(۱) ان کا رہن سہن نہایت اعلیٰ اور معاشرتی زندگی بڑی پرشکوہ تھی۔

خاندانی وجاہت: امام صاحب کی معاشرت اور رکھ رکھاؤ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک معزز اور صاحب حیثیت گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ابن عماد کا بیان ہے کہ ''وہ نہایت نجیب و شریف، رئیس، خوش وضع اور عظیم المرتبت تھے۔(۲)

وفات: امام نسائی کو شامیوں کی مار پیٹ سے اتنا صدمہ پہنچا کہ اسی کے اثر سے ۳۰۳ھ میں اٹھاسی سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا، جب ان کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو انھوں نے اپنے اصحاب و رفقا سے خواہش ظاہر کی کہ انھیں مکہ لے چلیں، بعض مورخین کا بیان ہے کہ راستہ میں مرو کے مقام میں ان کی وفات ہوگئی اور وہیں دفن کیے گئے لیکن بعض نے لکھا ہے کہ وفات مکہ میں ہوئی اور صفا و مروہ کے درمیان دفن کیے گئے۔ علامہ ابن کثیر نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ بیت المقدس میں دفن کیے گئے، مہینہ کی تعیین میں اختلاف ہے، بعض نے شعبان اور بعض نے صفر کا مہینہ لکھا ہے۔(۳)

ازواج و اولاد: ان کے چار بیویاں اور دو لونڈیاں تھیں،(۴) حافظ ابن حجر نے ان کے تلامذہ کے تذکرہ میں ایک صاحبزادے عبدالکریم کا نام بھی تحریر کیا ہے۔

حلیہ: بڑے وجیہ و شکیل تھے، چہرہ نہایت شاداب اور شمع کی طرح پرنور تھا، بڑھاپے میں بھی جسم اور چہرے کی تروتازگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔(۵)

(۱) تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۷ و البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۲۴ (۲) شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۳۹ (۳) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۶ و تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۹ و البدایہ ج ۱۱ ص ۱۲۴ (۴) ایضاً (۵) ایضاً۔

تصنیفات: امام نسائی کی جن تصنیفات کا علم ہو سکا وہ حسب ذیل ہیں:

۱- خصائص سیدنا علیؓ: اس رسالہ میں حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب بیان کیے گئے ہیں، اس کی تالیف کا مقصد امام صاحب نے خود یہ بیان کیا ہے کہ "میں جب دمشق آیا تو حضرت علیؓ سے لوگوں کو بیزار پایا، اس لیے یہ رسالہ تالیف کیا تا کہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ لوگوں کو ہدایت سے سرفراز کرے (۱) مگر لوگوں نے بدبختی سے اس کو سخت ناپسند کیا اور امام صاحب کو زدوکوب کر کے مسجد سے نکال دیا۔

۲- مسند علی، ۳- مسند مالک، ۴- کتاب الضعفاء والمتروکین، اس میں ضعیف ومتروک الحدیث رواۃ کا حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق ذکر کیا گیا ہے۔

یہ رسالہ امام بخاری کی التاریخ الصغیر اور کتاب الضعفاء الصغیر کے ساتھ مطبع انوار احمدی الہ آباد سے ۱۳۲۵ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

۵- کتاب الجمعہ، ۶- کتاب التمییز، ۷- کتاب المدلسین، ۸- فضائل الصحابہؓ۔

السنن: امام صاحب نے سنن میں دو کتابیں لکھی تھیں، سنن کبریٰ اور سنن صغریٰ، آخر الذکر کتاب زیادہ مشہور اور صحاح ستہ میں شامل ہے اور یہ امام صاحب کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف اور ان کا سب سے بڑا اور اہم علمی ودینی کارنامہ ہے، اس لیے اس کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے۔

سنن صغریٰ کے دوسرے نام المجتبیٰ اور المجتنیٰ بھی ہیں کیونکہ امام صاحب جب سنن کبریٰ کی تالیف کا کام انجام دے چکے تو امیر رملہ نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کی پوری کتاب صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے، آپ نے جواب دیا نہیں، امیر نے درخواست کیا کہ آپ میرے لیے اس میں سے اعلیٰ درجہ کی حدیثیں الگ کر دیجئے، اس درخواست پر امام صاحب نے یہ دوسری کتاب لکھی جس کا نام مجتبیٰ رکھا اور اب یہی سنن نسائی کے نام سے

(۱) بستان المحدثین ص ۱۱۱۔

مشہور ہے۔(۱)

سنن کبریٰ کے راوی ابن الاحمر ابوبکر محمد بن معاویہ متوفی ۳۵۸ھ اور سنن صغریٰ کے راوی ابن السنی ابوبکر احمد بن محمد م۳۶۴ھ ہیں، علامہ ذہبی نے مجتبیٰ کو امام صاحب کے شاگرد ابن السنی ہی کا اختصار بتایا ہے لیکن خود امام صاحب نے اس کی تردید کی ہے۔

سنن نسائی کی اہمیت: کتب صحاح میں جو مقبولیت صحیحین کو حاصل ہوئی وہ دوسری کتابوں کو نصیب نہیں ہوسکی، اور عام طور پر سنن نسائی کو ابوداؤد اور ترمذی کے بعد جگہ دی گئی ہے، تاہم اس کا نام بھی ان دونوں کے ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے، اس لیے قریب قریب یہ بھی ان کے ہم پایہ ہے اور اس کا صحاح ستہ میں شامل ہونا ہی اس کی اہمیت وعظمت کا ثبوت ہے اور جس طرح صحاح کی ہر کتاب بعض خصوصیات کے لحاظ سے دوسری کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے، اسی طرح نسائی کی بھی بعض خصوصیات سے دوسری کتابیں خالی ہیں۔

بعض علمائے فن نے صحیحین کے بعد اسی کا درجہ بتایا ہے، کیوں کہ اس میں سب سے کم ضعیف روایتیں ہیں اور اس کے رجال زیادہ قوی ہیں، قبول روایت کے معاملہ میں امام نسائی کے شرائط کی سختی اس قدر مشہور ہے کہ بعض علما کا خیال ہے کہ ان کے شرائط امام بخاری وامام مسلم سے بھی زیادہ شدید ہیں،(۲) ابوالحسن معافری کا بیان ہے کہ ''اگر عام محدثین اور امام نسائی کی احادیث کا موازنہ کیا جائے تو امام نسائی کی حدیثیں دوسروں کے مرویات کے مقابلہ میں صحت سے زیادہ قریب نظر آئیں گی'' علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ ''بعض مغاربہ کے نزدیک اس کو صحیح بخاری پر فوقیت حاصل ہے'' ابن احمر کا بیان ہے کہ ''اس فن کی جملہ تصنیفات میں سنن نسائی سب سے زیادہ افضل واشرف ہے اور اسلام میں ایسی بے نظیر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی''(۳) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ''فن رجال کے ماہرین کی

---

(۱) بستان المحدثین ص۱۱۱ (۲) تذکرہ ج۲ ص۲۶۸ وشروط الائمۃ الستۃ (۳) مقدمہ زہر الربی فتح المغیث ص۱۲۔

ایک جماعت نے ان کو امام مسلم سے برتر قرار دیا ہے اور امام دارقطنی وغیرہ نے ان کو فن حدیث اور فن رجال میں امام الائمہ ابوبکر بن خزیمہ پر ترجیح دی ہے" ان اقوال کو اگر مبالغہ پر بھی محمول کیا جائے تو ان سے کم از کم اتنا ثابت ہوتا ہے کہ امام نسائی نے ضعیف و متروک اشخاص سے کوئی روایت نہیں لی ہے بلکہ امام بخاری اور امام مسلم کی طرح صرف صحیح الاسناد حدیثیں درج کی ہیں اور اس اعتبار سے ان کی تصنیف ان دونوں بزرگوں کے طریقوں کی جامع ہے، ابوعبداللہ بن رشید فرماتے ہیں کہ:

وھو جامع بین طریقتی	سنن نسائی بخاری و مسلم دونوں کے
البخاری و مسلم مع حظ کثیر	طریقوں کی جامع ہے اور علل حدیث کا
من بیان العلل۔(۱)	بیان اس پر مستزاد ہے۔

خود امام نسائی سے منقول ہے کہ "کتاب السنن کا صحیح" یعنی میری کتاب السنن تمام تر حدیثوں پر مشتمل ہے، امام صاحب نے اس کی تالیف میں جو اہتمام و احتیاط کی ہے، اس کا اندازہ ابوالحسن احمد بن محبوب رملی کے اس بیان سے ظاہر ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "میں نے خود امام صاحب سے سنا کہ وہ فرماتے ہیں جب میں نے سنن کی جمع و تالیف کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ سے بعض ایسے رواۃ کے متعلق استخارہ کیا جن کے بارے میں مجھ کو تھوڑا تردد تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ ان لوگوں سے میں روایت نہ کروں، اس طرح میں نے عالی سندوں کی حدیثیں ذکر کی ہیں"(۲)

خصوصیات: ۱۔سنن نسائی کی سب سے اہم خصوصیت اس کے شرائط ہیں، جن کے متعلق کہا گیا کہ "ان لابی عبدالرحمٰن شرطا اشد من شرط البخاری ومسلم" یعنی امام نسائی کے شرائط امام بخاری و مسلم سے بھی سخت ہیں اور حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ امام نسائی نے نہ صرف بعض اُن رواۃ کو نظر انداز کر دیا ہے جن سے امام

(۱) مقدمہ زہرالربی (۲) شروط الائمۃ الستہ ص ۱۸ و مقدمہ فتح الباری ص ۸۔

ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے بلکہ امام بخاری و مسلم تک کے راویوں کی ایک جماعت سے حدیث کی تخریج میں اجتناب کیا ہے۔

۲- علل حدیث کا بیان امام نسائی کا خاص وصف سمجھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو جرح و تعدیل اور نقد و نظر کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا اور روایت کا سقم فوراً ان کی نگاہ کے سامنے آجاتا تھا، علامہ ذہبی فرماتے ہیں ''امام نسائی حدیث، علل حدیث اور علم الرجال میں امام مسلم، ترمذی اور ابوداؤد سے زیادہ ماہر ہیں اور امام بخاری و ابوزرعہ کے ہمسر ہیں، ابن رشید کا یہ بیان گذر چکا ہے کہ سنن نسائی، بخاری و مسلم دونوں کے طریقہ کی جامع ہے، علاوہ ازیں اس میں علل حدیث کے بھی ایک خاصے حصہ کا ذکر ہے (۱) رواۃ کے اسماء والقاب و کنیتوں کی تشریح، راوی کے شذوذ و تفرد، حذف و اضافہ عدم متابعت، شک، سہو اور غلطی وغیرہ کا ذکر، دو راویوں کے اختلاف و تضاد، عدم سماع و عدم لقا، راویوں کی توثیق و تضعیف، موقوف و مرسل، مسند و مرفوع، صحیح و ضعیف روایات کی نشاندہی، اسناد کی قوت و ضعف، اختلاف و تعدد طرق کا بیان، غریب الفاظ اور مشکل و مبہم چیزوں کی توضیح جس قدر اس کتاب میں پائی جاتی ہے، اس سے دوسری کتابیں خالی ہیں، امام صاحب نے راویوں اور روایات کا موازنہ کر کے صحیح روایات کی بھی نشاندہی کی ہے۔

۳- متعدد فوائد کے پیش نظر ایک ہی روایت کو کئی جگہوں میں ذکر کیا ہے۔

۴- وہ بلند پایہ مجتہد و فقیہ بھی تھے اور ان کی سنن فقہ و اجتہاد اور نظر و استدلال کی حیثیت سے بھی نہایت جامع ہے، اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے، خمس کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ — جان لو کہ جو غنیمت کا مال تم کو ملا ہے،

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۸ و مقدمہ زہر الربی۔

فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنِ السَّبِيْلِ الخ (توبہ)	اس کا پانچواں حصہ اللہ، رسول، قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

اس آیت میں اللہ کا ذکر ابتدائے کلام کے لیے آیا ہے، کیوں کہ ساری چیزیں تو اللہ ہی کی ہیں، یا خدا نے فئی اور خمس میں، اپنی ذات کو اس لیے شریک کیا ہے کہ درحقیقت یہ دونوں بہترین قسم کی کمائی ہیں اور صدقہ کو اپنی طرف اس لیے منسوب نہیں کیا کہ وہ اموال کی ناپاکی اور گندگی کا نام ہے، ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ غنیمت کا کچھ حصہ خانۂ کعبہ پر خرچ کیا جائے گا اور اسی حصہ کو اللہ نے اپنا بتایا ہے، نبی کا حصہ امامِ وقت کی جانب منتقل کیا جائے گا اور وہ اس سے اسلحہ اور جنگی سامان خریدے گا، اس میں سے وہ ان لوگوں کو بھی دے سکتا ہے جن کو مناسب سمجھے مثلاً مسلمانوں کی فائدہ رسانی کے کاموں یا علم دین، فقہ وحدیث اور قرآن وغیرہ کی تحصیل میں صرف کرے گا اور ایک حصہ رسول اللہ کے قرابتداروں یعنی بنوہاشم اور بنومطلب میں تقسیم کیا جائے گا، خواہ وہ امیر ہوں یا فقیر، ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ کے قرابت داروں میں صرف فقرا یعنی یتیموں اور مسافروں وغیرہ ہی کو دیا جائے گا اور یہی قول میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے، واللہ اعلم، بڑے چھوٹے اور مرد وعورت کے درمیان برابر تقسیم کیا جائے گا کیوں کہ حدیث میں اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو کسی سے زیادہ دیا ہو اور اس بارے میں مجھ کو علما کے کسی اختلاف کا بھی علم نہیں ہے، کیوں کہ اگر کوئی شخص کسی کی اولاد کے حق میں اپنے تہائی مال کی وصیت کر دے تو ان میں سے مرد وعورت سب کو برابر حصہ ملے گا، اسی اصول پر ان تمام چیزوں کو قیاس کرنا چاہیے جو کسی کے قرابتداروں اور خاندان والوں کے لیے متعین کر دی گئی ہو، الا یہ کہ شارع نے اس سلسلہ میں کوئی واضح اور صریح حکم دیا ہو یا اس کی تخصیص کر دی ہو، اسی طرح

مسلمانوں کے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو ایک ایک حصہ دیا جائے گا اور مسکین ومسافر کا حصہ کسی دوسرے کو نہیں دیا جا سکتا، باقی خمس کے چار اور حصوں کو امام المسلمین ان بالغ مسلمانوں میں تقسیم کرے گا جو جنگ میں شریک رہے ہوں۔"(۱)

امام نسائی نے بعض ابواب کے عنوانات اس طرح قائم کیے ہیں جن سے ان کا تفقہ واستدلال ظاہر ہوتا ہے اور بعض عنوانات سے وہ اپنے مخالف مسلک کی تردید بھی کرتے ہیں، ان کے فقہ واجتہاد کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی حدیث کو متعدد ابواب میں نقل کر کے اس سے مختلف مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔

۵- ترتیب وتالیف میں حسن وموزونیت کے لحاظ سے بھی سنن کا پایہ بلند ہے، ابن رشید کا بیان ہے کہ "یہ تمام کتب سنن میں تصنیف وترتیب کے لحاظ سے زیادہ بہتر اور عمدہ ہے۔(۲)

شروح وتعلیقات: سنن نسائی کے ساتھ اُس قدر اعتنا نہیں کیا گیا جس کی وہ مستحق تھی، اس لیے دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کے شروح، حواشی اور تعلیقات کی تعداد کم ہے(۳) ذیل میں ان کے نام درج کیے جاتے ہیں:

شرح ابن ملقن: مشہور مصنف وشارح حدیث علامہ ابن ملقن (م۸۰۴ھ) نے زوائد النسائی علی الاربعہ کے نام سے سنن نسائی کی شرح لکھی اور اس میں ان حدیثوں سے تعرض کیا جو بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد میں نہیں ہیں۔

زہر الربی: یہ علامہ جلال الدین سیوطی (م۹۱۱ھ) کی تعلیق اور شرح ہے جو نہایت مشہور ومعروف ہے، اس میں متن کے مشکل مسائل اور دشوار مقامات کو نہایت خوبی سے حل کیا گیا ہے، ۱۳۱۲ھ میں مصر کے مطبع میمنہ سے سنن اور حاشیہ سندھی کے ساتھ دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور غالباً الگ سے بھی چھپی ہے۔

---

(۱) سنن نسائی کتاب قسم الفئی ص ۶۳۸، ۶۳۹ (۲) مقدمہ زہر الربی (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۔

حاشیہ سندھی: محمد بن عبدالہادی سندھی (م ۱۱۳۸ھ) نے جملہ کتب صحاح کی طرح امام نسائی کی سنن کا بھی حاشیہ اور تعلیق تحریر کی جو بہت مقبول و متداول ہے، یہ حاشیہ سیوطی کی شرح سے زیادہ جامع اور مفصل ہے، اس میں متن کے ضروری اور اہم مقامات کو حل، اعراب کی تحقیق اور غریب الفاظ و مشکل لغات کی تشریح کی گئی ہے، یہ حاشیہ، سنن اور اس کی شرح زہرالربی کے ساتھ ۱۳۱۲ھ میں مطبع میمنہ مصر سے شائع ہوا ہے۔

حافظ ابن کثیر کی تنقید: حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ ''نسائی کے بعض رجال مجہول اور مجروح ہیں، ان کے یہاں ضعیف، معلل اور منکر حدیثیں بھی ہیں،(۱) لیکن امام نسائی کی حزم واحتیاط کے بارے میں جو اقوال نقل کیے گئے ہیں، وہ ابن کثیر کی تردید کے لیے کافی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ رجال و احادیث کی تمیز میں امام نسائی کو خاص کمال حاصل تھا، ان کی سختی اور شدت کا یہ حال تھا کہ امام بخاری، امام مسلم، امام مالک اور یحییٰ بن سعید القطان جیسے اکابر محدثین وائمہ فن کے بعض رواۃ سے نقل و روایت میں بھی انھوں نے احتیاط ملحوظ رکھی ہے، ان کا خود بیان ہے کہ ''سنن کی جمع و تالیف کے سلسلہ میں جن مشائخ کے بارے میں میرے دل میں کچھ شک و تردد ہوا میں نے ان کو ترک کر دیا، عام محدثین کے نزدیک وہ اپنے عدم تساہل اور فرط احتیاط کے لیے نہایت مشہور مانے جاتے ہیں، اس کے باوجود ان کے یہاں ضعیف و منکر روایات کا سرے سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا، جب کہ صحاح کی اہم ترین کتابوں کے بارے میں بھی مطلق اور مجرد صحت کے دعویٰ کو بعض علما نے تسلیم نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں ابن کثیر کا الزام اور بھی بے حقیقت ہو جاتا ہے، صحاح کو دوسرے مصنفین کے مقابلہ میں امام نسائی نے التزام صحت اور رجال کے متعلق زیادہ شدت اور احتیاط برتی ہے اور مجموعی حیثیت سے صحیحین کے بعد یہی زیادہ معتبر اور مستند کتاب مانی جاتی ہے، علامہ سیوطی اور شارح سندھی دونوں کا بیان ہے کہ ''فی الجملہ نسائی کی کتاب السنن میں صحیحین کے

(۱) اختصار علوم الحدیث والحطہ ص ۱۰۹ بحوالہ شرح الفیہ بقائی۔

بعد سب سے کم ضعیف روایتیں ہیں اور اس کے رجال بھی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ مجروح نہیں ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب اس اعتراض کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں ان کا مقصود سنن کبریٰ سے ہے کیوں کہ سنن صغریٰ میں تو امام نسائی نے صحیح ترین حدیثیں منتخب اور جمع کی ہیں اور ان روایتوں کو ترک کر دیا ہے جن کی سندوں میں کلام کیا گیا ہے چوں کہ ابن کثیر سے امام نسائی اور ان کی سنن کی توثیق کے متعلق بھی اقوال منقول ہیں، اس لیے اس توجیہ کے بعد ان کی دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں رہ جاتا، حقیقت یہ ہے کہ صحاح ستہ میں صحیحین کے بعد صحت میں سب سے اہم اور مقدم امام نسائی کی سنن ہے۔''(۱)

☆☆☆

---

(۱) اتحاف النبلاء ص ۹۱۔

امام ابویعلیٰ موصلیؒ

(متوفی ۳۰۷ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابویعلیٰ کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن علی بن مثنیٰ بن یحییٰ بن عیسیٰ بن ہلال۔

ولادت، خاندان ووطن: مشہور روایت کے مطابق وہ ۲۰۷ھ میں اپنے وطن موصل میں پیدا ہوئے، حافظ ذہبی نے شوال ۲۱۰ھ کی روایت کی ہے، ان کا خاندانی تعلق قبیلہ بنی تمیم سے تھا، اس لیے تمیمی کہلاتے ہیں، ان کا وطن موصل، دجلہ وفرات کا درمیانی علاقہ جزیرہ تھا۔(۱)

اساتذہ: امام ابویعلی کے چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن حاتم طویل، احمد بن حنبل، شیبان بن فروخ، علی بن جعد، غسان بن لیث، محمد بن منہال ضریر یحییٰ حمانی اور یحییٰ بن معین وغیرہ۔

تلامذہ: ان کے بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابن حبان، ابوبکر اسماعیلی، ابوبکر بن مقری، ابوحاتم، ابوعلی نیشاپوری، ابوعمرو بن حمدان، حمزہ بن محمد کتانی، محمد بن نصر نخاس اور نصر بن احمد مرجی۔

طلب علم کے لیے سفر: پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے طلب حدیث کے لیے سفر کیا اور قیاس ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق مختلف مراکز حدیث کے ارباب کمال سے استفادہ کیا ہوگا۔

---

(۱) کتاب الانساب ورق ۵۴۵ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۷۶ ومعجم البلدان ج ۸ ص ۱۹۸۔

حفظ وثقاہت: حافظ ابویعلیٰ مشہور حفاظ حدیث اور نامور محدثین اسلام میں شمار کیے جاتے ہیں، اپنے غیر معمولی حافظہ کی بناپر، الحافظ اور الحافظ المشہور کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، ان کی عدالت وثقاہت میں بھی کوئی کلام نہیں کیا گیا ہے، حافظ ذہبی اور ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں ''وہ ثقہ ومتقن تھے'' ابن حبان نے ان کو ائمہ ثقات میں ذکر کیا ہے، حاکم کا بیان ہے کہ ''وہ ثقہ ومامون تھے'' ابوعلی ان کے اتقان اور حفظِ احادیث کے بڑے مداح ومعترف تھے اور فرماتے تھے کہ ''ان سے بہت کم حدیثیں مخفی تھیں'' علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں ''وہ اپنے مرویات میں ثقہ وعادل اور احادیث میں حافظ وضابط تھے۔'' (۱)

زہد واتقاء: امام ابویعلیٰ تدین وتقویٰ میں عالی مرتبہ اور فضائل اخلاق سے آراستہ تھے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ''وہ صدق ودیانت، امانت، حلم، تقویٰ اور دوسرے تمام عمدہ اوصاف وکمالات کے جامع تھے'' ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ تدین واتقان سے متصف تھے، حافظ ابن کثیر نے ان کو صاحب خیر اور صاحب شذرات نے صاحبِ صلاح بتایا ہے۔ (۲)

اخلاص: وہ زیادہ نمود کو برا سمجھتے تھے، ہر کام خالصۃً لوجہ اللہ کرتے تھے، مورخین کا بیان ہے کہ وہ تصنیف وتالیف، تعلیم حدیث اور تحصیل علوم میں محض حسبۃً للہ اور اخلاص کی بناپر مشغول ہوئے تھے، ایک مرتبہ ابوعمر حیری نے ان کو حسن بن سفیان پر ترجیح دی، ایک شخص نے کہا یہ غلط ہے، حسن کی مسند ضخیم اور ان کے شیوخ اعلیٰ ہیں، حیری نے جواب دیا کہ ابویعلیٰ حسبۃً للہ حدیث بیان کرتے تھے اور حسن کا یہ پیشہ تھا۔ (۳)

شہرت ومقبولیت: امام ابویعلیٰ کو اپنے حسن نیت اور اخلاص کی برکت کی وجہ سے بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، ان کی ذات عوام وخواص کی عقیدت کا مرکز بن گئی، ان کے انتقال کے دن موصل کے بازار بند ہوگئے تھے اور لوگوں کا جم غفیر ان کے جنازہ میں شریک تھا۔

---

(۱) العبر ج ۲ ص ۱۷۵ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۲۵۰ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۷۵ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۳۰ (۲) ایضاً (۳) بستان المحدثین ص ۳۵ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۷۵۔

وفات: تقریباً سو سال کی عمر میں ۳۰۷ھ میں اپنے وطن موصل میں انتقال کیا۔(۱)

تصنیفات: امام ابویعلیٰ صاحب تصنیف تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وہ عمدہ اور بہتر تصنیفات کے مالک تھے لیکن ان کی تین ہی کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں:

معجم: شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں ''انھوں نے ترتیب شیوخ پر ایک کتاب لکھی تھی۔(۲)

مسند کبیر و مسند صغیر: حافظ ابویعلیٰ نے دو مسندیں لکھی تھیں، ایک کبیر، دوسری صغیر، مشہور مسند صغیر ہے جو ۳۶، اجزا پر مشتمل ہے، اس کو ترتیب ابواب کے لحاظ سے جامع بھی کہا جا سکتا ہے،(۳) یہ حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں سمجھی جاتی ہے، اس میں ثلاثی حدیثیں بھی ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کو حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں شامل کیا ہے، حافظ اسماعیل تمیمی فرماتے ہیں کہ میں نے کئی مسانید، مسند عدنی اور مسند ابن منیع وغیرہ پڑھیں، ان کی حیثیت نہروں کی ہے اور مسند ابی یعلیٰ بحر زخار کی طرح تمام نہروں کا سنگم ہے۔''(۴)

اس کی اہمیت کی وجہ سے علمائے فن نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، حافظ ابن کثیر نے جامع المسانید والسنن میں اور محمد بن سلیمان (م ۱۰۹۴ھ) نے جمع الفوائد من جامع الاصول و مجمع الزوائد میں اس کی حدیثیں درج کی ہیں، نورالدین ہیثمی نے اس کے زوائد مرتب کیے اور حافظ ابن حجر نے اتحاف المهرہ میں اور شہاب الدین بوصیری نے اطراف المسانید العشرۃ میں اس کے مرویات نقل کیے ہیں۔(۵)

مسند ابی یعلیٰ کے قلمی نسخے حیدر آباد کے دائرۃ المعارف العثمانیہ اور کتب خانہ آصفیہ کے علاوہ مکتبہ سندیہ اور جرمنی کے کتب خانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔(۶)

---

(۱) بستان المحدثین ص ۳۵ (۲) ایضاً (۳) ایضاً والرسالۃ المستطرفۃ ص ۶۱ (۴) حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۷۶ (۵) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۴۰ و ۱۴۴ والرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۴۳ و ۱۴۴ (۶) تذکرۃ النوادر ص ۳۹ وفہرست کتب خانہ آصفیہ ج ۱ ص ۶۷۰، ۶۷۱۔

امام ابن خزیمہ

(متوفی ۳۱۱ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوبکر کنیت، شیخ الاسلام لقب اور نسب نامہ یہ ہے: محمد اسحاق بن خزیمہ بن مغیرہ بن صالح بن بکر۔

ولادت، خاندان ووطن: ماہ صفر ۲۲۳ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے، مجشر بن مزاحم سے ولاء کا تعلق تھا۔(۱)

اساتذہ: شیوخ واساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوقدامہ سرخسی، ابوکریب، احمد بن منیع، اسحاق بن موسیٰ خطمی، بشر بن معاذ عقدی، عبدالجبار بن علاء، عتبہ بن عبداللہ محمدی، علی بن حجر، علی بن خشرم، محمد بن ابان مستملی، محمد بن اسلم زاہد، محمد بن حرب، محمد بن مہران، محمود بن غیلان، نصر بن علی جہضمی، یونس بن عبدالاعلیٰ۔

اسحاق بن راہویہ اور محمد بن حمید رازی سے بھی ان کو ملاقات اور سماع کا شرف حاصل ہوا، مگر اس وقت کم سن تھے، اس لیے احتیاط کی بنا پر ان بزرگوں سے حدیثیں نہیں بیان کرتے تھے۔(۲)

تلامذہ: جن لوگوں سے ان کی روایات کا زیادہ حصہ منقول ہے، ان کے نام یہ ہیں:

ابوبکر احمد بن مہران مقری، ابوحامد احمد بن محمد بن مالویہ، ابوعلی نیشاپوری،

(۱) المنتظم ابن جوزی ج ۶ ص ۱۸۴ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۸۷ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۰۔

ابوعمرو بن حمدان اسحاق بن سعید نسوی، محمد بن بصیر اور پوتے محمد بن فضل۔

ان کے تلامذہ میں ابراہیم بن ابی طالب اور ابوعمرو احمد بن مبارک مستملی بھی تھے، جو عمر میں ان سے بڑے تھے۔(۱)

رحلت وسفر: علم وفن کی تحصیل اور حدیث وفقہ کی تکمیل کے لیے انھوں نے مختلف مقامات کے سفر کیے، بچپن میں اپنے وطن کے علما ومشائخ سے استفادہ کیا، اس کے بعد رے، بغداد، بصرہ، کوفہ، شام، حجاز، عراق، مصر اور واسط وغیرہ تشریف لے گئے۔(۲)

حفظ وثقاہت: علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ حدیثوں کے اسناد ومتون کا ان سے بہتر کوئی حافظ میں نے نہیں دیکھا، ابواحمد دارمی نے خود ابن خزیمہ سے ان کے حافظہ کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ''میں جس چیز کو تحریر کرتا ہوں وہ مجھے زبانی یاد ہو جاتی ہے'' ابوعلی نیشاپوری فرماتے ہیں کہ جس طرح قرا کو قرآن کی سورتیں زبانی یاد ہوتی ہیں اسی طرح ابن خزیمہ کو فقہیات حدیث زبانی یاد ہیں، امام دارقطنی وغیرہ نے ان کو ثقہ وثابت بھی قرار دیا ہے، ابن حبان فرماتے ہیں کہ روئے زمین پر احادیث وسنن کے صحیح الفاظ اور زیادات کی یادداشت رکھنے والا ان کے مانند کوئی اور شخص نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنن واحادیث کا تمام ذخیرہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔(۳)

حدیث میں درجہ ومرتبہ: ابن خزیمہ کا شمار اکابر محدثین اور نامور ائمہ فن میں ہوتا ہے، احادیث پر ان کی نظر نہایت وسیع اور گہری تھی، وہ کم سنی ہی میں امام اور حافظ حدیث کی حیثیت سے مشہور ہو گئے تھے، ایک دفعہ امام شافعیؒ کے نامور شاگرد اور فقہ شافعی کے جامع ومدون امام مزنی سے ایک عراقی شخص نے دریافت کیا کہ جب قرآن مجید نے قتل کی صرف دو ہی صورتیں بیان کی ہیں، عمد وخطا، تو آپ لوگ تیسری قسم شبہ عمد کو کس طرح مانتے ہیں،

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۲۸۷ وطبقات الشافعیہ ج ۲ص ۱۳۰ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ص ۱۴۹ وطبقات الشافعیہ ج ۲ص ۱۳۱ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۲۸۹ وطبقات الشافعیہ ج ۲ص ۱۳۱ و ۱۳۴۔

انھوں نے جواب میں ایک حدیث پیش کی، اس نے کہا کہ آپ علی بن زید بن جدحان کی روایت سے استدلال کرتے ہیں، یہ سن کر مزنی خاموش ہو گئے اور ابن خزیمہ نے جواب کہ شبہ عمد کی روایتیں دوسرے طرق سے بھی مروی ہیں، عراقی نے کہا اور کس کے واسطہ سے مروی ہیں، امام ابن خزیمہ نے فرمایا ایوب سختیانی اور خالد حزا سے، اس نے ایک راوی عقبہ بن اولیس کے متعلق شک وتردد کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ ایک بصری شیخ ہیں اور ابن سیرین جیسے جلیل القدر بزرگ نے بھی ان سے روایت کی ہے، معترض نے امام مزنی سے عرض کیا کہ آپ مناظرہ کر رہے ہیں یا یہ؟ انھوں نے فرمایا کہ یہ احادیث کے بارے میں مجھ سے زیادہ واقف کار ہیں، اس لیے جب حدیثوں پر گفتگو ہوتی ہے تو میں خاموش رہتا ہوں اور یہ بحث ومناظرہ میں حصہ لیتے ہیں۔ (۱)

امام ابن خزیمہ مسائل وفتاوے کا جواب بھی احادیث کی روشنی میں دیتے تھے، امیر اسماعیل بن احمد نے ایک مرتبہ فئی وغنیمت کا فرق دریافت کیا تو انھوں نے سورۂ انفال کی آیت وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ الخ پڑھنے کے بعد چند حدیثیں بیان کیں، پھر سورۂ حشر کی آیت مَا اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ الخ پڑھ کر احادیث سے مسئلہ کی وضاحت کی، ابوزکریا یحییٰ بن محمد کا بیان ہے کہ اس موقع پر انھوں نے تقریباً ۱۷۰ حدیثیں بیان کی ہوں گی۔ (۲)

احادیث سے استنباط مسائل میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا، ابن سریج کا بیان ہے کہ وہ بڑی چھان بین اور محنت سے احادیث کے نکات ومطالب کا استخراج کرتے تھے۔ (۳)

حدیث کی نقل وروایت میں ان کے فضل وامتیاز کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ وکان مبرز فی علم الحدیث یعنی وہ علم حدیث میں بہت

(۱) طبقات الفقہا لابی اسحاق شیرازی ص ۸۷ (۲) طبقات الشافعیہ سبکی ج ۲ ص ۱۳۴ (۳) ایضاً ص ۱۳۲ وطبقات الفقہا شیرازی ص ۸۷۔

ممتاز اور نہایت فاضل تھے۔(۱)

انھوں نے سنن کی اشاعت واحیا کا مقدس فرض بھی انجام دیا، ایک مرتبہ ان کے ایک پڑوسی نے خواب دیکھا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شبیہ مبارک کو صیقل کر رہے ہیں، معبرین نے بتایا کہ ابن خزیمہ احیاءِ سنت اور اشاعت حدیث کا کام انجام دیں گے۔(۲)

فقہ واجتہاد: فقہ میں بھی ان کا درجہ نہایت بلند تھا، بویطی اور مزنی جیسے اساتذہ وقت سے اس کی تحصیل کی تھی لیکن فقہ کے عام مذاہب میں سے وہ کسی خاص مذہب سے وابستہ نہیں تھے بلکہ ان کا شمار مجتہدین مطلق میں ہوتا ہے، علامہ ابن سبکی نے ان کو المجتهد المطلق اور علامہ ابن کثیرؒ نے وھو من المجتهدین فی دین الاسلام لکھا ہے، ان کا خود بیان ہے کہ سولہ سال کی عمر کے بعد میں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔

ابوزکریا یحیٰی بن محمد عنبری فرماتے ہیں کہ میں نے ابن خزیمہ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح فرمان کی موجودگی میں کسی شخص کی بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا،(۳) بعض علما کا خیال ہے کہ وہ خود صاحب مذہب اور مستقل امام فقہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے فتاوے بھی ایک زمانہ میں بعض اسلامی ملکوں میں رائج تھے، ان کے بعض فقہی مسائل کتابوں میں ملتے ہیں مثلاً۔

وہ رفع یدین کو نماز کا اہم اور ضروری رکن سمجھتے تھے، صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے والے کے لیے اعادہ لازمی سمجھتے تھے۔

حافظ ابن قیم لکھتے ہیں کہ ''محمد بن اسحاق امام الائمہ کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، ان کے متبعین ان کے مذہب کی پیروی کرتے تھے، وہ مقلد کے بجائے خود امام مستقل اور صاحب مذہب تھے، بیہقی نے یحیٰی بن محمد عنبری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اصحاب

(۱) ج ۶ ص ۱۸۴ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۹۴ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۴ (۳) ایضاً والبدایہ ج ۱۱ ص ۱۴۹ وطبقات الفقہا شیرازی ص ۸۷۔

حدیث کے پانچ طبقے ہیں، ۱-مالکیہ ۲-شافعیہ ۳-حنبلیہ ۴-راہویہ اور ۵-خزیمیہ۔(۱)

کلام وعقائد کے بعض مسائل: بدعات کو سخت ناپسند کرتے تھے اور عام محدثین کی طرح کلام وعقائد کے غیر ضروری مسائل میں بحث وتدقیق احتیاط وتقویٰ کے منافی خیال کرتے تھے، اپنے تلامذہ اور منتسبین کو سخت تاکید کردی تھی کہ اس قسم کے مسائل مین پڑنے سے پرہیز کریں، بعض تلامذہ کے متعلق جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ ایسے مباحث ان کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں تو سخت برہمی ظاہر کی اور اعلان کردیا کہ یہ لوگ میرے حوالہ سے جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ غلط ہے۔

عقائد و کلام کے متعلق انھوں نے جو کتابیں لکھی تھیں، ان میں اہل سنت والجماعت کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے، بعض مسائل میں عام اہل سنت سے بھی زیادہ متشدد تھے، چند مسائل کے متعلق ان کے آرا وخیالات طبقات وتراجم کی کتابوں سے نقل کیے جاتے ہیں۔

قرآن مجید خدا کا کلام ہے، اس کی وحی وتنزیل اور وہ خود غیر مخلوق ہے، وہ خدا کی صفات میں ایک ذاتی صفت اور مستقل بالذات ہے، اس کو مخلوق، محدث اور فعلی صفت سمجھنے والے جہمی، بدعتی اور گمراہ ہیں، بعض جاہل کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مکرر کلام نہیں کرتا، یہ لوگ کلام الٰہی سے ناآشنا اور اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں، اللہ نے کئی مقامات پر تخلیق آدم کا ذکر کیا ہے جو حضرت موسیٰؑ کا قصہ مکرر بیان کیا ہے، فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ بار بار کہا گیا ہے، یہ کسی مسلمان کا عقیدہ نہیں ہوسکتا اور جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ ازل میں کلام کرنے کے بعد اللہ پھر کلام نہیں کرتا وہ جہمی ہے، اللہ عرش پر بلا کیف مستوی ومتمکن ہے۔

ان مسائل میں وہ اتنے متشدد تھے کہ جہمیہ وغیرہ کو کافر بھی کہہ دیتے تھے، فرماتے ہیں: اللہ ازل سے متکلم ہے، جو شخص یہ گمان کرے کہ اللہ ایک ہی بار کلام کرتا ہے وہ کافر

(۱) اعلام الموقعین ص ۳۶۲۔

ہے، اسی طرح جو اس کا اقرار نہ کرے کہ اللہ عرش پر ساتویں آسمان کے اوپر متمکن ہے وہ کافر ہے، اس کا خون مباح اور مال حلال ہے، قرآن کو کلام الٰہی کے بجائے مخلوق سمجھنے والا کافر ہے، اس سے توبہ کرائی جائے گی اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے گا، اور وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا، جہمیہ اور کلامیہ ملعون اور اپنے عقائد وخیالات میں جھوٹے ہیں۔(۱)

فضل وکمال کا اعتراف: ان کے معاصرین علما اور ارباب کمال ان کے علم وکمال کے معترف تھے، امام دارقطنی نے ان کو عدیم النظیر اور علامہ ذہبی نے فرید العصر اور حافظ ابن کثیر نے بحرامن بحور العلم لکھا ہے، ابوعلی نیشاپوری فرماتے ہیں کہ ''میں نے ان سے زیادہ صاحب کمالات آدمی نہیں دیکھا'' ان کے استاذ ربیع بن سلیمان کا بیان ہے کہ ''ابن خزیمہ نے ہم سے جتنا استفادہ کیا، ہم نے اس سے زیادہ ان سے استفادہ کیا'' علامہ ابن سبکی ان کی جامعیت وفضیلت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ مختلف علوم کے جامع اور مرتبہ کمال پر فائز تھے، نیشاپور میں جو علم وفن کا گہوارہ اور فضلا وارباب کمال کا مرکز تھا، یکتائے روزگار تھے، ان کی علمی شان سب سے بالا وبرتر تھی، ان کے گرد طلبا ومستفیدین کا ہجوم رہتا تھا، ان کے فتاوے تمام روئے زمین میں نقل ہوتے تھے، عقل وفطانت میں بے مثال تھے، بحث مناظرہ میں انھیں زیر نہیں کیا جاسکتا تھا، درحقیقت علم وفضل کا ایسا بحر زخار تھے جس سے تشنگان علوم سیراب ہوتے تھے، ان کی اس علمی ضیاباری سے ایک عالم کو بصیرت حاصل ہوتی تھی، علما واساطینِ فن بھی ان کی جانب رجوع کرتے تھے، ان کے فیض کا یہ حال تھا۔

کالبحر یقذف للقریب جواهرا کرما ویبعث للغریب صحائبا(۲)

''یعنی ابن خزیمہ سمندر کی طرح اپنے قریب کے لوگوں کو موتی اور

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۹۲ تا ۲۹۴ (۲) طبقات الشافعیہ ابن سبکی ج ۲ ص ۱۳۰۔

جواہرات سے مالا مال کرتے ہیں اور دور والوں کے لیے بارانِ رحمت کی طرح سامان فیض کرتے ہیں۔"

اتباع سنت: اتباع سنت میں بڑا اہتمام تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی وہ سنت کا لحاظ رکھتے تھے، ایک مرتبہ ان سے حمام میں بال منڈانے کے لیے کہا گیا، تو فرمایا کہ میرے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حمام میں داخل ہو کر بال منڈانا ثابت نہیں ہے، ابوعمرو بن اسماعیل کا بیان ہے کہ میں ابن خزیمہ کے درس میں شریک ہوتا تھا اور وہ اکثر معمولی کاموں میں مدد لیا کرتے تھے، ایک دفعہ میرا داہنا ہاتھ روشنائی سے سیاہ ہو گیا تھا، اس لیے میں نے ان کو بائیں ہاتھ سے قلم دینا چاہا تو انھوں نے نہیں لیا، میرے رفقا نے داہنے ہاتھ سے قلم دینے کے لیے کہا، جب میں نے داہنے ہاتھ سے دیا تو انھوں نے لے لیا۔(۱)

بزرگی وکرامت: وہ صاحب کرامت بھی تھے، لوگ ان کی ذات کو نہایت بابرکت خیال کرتے تھے، ابوعثمان زاہد کا بیان ہے کہ "اللہ تعالیٰ اہل نیشاپور کے مصائب وآلام ابن خزیمہ کی برکت سے دفع کر دے گا۔"

محمد بن ہارون طبری روایت کرتے ہیں کہ وہ اور محمد بن نصر مروزی، محمد بن علویہ وزان اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ چاروں آدمی تحصیل علم وسماع حدیث کے لیے ربیع بن سلمان کے پاس گئے، وہاں ہم لوگوں کا ساز وسامان ختم ہو گیا، جب تین دن اور تین رات تک فاقہ کرنا پڑا تو ہم نے آپس میں کہا ایسی حالت میں تو ہمارے لیے سوال کرنا جائز ہے لیکن ہر شخص سوال کرنے میں عار محسوس کرتا تھا، اس لیے قرعہ اندازی کی گئی، اتفاق سے قرعہ ابن خزیمہ کے نام نکلا، انھوں نے کہا، پہلے مجھے دو رکعت استخارہ کی نماز پڑھ لینے دو، ابھی وہ نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھولا گیا تو امیر مصر احمد بن طولون کا خادم اجازت لے کر اندر داخل ہوا اور سلام کر کے بیٹھ گیا، پھر ایک پرزہ نکال کر پوچھا کہ

(۱) طبقات الشافعیہ ابن سبکی ج ۲ ص ۱۳۱

محمد بن نصر کون صاحب ہیں؟ ہم لوگوں نے ان کی طرف اشارہ کر دیا، اس نے پچاس ہزار کی ایک تھیلی دی اور کہا، امیر نے سلام عرض کیا ہے اور آپ کے اخراجات کے لیے یہ رقم پیش کی ہے، ختم ہونے کے بعد مزید رقم پیش کی جائے گی، اسی طرح ہم چاروں کو تھیلیاں دے کر یہی پیغام پہنچایا، ہم لوگوں نے اس سے کہا، پہلے اس واقعہ کا سبب بتاؤ ورنہ ہم یہ تھیلیاں نہیں قبول کریں گے، اس نے کہا آج دوپہر میں امیر قیلولہ کر رہے تھے کہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ کل خدا کے یہاں حاضر ہو کر کیا جواب دو گے جب وہ تم سے ان چاروں علما کے متعلق سوال کرے گا جو تین روز سے بھوکے ہیں، اس خواب سے امیر گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور آپ لوگوں کا نام لکھوا کر یہ تھیلیاں بھیجیں، میں اسی وقت سے آپ لوگوں کی تلاش میں تھا، اب جا کر آپ لوگ ملے ہیں'' (۱)

قناعت: زندگی بڑی سادہ و درویشانہ اور تکلف و آرائش سے بالکل پاک تھی، ایک معمولی رقم میں گذر بسر کر لیتے تھے، پہننے کے لیے ہمیشہ ایک ہی قمیص ہوتی تھی، جب دوسری قمیص بنواتے تو پرانی کسی ضرورت مند کو دیدیتے تھے، لوگ درخواست کرتے کہ کچھ زیادہ کپڑے بنوا لیجئے، فرماتے کہ مجھے اپنے نفس کے آرام و راحت کا کوئی خیال نہیں۔ (۲)

سخاوت: بڑے فیاض اور مہمان نواز تھے، ان کے پوتے محمد بن فضل کا بیان ہے کہ میرے دادا بخل سے نا آشنا اور مال پس انداز نہیں کرتے تھے، ان کا کل مال و دولت اہل علم اور ضرورت مندوں کے لیے وقف تھا، ایک مرتبہ بڑی پر تکلف دعوت کی، مختلف قسم کے لذیذ کھانوں اور حلوے، میوے اور فواکہ سے دستر خوان آراستہ تھا، امرا و اعیان کے ساتھ اہل علم اور فقہا و محدثین بھی مدعو تھے، ہر شخص نے شکم سیر ہو کر کھایا، لوگوں کا بیان ہے کہ ایسی شاندار دعوت اور اس کا اہتمام صرف سلطان ہی کر سکتا تھا۔ (۳)

---

(۱) المنتظم ابن جوزی ج ۶ ص ۱۸۵ و ۱۸۶ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۱ (۳) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۵۔

صاف گوئی: ان کے اخلاقی اوصاف میں سب سے نمایاں وصف صاف گوئی ہے، امرا واعیانِ دولت کے سامنے بھی وہ اس میں باک نہ کرتے تھے، ایک دفعہ امیر اسماعیل بن احمد نے اپنے والد کے واسطہ سے ایک حدیث بیان کی جس کی سند میں ان کو وہم ہو گیا تھا، ابن خزیمہ بھی وہاں موجود تھے، انھوں نے فوراً اس کی تصحیح کی جب واپس ہوئے تو قاضی ابوذر نے بتایا کہ ہم لوگ بیس سال سے یہ غلط روایات سنتے تھے مگر تصحیح کی جرأت نہ ہوتی تھی، ابن خزیمہ نے کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں خطأ وتحریف جان کر خاموش رہنا گوارا نہیں کر سکتا۔(۱)

امامت وشہرت: اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی مرجعیت اور شہرت عطا فرمائی تھی، امام الائمہ ان کے نام کا جز بن گیا تھا، اسنوی کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں خراسان کے امام تھے، امام دارقطنی نے ان کو اور ابن ابی حاتم نے امام ومقتدا کہا ہے،(۲) مقبولیت کا یہ حال تھا کہ ان سے استفادہ کرنے کے لیے علما وطلبہ کا ہجوم لگا رہتا تھا، بڑے بڑے ارباب کمال دور دراز سے مشقتیں برداشت کر کے استفادہ کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مستفیدین کے قافلے ہر وقت خیمہ زن رہتے تھے، امرا وارباب حشمت بھی ان کے اعزاز واکرام کو ملحوظ رکھتے تھے، پہلی مرتبہ جب امیر اسماعیل بن احمد سے آپ کی ملاقات ہوئی تو اس نے ناواقفیت کی وجہ سے شایان شان التفات نہیں کیا، بعد میں جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ ابن خزیمہ ہیں تو اس نے بڑی معذرت اور شرمندگی کا اظہار کیا اور نہایت گرمجوشی کے ساتھ ملا۔(۳)

وفات: ۲؍ذی قعدہ ۳۱۱ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا،(۴) اور اپنے گھر کے ایک کمرہ میں دفن کیے گئے، بعد میں پورا گھر مقبرہ میں تبدیل ہو گیا تھا، علامہ ابن جوزی نے ۸؍ذوقعدہ اور ابواسحاق شیرازی نے ۳۱۲ھ سنہ وفات بتایا ہے،(۵) ایک شاعر کے مرثیہ کے دو شعر یہ ہیں:

---

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۱ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۹۵ (۳) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۴

(۴) ایضاً وتذکرۃ ج ۲ ص ۲۹۵ (۵) المنتظم ج ۶ ص ۱۸۶ وطبقات الفقہاء ص ۸۷۔

یـابن اسحاق قد مضیت حمیدا　　فسقی قبرك السحاب الهتون

مـاتـولیت لابل العلم ولی　　مـادفـنـاك بل هو المدفون (۱)

ترجمہ: اے ابن اسحٰق آپ کی زندگی نہایت قابل ستائش تھی، آپ کی قبر کو ہمیشہ برسنے والے بادل سیراب کرتے رہیں، آپ دنیا سے رخصت نہیں بلکہ علم رخصت ہوگیا، ہم نے آپ کے بجائے علم کو دفن کیا ہے۔

تصنیفات: ابن خزیمہ نامور مصنف بھی تھے، ان کی تصنیفات کی تعداد حاکم نے ۱۴۰ سے زیادہ بتائی ہے، ان کے علاوہ اُن کے مسائل کا مجموعہ بھی سو جزوں کے بقدر تھا، ابن کثیر کا بیان ہے فکتب الکثیر وصنف وجمع یعنی بے شمار کتابیں تصنیف کیں، ابن خزیمہ تصنیف شروع کرنے سے قبل استخارہ کی نماز پڑھتے تھے، اگر استخارہ نکل آتا تھا تب تصنیف کی ابتدا کرتے تھے، (۲) جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

فقہ حدیث بریرہ: یہ تین جزوں پر مشتمل ہے، اس میں ایک حدیث کی فقاہت کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب التوحید والصفات: یہ بڑی اہم اور مشہور کتاب ہے اور کئی اجزا پر مشتمل ہے، اس کا موضوع کلام وعقائد ہے، امام رازی اس کو کتاب الاشراک کے نام سے موسوم کرتے تھے، یورپ کے بعض کتب خانوں میں اس کے نسخے پائے جاتے ہیں، ابونعیم نے المستخرج علی التوحید لکھی تھی۔ (۳)

صحیح ابن خزیمہ: یہ علامہ ابن خزیمہ کی سب سے اہم کتاب ہے، اس کا شمار حدیث کی اہم اور معتبر کتابوں میں ہوتا ہے، مستند مصنفین اور ثقہ علما اس کی حدیثوں سے اخذ واستناد کرتے ہیں، کتب صحاح کے علاوہ جن محدثین نے اپنی کتابوں میں صحت کا زیادہ

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۳ (۲) ایضا ص ۱۳۴ و ۱۳۵ و تذکرۃ ج ۲ ص ۲۹۴ والبدایہ ج ۱۱ ص ۱۴۹

(۳) فوائد جامعہ ص ۱۴۳ و کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷۰ و تذکرۃ النوادر ص ۶۴ و تدریب الراوی ص ۳۵۔

التزام کیا ہے، ان کے مجموعے صحیح کہلاتے ہیں، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں ''جن دیگر علمانے صحاح کے مجموعے لکھے ان میں ابن خزیمہ کی صحیح بعض حیثیتوں سے زیادہ مشہور ہے،''

اس کی اہمیت کا اندازہ ابن کثیر کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے:

من انفع الکتب واجلها (۱) یعنی صحیح ابن خزیمہ نہایت مفید اور اہم کتابوں میں ہے، علامہ سیوطی نے بخاری و مسلم کے بعد جن کتابوں کو زیادہ معتبر بتایا ہے، ان میں کتب صحاح کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ صحیح ابن خزیمہ کا پایہ صحیح ابن حبان سے زیادہ ہے، کیوں کہ ابن خزیمہ نے صحت کی جانب زیادہ توجہ کی ہے، وہ ادنیٰ شبہہ پر بھی توقف سے کام لیتے ہیں، چنانچہ اکثر ان صح الخبر وان ثبت وغیرہ قسم کے الفاظ لکھے ہیں، یہ صحت میں صحیح مسلم کے قریب قریب ہے، اس کے نسخے یورپ کے بعض کتب خانوں اور جرمنی میں موجود ہیں، حافظ ابن حجر نے صحیح ابن خزیمہ پر مفید حواشی بھی لکھے تھے۔(۲)

☆☆☆

(۱) البدایہ ج ۱۱ ص ۱۴۹ و حواشی سعدی ص ۱۵ و تدریب الراوی ص ۳۱ (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۳۔

امام ابوعوانہ اسفرائینیؒ

(متوفی ۳۱۶ھ)

نام ونسب: یعقوب نام، ابوعوانہ کنیت، اور سلسلہ نسب یہ ہے: یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم بن یزید۔ بعض اہل سیر نے یزید کے بجائے زید لکھا ہے۔(۱)

وطن: وہ اسفرائن کے باشندہ تھے لیکن آخر عمر میں نیشاپور میں سکونت کر لی تھی، اس لیے اسفرائینی اور نیشاپوری دونوں نسبتوں سے مشہور ہیں، اسفرائین نواحی نیشاپور میں زرخیز اور شاداب شہر تھا، قدیم زمانہ میں اس کا نام مہرجان تھا، اس شہر کی جانب علما و اعیان کی ایک کثیر جماعت منسوب ہے، سمعانی کا بیان ہے کہ قدیم اور جدید ہر دور میں جملہ فنون کے ماہرین علما اور فضلا کی ایک جماعت یہاں پیدا ہوئی، ان میں ابوعوانہ بھی ہیں۔(۲)

اساتذہ: ابوعوانہ کے شیوخ و اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے، ان میں سے اکثر بڑے نامور اور کامل الفن ہیں، بعض شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوحاتم، ابوزرعہ، احمد بن ازہر، احمد بن سعید دارمی، اسماعیل بن محمد بن قیراط، حسن زعفرانی، سعد بن عبدالحکم، سعدان بن نصر، علی بن اسکاب، علی بن حرب، عمر بن شیبہ، محمد بن رجاء سندی، محمد بن عبدالحکم، محمد بن یحییٰ ذہلی، مسلم بن حجاج قشیری، یزید بن محمد بن عبدالصمد، یعقوب بن سفیان اور یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ سے علم حدیث کی اور امام شافعیؒ

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۳۴۳ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۲۱ (۲) بستان المحدثین ص ۳۷، کتاب الانساب ص ۳۴۔

کے ارشد تلامذہ ابوابراہیم مزنی اور ربیع بن سلیمان سے فقہ میں تکمیل بہم پہچائی۔

تلامذہ: ان کے تلامذہ اور مستفیدین کا حلقہ بھی بڑا وسیع ہے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ابواحمد علی، ابوبکر اسماعیلی، ابوعلی نیشاپوری، ابوالولید فقیہ، احمد بن علی رازی، حسین بن علی، سلیمان طبرانی، عبداللہ بن عدی، عبدالملک بن حسن اسفرائینی (۱)، محمد بن ابوعوانہ (۲) محمد بن یعقوب بن اسماعیل، یحییٰ بن منصور قاضی وغیرہ۔

طلب حدیث کے لیے سفر: ابوعوانہ نے علم حدیث کی طلب وجستجو میں متعدد مقامات کے سفر کیے، اس حیثیت سے بھی وہ دوسرے محدثین میں ممتاز ہیں، ان سے زیادہ کسی اور کے سفر کی تفصیل نہیں ملتی، علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ''ابوعوانہ نے طلب حدیث کے لیے سفر کیے اور اس کے جمع کرنے اور اس کی تحریر وکتابت میں بڑی مشقت اٹھائی'' حاکم کا بیان ہے کہ ''وہ کثیر الاسفار تھے اور انھوں احادیث کی تحصیل کے لیے روئے زمین کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا'' ابن خلکان کا بیان ہے کہ:

احد الحفاظ الجوالین والمحدثین المکثرین۔ (۳)	وہ ان حفاظ اور محدثین میں تھے جنھوں نے بڑے سفر کیے اور بکثرت حدیثیں جمع کیں۔

مؤرخین اور اصحاب سیر کا بیان ہے کہ انھوں نے خراسان، عراق، یمن، حجاز، شام، جزیرہ، فارس، اصفہان، ثغور، ری، واسط، بصرہ اور کوفہ وغیرہ مختلف ملکوں اور شہروں کا تحصیل علم اور طلب حدیث کے لیے سفر کیا۔

حفظ وثقاہت: ان کا حافظہ بے مثال تھا، علمائے فن نے ان کو الحافظ الکبیر الجلیل،

(۱) یہ ابوعوانہ کے بھتیجے تھے، (۲) یہ ابوعوانہ کے فرزند تھے، (۳) کتاب الانساب ورق ۳۴ وفیات الاعیان ج ۲ ص ۳۴۵، مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۲۷۰۔

احد الحفاظ، احد حفاظ الدنیا اور من اکابر حفاظ الحدیث لکھا ہے اور ثقہ جلیل اور الثقۃ الکبیر وغیرہ کے الفاظ میں ان کی توثیق کی ہے۔

اعتراف کمال: دوسرے علما و محدثین ان کے کمالات کے معترف تھے، حاکم لکھتے ہیں کہ ''ابوعوانہ بلند پایہ محدثین اور اصحاب کمال میں تھے'' ابن خلکان فرماتے ہیں کہ ''وہ نامور محدثین اور بلند ترین علمائے اسلام میں تھے۔''(۱)

فقہ و اجتہاد: فقہ میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، ذہبی کا بیان ہے کہ ''وہ حافظ و محدث ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ اور امام بھی تھے، ابن خلکان نے ان کے مزار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس مقام میں امام شافعی کے مذہب و مسلک سے تعلق رکھنے والے چالیس ایسے ائمہ مجتہدین اور فقہا مدفون ہیں جو اگر اپنی رائے و اجتہاد سے فتویٰ دیتے تو بلاشبہ وہ اس کے مستحق تھے''

مذہب و مسلک: انھوں نے فقہ کی تعلیم شافعی مذہب کے ائمہ سے حاصل کی تھی، اس لیے ان کو اس مذہب سے بڑا تعلق تھا، مصر سے واپس آنے کے بعد انھوں نے شوافع کی کتابوں سے پہلی مرتبہ اسفرائن کے لوگوں کو روشناس کرایا اور انہی کی بدولت اسفرائن میں امام شافعیؒ کے مذہب کی ترویج و اشاعت ہوئی۔(۲)

زہد و اتقا: زہد و تقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ تھے، علامہ سمعانی بیان کرتے ہیں کہ ''وہ زاہد، عبادت گذار، عفیف، پاکدامن اور کم خور تھے اور پانچ مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔

وفات: اپنے وطن اسفرائن میں ۳۱۶ھ میں انتقال کیا، ایک روایت ۳۱۳ھ کی بھی ہے لیکن وہ ضعیف ہے۔

تصنیفات: امام ابوعوانہ کی تصنیفات میں ایک مسند صحیح ان کی یادگار ہے جو در اصل صحیح مسلم

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۳۴۵ و تذکرہ ج ۳ ص ۲ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۲۲ (۲) ایضاً۔

پر مستخرج ہے، محدثین کی اصطلاح میں مستخرج اس کتاب کو کہا جاتا ہے جس میں کسی دوسری کتاب کی حدیثوں کو اس کی ترتیب متون اور طرق اسناد کے مطابق نقل کیا جاتا ہے، مسند ابوعوانہ میں امام مسلم کے طرق واسانید کے علاوہ دوسرے طرق اسناد اور بعض متون کا اضافہ بھی کیا گیا ہے، اس لیے اس کو صحیح بھی کہا جاتا ہے اور اس حیثیت سے دراصل یہ خود ایک مستقل تصنیف بن گئی ہے۔(۱)

خصوصیات: ۱- اس کی پہلی خصوصیت تو یہی ہے کہ صحیح مسلم کی مستخرج ہونے کے باوجود اس میں بعض اضافے بھی ہیں، علامہ ذہبی کا بیان ہے:

صاحب الصحيح المسند المخرج على صحيح مسلم وله فيه زيادات عدة۔(۲)	ابوعوانہ صاحب صحیح مسند ہیں، ان کی کتاب امام مسلم کی صحیح پر تخریج کی گئی ہے لیکن اس میں متعدد اضافے بھی ہیں۔

مثلاً باب الدليل علىٰ ايجاب الوضو میں تین حدیثیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قال ابوعوانة من هنا لم يخرجه اصحابنا.	یعنی یہاں سے جو روایتیں نقل کی جارہی ہیں ان کی ہمارے اصحاب نے تخریج نہیں کی ہے۔

اسی طرح آٹھ حدیثیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قال ابوعوانة الىٰ هنا زدت من عندي۔(۳)	یعنی یہاں تک میں نے خود اضافہ کیا ہے۔

۲-مختلف اسانید اور متعدد احادیث تحویل نظائر وشواہد کے ساتھ درج کیے ہیں اور اختلاف متن کی بحث کرتے ہوئے ایسے اقوال اور صحیح مرویات جمع کیے ہیں جو دوسری متداول کتابوں میں نہیں ملتے۔

---

(۱) بستان المحدثین ص۳۵،۳۶ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج۲ص۲ (۳) مسند ابوعوانہ ج۱ص۲۳۵،۲۳۷۔

۳-امام ابوعوانہ نے احادیث کے معنی کی صحیح تعبیر اور بلیغ تشریح بھی کی ہے۔

۴-فقہی ابواب پر مسند کو مرتب کرنے کے باوجود انھوں نے اس میں مختلف فصول قائم کیے ہیں جو ان کی طباعی کا ثبوت ہے۔

اس مسند کو پہلی مرتبہ مولانا محمد ہاشم ندوی نے ایڈٹ کر کے دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے ۱۳۶۲ھ و ۱۳۶۳ھ میں دو جلدوں میں شائع کیا ہے اور مفید تعلیقات اور مختصر حواشی بھی لکھے ہیں، دونوں جلدوں کے آخر میں ابواب وفصول کی مفصل فہرست، اسماء واعلام کی انڈکس اور پہلی جلد میں مصنف اور تصنیف کے متعلق مفید معلومات بھی درج ہیں، مسند کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں (۱) اور علمائے فن نے اس کے ساتھ اعتنا کیا ہے، علامہ ذہبی نے المنتقیٰ کے نام سے اس کی ۲۳۰ حدیثوں کو منتخب کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے اتحاف المہرۃ باطراف العشرۃ میں مستخرج ابی عوانہ کی حدیثیں درج کی ہیں۔(۲)

☆☆☆

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص۱۴۳ وتذکرۃ النوادر ص۴۰ (۲) بستان المحدثین ص۳۷ وذیل طبقات الحفاظ ص۳۲۳۔

امام ابوجعفر طحاویؒ

(متوفی ۳۲۱ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابوجعفر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ بن سلیم بن سلیمان بن حباب۔(۱)

ولادت: مشہور روایت کے مطابق وہ یکشنبہ کے دن ۱۰ ربیع الاول ۲۳۹ھ میں پیدا ہوئے، ۲۲۷ھ و ۲۳۸ھ بھی سنہ ولادت بیان کیا جاتا ہے۔(۲)

خاندان ووطن: امام طحاوی کا خاندانی تعلق یمن کے مشہور قبیلہ ازد کی شاخ حجر سے تھا، اسلامی فتوحات کے بعد ان کے خاندان والوں نے مصر میں سکونت اختیار کر لی تھی اور یہیں ایک گاؤں طحا میں امام صاحب کی ولادت ہوئی۔(۳) اس لیے وہ ازدی، حجری اور مصری وطحاوی کہلاتے ہیں، یاقوت کا بیان ہے کہ طحا کے قریب ہی طحطوط نام کے ایک گاؤں کو ان کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے لیکن انھوں نے اس کے بجائے طحا کی جانب ہی اپنی نسبت کو پسند کیا، علامہ سیوطی نے بھی اسی روایت پر اعتماد کیا ہے۔(۴)

اساتذہ: ان کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے، عبدالعزیز بن طاہر تمیمی نے ایک مستقل رسالہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے،(۵) طحاوی کے اکثر شیوخ کو مشہور محدث ابن وہب

(۱) الجواہر المضیہ ج۱ ص۱۰۲ (۲) تاریخ ابن عساکر ج۲ ص۵۵ وتاریخ ابن خلکان ج۱ ص۳۳ (۳) ایضاً وکتاب الانساب ورق ۳۶۷ و ۳۶۸ والجواہر المضیہ ج۱ ص۱۰۲ (۴) معجم البلدان ج۶ ص۳۰ والرسالۃ المستطرفہ ص۳۸ (۵) الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص۶۔

اور سفیان بن عیینہ سے شرف تلمذ حاصل ہے،(۱) بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

بحیر بن نصر، سلیمان بن شعیب کیسانی، عبدالغنی بن رفاعہ، عیسیٰ بن مثرود، محمد بن عبدالحکم، ہارون بن سعید ایلی، یونس بن عبدالاعلیٰ صدفی وغیرہ۔

فقہ واجتہاد کی تحصیل کے لیے پہلے امام شافعیؒ کے ممتاز ترین شاگرد اور فقہِ شافعی کے جامع ومرتب امام مزنی کی جانب جو ان کے ماموں تھے متوجہ ہوئے لیکن بعد میں قاضی ابوحازم اور احمد بن عمران وغیرہ سے اس کی تکمیل کی۔(۲)

تلامذہ: ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، بعض علما نے ان پر مستقل رسالہ لکھا ہے، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن عبدالوارث زجاج، احمد بن قاسم خشاب، ابومحمد حسن بن قاسم مصری، ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی، ابوالقاسم عبداللہ بن علی داؤدی، ابوسعید عبدالرحمٰن بن احمد، ابوبکر محمد بن ابراہیم مصری، ابوالحسن محمد بن احمد اخمیمی، محمد بن بکر، محمد بن مظفر، یوسف بن قاسم میانجی۔(۳)

طلب علم کے لیے سفر: مورخین نے صرف ۲۶۸ھ میں امام صاحب کے شام تشریف لے جانے کا ذکر کیا ہے، مگر ان کے اساتذہ میں مصر، یمن، کوفہ، بصرہ، حجاز، شام، خراسان اور مغرب وغیرہ مختلف اسلامی ملکوں کے ارباب کمال شامل ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان میں سے اکثر مقامات کا سفر بھی کیا ہوگا، ان کے شوق وجستجو کا یہ حال تھا کہ جب کوئی محدث یا صاحب کمال مصر آتا تو اس کی خدمت میں حاضر ہوکر استفادہ کی کوشش کرتے۔(۴)

---

(۱) العبر ج ۲ ص ۵۵ (۲) الجواہر ج ۱ ص ۱۰۳، ابن عساکر ج ۲ ص ۵۵ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴۷ (۳) الجواہر المضیہ ج ۱ ص ۱۰۴ والحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۷ (۴) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۵۴ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰ والحاوی ص ۱۸ و۱۹۔

حفظ وثقاہت: ابن یونس صاحب تاریخ مصر کا بیان ہے کہ ''امام طحاوی ثقہ وثابت اور صاحبِ عقل وفراست تھے'' مسلمہ بن قاسم قرطبی فرماتے ہیں، ''وہ ثقہ اور نہایت جلیل القدر تھے''، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''ثقہ وثابت اور ماہر حفاظ حدیث میں ایک امام طحاوی بھی ہیں۔'' بدرالدین عینی فرماتے ہیں کہ ''ان کی ثقاہت، دیانت، امانت اور فضیلت پر سب کا اتفاق ہے۔'' صاحبِ مرأۃ الزماں تحریر فرماتے ہیں کہ ''لوگ ان کے علم وفضل کی طرح ان کے صدق وثقاہت کے بھی معترف ہیں۔''(۱)

اعتراف کمال: تمام اکابر علما ومحدثین ان کے علمی کمالات کے معترف تھے، مورخین کا بیان ہے کہ ''ان کے بعد ان کا کوئی ہمسر اور جانشین نہیں پیدا ہوسکا۔'' ابن ندیم فرماتے ہیں کہ ''وہ علم وفضل میں بے مثال اور یکتائے روزگار تھے'' علامہ عینی کہتے ہیں کہ ''جن محدثین اور مورخین نے ان کا تذکرہ کیا ہے، وہ سب ان کی مدح وتوصیف میں متفق ہیں، متقدمین میں طبرانی، خطیب، حمیدی اور متاخرین میں حافظ مزی، ابن کثیر اور ذہبی وغیرہ نے ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کوئی واقف کار اور مصنف مزاج شخص ان کے علم وفضل اور اوصاف وکمالات کا منکر نہیں ہوسکتا۔'' حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ''ان کی تصنیفات ان کی وسعت نظر اور علمی تبحر پر شاہد ہیں۔''(۲)

جامعیت: امام طحاوی کو جملہ اسلامی علوم اور ان کے متعلقات میں مہارت حاصل تھی، مورخین اور علمائے سیر نے تفسیر، کلام، عربیت، ادب، لغت، نحو اور انساب وغیرہ میں ان کی ژرف نگاہی کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض علوم میں انھوں نے مستقل کتابیں لکھیں اور ان کی فقہی وحدیثی کتابوں میں بھی ان علوم پر بحثیں ہیں، حدیث وفقہ اور اصول وشروط کے خاص طور پر بڑے ماہر تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''انھوں نے شروط میں کتاب لکھی اور

---

(۱) الجواہر المضیئہ ج۱ ص۱۰۲ وکتاب الانساب ورق ۱۵۸، ۳۶۹ والبدایہ والنہایہ ج۱۱ ص۱۷۴ وتاریخ ابن عساکر ج۲ ص۵۵ (۲) الفہرست ص۲۹۲ والحاوی ص۱۲ و۱۳ وبستان المحدثین ص۸۸۔

وہ اس فن میں ممتاز و ماہر تھے" علامہ زاہد الکوثری فرماتے ہیں "امام طحاوی فضائل و کمالات کے جامع تھے، حدیث اور اس کے متعلقہ علوم اور فقہ اور اس کے اصول وضوابط میں علمائے امت میں بہت کم لوگ ان دونوں فنون میں ایسے جامع پیدا ہوئے، اس کا ان تمام لوگوں کو اعتراف ہے، جو اس سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوئے ہیں۔"(۱)

زہد و اتقاء: زہد و اتقاء میں بھی اُن کا درجہ نہایت بلند تھا، ابن ندیم فرماتے ہیں کہ وہ زہد و ورع میں یکتائے زمانہ تھے، صاحب مرأۃ الزمان کا بیان ہے کہ "ان کے زہد و تقویٰ پر لوگوں کا اتفاق ہے" علامہ عینی نے ان کی دیانت، ثقاہت، امانت اور راست بازی وغیرہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔(۲)

فقہی مسلک: شروع میں وہ شافعی مذہب سے وابستہ تھے، پھر حنفی مذہب اختیار کر لیا اور اس سے ایسا مستحکم تعلق ہوا کہ اس کے اکابر فقہا اور ائمہ مجتہدین میں شمار کیے جاتے ہیں، ان کے تمام سوانح نگاروں نے ابن یونس کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ مصر میں حنفی مذہب کی ریاست و سیادت ان پر تمام ہوگئی" حافظ ذہبی وغیرہ نے ان کو شیخ الحنفیہ لکھا ہے،(۳) گو اس مذہب میں بڑے بڑے جلیل القدر علما اور بکثرت ارباب کمال پیدا ہوئے لیکن ان سب میں امام طحاوی کو امتیازی درجہ حاصل ہے، انھوں نے اپنی تصنیفات سے اس مذہب کی بڑی اہم خدمات انجام دیں اور اس کی ترویج و اشاعت اور تائید و حمایت میں اپنی عمر صرف کر دی، جس کا اعتراف خود علمائے احناف کو بھی ہے، ابن قطلو بغا کا بیان ہے، وکان اماما فقیھا من الحنفیین (۴) حنفی مذہب سے شدید تعلق کے باوجود انھوں نے بعض مسائل میں اس سے اختلاف بھی کیا ہے اس لیے اا کو مجتہد منتسب وغیرہ کہا گیا ہے۔

---

(۱) العبر ج ۲ ص ۱۸۶ و ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰ و البدایہ ج ۱۱ ص ۱۷۴ و الحاوی ص ۳ (۲) القہر ست ص ۲۹۲ والحاوی ص ۱۲ (۳) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۵۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰ و العبر ج ۲ ص ۱۸۶ (۴) الجواہر المضیئہ ج ۱ ص ۱۰۳ و حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴۷۔

شافعی مذہب ترک کرنے کا سبب: امام طحاویؒ کے شافعی مسلک چھوڑنے کے متعلق مورخین نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ''ابتدا میں وہ اپنے ماموں اسماعیل بن یحیٰی مزنی ۲۶۴ھ کے درس میں جو امام شافعیؒ کے ممتاز ترین شاگرد اور فقہ شافعی کے بانیوں میں تھے، شریک ہوتے تھے، ایک دن انھوں نے کوئی مسئلہ بیان کیا، جس کو طحاوی بار بار سمجھانے کے باوجود بھی نہیں سمجھ سکے، اس پر انھوں نے بلادت وغباوت کا طعنہ دیا اور کہا کہ ''بخدا تم کو کچھ نہیں آ سکتا'' امام طحاوی اس واقعہ سے اتنا متاثر ہوئے کہ مزنی کے درس میں جانا ہی ترک کر دیا اور ابو جعفر احمد بن ابی عمران کے حلقۂ درس میں جو مصر میں حنفی مذہب کے قاضی تھے، شریک ہونے لگے اور پوری محنت سے فقہ میں مشق ومہارت بہم پہنچائی اور مختصر تصنیف کر کے اپنے تمام معاصرین پر گوئے سبقت لے گئے، ایک روز وہ امام مزنی کی قبر سے گذرے تو فرمایا کہ خدا تعالیٰ ان پر رحم کرے اگر یہ زندہ ہوتے تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کرتے۔'' (۱) علامہ ابن خلکان نے ایک دوسری وجہ یہ بھی تحریر کی ہے کہ محمد بن احمد شروطی نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اپنے ماموں کا مسلک کیوں ترک کیا تو فرمایا کہ میں نے خود ان کو دیکھا کہ وہ اکثر امام ابوحنیفہ کے مسلک کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی جانب مراجعت کرتے ہیں، اس لیے میں نے حنفیہ کا مذہب اختیار کر لیا اور اپنے ماموں اور استاذ کا مسلک ترک کر دیا۔ (۲)

وفات: پنجشنبہ کے دن غرۂ ذوقعدہ ۳۲۱ھ کو مصر میں انتقال کیا اور قرافہ میں امام شافعیؒ کے مزار کے متصل ہی دفن کیے گئے۔ (۳)

اولاد: ایک صاحبزادہ ابوالحسن علی اور پوتے ابوعلی حسن بن علی کا نام ضمناً ملتا ہے۔

تصنیفات: امام طحاوی جلیل القدر عالم اور بلند پایہ مصنف تھے، ان کو ان کی تصنیفات اور اہم علمی خدمات کی بنا پر بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۵۵ وتاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۱ ولسان المیزان ج ۱ ص ۲۷۵ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲ (۳) ایضاً ص ۳۳۔

"وہ نہایت مفید اور بیش بہا تصنیفات کے مالک تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ "ان کی تصنیفات بڑی انوکھی ہیں" علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں "انھوں نے متعدد مفید کتابیں لکھیں"(۱) جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ حسب ذیل ہیں:

۱-کتاب الاشربہ، ۲-کتاب التاریخ الکبیر، ۳-کتاب التسویہ بین حدثنا واخبرنا، ۴-رسالۃ حکم اراضی مکہ، ۵-رسالہ فی الرزیہ، ۶-کتاب الشروط الاوسط، ۷-کتاب العزل، ۸-کتاب الفرائض، ۹-قسم الفئ والغنائم، ۱۰-کتاب المحاضرہ والسجلات، ۱۱-کتاب الوصایا، ۱۲-مناقب ابی حنیفہ یا اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ، ۱۳-اختلاف الروایات علی مذہب الکوفیین (دو جزوں میں) ۱۴-الرد علی عیسیٰ بن ابان (دو جزوں میں)، ۱۵- النوادر الفقہیہ (دس جزوں میں)، ۱۶- النوادر و الحکایات (بیس جزوں میں)، ۱۷-کتاب فی النحل واحکامہا (چالیس جزوں میں)

۱۸-کتاب نقض کتاب المدلسین: ابوعلی حسین بن علی کرابیسی کی کتاب المدلسین کے رد وجواب میں ہے۔

۱۹-کتاب الرد علی ابی عبید: ایک جز پر مشتمل ہے، اس میں ابوعبید کی ان غلطیوں کی تردید کی گئی ہے جو انساب کے متعلق انھوں نے کی ہیں۔

۲۰-سنن شافعی: یہ ان حدیثوں پر مشتمل ہے جو امام مزنی کے واسطہ سے امام شافعیؒ سے مروی ہیں۔

۲۱-شرح الجامع الصغیر: امام محمد بن حسنؒ کی مشہور و معرکۃ الآراء کتاب الجامع الصغیر فی الفروع کی جو ۱۵۲۲ مسائل پر مشتمل ہے، شرح ہے۔

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۷۴ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲۔

۲۲-شرح الجامع الکبیر: یہ بھی امام محمدؒ صاحب کی مشہور کتاب الجامع الکبیر فی الفروع کی شرح ہے۔

۲۳-کتاب الشروط الصغیر: اس کا نام مختصر الشروط بھی ہے، یہ پانچ جزوں میں ہے اور مکتبہ شیخ الاسلام فیض اللہ میں موجود ہے۔

۲۴-کتاب الشروط الکبیر: چالیس اجزا پر مشتمل ہے، یورپ سے اس کا ایک جز چھپ چکا ہے اور بعض اجزا مکتبہ علی پاشا شہید اور استنبول کے مکتبہ ملا مراد میں ہیں۔(۱)

۲۵-احکام القرآن: ۲۰ جزوں پر مشتمل ہے، قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ تفسیر قرآن کے موضوع پر امام طحاویؒ نے ایک ہزار اوراق لکھے تھے، علامہ زاہد الکوثری کے خیال میں احکام القرآن ان ہی اوراق کا مجموعہ ہے لیکن بعض لوگوں کے نزدیک یہ دوسری اور مستقل کتاب ہے۔(۱)

۲۶-بیان السنۃ والجماعۃ: اس کے مختلف نام ہیں اور اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، یہ رسالہ کئی بار چھپ چکا ہے، ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء میں قازان سے عمر بن اسحاق ہندی کی شرح کے ساتھ ۷۴ صفحات میں شائع ہوا تھا، (۲) مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اسی نسخہ کی مدد سے اس کا ایک ایڈیشن دیوبند سے عقیدۃ الطحاوی کے نام سے شائع کیا ہے، اس میں اہل سنت والجماعت کے عقائد، امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے مذاہب، اصول اور معتقدات کی روشنی میں تحریر کیے گئے ہیں۔

۲۷-اختلاف العلماء: ۳۰ سے زیادہ اجزا پر مشتمل ہے، ابن ندیم نے اس کا نام کتاب الفقہاء لکھا ہے اور یہ تصریح کی ہے کہ یہ نہایت ضخیم کتاب ہے، امام طحاویؒ اس کو مکمل

(۱) دیکھئے الفہرست ابن ندیم ص ۲۹۲ و الجواہر المضیئہ ج ۱ ص ۱۰۴ و کشف الظنون باختلاف صفحات و فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۷۹ والحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۳۵ تا ۳۷ (۲) الجواہر المضیئہ ج ۱ ص ۱۰۴ والحاوی ص ۳۵ (۳) اکتفاء القنوع ص ۱۲۵ و معجم المطبوعات کالم ۱۲۳۳۔

نہیں کر سکے تھے، ابوبکر جصاص رازی متوفی ۳۷۰ھ نے اس کا مختصر لکھا تھا جو استنبول کے مکتبہ جار اللہ ولی الدین میں موجود ہے، علامہ کوثری کی نظر سے یہ مختصر گذرا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''اس میں ائمہ اربعہ کی طرح دوسرے قدیم مجتہدین اور فقہاء امصار مثلاً ابراہیم نخعی، عثمان بتی، امام اوزاعی، سفیان ثوری، لیث بن سعد، ابن شبرمہ، ابن ابی لیلیٰ اور حسن بن حیی وغیرہ کے اقوال و مذاہب بھی نقل کئے گئے ہیں، (۱) اگر آج امام طحاوی کی اصل کتاب موجود ہوتی تو اکابر علمائے متقدمین اور فقہائے امصار کے مسالک معلوم کرنے میں بڑی آسانی بھی ہوتی اور یہ کتاب ان کے اقوال کا اچھا اور عمدہ ماخذ بھی ہوتی۔

۲۸- کتاب المختصر فی الفقہ یا مختصر الطحاوی: اس کو امام مزنی کی مختصر کے انداز پر مرتب کیا گیا ہے، یہ حنفی فقہ کے فروع و جزئیات پر ایک مختصر اور جامع متن ہے اور اس میں اس مذہب کے اکابر یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام زفرؒ اور حسنؒ بن زیاد کے اقوال و آرا نقل کئے گئے ہیں۔(۲) امام طحاوی نے اقوال مختلفہ کے درمیان ترجیح بھی دی ہے، ائمہ کے اختلاف کی صورت میں غیر جانبدارانہ طور پر کبھی امام ابوحنیفہؒ اور کبھی صاحبین اور کبھی ان دونوں میں سے کسی ایک کے مسلک کو راجح قرار دیا ہے، بعض مواقع پر ان تینوں بزرگوں کے بجائے امام زفر یا حسن بن زیاد کے قول کی تائید کی ہے، اور چند مقامات پر ان سب بزرگوں کے قول کو مرجوح سمجھ کر اپنی رائے و اجتہاد کا ذکر بھی کیا ہے، جس مسئلہ میں ائمہ کے اقوال معلوم و منقول نہیں ہوتے تو اشارات نصوص اور دوسری دلالتوں سے ان کے اقوال مستنبط کرتے ہیں، اسی خصوصیت کی وجہ سے ان کو علمائے مجتہدین میں شمار کیا جاتا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حنفی مذہب کے مقلد ہی نہ تھے بلکہ مجتہد منتسب بھی تھے، چنانچہ انھوں نے حنفی مذہب کے خلاف بھی کچھ باتیں لکھی ہیں'' صاحب

۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۶۴ و الفہرست ص ۲۹۲، والطحاوی ص ۳۰۵ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰۰۔

دراسات اللبیب کا بیان ہے ''امام طحاوی حنفی مذہب سے شغف رکھنے اوراس کے ماخذ مرفوع وموقوف کی تخریج کر سکنے باوجود جب اس کو حدیث کے خلاف پاتے تو رد کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے تھے۔(۱)

یہ مختصر متن حنفیہ کی صحیح وقوی روایات اور مفتی بہ ومرجح اقوال کا بڑا مستند ماخذ اور اتنے گونا گوں مسائل کا مجموعہ ہے جو دوسرے متون اور مطول کتابوں میں نہیں ملتے، علاوہ ازیں اس میں ترجیح کے وجوہ اور کتاب وسنت اور قیاس وغیرہ سے دلائل بھی فراہم کئے گئے ہیں، اس لیے اس کو ہمیشہ مقبول اور معتبر سمجھا گیا ہے، اس کتاب کی اہمیت اس لیے اور زیادہ ہے کہ علمائے احناف میں سب سے پہلے امام طحاوی ؒ کو مختصر لکھنے کا شرف حاصل ہوا، اس کی اہمیت کی وجہ سے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، جن کی تعداد گیارہ سے متجاوز ہے، یہ کتاب دائرۃ المعارف حیدر آباد سے چھپ چکی ہے۔

مشکل الآثار: یہ امام طحاوی کی بڑی مشہور اور اہم کتاب ہے، اس کا مقصدِ تصنیف بیان کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں:

''ثقہ وثابت رواۃ سے مروی مسند ومقبول حدیثوں کی معرفت وغیرہ کے متعلق لوگوں کی ناواقفیت دیکھ کر میں نے ان پر غور کیا، اس کے نتیجہ میں جو مشکلات اور حدیثوں سے جو مسائل واحکام اور اہم نکات وحقائق مستنبط ہوئے، ان کو بیان کرکے ان پر عائد ہونے والے اعتراضات واشکالات کو اس میں دفع کرنے کی کوشش کی ہے''(۲) اس کی ترتیب وتصنیف میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے ایک حدیث ذکر کرکے اس کے متابعات اور مؤید روایتیں نقل کی گئی ہیں، پھر اس کا صحیح مدلول ومنشاء متعین کرکے اس پر عائد ہونے والے شکوک کا جواب یا دوسری حدیثوں سے اس کے اختلاف کی نوعیت وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، ثبوت واستدلال اور بحث وتحقیق میں قرآنی آیات، احادیث نبوی، آثار

(۱) بستان المحدثین ص ۸۸ واتحاف النبلاء المتقین ص ۱۹۲ (۲) مشکل الآثار ج ۱ ص ۳۔

صحابہ وتابعین، ائمہ مجتہدین کے اقوال وآرا بیان کیے گئے ہیں اور نحوی ولغوی مسائل کی تحقیق بھی کی گئی ہے، اور کلام عرب سے بھی کہیں کہیں شواہد پیش کیے گئے ہیں، اسناد ومتون اور رجال وغیرہ کے متعلق بھی مفید اور ضروری معلومات نقل کیے گئے ہیں، مشکل الآثار کے بعض اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱- اس کی سب سے اہم اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اصلاً مشکلات حدیث کا تعین کر کے ان کا محققانہ جواب دیا گیا ہے، جس سے مشکلات اور دقت طلب امور بھی حل ہوگئے ہیں اور شکوک وشبہات بھی دفع ہوگئے ہیں۔

۲- اس کتاب میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ احادیث کے اندر تضاد وتناقض نہیں ہوتا۔

۳- استدلال وتحقیق کی حیثیت سے بھی اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے، امام طحاوی تحقیق وتنقیح اور بحث واستدلال کا پورا حق ادا کر دیتے ہیں، اس کتاب میں جو اہم اور گوناگوں مسائل ومباحث بیان کیے گئے ہیں ان کے متعلق ماہرین فن اور ائمہ کے خیالات اور اہم کتابوں کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔

۴- فقہی واجتہادی حیثیت سے بھی مشکل الآثار کا پایہ بہت بلند ہے، امام طحاویؒ نے فقہائے صحابہؓ وتابعینؒ، ائمہ کبار اور مجتہدین اسلام کے اختلافات بھی بیان کیے ہیں اور ان کے درمیان توجیہ وتطبیق اور ترجیح بھی دی ہے، نیز وجوہِ ترجیح بھی بیان کیے ہیں، ان کے تفقہ واجتہاد کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بعض مسائل میں ائمہ احناف کے اقوال سے اختلاف کیا ہے۔

۵- تفسیری مباحث اور قرآنی علوم مثلاً آیتوں کی تشریح، ان کے مفہوم ومنشا کی توضیح، قرآن کے مشکل الفاظ وکلمات کی تحقیق اور بعض استعمالات کی توضیح، سبب نزول وشان نزول کی وضاحت اور تجوید وقرأت کے مسائل پر اس میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

۶- حدیث کی فنی بحثوں، اصول حدیث کے مباحث اور رجال واسناد وغیرہ پر

بھی عالمانہ گفتگو کی گئی ہے، امام صاحب جب کوئی حدیث نقل کرتے ہیں تو پہلے یہ واضح کرتے ہیں کہ حدیث صحیح ہے یا غلط، اگر صحیح ہے تو اس کے اسباب اور غلط ہے تو اس کے وجوہ وعلل بیان کرتے ہیں، اسی طرح حدیث منقطع ہے یا متصل، موقوف ہے یا مرفوع، مرسل ہے یا مسند، غریب ومنکر ہے یا مقبول ومشہور، ضعیف اور فاسد الاسناد ہے یا قوی، حسن اور صحیح الاسناد، راوی ثقہ وضابط ہے یا غیر ثقہ اور مجہول الحال، مدلس ہے یا غیر مدلس، شذوذ وتفرد سے اس نے کام لیا ہے یا دوسرے راویوں نے اس کی متابعت وموافقت کی ہے، اس کو وہم وشک ہوا ہے یا نہیں؟ نفسِ روایت کے اندر اس سے کیا سہو وخطا ہوئی ہے، راوی نے کوئی اضافہ یا کمی کی ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے، راوی کے ابہام، دوسرے راوی سے سماع وعدم سماع اور اسماء واعلام کے متعلق وضاحتیں کرتے ہیں، ایک قسم کی متعدد حدیثیں اس لیے بیان کرتے ہیں کہ ان کا باہمی فرق واختلاف اور کمی بیشی نمایاں ہو جائے۔

۷- حدیث کے مشکل وغریب الفاظ اور بعض اصطلاحی الفاظ پر ایک ماہر فن کی حیثیت سے داد تحقیق دی گئی ہے، نحو، بلاغت، معانی اور زبان کے استعمالات واسالیب پر بھی بعض اچھی بحثیں کی گئی ہیں۔

مشکل الآثار کی سات جلدیں استنبول کے مکتبہ فیض اللہ میں موجود ہیں، دائرۃ المعارف حیدر آباد نے صرف ۴ جلدیں شائع کی ہیں جو تقریباً ۱۶۳۳ صفحات پر مشتمل ہیں، ہر جلد کے آخر میں فہرست مضامین ہے جس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۵۰ ہے، مرتبین نے مختصر حواشی بھی لکھے ہیں جو الفاظ ولغات کی تشریح اور اسماء ورواۃ کے متعلق معلومات پر مشتمل ہیں، اصل متن میں جو مختصر حدیثیں ہیں، ان کو حاشیہ میں مکمل درج کیا گیا ہے۔

محدث ابوالولید بن رشد مالکی نے اس کا مختصر تحریر کیا ہے، جو دائرۃ المعارف سے شائع ہوا ہے، اس میں امام طحاوی پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، اس کا قاضی القضاۃ جمال الدین یوسف بن موسیٰ الملطی نے المعتصر من المختصر کے نام سے مختصر کیا ہے، یہ کتاب

بھی دائرۃ المعارف سے ۱۳۱۷ھ میں لمبی تقطیع کے ۴۶۷ صفحات میں شائع ہوئی ہے، چوں کہ مشکل الآثار میں ترتیب وتبویب نہیں تھی، اس لیے ابن رشد نے اس کو ابواب پر مرتب کیا تھا، قاضی لمطی کے مختصر میں پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں اور اوصاف وخصوصیات کی حدیثیں ہیں، پھر معجزات اور سنہ وفات کی روایتیں ہیں، اس کے بعد احکام وشرائع کے ابواب جدا جدا عنوانات کے تحت ہیں، پھر تفسیر قرآن اور اسباب نزول کے ابواب ہیں، باجی کے اعتراضات کا اس میں جواب بھی دیا گیا ہے، پورے مجموعہ میں ۹۳۴ حدیثیں ہیں، صاحب معتصر نے طویل سندیں حذف کر دی ہیں، متعدد طرق واسناد کی وہی حدیثیں نقل کی ہیں، جن میں نمایاں فرق واختلاف تھا، دو مختلف روایتوں کے صرف اسی حصہ کو نقل کیا ہے، جس سے ان کے اصل مدلول اور روایت کا خاص فرق وتضاد ظاہر ہوتا ہے۔

معانی الآثار: اس کا نام شرح معانی الآثار بھی ہے، یہ امام صاحب کی سب سے اہم اور بلند پایہ کتاب سمجھی جاتی ہے، اس میں فقہ وحدیث دونوں قسم کے مباحث ہیں، اس کی اہمیت کا اندازہ علمائے فن کے ان اقوال سے ہوتا ہے۔

علامہ ابن حزم ظاہری نے اس کو سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کے ہم پایہ قرار دیا ہے،(۱) شارح ہدایہ امیر اتقانی کا بیان ہے کہ اگر کسی شخص کو طحاوی کی عظمت وشان اور بلند پائیگی میں کلام ہو تو اسے معانی الآثار کا مطالعہ کرنا چاہیے، حنفی مذہب کا کیا ذکر جملہ مذاہب میں بھی ایسی بے مثال اور بے نظیر کتاب نہیں مل سکتی،(۲) علامہ عینی فرماتے ہیں "امام طحاوی کی جملہ تصنیفات نہایت عمدہ اور پر از منفعت ہیں، خصوصاً معانی الآثار کو اگر کوئی منصف مزاج شخص بغور دیکھے تو وہ اس کو حدیث کی اکثر مشہور ومقبول کتابوں سے برتر وراجح پائے گا، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ اور اس قسم کی دوسری کتابوں پر اس کی

(۱) ماتمس الیہ الحاجہ ص ۲۹ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۵۹، ۴۶۰۔

فوقیت اور برتری بالکل عیاں ہے، کیوں کہ اس کے اندر وجوہِ استنباط اور معارضات کی شکلیں بیان کی گئی ہیں اور ناسخ ومنسوخ میں امتیاز کیا گیا ہے اور اس قسم کے بہت سے مباحث ہیں اور یہی چیزیں معرفت حدیث کی اصل بنیاد ہیں، بعض لوگ طحاوی کی مرجوحیت کا یہ سبب بتاتے ہیں کہ اس کے کچھ رجال ضعیف اور مرتبۂ ثقاہت سے فروتر ہیں، حالانکہ سنن مذکورہ کا بھی یہی حال ہے بلکہ ان کی بعض روایات کو باطل اور موضوع بھی کہا جاتا ہے اور ضعیف حدیثوں کی تو کثرت ہے، سنن دارقطنی، بیہقی اور دارمی وغیرہ کا اس سے کوئی مقابلہ ہی نہیں، اس کتاب کی اہمیت وعظمت کے مخفی رہ جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ عام لوگوں میں مروج نہ تھی، اس لیے اس کے عجائب کا نہ تو استخراج کیا جا سکا اور نہ غرائب سے واقفیت حاصل کی گئی، یہ کتاب ایک طویل عرصہ تک گوشۂ گمنامی میں پڑی رہی اور عام لوگ اس سے بے خبر تھے۔''(۱) مولانا انور شاہ کشمیری کا بیان ہے کہ ''ہمارے نزدیک طحاوی کی مشہور کتاب معانی الآثار کا پایہ ابوداؤد کے قریب قریب ہے، کیوں کہ اس کے تمام رواۃ معروف ومشہور ہیں، گو بعض کے متعلق کلام بھی کیا گیا ہے، اس کے بعد ترمذی اور ابن ماجہ کا درجہ ہے۔''(۲)

اس کا مقصد تالیف خود امام طحاویؒ نے یہ بیان کیا ہے:

''مجھ سے میرے بعض احباب نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احکامی روایات وآثار کا ایک مجموعہ مرتب کرنے کی فرمائش کی تاکہ ناسخ ومنسوخ اور واجب العمل روایات سے قلت واقفیت کی بنا پر ملحدین اور ضعیف الاسلام لوگوں کا یہ وہم دور ہو جائے کہ ان میں تضاد واختلاف ہے، اس لیے اس کتاب میں ناسخ ومنسوخ، مطلق ومقید اور واجب العمل روایات نیز علما کی تاویل وتوجیہ اُن کے دلائل وشواہد اور مرجح ومختار مسلک کی تفصیل بیان کی گئی ہے، ترجیح کے دلائل و وجوہ بھی نقل کیے گئے ہیں اور ثبوت وتائید میں کتاب

(۱) ماتمس الیہ الحاجہ ص۳۰ (۲) فیض الباری ج۱ ص۵۷، ۵۸۔

وسنت، صحابہؓ وتابعین کے آثار اور اجماع وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے۔ (۱)

امام طحاوی نے اس کتاب میں مختلف حیثیتوں سے احادیث کا تضاد واختلاف دور کیا ہے اور ان کے محمل کی ایسی تعیین کی ہے، جو روایات وقیاس کے عین مطابق معلوم ہوتی ہے، طریقۂ تصنیف یہ ہے کہ پہلے اختلافی امور ومسائل میں مرجوح مسلک کی موید روایات نقل کی ہیں، اس کے بعد اس سے مختلف اور راجح مسلک کی حدیثیں اور ان کے مویدات ذکر کر کے دونوں میں محاکمہ اور ہر مذہب کے دلائل وشواہد اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ روایات کا ظاہری اختلاف بھی رفع ہو گیا ہے اور ان میں مکمل تطبیق بھی ہو گئی ہے، انھوں نے توجیہ وتوفیق کے مندرجہ ذیل اصول اختیار کیے ہیں۔

۱- دو قسم کی متضاد سمجھی جانے والی حدیثوں میں ایک قسم کو اولویت پر اور دوسری قسم کو غیر اولویت پر محمول کر کے فرق وتضاد کی نفی کی گئی ہے۔

۲- احادیث مختلفہ کو مطلق ومقید، مجمل ومفصل اور خاص وعام وغیرہ پر محمول کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں۔

۳- ناسخ ومنسوخ روایات کی تعیین اور ان میں امتیاز کر کے تعارض کو دفع کیا گیا ہے۔

۴- اگر صحیح الاسناد اور قوی روایات ضعیف اور کمزور حدیثوں کے معارض ہوں تو پہلی قسم کی حدیثوں کو قابل اختیار سمجھا جائے گا اور دوسری قسم کی حدیثوں کی یا تو توجیہ کی جائے گی یا مناسب توجیہ نہ ہونے کے وقت ان کو رد کر دیا جائے گا۔

۵- اگر کوئی روایت کسی متواتر حدیث کے خلاف ہو تو متواتر کے مقابلہ میں غیر متواتر روایت کو ساقط قرار دیا جائے گا۔

۶- اصول وکلیات شرع کے معیار پر حدیثوں کا جائزہ لے کر ان کی ایسی توجیہ کی

(۱) معانی الآثار ج ۱ ص ۶۔

گئی ہے کہ ظاہری اختلاف ختم ہو گیا ہے۔

معانی الآثار میں اکابر ائمہ احناف یعنی امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے آرا و مسالک کو نقل کرنے کا زیادہ التزام کیا گیا ہے اور ان بزرگوں کے اقوال کی حدیثوں سے مطابقت بھی دکھائی گئی ہے، تاہم دوسرے اکابر فقہا امام مالک، امام اوزاعی، سفیان ثوری، ابن ابی لیلیٰ اور فقہائے احناف میں امام زفر کے مذاہب کی بھی کہیں کہیں تصریح کی گئی ہے' اور فقہائے صحابہ و تابعین کے مذاہب بھی نقل کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کی اہمیت کا سب سے اہم اور نمایاں پہلو اس کی تحقیقی و استدلالی شان اور فقیہانہ و مجتہدانہ رنگ ہے، امام صاحب حنفی ہونے کے باوجود خود بھی مجتہد اور صاحبِ فقہ تھے، اس لیے انھوں نے مختلف فیہ امور و مسائل میں محاکمہ کر کے مرجح و مختار مسلک کی نشاندہی کی ہے اور عموماً نہایت تنقیح اور پوری تحقیق کے بعد ہی کسی مسلک کو مرجح قرار دیا ہے، یہاں تک کہ اپنے ائمہ سے بھی بعض مواقع پر اختلاف کیا ہے۔

روایات کی چھان بین اور تحقیق و تفتیش میں بھی بڑی دیدہ ریزی اور دقتِ نظر سے کام لیا گیا ہے، ان کے متون و طرق کی معرفت، اسناد کا جائزہ، رجال اور رواۃ کی تحقیق، رطب و یابس حدیثوں میں امتیاز، ارسال، انقطاع وقف اور رفع و اتصال کی نشاندہی اور روایت کے علاوہ درایت کے لحاظ سے بھی حدیثوں کو پرکھا گیا ہے۔

معانی الآثار میں حدیث و فقہ کے علاوہ تفسیر و قرأت کی بعض لطیف بحثیں بھی ہیں، مشہور مفسرین صحابہ و تابعین اور ائمہ تفسیر و قرأت کے اقوال، مختار و مرجح قرأت و تفسیر کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور سنت و حدیث کی طرح قرآنی آیات سے استنباط مسائل کیا گیا ہے، سیر، انساب اور ایام و مشاہد کا بھی ایک حد تک حسب موقع ذکر ملتا ہے، ابواب کی ترتیب و مطالب کی افادیت اور انداز بیان کے لحاظ سے بھی یہ ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

خصوصیات: ۱- اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں احادیث و آثار کا تضاد

ثابت کیا گیا ہے اور جو حدیثیں بظاہر باہم مختلف و متناقض معلوم ہوتی ہیں، ان کی نہایت مناسب اور دلنشیں توجیہ و تطبیق بیان کی گئی ہے۔

۲- گو اساطین احناف کے مسالک کے نقل کا زیادہ التزام کیا گیا ہے لیکن دوسرے فقہا و مجتہدین کے اقوال اور خصوصاً صحابہ و تابعین کے آثار و فتاوے کی بھی صراحۃً نشاندہی کی گئی ہے۔

۳- اقوال مختلفہ میں تطبیق اور ان کے دلائل کی تشریح کر کے مرجح مسلک کی تعیین کی گئی ہے۔

۴- مختلف طرق، تعدد اسناد، روایت اور راوی کی قوت وضعف کے اسباب، ناسخ و منسوخ، مطلق و مقید اور خاص و عام کی وضاحت نیز علمائے جرح و تعدیل کے اقوال کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

۵- معانی الآثار کی بعض حدیثوں سے دوسری کتب احادیث خالی ہیں۔

۶- وضع و ترتیب کی خوبی، انداز بیان اور طرز ادا کا حسن و دلآویزی۔

معانی الآثار پر اعتراض اور اس کا جواب: معانی الآثار کی ان خصوصیات اور اہمیتوں کے باوجود اس پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور اعتراض امام بیہقیؒ کا ہے کہ امام طحاوی نے ان حدیثوں کی جو عام محدثین کے نزدیک صحیح ہیں مگر احناف کے مسلک کے خلاف ہیں تضعیف اور ان روایتوں کی جو محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں مگر احناف کے مسلک کی موید ہیں، تصویب کی ہے لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس کا جواب پہلے گذر چکا ہے کہ امام طحاویؒ حنفی ہونے کے باوجود مجتہد بھی تھے اور اپنی انصاف پسندی کی وجہ سے بعض مسائل میں احناف کے مسلک کو مخالفِ حدیث ہونے کی وجہ سے مرجوح سمجھتے ہیں اور اگر کہیں ایسا واقع ہوا ہے تو اس کی مثالیں دوسرے مذاہب کے ائمہ کے یہاں بھی ملتی ہیں، اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے "امام بیہقی کی

اس امام عظیم کی شان میں جس پر اکابر علما و مشائخ نے اعتماد کیا ہے، یہ کھلی ہوئی زیادتی ہے'' حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں ''امام طحاوی کی شان سے یہ بعید اور ان کی عظمت کے منافی ہے، بخدا مجھ کو اس کتاب میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جو امام بیہقی نے اس کے بارے میں کہی ہے'' علامہ عینی فرماتے ہیں کہ ''کسی عاقل و منصف مزاج شخص کو اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امام طحاوی نے قرآن و احادیث نبویہ سے استنباط احکام کیا ہے۔''(۱)

امام بیہقی کی تردید میں علاؤالدین ترکمانی نے الجواہر النقی والرد علی البیہقی کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ (۲)

معانی الآثار پر اعتراض کرنے والوں میں ایک ممتاز نام شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کا بھی ہے، ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ صحاح کے مقابلہ میں اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، اس سلسلہ میں مولانا عبدالحیؒ لکھنوی کی یہ رائے نقل کردینا کافی ہے کہ ''میں ابن تیمیہ کے متعلق وہی بات عرض کروں گا جو شیخ صالح نے حافظ ابن حجرؒ کے بارے میں کہی ہے کہ ''ان کا موطا اور صحیح بخاری میں تفریق اور موطا کی صحت سے انکار صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے موطا میں اُس امعان نظر سے کام نہیں لیا ہے، جس امعان نظر سے بخاری میں کام لیا ہے، ورنہ ان کو موطا کی اہمیت سے انکار نہ ہوتا، اسی طرح اگر امام ابن تیمیہؒ نے بھی صحاح ستہ کی طرح معانی الآثار پر گہری نظر ڈالی ہوتی تو وہ طحاوی اور ائمہ صحاح کے درمیان اس طرح تفریق روا نہ رکھتے، بلکہ ابن حزم کی طرح جو اگرچہ اپنے تفت کے لیے مشہور ہیں اس کی عظمت کا اعتراف کرتے۔ (۳)

معانی الآثار کی صحت اور اس کے رجال وغیرہ کے بارے میں بعض لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے شارح ہدایہ امیر اتقانی لکھتے ہیں:

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۶۰۴ و ماتمس الیہ الحاجہ ص ۳۰ و ۳۱ (۲) تقریظ معانی الآثار ج ۲ ص ۵۔

(۳) ماتمس الیہ الحاجہ ص ۳۱۔

''میرے نزدیک امام طحاوی پر ان لوگوں کے اعتراض وانکار کے کوئی معنی نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ معتمد وثقہ ہیں اور متہم نہیں ہیں، اس کے علاوہ ان کا علمی پایہ بلند اور مرتبۂ اجتہاد مسلم ہے، ورع وتقویٰ کے لحاظ سے بھی وہ فائق تھے اور مذاہب فقہ سے واقفیت میں بھی شرف وتقدم رکھتے تھے..... اگر تم کو ابوجعفر کے فضل وکمال میں شک ہو تو ان کی کتاب شرح معانی الآثار کا مطالعہ کرو، اس کی حنفی مذہب تو کجا کسی مذہب میں بھی کوئی نظیر اور مثال تم کو نظر نہ آئے گی۔''(۱)

شروح وتلخیصات: معانی الآثار کی اہمیت کی بنا پر ہر زمانہ کے علما نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، وہ نصاب درس میں شامل کی گئی، اس کے شروح وحواشی لکھے گئے اور تلخیص بھی کی گئی، ذیل میں اس کی شرحوں اور تلخیصات کی فہرست درج کی جاتی ہے۔

۱- علامہ بدرالدین عینی (۸۵۵ھ) کو اس کتاب سے بڑا شغف تھا، انھوں نے ایک عرصہ تک اس کا درس بھی دیا اور اس کی دو شرحیں مبانی الاخبار اور نخب الافکار کے نام سے لکھیں، دونوں کے نسخے دارالکتب المصریہ میں موجود ہیں، پہلی کتاب آٹھ جلدوں میں اور دوسری چھ جلدوں میں ہے، ان کے علاوہ انھوں نے طحاوی کے رجال پر بھی ایک مستقل کتاب معانی الاخبار فی رجال معانی الآثار دو جلدوں میں لکھی، اس کا ناقص نسخہ بھی دارالکتب المصریہ میں پایا جاتا ہے،(۲) زاہدی کا بیان ہے کہ عینی نے طحاوی پر بخاری سے کم کام نہیں کیا ہے۔(۳)

۲- شیخ قاسم بن قطلو بغا حنفی (م ۸۷۹ھ) نے الایثار برجال معانی الآثار لکھی جو طحاوی کے رجال پر نہایت مفید کتاب ہے۔(۴)

۳- ابوالحسین محمد بن محمد باہلی مالکی (م ۳۲۱ھ) کی شرح تصحیح معانی الاثار جس

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۹۲ (۲) الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۳۲ و ۳۳ وفہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۴۴۳ (۳) الحاوی ص ۳۳، ۳۴ (۴) کشف الظنون ج ۲ ص ۶۰ ۴ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۹۲۔

کے متعلق بروکلمان نے لکھا ہے کہ بنکاک میں محفوظ ہے۔(۱)

۴- حافظ ابومحمد علی بن زکریا بنجی مولف لباب (م ۶۹۸ھ) بھی اس کے مشہور شارحین میں ہیں، ان کی شرح کا ایک جز آستانہ کے مکتبہ ایا صوفیا میں موجود ہے۔(۲)

۵- حافظ عبدالقادر قرشی (م ۷۷۵ھ) نے الحاوی فی تخریج الاحادیث معانی الآثار لکھی جو بڑی عمدہ اور مفید شرح ہے، اس میں مصنف نے طحاوی کی حدیثوں اور سندوں کا صحاح، مشہور مسانید اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ سے تعلق اور نسبت ظاہر کی ہے، اس کا ایک جز دارالکتب المصریہ میں موجود ہے۔(۳)

۶- حافظ ابوعمر بن عبدالبر (م ۴۶۳ھ) نے جو طحاوی کے بڑے عظمت شناس اور اکثر اپنی کتابوں میں ان کا حوالہ دیتے ہیں تلخیص کی ہے۔(۴)

۷- حافظ ابومحمد عبداللہ بن یوسف زیلعی صاحب نصب الرایہ (م ۷۶۲ھ) کی تلخیص مکتبہ رواق اتراک اور مکتبہ کوبریلی میں محفوظ ہے۔(۵)

۸- شیخ الاسلام حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) نے اتحاف المہرہ میں اس کے اطراف کو جمع کیا ہے۔(۶)

۹- شیخ التبلیغ مولانا محمد یوسفؒ صاحب دہلوی نے عربی میں شرح امانی الاخبار فی شرح معانی الآثار لکھی ہے، اس کی دو جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں۔

معانی الآثار کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے، ۱۳۰۲ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ نے اس کو لمبی تقطیع کی دو جلدوں میں شائع کیا ہے، دونوں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۹۰۰ ہے، مولانا وصی احمد دہلوی نے اس پر مختصر حواشی تحریر کیے ہیں، ان میں الفاظ ولغات کی تحقیق، اسماء واعلام کی مختصر تشریح اور دوسرے نسخوں کے اختلاف کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۶۰-۴ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۹۲ (۲) الحاوی ص ۳۳ (۳) الحاوی ص ۳۱، ۳۲ وفہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۴۴ (۴) الحاوی ص ۳۳ (۵) ایضاً (۶) ماتمس الیہ الحاجہ ص ۳۰۔ ☆

نَضَّرَ اللّٰہُ اَمْرًا سَمِعَ مِنَّا حَدِيْثًا فَبَلَّغَهُ (حدیث)

تذکرۃ المحدثین

حصہ دوم

اس میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات زندگی وسوانح اور ان کی علمی وحدیثی خدمات کی روح پرور ودلآویز تفصیل بیان کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْم
محمدن الامين وعلىٰ آلهٖ واصحابهٖ اجمعين

صاحبِ تصانیف محدثین کرام کے حالات میں ایک کتاب کی تالیف عرصہ سے دارالمصنفین کے پیش نظر تھی، حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں دوسرے ضروری کاموں کی وجہ سے اس کا موقع نہ ملا، ان کے لائق جانشین مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے یہ خدمت مولوی ضیاء الدین اصلاحی کے ذمہ کی، اس کی پہلی جلد ان کی رہنمائی میں شائع ہوئی، اس میں ان کا فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہے، دوسری جلد کا بھی زیادہ حصہ ان کی زندگی میں مرتب کیا جا چکا تھا اور انھوں نے اس کے بعض حصے معارف میں شائع بھی کیے تھے، اب جب کہ یہ جلد چھپ رہی ہے تو ان کی یاد برابر آ رہی ہے، یقیناً اس کی اشاعت سے وہ بہت خوش ہوتے۔

پہلے خیال تھا کہ دو جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل ہو جائے گا لیکن دوسری جلد کے بعد بھی کئی ممتاز محدثین کے تذکرے رہ گئے اور اب اندازہ ہے کہ تین جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل ہوگا اور مزید ایک اور جلد ہندوستان کے محدثین کے لئے مخصوص کرنی ہوگی، قدردانوں کا اصرار ہے کہ پہلے یہی جلد مرتب کی جائے، ان کی خواہش کے مطابق آئندہ پہلے ہندوستانی

محدثین سے متعلق جلد کی تالیف عمل میں آئے گی، اس کے بعد انشاء اللہ بیرونی ممالک کے محدثین کے متعلق تیسری جلد شائع ہوگی۔

اس جلد میں چوتھی صدی سے آٹھویں صدی کی ابتدا تک کے صاحبِ تصانیف محدثین کے حالات تحریر کیے گئے ہیں، حدیث کی جمع وتدوین کی تاریخ میں تیسری صدی ہجری کو زریں عہد سمجھا جاتا ہے، صحاحِ ستہ کے مصنفین اسی دور میں گذرے ہیں لیکن اس کے بعد کی صدیاں بھی صاحبِ کمال محدثین سے خالی نہیں ہیں، حدیث کے بڑے بڑے شارحین ان ہی صدیوں میں پیدا ہوئے، ان کے اہم کارنامے فنِ حدیث کی تاریخ میں ہمیشہ یادرکھے جائیں گے، اس جلد میں ان میں سے اکثر کے تذکرے اوران کی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اس میں جن محدثین کا ذکر ہے ان کے زمانے میں عقائد واحکام کی بنیاد پر مسلمانوں میں متعدد فرقے پیدا ہوگئے تھے، محدثین عموماً اہلسنت والجماعت کے ہمنوا تھے، وہ کوئی ایسی بات انگیز کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے جو بظاہر کتاب وسنت کے خلاف ہوتی، اس سلسلہ میں بعض کے یہاں شدت پسندی بھی آگئی تھی، جو نیک نیتی اورحق پسندی ہی کا نتیجہ تھی لیکن اس کی وجہ سے ان کو مخالفتوں اور آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا اوراعتراضات کا نشانہ بھی بننا پڑا، ان اعتراضات سے کہیں کہیں سرسری گزرجانا ممکن نہ تھا لیکن ان کے بارہ میں جو کچھ تحقیق سے درست معلوم ہوا ہے وہی لائق مرتب نے پیش کیا ہے اور جانبداری سے پرہیز کیا ہے۔

کاپی اور پروف کی تصحیح پر پوری توجہ صرف کی گئی ہے مگر اس کے بعد بھی کہیں کہیں غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی ناظرین اپنے ذوق سے خود تصحیح کرسکتے ہیں، اس کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ ہر محدث کے حالات نئے صفحے سے شروع کیے جائیں، مگر ایک جگہ آگے کے

صفحات چھپ جانے کی وجہ سے اس کا التزام نہیں ہو سکا اور مجبوراً یہ خامی انگیز کرنی پڑی (۱) لائق مرتب نے جس محنت و کاوش اور سلیقہ سے یہ کتاب مرتب کی ہے، اسے پڑھ کر ناظرین ضرور محظوظ ہوں گے، اس کی اشاعت سے دارالمصنفین کے سلسلۂ مطبوعات میں ایک اچھی اور قابلِ قدر تصنیف کا اضافہ ہوا ہے، ناظرین دعا کریں کہ مرتب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کی بیش از بیش توفیق نصیب ہو۔ آمین

سید صباح الدین عبدالرحمٰن
دارالمصنفین، اعظم گڑھ
۷/ربیع الاول ۱۳۹۷ھ، ۲۶/فروری ۱۹۷۷ء

(۱) الحمدللہ نئے اڈیشن میں یہ خامی دور ہوگئی ہے اور کہیں کہیں جو تحقیقی فروگزاشتیں ہوگئی تھیں ان کو بھی درست کر دیا گیا ہے۔ والعصمة لله وحده. (ض)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام عبدالباقی بن قانع

متوفی ۳۵۱ھ

نام ونسب: عبدالباقی نام، ابوالحسین کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، عبدالباقی بن قانع بن مرزوق بن واثق۔(۱)

ولادت، خاندان اور وطن: خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ وہ ۲۵/ذوقعدہ ۲۶۵ھ کو پیدا ہوئے، دوسرے مورخین نے بھی یہی سنہ تحریر کیا ہے مگر ایک روایت ۲۶۶ھ کی بھی ہے۔(۲)

امام ابن قانع بنوامیہ کے موالی میں تھے اور بغداد ان کا وطن تھا، اس لیے اموی اور بغدادی کہلاتے تھے۔(۳)

اساتذہ: ان کو جن اصحاب کمال اور ائمہ حدیث سے شرف تلمذ حاصل تھا ان کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن احمد وکیعی، ابراہیم بن اسحاق حربی، ابراہیم بن ہیثم بلدی، احمد بن اسحاق وزان، احمد بن علی خراز، احمد بن یحییٰ حلوانی، اسحاق بن حسن حربی، اسماعیل بن فضل بلخی، حارث بن ابی اسامہ، حسن بن عباس رازی، محمد بن مسلم واسطی، عبید بن شریک بزار،

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۱ص ۸۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۹۹ (۲) لسان المیزان ج ۳ص ۳۸۴ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۹۹ وتاریخ بغداد ج ۱۱ص ۸۸۔

علی بن محمد بن ابی الشوارب وغیرہ۔

تلامذہ: ان کے چند ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن بن رزقویہ، ابوالحسن دارقطنی، ابوالحسین بن فضل قطان، احمد بن علی بادی، ابوعلی بن شاذان، ابوالقاسم بن بشران، عبدالعزیز بن محمد بن شبان اور مرزبانی وغیرہ۔ (۱)

رحلت وسفر: طلب علم کے لیے ان کے سفر کی تفصیلات تو معلوم نہیں ہوسکیں لیکن علامہ ذہبی لکھتے ہیں، وکان واسع الرحلة (کثیرالاسفار تھے) اور شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کا بیان ہے "ورحلت بسیار کردہ۔" (۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے متعدد مقامات کے علمی سفر کیے تھے۔

حفظ وثقاہت: امام ابن قانع بغداد کے مشہور حفاظِ حدیث میں تھے، کثیرالحفظ ہونے کی وجہ سے الحافظ ان کا لقب پڑ گیا تھا، عام علمائے فن سے ان کی توثیق بھی منقول ہے، ابن ناصرالدین فرماتے ہیں کہ علما کی ایک جماعت سے ان کی توثیق منقول ہے، **حافظ ابن کثیر** کا بیان ہے کہ وہ حافظ، ثقہ اور امین تھے، علامہ خطیب کا بیان ہے کہ ہمارے عام اساتذہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، ابن جوزی، علامہ ذہبی اور دوسرے علما نے بھی ان کی **ثقاہت** کا تذکرہ کیا ہے۔ (۳)

حدیث میں درجہ: وہ بڑے نامور علما اور مشہور حفاظِ حدیث میں شمار کیے جاتے تھے، اس فن میں ان کی عظمت اور بلند پایگی کا اندازہ علامہ ذہبی کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ ابن قانع کثیرالحدیث تھے۔

روایت کی طرح درایت میں بھی امتیاز رکھتے تھے، خطیب لکھتے ہیں کہ وہ اہل علم اور اصحابِ فہم ودرایت میں تھے۔ (۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۳ ص۹۹ وتاریخ بغداد ج۱۱ ص۸۸ (۲) تذکرۃ ج۳ ص۹۹ وبستان المحدثین ص۸۶ (۳) حوالہ مذکورہ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج۳ ص۹۹ وتاریخ بغداد ج۱۱ ص۸۸۔

رجال: حدیث کی طرح رجال پر بھی ان کی اچھی نظر تھی، اسماء الرجال کی کتابوں میں ان کے اقوال درج ہیں۔

فقہ وقضا: فقہ میں ان کا درجہ بلند تھا، اسی لیے قضا کے منصب پر فائز کیے گئے، احکام ومسائل پر ان کی وسعتِ نظر کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ابوبکر جصاص رازی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں ان سے بے شمار روایتیں نقل کی ہیں۔(۱)

مذہب ومسلک: مسلکاً حنفی تھے اور ان کا شمار فقہائے حنفیہ میں ہوتا ہے، حافظ ابن حجر نے بھی ان کے حنفی اور اصحابِ رائے میں ہونے کا ذکر کیا ہے اور عبدالقادر قرشی اور صاحب تاج التراجم نے ان کا طبقات الحنفیہ میں ذکر کیا ہے۔(۲)

وفات: ۸۶ سال کی عمر میں اپنے وطن بغداد میں ۷رشوال ۳۵۱ھ کو انتقال کیا، ابن ماکولا نے ۳۵۴ھ کی روایت کی ہے مگر حافظ ابن حجر نے اس کی تضعیف کی ہے۔(۳) ان کے ازواج واولاد اور دیگر اہل خاندان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے، عبدالقادر قرشی نے الجواہر میں ان کے ایک بھائی احمد کا ذکر کیا ہے جو نامور قاضی، ممتاز فقیہ اور علم الفرائض کے ماہر تھے۔

تصنیفات: حافظ ابن قانع بڑے صاحب علم تھے، اس کا ثبوت ان کی متعدد تصنیفات ہیں، مورخین نے ان کو کئی کتابوں کا مصنف بتایا ہے لیکن ان میں سے صرف ایک کا نام معلوم ہو سکا اور یہ **معجم الصحابہ** ہے جو حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہے، حافظ ابن حجر نے مجمع المؤسس میں(۴) اور دوسرے علمائے سیر وتراجم نے بھی اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے، حافظ ذہبی اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کی ایک روایت نقل کی ہے جو یہ ہے:

عن كعب بن عياض قال	کعب بن عیاض سے روایت ہے کہ
قال رسول الله صلى الله	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

(۱) الجواہر المضیہ ج ۱ ص ۲۹۳ (۲) ایضاً وتاج التراجم فی طبقات الحنفیہ ص ۳۴ ولسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۴ (۳) لسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۴ (۴) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۶۵۔

عليه وسلم لكل امة فتنة وفتنة امتي المال۔(۱)	ہرامت کے لیے ایک نہ ایک چیز موجب فتنہ ہوتی ہے اور میری امت کے لیے مال باعثِ فتنہ ہے۔

مشہور فقیہ ابویعلیٰ صدفی نے اس معجم کی ان حدیثوں کی جو وہم وتصحیف پر مشتمل ہیں وضاحت کے لیے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام الاعلام والتعريف مما لا بن قانع في معجمه من الاوهام والتصحيف تھا۔(۲)

غالبًا انھوں نے رجال پر بھی کوئی کتاب لکھی تھی کیوں کہ رجال کی تمام معتبر کتابوں میں ان کے اقوال ملتے ہیں۔

ابن قانع پر بعض اعتراضات: عام علمائے فن نے ان کی توثیق کی ہے لیکن بعض علما نے ان پر اعتراضات بھی کیے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱- ان کے مشہور شاگرد امام دار قطنی کا بیان ہے کہ ان کا حافظہ اگر چہ نہایت عمدہ تھا لیکن وہ خطا بھی کرتے تھے اور بعض روایتوں میں ان سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ خطا پر اصرار کرتے تھے، مشہور محدث برقانی کا بیان ہے کہ اہل بغداد ان کو ثقہ بتاتے ہیں لیکن میرے نزدیک وہ ضعیف ہیں۔

۲- علامہ ابن حزم نے ان کو منکر الحدیث کہا ہے اور لکھا ہے کہ عام محدثین نے ان سے روایت کرنے میں بالکل احتراز کیا ہے اور ابن فتحون سے منقول ہے کہ حفاظ حدیث میں ان سے زیادہ کثیر الاوہام اور منکر المتون شخص میں نے نہیں دیکھا، مگر اس کے باوجود جلیل القدر اشخاص نے ان سے روایت کی ہے اور ان کے حافظہ کی تعریف کی ہے مثلاً امام دار قطنی وغیرہ، مگر یہ دونوں اعتراضات مطلقاً صحیح نہیں ہیں، اصل حقیقت یہ ہے جیسا کہ خطیب نے ابوالحسن بن فرات سے نقل کیا ہے کہ وفات سے دو سال پہلے وہ سوءِ حفظ اور اختلال عقل

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۹ و بستان المحدثین ص ۸۸ و ۸۹ (۲) لسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۴۔

کے عوارض میں مبتلا ہو گئے تھے، اس لیے ہم لوگوں نے ان سے سماع وروایت کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا لیکن بعض لوگوں نے اس وقت اس حالت میں بھی ان سے سماع جاری رکھا، خطیب برقانی کے اعتراض پر حیرت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ برقانی کی تضعیف کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، ابن قانع اصحاب علم وفہم ودرایت میں تھے اور ہمارے عام شیوخ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، البتہ آخر عمر میں وہ اختلال اور نسیان کے عوارض میں مبتلا ہو گئے تھے۔

علامہ ابن حزم کا اعتراض ناواقفیت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور اگر اس کو صحیح مانا جائے تو اس کا بھی وہی جواب ہے جو پہلے گذر چکا، حافظ بن حجر نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ آخر عمر میں اختلال میں مبتلا ہو گئے تھے، اس لیے لوگوں نے ان سے روایت کرنا ترک کر دیا تھا۔(۱)

ان تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ ابن قانع کی ثقاہت مسلم ہے، البتہ آخر عمر میں بعض عوارض میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے علمائے فن نے ان سے اس وقت روایت کرنے میں احتیاط برتا ہے، ابن جوزی کا بیان ہے:

وان كان من اهل العلم والفهم والثقة غيرانه تغير في آخر عمره.(۲)	وہ اگرچہ صاحب علم وفہم اور ثقہ تھے لیکن آخر عمر میں مختل ہو گئے تھے۔

☆☆☆

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۱ص ۸۹ ومیزان الاعتدال ج ۲ ص ۹۱ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۹ ولسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۳،۳۸۴ (۲) المنتظم ج ۷ ص ۱۴۔

امام سعید بن السکن

متوفی ۳۵۳ھ

نام ونسب: سعید نام، ابوعلی کنیت اور نسب نامہ حسب ذیل ہے:

سعید بن عثمان بن سعید بن السکن۔ (۱)

اپنے جداعلیٰ کی نسبت سے ابن السکن کہلاتے ہیں اور اسی نام سے مشہور ہیں۔

ولادت ووطن: ۲۹۴ھ ان کا سنہ ولادت ہے، اصلی وطن بغداد تھا لیکن مصر میں سکونت اختیار کرلی تھی، (۲) اسی لیے بغدادی اور مصری دونوں نسبتوں سے مشہور ہوئے، خاندانی حالات معلوم نہیں ہوسکے۔

اساتذہ وشیوخ: ان کے جن شیوخ کا نام معلوم ہوسکا وہ یہ ہیں:

ابن جوصا، ابوعروبہ حرانی، ابوالقاسم البغوی، سعید بن عبدالعزیز حلبی، محمد بن محمد بن بدر باہلی اور محمد یوسف فربری۔

تلامذہ: بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں:

ابوجعفر بن عون، ابوعبداللہ بن مندہ، عبداللہ بن محمد بن اسد قرطبی، عبدالغنی بن سعید، علی بن محمد دقاق، ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ بن مفرج۔ (۳)

طلب علم کے لیے سفر: علم کی تحصیل اور احادیث کی طلب کے لیے اس زمانہ کے مشہور مراکز حدیث کا سفر کیا علامہ ذہبی نے العبر میں عراق، شام، جزیرہ، خراسان اور ماوراء النہر

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۹ (۲) ایضاً و حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴۷ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۹۔

کے علما سے اور تذکرہ میں جیحون سے فرات تک کے اربابِ کمال سے استفادہ کا ذکر کیا ہے۔(۱)

حفظ وثقاہت: امام ابن السکن کا مشہور حفاظ اور معتبر محدثین میں شمار ہوتا ہے، مورخین نے ان کو الحافظ اور الحافظ الکبیر لکھا ہے اور ان کی عدالت وثقاہت پر بھی اتفاق ہے، ابن عماد نے ثقہ و حجت اور سیوطی نے الحافظ الحجہ لکھا ہے۔(۲)

حدیث میں درجہ: علامہ سیوطی نے مصر کے اعلیٰ طبقہ کے محدثین اور نقادان فن میں ان کا تذکرہ کیا ہے، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ابن السکن نے فن حدیث کی جانب خاص توجہ کی اس میں کتابیں لکھیں اور حدیثیں جمع کیں، ان کی حدیث میں بصیرت اور ژرف نگاہی کا یہ حال تھا کہ اکثر علما اس باب میں ان کی جانب رجوع کرتے اور ان کی رایوں پر پورا اعتماد کرتے، ایک دفعہ کچھ محدثین ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، انھوں نے کہا کہ ہمارے سامنے حدیث کی بہت سی کتابیں آ گئی ہیں، آپ ان میں سے چند ایسی کتابوں کی نشاندہی کر دیں جن پر ہم اکتفا کر سکیں، وہ یہ سن کر گھر میں داخل ہوئے اور کتابوں کے چار بستے لا کر تلے اوپر رکھ دیے پھر فرمایا:

ھذہ قواعد الاسلام کتاب مسلم وکتاب البخاری و کتاب ابی داؤد وکتاب النسائی.(۳)	یہ اسلام کی بنیادیں ہیں یعنی صحیح مسلم، صحیح بخاری، سنن ابی داؤد، اور سنن نسائی۔

امامت وشہرت: اپنے کمالات اور عظمت کی وجہ سے ان کا شمار ائمہ میں ہوتا ہے، علامہ ذہبی نے العبر میں احد الائمہ لکھا ہے اور تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں کہ ان کی شہرت کا دور دور چرچا

(۱) تذکرۃ والعبر ج۳ ص ۲۹۷۔(۲) شذرات الذہب ج۳ ص ۱۲ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴۔ (۳) شروط الائمۃ الستہ ص ۸۔

تھا، ان کی کتاب الصحیح المنتقیٰ اندلس میں پہنچ چکی تھی۔(۱)

وفات: ۵۹ سال کی عمر میں محرم ۳۵۳ھ میں انتقال کیا۔(۲)

تصنیفات: اہل سیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے متعدد کتابیں لکھی تھیں جو معدوم ہیں صرف دو کتابوں کے نام معلوم ہو سکے۔

۱- مصنف: اس کا صاحب کشف الظنون اور صاحب تحفۃ الاحوذی نے ذکر کیا ہے،(۳) مگر اور کسی قسم کے معلومات نہیں لکھے ہیں۔

۲- الصحیح المنتقیٰ: یہ احکامی احادیث وسنن کا مجموعہ ہے، گو ان کی سندیں مصنف نے حذف کردی ہیں تاہم اس میں صحت کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے، اسی لیے اس کا نام منتقی رکھا ہے، اور اپنے خیال میں انھوں نے صرف صحیح روایتیں ہی اس میں شامل کی تھیں اور ضروری مسائل واحکام کے ابواب قائم کرکے ان کے تحت حدیثیں درج کی ہیں، اس کتاب کی حدیثوں کی تین نوعیتیں ہیں، میں نے اس کتاب میں جن حدیثوں کا مجملاً بیان کیا ہے یعنی ان کے صحت وسقم کی کوئی تشریح نہیں کی ہے وہ بالاتفاق صحیح ہیں، دوسرے نمبر پر ایسی حدیثیں ہیں جو کسی نہ کسی امام کی مختار ومعمول بہا ہیں لیکن بعض ایسی حدیثیں بھی نقل کی ہیں جن کے ناقلین ان کی روایت میں منفرد ہیں مگر میں نے اس کی علت اور راوی کے انفراد کا ذکر کردیا ہے،(۴) ابن حزم کا بیان ہے کہ صحیحین کے بعد اسی کتاب کا درجہ ہے۔(تدریب ص۴۲)

---

(۱) العبر ج ۲ ص ۲۹۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۹۔ (۲) العبر ج ۲ ص ۲۹۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۹

(۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۵۱ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۶۔ (۴) الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۴ بحوالہ شفاء السقام سبکی۔

امام ابوبکر شافعیؒ

متوفی ۳۵۴ھ

نام ونسب: محمد نام، ابوبکر کنیت اور بزار لقب تھا، نسب نامہ حسب ذیل ہے،

محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ۔ (۱)

ولادت ووطن: امام ابوبکر شافعی کی ولادت ۲۶۰ھ میں واسط کے قریب ایک مقام جبل (جبل) میں ہوئی لیکن انھوں نے بغداد میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اسی لیے بغدادی کی نسبت سے مشہور ہوئے، علمائے سیر اسی بنا پر ان کو محدثینِ عراق میں لکھتے ہیں۔ (۲)

اساتذہ: ان کے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر بن ابی الدنیا، ابوقلابہ رقاشی، قاضی اسماعیل، عبداللہ بن روح مداینی، محمد بن جہم سمری، محمد بن شداد مسمعی، محمد بن فرج ازرق اور موسیٰ بن سہل وشاد۔

موسیٰ بن سہل وشاد نے اسماعیل بن علیہ جیسے عظیم محدث سے اور محمد بن شداد مسمعی نے یحییٰ بن قطان سے اکتسابِ فیض کیا تھا۔ (۳)

تلامذہ: ابوبکر کے حلقۂ فیض سے وابستہ لوگوں میں بعض کے اسماء حسب ذیل ہیں:

ابوعلی بن شاذان، احمد بن عبداللہ بن محاملی، امام دارقطنی، عبدالملک بن بشران،

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶ وبستان المحدثین ص ۵ (۲) ایضاً وکتاب الانساب ورق ۳۲۶ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶۔

عمر بن شاہین، ابوالحسن محمد بن احمد، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حافظ اور ابوطالب محمد بن محمد بن ابراہیم بن غیلان۔(۱)

حصول علم کے لیے سفر: انھوں نے ۲۱ سال کی عمر میں ۲۷۶ھ میں حدیث کی تحصیل شروع کی، اس کے بعد اس فن سے اس قدر اشتغال ہوا کہ متعدد مقامات کا سفر کیا، مصر وجزیرہ جانے کی تصریح ملتی ہے۔(۲)

ضبط وثقاہت: محدثین اور علمائے فن نے ان کی توثیق کی ہے، حافظ ذہبی نے الامام الحجہ المفید اور خطیب نے ثقہ وثبت لکھا ہے، امام دارقطنی کا بیان ہے کہ وہ ثقہ و مامون تھے، علامہ سمعانی لکھتے ہیں کہ وہ ایسے ثقہ و مامون تھے، جن کی نظر احادیث کے معاملہ میں کبھی نہیں چوکتی تھی، ان کے زمانہ میں ان سے زیادہ معتبر اور ثقہ آدمی کوئی نہیں تھا۔(۳)

حدیث میں درجہ ومرتبہ: حدیث میں ان کا درجہ ومرتبہ اتنا بلند تھا کہ امام دارقطنی نے ان کو جبلِ حدیث اور ذہبی نے امام ومحدثِ عراق کہا ہے، علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں کہ وہ حدیثوں کے عالم اور ان کی سندیں نہایت عالی ہوتی تھیں، علامہ سمعانی لکھتے ہیں۔

مـا رأيـت لـه الا اصولا صحيحة متقنة. (۴)	میں نے ان کے اصولِ حدیث نہایت صحیح اور قوی پائے۔

مذہب ومسلک: ان کے فقہی مذہب کی باقاعدہ تصریح نہیں ملتی لیکن شافعیت کی نسبت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شافعی رہے ہوں گے۔

کارنامہ: امام ابوبکر بڑے صاحب عزیمت اور نہایت راسخ العقیدہ بزرگ تھے، ان کے زمانے میں شیعیت کا بڑا غلبہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ علی الاعلان صحابہ کے فضائل کی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶ (۲) بستان المحدثین ص ۵ (۳) تذکرہ ج ۳ ص ۹۶ والعبر ج ۲ ص ۳۰۱ وکتاب الانساب ورق ۳۲۶ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۱۶ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶، ۹۷ وکامل ابن اثیر ج ۷ ص ۸۶ اور کتاب الانساب ورق ۳۲۶۔

حدیثیں بیان کرتے تھے، علامہ ابن اثیر نے ۳۵۱ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ اہل دیلم نے لوگوں کو فضائل صحابہ بیان کرنے سے روک دیا اور جامعِ اعظم اور دوسری مسجدوں کے صدر دروازوں پر تبرا لکھوایا تو یہ اس وقت بھی علی الاعلان صحابہ کے فضائل بیان کرتے تھے اور جامع اعظم اور باب الشام میں حسبۃً للہ اس قسم کی روایات کا املا کراتے تھے۔(۱)

وفات: انھوں نے ۹۵ سال کی طویل عمر میں ذی الحجہ ۳۵۴ھ میں انتقال کیا۔

پیشہ: ان کا ذریعہ معاش کپڑوں کی تجارت تھا، اسی لیے بزاز لقب پڑ گیا تھا۔(۲)

تصنیفات: مورخین نے ان کو صاحب تصانیف لکھا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ ان کی تصنیفات نہایت عمدہ تھیں لیکن ان کے ایک ہی مجموعہ حدیث کا پتہ چلتا ہے جو فوائد ابوبکر یا غیلانیات اور اجزاء الغیلانیات کے نام سے مشہور ہے، اس مجموعہ کو غیلانیات اس لیے کہا جاتا ہے کہ امام ابوبکر کے مشہور شاگرد شیخ ابوطالب محمد بن محمد بن ابراہیم بن غیلان م ۴۴۰ھ نے اس کی ان سے روایت کی ہے، ان کے نام کی نسبت کی وجہ سے اس کو غیلانیات وغیرہ کہتے ہیں، یہ گیارہ اجزا پر مشتمل ہے اس کی ترتیب ابواب وشیوخ پر ہے اور حدیث کی اعلیٰ واحسن کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، امام دارقطنی نے اس کی رباعی حدیثوں کی ایک مستقل رسالہ میں تخریج کی ہے، علامہ ذہبی اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کی ایک ایک حدیث نقل کی ہے۔(۳)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶، ۹۷ وکامل ابن اثیر ج ۷ ص ۱۸۶، المنتظم ج ۷ ص ۳۲، البدایہ ج ۱۱ ص ۲۶۰ (۲) تذکرہ ج ۳ ص ۹۷ والعبر ج ۲ ص ۳۰۱ (۳) بستان ص ۴۷ وتذکرہ ج ۳ ص ۹۷ وکشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۶۔

امام ابن حبان

متوفی ۳۵۴ھ

نام ونسب: محمد نام، ابو حاتم کنیت اور ابن حبان لقب تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے:

محمد بن حبان بن احمد بن حبان بن معاذ بن معبد بن شہید بن ہدیہ بن مرۃ بن سعد بن یزید بن مرۃ بن زید بن عبداللہ بن دارم بن حنظلہ بن مالک بن زید بن مناۃ بن تمیم۔ (۱)

نسب نامہ میں قدرے اختلاف منقول ہے۔

خاندان: ابن حبان عربی النسل تھے، جیسا کہ نسب نامہ سے ظاہر ہے، عرب کے مشہور قبیلہ تمیم کی شاخ دارم سے ان کا نسبی تعلق تھا، اسی لیے دارمی اور تمیمی کہلاتے ہیں۔

وطن: بست کو ان کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے، یہ سیستان میں غزنیں اور ہرات کے درمیان دریائے ہلمند کے کنارے واقع تھا، محب الدین خطیب کا بیان ہے کہ غالب گمان یہ ہے کہ ان کے آباواجداد میں سے کوئی بزرگ مجاہدین اسلام کے اس دستہ میں شامل رہے ہوں گے جو پہلی صدی ہجری میں محمد بن قاسم ثقفی کی سرکردگی میں ہندوستان آیا تھا اور ملتان کی فتح کے بعد ان ہی علاقوں میں آباد ہو گئے ہوں گے، انہی کی نسل سے محمد بن حبان بست میں پیدا ہوئے، یہ اس زمانہ میں صوبہ بحستان (سیستان) کا ایک اہم پررونق اور سرسبز وشاداب مقام سمجھا جاتا تھا اور خرما اور انگور کی پیداوار کے لیے مشہور تھا، غالباً باغوں کی کثرت کی بنا پر اس کا نام بست پڑ گیا تھا، جو بوستاں یا بستان کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہوتا ہے، یہ شہر اسلامی فتوحات سے پہلے اور اس کے بعد بھی کئی صدیوں تک آباد رہا، یاقوت

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۳۔

کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن حبان کے بعد تقریباً تین صدیوں تک یہ آباد رہا مگر چھٹی صدی کے آخر یا ساتویں صدی کے شروع میں ویران ہوگیا، اس کی خاک سے متعدد نامور محدثین اور اکابر علما پیدا ہوئے، عربی کا مشہور ادیب وشاعر ابوالفتح بستی (متوفی ۴۰۱ھ) کا وطن یہی علاقہ ہے اور سنن ابی داؤد کے مشہور شارح اور عظیم محدث امام ابوسلیمان خطابی (م ۳۸۸ھ) کا تعلق بھی اسی مردم خیز سرزمین سے ہے۔(۱) امام ابن حبان بست کے گل سرسبد تھے اور امام خطابی سے زیادہ کوئی باکمال شخصیت یہاں نہیں پیدا ہوئی۔

ولادت: مورخین نے ان کے سنہ ولادت کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن ذہبی کا بیان ہے کہ وفات (۳۵۴ھ) کے وقت ان کی عمر تقریباً اسی سال تھی،(۲) اسی لحاظ سے لگ بھگ ۲۷۵ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

شیوخ واساتذہ: ابن حبان کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، حافظ ذہبی اور علامہ ابن سبکی تحریر فرماتے ہیں:

وانما لا یحصون من مصر الی خراسان.	مصر سے خراسان تک کے بے شمار لوگوں سے ابن حبان نے کسب فیض کیا۔

ان کا خود کا بیان ہے کہ:

لعلنا قد کتبنا عن الفی شیخ ما بین الشاس والاسکندریه. (۳)	شاید ہم نے شاس واسکندریہ کے درمیان کے دوہزار بزرگوں سے حدیثیں لکھیں۔

اگر ان کی مختلف علوم میں جامعیت اور رحلت وسفر کی کثرت کو مدنظر رکھا جائے تو اس بیان میں کوئی مبالغہ نہ معلوم ہوگا۔

---

(۱) کتاب الانساب ورق ۸۱ معجم البلدان ج ۳ ص ۱۷۰، ۱۷۱ وجغرافیہ خلافت مشرقی ص ۲۸۱ - ۵۱۹

(۲) العبر جلد ۲ ص ۳۰۰ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۱۔

بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر بن خزیمہ، ابوخلیفہ جمحی، ابوعبدالرحمٰن نسائی، ابویعلیٰ موصلی، احمد بن حسن صوفی، قاضی ابواحمد اسحاق بن ابراہیم بستی جعفری، احمد دمشقی، حسن بن سفیان شیبانی، حسین بن ادریس ہروی، ابویعلیٰ زکریا ساجی، عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰن بن شیرویہ ازدی، ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز بغوی، عمر بن محمد، عمران بن موسیٰ بن مجاشع، محمد بن ابراہیم خلدی ہروی، محمد بن اسحاق بن ابراہیم سراج ثقفی، ابوالحسن محمد بن عبداللہ بن جنید بستی، محمد بن عثمان بن سعد دارمی، محمد بن یحییٰ مدینی، محمد بن یزید دورتی، ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق وغیرہ۔

امام الائمہ ابوبکر بن خزیمہ سے غیر معمولی تعلق تھا، سفر ہو یا حضر ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے اور وہ جو کچھ فرماتے تھے اسے قلمبند کر لیتے تھے، فقہ، حدیث، اصول اور فرائض وغیرہ کی ان ہی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ (۱)

تلامذہ: ان کے تلامذہ کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی، چند مشہور شاگردوں کے نام ملاحظہ ہوں:

ابوعبداللہ حاکم، ابوعبداللہ بن مندہ اصبہانی، جعفر بن شعیب بن محمد سمرقندی، حسن بن منصور، ابوعبداللہ محمد بن احمد غنجار بخاری، ابومعاذ عبدالرحمٰن محمد بن رزق اللہ بجستانی، محمد بن احمد بن منصور بوقانی، ابوالحسن محمد بن احمد بن ہارون عبدون زوزنی، ابوسلمہ محمد بن محمد بن داؤد شافعی، ابوعلی منصور بن عبداللہ خالد ذہلی وغیرہ۔ (۲)

طلب علم کے لیے سفر: امام ابن حبان نے علم و فن کی تحصیل کے لیے متعدد اسلامی ملکوں کا سفر کیا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ انھوں نے شاس واسبیجاب (مشرقی ترکستان) سے اسکندریہ (مصر) اور مصر سے خراسان کا چپہ چپہ چھان ڈالا تھا، علمائے سیر نے ان کے مرو، نیشاپور، اہواز، ابلہ، بصرہ، واسط، بغداد، کوفہ، مکہ، موصل، حلب، انطاکیہ، حمص، بخارا، لسا، ماوراءالنہر، جرجان، عراق، حجاز، شام، مصر اور جزیرہ جانے کی تصریح کی ہے اور لکھا ہے کہ ان

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۱ (۲) ایضاً۔

میں سے بعض جگہ تو وہ متعدد بار تشریف لے گئے تھے۔(۱)

حفظ وثقاہت: ان کو غیر معمولی ذکاوت اور بے نظیر حافظہ ملا تھا، ابوسعد ادریسی صاحب تاریخ سمرقند فرماتے ہیں کہ ''وہ آثار واحادیث کے نامور حفاظ میں تھے'' حافظ ابن حجر نے ان کی غیر معمولی ذہانت اور قوتِ حافظہ کا اعتراف کیا ہے، دوسرے اصحابِ سیر وتراجم نے بھی ان کو الحافظ الجلیل اور احد الحفاظ الکبار وغیرہ لکھا ہے۔

ان کی ثقاہت پر بھی ائمہ فن کا اتفاق ہے، تمام مورخین نے خطیب کے حوالہ سے ان کو ثقہ ومتقن لکھا ہے، علامہ ابن عماد حنبلی فرماتے ہیں کہ وہ حافظ ثابت اور امام وحجت تھے۔(۲)

حدیث میں بلند پائیگی: حدیث میں ان کو زیادہ امتیاز اور برتری حاصل تھی اور وہ اس فن کے باکمال ائمہ میں شمار کئے جاتے ہیں، مورخین اور ارباب سیر نے ان کو حدیث میں مکثر اور معرفت حدیث میں امام قرار دیا ہے، متون واسانید حدیث پر ان کی نظر وسیع اور گہری تھی، ماہرینِ فن کا بیان ہے کہ: وہ متون واسانید کے عالم اور واقف کار تھے، حدیث میں ان کے کارنامے غیر معمولی ہیں، انھوں نے علوم حدیث کی حیرت انگیز خدمات انجام دی ہیں، حاکم فرماتے ہیں کہ ''حدیث میں ان سے بے نظیر کتابیں یادگار ہیں۔''(۳) حدیث میں ان کی مہارت اور ژرف نگاہی کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ جرح وتعدیل کے امام تھے اور اس فن میں ان کی تصنیفات بڑی اہم خیال کی جاتی ہیں۔

فقہ: اپنے جامع کمالات استاذ امام ابن خزیمہ کی طرح وہ بھی فقہ وحدیث دونوں میں ممتاز تھے اور انھیں سے اس فن کی تکمیل وتحصیل کی تھی، علمائے سیر لکھتے ہیں کہ ''ابن حبان فقہ کے

---

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۱ ولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۵ وبستان المحدثین ص ۴۰ (۲) ایضاً والبدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۲۵۹ وشذرات الذہب ج ۳ ص ۱۶ (۳) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ واعلام ج ۳ ص ۸۸۰۔

عالم و عارف اور فقہائے دین میں ہیں'' سمرقند والوں میں فقہی ذوق پیدا کرنا ان ہی کا کارنامہ ہے، حاکم کا بیان ہے کہ ''وہ علم فقہ کا خزانہ تھے۔''(۱)

دیگر علوم: دینی علوم کی طرح وہ اس زمانہ کے مروجہ علوم اور جدید فنون سے بھی اچھی طرح واقف تھے، حاکم کا بیان ہے کہ لغت، عربیت نحو وادب کے علاوہ فلسفہ وکلام، طب ونجوم اور جغرافیہ میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

سوائے علم حدیث علوم دیگر ہم داشت فقہ ولغت وطب ونجوم فلک وہندسہ رانیک می دانست۔(۲)	وہ علم حدیث کے علاوہ دوسرے علوم میں درک رکھتے تھے، فقہ ولغت وطب ونجوم، فلکیات وہندسہ سے خوب واقف تھے۔

جامعیت: ان گوناگوں علوم سے واقفیت ومعرفت ابن حبان کی جامعیت کا ثبوت ہے، ادریسی کا بیان ہے کہ ''وہ متعدد علوم میں جامع تھے'' حاکم فرماتے ہیں کہ ''وہ علوم وفنون کا خزانہ تھے۔'' حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ انھوں نے ہر ہر فن میں کتابیں لکھی تھیں، علمائے اسلام میں ایسے جامع کمالات لوگ کم گذرے ہیں جن کو اتنے گوناگوں اور متنوع علوم میں اس قدر رسوخ اور ایسی مکمل مہارت حاصل رہی ہو، ان ہی کمالات اور جامعیت کی وجہ سے مورخین نے انھیں امام عصر، فاضل متقن، العالم البحر اور العلامۃ المتبحر وغیرہ لکھا ہے۔(۳)

فہم وفراست: اللہ تعالیٰ نے علم وفضل کی طرح ان کو فہم وفراست اور عقل ودانش سے بھی نوازا تھا، حاکم نے ان کو عقلائے رجال میں بتایا ہے اور خطیب نے بھی ان کی فہم وفراست کا اعتراف کیا ہے۔(۴)

علم کا شوق وذوق: ابن حبان کو علم وفن سے غیر معمولی شغف تھا، سفر کی زیادتی اسی دلچسپی کا

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۷ (۲) ایضاً وبستان المحدثین ص ۴۰ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ ولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴۔

نتیجہ تھی، وہ ابن خزیمہ کی خدمت میں رہ کر اپنی تشنگی علم بجھاتے تھے، علم سے تعلق اور دلچسپی کا یہ حال تھا کہ اپنے وطن بست میں ایک مدرسہ اور کتب خانہ قائم کیا تھا اور اپنی زندگی ہی میں اپنا مکان ان دونوں پر وقف کر دیا تھا، یہ مدرسہ اہل علم، محدثین اور فقہا سے معمور رہتا تھا اور کتب خانہ کا نہایت معقول انتظام کیا گیا تھا، اس کی نگرانی باقاعدہ ایک شخص کے متعلق کر دی گئی تھی، اس کی کشش لوگوں کو دور دراز سے یہاں کھینچ لاتی تھی، ان کو قیام اور کتبخانہ سے استفادہ اور کتابوں کے نقل کی پوری سہولت بہم پہنچائی جاتی تھی، کتابوں کی حفاظت کا بھی معقول انتظام تھا، چنانچہ کتب خانہ سے باہر کتابیں لے جانے کی کسی کو اجازت نہیں دی جاتی تھی، اس مدرسہ اور کتب خانہ کا فیض ابن حبان کے بعد بھی جاری رہا۔(۱)

منصب قضا: دینی علوم میں بصیرت اور پختگی کی وجہ سے انھیں قضا کا منصب تفویض کیا گیا تھا اور وہ ایک عرصہ تک سمرقند، نسا، نیشاپور اور خراسان کے بعض شہروں کے قاضی رہے۔(۲)

مقبولیت وشہرت: ابن حبان کے علم وفضل اور جامعیت وکمال کی بنا پر چار دانگ عالم میں ان کی شہرت ہو گئی تھی، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ "شہروں اور ملکوں میں ان کی غیر معمولی شہرت تھی اور وہ بالاتفاق ائمہ امت میں شمار کیے جاتے تھے" علامہ سمعانی نے ان کو امام العصر اور حافظ ذہبی نے ان کو ائمہ زمانہ میں محسوب کیا ہے، ان کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ جب سیر وسیاحت کے بعد اپنے وطن بست تشریف لائے تو ان کے گھر پر شائقین علم اور طالبین فیض کا ازدحام رہتا تھا اور ان کی تصنیفات بڑے شوق وذوق سے پڑھی اور سنی جاتی تھیں۔(۳)

فقہی مسلک: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شافعی المذہب تھے لیکن عام اصحاب طبقات

(۱) لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴ (۲) ایضاً وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ وکتاب الانساب ورق ۸۱ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ وکتاب الانساب ورق ۸۱۔

وتراجم نے اس باب میں سکوت اختیار کیا ہے، اس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص مسلکِ فقہ سے وابستہ نہ تھے، بلکہ اپنے استاذ امام ابن خزیمہ کی طرح تقلید کے بجائے تفقہ واجتہاد سے کام لیتے رہے ہوں گے حافظ ابن کثیر نے بھی ان کو مجتہدین میں شمار کیا ہے۔(۱)

جرح وتعدیل: اوپر گذر چکا ہے کہ وہ حدیث کی طرح اس کے متعلقہ علوم کے بھی ماہر تھے، جرح وتعدیل ان کا خاص موضوع تھا، اس میں انھوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔

فکروخیال میں جدت: امام صاحب کے بعض افکار وخیالات میں بڑی جدت اور ندرت پائی جاتی ہے اس قسم کی ایک عجیب اور دلچسپ رائے ذیل میں تحریر کی جاتی ہے:

حضرت انسؓ سے صومِ وصال کی جو روایت منقول ہے، اس میں آپؐ کے اس ارشاد مبارک:

انی لست کاحدکم انی اطعم واسقی۔	میں تم لوگوں کی طرح نہیں ہوں، مجھے (خداوند کی طرف سے) کھلایا پلایا جاتا ہے۔

کے متعلق اپنی صحیح میں لکھتے ہیں:

''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حدیثیں صحیح نہیں ہیں جن میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھ لینے کا ذکر ہے، دراصل ان حدیثوں میں حجر (پتھر) کے بجائے حجز کا لفظ ہوگا، جس کے معنیٰ طرف الازار یعنی نیفہ ہے کیوں کہ جب اللہ تعالیٰ مسلسل روزہ رکھنے کی صورت میں بھی اپنے رسولؐ کو کھلاتا پلاتا تھا تو اس وقت بھلا وہ کیسے آپ کو بھوکا چھوڑ دیتا، جب آپ روزے سے نہیں ہوتے تھے یہاں تک کہ آپؐ کو اپنے پیٹ پر پتھر رکھنا پڑتا تھا، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ بھوک میں پیٹ پر پتھر باندھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔''

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ص ۲۵۹۔

علامہ ابن سبکی نے اس رائے پر جو ایراد کیا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمایئے:

''علامہ کا یہ قول محل نظر ہے کیوں کہ خود انھوں نے اپنی اسی کتاب میں چند ورق پہلے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے واسطہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا:

والذی نفسی بیدہ ما اخرجنی الا الجوع۔(۱) — قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں بھی بھوک ہی کی وجہ سے نکلا ہوں۔

اسی طرح متعدد روایتوں میں آپؐ کی بھوک کا ذکر ہے، درحقیقت بھوک کو نقص اور عیب خیال کرنا ہی غلط ہے بلکہ اسی سے نبی کے درجات کی بلندی کا پتہ چلتا ہے، ان حدیثوں اور وصال کی روایت میں تطبیق کی صورت بالکل واضح ہے، اللہ کی مشیت اور مرضی سے نبی کے مختلف احوال ہوتے ہیں، کبھی وہ بھوکا ہوتا ہے، کبھی روزے سے ہوتا ہے، اور کبھی یہ حال ہوتا ہے کہ روزے میں بھی اس کو بھوک اور پیاس کی تکلیف کا مطلقاً احساس نہیں ہوتا اور یہ سب صورتیں اور مختلف حالتیں اپنے اپنے محل اور وقت کے اعتبار سے بالکل موزوں اور مناسب ہوتی ہیں۔''(۲)

اخلاق وعادات: افسوس ہے کہ تذکرہ وتراجم کی کتابیں ابن حبان کے اخلاق کے ذکر

(۱) امام مالک نے اس روایت کی اس طرح تخریج کی ہے کہ آپ مسجد میں تشریف لے گئے وہاں حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ پہلے سے موجود تھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھوک سے بیقرار ہوکر اپنے گھروں سے نکلے ہیں، آپ نے فرمایا (وانا اخرجنی الجوع) یعنی میں بھی اسی وجہ سے بے چین ہوکر نکلا ہوں، چنانچہ حضرت ابوالہیثم انصاری ان سب کو اپنے گھر لائے اور کھلایا پلایا۔ (موطا امام مالک ص ۷۱ا،۷۲ا، مطبوعہ احمدی پریس دہلی) (۲) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۲۔

سے خالی ہیں لیکن ان کی فیاضی اور سخاوت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر عمر میں جب انھوں نے اپنے وطن میں مدرسہ اور کتب خانہ قائم کیا تو شائقین علم کے لئے ان کا گھر لنگر خانہ بنا ہوا تھا، دور دراز کے لوگوں کے طعام کے مصارف وہی برداشت کرتے تھے۔(۱)

الحاد اور بدعقیدگی کا الزام اور اس کا جواب: ابن حبان پر بدعقیدگی، الحاد اور زندقہ کا الزام عائد کیا گیا ہے اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ جلاوطن کر دیئے گئے تھے، ذیل میں اس الزام کو نقل کر کے اس کی حقیقت واضح کی جاتی ہے۔

اس الزام کا دارومدار اُن دو روایتوں پر ہے جو مشہور صوفی ابو اسماعیل عبداللہ بن محمد انصاری ہروی (متوفی ۴۸۱ھ) سے مروی ہیں، ان میں پہلی روایت یہ ہے:

قال سألت یحییٰ بن عمار عن ابی حاتم بن حبان فقال رأیتهٗ ونحن اخرجناه من سجستان كان له علم كثير ولم يكن له دين كبير قدم علينا فانكر الحد لله فاخرجناه۔ (۲)

ابو اسماعیل ہروی کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ بن عمار سے ابو حاتم بن حبان کے بارہ میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے انھیں دیکھا ہے اور ہم ہی لوگوں نے ان کو سیستان سے جلاوطن کیا تھا، وہ کثیر العلم ضرور تھے مگر ان کا دینی پایہ زیادہ بلند نہ تھا، وہ ہمارے پاس آئے اور اللہ کے بارے میں حد کا انکار کیا تو ہم نے ان کو شہر بدر کر دیا۔

دوسری روایت ہے:

قال ابو اسماعیل الانصاری

ابو اسماعیل انصاری کہتے ہیں کہ میں

(۱) لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ و ۱۳۵ ومیزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۰ وطبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۱۴۱ ولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳۔

سمعت عبدالصمد بن محمد يقول سمعت ابى يقول انكروا على ابن حبان قوله (النبوة العلم والعمل) وحكموا عليه بالزندقة وهجروه وكتب فيه الى الخليفة فامر بقتله وسمعت غيره يقول لذلك اخرج الى سمرقند.(٢)	نے عبدالصمد سے اور انھوں نے اپنے والد محمد سے سنا کہ لوگوں نے ابن حبان کے قول (النبوۃ العلم والعمل یعنی نبوت علم وعمل ہے)(۱) کی وجہ سے ان پر نکیر کی ہے، الحاد وزندقہ کا الزام لگایا اور ان سے قطع تعلق کر کے خلیفہ سے ان کی شکایت کی، خلیفہ نے ان کے قتل کا حکم دیا (ابواسماعیل کہتے ہیں مگر) میں نے عبدالصمد کے علاوہ دوسرے شخص سے یہ سنا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ جلاوطن کر کے سمرقند بھیج دیئے گئے تھے۔

مذکورہ بالا دونوں روایتوں میں عائد کردہ الزامات کی نوعیت مختلف ہے، پہلی روایت میں ابن حبان کی فضیلت وبرتری میں کلام کیا گیا ہے اور دوسری روایت میں ان کے الحاد وزندقہ کا ذکر ہے، اسی طرح دونوں روایتوں میں الزام کے اسباب اور وجہیں مختلف بتائی گئی ہیں، پہلی روایت میں صرف جلاوطنی کا تذکرہ ہے اور دوسری میں اس کے بجائے خلیفہ کی طرف سے قتل کے فرمان کا ذکر ہے، مگر اس سے پتہ نہیں چلتا کہ واقعۃً وہ قتل کیے گئے تھے یا نہیں؟ (۳) پھر فرمانِ قتل کے بارہ میں خود راوی نے شک وتذبذب ظاہر کر کے

(۱) اس سے التباس ہوتا ہے کہ ابن حبان کے نزدیک نبوت علم وعمل کا نام ہے یعنی جس میں یہ اوصاف پائے جائیں وہ نبی ہوسکتا ہے گویا نبوت وہبی نہیں کسبی ہے (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵ ومیزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ ولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳ (۳) شاہ عبدالعزیز صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قتل نہیں کیے گئے تھے بلکہ بعض ثقہ محدثین نے درمیان میں پڑ کر اس کو رفع دفع کرا دیا تھا۔

روایت کو مشکوک بنا دیا ہے، علاوہ ازیں اس سے اس کا سوئے حفظ اور نسیان بھی ثابت ہوتا ہے۔

ابو اسماعیل انصاری کا زہد و تقدس اور تصوف میں ان کا کمال مسلم ہے مگر روایت و درایت میں ضبط و تیقظ ثابت نہیں ہے، عموماً صوفیہ روایات کی صحت اور سندوں کی قوت کا زیادہ لحاظ نہیں کرتے علاوہ ازیں وہی تنہا ان دونوں روایتوں کے راوی ہیں ان احتمالات کی موجودگی میں ابن حبان جیسے جلیل القدر محدث کے بارہ میں اتنے اہم اور سنگین الزام کو کیسے صحیح مانا جاسکتا ہے؟ ہروی کی پیدائش اور ابن حبان کی وفات کے درمیان چالیس بیالیس سال کا فرق ہے۔(۱) اگر یہ الزام کچھ بھی وزنی ہوتا تو اس عرصہ میں پوری طرح مشہور ہو چکا ہوتا اور اس کو بیان کرنے والے متعدد افراد اور ابن حبان کے معاصرین بھی ہوتے کیوں کہ ان کا شمار ائمہ حدیث اور جرح و تعدیل کے ماہرین میں ہوتا ہے، اس لیے دوسرے اربابِ فن محدثین اور رجال و اسناد کے ماہرین ان کے بارہ میں چھان بین ضرور کرتے لیکن اتنے اہم الزام کے بعد بھی ان کی شہرت واہمیت وثوق واعتبار اور عظمت و بلند پائیگی میں فرق نہ آنا اور ان کی ذات کا محدثین اور ائمہ فن کا مرکز توجہ بنا رہنا اور رجال کی کتابوں کا ان کے اقوال سے معمور ہونا اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ان پر یہ الزام ثابت و متحقق نہیں۔(۲)

ان روایتوں کے ناقابلِ یقین ہونے ہی کی بنا پر ان کو بعض ارباب سیر و تذکرہ نے نقل کرنے سے پرہیز کیا ہے اور جن مورخین نے ان کو نقل کیا ہے انھوں نے بھی ان پر نقد و تعقب کیا ہے۔

درحقیقت ایسے سنگین الزام محض مشکوک روایتوں کی بنیاد پر تسلیم نہیں کیے جاسکتے

(۱) طبقات ابن رجب ص ۳۹ (۲) اس سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ بالا روایت میں ابن حبان سے تعلقات اور روایات وغیرہ ترک کرنے کا جو ذکر ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے ممکن ہے ان کے بعض مخالفین نے ان سے روایت کرنا چھوڑ دیا ہو لیکن عام طور سے ثقہ اور معتبر سمجھے جاتے رہے۔

جب تک کہ متعدد افراد کے بیانات، معاصرین کی شہادتوں اور دوسرے قرائن سے ان کی پوری تصدیق نہ ہو جائے۔

دونوں روایتوں کے اختلاف واضطراب اوران میں خطا وتحریف کے احتمالات کو نظر انداز کر کے اگر انھیں صحیح بھی مان لیا جائے تو ابن حبان پر الحاد اور بدعقیدگی کا الزام ثابت نہیں ہوتا اس کی تفصیل یہ ہے:

اوپر گذر چکا ہے کہ پہلی روایت میں الحاد اور بے دینی کا سرے سے کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں محض ابن حبان کی دینی عظمت وجلالت کے بارہ میں کلام کیا گیا ہے اوراس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے حدوحیز کی نفی کرتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ کوئی الحاد اور بے دینی کی بات نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کو بلا حد ومکان ماننا ہی اسلامی عقائد کے مطابق اور صحیح نقطہ نظر ہے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں:

انظر ما اجهل هذا الجارح وليت شعرى من المجروح مثبت الحد لله اونافيه۔	ذرا غور کرو کہ یہ جارحانہ الزام لگانے والا بھی کس قدر ناواقف ہے کاش میں بھی جانتا کہ دونوں میں قابلِ الزام کون ہے؟ آیا وہ جو اللہ کے لیے حد کو ماننا اور ثابت کرتا ہے یا وہ جو اس کی نفی کرتا ہے۔

حافظ صلاح الدین خلیل بن کیکلدی کا بیان ہے:

بالله العجب من احق بالاخراج والتبديع وقلة الدين۔(۱)	بخدا سخت تعجب ہے آخر جلاوطنی کی سزا بدعت اور دین میں ضعف کے الزام کا کون زیادہ مستحق ہے؟

(۱) طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۱۴۱، ۱۴۲۔

حافظ ابن حجر نے بڑے صریح الفاظ میں علامہ ابن حبان کے موقف کو صحیح قرار دیا ہے، ان کے بیان کا خلاصہ ہے:

''معترض کا یہ کہنا کہ ابن حبان سے کوئی ایسی لغزش سرزد ہوگئی تھی جس کی وجہ سے لوگوں نے ان پر طعن کیا ہے اگر اس سے اس کی مراد پہلی روایت والا قصہ ہے جس میں ابن حبان کی جانب حد کی نفی کی نسبت کی گئی ہے تو دراصل اس میں کوئی لغزش نہیں ہے بلکہ انصاف کی بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابن حبان ہی کا موقف برحق ہے۔''(۱)

ان اقوال سے ظاہر ہوگیا کہ حد کے مسئلہ میں علامہ ابن حبان کی رائے میں کوئی غلطی اور قابل اعتراض بات نہ تھی بلکہ ان ہی کا نقطہ نظر صحیح تھا، البتہ اس پر اس پہلو سے اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے خواہ مخواہ ایک غیر ضروری مسئلہ کو چھیڑا، کیوں کہ محتاط علما اس قسم کے کلامی مسائل میں غور وخوض کو پسند نہیں کرتے، ان کے نزدیک خدائے تعالیٰ کی صفات وغیرہ میں بحث وتدقیق فضول اور لایعنی بات ہے اور ان مباحث میں سکوت افضل اور سوال وتفتیش اور بحث وجستجو بدعت ہے، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

''ابن حبان کا اللہ کے لیے حد ہونے کا انکار کرنا اور تم لوگوں کا اس کے لیے حد کا ثابت کرنا دونوں ہی فضول باتیں ہیں، ان کے متعلق خاموشی افضل واولیٰ ہے، اس لیے کہ نفی واثبات کے بارہ میں کوئی نص وارد نہیں ہے اور اللہ کی شان یہ ہے کہ ''اس کے مانند کوئی چیز بھی نہیں'' پس جو شخص حد کا قائل ہے اس کا مخالف اس سے کہے گا کہ تم نے تو رائے وقیاس سے اللہ کے لیے حد بنائی ہے، اس کے لیے تمہارے پاس کوئی ثبوت اور نص نہیں ہے (نتیجہ کے اعتبار سے اس قول سے اللہ کا محدود ہونا ثابت ہوتا ہے، حالاں کہ) محدود مخلوق ہے اور اللہ

(۱) لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴۔

کی شان اس سے بہت اعلیٰ وارفع ہے مگر حد کو ماننے والا نہ ماننے والے سے یہ کہے گا کہ تم نے تو خداوند کو معدوم چیزوں کے برابر کردیا ہے(۱) کیوں کہ معدوم چیزوں کے لیے کوئی حد نہیں ہوتی، پس ایسی حالت میں جو لوگ اللہ کو منزہ سمجھتے اور ان امور کے بارہ میں خاموشی اختیار کرتے ہیں وہی سلف صالحین کے متبع ہیں اورانھیں کا طریقہ احتیاط اور سلامتی پرمبنی ہے۔''(۲)

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ حد کے مثبت ومنکر دونوں نے ایک غیر ضروری اور بے سود مسئلہ کو موضوع بنا کر غلطی کا ارتکاب کیا ہے اوران دونوں کا طریقہ احتیاط وتورع کے منافی ہے، علامہ ذہبی دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''اثبات وانکار دونوں کے قائلین غلطی کرتے ہیں کیوں کہ حد کی نفی وثبوت کے متعلق کوئی نص وارد نہیں ہے، اورآدمی کے حسن اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لایعنی باتیں چھوڑ دے۔''(۳)

اوپر جو لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) حد کے بارہ میں ابن حبان کا موقف صحیح اوراسلامی عقائد کے مطابق تھا۔

(۲) ان کی غلطی اتنی ہے کہ انھوں نے ایک ایسے غیر ضروری اور لاطائل مسئلہ کو موضوع بحث بنایا جس میں سکوت افضل اور بہتر تھا لیکن اس کو عقیدہ کے بگاڑ اور دین میں فتور سے کوئی تعلق نہیں۔

مگر مزید غور وفکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن حبان نے بلاضرورت اس مسئلہ میں کلام نہیں کیا تھا، ذیل میں اس کی توضیح کی جاتی ہے:

---

(۱) حافظ ابن حجر نے اس کی تردید میں لکھا ہے کہ یہ بات قابل تسلیم نہیں ہے کیوں کہ اللہ کے وجود کے تحقق کے بعد اس کے لیے حد کی نفی اس کو معدوم اشیا کے برابر کردینا نہیں ہوسکتا (۲) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ ولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵۔

بلا شبہ یہ صحیح ہے کہ مسئلہ صفات میں غور وخوض نامناسب اور خلافِ احتیاط ہے لیکن یہ اس صورت میں جب خواہ مخواہ اور بلا ضرورت غور وخوض اور بحث وکلام کیا جائے مگر ضرورۃً اور ناگزیر حالات میں خاموشی کے بجائے اظہار خیال ہی مناسب ہے، علامہ ابن حبان نے ضروری اور ناگزیر حالت ہی میں اس کے متعلق اظہار خیال فرمایا تھا، ان کے زمانہ میں یہ مسئلہ بحث ونظر کا موضوع بنا ہوا تھا اور کچھ لوگ شد ومد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے حد وحیز ثابت کررہے تھے، اس لیے انھوں نے اس مسئلہ میں اظہار خیال ضروری سمجھا اور وہ بات کہی جو عقائد صحیحہ کے مطابق تھی اس لیے انھوں نے کوئی خلافِ احتیاط کام نہیں کیا، خلق قرآن کے مسئلہ میں امام احمدؒ کے طرز عمل میں بھی اس کی مثال ملتی ہے، اس کے بارے میں علمائے حق کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اس میں بحث وتفتیش فضول، سوال وتجسس بدعت اور خاموشی افضل واولیٰ ہے، چنانچہ امام بخاری سے جب اس کے متعلق استفسار کیا گیا تو انھوں نے یہی جواب دیا اور خود امام احمد سے بھی جب لوگوں نے عام حالات میں اس کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے اس کو فضول اور لایعنی مشغلہ قرار دیا اور اس میں بحث اور کرید کرنے سے منع کیا۔(۱) مگر جب معتزلہ کے استیلا وتسلط اور خلفائے عباسیہ کے جبر وتشدد نے اس کو فتنہ کی شکل دیدی تو اس وقت خاموشی کے بجائے انھوں نے اظہار خیال کو ضروری سمجھا اور ابتلا وآزمائش کی پرواہ کیے بغیر بڑی جرأت وبے باکی سے یہ اعلان کیا کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے، وہ کسی طرح بھی مخلوق نہیں ہوسکتا، اس کے نتیجہ میں انھوں نے قید وبند کی صعوبتیں اور سخت قسم کی جسمانی سزائیں برداشت کیں، ابن حبان نے اس اسوہ پر عمل کیا۔

رہی دوسری روایت تو اس میں الحاد وزندقہ کا ضرور ذکر ہے مگر اس کی جو وجہ بیان کی گئی ہے اس سے اس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا، کفر وایمان کا معاملہ نہایت نازک ہے، محققین اور علمائے حق کا معمول رہا ہے کہ وہ اس میں ہمیشہ توقف وتامل سے کام لیتے ہیں

(۱) احمد بن حنبل والمحنۃ ص ۳۳۔

اور پوری تحقیق کے بغیر الزام عائد نہیں کرتے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا توجیہ وتاویل سے کام لیتے تھے، محدثین اور نقادانِ فن نے ابن حبان کے بارہ میں بھی اس اصول کو مدنظر رکھا ہے، ان کی توجیہ وتاویل سے یہ الزام پوری طرح رفع ہوجاتا ہے، ذیل میں ان کے اقوال درج کیے جاتے ہیں۔

علامہ ذہبی رقمطراز ہیں:

''دوسرا اعتراض بھی درست نہیں ہے کیوں کہ اس کی عمدہ توجیہ ممکن ہے درحقیقت ابن حبان کی مراد مبتدا کو خبر میں محصور ومحدود کرنا نہیں ہے جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد (الحج عرفۃ، یعنی حج عرفہ ہے) کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حج کی ادائیگی کے لیے صرف عرفہ میں قیام کرلینا کافی ہے اور نہ تنہا عرفہ میں قیام سے حج کے تمام ارکان ومناسک ادا ہوجائیں گے، بلکہ آپ کا مقصد حج کے سب سے اہم، ضروری اور مقدم رکن کو بیان کرنا ہے، اسی طرح ابن حبان کے قول (النبوۃ العلم والعمل یعنی نبوتِ علم وعمل ہے) کا منشا یہ ہے کہ نبوت کی اہم اور ضروری حقیقت علم وعمل میں نبی کا کمال وامتیاز ہے اور کوئی شخص ان میں درجۂ کمال کو پہنچے بغیر نبی نہیں ہوسکتا یہ صحیح ہے کہ نبوت وہ مخصوص موہبتِ الٰہی اور عطیہ ربانی ہے جس کے لیے اللہ اپنے علم وعمل والے بندے کا انتخاب کرتا ہے اس میں آدمی کے کسب اور حیلہ وتدبیر کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور نہ وہ ریاضت اور محنت شاقہ سے حاصل کی جاسکتی ہے، اسی سے علم نافع اور عمل صالح کا سرچشمہ پھوٹتا ہے اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ابن حبان کے مذکورہ بالا قول میں کوئی خرابی اور قباحت نظر نہیں آئیگی، البتہ مطلق شکل میں ان سے جو کچھ منقول ہے وہ صحیح نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک فلسفیانہ رائے وخیال کی ہے۔''(۱)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵۔

علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر دونوں نے یہ توجیہ بھی تحریر کی ہے:

''ابن حبان کے اس قول (النبوۃ العلم والعمل) کی ایک مناسب توجیہ یہ ہے کہ اگر ان کی مراد یہ ہو کہ نبوت کا دارومدار علم وعمل پر ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نبوت ووحی سے اسی شخص کو سرفراز کرتا ہے جو ان دونوں اوصاف سے متصف ہو اور نبی وحی کی وجہ سے علم والا ہوتا ہے اور علم الٰہی عمل صالح کو مستلزم ہے تو اس اعتبار سے ان کا قول صحیح ہے کیوں کہ نبوت علم لدنی اور اعمال کا نام ہے جو قربت الٰہی کا ذریعہ ہیں، پس نبوت ان دونوں چیزوں کے بتمام وکمال پائے جانے کا نام ہے اور وحی الٰہی کے بغیر ان دونوں کا بدرجۂ کمال حصول نہیں ہوسکتا کیوں کہ وحی الٰہی ایسا یقینی علم ہے جس میں ظن وتخمین کو دخل نہیں ہوتا مگر غیر انبیا کا علم یقینی کم اور ظنی زیادہ ہوتا ہے، پھر نبوت عصمت کو مستلزم ہے اور انبیا کے علاوہ کسی شخص کے لیے عصمت نہیں خواہ وہ علم وعمل کے کتنے ہی اعلیٰ مدارج اور بلند مراتب کیوں نہ طے کرے، دوسری بات یہ ہے کہ جب کسی چیز کے بارے میں خبر دی جاتی ہے تو وہ اس کے ضروری مقاصد اور اہم اجزا کے لحاظ سے دی جاتی ہے جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (الحج عرفۃ یعنی حج تو عرفہ ہے)

تاہم کسی کے لیے اس طرح کی بات مطلقاً اور بلا قرینہ کہنا درست نہیں ہے اور اگر ابن حبان کا مقصد حصر ہو یعنی نبوت صرف علم وعمل ہی کا نام ہے تو بلاشبہ یہ زندقہ اور فلسفیانہ موشگافی ہوگی۔''(۱)

اس کے متعلق شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کی تقریر بھی قابل ملاحظہ ہے وہ فرماتے ہیں:

''مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ ابن حبان کا یہ قول (النبوۃ العلم والعمل)

---

(۱) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ ولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳ و ۱۱۴۔

عقائد صحیحہ کے چنداں خلاف نہیں، کیوں کہ ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ نبوت کوئی کسبی چیز ہے جو علم وعمل کی ریاضت سے حاصل ہو سکتی ہے جیسا کہ فلاسفہ کا مذہب ہے بلکہ ان کی غرض یہ ہے کہ نبوت کے لیے انسان میں اس نفس ناطقہ کا پایا جانا لازمی ہے جو علم وعمل میں نمایاں زیادتی رکھتا ہو، اس کے بعد ہی اس کو وہبی طور پر نبوت عطا کی جاتی ہے، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی کی جانب اشارہ کیا گیا ہے:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ. (انعام ۱۲۴)
اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت ونبوت سے کس کو سرفراز کرے۔

رہا یہ عقیدہ کہ انبیا علیہم السلام کو علمی وعملی استعداد میں دوسرے افراد پر برتری حاصل نہیں ہوتی بلکہ خدا تعالیٰ محض اپنے حکم وفیصلہ سے برابر برابر صلاحیت رکھنے والے لوگوں میں سے کسی ایک شخص کو زبردستی نبوت سے سرفراز کر دیتا ہے تو یہ بات ہرگز دین وشریعت سے ثابت نہیں ہے۔

یا ابن حبان کا منشا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انبیا علیہم السلام کو نبوت عطا کیے جانے کے بعد علم وعمل دونوں اعتبار سے فوقیت اور برتری حاصل ہو جاتی اس لیے وہ معصوم اور گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں تو یہ ایسی بات ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔"(۱)

ان توجیہات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن حبان کے قول (النبوۃ العلم والعمل) میں بھی الزام واعتراض اور الحاد وبدعقیدگی کی کوئی بات نہیں، زیادہ سے زیادہ اس کو سوئے تعبیر کہا جاسکتا ہے، البتہ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے بڑے محدث اور ایسی جلیل القدر شخصیت پر محض سوئے تعبیر کی وجہ سے اتنا بڑا اور ناروا الزام کیوں عائد کیا گیا ہے؟ اس کے مختلف اسباب معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) بستان المحدثین ص ۴۰۔

۱- ایک سبب یہ ہے کہ ابن حبان علم وفن میں نہایت ممتاز اور بڑے ذہین وطباع شخص تھے، ان کے غیر معمولی کمالات نے بعض لوگوں میں ان کو محسود بنادیا تھا اور وہ ان کو مطعون و متہم کرنے کی فکر میں رہتے تھے، ان کے اس قول نے ان کے لیے اس کا موقع فراہم کردیا اور انھوں نے ان کی تعبیری غلطی سے فائدہ اٹھا کر اور اس کو سیاق وسباق سے جدا کرکے اسے ان کا الحاد و زندقہ قرار دیا حاکم فرماتے ہیں:

''ابوحاتم نہایت عالی مرتبہ تھے، اس بنا پر ان سے حسد کیا جاتا تھا۔''(۱)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

''بجز عناد و تعصب کے ان پر اس الزام کے عائد کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہوسکتی وہ یگانہ روزگار اور غیر معمولی ذہین وطباع تھے ان کا حافظہ بے مثال تھا۔''(۲)

۲- دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ فلسفہ وکلام کے ماہر اور فلسفیانہ و متکلمانہ مذاق رکھتے تھے اور فلسفہ وکلام میں انہماک بعض لوگوں کے عقائد وخیالات میں فساد پیدا کردیتا ہے۔ اس بنا پر متقشف علما کو ابن حبان سے بدگمانی ہوگئی اور وہ ان پر طعن و تشنیع کرنے لگے، علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ ''وہ فلسفہ وکلام وغیرہ کے بڑے واقف کار تھے، اس لیے ان پر الحاد وزندقہ کا الزام لگایا جاتا ہے'' حالانکہ فلسفہ وکلام سے فسادِ عقیدہ ضروری نہیں ہے، ایسے بہت سے علما ہیں جو ان فنون سے غیر معمولی اشتغال رکھنے کے باوجود ذہنی حیثیت سے نہایت ممتاز اور بلند تھے، فلسفہ وکلام میں انہماک نے ان کے عقائد میں کوئی خرابی نہیں پیدا کی، اس لیے ابن حبان کے فلسفہ وکلام کی دلچسپی کو بھی ایمان وعقیدہ کے فساد اور بگاڑ کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا تا آنکہ اس کا پورا ثبوت موجود نہ ہو۔

۳- ابن حبان پر اتہام والزام کی روایت کرنے والے ابواسماعیل انصاری

(۱) لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۵ (۲) ایضاً ص ۱۱۴۔

ہروی جلیل القدر صوفی اور عارف باللہ تھے، صوفیہ کا ان مسائل میں تشدد مشہور ہے اس لیے وہ ابن حبان سے ان کے فلسفہ وکلام میں اشتغال کی بنا پر خوش نہ رہے ہوں گے، اس فروگذاشت نے ان کا رویہ اور سخت بنا دیا ہوگا اور انھوں نے ان پر الحاد وزندقہ کا الزام لگا دیا اس لیے یہ الزام درحقیقت ان کے غایتِ تورع اور تصوف میں غلو کا نتیجہ ہے جو حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔

وفات: ابن حبان نے جمعہ کا دن گذار کر ۲۴رشوال ۳۵۴ھ کی شب میں اپنے وطن بست میں انتقال کیا، انھوں نے اپنے مکان کے قریب ایک چبوترہ بنایا تھا، اسی میں دفن کیے گئے۔(۱)

تصنیفات: امام ابن حبان ان علمائے اسلام میں تھے جن سے بیشمار کتابیں یادگار ہیں، ان کی تصنیفات کیفیت وکمیت دونوں اعتبار سے اہم اور علمائے فن اور محدثین کا عمدہ ماخذ ومرجع ہیں، سمعانی اور حاکم کا بیان ہے کہ ''ابن حبان نے فن حدیث وغیرہ میں بیش قیمت اور عدیم الامثال کتابیں لکھی تھیں'' (۲) مگر افسوس کہ چند کے علاوہ اکثر تصنیفات اب ناپید ہیں، خطیب نے ان کی بربادی کا ماتم کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''یہ عظیم الشان کتابیں اس لائق تھیں کہ ان کی زیادہ سے زیادہ نقل واشاعت ہوتی، اہل علم ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتے، ان کی نقل وکتابت کرتے اور جلدوں میں باندھ کر محفوظ کر دیتے لیکن افسوس کہ امام صاحب کے اہل وطن ان کے مرتبۂ فضل وکمال سے ناآشنا تھے اور وہ اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے ان کی اہم اور بلند پایہ تصنیفات کی اشاعت سے غافل رہے۔''(۳)

جن کتابوں کا علم ہو سکا ہے ان کی فہرست اور بعض کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

---

(۱) لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴ وطبقات الشافعیہ الکبری ج ۲ ص ۱۴۱ (۲) کتاب الانساب سمعانی ورق ۸۱ و ۱۷۴ (۳) مقدمہ موارد الظمآن۔

۱- کتاب الصحابہ (۵ جز) ۲- کتاب التابعین (۱۲ جز) ۳- کتاب اتباع التابعین (۱۵ جز) ۴- کتاب تبع الاتباع (۷ جز) ۵- کتاب تباع التبع (۲۰ جز) ۶- کتاب الفصل بین النقلیۃ (۱۰ جز) ۷- کتاب علل اوہام الزہری (۲۰ جز) ۸- کتاب علل حدیث مالک (۱۰ جز) ۹- کتاب علل اوہام اصحاب التواریخ (۱۰ جز) ۱۰- کتاب علل مناقب ابی حنیفہ ومثالبہ (۱۰ جز) ۱۱- کتاب علل ما استند الیہ ابوحنیفہ (۱۰ جز) ۱۲- کتاب ما خالف الثوری شعبۃ (۳ جز) ۱۳- کتاب ما انفرد بہ اہل المدینہ من السنن (۱۰ جز) ۱۴- کتاب ما انفرد بہ اہل مکۃ من السنن (۱۰ جز) ۱۵- کتاب ما عند شعبۃ عن قتادہ ولیس عند سعید عن قتادہ (۲۰ جز) ۱۶- کتاب غرائب الاخبار (۲۰ جز) ۱۷- کتاب ما اغرب الکوفیون عن البصریین (۱۰ جز) ۱۸- کتاب ما اغرب البصریون عن الکوفیین (۱۰) ۱۹- کتاب اسامی من یعرف بالکنی (۳ جز) ۲۰- کتاب کنی من یعرف بالاسامی (۳ جز) ۲۱- کتاب الفصل والوصل (۱۰ جز) ۲۲- کتاب التمیز بین حدیث النصر الحدانی والنصر الخزار (۲ جز) ۲۳- کتاب الفصل بین حدیث اشعث بن مالک واشعث بن سوار (۲ جز) ۲۴- کتاب الفصل بین حدیث منصور بن معتمر ومنصور بن زاذان (۳ جز) ۲۵- کتاب الفصل بین مکحول الشامی والازدی (ایک جز) ۲۶- کتاب موقوف مارفع (۱۰ جز) ۲۷- کتاب آداب الرحلۃ (۲ جز) ۲۸- کتاب ما اسند جنادہ عن عبادۃ (ایک جز) ۲۹- کتاب الفصل بین حدیث ثور بن یزید وثور بن زید (ایک جز) ۳۰- کتاب ما جعل عبداللہ بن عمر عبیداللہ بن عمر (۲ جز) ۳۱- کتاب ما جعل شیبان سفیان وسفیان شیبان (۳ جز) ۳۲- کتاب مناقب مالک بن انس (۲ جز) ۳۳- کتاب مناقب الشافعی (۲ جز) ۳۴- کتاب المعجم علی المدن (۱۰ جز) ۳۵- کتاب المقلین من الحجازیین (۱۰ جز) ۳۶- کتاب المقلین من العراقیین (۲۰ جز) ۳۷- کتاب الابواب المفرقۃ (۳۰ جز) ۳۸- کتاب الجمع بین الاخبار المتضادۃ (۲ جز) ۳۹- کتاب وصف العدل والمعدل (۲ جز) ۴۰- کتاب الفصل بین حدثنا واخبرنا

(ایک جز) ۴۱- کتاب وصف العلوم وانواعہا (۳۰ جز) ۴۲- کتاب الحجۃ المبتدئین ۴۳- کتاب حفظ اللسان ۴۴- کتاب مراعات العشرۃ ۴۵- کتاب الثقۃ باللہ ۴۶- کتاب التوکل ۴۷- کتاب مراعاۃ الاخوان ۴۸- الفصل بین الغنی والفقر ۴۹- کتاب السخا والبذل ۵۰- کتاب صفۃ الصلوٰۃ (۱) ۵۱- کتاب شعب الایمان۔ اس موضوع پر امام بیہقی (۴۵۸ھ) کی کتاب زیادہ مشہور ومتداول ہے لیکن ابن حبان کو اولیت اور تقدم کا شرف حاصل ہے۔(۲) ۵۲- روضۃ العقلاء ونزہۃ الفضلاء، اسلام اور عربوں کے اخلاق وآداب پر یہ عمدہ کتاب ہے اس کا ایک حصہ قاہرہ سے ۱۳۲۸ھ میں شائع ہوا تھا، اس میں مصنف نے اپنی متعدد کتابوں کا ذکر اور حوالہ دیا ہے۔(۳) ۵۳- کتاب التاریخ یہ ضخیم کتاب کئی حصوں میں ہے، اس کا پہلا حصہ مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کے کتب خانہ میں موجود تھا اس حصہ میں ام ورقہ تک کے واقعات درج ہیں یہ حصہ ۱۲۹۴ھ کا لکھا ہوا ہے۔(۴)

۵۴- کتاب الہدایۃ الی علم السنن، یہ حدیث وفقہ دونوں کی جامع اور عمدہ تصنیف ہے، اس میں ترجمۃ الباب کے بعد حدیث نقل کرکے اس کے اسناد کے تمام ناموں (صحابہ سے لے کر اپنے شیخ تک) کے عام حالات، فضل وکمال، نسبتوں، کنیتوں، قبائل، اوطان اور سنینِ ولادت ووفات وغیرہ تحریر کیے گئے ہیں، پھر حدیث کی حکیمانہ اور فقہی تشریح کی گئی ہے متضاد ومتعارض حدیثوں میں جمع وتطبیق کی صورتیں اور روایات میں کمی بیشی اور فرق واختلاف کی صراحت بھی کی گئی ہے۔(۵)

۵۵- کتاب الجرح والتعدیل: اس کا نسخہ کتب خانہ ایا صوفیا میں ہے، بعض لوگوں نے اس کو اور کتاب الضعفاء کو جس کا ذکر آگے آرہا ہے، ایک ہی کتاب قرار دیا ہے، اس میں رواۃ کے درجہ ومرتبہ کو واضح کرنے کے لیے وہ تمام اقوال درج کیے گئے ہیں جو ان

(۱) مقدمہ موارد الظمآن ص ۱۵ تا ۱۸ واعلام ج ۳ ص ۸۸۰ (۲) ایضاً ص ۱۵ (۳) ایضاً ص ۱۷ (۴) ایضاً ومعارف اکتوبر ۱۹۲۹ء (۵) معجم البلدان ج ۲ ص ۱۷۵۔

کے ضعف وجرح یا ضبط وعدل کے بارہ میں اصحابِ فن سے منقول ہیں، اس کو کتاب الثقات کا تکملہ بھی بتایا جاتا ہے، عبدالعزیز خولی کا بیان ہے کہ یہ دس جلدوں میں ہے، حافظ ابن حجر کی نظر سے یہ کتاب گذری تھی، لسان المیزان کے مقدمہ میں انھوں نے اس پر نقد بھی کیا ہے۔(۱)

۵۶- کتاب الثقات: یہ رجال کی مبسوط، اہم اور شہرۂ آفاق کتاب ہے، اس کی اہمیت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس کے بعد رجال میں جو کتابیں لکھی گئیں ان سب میں اس کے حوالے ملتے ہیں، اس کی ابتدا میں سنت واتباع سنت کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور مقدمہ میں حدیث کے راویوں کی بتیس ۳۲ قسمیں گنائی گئی ہیں،(۲) اس میں پہلے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا تذکرہ ہے اس کے بعد عام صحابہ، تابعین وتبع تابعین سے لے کر اپنے عہد تک کے علمائے حدیث وروایت کا حروف کی ترتیب کے مطابق ذکر کیا گیا ہے، مصنف نے اس میں صرف ثقات کا ذکر کیا ہے، مگر ان کے نزدیک اس میں قدرے وسعت ہے یعنی جو راوی منکر الحدیث، مجروح اور مدلس نہیں ہے، وہ ثقہ ہے وہ خود فرماتے ہیں:

> ''اس میں صرف انہی ثقات کا ذکر ہے جن کی روایتوں سے احتجاج جائز ہے، جن راویوں کی بعض لوگوں نے تضعیف کی ہے وہ بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں بشرطے کہ وہ میرے معیار کے مطابق ثقہ ہوئے، میں نے اپنے اصول اور معیار کو کتاب الفصل بین النقلیہ میں تحریر کیا ہے جو لوگ اس معیار واصول کے مطابق ضعیف ہیں یا جن کی روایت سے استدلال روا نہیں ہے، میں نے ان کو اس میں شامل نہیں کیا ہے، ان لوگوں کا کتاب الضعفا میں ذکر ہوگا۔''(۳)

کتاب الثقات کے قلمی نسخے حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ اور سعیدیہ اور مکتبہ

---

(۱) مقدمہ موارد الظمآن ص ۱۵ ومفتاح السنۃ ص ۱۵۲ ومقدمہ لسان المیزان ص ۶ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۷۱ وبستان المحدثین ص ۴۰ (۳) فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ ص ۸۱ وتذکرۃ النوادر ص ۹۱۔

ایا صوفیہ اور مکتبہ سندیہ میں موجود ہیں۔(۱)

۵۷- کتاب الضعفاء: یہ بھی رجال کی مشہور اور ضخیم کتاب ہے اور اس کو حروف معجم پر مرتب کیا گیا ہے، صاحب شرح الفیہ لکھتے ہیں کہ اس کے مبسوط مقدمہ میں حدیث کے راویوں کی بیس قسمیں بیان کی گئی ہیں، بعض لوگوں نے اس کو اور کتاب الثقات کو مصنف کی تاریخ کبیر کا خلاصہ بتایا ہے جو طلبہ اور معلمین کی سہولت کے لیے انھوں نے خود علاحدہ تیار کیا تھا۔

کتاب الضعفاء کا مختصر، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں مختصر اسماء المجروحین کے نام سے موجود ہے۔(۲)

۵۸- صحیح ابن حبان: اس کا نام التقاسیم والانواع بھی ہے، یہ پانچ جلدوں میں ہے، اس کو حدیث کی مشہور اور اہم کتاب خیال کیا جاتا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ نے حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں اس کا بھی نام لیا ہے۔(۳) اس کی بعض اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱) صحیح ابن حبان کی سب سے اہم خصوصیت اس کی صحت ہے، صحیح میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ابن خزیمہ کی کتاب کے بعد اسی کا درجہ ہے، بعض محدثین نے اس کو سنن ابن ماجہ سے زیادہ صحیح روایتوں کا مجموعہ بتایا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ صحیحین کے بعد بہتر اور عمدہ مجموعے ابن خزیمہ اور ابن حبان کے ہیں۔

(۲) اس کو نہایت دلچسپ انداز اور نرالے ڈھنگ پر مرتب کیا گیا ہے یعنی فقہی ابواب اور مسانید پر احادیث مرتب کرنے کے مشہور اور مروج طریقوں کے بجائے اس کو اقسام وانواع پر مرتب کیا گیا ہے۔

---

(۱) تذکرۃ النوادر ص ۹۱ (۲) ایضاً و کشف الظنون ج ۲ ص ۸۴ و فہرست کتب خانہ آصفیہ ج ۱ ص ۷۸۸ و ۷۸۹ (۳) حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱۔

(۳) ہر حدیث کے آخر میں رجال واسناد کی تحقیق، حدیث کے مفہوم کی تعیین ووضاحت اور اسناد ومتون کی فنی بحثیں اور دوسرے مفید ولطیف معلومات بیان کئے گئے ہیں۔

(۴) کتاب کے عنوانات سے ابن حبان کی فقہی بصیرت، عالمانہ ژرف نگاہی اور سنت واثر سے مکمل واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔(۱)

مختصرات وزوائد: صحیح ابن حبان کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس کی جانب اعتنا کیا گیا اور اس کے زوائد، اطراف، حواشی اور مختصرات ترتیب دیئے گئے۔

۱- انواع واقسام پر مرتب کئے جانے کی وجہ سے اس سے استفادہ مشکل اور دشوار تھا اس لیے امیر علاء الدین ابوالحسن علی فارسی (م ۷۳۷ھ) نے اس کو فقہی ابواب پر ''الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان'' کے نام سے مرتب کیا، اس میں اصل کی تمام خصوصیات کو برقرار رکھا گیا ہے اس کی پہلی جلد احمد محمد شاکر مرحوم کی تصحیح، تعلیقات اور مقدمہ کے ساتھ دارالمعارف قاہرہ سے بڑے اہتمام کے ساتھ دیدہ زیب ٹائپ اور عمدہ کاغذ پر ۳۱۵ صفحے میں شائع ہوئی ہے۔(۲)

۲- حافظ ابن حجر نے اس پر مفید حواشی لکھے تھے۔(۳)

۳- ابوالفضل عراقی نے اس کے اطراف لکھے۔

۴- سراج الدین عمر بن علی معروف بابن ملقن (۸۰۴ھ) نے اس کو مختصر ابواب پر مرتب کیا۔

۵- ابوالحسن نورالدین ہیثمی نے موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان کے نام سے

---

(۱) اعلام ج ۳ ص ۸۸۰، شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۶، الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۹ ومقدمہ موارد الظمآن ص ۱۳ و ۱۴ (۲) مقدمہ موارد الظمآن ص ۱۴ (۳) مقدمہ تحفۃ الاحوذی، از مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوری ص ۱۶۳۔

اس کے زوائد لکھے، اس میں ان حدیثوں کو جمع کیا گیا ہے جو صحیحین میں نہیں ہیں اس کا نسخہ مدینہ کے کتب خانہ میں تھا، اس کی مدد سے دارالحدیث مکہ کے مدیر شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ نے اس کو ایڈٹ کر کے مطبعہ سلفیہ سے شائع کیا ہے، اس کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے، ہیثمی نے صحیحین کی بعض روایتوں سے اس کی عدم مطابقت وفرق اور حواشی میں حدیث کی بعض اور کتابوں سے اس کی روایتوں کی مطابقت دکھائی ہے اور کہیں کہیں راویوں کے ناموں کی تصحیح کی ہے۔

صحیح ابن حبان کے نسخے متعدد کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں اس کی ایک جلد مدینہ منورہ کے کتب خانہ محمودیہ میں بھی ہے، اس پر حافظ ابن حجر کے حواشی بھی ہیں۔(۱)

ایک شبہ کا جواب: اوپر جرح میں ابن حبان کے تشدد اور تعدیل میں نرمی کا ذکر کیا جا چکا ہے اسی بنا پر ان پر تساہل کا الزام عائد کیا گیا ہے، مگر یہ مطلق صورت میں قابل تسلیم نہیں ہے، اس لیے اس کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس شبہ اور الزام کی بنیاد ممتاز محدث علامہ نووی کے اس قول پر ہے:

یقارب صحیح الحاکم فی حکمه صحیح ابی حاتم بن حبان.(۲)	قریب قریب صحیح حاکم ہی کے حکم میں ابو حاتم ابن حبان کی صحیح بھی ہے۔

عام محدثین کے نزدیک حاکم کا تساہل مشہور ہے اس لیے نووی کے اس بیان سے خیال ہوتا ہے کہ ابن حبان کے یہاں بھی اسی قسم کا تساہل پایا جاتا ہے جس کے لیے حاکم کو شہرت ہے لیکن ارباب فن نے اس قول کی وضاحت میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس شبہہ کی تردید ہو جاتی ہے علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

''اس بیان سے بظاہر حاکم کی کتاب کی ترجیح معلوم ہوتی ہے مگر ایسا

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۲۳ (۲) تدریب الراوی ص ۳۱و۳۲۔

واقعہ نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد حاکم کے تساہل میں ابن حبان کی قربت ومماثلت کا اظہار ہے ابن حبان کی جانب اس کی نسبت اس لیے صحیح نہیں ہے کہ وہ صرف حسن کو صحیح سے موسوم کر دیتے ہیں باقی جن شرطوں کو انھوں نے بیان کیا ہے ان کا پوری طرح لحاظ رکھا ہے اور حاکم کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔"(۱)

حافظ ابن حجر رقمطراز ہیں:

"حاکم کے مقابلہ میں ان کا تساہل کم درجے کا ہے۔"

حازمی کا بیان ہے کہ:

"حاکم سے زیادہ ان کو حدیثوں میں درخور حاصل ہے، اگر ان کی جانب تساہل کی نسبت اس وجہ سے کی گئی ہے کہ ان کی کتاب میں حسن روایتیں موجود ہیں تو یہ بجا ہے کیوں کہ انھوں نے اس کو صحیح کے نام سے موسوم کیا ہے لیکن اگر اس سے شرطوں میں تخفیف وتساہل کی جانب اشارہ مقصود ہے تو یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ وہ اپنی صحیح میں انھیں ثقات اور غیر مدلس اشخاص کی حدیثیں بیان کرتے ہیں جنھوں نے اپنے شیوخ سے ان کو اور ان سے روایت کرنے والوں نے ان سے ان کا سماع کیا ہو اور ان میں کسی قسم کا ارسال وانقطاع نہ ہو حقیقت یہ ہے کہ رواۃ کی ثقاہت کے متعلق ان کا ایک خاص نظریہ ہے، اسی کے مطابق کتاب الثقات مرتب کی گئی ہے لیکن اس اصول سے ناواقفیت کی بنا پر ان پر اعتراض کیا جاتا ہے۔"(۲)

---

(۱) تدریب الراوی ص ۱۳۱و۱۳۲ (۲) مقدمہ موارد الظمآن ص ۱۴۔

امام ابوبکر آجری

(متوفی ۳۶۰ھ مطابق ۹۷۰ء)

نام ونسب: محمد نام، ابوبکر کنیت اور سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن حسین بن عبداللہ۔ (۱)

ولادت ووطن: وہ بغداد میں پیدا ہوئے، سنہ پیدائش کا مورخین نے ذکر نہیں کیا ہے، آجری کی نسبت سے زیادہ مشہور ہیں، انساب کے ماہر علامہ سمعانی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیشہ کی جانب نسبت ہے، یعنی وہ اینٹیں بناتے اوران کو فروخت کرتے تھے۔ (۲) لیکن علامہ ابن خلکان نے اس نسبت کے سبب سے لاعلمی ظاہر کی ہے اور کتاب الصلہ کے حاشیہ کے حوالہ سے یہ تحریر فرمایا ہے کہ آجر بغداد کے ایک گاؤں کا نام تھا اور یہ اسی کی جانب نسبت ہے۔ (۳)

آخر عمر میں مکہ معظمہ میں آباد ہو گئے تھے اور ۳۰ سال تک جوار بیت اللہ میں رہ کر حج بیت اللہ کو آنے والوں اور بلاد مغرب کے لوگوں کی تشنگی علم بجھاتے رہے، ابن خلکان اور ابن جوزی وغیرہ نے لکھا ہے کہ آجری جب مکہ معظمہ تشریف لائے تو یہ شہر انھیں بہت پسند آیا اورانھوں نے اللہ تعالیٰ سے اس میں ایک سال تک قیام کرنے کی دعا کی، ہاتف غیب نے صدا دی کہ ابوبکر ایک ہی سال کی تمنا کیوں کرتے ہو تم کو تیس سال تک یہاں قیام کرنے کا

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۸ (۲) کتاب الانساب ورق ۱۴ (۳) وفیات الاعیان ج ۳ ص ۲۹۱۔

موقع ملے گا، چنانچہ ان کی حیات مستعار کے بقیہ دن یہیں گزرے اور ۳۰ سال کے بعد جب داعی اجل کا پیام آیا تو وہ اسی کی خاک میں پیوند کیے گئے۔(۱)

اساتذہ وشیوخ: ابوبکر آجری کے بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہے:

ابوشعیب حرانی، ابومسلم ابراہیم بن عبداللہ کجی، احمد بن حسن بن عبدالجبار صوفی، احمد بن عمر بن زنجویہ قطان، احمد بن یحییٰ حلوانی، جعفر بن محمد فریادی، خلف بن عمرو عکبری، قاسم بن زکریا مطرز، مفضل بن محمد جندی، ہارون بن یوسف بن زیاد۔(۲)

تلامذہ: بعض مشہور شاگردوں کے نام حسب ذیل ہیں:

حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی، عبدالرحمٰن بن عمر بن نحاس، ابوالحسن علی بن محمد عبداللہ بشران سکری، ابوالحسن علی بن احمد بن عمر حمامی مقری، (ان کے بھائی) ابوالقاسم عبدالملک محمد بن حسین بن فضل قطان، محمود بن عمرو عکبری۔(۳)

حفظ وضبط اور حدیث میں درجہ: مورخین اور علمائے فن نے بالاتفاق ان کی توثیق کی ہے اور حدیث میں ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے، حافظ ذہبی ان کو ''الامام المحدث القدوہ'' لکھتے ہیں، علامہ ابن اثیر کا بیان ہے کہ ''طبرانی اور آجری کبارِ محدثین وحفاظ میں تھے'' خطیب، ابن جوزی اور ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''وہ ثقہ تھے'' علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ''آجری ثقہ وصدوق تھے'' حافظ ذہبی اور ابن عماد کہتے ہیں کہ وہ ثقہ وضابط محدث اور صاحب سنت تھے۔''(۴)

فقہ: فقہ واجتہاد میں بھی آجری کا درجہ بلند تھا اور وہ الفقیہ کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، اس فن میں کئی کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں۔

تدین وتقویٰ: علم وفضل کی طرح زہد وتقویٰ بھی ان کا شعار تھا، ابن ندیم کا بیان ہے کہ ''وہ

(۱) وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۹۱ وصفۃ الصفوہ ج ۲ ص ۲۶۶ (۲) تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۴۳ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۸ (۳) ایضاً وکامل ابن الاثیر ص ۲۰۴ (۴) العبر ج ۲ ص ۲۱۸۔

صلحائے عباد میں تھے۔" حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ "وہ عالم باعمل، صاحب سنت اور متبع شریعت تھے۔" مورخ خطیب اور علامہ سمعانی وغیرہ نے بھی ان کے صلاح وتدین کا اعتراف کیا ہے۔(۱)

فقہی مسلک: گو ان کے شافعی المذہب ہونے پر اتفاق ہے چنانچہ ابن ندیم لکھتے ہیں وکان علی مذهب الشافعی (وہ امام شافعی کے مسلک فقہ سے وابستہ تھے) لیکن ابن عماد حنبلی کا بیان ہے کہ:

کان حنبليا وقيل شافعيا	آجری حنبلی تھے مگر یہ بھی کہا گیا ہے کہ
وبه جزم الاسنوی وابن	وہ شافعی تھے اور اسنوی وابن اہدل نے
الاهدل۔ (۲)	اسی کو قطعی بتایا ہے۔

وفات: یکم محرم الحرام ۳۶۰ھ کو مکہ معظمہ میں وفات ہوئی اور یہیں سپرد خاک کیے گئے۔(۳)

تصنیفات: امام ابوبکر آجری کثیر التصانیف تھے، فقہ، حدیث اور زہد ورقاق وغیرہ میں انھوں نے متعدد کتابیں لکھی تھیں مگر اب وہ سب نایاب اور معدوم ہیں جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

۱- کتاب احکام النساء، ۲- کتاب مختصر الفقه، ۳- کتاب النصیحة: یہ تینوں کتابیں فقہ میں ہیں، ابن ندیم نے ان کا ذکر کیا ہے، ۴- کتاب الشریعة: یہ سنت وحدیث میں تھی، حاجی خلیفہ نے اس کا نام لکھا ہے۔

۵- کتاب الاربعین: یہ امام صاحب کی سب سے مشہور تصنیف ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب کتب حدیث کے طبقات واقسام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱) الفہرست ص ۳۰۱ و ۳۰۲، تذکرۃ ج ۳ ص ۱۴۸ انساب ورق ۱۴۔ (۲) الفہرست ص ۳۰۲ وشذرات الذہب ج ۳ ص ۳۵ (۳) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۹۱ وتاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۴۳۔

''اربعینیات میں چالیس حدیثیں ایک باب یا مختلف ابواب میں ایک سند یا متعدد سندوں سے جمع کی جاتی ہیں، اربعینیات بیشمار ہیں۔''(۴)

حاجی خلیفہ لکھتے ہیں کہ ''اربعینیات کی جمع وتالیف کے اغراض ومقاصد مختلف ہیں چنانچہ بعض میں توحید واثباتِ صفات، بعض میں احکام وعبادات، بعض میں مواعظ ورقاق اور بعض میں فضائل ومناقب کے متعلق روایتیں درج ہوتی ہیں، اربعینیات کے بعض مجموعے صحیح الاسناد اور طعن وقدح سے خالی اور بعض نہایت عالی سندوں اور طویل متن والی حدیثوں پر مشتمل ہیں۔''(۱)

ابن سبکی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آجری کی اربعین کی سندیں عالی اور بلند تھیں، حاجی خلیفہ اور دوسرے اصحابِ فہارس نے اس موضوع کی اکثر کتابوں کے نام لکھے ہیں، اس فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ اربعینیات میں سب سے قدیم مجموعہ یہی ہے (۲) گو اس کو نووی وغیرہ کی اربعین جیسی شہرت نہیں ملی تاہم قدامت اور اسناد کی قوت کے اعتبار سے اس کی اہمیت مسلم ہے۔

☆☆☆

(۴) بستان المحدثین۔ (۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۶۷ واتحاف النبلاء المتقین ص ۷ (۲) ایضاً وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۵۰۔

امام ابوالقاسم طبرانی

(متوفی ۳۶۰ھ)

نام ونسب: سلیمان نام، ابوالقاسم کنیت اور سلسلہ نسب یہ ہے: سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر۔

ولادت: امام ابوالقاسم ماہ صفر ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔(۱)

خاندان: ان کا قبیلہ لخم سے نسبی تعلق تھا، اس لیے لخمی کہلاتے تھے، لخم دراصل یمن کا ایک قبیلہ ہے، اس کی ایک شاخ شام میں آباد ہوگئی تھی، اس قبیلہ سے متعدد نامور لوگ منسوب ہیں، امام صاحب کے والدِ بزرگوار کو علم وفن سے بڑی دلچسپی تھی، اس لیے وہ اپنے فرزند کو بھی علم کی تحصیل وتکمیل کی تلقین کرتے رہتے تھے۔

وطن: ان کا اصلی وطن طبریہ ہے مگر آخر عمر میں انھوں نے اصبہان میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، طبریہ اردن کے قریب واقع ہے ۱۳ھ میں شرحبیل بن حسنہ نے اس کو اسلامی سلطنت کے زیر نگیں کیا تھا، اس کی نسبت سے وہ طبرانی کہلاتے ہیں، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ عکا میں پیدا ہوئے یہاں سے طبریہ کی مسافت دوروز میں طے ہوتی تھی۔(۲)

اساتذہ: امام طبرانی نے ایک ہزار سے زیادہ باکمال محدثین سے استفادہ کیا تھا، بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن ابی سفیان قیسرانی، ابراہیم بن محمد بن عرق حمصی، ابراہیم بن موید

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۹۵ و ۳۶۶، ابن خلکان ج ۱ ص ۳۸۳، کتاب المنتظم ج ۷ ص ۵۴ ومعجم البلدان ج ۶ ص ۲۳ تا ۲۵۔

شیبانی، ابوزرعہ دمشقی، ابوعبدالرحمٰن نسائی، ابومسلم کجی، احمد بن انس، احمد بن عبدالرحیم حوطی، احمد بن عبدالقاہر، احمد بن معلیٰ، احمد بن یحییٰ، ادریس بن جعفر عطاء، اسحاق بن ابراہیم دبری، ابوعلی اسماعیل بن محمد بن قیراط، بشر بن موسیٰ، حسن بن سہل، حسن بن عبدالاعلیٰ بوسی، حفص بن عمر، عبداللہ بن محمد بن سعید بن ابی مریم، علی بن عبدالعزیز بغوی، ابوخلیفہ فضل بن حباب جمحی ابوسعید بن ہاشم بن مرثد طبرانی اور یحییٰ بن ایوب علاف وغیرہ۔(۱)

تلامذہ: ان کے تلامذہ و منتسبین کی تعداد بھی بے شمار ہے اوران سے استفادہ کرنے والوں میں ان کے بعض شیوخ بھی شامل ہیں، بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابن عقدہ، ابوبکر بن زبدہ، ابوبکر بن مردویہ، ابواحمد بن عبداللہ بن عدی جرجانی، ابوالحسن بن قادیہ، ابوعمر محمد بن حسین بسطامی، حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ، احمد بن محمد صحاف، حسین بن احمد بن مرزبان، عبدالرحمٰن بن احمد صفا، ابوبکر عبدالرحمٰن بن علی ذکوانی، ابوالفضل محمد بن احمد جارودی، ابوعمر محمد بن حسین بسطامی، محمد بن عبیداللہ بن شہریار۔

امام طبرانی کے حلقہ فیض سے دو صاحب کمال وزرا بھی وابستہ تھے، ان میں ابن عمید لغت وعربیت اور شعر وادب میں سرآمد روزگار تھا، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دیلمی حکومت میں اس لیاقت وقابلیت کا کوئی اور وزیر نہیں گذرا اور دوسرا وزیر صاحب بن عباد بھی ممتاز ادیب وانشا پرداز اور امام طبرانی کا شاگرد اور تربیت یافتہ تھا۔(۲)

تحصیل علم کے لیے سفر: امام طبرانی ۲۷۳ھ میں علم وفن کی تحصیل میں مشغول ہوئے تھے، اس وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی، پہلے انھوں نے اپنے وطن طبریہ کے اصحابِ کمال سے استفادہ کیا، ۲۷۴ھ میں قدس اور ۲۷۵ھ میں قیساریہ تشریف لے گئے، اس کے بعد انھوں نے دوسرے اسلامی ملکوں اہم مقامات اور مشہور مراکز حدیث کا رخ کیا اور حمص، جبلہ،

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶ وغیرہ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۷ وبستان المحدثین ص ۵۵ وکتاب الانساب ورق ۳۶۶۔

مدائن، شام، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، یمن، مصر بغداد، کوفہ، بصرہ، جزیرہ، فارس اور اصبہان وغیرہ تشریف لے گئے، اصبہان کی مرکزیت کی وجہ سے یہیں بود و باش بھی اختیار کر لی تھی، علم کی تلاش و جستجو اور احادیث کی تحصیل میں ان کو سخت مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کے ذوق و شوق اور سرگرمی و انہماک میں کبھی کمی نہیں آئی شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

> ''۳۰ سال تک ان کو بستر پر سونا نصیب نہ ہوا مگر وہ آرام و آسائش کا خیال کئے بغیر حدیث کی تحصیل میں مشغول اور بوریا پر سوتے رہے۔''(۱)

حفظ وثقاہت: حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان میں ان کا مرتبہ بلند تھا، ان کے معاصرین فضلا اور ارباب کمال محدثین نے ان کے حافظہ اور ثقاہت کا اعتراف کیا ہے، علمائے سیر وتراجم نے ان کو الحافظ الکبیر، احد الحفاظ، الحافظ العلم، واسع الحفظ، الحجة اور من الثقات الاثبات المعدلین وغیرہ لکھا ہے، ابراہیم بن محمد بن حمزہ کا بیان ہے کہ ''میں نے ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں دیکھا۔'' ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ''وہ اپنے عہد کے ممتاز حافظ تھے'' علامہ ابن جوزی رقمطراز ہیں کہ ''امام سلیمان کا حافظہ نہایت قوی تھا، صاحب بن عباد ان کے حافظہ کی قوت اور یادداشت کی زیادتی کے معترف تھے۔'' ان کے صدق وثقاہت کے بارے میں بھی علمائے فن کا اتفاق ہے، حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ وہ ضبط وثقاہت اور صدق وامانت کے ساتھ بڑے عظیم رتبہ اور شان کے محدث تھے، احمد بن منصور اور ابن ناصر الدین کہتے ہیں کہ ''وہ ثقہ تھے'' علامہ ابن حجر نے ان کو ثابت وضابط لکھا ہے، یافعی اور ابن عماد تحریر فرماتے ہیں کہ طبرانی ثقہ وصدوق اور حدیثوں کے علل، رجال وابواب کے اچھے واقف کار تھے۔(۲)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۷ وبستان المحدثین ص ۵۵ وکتاب الانساب ورق ۳۶۶ والعبر ج ۲ ص ۳۱۶ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶ و ۱۳۰، لسان المیزان ج ۳ ص ۷۳، مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۳۷۲ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۳۰۔

حدیث میں درجہ: امام طبرانی علم وفضل کے جامع اور فن حدیث میں نہایت ممتاز تھے، علامہ ذہبی نے انھیں ''الامام العلامہ اور مسند الدنیا'' اور یافعی وابن عماد نے ''مسند العصر'' لکھا ہے، ابن ناصر الدین کہتے ہیں کہ وہ مسند الآفاق تھے، ایک دفعہ ابن عقدہ سے ایک اصبہانی شخص نے کوئی مسئلہ دریافت کیا، انھوں نے پوچھا کہ تم نے سلیمان بن احمد لخمی سے سماع کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں ان سے واقف نہیں، ابن عقدہ نے حیرت سے سبحان اللہ کہا اور فرمایا کہ ان کے ہوتے ہوئے تم لوگ ان سے حدیثیں نہیں سنتے اور ہم لوگوں کو خواہ مخواہ دق کرتے ہو میں نے طبرانی کا کوئی مثیل اور نظیر نہیں دیکھا، ابوبکر بن علی کا بیان ہے کہ وہ بڑے وسیع العلم تھے، حدیث میں ان کی وسعت نظر اور کمال کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد بن منصور شیرازی نے ان سے تین لاکھ حدیثیں لکھی تھیں، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ حدیث کی کثرت اور علوے اسناد میں ان کی ذات نہایت ممتاز تھی اور حدیث میں ان کی بالغ نظری کا پوری دنیائے اسلام میں چرچا تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ حدیث میں وسعت اور کثرتِ روایت میں وہ یکتا اور منفرد تھے۔ (۱)

فقہی مذہب: قیاس ہے کہ امام طبرانی کا فقہی مسلک وہی رہا ہوگا جو محدثین اور ائمہ سنت کا ہے، مولانا عبدالحلیم چشتی نے انھیں شافعی بتایا ہے۔ (۲)

ابوبکر چغابی سے ایک دلچسپ مناظرہ: امام طبرانی کے علم وفضل اور حدیث میں عظمت وکمال کا اندازہ اس مناظرہ سے بھی ہوتا ہے جو ان کے اور ابوبکر چغابی کے درمیان ہوا تھا، صاحب بن عباد بیان کرتے ہیں۔

مجھے دنیا میں وزارت سے زیادہ کوئی چیز مرغوب اور عزیز نہ تھی اور میں اس سے زیادہ کسی منصب کو اعلیٰ اور برتر نہیں خیال کرتا تھا، کیوں کہ اسی کی بدولت مجھے ہر طرح کا اعزاز اور ہر ہر طبقے میں مقبولیت حاصل تھی لیکن ایک روز میرے سامنے مشہور محدث ابوبکر

---

(۱) ایضاً وبستان المحدثین ص۵۴ (۲) فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ ص۱۸۰۔

جغابی اور ابوالقاسم طبرانی میں حدیث کے بارے میں ایک مباحثہ ہوا، حفظ وضبط میں طبرانی اور ذہانت وفطانت میں جغابی فائق معلوم ہوتے تھے، یہ مباحثہ دیر تک ہوتا رہا، دونوں طرف سے بڑے جوش وخروش کا اظہار اور پرزور آوازیں بلند ہورہی تھیں، اسی اثنا میں جغابی نے کہا میرے پاس ایک حدیث ایسی ہے جو اور کسی کو معلوم نہیں، طبرانی نے اسے بیان کرنے کے لیے کہا تو انھوں نے فرمایا:

حدثنا ابو خليفة قال حدثنا	ہم سے ابوخلیفہ نے حدیث بیان کی
سليمان بن ايوب ابوالقاسم	انھوں نے کہا ہم سے سلیمان بن
....	ایوب ابوالقاسم نے روایت کی......

طبرانی نے کہا حضرت! سلیمان بن ایوب تو میں ہی ہوں اور ابوخلیفہ میرے شاگرد ہیں اگر آپ اس حدیث کو میرے واسطہ سے بیان کریں تو آپ کی سند زیادہ عالی ہوگی، اس سے بے چارے ابوبکر جغابی بہت نادم ہوئے، ان کی ندامت اور طبرانی کی فتح ومسرت دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ کاش میں طبرانی ہوتا تو آج وہی سرور وانبساط اور غلبہ وکامرانی جو انھیں حاصل ہوئی ہے، مجھے حاصل ہوتی، یہ منظر دیکھ کر میرے دل سے وزارت کی اہمیت جاتی رہی کیوں کہ علم وفضل کی بدولت اس سے کہیں بڑھ کر اعزاز واکرام اور جاہ ومرتبہ حاصل ہوتا ہے۔(۱)

بعض مورخین نے صاحب بن عباد کے بجائے ابن عمید کی نسبت سے یہ واقعہ تحریر کیا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز نے اس پر کتنا دلچسپ اور بہتر تبصرہ فرمایا ہے وہ لکھتے ہیں:

ایں تمنا وآرزوے ہم از بقائے	صاحب بن عباد کا اس قسم کی آرزو وتمنا
وزارت وریاست او بود والا علمائے	کرنا درحقیقت وزارت وریاست ہی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۹۔

ربانیین را بسبب ایں غلبہ ہائے تغیرے نمی شود ونفس ایشاں بحرکت نمی آید ولکن المرء یقیس علی نفسہ۔ ....(۱)

کے اثر کا نتیجہ تھا، ورنہ علمائے ربانی کے اندر اس طرح کی فتح وکامرانی کے بعد بھی کوئی عجیب تبدیلی نہیں آتی اور نہ ان کی طبیعتیں اس قسم کے واقعات سے متاثر ہوتی ہیں مگر آدمی دوسروں کو بھی اپنے ہی اوپر قیاس کرتا ہے۔

دینی غیرت وحمیت: امام طبرانی میں بڑی دینی غیرت وحمیت تھی، ابن جوزی کا بیان ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں نہایت سخت تھے،(۲) ان کو صحابہ کرام سے غیر معمولی محبت وعقیدت تھی، اس لیے ان کی کوئی مذمت اور تنقیص گوارا نہیں کرتے تھے، بعض مصنفین کا بیان ہے کہ وہ پہلی دفعہ اصبہان تشریف لے گئے تو ابو علی زینم نے جو زکوۃ وخراج کا عامل تھا، ان کی بڑی آؤ بھگت کی امام صاحب اس کے یہاں برابر تشریف لے جاتے تھے، اس کی وفات کے بعد اس کے لڑکے نے امام صاحب کے لیے پانچ سو درہم ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا لیکن جب اس نے حضرت ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما کے بارہ میں مخالفانہ رویہ اختیار کیا تو امام طبرانی اس سے سخت آزردہ ہو گئے یہاں تک کہ اس کے یہاں آمد ورفت بھی بند کر دی۔(۳)

اس زمانہ میں قرامطہ اور فرقۂ اسماعیلیہ کا بڑا زور واثر تھا، یہ لوگ محدثین سے بڑی کدورت اور سخت عناد رکھتے تھے، ان لوگوں نے امام صاحب کی دینی معاملات میں شدت پسندی کی وجہ سے ان پر سحر کر دیا تھا، اس کی وجہ سے ان کی آنکھوں کی بصارت ختم ہو گئی تھی۔(۴)

---

(۱) بستان المحدثین ص۵۵ (۲) المنتظم ج۷ ص۵۴ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج۳ ص۱۲۸، ۱۲۹ (۴) بستان المحدثین ص۵۴۔

وفات: امام طبرانی نے بروز شنبہ ۲۸/ ذوقعدہ ۳۶۰ھ کو سو سال کی عمر میں انتقال کیا اور ایک صحابی حضرت حمد وسی کے مزار کے پہلو میں دفن کئے گئے، حافظ ابونعیم اصبہانی نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔(۱)

تصنیفات: امام طبرانی کثیر التصانیف تھے لیکن قدیم مصنفین کی طرح ان کی بھی اکثر کتابیں محفوظ نہیں، ذیل میں ان کی تصنیفات کے نام اور بعض کے متعلق مختصر معلومات درج ہیں۔

۱- کتاب الاوائل، ۲- کتاب التفسیر، ۳- کتاب المناسک، ۴- کتاب عشرۃ النساء، ۵- کتاب السنۃ، ۶- کتاب الطوالات، ۷- کتاب النوادر، ۸- کتاب دلائل النبوۃ، ۹- کتاب مسند شعبہ، ۱۰- کتاب مسند سفیان، ۱۱- کتاب حدیث الشامیین، ۱۲- کتاب الرمی، ۱۳- مسند العشرۃ، ۱۴- معرفۃ الصحابہ، ۱۵- فوائد معرفۃ الصحابہ، ۱۶- مسند ابی ہریرۃؓ، ۱۷- مسند عائشہؓ ۱۸- حدیث الاعمش، ۱۹- حدیث الاوزاعی، ۲۰- حدیث شیبان، ۲۱- حدیث ایوب، ۲۲- مسند ابی ذرؓ، ۲۳- کتاب الرؤیۃ، ۲۴- کتاب الجود، ۲۵- العلم الالویہ، ۲۶- فضل رمضان، ۲۷- کتاب الفرائض، ۲۸- کتاب الرد علی المعتزلہ، ۲۹- کتاب الرد علی الجہمیۃ، ۳۰- مکارم اخلاق العزاء، ۳۱- الصلوٰۃ علی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، ۳۲- کتاب المامون، ۳۳- کتاب الغسل، ۳۴- کتاب فضل العلم، ۳۵- کتاب ذم الرای، ۳۶- کتاب تفسیر الحسن، ۳۷- کتاب الزہری عن انس، ۳۸- کتاب ابن المنکدر عن جابر، ۳۹- مسند ابی اسحاق السبیعی، ۴۰- حدیث یحییٰ بن کثیر، ۴۱- حدیث مالک بن دینار، ۴۲- کتاب ماروی الحسن عن انس، ۴۳- حدیث ربیعہ، ۴۴- حدیث حمزۃ الزیات، ۴۵- حدیث مسعر، ۴۶- حدیث ابی سعد البقال، ۴۷- طرق حدیث من کذب علی، ۴۸- کتاب النوح، ۴۹- مسند ابی جحادہ، ۵۰- کتاب من اسمہ عطاء، ۵۱- کتاب من اسمہ شعبہ، ۵۲- کتاب اخبار عمر بن عبدالعزیزؒ، ۵۳- کتاب اخبار عبدالعزیز بن رفیع، ۵۴- مسند

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۰ و ابن خلکان ج ۱ ص ۳۸۳ و المنتظم ج ۷ ص ۵۴۔

روح ابن القاسم، ۵۵-کتاب فضل عکرمہ، ۵۶-کتاب امہات النبی، ۵۷-مسند عمارۃ بن غزیہ، ۵۸-مسند طلحہ بن مسرف و جماعۃ، ۵۹-مسند العبادلہ، ۶۰-احادیث ابی عمرو بن العلاء، ۶۱-کتاب غرائب مالک، ۶۲-جز وابان بن تغلب، ۶۳-جزء حریث ابن ابی مطر، ۶۴-وصیۃ ابی ہریرۃؓ، ۶۵-مسند الحارث العکلی، ۶۶-فضائل الاربعۃ الراشدین، ۶۷-مسند ابن عجلان، ۶۸-کتاب الاشربۃ، ۶۹-کتاب الطہارۃ، ۷۰-کتاب الامارۃ، ۷۱-مسند ابی ایوب الافریقی، ۷۲-مسند زیاد الجصاص، ۷۳-مسند زافر، ۷۴-حدیث شعبہ، ۷۵-کتاب من اسمہ عباد۔(۱)

۷۶-کتاب الدعا: یہ طبرانی کی مشہور اور ضخیم کتاب ہے، اس کی اہمیت و استناد اور ترتیب کی خوبی کا اندازہ ان کے اس بیان سے پوری طرح ہو جاتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''میری یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا مجموعہ ہے، چوں کہ میں نے دیکھا کہ اکثر لوگوں نے ان دعاؤں کو اختیار کر لیا ہے جو مسجع عبارتوں میں اور روزمرہ کے لیے وضع کی گئی ہیں، اور ان کو وراقوں (واعظین) نے جمع کیا ہے، یہ خود آنحضور صلعم یا کسی صحابی اور تابعی سے مروی نہیں ہیں بلکہ آپ سے دعا میں سجع قافیہ بندی اور تعدی کی کراہت وارد ہے، اس لیے میں نے یہ کتاب تالیف کی جو ان دعاؤں پر مشتمل ہے جن کی سندیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، اس میں پہلے دعا کے فضائل وآداب بیان کیے گئے ہیں، پھر آپ جس حال میں جو دعائیں کرتے تھے ان کو علاحدہ علاحدہ ابواب میں درج کیا گیا ہے، اس کے آخری باب میں آیت کریمہ (ادعونی استجب لکم) کی تفسیر کی گئی ہے۔''(۲)

---

(۱) ان رسائل کا ذکر متفرق کتابوں میں ملتا ہے، مولانا عبدالحلیم چشتی نے عجالۂ نافعہ کے فوائد میں ان کو جمع کر دیا ہے۔(ص ۸۰ و ۸۱) (۲) بستان المحدثین ص ۵۴۔

معاجم ثلاثہ: امام طبرانی نے معجم میں تین کتابیں لکھیں، یہ ان کی مشہور اور اہم اور حدیث کی بلند پایہ کتابیں سمجھی جاتی ہیں، شاہ ولی اللہ دہلوی نے ان کو حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں شامل کیا ہے، ان کی بدولت امام طبرانی کو لازوال شہرت ملی۔

معجم کی تعریف: محدثین کی اصطلاح میں ان کتابوں کو معجم کہا جاتا ہے جن میں شیوخ کی ترتیب پر حدیثیں درج کی گئی ہیں، اس طرح کی بعض کتابوں میں شیوخ کی وفات اور بعض میں ان کے علم وتقویٰ کے تقدم کا لحاظ کیا گیا ہے لیکن عموماً حروف تہجی کی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے، شیوخ کے بجائے صحابہ یا بلاد وامصار کی ترتیب پر بھی معاجم مرتب کیے گئے ہیں۔

۷۷- معجم کبیر: یہ دراصل مسند ہے کیوں کہ اس میں صحابہ کی ترتیب پر ان کے مرویات شامل کیے گئے ہیں لیکن اس کی شہرت معجم کے نام سے ہوئی، مشہور اور کثیر الروایت صحابی حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیثیں اس میں شامل نہیں ہیں، طبرانی ان کے مرویات کو علاحدہ ایک کتاب میں جمع کرنا چاہتے تھے لیکن یا تو وہ اسے مرتب نہیں کر سکے یا مرتب کیا تو اس کی شہرت نہیں ہو سکی، ابن عابدین کا بیان ہے کہ یہ بارہ جلدوں میں ہے اور اس میں ساٹھ ہزار حدیثیں شامل ہیں، ابن دحیہ کا بیان ہے کہ کتب معاجم میں سب سے بڑی یہی ہے اور جب محدثین مطلق معجم کہتے ہیں تو ان کی مراد اسی کتاب سے ہوتی ہے لیکن محدثین میں اس کے زیادہ متداول نہ ہونے کی وجہ سے امیر علاء الدین علی بلبن (م ۷۳۱ھ) نے اس کی از سر نو تہذیب وترتیب کی تھی، حافظ ابوالحسن ہیثمی نے اس کے ان مرویات کو جو صحاح میں نہیں ہیں، تین جلدوں میں جمع کیا تھا، مکتبہ شرقیہ دار العلوم پشاور میں اس کا نسخہ موجود ہے۔(۱)

۷۸- معجم اوسط: اس کو شیوخ کے ناموں پر مرتب کیا گیا ہے، اس میں طبرانی نے اپنے تقریباً ایک ہزار شیوخ کے افراد وغرائب جمع کیے ہیں، محدثین کے نزدیک افراد وغرائب

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۶۵ وبستان المحدثین ص ۵۳ والرسالہ المستطرفہ ص ۱۱۲ وفہرست مکتبہ شرقیہ دار العلوم پشاور ص ۴۷۔

ان حدیثوں کو کہا جاتا ہے جو ایک ہی شیخ کے پاس ہوں اور دوسرے شیوخ ان سے واقف نہ ہوں، یہی وجہ ہے کہ اس مجموعہ میں نفیس، عزیز اور منکر ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں لیکن اس کی ترتیب وتالیف میں امام طبرانی نے بڑی کاوش سے کام لیا تھا، ان کو خود بھی یہ کتاب بہت زیادہ عزیز تھی، اس سے حدیث میں ان کی فضیلت وکمال اور کثرت واقفیت کا پتہ چلتا ہے، اس کے باب میں تفرد ثقہ کا ذکر ہے۔

یہ چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، ابوالحسن ہیثمی نے اس کے زوائد بھی علاحدہ مرتب کئے تھے۔(۱)

۷۹۔معجم صغیر: یہ سب معاجم میں مختصر ہونے کی وجہ سے زیادہ مقبول اور متداول ہے، اس کی ترتیب بھی شیوخ کے ناموں پر ہے اور اس میں انھوں نے حروف تہجی کے مطابق ایک ہزار سے زیادہ شیوخ کی ایک ایک حدیث درج کی ہے، آخر میں بعض خواتین کی بھی حدیثیں ہیں ان کی حدیثوں کی تعداد دو ہزار بتائی گئی ہے لیکن بعض نے ڈیڑھ ہزار بھی کہا ہے، اس کے زوائد بھی ابوالحسن ہیثمی نے علاحدہ مرتب کئے تھے، معجم صغیر کے نسخے کئی کتب خانوں میں موجود ہیں، ۱۳۱۱ھ میں یہ مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی ہے، اس کی بعض خصوصیات ملاحظہ ہوں، اس میں روایت اور راوی کے متعلق مختلف قسم کی تصریحات کی گئی ہیں، مثلاً حدیث کے ضعف وقوت، رفع واتصال تفرد، شہرت اور غرابت، راویوں کے ضبط وثقاہت یا وہم وضعف، کنیت، نسبت، نام، لقب، قبیلہ، وطن اور بعض کے نسب نامے اور روایتوں میں فرق واختلاف اور کمی بیشی کی تصریح کی گئی ہے، جس سنہ اور مقام پر جو روایت سنی یا لکھی گئی ہے کہیں کہیں اس کی اور بعض راویوں کی صحابیت وتابعیت کا ذکر کیا گیا ہے، بعض روایتوں کے کسی خاص لفظ یا فقرہ کے متعلق یہ وضاحت کردی گئی ہے کہ وہ صرف اسی حدیث میں مذکور ہے، بعض شیوخ کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے فلاں شیخ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶ البستان المحدثین ص ۵۰ والرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۱۱۔

سے کتنی حدیثیں بیان کیں یا اس نے اور کن مشہور شیوخ سے سنیں یا اس سے کن مشہور اشخاص اور اہم راویوں نے حدیثیں روایت کی ہیں اسی طرح اکثر راویوں کے وہ نمایاں اوصاف بیان کئے گئے ہیں جن سے ان کی زیادہ شہرت ہے۔

۲- حدیث کے بارے میں اہل علم کے بیان کردہ مفہوم ومنشاء کو ذکر کرنے کے علاوہ خود بھی کہیں کہیں اس کی مراد واضح کی ہے اور راوی نے حدیث کے بعض الفاظ کی جو وضاحت کی ہے، اس کو اور کہیں کہیں خود بھی مشکل اور غریب الفاظ کے معنیٰ لکھے ہیں۔

۳- امام طبرانی نے ائمہ فقہ اور محدثین کے فقہی اقوال اور رائیں بھی نقل کی ہیں اور خود بعض روایتوں کی اس طرح تشریح کی ہے جن سے کسی خاص فقہی مسلک کی تائید اور وضاحت ہوتی ہے، مثلاً ایک حدیث ہے کہ:

عن ابن عباس ان النبي	حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ
صلى الله عليه وسلم قال يا	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
بني عبد مناف يا بني	اے بنی عبدمناف، اے بنی
عبدالمطلب ان وليتم هذا	عبدالمطلب اگر تم اس معاملہ کے ذمہ
الامر فلا تمنعوا احداً طاف	دار ہونا تو خانہ کعبہ کا طواف کرنے
بهذا البيت ان يصلي اية	والے کسی شخص کو رات اور دن کے کسی
ساعة شاء من ليل ونهار.	حصہ میں نماز پڑھنے سے منع نہ کرنا۔

امام طبرانی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

يعني الركعتين بعدا لطواف	آپؐ کی مراد سات پھیرے طواف کے
السبع ان يصلي بعد صلاة	بعد کی دو رکعتوں سے ہے کہ وہ فجر کی
الصبح قبل طلوع الشمس	نماز کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے
وبعد صلاة العصر قبل	اور عصر کی نماز کے بعد غروب سے پہلے

غروب الشمس وفی کل النهار۔ (معجم صغیر ص ۱۲)	اور اسی طرح دن کے ہر حصہ میں پڑھی جاسکتی ہیں یعنی ممنوع ومنہی عنہا اوقات میں بھی ان کو پڑھ لینے میں حرج نہیں ہے۔

۴- انھوں نے بعض حدیثوں کے متعلق شبہات کے جواب دیے ہیں، مثلاً ایک حدیث ہے کہ:

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے چار کام کیے اس کو چار چیزیں عطا کی جاتی ہیں، اس کا ذکر کتاب اللہ میں بھی ہے۔

۱- جس نے اللہ کو یاد کیا اللہ بھی اسے یاد کرتا ہے۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ۔ (بقرہ:۱۵۲)	سو مجھے یاد کرو تو میں تمہیں یاد کروں گا۔

۲- جس نے دعا کی اس کی دعا قبول کی جاتی ہے، اللہ کا ارشاد ہے:

اُدْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (مومن:۶۰)	مجھ سے مانگو تو میں تمہیں دوں گا

۳- شکر کرنے والے پر اللہ مزید فضل وانعام کرتا ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ۔ (ابراہیم:۷)	اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ نوازوں گا۔

۴- جو اللہ سے استغفار کرتا ہے، اللہ اس کی مغفرت کرتا ہے، اس کا فرمان ہے:

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا۔ (نوح:۱۰)	اپنے خداوند سے مغفرت چاہو بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا ہے۔

اس حدیث کے سلسلہ میں پہلے انھوں نے بعض لوگوں کے اس شبہہ کا ذکر کیا ہے کہ "ہم لوگ دعائیں کرتے ہیں مگر وہ قبول نہیں ہوتیں" پھر اس کا جواب یہ دیا ہے کہ:

"گویا یہ اعتراض خدا پر ہے کیوں کہ اس نے کہا ہے اور یقیناً اس کی

بات برحق ہے کہ:

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (مومن:۶۰)	مجھے پکارو! میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔

نیز:

وَاِذَاسَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (بقرہ:۱۸۶)	اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق پوچھیں تو (انھیں بتاؤ کہ) میں (ان کے) نزدیک ہوں اور پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

مگر اس حقیقت اور مفہوم سے اہل علم اور ارباب بصیرت ہی واقف ہو سکتے ہیں، ایک اور حدیث میں بھی اس کی وضاحت کی گئی ہے، حضرت ابوسعید خدریؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے مروی ہے کہ:

مامن مسلم یدعواللّٰہ بدعوۃ الا استجاب لہ فھو من دعوتہ علی احدی ثلاث اما ان یعجل لہ فی الدنیا واما ان تدخر فی الآخرۃ واما ان یدفع عنہ من البلاء مثلھا۔(۱)	جو مسلمان بھی اللہ سے دعا کرتا ہے اس کی دعا قبول ہوتی ہے، اس کی تین صورتیں ہیں، یا تو دنیا ہی میں قبولیت عطا کی جاتی ہے، یا اس کی دعا آخرت کے لیے موخر کی جاتی ہے اور ذخیرہ بنتی ہے یا دعا مانگنے والے کی اس طرح کی کوئی مصیبت دفع کردی جاتی ہے۔

معجم صغیر کے مطبوعہ ایڈیشن میں مختصر تشریحی حواشی بھی شامل ہیں جن میں نسخوں کے فرق واختلاف متن کی تصحیح، راویوں کے ناموں کی تحقیق، اعراب کی تعیین، لغات کی

(۱) معجم صغیر ص ۲۱۲۔

تشریح، حدیث کے مشکل جملوں کی وضاحت، اختلاف قرأت، ثلاثی حدیثوں کی نشاندہی اور دوسری کتب حدیث سے اس کی حدیثوں کی مطابقت اور غیر مطابقت اور دوسری بحثیں درج ہیں، شارح نے محدثین کے مسلک کی تائید کی ہے، مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

قال رسول الله ﷺ لاصلوٰة بعد الصبح حتی تطلع الشمس ولابعد العصر حتی تغرب الشمس (۱)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فجر اور عصر کے بعد طلوع وغروبِ آفتاب سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔

اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

> "یہ حکم بلاسبب پڑھی جانے والی نفل نمازوں کے بارے میں ہے لیکن فوت شدہ فرائض ونوافل یا کسی وجہ سے پڑھی جانے والی نفل نمازوں کو ان وقتوں میں بھی پڑھنا جائز ہے جیسا کہ متعدد حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے، اس کی تفصیل کے لیے مشہور محدث علامہ شمس الحق عظیم آبادی کے رسالہ اعلام اہل العصر باحکام رکعتی الفجر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔"(۲)

اس مطبوعہ نسخہ کے آخر میں مندرجہ ذیل چار رسالے شامل ہیں۔

۱- غنیۃ الالمعی: صاحب عون المعبود مولانا ابوالطیب محمد شمس الحق عظیم آبادی نے اس میں اصول حدیث اور بعض فقہی مسائل کے بارے میں سوالات کا جواب قلمبند کیا ہے۔

۲- التحفۃ المرضیہ فی حل بعض مشکلات الحدیثیہ: یہ شیخ حسین بن محسن انصاری (م ۱۳۲۷ھ) کا رسالہ اور امام ترمذی کی بعض اصطلاحوں کی تحقیق پر مشتمل ہے۔

۳- رفع الیدین فی الدعاء: یہ علامہ محمد بن عبدالرحمٰن بن سلیمان بن یحییٰ زبیدی یمانی کی تالیف ہے، اس میں فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کو مدلل طور

(۱) معجم صغیر حواشی ص ۲۲ (۲) ایضاً حواشی ص ۲۲۔

پر مسنون بتایا گیا ہے۔

۴- الکشف من مجاوزۃ ہذہ الامۃ الالف: یہ امام جلال الدین سیوطی کا رسالہ ہے، اس میں اس حدیث (ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لایمکث فی قبرہ الف سنۃ) کے متعلق گفتگو کر کے اس کو باطل قرار دیا گیا ہے۔

امام طبرانی پر بعض اعتراضات اور ان کا جواب: امام طبرانی کی عظمت وجلالت کے باوجود ان پر بعض اعتراضات کیے گئے ہیں، ذیل میں دو اعتراضات نقل کیے جاتے ہیں:

۱- پہلا اعتراض ان کے تفرد کے بارے میں ہے، اسماعیل بن محمد بن فضل تیمی نے ان کے افراد وغرائب پر مشتمل حدیثوں کو جمع کرنے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان حدیثوں میں نکارت پائی جاتی ہے اور یہ موضوع اور طعن وقدح سے خالی نہیں ہیں۔

۲- ان پر وہم وخطا اور نسیان کا بھی الزام عائد کیا گیا ہے، اس کی مثال یہ دی گئی ہے کہ انھوں نے مغازی وسیر کے باب میں مصر کے احمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم برقی سے روایت کی ہے، اس نام میں ان کو وہم ہوا ہے، اصل میں راوی احمد کے بجائے ان کے بھائی عبدالرحیم ہیں کیوں کہ احمد طبرانی کے مصر جانے سے دس سال پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔

ابن مندہ نے بھی اس کی وجہ سے ان پر طعن کیا ہے اور ابو بکر بن مردویہ نے اسی بنا پر انھیں لین قرار دیا ہے، ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ طبرانی کی جانب سے صاف نہ تھے، ابن مردویہ کی جانب سے خفگی کی ایک وجہ یہ بھی منقول ہے کہ انھوں نے بغداد جا کر جب ان حدیثوں کی تحقیق وتفتیش کی جن کو ان سے طبرانی نے ادریس سے اور ادریس نے یزید بن ہارون سے اور انھوں نے روح بن عبادہ کے واسطہ سے بیان کیا تھا تو انھیں، بہت کم حدیثوں کا پتہ چلا، علاوہ ازیں یہ معلوم ہوا کہ اہل بغداد کے نزدیک ادریس کا زیادہ پایہ بلند نہ تھا، اس لیے وہ ان سے زیادہ حدیثیں روایت نہیں کرتے تھے مگر امام طبرانی کے نزدیک ادریس مغتنم لوگوں میں تھے۔

اسی نوعیت کا ایک اور اعتراض حاکم نے علوم الحدیث میں تحریر کیا ہے کہ ابوعلی نیشاپوری امام طبرانی کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، اس کا سبب یہ تھا کہ طبرانی نے شعبہ کی ایک حدیث بیان کی اور کہا کہ یہ ان کو غندر اور شبابہ کے واسطے سے ملی ہے، ابوعلی نے سوال کیا کہ آپ سے اس کی کس نے روایت کی ہے؟ انھوں نے کہا عبداللہ بن احمد نے اپنے والد سے انھوں غندر اور شبابہ سے، حالاں کہ یہ غندر کی حدیث نہ تھی۔ (۱)

ان اعتراضات کا نمبروار جواب یہ ہے کہ:

۱- امام طبرانی کو طویل عمر ملی اور ان سے بیشمار حدیثیں منقول ہیں، اس لیے ان کے یہاں تفرد کی بھی کثرت ہے لیکن ارباب فن نے ان کے تفرد کو منکر نہیں قرار دیا ہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ کثرتِ روایت کی وجہ سے امام طبرانی کے تفرد کو منکر نہیں قرار دیا جاتا، حافظ ابن حجر نے تیمی کے مذکورہ بالا اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''افراد وغرائب جمع کرنے کا معاملہ صرف طبرانی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اکثر قدیم محدثین کا یہی حال تھا کہ وہ تفرد کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور اپنی ذمہ داری سے برأت کے لیے احادیث کو ان کی اصل سندوں کے ساتھ بیان کرنے پر اکتفا کرتے تھے۔''

شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

> ''معجم اوسط افراد وغرائب کا مجموعہ ہے، محدثین کے نزدیک اس میں بہت سی منکر روایتیں ہیں لیکن اس کی حقیقت اور منشا یہ ہے کہ غرابت اسی کی مقتضی ہے ورنہ تفرد ثقہ کا جس کو غریب صحیح کہا جاتا ہے، ایک علاحدہ باب ہے۔'' (۲)

۲- دوسرے اعتراض میں بعض ناموں کے بارے میں امام طبرانی کے سہو

---

(۱) لسان المیزان جلد ۳ ص ۷۳ (۲) میزان الاعتدال ج ۱ ص ۴۰ ولسان المیزان ج ۳ ص ۷۳ وبستان المحدثین ص ۵۳۔

ونسیان کا ذکر ہے، اس کتاب میں یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ وہم ونسیان علمائے فن کے نزدیک مانع ثقاہت اور قابل اعتراض نہیں چنانچہ حافظ ذہبی اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> ''یہ زیادہ اہم بات نہیں احمد بن منصور شیرازی فرماتے ہیں کہ ''میں نے ان سے تین لاکھ حدیثیں لکھیں، وہ ثقہ تھے، البتہ مصر کے ایک شیخ سے انھوں نے حدیث لکھی اور غلطی سے اس کو ان کے بجائے ان کے بھائی کی جانب منسوب کر دیا۔''(۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن مردویہ نے جو روایت کی اس کی بنیاد پر بھی طبرانی کو مجروح اور قابل طعن قرار دینا زیادتی ہے، رہی یہ بات کہ وہ طبرانی کی جانب سے صاف نہ تھے تو یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیوں کہ وہ خود ان کے حلقۂ فیض سے وابستہ تھے اور ان سے حزم واحتیاط کے ساتھ حدیثیں بھی نقل کرتے تھے، چنانچہ حافظ ابونعیم نے ان سے پوچھا کہ آپ نے طبرانی سے حدیثیں روایت کی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں میں ان سے احتیاط کے ساتھ روایتیں کرتا ہوں حافظ ضیاء کا بیان ہے کہ ابن مردویہ نے خود اپنی تاریخ میں طبرانی کا ذکر کیا ہے لیکن ان کی تضعیف نہیں کی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طبرانی ثقہ وثابت تھے اور ابن مردویہ کے نزدیک بھی ان کی ثقاہت مسلم تھی۔(۲)

لیکن اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ ابن مردویہ کو واقعی ان سے بدگمانی تھی تو تنہا ان کی ذاتی رائے کی وجہ سے طبرانی کو ضعیف اور غیر معتبر نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ابوعلی نیشاپوری کے بیان میں بھی وہم ونسیان کا ذکر ہے، اس کا جواب بھی مندرجہ بالا توضیح سے ہو گیا لیکن حافظ ابن حجر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۰ (۲) ایضاً۔

طبرانی کو کوئی وہم نہیں ہوا تھا، چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

ابونعیم نے ابوعلی کا تعاقب کرتے ہوئے غندر کی حدیث کو ابوعلی بن صواف سے اورانھوں نے عبداللہ بن احمد سے اسی طرح بیان کیا ہے جس طرح طبرانی نے بیان کیا ہے، اس سے طبرانی کا بری الذمہ ہونا ظاہر ہوتا ہے، حافظ ضیاء نے طبرانی کے دفاع میں ایک رسالہ لکھا تھا، جس میں وہ اس اعتراض کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

لو کان کل من وھم فی حدیث او حدیثین اتھم لکان ھذا لایسلم منه احد.(۱)	اگراسی طرح ہر شخص کو محض ایک یا دوحدیثوں میں وہم کی وجہ سے متہم قرار دیا جائے تو کوئی شخص بھی الزام واعتراض سے بچ نہیں سکتا۔

اس تفصیل سے ان اعتراضات کی حقیقت واضح ہوگئی اور یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ اگر یہ صحیح بھی ہوں تو ان سے ان کی عظمت واہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

☆☆☆

(۱) لسان المیزان ج ۳ ص ۷۴۔

امام ابوعمرو بن نجید

(المتوفی ۳۶۵ھ یا ۳۶۶ھ)

نام ونسب: اسماعیل نام، ابوعمرو کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: اسماعیل بن نجید بن احمد بن یوسف ابن خالد۔(۱)

پیدائش، خاندان و وطن: ۲۷۲ یا ۲۷۳ھ میں پیدا ہوئے، عرب کے مشہور قبیلہ سلیم سے خاندانی تعلق تھا، اسی لیے سلمی کہلاتے تھے۔

اساتذہ وشیوخ: امام ابوعمرو بن نجید نے ابراہیم بن ابوطالب، ابومسلم ابراہیم بن عبداللہ، عبداللہ ابن احمد بن علی بن حسین بن جنید، ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم بوشنجی، محمد بن ایوب رازی وغیرہ سے حدیث روایت کی اور جنید بغدادی اور ابوعثمان جیسے اجل صوفیہ سے تصوف کی تعلیم حاصل کی۔

تلامذہ: جن لوگوں نے ان سے علم ظاہر و باطن کی تحصیل کی تھی ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابوحفص بن مسرور، ابونصر احمد بن عبدالرحمٰن صفار، ابوعبداللہ حاکم، صاعد بن محمد قاضی عبدالقاہر بن طاہر فقیہ، ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین وغیرہ۔(۲)

حدیث میں درجہ: ابوعمر بن نجید کا روایت و حدیث میں درجہ بلند تھا، علمائے سیر وطبقات نے ان کی کثرتِ روایت، احادیث میں انہماک واشتغال اور ثقاہت کا اعتراف کیا ہے،

(۱) کتاب الانساب ورق ۳۰۲ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۸۹ (۲) ایضاً۔

ابن جوزی، ابن کثیر، شعرانی اور مولانا جامی وغیرہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، حاکم صاحب مستدرک کا بیان ہے (اسند من بقی بخراسان فی الروایۃ) یعنی خراسان کے محدثین میں ابن نجید سب سے زیادہ بلند پایہ اور مستند ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں، در علو اسناد در خراسان مشہور و مشار الیہ آفاق۔

زہد و تصوف: وہ عمل، اخلاص اور زہد و تقویٰ میں نہایت کامل تھے، حدیث سے زیادہ ان کو تصوف میں اشتغال تھا اور اسی حیثیت سے زیادہ مشہور بھی ہیں، اس زمانہ کے مشائخ و کبار صوفیہ اور اوتاد و ابدال میں شمار کیے جاتے تھے، مورخین نے ان کو الزاہد العابد، شیخ الصوفیہ اور صاحب احوال و مناقب لکھا ہے، ابن نجید ابو عثمان حیری کے اجل خلفا میں تھے، انھیں خود اپنے مسترشد پر بڑا ناز تھا اور فرماتے تھے کہ ابو عمرو میرے جانشین ہیں، لوگ ان سے محبت کرنے پر میری ملامت کرتے ہیں، حالاں کہ ان سے زیادہ کسی کو میرے طریقہ اور مشرب کا علم نہیں، گو وہ جنید و ابو عثمان کے صحبت نشین اور فیض یافتہ تھے لیکن تصوف میں ان کا اپنا خاص طریقہ بھی تھا، مولانا جامی لکھتے ہیں:

''ویرا طریقہ خاص بود از تلبیس حال و نگاہ داشت وقت۔''(۱)

انفاق فی سبیل اللہ: اللہ تعالیٰ نے ان کو علم ظاہر و علم باطن کی طرح دنیوی جاہ و حشمت سے بھی نوازا تھا لیکن ان میں بڑی بے نیازی اور استغنا تھا اور مال و دولت کی حرص و طمع سے ان کا دل پاک تھا، ان کو اپنے والد سے کافی مال و دولت وراثت میں ملا تھا لیکن خود کفاف پر بسر کرتے تھے اور باقی سب خدا کی راہ میں اور علما و مشائخ پر خرچ کر دیتے تھے۔

اخلاص: دنیا کے ارباب جاہ و حشمت کی طرح ان کو نام و نمود اور شہرت سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ ریا کاری کو سخت ناپسند کرتے تھے، ہر کام خالصتاً لوجہ اللہ کرتے، ان کا اخلاص بیمثال تھا، ایک روز ابو عثمان حیری کو سرحدوں پر مجاہدین کے اخراجات کے لیے کچھ رقم کی

---

(۱) نفحات الانس جامی ص ۲۱۶۔

ضرورت ہوئی لیکن حاضرین کی تہی دستی کی وجہ سے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، اس سے ان کا دل بھر آیا، وہ ضبط نہ کر سکے اور رو پڑے، رات میں عشاء کی نماز کے بعد ابوعمرو بن نجید نے دو ہزار درہم کی ایک تھیلی پیش کی، ابوعثمان بہت خوش ہوئے اور ان کے لیے دعائے خیر فرمائی، پھر انھوں نے مجلس میں یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ ابوعمرو کو جزائے خیر دے، انھوں نے دو ہزار درہم دے کر میری خواہش پوری کر دی، ابوعمرو نے اسی وقت فوراً مجمع میں کھڑے ہو کر کہا حضرات! میں جو رقم لایا تھا وہ میری ماں کی تھی وہ اسے دینے کے لیے راضی نہ تھیں، اس لیے تھیلی واپس کر دی جائے تاکہ میں اسے لے جا کر اپنی ماں کو دیدوں، چنانچہ ابوعثمان نے تھیلی منگا کر واپس کر دیا جب رات کا سناٹا ہوا اور سارا مجمع منتشر ہو گیا تو ابوعمرو نے دوبارہ وہی رقم شیخ کی خدمت میں نذر کی اور کہا آپ اسے اس طور پر خرچ کریں کہ ہمارے علاوہ کسی اور شخص کو اس کی اطلاع نہ ہو، ابوعثمان آبدیدہ ہو گئے اور ان کی بڑی ستائش و تحسین کی۔(۱)

حکیمانہ وصوفیانہ اقوال: ابوعمرو بن نجید سے بڑے حکیمانہ وصوفیانہ اقوال منقول ہیں، چند ملاحظہ ہوں۔

۱- بعض سکوت (خاموشی) گفتگو سے زیادہ بلیغ و موثر ہوتا ہے۔

۲- جو شخص اپنے نفس کو معزز و مکرم سمجھتا ہے اس کا دین اسے حقیر و ہین معلوم ہوتا ہے۔

۳- غیر اللہ سے انسیت رکھنا اصلی وحشت ہے۔

۴- پوچھا گیا کس چیز سے بندہ کو چارہ نہیں، فرمایا سنت کے مطابق بندگی کا التزام اور ہمیشہ دل کی نگرانی و پاسبانی۔

۵- حال اگر علم کا نتیجہ نہ ہو تو صاحب حال کے لیے اس کا ضرر نفع سے زیادہ ہے۔

(۱) نفحات الانس جامی ص ۱۱۶ کتاب الانساب ورق ۳۰۳ کتاب المنتظم ج ۷ ص ۸۴ و ۸۵۔

٦- تصوف امر و نہی کے تحت صبر کرنے کا نام ہے۔

٧- بندہ کے لیے سب سے بڑی آفت اس کا اپنے نفس سے مطمئن ہو جانا ہے۔

٨- جس شخص کو دیکھنے کے بعد تمہاری اصلاح نہ ہو وہ شخص مصلح نہیں ہے۔

٩- آدمی عبادت میں اسی وقت مخلص ہو سکتا ہے جب اس کو اپنے تمام افعال ریا اور تمام احوال و اقوال ادعا معلوم ہوں۔

١٠- پوچھا گیا، ادعاء کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ فرمایا دھوکہ سے، اس کی ابتدا ہی بگاڑ سے ہوتی ہے، جس شخص کی ابتدا صحیح ہو اس کی انتہا بھی صحیح ہوتی ہے اور جس کی ابتدا فاسد ہو وہ کسی وقت ہلاک و برباد ہو سکتا ہے۔

١١- ملامتی (١) میں کبھی ادعا نہیں ہوتا کیوں کہ اسے اپنے اندر کوئی چیز ادعا کی نظر نہیں آتی۔

١٢- جب اللہ اپنے بندہ کی بھلائی چاہتا ہے تو اسے صلحا و اخیار کی خدمت و صحبت اور ان کے ارشادات قبول کرنے کی توفیق عطا کرتا ہے اور اس کے لیے نیکیوں کی راہیں آسان کر دیتا ہے۔

١٣- عام مسلمانوں کا احترام کرو اور غیر ممکن کام کے درپے نہ بنو، سب سے اپنے کو حقیر سمجھو جس قدر تمہارا تعلق لوگوں سے زیادہ ہوگا اسی قدر خدا کے احکام میں تمہارا حصہ کم ہوگا۔

١٤- جو شخص نفع و ضرر نہ پہچاننے والے کے سامنے اپنے محاسن ظاہر کرتا ہے وہ دراصل جہل کا اظہار کرتا ہے۔

---

(١) یہ صوفیہ کا اصطلاحی لفظ ہے، اس کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں، مولانا جامی لکھتے ہیں، الملامتی ہو الذی لا یظہر خیرا ولا یضمر شرا (نفحات الانس) یعنی ملامتی وہ شخص ہے جو اپنی نیکی کا اظہار اور برائی کو پوشیدہ نہیں رکھتا۔

۱۵- جو شخص واقعۃً درست ہو گیا، اسے کوئی بگاڑ نہیں سکتا اور جو کج ہو گیا اسے کوئی سیدھا نہیں کر سکتا۔(۱)

وفات: سنہ وفات میں اختلاف ہے، ربیع الاول ۳۶۵ھ اور ۳۶۶ھ کی روایتیں ملتی ہیں، صاحب الرسالۃ القشیریہ نے تصریح کی ہے کہ مکہ معظمہ میں اور بعض مورخین کے بیان کے مطابق ۹۳ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔(۲)

اولاد و احفاد: اولاد و احفاد میں ایک نواسہ ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین بن محمد بن موسیٰ سلمی کا ذکر ملتا ہے جو بڑے صاحبِ کمال بزرگ اور بلند پایہ صوفی تھے، تصوف میں ان سے کئی کتابیں یادگار ہیں، ان کی سب سے مشہور کتاب طبقات الصوفیہ ہے، یہ صوفیہ کے حالات پر مشتمل اور قاہرہ سے چھپ چکی ہے، مولانا جامی کی نفحات الانس کا اصل ماخذ یہی کتاب ہے، تفسیر میں بھی ایک کتاب لکھی تھی جس میں صوفیانہ نقطہ نگاہ سے قرآن کی تفسیر کی گئی ہے، حدیث سے بھی اشتغال تھا، مرو، نیشاپور، عراق وحجاز کے علما سے حدیثوں کی تحصیل کی تھی لیکن محدثین نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ یہ صوفیہ کی مفید مطلب حدیثیں وضع کرتے تھے،(۳) ۳ رشعبان ۴۱۲ھ کو انتقال ہوا اور نیشاپور میں اپنی خانقاہ کے اندر دفن کیے گئے۔

تصنیفات: ان کی تصنیفات میں صرف جزء ابن نجید کا ذکر ملتا ہے لیکن اس کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا، جزء کتب حدیث کی ایک قسم ہے، محمود محمد خطاب سبکی لکھتے ہیں:

الجزء يطلق على ماهو اعم	جزء کا اطلاق اس کتاب پر ہوتا ہے جو
من الجامع والمسند وقد	جامع اور مسند دونوں سے عام ہوتی
يطلق على ماالف في نوعٍ	ہے اور کبھی اس پر بھی ہوتا ہے جو کسی
خاص.	خاص موضوع پر تالیف کی جاتی ہے۔

(۱) الرسالۃ القشیریہ ص ۳۴، طبقات شعرانی ص ۱۰۳، نفحات الانس ص ۲۱۶ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۰۳ المنتظم ج ۷ ص ۸۴، طبقات شعرانی ص ۱۰۳، الرسالۃ القشیریہ ص ۳۴ (۳) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۴۶۔

شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''جزء حدیث کی اس کتاب کو کہا جاتا ہے جس میں صرف ایک خاص شخص کی بیان کردہ حدیثوں کو جمع کیا جاتا ہے، چاہے وہ شخص صحابہ کے طبقہ سے ہو یا ان کے بعد کے طبقہ سے مثلاً جزء حدیث ابوبکر و جزء حدیث مالک''

اس قسم کا بھی محدثین میں بڑا رواج ہے، کبھی ایسا کرتے ہیں کہ جامع میں مذکور آٹھ موضوعوں (۱) میں کسی خاص موضوع کو اختیار کر لیتے ہیں اور اس پر ایک نہایت مبسوط کتاب مرتب کرتے ہیں چنانچہ باب الدیۃ پر ابوبکر بن ابی الدنیا نے ایک مبسوط کتاب لکھی تھی، علی ہذا القیاس مذکورہ بالا آٹھ مطالب میں سے ہر ہر موضوع پر مستقل اور جداگانہ رسالے لکھے گئے ہیں جن کا احاطہ دشوار ہے، حافظ ابن حجر اور علامہ سیوطی کی تصانیف میں رسالوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ (۲)

---

(۱) جوامع میں حسب ذیل موضوع سے متعلق احادیث ہوتی ہیں عقائد، احکام، رقاق، آداب، تفسیر، تاریخ وسیر، فتن وملاحم، فضائل ومناقب (۲) عجالۂ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۱۶ و ۱۰۳۔

امام ابوبکر اسماعیلی

(متوفی ۳۷۱ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابوبکر کنیت، اسماعیلی نسبت، اور سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد بن ابراہیم بن اسماعیل بن عباس بن مرداس۔ (۱)

پیدائش، خاندان اور وطن: وہ امام بخاری کی وفات کے اکیس سال بعد ۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان علمی حیثیت سے ممتاز تھا، ان کے بعد اس میں متعدد فضلا اور ارباب کمال گذرے، (۲) ان کا وطن جرجان تھا۔

شوق علم اور طلب حدیث کے لیے سفر: علم وفن سے ان کو فطری مناسبت تھی، بچپن میں لوگ عموماً پڑھنے لکھنے سے بیزار ہوتے ہیں لیکن اسماعیلی کو اسی زمانہ میں اس سے دلچسپی ہوگئی تھی، چھ سال کی عمر میں یعنی ۲۸۳ھ میں انھوں نے حدیثوں کی تحریر وکتابت شروع کردی تھی، اور ۲۸۹ھ میں باقاعدہ اس فن کی تحصیل میں مشغول ہوگئے تھے، اسی زمانہ میں وہ اس مقدس اور مبارک علم کی تحصیل کے لیے اپنے وطن سے نکل جانا چاہتے تھے، مگر ان کی کمسنی کی وجہ سے ان کے اعزہ نے سفر کی اجازت نہیں دی اور جب ان کا شوق اور اصرار حد سے بڑھ جاتا تو وہ لوگ مختلف حیلوں اور بہانوں سے انھیں باز رکھنے کی کوشش کرتے، ایک دن ان کو اس زمانہ کے مشہور محدث محمد بن ایوب رازی کی موت کی اطلاع ملی تو ان کا عجیب حال ہوگیا، وہ گھر سے باہر آکر رونے دھونے، چیخنے چلانے لگے کپڑے چاک کرنے اور سر پر

(۱) کتاب الانساب ورق ۳۶، تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۷۹ (۲) ایضاً وبستان المحدثین ص ۳۷۔

خاک ڈالنے لگے، یہ کیفیت دیکھ کر ان کے تمام اعزہ جمع ہو گئے اور اس کا سبب دریافت کیا، اسماعیلی نے کہا آج دنیا ایسے عظیم المرتبت اور صاحب کمال شخص سے خالی ہو گئی، آپ لوگوں کی بندشوں اور رکاوٹوں نے مجھے اس کے فیوض و برکات سے متمتع نہیں ہونے دیا، اعزہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، اب بھی خدا کے فضل سے بہت سارے نامور علما و مشائخ اور اساطین فن موجود ہیں، یہ حالت دیکھ کر اب ان کو سفر سے مزید روکنا مشکل تھا، اس لیے ان کے ماموں کو ان کے ہمراہ کر دیا گیا، اس طرح وہ پہلی مرتبہ ۲۹۴ھ میں ابوالحسن بن سفیان کی خدمت میں نسا تشریف لے گئے، ان کا خود بیان ہے کہ یہ سفر میں نے اس وقت کیا تھا جب نہ تو میری مسیں بھیگی تھیں اور نہ داڑھی کے بال نکلے تھے، ۲۹۶ھ میں بغداد گئے، اس سفر میں بھی ان کا کوئی عزیز ان کے ساتھ تھا، پھر حجاز، عراق، فارس، کوفہ، بصرہ، انبار، موصل، جزیرہ، نیشاپور وغیرہ تشریف لے گئے، نیشاپور کئی بار تشریف لے گئے۔(۱)

اساتذہ وشیوخ: جس شخص کے شوق وجستجوئے علم کا یہ حال رہا ہو اس کے اساتذہ وشیوخ کی تعداد وشمار نہیں کی جا سکتی، بعض نامور محدثین اور ارباب کمال کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن زہیر حلوانی، ابراہیم بن عبداللہ مخرمی، ابویعلیٰ احمد بن علی بن مثنیٰ موصلی، احمد بن محمد بن مسروق، بہلول بن اسحاق تنوخی انباری، جعفر بن محمد فریابی، حسن بن سفیان شیبانی، حمزہ بن محمد بن عیسیٰ کاتب، عبداللہ بن ناجیہ، عبدان بن احمد عسکری، عمران بن موسیٰ سختیانی، ابوخلیفہ فضل بن حباب جمحی، ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ، محمد بن حسن بن سماعہ، ابوجعفر محمد بن عبداللہ بن سلیمان حضرمی، محمد بن عثمان بن ابی شیبہ، شیخ زاہد محمد بن عثمان مقابری، محمد بن یحییٰ بن سلیمان مروزی، یحییٰ بن محمد حنائی، قاضی یوسف بن یعقوب۔(۲)

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں اس دور کے ائمہ اور نامور فضلا شامل تھے، بعض کے نام یہ ہیں:

(۱) کتاب الانساب ورق ۳۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۰ (۲) ایضاً۔

ابوالقاسم عبدری، ابوبکر بن محمد بن غالب برقانی، حسین بن محمد باسانی، حمزہ بن یوسف سہمی صاحب تاریخ جرجان، ابوعمرو عبدالرحمٰن بن (۱) محمد فارسی، عبدالواحد بن منیر معدل، ابوجعفر محمد بن احمد حجاجی، ابوبکر محمد بن ادریس جرجانی، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم، ابوعلی محمد بن علی بن سہل، ابوالحسن محمد بن علی طبری۔

حفظ وضبط: حفظ وضبط میں ممتاز اور مشہور حفاظ میں شمار کیے جاتے تھے، بہت ساری کتابیں ان کو زبانی یاد تھیں، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ میں ان کے کمال حفظ سے مبہوت ہوگیا اور میرا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ متقدمین کے علم وحافظہ کا متاخرین مقابلہ نہیں کرسکتے، ضبط واحتیاط کا یہ حال تھا کہ فن حدیث میں غیر معمولی امتیاز اور امام فن ہونے کے باوجود انھوں نے مستقل کتاب لکھنے کے بجائے مستخرج بخاری لکھنے پر اکتفا کیا، حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ وہ رفع اسناد اور علوے تفرد میں ممتاز تھے، (۲) حاکم کا بیان ہے کہ ان کے ضبط وثقاہت میں کوئی اختلاف نہیں کیا گیا ہے۔

حدیث میں درجہ: اسماعیلی منقولات کے متبحر عالم اور کامل الفن محدث تھے، وہ حدیث میں امام، مرجوع اور مقتدیٰ کی حیثیت رکھتے تھے، حاکم نے ان کو شیخ المحدثین اور امامِ اہل جرجان کہا ہے، ان کی عظمت وبلند پائیگی کا یہ عالم تھا کہ امام دارقطنی جیسے صاحب کمال اور جلیل القدر محدث نے کئی بار ان کی بارگاہ فضل وکمال میں حاضر ہونے کا قصد کیا لیکن مقدور نہ ہوسکا اور زندگی بھر اپنی اس محرومی پر حسرت وافسوس ظاہر کرتے رہے، حافظ حسن بن علی فرماتے ہیں کہ اسماعیلی اس پایہ کے محدث تھے کہ حدیث وسنن میں مستقل کتابیں لکھتے مگر انھوں نے مستخرج مرتب کرنے پر اکتفا کیا، ان کو اکثر کتابیں ازبر تھیں اور اللہ تعالیٰ نے علمِ وافر اور ذہن رسا سے نوازا تھا۔ (۳)

---

(۱) یہ اسماعیلی کے نواسے تھے، تذکرہ ج ۳ ص ۱۵۹ (۲) تذکرۃ ج ۳ ص ۱۶۰ و ۱۶۱ (۳) تاریخ جرجان ص ۷۰ وکتاب الانساب ورق ۳۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ و ۱۶۰۔

مسندِ درس: اسماعیلی کے حدیث میں کمال کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علم کی تکمیل کے بعد جب وہ مسند درس پر رونق افروز ہوئے تو ان کو بڑا عروج نصیب ہوا اور ان کے درس میں طلبہ و مستفیدین کا جم غفیر شریک ہوتا تھا، حمزہ سہمی اور علامہ سمعانی نے روزانہ کے شرکا کی تعداد چالیس اور پچاس کے لگ بھگ بتائی ہے، یہ لوگ اسماعیلی کی زبان سے جو بات نکلتی تھی اس کو قلمبند کر لیتے تھے۔(۱)

فقہ واجتہاد: وہ فقہ واجتہاد میں بھی صاحب کمال اور امام ومقتدیٰ سمجھے جاتے تھے، علامہ سمعانی لکھتے ہیں کہ اسماعیلی اہل جرجان کے امام اور فقہ وحدیث میں مرجع تھے، حاکم نے انھیں شیخ المحدثین والفقہا کہا ہے، ان کے صاحبزادے ابوسعید اور بعض علمائے جرجان نے فقہ کی ان سے تحصیل کی تھی۔

قرأت: فن قرأت میں اسماعیلی کو مہارت اور اچھی دستگاہ تھی، ابوالحسن محمد بن مظفر نے قرأت میں ان کی جودت کا اعتراف کیا ہے، حمزہ سہمی فرماتے ہیں کہ وہ ہر مجلس میں پیش پیش رہتے تھے، ان کے سامنے کسی کو قرأت کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، ابوالقاسم بغوی کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بہتر قاری نہیں دیکھا۔(۲)

تدین واخلاق: اسماعیلی متدین اور ستودہ صفات تھے، حاکم نے ان کی مروت وسخاوت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور حمزہ سہمی کا بیان ہے کہ وہ اپنے والدین کے نہایت مطیع اور فرمانبردار تھے، ان کے طرز عمل سے ان کے والدین اس قدر خوش تھے کہ ہمیشہ ان کے لیے خیر وبرکت کی دعا کرتے رہتے تھے۔(۳)

دولت وثروت: اللہ تعالیٰ نے ان کو علمی ودینی کمالات کی طرح مال ودولت کی فراوانی اور دنیوی جاہ ومنزلت سے بھی نوازا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ وہ دینی ودنیاوی وجاہت اور

(۱) تاریخ جرجان ص ۷۰ وکتاب الانساب ورق ۳۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ و۱۶۰ (۲) ایضاً (۳) ایضاً۔

ہر قسم کی خوبیوں کے جامع تھے۔(۱)

شہرت ومقبولیت: ان کو بڑی شہرت اور غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی، وہ امام اور مرجع خلائق تھے، درس میں حاضرین کی بڑی تعداد ہوتی تھی، جونہایت عقیدت کے ساتھ ان کا ایک ایک لفظ نقل کرتے تھے، ابن فرات کا بیان ہے کہ:

لقد رزق من العلم والجاہ والصیت الحسن۔ ان کو علم وجاہ اور اچھی شہرت نصیب ہوئی۔

بغداد میں جب ان کی موت کی خبر ہوئی تو اکابر محدثین اور فقہا نے کئی دنوں تک جمع ہو کر ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔(۲)

فقہی مسلک: اسماعیلی شافعی المذہب تھے اور شوافع کے ائمہ میں خیال کیے جاتے تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ وہ اپنے خطہ کے اکابر شافعیہ میں تے۔(۳)

کلامی عقائد: وہ اہل سنت والجماعت اور محدثین کے ہمنوا تھے، اس لیے ان کے اعتقادات بھی وہی تھے، ان کے بعض کلامی عقائد یہ ہیں:

اہل حدیث کا مسلک یہ ہے کہ اللہ اس کے ملائکہ، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کا اقرار کیا جائے، کتاب اللہ اور صحیح حدیثوں کے منطوق کو قبول کیا جائے اور ان سے انحراف نہ کیا جائے، محدثین کا عقیدہ ہے کہ اللہ کو اس کے اچھے ناموں سے پکارنا اور ان صفتوں سے متصف ماننا چاہیے جن سے اس نے اور اس کے رسول نے اس کو متصف کیا ہے، مثلاً اللہ نے آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اس کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں، وہ عرش پر متمکن ہے وغیرہ، ان ساری باتوں کو محض تسلیم کرنا ضروری ہے، ان کی حقیقت اور کیفیت معلوم کرنے کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔(۴)

(۱) تاریخ جرجان ص ۷۰ وکتاب الانساب ورق ۳۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ و ۱۶۰ (۲) تاریخ جرجان ص ۷۰ و ۷۱ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۶۰ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۶۰، ۱۶۱

وفات: عام مورخین کے بیان کے مطابق ۹۴ سال کی عمر میں سنیچر کے دن غرہ رجب ۳۷۱ھ میں انتقال ہوا اور اتوار کو تدفین ہوئی، ان کے صاحبزادے ابونصر نے جنازہ کی نماز پڑھائی، ابن سبکی اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے کہ صفر ۳۷۱ھ میں وفات پائی۔(۱)

اولاد: انتقال کے وقت پانچ اولادیں تھیں، تین لڑکیاں اور دو لڑکے، ایک لڑکے کا نام ابونصر محمد اور دوسرے کا ابوسعد اسماعیلی تھا، دونوں علم و فضل میں اپنے والد کے جانشین تھے، ابونصر اپنے باپ کی موجودگی ہی میں مسندِ درس پر فروکش ہو چکے تھے اور دوسرے صاحب زادے ابوسعد اپنے زمانے کے ممتاز فقیہ اور صاحبِ علم خیال کئے جاتے تھے۔(۲)

تصنیفات: امام اسماعیلی کی جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

۱- مسند عمر: یہ دو جلدوں میں تھی اور حافظ ذہبی کی نظر سے گذری تھی، انھوں نے اس کی تعلیق بھی لکھی تھی۔(۳)

۲- مسند کبیر: یہ نہایت ضخیم کتاب اور تقریباً سو جلدوں پر مشتمل تھی، مگر اس کو زیادہ شہرت نہیں ملی۔

۳- مستخرج: اس کا نام صحیح اسماعیلی بھی ہے، یہ صحیح بخاری پر مستخرج ہے(۴) حافظ ابن کثیر کے اس بیان سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے صحیح بخاری پر مستخرج لکھا، یہ بیشمار فائدوں اور معلومات پر مشتمل ہے۔

حافظ ابن حجر نے اس کا انتخاب کیا تھا، جو منتقی ابن حجر کے نام سے مشہور ہے، اسماعیلی نے بخاری کی تعلیقات کو یکجا کر دیا تھا لیکن حافظ نے ان کا جدا جدا ذکر کیا ہے(۵)

۴- معجم: اسماعیلی کی یہ اہم تصنیف ہے، اس کے متعلق حافظ ابن حجر نے

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۶۰، ۱۶۱ و تاریخ جرجان ص ۶۹ کتاب الانساب ورق ۳۶ المنتظم ص ۱۰۸ طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۸۰ (۲) تاریخ جرجان ص ۷۴ (۳) بستان المحدثین ص ۳۸ (۴) مستخرج کی تعریف کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۃ المحدثین ج ۱ ص ۴۰۸ (۵) بستان المحدثین ص ۳۷۔

مصنف کے حوالہ سے مجمع المؤسس میں یہ تصریح نقل کی ہے۔

میں نے جن شیوخ سے حدیثیں سنی اور لکھی ہیں یا جن کے سامنے قرأت کی ہے ان کے ناموں کے حصر اور حروف معجمہ پر تخریج کے متعلق اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا تاکہ طلبہ کو اس سے سہولت ہو اور ناموں میں التباس واشکال کے وقت وہ اس کی جانب رجوع کر سکیں، ہر شیخ کی صرف ایک ہی حدیث نقل کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے، اس کا مقصد فی الواقع مفید حدیثوں کو جمع کرنا ہے، جن راویوں کی طرف میرے خیال میں کذب واتہام یا عام محدثین سے تفرد کی بنا پر ناپسندیدہ ہیں، ان کی حقیقت اس میں اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے لیکن جن لوگوں کا قدح وطعن بالکل واضح اور ظاہر ہے، ان کی حدیث کی تخریج کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، میں نے تیمناً وتبرکاً اس کو احمد کے نام سے شروع کیا ہے اور جمادی الاولیٰ ۸۶۱ھ میں اس کی جمع وتالیف کی ابتدا کی ہے۔(۱)

☆☆☆

(۱) بستان المحدثین ص ۳۷ واتحاف اتلاء المتقین ص ۱۵۷۔

امام ابوالحسن دارقطنی

متوفی ۳۸۵ھ

نام ونسب: ابوالحسن کنیت، علی نام اورنسب نامہ یہ ہے: علی بن عمر بن احمد بن مہدی بن مسعود بن نعمان بن دینار بن عبداللہ۔(۱)

ولادت ووطن: صحیح روایت کے مطابق امام دارقطنی ۵/ذوقعدہ ۳۰۶ھ کو بغداد کے ایک محلہ دارقطن میں پیدا ہوئے، یہ محلہ کرخ اورنہر عیسیٰ بن علی کے درمیان واقع اورمتعدد اکابر کا مولد تھا لیکن بعد میں ویران ہوگیا، علامہ سمعانی کے بغداد تشریف لانے کے زمانہ میں یہ اجڑ چکا تھا۔(۲)

اساتذہ: امام صاحب کے بعض مشہور شیوخ واساتذہ کے نام یہ ہیں:

قاضی ابراہیم بن حماد، ابن درید، ابن زیاد نیشاپوری، ابن نیروز، ابوبکر بن ابی داؤد سجستانی، ابوحامد بن ہارون حضرمی، ابوسعید عدوی، ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز، ابوجعفر احمد بن اسحاق بن بہلول، احمد بن عیسیٰ بن مسکین بلدی، احمد بن قاسم فرائضی، ابوطالب احمد بن نصر، عبداللہ بن ابی حیہ، علی بن عبداللہ بن بشر، فضل بن احمد زبیدی، ابوعلی محمد بن سلیمان مالکی، محمد بن قاسم محاربی، محمد بن نوح جندیسابوری، ابوعمر محمد بن یوسف قاضی ازدی، یحییٰ بن محمد بن صاعد، یوسف بن یعقوب نیشاپوری۔(۳)

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴ کتاب الانساب ورق ۲۱۷، المنتظم ج ۷ ص ۸۳ (۲) ایضاً وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۹۹ (۳) ایضاً۔

تلامذہ: ان کے بعض مشہور تلامذہ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابوبکر احمد بن محمد برقانی، ابوبکر بن بشران، ابوحامد اسفرائینی، ابوالحسن بن الآبنوسی، ابوالحسین ابن مہتدی باللہ، ابوذر عبدابن احمد ہروی، ابوطالب بن عباری، ابوطاہر بن عبدالرحیم، قاضی ابوالطیب طبری ابوالقاسم بن بشران، ابوالقاسم بن محسن، ابومحمد جوہری، ابومحمد خلال، ابونعیم اصفہانی صاحب حلیۃ الاولیا، ابوالقاسم ازہری، تمام رازی صاحب فوائد مشہورہ، ابوعبداللہ حاکم صاحب المستدرک، ابوالقاسم حمزۃ بن محمد طاہر، ابوالقاسم حمزہ بن یوسف سہمی، ابوالقاسم عبدالصمد بن مامون ہاشمی، عبدالعزیز ازجی، حافظ عبدالغنی ازدی منذری صاحب ترغیب وترہیب، ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین سلمی۔ (۱)

طلب حدیث کے لیے سفر: امام دارقطنی کو علم وفن خصوصاً احادیث نبویؐ سے غیر معمولی شغف تھا، وہ نہایت کمسنی میں اس فن کی تحصیل میں مشغول ہو گئے تھے، ابو یوسف قواس کا بیان ہے کہ ''جب ہم بغوی کے پاس جاتے تھے تو دارقطنی بہت چھوٹے تھے، ان کے ہاتھ میں روٹی اور سالن ہوتا تھا'' امام صاحب کے زمانہ میں بغداد علمی حیثیت سے نہایت ممتاز اور نامور علما ومحدثین کا مرکز تھا، مگر وہ اپنی تشنگی علم کو بجھاتے کے لیے بغداد کے علاوہ کوفہ، بصرہ، واسط، شام اور مصر وغیرہ متعدد مقامات میں تشریف لے گئے۔ (۲)

حفظ وذکاوت: امام دارقطنی کا حافظہ غیر معمولی اور بے نظیر تھا، نہ صرف احادیث بلکہ دوسرے علوم کا بھی ان کا سینہ مخزن تھا، بعض شعرا کے دواوین ان کو ازبر تھے، قدیم عربوں کی طرح وہ تحریر وکتابت کے بجائے اکثر اپنے حافظہ ہی سے کام لیتے تھے، اپنے تلامذہ کو کتابیں زبانی املا کراتے تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کو الحافظ الکبیر، الحافظ المشہور، کان عالماً حافظاً وغیرہ لکھا ہے، ذہبی نے ان کو حافظ الزمان کہا ہے، حاکم فرماتے ہیں کہ ''وہ حافظہ میں

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ص ۳۴وکتاب الانساب ورق ۲۱۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۱۹۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۲۰۲۔

یکتائے روزگار تھے۔'' سمعانی کا بیان ہے کہ ''دار قطنی کا حافظہ ضرب المثل تھا'' علامہ ابن جوزی رقمطراز ہیں کہ ''وہ حافظہ میں منفرد اور یگانہ عصر تھے۔'' حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''بچپن ہی سے دار قطنی اپنے نمایاں اور غیر معمولی حافظہ کے لیے مشہور تھے'' ابو الطیب طاہری کا بیان ہے کہ ''بغداد میں جو بھی حافظ حدیث آتا وہ امام دار قطنی کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا اور اس کے بعد اس کے لیے ان کی علمی بلند پائیگی اور حافظہ میں برتری اور تقدم کا اعتراف کرنا لازمی ہو جاتا تھا'' ان کے حافظہ اور ذہانت کا یہ حال تھا کہ ایک ہی نشست میں ایک ہی روایت کی بیس بیس سندیں برجستہ بیان کر دیتے تھے، حافظ ذہبی نے اس طرح کے ایک واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کو دیکھ کر دار قطنی کی بے پناہ ذہانت، قوت حفظ اور غیر معمولی فہم و معرفت کے سامنے سرنگوں ہو جانا پڑتا ہے، شباب کے زمانہ میں ایک روز وہ اسماعیل صفار کے درس میں شریک ہوئے، وہ کچھ حدیثیں املا کرا رہے تھے، امام دار قطنی کے پاس کوئی مجموعہ حدیث تھا، یہ بیک وقت اس کو نقل بھی کرتے جاتے تھے اور صفار سے حدیثیں بھی سن رہے تھے، اس پر کسی شریک مجلس نے ان کو ٹوکا اور کہا تمہارا اسماع صحیح اور معتبر نہیں ہو سکتا، کیوں کہ تم لکھنے میں مشغول ہو اور شیخ کی مرویات کو ٹھیک سے سمجھنے اور سننے کی کوشش نہیں کرتے، امام دار قطنی نے جواب دیا کہ املا کو سمجھنے میں میرا طریقہ آپ سے مختلف ہے، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت شیخ نے اب تک کتنی حدیثیں املا کرائی ہیں؟ اس شخص نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ اب تک اٹھارہ حدیثیں املا کرائی ہیں، شمار کرنے پر وہ واقعی اٹھارہ ہی نکلیں، پھر آپ نے ایک ایک حدیث کو بے تکلف بیان کر دیا اور اسناد و متون میں وہی ترتیب بھی قائم رکھی جو شیخ نے بیان کی تھی، پورا مجمع اس حیرت انگیز ذہانت اور غیر معمولی حافظہ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

بعض مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شریک مجلس کے بجائے خود شیخ اسماعیل صفار نے ان کو تنبیہ فرمائی تھی۔

ابوبکر برقانی کا بیان ہے کہ میں اکثر ابومسلم بن مہران کے سامنے دارقطنی کی تعریف کیا کرتا تھا، ایک دن انھوں نے کہا تم دارقطنی کی تعریف میں افراط اور غلو سے کام لیتے ہو، ذرا ان سے رضراض کی وہ حدیث دریافت کرو جو ابن مسعودؓ سے مروی ہے میرے دریافت کرنے پر امام صاحب نے نہ صرف وہ حدیث بلکہ اس کے اختلافِ وجوہ اور امام بخاری کی اس روایت کے بارے میں خطا بھی واضح کر دی اور میں نے اس کو بھی علل میں شامل کر لیا۔(۱)

ثقاہت: حافظہ کی طرح ان کی ثقاہت بھی مسلم ہے، خطیب نے ان کے مناقب میں راست بازی، امانت اور عدالت کا ذکر کیا ہے، صاحب مشکوٰۃ نے اپنے دیباچہ میں امام دارقطنی کو اکابر محدثین اور ائمہ متقنین میں شمار کیا ہے۔

علل واسماء الرجال: وہ روایت کی طرح درایت کے بھی ماہر اور جرح وتعدیل کے فن میں امام تھے، ان کا شمار مشہور نقادان حدیث میں کیا جاتا ہے، ممتاز محدثین اور ائمہ فن نے ان کے اس کمال کا اعتراف کیا ہے، رجال کی تمام معتبر ومتداول کتابوں میں ان کے نقد وجرح کے اقوال موجود ہیں، حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ''امام کی عظمت وبراعتِ شان دیکھنی ہو تو ان کی علل کا مطالعہ کرو، تم مبہوت ہو جاؤ گے'' سعد بن علی زمانی سے چار ہم عصر محدثین، بغداد کے دارقطنی، مصر کے عبدالغنی بن سعید، اصبہان کے ابوعبداللہ بن مندہ اور نیشاپور کے ابوعبداللہ حاکم کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ ''دارقطنی علل سے واقفیت میں ان سب سے فائق ہیں۔'' خطیب کا بیان ہے کہ ''احادیث وآثار، عللِ حدیث، اسماء الرجال اور احوال ورواۃ کا علم ان پر ختم ہو گیا، حافظ ابن جوزی کا ارشاد ہے کہ ''امام دارقطنی کی علم حدیث، اسماء الرجال اور عللِ حدیث میں معرفت مسلم ہے'' حافظ ابن کثیر نے نہایت شاندار الفاظ میں ان کی ناقدانہ بصیرت وژرف نگاہی کا اعتراف کیا ہے، فرماتے ہیں

(۱) تاریخ بغداد صفحات ۳۶ تا ۳۸ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۹۹ تا ۲۰۱ وبستان المحدثین ص ۴۶۔

''احادیث پر نظر اور علل وانتقاد کے اعتبار سے وہ نہایت عمدہ تھے، اپنے دور میں فن اسماء الرجال، علل اور جرح وتعدیل کے امام اور فن درایت میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے۔'' ان کے معاصر وشاگرد حاکم کا بیان ہے کہ ''میں قیامِ بغداد کے زمانہ میں اکثر ان کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوتا تھا، یہ واقعہ ہے کہ میں نے ان کی جس قدر تعریفیں سنی تھیں ان سے بڑھ کر ان کو پایا، میں ان سے شیوخ، رواۃ اور عللِ حدیث کے متعلق سوالات کرتا تھا اور وہ ان کا جواب دیتے تھے، میری شہادت ہے کہ روئے زمین پر ان کی کوئی نظیر موجود نہیں۔''(۱) شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ ''فقہی احکام ومسائل اور حلال وحرام کی معرفت میں جو حیثیت مالک، سفیان ثوری، اوزاعی اور شافعی وغیرہ ائمہ فقہ کی رایوں اور اقوال کی ہے وہی حیثیت رجال اور صحیح وضعیف احادیث کے بارے میں یحییٰ بن معین، بخاری، مسلم، ابوحاتم، ابوزرعہ، نسائی، ابن عدی اور امام دارقطنی وغیرہ جہابذہ محدثین ونقادان فن کے کلام کی ہے۔''(۲) ان کی عظمت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علل میں ان کی تصنیف سب سے بہتر اور جامع خیال کی جاتی ہے اور اس فن میں ان کے بعض اولیات بھی ہیں، مثلاً مدبج (روایت اقران) کی ایجاد کا فخر ان ہی کو حاصل ہے، عراقی کا بیان ہے کہ ''میرے علم کے بموجب دارقطنی نے سب سے پہلے اس اصطلاح کو وضع کیا ہے۔''(۳)

ازہری کا بیان ہے کہ ایک دفعہ کسی حدیث کی علت یا کسی راوی کے متعلق محمد بن ابی الفوارس کو جواب دیتے ہوئے فرمایا: ''اے ابوالفتح! مشرق ومغرب کے درمیان اس فن کا جاننے والا میرے سوا کوئی نہیں۔'' حمزہ بن محمد بن طاہر دقاق نے مندرجہ ذیل شعروں میں ان کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے:

---

(۱) تدریب الراوی ص ۲۷۷ تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۷ وتذکرہ ج ۳ ص ۲۰۰ کتاب الانساب ورق ۲۱۷، المنتظم ج ۷ ص ۱۸۳ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷ (۲) الرد علی البکری ص ۱۳ (۳) تدریب الراوی ص ۲۱۷۔

جعلناك فيما بيننا ورسولنا ☆ وسيطا فلم تظلم ولم تتحرب

فانت الذی لولاك لم يعرف الورى ☆ ولو جهد واما صادق من مكذب

ترجمہ: اے امام حدیث! آپ ہمارے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان بہترین اور عمدہ واسطہ ہیں اگر آپ کی پر کمالات ذات نہ ہوتی تو لوگ انتہائی کوششوں کے باوجود بھی سچے اور جھوٹے راویوں اور صحیح و غلط حدیثوں میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔''

حدیث و اسماء الرجال سے ان کی گہری واقفیت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے جملوں میں معمولی غلطی بھی کرتا تو وہ فوراً اس کو تاڑ جاتے اور بروقت اس کی اصلاح کر دیتے تھے، ایک مرتبہ خلال نے یہ حدیث پڑھی: اللهم انك عفو تحب العفو فاعف عني، اس میں انھوں نے عفو کو مخفف پڑھا تو امام صاحب نے فوراً ٹوکا کہ عفو مشدد ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں ''علل حدیث و رجال کی معرفت میں یگانہ روزگار اور عدیم المثال تھے۔'' حاکم اور اس فن کے دوسرے ممتاز ائمہ نے اس کا اعتراف کیا ہے۔(۱)

حدیث میں درجہ: امام دارقطنی کو اصل شہرت حدیث میں امتیاز کی بنا پر حاصل ہے، ان کے حفظ و ضبط، ثقاہت و اتقان، روایت و درایت میں مہارت اور علل کی معرفت وغیرہ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا، اس سے بھی ان کے حدیث میں کمال، بلند پائیگی اور تبحر کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے، ائمہ فن اور نامور محدثین نے ان کے عظیم المرتبت اور صاحب کمال محدث ہونے کا اعتراف کیا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ ''احادیث و آثار کا علم ان پر ختم ہو گیا، وہ حدیث میں یکتائے روزگار، عجوبۂ دہر اور امام فن تھے۔'' امام بخاری کی طرح امام دارقطنی کو بھی ان کے زمانہ میں امیر المومنین فی الحدیث (اقلیم حدیث کے تاجدار) کا خطاب ملا تھا، عبدالغنی بن سعید کا بیان ہے کہ ''حدیث پر بحث و گفتگو میں تین اشخاص اپنے اپنے زمانہ

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۸، ۳۹ و تذکرہ ج ۳ ص ۲۰۱ و بستان المحدثین ص ۴۶۔

میں نہایت ممتاز تھے، علی بن مدینی، موسیٰ بن ہارون اور علی بن عمر دار قطنی ''علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں ''وہ علم حدیث میں منفرد اور امام تھے، ان کے معاصرین میں کوئی اس رتبہ اور پایہ کا شخص نہیں گذرا، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں، روایت کی وسعت و کثرت کے اعتبار سے وہ امامِ دہر تھے، ابن عماد حنبلی کہتے ہیں ''حدیث اور اس کے متعلق فنون میں وہ منتہی تھے اور اس میں امیر المومنین کہلاتے تھے'' ابوبکر بن ہبۃ اللہ صاحب طبقات الشافعیہ..... لکھتے ہیں کہ ''وہ اپنے دور میں حدیث کے امام تھے'' ابوالطیب طبری کا بیان ہے کہ امام صاحب کی مجلس میں ایک روز مسِ ذکر کی حدیث پڑھی جارہی تھی، امام صاحب نے اس کے بے شمار طرق جمع کر کے اس کے فوائد پر عمدہ تقریر کی اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر امام احمد بھی اس وقت موجود ہوتے تو وہ اس معاملہ میں مجھ سے استفادہ کرتے۔'' (۱)

امام صاحب کے اس فن میں مقام و مرتبہ کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صحاح ستہ کے مصنفین کے بعد جن مصنفین کو معتبر اور جن کی تصنیفات کو مستند اور زیادہ پر منفعت خیال کیا گیا ہے، ان میں ان کا نام نامی بھی ہے، ابن صلاح، نووی، صاحبِ مشکوٰۃ اور علامہ سیوطی نے اس حیثیت سے ان کا ذکر واعتراف کیا ہے۔ (۲)

فقہ وخلافیات: امام صاحب فقہ میں ممتاز فقہا کے مذاہب ومسالک کے نہایت واقف کار اور خلافیات کے بڑے ماہر تھے، ان کی سنن بھی اس پر شاہد ہے، خطیب لکھتے ہیں کہ ''حدیث کے علاوہ مذاہب فقہا کی معرفت میں بھی ان کا درجہ نہایت بلند ہے'' کتاب السنن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو فقہ سے بڑا اعتنا واشتغال تھا، کیوں کہ کتاب کے محتویات ومشمولات کو وہی شخص جمع اور مرتب کرسکتا ہے جس کو احکام ومسائل اور فقہا کے

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴، ۳۶، ۳۸ وابن خلکان ج ۲ ص ۵ والبدایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷، طبقات الشافعیہ لابی بکر ص ۳۳، شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۱۶ وکتاب الانساب ورق ۲۱۷ (۲) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۲ تدریب الراوی ص ۲۹۰ مقدمہ کمال ص ۱۷۔

اختلافات سے اچھی اور پوری طرح واقفیت ہو، اس فن کو انھوں نے ابوسعید اصطخری اور ایک روایت کے مطابق ان کے کسی خاص شاگرد سے حاصل کیا تھا، مورخین اور سوانح نگاروں کا متفقہ بیان ہے کہ: وکان عارفا باختلاف الفقهاء (۱)

فقہی مذہب: اگرچہ امام دارقطنی شافعی المذہب تھے لیکن ان کا شمار اس مذہب کے صاحبِ وجوہ فقہا میں ہوتا ہے، صاحبِ وجوہ وہ فقہا کہلاتے ہیں جنھوں نے اپنے ائمہ کے مذاہب کی تکمیل اور ان سے منسوب مختلف روایتوں کے درمیان تطبیق وترجیح اور ان کے وجوہ وعلل واضح کیے ہیں اور جن مسائل کے متعلق ان کے ائمہ کی تصریحات موجود نہیں تھیں، ان کو ان کے اصول وعلل پر قیاس کر کے فتوی دیا ہے۔'' ابن خلکان نے دارقطنی کو فقیہا علی مذہب الشافعی اور یافعی نے صاحب الوجوہ فی المذہب لکھا ہے۔ (۲)

نحو، تفسیر، قرأت وتجوید: امام صاحب کو علم نحو، فن قرأت وتجوید میں ید طولی حاصل تھا اور تفسیری وقرآنی علوم سے بڑا شغف تھا، ابوالفدا کا بیان ہے کہ ''وہ قرآنیات کے امام تھے؛'' حاکم کہتے ہیں کہ وہ نحاۃ وقراء کے امام اور تجوید وقرأت میں بلند پایہ تھے، انھوں نے حروف ومخارج کی تصحیح وادائیگی کا علم بچپن میں ابوبکر بن مجاہد سے سیکھا اور محمد بن حسین نقاش طبری، احمد بن محمد دیباجی ابوسعید قزاز وغیرہ ماہرین فن سے اس کی باقاعدہ تکمیل کی اور آخر عمر میں خود اس فن میں مرتبہ امامت واجتہاد پر فائز ہو گئے اور اس میں ایک رسالہ بھی لکھا، اس میں قدیم قراء سے مختلف ایک نیا طرز انھوں نے ایجاد کیا تھا، یہ طرز بعد میں مقبول ہوا اور لوگوں نے اسے اختیار کیا۔ (۳)

شعر وادب: امام دارقطنی شعر وادب کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے، بعض شعرا کے دواوین ان کو زبانی یاد تھے، عربی زبان وادب پر ان کو اس قدر قدرت اور کامل عبور تھا کہ ایک دفعہ مصر

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۵ التاج المکلل ص ۴۵ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۵ ومرآۃ الجنان ج ۲ ص ۴۲۵ (۳) تاریخ ابوالفدا ج ۲ ص ۱۳۰ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۰ و ۲۰۳ وتاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴ و ۳۵۔

تشریف لے گئے تو وہاں علوی خاندان کے ایک شخص مسلم بن عبداللہ موجود تھے، یہ ادب، فصاحت و بلاغت اور زبان دانی کے بڑے ماہر تھے، ان کے پاس زبیر بن بکار کی کتاب الانساب تھی جس کو حضر بن داؤد نے ان سے روایت کیا تھا اور جو انساب کے علاوہ اشعار اور ادبی فکاہات ولطائف کا بھی بہترین مجموعہ تھی، لوگوں نے امام دارقطنی سے اس کی قرأت کی فرمائش کی، امام صاحب نے سب کے شدید اصرار کی وجہ سے اس کو منظور کرلیا، چنانچہ اس تقریب کے لیے ایک مجلس کا اہتمام کیا گیا، اس میں مصر کے نامور علما وفضلا اور اساطینِ شعر وادب بھی شریک ہوئے تاکہ امام دارقطنی کی غلطیوں کی گرفت کرسکیں لیکن ان لوگوں کو ناکامی ہوئی، امام کے حیرت انگیز کمال کو دیکھ کر سب دنگ رہ گئے، خود مسلم کو بھی ان کے ادبی مذاق کی پختگی وبلندی اور عربی زبان پر غیر معمولی قدرت اور دسترس کا اعتراف کرنا پڑا۔(۱)

جامعیت: ان گوناگوں کمالات سے ان کی جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے، گو ان کو اصل شہرت حدیث میں امتیاز کی وجہ سے ہے تاہم وہ کسی فن میں بھی عاجز وقاصر نہ تھے، خطیب کا بیان ہے کہ "حدیث کے علاوہ بھی متعدد علوم وفنون میں ان کو درک ومہارت تھی۔" ازہری کا بیان ہے کہ امام دارقطنی بڑے ذہین وطباع تھے، ان کے سامنے کسی علم کا بھی تذکرہ کیا جاتا تو اس کے متعلق معلومات کا بیشار ذخیرہ ان کے پاس ہوتا، محمد بن طلحہ بغالی ایک روز ان کے ساتھ کسی دعوت میں شریک تھے، جب کھانے پر گفتگو چھڑی تو دارقطنی نے اس کے اتنے واقعات وحکایات اور نوادر وعجائب بیان کیے کہ رات کا اکثر حصہ ختم ہوگیا، حاکم سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ نے دارقطنی کی طرح کوئی جامعِ کمالات شخص دیکھا ہے، تو انھوں نے نفی میں جواب دیا، ابوالفدا کا بیان ہے کہ وہ متعدد علوم میں جامع تھے۔(۲)

فہم ودانش: اللہ تعالیٰ نے ان کو فہم ودانش سے بھی سرفراز کیا تھا، حاکم کا بیان ہے کہ امام

(۱) تذکرۃ الحفاظ وتاریخ بغداد حوالۂ مذکورہ (۲) تاریخ بغداد ج۱۲ ص۳۶ وتذکرۃ الحفاظ ج۳ ص۲۰۰ وتاریخ ابوالفدا ج۲ ص۱۳۰۔

دار قطنی اس حیثیت سے بھی یکتائے روزگار تھے، خطیب نے ان کے فقہ وفہم کی تعریف کی ہے۔(۱)

ورع وتقویٰ: حاکم کا بیان ہے کہ وہ ورع وتقویٰ میں بے مثال تھے، خلال کا بیان ہے ایک روز میں اپنے ایک استاد کے یہاں گیا وہاں ابوالحسین بن مظفر، قاضی ابوالحسن جراحی اور امام دارقطنی وغیرہ ائمہ فن واصحاب کمال موجود تھے، جب نماز کا وقت ہوا تو دارقطنی نے امامت کی، حالانکہ اس مجلس میں ان سے زیادہ معمر مشائخ موجود تھے، امام صاحب دین کے معاملہ میں کسی مصلحت، نرمی اور مداہنت کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کے زمانہ میں شیعیت کا زور تھا لیکن انھوں نے شیعوں کے علی الرغم حضرت عثمانؓ کو حضرت علیؓ سے افضل قرار دیا۔(۲)

شہرت ومقبولیت: امام صاحب اپنے بے شمار کمالات کی وجہ سے نہایت مقبول ومحترم سمجھے جاتے تھے، امام اور شیخ الاسلام ان کے نام کا جز ہو گیا تھا، جب مسندِ درس پر رونق افروز ہوتے تو تشنگانِ علوم کا ہجوم اردگرد رہتا تھا، آپ کی مجلسِ درس نہایت باوقار اور پر ہیبت ہوتی تھی، نامور محدثین کو بھی احترام کی وجہ سے لب کشائی کی جرأت نہیں ہوتی تھی، ابن شاہین ایک مرتبہ ان کے درس میں شریک ہوئے تو ان پر اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ ایک کلمہ بھی زبان پر نہ لا سکے کہ مبادا کوئی غلطی ہو جائے، آپ کے تلامذہ ہمیشہ آپ کا نام عزت واحترام کے ساتھ لیتے تھے، عبدالغنی جو خود بھی نامور اور صاحب کمال محدث تھے اور بقول برقانی دارقطنی کے بعد میں نے ان سے بڑا کوئی حافظِ حدیث نہیں دیکھا لیکن جب کبھی وہ دارقطنی کے حوالہ سے کوئی بات بیان کرتے تو قال استاذی سمعت استاذی وغیرہ ضرور کہتے، اس کا سبب دریافت کیا گیا تو نہایت فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا کہ ہم نے یہ جو دو چار حروف سیکھے ہیں وہ ان ہی امام دارقطنی کا فیض ہے۔(۳)

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴ وتذکرہ حوالہ مذکورہ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۸ (۳) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۹۶۔

لطائف وظرائف: امام صاحب بڑے پر مذاق اور شگفتہ مزاج تھے، اس لیے لطف وتفریح مزاح وتفنن اور دلچسپی کی باتیں بھی کرتے تھے، ایک روز ابوالحسن بیضاوی آپ کی خدمت میں ایک شخص کو لے کر آئے اور آپ سے کچھ حدیثیں املا کرانے کی فرمائش کی، امام صاحب نے پہلے معذرت کی اور کہا مجھے فرصت نہیں ہے لیکن بیضاوی نے اصرار کیا اور کہا کہ یہ مسافر ہیں اور دور دراز سے محض حدیث کی تلاش وتحصیل کے لیے آئے ہیں، امام صاحب نے اسی وقت اپنی یادداشت سے ایک حدیث بیس طرق اور سندوں سے بیان کی، سب کا متن یہ تھا نعم الشی الهدية امام الحاجة۔ یعنی حاجت اور غرض پیش کرنے سے پہلے ہدیہ کرنا بہت عمدہ بات ہے، جب دوسرے دن یہ صاحب پھر تشریف لائے تو اپنے ساتھ کچھ مناسب ہدیہ بھی لائے، امام دارقطنی نے ان کو اپنے قریب بیٹھایا اور ایک حدیث سترہ طرق سے زبانی املا کرائی جس کا متن یہ تھا:

اذا اتاکم کریم قوم فاکرموه — جب کسی قوم کا سردار یا شریف آدمی تمہارے پاس آئے تو اس کی تعظیم کرو۔

ان کی شگفتگی مزاج کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک دن نفل پڑھ رہے تھے، اتفاقاً ان کے پاس ہی ایک شخص کسی مجموعۂ حدیث کے مطالعہ میں مشغول تھا، اس نے ایک راوی نسیر (بنون وسین مصغر) کو بشیر (بباۓ موحدہ وشین معجمہ) پڑھا، امام دارقطنی نے نماز ہی میں ان کو متنبہ کرنے کے لیے سبحان اللہ کہا وہ سمجھ گئے لیکن دوبارہ بھی غلط ہی پڑھا اور نسیر کہنے کے بجائے یسیر (بضم یا وسین مصغر) کہا، امام صاحب نے دیکھا کہ اب بھی وہ صحیح نہیں پڑھ رہا ہے تو یہ آیت تلاوت کی: (ن والقلم ومايسطرون) تب قاری نے سمجھا کہ یہ نسیر ہے۔(۱)

(۱) امام دارقطنی شافعی المذہب تھے، شوافع کے یہاں نماز میں اس طور پر تلقین کرنا جائز ہے مگر امام ابوحنیفہؒ کے یہاں جائز نہیں ہے۔

اسی قسم کا ایک لطیفہ اور بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ نفل ادا کر رہے تھے کہ ابوعبداللہ کاتب نے عمرو بن شعیب کا نام غلطی سے عمرو بن سعید پڑھا، امام دارقطنی نے سبحان اللہ کہا قاری سمجھ گیا کہ میں نے غلط پڑھا ہے، اس لیے سند دہرا کر خاموش ہوگیا، امام صاحب نے اس کی تصحیح کے لیے یہ آیت پڑھی (يَاشُعَيْبُ أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ)(۱)

یہ واقعات محض لطائف ہی نہیں ہیں بلکہ ان سے امام صاحب کی ذہانت، قوتِ حفظ، استحضارِ علم اور حدیث میں بالغ نظری اور مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

اخلاق وعادات: امام صاحب کے اخلاق وعادات کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا لیکن بعض واقعات اور مورخین کے ضمنی بیانات سے ان کی طبعی شرافت اور حسن اخلاق کا پتہ چلتا ہے، مثلاً وہ فضول باتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے اور خاموشی کو پسند کرتے تھے، طبیعت میں نرمی اور انکساری تھی، لوگوں کی دلآزاری سے پرہیز کرتے تھے، طلبہ کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے، ان کی علمی امداد واعانت بھی کرتے، امام صاحب کی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی سے بھی ان کے حسنِ اخلاق کا پتہ چلتا ہے۔

عقائد: وہ بڑے صحیح العقیدہ تھے، مذہبی واعتقادی مسائل میں ان کا مسلک وہی تھا جو اہلسنت والجماعت کا ہے، مورخ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ فہم وفراست، حفظ وذکاوت، صدق وامانت اور ثقاہت وعدالت وغیرہ اوصاف کی طرح صحتِ اعتقاد اور سلامتی مذہب سے بھی متصف تھے، (۲) دوسرے مورخین نے بھی ان کے عقیدہ کی صحت ودرستگی کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان پر شیعیت کا الزام عائد کیا جاتا ہے، اس پر آگے بحث کی جائے گی۔

وفات: مشہور روایت کے مطابق ان کا انتقال ۸/ ذوقعدہ ۳۸۵ھ کو ہوا، مشہور فقیہ ابوحامد اسفرائنی نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور مشہور بزرگ معروف کرخی کے مزار کے متصل بابِ

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۹، تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۱، بستان المحدثین ص ۴۶ واتحاف النبلاء المتقین ص ۳۱۷ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴۔

حرب میں سپرد خاک کیے گئے، ابونصر بن ماکولا کا بیان ہے کہ میں نے رمضان کی ایک رات میں خواب دیکھا کہ کسی سے امام دارقطنی کے اخروی انجام کے بارے میں سوال کر رہا ہوں اور وہ یہ جواب دے رہے ہیں کہ جنت میں دارقطنی امام کہلاتے ہیں۔(۱)

امام دارقطنی پر بعض اعتراضات: امام دارقطنی کی عظمتِ شان اور زہد واتقا میں امتیاز کے باوجود ان پر چند اعتراضات کیے گئے ہیں اس لیے ذیل میں ان کو نقل کر کے ان کا جواب تحریر کیا جاتا ہے۔

شیعیت کا الزام: ان پر سب سے بڑا الزام شیعیت کا لگایا گیا ہے لیکن اس کی حقیقت صرف اس قدر بیان کی جاتی ہے کہ ان کو مشہور شیعی شاعر سید حمیری (۲) کا دیوان زبانی یاد تھا، چنانچہ خطیب لکھتے ہیں کہ ”میں نے حمزہ بن محمد بن طاہر دقاق کو یہ کہتے سنا کہ ابوالحسن دارقطنی کو منجملہ اور دواوین کے سید حمیری کا دیوان بھی زبانی یاد تھا، اسی وجہ سے ان کی طرف شیعیت کی نسبت کی جاتی ہے، ابن خلکان کا بیان ہے کہ ان کو جن عرب شعرا کے دواوین یاد تھے ان میں سید حمیری کا دیوان بھی تھا، اسی لیے ان پر شیعیت کا الزام لگایا گیا ہے،(۳) دوسرے مورخین نے بھی اسی چیز کو نقل کیا ہے اس کے علاوہ امام صاحب کی شیعیت کا اور کوئی

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ص ۴۰ وابن خلکان ج ۲ص ۵و۶ (۲) اس کا نام اسماعیل، کنیت ابوالہاشم اور نسب نامہ یہ ہے: اسماعیل بن محمد بن یزید بن ربیعہ بن مضر حمیری، اس کی ماں قبیلہ ازد کی تھی، یہ بڑا مشہور اور باکمال پرگو شاعر تھا لیکن نہایت دریدہ دہن، بدزبان اور غالی شیعہ تھا، ہجوگوئی کے لیے مشہور تھا، زیاد کی ہجو کہی تو اس کے لڑکے عبیداللہ نے اس کو قید کر لیا اور سخت سزائیں دیں لیکن حضرت معاویہؓ نے اسے آزاد کر دیا، صحابہ کرامؓ اور ازواج مطہراتؓ کی شان میں طعن وتشنیع، سب وشتم اور گستاخی ودریدہ دہنی اس کا شعار بن گیا تھا، اللہ کی شان دیکھیے کہ اس کے کمالات کے باوجود اس کی یاوہ گوئی اور دریدہ دہنی کی وجہ سے اس کا نام ونشان اور کلام سب مٹ گیا (کتاب الاغانی ج ۷ص ۲)(۳) تاریخ بغداد ج ۱۲ص ۳۵ وتاریخ ابن خلکان ج ۲ص ۶۔

ثبوت نہیں بیان کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے محض اتنی سی بات پر امام صاحب کو شیعیت سے متہم کرنا غلط اور سراسر خلافِ انصاف ہے، یہ پہلے گذر چکا ہے کہ ان کو زبان وادب اور شعر وسخن کا عمدہ ذوق تھا، اپنے اس ذوق کی تسکین کے لیے وہ ادب ومحاضرات کی کتابوں اور شعرا کے دواوین کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے، ان کا حافظہ نہایت قوی تھا، اس لیے اکثر چیزیں ان کے لوحِ قلب پر نقش ہو جاتی تھیں، سید حمیری یاوہ گو اور شیعہ ہونے کے باوجود ایک باکمال شاعر تھا، اس کا کلام ادبی لطائف ورعنائی سے معمور ہوتا تھا، اس کی خوبیوں اور لطفِ زبان کی وجہ سے امام صاحب کو اس اس سے دلچسپی رہی ہوگی اور یہ ان کو زبانی یاد ہو گیا ہوگا لیکن اس کا شیعیت سے کیا تعلق؟ یہ تو درحقیقت فن اور اہل علم کی قدردانی ہے لیکن تاریخِ اسلام میں جس طرح بے شمار مقدس اور برگزیدہ علمائے اسلام کو بے بنیاد اعتراضات اور بے سروپا الزامات کا نشانہ بنایا گیا ہے، اسی طرح امام صاحب پر بھی یہ الزام عائد کر دیا گیا اور اکابر پر ممکن ہے اس قسم کے الزامات کے کچھ وجوہ رہے ہوں لیکن امام دارقطنی کو شیعیت سے متہم کرنے کی معمولی وجہ بھی موجود نہیں ہے، چنانچہ حافظ ذہبی نے اس الزام کا ذکر کرنے کے فوراً بعد ہی اس کی پرزور تردید بھی کی ہے ما ابعد من التشیع یعنی ان کا شیعیت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ (تذکرہ ج ۳ ص ۲۰۰)

امام صاحب کے حالات وواقعاتِ زندگی سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے، کیوں کہ بعض ایسے صریح قرائن اور واضح شواہد موجود ہیں جن سے امام صاحب کی شیعیت سے بیزاری کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً:

ابن طاہر کا بیان ہے کہ بغداد میں ایک بار تفضیلِ علیؓ کے متعلق اختلاف ہوا لوگ امام دارقطنی کی خدمت میں استفسار کے لیے آئے، انھوں نے پہلے تو خاموشی اختیار کی مگر پھر فوراً ان کو خیال ہوا کہ یہ ایک مذہبی واعتقادی مسئلہ ہے اس میں مصالح کو دخل دینا

اور کتمانِ حق سے کام لینا نامناسب ہوگا، اس لیے بلا جھجک یہ فرمایا کہ حضرت عثمانؓ افضل ہیں کیوں کہ صحابہ کا اس پر فی الجملہ اتفاق ہے اور یہی اہلسنت والجماعت کا مسلک ہے،(۱) ایسے زمانہ میں جب شیعیت کا اس قدر غلبہ رہا ہو اس قسم کی بات کہنا حق گوئی، جرأت اور بیباکی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

امام دارقطنی کے اساتذہ میں ایک شخص کا نام ابوالعباس احمد بن محمد بن سعید کوفی الملقب بابن عقدہ ہے، یہ اگرچہ جلیل القدر محدث ہیں لیکن ان کا شیعیت کی جانب رجحان تھا، اس لیے امام صاحب ان کو ناپسند کرتے تھے، چنانچہ ایک موقع پر ان کے متعلق فرمایا:

حافظ محدث ولم يكن في	وہ حافظ ومحدث تھے لیکن دین میں
الدين بقوى لازيد فيه على	زیادہ قوی نہیں تھے، اس سے زیادہ میں
هذا۔	ان کے بارے میں اور کچھ نہیں کہوں گا

لیکن حمزہ بن محمد بن طاہر فرماتے ہیں کہ امام دارقطنی نے ان کے بارے میں کسی قدر سخت الفاظ بھی کہے ہیں حافظ ذہبی لکھتے ہیں كانه يشير الى الرفض (۲)(گویا اس سے ان کی شیعیت کی طرف اشارہ تھا)

ان واضح اور صریح واقعات کی موجودگی میں یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ان کا شیعیت سے ادنیٰ تعلق بھی رہا ہوگا، ان کے فضل وکمال تدین وتقویٰ اور عقیدہ میں صحت وپختگی کا پہلے جو ذکر ہو چکا ہے اس کے بعد ان کے متعلق اس قسم کے الزام کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

تدلیس: دوسرا اعتراض تدلیس کا ہے، ذہبی نے اس کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے بغوی سے جو روایتیں نہیں سنی ہیں ان کو اس طرح بیان کرتے تھے "قرء البغوى ابى القاسم حدثكم فلان۔" اس اعتراض کی بنیاد اس امر پر ہے کہ بغوی کی وفات

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۲ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۲ و ۵۹ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۶۵۔

کے وقت امام صاحب کمسن تھے، ابو یوسف قواس کا بیان ہے کہ "ہم لوگ بغوی کے پاس جاتے تھے تو دارقطنی بھی ہمارے پیچھے پیچھے جاتے تھے، یہ اس وقت اتنے چھوٹے تھے کہ ان کے ہاتھ میں روٹی اور سالن ہوتا تھا لیکن اس بیان سے خود دارقطنی کی بغوی سے ملاقات اور سماع کا ثبوت ملتا ہے کیوں کہ مشہور روایت کے مطابق امام دارقطنی ۳۰۶ھ میں پیدا ہوئے اور ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز بغوی نے ۳۱۷ھ میں انتقال کیا، دوسرے ان دونوں بزرگوں کا وطن بغداد تھا، اس اعتبار سے گیارہ سال کی عمر میں اپنے وطن کے شیخ سے سماع واستفادہ میں دشواری کی کوئی بات معلوم نہیں ہوتی رہا تدلیس کا معاملہ تو اس کا ذہبی کے علاوہ کسی اور نے ذکر نہیں کیا ہے اگر تنہا ذہبی کی حکایت صحیح مان لی جائے تو بھی محض نفس تدلیس ثقاہت کے لیے مانع نہیں ہے۔

خودستائی: امام دارقطنی نے بعض مواقع پر خود اپنی ہی زبان سے اپنی تعریف کی ہے، اس کو پہلے لکھا جا چکا ہے مگر اس کا جائزہ لینے کے لیے اس کو دوبارہ نقل کرنا ضروری ہے۔

ایک موقع پر آپ نے اپنے کو سب سے جامع اور افضل قرار دیا، ایک موقع پر کچھ حدیثوں کا املا کرانے اور ان کے فوائد پر تقریر کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر امام احمد بھی موجود ہوتے تو استفادہ کرتے، اسی طرح ایک دفعہ ایک حدیث کی علت کے متعلق سوال کا جواب دیتے ہوئے ابن ابی الفوارس سے یہ کہا کہ "شرق وغرب میں اس فن کا مجھ سے بہتر کوئی جاننے والا نہیں۔"

بلاشبہ اپنی تعریف خود ہی کرنا معیوب ضرور ہے لیکن اگر یہ خلاف واقعہ نہ ہو تو بعض حالات جیسے تحدیث نعمت، طلبہ کی ترغیب وتشویق اور لوگوں کی خواہش واصرار یا اور کسی ضرورت ومجبوری کی بنا پر اس میں قباحت نہیں رہ جاتی ہے، دوسرے یہ کوئی ایسی معصیت نہیں ہے جس کی کسی حال میں بھی گنجائش نہ ہو، امام صاحب کے جو اوصاف وکمالات پہلے بیان کیے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی جانب کوئی خلاف واقعہ بات

منسوب نہیں کی ہے اور آپ کی عظمت و بلند پائیگی اور شان زہد و ورع سے یہ بعید بھی ہے کہ بلا کسی خاص ضرورت اور وجہ کے خود ستائی سے آپ کی زبان آلودہ ہوئی ہو چنانچہ اپنی جامعیت کا تذکرہ کرنے سے پہلے آپ نے سوال کو ٹالنے کی پوری کوشش کی، یہاں تک کہ قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی:

فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ. (۱) (نجم-۲)	سوتم (بہت) اپنی پاکیزگی (جتایا) نہ کرو پرہیزگاروں کو وہی خوب جانتا ہے۔

لیکن اس پر بھی سائل خاموش نہ ہوا اور مصلحت داعی ہوئی تو آپ نے مناسب اور جائز وصف کا تذکرہ کیا، اسی پر دوسرے مواقع کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔

یافعی کا اعتراض: امام دارقطنی طلبہ کی حوصلہ افزائی اور اہل علم کے علمی و تصنیفی کاموں میں ان کی امداد کرتے تھے، ان کے شاگرد عبدالغنی کی کتاب المؤتلف والمختلف درحقیقت ان ہی سے استفادہ کا نتیجہ تھی، اسی طرح کافور اخشیدی کے وزیر ابوالفضل جعفر المعروف بابن خزابہ کے بارے میں آپ کو معلوم ہوا کہ وہ مسند تالیف کرنا چاہتے ہیں تو بغداد سے مصر تشریف لے گئے اور مسند کی تالیف تک وہاں قیام پذیر رہ کر اس کی امداد فرماتے رہے، ابوالفضل نے آپ کی خوب پذیرائی اور بڑا اعزاز و اکرام کیا اور واپسی کے وقت اس قدر مال و دولت آپ کے ہمراہ کیا کہ آپ کو ایک حد تک فراغت میسر آ گئی۔ (۲)

بظاہر اس واقعہ میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے، بلکہ یہ درحقیقت امام صاحب کی علم دوستی کا ثبوت ہے لیکن یافعی صاحب مرأۃ الجنان نے اس کو ان کی شان کے منافی اور خلاف اولیٰ قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ''امام صاحب نے اگرچہ ابن خزابہ کو مسند کی

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۵ و تذکرہ ج ۳ ص ۲۰۱ و ابن خلکان ج ۲ ص ۵۔ (۲) یہ واقعہ تمام کتابوں میں مذکور ہے۔

تخریج میں مدد پہنچانے کے لئے یہ سفر کیا تھا لیکن علمائے متدینین کے لئے میں اس کو مناسب نہیں سمجھتا، اگر اس قسم کا معاملہ وزرا و امرا کے بجائے اصحابِ علم و دین کے ساتھ کیا گیا ہوتا اور اس میں حصولِ دنیا کی کوئی آرزو شامل نہ ہوتی تو البتہ یہ ایک اچھی بات ہوتی اور اس کو اشاعتِ علم اور اعانت فی الخیر پر محمول کیا جاتا۔(۱)

اس اعتراض کا تجزیہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب نے مسند کی تالیف میں مدد پہنچا کر وزیر سے اپنے علم وفن کا معاوضہ قبول کیا، حالاں کہ اولاً تو معاوضہ قبول کرنے کی اکثر علما کے یہاں گنجائش ہے، دوسرے یہ معاملہ سرے سے معاوضہ میں داخل ہی نہیں ہے کیوں کہ امام صاحب نے پہلے سے اس قسم کا کوئی مطالبہ یا معاملہ نہیں کیا تھا بلکہ اس نے خود اور بلا طلب آپ کی امداد کی تھی، امام صاحب کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی، اس لیے آپ نے اس کے انعام و اکرام سے مستفید ہونا قبول کر لیا، کہیں اس قسم کی کوئی تصریح موجود نہیں ہے کہ آپ نے حرص و لالچ کی وجہ سے یہ سفر کیا تھا۔

تعصب: امام دارقطنی پر یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ وہ متعصب تھے، شافعی مذہب میں ان کو غیر معمولی غلو تھا اور اس کے برعکس وہ حنفی مذہب سے سخت عناد رکھتے تھے، پہلی بات کے ثبوت میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے مصر کے لوگوں کی فرمائش پر ایک رسالہ تحریر کیا، اس میں انھوں نے جہری نمازوں میں زور سے بسم اللہ پڑھنے کے متعلق حدیثیں جمع کی تھیں لیکن جب ان سے ان حدیثوں کی صحت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے اعتراف کیا کہ ''جہر بالبسملہ کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے، البتہ صحابۂ کرام سے اس کے متعلق صحیح اور ضعیف دونوں قسم کی روایتیں ملتی ہیں۔(۲)

اس واقعہ سے امام دارقطنی پر دو شبہات عائد ہوتے ہیں:

۱- انھوں نے جان بوجھ کر ضعیف اور غیر ثابت حدیثیں جمع کیں۔

(۱) مرآۃ الجنان ج۲ ص۴۲ (۲) فتاوی ابن تیمیہ ج۱ ص۷۷ و نصب الرایہ ج۱ ص۳۵۸ و ۳۵۹، کبیری ص۳۶

(۲) اس علم وواقفیت کے باوجود بھی کہ صحیح حدیثوں سے جہر بالبسملہ کی تائید نہیں ہوتی، انھوں نے اس سے رجوع نہیں کیا۔

پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ امام صاحب کا مقصد اس باب کی تمام احادیث کا استقصا اور ایک جامع رسالہ تالیف کرنا تھا، اس لیے انھوں نے اس میں ضعیف حدیثیں بھی درج کردی ہیں چنانچہ سنن میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''ان لوگوں کے علاوہ جن کا یہاں ہم نے نام لیا ہے، صحابۂ کرام اور ازواج مطہرات کی ایک جماعت نے جہر بالبسملہ کی حدیثیں بیان کی ہیں، ان کی اس نوعیت کی حدیثوں کو ہم مستقلاً کتاب الجہر میں لکھ چکے ہیں، یہاں اختصار کی وجہ سے ان ہی چند لوگوں کی روایتوں پر اکتفا کیا گیا ہے، اس رسالہ میں ان صحابہ وتابعین کے مرویات بھی جمع کئے گئے ہیں جو بسم اللہ زور سے پڑھنے کے قائل ہیں اور ان کے بھی جو ان کے مخالف یعنی آہستہ سے پڑھنے کے قائل ہیں۔''(۱)

اس کا جماعتی عصبیت سے کوئی تعلق نہیں، اگر امام دارقطنی کے پیش نظر جماعتی عصبیت ہوتی تو وہ اس میں اور سنن میں صرف جہر کی موید حدیثیں ہی شامل کرتے لیکن انھوں نے موید کے ساتھ مخالف حدیثیں بھی درج کر کے درحقیقت انصاف اور حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے، اس معاملہ میں انھوں نے مصر کے جو شوافع کا مرکز تھا لوگوں کی خواہش اور مرضی کی بھی کوئی پروانہ کی، جو چاہتے تھے کہ امام صاحب صرف جہر کی موید حدیثیں جمع کریں، مگر امام صاحب نے استقصاء وجامعیت کے پیش نظر ہر قسم کی حدیثیں جمع کیں اور لوگوں کے سوال پر صاف صاف اقرار بھی کرلیا کہ جہر کے متعلق کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں، اسی طرح سنن میں بھی اس نوعیت کی بعض حدیثوں کے ضعف ووہن کی وضاحت کی ہے۔

رہا رجوع کا معاملہ تو وہ خالی از امکان نہیں، کیوں کہ امام صاحب نے جس وقت

---

(۱) سنن دارقطنی ج ۱ص ۱۱۷۔

یہ رسالہ تالیف کیا تھا، ممکن ہے اس وقت زیر بحث مسئلہ ان کی نگاہ میں منقح نہ رہا ہو لیکن بعد میں جب رسالہ کے بارے میں سوالات کیے گئے اور امام صاحب کو اس معاملہ میں زیادہ توجہ سے غور کرنے کا موقع ملا تو اس وقت یہ مسئلہ ان کی نگاہ میں منقح ہو گیا، جیسا کہ ان کے جواب سے معلوم ہوتا ہے، اس تنقیح کے بعد ممکن ہے، انھوں نے رجوع بھی کر لیا ہو لیکن اس کی کوئی تصریح موجود نہیں ہے، اس لیے محض امکان وقیاس کی بنیاد پر اس کو تسلیم کرنا محال ہے لیکن رجوع نہ کرنے سے یہ خیال کرنا کہ ان کی رائے ضد اور عصبیت پر مبنی ہے صحیح نہیں کیوں کہ امام صاحب اور ان لوگوں کے جو جہری نمازوں میں زور سے بسم اللہ پڑھنے کے قائل ہیں، متعدد دلائل موجود ہیں، ان سے تعرض کرنے کا یہ محل نہیں ہے، فقہی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے، ان دلائل سے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف لیکن ان کی گنجائش سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ امام صاحب کے غلو اور بے جا عصبیت کا اس واقعہ سے کوئی پتہ نہیں چلتا، ان کا شافعی مذہب کی طرف میلان ضرور تھا لیکن وہ مجتہد فی المذہب تھے، مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

''امام دارقطنی شافعی مذہب کی طرف مائل تھے، مگر وہ مجتہدین اور ائمہ حدیث وسنت میں تھے، ان کا حال اپنے مابعد کے اکابر محدثین کی طرح نہیں جو سوائے چند گنے چنے مسائل کے عموماً تقلید کو لازمی سمجھتے تھے، امام دارقطنی فقہ واجتہاد اور علم میں لوگوں سے فائق وبرتر تھے۔''(۱)

اعتراض کے دوسرے جز یعنی حنفی مذہب سے تعصب وعناد کے سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے امام ابوحنیفہؒ پر طعن کیا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے سنن میں امام صاحب پر حدیث میں ضعف، تفرد اور ثقہ راویوں کی مخالفت وعدم متابعت کا الزام لگایا ہے۔

(۱) مقدمہ فتح الملہم شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۰۱ بحوالہ توجیہ النظر۔

بلاشبہ امام دارقطنی کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ کا پایہ فقہ واجتہاد کی طرح روایتِ حدیث میں زیادہ بلند نہیں تھا اور انھوں نے سنن میں ان کو ضعیف بھی کہا ہے اور مشہور حدیث (مَنْ کان له امام فقرأة الامام قرأة له) کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ تمام معتبر وثقہ راویوں نے حضرت جابرؓ کا نام لیے بغیر اس کو مرسل روایت کیا ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ نے اس کو مسند بیان کیا ہے اور اس کے سلسلہ اسناد میں حضرت جابرؓ کا بھی ذکر کیا ہے۔(۱)

اسی طرح دوسری جگہ وہ کہتے ہیں کہ وضو میں حضرت خالد بن علقمہ کے واسطہ سے تین دفعہ سر کا مسح کرنے کو صرف امام ابوحنیفہؒ نے بیان کیا ہے، جب کہ دوسرے ثقہ راویوں نے خالد بن علقمہ ہی کے واسطہ سے اس میں صرف ایک دفعہ مسح کرنے کو بیان کیا ہے۔

اس موقع پر امام دارقطنی نے امام صاحب پر ایک اعتراض اور کیا ہے اور وہ یہ کہ تین دفعہ مسح کرنے کی روایت بیان کرنے کے باوجود وہ ایک ہی دفعہ مسح کرنے کو مسنون سمجھتے ہیں۔(۲)

لیکن ان سب اعتراضات میں امام دارقطنی منفرد نہیں ہیں، بعض اور محدثین کا بھی یہی خیال ہے اور وہ بھی امام صاحب کو ضعیف الحدیث سمجھتے تھے اور مذکورہ بالا حدیثوں کے سلسلہ میں انھوں نے بھی امام صاحب پر ثقہ راویوں کی مخالفت کا الزام لگایا ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کو ضعیف الحدیث سمجھنا غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے مگر ان غلط فہمیوں کے بعض وجوہ واسباب بھی تھے جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے، اس لیے محدثین کو ان اسباب کی بنا پر معذور سمجھنا چاہیے، وہ کسی غلط جذبہ، بدنیتی، مخالفت اور تعصب کی وجہ سے امام صاحب سے سوئے ظن نہیں رکھتے تھے، بلکہ ایک اعتبار سے درحقیقت اس سے ان لوگوں کی صاف گوئی اور حق پسندی کا پتہ چلتا ہے کہ بڑے بڑے ائمہ کا علم وفضل اور زہد واتقا بھی ان کی حق پسندی میں مانع نہ ہوا اور انھوں نے اس رائے کو جسے وہ صحیح سمجھتے تھے، دیانت داری کے ساتھ ظاہر کر دیا۔

(۱) سنن دارقطنی ج ا ص ۱۲۳ (۲) سنن دارقطنی ج ا ص ۱۳۳۔

لیکن امام ابوحنیفہؒ کو ضعیف الحدیث قرار دینے والے محدثین بہت تھوڑے ہیں، اکثر ائمہ فن سے ان کی تعریف وتوثیق منقول ہے، علامہ ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو ثقہ قرار دینے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔(۱)

رہیں وہ حدیثیں جن کے سلسلہ میں امام صاحب پر عدم متابعت اور ثقہ راویوں کی مخالفت کا الزام لگایا گیا ہے تو چوں کہ ان کی ثقاہت محدثین کی ایک بڑی جماعت کے نزدیک مسلم ہے، اس لیے ان کا اضافہ مقبول ومعتبر ہوگا۔

پہلی حدیث (من کان له امام الخ) کے سلسلہ میں امام صاحب کی جانب سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ اس کو محمد بن منیع نے اپنی مسند اور امام محمد نے مؤطا اور کتاب الآثار میں مسند بیان کیا ہے اور ابن ہمام کا بیان ہے کہ ان کی سندیں صحیحین کے شرائط کے مطابق صحیح ہیں اور محمد بن منیع کی روایت میں سفیان وشریک نے جو صحیحین کے رجال میں ہیں حضرت جابرؓ کا نام لینے اور حدیث کو مسند بیان کرنے میں امام ابوحنیفہؒ کی متابعت کی ہے۔(۲)

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو حضرت جابرؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم نے بھی روایت کیا ہے اور گو بعض کے طرق میں ضعف بھی ہے تاہم صحیح اور تعدد وکثرتِ طرق نے اس کو قوی کر دیا ہے۔(۳)

تثلیث مسح کے متعلق بھی امام ابوحنیفہؒ کی زیادتی کو ثقہ کی زیادتی سمجھ کر قبول کیا جائے گا، دوسرے اس حدیث کے بھی شواہد ومتابعات موجود ہیں اور ان میں سے بعض کو خود امام دارقطنی نے بھی بیان کیا ہے، اس لیے اس کے بارے میں بھی امام دارقطنی کا اعتراض

---

(۱) حواشی سنن دارقطنی ج۱ ص۱۲۳ (۲) حاشیہ نصب الرایہ ج۲ ص۷، ۸ و حاشیہ معانی الآثار طحاوی ج۱ ص۱۲۸ و فیض الباری ج۲ ص۲۷۷، ۲۷۸ (۳) نصب الرایہ۔

بے معنیٰ معلوم ہوتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ امام ابوحنیفہؒ نے جب خود ہی تین دفعہ سر کا مسح کرنے کی روایت کی ہے تو ان کے نزدیک ایک دفعہ مسح کرنا کیوں مسنون ہے، گو امام دارقطنی کا یہ اعتراض صحیح ہے لیکن کسی چیز کی روایت کر دینے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ خود راوی کا اس کے مطابق عمل اور فتویٰ بھی ہو، امام دارقطنی اور دوسرے محدثین نے کتنی ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جن کے مطابق ان کا عمل نہیں ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ امام دارقطنی کو امام ابوحنیفہؒ سے کوئی عناد اور تعصب نہ تھا، انھوں نے نہایت فراخدلی سے حنفی مذہب کے ایک اہم رکن امام محمد کو ثقہ محدثین میں شمار کیا ہے،(۱) البتہ بعض اور اکابر محدثین کی طرح وہ امام صاحب کا پایہ حدیث میں زیادہ بلند نہیں سمجھتے تھے اور اپنی حق پسندی کی وجہ سے انھوں نے امام صاحب کی عظمت وجلالت کے باوجود اپنی اس رائے کو جسے وہ صحیح سمجھتے تھے، بیان بھی کر دیا، یہ الگ بات ہے کہ ان کی رائے غلط فہمی پر مبنی ہے لیکن اس میں وہ معذور تھے اور ان کی عظمتِ شان سے اس قسم کا تعصب بعید ہے جو بیان کیا جاتا ہے۔

تصنیفات: امام دارقطنی نے بے شمار کتابیں یادگار چھوڑیں جو سب مفید، بلند پایہ اور حسن تالیف کا نمونہ ہیں (۲) ان میں سے اکثر حدیث، اصول حدیث اور رجال کے موضوع پر لکھی گئی تھیں، مگر اب زیادہ تر نایاب ہیں، ذیل میں ان کی تصنیفات کے نام اور بعض کے بارے میں مختصر معلومات تحریر کیے جاتے ہیں۔

۱- **کتاب الرؤیۃ** (پانچ جزوں میں)، ۲- **کتاب المستجاد**، ۳- **کتاب معرفۃ مذاہب الفقہاء** (۳) ۴- **غریب اللغۃ:** محمد بن طاہر مقدسی المعروف بابن القیسرانی (م ۵۰۷ھ)

---

(۱) امام ابن ماجہ اور علم حدیث از عبدالرشید نعمانی بحوالہ غرائب مالک دارقطنی (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۰ والبدایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷ (۳) کشف الظنون ج ۲۔

نے اس کے اطراف لکھے تھے۔(۱)

۵-**اختلاف الموطآت:** اس میں موطا امام مالکؒ کی روایتوں اور اس کے مختلف نسخوں پر بحث کی گئی ہے۔(۲)

۶-**غرایب مالک:** اس میں امام مالک کی ان غریب حدیثوں کا ذکر ہے جو موطا میں شامل نہیں ہیں ممکن ہے یہ وہی کتاب ہو جو امام دارقطنی کی جانب کتاب الغرائب کے نام سے منسوب ہے، ابن عبدالہادی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضخیم کتاب تھی۔(۳)

۷- **الاربعین:** نام سے ظاہر ہے کہ اس میں چہل حدیثیں درج ہوں گی، یہ اس فن کی قدیم کتابوں میں ہے۔(۴)

۸-**کتاب الضعفاء:** یہ دراصل امام دارقطنی کے ان حواشی پر مشتمل ہے جو علامہ ابن حبان کی کتاب الضعفاء پر انھوں نے لکھے تھے،(۵) اس میں ضعیف راویوں کا حال اور ان کی معرفت کا ذکر ہے، رجال کی اکثر کتابوں میں امام دارقطنی کے جو اقوال درج ہیں وہ غالباً اسی سے ماخوذ ہوں گے، اس لحاظ سے یہ اہم کتاب ہے۔

۹- **اسماء المدلسین:** اس موضوع پر امام حسین بن علی کرابیسی (م ۲۴۵ھ) اور امام نسائی (م ۳۰۳ھ) نے پہلے کتابیں لکھی تھیں، یہ غالباً اس فن کی تیسری مشہور کتاب ہے۔(۶)

۱۰- **اسئلۃ الحاکم:** اس میں ان سوالات کا جواب دیا گیا ہے جو غالباً حاکم صاحب مستدرک نے دارقطنی سے حدیث و رجال وغیرہ کے بارے میں کئے ہوں گے، زین الدین قاسم بن قطلو بغا حنفی (م ۸۷۹ھ) نے اس کو جمع کیا تھا۔(۷)

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۵۸ (۲) حیات امام مالک مولانا سید سلیمان ندوی ص ۱۰۴ (۳) الرسالۃ المستطرفہ ص ۹۴، ۹۵ (۴) کشف الظنون ج ۱ ص ۷۸ (۵) تدریب الراوی ص ۲۶۱ و الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۱۸، ۱۱۹۔ (۶) کشف الظنون ج ۱ ص ۹۸ (۷) کشف الظنون ج ۱ ص ۱۰۰

۱۱- **باب القضا بالیمین مع الشاہد:** حدیث کی بعض کتابوں میں صرف ایک ہی باب کی روایتیں شامل ہوتی ہیں، یہ کتاب اسی قسم کی ہے اور اس میں صرف ایک ہی باب کی حدیثیں درج ہیں۔ (۱)

۱۲- **کتاب الجہر** : یہ بھی اسی نوعیت کی کتاب ہے، اس میں نماز میں بسم اللہ کو زور اور آہستہ سے پڑھنے کے بارے میں حدیثیں اور آثار درج ہیں۔ (۲)

۱۳- **رسالہ قرأت:** فن قرأت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ ہے، اس کے شروع میں اس فن کے اصول وقاعدے اور پھر فنی بحثیں تحریر کی گئی ہیں، اس کی ترتیب وتبویب اور طریقۂ تالیف کو اتنا پسند کیا گیا کہ بعد کے مولفین نے اسی ڈھنگ پر اپنی کتابیں مرتب کیں، ابن الجزری طبقات القراء میں لکھتے ہیں کہ اس کی قدر وقیمت کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ (۳)

۱۴- **الرباعیات:** اس میں مشہور محدث ابوبکر محمد بن عبداللہ بن ابراہیم المعروف بزار (م ۳۵۴ھ) کی تصنیف رباعیات کی جو غیلانیات کے نام سے مشہور ہے تخریج کی گئی ہے اور امام بخاری کی رباعیات کو علاحدہ ایک رسالہ میں مرتب کیا گیا ہے، یہ ایک زمانہ میں بہت متداول تھی۔ (۴)

۱۵- **کتاب المجتبیٰ من السنن الماثورہ:** یہ غالباً امام دارقطنی کی شہرۂ آفاق سنن کا انتخاب ہے، کتب خانہ خدیویہ مصر میں اس کی دوسری جلد کا قلمی نسخہ موجود ہے جو کتاب الزکوٰۃ سے آخر تک کے ابواب پر مشتمل ہے، کاتب کا نام عبداللہ بن محمد بن حسن موصلی المعروف با بن ترکیہ اور سنہ کتابت ۶۳۸ھ ہے۔ (۵)

---

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۵۳، الرسالۃ المستطرفہ ص ۴۲ (۲) سنن دارقطنی ص ۱۱۷ (۳) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴، ۳۵ وحاشیہ العمر ج ۳ ص ۲۹ (۴) کشف الظنون ج ۱ ص ۵۳۳ (۵) الاعلام ج ۲ ص ۶۲۳ وفہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۹۸۔

۱۶- **کتاب الاخوۃ** (۱): اس فن میں امام دار قطنی سے پہلے اور ان کے بعد متعدد کتابیں لکھی گئیں، اس کو اہم اور مفید کتابوں میں خیال کیا جاتا ہے۔

۱۷- **کتاب الافراد** (۲): یہ کتاب بڑی جامع اور سو اجزا پر مشتمل ہے، ابوالفضل بن طاہر نے اس کے اطراف لکھے تھے۔ (۳)

۱۸- **کتاب التصحیف** (۴): اس فن میں یہ ایک مفید اور جامع کتاب ہے، علامہ سیوطی کا بیان ہے:

اورد الدار قطنی فی کتاب التصحیف کل تصحیف وقع للعلماء حتی فی القرآن۔(۵)	امام دار قطنی نے کتاب التصحیف میں ان سب تصحیفات کا ذکر کیا ہے جو علما کو پیش آئی ہیں، یہاں تک کہ حدیث کے علاوہ قرآن کی تصحیف بھی بیان کی ہے۔

---

(۱) اس فن میں علی بن مدینی، امام نسائی اور ابوالعباس سراج وغیرہ متقدمین کی کتابیں اہم ہیں، اس کو ضبط کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دو شخصوں کی ولدیت میں اشتراک کی وجہ سے ان کو عینی بھائی نہ خیال کیا جائے (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۵۵ و تدریب الراوی ص ۲۱۸) (۲) یہ بڑا اہم اور مشکل موضوع ہے، اس لیے اس میں ماہر محدثین ہی نے کتابیں لکھی ہیں، ارباب فن کے نزدیک فرد کی دو قسمیں ہیں، مطلق اور نسبی، اول الذکر میں ایک شخص تمام رواۃ سے تفرد کرتا ہے، مؤخر الذکر میں کسی خاص پہلو اور حیثیت سے تفرد ہوتا ہے جیسے کسی روایت میں کسی خاص مقام کے راویوں کا تفرد (مقدمہ ابن صلاح ص ۴۱ و ۴۲) (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷ والرسالۃ المستطرفہ ص ۹۵ (۴) تصحیف وخطا سے محفوظ رہنا بہت مشکل ہے امام احمد فرماتے ہیں کہ اس سے کون بچ سکتا ہے، یہ اسناد و متون دونوں میں ہوتی ہے، اسناد کی مثال یہ ہے کہ یحییٰ بن معین نے عوام بن مراجم (بالراوالجیم) کو مزاحم کر دیا اور متن کی مثال یہ ہے کہ ابن لہیعہ نے ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم احتجر فی المسجد میں احتجر کو احتجم کر دیا (تدریب الراوی ص ۱۹۶) (۵) تدریب الراوی ص ۱۹۶۔

۱۹- **کتاب المؤتلف والمختلف** (۱): اس فن میں ابن ماکولا کی کتاب الاکمال زیادہ اہم اور مشہور ہے تاہم دارقطنی کی کتاب بھی جامع اور پراز معلومات ہے، سیوطی کا خیال ہے کہ اس موضوع پر پہلی کتاب دارقطنی کے شاگرد عبدالغنی بن سعید نے لکھی اور امام دارقطنی کی کتاب اس کے بعد لکھی گئی لیکن نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں کہ ''ابوعبداللہ محمد بن علی کا بیان ہے کہ عبدالغنی نے المؤتلف والمختلف لکھنے کے بعد جب اس کو امام دارقطنی کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے عبدالغنی سے پڑھنے کے لیے کہا، عبدالغنی نے کہا ''میں اسے کیا پڑھوں، میں نے تو اس کو آپ ہی سے استفادہ کر کے لکھا ہے۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالغنی کی تصنیف درحقیقت امام دارقطنی کے افادات پر مشتمل ہے، اس لحاظ سے گویا اس فن میں تقدم واولیت کا شرف انہی کو ہے، امام دارقطنی کی کتاب کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے اکثر کی اساس وبنیاد اسی پر ہے، علاوہ ازیں اس کے مختلف ذیول واستدراک بھی لکھے گئے ہیں (۲)

۲۰- **کتاب العلل** (۳): یہ کتاب اس موضوع پر متقدمین کی کتابوں کا نچوڑ اور بڑی جامع ہے، ابوعبداللہ حمید اندلسی کا بیان ہے کہ فن حدیث کی تین اہم چیزوں میں ایک العلل بھی ہے اور اس میں سب سے عمدہ کتاب امام دارقطنی کی ہے، (۴) ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ''اس میں صحیح وغلط، متصل، مرسل اور منقطع ومعضل وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے۔'' اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علل کے طرق کی کثرت وتعدد کو جمع کیا

---

(۱) اگر راویوں کے نام تحریر وکتابت میں یکساں اور ہم شکل ہوں لیکن تلفظ وتکلم میں مختلف ہوں تو اسے اصطلاح میں مؤتلف ومختلف کہا جاتا ہے (مقدمہ ابن صلاح ص۱۷۲) (۲) مقدمہ ابن صلاح ص۱۷۲ وتدریب الراوی ص۴۳۵ واتحاف النبلاء المتقین ص۱۳۷ (۳) معلل ان مسند حدیثوں کو کہا جاتا ہے جن کے متن یا اسناد میں کوئی ایسی پوشیدہ علت اور مخفی عیب ہوتا ہے جس کی صحت بآسانی نہ ہوسکے تاوقتیکہ تمام سندوں اور صحیح متن کا ٹھیک طور پر پتہ نہ ہو (تدریب الراوی ص۸۹) (۴) مقدمہ ابن صلاح ص۱۹۰۔

گیا ہے، یہ مسانید کی ترتیب پر ہے، امام دارقطنی نے اس کا املا کرادیا تھا اور ان کے شاگرد ابوبکر برقانی نے اس کو جمع وترتیب دیا تھا۔(۱)

حافظ ابن حجر کے ہاتھ کا لکھا ہوا، اس کا ایک قلمی نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے(۲) اور خدابخش لائبریری پٹنہ میں بھی اس کا مخطوطہ ہے، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے،(۳) ہر جلد کے متعلق علاحدہ علاحدہ مندرجہ ذیل تعارفی نوٹ درج ہیں:

المجلد الثانی: اس میں مسند احادیث کی خامیوں اور نقائص کو بتایا گیا ہے، یہ حدیثیں اکابر صحابہ یعنی حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل اور حضرت ابوذر (رضوان اللہ علیہم اجمعین) وغیرہ سے منسوب ہیں اور تھوڑی حدیثیں جو حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ ہیں ان میں بھی کچھ نقائص وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ قلمی نسخہ بہت نایاب ہے اور کسی کتب خانہ کی فہرست میں نہیں دیکھا گیا، خط نسخ میں خوش خط لکھا ہوا ہے، اس پر کوئی تاریخ وغیرہ نہیں ہے مگر آٹھویں صدی ہجری کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

المجلد الثالث: یہ علل الحدیث کی تیسری جلد ہے، باقی ماندہ اسناد حدیث جو حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہیں، ان کی خامیوں اور نقائص پر بحث کی گئی ہے، ۱۳۰۹ھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔

المجلد الخامس: کتاب علل الحدیث کا یہ آخری حصہ ہے، اس میں ان مسند حدیثوں پر تنقید کی گئی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اصحاب وصحابیات سے مروی ہیں، کاتب نے اس نسخہ کے آخر میں تحریر کیا ہے کہ یہ نسخہ اس نے ۱۳۰۹ھ کے ایک مکتوبہ نسخے سے نقل کیا ہے، مگر اپنا نام نہیں لکھا ہے، یہ نسخہ اور اس کے اور سب حصے جن کا ذکر ہو چکا ہے،

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷ والمنتظم ج ۷ ص ۸۳ وتدریب الراوی ص ۸۸ و۸۹ و۹۱ ورسالہ مستطرفہ ص ۱۲۲ (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۲۶ (۳) فہرست خدابخش خان لائبریری ص ۵۵۔

ایک ہی کاتب کے تحریر کردہ معلوم ہوتے ہیں،(۱) تیسری اور پانچویں جلدوں کے مخطوطے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں بھی پائے جاتے ہیں، تیسری جلد ۱۳۱۰ھ کی لکھی ہوئی ہے، (۲) اسی طرح مکتبہ سندیہ میں بھی علل کا نسخہ ہے۔

۲۱- **کتاب الاسخیاء:** اس میں جود وسخاوت کی فضیلت اور اسخیا کے محامد ومحاسن کے متعلق حدیثیں اور بعض واقعات سنداً بیان کئے گئے ہیں، اس کا ایک قلمی نسخہ ۶۰۰ھ کا نسخ میں لکھا ہوا خدا بخش لائبریری میں موجود تھا،(۳) ۱۹۳۴ء میں مولانا سید وجاہت حسین صاحب استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ نے اس کو تصحیح ومقابلہ کے بعد حواشی ومقدمہ کے ساتھ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سے شائع کیا ہے، مقدمہ میں امام دارقطنی کے حالات وکمالات اوراس کتاب کے بارے میں مفید معلومات لکھے گئے ہیں۔

۲۲و۲۳- **کتاب الالزامات والتتبع:** صحیح کی اہمیت ومقبولیت مسلم ہے لیکن بعض حیثیتوں سے ان پر محدثین کی ایک جماعت نے کچھ ایرادات بھی کئے ہیں، ان لوگوں میں امام دارقطنی کا نام زیادہ ممتاز ہے، ان کی علل حدیث سے گہری واقفیت اور دقت نظر کا اہل فن کو اعتراف ہے، ان کے اعتراضات اور شکوک دو طرح کے ہیں، پہلے کو انھوں نے کتاب الالزامات میں ذکر کیا ہے، اس کے متعلق وہ خود تحریر فرماتے ہیں:

مما اخرجه البخاری ومسلم	امام بخاری ومسلم دونوں یا ان میں
او احدهما من حديث بعض	سے ایک بزرگ نے کسی تابعی کی
التابعين وتركا من حديثه	ایک حدیث کی تخریج کی ہے اور اسی
شبيها به ولم يخرجاه او من	تابعی کی دوسری حدیث کو چھوڑ دیا یا
حديث نظير له من التابعين	بعض ایسی حدیثوں کی تخریج نہیں کی

(۱) نوادر خدا بخش لائبریری ج۱ص ۹۳ تا ۹۵۔(۲) فہرست کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ج۱ص ۶۴۶ و۶۴۷ (۳) فہرست کتب خانہ خدا بخش لائبریری جلد اول ص ۳۹۔

الثقات یلزم اخراجه علی شرطهما ومذهبهما فیما نذکره انشاء الله.(۱)

ہے جو ثقہ تابعین سے مروی تھیں، حالانکہ ان حضرات کے اصول وشرائط کے مطابق ان کی تخریج لازمی تھی، انشاء اللہ آگے ہم اس پر گفتگو کریں گے۔

علامہ نووی لکھتے ہیں:

الزم الامام الحافظ ابوالحسن علی بن عمر الدارقطنی رحمه الله وغیره البخاری ومسلما رضی الله عنهما اخراج احادیث ترکا اخراجها مع ان اسانیدها اسانید قد اخرجا لرواتها فی صحیحهما بها وذکر الدار قطنی وغیره ان جماعة من الصحابة رضی الله عنهم رووا عن رسول الله صلی الله علیه وسلم ورویت احادیثهم من وجوه صحاح لا مطعن فی ناقلیها ولم

امام دارقطنی نے امام بخاری وامام مسلم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے بہت سی ایسی حدیثیں چھوڑ دی ہیں جن کے راویوں کی سندوں سے خود انھوں نے صحیحین میں روایت کی ہے، امام دارقطنی وغیرہ کا بیان ہے کہ ان حضرات نے ایسی حدیثیں بھی نظر انداز کی ہیں جن کو صحابہ کی ایک جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا ہے اور جو بعد میں صحیح طریقوں سے بیان کی گئی ہیں اور ان کے راویوں میں کسی قسم کا کوئی طعن بھی نہیں پایا جاتا حالانکہ ان لوگوں کے اصول ومذہب کے مطابق ان کی

(۱) دیباچہ کتاب الالزامات۔

یخرجا من احادیثهم شیئاً فلیلزمهما اخراجها علی مذهبیهما۔ (۱)	تخریج لازم تھی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام دار قطنی نے اپنے اس رسالہ میں ان صحیح حدیثوں کو جمع کیا ہے جو صحیحین کی شرطوں کے مطابق ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں ہیں، اس حیثیت سے اس کی وہی نوعیت ہے جو حاکم کی المستدرک کی ہے۔

دوسرے رسالہ التتبع میں امام بخاری و مسلم پر نقد و تعقب کیا گیا ہے، صاحب کشف الظنون کا بیان ہے:

وهو ما اخرج فی الصحیحین وله علة۔ (۲)	یہ رسالہ صحیحین کی ان حدیثوں کا مجموعہ ہے جن کے اندر علت پائی جاتی ہے۔

یعنی اس میں امام بخاری و مسلم کے اوہام و علل پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، حافظ ابن حجرؒ نے ان حدیثوں کی جن کو امام دار قطنی نے موضوع بحث بنایا ہے، تعداد ایک سو دس بتائی ہے، ان میں بتیس حدیثیں متفق علیہ ہیں اور اٹھہتر صرف صحیح بخاری کی ہیں۔

عام طور سے علمائے فن نے امام دار قطنی کے اعتراضات کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمہ میں کتاب التتبع کی ہر ہر حدیث پر مفصل اور محققانہ بحث کر کے امام دار قطنی کے اعتراضات کا جواب دیا ہے، امام نووی نے بھی شرحِ مسلم اور شرح بخاری کے مقدمہ میں ان شبہات کا ازالہ کیا ہے جن کو امام دار قطنی نے تحریر کیا ہے، اسی طرح علامہ عینی اور قسطلانی کی شروح بخاری میں بھی دار قطنی کے الزامات کا جواب دیا گیا ہے، ان محققین کے جوابات کا ماحصل یہ ہے کہ امام بخاری و مسلم کی کتابوں کو صحیح حدیثوں کا مجموعہ اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کی سب حدیثیں صحیح اور متخب ہیں، باقی جو صحیح

---

(۱) مقدمہ مسلم نووی ص ۲۴ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۸۔

روایتیں ان میں شامل نہیں ہیں، اس کی وجہ سے ان پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا کیوں کہ ان دونوں کتابوں کا مقصد تمام صحیح حدیثوں کا حصر نہیں ہے۔

لیکن یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ ان حضرات نے امام دارقطنی کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ تمام تر درست ہی ہے اور ان کے سارے اعتراضات بالکل ہی بے معنی ہیں، کیوں کہ جواب میں بعض جگہ تکلف سے بھی کام لیا گیا ہے، مولانا انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

> ''امام دارقطنی نے سو سے زیادہ مقامات میں امام بخاری پر تعاقب کیا ہے لیکن ان کا نقد و کلام محض اسانید کے وصل وارسال تک محدود ہے، سوائے ایک جگہ یعنی (اذا جاء احدکم والامام یخطب فلیصل رکعتین ولیتجوز فیھما) کے، یہاں انھوں نے حدیث کے متن پر بھی کلام کیا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ دارقطنی محدثین کے مرتب قاعدوں پر چلنے کے عادی ہیں اور اسی حیثیت سے وہ اعتراض کرتے ہیں لیکن امام بخاری کی شان اس سے بہت بلند ہے، وہ اپنی بصیرت، اجتہاد اور وجدان پر اعتماد کرتے ہیں، قاعدے تو ناواقفین اور عوام کے لئے بنائے گئے ہیں تا کہ غیر محدود کو محدود کیا جا سکے اور امام بخاری و مسلم کا مرتبہ سب سے بڑھ کر ہے۔''(۱)

امام دارقطنی کی ایرادات کے بے نتیجہ اور بلا وزن نہ ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کی بنا پر صحیحین کی اس قسم کی حدیثوں کا قطعی الصحت ہونا محتمل قرار دیا گیا ہے، چنانچہ علامہ ابن صلاح لکھتے ہیں:

القول بان ما انفرد به	امام بخاری یا امام مسلم نے تنہا جن
البخاری او مسلم مندرج فی	حدیثوں کو بیان کیا ہے وہ بھی قطعی الصحت

(۱) مقدمہ فیض الباری ص ۵۷۔

قبيل مايقطع بصحته لتلقى	حدیثوں میں شامل ہیں کیوں کہ
الامة كل واحد من كتابيهما	امت میں ان دونوں کتابوں کو تلقی
بالقبول على الوجه الذي	بالقبول حاصل ہے جیسا کہ پہلے اس کی
فصلناه عن حالهما فيما	تفصیل گزر چکی ہے، بجز ان چند
سبق سوى احرف يسيرة	حدیثوں کے جن پر نقادان فن اور ائمہ
تكلم فيها بعض اهل النقد	حدیث جیسے دار قطنی وغیرہ نے کلام کیا
من الحفاظ كالدار قطني و	ہے اور یہ حدیثیں ماہرین فن کے
غيره وهي معروفة عند اهل	نزدیک مشہور و معروف ہیں۔
هذا الشان والله اعلم.(۱)	

درحقیقت امام دار قطنی کے اعتراضات کی وہی حیثیت ہے جو حاکم صاحب مستدرک کے استدراکات کی ہے، شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۴ و ۱۵ اگر علامہ ابن صلاح کے اس بیان کے پہلے حصہ یعنی بخاری یا مسلم کی حدیثوں کا قطعی الصحت ہونا جمہور کے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہے، چنانچہ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ "جمہور علمائے محققین نے ابن صلاح کے قول سے اختلاف کیا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ اگر حدیث متواتر نہ ہو تو اس سے قطعیت کے بجائے صرف ظن کا فائدہ حاصل ہوگا" البتہ حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن حجر اور مولانا انور شاہ کشمیری علامہ ابن صلاح کے ہمنوا ہیں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

واختلفوا في ان احاديث	صحیحین کی حدیثوں کے مفید قطعی ہونے
الصحيحين جعل تفيد القطع ام	میں اختلاف ہے جمہور ان کو مفید قطعی نہیں
لا فالجمهور الى انها لاتفيد	مانتے لیکن حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان
القطع وذهب الحافظ الى انها	سے قطعیت کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، حنفیہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

وہ ایک حیثیت سے صحیح اور دوسری حیثیت سے غلط ہیں،(۱) صحیح اس حیثیت سے ہیں کہ امام دارقطنی کی حدیثیں شیخین کے رجال اور شرائط کے مطابق ہیں لیکن غلط اس بنا پر ہیں کہ شیخین اسی حدیث کو ذکر کرتے ہیں جس کی صحت پر بحث مباحثے کے بعد ان کے شیوخ کا اجماع ہوگیا ہے اور مشائخ وائمہ حدیث نے اس کی صحت تسلیم کرلی ہے، پس صحیحین کی خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ وہ صرف قاعدہ اور اصولوں سے حدیث کی صحت تسلیم نہیں کرتے بلکہ ہر ہر حدیث کے وصل وانقطاع، رفع وارسال، شذوذ ونکارت وغیرہ پر مستقل طور سے بحث کرکے صحت کا فیصلہ صادر کرتے ہیں اور انہی حدیثوں کو صحیحین میں نقل کرتے ہیں جن کی صحت پر پہلے کے محدثین نے تحقیقات کے بعد اتفاق کرلیا ہے لیکن امام دارقطنی وغیرہ محض اصول وقواعد ہی کی بنا پر حدیث کو صحیح قرار دے دیتے ہیں۔

امام دارقطنی کے اعتراضات اہم ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی دقتِ نظر، کثرتِ تدبر اور اخلاص ونیک نیتی کا ثبوت ضرور ہیں، امام بخاری کے ایک بڑے مداح مولانا عبدالسلام

(حاشیہ گزشتہ صفحہ کا بقیہ)

تفيد القطع واليه جنح شمس	میں امام سرخسی اور حنابلہ میں حافظ ابن
الائمة السرخسي من الحنفية	تیمیہ نیز شیخ عمرو بن صلاح کا رجحان اسی
والحافظ ابن تيمية من الحنابلة	جانب ہے، ان لوگوں کی تعداد اگرچہ کم
والشيخ عمرو بن صلاح وهؤلاء	ہے لیکن یہی رائے صحیح ہے..... پھر حافظ
وان كانوا اقل عددا الا ان رأيهم	ابن حجر نے تصریح کی ہے کہ یہ مفید قطعی
هو الراي ...... ثم صرح الحافظ	نظری ہوتی ہیں۔
رضي الله عنه ان افادتها القطع	
نظري (مقدمہ فیض الباری ص ۴۵)	

حاشیہ صفحہ ہذا (۱) حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۰۶ و ۱۰۷۔

مبارک پوری لکھتے ہیں:

> ”امام دارقطنی بڑے پایہ کے ناقد تسلیم کئے گئے ہیں، انھوں نے صحیح کو بلاتقلید احد حرفاً حرفاً جانچا اور بلاتردد دل کھول کر لیکن دیانت سے جو شکوک ان کے ذہن میں آئے سب کو رسالہ کی صورت میں جمع کیا، خواہ وہ شکوک متن سے لگاؤ رکھتے ہوں، سلسلۂ اسناد سے یا راویوں سے۔“(۱)

امام دارقطنی کے یہ دونوں رسالے کمیاب تھے اور عموماً ان کو ایک ہی کتاب خیال کیا جاتا ہے، حیدر آباد کے کتب خانہ آصفیہ اور بہار شریف کے مکتبہ علم وحکمت میں ان کے قلمی نسخے موجود ہیں، مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ کی مہربانی سے بہار شریف کے نسخہ کی نقل دارالمصنّفین کے کتب خانہ میں بھی ہے، یہ خود مولانا کے قلم سے شعبان المعظم ۱۳۵۶ھ میں نقل ہوا ہے لیکن اصل نسخہ کا سنہ تحریر معلوم نہیں ہوسکا، پہلا رسالہ بڑی تقطیع کے آٹھ اور دوسرا ۲۳/۱۷۳۸ صفحے پر مشتمل ہے، آخر میں ۱۳ صفحے کا ایک اور رسالہ بھی ان کے ساتھ شامل ہے، یہ امام دارقطنی کے معاصر ابومسعود محمد بن ابراہیم بن عبیداللہ دمشقی (۴۰۱ھ) کی تالیف ہے، انھوں نے امام دارقطنی کے بعض تعقبات کو صحیح تسلیم کیا ہے لیکن اکثر کو غلط اور بعض کو غور وفکر کی کمی کا نتیجہ قرار دیا ہے، ایک حدیث کے بارے میں امام دارقطنی نے لکھا ہے کہ اس کی امام مسلم نے تخریج کی ہے لیکن دمشقی کا بیان ہے کہ ان کی امام مسلم نے سرے سے تخریج ہی نہیں کی ہے،(۲) تلاش کے بعد دمشقی کا بیان صحیح معلوم ہوا۔

۲۴۔ **سنن دارقطنی:** یہ امام دارقطنی کی سب سے اہم اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے، ذیل میں اس کی اہمیت اور خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سنن کی اہمیت اور کتب حدیث میں اس کا درجہ: صحاح ستہ کے بعد جو کتابیں شہرت وقبول اور وثوق واعتبار کے لحاظ سے ممتاز اور اہم مانی جاتی ہیں ان میں سنن دارقطنی بھی

---

(۱) سیرت البخاری ص ۹۶ (۲) رسالہ دمشقی قلمی ص ۵۵۔

ہے۔ بعض اہل علم نے اس کو تقریباً صحاح ستہ ہی کے ہم پایہ قرار دیا ہے، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

''فن حدیث میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں مگر علمائے سلف وخلف کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ صحیح اور معتبر کتاب صحیح بخاری ہے، پھر صحیح مسلم اور مؤطا امام مالک ہیں، ان کے بعد امام ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارقطنی کی کتابوں اور مشہور مسانید کا درجہ ہے۔'' (۱)

صحاح ستہ میں تمام صحیح حدیثوں کا حصر واستقصا نہیں ہے، ان کے علاوہ جو کتابیں صحیح اور مستند حدیثوں کے لیے مشہور خیال کی جاتی ہیں ان میں سنن دارقطنی کا نام سرفہرست ہے، علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں:

''صحیحین پر وہ صحیح اضافے مقبول ہیں جن کو امام ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن خزیمہ اور دارقطنی وغیرہ میں سے کسی نے اپنی مشہور ومعتبر کتاب میں بیان کیا ہو اور اس کی صحت کی تصریح کی ہو۔'' (۲)

یہی خیال علامہ نووی اور سیوطی کا بھی ہے، (۳) سیوطی اور امام بغوی نے اپنی کتابوں میں صحاح اور مستند کتب حدیث کی طرح سنن دارقطنی کی حدیثوں کی بھی تخریج کی ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ سنن دارقطنی کا درجہ صحاح سے کمتر ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے اس کو حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں شمار کیا ہے، (۴) البتہ اس طبقہ کی کتابوں میں اس کو یک گونہ خصوصیت ضرور ہے، چنانچہ ابن صلاح، نووی اور سیوطی نے مصنفینِ صحاح کے بعد کے جن سات نامور محدثین کی تصنیفات کو عمدہ اور زیادہ نفع بخش بتایا ہے ان سب میں امام دارقطنی کا نام سرفہرست گنایا ہے، (۵) دراصل حدیثوں کی جمع

---

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۶۴۲ (۲) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱ (۳) تدریب الراوی ص ۳۰ و ۳۱ (۴) عجالۂ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۵ (۵) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۲ و تدریب الراوی ص ۲۶۰۔

وترتیب کا زیادہ اہم اور مبارک زمانہ تیسری صدی ہجری کا ہے، اس عہد میں روایات کی چھان بین اور راویوں کے نقد و تحقیق کا جو اعلیٰ اور بلند معیار قائم کیا گیا، اس کی مثال بعد کے دور میں نہیں ملتی لیکن تیسری صدی ہجری کا یہ امتیاز مجموعی اعتبار سے ہے کیوں کہ اس کے بعد بھی حدیث کے ایسے مجموعے تیار کئے گئے جو صحاح ستہ سے کمتر ہونے کے باوجود اس دور کی دوسری کتابوں کے برابر یا ان سے بڑھ کر ہیں، سنن دار قطنی چوتھی صدی ہجری کی ایسی ہی اہم اور مشہور کتاب ہے جو بعض حیثیتوں سے صحاح کے بعد حدیث کی سب سے اہم کتاب ہے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں ''دار قطنی کی یہ مشہور کتاب اس فن کی بہترین کتابوں میں ہے۔''(۱)

خصوصیات: سنن کی بعض اہم خصوصیات یہ ہیں:

۱- امام دار قطنی کو کثرت وتعدد طرق میں بڑا کمال حاصل تھا، سنن میں اسانید وطرق کا انھوں نے استقصا کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ امام صاحب نے سنن کے شروع میں قلتین والی حدیث کے طرق واسانید میں مبالغہ سے کام لیا ہے، چنانچہ اس کی چون۵۴ سندیں بیان کی ہیں، اس سے ان کی قوتِ حفظ اور وسعتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔(۲)

اسی طرح دباغ میتہ کے سلسلے میں ستائیس۲۷ اور ماء بحر کے متعلق سولہ۱۶ سندوں اور طرق سے حدیث بیان کی ہے۔(۳)

۲- وہ فن جرح وتعدیل کے امام تھے، علل اور رجال حدیث پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، اس لیے سنن نقد وجرح کے اقوال کا عمدہ اور مفید ذخیرہ ہے، امام دار قطنی نے حدیثوں کے اکثر طرق واسانید بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر مفصل کلام کرکے ان کی قوت وضعف کا فیصلہ، حدیث کے درجہ ومرتبہ کی تعیین، اس کے صحیح، مرفوع ومسند یا ضعیف، سقیم، موقوف، مرسل، غریب اور منکر ہونے کی تصریح اور ایک قسم کی متعدد حدیثوں میں مرجح

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷ (۲) بستان المحدثین ص ۴۵ (۳) سنن دار قطنی ص ۱۵ تا ۱۷ و ۱۳ و ۱۴۔

اور اصح مافی الباب کی نشاندہی کی ہے، راویوں اور حدیثوں کے بیان کے فرق واختلاف، کمی بیشی، متابعت وعدم متابعت اور راوی کے متروک، مجہول، منکر، غیر ثابت، واضع، کذاب، سیئ الحفظ، مضطرب الحدیث اور نا قابلِ حجت ہونے یا ثقہ وثابت، قوی وحجت اور عادل وضابط ہونے کی تصریح، ان کے تفرد، دوسرے سے عدم ملاقات وعدم سماع، شک، اضطراب، اختلاف اور حدیث کے متن یا سند میں وہم وخطا پر مفصل کلام کیا ہے اور اس بارے میں اہل علم اور ارباب فن کے اقوال بھی بیان کئے ہیں، اس طرح سنن ترمذی کی طرح اس سے بھی حدیث کا صحیح، حسن اور ضعیف ہونا معلوم ہو جاتا ہے، علامہ ابن صلاح نے اس کی اس خصوصیت کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

ونص الدارقطني في سننه علی كثير من ذالك۔ (۱)	امام دارقطنی نے سنن میں اکثر حدیثوں کے حسن یا ضعیف ہونے کو واضح کر دیا ہے۔

۳- امام دارقطنی فقہ وخلاف کے ماہر تھے، اس لیے اس کتاب سے فقہی آرا ومذاہب اور اجتہادی مسائل بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔

۴- راوی کے نام وکنیت، وطن ومسکن اور بعض مشکل وغریب الفاظ کی مختصر وضاحت اور تفسیری بحثیں بھی کی گئی ہیں۔

۵- روایت کے حسن وقبح کے ضمن میں بعض واقعات اور تاریخی حالات بھی زیر بحث آگئے ہیں، مثلاً ایک جگہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے لیلۃ الجن میں شریک نہ ہونے کا ذکر ہے۔ (۲)

۶- سنن دارقطنی چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر کی تصنیف ہے، اس لیے اس کی سب سے اعلیٰ اور عمدہ سند خماسی ہے۔ (۳)

---

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۸ (۲) سنن دارقطنی ص ۲۸ (۳) بستان المحدثین ص ۴۵۔

سنن کے نسخے: امام دارقطنی سے جن لوگوں نے سنن کی روایت کی تھی ان کے نام یہ ہیں:

۱- ابوبکر محمد بن عبدالملک بن بشران، ۲- ابوطاہر محمد بن احمد بن محمد بن عبدالرحیم کاتب، ۳- ابومنصور محمد بن محمد توقانی، ۴- ابوبکر محمد بن احمد بن غالب برقانی (م ۴۲۵ھ)، ۵- ابوطیب طاہر بن عبداللہ بن طاہر طبری (م ۴۴۵ھ)، ۶- شریف ابوالحسن محمد بن علی بن عبداللہ بن عبدالصمد بن مہتدی باللہ (۱) (م ۴۶۵ھ)

اس طرح سنن کے چھ نسخے تھے مگر اول الذکر تین اشخاص کے نسخے زیادہ مقبول ہوئے، ہندوستان میں ابن بشران کا نسخہ متداول ہے، متداول نسخوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ معمولی ہے، یعنی تقدیم وتاخیر یا بعض راویوں کے نسب ونسبت کی کمی وبیشی کا، کہیں کہیں الفاظ میں بھی قدرے اختلاف ہے لیکن نفس حدیث میں فرق واختلاف نہیں ہے، ابن عبدالرحیم کے نسخہ میں کتاب السبق درج نہیں ہے۔ (۲)

سنن کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، ۱۳۱۰ھ میں دہلی کے مطبع انصاری سے یہ ۵۵۴ صفحات میں شائع ہوئی ہے، متن کے ساتھ حاشیہ میں مولانا شمس الحق عظیم آبادی صاحب غایۃ المقصود عون المعبود کی تعلیقات بھی ہیں اور آخر میں مولانا حسین بن محسن انصاری یمانی کے دو مختصر رسالے ہیں، ایک میں شاذ ومعلل حدیثوں کی تحقیق اور ان کے درمیان فرق کی وضاحت اور دوسرے میں صرف داہنے ہاتھ سے مصافحہ کرنے کو مسنون ثابت کیا گیا ہے۔

سنن کے حواشی، تعلیقات اور زوائد: سنن دارقطنی کے ساتھ علمائے فن کے شغف واعتنا سے بھی اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

۱- علامہ بغوی اور حافظ سیوطی نے اس کی حدیثوں کی تخریج کی ہے۔

---

(۱) مقدمہ حاشیہ سنن دارقطنی از مولانا شمس الحق عظیم آبادی ص ۳و۴ (۲) بستان المحدثین ص ۴۵ واتحاف النبلاء ص ۹۲۔

۲- حافظ ابن حجر نے اتحاف المهرة باطراف العشرة میں اس کے اطراف لکھے ہیں۔

۳- ابوالفضل بن طاہر نے سنن کے غرائب وافراد کے اطراف حروف معجم کی ترتیب پر لکھے ہیں۔

۴- علامہ ابن ملقن اور عراقی نے اس کے رجال کی بحث وتحقیق کی ہے۔

۵- شیخ زین الدین قاسم بن قطلو بغا حنفی نے ایک جلد میں اس کے زوائد جمع کیے ہیں۔(۱)

۶- مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے سنن کی مختصر شرح اور تعلیق لکھی ہے جو سنن کے ساتھ حاشیہ میں چھپی ہے، اس میں حدیثوں کی تحقیق وتنقید، ان کے علل، مصالح، مطالب اور بعض مشکل مقامات کو حل کیا گیا ہے اور ائمۂ فقہ واجتہاد کے مذاہب ومسالک، راوی کے ناموں، کنیتوں اور بلاد واماکن کی وضاحت اور لغوی وتفسیری مباحث پر بھی ان فنون کی اہم کتابوں کے حوالہ سے بقدر ضرورت گفتگو کی گئی ہے، حواشی کی ابتدا میں سنن وصاحب سنن کا تعارف، اس کے نسخوں اور مؤلف کتاب تک اپنی سند کا سلسلہ بیان کیا گیا ہے۔

سنن پر اعتراض: اوپر سنن کی اہمیت اور بلند پائیگی پر مختصر اظہار خیال کیا گیا ہے، آخر میں اس پر ایک اعتراض کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔

سنن دارقطنی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں ضعیف، غریب، موضوع اور منکر حدیثیں بھی شامل ہیں، علامہ ابن عبدالهادی کا بیان ہے:

الدارقطني يجمع في كتابه غرائب السنن ويكثر فيه من رواية الاحاديث الضعيفة و المنكرة بل والموضوعة۔ (۲)	امام دارقطنی نے اپنی سنن میں غریب حدیثیں اور ضعیف ومنکر بلکہ موضوع روایتیں تک بھی کثرت سے جمع کی ہیں۔

(۱) تدریب الراوی ص ۲۹ والرسالۃ المستطرفہ ص ۱۳۹ و ۱۴۱ (۲) الصارم المنکی فی الرد علی السبکی ص ۱۲ طبع مصر۔

علامہ عینی لکھتے ہیں:

وقدروی فی مسنده احادیث سقیمة ومعلولة ومنكرة و غريبة وموضوعة.(۱)	انھوں نے اپنی مسند (۲) میں سقیم، معلل، منکر، غریب اور موضوع حدیثیں بیان کی ہیں۔

اسی خیال کو علامہ زیلعی نے بھی نصب الرایہ میں نقل کیا ہے۔(۳)

لیکن یہ اعتراض اس وقت صحیح ہوتا جب سنن دارقطنی کو تمام تر صحیح، منتخب اور مستند حدیثوں کا مجموعہ مانا جاتا مگر اس کا دعویٰ تو خود امام دارقطنی نے بھی نہیں کیا ہے، بلکہ انھوں نے جا بجا سنن کے اندر احادیث کی نوعیت اور اس کی صحت وسقم کی حقیقت واضح کر دی ہے، نیز علمائے فن نے بھی اس کو صحاح ستہ سے کمتر اور تیسرے طبقہ کی کتابوں میں شامل کیا ہے، اس طبقہ کی کتابوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ دہلوی نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ صحیح، حسن، ضعیف، معروف، منکر، غریب، شاذ، خطا وصواب، ثابت ومقلوب ہر قسم کی حدیثوں پر مشتمل ہیں۔(۴)

نیز شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں "اس طبقہ کے مصنفین نے دوسرے طبقہ کے مصنفین کی جیسی صحت کا التزام نہیں کیا ہے اور نہ ان کی کتابیں شہرت وقبول اور وثوق واعتبار کے لحاظ سے دوسرے طبقہ کی کتابوں کے برابر ہیں، تاہم دارقطنی علوم حدیث میں تبحر، ضبط ووثوق اور ثقاہت وعدالت سے متصف تھے لیکن ان کی کتابوں میں صحیح، حسن، ضعیف اور موضوع ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں اور ان کے کچھ رجال تو عدالت سے متصف ہیں لیکن بعض مستور ومجہول ہیں۔" (۵)

---

(۱) البنایہ فی شرح الہدایہ ج ۱ ص ۷۰۹ (۲) امام دارقطنی کی کتاب سنن کے نام سے مشہور ہے، معلوم نہیں علامہ عینی نے اس کو مسند کیوں لکھا ہے۔ (۳) نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۴۰ و ۳۵۶ (۴) حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۷ (۵) عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۵۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ خود صحاح ستہ بھی ضعیف حدیثوں سے خالی نہیں ہیں، اس لیے یہ اعتراض امام دارقطنی کی طرح دوسروں پر بھی عائد ہوسکتا ہے، علاوہ ازیں انھوں نے کثرتِ اسناد تعددِ طرق اور شواہد و متابعات وغیرہ کے خیال سے ہر طرح کی حدیثیں نقل کی ہیں مگر ان کی نوعیت و حقیقت بھی واضح کردی ہے، شواہد و متابعات وغیرہ کے لحاظ سے امام مسلم اور ارباب صحاح نے بھی ضعیف اور غریب حدیثیں نقل کی ہیں۔

رہا یہ شبہ کہ اس طرح کی حدیثوں کی سنن دارقطنی میں زیادتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حدیثوں کا ضخیم مجموعہ ہے اور امام صاحب نے کثرت و تعددِ طرق اور متابعات و شواہد کو درج کرنے کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے، اس لیے اس میں ضعیف و غریب حدیثوں کی تعداد نسبۃً زیادہ ہوگئی ہے، پھر بھی صحیح حدیثوں کے مقابلہ میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔

اس توجیہ کے بعد نہ اس اعتراض کی کوئی اہمیت رہ جاتی ہے اور نہ سنن کے مرتبہ میں کوئی فرق آتا ہے۔

امام ابوسلیمان حمد خطابی

(متوفی ۳۸۸ھ)

نام ونسب: حمد نام، ابوسلیمان کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: حمد بن محمد بن ابراہیم بن خطاب۔(۱)

بعض ارباب سیر وتذکرہ نے ان کا نام احمد لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے، علامہ ذہبی نے اس کو وہم قرار دیا ہے اور علامہ مقدسی وابن خلکان لکھتے ہیں کہ "ابوسلیمان کا نام احمد بھی بیان کیا گیا ہے لیکن صحیح حمد ہے، حاکم نے ابوالقاسم ظفر بن طاہر بن محمد بستی فقیہ سے اس بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے خود خطابی سے سنا ہے کہ میرا اصلی نام حمد ہے لیکن بعض لوگ احمد بھی کہتے ہیں، میں نے ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا۔(۲)

ولادت ووطن: وہ ماہ رجب ۳۱۹ھ میں کابل کے مشہور شہر بست میں جو غزنین اور ہرات کے درمیان واقع ہے پیدا ہوئے۔(۳)

نسبتیں: امام ابوسلیمان اپنے وطن کی نسبت سے بستی کہلاتے ہیں لیکن ان کی مشہور نسبت خطابی ہے، جو ان کے پردادا خطاب کے نام کی طرف ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام صاحب کا خاندانی تعلق خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے بھائی زید بن خطاب سے ہے اور یہ نسبت اسی کی جانب ہے، مگر اکثر لوگوں کے نزدیک پہلا قول صحیح ہے۔(۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۳ ص۲۲۳ (۲) ایضاً وکتاب الانساب مقدسی ص۴۹ وتاریخ ابن خلکان ج۱ ص۲۹۷

(۳) ایضاً وکتاب الانساب سمعانی ورق ۸۱ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج۳ ص۲۲۳ وتاریخ ابن خلکان ج۱ ص۲۹۷ وکتاب الانساب سمعانی ورق ۸۱۔

اساتذہ: ان کے اساتذہ وشیوخ کی تعداد زیادہ ہے، حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ انھوں نے بیشمار لوگوں سے حدیثیں سنیں لیکن متداول تذکروں میں چند ہی اساتذہ کا نام مذکور ہے۔

ابوبکر بن داسہ، ابوسعید بن اعرابی اور ابوالعباس اصم سے علم حدیث، ابوعلی بن ابی ہریرہ اور قفال شاسی سے فقہ وافتا اور ابوجعفر رزاد، ابوعلی اسماعیل صفار اور ابوعمر زاہد وغیرہ سے لغت وعربیت کی تحصیل کی۔

تلامذہ: امام خطابی کے بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوحامد اسفرائنی، ابوعبداللہ حاکم، ابومسعود حسین بن محمد کرابیسی، ابوذر عبد بن احمد ہروی، ابوعبید ہروی، عبدالغفار (۱) بن محمد فارسی، ابوالقاسم عبدالوہاب بن ابی سہل خطابی، ابونصر محمد ابن احمد بن سلیمان بلخی، ابوعمرو محمد بن عبداللہ زرجاہی۔ (۲)

رحلت وسفر: امام خطابی کے زمانہ میں عراق، حجاز، خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ دینی علوم خصوصاً حدیث وروایت کا مرکز تھے، انھوں نے علم وفن کی تکمیل اور احادیث کی تحصیل کے لیے ان سب مراکز کا سفر کیا، نیشاپور میں طویل عرصہ تک قیام کر کے وہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے اور طلبہ وشائقین علوم کو فیض یاب بھی کیا۔ (۳)

جامعیت: امام خطابی بڑے جامع کمالات تھے، ان کو اپنے زمانہ کے تمام علوم میں کامل دستگاہ حاصل تھی، مورخین کا بیان ہے کہ وہ جامعیت کے اعتبار سے ابوعبید قاسم بن سلام کی طرح تھے، دونوں علم وادب، زہد وورع، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں ممتاز تھے، علاوہ ازیں امام خطابی کو یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ وہ اچھے شاعر تھے۔ (۴)

اعتراف کمالات: مورخین نے ان کی جامعیت، وفور علم اور کمالات کا پوری طرح

(۱) بعض مورخین نے ان کا نام عبدالغافر لکھا ہے (۲) کتاب الانساب سمعانی ورق ۸۱ وتاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۹۶ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱۸ (۳) کتاب الانساب ورق ۲۰۳ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۴ (۴) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۹۷۔

اعتراف کیا ہے۔ علامہ ذہبی نے ان کو علامہ، محقق اور علم کا خزانہ، سمعانی نے فاضل، کبیر الشان اور جلیل القدر لکھا ہے، حافظ ابن جوزی کا بیان ہے کہ ان کا علم نہایت وافر تھا اور ابن سمعانی کا بیان ہے کہ وہ علم میں عظیم حیثیت اور بلند مرتبہ کے مالک تھے، ابن عماد نے ان کو ان کے تمام معاصرین سے فائق قرار دیا ہے۔

حدیث میں درجہ: گو امام خطابی کو گوناگوں علوم میں کمال حاصل تھا لیکن ان کا اصلی اور امتیازی فن علم حدیث ہے، ان کا شمار اس فن کے ائمہ اور نامور محدثین میں کیا جاتا ہے، حفظ و ضبط، عدل و اتقان اور فہم و درایت میں ان کا درجہ بلند تھا، علامہ ذہبی نے ان کو ثقہ وثبت، سمعانی نے حجت وصدوق اور علامہ ابن سبکی نے امام حدیث لکھا ہے۔(۱)

فقہ: فقہ واجتہاد کی معرفت میں بھی بے نظیر تھے، مورخین نے ان کو فقیہ لکھا ہے اور حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ ''وہ فقہائے مجتہدین میں تھے۔''

لغت وعربیت: لغت وعربیت، نحو وادب اور معانی وغیرہ میں بھی صاحب کمال تھے، حافظ ابن جوزی نے لغت ومعانی میں ان کی معرفت کا اور دوسرے مورخین نے ادب وعربیت میں مہارت کا ذکر کیا ہے۔(۲) اسی لیے ادبا و نحاۃ اور اہل لغت کے حالات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی امام خطابی کا تذکرہ موجود ہے۔

شعر وسخن: ان کو شعر وسخن سے بھی دلچسپی تھی اور وہ خود مشق سخن بھی کر۔ نے تھے، چند اشعار درج ذیل ہیں:

کم معشر سلموا لم یوذھم سبع   ومانری بشرا لم یوذہ بشر

کتنے لوگ درندوں کے ضرر سے محفوظ رہتے ہیں، لیکن ہم نے آدمی کو آدمی کی اذیت سے محفوظ نہیں دیکھا۔

---

(۱) تاریخ ابن خلکان ج۱ص ۱۶۷ و کتاب الانساب ورق ۱۸۱، تذکرۃ الحفاظ ج۳ص ۲۲۳ والعبر ج۳ ص۳۹ والمنتظم ج۶ص ۳۹۷ وطبقات الشافعیہ ج۲ص ۲۱۸ (۲) ایضاً۔

وماغمة الانسان فی شقة النویٰ ولکنها والله فی عدم الشکل
وانی غریب بین بست واهلها وان کان فیها اسرتی وبها اهل

انسان کی کلفت و پریشانی مسافرت اور غریب الوطنی میں نہیں ہے بلکہ ہم مذاق اور ہم جنسوں کے نہ ہونے میں ہے، اسی لیے میں بست اور اہل بست کے درمیان رہ کر بھی غریب الوطن ہوں، حالاں کہ یہ میرا وطن ہے اور یہاں میرے اہل وعیال اور اعزہ واقارب موجود ہیں۔

لعمرك مالحیاة وان حرصنا علیها غیر ریح مستعارة
وما للریح دائمة هبوب ولکن تارة تجری وتارة

زندگی جس پر ہم اس قدر ریجھے ہوئے ہیں، بخدا اس مستعار ہوا کی طرح ہے جو ہمیشہ نہیں چلتی بلکہ کبھی کبھی چلتی ہے۔

تغنم سکون الحادثات فانها وان سکنت عما قلیل تحرك
وبادر بایام السلامة انها رهون وهل للرهن عندك مترك

حوادث کے رکنے کو غنیمت سمجھو کیوں کہ یہ جلد ہی متحرک بھی ہو جاتے ہیں اور سکون وسلامتی کے دنوں کو غنیمت سمجھو کیوں کہ یہ تمہارے پاس رہن ہیں اور جو چیز رہن ہو وہ تمہارے پاس چھوڑی نہیں جا سکتی۔

تسامح ولاتستوف حقك كله وابق فلم یستقص قط کریم
ولاتغل فی شیء من الامر واقتصد کلا طرفی قصدالامور ذمیم (۱)

نرمی اور آسانی سے کام لو اور اپنا حق پورا لینے کے بجائے کچھ باقی رکھو کیوں کہ شریف آدمی کبھی آخری حد کو نہیں پہنچتا، کسی معاملہ میں غلو سے کام نہ لو بلکہ میانہ روی اختیار کرو کیوں کہ اعتدال کے دونوں سروں (افراط وتفریط) پر ذمیم ہوتا ہے۔

(۱) یتیمۃ الدہر ج ۴ ص ۳۲۲ و معجم الادباء ج ۲ ص ۸۴ تا ۸۶ و ج ۴ ص ۱۴۲ و ۱۴۳۔

ارض للناس جمیعا　　مثل ما ترضی لنفسك
انما الناس جمیعا　　کلهم ابناء جنسك
فلهم نفس کنفسك　　ولهم حس کحسك (۱)

اپنے لیے جو کچھ پسند کرتے ہو وہی سب لوگوں کے لیے بھی پسند کرو، تمام لوگ تمہاری ہی جنس کے ہیں، تمہاری طرح وہ بھی صاحب نفس واحساس ہیں۔

زہد واتقا: علمی کمالات کی طرح ورع وتقویٰ میں بھی ممتاز تھے، مورخین نے ان کے زہد واتقا کا ذکر کیا ہے۔

امامت ومرجعیت: ان گوناگوں کمالات اور مختلف النوع خصوصیات کی وجہ سے ان کی ذات لوگوں کا مرکز بن گئی تھی اور وہ امام ومقتدیٰ کہلاتے تھے، ابن سمعانی لکھتے ہیں کہ وہ لائق اقتدا اور ائمہ سنت وحدیث میں تھے۔ (۲)

مسلک: امام خطابی گو خود اجتہادی بصیرت اور فقہی ژرف نگاہی میں ممتاز تھے تاہم وہ امام شافعی کے مسلک پر کاربند تھے۔

اخلاق وعادات: ان کے اخلاق وعادات کے ذکر سے کتابیں خاموش ہیں مگر ان کی سخاوت وفیاضی اور فہم ودانش کا اعتراف کیا گیا ہے، وہ اپنی کمائی کا بیشتر حصہ اپنے دوستوں اور نیک لوگوں پر خرچ کر ڈالتے تھے، ان سے متعدد حکیمانہ اقوال بھی منسوب ہیں اور ان کے شعروں میں بھی حکمت واخلاق اور فہم ودانائی کی باتیں ملتی ہیں۔

پیشہ: امام خطابی تجارت پیشہ تھے اور اپنے زہد وورع کی وجہ سے ہمیشہ حلال اور طیب رزق کماتے تھے۔

انتقال: مشہور اور صحیح قول کے مطابق بروز شنبہ ۶ ربیع الآخر ۳۸۸ھ کو وفات پائی، بعض مورخین نے ۱۶ ربیع الآخر اور بعض نے ربیع الاول کا مہینہ لکھا ہے، ایک قول کے مطابق ان

(۱) مقدمہ معالم السنن ص ۱۹ (۲) کتاب الانساب ورق ۲۰۳ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱۸۔

کی وفات ۳۸۶ھ میں ہوئی۔(۱)

تصنیفات: امام خطابی کو تصنیف و تالیف کا بڑا عمدہ ذوق تھا اور چوں کہ ان کو گوناگوں علوم سے مناسبت اور اشتغال تھا، اس لیے ان کتابوں کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے، ان سے بیشمار کتابیں یادگار ہیں اور ان میں اکثر کتابیں بیش قیمت اور حسن تالیف اور دلکش طرز تصنیف کا نمونہ ہیں، ذیل میں ان کی تصنیفات کی فہرست اور بعض کے متعلق مختصر معلومات پیش کئے جاتے ہیں:

۱- کتاب الجہاد، ۲- کتاب شان الدعا یا بیان الدعا، ۳- کتاب الشجاج یا کتاب النجاح، ۴- کتاب شرح الادعیۃ الماثورہ، ۵- کتاب شرح دعوات لابی خزیمہ، ۶- کتاب العروس، ۷- کتاب العزلہ، ۸- کتاب الغنیہ عن الکلام واہلہ، ۹- کتاب اصلاح الغلط (بعض نے اس کا نام اصلاح غلط المحدثین لکھا ہے)

۱۰- کتاب تفسیر اسامی الرب عزوجل: غالبًا شرح الاسماء الحسنٰی اور شرح اسماء اللہ الحسنٰی بھی اسی کتاب کے نام ہیں، اس موضوع پر علمائے اسلام کی متعدد تصنیفات کی فہرست صاحب کشف الظنون نے تحریر کی ہے، امام خطابی کی تصنیف اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

۱۱- اعلام السنن: اسی کا نام اعلام الحدیث اور شرح البخاری بھی ہے، اس میں بخاری شریف کی حدیثوں کی شرح کی گئی ہے، امام صاحب جب سنن ابی داؤد کی شرح لکھ چکے تو اہل بلخ کی فرمائش پر انھوں نے بخاری شریف کی بھی ایک جلد میں شرح لکھی جو لطیف نکات اور مفید مطالب پر مشتمل ہے لیکن یہ معالم السنن کی طرح طویل نہیں ہے بلکہ اس میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، امام محمد تمیمی اور ابوجعفر احمد بن سعید داؤدی نے اپنی شرحوں میں

---

(۱) کتاب الانساب ورق ۲۰۳ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱۸ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۲ وبستان المحدثین ص ۱۲۳۔

ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جن کو امام خطابی نے نظر انداز کر دیا ہے، ان کتابوں میں خطابی کے بعض مسامحات کا بھی ذکر ہے۔

اعلام السنن کا ایک نسخہ موصل کے جامع سلطان اویس میں ہے، داؤد چلپی نے مخطوطاتِ موصل کے ص ۹۴ پر اس کا ذکر کیا ہے، حلب کے مکتبہ شیخ محمد سلطان مرحوم میں اس کتاب کا نصفِ آخر موجود ہے جو ۴۸۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔

۱۲-غریب الحدیث: اس کا شمار امام خطابی کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہوتا ہے، ان سے پہلے اور بعد میں اس فن میں متعدد کتابیں لکھی گئیں جن میں ابو عبید، ابن قتیبہ اور امام خطابی کی کتابیں بہت اہم اور بہتر خیال کی جاتی ہیں، بعض علماء کا خیال ہے کہ امام خطابی کی کتاب کا پایہ ان سب میں بلند ہے، انھوں نے ابن قتیبہ کی کتاب کا ذیل بھی لکھا ہے اور ان کی غلطیوں اور اوہام کی نشاندہی بھی کی ہے، ابوالحسن عبدالغافر نے ان سے اس کتاب کی روایت کی تھی، غالباً یہ بیش قیمت اور اہم کتاب اب معدوم ہے۔

۱۳-معالم السنن: یہ ان کی سب سے اہم اور مشہور کتاب ہے، اس میں سنن ابی داؤد کی حدیثوں کی شرح، اس کے اہم مطالب کی توضیح اور اس کے مشکلات کو نہایت عالمانہ اور محققانہ انداز اور دلنشیں و دلکش پیرایہ میں حل کیا گیا ہے، اس کی چار جلدیں اعلام النبلا کے فاضل مصنف محمد راغب طباخ نے بعض مخطوطہ نسخوں کی مدد سے ایڈٹ کر کے مطبع علمیہ حلب سے ۱۳۵۱ھ و ۱۳۵۳ھ میں شائع کیا تھا اور اس کے شروع میں امام ابوداؤد اور امام خطابی کے حالات و کمالات بھی تحریر کیے ہیں، ان چاروں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار ہے، شہاب الدین ابومحمود احمد بن محمد بن ابراہیم مقدسی (م ۷۶۹ھ) نے عجالۃ العالم من کتاب المعالم کے نام سے اس کی تلخیص کی تھی، (۱) اس شرح کی بعض اہم خصوصیات یہ ہیں: (۲)

---

(۱) کشف الظنون (۲) اس شرح کی خصوصیات پر راقم نے معارف کے تین نمبروں (دسمبر ۶۹ء تا فروری ۷۰ء) میں ایک مفصل مضمون لکھا ہے۔

۱- یہ سنن ابوداؤد کی سب سے اہم، مستند اور قدیم شرح ہے، اس کے بعد جو شرحیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر اسی سے ماخوذ ہیں۔

۲- احادیث کی تشریح وتفسیر اور بحث وتحقیق کا معیار نہایت بلند اور طرز استدلال بہت دلکش اور دلنشیں ہے، جن چیزوں سے عموماً لوگ سرسری طور پر گذر جاتے ہیں، امام صاحب نے ان سے بڑے دقیق مسائل، گہرے معانی وحقائق اور دلچسپ نتائج ونکات مستنبط کئے ہیں اس ضمن میں احادیث کے اندر پیدا ہونے والے شکوک واعتراضات کا بھی بہت مفصل اور عالمانہ جواب دیا گیا ہے۔

۳- امام خطابی کا شمار ان علمائے اسلام میں ہوتا ہے جو شرعی احکام کے علل ومصالح بیان کرنے میں زیادہ ممتاز سمجھے جاتے ہیں، اس لیے انھوں نے معالم السنن میں حدیثوں کے اسرار وحکم بیان کرنے پر خاص توجہ کی ہے۔

۴- حدیثوں کے باہمی اختلاف وتضاد کو رفع کرنے اور ان میں جمع وتطبیق دینے کی پوری کوشش کی ہے۔

۵- امام خطابی کا پایہ جرح وتعدیل میں بھی نہایت بلند تھا، اس لیے معالم السنن میں حدیث کی فنی بحثوں اور اصول حدیث پر بڑی ماہرانہ گفتگو کی گئی ہے۔

۶- معالم السنن فقہی حیثیت سے بھی نہایت اہم کتاب خیال کی جاتی ہے، امام صاحب فقہ وخلاف میں ممتاز اور خود بھی صاحب تفقہ واجتہاد تھے، چنانچہ اس میں صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور اس زمانہ تک کے تمام ائمہ ومجتہدین کے آرا ومسالک کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور مختلف اقوال میں محاکمہ کر کے مرجح قول کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، علاوہ ازیں بعض مسائل سے امام صاحب کی فقہی ژرف نگاہی اور اجتہادی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

۷- وہ لغت وعربیت میں بھی ممتاز تھے، اس لیے لغوی، نحوی وصرفی بحثیں کلام کی

بلاغت، طرز ادا اور اسلوب بیان کی بھی اس میں وضاحت کی گئی ہے۔

غرض حدیثوں کی تفسیر، ان کے مواقع استنباط، وجوہ معانی کی دلالت، مشکل الفاظ، دقیق متون کی شرح، فقہی مباحث، احکام و مسائل کے استنباط اور علما کے اقوال و اختلافات کی تفصیل وغیرہ کے لحاظ سے یہ بے نظیر اور متعدد گوناگوں فوائد، مختلف النوع مباحث اور حدیث سے متعلق اہم تحقیقات پر مشتمل نہایت جامع و مدلل کتاب ہے۔

امام ابن جمیع

(متوفی ۴۰۲ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوالحسین کنیت، نسب نامہ یہ ہے: محمد بن احمد بن محمد بن احمد بن عبدالرحمٰن بن یحییٰ بن جمیع (۱)، اپنے جد امجد جمیع کے نام پر ابن جمیع کے لقب سے مشہور ہوئے۔

ولادت، خاندان ووطن: امام ابن جمیع کا قبیلہ ازد کی مشہور شاخ غسان سے جو شام میں آباد تھی، خاندانی تعلق تھا اور وطن شام کا ایک شہر صیدا ہے، یہیں ۳۰۵ھ میں وہ پیدا ہوئے، علامہ سمعانی نے سنہ ولادت ۳۰۶ھ لکھا ہے۔ (۲)

وطن کی نسبت سے صیداوی اور صیدانی اور خاندان کی نسبت سے غسانی کہلاتے تھے۔

رحلت وسفر: اس عہد کے دستور کے مطابق امام ابن جمیع نے علم کی تحصیل اور احادیث کی طلب کے لیے مختلف اسلامی ملکوں اور شہروں جیسے دمشق، بغداد، مکہ، بصرہ، کوفہ، عراق، مصر اور فارس وغیرہ کا سفر کیا اور ان مرکزی مقامات کے علماء ومحدثین سے اکتسابِ فن کیا، کثرتِ سفر کی وجہ سے ابن جمیع ''الجوال'' اور ''ذوالرحلۃ الکثیرۃ'' یعنی بہت بڑے سیاح کہلاتے تھے۔ (۳)

اساتذہ: ابن جمیع کے چند نامور شیوخ کے نام یہ ہیں:

(۱) بستان المحدثین ص۸۶ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۵۸ (۳) ایضاً وبستان المحدثین ص۸۶۔

ابوسعید بن الاعرابی، ابوالعباس بن عقدہ، ابوعبداللہ محاملی، ابوروق ہزانی۔

تلامذہ: بعض ممتاز شاگردوں کے نام یہ ہیں:

حافظ عبدالغنی بن سعید، تمام رازی (صاحب فوائد) محمد بن علی صوری، ابوسعد احمد بن محمد بن عبداللہ مالینی، ابونصر عبدالرحمٰن بن ابی عقیل الصوری، ابونصر حسین بن محمد بن احمد خطیب دمشقی اور حسن بن جمیع وغیرہ۔(۱)

حفظ وضبط اور حدیث میں درجہ ومرتبہ: ابن جمیع کے حفظ وضبط، عدالت وثقاہت اور حدیث میں بلند پائیگی کے علمائے فن اور محدثین معترف ہیں، الحافظ ان کا لقب تھا اور خطیب بغدادی وغیرہ نے ان کی توثیق وتعدیل کی ہے، خطیب کا بیان ہے کہ ھو اسند من بقی من الشام۔ حدیث میں ان کے کمال اور رسوخ کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسند الشام ومحدثه یعنی شام کے محدث ومسند کے نام سے موسوم کیے جاتے تھے۔(۲)

مداومت عمل اور ذوق عبادت: ابن جمیع کے عام حالات وواقعات معلوم نہیں ہو سکے، اس لیے ان کی سیرت وکردار اور عام اوصاف وخصائل کے متعلق بھی کچھ نہیں لکھا جا سکتا، تاہم ان کے ذوق بندگی، کثرتِ عبادت اور معمولات وغیرہ میں اہتمام اور پابندی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر سے انھوں نے مسلسل روزہ رکھنا شروع کیا تو کبھی عمر بھر ان کے روزے فوت نہ ہوئے اور نہ اس معمول میں کوئی فرق آیا۔(۳)

وفات: ۹۷ سال کی عمر میں ماہ رجب ۴۰۲ھ کو انتقال کیا (۴) لیکن علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ۳۷۴ھ کے بعد ان کا انتقال ہوا۔(۵)

مسند یا معجم: ابن جمیع کی صرف ایک تصنیف کا پتہ چلتا ہے، بعض لوگوں نے اس کا نام مسند اور بعض نے معجم بتایا ہے، غالباً اس میں مسند ومعجم دونوں کی خصوصیات موجود تھیں، اس کا مکمل

---

(۱) کتاب الانساب ورق ۳۵۸ وبستان المحدثین ص ۸۶ (۲) ایضاً والعبر ج ۳ ص ۸۰ (۳) العبر ج ۳ ص ۸۰ وبستان المحدثین ص ۸۶ (۴) ایضاً (۵) کتاب الانساب ورق ۳۵۸۔

قلمی نسخہ حافظ ابن حجر کے ہاتھ کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے اور ان کے قلم سے اس پر مفید حواشی بھی تحریر ہیں۔(۱) اس معجم کے ایک قدیم مستند اور نایاب نسخے کا ایک جز جو سات حدیثوں پر مشتمل ہے، خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی ہے، اس کے خاتمہ کے ایک نوشتہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس اصل نسخہ سے یہ نسخہ نقل کیا گیا ہے، اس سے بعد میں عبارت لفظ بلفظ ملا کر دیکھ لی گئی ہے، ایک اور کرم خوردہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس نسخہ کا چند محدثین نے اپنے نسخوں سے بھی موازنہ کیا ہے یہ جز ۶۰۶ھ یا اس سے قبل کا نوشتہ ہے۔(۲)

OOO

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵ (۲) نوادر خدا بخش لائبریری، ص ۹۷و۹۸۔

امام ابو عبداللہ حاکم

(متوفی ۴۰۵ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوعبداللہ اور ابن بیع کنیت اور حاکم لقب ہے، پورا نسب نامہ یہ ہے:

محمد بن عبداللہ بن محمد بن حمدویہ بن نعیم بن حکم۔ (۱)

امام ابوعبداللہ کے اجداد میں کوئی بزرگ تجارتی کاروبار کرنے کی بنا پر بیع (بیوپاری) کہلاتے تھے، اس نسبت سے امام صاحب کو ابن بیع کہا جاتا ہے، منصب قضا پر فائز ہونے کی وجہ سے حاکم کے لقب سے ملقب کیے گئے، (۲) ابوالفدا نے ابن الحاکم لقب تحریر کیا ہے، (۳) یہ غالباً اس لیے کہ ان کے جدامجد کا نام حکم تھا ممکن ہے بعد میں ابن حذف ہو کر صرف حاکم رہ گیا ہو۔

ولادت: امام صاحب دوشنبہ ۳/ ربیع الاول ۳۲۱ھ کو نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ (۴)

خاندان ووطن: امام صاحب کے مرزبوم ہونے کا فخر عراق عجم کے مشہور مردم خیز شہر نیشاپور کو حاصل ہے، اس لیے وہ نیشاپوری کہلاتے ہیں لیکن ضبی اور طہمانی کی نسبتوں سے ان کا عربی قبائل سے خاندانی تعلق ظاہر ہوتا ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ "حاکم کی دادی سبطہ عیسی بن عبدالرحمٰن ضبی کی صاحبزادی تھیں، طہمانی کی نسبت ابراہیم بن طہمان کی جانب ہے جو

(۱) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۴۷۳ وابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ والمنتظم ج ۷ ص ۲۷۴ وتبیین کذب المفتری ص ۲۲۷ والطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۴ (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ وبستان المحدثین ص ۴۲ (۳) تاریخ ابوالفدا ج ۲ ص ۴۴ (۴) الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۴ وتبیین کذب المفتری ص ۲۲۰۔

صاحب فضل وکمال تھے۔(۱)

امام صاحب ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، ان کے والد اور ماموں علم وفن کے دلدادہ تھے، ان دونوں بزرگوں کے فیضِ توجہ سے وہ بچپن ہی میں علم وفن کی تحصیل میں مشغول ہوگئے تھے اور سب سے پہلے اپنے والد ماجد سے اکتسابِ فیض کیا، ان کے والد بزرگوار کو امام مسلم کو دیکھنے کا شرف بھی حاصل ہے۔(۲)

اساتذہ: مورخین کا بیان ہے کہ امام صاحب کو تقریباً دو ہزار فضلا اور محدثین سے استفادہ کرنے کا موقع ملا تھا، خاص نیشاپور کے اساتذہ کی تعداد ایک ہزار بتائی جاتی ہے، اپنے والد کے علاوہ جن ممتاز محدثین سے انھوں نے حدیثوں کی روایت کی ہے ان کے نام یہ ہیں:

ابن ابی سبرہ، ابن درستویہ، ابو حامد بن حسنویہ مقری، ابو سہل بن زیاد، ابو بکر احمد بن سلمان نجاد، حسن بن یعقوب بخاری، ابو علی حسین بن علی الحافظ نیشاپوری، ابو صالح خلف بن محمد بن اسماعیل خیام، ابو محمود دعلج بن احمد سجزی، ابو محمد عبدالرحمٰن بن حمدان جلاب، ابو عمرو عثمان بن محمد بن سماک، علی بن محمد بن عقبہ شیبانی، ابو العباس محمد بن احمد بن محبوب التاجر محبوبی، ابو جعفر محمد بن صالح بن ہانی، محمد بن عبداللہ صفار اصبہانی، ابو جعفر محمد بن علی بن رحم شیبانی، محمد بن علی بن عمر، ابو نصر محمد بن محمد بن یوسف، ابو العباس محمد بن یعقوب الاصم، ابو عبداللہ محمد بن یعقوب بن الاخرم شیبانی۔

فقہ کی تحصیل اس زمانہ کے مشہور فقہا، ابو سہل محمد بن سلیمان صعلوکی، ابو علی بن ابی ہریرہ، ابو الولید حسان بن محمد اور ابو بکر احمد بن اسحاق ضبعی وغیرہ سے کی، قرأت کا فن محمد بن ابو منصور صرام ابن امام، علی بن علی نقار کوفی اور ابو عیسیٰ بکار بغدادی وغیرہ قراء سے سیکھا اور تصوف واسرار دین کی تکمیل کے لیے ابو عمرو بن نجید، ابو الحسن بوشنجی، ابو سعید احمد بن یعقوب ثقفی، ابو نصر صفار، ابو القاسم رازی جعفر بن نصیر، ابو عمرو الزجاجی، جعفر بن ابراہیم خدا شیخ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۴۶ (۲) ایضاً، الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۵۔

ابوعثمان مغربی اور ابوعمر بن محمد بن جعفر خلدی وغیرہ مشائخ وصوفیہ کی صحبت اختیار کی۔(۱)

تلامذہ: امام حاکم کے بعض مشہور تلامذہ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابوذر ہروی، ابوصالح موذن، ابویعلیٰ خلیلی، ابوبکر احمد بن حسین بیہقی، ابوبکر احمد بن علی بن خلف شیرازی، ابوعثمان اسماعیل بن عبدالرحمٰن صابونی، زکی عبدالحمید بجیری، ابوالقاسم بن عبداللہ ابن احمد ازہری، ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری، عثمان بن محمد جمحی، ابوالفتح محمد بن احمد بن ابی الفوارس، محمد بن احمد بن یعقوب، ابوبکر محمد بن علی بن اسماعیل قفال شاسی اور ابوالعلا محمد بن یعقوب واسطی۔(۲)

ان کے شیوخ میں امام ابوالحسن دارقطنی، احمد بن ابوعثمان حیری اور ابواسحاق مزکی نے بھی ان سے سماع کیا تھا، امام دارقطنی سے ان کی برابر مصاحبت اور ہم نشینی رہتی تھی، خطیب بغدادی ایک واسطہ سے حاکم کے شاگرد ہیں۔

شوق علم: امام حاکم بچپن ہی میں تعلیم وتعلم میں مشغول ہوگئے تھے اور نو سال کی عمر میں باقاعدہ حدیث کا سماع کیا، علم سے شغف کا یہ حال تھا کہ ان کو اپنے سے کمتر اور کمسن لوگوں سے بھی روایت کرنے میں کسی طرح کا عار نہ ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے۔

رحلت وسفر: اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے انھوں نے سب سے پہلے اپنے وطن نیشاپور کے جو اس وقت علمائے فن اور محدثین کا مرکز بنا ہوا تھا، اربابِ کمال کی جانب رجوع کیا، بیس سال کے ہوئے تو دوسرے علمی شہروں اور مراکز حدیث کا رخ کیا اور عراق، بغداد، مکہ، کوفہ، مرو، بخارٰی، ماوراء النہر، ہمدان اور اصبہان وغیرہ تشریف لے گئے، اسفار کی کثرت کی وجہ سے مورخین ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ طاف الآفاق، رحل الکثیر، بغداد دو بار گئے

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۲، الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۵ وکتاب الانساب ورق ۱۰۰، کذب المفتری ص ۲۲۹ (۲) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۴۷۳۔

تھے پہلی بار عین شباب کے زمانہ میں اور دوسری دفعہ گئے تو ان کا سن زیادہ ہو چکا تھا۔(۱)

حدیث وروایت میں کمال وامتیاز: علم حدیث میں غیر معمولی کمال وامتیاز کی بنا پر وہ الحافظ الکبیر اور امام المحدثین وغیرہ القاب سے یاد کئے جاتے تھے، ابوحازم عبدوی کا بیان ہے کہ ''حاکم اپنے زمانہ میں محدثین کے امام تھے'' یافعی لکھتے ہیں ''حدیث اور اس کے متعلق علوم کی معرفت میں ان کو بڑی مہارت حاصل تھی'' علامہ ذہبی فرماتے ہیں ''نہ صرف خراسان بلکہ ساری دنیا میں اقلیم حدیث کی تاجداری ان پر ختم ہوگئی'' علامہ ابن صلاح اور حافظ نووی نے صحاح ستہ کے مصنفین کے بعد جن سات محدثین کو نہایت صاحب کمال قرار دیا ہے، ان میں امام دارقطنی کے بعد دوسرا نام حاکم ہی کا بتایا ہے، ان کے زمانہ کے جن چار محدثین کو خصوصیت سے سرآمد روزگار سمجھا جاتا تھا، ان میں ایک یہ بھی تھے، عبدالغافر کہتے ہیں وہ اپنے زمانہ میں اہل حدیث کے امام اور فنِ حدیث سے بخوبی واقف تھے۔

حفظ وثقاہت: حدیث میں ان کے کمال کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے حفظ وضبط اور ثقاہت وعدالت پر تمام ائمہ فن اور محدثین کا اتفاق ہے، اہل سیر نے الحافظ الکبیر من اہل الحفظ اور من اکابر حفاظ الحدیث وغیرہ کہہ کر ان کے حافظہ کی توثیق کی ہے، ابوعبدالرحمٰن سلمی کا بیان ہے کہ میں نے امام دارقطنی سے حاکم اور ابن مندہ کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ابن بیع حافظہ میں زیادہ مستند اور اتقن ہیں۔

کلامی مذہب: کلام وعقائد میں اشاعرہ کے ہمنوا تھے، ابن سبکی نے ان کے اشعری المذہب ہونے کی تصریح کی ہے اور علامہ ابن عساکر نے تبیین میں اشاعرہ کے دوسرے طبقہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اس طبقہ میں ان لوگوں کے ترجمے درج ہیں جو امام ابوالحسن اشعری کے تلامذہ کے صحبت یافتہ اور ان کے اصول پر کاربند تھے۔

تدین وتقویٰ: وہ زہد واتقا اور دیانت وامانت میں ممتاز تھے، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ

---

(۱) تاریخ بغداد ج۵ ص ۴۷۳۔

"حاکم متدین، امین، صاحبِ حزم و ورع اور اللہ کی جانب مائل و متوجہ رہتے تھے۔"(۱) حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، تصوف سے اشتغال اور اکابرِ صوفیہ و مشائخ سے وابستگی بھی ان کے تدین کا ثبوت ہے۔

سیاسی و اجتماعی مشاغل: پہلے گذر چکا ہے کہ امام صاحب عہدۂ قضا پر متمکن ہونے کی بنا پر حاکم کہلاتے تھے، بعض مورخین نے ان کو نسا کا لیکن اکثر نے نیشاپور کا قاضی بتایا ہے، یہ ۳۵۹ھ کا واقعہ ہے، اس زمانہ میں دولت سامانیہ کی طرف سے نیشاپور میں ابوالنصر محمد بن عبدالجبار عتبی کی ولایت قائم تھی، امام صاحب محکمۂ قضا کے فرائض سے اس قدر خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے کہ دوبارہ ان کو جرجان کا عہدۂ قضا پیش کیا گیا لیکن انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا مگر بعض مورخین نے ان کے جرجان کے قاضی مقرر کئے جانے کی تصریح کی ہے۔

امام صاحب پر دولت سامانیہ اور اس کے امرا و حکام کو بڑا اعتماد تھا، امیر ابوالحسن ان سے مشورے طلب کرتا تھا اور بنی بویہ کے پاس سفارت کے لیے بھیجتا تھا، امام صاحب نے بنی بویہ اور سامانی حکومت کے درمیان سفارتی فرائض بڑی اچھی طرح انجام دیے۔

ان کو ملی و اجتماعی کاموں سے بھی یک گونہ دلچسپی تھی، ایک زمانہ میں مدرسہ دارالسنت کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری انہی کے سپرد تھی، ان کے استاذ احمد بن اسحاق ضبعی نے اپنی وفات کے بعد مدرسہ کے امور و معاملات کی نگرانی اور اوقاف کی تولیت و اہتمام کے بارے میں ان کو وصیت کی تھی۔(۲)

مقبولیت و مرجعیت: امام صاحب اپنے گوناگوں کمالات کی وجہ سے مسلمانوں کے مقتدا و امام اور ان کی عقیدت و توجہ کا مرکز بن گئے تھے اور خواص و عوام سب میں یکساں مقبول اور

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۵۵ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۳۸۵ والطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۵ وتبیین کذب المفتری ص ۲۲۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۶۔

ہر دلعزیز تھے، علامہ ابن سبکی کا بیان ہے کہ ان کی عظمت شان، جلالت قدر اور امامت فن پر سب کا اتفاق ہے، وہ ان ائمۂ اعلام میں تھے جن کے ذریعہ اللہ نے اپنے دین مبین کی حفاظت کا کام لیا ہے، لوگ دور دراز سے ان کی خدمت میں آ کر اپنی علمی تشنگی بجھاتے تھے، وہ جس بزم میں پہنچ جاتے اس کی رونق بڑھ جاتی، لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے اور شایان شان استقبال کرتے، اکابر محدثین و نامور ائمہ فن کے مجمع میں بھی تشریف لے جاتے تو لوگوں کو اپنے علمی تبحر اور خوش کلامی سے متاثر کر لیتے تھے، عبدالغافر امام حاکم کی مدح و ستائش میں نہایت رطب اللسان رہتے تھے، ان کا بیان ہے کہ ہمارے اساتذہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ کے اکثر فضلا و اربابِ کمال جیسے صعلوکی اور ابن فورک وغیرہ ان کو اپنے سے فائق اور مقدم سمجھتے تھے اور ان کے حفظ و معرفتِ حدیث میں انفرادیت کی بنا پر ان کی فضیلت و برتری کے معترف اور ان کی عزت و احترام کا پورا خیال رکھتے تھے، ان کی تصنیفات، طرقِ حدیث میں ان کے علم و نظر، علمی مباحث و امالی وغیرہ میں ان کے تصرفات و کمالات کا جو جائزہ لے گا وہ ان کے فضل و کمال کا ضرور اعتراف کرے گا اور اس کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ اپنے سے پہلے کے علماء پر بھی فوقیت رکھتے تھے، حاکم اپنے کمالات کی وجہ سے اس بلند مقام پر فائز تھے، جہاں پہنچنا دوسروں کے لیے ممکن نہیں تھا، وہ اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے، ان کی موت سے جو خلا ہوا ہے وہ پر نہیں ہو سکتا۔ (۱)

وفات: امام صاحب نے اپنے وطن نیشاپور میں منگل یا بدھ ۳/صفر ۴۰۵ھ کو دفعۃً انتقال کیا، حمام سے غسل کر کے نکل رہے تھے اور صرف تہبند باندھے ہوئے تھے کہ ایک آہ کھینچی اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، عصر بعد تجہیز و تکفین کی گئی، قاضی ابوبکر حیری نے جنازہ کی نماز پڑھائی، خلیل بن عبداللہ نے ارشاد میں ۴۰۳ھ سنہ وفات لکھا ہے لیکن علامہ ابن سبکی وغیرہ

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۳۸۵ و الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۵ وتبیین کذب المفتری ص ۲۲۹ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۶۔

نے اس کی تردید کی ہے۔

حسن بن اشعث قرشی نے خواب دیکھا کہ حاکم نہایت اچھی وضع قطع میں ایک گھوڑے پر سوار ہو کر کہہ رہے ہیں کہ مجھے نجات مل گئی، میں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ حدیث کی تحریر و کتابت کی وجہ سے اللہ نے مجھ کو نجات دی ہے۔(۱)

تصنیفات: امام ابوعبداللہ حاکم کی تصنیفات کمیت و کیفیت دونوں حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں، ان کا خود بیان ہے کہ ''میں نے زمزم کا پانی پی کر خدا سے حسن تصنیف کی دعا کی تھی، ان کی دعا مقبول ہوئی، اربابِ سیر کا اتفاق ہے کہ تصنیفی حیثیت سے ان کا مرتبہ نہایت بلند تھا، سعد بن علی زنجانی سے جب چار ہم عصر محدثین کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے ہر ایک کی جدا جدا خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان سب میں حاکم سب سے بہتر تصنیف والے تھے، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ'' حاکم نے علوم حدیث میں بے نظیر تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں'' سمعانی کا بیان ہے کہ انھوں نے علوم حدیث اور دیگر فنون میں بڑی عمدہ کتابیں لکھیں، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں'' حاکم را در فن تصنیف و ترتیب دخل تمام بود۔''

ان کی تصنیفات کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے، بعض لوگوں نے پانچ سو، بعض نے ایک ہزار اور بعض نے ڈیڑھ ہزار جز کے بقدر تعداد بتائی ہے،(۲) لیکن قدما کی طرح ان کی بھی اکثر کتابیں اب معدوم اور ناپید ہیں، جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔الاربعین، ۲۔الامالی، ۳۔امالی العشیات، ۴۔تراجم

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۳۸۵ والطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۵ وتبیین کذب المفتری ص ۲۲۹ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۶ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ والطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۸ وبستان المحدثین ص ۱۴۱۔

الشیوخ، ۵-تراجم المسند علی شرط الصحیحین۔ ۶-التلخیص، ۷-فضائل الامام الشافعی، ۸-فضائل العشرۃ المبشرۃ، ۹-فضائل فاطمہ، ۱۰-فوائد الخراسانیین، ۱۱-فوائد الشیوخ، ۱۲-فوائدالعراقیین، ۱۳-ماتفرد باخراجه کل واحد من الامامین، ۱۴-کتاب المبتدا من اللآلی، ۱۵-مناقب الصدیق۔

۱۶-کتاب العلل: علل میں امام مسلم اور دارقطنی کی کتابیں اہم سمجھی جاتی ہیں، حاکم کی کتاب کا بھی ان ہی کے ساتھ نام لیا جاتا ہے، ۱۷-تفسیر القرآن: علامہ سیوطی اور صاحبِ کشف الظنون نے تیسری اور چوتھی صدی ہجری کی اہم کتب تفسیر میں اس کو شمار کیا ہے، سیوطی لکھتے ہیں ''پھر ابن ابو حاتم، ابن ماجہ، حاکم، ابن مردویہ، ابن حبان اور ابن منذر وغیرہ کی تفسیریں ہیں، ان میں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے آثار سنداً بیان کئے گئے ہیں۔''(۱)

۱۸-تخریج الصحیحین: اس کا نام المدخل الی معرفة الصحیحین بھی ہے اور غالباً حاکم نے رسالہ المدخل میں اسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''حجاز، عراق اور شام کے لوگ صحیح حدیثوں کی معرفت میں اہلِ خراسان کی برتری اور تقدم کے معترف ہیں، اس کی وجہ شیخین (بخاری ومسلم رحمہما اللہ) کی اس فن میں مہارت وانفرادیت ہے، اللہ ان دونوں بزرگوں کو اسلام کی اس خدمت کی جزائے خیر عطا کرے، میں نے ان کی کتابوں کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے، اس میں ان کی صحیح وسقیم حدیثوں کی متفق علیہ اور مختلف فیہ شرطوں کا ذکر ہے،(۲) اس کی ابتدا میں حدیثوں کی حفظ واشاعت کے بارے میں حدیثیں اور آثار اور جھوٹی حدیثیں گھڑنے کے متعلق وعیدیں بیان کی گئی ہیں، پھر ان لوگوں کے نام تحریر کئے گئے ہیں جن کا صحیحین یا ان میں سے کسی ایک

(۱) الاتقان ج ۲ ص ۱۹۰ (۲) المدخل الی علم الحدیث ص ۶۔

کے اندر ذکر ہے، اس کے بعد ان اشخاص کا ذکر ہے جن سے امام بخاری نے روایتیں کی یا سنی ہیں، حافظ محمد طاہر مقدسی نے اس کتاب کے اکثر مباحث الجمع بین رجال الصحیحین میں درج کئے ہیں۔

۱۹-مزکی الاخبار: معرفۃ علوم الحدیث کے بعض قلمی نسخوں میں اس کا نام کتاب المزکین لرواۃ الاخبار لکھا ہوا ہے، حاکم خود اس کے متعلق لکھتے ہیں ''اس میں راویوں کے دس طبقوں کا ذکر ہے، ہر طبقہ میں ایک دور کے چار بلند پایہ رواۃ شامل کئے گئے ہیں، اس طرح کل چالیس راویانِ حدیث کا اس میں ذکر ملتا ہے، پہلے طبقہ میں حضرت ابو بکر وعمر، علی اور زید بن ثابت (رضی اللہ عنہم) کا ذکر ہے، کیوں کہ ان بزرگوں نے راویوں کی جرح وتعدیل اور روایات کی صحت وسقم کی بحث وتحقیق کی ہے، دسویں طبقہ میں ابو اسحاق ابراہیم بن حمزہ اصبہانی، ابو علی نیشاپوری، ابو بکر محمد بن عمر بن سالم بغدادی اور ابو القاسم حمزہ بن علی کنانی مصری کا ذکر ہے۔(۱)

۲۰-کتاب الاکلیل: بعض مصنفین نے اس کا نام اکلیل فی الحدیث لکھا ہے، یہ کتاب انھوں نے بعض امرا کی فرمائش پر لکھی تھی، اس کے بعد انھوں نے اصول حدیث میں اپنی مشہور تصنیف المدخل الی الاکلیل کے نام سے بھی ایک رسالہ لکھا، اس کے آخر میں وہی باتیں مذکور ہیں جو اکلیل میں بیان کی گئی ہیں، یعنی صحیح حدیثوں کے رموز وطبقات (۲) وغیرہ، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ ''یہ بڑی مفید کتاب ہے اور مفسر (۳) کو اس کے بغیر چارہ نہیں، علامہ ابن عساکر نے حاکم کی ایک کتاب کا نام ''الاکلیل فی دلائل النبوۃ'' بھی بتایا ہے، غالباً یہ کوئی اور کتاب ہوگی یا ممکن ہے نام میں تصحیف ہوگئی ہو۔

۲۱- المدخل الی علم الحدیث: المدخل الی معرفۃ الصحیح والسقیم من الاخبار اور

(۱) معرفۃ علوم الحدیث ص ۵۲ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۱۳۵ (۳) مفسر کا لفظ یہاں کتابت کی غلطی معلوم ہوتا ہے صحیح محدث ہوگا۔

المدخل الیٰ علم الصحیح بھی اسی کے نام ہیں اور غالباً علامہ ابن صلاح اور صاحب کشف الظنون نے المدخل الیٰ اکلیل بھی اسی کا نام تحریر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب الاکلیل کا مقدمہ ہے، خود امام صاحب کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں میں نے اس کو امیر مظفر کی استدعا پر کتاب الاکلیل کی صحیح وسقیم حدیثوں کی نشاندہی کے لیے لکھا تھا۔"(۱) اس میں پہلے علم اسناد وروایت کی اہمیت، محدثین کی فضیلت اور کتب حدیث کے بعض طبقات کا اجمالاً ذکر کرنے کے بعد صحیح حدیثوں کی دس قسمیں بیان کی گئی ہیں، ان میں پانچ قسمیں متفق علیہ اور پانچ مختلف فیہ ہیں، پھر نقد وجرح پر گفتگو کی گئی ہے اور آخر میں اکلیل کی حدیثوں کے متعلق ان امور کا ذکر ہے، جن سے ان کی صحت وضعف کا پتہ چل جاتا ہے لیکن حاکم نے اس میں متفق علیہ اور مختلف فیہ حدیثوں کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے، بعض علما نے اس پر اعتراضات بھی کیے ہیں، شیخ محمد راغب طباخ نے مطبع علمی حلب سے جمادی الاول ۱۳۵۱ھ میں اس مفید رسالہ کو شائع کیا ہے۔

۲۲- **تاریخ نیشاپور:** یہ بڑی ضخیم کتاب ہے، اس میں خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد کی طرح علما ومشاہیر فن کے تراجم درج ہیں اور حوادث وواقعات کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے،(۲) اسی لیے اس کا نام تاریخ علمائے نیشاپور بھی ہے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ "حاکم کے اس عظیم الشان کارنامہ کے سامنے نامور محدثین وفقہا کو سرنگوں ہوجانا پڑا جو اس کا بغور مطالعہ کرے گا اس کو ان کے گوناگوں کمالات اور مختلف علوم میں جامعیت کا پورا اندازہ ہوجائے گا۔" ابوالفضل بن فلکی ہمدانی فرماتے ہیں کہ "میرے نیشاپور کا سفر کرنے اور وہاں اقامت اختیار کرنے کی ایک وجہ حاکم کی اس تاریخ کو دیکھنا بھی تھا۔"

عبدالغافر بن اسماعیل فارسی نے اس کا ذیل لکھا تھا، اس میں ۵۱۸ھ تک وفات پانے والے لوگوں کا ذکر ہے اور علامہ ذہبی نے "مختصر تاریخ حاکم" کے نام سے اس کا

(۱) المدخل الیٰ علم الحدیث ص ۳۴ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۵۴۴۔

اختصار لکھا تھا۔(۱)

۲۳-معرفۃ علوم الحدیث: یہ علوم حدیث پر ایک اہم اور مفید کتاب ہے، امام حاکم کو اپنے زمانہ میں بدعتوں کی کثرت، سنن سے عام ناواقفیت اور حدیثوں کے ضبط وتحریر میں اہمال اور لاپروائی کی وجہ سے اس کی ترتیب وتصنیف کا خیال ہوا تھا۔'' (۲) اس سے پہلے علومِ حدیث میں جو کتابیں لکھی گئی تھیں، ان کی حیثیت متفرق اجزا کی تھی، ابو محمد حسن بن عبدالرحمٰن بن خلاد رامہرمزی (م ۲۶۰ھ) کی کتاب المحدث الفاصل بین الراوی والواعی، اس موضوع کی پہلی باقاعدہ کتاب ہے لیکن اس میں مکمل استیعاب واستقصا نہیں کیا گیا تھا، (۳) حاکم کے بعد خطیب بغدادی اور علامہ ابن صلاح کی کتابیں فوائد ومعلومات کے لحاظ سے اہم ہیں لیکن حاکم کا شرف وتقدم مسلم ہے، مگر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''حاکم اپنی کتاب کی باقاعدہ ترتیب وتہذیب نہیں کر سکے۔'' (۴) لیکن یہ بیان محل نظر ہے، علامہ ابن خلدون رقمطراز ہیں کہ ''علوم حدیث میں لوگوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں لیکن اس فن کے یگانۂ روزگار ائمہ وعلمائے فحول میں ابوعبداللہ حاکم ہیں، ان کی کتابیں مشہور ہیں، انھوں نے اس فن کو باقاعدہ مرتب ومہذب کیا اور اس میں بعض انواع کا اضافہ کیا اور اس کے محاسن اچھی طرح منقح اور نمایاں کیے (۵) اور ملا چلپی لکھتے ہیں کہ ''اس فن کی جانب سب سے پہلے ابوعبداللہ حاکم نے اعتناء کیا، اس کے بعد علامہ ابن صلاح نے علوم الحدیث کے نام سے بڑی اہم اور قابل ذکر کتاب لکھی جو مقدمہ ابن صلاح کے نام سے مشہور ہے، اس میں انھوں نے بعض انواع کا مفید اضافہ کیا ہے لیکن حاکم کی حیثیت متقدم ومتبوع کی ہے اور ابن صلاح ان کے تابع ہیں انھوں نے اکثر چیزیں حاکم کے حوالہ سے لکھی ہیں۔'' (۶)

(۱) کشف الظنون ص ۲۳۴ (۲) مقدمہ حاکم ص ۱و۲ (۳) تدریب الراوی ص ۹ ونخبۃ الفکر فی شرح نزہۃ النظر ص ۳ (۴) تدریب الراوی ص ۹ ونخبۃ الفکر فی شرح نزہۃ النظر ص ۳ (۵) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۸۵ (۶) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۲۹۔

اس تفصیل سے ثابت ہوگیا کہ اس موضوع پر یہ دوشرح باقاعدہ اور پہلی مکمل وجامع کتاب ہے، جو پانچ اجزا اور باون انواع پر مشتمل ہے، اس میں مصنف نے حدیث کے اسناد ومتون وغیرہ گوناگوں انواع واقسام اور راویوں کے مختلف درجات وطبقات، ان کے مراتب اور اصول حدیث کے مہمات مسائل پر سیر حاصل اور عمدہ بحثیں کی ہیں، ہر بحث کی تعریف، اہمیت، نوعیت اور ضرورت کو مثالوں سے واضح کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں متقدمین کے کاموں کا ایک حد تک ذکر بھی آ گیا ہے، ہر بحث میں پہلے احادیث وآثار سنداً بیان کئے گئے ہیں اور آخر میں ان سے مصنف نے جو حقائق اور معنی خیز نتائج اخذ کئے ہیں، ان کا ذکر ہے۔ ضمناً اکثر صحابہ وراویانِ حدیث کے بعض خصوصیات سنینِ وفات اور ان کے بارے میں دوسرے مختلف النوع معلومات بھی تحریر کئے گئے ہیں۔

معرفۃ علوم الحدیث کے قلمی نسخے یورپ، ترکی، مصر، شام اور ہندوستان کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، ان سب کی مدد ومقابلہ وتصحیح کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات وعربی کے سابق صدر ڈاکٹر سید معظم حسین نے اس کو ایڈٹ کیا تھا جو ۱۹۳۵ء میں مصر سے دائرۃ المعارف حیدرآباد کے اہتمام میں شائع ہوا ہے، اس کے شروع میں فاضل مرتب نے ایک جامع ومبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے، اس میں مصنف کے حالات وکارنامے اور اصولِ حدیث کی امہاتِ کتب کا تذکرہ کیا گیا ہے اور حواشی میں نسخوں کے فرق واختلاف اور کمی بیشی کی تصریح کی ہے۔

حافظ ابونعیم اصبہانی نے اس پر مستخرج لکھا تھا اور علامہ طاہر جزائری نے توجیہ النظر میں اس کا ملخص شامل کیا ہے۔(۱)

۲۴- المستدرك على الصحيحين: یہ حاکم کی سب سے اہم اور شہرۂ آفاق کتاب ہے، ذیل میں اس کے متعلق ضروری معلومات پیش کیے جاتے ہیں:

---

(۱) مقدمہ مصحح۔

مستدرک کی تعریف: محدثین کی اصطلاح میں حدیث کی وہ کتابیں مستدرک کہلاتی ہیں جن میں ان حدیثوں کو نقل کیا جاتا ہے جو حدیث کی کسی اور کتاب کی شرط کے مطابق ہونے کے باوجود اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہوں (۱) اس طرح کی حدیث کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ابوعبداللہ حاکم کی المستدرک علی الصحیحین زیادہ مشہور و متداول ہے، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم پر مستدرک ہے، یعنی اس میں ان حدیثوں کو شامل کیا گیا ہے جو حاکم کے خیال میں صحیحین کے معیار و شرائط کے مطابق ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔

مستدرک کی تالیف کی وجہ: حاکم نے مستدرک کے شروع میں اس کی جمع و تالیف کا سبب و مقصد اور ان حالات کا ذکر کیا ہے جو اس کی ترتیب و تصنیف کا باعث ہوئے تھے، وہ لکھتے ہیں:

> "ائمہ حدیث میں ابوعبداللہ محمد اسماعیل جعفی ابوالحسین، مسلم بن حجاج قشیری نے صحیح حدیثوں کے دو نہایت عمدہ اور بیش قیمت مجموعے مرتب کیے ہیں، ان دونوں کتابوں کی چار دانگ عالم میں شہرت ہے لیکن دونوں بزرگوں میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ بجز ان حدیثوں کے جن کی انھوں نے تخریج کی ہے اور کوئی حدیث صحیح نہیں ہے مگر ہمارے زمانہ کے بعض مبتدعین اور اہل اہوا جو محدثین پر سب و شتم کرنے میں بہت جری واقع ہوئے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں ہے، رہے وہ اسانید جو ایک ہزار یا اس سے کچھ کم و بیش اجزا پر مشتمل ہیں سب کے سب سقیم اور غیر صحیح ہیں، اس صورت حال کے پیش نظر اس شہر کے کچھ اعیان و مشاہیر اہل علم نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ایسی کتاب مرتب و مدون کروں جو ان حدیثوں پر مشتمل ہو جن کے اسانید اسی طرح کے .... ہوں جس طرح کے

---

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۳۷ و ۱۰۳۔

اسانید کو شیخین نے صحیح اور قابل احتجاج قرار دیا ہو اس لیے کہ جو حدیث علت قادحہ سے خالی ہو اس کو صحیح سے خارج کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔"(۱)

مستدرک کی اہمیت: مستدرک کا شمار حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہوتا ہے اور بعض حیثیتوں سے اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کو محسوب کیا ہے،(۲) اس طبقہ میں مسند دارمی، سنن دارقطنی، مسند ابوداؤد طیالسی اور مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ جیسی اہم اور بلند پایہ کتابیں ہیں، بعض محدثین نے اس کا پایہ صحیح ابن حبان کے قریب قریب بتایا ہے،(۳) اور اس کا نام بھی صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان کے ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے، حافظ ابن صلاح اور علامہ نووی نے صحاح کے بعد حدیث کی جن کتابوں کو زیادہ اہم، قابل اعتماد اور پرازمنفعت قرار دیا ہے، ان میں امام دارقطنی کی سنن کے بعد اسی کا نام لیا ہے۔(۴)

مستدرک کی حدیثوں کی نوعیتیں: اوپر حاکم کا جو بیان گذرا ہے، اس سے اور حاکم کی دوسری تصریحات سے مستدرک کی حدیثوں کی مندرجہ ذیل نوعیتوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱- مستدرک میں شیخین (امام بخاری و امام مسلم) کی ان متروک حدیثوں کو جو ان کے معیار و شرائط کے مطابق ہیں جمع کیا گیا ہے۔

۲- دونوں بزرگوں میں سے صرف ایک کی متروک حدیثوں کو بھی درج کیا گیا ہے۔

۳- مستدرک میں ایسی حدیثیں بھی شامل ہیں جو صحیحین کے اصول و شرائط کے مطابق تو نہیں ہیں لیکن امام حاکم کی تحقیق میں وہ صحیح اور علل واسقام سے پاک ہیں۔(۵)

۴- حاکم کے (۶) بیان کے مطابق بعض ایسی حدیثیں بھی مستدرک میں ہیں

(۱) المستدرک ج۱ ص۲و۳ (۲) عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ (۳) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص۸ (۴) مقدمہ ابن صلاح ص۱۹۲، تدریب الراوی ص۳۰ و ۳۱ و ۲۶۰ (۵) مقدمہ ابن صلاح ص۱۱ (۶) یہ حاکم کا خود بیان ہے ورنہ عام اہل فن نے تو مستدرک میں ضعیف اور موضوع حدیثوں کی کثیر تعداد بتائی ہے۔

جن پر کلام کیا گیا ہے اور وہ ان کے معیار وشرائط کے مطابق بھی نہیں ہیں لیکن انھوں نے ان کو شواہد ومتابعات کی حیثیت سے یا اور کسی خاص اضطرار وغیرہ کی بناء پر نقل کیا ہے۔

حاکم نے مستدرک میں کہیں کہیں ایک مقدمہ کا حوالہ دیا ہے جس میں انھوں ان اصول وخصوصیات اور شرائط کا مفصل ذکر کیا تھا جن کو مستدرک کی تالیف وترتیب میں مدنظر رکھا تھا لیکن یہ مقدمہ مستدرک کے مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں ہے، وہ یا تو محفوظ نہیں رہا یا حاکم نے اس کو مرتب ہی نہ کیا ہو اور اس بنا پر کہ اس کو لکھنے کا ارادہ تھا، اس کا حوالہ دے دیا ہو، اگر یہ مقدمہ موجود ہوتا تو اس سے مستدرک کے اصول وشرائط اور اس کی حدیثوں کی نوعیت اور خصوصیات معلوم کرنے میں بڑی آسانی ہوتی، جہاں انھوں نے اس کے حوالے دیے ہیں ان سے بھی مستدرک کی حدیثوں کی نوعیت اور خصوصیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، اس ذیل میں مستدرک کی حدیثوں کی بعض نوعیتیں ان حوالوں کی مدد سے لکھی جاتی ہیں۔

۵- مستدرک میں ایک صحابی کی حدیث دوسرے صحابی سے بشرطے کہ وہ صحیح طرق سے ثابت ہو درج کی جائے گی۔(۱)

۶- اگر کسی صحابی سے کسی ایک ہی معروف تابعی کی روایت کا پتہ چل سکا ہو تو اس کو بھی مستدرک میں بطور حجت پیش کیا جائے گا اور اس کو صحیح قرار دیا جائے گا۔(۲)

۷- ثقات کے تفرد اور اضافے کی تخریج بھی کی جائے گی، بشرطے کہ وہ مرتب کے خیال میں علتوں سے خالی ہوں کیوں کہ ثقہ کا اضافہ مقبول ہوتا ہے۔(۳)

۸- کسی موصول ومسند حدیث کو اگر ارسالاً اور موقوفاً بھی روایت کیا گیا ہو تو موصول ومسند حدیث کو محض دوسری حدیث کے وقف وارسال کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ ہمارے اصول اور قاعدے کے مطابق ایسی صورت میں مسند وموصول روایت کرنے والے کی حدیث قابل قبول ہوگی۔(۴)

---

(۱) المستدرک ج ۱ص ۱۱۸و۱۱۹ (۲) ایضاً ص ۲۳ (۳) ایضاً ص ۴۲ وج ۲ص ۵۸ (۴) ایضاً ج ۱ص ۱۷۲۔

۹- حلال وحرام کے متعلق احادیث میں زیادہ احتیاط اور سختی برتی جائے گی، مگر فضائلِ اعمال کے سلسلہ کی حدیثوں میں زیادہ سختی سے کام نہ لیا جائے گا، اس اصول کے متعلق انھوں نے کتاب الدعوات میں شیخین کی متروک حدیثوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ابوسعید عبدالرحمٰن بن مہدی کا یہ قول بھی تحریر کیا ہے کہ:

''ہم لوگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حلال وحرام سے متعلق حدیثیں روایت کرتے ہیں تو اسانید ورجال کو پرکھنے میں زیادہ شدت برتتے ہیں اور پوری احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہیں مگر فضائلِ اعمال اور ثواب وعقاب، مباحات ودعوات سے متعلقہ روایات کے اسانید میں تساہل سے کام لیتے ہیں۔''(۱)

المدخل میں اس قول کے ساتھ امام احمدؒ کا بھی اسی طرح کا ایک قول نقل کیا ہے:

''جب ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرویات بیان کرتے ہیں تو حلال وحرام اور سنن واحکام کے سلسلہ میں تشدد سے اور فضائلِ اعمال اور غیر احکامی حدیثوں میں لینت اور نرمی سے کام لیتے ہیں۔''(۲)

تلاش وتفحص: امام ابوعبداللہ نے ان ہی اصول وشرائط کے مطابق مستدرک میں حدیثیں جمع کی ہیں اور جو حدیثیں ان کے بیان کے مطابق نہیں ہیں، ان کو نقل کرنے سے احتراز کیا ہے، چنانچہ کہیں کہیں مستدرک میں اس کی تصریح وتوضیح کی ہے، اس سے مستدرک کی جمع وتالیف اور ترتیب وتدوین میں ان کی تلاش ومحنت اور چھان بین کا پتہ چلتا ہے، بعض مواقع پر انھوں نے خود بھی اس تلاش وتحقیق کا ذکر کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں نے مشہور حدیث ''من سئل عن علم فکتمه جیيء به یوم القیامة وقد الجم بلجام من نار۔ ''کے متعلق جو متعدد طرق واسانید سے مروی ہے، امام دارقطنی سے دریافت کیا کہ کیا عطار کی روایت کے متعدد اسناد

---

(۱) المستدرک ج۱ص۴۹۰ (۲) المدخل ص۴۔

میں کوئی سند صحیح ہے، انھوں نے جواب دیا کہ نہیں، میں نے وجہ دریافت کی تو کہا کہ عطا نے حضرت ابو ہریرہؓ سے سماع نہیں کیا ہے لیکن جب میں نے اس کی مزید تحقیق کی تو متعدد لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ انھوں نے ابو ہریرہؓ سے عطاء کے سماع کا ذکر کیا ہے، اس سے ثابت ہوگیا کہ یہ حدیث صحیح سندوں سے مروی ہے اور اس میں کوئی سقم نہیں ہے، میری اس تحقیق کو امام دارقطنی نے بھی پسند کیا اور اس بارے میں وہ میرے معترف اور ہمنوا ہو گئے۔"(۱)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"زکوۃ کی تفسیر وتوضیح کرنے والی حدیثوں کی تخریج میں جس قدر ممکن ہوسکا ہے، میں نے اپنی غیر معمولی محنت وکاوش صرف کردی ہے اور ان کی صحت کے بارے میں خلفائے اربعہ، صحابہ اور تابعین کے صحیح اسناد، ان کے تعامل اور شہرت وقبول سے استدلال بھی مہیا کر دیا ہے جو غور وفکر کرنے والوں کے لیے کافی ہے۔"(۲)

حاکم کی کاوش کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مستدرک میں ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن سے حدیث کی دوسری کتابیں خالی ہیں۔

مستدرک کے خصوصیات: مستدرک کے بعض اہم خصوصیات یہ ہیں:

۱- حاکم نے اس کی ترتیب، ابواب کی تبویب اور احادیث کے نقل وانتخاب میں حسن وموزونیت کے علاوہ بعض مقامات میں جدت واختراع سے بھی کام لیا ہے، اس سے ان کی محنت اور جانفشانی کا اندازہ ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"جہاں تک تلاش واجتہاد نے میری رسائی کی ہے میں نے خلفائے اربعہ کے فضائل سے متعلق وہ تمام حدیثیں جمع کر دی ہیں جو صحیح سندوں سے مروی ہیں اور جن کو شیخین نے ترک کر دیا ہے، پھر میں نے اس کتاب کے نظم وترتیب

---

(۱) المستدرک ج ۱ ص ۱۰۱ (۲) المستدرک ج ۱ ص ۳۹۷۔

کے لحاظ سے یہ مناسب سمجھا کہ ان بزرگوں کے مناقب کے بعد دیگر صحابہ کے فضائل وفیات کی ترتیب پر جمع کروں۔''(۱)

عام محدثین کے برخلاف انھوں نے کتاب الفتن والملاحم کے بعد کتاب الاہوال کا بھی ایک علاحدہ باب علامہ ابن خزیمہ کے تتبع میں قائم کیا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے مبلغ علم کے مطابق آخری زمانہ کے فتن کے متعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ مروی تھا، وہ سب میں نے اس کے اندر بہتر سندوں کے ساتھ بیان کر دیا ہے، شیخین نے قیامت اور حشر ونشر کے اہوال کی حدیثیں کتاب الفتن ہی میں شامل کر دی ہیں لیکن میں نے اس سلسلہ میں ابوبکر بن محمد بن اسحق بن خزیمہ کے انداز پر اس کو باب الفتن سے علاحدہ ذکر کیا ہے۔(۲)

امام بخاری وغیرہ محدثین نے کتاب البیوع میں متعدد مستقل ابواب مثلاً کتاب السلم، شفعہ اور اجارہ وغیرہ قائم کیے ہیں لیکن حاکم نے کتاب البیوع کے جامع عنوان ہی میں ان سب ابواب کو بھی جمع کر دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

''میں نے اسی کتاب (کتاب البیوع) کے ضمن میں ان کتب کو بھی درج کر دیا ہے جن کے لیے امام بخاری نے کتاب البیوع کے آخر میں مستقل عنوانات قائم کیے ہیں، یہ وضاحت اس لیے کر دی گئی تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ میں نے کتاب البیوع کو ان ابواب سے خالی رکھا ہے۔''(۳)

فضائلِ صحابہ میں صرف صحابہ کے مناقب وفضائل ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کے سنین اور مختصر حالات بھی تحریر کیے ہیں۔

۲- دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاری وامام مسلم کی کتابوں کی بھی بعض

(۱) ایضاً ج ۳ ص ۱۸۰ (۲) المستدرک ج ۴ ص ۵۵۸ (۳) ایضاً ج ۲ ص ۶۵ و ۶۶۔

خصوصیات واصول اور اس کے متعلق مفید معلومات اس سے معلوم ہو جاتے ہیں، مثلاً:

(الف) شیخین نے بعض غیر معلل حدیثوں کو نقل کرنے سے اس لیے احتراز کیا ہے کہ ان کے رواۃ میں کوئی راوی قلیل الروایت رہا ہو، چنانچہ ایک حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اس حدیث کے از اول تا آخر تمام رواۃ سے بجز یوسف بن ابی بردہ کے شیخین نے حجت قائم کی ہے اور جو کچھ اس سلسلہ میں مجھ کو معلوم ہوا ہے، وہ یہ کہ ان دونوں حضرات نے کسی جرح وضعف کی وجہ سے ان کو نہیں چھوڑا ہے بلکہ ان کی قلتِ روایت کی وجہ سے۔''(۱)

(ب) شیخین نے بعض صحیح حدیثوں کو کسی ایک راوی کے تفرد یا اس حدیث کے دوسرے رواۃ کی کسی مخالفت وعدم متابعت کی وجہ سے اس کو نظر انداز کر دیا ہے، حاکم اس کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> حضرت عثمانؓ سے وضو کے متعلق جو حدیث مروی ہے، اس کے طرق کی تخریج پر شیخین نے بھی اتفاق کیا ہے لیکن ان کی روایات میں داڑھی کے تین بار خلال کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، حالانکہ یہ بھی صحیح اسناد سے ثابت ہے اور ان دونوں بزرگوں نے عامر بن شقیق کے سوا اس کے تمام رواۃ سے حجت قائم کی ہے لیکن عامر کے متعلق مجھ کو کسی طعن کا کوئی علم نہیں۔''(۲)

(س) شیخین کے غیر معمولی حزم واحتیاط کی بنا پر روایت ترک کر دینے کا اصول بھی اس سے معلوم ہوتا ہے، مثلاً لکھتے ہیں:

> ''یہ حدیث صحیح الاسناد ہے لیکن ان دونوں بزرگوں نے عبداللہ بن محمد بن عقیل ابن ابی طالب کے تفرد اور ان کی جانب سوء حفظ کی نسبت کی وجہ سے اس

---

(۱) المستدرک ج ۱ ص ۳۲ (۲) ایضاً ص ۱۴۹۔

کی تخریج نہیں کی ہے مگر ہمارے ائمہ متقدمین کے نزدیک وہ ثقہ و مامون شخص ہیں۔''(۱)

(ج) شیخین کے کسی راوی سے استشہاد کا حال معلوم ہوتا ہے۔

(د) شیخین یا ان میں سے ایک کے بارے میں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے حاکم کے کن کن رواۃ سے احتجاج کیا ہے۔

(ہ) حدیثوں کے شیخین کے شرائط کے مطابق ہونے کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض حدیثوں کو انھوں نے مکمل یا مختصر صورت میں یا قدرے فرق واختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے، چنانچہ کتاب العلم کی ایک حدیث کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس کو شیخین نے مفصل ومختصر دونوں طرح ذکر کیا ہے، میں نے اس کا اعادہ اس وجہ سے کیا ہے کہ اس کے سوا مجھے ان کے یہاں اجماع کی حجیت ثابت کرنے والی اور کوئی حدیث نہیں ملی، باقی ان ابواب میں اس موقع پر میں نے متعدد ایسی حدیثیں نقل کی ہیں جن کی ان لوگوں نے تخریج نہیں کی ہے۔''(۲)

۳- مستدرک میں فقہی مسائل سے کم تعرض کیا گیا ہے تاہم ان کے ذکر سے یکسر خالی نہیں ہے اور حاکم نے بعض فقہی اختلافات میں مرجح واولیٰ کی نشاندہی بھی کی ہے، جس سے ان کی اجتہادی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۴- مستدرک کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض حدیثوں کے مراجع ومصادر کی نشاندہی بھی کی ہے، اس سلسلہ میں جامع بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داود، سنن نسائی، موطا امام مالک، المبسوط امام شافعی اور صحیح ابن خزیمہ کے نام لیے ہیں لیکن بعض کتب ومسانید و وحدان کا نام لیے بغیر بھی ذکر کیا ہے۔

۵- بعض ابواب اور مضامین کی حدیثوں کو جمع کرنے میں بڑا اہتمام کیا ہے اور

(۱) المستدرک ج۱ص۱۷۱و۷۲ (۲) المستدرک ج۱ص۱۱۳۔

بعض حدیثوں کے اسناد وطرق کو جمع کرنے میں بڑے استقصا سے کام لیا ہے، اسی لیے مستدرک میں بکثرت ایسی حدیثیں ہیں جن سے دوسری کتب حدیث خالی ہیں۔

۶- حدیثوں کی تصحیح وتصویب، ان کے قوی عزیز، ضعیف وشاذ اور غریب ہونے کی نشاندہی، وقف وارسال، رفع واتصال اور علوے اسناد کی تصریح، حفظ وضبط اور اتقان کے لحاظ سے اس کے اولیٰ واحسن ہونے اور علت وضعف اور سقم وعیب سے خالی ہونے کا ذکر، راویوں کی توثیق، دوروایتوں اور راویوں میں باہمی موازنہ، راوی کے شک ووہم، اس کے تفرد، مخالفت، عدم متابعت اور سماع ولقا یا عدم سماع بقا کی توضیح اور بعض حدیثوں کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ اس کو کس جگہ کس وقت اور کس ماہ وسنہ میں انھوں نے روایت کیا ہے، اسی طرح روایات کے شواہد ومتابعات، فنی مباحث کے متعلق علمائے جرح وتعدیل کے اقوال، روایات ورواۃ کی صحت وقوت یا ضعف وجرح کو واضح کر کے اس کے دلائل بھی بیان کیے ہیں اور حدیث کے مفہوم وغیرہ کے سلسلہ میں بھی مختلف النوع وضاحتیں کی ہیں جن کو آگے لکھا جائے گا۔

طرز استدلال: مستدرک کے محاسن وخصوصیات کا اندازہ اس کے طرز استدلال سے بھی ہوتا ہے، لیکن اکثر دلائل خالص فنی نوعیت کے ہیں، اس لیے جب تک ان کا اصل پس منظر اور پوری تفصیل سامنے نہ ہو ان کو نقل کرنا نہ زیادہ مفید ہوگا اور نہ عام لوگوں کے لیے اس میں دلچسپی کا کوئی سامان ہے لیکن حاکم کے استدلال کی خصوصیت اور ان کے نقد ونظر کا اندازہ کرنے کے لیے یہاں ان کے ان انتقادات کا ذکر کیا جاتا ہے جو انھوں نے شیخین پر کیے ہیں، شیخین پر حاکم کے نقد وتبصرہ دو طرح کے ہیں، ایک تو وہ جن میں کسی حدیث کے بارے میں صرف شیخین کی عدم تخریج کا ذکر ہے، دوسرے وہ ہیں جن میں شیخین کے عدم تخریج کے وجوہ واسباب کا ذکر کرنے کے بعد ان پر تنقید کی گئی ہے، ان میں سے دوسری نوع کی بعض تنقیدیں یہاں درج کی جاتی ہیں:

"یہ حدیث صحیح اور ثقہ محدثین کے یہاں متداول ہے لیکن ان دونوں بزرگوں نے اس لفظ کے ساتھ اس کی تخریج نہیں کی ہے، میرے خیال میں ان لوگوں نے اس کے راوی ہصان بن کاہل (یا کاہن) کی وجہ سے اس کو چھوڑ دیا ہے، کیوں کہ ان سے روایت کرنے والے معروف شخص محض حمید بن ہلال عدوی ہیں لیکن ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ ان سے قرہ بن خالد نے بھی روایت کیا ہے، علاوہ ازیں خود شیخین نے بھی بعض ثقہ لوگوں سے ایسی روایتوں کی تخریج کی ہے جن سے صرف ایک شخص نے روایت کیا ہے، اس اصول کے بموجب ان دونوں بزرگوں کو اسی جیسی دوسری حدیث کی تخریج بھی کرنی چاہیے تھی۔"(۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"شیخین اجلح بن عبداللہ کندی کے ترک اور عدمِ احتجاج پر متفق ہیں اور ان سے ان کی ناراضگی کی وجہ محض عبداللہ بن بریدہ کی ایک حدیث کی روایت ہے، حالاں کہ اس میں تین ثقہ راویوں نے ان کی متابعت کی ہے، پس یہ حدیث صحیح ہے لیکن ان دونوں بزرگوں نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔"(۲)

امام دار قطنی نے بھی کتاب الالزامات علی الشیخین کے نام سے مستدرک ہی کی طرح ایک کتاب لکھی تھی، امام حاکم نے اس کے حوالہ سے بھی شیخین پر نقد کیا ہے، اس کی ایک مثال یہ ہے۔

"یہ صحیح حدیث ہے، اس میں کوئی علت نہیں پائی جاتی لیکن شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے کیوں کہ عروہ، کرز بن علقمہ سے روایت کرنے میں منفرد ہیں اور کرز بن علقمہ صحابی ہیں اور ان کی حدیث ائمہ کے مسانید میں درج ہے۔ میں نے علی بن عمر سے سنا ہے کہ امام بخاری و مسلم کے لیے کرز کی اس حدیث کی

(۱) المستدرک ج ۱ ص ۸ (۲) ایضاً ج ۲ ص ۷۷۔

تخریج لازم تھی، کیوں کہ اس کو عروہ بن زبیر نے اور ان سے زہری و عبدالواحد جیسے اکابر نے روایت کیا ہے، امام ابوالحسن کے بیان کی واضح دلیل یہ ہے کہ شیخین عتبان ابن مالک جن کے گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی حدیث پر متفق ہیں، حالاں کہ ان سے روایت کرنے والے تنہا محمود بن ربیع ہیں۔"(۱)

حزم واحتیاط: امام حاکم کے اصول و شرائط اور بحث واستدلال سے مستدرک کی تالیف میں ان کی احتیاط کا بھی اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے وہی احادیث و روایات نقل کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کے اصول و معیار کے مطابق غیر معلل اور ضعف و سقم سے خالی ہیں، اس لیے حدیث نقل کرنے کے بعد عموماً انھوں نے اس کی صراحت بھی کر دی ہے کہ وہ قدح وعلت اور سقم و عیب سے پاک ہے لیکن حاکم کا عام رجحان یہ ہے کہ کوئی صحیح اور غیر معلل حدیث چھوٹنے نہ پائے، اس لیے احتیاط کے باوجود بھی مستدرک میں لینت و مداہنت کو راہ مل گئی ہے، اس پر آگے مستقل بحث کی جائے گی۔

احادیث کے متعلق وضاحتیں: امام ابوعبداللہ حاکم نے احادیث کے بارے میں مختلف النوع وضاحتیں کی ہیں، ان سے احادیث کے متعلق مفید معلومات فراہم ہوتے ہیں، یہ وضاحتیں مختلف طرح کی ہیں۔

۱۔ کسی حدیث کے متداول ہونے یا کسی خاص مقام میں مروج ہونے کا ذکر۔

۲۔ بعض حدیثوں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ کسی خاص مسئلہ میں اصل و بنیاد اور حجت و دلیل ہیں۔

۳۔ بعض حدیثوں کے کسی باب میں نقل کرنے کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔

۴۔ حاکم نے بعض حدیثوں کی اپنے زمانہ کے حالات کے لحاظ سے خاص اہمیت و ضرورت واضح کی ہے، مثلاً احتکار کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

---

(۱) المستدرک ج ۱ ص ۴۳۔

''عسرت اور تنگی کے موقع پر مسلمانوں کی مواسات سے احتراز کے زجر و توبیخ کے بارے میں جو اخبار و احادیث وارد ہیں، ان کا ذکر یہاں بہت ضروری ہے، کیوں کہ اس وقت مسلمان ان ہی حالات سے دوچار ہیں۔''(۱)

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''یہ چھ حدیثیں نہایت تلاش و جستجو کے بعد یہاں نقل کی گئی ہیں، گو یہ ہماری اس کتاب کی شرط کے موافق نہیں ہیں تاہم چوں کہ لوگ اس ضیق میں مبتلا ہیں (اللہ اس کو ختم کرے) اس لیے یہاں ہم نے ان کو نقل کر دیا ہے۔''(۲)

۵- انھوں نے کہیں کہیں ابواب کے شروع یا درمیان میں نوٹ لکھے ہیں جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں مثلاً فضائلِ صحابہ کے ابواب کے شروع میں لکھتے ہیں:

''ہم نے صحابہ کے ذکر میں پہلے ان کے نسب و وفات کا ذکر کیا ہے، پھر ان کے مناقب میں وہ حدیثیں درج کی ہیں جو شیخین کی شرطوں کے مطابق ہیں لیکن انھوں نے ان کی تخریج نہیں کی، ہم کو اعتراف ہے کہ ہم اس باب میں محمد بن عمر واقدی اور ان کے جیسے لوگوں کی روایات سے صرف نظر نہیں کر سکے ہیں۔''(۳)

اصحابِ صفہ کے بیان میں حاکم نے ان کے متعلق روایات کی مدد سے ان کے ناموں کی مفصل فہرست دی ہے، ان کے طبقات وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور ان کے اشغال و معمولات اور امتیازی خصوصیات کے سلسلہ میں ان سے اصحابِ تصوف کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔(۴)

مستدرک کی تلخیصات: جن علما نے مستدرک کے ساتھ اعتنا کیا ہے، ان میں علامہ ذہبی

---

(۱) المستدرک ج ۲ ص ۱۱ (۲) مستدرک ج ۲ ص ۱۳ (۳) ایضاً ج ۳ ص ۶۱ (۴) ایضاً کتاب الہجرۃ ص ۱۶ تا ۱۸۔

(م ۷۴۸ھ) کا نام زیادہ مشہور ہے، انھوں نے مستدرک کی تلخیص لکھی جو بہت مشہور ہے، اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا کہ خود ان کی اور بعض دیگر علما کی رائے میں اس کو دیکھے بغیر مستدرک کی تصحیح پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس میں ذہبی نے طویل حدیثوں اور اسناد کا اختصار ہی نہیں کیا ہے بلکہ جا بجا حاکم پر نقد و تعقب بھی کر کے احادیث کی تصحیح میں ان کے تساہل، روایتوں کے ضعف و نکارت اور وضع نیز راویوں کے جرح و سقم وغیرہ کو بھی واضح کیا ہے۔

علامہ ذہبی نے اپنی تلخیص میں بعض مواقع پر حاکم کے استدراک کی توثیق و تائید اور بعض مواقع پر سکوت اختیار کیا ہے، یہ بھی حاکم کی رائے سے اتفاق ہی ہے، رہا ان کا نقد و تعقب تو اس کی مختلف نوعیتیں ہیں:

(الف) حاکم نے کسی حدیث کو شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرائط کے مطابق بتایا ہے اور ذہبی نے اس کی تردید کی ہے۔

(ب) حاکم نے کسی حدیث کو دونوں بزرگوں کے شرائط کے مطابق قرار دیا ہے لیکن ذہبی کی تحقیق میں وہ صرف ایک ہی کی شرط کے مطابق ہے۔

(س) حاکم نے احادیث کی صحت اور رجال و اسناد کی قوت کا ذکر کیا ہے اور ذہبی نے ان کا ضعف و وضع، جرح و قدح اور سقم و نکارت ثابت کیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ذہبی نے بڑی دقت نظر سے مستدرک کی تلخیص کی تھی اور ان کے نقد و تعقب کا زیادہ حصہ صحیح ہے لیکن کہیں کہیں اس میں بھی فروگذاشتیں ہیں مثلاً کسوف کے بیان میں ایک حدیث نقل کرنے کے بعد حاکم نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ (ولم یخرجاه) یعنی شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے، ذہبی نے اس پر یہ تنقید کی ہے:

واسناده حسن وما هو علی	اس کے اسناد حسن ہیں لیکن وہ شیخین میں
شرط واحد منهما. (۱)	سے کسی کی شرط کے مطابق نہیں ہے

(۱) المستدرک کتاب الجر ۃ ج ا ص ۳۲۵۔

حالاں کہ حاکم نے یہاں سرے سے حدیث کے شیخین کی شرط کے مطابق ہونے کا ذکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ صرف یہ لکھا ہے کہ انھوں نے اس کی تخریج نہیں کی تھی، اس بنا پر ذہبی کا یہ نقد صحیح نہیں ہے۔

مستدرک اور تلخیص کے مصححین نے بھی علامہ ذہبی کے نقد پر تعقب کیا ہے، مثلاً ایک جگہ حاکم نے ایک حدیث کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے، اس پر نقد کرتے ہوئے ذہبی نے لکھا ہے:

عبدالرحمن لم يسمع من ابيه وعبدالرحمن ومن بعده سوا بحجة.	عبدالرحمٰن نے اپنے والد سے سماع نہیں کیا تھا اور عبدالرحمٰن اور ان کے مابعد کے راوی حجت نہیں۔

مصحح لکھتے ہیں:

"تقریب التہذیب میں عبدالرحمٰن کو ثقہ اور صغار تابعین میں بتایا گیا ہے، ان کا انتقال ۷۹ھ میں ہوا تھا، انھوں نے اپنے والد سے سماع کیا ہے لیکن بہت کم، اسی طرح عبدالرحمٰن کے صاحبزادے قاسم کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ ثقہ و عابد اور طبقہ رابعہ میں ہیں، پس ذہبی کا ان لوگوں کو مطلقاً عدمِ حجت قرار دینا کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔"(۱)

ذہبی ایک جگہ ایک راوی ابوالصہباء کے متعلق لکھتے ہیں کہ "صحیح بخاری میں ان سے روایت نہیں کی گئی ہے گو واقعہ کے لحاظ سے یہ بات درست ہو لیکن علامہ ذہبی کا منشا حاکم پر نقد اور اس راوی کو ضعیف قرار دینا ہے، جو صحیح نہیں ہے، تقریب ہی کے حوالہ سے مصحح لکھتے ہیں کہ وہ طبقۂ رابعہ اور مقبول رواۃ میں ہیں۔(۲)

بعض مقامات پر اصل اور تلخیص میں معمولی فرق بھی ہے مثلاً روزے کے بیان

(۱) المستدرک مع تلخیص ج ۱ ص ۵۰۹ (۲) ایضاً ص ۵۲۵۔

میں حاکم نے ایک حدیث میں صرف "والتلت العروق" لکھا تھا مگر ذہبی نے اس کو تلخیص میں "والتلت العروق بالماء" لکھا ہے،(۱) ایک اور جگہ حاکم نے "اغار" لکھا تھا، ذہبی نے اس کو "اغان" کر دیا ہے،(۲) ایک جگہ حاکم نے "ثنا یعقوب بن ابراہیم" لکھا ہے، ذہبی نے اس کو بدل کر "رواہ یعقوب الدورقی" (۳) کر دیا ہے، گو یعقوب بن ابراہیم اور یعقوب الدورقی ایک ہی شخص ہیں لیکن اس تصرف سے اشتباہ ہو سکتا ہے، دوسرے ذہبی نے ثنا کو جو خود مختصر تھا رواہ کر دیا ہے۔

مستدرک کی یہ تلخیص بھی اس کے ساتھ چار ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

۲- امام سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے توضیح المستدرک فی تصحیح المستدرک لکھی تھی جو ایک جلد میں ناتمام ہے، اس میں بھی حدیثوں کی تلخیص ہے۔(۴)

۳- مستدرک کی موضوع حدیثوں کو بھی ایک جز میں جمع کیا گیا تھا جو تقریباً ایک سو حدیثوں پر مشتمل ہے،(۵) بعض لوگوں نے اس کو بھی ذہبی کی تصنیف بتایا ہے۔

مستدرک کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، دائرۃ المعارف حیدر آباد نے جس کے اسلامی علوم وفنون کی خدمت اور علمائے اسلام کی بیش قیمت اور کمیاب کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں کارنامے اظہر من الشمس ہیں، اس شہرۂ آفاق کتاب کو بھی اس کے کئی مخطوطات کی مدد سے چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا تھا، پہلی جلد ۱۳۳۴ھ اور باقی جلدیں بالترتیب ۱۳۴۰ھ تا ۱۳۴۲ھ میں تصحیح وتحشیہ کے بعد شائع کی ہیں۔

فاضل مصحح نے مستدرک اور تلخیص پر کہیں کہیں مختصر مگر مفید نوٹ لکھے ہیں، مستدرک کی اشاعت کے بعد دار المصنفین کے سابق رفیق اور مشہور صاحب علم وقلم مولانا ابوالجلال ندوی نے اس پر ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا، اس میں مستدرک کے ناشرین کو بعض

(۱) المستدرک مع تلخیص ج ۱ ص ۳۲۲ (۲) ایضاً ج ۲ ص ۳ (۳) ایضاً ج ۱ ص ۱۱۵ (۴) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۲۷ (۵) ایضاً۔

مشورے دیے تھے، اس کے جواب میں دائرۃ المعارف کے رکن مولانا ہاشم ندوی کا مضمون بھی اسی زمانہ میں چھپا تھا۔(۱)

صحیح مستدرک اور حاکم پر بعض اعتراضات کا جائزہ: حاکم اور ان کی مستدرک پر چند اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، ان میں سے بعض تو غلط ہیں اور بعض اگرچہ غلط نہیں ہیں تاہم وہ بحث و تنقیح طلب ضرور ہیں، اس لیے مستدرک کی اہمیت و خصوصیت بیان کرنے کے بعد ان کا جائزہ لینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

امام حاکم اور ان کی مستدرک پر سب سے مشہور الزام تساہل کا ہے، اس سلسلہ میں چند اور ضمنی الزامات بھی عائد کیے گئے ہیں، گو ان کا اصل تعلق بھی تساہل ہی سے ہے لیکن ان پر علاحدہ علاحدہ اور مستقلاً گفتگو کرنا زیادہ مفید و مناسب ہوگا۔

مستدرک اور صحیحین: پہلے گذر چکا ہے کہ مستدرک کی تالیف کا مقصد صحیحین کی ان متروک حدیثوں کو جمع و مدون کرنا ہے جو حاکم کے خیال میں ان کی شرطوں کے مطابق صحیح ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں کی گئیں، اس سلسلہ میں بحث طلب امر یہ ہے کہ حاکم نے جن حدیثوں کے صحیحین کی شرطوں کے مطابق صحیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے وہ واقع میں صحیح ہیں یا نہیں۔

۱- ابوسعید مالینی کا بیان ہے کہ ''میں نے مستدرک کا مطالعہ کیا تو مجھ کو اس کی ایک حدیث بھی شیخین کے شرائط کے مطابق نہیں ملی۔''(۲)

۲- دوسرے علمائے فن کے نزدیک مستدرک کی تمام حدیثیں تو نہیں متعدد ایسی ضرور ہیں جن کے متعلق حاکم کا یہ دعویٰ خلاف واقعہ ہے کہ وہ شیخین کی شرائط کے مطابق صحیح ہیں، ابراہیم بن محمد ارموی کا یہ بیان اکثر کتابوں میں مذکور ہے کہ:

---

(۱) پہلا مضمون معارف کے جولائی و اگست ۲۶ء کے دوسرا نومبر دسمبر ۲۶ء کے شماروں میں شائع ہوا تھا
(۲) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۹ و بستان المحدثین ص ۴۲۔

"ابوعبداللہ حاکم نے مستدرک میں بہت سی ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن کے بارے میں گو ان کا خیال ہے کہ وہ شیخین کی حدیثوں کی طرح صحیح ہیں جیسے من کنت مولاہ الخ اور حدیث طیر وغیرہ لیکن علمائے کبار نے اس سلسلہ میں حاکم کو غلط ٹھہرایا ہے اور ان پر سخت نکیر کی ہے۔"(۱)

پہلی رائے کو عام طور پر حقیقت سے بعید اور زیادتی پر محمول کیا گیا ہے، علامہ ذہبی نے اس کی نہایت پرزور تردید کی ہے، ان کی تردید اس لیے قابل لحاظ ہے کہ انھوں نے مستدرک کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اس کی تلخیص لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"مستدرک کے متعلق مالینی کی رائے سراسر زیادتی، صریح ناانصافی اور سخت غلو پر مبنی ہے، انصاف کی بات یہ ہے کہ مستدرک کا تقریباً نصف حصہ ایسی حدیثوں پر مشتمل ہے جو شیخین یا کسی ایک بزرگ کے شرائط کے مطابق ہے، البتہ اس کے چوتھائی حصہ میں ایسی حدیثیں ہیں جن کے اسناد تو بظاہر صحیح ہیں لیکن وہ شیخین کی شرطوں کے مطابق نہیں ہیں، بقیہ چوتھائی حصے میں ضعیف ومنکر بلکہ موضوع حدیثیں بھی شامل ہیں، میں نے اپنی تلخیص میں ان کی تصریح وتنبیہ کی ہے۔"(۲)

اس سے دوسری رائے رکھنے والوں کی تائید ہوتی ہے یعنی مستدرک کی بعض حدیثوں کے بارے میں حاکم کا دعویٰ صحیح نہیں ہے لیکن اکثر کے متعلق صحیح ہے۔

اس مسئلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بہت مناسب اور حقیقت پسندانہ توجیہ کی ہے وہ لکھتے ہیں:

حاکم نے صحیحین پر مستدرک لکھا ہے، اس کی حدیثوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ شیخین کی شرطوں کے مطابق ہیں لیکن انھوں نے ان کی تخریج نہیں کی ہے، میں نے

---

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۹ وبستان المحدثین ص ۴۳۔ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۹ وبستان المحدثین ص ۴۲۔

جب مستدرک کا تتبع اور چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ ایک حیثیت سے حاکم کا بیان صحیح ہے لیکن دوسری حیثیت سے صحیح نہیں ہے، اس کی تفصیل وتوجیہ یہ ہے۔

مستدرک میں ایسی حدیثیں ہیں جو شیخین کے رجال واسناد اوران کی شرائطِ صحت واتصال کے مطابق ہیں، اس پہلو سے حاکم کا شیخین پر استدراک صحیح ہے لیکن دوسرے پہلو سے صحیح نہیں ہے کیوں کہ شیخین اسی حدیث کا ذکر کرتے ہیں جس کی صحت پر ان کے شیوخ نے نقد وجرح کر کے اجماع کر لیا ہو، امام مسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی صحیح میں وہی حدیثیں لکھی ہیں جن کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے لیکن مستدرک کی اکثر متفرد حدیثیں ایسی ہیں جو شیخین کے زمانہ کے شیوخ اور محدثین پر مخفی اور مستور رہ گئی تھیں، گو بعد میں ان کی شہرت ہوگئی ہو یا ایسی حدیثیں ہیں جن کے رجال کے بارے میں محدثین نے اختلاف کیا ہے کیوں کہ شیخین محض قاعدہ واصول سے حدیث کی صحت تسلیم نہیں کرتے بلکہ اپنے شیوخ کی طرح احادیث کے وصل وانقطاع وغیرہ کی باقاعدہ بحث وتحقیق کرتے ہیں اور اس میں انھوں نے اس قدر شدت برتی ہے کہ صحت واستناد کا مسئلہ پوری طرح ظاہر ہوگیا ہے، اس کے برخلاف امام حاکم کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ صرف محدثین کے عام قواعد وضوابط پر اعتماد کر کے حدیثوں کو صحیح قرار دیتے ہیں، مثلاً یہ قاعدہ کہ ثقہ راوی کی زیادتی مقبول ہوتی ہے، یا جب اہلِ فن وصل وارسال یا وقف ورفع میں مختلف الرائے ہوں تو اس راوی کا قول حجت مانا جائے گا، جس کے بیان میں اضافہ ہو اور اس نے اس کو یاد رکھا ہو، یہ حقیقت ہے کہ محدثین کے یہاں احادیث کی تصحیح اور جانچ کے اس معیار کی بنا پر خرابی اور خلل پیدا ہوا ہے اور اسی حیثیت سے شیخین اور حاکم کے یہاں فرق پایا جاتا ہے، واللہ اعلم۔(۱)

علامہ زیلعی حنفی کا بھی ایک بصیرت افروز بیان اس سلسلہ میں قابل غور ہے، وہ جہر یا بسملہ کی حدیثوں پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۱۰۶ و ۱۰۷۔

"کسی شخص کے بارے میں مجرد کلام سے اس کی حدیث کو ساقط نہیں قرار دیا جاسکتا کیوں کہ اس طرح تو سنت وحدیث کا بیشتر سرمایہ ہی متروک ہو جائے گا، اس لیے کہ جرح وکلام سے اس شخص کے علاوہ جس کو خود اللہ نے معصوم ومحفوظ بنادیا ہو کوئی شخص بھی محفوظ نہیں ہے، صحیحین تک میں ایسے لوگوں کی روایتوں کی تخریج کی گئی ہے جن پر کلام کیا گیا ہے، جیسے جعفر بن سلیمان ضبعی، حارث بن عبدالایادی، ایمن بن نابل حبشی، خالد بن مخلد قطوانی، سوید بن سعید حرثانی اور یونس بن اسحٰق سبیعی وغیرہ لیکن شیخین نے ایسے متکلم فیہ لوگوں کی ان ہی روایات کی تخریج کی ہے جن کی متابعت بھی کی گئی ہے اور جن کے شواہد ظاہر و باہر ہیں اور جن کی اصل معروف ومعلوم ہے لیکن اس طرح کے راویوں کے تفرد کو نہیں بیان کیا اور قبول کیا ہے، خصوصاً ایسے مواقع پر جہاں ان راویوں نے ثقات کی مخالفت کی ہے، جیسے امام مسلم نے ابواویس کی حدیث "قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی" کی اس لیے تخریج کی ہے کہ وہ اس کو بیان کرنے میں متفرد نہیں ہیں بلکہ دوسرے ثقہ وثابت رواۃ مالک، شعبہ اور ابن عیینہ نے بھی اس کو بیان کیا ہے، اس لیے یہ حدیث متابع ہوگئی ہے، یہ علامت صحیحین پر استدراک کرنے والوں کے یہاں بھی راہ پاگئی ہے، اس لیے ان کے استدراک میں تساہل پایا جاتا ہے، ان لوگوں میں سب سے زیادہ تساہل ابوعبداللہ حاکم نے مستدرک میں کیا ہے، وہ جن کی حدیثوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ شیخین کی یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہیں ان میں یہ علت موجود ہوتی ہے، صحیحین میں کسی راوی کی روایت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ راوی جس حدیث میں بھی پایا جائے وہ حدیث صحیحین کی شرط کے مطابق ہو جائے گی، حاکم عموماً ایسی حدیث بھی نقل کرتے ہیں جس کے رواۃ کی وجہ سے صحیحین میں اس کی تخریج نہیں کی گئی ہے،

اب اگر اس طرح کی کوئی حدیث حضرت عکرمہؒ سے مروی ہو اور انھوں نے اس کو حضرت ابن عباسؓ سے بیان کیا ہو تو محض اس بنا پر کہ شیخین نے بھی عکرمہ سے ابن عباسؓ کے مرویات کی تخریج کی ہے، اس لیے اس کو بھی صحیحین کے شرائط کے مطابق قرار دیا جائے تو یہ سراسر تساہل ہے، اسی طرح وہ ایسی حدیث بھی نقل کرتے ہیں جس کے بعض رجال بخاری کے اور بعض مسلم کے ہوتے ہیں اور وہ ان کو شیخین کے شرائط کے مطابق قرار دیتے ہیں جو تساہل ہے یا کبھی ایسی حدیث بیان کرتے ہیں جس میں کوئی ایسا راوی ہوتا ہے جس سے شیخین نے اس کی وہ روایت کی ہے جس کو اس نے اپنے کسی خاص استاذ اور متعین شیخ سے سنا ہے کیوں کہ راوی کا اپنے خاص استاذ سے زیادہ اہم تعلق ہوتا ہے اور وہ اس کی حدیث کے حفظ وضبط میں مشہور ہوتا ہے لیکن وہی راوی جب اپنے دوسرے شیخ سے کوئی روایت کرتا ہے تو اس کی شیخین تخریج نہیں کرتے کیوں کہ اس شیخ سے روایت کرنے میں وہ ضعیف، غیر ضابط اور غیر مشہور یا اسی قسم کی کوئی اور وجہ مانع ہوتی ہے لیکن حاکم نے اس راوی کی ایسی حدیثیں بھی جن کو اس نے اپنے مخصوص ومتعین شیخ کے بجائے کسی اور شیخ سے بیان کیا ہے، تخریج کی ہے اور کہا ہے کہ روایت شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہے، یہ بھی ان کے تساہل ہی کا نتیجہ ہے، کیوں کہ شیخین اس راوی پر صرف اس صورت میں اعتماد کرتے ہیں جب اس نے حدیث کو اپنے مخصوص ومتعین شیخ سے روایت کیا ہو مگر جب وہ اپنے دوسرے شیوخ سے روایت کرتا ہے تو اس پر اعتماد نہیں کرتے، مثلاً انھوں نے خالد بن مخلد قطوانی کی ایک حدیث کی جس کو انھوں نے سلیمان بن بلال سے روایت کیا ہے، تخریج کی ہے لیکن ان کی اس روایت کی تخریج نہیں کی ہے جس کو انھوں نے عبداللہ بن مثنی کے واسطہ سے روایت کیا ہے، کیوں کہ خالد، ابن مثنی

سے روایت کرنے میں معروف نہیں ہیں ایسی صورت میں اگر کوئی شخص خالد کی اس روایت کے بارے میں جو وہ ابن مثنی سے بیان کریں یہ کہے کہ وہ شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہے تو یقیناً تساہل کہا جائے گا، اسی طرح حاکم ایسی حدیث بھی بیان کرتے ہیں جس کے اسناد میں کوئی راوی ضعف یا کذب سے متہم ہوتا ہے، مگر اس کے اکثر رجال صحیح وقوی ہوتے ہیں، اس کے باوجود وہ اس کے متعلق بھی کہہ دیتے ہیں کہ وہ شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہے، یہ بھی سخت قسم کا تساہل ہے، جو شخص مستدرک کا بغور مطالعہ کرے گا اس پر یہ سب باتیں جو ہم نے بیان کی ہیں خود منکشف ہو جائیں گی۔'' (۱)

علامہ زیلعی حنفی نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی مثالیں ضرور مستدرک میں ملتی ہیں لیکن ایسے بعض مواقع پر جن کا ذکر زیلعی نے کیا ہے، حاکم نے خود بھی تصریح کر دی ہے، مثلاً جس سند کے تمام رجال صحیح ہوں اور کوئی ایک راوی ضعیف ہو اس کے بارے میں حاکم نے یہ بتا دیا ہے کہ شیخین نے اس حدیث کو فلاں راوی کی وجہ سے ترک کر دیا ہے، پھر انھوں نے اس راوی کو صحیح وضابطہ قرار دینے کی کوشش کی ہے، یا اس کے بارے میں علمائے جرح وتعدیل کا اختلاف بیان کر کے لکھ دیا ہے کہ اگر اس کا قوی ہونا ثابت ہو جائے تو یہ روایت بالکل صحیح ہوگی، یہی حال دوسری مثالوں کا ہے، حاکم نے عموماً شیخین کی عدم تخریج کے اسباب بھی بیان کر دیے ہیں، جن سے ان کے استدراکات کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ زیلعی کی اکثر مثالیں صحیح ہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ شیخین کے متعلق حاکم کے سب دعوے خواہ صحیح نہ ہوں لیکن سب غلط بھی نہیں ہیں، حافظ ذہبی نے اپنی تلخیص میں غلط دعووں کی وضاحت کے ساتھ صحیح کی توثیق بھی کی ہے اور جن کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے، اس سے بھی حاکم کی

(۱) نصب الرایہ جلد اول ص ۳۴۲ طبع جدید۔

تصویب ظاہر ہوتی ہے۔

ضعیف وموضوع حدیثیں: دوسرا ضمنی اعتراض یہ ہے کہ مستدرک میں ضعیف اور موضوع حدیثیں بھی ہیں، چنانچہ علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ مستدرک میں ایسی حدیثیں بھی ہیں جو شرائطِ صحت کے خلاف ہیں، بلکہ موضوع حدیثیں بھی ہیں جو اس کے شایان شان نہیں۔''(۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''گو حاکم حدیث میں امام ۔۔وق تھے، تاہم انھوں نے مستدرک میں ساقط حدیثوں کی بھی تصحیح کردی ہے۔''

اوپر ان کا یہ بیان گذر چکا ہے کہ مستدرک کا تقریباً چوتھائی حصہ منکر و واہی اور موضوع حدیثوں پر مشتمل ہے، انھوں نے تلخیص میں بھی حدیث کا ضعف ونکارت اور وضع دکھایا ہے اور حاکم کی موضوع حدیثوں کو ایک مستقل جز میں جمع کیا گیا تھا جو تقریباً ایک سو حدیثوں پر مشتمل تھا، حافظ ابن جوزی نے بھی ان کی ساٹھ موضوع حدیثوں کا ذکر کیا ہے گو اس کو محدثین نے مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا ہے، اکثر تذکرہ نگاروں نے مستدرک کی ضعیف وموضوع حدیثوں کی مثال دیتے ہوئے "من كنت مولاه فعلي مولاه" اور ''حدیث طیر'' وغیرہ کو پیش کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس کا شمار حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں کیا ہے اور اس طبقہ کے متعلق ان کا اور ان کے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا یہ بیان ہے کہ:

''اگرچہ کتابوں کے مؤلفین علوم حدیث میں ماہر، ثقہ اور ضبط وعدالت کی صفات سے متصف تھے لیکن ان میں صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں پائی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۹۔

جاتی ہیں، بلکہ ان کی بعض حدیثیں موضوع بھی ہیں، گو ان کے اکثر رواۃ عدالت کی صفت سے متصف تھے تاہم بعض مستور اور مجہول الحال ہیں۔''(۱)

ان سب بیانات سے مستدرک میں ضعیف ومنکر بلکہ موضوع حدیثوں کا بھی یقینی طور پر پایا جانا ثابت ہو جاتا ہے لیکن موضوع حدیثوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، حافظ ابن جوزی نے ساٹھ حدیثوں کی نشاندہی کی ہے لیکن ان میں سے اکثر کو محدثین نے تسلیم نہیں کیا ہے، رہی ضعیف حدیثیں تو وہ موضوع کے ساتھ شامل ہو کر چوتھائی حصہ کے بقدر ہوں گی، ضعیف حدیثوں سے کوئی کتاب بھی خالی نہیں ہے لیکن مستدرک میں ان کی تعداد اس لیے زیادہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ خود ضخیم کتاب ہے اور اس کی ضخامت کے اعتبار سے یہ تعداد زیادہ نہیں، اس کا زیادہ حصہ جیسا کہ ذہبی کے بیان سے ظاہر ہے، صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے، علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں:

''مستدرک میں جو نہایت ضخیم کتاب ہے، صحیحین کی متروک حدیثوں کو شامل کیا گیا ہے، گو اس کی بعض حدیثوں کے بارے میں کلام کیا گیا ہے لیکن اس کا بڑا حصہ صحیح ہے۔''(۲)

گو مستدرک کی ضعیف وموضوع حدیثوں کی وجہ سے اس کا پایہ گھٹ ضرور گیا ہے، تاہم ان سے حاکم کے علوئے مقام اور عظمتِ شان میں فرق نہیں آتا، علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:

''حاکم کا درجہ ومرتبہ نہایت بلند ہے، وہ کسی طرح ضعفا میں شمار کیے جانے کے مستحق نہیں ہیں، ان کی جانب سے یہ معذرت کی جائے گی کہ مستدرک ان کے آخر عمر کی تصنیف ہے، جب ان کی حالت متغیر ہو گئی تھی اور اس وقت ان پر ذہول ونسیان بھی طاری رہتا تھا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اس میں بعض

(۱) عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۵ (۲) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۰۔

ایسے راویوں کو بھی صحیح قرار دے دیا ہے اور ان لوگوں کی حدیثیں بھی درج کر لی ہیں جن کا وہ اپنی کتاب الضعفا میں تذکرہ کر چکے ہیں اور جن کے ناقابلِ حجت ہونے اور جن کی حدیثوں کے ترک کر دینے کا فیصلہ کر چکے تھے، مثلاً عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کی ایک حدیث کی تخریج کی ہے، حالاں کہ ان کا ضعفا میں تذکرہ کیا ہے اور ان کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے والد کے واسطہ سے ایسی موضوع حدیثیں بیان کی ہیں جن کا ضعف و وضع غور و تامل کرنے والے اہل فن سے مخفی اور پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔'' (۱)

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ حاکم نے مستدرک کی بعض حدیثوں کو ضعیف سمجھنے کے باوجود شواہد و متابعات کی حیثیت سے یا اور کسی مصلحت کی بنا پر نقل کیا ہے اور ایسے مواقع پر انھوں نے ان اسباب کی صراحت بھی کر دی ہے جو ضعیف حدیث کی روایت ذکر کرنے کا باعث ہوئے ہیں، علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

وربما اورد فيه مالم يصح عنده منبها علىٰ ذلك (۲)	بعض اوقات وہ غیر صحیح روایت لائے ہیں مگر اس کے متعلق تنبیہ کر دی ہے۔

یہ بھی ہے کہ حاکم خود صاحب فن تھے، ان کی تحقیق میں بعض حدیثیں اور رواۃ قوی و صحیح تھے لیکن بعض دوسرے اہل فن نے ان کو ساقط الاعتبار قرار دیا ہے۔

تساہل کا الزام: اب تک جن الزامات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی دراصل تساہل ہی کے تحت آتے ہیں لیکن اب اس کا مستقل طور سے ذکر کیا جاتا ہے، پہلے جو باتیں نقل کی گئی ہیں ان کے علاوہ بعض مزید تفصیلات ملاحظہ ہوں۔

علامہ ابن صلاح کا مشہور بیان ہے۔

هو واسع الخطوفي شرط	وہ صحیح روایت کے شرائط کے بارے

(۱) لسان المیزان تذکرہ حاکم (۲) تدریب الراوی ص ۳۱۔

الصحیح، متساھل فی القضاء۔ (۱)	میں بڑے توسع پسند اور صحیح حکم لگانے میں نہایت متساہل تھے۔

علامہ زیلعی کا بیان ہے کہ:

فالحاکم عرف تساھله وتصحیحه بالاحادیث الضعیفة بل الموضوعة۔ (۲)	پس حاکم کا تساہل اور ضعیف بلکہ موضوع حدیثوں کی تصحیح مشہور ومعروف ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری لکھتے ہیں:

''حدیث کی تصحیح میں حاکم کا تساہل اسی طرح مشہور ہے جس طرح علامہ ابن جوزی کا تضعیف حدیث میں تساہل مشہور ہے، شیخ الاسلام علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان دونوں کے تساہل نے ان کی کتابوں کا فائدہ معدوم کر دیا ہے۔(۳)

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ محدثین کے نزدیک حاکم کا تساہل مشہور و مسلم ہے مگر یہ بحث توضیح وتنقیح طلب ہے۔

حاکم پر جس شد و مد کے ساتھ یہ الزام عائد کیا گیا ہے، اس سے بظاہر حاکم کا احادیث میں زیادہ غیر محتاط و مداہن ہونا ثابت ہوتا ہے جو صحیح نہیں ہے اور نہ تساہل کا یہ مطلب ہے کہ انھوں نے رطب ویابس ہر قسم کی روایات بلا تحقیق وتفتیش نقل کر دی ہیں، ان کی تلاش وتفحص، حزم واحتیاط اور احکامی روایتوں میں شدت کا ذکر پہلے آ چکا ہے، ان کا بلند پایہ محدث اور علوم حدیث میں ماہر ہونا مسلم ہے، روایات کے قبول ورد کے اصول وضوابط کی وہ پابندی بھی کرتے تھے اور ان کے بارے میں غیر محتاط نہ تھے البتہ جہاں انھوں نے ان اصولوں کو ترک کیا ہے، اس کی صراحت کر دی ہے، جرح وتعدیل حاکم کا خاص فن تھا، اس

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱ (۲) نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۶۰ (۳) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۷۷۔

میں انھوں نے ایسی مہتم بالشان کتابیں لکھی ہیں جن کے حوالوں سے رجال کی کوئی کتاب خالی نہیں ہے، ان باتوں سے ان کے حزم واحتیاط کا پتہ چلتا ہے، اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

"حدیث کے طالب علم کو محدث کے حالات کی بحث وتفتیش کرنی ضروری ہے، اس کو سب سے پہلے محدث کے متعلق یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ عقیدہ توحید کو مانتا اور انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کا پابند ہے یا نہیں؟ پھر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ وہ صاحب ہوئی تو نہیں ہے جو لوگوں کو اپنی خواہشات کے مطابق دعوت دیتا ہے کیوں کہ داعی بدعت کی حدیث قبول نہ کرنے پر ائمہ مسلمین کا اجماع ہے، اس کے بعد سن وسال کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ اس کا اپنے ان شیوخ سے جن سے وہ حدیثیں روایت کرتا ہے، سماع ممکن ہے یا نہیں، کیوں کہ ہم نے ایسے شیوخ دیکھے ہیں جنھوں نے اپنے شیوخ سے ایسے سن میں حدیثیں بیان کی ہیں جس سن میں ان کی ان شیوخ سے ملاقات ممکن ہی نہیں۔"(۱)

اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"صحیح حدیث کی معرفت مجرد روایت سے نہیں ہوتی بلکہ اس کو عقل وفہم، حفظ وضبط اور کثرتِ سماع وغیرہ سے معلوم کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں اہلِ علم ومعرفت کے مذاکرہ سے بڑھ کر کوئی چیز معاون نہیں ہے، اسی سے مخفی علت ظاہر ہوتی ہے پس جب اس طرح کی کوئی حدیث صحیح اسانید سے پائی جائے اور وہ شیخین کی کتابوں میں مروی نہ ہو تو ایسی صورت میں حدیث کے طالب علم کو اس کی تحقیق اور کرید کرنا نیز اس کی معرفت رکھنے والوں سے مذاکرہ لازم ہے تاکہ اس

(۱) معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۵ و ۱۶۔

کی علت کا پتہ چل سکے۔''

جس امام کے یہ خیالات ہوں اور جس کا روایات کے رد و قبول میں یہ معیار ہو، اس کو غیر محتاط یا حاطب اللیل کس طرح کہا جا سکتا ہے، اس لیے ان کے تساہل کا صرف یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ دوسرے محدثین نے جو غیر معمولی تشدد روا رکھا تھا اور جس کے نتیجہ میں بے شمار صحیح حدیثیں ان کے معیار پر پوری نہ اتریں اور نہ ان کے انتخاب میں آسکیں۔ حاکم نے اس طرح کا تشدد اس لیے روا نہیں رکھا تا کہ کوئی صحیح و ثابت حدیث محفوظ ہونے سے نہ رہ جائے، اسی نیک جذبہ نے ان کے یہاں قدرے نرمی اور مداہنت پیدا کر دی ہے، اس لیے حدیث کی تصحیح میں حاکم کا تساہل اگرچہ مسلم ہے لیکن اس کی نوعیت وہ نہیں ہے جو غلو و اغراق کی وجہ سے اس کو دے دی گئی ہے۔

حاکم کے تساہل کے چند اسباب تھے جن کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے:

۱- خود ان کا یہ بیان گذر چکا ہے کہ مستدرک منکرین حدیث، اہل اہوا اور مبتدعین کے اس الزام اور مغالطہ کے جواب میں لکھی گئی ہے کہ صحیح حدیثوں کی تعداد بہت کم ہے، حاکم نے اس شبہہ کی تردید میں یہ بھی لکھا ہے کہ صحیح حدیثیں صرف صحیحین ہی میں منحصر نہیں ہیں، جیسا کہ خود شیخین نے بھی اس کی صراحت کی ہے اور ابن صلاح، نووی اور دوسرے اساطینِ فن کا بھی بیان ہے، اس بنا پر حاکم نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ اپنے علم و امکان بھر زیادہ سے زیادہ صحیح روایات کا مجموعہ مرتب کر دیں اس کی وجہ سے مستدرک میں تساہل ہو گیا ہے۔

۲- حاکم نے حدیثوں کی تائید و توثیق کے لیے کثرت سے شواہد و متابعات نقل کیے ہیں، ان میں اور فضائلِ اعمال کی حدیثوں میں انھوں نے زیادہ شدت اور احتیاط نہیں برتی ہے، چنانچہ مستدرک کی اس قسم کی حدیثوں میں زیادہ تساہل پایا جاتا ہے۔

۳- حافظ ابن حجر وغیرہ نے لکھا ہے کہ مستدرک حاکم کے آخر عمر کی تصنیف ہے، اس زمانہ میں ان کی ۔ ۔ ت دگرگوں ہو چلی تھی، ان کو نظر ثانی اور حک و اصلاح کا موقع بھی

نہیں ملا تھا، اس لیے مستدرک میں تساہل زیادہ پایا جاتا ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ’’حاکم کے یہاں تساہل کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب کا مسودہ تو مکمل کرلیا تھا لیکن اس کی تنقیح نہیں کرسکے تھے، مستدرک کے چھ جزوں میں صرف ڈیڑھ جز تک مجھ کو حاکم کا املا ملا ہے، بقیہ اجزا کی حاکم کی بطریقِ اجازت روایت کی گئی ہے اوران اجزا میں ان جزوں کے مقابلہ میں جن کا حاکم نے خود املا کرایا ہے، زیادہ تساہل پایا جاتا ہے۔(۱)

حاکم کا تساہل تو متعارف ومسلم ہے لیکن اس الزام سے بعض اکابر محدثین بھی بری نہیں ہیں، چنانچہ بعض محدثین کے نزدیک تساہل کے اعتبار سے صحیح ابن حبان بھی مستدرک ہی کے لگ بھگ ہے، ابن خزیمہ کی عظمتِ شان میں کس کو کلام ہوسکتا ہے، ان کا اوران کی صحیح کا پایہ ان دونوں سے بہت بلند ہے لیکن علامہ سخاوی لکھتے ہیں:

وکم فی کتاب ابن خزیمة	ابن خزیمہ کی کتاب میں کتنی ایسی
ایضاً من حدیث محکوم منه	حدیثیں ہیں جن کی صحت کا حکم لگایا گیا
بصحته وهو لایرتقی عن	ہے، حالاں کہ وہ حسن کے مرتبہ سے
رتبة الحسن۔(۲)	اوپر کی نہیں ہیں۔

امام دارقطنی اورامام ترمذی پربھی (اول الذکر حاکم کے استاذ اور موخرالذکر امام بخاریؒ کے ممتاز شاگرد اورائمہ صحاح میں ہیں) یہی الزام عائد کیا گیا ہے، علامہ ذہبی جیسے نقادِفن کا بیان ہے:

ان العلماء لایعتدون بتصحیح	علمائے فن ترمذی اورحاکم کی تصحیح کوزیادہ
الترمذی ولا الحاکم۔ (۳)	قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

علامہ زیلعی فرماتے ہیں:

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۲۷ وتدریب الراوی ص ۳۱ (۲) فتح المغیث ص ۱۴ (۳) الرسالة المستطرفة ص ۲۰۔

حتی قیل ان تصحیحه دون تصحیح الترمذي والدار قطني۔(۱)	یہاں تک کہا گیا ہے کہ حاکم کی تصحیح امام ترمذی ودارقطنی کی تصحیح سے بھی کم تر ہے۔

حافظ سخاوی کہتے ہیں:

بل وفیما صححه الترمذی من ذالك جملة مع انه ممن یفرق بین الصحیح والحسن۔(۲)	بلکہ امام ترمذی کی تصحیح میں بھی تساہل کا بڑا حصہ شامل ہے، حالاں کہ وہ ان لوگوں میں ہیں جو صحیح وحسن میں امتیاز کرنے والے ہیں۔

اسی طرح ضیاء مقدسی، ابن عوانہ، ابن سکن اور جارود وغیرہ نامور محدثین کی تفصیلات اگرچہ صحیح کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں لیکن ایک جماعت نے ان پر بھی انصافاً یا تعصباً نقد کیا اور تساہل کا الزام لگایا ہے۔(۳)

اس لیے جس طرح ان ائمہ کی تصنیفات کی خامیوں کی وجہ سے ان کے جلالتِ قدر میں کوئی شبہہ نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح حاکم کی عظمت میں بھی ان کے تساہل کی بنا پر کلام نہیں کیا جاسکتا۔

حاکم کی تصحیح کا حکم: حاکم کا تساہل تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان کی توثیق وتصحیح کا کیا حکم ہوگا؟ محدثین اور علمائے فن کے نزدیک چند صورتوں کو چھوڑ کر عام طور پر حاکم کی تصحیح کا لحاظ کیا جائے گا، یہ مستثنیٰ صورتیں حسب ذیل ہیں:

(الف) جس حدیث کی حاکم نے توثیق کی ہو وہ کسی دوسری صحیح وثابت حدیث کے خلاف ہو، علامہ زیلعی جہر بالبسملہ کے بیان میں لکھتے ہیں:

وتصحیح الحاکم لایعتد به	حاکم کی تصحیح کا اعتبار نہیں کیا جائے گا،

(۱) نصب الرایہ ج۱ص۳۵۳ (۲) فتح المغیث ص۱۴ (۳) فتح المغیث ص۱۴۔

سیما فی هذا الموضع فقد	خصوصاً اس مقام پر، کیوں کہ ان کا
عرف تساهله فی ذالك	تساہل یہاں معروف ومعلوم ہے......
وتوثيق الحاكم لا يعارض	اور حاکم کی توثیق کو اگر وہ صحیح وثابت
مايثبت فی الصحيح خلافه	حدیث کے خلاف ہو،اس کے معارض
لما عرف من تساهله۔ (۱)	نہیں قرار دیا جائے گا، کیوں کہ ان کا
	تساہل معروف ہے۔

زیلعی کے اس بیان سے حاکم کی تصحیح کا سرے سے نا قابلِ اعتبار ہونا ثابت نہیں ہوتا کیوں کہ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

حتیٰ قیل ان تصحیحه دون	یہاں تک کہا گیا ہے کہ حاکم کی تصحیح کا
تصحيح الترمذی والدار	درجہ امام ترمذی اور دارقطنی کی تصحیح سے
قطنی بل تصحیحه کتحسین	کم تر ہے، بلکہ ان کی تصحیح کی حیثیت
الترمذی واما ابن خزیمه	امام ترمذی کی تحسین کی طرح ہے،
وابن حبان فتصحیحهما	رہے ابن خزیمہ اور ابن حبان تو ان کی
ارجح من تصحيح الحاكم	تصحیح بلا اختلاف حاکم کی تصحیح سے راجح
بلا نزاع۔(۲)	ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیلعی کے نزدیک حاکم کی تصحیح بالکل ساقط اور نا قابل اعتبار نہیں ہے، بلکہ جب وہ صحیح حدیث کے معارض ہوتو نا قابل اعتبار ہوگی۔

(ب) حاکم نے جس حدیث کی تصحیح کی ہو اگر اس کے بارے میں دوسرے محدثین کا فیصلہ اس کے برعکس ہوتو حاکم کی تصحیح کا لحاظ نہیں ہوگا، علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ حاکم کی تصحیح کا اسی وقت اعتبار کیا جائے گا جب کہ اس کے بارے میں دوسرے ائمہ کی

(۱) نصب الرایہ ج ا ص ۳۴۴ (۲) نصب الرایہ ج ا ص ۳۵۴۔

اس کے خلاف کوئی تصریح موجود نہ ہو۔

(س) جس حدیث کی حاکم نے تصحیح کی ہو اس میں ضعیف کر دینے والی کوئی علت موجود ہو، ابن صلاح اور نووی نے اس کی تصریح کی ہے۔

ان صورتوں کے سوا حاکم کی تصحیح کو معتبر اور حجت سمجھا جائے گا، البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ ان کی تصحیح کے بارے میں کس قسم کا حکم لگایا جائے گا، ابن صلاح اور حافظ نووی کے نزدیک اس کو حسن پر محمول کیا جائے گا، ابن صلاح فرماتے ہیں:

فالاولیٰ ان نتوسط فی امره فنقول ماحکم بصحته ولم نجد ذالك فیه لغیره من الأئمة ان لم یكن من قبیل الصحیح فهو من قبیل الحسن یحتج به ویعمل به الا ان تظهر فیه علة توجب ضعفه۔(۱)	ہمارے نزدیک حاکم کی تصحیح کے بارے میں بیچ کی راہ اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے پس جس حدیث کے صحیح ہونے کا انھوں نے فیصلہ کیا ہو اور اس میں دوسرے ائمہ کی کوئی تصریح موجود نہ ہو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ اگر وہ صحیح کے قبیل سے نہیں ہے تو حسن کے قبیل سے ہے، اس کو لائق حجت اور قابل اعتماد سمجھا جائے گا، بشرطے کہ اس میں کوئی ایسی علت نہ ہو جو ضعف کی موجب ہو۔

نووی لکھتے ہیں:

فماصححه ولم نجد فیه لغیره من المعتدین	جس حدیث کی حاکم نے تصحیح کی ہو اور اس کی صحت یا ضعف کے متعلق

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱۔

تصحيحا و لاتضعيفا حكمنا بانه حسن الا ان يظهر فيه علة توجب ضعفه.(۱)

دوسرے معتبر محدثین کی تصریح موجود نہ ہو تو ہم اس کو حسن قرار دیں گے، بشرطیکہ اس کو ضعیف قرار دینے والی علت موجود نہ ہو۔

زیلعی کے اوپر کے بیان میں بل تصحیحه کتحسين الترمذی سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ جزائری نے محدث ابن صلاح کے بیان "وان لم يكن من قبيل الصحيح فهو من قبيل الحسن" کا دوسرا مفہوم بتایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

''جس حدیث کی تصحیح میں حاکم منفرد ہوں اور دوسرے محدثین کا اس کے بارے میں کوئی فیصلہ موجود نہ ہو تو اس کو احتیاطاً صحیح و حسن کے درمیان دائر سمجھا جائے گا لیکن لوگوں نے ان کے بیان کا یہ مطلب لیا ہے کہ اس پر محض حسن کا حکم لگایا جائے گا۔''(۲)

لیکن متاخرین کے نزدیک حاکم کی تصحیح کے بارے میں اقتضائے حال کے مطابق حکم لگایا جائے گا، جزائری کا بیان ہے کہ:

''اکثر محدثین کی رائے یہ ہے کہ جس حدیث کی تصحیح میں حاکم منفرد ہوں اس کے متعلق بحث و تحقیق کی جائے گی اور اس پر اس کے اقتضائے حال کے مطابق صحت یا حسن یا ضعف کا حکم لگایا جائے گا۔''(۳)

بدر بن جماعہ سے بھی یہی منقول ہے اور عراقی، سخاوی (۴) اور سیوطی وغیرہ نے بھی اس کی تائید کی ہے، علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

''صحیح طریقہ یہ ہے کہ حاکم کی تصحیح کی تحقیق کر کے اس کے اعتبار سے

---

(۱) تدریب الراوی ص ۱۰۳ (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۷۸ (۳) ایضاً (۴) الفیہ ص ۷ و فتح المغیث ص ۱۳ و ۱۴۔

حسن، صحیح یا ضعیف ہونے کا حکم لگایا جائے، عراقی نے بھی اس کی موافقت کی ہے اور کہا ہے کہ اس پر محض حسن ہی کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔"(۱)

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری لکھتے ہیں:

"غالباً ابن صلاح نے یہ مسلک اس لیے اختیار کیا ہے کہ ان کے خیال میں اب لوگ تصحیح کے اہل نہیں رہے، اس لیے اس کا قصہ ہی ختم ہوگیا جو درست نہیں ہے، تصحیح کا معاملہ ختم نہیں ہوا ہے، بلکہ اب بھی اگر کسی شخص میں اس کی اہلیت موجود ہو اور اس میں اس کے اوصاف و شرائط موجود ہوں تو وہ تصحیح کا فیصلہ کرسکتا ہے۔"(۲)

باقی رہی حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی یہ تحریر کہ:

"ذہبی نے یہ کہا ہے کہ کسی شخص کو میری تلخیصات و تعقبات دیکھے بغیر حاکم کی تصحیح سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔"(۳)

اور

"محدثین کا فیصلہ یہ ہے کہ ذہبی کی تلخیص دیکھے بغیر مستدرک حاکم پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔"(۴)

اوپر کے بیانات کے معارض نہیں ہے اور نہ اس سے حاکم کی تصحیح کا مطلقاً باطل ہونا ہی ثابت ہوتا ہے۔

رفض و تشیع کا الزام: امام ابوعبداللہ حاکم پر سب سے بڑا الزام رفض و تشیع کا عائد کیا گیا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ محمد بن طاہر روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابواسماعیل انصاری سے حاکم کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ "وہ حدیث میں ثقہ مگر سخت رافضی تھے۔"(۵)

(۱) تدریب الراوی ص ۱۳۱ (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۷۸ (۳) بستان المحدثین ص ۱۴۱ (۴) ایضاً ص ۱۴۳ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۷۔

۲- دوسری جماعت ان کے رفض کی نفی وتردید کرتی ہے لیکن وہ بھی ان کو شیعیت سے متہم کرتی ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں، وہ شیعیت میں ضرور مشہور تھے لیکن شیخین کے مسئلہ میں تعرض نہیں کرتے تھے، ابو اسماعیل انصاری کا قول خلافِ انصاف ہے، درحقیقت حاکم رافضی نہ تھے، بلکہ شیعی تھے۔"(۱)

مگر خود ابن طاہر کے بیان سے جنھوں نے حاکم کے رافضی ہونے کی ابو اسماعیل سے روایت کی ہے، رفض کا کوئی پتہ نہیں چلتا، چنانچہ وہ کہتے ہیں حاکم اندرونی طور (۲) سے تو شیعوں سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن خلافت وتقدیم کے مسئلہ میں وہ تسنن کا اظہار کرتے تھے۔(۳)

حاکم کی شیعیت کے بارے میں سب سے مشہور روایت وہ ہے جس کو خطیب بغدادی نے اور ان کے حوالہ سے بعض دوسرے اربابِ سیر وتذکرہ نے نقل کیا ہے کہ:

> "حاکم ثقہ تھے مگر تشیع کی جانب میلان رکھتے تھے، مجھ سے ابراہیم بن محمد ارموی نے جو ایک صاحبِ علم اور صالح شخص تھے بیان کیا کہ حاکم نے ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن کے بارے میں ان کا گمان ہے کہ وہ صحیحین کے شرائط کے مطابق ہیں اس لیے شیخین پر ان کی تخریج ضروری تھی، چنانچہ اسی قسم کی حدیثوں میں حدیث طیر اور من کنت مولاہ فعلی مولاہ بھی ہیں جو حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب میں وارد ہیں اور ان کی وجہ سے محدثین نے ان پر نکیر وملامت کی ہے۔"(۴)

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاکم پر رفض کا الزام صحیح نہیں ہے بلکہ سراسر

---

(۱) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۸۵ (۲) یہاں اس بیان پر کوئی تبصرہ کرنا مقصود نہیں ورنہ کسی کے باطن کے متعلق اس قسم کا فیصلہ کرنا بجائے خود کتنا درست اور مقتضائے انصاف ہے، فقہا کا عام قاعدہ یہ ہے کہ نحن نحکم بالظاہر (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۸ (۴) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۴۷۴۔

بے بنیاد ہے، علامہ ذہبی کے مذکورہ بالا بیان کے علاوہ دوسرے بیانات سے بھی جو آگے نقل کیے جائیں گے اس کی پوری تردید ہوتی ہے، علامہ ابن سبکی نے بھی اس کی پرزور تردید کی ہے، یہ الزام محض ابو اسماعیل انصاری سے مروی ہے، بعض دوسرے محدثین کے متعلق بھی ان کے اس قسم کے غیر معروف اور منفرد اقوال مروی ہیں جن کو محققین اور ناقدین فن نے خلاف واقعہ اور مطرود قرار دیا ہے، حاکم پر بھی ان کے الزام کی یہی نوعیت ہے، اس لیے اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

البتہ شیعیت کا الزام بظاہر قوی معلوم ہوتا ہے، اس لیے اس کا یہاں مفصل جائزہ لیا جاتا ہے:

جن لوگوں نے حاکم پر شیعیت کا الزام عائد کیا ہے، ان کے اقوال کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حاکم کی شیعیت کا خلفائے ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام کے سب وشتم یا حضرت علیؓ کی تفضیل اور خلافت میں ان کی تقدیم سے کوئی تعلق نہیں تھا، ابن طاہر جیسے مخالف شخص کو بھی اعتراف ہے کہ تقدیم وخلافت کے مسئلہ میں وہ تسنن کا اظہار کرتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ فرماتے ہیں:

> ''بعض علما سے منقول ہے کہ ان کے تشیع کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ پر حضرت علیؓ کی فضیلت (۱) کے قائل تھے جو اسلاف کی ایک جماعت کا بھی مذہب ہے۔'' (۲)

اس لیے یہ امر بھی مسلم ہے کہ امام ابوعبداللہ حاکم حضرت علیؓ کو نہ شیخین سے افضل مانتے تھے اور نہ ان کو ان بزرگوں کے مقابلہ میں خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے اس لیے اب صرف دو چیزیں لائق بحث رہ جاتی ہیں۔

---

(۱) حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ بیان محل نظر ہے، آئندہ مباحث سے اس کی تردید ہو جائے گی (۲) بستان المحدثین ص ۱۴۱۔

۱- پہلی چیز حضرت علیؓ کی محبت وعقیدت میں غیر معمولی غلو وافراط ہے، جس کا ثبوت خطیب کی روایت میں ملتا ہے کہ حاکم نے حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب میں ضعیف وموضوع حدیثیں روایت کی ہیں۔

۲- دوسری چیز حضرت امیر معاویہؓ سے ان کی برہمی ہے، چنانچہ علامہ ذہبی رقمطراز ہیں:

''ان کا حضرت علیؓ کے مخالفین سے انحراف اگرچہ کھلا ہوا ہے لیکن وہ شیخین کو ہر حال میں فائق ومعظم سمجھتے تھے، اس لیے وہ شیعی ضرور تھے لیکن رافضی نہیں تھے۔''(۱)

اور ابن طاہر کا یہ بیان نقل کیا ہے:

''حاکم حضرت امیر معاویہؓ اور ان کی اولاد سے برگشتہ تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے اور اس کے متعلق کوئی معذرت نہیں کرتے تھے۔(۲)

ابن عماد کا بیان ہے کہ:

''علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ حاکم خلفائے ثلاثہ خصوصاً شیخین کی پوری تعظیم کرتے تھے، البتہ حضرت معاویہؓ کے بارے میں انھوں نے کلام کیا ہے، اس کی وجہ سے ان کو زدوکوب بھی کیا گیا تھا۔''(۳)

حافظ ابن جوزی اور علامہ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں:

''ابوعبدالرحمٰن سلمی کا بیان ہے کہ ابوعبداللہ بن کرام کے اصحاب نے حاکم کو عبث تنگ کر رکھا تھا، ان کا منبر توڑ ڈالا تھا اور ان کے لیے گھر سے نکلنا اور مسجد میں جانا تک دشوار کر دیا تھا، میں نے یہ حالت دیکھ کر ان سے کہا کہ اگر آپ حضرت امیر معاویہؓ کے مناقب میں کسی حدیث کی تخریج یا املا کرا دیں تو

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۸ (۲) ایضاً (۳) شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۷۷۔

اس مشقت وابتلا سے آپ کو چھٹکارامل جائے، حاکم نے اس کے جواب میں تین
دفعہ کہا کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔''(۱)

جہاں تک حضرت علیؓ کی محبت میں افراط وغلو کا معاملہ ہے تو اس کو اعتراض وملامت یا شیعیت کی بنیاد قرار دینا صحیح نہیں ہے، بہت سے اکابر اور ائمہ اسلام کو حضرت علیؓ اور اہل بیت کی محبت میں غلو رہا ہے، اس لیے حاکم کا غلو اسی وقت قابل اعتراض ہوسکتا ہے جب دوسرے صحابہ کی عظمت وجلالت کا انھوں نے پاس ولحاظ رکھا نہ ہو، یا وہ حضرت علیؓ کو اجلۂ صحابہ پر فضیلت دیتے ہوں لیکن خود حاکم کو شیعی قرار دینے والوں کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ وہ شیخین کی تنقیص نہیں کرتے تھے بلکہ عام اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق وہ ان کو حضرت علیؓ سے افضل اور خلافت کے لیے اقدم وانسب سمجھتے تھے، اس لیے ان کا غلو نہ قابلِ اعتراض ہے اور نہ شیعیت کا ثبوت، حاکم کے حالات وواقعات زندگی اور تصنیفات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے خلفائے ثلاثہ پر حضرت علیؓ کو ترجیح دی، یا کم از کم ان بزرگوں کی کوئی تنقیص کی ہے لیکن اس بارے میں علامہ ابن سبکی کے ان اصولوں کی رہنمائی میں فیصلہ زیادہ مناسب ہے، وہ لکھتے ہیں:

''اگر کسی شخص کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جائے یا اس پر کوئی الزام عائد کیا جائے تو انصاف پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کے شیوخ واساتذہ اور رفقا وتلامذہ وغیرہ کے متعلق بحث وتفتیش کی جائے، اس کے بعد اس کے ماحول اور ان حالات کا جائزہ لیا جائے جن میں اس کی نشوونما ہوئی ہے، پھر ان معاصرین، ہم وطنوں اور اعزہ واقربا کے اقوال وآرا معلوم کیے جائیں جو اس کے حالات وواقعات زندگی سے زیادہ واقف اور باخبر ہوتے ہیں، معاصرین کے متعلق اس کی تحقیق ضرور کرلینی چاہیے کہ ان کے متہم شخص سے تعلقات کی

(۱) المنتظم ج ۷ ص ۲۷۵ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۵۔

نوعیت کیا تھی؟ وہ اس کے موافق، حمایتی اور دوست تھے، یا معاند و مخالف اور معترض ونکتہ چیں یا بالکل غیر جانبدار لیکن غیر جانب دار بہت کم ہوتے ہیں۔

ان اصولوں کی روشنی میں امام حاکم کے تشیع وتفضیلِ علیؓ کے الزام پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، یہ تو مسلم ہے کہ وہ جلیل القدر محدث تھے، ان کی اس حیثیت میں ان کے مخالفین کو بھی کوئی کلام نہیں اور محدثین میں ایسے عقائد شاذ ونادر ہی ہوتے ہیں۔

اس کے بعد حاکم کے ان شیوخ پر غور کیا جائے جن سے انھوں نے علم وفن کی تحصیل کی ہے، خصوصاً ان لوگوں کو دیکھا جائے جن سے ان کو زیادہ تعلق اور قربت رہی ہے، تو معلوم ہوگا کہ ان کے شیوخ میں اکابر اہل سنت اور ایسے لوگ ہیں جو عقائد میں امام ابوالحسن اشعری سے وابستہ تھے جیسے ابوبکر بن اسحٰق ضبعی، ابوبکر بن فورک اور ابوسہل صعلوکی وغیرہ، یہی وہ لوگ ہیں جن سے حاکم کی مجالست تھی اور اصول ودیانات وغیرہ میں مباحثے اور مجادلے رہتے تھے۔

اسی طرح حاکم نے اپنی تاریخ میں اہل سنت کے جو تراجم لکھے ہیں، ان میں ان کی پوری توصیف وتعریف کی گئی ہے کہیں بھی ان کے عقائد پر طنز وتعریض نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ابن عساکر نے ان کو ان اشاعرہ کے زمرہ میں شامل کیا ہے جو اہلِ رفض وتشیع کو مبتدع کہتے اور ان کے عقائد سے تبری ظاہر کرتے ہیں یہ چیزیں حاکم پر لگائے جانے والے الزام کو مشکوک بنا دیتی ہیں، آگے جو تفصیلات بیان کی جائیں گی ان سے یہ شکوک وشبہات سراسر یقین واذعان میں تبدیل ہو جائیں گے اور پوری طرح ثابت ہو جائے گا کہ حاکم کا دامن رفض وتشیع کے الزام سے بالکل پاک ہے۔(۱)

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۷، ۶۸۔

آگے علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں:

''حاکم کے اندر تشیع کی جانب میلان کا ذکر کیا جاتا ہے، اگر یہ شریعت کے مطلوب واقتضا سے بھی بڑھ کر رہا ہو تو بھی یہ اس حد وانتہا کو نہیں پہنچا ہوا تھا کہ وہ شیخین کی مذمت وتنقیص کرتے رہے ہوں یا حضرت علیؓ کو ان سے افضل مانتے رہے ہوں بلکہ میں تو اس کو بھی بالکل بعید سمجھتا ہوں کہ وہ حضرت عثمانؓ پر حضرت علیؓ کو فوقیت دیتے رہے ہوں کیوں کہ میری نظر سے ان کی کتاب الاربعین میں ایک باب خلفائے ثلاثہ کی عظمت وتفضیل پر گذرا ہے، اس میں انھوں نے جملہ صحابہ کے مقابلہ میں ان ہی تینوں حضرات کی عظمت کا خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے، اسی طرح مستدرک میں انھوں نے حضرت علیؓ سے پہلے حضرت عثمان کا ذکر کیا ہے اور اس میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ:

اول حجر حمله النبی صلی الله علیه وآله وسلم لبناء المسجد ثم حمل ابوبکر حجرا آخر ثم حمل عمر ثم حمل عثمان حجرا آخر فقلت یارسول الله الاترى الى هؤلاء کیف یساعدونك فقال یاعائشة هؤلاء الخلفاء من بعدی.	مسجد (نبوی) کی تعمیر کے لیے پہلا پتھر خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا پھر دوسرا حضرت ابوبکرؓ نے، تیسرا حضرت عمرؓ نے اور چوتھا پتھر حضرت عثمانؓ نے رکھا، میں نے کہا اے اللہ کے رسول دیکھیے کس طرح یہ لوگ آپ کی معاونت کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا اے عائشہ یہی لوگ میرے بعد میرے خلفا اور جانشین ہوں گے۔

گو اس روایت کی صحت میں علامہ ذہبیؒ وغیرہ نے کلام کیا ہے لیکن قابل غور امر صرف یہ ہے کہ جو شخص اعتراضات کی پرواہ کیے بغیر ایسی حدیث کی تخریج

کر سکتا ہے جو خلفائے ثلاثہ کی خلافت کے متعلق تقریباً ایک منصوص اور قطعی امر کی حیثیت رکھتی ہے، کیا اس کے بارے میں رفض و تشیع کا گمان کیا جا سکتا ہے؟

حضرت عثمانؓ کے فضائل میں انھوں نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ:

عن جابر بن عبدالله رضی الله عنهما قال بينما نحن فی بيت ابن حشفة فی نفر من المهاجرين فيهم ابوبكر وعمر وعثمان وعلی وطلحة والزبير وعبدالرحمان بن عوف وسعد بن ابی وقاص رضی الله عنهم فقال رسول الله ﷺ لينهض كل رجل منكم الی كفؤه فنحفص النبی ﷺ الی عثمان فاعتنقه وقال انت وليی فی الدنيا والآخرة.	حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ جس میں حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہم تھے، ابن حشفہ کے گھر میں تھے (اس موقع) پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر شخص کو اپنے ہمسر کے ساتھ ہو جانا چاہیے اور آپ نے خود حضرت عثمانؓ کے ساتھ ہو کر ان سے معانقہ کیا اور فرمایا کہ تم میرے دنیا و آخرت میں ولی ہو۔

اس حدیث میں بھی کلام کیا گیا ہے، حاکم نے ان کے علاوہ اور بھی متعدد حدیثیں حضرت عثمانؓ کی فضیلت میں بیان کی ہیں، جن میں سے بعض کو صحیح مانا گیا ہے اور بعض پر استدراک واعتراض کیا گیا ہے، اسی طرح حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ وغیرہ کے فضائل ومناقب کی حدیثیں بھی جمع کی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی جانب میلان اور عقیدت میں وہ ایسے غلو واغراق سے کام نہیں لیتے تھے، جو بدعت

یا دوسرے صحابہ کے سب وشتم کا باعث ہو۔(۱)

غرض حاکم کا حضرت علیؓ کے بارے میں غالی ومفرط ہونا اولاً تو ثابت ہی نہیں ہے اور اگر کسی درجہ میں ثابت بھی ہو جائے جب بھی قابل اعتراض اور موجب تشیع نہیں ہے کیوں کہ:

۱- انھوں نے خلفائے اربعہ کا جہاں ایک ساتھ تذکرہ کیا ہے، وہاں اسی ترتیب کے مطابق کیا ہے جو اہل سنت نے ان بزرگوں کے درمیان قائم کی ہے، چنانچہ مستدرک کے فضائل صحابہ کے ابواب میں یہی ترتیب ہے، یعنی پہلے بالترتیب خلفائے ثلاثہ کا اور ان کے بعد حضرت علیؓ کا تذکرہ ہے۔

ایک جگہ معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

النوع السابع من هذا العلم معرفة الصحابة على مراتبهم۔	اس علم وفن کی ساتویں نوع صحابہ کرام کے مراتب کے لحاظ سے ان کی معرفت ہے۔

اس نوع میں انھوں نے مراتب ہی کے اعتبار سے صحابہ کے بارہ طبقوں کا ذکر کیا ہے، پہلے طبقہ میں خلفائے اربعہ کے نام اس ترتیب کے ساتھ لیے ہیں۔

فاولهم قوم اسلموا بمكة مثل ابى بكر وعمر وعثمان وعلى وغيرهم رضى الله عنهم۔(۲)	اول طبقہ میں وہ لوگ ہیں جو مکہ میں اسلام لائے جیسے ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ وغیرہ

محدثین کے سنین اور عمروں کے بیان میں بھی انھوں نے خلفائے ثلاثہ کے بعد حضرت علیؓ کا سنہ وفات تحریر کیا ہے۔(۳)

۲- عام اہل سنت کی طرح حاکم بھی ان چاروں بزرگوں کو خلیفہ برحق سمجھتے تھے

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۷۰و۱۷ (۲) معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۲ (۳) ایضاً ص ۲۰۲و۲۰۳۔

اور اپنی تصنیفات میں خلفا کی حیثیت سے ان کا ذکر بھی کیا ہے۔

۳- ان بزرگوں کے مناقب میں جو حدیثیں اور آثار جمع کیے ہیں ان سے بھی ان کی وہی فضیلت وعظمت اور ان کا وہی درجہ ومرتبہ ثابت ہوتا ہے جو عام امت نے ان کو دیا ہے، یعنی حضرت ابوبکر متفقہ طور پر امت میں سب سے برگزیدہ وبرتر ہیں، حاکم نے بھی احادیث وآثار سے یہی ثابت کیا ہے، یہاں تک کہ خود جناب امیرؓ کے ایسے اقوال نقل کیے ہیں جن سے حضرت ابوبکرؓ کا سب سے فائق وبرتر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں جناب امیرؓ کی تاخیر اور آپ کی آزردگی کا مسئلہ آج تک امت کے درمیان بحث ونزاع کا موضوع بنا ہوا ہے لیکن حاکم جناب امیرؓ ہی کی زبانی اس کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال علي والزبير ماغضبنا	حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں
الالانا قد اخرنا عن	کہ ہم کو غصہ اس وجہ سے تھا کہ ہم
المشاورة وانا نرى ابابكر	لوگوں کو مشورہ میں نظر انداز کیا گیا تھا،
احق الناس بها بعد رسول	ورنہ ہم لوگ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ
الله صلى الله عليه وسلم	وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ ہی کو سب
انه لصاحب الغار وثاني	سے زیادہ خلافت کا مستحق سمجھتے تھے، وہ
اثنين وانا نعلم بشرفه	غار میں آپ کے ساتھ اور دو میں کے
وكبره ولقد امره رسول الله	دوسرے تھے ہم کو ان کا فضل وشرف
صلى الله عليه وسلم	خوب معلوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ
بالصلوة بالناس وهو	علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں ان کو حکم دیا
حي۔(۱)	تھا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

(۱) المستدرک ج۳ص۶۶و۶۷۔

جہاں تک شیخین کی عظمت کا معاملہ ہے، اس میں معترضین کو بھی اعتراف ہے کہ حاکم نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے، البتہ حضرت عثمانؓ کا معاملہ ضرور مختلف فیہ ہے حالاں کہ یہ بھی خلاف واقعہ ہے، حاکم حضرت عثمان غنیؓ کو تیسرا اور برحق خلیفہ مانتے تھے اور ان کے قتل کو ناحق سمجھتے تھے، معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

قتل عثمان بن عفان رضی الله عنه صبرا۔ (۱) حضرت عثمان مظلوم قتل کیے گئے تھے۔

خلافت میں حضرت عثمانؓ کی ترتیب کے متعلق جو اشارات بعض حدیثوں میں ملتے ہیں وہ مستدرک میں بھی ہیں ابن سبکی نے اس قسم کی دو حدیثیں مستدرک سے نقل کی ہیں یہاں دو اور روایتیں ملاحظہ ہوں:

''حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رات ایک صالح شخص نے خواب دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ابوبکرؓ سے حضرت عمرؓ اور حضرت عمرؓ سے حضرت عثمانؓ جڑ گئے، راوی حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ جب ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھے تو یہ بات چیت کر رہے تھے کہ صالح آدمی سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں اور جڑ جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے امور کے ذمہ دار ہوں گے۔'' (۲)

دوسری حدیث حضرت انس بن مالک کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

''بنی مصطلق کے لوگوں نے مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ ہم لوگ آپ کے بعد کس کو صدقات دیں، آپ نے فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ کو، ان لوگوں نے کہا جا کر پوچھو ابوبکرؓ کے بعد کس کو

(۱) معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۰۳ (۲) مستدرک ج ۳ ص ۷۱ و ۷۲۔

ہم دیں گے، آپ نے حضرت عمرؓ کا نام لیا، تیسری دفعہ پھر بھیجا تو آپ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کو دینا۔"(۱)

اسی طرح حاکم نے حضرت علیؓ کے مناقب میں جو روایتیں نقل کی ہیں ان سے خلفائے ثلاثہ اور عام صحابہ کی کوئی تنقیص نہیں ہوتی۔

عام محدثین کی طرح حاکم کا بھی یہ مسلک ہے کہ صحابہ کرام کی عدالت میں طعن اور ان کی تنقیص کرنے والے کی روایت قبول نہیں کی جائے گی، مذاہب محدثین کی معرفت کے بیان میں لکھتے ہیں:

"علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ ابو اسرائیل ملائی کا پایہ حدیث میں بلند نہیں تھا کیوں کہ وہ حضرت عثمانؓ کا برائی کے ساتھ ذکر کرتے تھے۔"

اسی طرح علی بن حسین سے روایت ہے کہ حسین نے سدی کے یہاں جانا اس لیے ترک کر دیا تھا کہ وہ شیخین کو سب وشتم کرتے تھے۔(۲)

درحقیقت متقدمین کے نزدیک حاکم صحابہ کے معاملہ میں جادۂ حق اور مسلک اعتدال سے منحرف نہیں تھے جن لوگوں نے ان کو شیعی قرار دیا ہے، انھوں نے بھی اس کے ثبوت میں کوئی واقعہ یا ان کی تصنیفات سے کوئی مثال نہیں پیش کی ہے، رہیں وہ دونوں روایتیں جو صاحب مستدرک کے رفض وتشیع کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں، تو ان سے بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

پہلی حدیث یعنی "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کی حاکم نے تین طرق سے تخریج کی ہے، اور سب کی تصحیح وتصویب کی ہے، (۳) امام ترمذی نے اپنی جامع میں، امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور امام احمد نے مسند میں بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے، ان کے علاوہ طبرانی نے معجم میں ضیاء مقدسی نے مختارہ میں اور امام نسائی نے خصائص علیؓ میں

(۱) المستدرک ج ۳ ص ۷۷ (۲) معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۳۷ (۳) ملاحظہ ہو المستدرک ج ۳ ص ۱۰۹ و ۱۱۰۔

اس کی تخریج کی ہے گو حاکم کے بعض رجال پر کلام کیا گیا ہے اور ان کی روایتوں میں بعض ایسے اضافے ہیں جو صحاح اور مسند احمد بن حنبل میں نہیں ہیں، تاہم روایت کے جس حصہ کو قابل بحث، وجہ اعتراض اور شیعیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، یعنی "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" وہ سب میں مشترک ہے، اسی لیے اکثر محدثین نے اس حدیث کو ضعیف اور بے اصل نہیں قرار دیا ہے، علامہ ذہبی نے جنھوں نے مستدرک کی تلخیص میں جابجا حاکم پر نقد و تعقب کیا ہے اور اسی باب یعنی فضائل علیؓ کی متعدد ضعیف و واہی حدیثوں پر تنبیہ کی ہے، جس میں بعض جگہ ان کا لہجہ بہت تیز و تند ہو گیا ہے مثلاً:

العجب من الحاکم وجرأته فی تصحیح هذا وامثاله من البواطیل۔(۱)	حاکم پر اور ان کی ایسی اور اس جیسی باطل حدیثوں کی تصحیح کی جرأت پر سخت حیرت ہے۔

لیکن زیر بحث روایت کے صرف ایک طریق کے ایک راوی محمد کے علاوہ انھوں نے کسی پر کلام نہیں کیا ہے (۲) اور تذکرہ میں اس صراحت کے باوجود کہ مستدرک میں غیر صحیح حدیثیں پائی جاتی ہیں، اس حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ:

واما حدیث من کنت مولاہ الخ فله طرق جیدة وقد افردت ذالك۔ (۳)	رہی حدیث من کنت مولاہ الخ تو اس کے طرق جید ہیں اور میں نے اس کے لیے علاحدہ رسالہ لکھا ہے۔

ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں، مستدرک میں حاکم کی ساقط روایات کی تصریح کی ہے لیکن اس حدیث کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، ضعاف و موضوعات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے، علامہ سیوطیؒ نے اس کو حدیث حسن قرار دیا ہے۔ (۴) البتہ امام ترمذی نے اس کو غریب بتایا

(۱) تلخیص مستدرک ج ۳ ص ۱۲۷ (۲) ایضاً ص ۱۱۰ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۵ (۴) الجامع الصغیر ج ۲ ص ۵۵۔

ہے، مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری لکھتے ہیں:

''امام ترمذی نے اس کو حدیث حسن غریب بتایا ہے لیکن امام احمد، نسائی اور ضیاء نے بھی اس کی تخریج کی ہے، اس باب میں امام احمدؒ نے حضرت بریدہؓ سے اور انھوں نے اور ابن ماجہ نے براء بن عازبؓ سے امام ابن ماجہ نے سعدؓ بن ابی وقاص سے اور امام احمدؒ نے حضرت علیؓ سے روایتیں کی ہیں۔''(۱)

اور علامہ اسماعیل بن محمد عجلونی (م ۱۱۶۲ھ) نے تو اس کے متعلق یہاں تک لکھا ہے کہ:

''حدیث من کنت مولاہ کی امام طبرانی، احمد اور ضیاء نے مختارہ میں زید بن ارقم، حضرت علی اور تیس صحابہ سے اس لفظ "اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ" کے ساتھ تخریج کی ہے، پس یہ حدیث مشہور یا متواتر ہے۔''(۲)

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بعض علمائے فن اور محدثین نے اس روایت کی تضعیف کی ہے، علامہ زیلعی نے اس کے ضعیف ہونے کی نصب الرایہ میں صاف تصریح کی ہے، تاہم یہ حدیث چاہے صحیح ہو یا ضعیف وموضوع، مجرد اس کو نقل کرنے کی بنا پر حاکم کو شیعی قرار دینا یا ان کو مطعون کرنا سراسر زیادتی اور ناانصافی ہے جب مستدرک میں اور بھی ضعیف وموضوع حدیثیں موجود ہیں اور ان کی بنیاد پر حاکم کے عقیدہ ومسلک کے بارے میں کوئی خاص رائے نہیں قائم کی گئی ہے، یہاں تک کہ خود خلفائے ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام کے مناقب میں بھی کمزور اور ساقط روایتیں درج ہیں لیکن ان کی بنیاد پر کسی نے حاکم پر ان بزرگوں کی عقیدت میں غلو وافراط کا الزام عائد نہیں کیا ہے، اس لیے اس روایت کو ان کے عقیدہ ومسلک کی بنیاد اور حضرت علیؓ کی محبت میں بے جا افراط وغلو کی دلیل کس طرح ثابت

(۱) جامع ترمذی مع شرح تحفۃ الاحوذی ج ۴ ص ۳۲۶ و ۳۲۷ (۲) کشف الخفا ومزیل الالباس ج ۲ ص ۲۷۴۔

کیا جا سکتا ہے، پھر جب اس کی تخریج متعدد ائمہ کبار نے کی ہے اور اس کی وجہ سے ان کو رفض وتشیع سے متہم نہیں کیا گیا تو آخر حاکم ہی کو ہدف طعن اور شیعی قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

اگر اس حدیث کی حجیت یقینی اور مسلم بھی مان لی جائے جب بھی اس کے مفہوم سے رفض وشیعیت کی کوئی تائید نہیں ہو سکتی، عربی زبان میں مولیٰ کا لفظ کئی معنوں میں آتا ہے اور جیسا کہ شارحین نے لکھا ہے یہاں مولیٰ اور ولی کا لفظ دوست اور ساتھی کے معنیٰ میں ہے، ملا علی قاری کا بیان ہے کہ من کنت مولاہ الخ من کنت تولاہ کے مفہوم میں ہے، یعنی یہ ولی سے ہے جو عدو کا ضد ہے اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ "میں جس سے محبت کرتا ہوں علی بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔" دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "جو مجھ سے محبت کرتا ہے اس سے علی بھی محبت کرتے ہیں۔"(۱) پہلے مفہوم کی تائید ان حدیثوں سے بھی ہوتی ہے، جن میں حضرت علیؓ سے محبت کرنے والے کو مومن اور بغض ونفرت کرنے والے کو منافق کہا گیا ہے۔

دوسرے اس قسم کے الفاظ بعض اور صحابہ کرام کے بارے میں بھی حدیثوں میں آئے ہیں، خود حاکم نے حضرت عثمانؓ کے متعلق ایک روایت نقل کی ہے جو پہلے گذر چکی ہے کہ آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو دنیا وآخرت دونوں میں اپنا ولی بتایا ہے، اس طرح یہ حضرت علیؓ کی کوئی ایسی اہم اور خاص خصوصیت نہیں ہے جس میں دوسرے صحابہ شریک نہ ہوں۔

تیسرے بریدہ اسلمیؓ اور عمران بن حصین کی حدیثوں سے جو مستدرک اور مذکورہ بالا کتابوں میں مذکور ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب امیرؓ کے متعلق یہ الفاظ ایک خاص موقع پر فرمائے تھے، جب بعض لوگوں نے ان کے کسی طرز عمل سے آزردہ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی شکایت کی تھی، اس پر آپؐ نے ناگواری ظاہر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ "علیؓ سے بغض ونفرت کا اظہار کر کے تم لوگ مجھ سے نفرت کا اظہار کر رہے ہو، کیوں کہ جس کا میں دوست ہوں علیؓ بھی اس کے دوست ہیں۔"

---

(۱) تحفۃ الاحوذی مع جامع ترمذی ج ۴ ص ۳۲۶۔

اس واقعہ کی روشنی میں یہ حدیث صحیح ہو یا ضعیف، اس سے شیعیت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

رہی دوسری حدیث تو اس کو حاکم نے دو طرق سے مستدرک میں نقل کر کے صحیح اور شیخین کے شرائط کے مطابق قرار دیا ہے، بلکہ پہلے طریق کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس کو حضرت انسؓ سے ان کے تیس شاگردوں نے روایت کیا ہے اور یہ حضرت علیؓ، ابوسعید خدریؓ اور سفینہؓ سے بھی صحت کے ساتھ مروی ہے،(۱) ''حدیث طیر'' کا معرفۃ علوم الحدیث میں بھی انھوں نے ذکر کیا ہے لیکن وہاں اس کی صحت و سقم کے بارے میں کوئی رائے نہیں ظاہر کی ہے۔

''حدیث طیر'' کو حاکم کے علاوہ امام ترمذی نے اپنی جامع (۲) میں اور امام نسائی نے خصائصِ علیؓ (۳) میں نقل کیا ہے۔

حاکم کی دونوں روایتوں میں ایسی تفصیلات اور اضافے ہیں جو امام ترمذی وغیرہ کی روایتوں میں نہیں ہیں، حاکم کے مقابلہ میں امام ترمذی و نسائی کی حدیثیں بہت مختصر ہیں، مسئلہ کی وضاحت و تنقیح کے خیال سے یہاں ترمذی کی روایت نقل کی جاتی ہے۔

عن انس بن مالك رضي الله عنه كان عند النبي صلى الله عليه وسلم طير فقال	حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چڑیا تھی، آپ نے فرمایا کہ

(۱) ملاحظہ ہو المستدرک ج ۳ ص ۱۳۰ تا ۱۳۲ (۲) تحفۃ الاحوذی مع ترمذی ج ۴ ص ۳۲۸ (۳) یہ رسالہ ۱۳۰۸ھ میں مصر سے شائع ہوا ہے، اس میں یہ حدیث موجود نہیں ہے لیکن مولوی سید اولاد حسین صاحب نے جو نواب رام پور کے مصاحب خاص و واعظ دربار تھے، خصائصِ مرتضوی کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا جو محلہ جوہری لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، اس میں حدیث طیر کا متن اور اردو ترجمہ موجود ہے، ملاحظہ ہو خصائص مرتضوی ص ۴۔

اللھم ائتنی باحب خلقك	اے اللہ تو اس شخص کو میرے پاس بھیج
الیك یاکل معی ھذا الطیر	دے جو تیرے نزدیک، تیری مخلوق
فجاء علی فاکل معه.	میں سب سے زیادہ محبوب ہے تاکہ وہ
	میرے ساتھ یہ چڑیا کھائے، چنانچہ
	حضرت علیؓ تشریف لائے اور انھوں
	نے آپ کے ساتھ اس کو تناول فرمایا۔

امام نسائی کی روایت میں ہے کہ پہلے ابوبکرؓ پھر حضرت عمرؓ تشریف لائے، مگران کو باریابی کی اجازت نہیں ملی، تیسری دفعہ جب پھر حضرت علیؓ تشریف لائے تو آپ نے اجازت مرحمت فرمائی، حاکم کی دونوں حدیثیں نہایت طویل ہیں، ان کا ملخص اور ماحصل یہ ہے کہ آں حضورؐ کی دعا "اللھم ائتنی الخ" سن کر حضرت انسؓ نے دعا کی کہ اے اللہ! یہ محبوب بندہ قبیلہ انصار کا کوئی آدمی ہو، چنانچہ جب دو دفعہ حضرت علیؓ ہی تشریف لائے تو حضرت انسؓ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرورت سے تشریف لے گئے ہیں مگر جب تیسری دفعہ بھی حضرت علیؓ ہی آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو لو آؤ، تم ہی پر موقوف نہیں ہے، ہر شخص کو اپنی قوم سے محبت ہوتی ہے۔

امام ترمذیؒ نے اپنی روایت کے متعلق فرمایا ہے کہ:

ھذا حدیث غریب لانعرفه	یہ حدیث غریب ہے، سدی سے صرف
من حدیث السدی الامن ھذا	اسی سند اور طریق سے ان کی حدیث کا
الوجه وقدروی ھذا الحدیث	ہم کو علم ہے حالانکہ یہ حضرت انسؓ سے
من غیر وجه عن انس.	متعدد وجوہ وطرق سے مروی ہے۔

علامہ ذہبی تلخیص میں حدیث طیر کے پہلے طریق کے بارے میں لکھتے ہیں:

ابن عیاض لااعرفه ولقد	ابن عیاض کے بارے میں مجھ کو

کنت زمانا طویلاً اظن ان	واقفیت نہیں ہے، میرا ایک زمانہ تک
حدیث الطیر لم	خیال تھا کہ حاکم نے حدیث طیر کو
یجسر الحاکم ان یودعه فی	مستدرک میں نقل کرنے کی جسارت نہ
مستدرکه فلما علقت هذا	کی ہوگی لیکن جب میں نے یہ تعلیق
الکتاب رأیت الهول من	لکھی تو مجھ کو ایسی ہولناک موضوع
الموضوعات التی فیه فاذا	حدیثیں اس میں ملیں جن کے مقابلہ
حدیث الطیر بالنسبة الیها	میں حدیث طیر بلند پایہ ہے، کیوں کہ
سماء قال وقدرواه عن انس	اس کے متعلق خود حاکم نے کہا ہے کہ
جماعة اکثر من ثلاثین نفسا	اس کو حضرت انسؓ سے تیس سے زیادہ
ثم صحت الروایة عن علی	اشخاص نے بیان کیا ہے اس کے علاوہ
وابی سعید وسفینة۔ (۱)	یہ حضرت علیؓ، ابو سعیدؓ اور سفینہؓ سے بھی
	صحت کے ساتھ مروی ہے۔

اور دوسرے طریق کے ایک راوی ابراہیم بن ثابت کو ساقط قرار دیا ہے۔ (۲)

تذکرہ میں اس حدیث کے متعلق ذہبی کا رویہ مزید نرم ہوگیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

واما حدیث الطیر فله طرق	رہی حدیث طیر تو یہ بکثرت طرق سے
کثیرة جدا افردتها بمصنف	مروی ہے، میں نے ان سب کو ایک
وبمجموعها یوجب ان یکون	مستقل رسالہ میں جمع کیا ہے، ان
الحدیث لهٗ اصل۔ (۳)	سب کے مجموعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ
	یہ بے اصل نہیں ہے۔

(۱) تلخیص مع مستدرک ج ۳ ص ۱۳۱ (۲) ایضاً ص ۱۳۲ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۵۔

ذہبی کے ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو حدیث طیر کے ضعیف یا موضوع ہونے کے بارے میں شرح صدر نہیں تھا اور امام ترمذی نے اگر چہ اس کو غریب بتایا ہے تاہم انھوں نے اس کے کثرتِ طرق وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی یہ موضوع اور ضعیف نہیں ہے۔

لیکن عام علما نے حدیث طیر کو صحیح تسلیم نہیں کیا ہے جیسا کہ حاکم پر ان کے اعتراضات سے ظاہر ہوتا ہے، البتہ بعض کے نزدیک ضعیف ہے اور بعض کے نزدیک موضوع، علامہ ابن سبکی نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ''حدیث طیر پر وضع کا الزام لگانا صحیح نہیں ہے، ہمارے دوست حافظ صلاح الدین خلیل بن کیکلد علائی نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے متعلق صحیح فیصلہ یہ ہے کہ اس کے بعض طرق حسن کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ اس کو ضعیف کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے تمام طرق کا موضوع ہونا ثابت نہیں ہوتا، انھوں نے اس کی سند کے تمام رجال کو بجز احمد بن عیاض کے، ثقہ ومعرف بتایا ہے لیکن میری نظر سے ان کی جرح یا توثیق کے بارے میں کوئی قول نہیں گذرا ہے۔''(۱)

علامہ زیلعی نے بھی جن کی رائے آگے نقل کی جائے گی، اس کو ضعیف ہی قرار دیا ہے۔

لیکن جن لوگوں نے اس کو موضوع قرار دیا ہے، ان کی تعداد زیادہ ہے، علامہ ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے، وہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

> ''حاکم نے حدیث طیر کو صحیح بتایا ہے لیکن ابن ناصر کہتے ہیں کہ یہ موضوع ہے اور اہل کوفہ میں سے ساقط الاعتبار قسم کے لوگوں نے کچھ مشہور اور کچھ مجہول

---

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱ے و ۲ے۔

راویوں کے واسطہ سے اس کو حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے۔"(۱)

علامہ ابن کثیر نے بھی یہی لکھا ہے۔(۲)

علامہ شوکانی فرماتے ہیں:

قال في المختصر له طرق	مختصر میں کہا گیا ہے کہ اس کے بہت
كثيرة كلها ضعيفة وقد	سے طرق ہیں جو سب ضعیف ہیں اور
ذكره ابن جوزي في	علامہ ابن جوزی نے اس کا موضوعات
الموضوعات واما الحاكم	میں تذکرہ کیا ہے مگر حاکم نے مستدرک
فاخرجه في المستدرك	میں اس کی تخریج کر کے اسے صحیح قرار
وصححه واعترض عليه	دیا ہے اس کی وجہ سے اکثر علما نے ان
كثير من اهل العلم ومن اراد	پر اعتراضات کئے ہیں جس کو اس کی
استيفاء البحث فلينظر	مفصل بحث دیکھنی ہو وہ سیر النبلا (۴)
ترجمة الحاكم في	میں حاکم کا ترجمہ دیکھے۔
النبلاء(۳)	

علامہ محمد بن طاہر پٹنی نے بھی اس کو موضوع بتایا ہے۔(۵)

حاکم نے مستدرک میں اس کی صحت ثابت کرنے کے لیے کثرتِ طرق کا سہارا لیا ہے مگر علامہ زیلعی فرماتے ہیں:

وكم من حديث كثرت رواته	کتنی حدیثیں ایسی ہیں جن کے رواۃ
وتعددت طرقه وهو حديث	زیادہ اور طرق متعدد ہوتے ہیں لیکن وہ

(۱) المنتظم ج ۷ ص ۲۷۵ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۵۵ (۳) الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ ص ۲۰۸ (۴) افسوس ہے کہ سیر النبلا کی یہ جلد ہماری نظر سے نہیں گذری (۵) تذکرۃ الموضوعات ص ۹۵، ۹۶۔

ضعیف کحدیث الطیر	حدیثیں ضعیف ہوتی ہیں حدیثِ طیر،
وحدیث الحاجم والمحجوم	حدیث حاجم ومحجوم اور حدیث من
وحدیث من کنت مولاہ	کنت مولاہ فعلی مولاہ۔
فعلی مولاہ۔(۱)	

امام دارقطنی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کے سامنے اس حدیث کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے مستدرک اور حاکم پر اظہار نکیر کیا، خود حاکم کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بعد میں اس حدیث کو موضوع سمجھ کر مستدرک سے خارج کر دیا تھا، ابومحمد بن سمرقندی کا بیان ہے کہ حاکم کو 'حدیث طیر' کے متعلق جب امام دارقطنی کی نکیر وملامت کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اس کو مستدرک سے خارج کر دیا''(۲)

علامہ ذہبی کے ایک بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''حاکم شاگرد ابوعبدالرحمن شاذیاجی کہتے ہیں کہ سید ابوالحسن کی مجلس میں ہم لوگوں نے حاکم سے حدیث طیر کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ''یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ اگر اس کو صحیح مانا جائے تو رسول اللہ کے بعد کوئی شخص حضرت علیؓ سے افضل نہ ہوگا، مگر میرا خیال ہے کہ اس کے متعلق بعد میں حاکم کی رائے بدل گئی تھی اور انھوں نے اس کو مستدرک میں شامل کر دیا تھا، اس طرح یہ حدیث مستدرک میں باقی رہ گئی۔''(۳)

بہر حال حاکم نے چاہے حدیث طیر کو مستدرک سے خارج کیا ہو یا نہ کیا ہو، اس کا موضوع اور باطل ہونا اکثر علمائے فن اور محدثین کے نزدیک مسلم ہے۔

---

(۱) نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۶۰ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۸ (۳) دیکھو تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۵، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں' ہمارے استاذ علامہ ذہبی کا بیان درست اور بجا ہے، مستدرک میں حدیث طیر کا رہ جانا تسامح کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، پہلے تو میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

گو محدثین اور اصحاب فن کے نزدیک اس حدیث کا موضوع ہونا مسلم ہے لیکن اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے جب بھی اس سے شیعیت کی تائید نہیں ہوتی کیوں کہ اس سے حضرت علیؓ کا علی الاطلاق سب سے افضل و برتر ہونا یقینی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔

شافعیت میں غلو اور تعصب کا الزام: امام حاکم شافعی المذہب تھے، ان پر الزامات کی فہرست میں ایک الزام یہ بھی ہے کہ ان کو اس مذہب میں بے جا غلو اور تعصب تھا لیکن اس

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) حاکم کے تخریج نہ کرنے کے باوجود اس حدیث کو مستدرک میں شامل کر دیا گیا ہو، اس لیے میں نے اس کی تحقیق کے لیے مستدرک کے قدیم نسخوں کا جائزہ لیا لیکن مجھ کو اس سلسلہ میں شرح صدر نہ ہوا مگر جب امام دار قطنی کے استدراک ونکیر سے حاکم نے مطلع ہونے کے بعد اس کو خارج نہیں کیا تو خیال ہوا کہ ممکن ہے حاکم نے اس کی پہلے تخریج کی ہو اور بعد میں خارج کر دیا ہو لیکن بعض نسخوں میں یہ صحیح رہ گئی ہو، اگر یہ ثابت ہو جائے تو دونوں روایتیں درست ہو جائیں گی اور صورت واقعہ یہ ہو گی کہ حاکم نے اس حدیث کی تخریج کی تھی، مگر جب ان کو اس کا باطل ہونا قطعیت کے ساتھ معلوم ہو گیا تو انھوں نے اس کو مستدرک سے خارج کر دیا، جیسا کہ اس روایت سے جس کی سندوں کو ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے، معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض نسخوں میں یہ حدیث یا تو کتاب کے مشتہر اور شائع ہو جانے کی وجہ سے باقی رہ گئی ہو یا حاکم کے مخالفین اور نکتہ چینوں نے اس کو اس میں شامل کر دیا ہو (طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷۱) علامہ ابن سبکی نے مخالفین کے بارے میں جس شبہہ کا اظہار کیا ہے، وہ بے بنیاد نہیں ہے، خود ابن طاہر کا بیان ہے کہ میں نے حاکم کے قلم سے ایک ضخیم مجموعہ میں حدیث طیر دیکھی تو اس کو تعجب کی وجہ سے نقل کر لیا ممکن ہے اسی طرح بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہو، اس طرح سے اس کو عام شہرت ہو گئی ہو اور جن لوگوں کو حاکم کی بعد کی رائے کی اطلاع نہ ہو سکی ہو انھوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ حدیث مستدرک میں شامل ہے اور مستدرک کے بعض نسخوں میں یہ حدیث موجود تھی، اس لیے جامعین و مرتبین سے عدم امتیاز کی بنا پر تسامح ہو گیا، اس طرح وہ مستدرک کے متداول نسخوں میں بھی باقی رہ گئی ہے۔ ''ض''

الزام کا ان کے سوانح نگاروں نے ذکر نہیں کیا ہے، اس کو مشہور عالم اور ندوۃ المصنفین دہلی کے سابق رفیق مولانا عبدالرشید نعمانی نے زیادہ شدومد سے لکھا ہے، وہ اپنی ایک عربی تصنیف ماتمس الیه الحاجة لمن یطالع سنن ابن ماجہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''علامہ ابن صلاح نے ائمہ خمسہ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی) کے بعد جن اکابر محدثین کا ذکر کیا ہے، یعنی دارقطنی، حاکم، عبدالغنی بن سعید مصری ابونعیم اصبہانی اوران کے بعد کے طبقہ میں ابن عبدالبر، بیہقی اور خطیب، یہ سب کے سب عبدالغنی بن سعید اور ابن عبدالبر کے علاوہ ائمہ شافعیہ میں ہیں اوران لوگوں کو اس مذہب کے بارے میں شدید تعصب تھا۔''

حافظ ابن جوزی المنتظم میں لکھتے ہیں:

''.......... اسماعیل بن ابوالفضل قومسی اصبہانی سے یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ وہ تین محدثین کو ان کے سخت تعصب اور انصاف کی کمی کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے۔ ۱- حاکم ابوعبداللہ۔ ۲- ابونعیم اصبہانی۔ ۳- ابوبکر خطیب، اسماعیل نے بالکل صحیح کہا ہے، وہ ثقہ وصدوق اور کبار محدثین میں تھے، ان کو رجال ومتون کی اچھی اور عمدہ معرفت حاصل تھی اور وہ بڑے متدین تھے۔(۱)

مولانا نے آگے چل کر ان محدثین میں سے بعض کے تعصب کی مزید وضاحت کی ہے لیکن حاکم کے متعلق یہاں صرف اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے مگر حاکم کے رسالہ المدخل الی علم الحدیث پر ان کا ایک طویل مضمون ماہنامہ برہان دہلی کے کئی نمبروں میں شائع ہوا ہے، اس میں المدخل کے بعض مختصر مباحث کی توضیح وتفصیل کے علاوہ اس پر نقد وتعقب بھی کیا گیا ہے، اس مضمون کے شروع میں کسی قدر تفصیل اور تیز لہجہ میں اس الزام کا اعادہ کیا گیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

---

(۱) ماتمس الیه الحاجة ص۱۳ بحوالہ المنتظم ج۸ ص۲۶۹۔

"حاکم کی تصانیف کے مطالعہ کے وقت دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں، اولاً ان کا نقد ونظر میں تساہل، ثانیاً تعصب، ان کا تساہل تو ایک متعارف چیز ہے، مگر تعصب پر ممکن ہے، ظاہر بینوں کو یقین نہ آئے لیکن یہ صرف ہمارا بیان نہیں بلکہ ائمہ فن کی تصریح ہے، حافظ عبدالرحمٰن بن جوزی نے بسند صحیح حافظ اسماعیل بن ابی الفضل قومسی کا یہ قول نقل کیا ہے، (۱) المدخل میں بھی ائمہ احناف کا جس طریقہ پر ذکر کیا ہے، اس سے حافظ اسماعیل کے بیان کی توثیق ہو جاتی ہے، ضعفا سے روایت کے باب میں جہاں ائمہ کا نام لیا ہے، امام مالک کا ذکر اس عظمت شان کے ساتھ کیا ہے "وھذا مالك بن انس امام اھل الحجاز بلا مدافعة۔ اسی طرح امام شافعی کا نام لینے کے بعد لکھتے ہیں: "وھو الامام لاھل الحجاز بعد مالك۔" لیکن امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے صرف نام بتانے پر اکتفا کی ہے، چنانچہ تحریر ہے "وھذا ابو حنیفة ثم بعده ابو یوسف یعقوب بن ابراھیم القاضی ومحمد بن الحسن الشیبانی اور ابوعصمہ نوح بن ابی مریم پر جو امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں سے ہیں اور فقہا میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، وضع حدیث کا الزام لگایا ہے اور ایک مجہول شخص کے بیان سے استدلال کیا ہے۔" (۲)

مذکورہ بالا دونوں تحریروں کا تجزیہ کرنے سے حاکم کے تعصب کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں:

۱- رسالہ المدخل میں حاکم نے امام مالک اور امام شافعی کا جس عظمتِ شان کے ساتھ ذکر کیا ہے اس عظمت کے ساتھ امام ابوحنیفہ کا نہیں کیا ہے۔

(۱) یہ بیان پہلی تحریر میں گذر چکا ہے، اس لیے اس کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے (۲) ماہنامہ برہان فروری ۱۹۴۲ء ص ۱۰۴ و ۱۰۵۔

۲- حاکم نے امام ابوحنیفہ کے ایک شاگرد ابوعصمہ نوح ابن ابی مریم پر جو فقہ میں امتیاز رکھتے تھے، ایک مجہول شخص کے بیان پر اعتماد کر کے وضع حدیث کا الزام لگایا ہے۔

پہلا تجزیہ یقیناً صحیح ہے، المدخل میں حاکم نے ان ائمہ کا اسی حیثیت سے ذکر کیا ہے،(۱) لیکن غالباً اس کو امام اعظم کی تنقیص اور شافعیت میں غلو وتعصب کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ

۱- امام اعظم کے بارے میں معتدل محدثین کو اگرچہ پوری طرح تسلیم تھا کہ فقہ و اجتہاد میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا لیکن حدیث میں وہ ان کا پایہ زیادہ بلند نہیں مانتے تھے، بلکہ بعض کا تو یہاں تک خیال ہے کہ روایت وحدیث کے معاملہ میں وہ ضعیف اور کمتر تھے (۲) یہ خیال خواہ تمام تر غلط یا سراسر غلط فہمی پر مبنی ہو لیکن واقعہ یہی ہے، ان کے مقابلہ میں وہ ائمہ ثلاثہ خصوصاً امام مالک اور امام احمد کو حدیث میں نہایت بلند پایہ اور عالی مرتبہ سمجھتے تھے، اسی لیے محدثین ائمہ ثلاثہ سے امام اعظم کے مقابلہ میں زیادہ قریب بھی ہیں اور ان کے زیادہ ہم نوا بھی اور وہ ان ائمہ کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اس عظمت کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کا نہیں کرتے لیکن محض اس بنا پر محدثین کی پوری جماعت کو امام اعظم کا مخالف ومعاند اور ان ائمہ کا بیجا ہمنوا اور حمایتی نہیں قرار دیا جا سکتا، اس لیے حاکم کا بھی ان ائمہ کے مقابلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا اس عظمت شان کے ساتھ ذکر نہ کرنا جس عظمت شان کے ساتھ کرنا چاہیے، درحقیقت شافعیت میں غلو اور تعصب کا نتیجہ نہیں ہے۔

۲- حاکم عام محدثین کے برخلاف امام ابوحنیفہؒ کو صرف فقہ واجتہاد ہی میں امام اور بلند پایہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ حدیث وروایت میں بھی ان کی اہمیت کے قائل تھے چنانچہ یہاں بھی سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے امام مالک اور امام شافعی کی طرح ان

(۱) المدخل ص ۵۔ (۲) اس کے متعلق مفصل بحث کے لیے راقم کا مضمون ''کیا امام دارقطنی امام ابوحنیفہ سے تعصب رکھتے تھے'' مطبوعہ معارف ستمبر ۶۹ء ملاحظہ کیجیے۔

کا اور صاحبین کا بھی ذکر ائمہ محدثین ہی کی حیثیت سے کیا ہے، جیسا کہ ابتداءً "فمن الائمة الماضين" اور صاحبین کا نام لینے کے بعد وکذالك من بعد هما من ائمة المسلمين" سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو ان بزرگوں کی امامت فن اور معرفتِ حدیث سے انکار نہیں تھا لیکن امام شافعی اور امام مالک کے ساتھ انھوں نے جو توصیف وتکریم کا انداز اختیار کیا ہے اس کا غالباً سبب یہ ہے کہ ان کو بالاتفاق محدثین کی جماعت بھی حدیث وروایت میں امام سمجھتی تھی لیکن امام ابوحنیفہ کا معاملہ اس سے کچھ مختلف ہے۔

حاکم کے نزدیک حدیث میں امام ابوحنیفہ کی اہمیت اور درجہ کا اندازہ خود مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب کی اس تحریر سے بھی ہوتا ہے:

> ''حاکم اپنے مستدرک میں امام ابوحنیفہ سے استشہاد بھی کرتے ہیں اور ان کو ائمہ اسلام میں بھی شمار کرتے ہیں، انھوں نے ان کا اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث کی انچاسویں نوع میں ان مشہور ثقہ ائمہ تابعین وتبع تابعین میں ذکر کیا ہے جن کی حدیثیں حفظ ومذاکرہ اور تبرک کے لیے لکھی جاتی ہیں اور جن کا مشرق ومغرب میں شہرہ ہے۔''(۱)

۳- حاکم شافعی المذہب تھے، اس لیے ظاہر ہے کہ ان کو غلو، جیسا کہ مولانا نے بھی لکھا ہے، اسی مذہب میں ہوگا لیکن یہ بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے امام مالک کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس عظمت شان کے ساتھ امام شافعی کا ذکر نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں ان پر اگر کوئی الزام عائد ہو سکتا ہے تو وہ مالکیت میں غلو کا نہ کہ شافعیت میں، حقیقت یہ ہے کہ حدیث وروایت میں امام مالک کا درجہ امام شافعی سے بڑھ کر تھا، اس لیے حاکم نے اپنے امام مذہب کے مقابلہ میں ان کا اگر زیادہ عظمتِ شان کے ساتھ ذکر کیا ہے تو یہ دراصل ان کے تعصب کا نہیں بلکہ انصاف پسندی کا نتیجہ ہے۔

---

(۱) ماتمس اليه الحاجة لمن يطالع سنن ابن ماجہ ص ۳۲۔

۴- اس عبارت میں جس طرح انھوں نے امام اعظم اور صاحبین کے ناموں کے ساتھ امام وغیرہ کا لفظ نہیں لکھا ہے، اسی طرح کتاب کے دوسرے مقامات ومباحث میں حدیث وروایت کے کئی اساطین واکابر جیسے امام احمد، امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ کا صرف سادہ نام دیدیا ہے اور عموماً عربی مصنفین کا یہی قاعدہ بھی ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ صحیح ہے کہ حاکم کو امام مالک اور امام شافعی کی طرح امام اعظم اور صاحبین کا بھی اسی تعریف وتکریم کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے تھا ممکن ہے انھوں نے ایسا کیا ہو مگر بعد میں جب حق پسندی کی جگہ عصبیت نے لے لی ہو تو ناقلین نے اسے حذف کر دیا ہو۔

رہا دوسرا جز تو واقعہ کے اعتبار سے وہ بھی صحیح ہے، حاکم نے ابوعصمہ کے متعلق المدخل میں یہ ضرور لکھا ہے کہ:

> ''بعض لوگوں نے ثواب کے خیال سے بھی حدیثیں وضع کیں، ان لوگوں نے خود ہی بیان کیا ہے کہ انھوں نے لوگوں کو فضائل اعمال کی دعوت وتلقین کرنے کے لیے ایسا کیا جیسے ابوعصمہ نوح بن ابی مریم مروزی، محمد بن عکاشہ کرمانی، احمد بن عبداللہ جوباری، محمد بن قاسم طائکانی اور مامون بن عبداللہ ہروی وغیرہ۔ میں نے محمد بن یونس مقری سے، انھوں نے جعفر بن احمد بن نصر سے اور انھوں نے ابوعمارہ مروزی سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ابوعصمہ سے کہا گیا کہ آپ کو عکرمہ کی وہ حدیث کیسے ملی ہے، جس کو انھوں نے عباس رضی اللہ عنہ سے قرآن کے فضائل کے سلسلہ میں روایت کیا ہے، تو انھوں نے کہا کہ میں نے لوگوں کو قرآن سے بے نیاز اور روگرداں ہو کر امام ابوحنیفہ کی فقہ اور محمد بن اسحاق کے مغازی میں مشغول پایا تو ثواب کے خیال سے یہ حدیث وضع کر الی۔''(۱)

(۱) المدخل ص۱۹، ۲۰، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نوح کا یہ بیان نقل (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مگر ابوعصمہ کے متعلق حاکم کی یہ منفرد رائے نہیں ہے، کم وبیش تمام ائمہ جرح وتعدیل نے ان کو غیر ضابط، منکر الحدیث اور وضاع وکذاب تک کہا ہے، ان کے بارے میں سب سے نرم رائے ابن عدی کی ہے، مگر وہ کہتے ہیں ہم نے ان سے جو روایتیں کی ہیں وہ سب عموماً ایسی ہیں جن میں ان کی متابعت نہیں کی گئی ہے لیکن ان کے ضعف کے باوجود ان کی حدیثیں لکھی جائیں گی اور سب سے سخت رائے ابن مبارک کی ہے وہ ان پر نکیر کرتے، ان کی حدیثوں کو ناپسند کرتے اور انھیں وضعی اور جعلی قرار دیتے تھے، ایک بار وکیع سے انھوں نے فرمایا کہ ہمارے یہاں ایک شیخ ہیں، ان کا نام ابوعصمہ ہے، یہ اسی طرح حدیثیں وضع کرتے ہیں جس طرح معلیٰ بن ہلال کرتے تھے۔

ابوعصمہ کے متعلق ذیل میں متعدد نقادانِ فن کے اقوال اور جرحیں درج کی جاتی ہیں:

امام احمد: وہ حدیث میں بلند پایہ نہ تھے، بلکہ منکر حدیثیں بیان کرتے تھے۔

یحییٰ ابن معین: نہ حدیث میں ان کی کوئی اہمیت ہے اور نہ ان کی حدیثیں لکھی جائیں گی۔

وکیع: ان کا کیا اعتبار؟ ابن مبارک ان سے روایت نہیں کرتے۔

امام بخاری: ان کی حدیثیں غیر صحیح اور وہ منکر الحدیث وذاہب الحدیث ہیں۔

ابوحاتم: دولابی، امام مسلم اور امام دارقطنی: متروک الحدیث۔

ابوزرعہ: ضعیف الحدیث۔

امام نسائی: ابوعصمہ غیر ثقہ وغیر مامون اور ساقط الحدیث ہیں، ان سے حدیث نہیں لکھی جائے گی۔

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ) کرنے کے بعد لکھتے ہیں "وایں عذر او بدتر از گناہ است زیرا کہ احادیث صحیحہ کہ درفضائلِ قرآن وارد شدہ برائے ترغیب کافی بودہ" ملاحظہ ہو (عجالہ نافعہ مع فوائد ص ۲۵)

جوزجانی: ساقط الحدیث

ابن حبان: ابوعصمہ سندوں کو الٹ پلٹ دیتے تھے اور ثقہ لوگوں کی جانب منسوب کر کے حدیثیں بیان کرتے تھے، وہ کسی حال میں بھی اعتبار واحتجاج کے لائق نہیں، ان کا لقب اگرچہ جامع تھا، مگر وہ صدق کے سوا ہر چیز کے جامع رہے ہوں گے۔

ابن عیینہ وابوعلی نیشاپوری: وہ کذاب تھے۔

خلیلی: ان کے ضعف پر محدثین کا اجماع ہے۔

ساجی: متروک الحدیث ہیں، ان کے پاس باطل حدیثیں ہوتھیں۔

ابوسعید النقاش: انھوں نے موضوعات کی روایت کی ہے۔

حافظ ذہبی وابن عماد: متروک الحدیث، ذہبی نے ان کی بعض ضعیف اور واہی حدیثوں کی مثالیں بھی دی ہیں۔

حافظ ابن حجر: لوگوں نے حدیث میں ان کو کاذب قرار دیا ہے، انھوں نے زہری اور ابن منکدر کو ضرور پایا تھا، مگر ان سے حدیثیں بیان کرنے میں تدلیس سے کام لیتے تھے، ابن مبارک نے ان کی ایک طویل حدیث کو بے اصل قرار دیا ہے، واقعتہ اس میں وضع کے آثار وعلامات بالکل ظاہر وواضح ہیں، ابوجعفر طبری نے اپنی تاریخ کی ابتدا میں بدء الخلق کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس کی عدم صحت کی جانب اشارہ بھی کیا ہے۔

علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے حاکم کا مذکورہ بالا بیان بلا نقد وتبصرہ نقل کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک حاکم کا بیان قابل اعتراض نہیں ہے۔(۱)

ائمہ جرح وتعدیل کے ان متفقہ آرا واقوال کے بعد یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ

(۱) ائمہ جرح وتعدیل کے ان بیانات کے لیے میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۵ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۸۷ تا ۴۸۹ تقریب التہذیب ص ۲۶۴، خلاصہ تذہیب ص ۴۰۵ العبر ج ۱ ص ۲۶۴ تاریخ الصغیر امام بخاری اور کتاب الضعفاء والمتروکین امام نسائی ملاحظہ ہو۔

امام حاکم نے بربنائے تعصب نوح کو واضع حدیث قرار دیا ہے، اگر ان کی روایت مجہول شخص کے واسطہ سے بھی ہو تو ان آرا کی موجودگی میں اس کے صحیح ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے، آخر ابن حجر اور ذہبی نے بھی تو حاکم کے بیان پر کوئی رد و کد نہیں کیا ہے اسی طرح مولانا عبدالحلیم چشتی نے جو اس دور کے مشہور فاضل اور اچھے اہل قلم ہیں، ابوعصمہ نوح بن ابی مریم کے ضعیف و متروک ہونے کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ابوعصمہ نوح نے امام زہری، ثابت بنانی، یحییٰ بن سعید انصاری اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہم سے حدیث پڑھی اور ان سے شعبہ اور عبداللہ بن مبارک رحمہما اللہ راوی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ ثقہ تھے لیکن اور محدثین کی نظر میں متروک ہیں ان پر زہد کا بڑا غلبہ تھا.......... حافظ ذہبی کتاب العبر میں لکھتے ہیں.......... وھو متروک الحدیث.......... (فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۵۲۴ و ۵۲۵)

مولانا عبدالرشید صاحب نے اپنے خیال کی تائید و توثیق میں اسماعیل بن ابوالفضل قومسی کا ایک بیان بھی نقل کیا ہے جس کا صرف حافظ ابن جوزی جیسے متشدد شخص نے المنتظم میں خطیب بغدادی کے تذکرہ میں ذکر کیا ہے لیکن ان تمام سوانح نگاروں کے اقوال کے مقابلہ میں اس شاذ اور منفرد قول کی اہمیت ہوسکتی ہے؟ جنھوں نے حاکم کے مفصل ترجمے لکھے اور ان پر عائد کیے جانے والے الزامات گنائے، مگر اس الزام کا ذکر تک نہیں کیا، مولانا کو چاہیے تھا کہ وہ دیگر ائمہ اور ناقلین خصوصاً حاکم کے اساتذہ، تلامذہ اور معاصرین وغیرہ کے اقوال سے ثبوت اور سندیں پیش کرتے یا پھر احکام و مسائل میں حاکم کے غلو و تعصب کی مثالیں بیان کرتے تو ممکن ہے، ''ظاہر بینوں'' کو بھی حاکم کے تعصب کا یقین ہو جاتا۔

مستدرک کے بعض مقامات میں حاکم نے ضرور شافعی مذہب کی تائید و حمایت کی

ہے لیکن اس کا غلو و تعصب سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اسی طرح کے بعض مواقع پر انھوں نے امام شافعیؒ کے بجائے بعض دوسرے ائمہ جیسے ابن خزیمہ وغیرہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے ظاہر ہے کسی کے اپنے فقہی مسلک کی ترجیح اور اپنے امام مذہب کی تائید کو اس کے غلو و تعصب پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

امام ابوالقاسم تمّام رازی

(متوفی ۴۱۴ھ)

نام ونسب: تمام نام، ابوالقاسم کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: تمام بن محمد بن عبداللہ بن جعفر بن عبداللہ بن جنید۔(۱)

ولادت، خاندان اور وطن: امام ابوالقاسم تمام کا اصل آبائی وطن رے تھا لیکن اسلامی عہد میں ان کا خاندان دمشق میں آباد ہو گیا تھا، یہیں وہ ۳۳۰ھ میں پیدا ہوئے، اسی لیے رازی اور دمشقی کہلاتے ہیں، بجلی کی نسبت سے بھی مشہور ہیں، کیوں کہ ان کے خاندان کا عرب کے مشہور قبیلہ بجیلہ سے ولا کا تعلق تھا، ان کے والد بزرگوار ابوالحسین محمد بھی بلند پایہ محدث تھے۔(۲)

اساتذہ: اپنے والد ماجد کے علاوہ جن محدثین سے ان کو شرف تلمذ حاصل ہے، ان کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن احمد بن حزام، ابوعلی احمد بن محمد بن فضالہ، ابومیمون بن راشد، ابویعقوب اذرعی، ابوعلی حسن بن حبیب حصائری، (۳) خثیمہ بن سلیمان طرابلسی، محمد بن حمید جوار بی وغیرہ۔

ابوعمرو بن العلاء، (۴) علی غلام سباک سے فن قرأت کی تحصیل کی تھی۔

---

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۴۲ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۵۸ (۳) شاہ عبدالعزیز صاحب نے حسن بن حلت حضائری لکھا ہے (بستان ص ۹۲) (۴) حافظ ذہبی نے ان کا نام علی احمد بن عثمان علام لکھا ہے۔

تلامذہ: ان کے تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن (۱) میدانی، ابوعلی اہوازی، احمد بن عبدالرحمن طرائفی، احمد بن محمد عتیقی، حسن بن علی الباد، عبدالعزیز بن احمد کتانی اور عبدالوہاب کلابی وغیرہ۔(۲)

حفظ وضبط: وہ حفظِ حدیث میں بے نظیر تھے، ابوبکر حداد کا بیان ہے کہ حفظ و روایت میں ہم نے ان سے زیادہ جامع اور باکمال شخص نہیں دیکھا، عبدالعزیز کتانی فرماتے ہیں کہ اہلِ شام کی روایتوں کے یہ سب سے بڑے اور اچھے حافظ وضابط تھے۔

ثقاہت: ان کی عدالت وثقاہت بھی مسلم ہے، کتانی نے اس کا اعتراف کیا ہے، حافظ ابن عساکر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ و مامون تھے۔

علل واسماء الرجال میں مہارت: علل اور رجال حدیث کے ماہر تھے، اہوازی کا بیان ہے کہ تمام فن حدیث میں تبحر، علل سے واقف اور رجال کی معرفت میں بڑا درخور رکھتے تھے، میں نے ایسا ماہر فن نہیں دیکھا۔(۳)

حدیث میں درجہ: ان تصریحات سے حدیث میں ان کی اہمیت وعظمت کا اندازہ ہوتا ہے، علمائے فن نے ان کو عارف وعالم بالحدیث اور محدث الشام وغیرہ کہا ہے۔

وفات: چوراسی سال کی عمر میں ۳ رمحرم الحرام ۴۱۴ھ کو انتقال کیا۔(۴)

تصنیفات: ان کی صرف ایک ہی کتاب فوائد کا نام معلوم ہوسکا ہے، یہ تیس جزؤں پر مشتمل تھی۔(۵)

---

(۱) ذہبی نے ابوالحسن کے بجائے ابوالحسین لکھا ہے (تذکرہ ج ۳ ص ۲۵۸) (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۴۲ وتذکرہ ج ۳ ص ۲۵۸ وبستان المحدثین ص ۹۲ (۳) ایضاً (۴) ایضاً (۵) الرسالۃ المستطرفہ ص ۷۹۔

☆☆☆

امام ابوبکر بن مردویہ الکبیر اصبہانی

(م ۴۱۶ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن موسیٰ بن مردویہ بن فورک۔(۱)

اپنے دادا مردویہ کے نام پر ابن مردویہ کے لقب سے معروف ہیں، الکبیر بھی ان کے نام کا جز ہے، کیوں کہ ان کے پوتے ابوبکر احمد بن محمد بھی ابن مردویہ کے لقب سے مشہور ہیں اور ان کو ابن مردویہ الصغیر کہا جاتا ہے، ابن مردویہ صغیر کی اپنے دادا ابن مردویہ کبیر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ان کا انتقال ۴۹۸ھ میں ہوا۔

ولادت ووطن: ۳۲۳ھ میں اصبہان میں پیدا ہوئے۔(۲)

اساتذہ: بعض اساتذہ وشیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوسہل بن زیاد القطان، احمد بن عبداللہ بن دلیل، احمد بن عیسیٰ خفاف، احمد بن محمد بن عاصم کرمانی، اسحاق بن محمد بن علی کوفی، اسماعیل خطی، محمد بن احمد بن علی اسواری، محمد عبداللہ بن علم الصفار، محمد بن علی بن دحیم شیبانی اور میمون بن اسحاق خراسانی۔

تلامذہ: ابن مردویہ کبیر کے ممتاز شاگردوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

ابوعبداللہ ثقفی، ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن مندہ، عبدالوہاب بن مندہ، ابوالخیر محمد بن احمد ردا، ابوبکر محمد بن حسن، ابومنصور محمد بن سکرویہ، ابومطیع محمد بن عبدالواحد مصری۔(۳)

---

(۱) المنتظم ج ۷ ص ۲۹۴ والبدایہ ج ۱۲ ص ۸ (۲) تذکرہ ج ۳ ص ۲۵۳ (۳) ایضاً۔

سفر: حدیث کی تحصیل اور علوم وفنون کی تکمیل کے لیے ان کے عراق وغیرہ تشریف لے جانے کا ذکر ملتا ہے۔

حدیث میں درجہ: حدیث میں بلند مرتبت تھے، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ وہ اس فن کے ممتاز ماہر اور رجال کی اچھی پرکھ رکھتے تھے، ابن عماد کا بیان ہے کہ وہ حدیث میں ماہر اور اس کے واقف کار تھے، ان کا حفظ واتقان اور ضبط وثقاہت بھی مسلم ہے، حافظ ذہبی نے الحافظ الثبت لکھا ہے۔ (۱)

وفات: مشہور روایت کے مطابق ۲۴ رمضان ۴۱۶ھ کو انتقال ہوا (۲) لیکن ابن اثیر، ابن جوزی اور ابن کثیر نے ۴۱۰ھ سنہ وفات تحریر کیا ہے۔ (۳)

تصنیفات: ابن مردویہ کی حسب ذیل تصنیفات کا علم ہو سکا ہے۔

۱۔ المستخرج علی جامع الصحیح البخاری۔ ۲۔ تفسیر ابن مردویہ۔ ۳۔ تاریخ اصبہان۔ (۴)

☆☆☆

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۵۳ وشذرات الذہب ج ۳ ص ۱۹۰ (۲) تذکرہ وبستان المحدثین (۳) تاریخ ابن اثیر ج ۹ ص ۱۰۸، المنتظم ج ۷ ص ۲۹۴، البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۸ (۴) مولانا عبدالحلیم چشتی نے غلطی سے ان کی ایک تصنیف الجامع المختصر فی الطب کا ذکر کیا ہے، فوائد جامعہ ص ۸۴ حالانکہ یہ احمد بن عبدالرحمن مندویہ اصبہانی کی تصنیف ہے، دیکھئے کشف الظنون ج ۱ ص ۳۸۵۔

امام ابوبکر احمد بن محمد برقانی خوارزمی

(متوفی ۴۲۵ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن محمد بن احمد بن غالب۔

ولادت ووطن: امام ابوبکر برقانی ۳۳۶ھ میں خوارزم کے نواح کے ایک گاؤں برقان میں پیدا ہوئے، اسی لیے برقانی اور خوارزمی کی نسبتوں سے مشہور ہیں، برقان دریائے جیحون کے مشرقی ساحل پر ایک زرخیز اور شاداب مقام تھا پھر ویران ہوگیا(۱) اور امام برقانی نے دریائے بغداد میں سکونت اختیار کرلی اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

اساتذہ: ان کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، بعض کے نام یہ ہیں:

ابن نحاس مصری، ابواحمد الحافظ، ابوبحر بن کوثر البربھاری، ابوبکر احمد بن ابراہیم اسماعیلی، احمد بن ابراہیم بن حباب، احمد بن جعفر بن سلمہ، ابوالعباس احمد بن محمد بن حمدان نیشاپوری، ابوبکر ابن ابی الحدید، ابوبکر بن مالک قطیعی، ابومحمد بن ماسی، ابومنصور ازہری، ابوسہیل بشر بن احمد، ابومحمد عبدالغنی ابن سعید ازدی مصری، عبداللہ بن احمد بن صدیق، عبداللہ بن عمر بن علک، ابوالحسن علی بن عمر دارقطنی، ابوعلی محمد بن احمد بن حسین بن صواف، ابوعمرو محمد بن احمد بن حمدان، محمد بن جعفر بن ہثیم بندار، ابوالفضل محمد بن عبداللہ بن خمیرویہ، محمد بن علی حسانی، ابوصخر محمد بن مالک، السعدی، ابوحاتم محمد بن یعقوب۔ (۲)

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں ابواسحاق شیرازی، امام بیہقی اور خطیب جیسے مشاہیر شامل ہیں،

(۱) کتاب الانساب ورق ۷۵ ومعجم البلدان ج ۲ ص ۱۳۱ (۲) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۷۳ و ۳۷۴، کتاب الانساب ورق ۷۵ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۷۴ والطبقات الکبری ج ۲ ص ۱۹۔

چند اور شاگردوں کے نام یہ ہیں:

ابوطاہر احمد بن حسن کرجی، ابوعبداللہ صوری، ابوالفضل بن خیرون، ابوالقاسم بن ابوالعلاء ابوالمعالی ثابت بن بندار مقری، ابومسعود سلیمان بن ابراہیم الحافظ، ابویعلی محمد بن احمد العبدی البصری، ابوالفضل محمد بن عبدالسلام شافعی انصاری۔ (۱)

رحلت وسماع حدیث کی ابتدا: ۳۵۰ھ کے بعد انھوں نے حدیث کے سماع کی ابتدا کی اور اس کے بعد بغداد، جرجان، ہرات، دمشق، مصر، اسفرائن، مرو اور نیشاپور وغیرہ تشریف لے گئے اور ان مقامات کے اکابر شیوخ سے کسب فیض کیا، علم وفن کے اس قدر شوقین تھے کہ اس کے لیے ہر قسم کی صعوبت اور مشقت برداشت کرتے تھے، اسفرائن میں صرف ایک درہم ان کے پاس تھا، اسی پر پورا مہینہ گذار دیا، اور تیس جز کے بقدر حدیثیں لکھیں۔ (۲)

حفظ وثقاہت: امام برقانی احادیث کے حافظ اور نہایت عادل وضابط شخص تھے، خطیب کا بیان ہے کہ وہ ثقہ، متورع، متقن، متثبت اور ذی فہم تھے، ہمارے شیوخ میں ان سے زیادہ ثقہ وثابت شخص کوئی نہیں تھا، میں نے ازہری سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے برقانی سے بڑھ کر متقن کسی شخص کو دیکھا ہے، انھوں نے جواب دیا نہیں، ابوالولید باجی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ حافظ تھے، ذہبی، ابن عساکر، ابن سبکی، اسنوی اور ابن عماد وغیرہ۔ نے ان کو الحافظ الکبیر اور الحافظ الامام وغیرہ لکھا ہے۔ (۳)

فن حدیث میں امتیاز اور اس سے غیر معمولی اشتغال: امام برقانی۔ نے اس فن کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنالیا تھا، ان کا خود بیان ہے کہ مجھ کو اس فن سے اس قدر غیر معمولی لگاؤ ہو گیا تھا کہ اور چیزوں کی طرف دھیان دینے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا، اسی لیے ان کا کتب خانہ حدیث کے کتابوں کا دفتر بن گیا تھا اور ان کو بیشمار حدیثیں بھی ازبر تھیں، خطیب کا بیان ہے کہ وہ کثیر الحدیث تھے، اس سے اس فن میں ان کی عظمت اور بلند پائیگی کا اندازہ ہوتا ہے، تمام مورخین نے حدیث میں ان کی فہم وبصیرت، ژرف نگاہی اور علم ونظر کی وسعت کا اعتراف

(۱) تذکرہ ج ۳ ص ۲۷۴ وانساب سمعانی ورق ۷۵ (۲) ایضاً والعبر ج ۳ ص ۱۵۶ (۳) حوالہ سابقہ۔

کیا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ برقانی حدیث کی اچھی فہم وبصیرت رکھتے تھے، ابن عساکر اور سمعانی کا بیان ہے کہ وہ حدیث کی فہم ومعرفت میں ممتاز تھے، ابواسحاق شیرازی فرماتے ہیں کہ جب وہ اس فن کی جانب متوجہ ہوئے تو اس کے امام بن گئے، ذہبی نے ان کو شیخ بغداد اور شیخ المحدثین کا لقب دیا ہے، ازہری کا بیان ہے کہ برقانی امام حدیث ہیں اور ان کی وفات کے بعد اس فن کی عظمت شان باقی نہیں رہے گی۔(۱)

تفسیر وقرآنیات: قرآن مجید کے حافظ اور علوم قرآنی کے واقف کار تھے۔(۲)

فقہ: فقہ کے ماہر اور ممتاز فقیہ تھے، حدیث سے پہلے اس فن کی تحصیل شروع کی تھی اور اس موضوع پر بعض کتابیں بھی لکھیں خطیب نے عارف بالفقہ، ابن کثیر نے عالم بالفقہ اور ذہبی نے شیخ الفقہا لکھا ہے، ابوبکر اسمٰعیلی اپنے پاس آنے والے طلبہ کے سامنے ایک ورق خود پڑھنے کے بعد ان سے پڑھواتے تھے لیکن برقانی کے سامنے دو ورق پڑھتے اور فرماتے کہ تم لوگوں پر ان کو اس لیے ترجیح دیتا ہوں کہ یہ فقیہ بھی ہیں، فقہ واجتہاد میں امام شافعی کے مذہب سے وابستہ تھے۔(۳)

نحو وعربیت: وہ عربی ادب اور علم نحو میں اچھی دسترس رکھتے تھے۔(۴)

شعروسخن: شعروسخن کا ذوق تھا اور کبھی کبھی اشعار کہتے تھے، خطیب نے ان کے آٹھ اشعار نقل کئے ہیں،(۵) ان کے شعروں سے بھی حدیث سے ان کی مناسبت کا پتہ چلتا ہے۔

ورع وتقویٰ: ان گوناگوں علمی کمالات کے ساتھ ہی وہ نہایت متدین اور بڑے عبادت گذار بھی تھے، خطیب کا بیان ہے کہ وہ صاحب ورع وتقویٰ تھے، میں نے محمد بن یحییٰ کرمانی فقیہ سے سنا ہے کہ محدثین کی جماعت میں برقانی سے زیادہ عبادت کرنے والا نہیں

(۱) البدایہ والنہایہ ج۱۲ص ۳۶ (۲) تاریخ بغداد ج۴ص ۳۷۴و ۳۷۵ وتاریخ ابن عساکر ج۱ص ۶ ۳ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۷۴ و ۲۷۵ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۹ (۳) ایضاً (۴) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۷۵، ۳۷۶ (۵) ایضاً۔

دیکھا، ابن سبکی فرماتے ہیں کہ وہ مجموعہ فضائل اور عابد شخص تھے۔(۱)

وفات: یکم رجب ۴۲۵ھ کو بدھ کے دن انتقال ہوا اور پنجشنبہ کو تدفین ہوئی، ابوعلی بن ابی موسیٰ ہاشمی نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور بغداد کے مقبرہ جامع میں باب سکہ خرقی کے قریب دفن کئے گئے۔

محمد بن علی صوری کا بیان ہے کہ میں برقانی کی وفات سے چار روز پہلے ان کی عیادت کے لیے گیا تو انھوں نے کہا آج ۲۶؍جمادی الاخریٰ ہے، میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ رجب کا چاند ہونے کے بعد میرا خاتمہ ہو، کیوں کہ ایک روایت میں ہے کہ (ان اللّٰہ عتقاء من النار) ممکن ہے اللہ کی رحمت سے میں بھی اس زمرہ میں شامل ہو جاؤں، یہ بات انھوں نے سنیچر کو کہی تھی اور اللہ کی شان دیکھئے کہ بدھ کو رجب کا چاند ہونے کے بعد ان کا انتقال ہوا۔(۲)

تصنیفات: برقانی نے علم حدیث میں کئی مفید کتابیں لکھیں، تذکرہ نگاروں نے ان کو کثیر التصانیف بتایا ہے اور لکھا ہے کہ وفات کے وقت تک وہ تصنیف وتالیف اور علمی اشغال میں منہمک رہے، ان کی تصنیفات میں مسند مشہور ہے جو مسند خوارزمی کہلاتی ہے، مسند خوارزمی دراصل صحیحین کی حدیثوں پر مشتمل اور مستخرج ہے،(۳) حمیدی نے اپنی الجمع بین الصحیحین کے نقل میں اس کی حدیثوں پر اعتماد کیا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ ۱۱۷۸ھ کا لکھا ہوا دارالعلوم اسلامیہ پشاور کے اور ایک یحییٰ بن ناصر کے ہاتھ کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں ہے۔(۴)

مسند کے علاوہ انھوں نے امام ثوری، شعبہ، ایوب، سعید، عبداللہ بن عمر، عبدالملک بن عمیر، بیان بن بشر اور مطر الوراق کی حدیثوں کے جمع وتالیف کا کام انجام دیا۔(۵)

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۷۵ و ۳۷۶ (۲) ایضاً (۳) ایضاً والرسالۃ المستطرفۃ ص ۲۷ (۴) لباب المعارف فہرست دارالعلوم پشاور ص ۵۲ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵ (۵) تاریخ بغداد وتاریخ ابن عساکر وتذکرہ ذہبی۔

امام ابونعیم اصفہانی

(متوفی ۴۳۰ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابونعیم کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، احمد بن عبداللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن وائل بن مہران۔

ولادت: رجب ۳۳۶ھ میں اصفہان میں پیدا ہوئے، ایک روایت ۳۳۴ھ کی بھی ہے۔

خاندان: گو عجم نژاد تھے تاہم ان کے خاندان کو خانوادہ نبوت سے ولاء کا شرف حاصل ہے، ان کے جد اعلیٰ مہران کو اس خاندان میں سب سے پہلے مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہوا، یہ عبداللہ ابن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابوطالب کے مولیٰ تھے، ابونعیم کے والد عبداللہ علم وفن کے بڑے دلدادہ تھے، انھوں نے اپنے فرزند کو نہایت کم سنی ہی میں تحصیل علم اور سماع حدیث کے مقدس اور بابرکت مشغلہ میں لگا دیا تھا، چنانچہ ۳۴۴ھ میں ابونعیم نے جب کہ سات یا آٹھ ہی سال کے تھے، احادیث کا باقاعدہ سماع شروع کر دیا تھا، ان کے نانا محمد بن یوسف بناء مشہور زاہد اور ممتاز صوفی تھے۔(۱)

اساتذہ: ابونعیم کے اساتذہ اور تلامذہ دونوں کی فہرست بڑی طویل ہے، ارباب سیر کا بیان ہے کہ انھوں نے بیشمار فضلا سے اور بے شمار فضلا نے ان سے استفادہ کیا تھا، حافظ ذہبی ان کے چند شیوخ کا نام گنانے کے بعد لکھتے ہیں:

وخلائق بخراسان والعراق	(ان کے علاوہ) انھوں نے خراسان
فاكثروتهياء له من لقى	وعراق کے بے شمار لوگوں سے کسب

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۵ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۱ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷ و ۸۔

الکبار مالم یقع حافظ.(۱)

فیض کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان کو جس قدر اکابر شیوخ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس سے اور محدثین محروم ہیں۔

ابونعیم کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ چھ سال کی عمر ہی میں بعض مشہور ومعتبر محدثین نے تبرکاً ان کو اجازتِ حدیث مرحمت کردی تھی۔(۲) حافظ ذہبی اور علامہ ابن سبکی نے لکھا ہے کہ شام کے خیثمہ بن سلیمان بغداد کے جعفر خالدی اور ابوسہل بن زیاد، واسط کے عبداللہ بن عمر بن شوذب اور نیشاپور کے ابوالعباس اصم نے ان کو اجازت عطا کی تھی۔(۳)

ان حضرات کے علاوہ ابونعیم نے مندرجہ ذیل شیوخ سے بھی روایت کی ہے۔

ابراہیم بن عبداللہ ابوالعریم کوفی، ابواحمد محمد بن احمد بن عسال، ابوبحر بن کوشی، ابوبکر آجری، ابوبکر جعانی، ابوبکر بن خلاد نصیبی، ابوبکر بن ہیثم بندار، ابوشیخ بن حیان، ابوعلی بن صواف، ابوالقاسم طبرانی، ابومحمد بن فارس، احمد بن بندار عشار، احمد بن حسن مکی، احمد بن محمد قصار، احمد بن معبد سمسار، حبیب قزاز، عبداللہ بن جعفر جابری، عبداللہ بن حسن بن بندار فاروق بن عبدالکبیر خطابی۔(۴)

تلامذہ: معاصرین واقران کے علاوہ ان کے تلامذہ کی فہرست میں بے شمار ایسے لوگ بھی تھے جو سن وسال میں ان سے بڑے اور مدتوں پہلے فوت ہو چکے تھے، ابوعبدالرحمٰن سلمی نے جو اکابر صوفیہ میں اور ابونعیم سے معمر تھے، طبقات الصوفیہ میں ایک شخص کے واسطہ سے ان سے روایت کی ہے چند تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر خطیب (یہ نہایت مخصوص تلامذہ میں تھے) ابوبکر بن علی ذکوانی، ابوسعید مالینی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۲ (۲) بستان المحدثین ص ۴۳ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۱ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷ (۴) ایضاً۔

ابوصالح موذن، ابوعلی المقری، ابوعلی وحشی، ابوالفضل احمد الحداد، ابوعلی حسن بن احمد حداد، سلیمان بن ابراہیم، قاضی عبدالسلام بن احمد کوشیار بن لیالیروزجیلی، ابوبکر محمد بن ابراہیم عطار، ابومنصور محمد بن عبداللہ شروطی، ابوسعید محمد بن محمد بن مطرز، ہبۃ اللہ بن محمد شیرازی، یوسف بن حسن تفکری۔(۱)

رحلت وسفر: ان کے شیوخ مختلف اسلامی ملکوں اور شہروں سے تعلق رکھتے تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے عراق، حجاز، خراسان، شام، بغداد، واسط، نیشاپور، مکہ، بصرہ اور کوفہ وغیرہ کا سفر کیا ہوگا۔

حفظ وضبط اور ثقاہت: ابونعیم کے حفظ وضبط اور ثقاہت وعدالت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مورخین اور ارباب سیر نے ان کو الحافظ المشہور، الحافظ الکبیر اور من اکابر الحفاظ الثقات وغیرہ لکھا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ ابونعیم اور ابوحازم عبدوی ہی کے لیے حفظ کا لفظ مطلقاً بولا جاسکتا ہے، ابن مردویہ فرماتے ہیں کہ اس وقت روئے زمین پر ابونعیم سے بڑا حافظ ومسند کوئی نہیں، وہ حافظ الدنیا ہیں، ابن سبکی تحریر فرماتے ہیں کہ وہ حفظ وضبط میں مرتبہ کمال پر فائز تھے۔(۲)

ابونعیم صدق وثقاہت میں بھی بلند پایہ تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ان کے بارے میں جو کچھ کلام کیا گیا ہے اس کی کوئی دلیل وبنیاد نہیں بلکہ اس کی تمام تر وجہ وہ مخاصمت ہے جو ان کے اور ابن مندہ کے درمیان تھی۔(۳)

حدیث میں درجہ ومرتبہ: وہ فن حدیث میں بڑا درخور رکھتے تھے، علمائے سیر نے ان کو محدث العصر اور من اعلام المحدثین والرواۃ کے لقب سے موسوم کیا ہے، ابن نجاد کا بیان ہے کہ "وہ محدثین کے سرتاج اور اعلام دین میں تھے" حدیث کی جمع وروایت کی طرح اس کی

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۲۹۲ وطبقات الشافعیہ ج ۳ص ۸ (۲) ایضاً وتاریخ ابن خلکان ج ۱ص ۴۵ (۳) میزان الاعتدال ج ۱ص ۵۲۔

معرفت ودرایت میں بھی شہرت وامتیاز رکھتے تھے، ابن سبکی کا بیان ہے کہ ''وہ ان ممتاز لوگوں میں تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے روایت میں علو کے ساتھ درایت میں بھی حد کمال پر فائز کیا تھا،'' حافظ ذہبی لکھتے ہیں ''وہ علوئے اسناد، حفظ حدیث اور جملہ فنون حدیث میں تبحر کے لحاظ سے پوری دنیا میں ممتاز تھے۔'' ابن عساکر فرماتے ہیں کہ ''ابونعیم جمع ومعرفتِ حدیث میں یکتا اور فضائل وکمالات کا مجموعہ تھے۔''(۱)

فقہ وتصوف میں بلند پائیگی: حدیث کے علاوہ فقہ وتصوف میں بھی جامع کمال تھے(۲) اور مسلکاً شافعی تھے، تصوف وسلوک سے ان کی دلچسپی خاندانی تھی، ان کے نانا محمد بن یوسف کے متعلق پہلے گذر چکا ہے کہ وہ مشہور اہل اللہ اور اکابر صوفیہ میں تھے، ابونعیم کو بھی اس میں کمال حاصل تھا، اس پر ان کی شہرۂ آفاق کتاب حلیۃ الاولیا شاہد ہے۔

عقیدہ: عقائد میں اشاعرہ کے ہم نوا تھے، حافظ ابن عساکر نے تبیین میں دوسرے طبقہ میں ان کا ذکر کیا ہے،(۳) حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ وہ اشعری مذہب کی جانب شدید میلان رکھتے تھے۔(۴)

شہرت ومقبولیت اور مجلس درس کی وسعت: ابونعیم کے علمی کمالات اور غیر معمولی فنی شہرت نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنادیا تھا، اس لیے ان کی مجلس درس بڑی وسیع تھی، لوگ دور دراز کا سفر کرکے ان کے پاس آتے، طلبہ کا جم غفیر ہر وقت استفادہ کے لیے موجود رہتا تھا، ہم عصر لوگوں کے علاوہ وہ لوگ بھی ان سے استفادہ کرنے کے لیے آتے تھے جو عمر میں ان سے بڑے تھے، ابن مردویہ کا بیان ہے کہ وہ ان فضلائے روزگار میں تھے جن کے پاس لوگ قصد وارادہ سے سفر کرکے آتے اور مستفید ہوتے تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۳ ص۲۹۱ و۲۹۲ و۲۹۳ وطبقات الشافعیہ ج۳ ص۷و۸ وتبیین کذب المفتری ص۲۴۶ والعبر ج۳ ص۱۷۰ (۲) طبقات الشافعیہ ج۳ ص۷ (۳) تبیین کذب المفتری ص۲۴۶ (۴) المنتظم ج۸ ص۱۰۰۔

لکھتے ہیں کہ جب ان کی مجلس درس آراستہ ہوتی تو ارباب فن اور محدثین عجز و نیاز کے ساتھ ان کے دولت کدہ پر حاضر ہو کر بڑی رغبت اور مکمل انہماک کے ساتھ اکتساب فیض کرتے تھے کیوں کہ ان کے علوے اسناد جودتِ حفظ اور وفورِ علم کا چرچا تھا۔

درس کا سلسلہ صبح سے شروع ہو کر ظہر کے وقت تک جاری رہتا تھا اور مجلس درس ہمیشہ طلبہ و مستفیدین سے معمور رہتی تھی، روزانہ باری باری ایک شخص قرأت کرتا تھا، ظہر کے وقت جب مجلس برخاست ہوتی اور وہ گھر آنے لگتے تو شائقین راستے میں بھی ایک جزء کے بقدر پڑھ لیتے تھے، اس سے ان کو کوئی آزردگی اور ناگواری نہیں ہوتی تھی، کیوں کہ علم حدیث سے ان کا اشتغال اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ بقول حافظ ذہبی۔

لم یکن لہ غداء سوی التسمیع و التصنیف۔ (۱)	حدیثیں سنا اور سنانا اوران کی جمع و تالیف ہی ان کی غذا تھی۔

ابو نعیم کے خلاف شورش و ہیجان: اس زمانہ میں حنابلہ کا زور و اثر بہت بڑھ گیا تھا، ان کی سخت گیری اور تشدد کے بعض واقعات بھی تاریخوں میں مذکور ہیں، ان کے اور اشاعرہ کے درمیان سخت کشمکش اور آویزش رہتی تھی، اوپر گذر چکا ہے کہ ابو نعیم کا میلان اشعریت کی جانب تھا، اس کے نتیجہ میں ان کے خلاف شورش و ہنگامہ برپا ہوا اور ان کو شدائد و محن سے دوچار ہونا پڑا، محمد بن عبدالجبار فرسانی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ابوبکر بن ابوعلی معدل کی مجلس درس میں ایک شخص نے کہا کہ ابو نعیم کی صحبت میں جانے والوں کو یہاں سے اٹھ جانا چاہیے کیوں کہ وہ اپنے اعتقادات کی وجہ سے ان لوگوں میں غیر مقبول اور مبغوض تھے۔

ابو نعیم کے خلاف اس قدر ہیجان برپا ہو گیا تھا کہ اہل صفہان نے ان کا جامع مسجد میں داخلہ تک بند کر دیا تھا، (۲) حنابلہ کی شدت پسندی کے علاوہ اس کا یہ سبب بھی ہو سکتا

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۲ و بستان المحدثین ص ۴۴ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۳، ۲۹۴ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۹۔

ہے کہ ابونعیم کے فضل وکمال اور غیر معمولی شہرت ومقبولیت نے ان کی ذات کو محسود ومبغوض بنادیا ہو۔

وفات: ۹۴ رسال کی عمر میں محرم الحرام ۴۳۰ھ میں انتقال کیا، ابن خلکان نے محرم کے بجائے صفر کا مہینہ لکھا ہے، تاریخ وفات ۱۸، ۲۰ اور بعض نے ۲۱ محرم الحرام لکھی ہے، ظہر کے بعد تجہیز وتکفین ہوئی۔ (۱)

تصنیفات: ابونعیم سے بے شمار کتابیں یادگار ہیں، جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

۱- کتاب الاربعین ۲- تثبیت الرؤیا، ۳- جزء فضل سورۃ الاخلاص، ۴- کتاب حرمۃ المساجد، ۵- رسائل مختصرہ، ۶- ریاضۃ المتعلمین یا ریاض المتعلم، ۷- کتاب الریاضۃ والادب، ۸- کتاب صفۃ الجنۃ، ۹- کتاب الطب یا کتاب الطب النبوی، ۱۰- طرق حدیث (ان اللہ تسعا وتسعین اسما)، ۱۱- عمل الیوم واللیلہ (۲)، ۱۲- کتاب الفتن (۳)، ۱۳- کتاب فضائل الخلفاء، ۱۴- کتاب فضائل الصحابہ، ۱۵- فضل السواک، ۱۶- کتاب فضل العالم العفیف، ۱۷- کتاب الفوائد، ۱۸- کتاب مختصر الاستیعاب، ۱۹- کتاب المستخرج علی البخاری، ۲۰- کتاب المعتقد، ۲۱- کتاب معرفۃ الصحابہ، ۲۲- کتاب معجم الشیوخ: ۳ جلدوں پر مشتمل تھی، ۲۳- کتاب معجم الصحابہ: حافظ ابن کثیر کے پاس اس کا ایک نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ (۴)

۲۴- کتاب علوم الحدیث: حاکم کی اصول حدیث میں مشہور تصنیف کتاب معرفۃ علوم الحدیث پر مستخرج ہے۔

۲۵- کتاب المستخرج علی التوحید: علامہ ابن خزیمہ کی مشہور کتاب التوحید

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۳، ۲۹۴ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۹ وتاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۵ والمنتظم ج ۸ ص ۱۰۰ (۲) امام نسائی اور ان کے شاگرد ابن سنی کی بھی اس نام کی کتابیں ہیں (۳) کتاب الفتن والملاحم کے نام سے امام ابوعبداللہ نعیم بن حماد خزاعی کی کتاب بہت مشہور ہے (۴) البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۴۵۔

والصفات پر مستخرج ہے۔

۲۶- کتاب المہدی: اس میں امام مہدی کے اوصاف وخصائص اور ان کے خروج کی حقیقت وغیرہ کا ذکر ہے، حافظ ابن قیم کی بھی اس نام کی ایک کتاب ہے۔(۱)

۲۷- کتاب تاریخ اصبہان: اصبہان کی تاریخ میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ ان سب میں زیادہ اہم اور مشہور سمجھی جاتی ہے، اس کے قلمی نسخے مکتبہ شیخ الاسلام مدینہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد مکتبہ سندیہ اور کتب خانہ رام پور میں موجود ہیں، رام پور کا مخطوطہ مکتبہ سندیہ کے مخطوطہ سے منقول ہے۔(۲)

یہ غیر مطبوعہ کتابوں کے نام تھے، ذیل میں مطبوعہ کتابوں کا مختصر تعارف اور ان کی خصوصیات درج ہیں۔

۲۸- دلائل النبوۃ: اس کتاب میں وہ تمام واقعات وروایات سنداً بیان کی گئی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص وکمالات اور فضائل ومکارم نیز دلائلِ نبوت اور معجزات وغیرہ سے متعلق ہیں، پہلے قرآن مجید کی روشنی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف وخصوصیات بیان کئے گئے ہیں اور تائید میں روایات بھی پیش کی گئی ہیں، پھر آپ کے حسب ونسب کی فضیلت اور قدیم کتابوں اور انبیا کے صحیفوں میں آپ کے بارے میں جو پیشینگوئیاں ہیں ان کو ذکر کیا ہے اور اس کے بعد آپ کی ولادت سے وفات تک کے تمام حیرت انگیز واقعات اور معجزات اور آپ کی پیشنگوئیاں اور امورِ غیب سے متعلق خبروں کا مفصل ذکر ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید اور خود آپ کی پاکیزہ زندگی اور عمدہ سیرت واخلاق تھے، ان دونوں کی حیرت انگیز تاثیر نے بے شمار لوگوں کے قلوب کو مسخر کر کے ان کو حلقہ بگوش اسلام کر دیا تھا، امام ابو نعیم نے اس طور پر ایمان لانے

(۱) روضات الجنات ص ۷۶ وکشف الظنون ج ۲ ص ۳۰۴ (۲) تذکرۃ النوادر ص ۸۳۔

والے متعدد افراد کے مکمل واقعات تحریر کیے ہیں، اس حیثیت سے یہ صرف دلائل ومعجزات نبوی ہی کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ عہد نبوی کے مختلف النوع اہم واقعات وحالات اور بعض غزوات وسرایا کا مکمل مرقع بھی ہے، مصنف نے بعض واقعات کی تفصیل اور ان کے دلائل وعلائم کی نوعیت وغیرہ بھی بیان کر دی ہے اور بعض شبہات واشکالات کو بھی رفع کیا ہے، آخر میں بعض مشہور انبیائے کرام اور رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے معجزات کا تقابلی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے، اس میں بعض جلیل القدر انبیاء کے خاص اور اہم معجزات کا تذکرہ کرنے کے بعد دکھایا گیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی نوعیت کے معجزات عطا کیے گئے تھے۔ گوفنی حیثیت سے اس کی تمام حدیثوں اور روایتوں کا معیار یکساں نہیں ہے، تاہم اس کا شمار معتبر کتابوں میں ہوتا ہے اور اس کے اکثر اہم واقعات حدیث وسیر کی کتابوں میں موجود ہیں۔

دلائل النبوۃ کا پہلا ایڈیشن ۱۳۲۰ھ میں اور دوسرا زیادہ جامع اور مکمل صورت میں ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع ہوا ہے، اس کی ترتیب وتصحیح میں بعض قلمی نسخوں کے علاوہ حدیث، سیر وتاریخ اور اسماء الرجال کی مشہور کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۲۹- حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء: یہ ابونعیم کی سب سے مشہور ومقبول عمدہ اور بے نظیر کتاب ہے، علامہ ابن خاکان نے اس کو بہترین اور صاحب کشف الظنون نے عمدہ اور معتبر کتاب بتایا ہے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ ایسی عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی، علامہ ذہبی نے اس کو عدیم النظیر کتاب بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ مصنف کی زندگی ہی میں اس کو پوری شہرت اور غیر معمولی حسنِ قبول واعتبار حاصل ہو گیا تھا اور یہ اسی زمانہ میں جب نیشاپور پہنچی تو لوگوں نے چار سو دینار میں اسے خریدا، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ اسلامیات میں ایسی نادر اور بے مثال کتاب نہیں لکھی گئی، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ اس سے مصنف کی وسعت نظر، ان کے شیوخ کی کثرت اور مخارج وطرق حدیث سے پوری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ طبقات صوفیہ میں یہ نہایت اہم اور عمدہ کتاب ہے، اس سے پہلے جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کو ایسی شہرت وقبولیت نصیب نہیں ہوئی، بعد کی کتابوں میں حافظ ابن جوزی کی صفوۃ الصفوہ گو اہم اور مشہور کتاب ہے لیکن دراصل اس کی بنیاد و ماخذ یہی ہے۔

حلیۃ الاولیاء میں ان صحابہ کرم، تابعین عظام، تبع تابعین اور مابعد کے ائمہ اعلام و متقین کا ذکر ہے جو زہد ونسک اور معرفت وتصوف میں ممتاز اور صاحب کمال تھے، مصنف نے ان بزرگوں کے فضائل ومناقب خصوصاً ان کے زہد ونسک سے متعلق واقعات وحکایات جمع کر کے ان کا تصوف میں درجہ ومرتبہ بھی دکھایا ہے اور ان سے مروی حدیثیں اور ان کے عارفانہ اقوال وملفوظات بھی درج کئے ہیں، پہلے خلفائے اربعہ اور بقیہ صحابہ مبشرہ اور ان کے بعد دوسرے عارف وزاہد صحابہ کرام کا تذکرہ ہے، پھر اصحاب صفہ اور عابدہ وزاہدہ صحابیات کا علاحدہ علاحدہ ذکر ہے، صحابہ کے بعد تابعین وتبع تابعین وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں اولیاء اللہ کے فضائل ومحامد، ان کے اوصاف وکمالات اور تصوف کی حقیقت وغیرہ پر لطیف بحث ہے، اصحاب فن نے اس کے طول اسناد، روایات وحکایات کے تکرار اور موضوع سے غیر متعلق بعض چیزوں کے ذکر کئے جانے پر نقد کیا ہے(۱)، اس میں امام ابوحنیفہؒ کا تذکرہ شامل نہ کئے جانے کی وجہ سے ان پر تعصب کا الزام عائد کیا گیا ہے، علاوہ ازیں یہ صحیح، حسن، ضعیف اور بعض موضوع روایتوں پر بھی مشتمل ہے۔ (مستطرفہ ص ۱۱۵)

حلیۃ الاولیاء کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ بعد میں لکھی جانے والی اکثر کتابوں کا یہی ماخذ ہے اور اس کے زوائد ومختصرات بھی لکھے گئے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- ابوالحسن نورالدین ہیثمی نے حدیث کی متعدد کتابوں کی طرح اس کے زوائد

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۴۵۲ و ۴۵۳۔

بھی ایک ضخیم جلد میں جمع کیے تھے۔(۱)

۲- ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی جوزی (م ۵۹۷ھ) نے صفوۃ الصفوہ کے نام سے اس کا نہایت عمدہ اختصار اس طرح کیا ہے کہ وہ مستقل کتاب ہوگئی ہے، اس میں انھوں نے ابونعیم پر نقد وتعقب بھی کیا ہے، اس کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، اس کا بھی احاسن المحاسن کے نام سے اختصار کیا گیا تھا۔(۲)

۳- محمد بن حسن شافعی (م ۷۷۶ھ) نے مجمع الاخبار فی مناقب الاخیار کے نام سے اختصار کیا اس میں نہ حلیہ کی طرح زیادہ طوالت ہے اور نہ صفوہ کی طرح زیادہ اختصار، اس کی ترتیب میں حلیہ کا تتبع کیا گیا ہے اور بعض تراجم کا اضافہ بھی ہے۔

ابن مرزوق ابوالمعالی سعد بن علی وراق خطیری (م ۵۲۸ھ) نے بھی مختصرات لکھے تھے۔(۳)

ابونعیم پر بعض اعتراضات: امام ابونعیم پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں گو یہ زیادہ اہم نہیں ہیں، تاہم ان کا ذکر کیا جاتا ہے، ان پر سب سے اہم اعتراض تساہل کا عائد کیا گیا ہے، خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ ''میں ان میں تساہل کی بعض چیزیں پاتا ہوں، جیسے اجازت کے سلسلہ میں ان کا تساہل اور مسموع کو مجاز سے ممیز وواضح نہ کرنا۔ عبدالعزیز نخشبی کا بیان ہے کہ ''ابوبکر بن خلاد سے حارث بن ابی اسامہ کی مکمل مسند کا سماع نہ کرنے کے باوجود وہ اس کے تمام حصوں کی روایت کرتے تھے۔''(۴) حافظ ذہبی نے ان بیانات کا جائزہ لے کر ان کی مکمل تردید کی ہے۔(۵)

۲- ابونعیم پر ان کے معاصر اور بلند پایہ محدث امام ابوعبداللہ بن مندہ نے سخت

(۱) تدریب الراوی ص ۲۹ والمستطرفہ ص ۱۴۱ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۴۵۲ و ۴۵۳ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۸۱ و ۴۰۹ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۴ و ۲۹۵ والمنتظم ج ۸ ص ۱۰۰ والبدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۴۵ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۴۔

تنقیدیں کی ہیں لیکن محدثین اور علمائے فن نے ان کو معاصرت پر جو منافرت کی اصلی بنیاد ہے، محمول کر کے ان کو نا قابل اعتنا قرار دیا ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

''ان دونوں بزرگوں میں باہم رنجش تھی، اس لیے ابونعیم پر ابن مندہ کی تنقید لائق التفات نہیں ہوسکتی، وہ ان علمائے اعلام اور ثقہ ومعتبر لوگوں میں تھے جن پر دلیل وحجت کے بغیر ہی کلام کیا گیا ہے، غالباً ابن مندہ کی تنقید کی وجہ یہ ہے کہ خود ابونعیم نے بھی ان پر تنقید کی ہے۔''(۱)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

''گو ابن مندہ کے اعتراضات نہایت سخت ہیں مگر ان دونوں میں کسی کی بات بھی دوسرے کے حق میں قابل قبول نہیں ہوسکتی، دونوں کے اعتبار ووثوق میں کلام نہیں لیکن معاصرین کی ایک دوسرے پر نکتہ چینی قابل اعتنا نہیں ہوتی کیوں کہ وہ حسد وعداوت پر مبنی ہوتی ہے، انبیا وصدیقین کے علاوہ کسی زمانہ کے لوگ بھی اس فتنہ سے محفوظ نہیں رہے۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ (۲)	خداوندا: تو ایمان والوں کے لیے ہمارے دلوں میں کھوٹ نہ بنائیو، خداوندا: تو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

۳- صاحب روضات الجنات نے شیعیت کو بھی ان کی جانب منسوب کیا ہے(۳) لیکن اس بیان میں وہ منفرد ہیں، علاوہ ازیں وہ خود بھی اسی مسلک سے وابستہ تھے، اس لیے ان کا بیان صحیح نہیں ہوسکتا، ابونعیم کی کتابوں سے بھی اس کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی۔

---

(۱) میزان الاعتدال ج۱ص۶۵۲ (۲) لسان المیزان ج۱ص۲۰۱، ۲۰۲ (۳) روضات ص۷۶۔

☆☆☆

ابو محمد حسن خلّال

(م ۴۳۹ھ)

نام ونسب: حسن نام، ابو محمد کنیت اور خلّال لقب ہے، نسب نامہ یوں ہے: حسن بن محمد بن حسن بن علی۔(۱)

ولادت: ۳۵۲ھ میں پیدا ہوئے۔

وطن: دارالسلام بغداد کو ان کے مولد ومنشا ہونے کا فخر حاصل ہے، شروع میں ان کا قیام یہاں کے ایک مشہور اور بڑے محلہ نہر القلائین میں تھا لیکن بعد میں باب البصرہ میں منتقل ہو گئے تھے۔(۲)

اساتذہ: خلّال کے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر بن شاذان، ابوبکر قطیعی، ابوبکر وراق، ابوالحسن بن لوٗ لوٗ وراق، ابوالحسین بن مظفر ابوسعید حرقی، ابوعبداللہ بن عسکری، ابوعمر بن حیویہ، ابوالفتح قواس، ابوحفص عمر بن محمد زیات، ابوعلی محمد بن احمد عطشی۔

تلامذہ: بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر خطیب، ابوالحسین بن طیوری، ابوسعید احمد بن طیوری، جعفر بن احمد سراج، جعفر بن محسن سلماسی، علی بن احمد دینوری اور معمر بن ابی عمامہ الواعظ وغیرہ۔(۳)

حفظ وثقاہت: خلّال حدیث کی معرفت، اس کے حفظ وضبط اور عدالت وثقاہت میں

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰۷ و المنتظم ج ۸ ص ۱۳۲ و بستان المحدثین ص ۹۵ (۲) ایضاً (۳) ایضاً۔

ممتاز تھے، خطیب کا بیان ہے کہ ہم نے خلال سے روایتیں نقل کی ہیں، وہ ثقہ وضابط اور معرفتِ حدیث میں ممتاز تھے، ابن جوزی لکھتے ہیں وہ ثقہ اور عادل تھے اور حدیث کے معاملہ میں واقف کار اور بیدار مغز تھے، محمد بن علی صوری سے مروی ہے کہ میری آنکھوں نے عبدالغنی بن سعید کے بعد ابو محمد خلال بغدادی سے بڑھ کر حدیثوں کا حافظ نہیں دیکھا، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ:

''در حفظ حدیث سر آمد ابنائے روزگار بود۔''	وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں حفظ حدیث کے لحاظ سے نہایت فائق و برتر تھے۔(۱)

وفات: ۸۷ رسال کی عمر میں جمادی الاولیٰ ۴۳۹ھ میں خلال کی وفات ہوئی اور باب حرب کے مقبرہ میں دفن کئے گئے۔(۲)

تصنیفات: ۱- خلال کی تصنیفات میں ان کی مسند زیادہ مشہور ہے، یہ دراصل صحیحین پر مستخرج ہے۔(۳)

حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

خرج المسند على الصحيحين وجمع ابوابا وتراجم كثيرة.(٤)	خلال نے صحیحین پر مستخرج لکھی اور بیشمار ابواب وتراجم جمع کئے۔

۲- کرامت اولیا: شاہ عبدالعزیز صاحب نے خلال کی تصنیفات میں اس کا بھی ذکر کیا ہے۔(۵)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰۷ والمنتظم ج ۸ ص ۱۳۲ وبستان المحدثین ص ۹۵ (۲) ایضاً (۳) الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۷ (۴) العبر ج ۳ ص ۱۸۹ (۵) بستان المحدثین ص ۹۵۔

امام ابوعبداللہ قضاعی

(المتوفی ۴۵۴ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوعبداللہ کنیت، شہاب الدین لقب اور نسب نامہ یہ ہے: محمد بن سلامہ بن جعفر بن علی بن حکمون بن ابراہیم بن محمد بن مسلم۔ (۱)

وطن وخاندان: قبیلہ بنوقضاعہ سے جو معد بن عدنان یا حمیر کی شاخ ہے خاندانی تعلق اور مصر وطن تھا، خاندان کی نسبت سے قضاعی کہلاتے تھے، سمعانی کا بیان ہے کہ اس نسبت سے بے شمار لوگ مشہور ہیں، متاخرین میں امام ابوعبداللہ قضاعی کا نام قابل ذکر ہے۔ (۲)

اساتذہ وشیوخ: امام قضاعی کے چند اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن بن جہضم، ابوعبداللہ تمیمی، ابومحمد بن نحاس، احمد بن بربال، احمد بن عمر حیری، ابومسلم محمد بن احمد کاتب۔ (۳)

تلامذہ: ان سے استفادہ کرنے والوں میں ابوبکر خطیب، ابونصر بن ماکولا اور حمیدی صاحب الجمع بین الصحیحین جیسے مشاہیر ارباب کمال کے علاوہ ابوعبداللہ رازی، سہیل بن بشر اسفرائنی، ابوسعد عبدالجلیل نیشاپوری اور محمد بن برکات سعید وغیرہ شامل ہیں، سمعانی کہتے ہیں، ابوبکر محمد بن عبدالباقی انصاری نے امام قضاعی سے اجازۃً روایت کی ہے۔ (۴)

رحلت وسفر: طلب علم کے لیے ان کے سفر کا حال معلوم نہیں ہوسکا لیکن وہ مصریوں کے سفیر کی حیثیت سے روم تشریف لے گئے تھے، ابن سبکی لکھتے ہیں کہ یہ عجیب لطف کی بات

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۳ (۲) ایضاً وکتاب انساب ورق ۴۵۷ (۳) ایضاً (۴) ایضاً وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۳۔

ہے کہ اس سفر میں ان کی قسطنطنیہ میں ایک شیخ سے ملاقات ہوئی، ان سے انھوں نے سماع و روایت کی۔(۱)

حدیث: علمائے سیر نے لکھا ہے کہ وہ صاحب کمال محدث تھے، سلفی کا بیان ہے کہ وہ ثقات و اثبات میں تھے۔(۲)

فقہ: فقہ میں زیادہ دستگاہ رکھتے تھے، ان کا فقہائے شافعیہ میں شمار ہوتا ہے، فقہ میں کمال کی بنا پر وہ عہدہ قضا پر فائز تھے۔

تاریخ وتراجم: حدیث وفقہ کی طرح تاریخ وطبقات اور رجال پر بھی اچھی نظر تھی، ان فنون میں ان سے بعض کتابیں یادگار ہیں۔

فضل وکمال: ابن ماکولا کا یہ بیان تمام ارباب سیر نے ذکر کیا ہے کہ وہ متعدد علوم میں جامع تھے، میں نے مصر میں ان کے پایہ کا کوئی شخص نہیں دیکھا۔(۳)

عہدہ قضا: اپنے فضل وکمال کی وجہ سے وہ مصر کے قاضی مقرر کیے گئے اور پھر ترقی کر کے قاضی القضاۃ ہو گئے۔

امامت ومقبولیت: علمائے انساب وطبقات نے ان کو امام لکھا ہے اور ابن سبکی نے مرضی الجملہ کہا ہے، اس سے ان کی مقبولیت ومحبوبیت کا اندازہ ہوتا ہے۔(۴)

مسلک: اوپر گذر چکا ہے کہ وہ فقہائے شافعیہ میں تھے، ابن سبکی نے اسی حیثیت سے طبقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

وفات: انھوں نے ۴۵۴ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، ابن خلکان نے ۱۶؍ ذوقعدہ اور سیوطی نے ۱۷؍ ذوقعدہ تاریخ وفات لکھی ہے، مگر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ذی الحجہ کا مہینہ بتایا ہے، وفات مصر میں جمعرات کو ہوئی اور جمعہ کے دن عصر بعد مصلی نجار میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔(۵)

---

(۱) طبقات سبکی وابن خلکان ج ۲ ص ۲۴۳ (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) ایضاً (۵) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۴۴ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۶۹ وبستان المحدثین ص ۸۴۔

تصنیفات: امام قضاعی کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں:

شہاب الاخبار: اس کا پورا نام شہاب الاخبار فی الحکم والامثال والآداب من الاحادیث النبویہ ہے، یہ کتاب مسند قضاعی اور الشہاب المواعظ والآداب کے نام سے بھی موسوم ہے۔ اس میں حکم وامثال، وصایا وآداب اور مواعظ وغیرہ سے متعلق ایک ہزار چھوٹی چھوٹی حدیثیں بلا سند نقل کی گئی ہیں اور خاتمہ میں ادعیہ کے متعلق دو سو کلمات حدیث درج کیے گئے ہیں، یہ کتاب دس جزوں پر مشتمل اور کلمات حدیث پر مرتب کی گئی تھی لیکن حروف میں ترتیب کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے، اس عمدہ اور لطیف کتاب کی کئی شرحیں اور خلاصے لکھے گئے ہیں اور بعض علما نے تو بعینہ اسی طرز پر اپنی کتابیں مرتب کی ہیں، ان کتابوں میں فردوس الاخبار دیلمی، مشارق الانوار صغانی اور جامع صغیر سیوطی بہت مشہور ہیں، شرحوں اور مختصرات کے نام یہ ہیں:

۱- شیخ نجم الدین الغیطی، محمد بن احمد بن اسکندری (م ۹۸۴ھ) نے شہاب کا خلاصہ کیا۔

۲- ابن اثیر نے ضوء الشہاب کے نام سے مختصر لکھا۔

۳- امام حسن بن محمد صغانی (م ۶۵۰ھ) نے مشارق کی طرح کشف الحجاب عن احادیث الشہاب کے نام سے بھی اس کی عمدہ ترتیب کی۔

۴- امام سیوطی نے جامع صغیر کی ترتیب پر ایک اور کتاب اسعاف الطلاب بترتیب الشہاب کے نام سے لکھی جو اس کا خلاصہ تھی۔

۵- ابوالمظفر محمد بن اسعد معروف بابن حکیم حنفی (م ۵۶۷ھ) نے شہاب کی شرح کی۔

۶- شیخ عبدالرؤف مناوی نے ایک ممزوج شرح لکھی، اس کا نام رفع النقاب عن کتاب الشہاب ہے، امینی نے اسعان الطلاب بشرح ترتیب الشہاب نام بتایا ہے لیکن بعض

فہرستوں میں اسعاف الطلاب بترتیب الشہاب بھی نام درج ہے۔

۷- وحشی محمد بن حسین موصلی کی شرح کا ابراہیم بن عبدالرحمٰن وادیاسی (۵۷۰ھ) نے خلاصہ کیا۔

۸- استاد ابوالقاسم بن ابراہیم وراق عالی نے بھی ایک شرح لکھی۔

۹- ایک شرح کا نام حل الشہاب ہے۔

۱۰- صاحب کشف الظنون نے ایک اور شرح کا بھی ذکر کیا ہے مگر اس کا اور شارح کا نام نہیں لکھا ہے۔(۱) شہاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں ہے۔(۲)

۲- خطط مصر: اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، پہلی کتاب ابوعمر محمد بن یوسف کندی کی اور دوسری قضاعی کی بتائی جاتی ہے۔

۳- دستور الحکم۔

۴- مختصر التاریخ: یہ تراجم القضاعی کے نام سے بھی مشہور اور پانچ جزوں پر مشتمل ہے اس میں مصنف نے ابتدا سے اپنے دور تک کے حالات اختصار کے ساتھ تحریر کیے ہیں۔

۵- کتاب الانباء عن الانبیاء وتواریخ الخلفا: نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں انبیاو خلفا کے حالات وواقعات درج ہوں گے۔

۶- کتاب مناقب الشافعی واخبارہ۔

۷- معجم الشیوخ۔

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷ والرسالۃ المستطرفہ ص ۶۴ (۲) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۶۷۔



گلستان حدیث کے مہکتے گلاب

کیا ہی شاندار اور قابل رشک زندگیاں تھیں ان جلیل القدر اور قسمت کے دھنی انسانوں کی!...... کہ جنہوں نے اپنی زندگی کا محور و مرکز حدیث رسول مقبول ﷺ کو بنائے رکھا۔ ان کی صبحیں اور شامیں قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ کی دلنواز صداؤں میں بسر ہوتیں۔ رسول اللہ سے عملی محبت کا ثبوت یہ ہوتا کہ ان کو آپ کے فرامین بمعہ سند سینکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں حفظ ہوتے۔ دنیا ان کے حافظے سے انگشت بدنداں تھی، وہ حدیث رسول کی تلاش و جستجو میں قریہ قریہ بستی بستی چلے پھرتے، جہاں سے حدیث رسول اور فرمانِ رسول، حکم رسول ملتا تحقیق تفتیش کے بعد اسے محفوظ کر لیتے اور امت محمدیہ تک آپ کے فرامین پہنچانے کا بندوبست کرتے۔ یوں جستجوئے حدیث میں ان کی زندگیاں گزر جاتیں اور وہ امت محمد کے ہاتھوں میں فرامین رسول کا گرانقدر مجموعہ دے کر اگلے جہان جا پہنچتے۔ ان کی زندگیوں کا لمحہ لمحہ اس شعر کا مصداق ہوتا:

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
اِلا حدیث یار را تکرار می کنیم

گلشن حدیث کے ان مہکتے گلابوں کی خوشبو سے امت محمدیہ کے ہر ہر فرد کی سانسیں مہکی ہوئی ہیں۔ ان رجال عظیم کی زندگیاں کیسے اور کن عظیم کاموں میں گزریں۔ انہوں نے آقائے دو جہاں سے عملی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے خدمت حدیث کے لیے کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ محدثین کرام کی زندگیوں کے روشن مگر پردہ اخفا میں سنہرے گوشوں کو آشکار کرنے اور آپ کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

محمد طاہر نقاش

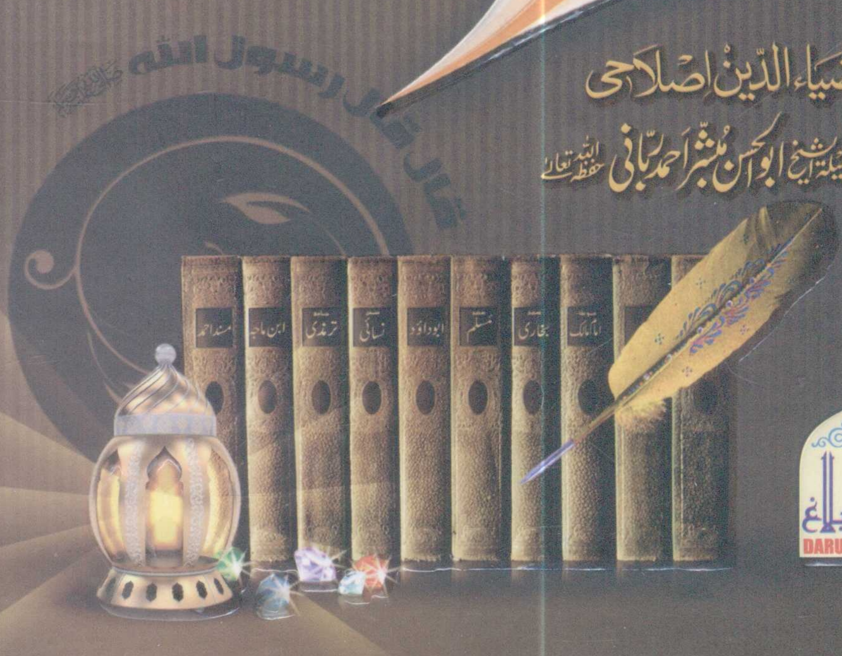
دارالابلاغ
کتاب و سنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ
DARULIBLAGH

تذکرۃ المحدثین

آسمان علم کے روشن ستاروں اور گلستان حدیث کے
مہکتے گلابوں کا روح پرور دلآویز
اور ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

تالیف: ضیاء الدین اصلاحی

تقریظ: فضیلۃ الشیخ ابو الحسن مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ تعالیٰ



دار الابلاغ
DARULIBLAGH

تذکرۃ المحدثین

DARULIBLAGH

کتاب وسنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ

تذکرۃ المحدثین

جلد دوم

تالیف .... ضیاء الدین اصلاحی

اعداد .... محمد طاہر نقاش

اشاعت اول .... مئی 2014ء

پاکستان میں ہماری کتب مندرجہ ذیل اداروں سے مل سکتی ہیں

- لاہور۔ ابلاغ (جیل روڈ 35717842 گلبرگ 35717842 ماڈل ٹاؤن 35942233)
- راولپنڈی۔ تجلیات طیبہ کشمیری بازار 5535168 دار الفکر اسلامی 0321-5216287 مکتبہ عائشہ 0321-5075075
- اسلام آباد۔ المسعود اسلامک بکس 2261356 البلاغ 2281420 دارالسلام شوروم 0321-5370378
- الھدیٰ انٹرنیشنل 4434615, 0321-8014008
- کراچی۔ فضلی سنز 32212991 علمی کتب خانہ 32628939
- فیصل آباد۔ مکتبہ اسلامیہ بیرون امین پور بازار 631204۔ مکتبہ اہلحدیث امین پور بازار 0300-6628021
- پشاور۔ معراج کتب خانہ 214720۔
- واہ کینٹ۔ البلاغ 051-4541148

دارالابلاغ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

رحمٰن مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4453358, 042-37361428

ضروری نوٹ: اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور انسانی بساط وطاقت کے مطابق ہم نے اس کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ خاص طور پر عربی عبارات میں تصحیح اغلاط میں پوری طرح احتیاط کی ہے۔ لیکن پھر بھی بشری تقاضے کے تحت اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو ازراہِ کرم مطلع فرمائیں۔

آئندہ ایڈیشن میں اس کا ازالہ کر دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ (ادارہ)

تذکرۃ المحدّثین

آسمان علم کے روشن ستاروں اور گلستان حدیث کے
مہکتے گلابوں کا روح پرور دلآویز
اور ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

جلد دوم

ضیاء الدّین اصلاحی

قال قال رسول الله ﷺ



دارالابلاغ
DARULIBLAGH

دارالابلاغ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز لاہور پاکستان
فون: 4453358-0300

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ

کے نام سے شروع کرتا ہوں

جو بڑا ہی مہربان

نہایت رحم کرنیوالا ہے

فہرست مضامین

حصہ دوم

19
امام ابوبکر بن حسین بیہقی

20

امام ابن عبد البر قرطبی

21

امام ابوبکر خطیب بغدادی

22
امام ابو عبداللہ محمد بن ابو نصر فتوح حمیدی

23
امام شیرویہ بن شہردار دیلمی

24

امام ابو محمد حسین فراء بغوی

25

امام ابوالحسن رزین بن عماد یہ عبدری سرقسطی

26

امام ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی

27

امام قاضی ابوالفضل عیاض

28

امام ابوالسعادات مبارک بن اثیر جزری

29

امام ابوعبداللہ محمد ضیاء مقدسی

30

امام ابوزکریا یحییٰ نووی

31
امام ابو محمد عبدالمومن دمیاطی

32
امام ولی الدین خطیب تبریزی

33
امام جمال الدین زیلعی

حصہ سوم

1
امام حسن صنعانی

2

شیخ علی متقی

3
شیخ محمد بن طاہر

4

شیخ عبدالحق محدث دہلوی

5

شیخ نورالحق دہلوی

6 شیخ الاسلام محمد

7 مولانا سلام اللہ محدث رامپوری

8 مولانا نورالاسلام

9 شیخ محمد سالم

تقریظ

حامداً و شاکراً و مصلیًا و مسلّماً

دین اسلام کا دوسرا بڑا ماخذ حدیث رسول ﷺ ہے جو بذریعہ وحی آپ ﷺ کو عطا کیا گیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی حفاظت کے لیے وہی بڑے اسباب و ذرائع پیدا فرمائے جو قرآن حکیم کے لیے پیدا کیے۔ یعنی حفظ و کتابت۔ نبی اکرم ﷺ سے دین اسلام کا سماع کرنے اور لکھنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دونوں طریقوں سے اس کو ضبط کیا۔ اپنے سینوں میں بھی اور دفاتر میں بھی۔ آپ جب بولتے تھے تو سن کر بھی آپ کے فرامین کو محفوظ کیا جاتا تھا اور آپ کا اس کے متعلق حکم بھی تھا۔ جب قبیلہ عبدالقیس کا وفد آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا، آپ نے انہیں اللہ اکیلے کی توحید پر ایمان، رسالت، اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، صیام رمضان اور غنائم میں سے خمس کی ادائیگی کا امر فرمایا، اور کدو، سبز مٹکے، تارکول کے برتن اور کھجور کے تنوں سے کرید کر بنائے گئے برتنوں سے منع کیا۔ اور آخر میں حکم دیتے ہوئے فرمایا:

((إِحْفِظُوْهُنَّ وَأَخْبِرُوا بِهِنَّ مِنْ وَرَاءِ كُمْ .)) ❶

''ان احکامات کو حفظ کرلو اور اپنے پچھلوں کو بھی ان کی خبر دو۔''

سیّدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ آپ کی باتیں، ارشادات، فرامین اور معمولات لکھا کرتے تھے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ میں حفظ کے ارادے سے آپ کی ہر بات جو سنتا تھا اسے لکھ لیا کرتا تھا۔ مجھے قریش نے یہ کہہ کر روکا کہ تو جو کچھ بھی اللہ کے رسول سے سنتا ہے لکھ لیتا ہے، آپ تو انسان ہیں، غصے اور غضب میں بھی بولتے ہیں اور خوشی و رضا مندی میں بھی تکلم فرماتے ہیں۔ میں لکھنے سے رک گیا اور اللہ کے رسول ﷺ سے یہ بات بیان کر دی۔ آپ نے اپنی انگلی سے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

((اكْتُبْ وَالَّذِىْ نَفْسِى بِيَدِهِ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ إِلَّا حَقٌّ .)) ❷

---

❶ صحیح البخاری، کتاب الإیمان: ٥٣.

❷ سنن أبی داؤد کتاب العلم باب کتابة العلم: ٣٦٤٦، مسند احمد: ٢/١٦٢، تقیید العلم، ص: ٨٠، تهذیب الکمال: ٣/٣٨ ـ ٣٩، ابن ابی شیبه: ٩/٤٩ ـ ٥٠، جامع بیان العلم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

”(اے عبداللہ ابن عمر!) تو لکھ، اس ذات باری تعالیٰ کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری (محمد ﷺ) کی جان ہے، میری زبان سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔“

یہ دونوں صحیح احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ رسول معظم ﷺ نے خود اپنی احادیث کو حفظ کرنے اور لکھنے کا حکم دیا۔ اور امام ابوداؤد نے اس حدیث پر کتاب علم کا باب باندھ کر حدیث لکھنا ثابت کیا ہے۔ امام بخاری نے صحیح البخاری میں کتاب العلم کے اندر باب کتابة العلم۔ اور۔ باب حفظ العلم۔ قائم کر کے یہ دونوں باتیں ثابت کی ہیں۔

صحابہ کرام سے لے کر تدوین حدیث کے دور تک بلکہ اس کے بعد اس کی اشاعت اور ترویج کے لیے آج تک جتنے علماء محدث پیدا ہوئے ان میں سے ہر ایک کی زندگیوں کو بھی ضبط کیا کہ فلاں محدثین کب اور کہاں پیدا ہوا، کتنی عمر میں قرآن مجید اور حدیث کے حفظ کرنے اور لکھنے کی طرف متوجہ ہوا، حصول علم کے لیے کن کن بلاد اسلامیہ کے سفر کیے اور کن کن اساتذہ کرام سے ملا اور کتنا عرصہ ان کے ہاں مقیم رہا۔ اس کا قوت حفظ کس قدر تھا۔ پیدائشی طور پر حافظے کا مضبوط تھا یا کمزور تھا۔ اگر شروع سے ہی حافظے کا مضبوط اور قوی ہے تو کیا بعد میں کسی حادثے کی وجہ سے ضبط میں خلل وارد ہوا یا نہیں۔ اس کے ضبط میں خلل واقع ہونے سے قبل کون کون اس سے روایت کیا کرتے اور ضبط میں تخلل کے بعد کون ان سے روایت کرتے ہیں۔ اس کی صداقت و عدالت کیسی ہے، یہ اپنی عام گفتگو اور حدیث کے بیان کرنے میں کذب بیانی سے کام لیتا ہے یا نہیں۔ اپنے اساتذہ سے حدیث بیان کرنے میں تدلیس اور دھوکہ دہی تو نہیں کرتا۔ اس نے علم حدیث کے نشر کرنے، پھیلانے اور بیان کرنے میں کہاں کہاں ڈیرہ ڈالے رکھا اور اس کی وفات کب اور کہاں واقع ہوئی۔ الغرض ایک ایک راوی حدیث کے حالات ضبط کیے گئے جسے علم الرجال کا نام دیا گیا اور یہ صرف امت محمدیہ کی خصوصیت ہے اس امت سے پہلے کسی بھی نبی کی امت نے یہ کام سرانجام نہیں دیا۔ ہر بات کی سند ضبط کی اور ہر ہر راوی کے حالات زندگی قلمبند کیے اور اس میں کمال دیانت داری کا مظاہرہ کیا۔

بڑے علم و عمل کے پہاڑ اور دیانتداری میں عروج پر پہنچے ہوئے لوگوں نے اس میں حظ وافر پایا ہے، امام یحییٰ بن معین، امام علی بن المدینی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام حمیدی،

(گزشتہ صفحہ حاشیہ) و فضلہ، ص: ۸۹۔۹۰، مسند الدارمی: ۱/۱۲۵، المستدرک للحاکم: ۱/۱۰۵۔ ۱۰۶، امام حاکم نے اسے صحیح کہا اور امام ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔

امام بزار، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ، امام دارقطنی، امام حاکم، امام بیہقی، امام یعقوب بن سفیان، امام ابن عساکر، امام ابونعیم اصبہانی، امام ابو القاسم اصبہانی، خطیب بغدادی، امام عبدالغنی المقدسی، امام مزی، امام ذہبی، امام بن کثیر، حافظ ابن حجر وغیرہم نے اس میں کارہائے نمایاں سر انجام دیے اور بڑی بڑی ضخیم کتب اس فن میں مرتب کیں۔

ان ہی آئمہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے برصغیر پاک و ہند کے ایک معروف عالم دین ضیاء الدین اصلاحی نے تین حصوں پر مشتمل "تذکرۃ المحدثین" مرتب کی جس میں اس پاک بازگروہ کی مثالی سیرت و کردار اور عظیم کارناموں پر مشتمل ایک علمی دستاویز تیار کر کے امت پر احسان کیا ہے، پہلے حصے میں دوسری صدی کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کئی ایک آئمہ حدیث کے حالات زندگی، سوانح حیات، اور خدمت حدیث کے کارنامے مرتب کیے۔ دوسرے حصے میں چوتھی صدی کے نصف آخر سے لے کر آٹھویں صدی ہجری کے مشہور و معروف علماء کے حالات زندگی اور علم حدیث کے لیے خدمات جمع کیں اور تیسرے حصے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور دیگر حدیث کی خدمت کرنے والے متعدد علماء کا تذکرہ ہے۔

بلا اختلاف عقیدہ و منہج ہر اس شخص کا تذکرہ کیا جس نے حدیث کی خدمت میں جس بھی صورت میں حصہ لیا۔ اس کے بارے تفصیلی معلومات کا ذخیرہ اس دستاویز میں جمع کر دیا، اور اس کتاب کا مقدمہ برصغیر کے مشہور مؤرخ شاہ معین الدین احمد ندوی رحمہ اللہ نے لکھا اور اس عنوان کی افادیت اور اہمیت کو اجاگر کیا۔

یہ کتاب حدیث کے خدمت گاروں کا ایک قیمتی خزینہ اور معرفت و علم کا دفینہ ہے اور متلاشیان علم حدیث کے لیے گراں قدر تحفہ ہے، جسے ہر طالبِ علم حدیث اور مکتبہ و لائبریری کی زینت ہونا چاہیے تاکہ ان علم کے درخشندہ ستاوں کی سیرت و کردار سے راہنمائی لے کر حدیث کی معرفت اور خدمت میں اپنا حصہ ڈال سکے۔ اللہ رب العزت ہر طالبعلم، کتاب کے مؤلف، ناشر اور معاون کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ اور نجات کا وسیلہ و ذریعہ بنائے۔ اور اس سلسلہ ذھبیہ میں پرو دے۔ آمین یا رب العالمین۔

خویدم العلم و أهله

ابوالحسن مبشر احمد ربانی عفا اللہ

رئیس مرکز الحسن 882/p سبزہ زار لاہور

۲۵ فروری ۲۰۱۴ـ ۲۴ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ

حرف تمنا

گلستان حدیث کے مہکتے گلاب

کیا ہی شاندار اور قابل رشک زندگیاں تھیں ان جلیل القدر اور قسمت کے دھنی انسانوں کی!..... کہ جنہوں نے اپنی زندگی کا محور و مرکز حدیث رسول مقبول ﷺ کو بنائے رکھا۔ ان کی صبحیں اور شامیں قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ کی دلنواز صداؤں میں بسر ہوتیں۔ رسول اللہ سے عملی محبت کا ثبوت یہ ہوتا کہ ان کو آپ کے فرامین بمعہ سند سینکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں حفظ ہوتے۔ دنیا ان کے حافظے سے انگشت بدنداں تھی، وہ حدیث رسول کی تلاش و جستجو میں قریہ قریہ بستی بستی چلے پھرتے، جہاں سے حدیث رسول اور فرمانِ رسول، حکم رسول ملتا تحقیق تفتیش کے بعد اسے محفوظ کر لیتے اور امت محمدیہ تک آپ کے فرامین پہنچانے کا بندوبست کرتے۔ یوں جستجوئے حدیث میں ان کی زندگیاں گزر جاتیں اور وہ امت محمد کے ہاتھوں میں فرامین رسول کا گرانقدر مجموعہ دے کر اگلے جہان جا پہنچتے۔ ان کی زندگیوں کا لمحہ لمحہ اس شعر کا مصداق ہوتا:

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم — الا حدیث یار راتکرار می کنیم

گلشن حدیث کے ان مہکتے گلابوں کی خوشبو سے امت محمدیہ کے ہر ہر فرد کی سانسیں مہکی ہوئی ہیں۔ ان رجال عظیم کی زندگیاں کیسے اور کن عظیم کاموں میں گزاریں۔ انہوں نے آقائے دو جہاں سے عملی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے خدمتِ حدیث کے لیے کیسے کیسے کارہائے نماں انجام دیے۔ محدثین کرام کی زندگیوں کے روشن مگر پردہ اخفا میں سنہرے گوشوں کو آشکار کرنے اور آپ کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، آج ہی اس کا مطالعہ کریں۔ تاکہ حدیث رسول ﷺ فرمان رسول اور حکم رسول کی اہمیت، فضیلت اور محبت آپ کے دل و دماغ میں راسخ ہو، آپ اپنی نسل کو بھی اس روشن شاہراہِ حیات پر چلانے کی منصوبہ بندی کر کے اپنی آخرت کی یقینی کامیابی کا سامان کر سکیں۔

خادم کتاب و سنت

محمد طاہر نقاش

۲۲ فروری ۲۰۱۴ء لاہور

خطبہ مسنونہ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ، وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ

أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ○ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۙ○ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ○

① ((مسلم، الجمعة، باب تخفیف الصلوة و الخطبة، حدیث ۸۶۸ و ۸۶۷۔ والنسائی، ۳۲۷۸))

② ((رواہ الاربعة واحمد والدارمی و روی البغوی فی شرح السنه مشکوۃ مع تعلیقات الالبانی، النکاح، باب اعلان النکاح ... وقال الالبانی حدیث صحیح۔))

تنبیہات:

➢ صحیح مسلم، سنن نسائی اور مسند احمد میں ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی حدیث میں خطبہ کا آغاز ((ان الحمدلله)) سے ہے لہٰذا ((الحمدلله)) کی بجائے ((ان الحمدلله)) کہنا چاہیے۔

➢ یہاں ((نومن به ونتوکل علیه)) کے الفاظ صحیح احادیث میں موجود نہیں ہیں۔

➢ یہ خطبہ نکاح، جمعہ اور عام وعظ وارشاد یا درس وتدریس کے موقع پر پڑھا جاتا ہے۔ اسی خطبہ حاجت کہتے ہیں اسے پڑھ کر آدمی اپنی حاجت وضرورت بیان کرے۔

10-Feb 2013(5x7)

''بلاشبہ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ ہم اسی کی تعریف کرتے، اسی سے مدد مانگتے اور اسی سے بخشش طلب کرتے ہیں۔ اپنے نفس کی شرارتوں اور اپنے برے اعمال سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ جسے اللہ راہ دکھائے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ دھتکار دے اسے کوئی راہ راست پر نہیں لاسکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے، وہ اکیلا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

''حمد وصلوۃ کے بعد! یقیناً تمام باتوں سے بہتر بات اللہ کی کتاب اور تمام طریقوں سے بہتر طریقہ محمد ﷺ کا ہے اور تمام امور میں سے برے کام (دین میں) خود ساختہ (بدعت والے) کام ہیں، ہر بدعت گمراہی اور ہر گمراہی کا انجام جہنم ہے۔''

''اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں اس حال میں موت آئے کہ تم مسلمان ہو۔ لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، (پھر) اس سے اس کی بیوی کو بنایا اور (پھر) ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیں اور انہیں (زمین پر) پھیلا دیا۔ اللہ سے ڈرتے رہو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قطع رحمی سے (بچو)۔ یقیناً اللہ تم پر نگران ہے۔ اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو اور سیدھی (سچی اور کھری) بات کہو۔ اللہ تمہارے اعمال سنوار دے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی، یقیناً اس نے عظیم کامیابی حاصل کر لی۔''

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی

(متوفی ۴۵۸ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابوبکر کنیت، نسب نامہ یہ ہے: احمد بن حسین بن علی بن عبداللہ بن موسیٰ (۱)۔

ولادت ووطن: امام ابوبکر بیہقی شعبان المعظم ۳۸۴ھ میں بیہق میں پیدا ہوئے، بیہق خراسان کے مشہور مردم خیز شہر نیشاپور کے مضافات میں اس سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، (۲) یاقوت کا بیان ہے کہ یہ بڑا زرخیز، نہایت آباد اور وسیع مقام اور تقریباً تین سو اکیس گاؤں پر مشتمل ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ بیہق چند گاؤں کا نام ہے، جو باہم متصل اور نیشاپور سے تیس کوس کے فاصلہ پر واقع ہیں، یہ اسی طرح ہے جس طرح نواح دہلی میں بارہ وہریانہ ہیں، ان دیہاتوں میں سب سے بڑا گاؤں خسروجرد ہے۔ (۳)

خسروجرد کو سب سے بڑا گاؤں ہونے کی وجہ سے مرکزیت حاصل تھی، امام بیہقی کے زمانہ تک اس کی مرکزیت قائم رہی لیکن بعد میں سبزہ وار مرکزی مقام بن گیا تھا۔ (۴)

ظہیر الدین بیہقی کا بیان ہے کہ اگرچہ امام بیہقی کے اسلاف کا تعلق شامکان اور نوبہار سے تھا لیکن ان کی ولادت اور نشوونما بیہق میں ہوئی۔ (۵)

امام ابوبکر ان مقامات کی نسبت سے بیہقی، خسروجردی اور نیشاپوری کہلاتے ہیں

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵ و کتاب الانساب ورق ۱۰۱ (۲) ایضاً (۳) بستان المحدثین ص ۵۱ (۴) کتاب الانساب ورق ۱۹۹ و معجم البلدان ج ۲ ص ۳۴۶ و ج ۳ ص ۴۳۷ (۵) تاریخ بیہق مطبوعہ حیدرآباد ص ۳۱۸۔

لیکن ان کی مشہور نسبت بیہقی ہے۔

اساتذہ وشیوخ: امام بیہقی کے شیوخ کی تعداد سو سے متجاوز تھی، ان میں چند مشہور کے نام یہ ہیں:

ابن یعقوب ایادی، ابوبکر بن فورک، ابوزکریا مزکی، ابوعبداللہ بن لطیف، ابوعبدالرحمٰن سلمی، ابوعلی روذباری، ابوالحسن بن بشران، جناح بن تدیر محاربی، حسن بن احمد بن فراس، عبداللہ ابن یوسف بن ناموبہ، ابوالحسن محمد بن حسین علوی، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم، ابوطاہر محمد بن زیادی، ہلال بن محمد حفار۔

فقہ کی تعلیم وتحصیل مشہور فقیہ ابوسہل صعلوکی اور ابوالفتح ناصر بن محمد عمری مروزی سے کی تھی۔

بیہقی کو اپنے اساتذہ میں ابوالحسن محمد بن حسین علوی اور ابوعبداللہ حاکم سے زیادہ استفادہ کا موقع ملا، خصوصاً حاکم کے جلیل القدر تلامذہ میں شمار کیے جاتے ہیں اور عرصہ دراز تک ان کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔(۱)

تلامذہ: امام بیہقی سے بیشمار لوگوں نے روایت اور تحصیل علم کی ہے، بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

اسماعیل بن احمد (امام بیہقی کے فرزند) حسین بن احمد بن علی، ابوالقاسم زاہر بن طاہر سحامی، عبدالجبار بن عبدالوہاب دھان، عبدالجبار بن محمد خواری، عبدالحمید بن محمد خواری، ابوالحسن عبداللہ بن محمد بن احمد (امام بیہقی کے پوتے) عبدالمنعم قیشری، ابوعبداللہ محمد فراوی، ابوالمعالی محمد بن اسماعیل فارسی۔(۲)

شیخ الاسلام ابواسماعیل انصاریؒ کو بھی امام بیہقی سے اجازت حاصل تھی اور علامہ سمعانی لکھتے ہیں:

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۲ص ۳۲۸ و ۳۲۹ وطبقات الشافعیہ ج۳ص۳ وتاریخ ابن خلکان ج۱ص۳۵ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج۲ص ۳۳۰۔

أدركت عشرة نفر من أصحابه الذين حدثوني عنه. (۱)	میری امام بیہقی کے دس تلامذہ سے ملاقات تھی، انھوں نے مجھ سے ان کے واسطہ سے حدیثیں بیان کی ہیں۔

طلب حدیث کے لیے سفر: امام بیہقی بچپن ہی سے حدیث کے مبارک علم کی تحصیل وتکمیل اور اس کی جمع وتحریر میں مشغول ہو گئے تھے اور انھوں نے اس کے لیے متعدد مقامات اور علمی مرکزوں کا سفر بھی کیا تھا، پہلے بیہق سے نیشاپور تشریف لے گئے، خراسان کے اکابر علماء ومحدثین سے استفادہ کرنے کے بعد انھوں نے عراق، جبال اور حجاز کے مختلف اہم شہروں بغداد، مکہ اور کوفہ وغیرہ کا سفر کیا۔ (۲)

حفظ وثقاہت: امام بیہقی کے حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان پر ائمہ فن اور محدثین کا اتفاق ہے، ابوالحسن عبدالغافر فارسی کا بیان ہے کہ ''وہ اپنے زمانہ میں حفظ میں یکتا اور اپنے تمام معاصرین میں ضبط واتقان کے اعتبار سے یگانہ تھے، حافظ ذہبی نے ان کو حافظہ میں قوی بتایا ہے، ابن ناصرالدین فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور قابل اعتماد تھے، اہل سیر اور ارباب تذکرہ نے ان کو الحافظ الکبیر المشہور کے لقب سے موسوم کیا ہے۔ (۳)

حدیث میں درجہ ومرتبہ: حفظ وضبط کی طرح معرفتِ حدیث میں بھی عدیم المثال تھے اور احادیث کے علل واسقام کی تمیز میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے جمع وتلفیق حدیث ان کی امتیازی خصوصیت تھی، حدیث اور اس کے متعلقات میں اس درجہ عبور ہونے کی بنا پر ان کا شمار نامور محدثین اور اکابر فن میں ہوتا ہے، علامہ ابن عساکر نے ان کو شیخ السنہ (۴) اور ابن عماد نے شیخ خراسان (۵) لکھا ہے، ظہیرالدین بیہقی لکھتے ہیں کہ فن حدیث میں ان

(۱) کتاب الانساب ورق ا (۲) تبیین کذب المفتری ص ۲۶۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۹ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۹ وشذرات الذہب ج ۳ ص ۳۰۴ (۴) تبیین کذب المفتری ص ۲۶۶ (۵) شذرات الذہب ج ۳ ص ۳۰۵۔

کا کوئی ہمسر اور ثانی نہ تھا، ان کے زمانہ میں خراسان کے اندر کسی کو ان کی مرضی و سند کے بغیر کوئی حدیث بیان کرنے یا اس میں کسی قسم کا تصرف کرنے کی مجال نہ تھی۔

وہ ایک روز اپنے استاذ حاکم کی مجلس میں جہاں متعدد علما و اصحاب فضل و کمال موجود تھے، حاضر ہوئے، حاکم نے ایک حدیث بیان کرتے ہوئے اس کے کسی راوی کا نام ترک کر دیا، امام بیہقی نے فوراً اعتراض کیا، حاکم کو غصہ آ گیا لیکن جب اصل سے مقابلہ کیا گیا تو بیہقی کی بات درست نکلی۔(۱)

گو حدیث کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی ان کو دستگاہ حاصل تھی، تاہم اس فن میں ان کو زیادہ نمایاں مقام اور بلند درجہ حاصل تھا، اسی لیے ان کی شہرت اسی کی نسبت سے ہے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں:

غلب علیہ علم الحدیث واشتھر بہ۔ (۲)	ان پر علم حدیث خاص طور سے غالب تھا اور اس میں ان کو نہایت نمایاں شہرت حاصل ہوئی۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ نہ تو امام بیہقی کے شیوخ کی تعداد اور محدثین کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی اور حدیث کی کئی اہم اور بلند پایہ کتابیں ہی ان کی نظر سے گذری تھیں لیکن اس کے باوجود وہ اس فن میں یگانہ روزگار اور یکتائے زمانہ تھے اور ان سے بے شمار حدیثیں مروی ہیں، نیز اس فن میں ان سے متعدد بے نظیر کتابیں بھی یادگار ہیں۔(۳) علامہ سمعانی فرماتے ہیں کہ ان کے پاس احادیث کا بڑا وسیع ذخیرہ تھا اور انھوں نے متعدد بے مثال تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، علامہ یافعی تحریر کرتے ہیں کہ "بعض لوگوں کا بیان ہے کہ ان کے شیوخ کی تعداد تقریباً ایک سو ہے اور یہ تعداد درحقیقت بیہقی کے علوم و کمالات کے اعتبار سے زیادہ نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے کاموں میں خاص برکت عطا کی تھی، گو ان کو

(۱) تاریخ بیہقی ص ۱۱۷ (۲) ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵ (۳) کتاب الانساب ورق ۱۰۱۔

متعدد کتب حدیث کے سماع کا شرف حاصل تھا تاہم بعض کتابوں کے استفادہ سے وہ محروم بھی رہ گئے تھے، چنانچہ مسند امام احمد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور جامع ترمذی وغیرہ کتابیں ان کے پاس نہیں تھیں۔‘‘(۱)

علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ ’’علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ بیہقی کا دائرہ علم حدیث میں زیادہ وسیع نہیں تھا تاہم خدا نے ان کے مرویات میں بڑی برکت عطا کی تھی اور وہ حدیث کے ابواب ورجال کے بارے میں پوری مہارت اور مکمل واقفیت رکھتے تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی فرماتے ہیں:

باوجود اس تبحر اور علوے اسناد کے امام بیہقی کے پاس سنن نسائی، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ نہیں تھیں، اس لیے ان تینوں پر جیسی اطلاع ہونی چاہیے تھی ان کو نہیں تھی، مگر حق تعالیٰ نے ان کے علم میں غیر معمولی برکت اور فہم میں نہایت بصیرت عطا کی تھی، ان کی یادگار ایسی عجیب تصنیفات ہیں جو ان سے پہلے کے لوگ بھی نہیں لکھ سکے تھے۔(۲)

فقہ: امام بیہقی کو فقہ واصول میں بھی پورا درک حاصل تھا، فقیہ جلیل اور اصولی ان کے نام کا جز بن گیا تھا، ان کی تصنیفات حدیث میں گوناگوں فقہی معلومات ومسائل موجود ہیں اسی لیے ان کو علم حدیث وفقہ کا جامع کہا جاتا ہے، حافظ ابن عساکر لکھتے ہیں:

انھوں نے اپنی کتابوں میں علم حدیث وفقہ دونوں کے مسائل ومعلومات جمع کیے ہیں اسی کے ساتھ عللِ حدیث، صحیح وسقیم روایتوں کی نشاندہی، احادیث کے درمیان جمع وتطبیق کے وجوہ اور فقہ واصول وغیرہ مختلف النوع مباحث بیان کیے ہیں۔(۳)

عربیت وشعروسخن: ان کو عربیت اور شعروسخن کا اچھا ذوق تھا، ان کی تصنیفات سے ان کے حسنِ ذوق کا اندازہ ہوتا ہے اور ان سے منقول بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

(۱) مرآۃ الجنان ج۳ص۸۲ وطبقات الشافعیہ ج۳ص۴ (۲) بستان المحدثین ص۵۱ (۳) تبیین کذب المفتری ص۲۶۶۔

من عزّ بالمولی فذاك جليل ومن رام عز سواه ذليل

جس شخص کو خدا نے عزت دی وہ بزرگ ہے اور جس نے خدا کے سوا کسی دوسرے سے عزت طلب کی وہ ذلیل ہے۔

ولو ان نفسی مذبرأها مليكها مضى عمرها فی سجدة لقليل

اگر میرا نفس اس وقت سے لے کر جب سے کہ خدا نے اسے پیدا کیا ہے، عمر بھر خدا کی عبادت کرتا ہے تو بھی یہ بہت کم ہے۔

احب مناجاة الحبيب باوجه ولكن لسان المذنبين كليل (۱)

میں عمدہ طور سے اپنے حبیب کی مناجات پسند کرتا ہوں لیکن گنہ گار کی زبان گونگی ہے۔

گو حدیث، فقہ، اصولِ فقہ اور عربیت وغیرہ میں امام صاحب کو امتیازی شہرت حاصل تھی تاہم دوسرے علوم وفنون میں بھی عاجز نہ تھے، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں ''وہ علوم وفنون میں اپنے زمانہ میں اپنے معاصرین میں یکتا اور بے نظیر تھے۔ (۲)

تحقیق وانصاف پسندی: امام بیہقی کی ایک خصوصیت حقیقت بینی اور انصاف پسندی بھی ہے، مورخین واصحاب سیر نے علمی وفنی مباحث میں امام صاحب کی غیر معمولی تحقیق وتدقیق اور انصاف پسندی کا ذکر کیا ہے۔ صاحب تاریخ بیہق کا بیان ہے:

وتحقیقات درعلوم بسیار دارد ودر مباحثہ	علوم میں بڑی تحقیق سے کام لیتے تھے
ومناظرۂ علوم غایت انصاف مرعی	اور مباحثہ ومناظرہ میں انصاف کو پوری
میداشت۔ (۳)	طرح ملحوظ رکھتے تھے۔

امامت ومرجعیت: امام بیہقی کے گوناگوں کمالات نے ان کی ذات کو مسلمانوں کا امام ومقتدیٰ اور اصحاب علم وفن کا مرجع بنادیا تھا، تمام ارباب سیر وتذکرہ نے ان کی امامت فن کا

(۱) بستان المحدثین ص ۵۱ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵ (۳) تاریخ بیہق واتحاف النبلاء ص ۱۹۰۔

اعتراف کیا ہے، امام صاحب کی مرجعیت ومقبولیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب وہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہوکر اپنے وطن بیہق میں درس وافادہ اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہوئے تو بڑے بڑے ائمہ فن اور نامور اصحاب کمال نے ان سے نیشاپور تشریف لانے کی فرمائش کی تاکہ اس مرکزی مقام میں لوگوں کو ان سے استفادہ میں سہولت اور ان کی کتابوں کے سماع کا زیادہ موقع ملے، لوگوں کی اس طلب وخواہش کو دیکھ کر آپ ناحیہ سے ۴۴۱ھ میں نیشاپور پہنچے، وہاں کے شائقین نے امام صاحب کا شایان شان استقبال کیا اور جب مجلس درس آراستہ کی گئی تو اس میں جہابذۂ فن اور نامور اصحاب کمال شریک ہوکر آپ کی کتابوں کا سماع کرتے اور آپ سے استفادہ کرتے تھے اور آپ کے لیے دعائے خیر وبرکت کرتے تھے، یہ تمام لوگ آپ کے ذوقِ علم اور کثرتِ استحضار کے معترف تھے۔(۱)

اعتراف کمالات: امام بیہقی کے اوصاف وکمالات کا ان کے معاصرین، ارباب کمال اور مورخین واصحاب سیر نے اعتراف کیا ہے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ ''امام بیہقی مسلمانوں کے ائمہ ہداۃ اور دین متین کے داعیوں میں تھے، وہ علم وفضل کا پہاڑ اور اپنے پورے دور میں عدیم المثال، یکتائے روزگار، میدان علم کے شہ سوار، حاذق الفن محدث، سرعت فہم، جودت طبع اور ذہن کی درّاکی میں بے نظیر تھے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں یکتا اور اپنے معاصرین میں بے مثال تھے، ظہیر الدین بیہقی کا بیان ہے کہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جن سات آدمیوں کی تصنیفات اسلامی کتابوں کا بہترین ذخیرہ خیال کی جاتی ہیں ان میں ایک امام بیہقی بھی ہیں اور ان سے مسلمانوں کو بڑا فیض پہنچا ہے اور امام حاکم کے اجل تلامذہ میں ہونے کے باوجود بعض حیثیتوں سے ان سے فائق وبرتر سمجھے جاتے تھے، ابن خلکان ذہبی اور ابن عساکر کا بیان ہے کہ ''گو وہ امام ابوعبداللہ حاکم کے تلامذہ میں تھے، تاہم متعدد علوم وفنون میں یکتا ہونے کی بنا پر ان سے بڑھ کر تھے،'' امام سیوطی فرماتے ہیں کہ محدثین کا

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۹ وتبیین کذب المفتری ص ۲۶۶۔

اتفاق ہے کہ حاکم کے شاگرد امام بیہقی حدیث کی طلب میں ان سے فائق تھے۔(۱)

فقہی مذہب: امام بیہقی شافعی المذہب تھے، ان کو اس مذہب سے غیر معمولی شغف تھا، اس کی نشر و اشاعت اور تہذیب و تنقیح میں انھوں نے اہم اور نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں، اس مذہب کو ان کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچا، ابن سبکی کا بیان ہے کہ کوئی شافعی المذہب ان کی تصنیفات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، امام الحرمین ابوالمعالی جوینی سے منقول ہے کہ "امام بیہقی کے علاوہ کوئی ایسا شافعی المذہب نہیں ہے جس پر امام شافعی کے احسانات نہ ہوں لیکن امام بیہقی کا خود امام شافعی پر احسان ہے کیوں کہ ان کی تصنیفات سے ان کے مذہب و مسلک کی بڑی تائید و اشاعت ہوئی ہے، وہ تمام شوافع میں اس مذہب کے اصول و فروع کی حمایت میں نہایت پیش پیش رہے اور اس کی تفریع و تخریج اور اس کے مختصر مجمل کی توضیح و تشریح کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔

ابن خلکان اور ذہبی نے لکھا ہے کہ وہ امام شافعی کے نصوص جمع کرنے والے پہلے شخص ہیں" لیکن علامہ ابن سبکی اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں "یہ خلاف واقعہ ہے، درحقیقت جامعین نصوص میں وہ بالکل آخری شخص ہیں، انھوں نے متقدمین کے تمام مباحث اور ان کی کتابوں کے اکثر امور و مسائل کا استیعاب کر لیا ہے، ان کے بعد کسی اور شخص کے بارے میں مجھ کو نہیں معلوم کہ اس نے امام شافعی کے نصوص جمع کیے ہوں کیوں کہ امام بیہقی اس کو اس قدر جامع اور مکمل طور پر مرتب کر چکے تھے کہ بعد والوں کے لیے مزید کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔"(۲)

کلامی مذہب: امام صاحب اشعری المذہب اور اہل سنت والجماعت میں تھے، علامہ

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۳ ص۳۲۹ و تبیین کذب المفتری ص۲۶۶ و تاریخ ابن خلکان ج۱ ص۳۵ و طبقات الشافعیہ ج۳ ص۳ و۴ و تدریب الراوی ص۳۱ (۲) طبقات الشافعیہ ج۳ ص۴ و تاریخ ابن خلکان ج۱ ص۳۵۔

ابن سبکی لکھتے ہیں کہ انھوں نے اشعری مذہب کے مطابق علم کلام پڑھا اور حافظ ابن عساکر نے تبیین کذب المفتری میں ان کا اشاعرہ کے تیسرے طبقہ میں ذکر کیا ہے، بعض اکابر محدثین کی طرح ان کی جانب بھی شیعیت کی نسبت کی گئی ہے لیکن یہ سراسر غلط الزام ہے۔

زہد وورع: امام بیہقی زہد وورع میں بھی ممتاز تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کو دیندار، صاحب ورع، زاہد، قانت اور عفیف وغیرہ لکھا ہے، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، ان کے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وفات سے ۳۰ رسال پہلے سے انھوں نے مسلسل روزے رکھنا شروع کر دیے تھے۔(۱)

عادات واخلاق: اصحاب سیر وتذکرہ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے عادات وخصائل نہایت پاکیزہ تھے، عفت وقناعت ان کی سیرت کا اہم جوہر تھی، زہد وورع اور شمائل واخلاق میں وہ سلف صالحین اور علمائے ربانیین کے اوصاف کے حامل تھے، علامہ ابن عبدالغافر کا یہ بیان تمام کتابوں میں ملتا ہے۔

كان البيهقي على سيرة العلماء	امام بیہقی علمائے سلف کی طرح معمولی
قانعا من الدنيا باليسير	اور تھوڑی چیز پر قانع اور زہد وورع میں
متحملا في زهده وورعه وبقي	ممتاز تھے، وفات تک ان کا یہی حال
كذالك الى ان توفي۔(۲)	تھا۔

وفات: امام بیہقی نے ۷۴ رسال کی عمر میں شنبہ ۱۰ رجمادی الاولی ۴۵۸ھ کو نیشاپور میں انتقال کیا، ان کی نعش مبارک وہاں سے بیہق لائی گئی اور یہیں سپرد خاک کیے گئے۔(۳)

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اولاد: ان کی اولاد میں ابوعلی اسماعیل اور محمد کا ذکر ملتا ہے، اول الذکر صاحب کمال محدث

(۱) شذرات الذہب ج ۳ ص ۳۰۵ (۲) تبیین کذب المفتری ص ۲۶۷ (۳) ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۳۰ والمنتظم ج ۸ ص ۲۸۲۔

اور عہدۂ قضا پر فائز تھے، امام صاحب کے تلامذہ کے ضمن میں ان کا نام گذرا ہے، دوسرے صاحبزادے محمد کے بیٹے ابوالحسن عبداللہ بھی جلیل القدر محدث تھے، ان کو اپنے دادا سے روایت وسماع کا فخر حاصل تھا۔(۱)

تصنیفات: امام بیہقی مایہ ناز مصنف تھے، ان کے فضل وکمال کا سب سے بڑا ثبوت ان کی تصنیفات ہیں جو ایک ہزار جز کے بقدر ہوں گی، ان کے علمی کاموں میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت دی تھی، اس لیے ان کی تصنیفات کی تعداد زیادہ ہے اور وہ کیفیت کے اعتبار سے بھی بہت اہم ہیں، مورخین اور اصحاب سیر کا بیان ہے کہ ان کی تمام تصنیفات نہایت جامع، پر مغز، مفید، بے نظیر اور عدیم المثال ہیں، امام بیہقی کا شمار ان علمائے اسلام میں ہوتا ہے جن کی کتابوں سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے، کتب صحاح کی شہرت وعلوئے منزلت کے بعد جن محدثین کی تصنیفات کو عالم اسلام میں بقائے دوام حاصل ہوا اور جن کی علمی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، ان میں امام الحدیث وشیخ السنۃ ابوبکر بیہقی بھی ہیں، ان کا شمار ان ائمہ وحفاظ سبعہ میں ہوتا ہے جن کے متعلق حافظ ابن صلاح کا بیان ہے کہ انھوں نے عمدہ اور مفید کتابیں تصنیف کیں۔''(۲)

بالخصوص شافعی مذہب کو ان سے زیادہ کسی اور مصنف کی تصنیفات سے فائدہ نہیں ہوا، اس مذہب کی تائید وحمایت، اس کی تفریع وتخریج نیز ضبط وتحقیق اور شرح وبسط ان کا خاص اور اہم کارنامہ ہے، اوپر گذر چکا ہے کہ کوئی شافعی المذہب نہ ان کے احسانات سے سبکدوش ہوسکتا ہے اور نہ ان کی کتابوں سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔

علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ''امام بیہقی کی امانت، تدین، فضل وکمال اور ضبط واتقان کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کی کتابوں سے چہار جانب کے لوگوں کو نفع بخشا، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

---

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۳ص ۳ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۳۴۳ (۲) ایضاً۔

ان کی کتابوں کو مختلف شہروں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں تصنیف وتالیف میں یکتا تھے، ان کی چھوٹی بڑی تمام کتابیں بے نظیر اور مفید ہیں، علامہ ابن سبکی کہتے ہیں کہ ان کی تمام تصنیفات بیش قیمت، بلند پایہ اور ترتیب وتالیف میں عمدہ ہیں، متقدمین کی کتابیں بھی اس درجہ کی نہیں ہیں۔(۱)

ذیل میں ان کی تصنیفات کے نام اور بعض کے متعلق مختصر معلومات درج کیے جاتے ہیں:

۱- کتاب البعث والنشور (ایک جلد)، ۲- بیان خطاء من اخطاء علی الشافعی، ۳- ترغیب الصلاۃ، ۴- کتاب الترغیب والترتیب (ایک جلد)، ۵- جامع ابواب وجوہ قرأۃ قرآن، ۶- کتاب الرؤیۃ، ۷- کتاب فضائل الاوقات، ۸- فضائل الصحابہ یا المصنف فی فضائل الصحابہ، ۹- کتاب القدر، ۱۰- کتاب مناقب احمد، ۱۱- کتاب مناقب الشافعی، ۱۲- کتاب المعارف، ۱۳- کتاب ینابیع الاصول، ۱۴- کتاب اثبات عذاب القبر، اس کا قلمی نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام میں ہے۔(۲)

۱۵- کتاب الاسرار: ذہبی نے اس کا نام کتاب الاساری اور صاحب کشف الظنون نے کتاب الاسرار لکھا ہے۔

۱۶- کتاب المعرفۃ: معرفۃ العلوم، معرفۃ الحدیث اور معرفۃ علوم الاحادیث بھی اس کے نام تحریر کئے گئے ہیں، غالباً اس میں علم حدیث کے مصطلحات بیان کئے گئے ہیں۔

۱۷- کتاب الآداب: ایک جلد، مکارم اخلاق، بروصلہ اور آداب وغیرہ سے متعلق احادیث پر مشتمل ہے۔(۳)

۱۸و۱۹- کتاب الدعوات الصغیر وکتاب الدعوات الکبیر: دونوں امام بیہقی کی اہم اور عمدہ کتابیں ہیں۔(۴)

(۱) العبر ج ۳ ص ۲۴۲، البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۴ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۴ (۲) رسالہ معارف ج ۱۸ ص ۳۳۲ (۳) الرسالۃ المستطرفۃ ص ۳۶ (۴) کشف الظنون ج ۲ ص ۷۶ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۴۔

۲۰- کتاب الاربعین: یہ اخلاق سے متعلق ۱۰۰ احدیثوں کا مجموعہ اور چالیس ابواب پر مرتب کی گئی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے اربعین صغریٰ واربعین کبریٰ کے نام سے دونوں کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ (۱)

۲۱- کتاب احکام القران: احکام القرآن کے نام سے کئی کتابیں لکھی گئی ہیں سب سے پہلی کتاب امام شافعی کی بتائی جاتی ہے، بیہقی نے اس میں ان کے اقوال کی تلفیق کی ہے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ میں ہے۔ (۲)

۲۲- کتاب الخلافیات: دوجلدوں میں ہے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں کہ ایسی فاضلانہ کتاب وہی لکھ سکتا ہے جو فقہ وحدیث دونوں میں جامع اور نصوص کا ماہر ہو۔ صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ اس میں ان مسائل کا ذکر ہے جو امام اعظم اور امام شافعی کے درمیان مختلف فیہ ہیں۔ (۳)

۲۳- نصوص الشافعی: یہ دس جلدوں میں ہے (۴) لیکن حافظ ذہبی نے تین جلدیں بتائی ہیں، ابن خلکان اور ذہبی کا خیال ہے کہ امام شافعی کے نصوص جمع کرنے میں اولیت کا شرف بیہقی کو حاصل ہے لیکن ابن سبکی نے اس کی تردید کی ہے۔

۲۴- دلائل النبوۃ: یہ تین جلدوں میں ہے، علامہ ابن سبکی نے اس کو بے نظیر کتاب کہا ہے اور ذہبی فرماتے ہیں کہ اس کی تحصیل ضروری ہے، مدینہ منورہ کے کتب خانہ محمودیہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے، سراج الدین عمر بن علی المعروف بابن ملقن نے اس کا مختصر لکھا ہے۔ (۵)

۲۵- کتاب ماوردنی حیات الانبیا بعد وفاتہم ۱۳۴۹ھ میں یہ حیاۃ الانبیا کے نام

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۷۷ و بستان المحدثین ص ۵۱ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۵۶ و معارف ج ۱۸ ص ۲۳۱ (۳) کشف الظنون ج ۱ ص ۷۲۳ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۴ (۴) ابن خلکان ج ۱ ص ۴۹۵ (۵) معارف ج ۱۸ ص ۱۰ ۴ کشف الظنون ج ۲ ص ۴۹۵۔

سے محمد بن محمد خانجی کی تعلیق کے ساتھ مصر سے پندرہ صفحات میں شائع ہوئی ہے،(۱) صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ یہ ایک ہزار مسائل پر مشتمل ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مطبوعہ رسالہ اصل کتاب کا مختصر ہے۔

۲۶و۲۷- کتاب الزہد: اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، امام احمد اور ابن مبارک کی کتابیں زیادہ اہم اور مشہور ہیں، امام بیہقی نے زہد میں کتاب الزہد الکبیر اور کتاب الزہد الصغیر کے نام سے دو کتابیں لکھی تھیں، کتاب الزہد الکبیر کا ایک قلمی نسخہ مدینہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام میں اور دوسرا مکتبہ سندیہ میں ہے۔(۲)

۲۸- کتاب الاعتقاد: اس میں عقائد کے وہ اصول وفروع بیان کئے گئے ہیں جن کو جاننا اور ان پر اعتقاد رکھنا مکلّف لوگوں کے لیے ضروری ہے، اس کی ترتیب ابواب پر ہے، امام برہان الدین ابراہیم بن عمر بقائی (م ۸۸۵ھ) نے خیر الزاد المنتقی من کتاب الاعتقاد کے نام سے اس کا انتخاب کیا تھا، اس کا مکمل نام کتاب الاعتقاد والہدایہ الی سبیل الرشاد ہے بعض نے کتاب المعتقد بھی لکھا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ''یہ بڑی نفیس اور عمدہ کتاب ہے۔''(۳)

۲۹- کتاب المبسوط: یہ عظیم الشان کتاب بیس جلدوں میں ہے، امام بیہقی خود فرماتے ہیں کہ امام شافعی کے قدیم قول نقل کرنے اور ان کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں نے توفیق الٰہی سے ان کے دلائل تحریر کیے ہیں اور اس کو امام مزنی کی مختصر کی ترتیب پر اس لیے مدون کیا گیا ہے کہ جو لوگ مفصل اور مبسوط مباحث دیکھنے کے خواہش مند ہوں وہ اس کی جانب رجوع کر سکیں۔

---

(۱) ایضاً ص ۲۹۸ وفوائد جامعہ ص ۷۷و۷۸۔ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۱۹ والرسالۃ المستطرفہ ص ۴۴ ومعارف ج ۱۸ ص ۳۲ وتذکرۃ النوادر ص ۱۹۱ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۳ والرسالۃ المستطرفہ ص ۴۰ وبستان المحدثین ص ۶۴۔

۳۰- کتاب القراۃ خلف الامام: یہ رسالہ مولانا تلطف حسین مرحوم کے زیر اہتمام مئی ۱۹۱۵ء میں مطبع پرنٹنگ ورکس دہلی سے متوسط تقطیع کے ۱۷۶ صفحات میں شائع ہوا تھا، اصل کتاب ۱۶۰ صفحوں پر مشتمل ہے، سولہ صفحات میں مضامین اور اغلاط کی فہرست ہے، اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ امام، مقتدی اور منفرد سب کو خواہ سری نماز ہو یا جہری سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے کیوں کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی، مصنف نے اس بحث کی تمام روایات واحادیث جمع کر کے شوافع کے مسلک کو قوی اور مرجح ثابت کیا ہے اور دوسرے فقہا کے مسالک اور ان کی موید حدیثیں بھی ذکر کی ہیں، حدیث ورجال کی فنی بحثیں اور اہل لغت وادب کے بیانات بھی جہاں ضروری معلوم ہوئے ہیں دیدیے گئے ہیں۔

۳۱- کتاب الاسماء والصفات: بیہقی کی اس مفید اور جامع کتاب کو علامہ ابن سبکی نے عدیم النظیر اور بے مثال بتایا ہے، ۱۳۱۳ھ میں یہ پہلی مرتبہ مطبع انوار احمدی الہ آباد اور پھر مصر سے شیخ محمد زاہد کوثری کے حواشی وتعلیقات کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اس میں خدا کے ناموں اور صفتوں پر مبسوط بحث کی گئی ہے اور ہر مبحث کے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں، ضمناً تفسیر وکلام اور حدیث ورجال کی بعض فنی بحثیں بھی آ گئی ہیں، علامہ کوثری اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مصنف نے ہر باب سے متعلق جتنی حدیثیں مروی ہیں ان سب کو اکٹھا کر دینے کی کوشش کی ہے اور صحیح وغیر صحیح حدیث کی تصریح اور اسماء وصفات سے متعلق وارد نصوص کی توجیہ وتاویل، ماہرین فن اور اہل نظر کے بیان کردہ مرادی معانی بھی بیان کیے ہیں۔
>
> چند مقامات سے قطع نظر مصنف کی اکثر بحثیں نہایت عمدہ اور خوب ہیں۔''(۱)

۳۲- کتاب المدخل: یہ دراصل کتاب السنن الکبیر کا مقدمہ ہے، اسی لیے اس کا

(۱) بحوالہ فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ ص ۱۴۴ و ۱۴۵۔

پورا نام المدخل الی السنن ہے، اس میں امام بیہقی نے فن حدیث کے نکات اور ضروری اصولی مباحث کی تشریح کی ہے تاکہ سنن سے استفادہ کرنے والوں کو سہولت ہو، یہ مقدمہ بعض حیثیتوں سے خود ایک مستقل کتاب ہے جو کئی ابواب پر مشتمل ہے، راقم کو اس کے صرف ایک ہی قلمی نسخہ کا علم ہوسکا ہے، جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ کی زینت ہے مگر ناقص الاول ہے اور صرف ۵۷ ورقوں پر مشتمل ہے، اس کے متعلق مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کا ایک مبسوط مقالہ معارف اپریل ومئی ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا ہے، اس کی ترتیب ابواب پر کی گئی ہے اور بارہ جزوں پر مشتمل ہے، ہر باب کے مطابق سرد روایات کے بعد نتائج کا استنباط بھی کیا گیا ہے، کتاب معرفۃ السنن میں اس کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں، علامہ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) نے کتاب المدخل کی تلخیص کی تھی، انھوں نے مقدمہ ابن صلاح کے مختصر میں جن فوائد کا اضافہ کیا ہے، ان میں سے بعض کے متعلق خود یہ بیان کیا ہے کہ وہ بیہقی کی کتاب المدخل سے ماخوذ ہیں، اسی طرح امام سیوطی کی تدریب الراوی میں بھی اس کے حوالے موجود ہیں۔

۳۳-شعب الایمان: اس کتاب کا پورا نام الجامع المصنف فی شعب الایمان ہے، یہ بیہقی کی مفید ومشہور کتاب ہے جو دو جلدوں اور ۷۷ ابواب پر مشتمل ہے، امام صاحب کے پوتے ابوالحسن عبیداللہ اور ابوالقاسم زاہر بن طاہر شحامی اس کے راوی ہیں، (۱) اس میں مصنف نے صحیحین وغیرہ کی مشہور حدیث الایمان بضع وسبعون شعبۃ الخ کے مطابق ایمان کے ستر شعبوں کی تفصیل تحریر کی ہے، نیز ہر ہر شعبہ کے متعلق دوسری روایتیں اور قرآنی آیتیں بھی استشہاد میں پیش کرکے ان کی شرح وتوضیح کی گئی ہے۔

شمس الدین تونوی اور معین الدین محمد بن حمویہ نے اس کے مختصر اور جلال الدین سیوطی نے ایک جلد میں زوائد تحریر کیے ہیں، (۲) اس کا مختصر مصر سے عربی میں اور اردو

(۱) مختصر شعب الایمان ص ۵و۶ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۳۸۵۔

ترجمہ کارخانہ تجارت کتب کراچی سے شائع ہوا ہے۔

۳۴۔ کتاب معرفۃ السنن والآثار: یہ امام بیہقی کی معرکۃ الآرا کتاب ہے، امام صاحب ابھی اس کی ترتیب وتالیف سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بعض لوگوں نے اس کی اہمیت اور مقبولیت کے خواب دیکھے، اس کے شروع میں حدیث وسنت کی اہمیت روایت، اسناد میں احتیاط اور بعض ضروری فنی مباحث، اجماع، اجتہاد، قیاس، عام وخاص، امرونہی دلیل خطاب اور ناسخ ومنسوخ وغیرہ کی نوعیت، امام شافعی کے حالات وکمالات اور اجتہادی مرتبہ پر لطیف بحث کی گئی ہے، اس کے بعد فقہی ابواب کی ترتیب پر احکام ومسائل سے متعلق روایات جمع کی گئی ہیں، روایات کے نقل میں سرد واستقصا سے کام لیا گیا ہے اور ایک نوع کی روایتوں کے متعدد طرق واسناد کی تخریج، ان کی صحت وسقم، ان سے استنباطات کا ذکر اور امام شافعی کے آرا واقوال کی تصریح کی گئی ہے، علامہ ابن سبکی کا بیان ہے کہ کوئی شافعی المذہب اس کتاب سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ یہ کتاب کئی اجزا پر مشتمل ہے، اس کا ایک جز جو طہارت اور نماز کے ابواب پر مشتمل ہے مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری کے ہاتھ کا لکھا ہوا، دارالمصنفین کے کتب خانہ میں ہے، موصوف نے اس کا ایک مختصر جز بانکی پور پٹنہ سے شائع بھی کیا ہے، اس میں طہارت کے اکثر ابواب آگئے ہیں۔

۳۵و۳۶۔ کتاب السنن: امام بیہقی کی سنن میں دو کتابیں ہیں، ایک السنن الکبیرہ یا سنن کبریٰ اور دوسری السنن الصغیرہ یا سنن صغریٰ کے نام سے موسوم ہے اور جیسا کہ ناموں سے ظاہر ہے، احکامی احادیث پر مشتمل ہیں، ان کو امام مزنی کی مختصر کی طرح پر فقہی ابواب پر مرتب کیا گیا ہے، دونوں کی ابوالقاسم زاہر بن طاہر شحامی نے امام صاحب سے روایت کی ہے، بعض علمائے اسلام کا بیان ہے کہ اسلامیات کے ذخیرہ میں ایسی عظیم الشان کتابیں نہیں لکھی گئیں، سنن صغریٰ ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، اس کے ناقص قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ مصر میں ہیں۔(۱) سنن کبریٰ مکمل دس جلدوں میں دائرۃ المعارف

(۱) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج۱ص ۳۵۱و۳۵۲۔

حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے، اس کا مختصر تعارف اور اس کے متعلق بعض معلومات درج ذیل ہیں:

سنن کبریٰ، امام بیہقی کی مایۂ ناز اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے جو نہ صرف بیہقیات بلکہ پورے ذخیرۂ حدیث کی ممتاز اور اہم کتاب ہے، اس کی عظمت اور اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ صحاح ستہ کے بعد جن کتابوں کو غیر معمولی شہرت اور بقائے دوام نصیب ہوا، ان میں یہ بھی ہے، حافظ ابن صلاح نے صحاح ستہ کے بعد کی عمدہ اور پر منفعت اور علامہ سیوطی نے معتبر و مستند کتابوں میں اس کو شمار کیا ہے اور شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کو محسوب کیا ہے، اس کی اہمیت کی بنا پر بعض اساطین فن کا بیان ہے کہ ''اسانید، علل، اسماء الرجال اور صحاح کے متون کے علاوہ جن متون کا علم وسماع ایک محدث اور طالب فن کے لیے ضروری ہے، ان میں کتاب السنن الکبیر کا متن بھی ہے، اس کو مصنف کی زندگی ہی میں پوری شہرت و مقبولیت اور مکمل اعتبار و استناد حاصل ہو گیا تھا، ان کے استاذ امام ابو محمد عبداللہ بن یوسف جوینی نے بہ صرف کثیر اس کا نسخہ حاصل کر کے بڑے شوق سے ملاحظہ فرمایا اور اپنی مسرت و اطمینان کا اظہار کیا، (۱) امام بیہقی نے اس کی ترتیب و تالیف اور متون و اسناد کی صحت و جودت میں بڑی احتیاط اور نہایت چھان بین سے کام لیا ہے، اہل فن کو اعتراف ہے کہ سنن میں دیدہ و دانستہ کوئی موضوع حدیث شامل نہیں کی گئی ہے۔

خصوصیات: سنن بیہقی کی چند اہم اور نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

۱- جامعیت، ضخامت اور حجم وغیرہ سے قطع نظر اس میں متعدد ایسی حدیثیں شامل ہیں جو حدیث کی معروف و معتبر کتابوں میں نہیں ہیں اور بے شمار ایسی حدیثیں بھی ہیں جو اگرچہ دوسری کتابوں میں موجود ہیں لیکن بیہقی کے اسناد و متون میں بعض مفید اضافے ہیں، چنانچہ جو حدیثیں دوسری کتابوں میں مختصر و مجمل یا عام و مطلق مروی ہیں وہ اس میں مطول

(۱) معرفۃ السنن والآثار مطبوعہ ص ۵۵۔

ومفسر اور خاص ومقید نقل کی گئی ہیں، اسی طرح جو کتابیں دوسری کتابوں میں ضعیف سندوں یا موقوف، مرسل اور منقطع نقل ہوئی ہیں، وہ اس میں صحیح سندوں سے مرفوع، مسند اور متصل درج کی گئی ہیں۔

درحقیقت وجوہ وطرق کی کثرت اور تعدادِ اسناد کو محدثین کے نزدیک بڑی اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ یہ حدیث کی قوت کا موجب ہے، سنن بیہقی اس اعتبار سے بڑا امتیاز رکھتی ہے، امام بیہقی نے تعدد طرق، کثرت اسانید اور متحد المعنی روایات کو جمع کرنے کی طرف خاص دھیان دیا ہے۔

۲- تراجم کی کثرت بھی سنن بیہقی کی امتیازی شان ہے، انھوں نے ہر ہر مسئلہ کے لیے مستقل اور جداگانہ ابواب قائم کیے ہیں، اس کی وجہ سے ایک روایت کے گوناگوں پہلو اور مختلف گوشے سامنے آ گئے ہیں۔

۳- معانی ومطالب کی وسعت وتنوع اور استدلال، استنباط اور استخراج کے لحاظ سے سنن بیہقی بے نظیر کتاب مانی جاتی ہے، عنوانات اور ابواب قائم کرکے آیات واحادیث سے لطیف استنباط کیے گئے ہیں جن کی طرف عموماً ذہن منتقل نہیں ہوتا، اس طرح استدلال میں بھی نہایت دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے، اس خصوصیت کا آگے مزید ذکر آئے گا۔

۴- علامہ ابن سبکی نے اس کو ترتیب وتہذیب اور جودت تصنیف وغیرہ کے لحاظ سے بے نظیر کتاب قرار دیا ہے، مصنف نے اس کی تالیف وترتیب میں نہایت لطیف اسلوب اور عمدہ پیرایہ بیان اختیار کیا ہے، طرز استدلال، تقسیم ابواب اور حدیثوں کی وضع وترتیب میں ندرت کے باوجود بڑی موزونیت اور مناسبت پائی جاتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ابواب کے تفنن اور اسالیب کے تنوع کے اعتبار سے اس کا درجہ اکثر کتب سنن ومسانید سے بڑھا ہوا ہے، امام بخاری کی طرح امام بیہقی کے ابواب بھی حدیث سے ماخوذ ہوتے ہیں کہیں کہیں مناسبت کا پہلو بہت دقیق اور کہیں کہیں نہایت معمولی ہوتا ہے، بعض ابواب کے آخر

میں ایسی حدیثیں درج کی ہیں جن کی آنے والے باب وترجمہ سے مناسبت بالکل واضح ہوتی ہے، جیسے باب قتل الرجل بالمرأۃ کے خاتمہ کی حدیث میں ایک یہودی کے ایک مسلمان بچی کے قتل وقصاص کا ذکر ہے اور اس کے بعد فیمن لا قصاص بینہ باختلاف الدینین لائے ہیں،(۱) بعض ابواب ظاہری مفہوم کے لحاظ سے باہم دگر مختلف معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل ان مختلف ابواب سے امام صاحب کا مقصد کسی خاص مسلک کو جو ان کے نزدیک بالکل محقق ہوتا ہے، الفاظ اور عبارتوں کے تنوع، تجدید ابواب اور تخریج احادیث کے ذریعہ مدلل طور پر ثابت کرنا ہوتا ہے۔

۵- امام بیہقی نے حوالے اور حدیثوں کے مآخذ کی نشاندہی کر دی ہے، اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ حدیث اور کن کن کتب حدیث میں مذکور ہے، صحیحین کے حوالے اس کثرت سے دیئے ہیں گویا سنن بیہقی المستخرج علی الصحیحین بن گئی ہے، حوالہ دینے کے ساتھ انھوں نے اس فرق واختلاف کو بھی واضح کر دیا ہے جو ان کی اور دوسری کی روایت کے سند ومتن میں پایا جاتا ہے۔(۲)

---

(۱) السنن الکبریٰ ج ۸ ص ۴ (۲) صحیحین کے حوالوں کے سلسلہ میں یہ واضح رہنا چاہئے کہ امام بیہقی نے الفاظ ومعانی اور متون وغیرہ کی ہو بہو اور بالکل ٹھیک ٹھیک مطابقت کا التزام نہیں کیا ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی روایت میں ان الفاظ واسناد کا ذکر کیا ہے جو ان کو اپنے شیوخ سے ملے ہیں، اس لیے ان کے اور صحیحین کے الفاظ ومعانی میں اکثر معمولی اور خفیف سا فرق ہوتا ہے اور اس کی انھوں نے عمدہ تصریح ووضاحت کر دی ہے، علامہ ابن صلاح لکھتے ہیں:

وهكذا ما اخرجه المولفون في تصانيفهم المستقلة كالسنن الكبير للبيهقي وشرح السنة لابي محمد البغوي وغيرهما مما	اسی طرح جن مصنفین نے جیسے امام بیہقی اور ابومحمد بغوی نے اپنی مستقل تصنیفات سنن کبیر وشرح السنۃ وغیرہ میں جو یہ کہا ہے کہ ''اس حدیث کی امام بخاری ومسلم

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

۶۔ سنن بیہقی فقہی مسائل و معلومات کا گنجینہ ہے، اس کے ابواب و تراجم فقہی مسائل ہی کے لحاظ سے قائم کیے گئے ہیں، علاوہ ازیں ایک ایک حدیث سے مختلف مسائل کو مستنبط اور متعدد ابواب کی تفریع کی گئی ہے، اس سے امام بیہقی کے فقہی کمال اور اجتہادی مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے، صحابہ و تابعین کے آثار اور ائمہ مابعد کے اقوال و مسالک بھی جمع کیے گئے ہیں اور ضعیف و قوی اور مرجوح و راجح اقوال میں محاکمہ بھی کیا گیا ہے، امام شافعی کے قدیم وجدید اقوال، شوافع کے مذہب، اصول اور دلائل خصوصیت سے ذکر کیے گئے ہیں،

قالوا فیه اخرجه البخاری او مسلم فلا یستفاد بذالك اکثر من ان البخاری او مسلما اخرجا اصل ذالك الحدیث مع احتمال ان یکون بینهما تفاوت فی اللفظ وربما کان تفاوتافی بعض المعنی فقد وجدت فی ذالك مافیه بعض تفاوت من حیث المعنی واذا کان الامر فی ذالك علی هذا فلیس لك ان تنقل حدیثا منهما وتقول هوعلی هذا الوجه فی کتاب البخاری او کتاب مسلم الا ان تقابل لفظه او یکون الذی خرجه قد قال اخرجه البخاری بهذا اللفظ۔	نے تخریج کی ہے" تو اس سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ اس کی اصل شیخین کے یہاں موجود ہے، ورنہ دونوں کے درمیان لفظ اور بعض اوقات معنی میں بھی فرق و تفاوت کا احتمال رہتا ہے، ایسی حالت میں تم اس طرح کی کتابوں سے کوئی حدیث نقل کر کے یہ نہیں کہہ سکتے ہو کہ وہ بعینہ اسی شکل میں بخاری یا مسلم کی کتابوں میں بھی موجود ہے، تا آں کہ تم دونوں کے الفاظ کا مقابلہ نہ کرلو یا یہ کہ خود تخریج کرنے والا اس کے متعلق یہ واضح کر دے کہ اس کی ان ہی لفظوں کے ساتھ امام بخاری نے تخریج کی ہے۔

(مقدمہ ابن صلاح ص ۱۲
مطبع قیم بمبئی ۱۳۵۷ھ)

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب لکھ کر انھوں نے امام شافعی پر احسان کیا ہے، اس ضمن میں ان کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے مختلف فیہ امور ومسائل کے متعلق صرف اپنے فقہی مسلک کی موید روایات واحادیث نقل کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ دوسرے مذہب کی موید حدیثوں کو بھی بیان کیا ہے۔

۷- امام بیہقی جرح وتعدیل کے بھی امام تھے، اس لیے اس میں اسانید ومتون کے متعلق مبسوط ومفصل کلام کیا گیا ہے اور احادیث ورجال کی قوت وضعف، جرح وعدالت صحت وسقم اور ترجیح وتضعیف وغیرہ کے متعلق بڑا وافر مواد جمع کر دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں ناقدین ومبصرین فن کے اقوال خاص اہتمام سے منضبط کئے گئے ہیں، اس طرح اسناد ورجال اور روایات ومتون کے بارے میں اس کے اندر مختلف النوع مفید اور معلومات افزا وضاحتیں اور تصریحات آ گئی ہیں۔

۸- بعض کتب وابواب کے شروع مین ان کی مناسبت اور محل کے اقتضا کے لحاظ سے کلام مجید کی آیتیں اور حدیثوں کے ٹکرے بھی نقل کئے گئے ہیں جو معنی خیز ہونے کے علاوہ امام بیہقی کی وسعت علم ونظر اور قوت استدلال کا نمونہ بھی ہیں۔

۹- امام بیہقی نے احادیث کی مناسب توجیہ وتطبیق، ان کے مصالح وحکم، ان کی کسی خاص دلالت، ان سے ثابت ہونے والے مخصوص مسئلہ اور ان سے استدلال واستنباط کے کسی اہم نکتہ اور پہلو کا تذکرہ بھی کیا ہے، بعض بحثوں کے سلسلہ میں شارحین حدیث کے آرا اور اہل لغت کے اقوال بھی نقل کئے ہیں، کہیں کہیں فنی اور اصطلاحی تشریحات بھی کی گئی ہیں، سنن بیہقی کے ان گوناگوں خصوصیات اور جامعیت نے اس کو حدیث کی امہات کتب کی صف میں جگہ دی ہے، درحقیقت یہ امام بیہقی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جس کے سامنے ارباب کمال اور ائمہ سرنگوں نظر آتے ہیں، چنانچہ ان کو اعتراف ہے کہ متاخرین خصوصا چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں امام دارقطنی کے بعد ان پایہ اور مرتبہ کا کوئی اور

محدث نہیں گذرا ہے، علامہ ابن صلاح سنن کی عظمت واہمیت اور جامعیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ماتم كتاب فى السنة اجمع للادلة من كتاب السنن الكبرى للبيهقى كانه لم يترك فى سائر اقطار الارض حديثا الا وقد وضعه فى كتابه۔ (۱)

دلائل کے لحاظ سے بیہقی کی سنن کبریٰ سے زیادہ جامع اور مکمل تصنیف حدیث وسنت کے ذخیرہ میں موجود نہیں گویا امام صاحب نے تمام حدیثوں کو چھان بین کرکے اس میں جمع کردیا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ تمام ترصحیح وثابت حدیثوں کا ہی ذخیرہ نہیں ہے، جب ضعیف اور غیر معتبر روایتوں سے حدیث کی مشہور ومتداول کتابیں بھی یکسر خالی نہیں ہیں تو اتنے ضخیم مجموعہ میں ضعیف اور کمتر درجہ کی حدیثوں کا شامل ہوجانا نہ تو تعجب انگیز ہے اور نہ اس سے سنن بیہقی کی اہمیت وعظمت میں کوئی فرق آسکتا ہے، امام بیہقی نے استقصاء تعدد طرق اور کثرت اسانید کے پیش نظر بھی ضعیف ومتروک حدیثیں درج کی ہیں اور امکان کی حد تک ان کے سقوط وضعف کی تصریح کردی ہے۔

امام بیہقی کی اس عظیم الشان اور شہرۂ آفاق تصنیف کو پہلی دفعہ شائع کرنے کا فخر دائرۃ المعارف حیدر آباد کے حصہ میں آیا، دائرہ نے اس کو دس جلدوں میں (۱۳۴۴ھ تا ۱۳۵۶ھ) مختصر مفید حواشی کے ساتھ اہتمام سے شائع کیا ہے، ہر جلد کے آخر میں ابواب (مضامین) اور ناموں (راویوں) کے لحاظ سے دو مفصل فہرستیں دی گئی ہیں، ترتیب وتصحیح کی خدمت دائرہ کے مشہور رکن مولانا محمد ہاشم ندوی مرحوم نے اپنے بعض رفقائے کار کے تعاون سے انجام دی ہے۔

---

(۱) مقدمہ ابن صلاح

ان سب جلدوں کی تصحیح میں مصر، حضرموت، سندھ، مدراس، بمبئی اور رام پور وغیرہ کے نو قلمی نسخوں سے مدد لی گئی ہے۔

قاضی القضاۃ شیخ علاء الدین علی بن عثمان ترکمانی (م ۷۵۰ھ) نے سنن کا ایک ضخیم حاشیہ لکھا تھا، یہ الجواہر النقی فی الرد علی البیہقی کے نام سے موسوم اور سنن کے مطبوعہ نسخہ کے حاشیے پر دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع ہوا ہے۔

علامہ ترکمانی اپنے زمانہ کے مشہور حنفی فاضل تھے، فقہ واصول میں ماہر اور حدیث ورجال مین تبحر رکھتے تھے، الجواہر النقی میں انھوں نے سنن بیہقی پر بطریق معارضہ مناقشات اور بیہقی کے نقد ونظر اور رجال اور روایات کی تصحیح وتضعیف میں تساہل اور استدلال واستنباط کی بعض خامیوں کا تذکرہ اور اسی نوع کے بعض دوسرے تعقبات کیے ہیں، یہ حاشیہ دو حصوں میں ہے، ترکمانی کے بعض استدراکات اور تنقیدیں ضرور اہم ہیں لیکن بعض میں بحث وکلام کی گنجائش ہے، زین الدین قاسم بن قطلو بغا حنفی نے ترصیع الجواہر النقی کے نام سے حروف معجم پر اس کی تلخیص کی تھی مگر وہ ناتمام رہ گئی تھی۔ (۱)

بیہقی وسنن بیہقی پر اعتراض: امام بیہقی پر کیے جانے والے اعتراضات میں تعصب اور شافعیت میں غلو کا اعتراض اہم اور قابل ذکر ہے، ان کے زمانہ میں شخصی تقلید کی بنیاد بھی پڑ چکی تھی اور فقہی وجماعتی عصبیت میں بڑی شدت بھی پیدا ہوگئی تھی، چنانچہ بعض اکابر علما کی طرح ان کا دامن کمال بھی اس سے آلودہ نظر آتا ہے، ان کی کتابوں میں شافعیت کی پرزور وکالت اور امام شافعی سے پرجوش عقیدت بہت نمایاں ہوگئی ہے، اس حد تک بھی مضائقہ نہ تھا لیکن بعض مسائل میں ان کا رویہ انصاف اور حق پسندی پر مبنی نہیں معلوم ہوتا، علاوہ ازیں انھوں نے معرفۃ السنن والآثار میں حنفی مذہب کے ممتاز فقیہ ومجتہد امام طحاوی پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ''انھوں نے بعض کمزور حدیثوں کو جو ان کی رائے کے موافق تھیں تصویب اور بعض صحیح

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۶ والرسالۃ المستطرفۃ ص ۳۰۔

حدیثوں کی اپنی رائے ومسلک کے خلاف ہونے کی وجہ سے تردید کی ہے۔" یہ اعتراض بے جا ہے، اس کتاب کی پہلی جلد میں امام طحاوی کے تذکرہ میں اس پر تبصرہ گذر چکا ہے۔

تاہم امام بیہقی نے سنن میں بعض جگہ شوافع کے مسلک اور امام شافعیؒ کے آرا کو مرجوح بھی قرار دیا ہے، کہیں کہیں امام شافعی کے ان اقوال کو صحیح اور اولیٰ قرار دیا ہے، جو متعارف اور مشہور قول کے خلاف ہوتے ہیں جیسے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ امام شافعی مسح میں تکرار کے قائل تھے، لیکن امام بیہقی نے اس کی تردید کی ہے، بعض جگہ انھوں نے امام شافعی کے قول کی تردید کر کے ان کی جانب سے توجیہ پیش کی ہے، جیسے صیام عن المیت کے باب میں مختلف روایتیں اور حدیثیں بطور دلیل نقل کر کے ان کے قول کی تردید کی ہے، مگر آخر میں ان کی جانب سے یہ عذر بھی پیش کیا ہے کہ:

ولو وقف الشافعي رحمه الله	اور اگر امام شافعیؒ ان تمام حدیثوں کے
على جميع طرقها ونظائرها	طرق سے واقف ہوتے تو ان کی
لم يخالفها انشاء الله. (۱)	مخالفت نہ کرتے۔

اسی طرح انھوں نے سنن میں اپنے مسلک ومذہب کے مخالف اقوال اور دوسرے فقہا کے مذاہب کی موید حدیثیں بھی اسی فراخدلی کے ساتھ بیان کی ہیں، جس طرح خود اپنے مذہب ومسلک کی موید روایتیں نقل کی ہیں، یہ الگ بحث ہے کہ ان کے نزدیک روایات کا پایہ اور درجہ کیا ہے۔

☆☆☆

(۱) سنن بیہقی ج ۴ص ۲۵۷۔

حافظ ابن عبدالبر قرطبی

(متوفی ۴۶۳ھ)

نام ونسب: یوسف نام، ابوعمر وکنیت اور ابن عبدالبر عرفیت ہے، صحیح شجرۂ نسب یہ ہے:
یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر بن عاصم۔(۱)

ولادت: بروز جمعہ ۲۵/ربیع الآخر ۳۶۸ھ کو پیدا ہوئے۔(۲)

خاندان ووطن: ابن عبدالبر کا وطن قرطبہ ہے جو اندلس کا پایہ تخت اور دنیائے اسلام کا عظیم الشان اور ممتاز شہر ہے، گو آپ کا مولد بلاد مغرب ہے لیکن آباء واجداد عرب نژاد اور قبیلہ نمر بن قاسط سے تعلق رکھتے تھے، آپ کے والد بزرگوار ابومحمد عبداللہ (متوفی ۳۸۰ھ) قرطبہ کے اکابر علما وفقہا اور ممتاز لوگوں میں تھے، ان کو شعر وادب سے بھی شغف تھا، (۳) ابن عبدالبر کی نشو ونما اسی صاحب کمال باپ کی آغوش میں ہوئی تھی، وہ وطن کی نسبت سے قرطبی اور خاندان کی نسبت سے نمری کہلاتے ہیں۔

اساتذہ: حافظ ابن عبدالبر نے جن ائمہ کمال سے استفادہ کیا تھا ان کے نام یہ ہیں:

ابوزکریا اشعری، ابوسعید نصر، ابوعمر باجی، ابوعمر طلمنکی، ابوالقاسم بن ابوجعفر، ابومحمد بن اسد، ابوالولید بن فرضی، ابراہیم بن نصر، ابوعمر احمد بن حسور، احمد بن فتح الرسان، احمد بن قاسم نزار، حسین بن یعقوب، خلف بن سہل، ابوالقاسم خلف بن قاسم، سعد بن نصر، سعید بن قزاز، ابوزید عبدالرحمٰن بن یحییٰ، عبداللہ بن محمد جہنی، ابومحمد عبداللہ بن محمد بن عبدالمومن،

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰۶ (۲) ابن خلکان ج ۳ ص ۱۷ وتدریب الراوی ص ۲۶۱ (۳) الدیباج الذہب ص ۳۵۹۔

ابوعبداللہ محمد بن عبدالملک بن ضیغون، عبدالوارث بن سلیمان، یحییٰ بن وجہ الحیۃ۔

دور دراز کے حسب ذیل علمانے ان کو روایت حدیث کی اجازت تحریراً عطا کی تھی۔

ابوذر ہروی، ابوالفتح بن سی بخت، عبدالغنی منذری مصری، ابوالقاسم عبداللہ بن سقفی، مصری اور ابومحمد نحاس مصری وغیرہ ان کو حافظ ابوالولید بن فرضی کی خدمت میں رہنے اور استفادہ کرنے کا زیادہ موقع ملا، ان سے حدیث، رجال اور ادب وغیرہ علوم حاصل کئے۔(۱)

تلامذہ: ابن عبدالبر سے جن لوگوں نے استفادہ کیا تھا اُن کے نام یہ ہیں:

ابوالعباس والائی، ابوعبداللہ حمیدی، ابومحمد بن ابی قحافہ، ابواحمد جعفر بن حجاف (امیر بلنسیہ) ابوعلی حسین بن احمد غسانی، ابوبحر سفیان بن عاصی، ابوداؤد سلیمان بن ابوالقاسم مقری، ابوالحسن ظاہر بن مفوز، محمد بن فتوح انصاری۔(۲)

رحلت وروایت کی ابتدا: ان کے علم وفن کی تحصیل اور سماع حدیث کی ابتدا کب ہوئی؟ اس کا پتہ نہیں چلتا، تاہم وہ اپنے معاصر خطیب کی ولادت کے وقت علم حدیث کی تحصیل میں مشغول ہو چکے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بچپن ہی میں اس فن کی تحصیل شروع کر دی تھی، بعض مورخین کا بیان ہے کہ وہ نہ اندلس سے باہر تشریف لے گئے اور نہ ان ستر علما کے علاوہ جو اس زمانہ میں یکتا تھے، کسی کو دیکھا اور نہ ان کے علاوہ کسی سے علم حاصل کیا لیکن صحیح یہ ہے کہ گو ان کا قیام عموماً زیادہ اندلس ہی میں رہا اور انھوں نے بلاد مغرب کے باہر قدم نہیں نکالا، مگر اندلس کے شرق وغرب اور مغرب کے اکثر شہروں میں تشریف لے گئے، چنانچہ مختلف وقتوں میں دانیہ، بلنسیہ اور شاطبیہ میں سکونت اختیار کی، ان پر علم کا شوق ہمیشہ مستولی رہا اور وہ کبھی علم کی طلب وتحصیل سے غافل نہیں ہوئے۔(۳)

(۱) کتاب الانساب ورق ۴۴۷ و ۵۶۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۶ وابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۷ والدیباج ج ۱ ص ۳۵۷ (۲) تذکرہ والدیباج، حوالہ سابقہ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۶ وابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۸ والدیباج المذہب ص ۳۵۷ وبستان المحدثین ص ۶۹۔

حفظ وضبط اور ثقاہت: علامہ ابن البر کے حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان پر محدثین اور علمائے فن کا اتفاق ہے، حفظ واتقان میں سرآمد روزگار اور تمام معاصرین سے فائق ہونے کی بنا پر حافظِ اندلس کہلاتے تھے، ابوالولید باجی فرماتے ہیں کہ اہل مغرب میں ان سے بڑھ کر نامور اور ممتاز حافظ حدیث کوئی اور نہ تھا، صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ اندلس کی سرزمین میں وہ سنن ماثورہ کے سب سے بڑے حافظ تھے، اہل سیر نے ان کی توثیق وتعدیل کرتے ہوئے ان کو ثقہ وحجت بتایا ہے۔(۱)

حدیث میں درجہ ومرتبہ: تمام علمائے فن نے حدیث میں ان کے کمال وامتیاز کا اعتراف کیا ہے، گوان کو متعدد علوم سے مناسبت تھی لیکن زیادہ اور اصلی اشتغال وانہماک اسی فن سے تھا، اس لیے حدیث ورجال میں وہ نہایت ممتاز تھے، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مغرب کے باہر قدم نہیں نکالا مگر اس کے باوجود بقول شاہ عبدالعزیز صاحبؒ ان کا پایہ خطیب بیہقی اور ابن حزم جیسے ارباب کمال واساطین فن سے کمتر نہیں تھا بلکہ وہ بعض حیثیتوں سے ان سب میں ممتاز تھے، ابن خلکان کا بیان ہے کہ وہ حدیث واثر کے حافظ اوران کے متعلقہ علوم میں امام عصر تھے، ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ مکثر حفاظ میں تھے، نیز علم حدیث ورجال کے ممتاز عالم تھے، انھوں نے فن حدیث میں ایسی مہارت اور پختہ استعداد بہم پہنچائی کہ متقدمین میں علمائے اندلس پر گوئے سبقت لے گئے، ابوالولید باجی کا بیان ہے کہ اندلس میں ابوعمرو سے زیادہ حدیث میں کوئی بلند پایہ شخص نہیں تھا، صاحب دیباج رقمطراز ہیں کہ وہ علمائے اندلس کے شیخ اور محدث کبیر تھے، غسانی فرماتے ہیں کہ ابن عبدالبر کہتے تھے ہمارے شہر میں قاسم بن محمد اور احمد بن جلد حباب کے ہم پایہ اور ہمسر کوئی شخص نہیں، حالانکہ وہ خود ان لوگوں سے کمتر نہ تھے۔

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۶ وابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۸ والدیباج المذہب ص ۳۵۷ وبستان المحدثین ص ۶۹۔

حدیث میں ان کی عظمت و بلند پائیگی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن صلاح اور نووی نے ائمہ صحاح کے بعد کے سات اہم اور برگزیدہ محدثین کی فہرست میں ان کا نام بھی لکھا ہے اور شاہ عبدالعزیزؒ نے مالکیہ میں ان کو سب سے بڑا صاحب کمال شارح حدیث قرار دیا ہے، ان کے علوے اسناد سے بھی ان کے کمال کا پتہ چلتا ہے، تمام محدثین نے ان کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں امامت فن کی طرح علوئے اسناد کا بھی ان پر خاتمہ ہو گیا، ان کے علوئے اسناد کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ (وكان سنده مما يتنافس فيه) یعنی ان کی سندیں، قابل رشک ہوتی ہیں، ان کے عوالی اسناد میں ابوداؤد کی سنن اور زعفرانی کی کتاب کا خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے، کیوں کہ ان کے اور مصنفین کے درمیان صرف دو ہی واسطے ہیں۔(۱)

رجال اور جرح وتعدیل میں امتیاز: حافظ ابن عبدالبر کی حدیث میں جلالت قدر کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کے ماہر تھے، محدثین اور علمائے رجال نے حدیث کی طرح اسماء الرجال سے بھی ان کے شغف کا ذکر کیا ہے، ابوعبداللہ حمیدی فرماتے ہیں "وہ علوم حدیث ورجال کے عالم اور قدیم السماع تھے۔" محمد بن عبدالباقی زرقانی (م۱۰۹۹ھ) لکھتے ہیں کہ وہ حدیث ورجال کے عالم تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ ان کی سند عالی اور وہ توثیق وتضعیف کے ماہر تھے، انھوں نے مؤطا کی جو شرحیں لکھی ہیں، ان سے ان کی حدیث اور جرح وتعدیل دونوں میں مہارت کا پتہ چلتا ہے، بعض اہل علم کا خیال ہے کہ ابن عبدالبر نے متن وسند کی تصحیح، مرسل ومسند کی تمیز موصول ومنقطع میں تفریق اور ضعفا وثقات میں امتیاز کر کے صحیح وسقیم کو پوری کوشش سے الگ کر دیا اور مخفی ومستور حدیثوں کا کھوج لگا کر ان کے علل کی نشاندہی اور اسقام وعیوب پر متنبہ کر دیا، مؤطا کے شروح میں سندوں کی وضاحت پر خاص توجہ مبذول کی ہے اور مرسل ومنقطع اور ملاقات مؤطا پر لطیف

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۵ و ۳۲۶ و ابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۷ و ۴۱۸ والدیباج ص ۳۵۷، ۳۵۸۔

بحث وکلام کیا ہے۔(۱)

تفقہ واجتہاد: فقہ میں بھی نہایت ژرف نگاہ اور صاحب بصیرت تھے، ابوعلی غسانی فرماتے ہیں کہ ہمارے استاد ابن عبدالبر قرطبی نے اپنے وطن میں فقہ کی تحصیل کی اور اس میں نمایاں قابلیت اور بصیرت پیدا کی اور مشہور فقیہ ابوعمر احمد بن عبدالملک ابن ہاشم اشبیلی کی صحبت اختیار کی اور ان سے مسائل کی تحصیل کی ابن خلکان اور ذہبی نے علم حدیث واثر کی طرح فقہ میں بھی ان کے تقدم اور فقہی بصیرت کا ذکر کیا ہے، ابوعبداللہ حمیدی فرماتے ہیں کہ وہ فقیہ اور خلافیات کے عالم تھے۔

ابن عبدالبر اپنے فقہی کمالات کے اعتبار سے مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے، حافظ سید عبدالحی کتانی تحریر فرماتے ہیں کہ وہ ائمہ مجتہدین کے مقام ومرتبہ پر فائز تھے اور مالکی ہونے کے باوجود بعض مسائل میں دوسرے ائمہ کے ہمنوا اور بعض میں منفرد رائے رکھتے تھے۔(۲)

دیگر علوم: اوپر گذر چکا ہے کہ ابن عبدالبر تنہا فقہ وحدیث ہی میں ممتاز نہ تھے، بلکہ ان کو متعدد علوم وفنون سے مناسبت تھی، چنانچہ قرأت وتفسیر، تاریخ وانساب، سیر واخبار اور ادب وعربیت وغیرہ مختلف علوم میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، ان کے سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ علم انساب واخبار میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ذہبی نے ان کی عربیت، ادب اور معانی وبیان میں تبحر کا ذکر کیا ہے اور صاحب مطمح الانفس کا بیان ہے کہ فن ادب میں ان کا تبحر مسلم ہے۔(۳)

شعر وسخن: شعر وسخن کی طرف بھی میلان تھا، چند شعر ملاحظہ ہوں:

تذکرت من یبکی علیّ مداوما — فلم ار الا العلم باالدین والخبر

(۱) تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۵ و ۳۲۶ وابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۰ و ۴۱۸ والدیباج ص ۳۵۵ و ۳۵۸ فہرس الفہارس ص ۴۰۰ (۲) ایضاً (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۶ وابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۸ والدیباج ص ۳۵۸ ومطمح الانفس ص ۷۰۔

علــوم کتاب اللہ والسنن التی　　انت عن رسول اللہ مع صحۃ الاثر
وعلم الاولیٰ من ناقدیہ وفھمنا　　لما اختلفوا فی العلم بالرای والنظر

(ترجمہ) میں نے اس چیز کو یاد کیا جو مجھ پر ہمیشہ بکا کرتی رہے تو دین وحدیث کے علم کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آئی یعنی اللہ کی کتاب اور رسول اللہؐ سے بطریق صحت مروی حدیثوں اور نقادان فن کے علوم اور خود ہماری فہم وبصیرت ان چیزوں کے بارے میں جن کے علم میں لوگوں نے اختلاف رائے کیا ہے۔

یہ دو شعر بھی ان سے منسوب ہیں:

مـقالۃ ذی نصح وذات فوائد　　اذا من ذوی الالباب کان استماحھا
عـلیکـم بـآثـار الـنبی فـانـہ　　من افضل اعمال الرشاد اتباعھا

(ترجمہ) عقلمندوں کی پر موعظت اور فائدہ مند گفتگو کو سن لو، رسولؐ اللہ کے آثار وحدیث کی پیروی کو لازم سمجھو کیوں کہ تمام اعمال رشد سے بڑھ کر اس کا اتباع ہے۔

دو شعر اور ملاحظہ ہوں:

اذاھـــان حــرعــنـدقوم اتــاھم　　ولـم یـنـأ عنھم کان اعمیٰ واجھلا
ولـم تـضـرب الامثـال الالعالم　　ومـاعوتب الانسان الالیعقلا (۱)

(ترجمہ) جب کوئی شریف آدمی کسی قوم کے نزدیک ذلیل ہو جائے اور پھر بھی یہ ان سے دور نہ ہو تو وہ اندھا اور جاہل ہے اور مثلیں تو عالم ہی کے لیے بیان کی جاتی ہیں اور انسان کو فہمائش ہی کے لیے جھڑکا جاتا ہے۔

اعتراف کمالات: علامہ ابن عبدالبر کی عظمتِ شان، بلند پائیگی اور علمی کمالات کا تمام معاصرین فضلاء، ائمہ فن اور ارباب سیر نے اعتراف کیا ہے، ذہبی نے احدالاعلام اور

(۱) بستان المحدثین ص ۱۰۷۔

صاحب شذرات نے العلامۃ العلم لکھا ہے، سمعانی کا بیان ہے کہ وہ جلیل القدر امام فاضل تھے، صاحب تذکرہ نے ان کو الامام وشیخ الاسلام بتایا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اندلس میں وہ بڑے عظیم مقام ومرتبہ کے مالک تھے، ان کی شہرت کا ساری دنیائے اسلام میں غلغلہ تھا، لوگ ان کے پاس سماع کے لیے سفر کرکے آتے اور تمام علمائے زمانہ ان کے علمی کمالات کے سامنے سرنگوں ہو جاتے، سید عبدالحی کتانی فرماتے ہیں کہ ان کی تصنیفات ان کی وسعتِ علم، قوتِ فہم اور ابتکارِ ذہن کا ثبوت ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ وہ بلادِ مغرب کے کبار اور منتخب علماء میں تھے، ان کا علمی پایہ خطیب، بیہقی اور ابن حزم سے کمتر نہیں تھا، حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے علمی کمالات کی وجہ سے نہایت مقبول، مرجع انام، یگانہ روزگار اور امام وقت سمجھے جاتے تھے۔(۱)

فقہی مذہب: بلاد مغرب کے اکابر وفضلا کی طرح وہ بھی امام دارالہجرت کے مکتب فقہ واجتہاد سے وابستہ تھے، عبدالحی کتانی لکھتے ہیں کہ وہ مالکی تھے اور مالکیہ کے لیے قابل فخر تھے، اوپر گذر چکا ہے کہ ان میں اجتہادی شان تھی، اس لیے مسائل میں آزادانہ غور وفکر کرکے مستقل رائیں رکھتے تھے، پہلے وہ اثری اور ظاہری تھے، پھر مالکی ہوئے اور آخر تک اسی پر قائم رہے مگر مالکی ہونے کے باوجود اس مذہب کے جامد مقلد نہ تھے، چنانچہ بعض مسائل میں وہ شافعیہ کے ہم نوا تھے، حافظ ذہبی اور ابوعبداللہ حمیدی وغیرہ نے امام شافعیؒ کے اقوال ومذاہب کی طرف ان کے میلان کا ذکر کیا ہے، ان کے اس میلان کی وجہ سے ابن کثیر نے ان کا طبقات الشافعیہ میں تذکرہ کیا ہے، ان کی بعض تصنیفات میں بھی شافعی مذہب کی جانب میلان کی جھلک موجود ہے، مثلاً مالک وشافعی کے اختلاف پر انھوں نے جو کتاب تالیف کی ہے، اس میں شافعی مذہب کی طرف ان کا رجحان نظر آتا ہے، اسی طرح

(۱) کتاب الانساب ورق ۴۴۷، العبر ج ۳ ص ۲۵۵ شذرات ج ۳ ص ۳۱۴ تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۴ فہرس الفہارس ص ۲۰۱ وبستان المحدثین ص ۶۹۔

رسالۂ الجہر بالبسملہ میں بھی انھوں نے شوافع کے مذہب کی تائید کی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ مالکی تھے، البتہ ان میں اجتہادی بصیرت تھی اوران کا شمار صاحب اختیار فقہا میں ہوتا ہے، اسی لیے اپنے مذہب کے خلاف شوافع کی جانب ان کے میلانات کو قابل ردو انکار نہیں قرار دیا گیا ہے، سید عبدالحی کتانی لکھتے ہیں کہ ابن عبدالبر کی تصنیفات کے تتبع واستقرا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اندھی تقلید سے دور تھے اور امام مالکؒ کے مذہب واصول سے مراجعت کرکے اپنے اعتماد پر کوئی قول اختیار کرتے تھے۔(۱)

عہدۂ قضا: فقہی جامعیت اوراجتہادی بصیرت کی وجہ سے محکمۂ قضا بھی ان کے سپرد کیا گیا، چنانچہ مظفر ابن افطس کے زمانۂ امارت میں وہ اشبونہ اور دشترین کے قاضی رہے۔(۲)

امرا ووزرا سے تعلقات: امرا وسلاطین سے تعلقات بھی تھے اوران کے ہدایا وتحائف ابن عبدالبر کے پاس آتے تھے، شاطبیہ کے زمانۂ قیام میں کچھ لوگوں نے سلطان کے دسترخوان پر کھانا کھانے اوراس کے ہدایا وتحائف قبول کرنے کی وجہ سے اعتراض کیا تو انھوں نے اس کے رد میں اشعار کہے اور متعدد صحابۂ کرام، تابعین اور فقہائے امصار کا اس کے متعلق طرز عمل بیان کرکے واضح کیا کہ یہ حضرات بھی امرا وسلاطین کے تحائف قبول کرتے تھے۔(۳)

تدین: علم وفضل کی طرح ورع وتدین میں بھی ممتاز تھے، مورخین نے ان کے صدق دیانت، حسنِ عقیدہ، عفت، پاکدامنی اوراتباع سنت کا ذکر کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ جو صدق ودیانت، حسن عقیدہ اوراتباع سنت ان کے حصہ میں آیا وہ کسی اور کے حصہ میں کم آیا ہے۔(۴)

---

(۱) تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۶ وبستان المحدثین ص ۷۰ وفہرس الفہارس ص ۲۰۱ و ۲۰۲ (۲) ابن خلکان ج ۳ ص ۲۱۸ وتذکرہ ج ۳ ص ۳۲۶ (۳) نفح الطیب ص ۱۶۱ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۶ وبستان المحدثین ص ۶۹ و ۷۰۔

ابتلا وآزمائش: حافظ ابن عبدالبر کو ابتلا وآزمائش سے بھی دوچار ہونا پڑا، چنانچہ وہ اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر اندلس اور مغرب کے دوسرے علاقوں میں چلے گئے، ابن خلکان اور صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ:

رحل عن وطنه في الفتنة	فتنہ کے وقت وہ اپنے وطن سے رحلت
فجال الغرب الاندلس۔ (۱)	کر کے مغربی اندلس چلے گئے۔

لیکن اس کی مزید تفصیل معلوم نہیں ہوسکی کہ ان کو کس بنا پر ابتلاء کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

وفات: اسی غریب الوطنی میں اندلس کے ایک شہر شاطبیہ میں داعیِ اجل کا پیغام آگیا اور ۹۵ رسال سے زیادہ عمر میں جمعہ کا دن گذار کر ربیع الآخر کی آخری تاریخ کو ۴۶۳ھ میں انتقال ہوا۔ (۲) اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

اولاد: آپ کی اولاد میں ابومحمد عبداللہ بن یوسف کا ذکر ملتا ہے، یہ بھی ذی کمال اور صاحب تصنیفات تھے، اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ یہ ادب وبلاغت کے فن کے عارف اور شاعر تھے، سن وفات ۴۸۰ھ بتایا جاتا ہے۔ (۳)

تصنیفات: وہ ممتاز اور بلند پایہ مصنف تھے، تصنیف وتالیف کا ان کو فطری اور عمدہ ذوق تھا، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ "تصنیف وتالیف میں توفیقِ الٰہی اور تائیدِ ایزدی ان کے شامل حال تھی۔" اللہ تعالیٰ نے ان کی کتابوں سے بڑا فائدہ پہنچایا" علامہ ابن حزم کا بیان ہے کہ "ان کی کتابیں مختلف حیثیتوں سے اہم اور بے مثال ہیں، حافظ ابن کثیر رقم طراز ہیں کہ "ابن عبدالبر عمدہ اور عظیم الشان کتابوں کے مصنف تھے۔" (۴) سید عبدالحی کتانی

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۸ والدیباج ص ۳۵۷ (۲) تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۶، العبر ج ۳ ص ۲۵۵، ابن خلکان ج ۳ ص ۴۲۱ (۳) تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۴۲۱ (۴) ایضاً ونفح الطیب ج ۲ ص ۱۳۱ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۵ والبدایہ ج ۱۲ ص ۱۰۴۔

لکھتے ہیں کہ وہ عدیم النظیر مصنف تھے، ان کی تصنیفات کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

۱-البستان فی الاخدان، ۲-البیان عن تلاوۃ القرآن یا البیان فی تاویلات القرآن (۱)، ۳-کتاب اخبار ائمۃ الامصار (سات جزوں کے بقدر)، ۴-اختصار تاریخ احمد بن سعید، ۵-اختصار التحریر، ۶-اختصار التمییز لمسلم، ۷-کتاب اختلاف اصحاب مالک ابن انس واختلاف روایاتھم عنہ (چوبیس جزوں میں)، ۸-کتاب الاستظہار فی حدیث عمار، ۹-کتاب الشواہد فی اثبات خبر الواحد (ایک جز میں)، ۱۰-کتاب الفرائض، ۱۱-کتاب المدخل فی القراآت یا کتاب التجوید والمدخل الی علم القراآت بالتجرید (۲ جزوں میں)، ۱۲-فہرست الشیوخ۔

۱۳-کتاب جمہرۃ الانساب: یہ عربی قبائل وانساب کے بیان میں ہے۔ (۲)

۱۴-الاحتیال بمافی شعر ابی العتاہیۃ من الامثال، کتب خانہ شیخ الاسلام (مدینہ) میں اس کا قلمی نسخہ ہے۔ (۳)

۱۵-الاجوبۃ المرعیۃ علی المسائل المستغربۃ من صحیح البخاری بھی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں صحیح بخاری کے مشکلات حل کیے گئے ہوں گے۔

۱۶-کتاب العقل والعقلا: موضوع نام سے ظاہر ہے، اس میں عقل اور عقلا کے بارے میں علما، حکما کے ملفوظات ایک جزو میں درج ہیں۔

۱۷-کتاب الکنیٰ: اس میں ان رواۃ کا ذکر ہے جو ناموں کے بجائے کنیتوں سے مشہور ہیں، اسی لیے بعض لوگوں نے اس کا نام کتاب اسماء المعروفین بالکنیٰ لکھا ہے، یہ سات جزوں میں ہے۔

۱۸-کتاب الاکتفاء فی قرأۃ نافع وابی عمرو: اس میں قرائے سبعہ کے ان دونوں

(۱) کشف الظنون ج ۱ (۲) ابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۸ (۳) مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۶۳۔

ائمہ کے اختلافات کی توجیہ اور ان کے دلائل بیان کیے گئے ہیں، یہ ایک جز میں ہے۔

۱۹- کتاب الدرر فی اختصار المغازی والسیر : اس میں رسول اللہ (ﷺ) کے حالات اور غزوات کے واقعات تحریر کیے گئے ہیں، یہ دراصل ابن اسحاق وابنِ عقبہ کی کتابوں کا خلاصہ ہے، کتب خانہ خدیویہ مصر میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے (۱) اور اب شائع بھی ہو چکی ہے۔

۲۰- کتاب بہجۃ المجالس وانس المجالس: اس میں ادب ومحاضرات کی بلند پایہ کتابوں سے نادر واقعات، دلچسپ حکایتیں، منتخب اشعار اور حکیمانہ اقوال جمع کیے گئے ہیں، ایک سو چوبیں ابواب (۲) پر مشتمل یہ رسالہ دو یا تین جلدوں میں ہوگا، ابن خلکان نے اس کتاب کے مندرجہ ظریفانہ واقعات نقل کیے ہیں، اس کے بعض اجزا چھپ گئے ہیں۔

۲۱- کتاب الکافی: صاحبِ کشف الظنون نے اس کا نام کافی فی فروع المالکیہ لکھا ہے، یہ فقہ مدینہ اور مذہب مالکی کے فروع وجزئیات میں ایک مبسوط کتاب ہے جو پندرہ یا سولہ جزوں پر مشتمل ہے، اس میں ان باتوں کا ذکر ہے، جن کی معرفت مفتی کے لیے ضروری ہے، مدینہ کے کتب خانہ سیدنا عثمانؓ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ (۳)

۲۲- القصد والامم: پورا نام القصد والامم فی التعریف باصول انساب العرب والعجم ومن اول تکلم بالعربیۃ من الامم ہے، اس سے موضوع کا پتہ چل جاتا ہے، یعنی بعدِ وطن، مرورِ ایام اور امتدادِ زمانہ کی وجہ سے عربی وعجمی قبائل واقوام کے حسب ونسب میں گڈمڈ اور خلط ملط ہو جانے کا ذکر ہے، (۴) ابتدا میں یہ بحث کی گئی ہے کہ سب سے پہلے کس شخص نے عربی میں بات چیت کی، یہ رسالہ ۱۳۵۰ھ میں قاہرہ سے چھپا ہے۔

۲۳- الانباہ علی قبائل الرواۃ: یہ دراصل استیعاب کا دیباچہ ہے، اس میں ان اہم

(۱) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج۵ ص۵۳ وتذکرۃ النوادر ص۸۰ (۲) ابن خلکان ج۳ ص۲۱۸ (۳) مقالات سلیمان ج۲ ص۴۷ (۴) مقدمہ القصد والامم۔

قبائل کا ذکر ہے جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت و اتصال اور روایت کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے، مصنف کا خود بیان ہے کہ اس میں انھوں نے مندرجہ ذیل اصحاب کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

۱- ابوبکر محمد بن اسحاق، ۲- ابومنذر ہشام بن محمد بن سائب کلبی، ۳- ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ، ۴- محمد بن عبدہ بن سلیمان، ۵- محمد بن حبیب، ۶- ابوعبداللہ احمد بن محمد بن عبید عدوی، ۷- زبیر بن بکار، ۸- مصعب بن عبداللہ زبیری، ۹- علی بن کیسان کوفی، ۱۰- علی بن عبدالعزیز جرجانی، ۱۱- عبدالملک بن حبیب اندلسی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب بڑی محنت و مطالعہ کا نتیجہ ہے، اس میں مذکورۂ بالا حضرات کے اقوال کے علاوہ احادیث و آثار اور اہل اخبار و سیر کے بیانات بھی شامل ہیں، (۱) اور عرب کے مختلف قبائل کے انساب اور علم انساب کی اہمیت کا تذکرہ کیا گیا ہے، القصد والامم کے ساتھ یہ کتاب بھی ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوئی ہے، جلال الدین سیوطی نے اس کا ذیل لکھا تھا۔ (۲)

۲۴- الانصاف فیما فی بسم اللہ من الخلاف: اس میں بسم اللہ کے متعلق صحابہ وتابعین، ائمہ سلف اور فقہا کے مذاہب، ان کے مسالک و اختلافات نقل کیے گئے ہیں کہ وہ سورہ فاتحہ کی آیت ہے یا نہیں؟ اور نماز میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ اس کو بھی پڑھنا چاہیے یا نہیں اور اگر پڑھنا چاہیے تو زور سے یا آہستہ سے، نیز وہ تمام قرآنی سورتوں کی آیت ہے یا صرف سورۂ نمل کی؟ مصنف نے ان امور کے متعلق تین مستقل مذاہب تحریر کیے ہیں، کہیں کہیں ان مذاہب کے جزوی اختلافات کا ذکر بھی آ گیا ہے، ہر ہر مذہب کے دلائل اور اس کی مؤید حدیثیں بھی جمع کی گئی ہیں، اس سے مصنف کی غیر جانب داری کا اندازہ ہوتا ہے، یہ رسالہ ۱۳۴۳ھ میں مصر سے شائع ہوا تھا۔

---

(۱) ملاحظہ ہو مقدمہ کتاب ہذا (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۱۵۳۔

۲۵- الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الفقہاء و مالک والشافعی وابی حنیفہ: یہ فقہ اسلامی کے ائمہ ثلاثہ کے فضائل ومناقب اور اوصاف وکمالات کا مجموعہ اور تین جزوں پر مشتمل ہے، پہلے جز میں امام مالک کا دوسرے میں امام شافعی کا اور تیسرے میں امام ابوحنیفہ کا تذکرہ ہے، مصنف نے ان اساطینِ فقہ کے تذکرہ میں ضمناً ان کے نامور تلامذہ اور ممتاز اصحاب کا بھی مختصر تذکرہ شامل کردیا ہے، یہ رسالہ مکتبہ قدسی قاہرہ سے ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوا ہے، شروع میں مصنف کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔

۲۶- جامع بیان العلم وفضلہ: یہ علم کی حقیقت، علما کی فضیلت وعظمت اور ان کے فرائض وغیرہ کے متعلق ایک اور جامع کتاب ہے، اس میں طلب علم کی اہمیت اس کے ضروری آداب، طلبہ، شیوخ اور علماء کے اوصاف اور دین میں علم ونظر، فکرواستدلال، قیاس واجتہاد، فہم وبصیرت اور دلیل وبرہان کی ضرورت اور تقلید واتباع کا فرق واضح کیا گیا ہے اور بحث ومباحثہ، قیاس ورائے اور تقلید کی مختلف قسموں پر گفتگو کرکے یہ دکھایا گیا ہے کہ ان کی کون سی صورتیں پسندیدہ اور کون سی ناروا اور ناپسندیدہ ہیں، مصنف نے ان امور کے متعلق روایات وآثار اور سلفِ صالحین کے اقوال کا عمدہ ذخیرہ جمع کردیا ہے اور روایتوں کی صحت وسقم اور سندوں کی قوت وضعف پر فنی کلام بھی کیا ہے، یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھی، احمد بن عمر محمصانی بیروتی ازہری نے اس کا مختصر شائع کیا ہے، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ایما سے اس مختصر کا اردو ترجمہ کرکے ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع کیا تھا، اس کے مقدمہ میں انھوں نے اسلام سے پہلے اور بعد کی علمی حالت، اسلام میں علم کی اہمیت اور مسلمانوں کے علم وفن میں اشتغال وانہماک کا ذکر کیا ہے۔

علامہ ابن عبدالبر نامور محدث تھے، خصوصاً حدیثوں کی شرح وتوجیہ میں وہ بڑے ممتاز سمجھے جاتے ہیں، مالکیہ میں اس پایہ کا اور کوئی شارح حدیث نہیں گزرا، انھوں نے مؤطا امام مالک کی کئی شرحیں لکھی تھیں، ذیل میں ان شرحوں کے متعلق معلومات درج کیے

جاتے ہیں۔

۲۷- کتاب الاستذکار: اس کا پورا نام الاستذکار بمذاہب علماء الامصار فیما تضمنہ الموطا من معانی الرای والآثار ہے، یہ مصنف کی عظیم الشان شرح تمہید کا خلاصہ اور اسی طرح شروحِ حدیث میں بڑی اہم کتاب خیال کی جاتی ہے۔شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''یہ موطا کی بہترین اور عمدہ شرحوں میں ہے، اس کے ابواب کی تنسیق میں بڑی فنی مہارت سے کام لیا گیا ہے اور مختصر ہونے کی وجہ سے نہایت مقبول ومتعارف ہے۔''(۱)

مدینہ کے کتب خانہ محمودیہ اور سیدنا عثمانؓ کے علاوہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔(۲)

۲۸- التقصی بحدیث الموطا، ۲۹- التقصی بحدیث المؤطاء: بعض لوگوں نے ان دونوں کو ایک ہی تصنیف قرار دیا ہے لیکن یہ دو مستقل کتابیں معلوم ہوتی ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا بیان ہے کہ التقصی مؤطا کی احادیث مسند ومتصل کے انتخاب وترتیب وبیان اور التقصی موطا کی منقطع، مرسل، منفصل اور بلاغات کے وصل ورفع واسناد پر مشتمل ہے، (۳) صاحب کشف الظنون کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔(۴)

التقصی امام مالک کے شیوخ کے ناموں پر مرتب کی گئی ہے، باجی اور ابوعمران فارسی نے اس کو قالصی کے ملخص پر ترجیح دی ہے، مدینہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام عارف حکمت بے میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔(۵)

---

(۱) بستان المحدثین ص ۷۰ (۲) مقالات سلیمان جلد دوم ص ۳۷۰ و ۳۷۴ و فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر جلد اص ۲۶۷ (۳) حیات امام مالک ص ۱۰۳ و ۱۰۵ (۴) کشف الظنون جلد دوم ۲۵۷ (۵) مقالات سلیمان جلد دوم۔

التغطا کے متعلق کتانی نے لکھا ہے کہ یہ مرسل، منقطع اور معضل روایات کے وصل میں ہے، موطا میں جو حدیثیں بلغنی عن الثقة کہہ کر مسند بیان کی گئی ہیں، ان کی تعداد اکسٹھ ہے، ان میں سے چار کے علاوہ سب دوسرے طرق سے مروی ہیں۔ (۱)

۳۰/۴- یہ کتاب التمہید کا دیباچہ یا مختصر ہے جو ۱۳۵۰ھ میں مکتبہ قدسی قاہرہ سے چھپی ہے، اس کا نام ٹائیٹل پر ''تجرید التمہید لما فی الموطاء من المعانی والاسانید اوالتقصی لحدیث الموطاء وشیوخ مالک'' درج ہے اور ناشر نے اس کو تمہید کا خلاصہ بتانے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا دوناموں تجرید التمہید اوالتقصی سے موسوم کیا جانا عجیب نہیں ہے کیوں کہ پہلے زمانہ میں مصنفین عموماً اسی طور پر نام رکھتے تھے۔ (۲)

اس بیان سے یہ شبہہ نہیں ہونا چاہیے کہ تمہید اور تقصی ایک ہی کتاب ہے، کیوں کہ تجرید کے مقدمہ سے بداہتاً ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمہید کا مقدمہ یا خلاصہ ہے چنانچہ مصنف لکھتے ہیں:

> ''تمہید کی طوالت کی وجہ سے ہم نے موطا کی احادیث وسنن کو اس میں علاحدہ جمع کر دیا ہے اور مسند، مرسل، متصل و منقطع کو ممیز کر دیا ہے، کیوں کہ یہ سب امام مالک اور ان کے اتباع کے نزدیک حجت وواجب العمل ہیں، پس اس کو کتاب التمہید کا ایک ایسا آسان مدخل (مقدمہ) خیال کرنا چاہیے جس میں امام مالک کے رواۃ کے وصل وارسال پر مختصراً تنبیہ کی گئی ہے۔'' (۳)

اس کی ترتیب حروف معجم کے مطابق ہے اور اس میں امام مالک کے شیوخ کے نام ونسب، کنیت، سنین وفات، روایت میں ان کا درجہ، ضبط وثقاہت ان سے امام مالک کی مرویات کی تعداد، حدیثوں کے رفع واتصال اور وقف وانقطاع اور اسناد وارسال پر بحث کی گئی ہے اور حدیثوں کا متن بھی دیا گیا ہے اور آخر میں بلاغات ومراسیل کا علاحدہ باب ہے

(۱) الرسالة المستطرفہ ص۱۴ و۱۵ (۲) تجرید ص۳ (۳) ایضاً ص۱۰ و۱۱۔

مطبوعہ نسخہ کے اخیر میں تمہید کے بعض اجزا بھی شامل کئے گئے ہیں۔

امام مالک کے رواۃ کے متعلق تجرید ایک عمدہ کتاب ہے۔

۵/۳۱۔ التمہید لمافی الموطا من المعانی والاسانید: یہ موطا کی ضخیم اور عظیم الشان شرح ہے، اس کو حدیث کی عمدہ اور بہترین شرحوں میں خیال کیا جاتا ہے، اسی کی بدولت حافظ ابن عبدالبر کو ممتاز محدث اور مالکیہ میں سب سے بلند پایہ شارح حدیث قرار دیا گیا ہے، ابن خلکان نے اس کو ستر جزوں پر مشتمل بتایا ہے، بعض علما کا خیال ہے کہ یہ پندرہ یا بیس جلدوں میں تھی، اس کی اہمیت کا اندازہ علمائے فن کے ان بیانات سے ہوتا ہے۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ ''فقہ حدیث میں ایسی عمدہ کتاب میری نظر سے نہیں گذری۔''

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ''ابن عبدالبر سے پہلے کسی نے ایسی عظیم الشان کتاب نہیں لکھی تھی۔''

شاہ عبدالعزیز صاحب رقم طراز ہیں ''یہ فقہ حدیث میں نادرۂ روزگار اور روشن ضمیر مجتہدوں کے لیے سرمہ بصیرت ہے، مذہب مالکی کے متعلق تنہا یہی کتاب کافی ہے۔''(۱)

مولانا محمد سورتی مرحوم اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں ''شروح حدیث میں ابن عبدالبر کی قابل قدر اور بہترین کتاب ہے جس کی نظیر اب تک کوئی شرح نہیں دیکھی گئی، ابن حزم نے اس کی بے حد تعریف کی ہے اور یہ اس کا استحقاق بھی رکھتی ہے...... یہ کتاب اپنے فن میں لاجواب اور اعلیٰ ترین علمی کارنامہ ہے۔''(۲)

اس کی ترتیب بھی امام مالک کے رواۃ اور شیوخ کے ناموں پر کی گئی ہے اور اس میں موطا کی حدیثوں کی تشریح، ان کے معانی ومطالب کی وضاحت اور ان کی اسانید کی

(۱) نفح الطیب ج ۳ ص ۱۳۱ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۵ وابن خلکان ج ۳ ص ۲۱۸ والدیباج المذہب ص ۳۵۷ وبستان المحدثین ص ۲۹ (۲) معارف فروری ۳۲ء۔

تحقیق کے علاوہ فقہ وحدیث کے گوناگوں فوائد ونکات تحریر کیے گئے ہیں، مصنف کا خود بیان ہے کہ:

''ہم نے تمہید میں سنن وروایات کے معانی ووجوہ اور ان کی بابت علما کے آرا ومذاہب تفصیل سے لکھے ہیں، اس لیے یہ شرح بہت طویل ہوگئی ہے، علاوہ ازیں اس میں شواہد وادلہ کی کثرت ہے، شروع میں امام مالک کے فضائل وکمالات، نقل وروایتِ حدیث میں ان کی احتیاط اور چھان بین اور حدیث کے اصول وضوابط بیان کیے گئے ہیں، مؤطا کے مراسیل کا وصل بھی ثقہ راویوں کے طرق سے بیان کردیا گیا ہے، تاکہ مراسیل کی صحت پوری طرح ظاہر ہوجائے۔''(۱)

شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی لکھتے ہیں کہ ''اس ترتیب وتصحیح میں ابن عبدالبر نے مؤطا کے بارہ مستند اور مشہور نسخوں سے مدد لی تھی،(۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے کتنی جانفشانی اور کس قدر اہتمام سے یہ شرح لکھی تھی۔

تجرید کے مطبوعہ ایڈیشن کے آخر میں اس کے جو اجزا شائع کیے گئے ہیں، ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بڑی مفید محققانہ اور معلومات افزا شرح ہے، مگر غالبًا ابھی تک یہ بے نظیر شرح شائع نہیں ہوئی ہے، تمہید کے قلمی نسخے ہندوستان، حجاز اور مصر کے بعض کتب خانوں میں موجود ہیں مگر وہ ناقص ہیں۔

تمہید کی اہمیت اور ضخامت کی وجہ سے اس کے مختصرات لکھے گئے ہیں خود مصنف نے استذکار وتجرید کے نام سے اس کے دو خلاصے لکھے تھے، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے صاحب کشف الظنون نے ابوالولید، سلیمان بن خلف باجی (م ۴۷۴ھ) شیخ زین الدین عمر حلبی اور ابوعلی حسن ابن رشیق قیروانی (م ۴۵۶ھ) کے مختصرات کا ذکر کیا ہے۔(۳)

تجرید ص ۹ و ۱۰ (۲) مصفی ص ۷ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷۳۔

۳۲- الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: یہ نہایت مفید اور اہم کتاب ہے اور مغرب کی طرح بلاد مشرق میں بھی اس کا آوازہ شہرت پوری طرح بلند تھا اور لوگ اس کو بڑی قدر و عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس میں ۲۵۸۵ صحابہ کرام کے حالات و مناقب بیان کیے گئے ہیں، اس سے پہلے بھی صحابۂ کرام کے حالات میں کئی مستقل کتابیں لکھی جا چکی تھیں مگر استیعاب کو ان میں یک گونہ اہمیت حاصل ہے، اہل فن کے نزدیک طبقات صحابہ میں ابوعبداللہ بن مندہ، حافظ ابونعیم اور قاضی ابوعمر بن عبدالبر کی کتابیں زیادہ مشہور و مقبول خیال کی جاتی ہیں جو متاخرین کی کتابوں کا مآخذ ہیں۔''

علامہ ابن اثیر جزری متوفی ۶۳۰ھ لکھتے ہیں:

''صحابہ کے حالات میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر سب میں جامع ابن مندہ، ابونعیم اور ابن عبدالبر قرطبی کی کتابیں ہیں، اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے ان کی تصنیفات عمدہ اور سعی بلیغ کا نتیجہ ہیں...... اس لیے میں نے ان کے مواد و محتویات کو یکجا کر کے ان میں بعض اضافے کرنے کا ارادہ کیا ہے۔''(۱)

حافظ ذہبی ابن اثیر کی کتاب کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

''اسد الغابہ ان تمام صحابہ کے ناموں پر مشتمل ہے جو معرفت صحابہ میں لکھی جانے والی چاروں کتابوں میں مذکور ہیں، یہ ابن مندہ اور ابوعمر بن عبدالبر کی کتابوں کا ذیل ہونے کے باوجود بعض اہم اور مفید اضافوں پر مشتمل ہے۔''(۲)

اس موضوع کی عظیم الشان اور معرکۃ الآرا کتاب حافظ ابن حجر کی الاصابہ فی تمییز الصحابہ ہے جو بعد میں لکھی جانے کی وجہ سے بڑی جامع اور مکمل ہے، تاہم قدما کی تصنیفات خصوصاً ابن عبدالبر کی کتاب اس کا ماخذ ہے، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

---

(۱) مقدمہ اسد الغابہ ص ۳ و ۴ (۲) تجرید اسماء الصحابہ ص ۲ و ۳۔

جمع فیہ مافی الاستیعاب وذیلہ۔ (۱) — جو کچھ استیعاب میں ہے اصابہ اس کی جامع بھی ہے اور اس پر ذیل بھی۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ معرفت صحابہ میں لکھی جانے والی اہم کتابوں میں استیعاب بھی ہے، بلکہ ابن مندہ اور ابو نعیم کی کتابوں پر اس کو یک گونہ ترجیح بھی حاصل ہے، علامہ ابن حزم کا بیان ہے کہ ''معرفت صحابہ میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں لیکن متقدمین میں کسی کی کتاب ابن عبدالبر کی کتاب کے ہم پایہ نہیں ہے۔'' باجی سے منقول ہے کہ اس موضوع پر کوئی کتاب استیعاب کے برابر نہیں ہے، ابن خلکان اور صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ ''اس فن میں یہ مفید اور بلند پایہ کتاب ہے۔'' (۲)

دوسرے متقدمین کی طرح اب ابن مندہ اور ابو نعیم کی کتابیں بھی معدوم اور ناپید ہیں مگر ابن عبدالبر کی کتاب موجود ہے، اس کے بعد جو کتابیں لکھی گئیں ان میں ابن اثیر اور حافظ ابن حجر کی کتابیں جو محفوظ رہ گئی ہیں، بڑی اہم اور جامع ہیں، تاہم استیعاب کو زمانی تقدم حاصل ہے۔

ترتیب: استیعاب کو حروف معجم کی ترتیب کے مطابق علاحدہ علاحدہ ابواب پر مرتب کیا گیا ہے لیکن مصنف کا تعلق بلاد مغرب سے ہے اور اہل مغرب کے یہاں حروف معجم کی ترتیب اہل مشرق سے مختلف ہے، اس لیے اس میں اسی کا لحاظ کیا گیا ہے، پہلے ناموں اور کنیتوں کے لحاظ سے صحابہ کرام کا اور آخر میں ناموں اور کنیتوں کے اعتبار سے صحابیات کا ذکر ہے، ہر حرف کے خاتمہ کے بعد جداگانہ فصل قائم کر کے اسی حرف کے باقی ماندہ اسماء کو بلا ترتیب باب الافراد کے عنوان کے تحت جمع کیا ہے۔

صحابہ کرام سے پہلے شروع میں مصنف نے تبرک کے خیال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مختصر اور جامع تذکرہ لکھا ہے۔

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۱۱۰ (۲) وفیات الاعیان ج ۳ ص ۲۱۸ والدیباج المذہب ص ۳۵۷۔

مقصد تصنیف: ابن عبدالبر نے استیعاب کی تصنیف کی یہ وجہ لکھی ہے:

''کتاب اللہ کی مراد کو واضح کرنے کا اصل ذریعہ اور اس کے بعد سب سے اہم اور مقدس چیز سنن نبوی کا علم ہے اور سنت کے حفظ وضبط میں سب سے زیادہ مفید ومعاون چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری وصحابہ کی معرفت ہے، کیوں کہ انھیں لوگوں کے نقل وبیان سے سنتیں ہم تک پہنچی ہیں، پس یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے درمیان واسطہ ہیں ان کی فضیلت، تعدیل اور تزکیہ کا خود خدا اور رسول نے ذکر کیا ہے۔'' (۱)

شرائط: صحابی کی تعریف میں محدثین اور علما کا اختلاف ہے، مصنف نے جس معیار اور شرط کے مطابق صحابہ کے ناموں کو اس میں جمع کیا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

''صحابی کی تعریف میں ہم نشینی ...... صحبت اور مجالست وغیرہ کی جو قید بیان کی گئی ہے، ہم نے اس پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس میں مزید وسعت دے کر ان لوگوں کو بھی شامل کر لیا ہے، جنھوں نے حالتِ ایمان میں آپ سے ملاقات کی تھی، خواہ ان کی ملاقات ایک ہی دفعہ کی رہی ہو، اسی طرح جن لوگوں نے آپ کو ایک بار دیکھا تھا یا آپ سے کوئی ایک لفظ سن کر بیان کیا ہے اور یہ اصول روایت کے مطابق ہم تک پہنچا ہے یا جو لوگ آپ کے عہد میمون میں مسلمان والدین کے یہاں پیدا ہوئے اور آپ نے ان کو دیکھ کر ان کے لیے خیر وبرکت کی دعا فرمائی یا جن لوگوں نے آپ پر ایمان لا کر آپ کی خدمت میں صدقات بھجوائے مگر خود آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکے، ان سب کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔'' (۲)

خصوصیات: استیعاب کی بعض نمایاں اور اہم خصوصیات یہ ہیں:

(۱) مقدمہ استیعاب ج ۱ ص ۱ و ۹ (۲) ایضاً ص ۱۰ و خاتمہ ج ۲ ص ۸۰۶۔

۱- قدما کی کتابوں کی غیر ضروری تفصیل اور واقعات کے تکرار نے صحابہ کے صحیح مقام و مرتبہ، ان کے اصلی واقعات و کارنامے اور حقیقی فضائل و کمالات کو اوجھل کر دیا ہے لیکن استیعاب میں اختصار کے باوجود ضرور نکات اور مفید مباحث ہی درج کیے گئے ہیں تا کہ قاری غیر متعلق بحثوں میں الجھے بغیر اصل مقصود سے خاطر خواہ واقف ہو جائے۔

۲- یہ ان کتابوں کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، جو اس سے پہلے لکھی گئی تھیں مگر اختصار کے باوجود اس قدر جامع ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد ان طویل و ضخیم کتابوں کو پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، اس اعتبار سے قدما کی ناپید کتابوں کی اس سے تلافی ہوگئی ہے، اس میں ان کے مختلف بیانات نقل کر کے مشہور و مرجح قول کی تعیین و تصریح بھی کی گئی ہے۔

۳- گو اس کتاب کا اصل مقصد صحابہ کرام کے سادہ واقعات زندگی بیان کرنا ہے تاہم اس ضمن میں ان کے انساب و احساب کے متعلق معلومات اور روایات و اسناد پر اصول روایات کے مطابق محققانہ بحث و کلام بھی کیا گیا ہے وہ خود لکھتے ہیں کہ میں نے صحابہ کرام کے ناموں اور اہم واقعات کو اس طرح ذکر کیا ہے کہ ان سے واقف ہو جانے کے بعد علم و معرفت حدیث میں بھی پورا درک حاصل ہو سکتا ہے کیوں کہ اس میں مرسل و مسند وغیرہ کے متعلق مفید معلومات ہیں۔(۱)

۴- استیعاب نہایت معتبر و مستند کتاب ہے، مصنف کا خود بیان ہے کہ میں نے اس کی تالیف میں علمائے سیر و انساب کے مشہور اقوال کو نقل کرنے میں ان معروف و معتبر کتابوں پر اعتماد کیا ہے، جن پر علما نے اسلامی عہد کے وقائع و احوال اور اہل اسلام کے سیر و سوانح کی معرفت کے سلسلہ میں اعتماد کیا ہے، اسی طرح اس میں پہلے کی تمام کتابوں یا سماعی روایات سے جو کچھ مصنف کو معلوم ہو سکا اس کو تحقیق و انتخاب کے بعد شامل کیا ہے، مصنف نے مقدمہ میں ان تمام کتابوں کا ذکر کیا ہے جو ان کا ماخذ تھیں، اس سے اُن کی محنت

(۱) خاتمہ ج ۲ ص ۸۰۶۔

وتحقیق اور وسعتِ علم ونظر اور کثرتِ مطالعہ وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعد میں یہ تمام کتابوں کا ماخذ بن گئی ہے۔

تلخیصات وذیول: استیعاب کی اہمیت کی وجہ سے اس کے مختصرات وذیول بھی لکھے گئے اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے بھی کیے گئے، بعض خلاصوں کے نام یہ ہیں۔

۱- شہاب الدین احمد بن یوسف بن ابراہیم اذرعی مالکی نے روضۃ الاحباب فی مختصر الاستیعاب لکھا۔(۱)

۲- محمد بن یعقوب بن محمد بن احمد خلیلی نے اعلام الصحابہ باعلام الصحابہ کے نام سے اختصار وتلخیص کی۔(۲)

۳- شیخ ابومحمد زکی الدین بن عبدالقوی منذری شافعی مصری (م ۶۵۶ھ) نے استیعاب کے مختصر کا مختصر لکھا، اس کا قلمی نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں ہے۔(۳)

۴- ابن ابی طی یحییٰ بن حمیدہ حلبی (م ۶۳۰ھ) نے استیعاب کی تہذیب وتنقیح کی تھی۔

۵- سلطان احمد خاں عثمانی نے اپنے امام مولیٰ مصطفیٰ کو اس کے ترجمہ کا حکم دیا لیکن وہ حرف ح تک مکمل کرنے کے بعد انتقال کر گئے، ان کے بعد مولیٰ کمال الدین محمد بن احمد المعروف بطاش کبریٰ زادہ نے اس کو شروع کر کے حرف را تک مکمل کیا تھا کہ سلطان کی وفات ہو گئی اور ترجمہ ناقص رہ گیا۔(۴)

جامعیت کے باوجود استیعاب میں بعض صحابہ کے حالات رہ گئے تھے، اس لیے ں اصحاب علم نے اس کے ذیول لکھے۔

۱- ابوبکر بن فتحون مالکی اندلسی (متوفی ۵۱۹ھ) نے جو قاضی عیاض کے شیوخ

(۱) فہرست کشف الظنون ج ۱ ص ۹۳ (۲) الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۶۵ (۳) فہرست کتب خانہ رام پور ج ۱ ص ۱۳۸ (۴) کشف الظنون ج ۱ ص ۹۳ و ۹۴۔

میں ہیں ایک عمدہ اور سیر حاصل ذیل لکھا، اس میں ابو عمر کے شرائط کے مطابق ان پر استدراک کر کے متعدد ناموں کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۲- ابن فتحون کے معاصر ابو اسحاق بن امین نے بھی ذیل لکھا تھا۔

۳- ابو القاسم محمد بن عبد الواحد غافقی غرناطی (متوفی ۶۱۹ھ) نے ذیل لکھا۔

۴- ابو الحجاج یوسف بن محمد مقلد جماہری (متوفی ۵۵۸ھ) نے الارتجال فی اسماء الرجال کے نام سے ذیل لکھا، اس میں استیعاب پر استدراک بھی کیا گیا ہے۔(۱)

اس گراں مایہ کتاب کو دائرۃ المعارف حیدر آباد نے پہلی دفعہ دو جلدوں میں ۱۳۱۸، ۱۹ھ میں شائع کیا، دونوں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۸۰۸ اور ۹۶ صفحے فہرست کے ہیں، مولانا حسن بن احمد حنفی نے تصحیح کی اور مختصر حواشی لکھے ہیں، دوسری مرتبہ اس کو ابن حجر کی اصابہ کے حاشیہ پر مصر سے ۱۳۲۸ھ میں چار جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

ایک شبہہ کا ازالہ: حافظ ابن حجر اصابہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''ابن عبد البر نے اس خیال سے کہ انھوں نے متقدمین کی کتابوں کے تمام مواد و معلومات کو اس میں شامل کر دیا ہے، اس کا نام استیعاب رکھا ہے لیکن اس میں بہت سارے صحابہ کا ذکر نہیں آ سکا ہے، اسی لیے اس کے متعدد ذیول لکھے ہیں۔''

اس بیان سے استیعاب کی عظمت و اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ فی الواقع اس کے اندر کوئی خاص اعتراض کی بات ہے، کیوں کہ اس کا تجزیہ کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱- چوں کہ یہ متقدمین کی کتابوں کے مباحث و معلومات پر مشتمل ہے اس لیے اس کا نام استیعاب رکھا گیا ہے۔

۲- اس میں بہت سارے صحابہ کا تذکرہ نہیں ہے۔

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۹۳ و الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۲۵۔

پہلے جز سے اعتراض ثابت نہیں ہوتا، دوسرے جز میں جو اعتراض کی بات معلوم ہوتی ہے، وہ اسی وقت درست ہو سکتی ہے جب ابن عبدالبر نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ انھوں نے اس میں تمام صحابہ کے ناموں کا احاطہ کرنے کی وجہ سے اس کا نام استیعاب رکھا ہے لیکن جب ان کا یہ دعویٰ ہی نہیں ہے، بلکہ انھوں نے اس کا نام استیعاب اس لیے رکھا ہے کہ یہ متقدمین کی کتابوں کے مباحث کو حاوی ہے، علاوہ ازیں ان کا یہ خود بیان بھی ہے کہ ”مجھے امید ہے کہ میری یہ کتاب ان لوگوں کی نسبت سے جن کا اس میں تذکرہ ہے، نیز دوسرے فوائد کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر ثابت ہوگی اور اس کے مطالعہ میں ترتیب و بیان وغیرہ کے لحاظ سے دشواری بھی کم پیش آئے گی تاہم میں احاطہ واستقصا کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ اس تقصیر کا اعتراف کرتا ہوں جو انسان کا خاصہ (۱) ہے، اس بنا پر یہ بیان بطور واقعہ تو صحیح ہوسکتا ہے لیکن بطور اعتراض درست نہیں ہوسکتا۔

(۱) مقدمہ استیعاب ص ۹۔

امام ابوبکر خطیب بغدادی

(متوفی ۴۶۳ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابوبکر کنیت، خطیب لقب اور سلسلہ نسب یوں ہے: احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی بن ثابت۔(۱)

ولادت ووطن: امام ابوبکر خطیب کی ولادت پنجشنبہ کے دن ۲۴ر جمادی الاخریٰ ۳۹۲ھ کو عراق کے قریہ درزیجان میں ہوئی، یہ بغداد کے قریب اس کے مغرب جانب دریائے دجلہ کے کنارے ایک بڑا گاؤں تھا(۲) لیکن امام صاحب کی اصل نشوونما دنیائے اسلام کے مشہور شہر دارالسلام بغداد میں ہوئی، اسی لیے وہ بغدادی کہلاتے ہیں، ان کے والد بزرگوار کو علم وفن خصوصاً حدیث سے اشتغال ومناسبت تھی اور وہ درزیجان میں خطیب تھے، اسی لیے یہ ان کے اور ان کے فرزند کے نام کا جز ہوگیا تھا، امام سمعانی لکھتے ہیں کہ خطیب کی نسبت ممبر پر خطبہ دینے کی طرف ہے، اس نسبت سے جو علماو محدثین منسوب ہیں ان میں ابوبکر احمد زیادہ مشہور ہیں۔

اپنے صاحب علم وکمال باپ کی توجہ سے ابوبکر خطیب بچپن ہی سے علم وفن کی تحصیل میں منہمک ہوگئے تھے۔(۳)

اساتذہ: خطیب کے اساتذہ میں مختلف اسلامی ملکوں اور مرکز حدیث کے فضلا شامل ہیں

(۱) ابن خلکان ج ۱ ص ۴۶ (۲) معجم البلدان ج ۴ ص ۵۲ (۳) کتاب الانساب ورق ۲۰۴ طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۲ تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۱۔

ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن مخلد باقرجی، ابونصر احمد بن حسین کسار، ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی، ابوبکر حیری ابو حازم عبدوی، ابوسعید مالینی، ابوعمر بن مہدی فارسی، ابوالفتح بن ابوالفوارس، ابوالحسن بن رزقویہ، ابوالحسن بن صلت اہوازی، ابوالحسن بن عبدکویہ، ابوالحسن بن بشران، ابوالحسین بن تیم، حسین بن حسن جوالیقی، ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن سراج، ابوعمر قاسم بن جعفر ہاشمی، محمد بن عبداللہ بن شہریار محمد بن عیسیٰ اور ہلال حفار وغیرہ۔

علوم فقہ کی تحصیل ابوالحسن محاملی، قاضی ابوالطیب طاہر بن عبداللہ طبری اور ابونصر بن صباغ اور شیخ ابواسحاق وغیرہ۔ سے کی، امام ابوداؤد صاحب سنن کے وہ دو واسطوں سے شاگرد ہیں۔

تلامذہ: خطیب کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے، ان میں بعض وہ ہیں جن سے خود خطیب کو شرف تلمذ حاصل ہے، احمد بن احمد متوکلی، ابوبکر احمد بن محمد برقانی، ابوبکر بن خاصیہ، ابوعبداللہ حمیدی، ابوالفضل بن خیرون، ابوالقاسم ازہری، ابومنصور بن خیرون، ابونصر بن ماکولا، طاہر بن سہل اسفرائنی، عبداللہ ابن احمد سمرقندی، عبدالرحمٰن بن محمد شیبانی، عبدالعزیز بن احمد کتانی، عبدالکریم ابن حمزہ، عبیداللہ بن احمد بن عثمان، علی بن احمد بن قیس غسانی، مبارک بن طیوری، محمد بن علی بن ابوالعلا مصیصی، محمد بن مرزوق زعفرانی، ابوالفتح نصراللہ بن محمد مصیصی، ہبۃ اللہ بن عبداللہ شروطی، یوسف بن ایوب ہمدانی۔

علامہ سمعانی فرماتے ہیں کہ میں نے خطیب کے پندرہ تلامذہ سے سماع کیا ہے اور حافظ ابن عساکر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو چوبیس شاگردوں سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ (۱)

رحلت وسفر: خطیب اپنے علم وفن کے دلدادہ والد ماجد کی ترغیب وتشویق سے بچپن ہی میں

(۱) کتاب الانساب ورق ۲۰۴، طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۲ و تذکرہ ج ۳ ص ۲۳۱۔

تحصیلِ علم میں لگ گئے تھے، ۴۰۳ھ میں اگیارہ سال کے ہوئے تو ان کے والد نے باقاعدہ حدیث کا سماع شروع کرایا، اس کے بعد بیس سال کی عمر تک وہ اپنے وطن ہی کے علما واساطینِ فن سے کسبِ فیض کرتے رہے، اس کے بعد بصرہ، کوفہ، نیشاپور، اصفہان، دینور، ہمدان، رے، مکہ، مدینہ قدس، دمشق اور صور تشریف لے گئے۔

خطیب کو علم وفن سے اشتغال اور مطالعۂ حدیث کا شوق اتنا زیادہ تھا کہ راستہ چلتے تھے تو ان کے ہاتھ میں کسی نہ کسی کتاب کا جز ہوتا تھا اور وہ اس کو پڑھتے رہتے تھے۔(۱)

حدیث میں درجہ ومرتبہ: خطیب کی حدیث میں متعدد تصنیفات ہیں گو ان کا پایہ زیادہ بلند نہیں ہے تاہم خطیب کا شمار محدثین اور حفاظ میں ہوتا ہے، علمائے فن نے ان کے حفظ وضبط، ثقاہت واتقان اور روایت ودرایت میں اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

ابوسعد بن سمعانی فرماتے ہیں کہ ''وہ ثقہ، حجت اور کثیر الضبط تھے اور ان پر حفظ وضبط کا خاتمہ ہو گیا، ابوالعینان رواسی کا بیان ہے کہ وہ اس فن میں امام تھے، ان کے جیسا باکمال شخص میں نے نہیں دیکھا، خطیب کے نامور شاگرد ابن ماکولا جو علم حدیث ورجال میں بہت ممتاز تھے، فرماتے ہیں کہ ''حدیثِ رسول کی معرفت، حفظ وضبط، اتقان اور فنونِ علل واسناد، صحیح وغریب، فرد ومنکر اور سقیم وغیرہ نیز روایتوں کی شناخت اور تمیز میں وہ آخری اور نامور محدث تھے، جن کو ہم نے دیکھا ہے، درحقیقت اہل بغداد میں امام دارقطنی کے بعد ان کے جیسا صاحب کمال محدث پیدا نہیں ہوا، میں نے صوری سے خطیب اور ابونصر سجزی کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے واضح طور پر خطیب کو افضل وبرتر قرار دیا، ہم کو اس فن میں جو کچھ حاصل ہوا وہ دراصل اسی امامِ فن کے فیض وبرکت کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔''

موتمن ساجی فرماتے ہیں کہ ''بغداد میں امام دارقطنی کے بعد خطیب سے بڑا حافظ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۳۶ و منتظم ج ۸ ص ۲۶۷۔

حدیث پیدا نہیں ہوا، ابوعلی بردانی کا بیان ہے کہ" شاید خطیب نے بھی اپنے جیسا صاحبِ فن نہ دیکھا ہو، ابواسحاق شیرازی فرماتے ہیں کہ خطیب معرفت وحفظِ حدیث میں دارقطنی اوران کے ہم پایہ لوگوں کے ہم سر تھے۔" ابواسحاق شیرازی خطیب کے اساتذہ میں تھے لیکن وہ ان کی مہارتِ فن اوراحادیث میں بلند پائیگی کی وجہ سے ان کے نہایت مداح ومعترف تھے، ایک دفعہ خطیب ان کے درس میں حاضر ہوئے تو شیخ نے ایک حدیث بحر بن کثیر سقاء کے واسطہ سے بیان کر کے کہا کہ ان کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ خطیب نے ادب سے ان کا حال بیان کرنے کی استاذ سے اجازت لی، اس وقت شیخ ان کے سامنے سنبھل کر نہایت ادب سے شاگرد کی طرح بیٹھ گئے، جب خطیب نے شرح وبسط سے ان کا حال بیان کیا تو شیخ ابواسحاق نے بے اختیار آفریں کہا اور فرمایا کہ" خطیب اپنے وقت کے دارقطنی ہیں۔" علامہ سمعانی لکھتے ہیں کہ وہ متقدمین حفاظ اورائمہ کبار یحییٰ بن معین، علی بن مدینی اوراحمد بن ابی خیثمہ وغیرہ کے ہم پایہ اور علامہ عصر تھے اوراپنے اقوال ومنقولات اورتصنیفات کے جمع وانتخاب میں ثقہ، حجت، صدوق اورمعتمد تھے۔"

ابن عبدالبر کی طرح جو خطیب کے معاصر، نہایت بلند پایہ محدث اوراپنے کمالات کی وجہ سے حافظِ مغرب کہلاتے تھے، یہ بھی اپنے زمانہ میں حافظِ مشرق کہلاتے تھے۔" شجاع ذہلی کا بیان ہے کہ وہ بے نظیر محدث تھے۔" سعید مودب فرماتے ہیں کہ وہ کثیر الروایات اورجمع وتحریر حدیث پر خاص دھیان دینے والے ثقہ، ضابط، متقن اورنہایت باخبر محدث تھے، علامہ ابن صلاح اورحافظ نووی نے ائمہ صحاح کے بعد جن سات اکابر محدثین کا ذکر کر کے ان کی تصنیفات کو بیش قیمت اور پُر منفعت قرار دیا ہے، ان میں طبقہ ثانیہ کے لوگوں میں خطیب کا نام بھی لیا ہے، علامہ ابن کثیر ان کو مشاہیر محدثین میں بتاتے ہیں اورابن خلکان فرماتے ہیں کہ" وہ حفاظ متقنین میں تھے، ابوالحسن ہمدانی نے خطیب کی وفات کو" علم حدیث کی موت قرار دیا ہے"، ابن جوزی کا بیان ہے کہ" وہ فنونِ حدیث میں

فائق تھے، ان پر یہ علم تمام ہوگیا۔" حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ "وہ امام و حافظ کبیر اور شام و عراق کے محدث تھے، ضبط و اتقان اور حفظِ حدیث کا ان پر خاتمہ ہوگیا۔" علامہ ابن سبکی اور ابو بکر بن ہبۃ اللہ نے بھی ان کی مہارتِ فن، عظمتِ شان اور حدیث میں امامت و جلالت کا ذکر کیا ہے۔

خطیب کی حدیث میں عظمت و بلند پائیگی کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جرح و تعدیل کے فن میں یکتا اور روایات و احادیث کی شناخت و تمییز میں ماہر تھے، حدیث، رجال، جرح و تعدیل اور اصولِ اسناد و روایات میں ان کی کئی کتابیں ہیں، حدیث کے متعلقہ علوم میں شاید ہی کوئی ایسا فن ہو جس میں انھوں نے کتابیں نہ لکھی ہوں، حدیث میں ان کے وثوق و اعتبار کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ بادشاہِ وقت نے یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ "واعظین، علما اور محدثین ان کے سامنے پیش کیے بغیر کوئی حدیث نہ بیان کریں، جس حدیث کی روایت کی خطیب اجازت دیں، وہ بیان کی جائے اور جس کی ممانعت کریں لوگ اس کو بیان کرنے سے باز رہیں۔"

حدیث میں ان کی غیر معمولی بصیرت، گہری تحقیق اور وسیع نقد و نظر کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ کچھ یہودیوں نے جو خیبر میں رہتے تھے اور حضرت عمرؓ فاروق کے زمانے میں شام کے اطراف و جوانب میں آباد ہوگئے تھے، خلیفہ کے سامنے ایک خط پیش کیا اور اس کے متعلق دعویٰ کیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا ہے، جس کو حضرت علیؓ نے لکھا ہے، اس پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر اور بعض صحابہ کرام کی شہادتیں بھی ثبت تھیں اس خط کا مضمون یہ تھا کہ "ہم نے یہود کے فلاں فلاں قبیلے سے جزیہ معاف کر دیا" خلیفہ نے خط کی اصلیت کا پتہ لگانے کے لیے اس کو خطیب کے پاس بھیجا، انھوں نے اس کو بالکل جعلی اور من گھڑت قرار دیا ہے، وجہ دریافت کرنے پر بتایا کہ اس میں حضرت امیر معاویہؓ اور سعد بن معاذ کی گواہیاں بھی درج ہیں، حالانکہ فتح خیبر کے وقت حضرت معاویہؓ مسلمان نہیں ہوئے تھے اور حضرت سعدؓ کو

غزوۂ خندق میں ایسا کاری زخم لگا کہ جانبر نہ ہو سکے اور ان کی وفات غزوۂ بنی قریظہ کے قریبی زمانہ میں ہوگئی تھی، اس لیے وہ فتح خیبر کے وقت زندہ ہی نہ تھے۔(۱)

فقہ: خطیب ممتاز اور نامور فقیہ بھی تھے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ وہ اصلاً فقیہ تھے لیکن فن حدیث و تاریخ سے ان کو زیادہ سروکار رہا، اسی لیے ان علوم کا ان پر غلبہ ہوگیا، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں کہ وہ اکابر واعیان فقہا میں تھے اور جید و نامور فقہا سے اس فن کی تحصیل و تکمیل کی تھی، ان کی تحقیقات سے ان کی فقہی جزرسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

تاریخ: حدیث کی طرح تذکرہ و تراجم اور تاریخ بھی ان کا خاص موضوع تھا، اس پر ان کی تصنیفات شاہد ہیں ان کے سوانح نگاروں نے ان کو بلند پایہ مورخ بتایا ہے، حافظ ابن کثیر فنِ تاریخ میں ان کے کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

مازلت تدأب فی التاریخ مجتهدا ☆ حتی رأیتك فی التاریخ مکتوبا(۲)

قرأت وعلم قرآن: فن قرأت و تجوید اور علوم قرآنی میں بھی ممتاز تھے، بڑے خوش الحان تھے اور قرآن مجید نہایت ترتیل کے ساتھ پڑھتے تھے، مورخین نے ان کے حسن قرأت اور فصیح اللہجہ ہونے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔(۳)

شعروادب: خطیب اسلامی علوم ہی کے یگانہ و فاضل نہ تھے، بلکہ شعروادب میں بھی صاحبِ کمال تھے، ان کی تصنیفات، ادبی شکوہ، حسن تحریر، لطافت بیان اور سلاست کلام سے معمور ہیں، ان کو لغت و اعراب کے فن سے پوری واقفیت تھی، احادیث صحیح اعراب کے ساتھ پڑھتے تھے، شعروادب کے بڑے عارف تھے اور اس پر ان کی اچھی نظر تھی، خود بھی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۳۶ وطبقات الشافعیہ ج ۳ والمنتظم ج ۸ مختلف صفحات وابن خلکان ج ۱ ص ۴۶ وکتاب الانساب ورق ۲۰۴ والبدایہ ج ۱۲ ص ۱۰۱ ومقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۲ وبستان المحدثین وغیرہ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۰۳ (۳) المنتظم ج ۸ ص ۲۶۷۔

دادِ سخن دیتے تھے، یاقوت نے معجم الادباء میں اسی حیثیت سے ان کا مفصل تذکرہ لکھا ہے، ابن جوزی کہتے ہیں کہ ادب کے واقف کار اور اچھے شاعر تھے، تذکرہ وتراجم کی کتابوں میں ان کے متعدد اشعار درج ہیں، چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ان كنت تبغي الرشاد محضا　　لامر دنيــاك والمعــاد

فخالف النفس في هواها　　ان الهوى جامع الفساد

ترجمہ: اگر دنیا وعقبیٰ کے معاملہ میں خالص ہدایت کے طلب گار ہو تو ہوائے نفس کی مخالفت کرو کیوں کہ یہ مفاسد اور برائیوں کا سرچشمہ ہے۔

لاتغبطن اخا الدنيا لزخرفها　　ولا للذة وقت عجلت فرحا

فالدهر اسرع شيء في تقلبه　　وفعله بين للخلق قد وضحا

كم شارب عسلا فيه منيته　　وكم تقلد سيفا من به ذبحا

ترجمہ: دنیا کی رعنائی ودلفریبی کی وجہ سے دنیا والوں پر رشک نہ کرو اور نہ عارضی لذت وآسودگی پر اتراؤ، کیوں کہ زمانہ کا انقلاب نہایت تیز اور اس کا برتاؤ لوگوں کے ساتھ بہت کھلا ہوا ہوتا ہے (دنیا کی بے ثباتی اور تدبیر کی درماندگی کا یہ حال ہے کہ) شہد کا شربت پینے والے کتنے لوگوں کی اسی سے موت ہو جاتی ہے اور کتنے ایسے لوگ ہیں جو اپنی گردنوں میں (حفاظت کے خیال سے) تلواریں لٹکائے ہوئے ہوتے ہیں مگر وہ انہی سے موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں۔

طلبت اخا صحيح الود محضا　　سليم الغيب مامون اللسان

فلم اعرف من الاخوان　　الانفاقا في التباعد والتلاقي

وعالم دهرنا لاخير فيه　　ترى صورا تروق بلا معاني

ترجمہ: میں نے پرخلوص آپ کی محبت کرنے والے اور ایسے دوستوں کو تلاش کیا جن کا ظاہر وباطن یکساں قابل اعتماد ہو تو مجھے اپنے تمام دوستوں میں نفاق اور

دوز خے پن کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں نظر آئی اور ہمارے زمانے کے علما اس قدر بے فیض ہیں کہ ان کی صورتیں تو چمکدار ہیں لیکن ان میں کوئی کیفیت و معنی نہیں ہے۔

یہ تو پند و نصائح اور دنیا کی بے ثباتی وغیرہ کے متعلق حکیمانہ اشعار تھے، اب تغزل کی رنگینی و رعنائی ملاحظہ ہو۔

الشمس تشبهه والبدر يحكيه　　والدر يضحك والمرجان من فيه

من سرى وظلام الليل معتكر　　فوجهه عن ضياء البدر يغنيه

ترجمہ: میرے ممدوح کا حسن و جمال شمس و قمر سے بڑھ کر ہے اسی لیے وہ اس کے جمال کی نقل کرتے ہیں، اس کے دانت اتنے آبدار، چمکدار اور خوبصورت ہیں کہ جب وہ ہنستا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موتی و مرجان ہنس رہے ہیں، اگر کوئی شخص گھٹا ٹوپ اندھیری رات میں سفر کرے تو محبوب کے جلوۂ جمال آرا اور رخ زیبا کی تابنا کی اس کو بدر کامل کی روشنی سے مستغنی کر سکتی ہے۔

وكم حكيم رآه ظنه ملكا　　وردد الفكر فيه انه بشر (۱)

ترجمہ: بعض دانشوروں نے (اس کی عفت و معصومیت کی وجہ سے) اس کو فرشتہ خیال کیا لیکن جب انھوں نے اس کو بغور دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ انسان ہے۔

دیگر کمالات: اس گوناگوں کمالات کے ساتھ ان کا خط نہایت عمدہ اور پاکیزہ تھا اور وہ خطاطی اور خوشنویسی کے لیے مشہور تھے، بڑے فصیح البیان تھے، آواز اتنی بلند تھی کہ جامع منصور میں حدیث بیان کرتے تو آخری کونے میں سنائی دیتی تھی۔

ذہانت و فطانت اور مطالعہ سے دلچسپی: ان کی دماغی قوت و صلاحیت بڑی حیرت انگیز اور ذہانت و ذکاوت نہایت غیر معمولی تھی، ہر وقت علم و مطالعہ کا شغل جاری رکھتے تھے، صبر آزما اور مشقت طلب کاموں میں لگے رہنے کے باوجود علمی مشاغل میں بھی مصروف

(۱) بستان المحدثین ص ۴۳۔

تھے، حج کے زمانہ میں پورا قرآن مجید غروب آفتاب کے وقت تک ختم کر دیتے۔ اس کے بعد لوگ ان کے پاس آتے اور حدیثیں بیان کرنے کی فرمائش کرتے تو ذرا بھی کبیدہ خاطر نہیں ہوتے بلکہ پورے انشراح صدر کے ساتھ ان کو حدیثیں سناتے۔

مکہ کے زمانہ قیام میں کریمہ بنت احمد مروزی ستی سے جو مرو کے ایک گاؤں کشمیہن کی صالح، عبادت گذار اور صاحب فضل وکمال خاتون اور صحیح بخاری کی مشہور راویہ تھیں، صحیح بخاری کو صرف پانچ روز میں ختم کر دیا، اسی طرح بخاری کے ایک اور مشہور راوی ابوعبدالرحمٰن اسماعیل بن احمد فریری سے تین مجلس میں اس کو ختم کیا، دو روز مغرب کے وقت سے پڑھنا شروع کیا اور فجر تک پڑھتے رہے، تیسرے روز چاشت کے وقت سے شروع کرکے مغرب کے وقت تک مکمل کرلیا، علامہ ذہبی نے اس حیرت انگیز دماغی قوت اور ذہانت کو بالکل عجوبہ بتایا ہے۔(۱)

اعزاز ومقبولیت: علمی حیثیت سے خطیب کا پایہ بہت بلند تھا، ابن خلکان نے ان کو علمائے متبحرین میں بتایا ہے، ان کے علمی کمالات اتنے متنوع اور گوناگوں تھے کہ بقول سمعانی (فضله اشهر من ان يوصف) ان کو شمار اور بیان نہیں کیا جاسکتا، ان کمالات نے ان کو امامت ومقبولیت کا درجہ عطا کیا تھا، خصوصاً فنونِ حدیث میں تو وہ مسلم امام عصر تھے، سمعانی کا بیان ہے کہ وہ بلاپس وپیش امام عصر اور حافظِ دہر تھے، انھوں نے اپنی مقبولیت اور اعزاز کے لیے اللہ تعالیٰ سے حرم کی حاضری کے موقع پر زمزم کا پانی پی کر دعا کی تھی، ان کی یہ دعا ایسی مقبول ہوئی کہ بغداد میں کسی کو ان کے سامنے پیش کیے بغیر حدیث بیان کرنے کی اجازت نہ تھی۔(۲)

شکوہ ودبدبہ اور وقار ومتانت: علمی کمالات کے ساتھ ان میں شان وشوکت، ظاہری وجاہت اور رعب وداب بھی تھا اور بڑے وقار، متانت اور سنجیدگی سے رہتے تھے،

(۱) بستان المحدثین ص ۴۷ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۳۶۔

علامہ سمعانی لکھتے ہیں:

وکان مھیبا وقورا نبیلا خطیرا ثقة۔ (۱)	ذی ہیبت، باوقار، پرعظمت اور ثقہ وسنجیدہ آدمی تھے۔

ان کی مجلس درس بھی نہایت آراستہ ہوتی تھی، بغداد کی سب سے اچھی اور عمدہ جگہ کو درس کے لیے منتخب کیا تھا۔

زہد وتدین: خطیب زہد وتقویٰ میں بھی نمایاں تھے، عبادت وتلاوت قرآن سے بڑا شغف تھا اور انفاق فی سبیل اللہ کا ذوق بہت بڑھا ہوا تھا، تصنیف وتالیف، درس وتدریس اور مطالعہ حدیث سے جو وقت بچتا وہ عبادت اور تلاوت قرآن میں بسر ہوتا، ہر روز وشب میں ایک قرآن ختم کرنے کا معمول تھا، اس میں فرق نہیں آنے دیتے، غیر معمولی اوقات وحالات اور سفر میں بھی یہ معمول جاری رہتا، چنانچہ حج بیت اللہ کے سفر میں بھی ہر روز غروب آفتاب کے وقت تک الحان وترتیل کے ساتھ قرآن مجید ختم کر دیتے تھے، مستجاب الدعوات تھے، ایک دفعہ زمزم کا پانی پی کر خدا سے تین باتوں کی دعا مانگی، اول یہ کہ میری کتاب ''تاریخ بغداد'' کو شرف قبول اور حسن اعتبار حاصل ہو، دوسرے بغداد کی جامع منصور میں سب سے عمدہ اور مقدس جگہ میں حدیث کی تعلیم واملا میں مشغول رہنے کی مجھ کو توفیق وسعادت میسر آئے اور آخری دعا یہ تھی کہ بشر حافی کی قبر کے متصل ان کے پہلو میں دفن کیا جاؤں، خدا نے ان کی تینوں دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا۔ (۲)

دولت وثروت کی فراوانی اور جذبہ خیر وخیرات: اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیوی اعزاز وجاہت اور مال ودولت سے بھی اچھی طرح نوازا تھا، بڑے دولت مند شخص تھے لیکن ان کی دولت وثروت غریبوں اور ناداروں کے لیے وقف تھی، اصحاب علم اور محدثین کی خدمت کے لیے خطیر رقمیں خرچ کرتے تھے، حافظ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ وہ حدیث کے طلبہ کو زر وجواہر

(۱) کتاب الانساب ورق ۲۰۴ (۲) تبیین کذب المفتری ص ۲۶۸ وتذکرہ ج ۲ ص ۳۳۴۔

سے نوازتے تھے۔ ابوزکریا تبریزی کا بیان ہے کہ "میں جامع دمشق کے منارہ میں رہتا تھا اور خطیب سے ادب ومحاضرات کی کتابیں پڑھتا تھا، ایک روز وہ خود مجھ سے ملنے کے لیے اوپر تشریف لائے اور کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد مجھے ایک کاغذ دیا اور کہا یہ اچھا تحفہ ہے، اس کو لے کر قلم خریدلو، میں نے دیکھا تو اس میں چار دینار تھے، پھر دوسری دفعہ بھی وہ اوپر آئے اور اسی طرح کا برتاؤ میرے ساتھ کیا۔

وفات سے پہلے بیماری کے زمانہ میں اپنا سارا مال واثاثہ محدثین، فقہا اور فقرا میں تقسیم کردیا اور اپنا کتب خانہ مسلمانوں کے لیے وقف کر گئے، یہ وصیت بھی کی کہ مرنے کے بعد جسم کا کپڑا صدقہ وخیرات کر دیا جائے۔(۱)

امراووزرا سے تعلقات: خطیب کے بعض امراواعیان دولت سے بھی تعلقات تھے اور وہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے، عزالدولہ کے زمانہ میں جو نہایت سخی وفیاض تھا، خطیب صور تشریف لے گئے، تو اس نے بڑا اعزاز واکرام کیا اور مال وزر سے نوازا، حدیث کے استناد کے سلسلہ میں خلیفہ بغداد کو ان پر جس قدر اعتبار تھا، اس کا حال پہلے گذر چکا ہے، جب حج بیت اللہ سے بغداد واپس آئے تو ابوالقاسم بن مسلمہ سے بڑے گہرے تعلقات ہو گئے تھے اور اس نے امام صاحب کی قدر وعظمت شناسی کا خوب حق ادا کیا۔(۲)

استغناو بے نیازی: امرا دوزرا سے قربت وتوسل کے باوجود مزاج میں نہ تو تملق تھا اور نہ حرص وجاہ کی طلب کا جذبہ، مال ودولت سے ہمیشہ بے نیاز اور کنارہ کش رہتے، فضل ابن عمر نسوی کا بیان ہے کہ ایک روز میری موجودگی میں جامع منصور کے اندر ایک علوی شخص ان کے پاس کچھ دینار لے کر آیا اور کہا کہ فلاں شخص نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ ہدیہ دیا ہے تاکہ آپ اس کو اپنی ضرورت میں صرف کریں خطیب نے کہا مجھے ضرورت نہیں، اس نے کہا غالباً آپ اس کو کم سمجھ رہے ہیں، اس لیے اس نے تھیلی کھول کر مصلی پر بکھیر دیا، اس میں تین

(۱) تبیین کذب المفتری ص ۲۶۸ وتذکرہ ج ۳ ص ۳۴۴ (۲) المنتظم ج ۸ ص ۲۵۶۔

سو دینار تھے، خطیب برافروختہ ہوگئے اور مصلیٰ اٹھا کر دیناروں کو نہایت تمکنت سے زمین پر جھٹک دیا اور خود مسجد سے باہر چلے آئے، اس پر وہ شخص بہت خفیف ہوا۔(۱)

فقہی مسلک: خطیب شافعی المذہب تھے، حافظ ذہبی نے ان کو اکابر شافعیہ میں بتایا ہے، اسی لیے مذہب میں ان کے غلو و تعصب کا ذکر بھی کیا جاتا ہے، اس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

عقیدہ: محدثین اور اصحاب روایت کی طرح وہ عقائد میں امام ابوالحسن اشعری کے ہم نوا تھے، حافظ ابن عساکر نے تبیین میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

وکان یذھب فی الکلا م الی مذھب ابی الحسن الاشعری.(۲)	وہ کلام وعقیدہ میں مذہب اشعری پر کاربند تھے۔

ابتلا و آزمائش: امام ابوبکر خطیب کے زمانہ میں اسلامی ممالک خصوصاً بغداد میں سخت خلفشار اور ہیجان برپا تھا، ایک طرف شیعی وسنی تصادم اور فقہی مذاہب کے ماننے والوں کے باہمی اختلاف نے ملت اسلامی کا شیرازہ درہم برہم کردیا تھا اور دوسری طرف حکام وامرا کے اقتدار کی باہمی کشمکش اور افتراق نے حکومت وسلطنت کے نظام کو تہ وبالا کردیا تھا، ان حالات کا اثر خطیب کی زندگی پر بھی پڑا، ان کے بعض اعیان دولت سے تعلقات کا پہلے تذکرہ کیا جاچکا ہے، قائم بامراللہ کے دور حکومت میں ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے کچھ امراء ووزراء ان کے درپے آزار ہوگئے اور ان پر بغداد کی سرزمین تنگ ہوگئی اور وہ بغداد چھوڑ کر قید وبند کی زندگی گذارنے کے لیے مجبور ہوگئے۔

۴۴۰ھ اور ۴۵۰ھ کے درمیان بغداد میں ارسلان المعروف بہ بساسیری نے جو دیالمہ کا ایک ترکی غلام اور بغداد کے ترکوں کا سردار تھا، اتنا عروج واقتدار حاصل کرلیا کہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۳ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۳۔ (۲) تبیین کذب المفتری ص ۲۷۱۔

خلیفہ قائم بامراللہ کے خلاف بغاوت کردی، یہ اگرچہ آخر میں طغرل بک کے ہاتھوں مارا گیا لیکن ایک زمانہ میں وہ دولت عباسیہ کا مختار کل بن گیا تھا اور امراء اور حکام اس سے لرزہ براندام رہتے تھے، عراق وخوزستان میں اس کے نام کا خطبہ بھی پڑھا جانے لگا تھا، غرض عباسی حکومت کے اکثر علاقوں پر اس کا قبضہ وتصرف ہوگیا تھا، قائم بامراللہ کو اس نے اتنا زیر اور مجبور کرلیا تھا کہ وہ اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کرسکتا تھا، یہ شخص باطنی شیعہ تھا لیکن بغداد کا رئیس الرؤساسنی تھا، اس لیے دونوں میں اندرونی کشمکش اور مخالفت رہتی تھی بساسیری نے ۴۵۰ھ میں بغداد پر قبضہ کرکے مستنصر علوی کا خطبہ جاری کردیا، اس کا یہ عروج واقبال اور شیعی غلبہ وتسلط دیکھ کر خطیب بغداد سے دمشق چلے گئے لیکن وہاں بھی ان کو سکون نہ ملا، وہاں کا حکمراں بھی شیعی تھا، اس کے بعض افعال پر خطیب نے ناراضگی کا اظہار کیا تو اس نے ان واقعات کو بہانہ بنا کر ان کو قتل کردینا چاہا اور پولیس کو گرفتاری کا حکم بھی دیدیا مگر وہ شریف زینبی کی پناہ میں آگئے، شریف نے خوبصورتی سے معاملہ کو رفع دفع کردیا تاہم امیر نے دمشق سے خطیب کی جلاوطنی کا فرمان جاری کردیا اور یہ پہلے صور پھر حلب وطرابلس ہوتے ہوئے عراق واپس آئے۔(۱)

بعض مورخین کا بیان ہے کہ خطیب نے جامع دمشق میں حدیث کا درس دینا شروع کیا، ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ مسجد کے آخری حصے میں سنائی دیتی تھی، ایک روز اسی شان سے انھوں نے حدیث کا درس دیتے ہوئے فضائل عباس کی حدیثیں بیان کرنا شروع کیں تو روافض اور فاطمیہ سخت مشتعل ہوگئے، یہاں تک کہ انھوں نے خطیب کو قتل کردینے کا ارادہ کیا لیکن وہ پھر شریف زینبی کی پناہ میں آگئے، ان کی کوشش وسفارش سے اگرچہ لوگ ان کے قتل کے ارادہ سے باز آگئے مگر وہ جلاوطن کردیے گئے۔(۲)

ان دونوں بیانوں میں معمولی اختلاف کے باوجود خطیب کے آلام ومصائب اور

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۶ وطبقات الشافعیہ لابی بکر ص ۵۷ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۰۲۔

شدائد ومحن میں مبتلا ہونے کی تصریح موجود ہے۔

خطیب کو اپنی فقہی اور جماعتی عصبیت کی وجہ سے بھی ابتلا ومحن سے دوچار ہونا پڑا، وہ شافعی المذہب تھے اور متکلمین واشاعرہ سے ان کے تعلقات بھی تھے، اس کی وجہ سے حنابلہ نے ان کو زدوکوب کیا۔

وفات: خطیب رمضان المبارک ۴۶۳ھ میں بیمار ہوئے، بیماری بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ذی الحجہ کی ابتدائی تاریخوں میں ان کی حالت زیادہ خراب ہوگئی اور بالآخر دوشنبہ ۷/ذی الحجہ کو اکہتر سال کی عمر میں داعی اجل کا پیام آ گیا، بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ شوال ہی میں انتقال ہوا۔

دوسرے روز یعنی منگل کو تجہیز وتکفین کی گئی، جنازہ اٹھانے اور کندھا دینے والوں میں خطیب کے استاذ اور مشہور شافعی فقیہ شیخ ابواسحٰق شیرازی بھی تھے، جنازہ میں ایک جم غفیر شریک تھا، ایک جماعت یہ منادی کر رہی تھی:

هذا الذی کان یذب عن رسول الله ﷺ هذا الذی کان ینفی الکذب عن رسول الله ﷺ هذا الذی کان یحفظ حدیث رسول الله ﷺ۔	یہ اس شخص کا جنازہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے سینہ سپر ہوکر آپ کی طرف سے کذب وافترا کی تردید کرتا تھا اور آپ کی حدیثوں کو یاد کرتا تھا۔

ابوالحسین بن مہتدی باللہ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور ان کی آرزو کے مطابق بابِ حرب میں بشر حافی کی قبر کے پہلو میں دفن کیے گئے، تکفین وتدفین کے بعد کئی قرآن ختم کیے گئے اور بعض لوگوں نے ان کی عنداللہ مقبولیت اور بخشش کے خواب بھی دیکھے۔(۱)

حلیہ: خطیب بڑے وجیہ وشکیل تھے، اہل سیر لکھتے ہیں کہ:

(۱) تاریخ ابن خلکان ج۱ ص۴۶ تبیین کذب المفتری ص۲۶۹ و۲۷۰ وتذکرہ ج۳ ص۳۳۹۔

وكان في درجة الكمال والرتبة خلقا وخلقا وهيئة ومنظراً. (۱)	وہ خلق وخلقت (صورت وسیرت) اور ہیئت ومنظر ہر اعتبار سے نہایت کامل تھے۔

اولاد: مورخین نے تصریح کی ہے کہ ان کے کوئی اولاد نہ تھی، چنانچہ مرض الموت میں اپنا سارا مال واسباب جو آئندہ بیت المال کی ملکیت ہونے والا تھا، خلیفہ سے اجازت لے کر فقرا اور اہل علم میں خرچ کر دیا۔

تصنیفات: خطیب کی تصنیفات کی تعداد ایک سو کے قریب بتائی جاتی ہے، ان میں بہت سی معدوم اور نایاب ہیں، ان کی اکثر کتابیں فنونِ حدیث سے متعلق گوناگوں مسائل ومباحث اور مفید ومتنوع معلومات پر مشتمل ہیں، ان میں ادب وانشاء، حسنِ تحریر، سلاست وروانی اور طرزِ ادا وطریقۂ بیان کی دلکشی بھی ہے، حافظ ابن جوزی ان کی تصنیفات گنانے کے بعد لکھتے ہیں "جو شخص ان کا بغور مطالعہ کرے گا وہ خطیب کی قدر وعظمت اور عدیم المثال کارنامے کا اعتراف کرے گا، انھوں نے ایسا عظیم الشان علمی ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے جو ان سے پہلے کے ان سے کہیں فائق محدثین وائمہ مثلاً دارقطنی وغیرہ بھی نہیں انجام نہیں دے سکے۔ (۲)

خطیب کی معلوم کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:

۱-ابطال النکاح بغیر ولی، ۲-الاسماء المتواطئۃ والانساب المتکافئۃ، ۳-امالی الخطیب، ۴-بیان اہل الدرجات العلی، ۵-کتاب التبیین لاسماء المدلسین یا کتاب اسماء المدلسین، ۶-کتاب البسملۃ وانہا جزء من الفاتحۃ، بعض لوگوں نے اس کا نام کتاب نہج الصواب فی ان البسملہ من فاتحۃ الکتاب اور بعض نے نہج الصواب فی ان البسملۃ آیۃ من فاتحۃ الکتاب بھی لکھا ہے، ۷-کتاب الجہر بالبسملہ (ایک جز میں)، ۸-کتاب التفصیل لمبہم المراسیل یا کتاب مبہم المراسیل، ۹-کتاب تمییز المزید فی متصل الاسانید، ۱۰-کتاب التنبیہ

(۲) تبیین کذب المفتری وکتاب الانساب (۲) المنتظم ج ۸ ص ۲۶۶۔

والتوقیف علی فضائل الخریف، ۱۱- کتاب الاجازۃ للمعلوم والمجہول یا اجازۃ المجہول والمعدوم، ۱۲- کتاب الاحتجاج بالشافعی فیما اسند الیہ والرد علی الطاغین بعظم جہلہم علیہ، ۱۳- جزء حدیث اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ، ۱۴- جزء حدیث الامام ضامن والمؤذن موتمن، ۱۵- جزء حدیث الستۃ من التابعین وطرقہ واختلاف وجوہہ، ۱۶- جزء حدیث طلب العلم فریضۃ، ۱۷- جزء حدیث النزول، ۱۸- جزء حدیث عبدالرحمٰن بن سمرۃ وطرقہ، ۱۹- کتاب الدلائل والشواہد علی صحۃ العمل بخبر الواحد، ۲۰- کتاب الرحلۃ یا الرحلۃ فی طلب الحدیث (ایک جز میں)، ۲۱- کتاب الرواۃ عن مالک، ۲۲- کتاب روایات الصحابہ عن التابعین، ۲۳- کتاب روایۃ الابناء عن الآباء یا کتاب روایۃ الآباء عن الابناء، ۲۴- کتاب السابق واللاحق، ۲۵- کتاب الاسماء والالقاب، ۲۶- صلوٰۃ التسبیح والاختلاف فیہا (ایک جزء میں)، ۲۷- کتاب صوم یوم الشک یا کتاب النہی عن صوم یوم الشک (ایک جز میں)، ۲۸- کتاب طرق حدیث قبض العلم (تین جزوں میں)، ۲۹- عوالی مالک بن انس، ۳۰- کتاب غسل الجمعۃ (تین جزوں میں)، ۳۱- کتاب الفصل للوصل والمدرج فی النقل، ۳۲- کتاب الفقیہ والمتفقہ، ۳۳- کتاب الفنون یا کتاب الفتون، ۳۴- الفوائد للصحاح والغرائب، ۳۵- القضاء بالیمین مع الشاہد (۲ جزوں میں)، ۳۶- کتاب القنوت والآثار المرویۃ فیہ (تین جزوں میں)، ۳۷ کتاب القول فی النجوم یا کتاب القول فی علم النجوم، ۳۸- کشف الاسرار، ۳۹- کتاب المتفق والمفترق، ۴۰- کتاب المسلسلات للرباعیات (تین جزوں میں)، ۴۱- مسند ابی اسحاق الشیبانی (۳ جزوں میں) ۴۲- مسند ابی بکر الصدیق علی شرط الصحیحین (ایک جز میں)، ۴۳- مسند بنان بن بشر، ۴۴- مسند صفوان بن سلیم، ۴۵- مسند صفوان غسانی، ۴۶- مسند محمد بن حجادہ، ۴۷- مسند محمد بن سوقۃ، ۴۸- مسند مسعر بن کدام یا مسند مطر الوراق، ۴۹- مسند نعیم بن حماد الغطفانی، ۵۰- کتاب معجم الرواۃ عن مالک، ۵۱- کتاب معجم الرواۃ عن شعبۃ، ۵۲- کتاب المکمل فی بیان المہمل (ایک

جلد میں)، ۵۳-مناقب احمد بن حنبل ۵۴-مناقب الشافعی، ۵۵- کتاب من حدث ونسی، ۵۶- کتاب من وافقت کنیتہ اسم ابیہ مما لا یومن وقوع الخطاء فیہ، ۵۷- کتاب الموضح یا کتاب موضح اوہام الجمع والتفریق، ۵۸-الاسماء المبہمہ فی الانباء المحکمۃ، ایک جز میں، حروف معجم کے مطابق مرتب کی گئی ہے، ۵۹- کتاب البخلاء اس کا قلمی متحف بریطانی میں ہے اور تین جزوں پر مشتمل ہے، ۶۰- کتاب تقیید العلم تین جزء کے بقدر ہے اور اس کا مخطوطہ برلن میں ہے، ۶۱- کتاب الحیل تین جز میں ہے، بعض مصنفین نے سہواً اس کا نام کتاب الخیل لکھا ہے، جو دراصل ابوجعفر محمد بن حبیب بغدادی (م ۲۴۵ھ) کی تصنیف ہے۔(۱)

۶۲-کتاب رافع الارتیاب فی المقلوب من الاسماء والالقاب یا کتاب مقلوب الاسماء (ایک جلد میں رجالِ حدیث کے متعلق لکھی گئی ہے۔)(۲)

۶۳-کتاب المؤتلف والمختلف: یہ ضخیم کتاب امام دارقطنی کی المؤتلف والمختلف فی اسماء الرجال سے ماخوذ ہے، مگر اس میں بکثرت اضافے بھی ہیں، برلن میں قلمی نسخہ موجود ہے۔

۶۴-کتاب المؤتنف، کتاب المؤتلف والمختلف کا تکملہ ہے، اسی لیے اس کا نام الموتنف لتکمۃ المؤتلف والمختلف بھی ہے۔

۶۵-کتاب اقتضاء العلم: اس کے متعلق شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "یہ نہایت عمدہ کتاب ہے، بعض محدثین نے اس کا انتخاب کیا ہے، جو ملک عرب میں مشہور ہے اور اکثر جگہ تحصیل واجازت کے وقت اس منتخب کو پڑھاتے ہیں۔(۳)

۶۶-کتاب الجامع فی ادب الراوی والسامع یا کتاب الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع: الجامع اور جامع خطیب کے نام سے بھی موسوم کی جاتی ہے، اس میں اصول حدیث کے مباحث اور راوی وسامع کے آداب وشرائط کا ذکر ہے۔(۴)

(۱) کشف الظنون ج۲ ص۲۷۶ (۲) ایضاً ج۱ ص۵۳۲ (۳) بستان المحدثین ص ۶۵ (۴) کشف الظنون ج۱ ص۳۸۶۔

۶۷-کتاب التطفیل یا کتاب الطفیلیین: دمشق سے ۱۳۴۶ھ میں چھپ گئی ہے، خطیب نے اپنے کسی دوست کی فرمائش پر اس میں طفیلیوں کے واقعات وحکایات اور نادر اقوال واشعار جمع کیے ہیں، اس کا شمار ادب ومحاضرات کی عمدہ اور دلچسپ کتابوں میں ہوتا ہے، اس کے شروع میں ناشر نے خطیبؒ کے مختصر حالات وسوانح بھی لکھے ہیں۔

۶۸- کتاب شرف اصحاب الحدیث: اس کا مخطوطہ برلن اور مدینہ میں موجود ہے، جماعت اہل حدیث کے ایک صاحب علم مولانا محمد صاحب مدرس مدرسہ محمدیہ واڈیٹر اخبار محمدی نے حج بیت اللہ کے سفر میں مدینہ کے نسخہ کی نقل لے کر ۱۳۴۵ھ میں محبوب المطابع دہلی سے اس کو شائع کیا تھا، عربی متن کے ساتھ اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے، اس میں حدیث کے ناقلین اور راویوں کے مراتب وفضائل کے متعلق احادیث وآثار اور علمائے اسلام کے اقوال درج کیے گئے ہیں۔

۶۹-کتاب غنیۃ المقتبس فی تمییز الملتبس: اس کا ایک قلمی نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں ہے، اس کو ۱۳۳۵ھ میں مولانا حمید الدین فراہیؒ نے حیدر آباد میں نقل کرایا تھا، یہ کسی شخص کے استفسار میں لکھی گئی ہے اور اس میں مشتبہ ناموں کے بارے میں اشتباہات کو رفع کیا گیا ہے، ۱۲ جزوں پر مشتمل ہے اور رجال پر مفید کتاب ہے۔

۷۰، ۷۱-کتاب تلخیص المتشابہ فی الرسم وحمایۃ ما اشکل منہ عن نوادر التصحیف والوھم: یہ رجال پر ایک ضخیم کتاب ہے، علاء الدین بن علی بن عثمان ماردینی نے اس کا مختصر لکھا تھا، راویوں کے نام ونسب اور ان کے واقعات واخبار کی تحقیق کے لحاظ سے یہ بڑی مفید کتاب ہے، اس کا قلمی نسخہ سات سو صحیفے میں کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے مگر ناقص الآخر ہے،(۱) خود مصنف نے تالی التلخیص یا

(۱) کشف الظنون ج۱ص ۳۲۳ وجلد۲ص ۹۷ وتاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ج۲ص ۳۲۵۔

باقی التلخیص کے نام سے اس کا ایک ضمیمہ بھی لکھا تھا۔

۷۲۔ کتاب الکفایۃ: تیرہ جزوں پر مشتمل مصطلحاتِ حدیث میں اہم کتاب ہے، اس میں روایات واحادیث کے اصول وضوابط کے متعلق اصحابِ فن اور محدثین کے اقوال سنداً بیان کیے گئے ہیں جن مباحث میں علمائے جرح وتعدیل کے اختلافات منقول ہیں، ان کو درج کر کے ان کے متعلق اپنی ترجیحی رائے تحریر کی اور بعض مبہم اقوال کا مفہوم اور دقیق استدلال کی تشریح بھی کر دی ہے، اس کی جامعیت واہمیت کے متعلق حافظ ابن حجر جیسے ماہر فن کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

> ''مصطلحاتِ حدیث میں قاضی ابومحمد رامہرمزی نے سب سے پہلے المحدث الفاصل لکھی لیکن اس میں استیعاب سے کام نہیں لیا گیا ہے، اس کے بعد ابوعبداللہ حاکم کی تصنیف ہے لیکن یہ مہذب ومرتب نہیں، ابونعیم نے حاکم کی کتاب کا مستخرج لکھا لیکن اس میں بھی آئندہ آنے والے کے لیے بعض چیزیں چھوڑ دی گئی ہیں، ان لوگوں کے بعد خطیب نے قوانینِ روایت میں کفایہ اور آدابِ روایت میں الجامع لآداب الراوی والسامع لکھی، حدیث سے متعلق شاید ہی کوئی ایسا فن ہو جس میں ان کی علاحدہ تصنیف نہ ہو، ابوبکر بن نقطہ کا بیان ہے کہ جو شخص انصاف سے ان کی کتابیں پڑھے گا اس کو معلوم ہوگا کہ خطیب کے بعد کے محدثین ان کی کتابوں کے محتاج ہیں۔''

اس کے قلمی نسخے برلین، لیڈن، مصر اور ہندوستان میں حیدرآباد، سندھ اور پٹنہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، خدا بخش لائبریری پٹنہ کا نسخہ بڑا گرانقدر ہے، یہ سلطان صلاح الدین کے بیٹے احمد کی ملکیت میں رہ چکا ہے، اس پر شہزادہ کی خودنوشتہ تحریر ہے، یہ بہت سے محدثین اور علما کے استعمال میں بھی رہا ہے۔

حیدرآباد کے دائرۃ المعارف نے ۱۳۵۷ھ میں اس کا متن مختصر حواشی کے ساتھ

شائع کیا ہے، تعداد صفحات ۴۵۱ ہے، چند صفحوں میں خطیب کے حالات وکمالات دیئے گئے ہیں، تصحیح ومقابلہ کا کام مولانا سید ہاشم ندوی مرحوم نے اپنے بعض رفقا کی معاونت سے انجام دیا ہے۔

۳۷- تاریخ بغداد: خطیب کی سب سے ضخیم، عظیم الشان اور شہرۂ آفاق کتاب ہے، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ اگر ان کی اور تصنیفات نہ بھی ہوتیں تو تنہا یہی کتاب ان کے فخر وشرف اور فضل وکمال کے لیے کافی تھی اور اس سے ان کے علمی تبحر ووسعت مطالعہ اور دقتِ نظر وغیرہ کا پورا اندازہ ہوجاتا ہے، خطیب کو خود بھی اس کتاب پر بجا طور سے فخر تھا، پہلے گذر چکا ہے کہ انھوں نے اس کی مقبولیت کے لیے خدا سے جو دعا مانگی تھی وہ قبول ہوئی اور تاریخ بغداد کو بے نظیر اور حیرت انگیز حسنِ قبول حاصل ہوا، بغداد کی متعدد تاریخیں لکھی گئیں، خطیب کو اولیت کا شرف بھی حاصل نہیں ہے تاہم اس کے جیسی شہرت ومقبولیت کسی کے حصہ میں نہیں آئی، خطیب اس کے موضوع ومحتویات کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

> ''یہ کتاب مدینۃ السلام (بغداد) کی تاریخ ہے، اس میں اس کی آبادی اور تعمیر کا ذکر اور یہاں کے مشاہیر واعیان، واردین، علما وفضلا کا تذکرہ ہے۔(۱)

دوسری جگہ اس کی نوعیت وترتیب وغیرہ کے متعلق مزید تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس میں دارالسلام بغداد کے خلفا، اشراف، کبرا، قضات، فقہا، محدثین، قرا، زہاد، صلحا اور اربابِ شعر وادب کا ذکر ہے جو لوگ یہاں پیدا ہوئے، یا پیدا تو کسی دوسری جگہ ہوئے لیکن یہاں سکونت اختیار کر لی یا جو یہاں کی سکونت ترک کر کے دوسری جگہ فوت ہوئے، یا دوسرے مقامات کے جو لوگ یہاں آئے، ان سب کا نیز بغداد کے مضافات اور نواح میں رہنے والوں کا اس میں تذکرہ ہے، ان کی کنیت، حسب ونسب، ان کے مشہور واقعات، مناقب وفضائل، مدت

(۱) تاریخ بغداد ج ۱ ص ۳۔

عمر، تاریخِ وفات اور عام حالات غرض ان لوگوں کے بارے میں جو روایتیں بزرگوں سے محفوظ و منقول چلی آ رہی ہیں سب جمع کر دی گئی ہیں، خواہ ان کا تعلق مدح وقبول اور تعدیل سے ہو یا ذم وقدح یا جرح سے، ترتیب حروف معجم کے مطابق ہے لیکن جن لوگوں کا نام محمد ہے، ان کا تبرک کے خیال سے میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔''(۱)

اس زمانہ کے دستور کے مطابق خطیب نے حالات وواقعات بسلسلۂ روایت واسناد لکھے ہیں، اس کے اسلوب وطریقۂ بیان کے متعلق نامور مبصر وفاضل اجل مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم لکھتے ہیں:

''تاریخِ خطیب جس طرح بہترین زمانہ کی تاریخ ہے، اسی طرح طرز بیان کے لحاظ سے مسلمان مورخین کی تصنیف کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، الفاظ بقدر معانی استعمال کیے ہیں، عبارت آرائی مدح طرازی کا نام نہیں، بیان صاف اور متین ہے، جرح وتعدیل دونوں بے لاگ ہیں، اگرچہ بعض معرکۃ الآرا مقامات میں قوتِ فیصلہ کی کمی نمایاں ہے، محدثانہ روایات ہیں، ادیبانہ مبالغہ، منطقیانہ تذبذب پاس نہیں۔'' (معارف ج ۳۲ عدد ۲ ص ۱۰۸)

پہلی جلد کا نصف حصہ بغداد کے متعلق مختلف النوع علمی، فقہی، کلامی اور تاریخی معلومات پر مشتمل ہے، مثلاً بغداد کی زمین کی بیع وشرا اور اس کی پیداوار کا کیا حکم ہے، چونکہ حضرت عمرؓ نے سواد (عراق) کی زمین کو مسلمانوں کے لیے وقف فرما دیا تھا، اس لیے اس پر مالکانہ قبضہ وتصرف فقہا کے ایک گروہ کے نزدیک ناجائز ومکروہ ہے، بعض علما کو اسی لیے بغداد کی سکونت میں کلام تھا، خطیب نے اس مبحث پر موافق ومخالف دونوں پہلوؤں سے مبسوط بحث کی ہے اور فیصلہ جواز کے حق میں دیا ہے، دوسرے باب میں یہ بحث ہے کہ

(۱) تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۱۲ و ۲۱۳۔

حضرت عمرؓ نے ارضِ سواد فاتحین میں تقسیم کیوں نہیں فرمایا، اسی سلسلہ میں عہدِ فاروقی کے بندوبستِ آراضی کا ذکر آتا ہے، اس بیان میں بندوبست شدہ آراضی کی شرح لگان، پیداوار کی قسمیں، تعداد رقبہ وغیرہ سب کچھ آ گیا ہے، آگے ایک باب میں ان روایتوں کا ذکر ہے جو بغداد کی مذمت سے متعلق ہیں، مصنف نے ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد ان پر بحث وتنقیح کر کے ان کو ضعیف وسقیم قرار دیا ہے، اس کے بعد بغداد کے مناقب اور اہل بغداد کے اوصاف کا تذکرہ ہے، اس سلسلہ میں بغداد کی معتدل آب وہوا اور ساکنینِ بغداد کی عقل واخلاق کی تعریف اور ان کے علمی کارناموں اور خدمات حدیث کا تذکرہ ہے، پھر بغداد کی دو مشہور نہروں دجلہ وفرات کے فوائد ومنافع کا ذکر ہے، اس کے بعد بغداد کی وجہ تسمیہ کا بیان شروع ہوتا ہے اور بانی بغداد، ابوجعفر منصور عباسی کے حالات ومناقب، بغداد کی بناء، سن تعمیر، مصارفِ تعمیر، طریقۂ تعمیر، پایہ تخت حکومت، محل شاہی، بازاروں، محلات، شوارع، مساجد، مقابر اور پلوں کا ذکر ہے، تعمیر میں جو ترمیمات اور اضافے ہوئے ان کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

بغداد سے متصل ہی چوں کہ مدائن واقع ہے، اس لیے اس کے متعلق بھی معلومات بیان کئے گئے ہیں اور مدائن کا تذکرہ ان پچاس صحابہ کرام کے ذکر کی تقریب بن گیا ہے، جن کے قدوم سے مدائن مشرف ہوا تھا، مدائن کے اسی شرف ومزیت کی بناء پر اس کا بغداد سے متصل دیگر قصبات نہروان وانبار وغیرہ سے پہلے ذکر کیا گیا ہے، اس تاریخ میں مدائن ہی کے تعلق ومناسبت سے صحابہ کرام کا تذکرہ شامل ہے، ورنہ بغداد میں کسی صحابی کا آنا ثابت نہیں ہے، اس کے بعد بغداد کے ساکنین، واردین وصادرین کے تراجم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو چودہ جلدوں پر جا کر تمام ہوتا ہے۔

تاریخِ بغداد صرف رجالِ بغداد کا ترجمہ وتذکرہ ہی نہیں ہے بلکہ رجال کے حالات کے ضمن میں علمی دقائق اور مجتہدانہ مباحث بھی محدثانہ قوت کے ساتھ حل کیے گئے

ہیں، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

فكتب على طريقة المحدثين جمع فيه رجالها ومن وردبها وضم اليه فوائد جمة فصار كتابا عظيم الحجم والنفع۔ (۱)	اس میں محدثین کے انداز اور طریقہ کے مطابق بغداد کے رجال ووار دین کا تذکرہ اور دیگر بے شمار فوائد شامل کیے ہیں، اس لیے یہ کتاب نہایت ضخیم اور پر منفعت ہوگئی ہے۔

بغداد کے لوگوں کے تذکرہ کی ابتدا تبرکاً محمد کے نام سے کی ہے اور سب سے پہلے محمد بن اسحاق صاحب سیرت کا ذکر کیا ہے اور اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ ان سے زیادہ کوئی کبیر السن، عالی الاسناد اور قدیم العہد شخص نہ تھا۔ (۲)

ان کو تاریخِ بغداد کی ترتیب اور اہل بغداد کا تذکرہ لکھنے کا خیال غالباً حافظ ابوالفضل صالح بن احمد تمیمی کے اس قول کی وجہ سے ہوا کہ "طالب حدیث کے لیے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اپنے شہر کی کتب حدیث اور ان کے مؤلفین کے حال سے آغاز کرے اور ان کی فہم میں ملکہ بہم پہنچائے تاکہ صحیح وسقیم کی مکمل معرفت حاصل ہو، اس کے بعد دوسرے شہروں کو لے۔" (۳)

پہلے گذر چکا ہے کہ خطیب نے رجال کی مدح وثنا، ذم وقدح، قبول ورد اور جرح وتعدیل کے بارے میں جو کچھ منقول ہے، سب جمع کر دیا ہے، اس لیے بعض ائمہ واساطینِ فن کے مناقب وفضائل کے ساتھ ساتھ ان کے متعلق نقد وجرح کے اقوال بھی تحریر کیے ہیں، اسی حیثیت سے حنفی مذہب کے اساطین ثلثہ امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے بارے میں بھی مدح ومنقبت اور رد وجرح پر مشتمل اقوال نقل ہوئے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ خطیب کی اپنی رائے نہیں ہے بلکہ وہ ان حضرات کے عظمت شناس اور کمالات کے معترف تھے، رہے

(۱) کشف الظنون ج ا ص ۲۲۱ (۲) تاریخ بغداد ج ا ص ۲۱۴ (۳) ایضاً۔

مخالفانہ اقوال تو وہ محض مورخانہ فرض ادا کرنے کے لیے جمع کیے گئے ہیں۔

تاریخ بغداد سات ہزار آٹھ سو اکتالیس مشاہیر رجال کا جو مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں تذکرہ ہے، یہ مصر سے مختصر حاشیوں کے ساتھ ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۱ء میں چودہ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، رجال کی فہرست اور صفحے پر سطروں کا شمار بھی دیا گیا ہے، صفحات کی تعداد ۶۷۹۱ ہے، اس میں فہرست کے صفحے بھی شامل ہیں۔

ذیول: اس تاریخ کی اہمیت کی وجہ سے اس کے متعدد ذیول لکھے گئے ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

۱- امام ابوسعد عبدالکریم سمعانی صاحب کتاب الانساب (م۵۶۲ھ) نے خطیب کے نہج واسلوب پر پندرہ جلدوں میں ذیل لکھا۔

۲- عماد الدین ابوعبداللہ محمد بن حامد کاتب ووزیر (م۵۹۷ھ) نے سمعانی کے ذیل پر تین جلدوں میں ذیل لکھا، اس میں اس پر بعض اضافے کیے ہیں۔

۳- ابوعبداللہ محمد بن سعید المعروف بابن الدبیثی وسطی (م۶۳۷ھ) کے ذیل میں بھی سمعانی کے ذیل پر اضافے ہیں۔

۴- ابن قطیعی نے ابن دبیثی کے ذیل پر ایک ضمیمہ لکھا۔

۵- حافظ شمس الدین ذہبی (م۷۴۸ھ) نے ابن دبیثی کے ذیل کی تلخیص واختصار کیا اور اس کا نام المختصر المحتاج الیہ من تاریخ بغداد رکھا۔

۶- تاریخ خطیب کا سب سے طویل وضخیم ذیل حافظ محب الدین محمد بن محمود المعروف بابن النجار بغدادی (م۶۴۳ھ) نے لکھا اس میں مذکورہ بالا تمام ذیول کے مقابلہ میں زیادہ اضافے ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ تیس جلدوں میں ہے۔

۷- ابن نجار کے ذیل پر تقی الدین محمد بن رافع متوفی ۷۷۴ھ نے عمدہ اور بہتر ذیل لکھا۔

۸- ابن نجار کے ذیل پر ابوبکر مارستانی کا بھی ایک ذیل ہے۔

۹- مارستانی کے ذیل پر تاج الدین علی بن انجب شاعر بغدادی نے ایک ذیل لکھا۔

۱۰- خطیب کے شاگرد ابوالیمن مسعود بن محمد بخاری (م ۴۹۱ھ) نے تاریخ کا مختصر اور خلاصہ لکھا، اس کا قلمی نسخہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے کتب خانہ میں ہے، جو فلسکیپ سائز کے ۳۸۱ صفحے پر مشتمل ہے۔(۱)

۱۱- مشہور مستشرق (Salomon) نے تاریخ خطیب کے شروع کے حصہ کو جس میں بغداد کے نام اور تاریخ بناء وغیرہ کا ذکر ہے اور جس کی حیثیت مقدمہ کی ہے، ۱۹۰۴ء میں پیرس سے فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔

۱۲- تاریخ خطیب جب پہلی دفعہ شائع ہوئی تو نواب صدر یار جنگ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے معارف کے کئی نمبروں میں اس پر ایک مبسوط، پرمغز اور معلومات افزا تبصرہ لکھا جو ۳۷ء میں کتابی صورت میں بھی شائع ہو گیا ہے، اس میں پہلے خطیب کے مختصر و جامع حالات ہیں، اس کے بعد تاریخ بغداد کے خصوصیات اور اس کے مندرجات و مشمولات کا تعارف اور آخر میں اس کے بعض حصوں پر مدلل اور جامع تبصرہ کیا گیا ہے۔

۱۳- امام محمدی: مولوی محمد صاحب اڈیٹر اخبار محمدی دہلی نے اس میں تاریخ بغداد سے امام ابوحنیفہؒ کے ترجمہ وسوانح حیات کا حصہ علاحدہ جمع کر کے اردو ترجمہ کے ساتھ ۱۳۴۵ھ میں دہلی سے شائع کیا تھا، یہ امام صاحب کے ردوقدح اور مناقب ومثالب دونوں پر مشتمل ہے، معلوم نہیں اس کی اشاعت کی ضرورت ہی کیا تھی؟

تاریخ بغداد کی غیر معمولی شہرت اور حیرت انگیز مقبولیت کے باوجود اس پر بعض اعتراضات کیے گئے ہیں اور اس کے رد میں مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، ان کتابوں میں

(۱) یہ کتب خانہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہو گیا ہے۔

اکثر کا تعلق ان جرحوں سے ہے جو رجال خصوصاً امام ابوحنیفہ وغیرہ کے متعلق اس میں نقل کی گئی ہیں۔

۱-السهم المصيب في رد الخطيب: اس کو سلطان(۱) عیسیٰ بن ابوبکر ایوبی نے ۶۲۱ھ میں خطیب کے رد اور امام ابوحنیفہ کی تائید کے لیے تالیف کیا تھا، طرز بیان الجھا ہوا ہے، مولانا اعزاز علی دیوبندی مرحوم نے جدہ کے قلمی نسخہ سے نقل کر کے اس کو ۱۳۵۰ھ میں مطبع جامعہ ملیہ دہلی سے شائع کیا تھا۔

۲-الانتصار لامام ائمة الامصار: ابوالمظفر یوسف بن عبداللہ المعروف بسبط ابن الجوزی نے دو جلدوں میں امام ابوحنیفہ کی تائید اور خطیب کی تردید کی ہے۔

۳-جامع المسانيد: اس کے مقدمہ میں ابوالموید الخوارزمی نے خطیب کا رد لکھا ہے۔

۴-تانيب الخطيب: یہ مصر کے مشہور محقق و نامور فاضل محمد زاہد بن حسن کوثری کی تصنیف ہے، اس میں امام ابوحنیفہ اور مذہب حنفی کے اساطین ابویوسف، محمد بن حسن اور حسن بن زیاد کے متعلق خطیب کے بیانات کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے اور ان روایتوں کو جو ان بزرگوں کے رد و قدح اور جرح و ذم سے متعلق ہیں، غیر صحیح قرار دیا گیا ہے، مصنف نے ان روایتوں کو جن کو خطیب نے مورخانہ فرض و دیانت سمجھ کر نقل کیا تھا اور ان کے بارے میں معذرت کر دی تھی، خود خطیب کی رائے قرار دیا ہے، اسی غلط فہمی نے ان کی تحریر میں مناظرانہ رنگ پیدا کر دیا ہے اور انھوں نے خطیب پر بعض ناروا ذاتی تنقیدیں بھی کی ہیں، خطیب کا تعصب مسلم سہی مگر ان کو امام ابوحنیفہ کی عظمتِ شان میں کلام نہ تھا۔

کوثری صاحب نے خطیب کے بارے میں اس انصاف سے بھی کام نہیں لیا جو خطیب نے امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں کیا تھا، چنانچہ انھوں نے خطیب کے ترجمہ میں

---

(۱) صاحب کشف الظنون نے اس کا نام عیسیٰ بن ابوبکر ایوبی حنفی (م ۶۲۴ھ) لکھا ہے۔ (جلد۲)

صرف ان کے مثالب ہی بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اس ضمن میں بعض غیر معتبر واقعات کو زیادہ نمایاں طور پر پیش کر کے تاریخ کو جھوٹ پوٹ کا انبار اور خطیب کی بدنیتی پر مبنی قرار دے کر ان کے علمائے جرح وتعدیل میں شمار کیے جانے کو خلافِ انصاف قرار دیا ہے، اس کتاب کے جواب میں بھی بعض کتابیں لکھی گئی ہیں، دائرۃ المعارف النعمانیہ کے ایک مصحح مولانا عبدالرحمٰن بن یحییٰ معلمی یمانی نے بھی جواب تحریر کیا تھا، جو ہماری نظر سے نہیں گذرا مگر کوثری صاحب کا جواب الجواب ہم نے دیکھا ہے، تانیب الخطیب دو سو صفحے پر مشتمل ہے اور ۱۹۴۲ میں مصر سے شائع ہوئی ہے۔

خطیب پر بعض اعتراضات: دوسرے اکابر علما کی طرح خطیب اور ان کی تصنیفات پر بھی اعتراضات ہوئے ہیں، ذیل میں ان کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۱۔تعصب: خطیب پر زیادہ اہم اعتراض یہ ہے کہ ان کو حنبلی و حنفی مذہب سے سخت کد تھا، حنبلی مذہب سے عناد کا ذکر حافظ ابن جوزی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''خطیب پہلے حنبلی تھے لیکن مبتدعین (۱) کے بارے میں نرم اور ان کی جانب مائل تھے، اس لیے حنابلہ ان کے درپے آزار ہوئے، اس کا ردعمل یہ ہوا کہ انھوں نے شافعی مسلک اختیار کر لیا اور اپنی کتابوں میں جہاں ممکن ہوا ہے، اشارۃ وصراحۃ امام احمدؒ، ان کے تلامذہ اور حنبلی مذہب کے خلاف تعصب سے کام لیا ہے، مثلاً:
>
> انھوں نے امام احمدؒ کو سید المحدثین اور امام شافعی کو تاج الفقہا لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ امام احمد کے تفقہ واجتہاد کے معترف نہ تھے، حسین

(۱) غالباً اس سے اشاعرہ متکلمین مراد ہیں جن کے متعلق خطیب کی نرمی و مداہنت کا ذکر کیا جاتا ہے اور اگر اہل بدعت واقعتاً مراد ہیں تو خطیب کے ان کی جانب میلان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ یہ حنابلہ کی غلط فہمی اور شدت پسندی کا نتیجہ ہے۔

کرابیسی کے ترجمہ میں امام احمد کے متعلق ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

ایش نعمل بهذا الصبي ان قلنا لفظنا بالقرآن مخلوق قال بدعة وان قلنا غير مخلوق قال بدعة. (۱)	آخر ہم کیا کریں! اگر ہم کہتے ہیں کہ ہمارا تلفظ بالقرآن مخلوق ہے تو یہ (امام احمد) اس کو بدعت کہتے ہیں اور اگر ہم اس کو غیر مخلوق کہتے ہیں تب بھی وہ اس کو بدعت بتاتے ہیں۔

اسی طرح امام احمد کے بعض اصحاب وتلامذہ کے بارے میں بھی خطیب کے ردوقدح کی بعض مثالیں تحریر کی ہیں جن کو طوالت کی وجہ سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور حنفی مذہب کے خلاف خطیب کے تعصب کا مولانا عبدالرشید نعمانی نے اس طرح ذکر کیا ہے:

''امام ابوحنیفہ سے سخت عداوت ونفرت رکھنے والوں میں خطیب بھی ہیں، علامہ محمد معین سندھی دراسات اللبیب میں لکھتے ہیں:

''امام دارقطنی کی طرح خطیب بغدادی بھی امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں مفرط وغالی تھے لیکن ان کی اور ان کے متبعین کی رائے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ امام ابوحنیفہؒ کی توثیق، جلالت قدر اور عظیم مرتبہ ومنقبت پر مکمل اتفاق ہے۔''

حافظ محمد بن یوسف صالحی شافعی عقود الجمان میں لکھتے ہیں:

''امام ابوحنیفہ کی عظمتِ شان کو مجروح کرنے والے ان بیانات سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے، جو خطیب بغدادی نے نقل کیے ہیں، انھوں نے امام صاحب کے مداحوں کی رائیں بھی تحریر کی ہیں، لیکن آخر میں مذمت کرنے والوں

(۱) المنتظم ج ۸ ص ۲۶۷، ۲۶۸۔

کے اقوال ذکر کر کے اپنی کتاب میں زبردست دھبہ لگا دیا ہے۔"

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

"ابن القطان خطیب کی طرح امام ابوحنیفہ کے معاملہ میں مفرط تھے، اس لیے امام صاحب کے بارے میں ان دونوں کی جرحیں خواہ مفسر ہی کیوں نہ ہوں قبول نہیں کی جائیں گی، درحقیقت یہ دونوں خود اسی غلو اور افراط شنیع کی وجہ سے مجروح ہوگئے ہیں۔(۱)

تعصب کے متعلق ان بیانات کی تنقیح سے پہلے یہ وضاحت کر دینا مناسب ہوگا کہ خطیب کے زمانے میں فقہی و جماعتی عصبیت میں قدرے شدت پیدا ہوگئی تھی، بلکہ ان کے بعد بغداد حنابلہ اور شوافع کی معرکہ آرائیوں کا مرکز بھی بن گیا تھا، اگر حافظ ابن جوزی کا یہ بیان صحیح مان لیا جائے کہ وہ ابتداءً حنبلی تھے تو اس مذہب کے خلاف ان کا ردعمل بالکل قدرتی امر ہے لیکن یہ قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ ان جیسے صاحب علم وکمال شخص نے محض حنابلہ کی سختیوں سے تنگ آکر اپنی رائے کو تبدیل کر دیا ہو، یہی وجہ ہے کہ عام مورخین نے اس کی کوئی تصریح نہیں کی ہے، البتہ یہ ضرور مسلم ہے کہ شافعی ہونے کی بناء پر حنابلہ نے خطیب کو زدوکوب کیا تھا اور یہ بات بھی درست ہے کہ حنابلہ سخت گیری اور تشدد کے لیے مشہور ہیں، اس کے برخلاف خطیب کے مزاج میں نرمی، اعتدال اور توسع پسندی تھی، اس لیے حنابلہ سے ان کی ہم آہنگی مشکل تھی۔

ان حالات میں خطیب کے اندر اگر اشتعال پیدا ہوگیا ہو اور وہ دوسرے مذاہب کے خلاف یک گونہ عصبیت سے کام لیتے رہے ہوں تو یہ بعید نہیں ہے لیکن اس کی جو مثالیں بیان کی گئی ہیں، ان سے خطیب کا تعصب ثابت نہیں ہوتا، اس کی وجہیں حسب ذیل ہیں:

خطیب کو امام احمد کے فقیہ و مجتہد ہونے میں کوئی کلام نہیں تھا، انھوں نے

(۱) ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ ص ۳۲ بحوالہ ذب ذبابات الدراسات ص ۴۴۴۔

امام احمد کے ترجمہ میں کئی جگہ ان کے تفقہ واجتہاد کا ذکر کیا ہے، خود امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''میں نے جب بغداد چھوڑا تو وہاں اس وقت امام احمد سے بڑا صاحبِ ورع وتقویٰ اور فقیہ و عالم شخص کوئی نہیں تھا۔'' اسی طرح اور بھی متعدد اصحابِ علم وفن کے ایسے بیانات نقل کئے ہیں جن سے امام احمد کی فقہ واجتہاد میں عظمت ومرتبت پوری طرح واضح ہوتی ہے، اس بنا پر یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ امام احمد کے تفقہ واجتہاد کے معترف نہیں تھے، البتہ یہ ممکن ہے کہ اکثر متقدمین کی طرح خطیب کو ان کے امامِ فقہ وصاحب مذہب ہونے میں کلام رہا ہو، کیوں کہ چوتھی صدی ہجری تک امام صاحب کی اس حیثیت سے شہرت نہیں ہوئی تھی، علامہ ابن جریر نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ (انما هو رجل حديث لا رجل فقه) خطیب کے معاصر اور مشہور مالکی محدث علامہ ابن عبدالبر نے انتقاد میں صرف ائمہ ثلاثہ کے تذکرہ پر اکتفا کیا ہے، بشاری مقدسی نے ان کو فقہا کے بجائے محدثین کے زمرہ میں شامل کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شروع میں امام احمد کی اصل شہرت محدث کی حیثیت سے زیادہ تھی لیکن بعد میں وہ امام فقہ اور صاحبِ مذہب کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے اور یہ شہرت اس قدر بڑھی کہ اب لوگ ان کو محدث کے بجائے فقیہ ومجتہد ہی کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں، چنانچہ ساتویں صدی میں فقہائے ثلاثہ کے ساتھ ان کا بھی نام لیا جانے لگا اور وہ ان چار مشہور ائمۂ اسلام اور فقہائے مجتہدین میں شمار کئے جانے لگے، جن کے فقہی واجتہادی مذاہب پر مسلمانوں کا اب تک عمل ہے، اس کی تفصیل اس کتاب کی پہلی جلد میں امام احمد کے تذکرہ میں گذر چکی ہے، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ پس خطیب کا امام احمد کو امامِ فقہ واجتہاد کی حیثیت سے ذکر نہ کرنا ان کی عظمت شان کے منافی ہے اور نہ اس سے ان کا مقصد امام احمد کا استخفاف ہے، رہی وہ ردوقدح جو مثالاً پیش کی گئی ہے تو اس کی حقیقت ملاحظہ ہو۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ ''خطیب نے واقعات

واقوال کو ذکر کرنے میں مورخانہ فرض ودیانت سے کام لیا ہے، اس لیے جہاں ائمہ اور رجال کے مناقب سے متعلق اقوال جمع کیے ہیں وہیں مخالفانہ اور نقد وجرح سے متعلق آرا بھی تحریر کیے ہیں، اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خود خطیب اس کے قائل تھے یا یہ واقعی ان کی رائے تھی۔

اس حیثیت سے حسین کرابیسی کا قول امام احمد کے متعلق صرف بطور واقعہ نقل کیا گیا ہے، اس کا مقصد ان کی مذمت وتنقیص نہیں ہے، امام احمد اور کرابیسی کے درمیان عقائد کے سلسلہ میں شدید اختلافات تھے، اس سلسلہ میں دونوں میں بعض مناقشات بھی ہوئے، امام احمد ان کے سخت نکتہ چیں تھے، دوسرے محدثین نے بھی کلام سے دلچسپی کی وجہ سے کرابیسی کے بارے میں ردوقدح کی ہے، امام احمد خلق قرآن کے باب میں جس قدر متشدد تھے، اس کا حال پہلی جلد میں گذر چکا ہے لیکن کرابیسی پر خلق قرآن کا الزام عائد کیا گیا ہے، خطیب نے مورخ کی حیثیت سے ان باتوں کا تذکرہ کیا ہے، اسی سلسلہ میں انھوں نے ایک واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص نے کرابیسی سے دریافت کیا کہ قرآن کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا وہ غیر مخلوق ہے، اس شخص نے پوچھا کہ جو قرآنی الفاظ آپ کے منہ سے ادا ہوتے ہیں ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کرابیسی نے جواب دیا کہ وہ مخلوق ہیں، اس شخص نے امام احمد سے یہ واقعہ بیان کیا تو انھوں نے اس پر ردونکیر کرتے ہوئے کہا کہ یہ بدعت ہے، سائل نے دوبارہ کرابیسی سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے تلفظ بالقرآن کو غیر مخلوق قرار دیا، چنانچہ اس شخص نے امام احمد کو کرابیسی کے رجوع کی خبر دی، انھوں نے ناگواری ظاہر کرتے ہوئے اس کو بھی بدعت قرار دیا ہے۔(۱)

---

(۱) غالباً امام احمد نے یہ جواب اس لیے دیا ہوگا کہ محدثین اور متدین علما ان مباحث میں غور وخوض سے بھی محترز رہتے تھے اور اس کو سخت ناپسند کرتے تھے، چنانچہ امام بخاری جب نیشاپور تشریف لے گئے اور وہاں لوگوں نے اس کے متعلق استفسار کیا تو انھوں نے تلفظ بالقرآن کو (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

شخص مذکور نے جب کرابیسی سے امام صاحب کی رائے کو بیان کیا تو انھوں نے کہا آخر ہم کیا کریں، اس شخص کا منشا کیا ہے، ہم اگر کہتے ہیں کہ تلفظ بالقرآن مخلوق ہے تو وہ اس کو بدعت قرار دیتا ہے اور اگر غیر مخلوق کہتے ہیں تب بھی بدعت ہی قرار دیتا ہے، جب امام احمد اوران کے تلامذہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ لوگ بہت برہم ہوئے اور ان لوگوں کی حسین پر نکتہ چینی کی یہی وجہ ہے۔(۱)

ظاہر ہے اس واقعہ کا امام احمد کی تنقیص سے کوئی تعلق نہیں ہے، خطیب کا اگر واقعی کوئی جرم ہے تو وہ محض نقلِ حکایت اور بیان واقعہ، اب واقعہ کی صحت وعدمِ صحت تو قابلِ بحث ہوسکتی ہے لیکن مجرد اس کے نقل کو اعتراض کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا، اگر دقتِ نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کرابیسی اور امام احمد کے اختلافات کے درمیان خطیب کا رجحان امام احمد کے موقف کی جانب تھا، اگر چہ انھوں نے کرابیسی کے بعض کمالات کا اعتراف کیا ہے لیکن کلام کے متعلق ان کی رایوں کو وہ پسند نہیں کرتے تھے، اسی لیے خاص طور پر اس کے متعلق محدثین اور اہلِ فن کی جرحیں اور کرابیسی کے بارے میں بعض علما کے سخت آرا تحریر کیے گئے ہیں۔(۲)

اس کے مقابلہ میں امام احمد کی تعریف میں وہ نہایت رطب اللسان نظر آتے ہیں، چنانچہ ان کے ترجمہ میں ان کے جملہ محامد وفضائل اور خدماتِ حدیث کا مفصل تذکرہ کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا دل امام احمد کی محبت وعقیدت سے معمور وسرشار تھا، جس شخص نے امام احمد کے متعلق اس قسم کے اقوال نقل کیے ہیں:

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) مخلوق بتایا، اس پر سخت ہنگامہ برپا ہوگیا اور امام ذہلی نے جن کو اس مسئلہ میں بڑا غلو تھا یہاں تک کہا کہ ''جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ میرے منھ سے نکلنے والے قرآنی الفاظ مخلوق ہیں وہ بدعتی ہے، نہ اس کے پاس بیٹھنا چاہیے اور نہ اس سے گفتگو کرنی چاہیے۔'' (طبقات الشافعیہ ترجمہ بخاری)

(۱) تاریخ بغداد ج۸ص ۶۵ (۲) ایضاً۔

من سمعتموه يذكر احمد بن حنبل بسوء فاتهموه على الاسلام.	اگر کسی شخص کو امام احمد کا تذکرہ برائی سے کرتے ہوئے سنو تو اس کے اسلام پر تہمت عائد کرو۔

آگے لکھتے ہیں:

''امام احمد کی ذات مبارک ایسی کسوٹی ہے جس پر مسلم و کافر کو پرکھا جا سکتا ہے، ان کی مذمت کرنے والا فاسق ہے۔''

نیز فرماتے ہیں:

اضحى ابن حنبل معنة مامونة ويحب احمد يعرف المتنسك
واذا رأيت لاحمد متنقصا فاعلم بان ستوره ستهتك (۱)

(یعنی امام ابن حنبل کی ذات درحقیقت ایک ابتلا و آزمائش ہے، ان کی محبت زہد و تقویٰ کی علامت ہے، اگر کوئی شخص ان پر نکتہ چینی کرے تو سمجھ لو کہ اس کا پردہ چاک ہو کر رہے گا۔)

اس کے دل میں اس امام جلیل کے استخفاف اور نکتہ چینی کا خیال بھی کس طرح آ سکتا ہے، اگر واقعی ایسا ہوتا تو وہ ان کی مذمت کے متعدد واقعات و اقوال تحریر کرتے لیکن معترضین کو تاریخ بغداد جیسی ضخیم کتاب میں خوردہ گیری کے باوجود اس کے سوا اور کوئی مثال نہیں مل سکی جو بالکل بے بنیاد ہے، یہی حال ان الزامات کا بھی ہے جو ان پر امام احمد کے تلامذہ کی نکتہ چینی کے بارے میں لگائے گئے ہیں، اس لیے ان کی بحث و تنقیح کو غیر ضروری سمجھ کر ہم نے نظر انداز کر دیا، کتاب الکفایہ کے آخر میں خطیب کے سوانح نگار نے لکھا ہے۔

ثم ذكر امثلة ممازعمه تعصبا من الخطيب على الحنابلة ومن نظر بعيني الانصاف	ابن جوزی نے اپنے گمان کے مطابق خطیب کے حنابلہ کے بارے میں تعصب کی جو مثالیں بیان کی ہیں، اگر

(۱) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۲۰ و ۴۲۱۔

لم یجد فیھا مثالا واحدا یظھر منه التعصب۔ (۱)	ان پر کوئی شخص انصاف سے غور کرے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی مثال سے بھی ان کا تعصب ظاہر نہیں ہوتا۔

امام ابوحنیفہؒ کے خلاف خطیب کے تعصب کی بنیاد تاریخ بغداد کے ان بیانات کو قرار دیا گیا ہے۔ جو ان کے ترجمہ میں درج ہیں، لیکن اس کے متعلق یہ وضاحت پہلے کی جا چکی ہے کہ خطیب نے ایک مورخ کی حیثیت سے وہ سب اقوال و بیانات جمع کر دیئے ہیں جو انھوں نے سنے تھے یا جن کا ان کو علم ہوا تھا، خواہ ان کا تعلق مناقب و محامد سے ہو یا مثالب و معائب سے، علاوہ ازیں انھوں نے امام ابوحنیفہؒ کے متعلق جو جرحیں تحریر کی ہیں ان کے بارے میں پہلے ہی معذرت کر دی ہے، نیز انھوں نے کہیں سے اس کو ظاہر نہیں ہونے دیا ہے کہ یہ ان کی اپنی رائے بھی تھی، بلکہ اس کے برعکس وہ امام صاحب کی جلالتِ قدر کے پوری طرح معترف معلوم ہوتے ہیں، البتہ چوں کہ محدثین کی ایک جماعت امام ابوحنیفہ کو حدیث میں زیادہ بلند پایہ نہیں سمجھتی تھی، اس لیے اس سے ان کے متعلق بعض سخت رائیں منقول ہیں، ممکن ہے، خطیب پر اس کا اثر رہا ہو، نیز چوں کہ ان کے زمانہ میں جماعتی عصبیت کا رجحان پیدا ہو رہا تھا، اس کی وجہ سے ممکن ہے ان کے اندر بھی عصبیت کا شائبہ آ گیا ہو لیکن تاریخ کے ان بیانات کو اس کا ثبوت قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

۲- اشاعرہ و متکلمین سے تعلق، حافظ ابن جوزی نے خطیب پر اس اعتراض کا بھی ذکر کیا ہے کہ:

''ان کو اشاعرہ و متکلمین سے بڑی شیفتگی تھی، حالاں کہ یہ محدثین کے شایانِ شان نہیں، حدیث میں کلام کی مذمت کی گئی ہے اور خود امام شافعیؒ سے بھی

(۱) خاتمہ کتاب الکفایہ ترجمۃ المولف۔

اس کی تردید منقول ہے۔''(۱)

اس کا جواب یہ ہے کہ اشاعرہ و متکلمین سے دلچسپی اہل بدعت کی جانب میلان کا نتیجہ نہیں ہے، جیسا کہ حنابلہ نے غلطی سے سمجھا ہے، عقائد وصفات کے بارے میں خطیب کی رائے سلف کے موافق تھی، رہی امام ابوالحسن اشعری کی ہمنوائی تو یہی قدیم وجدید محدثین کا مذہب تھا محتاط اور ثقہ علما نے کلام وعقائد میں غور وخوض کو ممنوع اس لیے قرار دیا ہے کہ ان مسائل میں توغل وانہماک سے لوگ مہماتِ دین سے غافل ہو جاتے تھے۔

۳-عامیانہ جرح وتعدیل کا اعتراض: حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ ''جرح وتعدیل کے معاملہ میں خطیب کا حال ان عوام محدثین کی طرح ہے جو قلت فہم کی وجہ سے خلاف واقعہ جرحیں کرتے ہیں، خطیب نے کتاب الجہر وکتاب القنوت میں غیر صحیح حدیثیں بیان کی ہیں اور مسئلہ صوم یوم الغیم کے بارے میں ایک موضوع حدیث ذکر کر کے اس سے استدلال کیا ہے اور اس کے سقم وجرح اور وضع کے بارے میں اصحاب فن کے بیانات نہیں نقل کئے ہیں، حالاں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت کے ساتھ ثابت ہے کہ جس نے جان بوجھ کر جھوٹی حدیث بیان کی وہ بھی جھوٹا ہے۔''(۲)

عامیانہ جرح وتعدیل کا الزام خطیب پر اس لیے عائد کیا گیا ہے کہ ان کو جو کچھ معلوم ہوا اور انھوں نے جو کچھ سنا اس کو بلا نقد وتبصرہ اور بلا بحث وتحقیق جمع کر دیا ہے لیکن دراصل اس معاملہ میں انھوں نے ایک مورخ کا فرض ادا کیا ہے، باقی غیر صحیح حدیثوں کے نقل واحتجاج کا جہاں تک معاملہ ہے تو اس کے بارے میں ہم کچھ تیقن کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کیوں کہ ان کی تصنیفات ہماری نظر سے نہیں گذریں ممکن ہے کہ انھوں نے کچھ غیر صحیح حدیثیں ذکر کی ہوں لیکن اس میں قصد وارادہ کو دخل نہیں اور نہ وہ جان بوجھ کر موضوع حدیث سے استدلال کر سکتے ہیں کیوں یہ ان کے اصول ومذہب کے خلاف ہے، غیر صحیح

(۱) المنتظم ج ۸ ص ۲۶۹ (۲) ایضاً ص ۲۶۸، ۲۶۹۔

حدیثوں سے حدیث کی کوئی کتاب خالی نہیں اور خطیب کی عظمتِ شان اگرچہ مسلم ہے لیکن پہلے گذر چکا ہے کہ ان کی تصنیفاتِ حدیث کا پایہ زیادہ بلند نہیں ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے ان کو چوتھے طبقہ کی کتب حدیث میں محسوب کیا ہے، اس لیے ان میں ضعیف وساقط الاعتبار ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں۔

۴۔ ناصبیت کا الزام: خطیب پر ایک الزام ناصبیت کا بھی ہے، اس کی وجہ پہلے گذر چکی ہے کہ جامع دمشق میں حدیث کا درس دیتے ہوئے انھوں نے فضائلِ عباس کی روایتیں بیان کی تھیں، (۱) مگر یہ ناصبیت کا کوئی ثبوت نہیں ہے کیوں کہ وہ صحابہ کے فضائل اور مراتب ودرجات کے قائل اور اہل بیت سے محبت رکھتے تھے، البتہ یہ ممکن ہے کہ فضائلِ عباس کی حدیثیں بیان کرنے کی وجہ سے چوں کہ روافض اور فاطمیہ اس قدر مشتعل ہو گئے تھے کہ وہ خطیب کو قتل کر دینا چاہتے تھے، اس لیے اس اشتعال اور ان کے زمانہ میں دمشق میں شیعیت کے استیلا اور فاطمیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے ردعمل میں خطیب میں نمایاں جوش وخروش پیدا ہو گیا ہو اور انھوں نے اس معاملہ میں شدت سے کام لیا ہو جس کا ان کو خمیازہ بھگتنا پڑا تھا لیکن یہ ناصبیت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

۵۔ تصنیفات کے متعلق اعتراض: ایک اعتراض یہ ہے کہ ان کی اکثر کتابیں حافظ محمد بن عبداللہ ساحلی صوری (م ۴۴۱ھ) کی تصنیفات سے ماخوذ ہیں، صوری جن کتابوں کو شروع کرنے کے بعد مکمل نہیں کر سکے تھے، خطیب نے انہی کی تکمیل کی اور صوری کی کتابوں کی بنیاد پر اپنی کتابیں مرتب کیں۔ (۲)

گو خطیب کی بعض کتابیں واقعتاً صوری کی کتابوں کی تخریج ہیں تاہم اس کی وجہ سے ان کی سب کتابوں کو صوری کی کتابوں کا چربہ قرار دینا صحیح نہیں ہے، اس کے متعلق ابن جوزی کا یہ بیان قابل غور ہے:

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۰۲ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۷ (۲) المنتظم ج ۸ ص ۲۶۶۔

"ایک شخص کی نکالی ہوئی راہ پر لامحالہ دوسرے لوگ بھی چلنے ہی لگتے ہیں، اس لیے خطیب کا کسی ڈھانچہ کو اصلی قالب اور نیا رنگ وروپ دیدینا کوئی عیب کی بات نہیں ہے، اصل میں یہ چیز دیکھنی چاہیے کہ ان کے کارناموں کی نوعیت کیا ہے؟ سو اس حیثیت سے خطیب کسی طرح قاصر نظر نہیں آتے، ان کی تصنیفات عدیم المثال اور بے نظیر ہیں، ان کا بغور مطالعہ کرنے سے ان کی قدر وقیمت کا اندازہ ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ دارقطنی وغیرہ کی تصنیفات بھی اس معیار اور پایہ کی نہیں ہیں۔" (۱)

(۱) المنتظم ج ۸ ص ۲۶۶۔

ابو عبداللہ محمد ابو نصر فتوح حمیدی

(المتوفی ۴۸۸ھ)

نام و نسب: محمد نام، ابو عبداللہ کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: محمد بن ابو نصر فتوح بن عبداللہ بن فتوح بن حمید بن یصل۔(۱)

ولادت: حمیدی سے منقول ہے کہ میں ۴۲۰ھ سے پہلے پیدا ہوا، عام مورخین نے اسی بیان پر اعتماد کر کے لکھا ہے کہ وہ ۴۲۰ھ سے پہلے پیدا ہوئے تھے،(۲) لیکن صاحب اعلام نے تصریح کی ہے کہ وہ ۴۹۸ھ (مطابق ۱۰۲۷ء) میں پیدا ہوئے،(۳) ابن عماد کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''حمیدی کا انتقال تقریباً ستر سال کی عمر میں ہوا،(۴) ان کا سن وفات ۴۸۸ھ ہے، اس لحاظ سے سن ولادت ۴۱۸ھ ہوگا۔

وطن: حمیدی کا اصل وطن رصافہ ہے لیکن ان کے والد میورقہ میں جو شرق اندلس کے قریب ایک جزیرہ ہے، آباد ہو گئے تھے، یہیں حمیدی کی ولادت ہوئی، اس جزیرہ کی نسبت سے جو اکابر منسوب ہیں ان میں حمیدی کا نام زیادہ ممتاز ہے، آخر عمر میں وہ بغداد چلے آئے تھے اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔(۵)

نسبتیں: ان کی سب سے مشہور نسبت حمیدی ہے جو ان کے پردادا حمید بن یصل کی جانب

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۷ و ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ و کتاب الانساب ورق ۵۴۸ (۲) ایضاً (۳) اعلام ج ۳ ص ۹۶۳ (۴) شذرات الذہب ج ۳ ص ۳۹۲ (۵) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۷ و المنتظم ج ۹ ص ۹۶ و معجم البلدان ج ۸ ص ۲۲۹ و بستان المحدثین ص ۸۲ و نفح الطیب ج ۱ ص ۳۷۵۔

ہے، بعض مورخین نے اس کی نسبت مشہور صحابی حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے صاحبزادے حمید کی جانب بتائی ہے مگر ابن خلکان نے اس کی تردید کی ہے۔

ان کی دوسری معروف نسبت میورقی ہے جو ان کے مولد میورقہ کی جانب ہے، ایک نسبت ازدی بھی ہے، یہ غالباً خاندان کی جانب ہوگی، وہ ظاہری بھی کہلاتے تھے، اس سے ان کے فقہی مذہب کا پتہ چلتا ہے۔

مغربی اور اندلسی کی نسبتوں سے ان کا اندلسی اور مغربی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

اساتذہ: انھوں نے جن اساتذہ سے علم وفن کی تحصیل کی تھی، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابوبکر احمد بن علی خطیب، ابوجعفر بن سلمہ، ابوعبداللہ قضاعی، ابوعمر بن عبدالبر، ابوغالب ابن بشران اموی، ابوالقاسم جیانی دمشقی، ابوالحسن عبدالدائم بن حسن ہلالی، ابوزکریا عبدالرحیم بخاری، عبدالصمد بن مامون، عبدالعزیز بن احمد کتانی، ابومحمد عبدالعزیز بن حسن ضراب، ابومحمد بن حزم علی بن احمد، ابوتمام علی بن محمد واسطی۔

صحیح بخاری کی مشہور راویہ کریمہ مروزیہ سے انھوں نے مکہ معظمہ میں ملاقات کی تھی، ارباب سیر نے تصریح کی ہے کہ ان کا ابن حزم سے خاص تعلق تھا اور وہ ان کے اجل تلامذہ میں تھے۔(۱)

تلامذہ: حمیدی کے مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابواسحٰق بن نبہان رمی، ابوعامر عبدری، اسماعیل بن سمرقندی، اسماعیل بن محمد طلحی، حسین بن حسن مقدسی، ابوعبداللہ حسین بن نصر، صدیق بن عثمان بربری علی بن علی امینی، ابوالفتح محمد بن بطی، محمد بن طرخان، محمد بن علی خلال، محمد بن ناصر، یوسف بن ایوب نہرانی زاہد۔

ان کے شیوخ میں خطیب نے بھی ان سے روایت کی ہے۔(۲)

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ وتذکرہ ج ۴ ص ۱۷ وکتاب الانساب ورق ۵۴۸ وبستان المحدثین ص ۸۲

(۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ وتذکرہ ج ۴ ص ۱۷ کتاب الانساب ورق ۵۴۸ وبستان المحدثین ص ۸۲۔

طلب علم اور سماع حدیث کے لیے سفر: حمیدی نے مشہور ممالک اسلامیہ اور مراکز حدیث کا دورہ کر کے علم وفن کی تحصیل کی اور حدیث اور اس کے متعلقہ فنون میں درک ومہارت بہم پہنچائی، اس سلسلہ میں انھوں نے اندلس، عراق، قیروان، حجاز، شام، افریقہ اور مصر وغیرہ کا سفر کیا اور ان مقامات کے علمائے فن اور ارباب کمال سے استفادہ کیا، شروع میں وہ بلاد مغرب میں مقیم رہے۔ ۴۴۸ھ میں بلاد مشرق کا سفر کیا اور پہلی دفعہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے، یہیں ان کی کریمہ مروزیہ سے ملاقات ہوئی، وہ نہایت کم سنی میں علم وفن کی تحصیل اور حدیث کی روایت وسماع میں مشغول ہو گئے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ سب سے پہلے میں نے ۴۲۵ھ میں فقیہ اصبغ بن راشد سے سماع کیا، گو اس وقت میری عمر کم تھی تاہم ان کے سامنے جو کچھ پڑھا جاتا تھا، اس کو سمجھ لیتا تھا، (۱) صاحب نفح الطیب لکھتے ہیں کہ ''وہ لوگوں کے دوش پر بیٹھ کر سماع کے لیے جاتے تھے۔'' (۲)

اشتغال علم: ان کو علم وفن سے بڑا تعلق تھا اور وہ برابر اس کی طلب وتحصیل اور نشر واشاعت میں منہمک رہتے تھے، ابن ماکولا کا بیان ہے کہ ان سے زیادہ میں نے علم سے اشتغال رکھنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔'' یافعی کا بیان ہے کہ وہ علم اور تحصیل علم کے دلدادہ تھے، ہمیشہ پورے شوق اور نہایت توجہ ومحنت سے علمی کاموں میں مصروف رہتے تھے، یہاں تک کہ گرمی کی تکلیف دہ راتوں میں بھی وہ علمی اشغال کو انہماک کے ساتھ جاری رکھتے تھے، علم سے تعلق اور اس کی نشر واشاعت سے ان کی دلچسپی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے کتابوں کا ایک وسیع ذخیرہ جمع کیا تھا اور ان کا کتب خانہ طلبہ اور شائقین علم کے لیے وقف رہتا تھا۔ (۳)

---

(۱) تذکرہ ج ۴ ص ۱۷، العبر ج ۳ ص ۳۲۳، وابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ (۲) نفح الطیب ج ۱ ص ۳۷۵

(۳) نفح الطیب ج ۱ ص ۳۷۵، ۳۷۶، ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵، تذکرہ ج ۴ ص ۱۸، المنتظم ج ۹ ص ۹۶، مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۱۴۹، شذرات ج ۳ ص ۳۹۲، تاریخ ابن اثیر ج ۱ ص ۸۸۔

ضبط وثقاہت: ان کے حفظ وضبط اور عدالت وثقاہت میں کوئی کلام نہیں کیا گیا ہے، ان کے معاصرین، تلامذہ اور سوانح نگاروں نے ان کو حافظ الحافظ المشہور، الحافظ الکبیر، احد حفاظ عصرہ، ثقہ، ثبت حجت، قدوہ اور متقن وغیرہ کہا ہے۔

حدیث میں درجہ ومرتبہ: حمیدی کا درجہ حدیث وروایت میں مسلم ہے، اربابِ فن نے ان کو صاحب حدیث، اور حافظ مکثر کہا ہے جو اس فن میں ان کی عظمت وجلالت کا ثبوت ہے، ابن ماکولا نے ان کے تیقظ کی تعریف کی ہے، یحییٰ بن ابراہیم سلماسی فرماتے ہیں کہ ''وہ حدیث اور اس کے علل ورواۃ کے عارف وامام اور اس کے ضبط وتحقیق اور تطبیق واصول میں ماہر تھے۔'' ذہبی کا بیان ہے کہ ان کو حدیث سے ویسی ہی واقفیت تھی جیسی ہونی چاہیے تھی، صاحب نفح الطیب لکھتے ہیں کہ وہ حدیث کے حفظ وضبط اور معرفت، نیز ثقاہت واتقان اور صدق وغیرہ میں امام تھے، ان کی یہ خصوصیت بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ حدیثیں بڑے دلکش اور عمدہ انداز میں پڑھتے تھے۔(۱)

علم رجال: حدیث کی طرح اس کے متعلقہ علوم یعنی علل حدیث اور فن رجال میں بھی ماہر تھے، علم حدیث کے سلسلہ میں اسماء الرجال کے فن کو جو اہمیت حاصل ہے حمیدی کو اس کا پورا اندازہ تھا، چنانچہ فرماتے ہیں کہ علم حدیث کے سلسلہ میں تین چیزوں پر خاص طور سے دھیان دینے اور ان کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک کتاب العلل اس میں سب سے عمدہ تصنیف امام دارقطنی کی ہے، دوسری مؤتلف ومختلف، اس فن میں امیر ابن ماکولا کی اکمال سب سے عمدہ کتاب ہے، تیسری وفیاتِ مشائخ، اس میں کوئی کتاب نہیں ہے، اس لیے میں نے اس کو مرتب کرنے کا ارادہ کیا ہے لیکن ابن ماکولا کا بیان ہے کہ وہ صحیحین میں اشتغال کی وجہ سے اس کی جانب اعتنا

(۱) تذکرہ ج ۴ صفحات ۱۸، ۱۹، ۲۰، ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ وبستان ص ۸۲، ونفح الطیب ج ۱ ص ۳۷۵ و ۳۷۶۔

نہیں کر سکے اور ان کی وفات ہوگئی۔(۱)

ذہانت ووسعتِ علم: مورخین نے حمیدی کی ذہانت وفطانت، وسعتِ علم ومطالعہ اور کثرتِ معلومات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ علوم کا مخزن تھے، ابو عامر حیدری نے ان کو علمی حیثیت سے عدیم المثال بتایا ہے، یحیٰ بن ابراہیم سلماسی فرماتے ہیں کہ ''وہ فضل وشرافت اور وفور علم میں بے نظیر تھے، میں نے علم وفن کی اشاعت کا ان سے زیادہ حریص شخص نہیں دیکھا۔''(۲)

فقہ: فقہ میں بھی امتیاز رکھتے تھے، اپنے والد اور مشہور فقیہ محمد بن ابوزید سے اس فن کی تحصیل کی تھی، ان سے انھوں نے الرسالہ ومختصر مدونہ کی روایت بھی کی ہے، ابو عامر حیدری کا بیان ہے کہ وہ فقہ وحدیث دونوں میں جامع تھے۔(۳)

سیر وتاریخ: حمیدی کی اخبار، سیر، تاریخ اور وقائع پر بھی گہری نظر تھی، اس پر ان کی تصنیفات شاہد ہیں۔

ادب وعربیت: دینی علوم کی طرح ادبیات سے بھی شغف تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

درعلم عربیت وادب وحل تراکیب	علم وعربیت وادب، قرآن کی ترکیبوں
قرآن ودریافت لطافت بلاغت	کے حل اور اس کی بلاغت ولطائف کی
آن دستگاہی کلی نصیب دارد۔(۴)	دریافت میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔

صاحب نفح الطیب کا بیان ہے کہ وہ علم وادب وعربیت میں متبحر تھے، (ج ۱ ص ۳۷۵)

شعر وسخن: حمیدی نے موزوں طبیعت پائی تھی، اس لیے شعر وشاعری بھی کرتے تھے، ان

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵، ۲۸۶ وتذکرہ ج ۴ ص ۱۹ ومرأۃ الجنان ج ۳ ص ۱۴۹ (۲) نفح الطیب ج ۱ ص ۳۷۵، تذکرہ ج ۴ ص ۱۸، ومرأۃ الجنان ج ۳ ص ۱۴۹ (۳) تذکرہ ج ۴ ص ۱۷ و ۱۸ ونفح الطیب ج ۱ ص ۳۷۵ (۴) بستان المحدثین ص ۸۲۔

کے اشعار وعظ و پند اور حکمت و موعظت پر مشتمل ہوتے تھے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

لقاء الناس ليس يفيد شيئا سوى الهذيان من قيل وقال
فاقلل من لقاء الناس الا لاخذ العلم او اصلاح حال

ترجمہ: لوگوں سے میل جول بے فائدہ ہے، اس سے بکواس اور لا یعنی قیل وقال کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، اس لیے علم کی تحصیل یا اپنی اصلاح کے علاوہ لوگوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کردو۔

كتاب الله عزوجل قولى وماصحت به الآثار دينى
ومااتفق الجميع عليه بدأ وعودا فهو عن حق مبين
فدع ماصد عن هذا وخذها تكن منها على عين اليقين (۱)

ترجمہ: اللہ کی کتاب اور صحیح روایت و آثار میرا مسلک و دین ہے اور جن چیزوں پر امت اول سے آخر تک متفق ہو وہ بھی بجا طور پر حق مبین ہے، اس لیے اگر تم بھی ان کو اختیار کرلو اور جو چیزیں ان میں مانع ہوں ان کو چھوڑ دو تو عین یقین پر فائز ہو جاؤ گے۔

ورع وتقویٰ: علم وفضل کی طرح تقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ تھے، ان کے ورع وعفاف، عفت وتدین اور پاکبازی کا تمام ارباب سیر نے ذکر کیا ہے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ وہ نباہت ومعرفت، اتقان، تدین اور ورع سے متصف تھے، ان کے معاصر اور دوست امیر ابن ماکولا فرماتے ہیں کہ مجھ کو پاکی، نزاہت، عفت اور پرہیزگاری میں حمیدی کا کوئی مثیل نظر نہیں آیا، اتباع سنت ان کا خاص شعار تھا، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، شرم وحیا کے پیکر تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز ابوبکر بن میمون نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا، حمیدی نے غفلت کی وجہ سے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ سمجھے کہ غالباً مجھ کو اندر جانے

(۱) بستان المحدثین ص ۸۲ و اتحاف النبلاء ص ۳۸۳۔

کی اجازت ہے، چنانچہ وہ کمرے کے اندر داخل ہو گئے، اس وقت حمیدی کی ران کھلی تھی، وہ شرم سے پانی پانی ہو گئے اور دیر تک ان پر رقت طاری رہی، انھوں نے کہا جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے اس وقت سے آج تک کسی نے میری ران کو برہنہ نہیں دیکھا تھا۔(۱)

دنیا سے بیزاری: ورع وتدین کی بنا پر وہ دنیا سے نہایت بےزار اور کنارہ کش رہتے اور دنیا اور اس کے زخارف کے تذکرہ سے کبھی ان کی زبان آلودہ نہ ہوتی اور نہ ان کی مجلسوں میں مال ومتاع دنیا کا کوئی چرچا ہوتا تھا، ان کی زندگی نہایت سادہ اور صبر وقناعت کی تھی، صرف کفاف پر گذر بسر کرتے تھے، ابوبکر بن خاضیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو کبھی دنیا کا تذکرہ کرتے ہوئے نہیں پایا، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ لوگوں نے ان کی مجلسوں اور گھر وغیرہ میں بارہا ان کا امتحان لینا چاہا لیکن ان کی زبان پر دنیا اور اس کی جاہ وحشمت کا کوئی ذکر نہیں آیا، ان کی شاعری بھی نہایت پر از حکمت اور دنیا کی مذمت پر مشتمل ہوتی تھی۔(۲)

فقہی مذہب ومسلک: وہ امام ابن حزم کے اخص تلامذہ میں تھے، اس لیے ان کا رجحان بھی اپنے استاذ کی طرح ظاہری مذہب کی طرف تھا، غالباً ان کے زمانہ میں اہلِ ظاہر کے خلاف یک گونہ شورش وہیجان پایا جاتا تھا، اس لیے وہ اپنی ظاہریت کو مخفی رکھتے تھے، قاضی عیاض کا بیان ہے کہ اس کے باوجود ان کو فتنوں سے دوچار ہونا پڑا اور بعض علما نے ان کے ساتھ سختی اور شدت کا معاملہ کیا، اس سے تنگ آکر بلادِ مشرق کی طرف چلے گئے۔(۳)

وفات: حمیدی نے منگل کی شب میں ۱۷ ذی الحجہ ۴۸۸ھ کو اس جہانِ فانی کو الوداع کہا اور بدھ کے روز باب ابرز میں شیخ ابواسحق شیرازی کے مزار کے پاس دفن کیے گئے۔ مشہور شافعی فقیہ محمد بن احمد بن حسین نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

---

(۱) ابن خلکان ج ۳ ص ۲۸۵ وتذکرہ ج ۴ ص ۱۸ (۲) تذکرہ ج ۴ ص ۱۸ وبستان المحدثین ص ۸۲

(۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۹، ۲۰۔

مدفن: مشہور ہے کہ انھوں نے وفات سے پیشتر بغداد کے افسر اعلیٰ مظفر کو وصیت کی تھی کہ مجھ کو بشر حافی کے مزار کے پاس دفن کیا جائے لیکن اس نے اس وصیت کا خیال نہیں کیا اس لیے وہ پہلے شیخ ابو اسحاق کے مقبرہ کے قریب دفن کیے گئے، مگر کچھ دنوں کے بعد مظفر نے خواب دیکھا کہ حمیدی اس بارے میں اس سے گلا و شکایت کر رہے ہیں، اس کا اثر یہ ہوا کہ ماہ صفر ۴۹۱ھ میں اس نے ان کو سابق مدفن سے منتقل کر کے بشر حافی کے مقبرہ کے پاس دفن کرا دیا، کہا جاتا ہے کہ اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود ان کا کفن تر و تازہ اور جسم صحیح و سالم تھا اور دور تک اس کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، بعض مورخین نے اس واقعہ کو ان کی کرامت میں شمار کیا ہے۔(۱)

تصنیفات: حمیدی سے جو تصنیفات یادگار ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں:

۱- کتاب الجمع بین الصحیحین: یہ حمیدی کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف ہے، اس کو انھوں نے صحابہ کے ناموں پر ان کے فضل و تقدم کے اعتبار سے مرتب کیا ہے، اس لیے اس میں سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ اور اس کے بعد خلفائے راشدین پھر عشرہ مبشرہ کی حدیثیں ہیں اور اس کے بعد دیگر صحابہ کے مرویات ان کے مراتب کے اعتبار سے درج ہیں، اس موضوع پر اور علما نے بھی کتابیں لکھی ہیں لیکن حمیدی کی تصنیف کو خاص امتیاز حاصل ہے اور وہ بڑی مستند و معتبر خیال کی جاتی ہے، علامہ ابن اثیر جزری لکھتے ہیں:

واعتمدت فی النقل من	میں نے صحیحین کی حدیثیں (اپنی
الصحیحین علی ماجمعه	کتاب جامع الاصول میں) نقل کرنے
الحمیدی فی کتابه فانه	میں حمیدی کی کتاب پر اعتماد کیا ہے،
احسن فی ذکر طرقه	کیوں کہ انھوں نے روایات کے طرق
واستقصیٰ فی ایراد رواته	بیان کرنے میں بڑی خوبی سے کام لیا

(۱) ایضاً و بستان المحدثین ص ۸۲ و نفح الطیب ج ۱ ص ۳۷۶۔

والیه المنتهی فی جمع هذین الکتابین۔	ہے اور رواۃ کا بھی نہایت استقصا سے ذکر کیا ہے، پس ان دونوں کتابوں کے بارے میں یہی کتاب اصل مرجع ہے۔

اس کتاب کی اہمیت کی وجہ سے اس کی شرحیں اور تلخیصات بھی کی گئی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱- الایضاح عن معانی الصحاح: یہ عون الدین ابوالمظفر یحییٰ بن محمد المعروف بابن ہبیرہ وزیر حنبلی (م ۵۶۰ھ) کی شرح ہے، اس میں حکم نبوی کی شرح ووضاحت کی گئی ہے، اور یہ چند جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی پہلی جلد کو لوگوں نے کتاب الافصاح کے نام سے علاحدہ اور مستقل کتاب قرار دیا ہے۔

۲- الحجة: ابوعلی حسن بن خطیر نعمانی الظہیر فارسی (م ۵۸۹ھ) کی شرح ہے، جو کتاب الافصاح کا مختصر ہے تاہم اس میں بعض اضافے بھی ہیں۔

۳- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے الجمع کی تلخیص کی ہے، الجمع کے قلمی نسخے شیخ الاسلام مدینہ، خدیویہ مصر اور خدا بخش خان پٹنہ کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔(۱)

ایک اعتراض اور اس کا جواب: عراقی کا بیان ہے کہ حمیدی نے اس میں بعض ایسے الفاظ اور تتمے بڑھائے ہیں جو صحیحین میں موجود نہیں ہیں، اس بنا پر اصل واضافہ میں تمیز مشکل ہوگئی ہے لیکن بقائی نے اس کا جواب دیتے ہوئے خود حمیدی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ گو میں نے اس میں تتمے کے طور پر صحیحین کے ساتھ اعتنا کرنے والے بعض لوگوں مثلاً اسماعیلی وبرقانی وغیرہ کے بیانات الفاظِ حدیث کی تشریح وغیرہ کے ضمن میں نقل کیے ہیں مگر اصل واضافہ میں امتیاز کے لیے اس قسم کے الفاظ بھی لکھے ہیں۔

(۱) مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۵۷ و فہرست خدیویہ مصر ج ۲ ص ۳۲۵ و فہرست کتب خانہ خدا بخش پٹنہ ج ۱ ص ۴۷

الیٰ ھھنا انتھت روایة البخاری او من ھنا زادہ البرقانی اوکذا زادہ فلان۔ (۱)	یہاں بخاری کی روایت تمام ہوگئی یا یہاں سے برقانی کا اضافہ شروع ہوتا ہے یا یہ فلاں شخص کا اضافہ ہے۔

۲-کتاب تاریخ اندلس: اس کا اصل نام جذوۃ المقتبس فی تاریخ علماء الاندلس یا جذوۃ المقتبس فی اخبار علماء الاندلس ہے، اس کے شروع میں مصنف نے لکھا ہے کہ انھوں نے اس کو اپنی یادداشت سے مرتب کیا ہے۔ (۲)

۳-کتاب الامانی الصادقہ، ۴-کتاب تسہیل السبیل الیٰ علم الترسیل، ۵-کتاب ماجاء من النصوص والاخبار فی حفظ الجار، ۶-کتاب ذم النمیمہ، ۷-کتاب الذہب المسبوک فی وعظ الملوک، ۸-کتاب الرسل، ۹-جمل تاریخ الاسلام یا تاریخ الاسلام، ۱۰-کتاب مخاطبات الاصدقاء فی المکاتبات واللقاء، ۱۱-کتاب من ادعی الامان من اہل الایمان۔ (۳)

☆☆☆

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۴۰۰ و ۴۰۱۔ (۲) ایضاً ج ۱ ص ۳۹۰ و بستان المحدثین ص ۸۲ (۳) ایضاً و نفح الطیب ج ۱ ص ۴۷۵۔

حافظ شیرویہ بن شہردار دیلمی

(م۵۰۹ھ)

نام ونسب: شیرویہ نام ابوشجاع کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: شیرویہ بن شہردار بن شیرویہ ابن فناخسرو۔

ولادت ووطن: ۴۴۵ھ میں ہمدان میں پیدا ہوئے۔

خاندان: وہ نسباً عجمی تھے اور ان کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی فیروز دیلمی سے ملتا ہے، حضرت فیروز دیلمی کو مدعیٔ نبوت اسود عنسی کے قاتل ہونے کا فخر حاصل ہے۔(۱)

شیوخ: شیرویہ کے بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوالقاسم بن السری (یا البسری) احمد بن عیسیٰ بن عباد دینوری، سفیان بن حسین بن فنجویہ، ابومنصور عبدالباقی بن محمد (یا علی) العطار، عبدالحمید بن حسن قفاعی، ابوعمرو عبدالوہاب بن مندہ، ابوالفرج علی بن محمد حریری بجلی ابوالفضل محمد بن عثمان قومسانی (یا قوسانی) محمد بن عیسیٰ دینوری اور یوسف بن محمد بن یوسف مستملی وغیرہ۔(۲)

تلامذہ: چند تلامذہ کے نام ملاحظہ ہوں:

حافظ ابوموسیٰ مدائنی، حافظ ابوالعلا احمد بن حسن عطا، حافظ ابوالعلا احمد بن محمد بن

(۱) طبقات الشافعیہ ج۴ ص۲۳۰ وشذرات الذہب ج۴ ص۳۴ (۲) طبقات الشافعیہ ج۴ ص۲۳۰ وتذکرۃ الحفاظ ج۴ ص۵۵ و۵۶۔

فضل اسفرائنی، محمد بن قاسم ساوی۔

شیرویہ کے خاص تلامذہ میں ان کے نامور فرزند شہردار دیلمی بھی ہیں،(۱) ان کے مختصر حالات آگے درج ہیں۔

رحلت وسفر: ذہبی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمدان کے علاوہ انھوں نے اصفہان، بغداد اور قزوین کے اہل علم اور محدثین سے کسب فیض کیا تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ان جگہوں کے علاوہ دوسرے اسلامی شہروں میں بھی سیر وسیاحت کی اور ابن صلاح نے ان کے متعلق واسع الرحلہ لکھا ہے۔(۲)

حدیث میں درجہ: وہ مشہور حفاظ اور صاحب تصنیف محدثین میں تھے، اہل سیر نے ان کو المحدث والحافظ لکھا ہے، ذہبی نے ان کے حسن معرفت کا بھی ذکر کیا ہے، تاہم ضبط واتقان میں زیادہ بلند پایہ نہ تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

اما در اتقان، معرفت وعلم او قصور یست در سقیم وصحیح احادیث تمیز نمی کند ولہذا دریں کتاب او موضوعات وواہیات تودہ تودہ مندرج۔(۳)

اتقان، معرفت اور علم میں کچھ قصور تھا، سقیم اور صحیح حدیثوں میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا ان کی اس کتاب (فردوس الاخبار) میں موضوعات اور غیر مستند چیزیں درج ہیں۔

تاریخ وسیر: حدیث کی طرح سیر وتاریخ بھی ان کا موضوع تھا اور ان فنون پر ان کی اچھی نظر تھی اور مورخ ہمدان کہلاتے تھے۔

ذہانت: وہ غیر معمولی ذہین تھے، ذہبی نے ذکی القلب، ابن صلاح نے ذکی اور یحیٰی ابن مندہ نے کیس کہہ کر ان کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۲۳۰ تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۵ و ۵۶ (۲) تذکرہ ج ۴ ص ۵۶ و بستان ص ۶۲ وشذرات الذہب ج ۴ ص ۲۴ (۳) بستان المحدثین ص ۶۲۔

عقیدہ ومسلک: شیرویہ صحیح العقیدہ اور مذہب اہل سنت کے بڑے حامی اور فرق باطلہ سے متنفر تھے، ابن صلاح اور ابن مندہ نے ان کو مذہب سنت میں متصلب اور اعتزال سے دور بتایا ہے۔

فقہی مذہب: فقہ میں امام شافعی کے مذہب کے پیرو تھے، ابن شہبہ اور تاج الدین نے طبقات الشافعیہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

اخلاق واوصاف: حسنِ خلق سے بھی متصف تھے، ابن مندہ وابن صلاح نے ان کے خلیق، دلیر اور کم گو ہونے کا ذکر کیا ہے۔

شکل وشباہت: سیرت کی طرح عمدہ صورت بھی پائی تھی اور بڑے وجیہ وشکیل آدمی تھے، ابن مندہ وابن صلاح نے کہا ہے کہ وہ صورت وسیرت دونوں میں ممتاز تھے۔

وفات: رجب ۵۰۹ھ میں وفات ہوئی۔(۱)

اولاد: ان کے ایک صاحب زادہ ابو منصور شہردار کا ذکر ملتا ہے، یہ بھی صاحبِ فضل وکمال تھے، اس لیے ان کے مختصر حالات درج ہیں۔

شہردار نے اپنے والد کے علاوہ متعدد اساتذۂ فن سے علمِ حدیث کی تحصیل کی تھی، ان کو علمِ حدیث کی فہم ومعرفت کا بڑا ملکہ تھا، سمعانی نے ان کے فہم ومعرفت کی شہادت دی ہے، لوگوں کا خیال ہے کہ ضبط واتقان اور فہم ومعرفتِ حدیث میں اپنے والد سے بہتر تھے، طلبِ علم میں یہ ان کے ساتھ ساتھ رہتے تھے، ۵۰۵ھ میں ان کے ہمراہ اصفہان گئے اور ۵۳۷ھ میں تنہا بغداد تشریف لے گئے، زیادہ وقت درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں بسر کرتے، علم وادب سے اچھی واقفیت تھی، زہد واتقاء کے زیور سے آراستہ اور بڑے عبادت گذار تھے، مسجد ہی میں رہ کر تالیف وتصنیف اور درس وتدریس کا کام بھی انجام دیتے

(۱) یہ تفصیلات تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۶ طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۲۳۰ شذرات الذہب ج ۴ ص ۲۴ اور بستان المحدثین ص ۶۲ سے ماخوذ ہیں۔

تھے، اپنے والد شیرویہ کی کتاب فردوس الاخبار کو ازسرنو مرتب کیا اور جب اس کی تہذیب وتنقیح سے فارغ ہوئے تو ان کے لڑکے اور شیرویہ کے پوتے ابومسلم احمد اور دوسرے شاگردوں نے ان سے اس کی روایت کی، ۵۵۸ھ میں انتقال کیا۔(۱)

تصنیفات: حافظ شیرویہ کا خاص مشغلہ درس وتدریس اور تالیف وتصنیف تھا، ان کی جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱- کتاب الفردوس: یہ قضاعی کی کتاب الشہاب پر مستخرج ہے، اسی لیے اس کا نام فردوس الاخبار بماثور الخطاب المخرج علی کتاب الشہاب ہے، یہ دس ہزار چھوٹی حدیثوں پر مشتمل ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے کتب حدیث کے چوتھے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کی ترتیب مشارق اور جامع صغیر کی طرح حروف تہجی پر ہے، اس میں سندوں کا ذکر نہیں ہے لیکن رواۃ کا ذکر ہے، حوالہ اور مخرج کے لیے علامتیں اور رموز دیے گئے ہیں، سیوطی کی جامع صغیر میں بعینہ اس کا تتبع کیا گیا ہے، یہی کتاب مسند الفردوس کے نام سے مشہور ومتداول ہے، جس کو مصنف کے فرزند (محدث شہردار) نے چار جلدوں میں ازسرنو صحابہ کے ناموں پر مرتب کیا ہے اور ہر ہر حدیث کو سنداً بیان کیا ہے۔(۲)

حافظ ابن حجر نے تہدیس القوس فی مختصر مسند الفردوس کے نام سے اس کا مختصر کیا ہے، (۳) اور سیوطی کا بیان ہے کہ حافظ نے اس کے زوائد ایک جلد میں جمع کیے ہیں (۴) اس کے قلمی نسخے مدینہ، جرمنی، مصر، حیدرآباد اور رام پور کے کتب خانوں میں ہیں۔(۵)

---

(۱) شہردار کے حالات کے لیے طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۲۳۰ و بستان المحدثین ص ۶۲ ملاحظہ ہو، (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۸۶ و ۴۳۴ والرسالۃ المستطرفہ ص ۶۴ و بستان المحدثین ص ۶۲ (۳) ایضاً (۴) تدریب الراوی ص ۲۹۔ (۵) مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۵۸، مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۴ فہرست خدیویہ مصر ج ۱ ص ۴۱۹ و ۴۲۰ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۲- تاریخ ہمدان، شیخ محمد بن عبدالملک ہمدانی (م ۵۲۱ھ) نے اس کا ذیل لکھا ہے۔(۱)

۳- کتاب حکایات المنامات،۴- ریاض الانس لعقلاء الانس فی معرفۃ احوال النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتاریخ الخلفاء: اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے علاوہ خلفائے راشدین اور خلفائے بنی امیہ وعباس کا تذکرہ بھی آ گیا ہے، یہ کتاب عباسی خلیفہ مستظہر باللہ ابوالعباس احمد بن عبداللہ المقتدی بامراللہ (۴۸۷ھ تا ۵۱۲ھ) کے تذکرہ پر تمام ہوئی ہے، اس کا قلمی نسخہ مصر کے کتب خانہ میں ہے۔(۲)

☆☆☆

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) وفہرست کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ج ۱ص ۶۵۴ و ۶۵۵ وفہرست انگریزی رضا لائبریری رام پور ج ۱ص ۴۶۴ تا ۴۶۶۔

(۱) کشف الظنون ج ۱ص ۲۳۵ (۲) تذکرۃ النوادر ص ۸۰ و ۸۱۔

امام ابومحمد حسین فراء بغوی

(متوفی ۵۱۹ھ)

نام ونسب: حسین نام، ابومحمد کنیت، محی السنۃ ورکن الدین لقب اورالفراء وابن الفراء عرفیت ہے،نسب نامہ یہ ہے: حسین بن مسعود بن محمد بن الفراء۔

فراء وابن الفراء کی عرفیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرو(پوستین) سینااورفروخت کرنا ان کا خاندانی پیشہ تھا۔(۱)

ولادت ووطن: امام بغوی ۴۳۶ھ یااس سے کچھ پہلے بغ میں پیدا ہوئے، یہ ہرات اورمرو کے درمیان خراسان کا ایک مقام ہے،اس کا اصلی نام بغشور جو باغ کور کامعرب ہے بتایا جاتا ہے ''شور'' حذف ہوجانے سے بغ ہوگیا،بغوی کی نسبت اسی کی طرف ہے، ابوسمعانی (م۵۶۲ھ) کوکئی بار یہاں جانے کا اتفاق ہوا، ان کے زمانے تک یہ آباد اورمعمورتھالیکن یاقوت حموی کا بیان ہے کہ ۶۱۶ھ میں یہ اجڑنا شروع ہوگیا تھا،اس شہرکوجن اکابرعلمائے اسلام کا مولد ہونے کا شرف حاصل ہےان میں فراء بغوی بھی ممتاز اورقابل ذکر ہیں۔(۲)

اساتذہ: ان کے بعض مشہورشیوخ کے نام ملاحظہ ہوں:

احمد بن نصرتوقانی،حسان بن محمد منیعی ، قاضی حسین ، ابوالفضل زیاد بن محمد حنفی ،

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۴ص۵۴ وبستان المحدثین ص۵۲ (۲) ایضاً وابن خلکان ج۱ص۲۶۰ وکتاب الانساب ورق۸۶ ومعجم البلدان ج۲ص۲۴۵و۲۴۶۔

ابوالحسن عبدالرحمٰن بن محمد داؤدی ابوعمر عبدالواحد بن احمد ملیحی، ابوالحسن علی بن یوسف جوینی، ابوالحسن محمد بن محمد شیرازی، ابوبکر محمد بن ہیثم ترابی اور ابوبکر یعقوب بن احمد صیرفی۔

قاضی حسین صاحب تعلیقہ فقہ میں بڑے صاحب کمال تھے، ان کا شمار اجل شوافع میں ہوتا ہے، بغوی ان کے خاص تلامذہ میں تھے اور فقہ کی تحصیل ان ہی سے کی تھی۔

تلامذہ: ابومنصور محمد بن اسعد عطاردی المعروف بابن حفدہ، ابوالفتوح محمد بن محمد طائی وغیرہ ان کے مشہور شاگرد ہیں، بغوی کے آخری شاگرد جن کو ان سے روایت کی اجازت حاصل تھی، ابوالمکارم فضل اللہ بن محمد توقانی تھے، یہ چھٹی صدی ہجری تک طالقان میں بقید حیات رہے اور علامہ ذہبی کے شیخ فخر الدین علی مقدسی کو ان سے اجازت حاصل تھی۔(۱)

سماع حدیث کی ابتدا: بغوی کے سوانح نگاروں نے ان کے رحلت وسفر کی تصریح نہیں کی ہے لیکن اس عہد کے محدثین کی طرح انھوں نے بھی سماع حدیث اور تحصیل علم کے لیے اسلامی ممالک کا سفر ضرور کیا ہوگا، علامہ ابن سبکی کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۴۶۰ھ کے بعد حدیث کے سماع کا آغاز کیا تھا۔(۲)

حدیث میں درجہ: ان کا درجہ حدیث میں مسلم ہے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ اس فن میں ان کا مقام نہایت بلند ہے، ابن خلکان نے محدث اور ذہبی نے الحافظ کہہ کر ان کے حدیث میں کمال و امتیاز کا ذکر کیا ہے، ابن ہبۃ اللہ بغوی کو فن حدیث میں امام اور صاحب روضات عدیم النظیر بتاتے ہیں، شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ وہ بے نظیر محدث اور معتبر و معتمد شارحین حدیث میں تھے، شوافع میں احادیث کی شرح و توجیہ کے لیے جو علما ممتاز سمجھے جاتے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہیں (۳) ان کا لقب محی السنۃ اس فن میں ان کی عظمت و کمال کا ثبوت ہے۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۴ و ۵۵ وطبقات الشافعیہ (ابن سبکی) ج ۴ ص ۲۱۴ و ۲۱۵ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۲۱۴ (۳) طبقات الشافعیہ ابن سبکی ج ۴ ص ۲۱۴ وابن خلکان ج ۱ ص ۲۵۹ و ۲۶۰ وطبقات الشافعیہ لابن ہبۃ اللہ ص ۴۷ بستان المحدثین ص ۵۲ وعجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۴

تفسیر: کلام رسول کی طرح کلام الٰہی سے بھی ان کو خاص شغف اور لگاؤ تھا، چنانچہ حدیث کی طرح قرآن مجید کی تشریح وتفسیر میں بھی وہ ممتاز مانے جاتے ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ان کو بے عدیل اور صاحب روضات نے عدیم النظیر مفسر کہا ہے اور ابن سبکی نے علم تفسیر میں عالی وبلند پایہ اور ابن ہبۃ اللہ نے امام بتایا ہے(۱)، حدیث کی طرح تفسیر میں بھی ان کی کتاب نہایت اہم خیال کی جاتی ہے، کلام اللہ کے سلسلہ میں وہ قرأت وتجوید کے فن کے ماہر بھی تھے، اپنی تفسیر میں انھوں نے قرأت کے متعلق مفید بحثیں کی ہیں۔

فقہ: وہ فقہ کے ماہر اور مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے، اسی لیے علامہ ذہبی نے ان کو المجتہد کہا ہے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں۔

''ان کو فقہ میں یدطولا حاصل تھا اور اس میں ان کی معلومات کا دائرہ نقل وتحقیق ہر اعتبار سے وسیع تھا، ان کے اختیار کردہ مسائل پر جب بحث کی گئی تو وہ ان اقوال کے مقابلہ میں جن کو انھوں نے ترک کیا تھا، قوی اور مرجح تھے، ابن ہبۃ اللہ کا بیان ہے کہ وہ فقہ میں امام تھے، قاضی حسین صاحب تعلیقہ سے تلمذ ان کے بلند پایہ فقیہ ہونے کا ثبوت ہے۔''

بغوی مجتہدانہ اوصاف کے باوجود شافعی المذہب تھے اور ان کا شمار اکابر شوافع میں ہوتا ہے۔(۲)

جامعیت واعتراف کمالات: اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے بغوی کی جامعیت، گوناگوں کمالات اور اسلام کے تین اہم اور بنیادی علوم یعنی تفسیر، حدیث اور فقہ میں امامت وعظمت شان پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، چنانچہ علامہ ابن سبکی و ابن ہبۃ اللہ کا بیان ہے کہ وہ قرآن وسنت اور فقہ کے علوم کے جامع، امام اور یکتائے روزگار تھے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بغوی ان تینوں علوم کے فاضل تھے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ

(۱و۲) طبقات الشافعیہ ابن سبکی ج ۴ ص ۲۱۴ وابن خلکان ج ۱ ص ۲۵۹ و ۲۶۰ وطبقات الشافعیہ لابن ہبۃ اللہ ص ۴۷ بستان المحدثین ص ۵۲ وعجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۴۔

ان تینوں فنون میں جامع اور ہر ایک میں مرتبہ کمال پر فائز تھے، ان کی پوری زندگی انہی علوم کے پڑھنے پڑھانے اور ان سے متعلق کتابیں لکھنے میں بسر ہوئی، ابن اہدل کا بیان ہے کہ انھوں نے مختلف الفنون مفید تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، علامہ ابن سبکی کا بیان ہے کہ بغوی جلیل القدر امام تھے، وہ بغداد نہیں جا سکے ورنہ ان کا بڑا مبسوط تذکرہ لکھا جاتا، شیخ امام (صاحب شرح مہذب) ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کی تحقیقات کی تعریف کرتے تھے، ذہبی نے ان کو امام، حافظ، مجتہد اور محی السنۃ اور ابن خلکان نے علوم کا سمندر بتایا ہے اور یافعی و ابن عماد نے امام اور عالم خراسان لکھا ہے۔ (۱)

شغل: اوپر گذر چکا ہے کہ وہ تفسیر، حدیث اور فقہ تینوں علوم کے جامع تھے اور ان ہی مبارک علوم سے متعلق تصنیف وتالیف اور درس وتدریس میں عمر گذار دی (۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم وفن کی خدمت وتحقیق ہی ان کا خاص معمول تھا اور شب وروز وہ اسی میں مشغول ومنہمک رہتے تھے۔

زہد وعبادت: عملی اور دینی حیثیت سے بھی ممتاز اور بلند پایہ تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ قائم اللیل وصائم النہار علمائے ربانیین میں تھے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں کہ بغوی علم وعمل کے جامع، متبع سلف اور دینی لحاظ سے عالی مقام تھے، دوسرے ارباب سیر وتذکرہ نے بھی ان کے زہد وورع، صلاح وتقویٰ اور نسک وعبادت کا ذکر کیا ہے۔ (۳)

سادگی وقناعت: ان کی زندگی تکلف وآرائش سے خالی اور نہایت سادہ تھی، قناعت اور سادگی کا یہ حال تھا کہ ہمیشہ روکھا سوکھا کھاتے اور موٹا جھوٹا پہنتے تھے اور کفاف پر گذر بسر

---

(۱) طبقات الشافعیہ ج۴ ص۲۱۴ و ۲۱۵، البدایہ والنہایہ ج۱۲ ص۱۹۳، بستان المحدثین ص۵۲ وتذکرۃ الحفاظ ج۴ ص۵۴ ومرآۃ الجنان ج۳ ص۲۱۳ وشذرات الذہب ج۴ ص۴۹ (۲) تاریخ ابن خلکان ج۱ ص۵۹ وبستان المحدثین ص۵۲ (۳) تذکرہ ج۴ ص۵۴ طبقات ج۴ ص۲۱۴، والبدایہ ج۱۱ ص۱۹۳ وبستان ص۵۳۔

کرتے تھے، افطار میں صرف روٹی کا ایک خشک ٹکڑا ان کے لئے کافی ہوتا تھا، لوگوں نے اصرار سے کہا کہ خشک روٹی سے دماغ میں خشکی پیدا ہو جائے گی مگر اس پر بھی انھوں نے سالن نہیں استعمال کیا، البتہ روغن زیتون سے روٹی کھانے لگے، مال و دولت کی ذرہ برابر حرص و ہوس نہ کرتے، ان کی بیوی کا انتقال ہوا تو انھوں نے ان کے ترکہ سے اپنا حصہ نہیں لیا۔(۱)

طہارت ونظافت: صفائی اور ستھرائی کا بڑا خیال رکھتے، طہارت اور وضو کے بغیر درس نہیں دیتے تھے۔(۲)

وفات: مروروز میں شوال ۵۱۶ھ میں وفات پائی اور اپنے استاذ قاضی حسین کے مقبرہ کے پاس طالقان میں دفن کیے گئے، ان کی قبر عرصہ تک زیارت گاہِ خلائق بنی ہوئی تھی، ایک روایت کے مطابق انھوں نے ۵۱۰ھ میں انتقال کیا۔(۳)

تصنیفات: امام بغوی نامور مصنف تھے، تفسیر، قرأت، حدیث اور فقہ جیسے اسلامی علوم میں ان سے مفید اور بلند پایہ کتابیں یادگار ہیں، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ان کی نیک نیتی کی وجہ سے ان کی تصنیفات میں بڑی برکت ہوئی، ذیل میں تصنیفات کے نام اور بعض کا تعارف درج ہے۔

معالم التنزیل: یہ تفسیر کی مشہور و متداول کتاب ہے، اس میں صحابہ و تابعین اور متقدمین علمائے تفسیر کے اقوال وآثار نقل کرنے کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے، اس لیے اس کی حیثیت ماثوری تفسیروں کی ہے، مصنف نے مقدمہ میں کلام مجید کی اہمیت، اس کے نزول کا مقصد اور اس کی تفسیر وتاویل کی ضرورت اور ائمہ سلف کے تفسیری خدمات وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ گو قدیم اکابر مفسرین کے کارناموں پر اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے لیکن قدیم کی تجدید کے لیے ان میں کاوش وجدوجہد کا سلسلہ برابر جاری رکھنا چاہیے، اس لیے

(۱) تا (۳) ایضاً و ابن خلکان ج ا ص ۲۵۹ و ۲۶۰۔

میں نے لوگوں کی فرمائش پر ایک متوسط درجہ کی کتاب مرتب کی ہے جو اطناب ممل اور اختصار مخل سے خالی ہے اور مجھے امید ہے کہ اس فن سے اشتغال رکھنے والوں کے لیے یہ مفید ثابت ہوگی۔''(۱)

اس میں اسباب نزول کی تعیین، ناسخ ومنسوخ کی تصریح، فقہا کے احکامِ شرعی کے استنباطات کا ذکر اور اعراب وقرأت کے اختلاف اور نحوی وصرفی اشکالات کو حل کرنے پر خاص توجہ کی گئی ہے، ان مباحث کی توضیح کے لیے احادیث اور صحابہ وتابعین کے آثار اور مابعد کے ائمہ تفسیر کے اقوال سے مدد لی گئی ہے۔

خازن کا بیان ہے کہ علم تفسیر میں بغوی کی معالم التنزیل بڑی اہم اور بلند پایہ کتاب ہے، یہ صحیح اقوال کا مجموعہ، شکوک وتصحیف سے پاک، احادیث وآثار سے مزین اور عجیب واقعات پر مشتمل ہے۔(۲)

مقدمہ میں مشہور مفسر صحابہ وتابعین سے مصنف نے اپنے اسناد اور فضائلِ قرآن کی حدیثیں جمع کی ہیں، اس کی اہمیت کی بنا پر بعض علما نے اس کے خلاصے اور مختصرات لکھے ہیں۔

۱- مشہور مفسر علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی کی تفسیر لباب التنزیل جو تفسیر خازن کے نام سے معروف ہے، دراصل معالم ہی کا ملخص ہے، وہ خود لکھتے ہیں کہ ''چوں کہ تفسیر بغوی نہایت عمدہ خصوصیات پر مشتمل تھی، اس لیے میں نے اس کا انتخاب کیا ہے اور دوسری تفسیروں کی مدد سے بعض اضافے کیے ہیں، نیز طلبۂ فن کے فائدہ کے لیے غریب حدیثوں کی شرح کردی اور اس کی سندوں اور بعض زوائد کو حذف کردیا۔(۳)

۲- دوسرا مختصر شیخ تاج الدین ابونصر عبدالوہاب بن محمد حسینی (م۸۷۵ھ) کا ہے۔(۴)

معالم التنزیل ہندوستان اور مصر سے شائع ہوچکی ہے، مصر سے تفسیر خازن کے

---

(۱) مقدمہ معالم التنزیل (۲) مقدمہ تفسیر خازن ج۱ص۳ (۳) مقدمہ تفسیر خازن ج۱ص۳ (۴) کشف الظنون ج۲ص۲۵۸۔

حاشیے پر ۱۳۲۲ و ۱۳۳۱ھ میں سات جلدوں میں چھپی ہے۔

۲- مصابیح السنۃ: یہ حدیث کی اہم اور مشہور کتاب ہے جو بڑی معتبر اور مستند خیال کی جاتی ہے، اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خطیب تبریزی کی مشہور ومتداول کتاب مشکوٰۃ المصابیح جو عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے، اس کا تکملہ ہے، صاحبِ مشکوٰۃ کے درج ذیل بیان سے اس کی نوعیت اور اہمیت وغیرہ ثابت ہوتی ہے۔

محی السنۃ قامع البدعت امام ابو محمد حسین بن مسعود فراء بغوی کی (اللہ ان کے درجات بلند کرے) کتاب المصابیح نہایت جامع کتاب ہے لیکن اس میں اختصار کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اور سندیں حذف کردی گئی ہیں، اس لیے بعض ناقدینِ فن نے اس میں کلام کیا ہے، حالاں کہ فی نفسہٖ اس کے نقلِ اسناد میں کوئی کلام نہیں ہے، مصنف علمائے ثقات میں ہیں تاہم اس حیثیت سے اس میں یک گونہ کمی تھی کیوں کہ نہ تو صحابہ کا اس میں ذکر ہے اور نہ حدیثوں کا جس سے اصل مخرج معلوم ہوتا ہے،......... کتب وابواب کے سرد وترتیب میں میں نے بغوی کا ٹھیک ٹھیک تتبع کیا ہے، البتہ ہر باب کو دو کے بجائے تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔(۱)

نام: یہ مصابیح السنۃ اور کتاب المصابیح کے نام سے مشہور ہے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نام خود مصنف کا رکھا ہوا نہیں ہے، بلکہ ان کے دیباچہ کی اس عبارت سے ماخوذ ہے۔(۲)

ان احادیث هذا الكتاب مصباح۔ اس کتاب کی حدیثیں چراغ ہیں۔

تقسیم وترتیب: یہ کتاب ابواب وفصول میں منقسم ہے، ہر باب کی حدیثیں دو فصلوں میں صحاح وحسان کے عنوان کے تحت شامل کی گئی ہیں، صحاح کے اندر بخاری ومسلم اور حسان کے اندر ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی وغیرہ کی حدیثیں درج ہیں، شاہ عبدالعزیز

(۱) مقدمہ مشکوٰۃ المصابیح۔ (۲) مقدمہ مشکوٰۃ المصابیح۔

صاحب" لکھتے ہیں کہ "یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ کتاب نیت والی حدیث سے شروع ہوتی ہے اور نیت ہی ہر کام کا سرا ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ آخرت کے لفظ پر ہوا ہے، جو کتاب کے حسنِ خاتمہ کی خبر دیتا ہے۔(۱)

تعداد احادیث: مصابیح میں لگ بھگ ساڑھے چار ہزار حدیثیں ہیں، ان میں نصف سے کچھ کم صحاح (صحیحین کی) اور نصف سے کچھ زیادہ حسان (سنن کی) ہیں۔(۲)

خصوصیات: مصابیح کی بعض خصوصیتیں یہ ہیں:

۱- ائمہ صحاح اور اکابر محدثین کی روایات کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے اس کی حدیثیں نہایت معتبر و مستند ہیں گو اصحابِ صحاح کے یہاں بھی بعض ضعیف وغریب اور منکر حدیثیں پائی جاتی ہیں، اس لیے یہ بھی ان سے یکسر خالی نہیں ہے، تاہم فی الجملہ یہ صحیح اور مستند حدیثوں کا مجموعہ ہے اور بغوی نے غریب وضعیف روایتوں کی نشاندہی کر دی ہے، اس حیثیت سے کتبِ حدیث میں اس کا پایہ نہایت بلند ہو گیا ہے، صاحب روضات لکھتے ہیں، اکثر علما نے اس کی حدیثوں کو نقل کیا ہے اور یہ صحیح و عمدہ روایات پر مشتمل ہے کیوں کہ ان کو ثقہ و عادل راویوں نے عادل وضابط راویوں سے نقل کیا ہے۔(۳)

۲- مختلف کتب حدیث کی روایات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے یہ بڑی جامع کتاب ہے اس لیے اس کا مطالعہ ایک حد تک حدیث کی طویل اور ضخیم کتابوں سے مستغنی کر دیتا ہے۔

۳- مختصر اور سندوں کے نقل نہ کرنے کی وجہ سے اس سے استفادہ بہت آسان ہے۔

۴- یہ ایمانیات، اعتقادیات اور اعمال واحکام ہر قسم کی روایتوں کا مجموعہ ہے، اس لیے ہر طرح کا ذوق رکھنے والے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۵- اس کی ترتیب عمدہ ہے، صاحب الانوار نے حمیدی، ابن اثیر، صغانی، قضاعی،

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۲ (۲) بستان المحدثین ص ۱۳۲ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۲۔

نووی اور مدینی وغیرہ متعدد نامور مصنفین کی کتابوں کے مقابلہ میں اس کی ترتیب کو عمدہ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ جو حدیث جہاں رکھی گئی ہے اس سے زیادہ موزوں جگہ اس کی اور نہیں کوئی ہوسکتی تھی۔(۱)

۶۔مصنف نے چوں کہ احادیث کو صحاح وحسان میں تقسیم کیا ہے اور ضعیف وغریب کی نشاندہی کی ہے اس لیے عموماً اس سے ہر روایت کی صحت وقوت اور ضعف وغیرہ کا حال معلوم ہوجاتا ہے۔

بعض اعتراضات: ۱۔صاحب مشکوٰۃ کا جو بیان اوپر گذرا ہے، اس میں مصابیح میں مکمل سندیں حذف کرنے کا ذکر ہے، اس میں شبہ نہیں کہ روایات میں اسناد کو بڑی اہمیت حاصل ہے، مصنف مصابیح کو بھی اس کا پورا اندازہ تھا تاہم انھوں نے طوالت کے خوف اور اختصار کی بنا پر سندیں حذف کی ہیں، دوسرے اس میں ائمہ فن اور جہابذۂ محدثین کی حدیثیں نقل کی گئی ہیں، جن کی احتیاط میں کوئی شبہ نہیں اس لیے ان کے نقل پر اعتماد کرکے سندیں چھوڑ دی گئی ہیں۔

نووی نے بغوی کی صحاح وحسان پر تقسیم کے متعلق لکھا ہے:

واما تقسيم البغوى الى	بغوی نے صحاح وحسان کی تقسیم کرکے
حسان وصحاح مريدا	جو صحاح سے صحیحین کی اور حسان سے
بالصحاح ما فى الصحيحين	سنن کی حدیثیں مراد لی ہیں وہ درست
وبالحسان مافى السنن	نہیں ہے کیوں کہ سنن میں تو صحیح،
فليس بصواب لان فى	حسن، ضعیف اور منکر ہر طرح کی
السنن الصحيح والحسن	حدیثیں ہیں۔
والضعيف والمنكر.(۲)	

(۱) کشف الظنون ج۲ص۴۴۴ (۲) تقریب مع شرح تدریب الراوی ص۵۴۔

نووی کے اعتراضات کا منشا یہ ہے کہ جب کتب سنن صرف حسن روایات ہی پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ ان میں دوسری قسم کی حدیثیں بھی ہیں تو ان کی تمام مرویات کو حسان سے موسوم کرنا صحیح نہیں ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ بغوی کی خاص اصطلاح ہے، اس لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں، چنانچہ تاج تبریزی کا بیان ہے کہ ''بغوی پر ابن صلاح اور نووی کے اس اعتراض پر مجھے سخت تعجب ہے کیوں کہ اصطلاح کے بارے میں ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عراقی کے مذکورہ جواب کے با ے میں یہ لکھا ہے کہ ''بغوی کی مدافعت میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر ہر حدیث کے آخر مٰیں اس کے صحیح یا حسن اور غریب ہونے کو واضح کر دیتے ہیں تو یہ واقعہ کے خلاف ہے کیوں کہ انھوں نے سنن سے جن حدیثوں کی تخریج کی ہے ان میں صحیح وحسن کے درمیان امتیاز کرنے کے بجائے سکوت اختیار کیا ہے، البتہ انھوں نے زیادہ تر غریب وضعیف کی توضیح کردی ہے، اس لیے سنن کے مرویات میں صحیح کو حسن سے خلط ملط کر دینے کا اعتراض اپنی جگہ باقی رہتا ہے، شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ ''ابن صلاح کا منشا یہ ہے کہ بغوی نے خاص اپنے لیے سنن کی حدیثوں کو حسان کہنے کی ایک اصطلاح وضع کی ہے تا کہ ہر حدیث کے خاتمہ پر ان کو یہ واضح نہ کرنا پڑے کہ اس کی اصحابِ سنن نے تخریج کی ہے لیکن یہ ایک نئی اصطلاح ہے جو عرفی اصطلاح پر جاری نہیں ہوسکتی ہے۔(۱)

مصابیح کی اہمیت اور خصوصیات کی وجہ سے اس کی متعدد شرحیں اور کئی مختصرات لکھے گئے ہیں، ذیل میں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ قاضی ناصرالدین عبداللہ بن عمر بیضاوی (م۶۸۵ھ) کی شرح کا نام تحفۃ الابرار بتایا جاتا ہے۔

(۱) تقریب مع شرح تدریب الراوی ص۵۴۔

۲-شہاب الدین فضل اللہ بن حسین توریشی حنفی کی شرح جو المیسر کے نام سے موسوم ہے۔

۳-شمس الدین محمد بن مظفر خلخالی (م ۷۴۵ھ) کی شرح التنویر ہے۔

۴-علاء الدین علی بن محمد الشہیر بمصنفک (المتوفی ۸۷۵ھ) کی شرح۔

۵-محمد بن محمد واسطی بغدادی، مدرس مستنصریہ معروف بابن عاقولی (م ۷۹۷ھ) کی شرح۔

۶-شمس الدین محمد بن جزری (م ۸۳۳ھ) نے تین جلدوں میں تصحیح المصابیح کے نام سے شرح لکھی۔

۷-ظہیر الدین محمود بن عبدالصمد فاروقی کی شرح۔

۸-قرۃ بن یعقوب بن ادریس حنفی رومی قرمانی (م ۸۳۳ھ) کی شرح۔

۹-قطب الدین محمد ارنیقی (م ۸۴۴ھ) کی شرح۔

۱۰-علی بن عبداللہ بن احمد المعروف بزین العرب نے تین دفعہ میں تین شرحیں لکھیں، ان میں سے جو درمیان میں لکھی گئی وہ زیادہ مشہور و متداول ہے۔

۱۲-مظہر الدین حسین بن محمود بن حسن زیدانی کی شرح کا نام المفاتیح فی شرح المصابیح ہے، اس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں حدیث کے مصطلحات وانواع علوم پر بحث کی گئی ہے۔

۱۳-مصابیح کی شرحوں میں ازہار بھی ہے لیکن اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں۔

۱۴-شیخ عبدالمومن بن ابی بکر بن محمد زعفرانی کی شرح۔

۱۵-خلیل بن مقبل حلبی کی بسیط شرح۔

۱۶-شیخ ابوعبداللہ اسماعیل بن محمد بن اسماعیل المدعو بالاشرف الفقاعی۔

۱۷-شیخ صدر الدین ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم سلمی منادی شافعی کی شرح کا نام

المناہج والتفاتیح فی شرح احادیث المصابیح ہے، اس میں مصابیح کی حدیثوں کی تخریج کی ہے اور اگر کوئی حدیث کتبِ صحاح کی نہیں ہے تو موطا امام مالک اور مسند شافعی وغیرہ سے اس کی تخریج کی ہے۔

۱۸- قطب الدین محمد نکیدی ارنقی نے تلفیقات المصابیح کے نام سے شرح لکھی ہے، اس میں امام نووی کی شرح سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے، شروع میں اصولِ حدیث پر ایک مقدمہ بھی ہے۔

۱۹- منہل الینابیع کے شارح کا نام معلوم نہیں۔

۲۰- غیاث الدین محمد بن محمود واسطی (م ۷۱۸ھ) کی شرح۔

۲۱- ابوذر احمد بن ابراہیم حلبی کی شرح جو ناتمام ہے۔

۲۲- محمد بن عبداللطیف المعروف بابن الملک کی شرح جو لطیف اور ممزوج ہے، (۱) ایک جلد میں ہے، اس کے خاتمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۰۹ھ میں لکھی گئی۔

۲۴- عثمان بن محمد ہروی کی مختصر شرح: یہ بیضاوی کی شرح کے بعد لکھی گئی۔

شرحوں کے علاوہ تکملے اور مختصرات بھی لکھے گئے۔

۲۵- شیخ مجدالدین ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ) نے التخاریج فی فوائد متعلقۃ باحادیث المصابیح لکھی۔

۲۶- شیخ ولی الدین ابوعبداللہ خطیب ۷۳۷ھ کی مشہور و متداول تصنیف مشکوٰۃ المصابیح، مصابیح کا تتمہ ہے۔

۲۷- مفتاح الفتوح: صاحبِ کشف الظنون نے مصنف کا نام نہیں لکھا ہے، مگر

(۱) ممزوج وہ شرح کہلاتی ہے جس میں متن اور شرح کی عبارتیں ملی جلی ہوتی ہیں اور امتیاز کے لیے ''م'' اور ''ش'' کے حروف لکھ دیئے جاتے ہیں یا متن کے اوپر نشان کھینچ دیا جاتا ہے۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۲۲)

یہ بتایا ہے کہ اس میں شرح السنۃ اور نہایہ وغیرہ سے بعض چیزوں کا اضافہ کیا ہے اور ۷۰۷ھ میں لکھی گئی۔

۲۸- شیخ ابوالنجیب عبدالقاہر بن عبداللہ سہروردی متوفی ۵۶۳ھ نے مختصر لکھا ہے

۲۹- شیخ تقی الدین علی بن عبدالکافی سبکی (م۷۵۶ھ) نے ضیاء المصابیح کے نام سے خلاصہ لکھا۔(۱)

۳۰- شرح السنۃ: یہ بھی امام بغوی کی مشہور اور اہم تصنیفات میں ہے۔ اس میں مشکلات وغرائبِ حدیث اور فقہی مسائل وغیرہ کا مفصل ذکر ہے، مصنف خود مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''یہ اخبار وروایات کے گوناگوں علوم وفوائد پر مشتمل ہے، اس میں حدیثوں کی مشکلات کو حل اور غریب کی تفسیر کی گئی ہے، نیز ان سے مستنبط ہونے والے فقہی احکام اور ان کے سلسلہ میں علماء وفقہا کے اختلافات بیان کئے گئے ہیں، یہ شرح احکام کے سلسلہ میں مرجع اور ایسی اہم باتوں اور ضروری نکتوں پر مشتمل ہے، جن سے واقفیت نہایت ضروری ہے، میں نے اس میں وہی باتیں لکھی ہیں جن پر ماہرینِ فن ائمہ سلف کا اعتماد واعتبار ہے اور ان چیزوں کو چھوڑ دیا ہے جن کو ان بزرگوں نے چھوڑ دیا ہے۔''(۲)

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں:

''امام نووی، محی السنۃ بغوی اور ابوسلیمان خطابی شرحِ حدیث کے سلسلہ میں تمام شوافع میں زیادہ قابل اعتماد ہیں، ان لوگوں کے قول محکم اور بحثیں پر مغز ہوتی ہیں، خصوصاً شرح السنۃ بغوی فقہ حدیث اور توجیہِ مشکلات میں نہایت

(۱) ان شرحوں کا ذکر کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۴ و ۴۴۵ اور اتحاف النبلاء المتقین ص ۱۵۱، ۱۵۲ میں ہے

(۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۵۶۔

کافی وشافی ہے، گویا کہ مصابیح اور مشکوٰۃ کی شرح اسی سے ہو جاتی ہے۔"(۱)

مصابیح کی طرح اس کے ساتھ بھی اعتنا کیا گیا ہے، صاحب کشف الظنون نے اس کے چند مختصرات کا ذکر کیا ہے:

۱۔صفی الدین محمود بن ابوبکر ارموی قرافی کا مختصر، ۲۔ابوالقاسم ہبۃ اللہ طبری اسکافی کا مختصر، ۳۔ ابوالقاسم عبداللہ بن حسن بن عبدالملک واسطی، شافعی نے لباب شرح السنۃ فی معرفۃ احکام الکتاب والسنۃ کے نام سے مختصر لکھا اور سندوں کو حذف کر دیا ہے۔

۴۔شیخ علاء الدولہ احمد بن محمد بن احمد البنا مالکی نے الفلاح کے نام سے مختصر لکھا۔

۵۔رضی الدین ابراہیم بن محمد طبری (م۷۲۲ھ) کا مختصر جواہر الجمۃ فی مختصر شرح السنۃ کے نام سے موسوم ہے۔(۲)

۶۔بغوی نے خود اس شرح کی تجرید کی ہے، دونوں کے قلمی نسخے رضا لائبریری رام پور میں ہیں۔(۳)

۴۔التہذیب فی الفقہ: اس میں امام شافعیؒ کے مذہب کے فقہی فروع وجزئیات کی تہذیب کی ہے۔

صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ اس میں دلائل نہیں بیان کیے گئے ہیں، غالباً اس میں اپنے شیخ قاضی حسین کے تعلیقہ میں کچھ کمی بیشی کر کے اس کی تلخیص کی ہے۔

حسین بن محمد مروزی ہروی شافعی نے لباب التہذیب کے نام سے اس کی تلخیص اور شہاب احمد بن محمد مروزی ہروی شافعی نے لباب التہذیب کے نام سے اس کی تلخیص اور شہاب احمد بن محمد بن منیر اسکندری (م۶۸۳ھ) نے مختصر کیا ہے،(۴) یہ دس جلدوں میں

(۱) عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۱۷ (۲) کشف الظنون ج ۳ ص ۵۵ و ۵۶ (۳) فہرست انگریزی رضا لائبریری رام پور، مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی ج ۱ ص ۴۶۶ و ۴۶۷ (۴) کشف الظنون ج ۱ ص ۳۵۲۔

ہے، آٹھ جلدیں (تیسری اور چوتھی کو چھوڑ کر) کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہیں۔(۱)

۵-الجمع بین الصحیحین۔

۶-تعلیقات فتاویٰ قاضی حسین: اس میں اپنے شیخ اور مشہور فقیہ کے فتاویٰ پر تعلیقات لکھی ہیں۔

۷-فتاویٰ بغوی: یہ خود ان کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔

۸-ارشاد الانوار فی شمائل النبی المختار، ۹-ترجمۃ الاحکام فی الفروع، ۱۰-الکفایہ فی القراۃ، ۱۱-الکفایۃ فی الفقہ، ۱۲-معجم الشیوخ، (۲) ۱۳-تجرید، مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اس کو شرح السنہ کی تجرید بتایا ہے۔(۳)

۱۴- شرح ترمذی: مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنے مضمون ''حجاز کے کتب خانے'' میں اس کا ذکر کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ اس کے جز ثانی کا نسخہ مدینہ کے کتب خانہ محمودیہ میں ہے۔(۴)

☆☆☆

(۱) فہرست کتب خانہ ج ۳ ص ۲۱۲ (۲) فوائد جامعہ مع عجالہ نافعہ ص ۱۹۵ (۳) فہرست انگریزی رضا لائبریری رام پور ج ۱ ص ۲۶۷ (۴) مقالات سلیمان ج ۲ ص ۲۷۰۔

ابوالحسن رزین بن معاویہ عبدری سرقسطی

(م ۵۳۵ھ)

نام ونسب: رزین نام، ابوالحسن کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: رزین بن معاویہ بن عمار، (۱)

خاندان ووطن: قبیلۂ قریش کے مشہور بطن عبدالدار بن قصی سے ان کا خاندانی اور اندلس کے شہر سرقسطہ سے وطنی تعلق ہے، اس لیے عبدری اور سرقسطی کی نسبتوں سے مشہور ہیں۔ (۲)

اساتذہ: رزین نے ابومکتوم عیسیٰ بن ابی ذر ہروی سے صحیح بخاری اور حسین طری سے صحیح مسلم کی روایت کی ہے۔ (۳)

سفر ومجاورتِ مکہ: انھوں نے بلادِ مشرق کا سفر کیا اور عرصۂ دراز تک مکہ معظمہ میں قیام کیا، حرمین میں قیام کی وجہ سے امام الحرمین کہلاتے تھے، بعض تذکرہ نگاروں نے تصریح کی ہے کہ ان کی وفات بھی مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ (۴)

حدیث میں درجہ: گو سلفی نے ان کو نازل الاسناد کہا ہے، (۵) تاہم حدیث میں ان کا کارنامہ اور درجہ مسلم ہے۔

اعتراف کمالات: سلفی نے ان کو شیخ عالم اور ابن بشکوال نے عالم، فاضل اور عالم بالحدیث کہا ہے۔ (۶)

فقہی مسلک: بلادِ مغرب کے لوگوں کی طرح امام رزین بھی امام دارالہجرت کے مسلک

---

(۱) الدیباج المذہب ص ۱۱۸ (۲) انساب ورق ۳۸۱ و اعلام ج ۱ ص ۳۲۱ (۳) شذرات الذہب ج ۴ ص ۱۰۶ (۴ و ۵) الدیباج ص ۱۱۸ و شذرات الذہب ج ۴ ص ۱۰۶ (۶) الدیباج ص ۱۱۸۔

سے وابستہ تھے، صاحب دیباج کا بیان ہے کہ وہ مالکیہ کے امام تھے۔(۱)

صلاح وتقویٰ: مورخین اور علمائے سیر نے ان کو صالح آدمی کہا ہے۔(۲)

وفات: اکثر لوگوں نے ان کا سنہ وفات ۵۳۵ھ لکھا ہے لیکن بعض نے ۵۲۵ھ بتایا ہے، شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ امام رزین نے ۵۲۰ھ کے بعد انتقال کیا۔(۳)

تصنیفات: امام رزین کی دو کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔

۱- تجرید الصحاح الستہ یا کتاب الجمع بین الصحاح الستہ: یہ حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں خیال کی جاتی ہے، اس کی اہمیت اس بنا پر زیادہ ہے کہ اس سے پہلے جو کتابیں لکھی گئیں وہ صرف صحیحین کی روایات کی جامع ہیں لیکن یہ حدیث کی ان چھ اہم کتابوں کی جامع ہے جو اپنے وثوق واعتبار کی وجہ سے امت میں متداول اور علما وفقہا کا ماخذ اور احکام وشرائع کا مرجع ہیں اور ان کے مصنفین بھی حفاظ ومحدثین کی پوری جماعت میں ممتاز ہیں، اس حیثیت سے اس کی نوعیت یک گونہ مختلف ہے، اس کتاب کے بعد اس نوعیت کی اور کتابیں بھی لکھی گئیں، ان میں امام ابن اثیر جزری کی کتاب زیادہ مشہور ہے لیکن اس میں دراصل اس کی از سر نو ترتیب وتہذیب کی گئی ہے، فالفضل للمتقدم۔

چوں کہ چھٹی صدی اور اس کے بعد بھی صحاح ستہ میں سنن ابن ماجہ کے بجائے موطا امام مالک کو محسوب کیا جاتا تھا، اس لیے امام رزین نے صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کے ساتھ موطا ہی کی روایتوں کو جمع کیا ہے۔(۴)

۲- اخبار مکہ: اوپر گذر چکا ہے کہ امام رزین نے مدت دراز تک مکہ میں قیام کیا، اس لیے غالباً ان کو اس کتاب کو مرتب کرنے کا خیال ہوا ہوگا اور اس میں یہاں کے واقعات واخبار جمع کیے ہوں گے۔

(۱) الدیباج المذہب ص ۱۱۸ وروضات الجنات ص ۲۸۶ (۲) ایضاً (۳) ایضاً ومقدمہ شرح مشکوۃ ص ۱۳، واتحاف النبلاء ص ۱۵۷۔ (۴) کشف الظنون ج ۱ ص ۳۲۵ والرسالۃ المستطرفہ ص ۲۸۶۔

ابوبکر محمد بن عبداللہ بن العربی

(م ۵۴۳ھ)

نام ونسب: ابوبکر کنیت، ابن العربی لقب وعرفیت اور نام ونسب یہ ہے: محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن احمد۔(۱)

ولادت: مشہور روایت کے مطابق جمعرات ۲۲ رشعبان ۴۶۸ھ کو پیدا ہوئے، ابن خلکان نے ۴۶۹ھ کی بھی روایت کی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے ۴۴۸ھ سن پیدائش لکھا ہے لیکن یہ کتابت وطباعت کی غلطی معلوم ہوتی ہے اور پہلی روایت صحیح ہے کیوں کہ ابن بشکوال نے خود ان سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ میں شعبان ۴۶۸ھ میں پیدا ہوا تھا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب وہ ۴۸۵ھ میں بلادِ مشرق کی سیاحت کے لیے گئے تو اس وقت مورخین کے بیان کے مطابق ان کی عمر سترہ سال تھی۔(۲)

خاندان: امام ابوبکر بن العربی کا خاندانی تعلق یمن کے قبیلہ معافر سے ہے، اسی لیے وہ معافری کہلاتے ہیں، ان کے والد ابومحمد عبداللہ کو علمی ودنیاوی وجاہت حاصل تھی اور وہ اشبیلیہ کے ممتاز علما ورؤسا میں تھے، فقہ وادب کے ماہر اور شعر وسخن کا عمدہ ذوق رکھتے تھے، دولت عبادیہ میں ان کو بڑا رسوخ حاصل تھا اور وہ بنو عباد کی جانب سے بعض اعلیٰ مناصب پر فائز تھے، جب آل عباد کا زوال شروع ہوا تو یہ اپنے لڑکے ابوبکر کے ساتھ بلادِ مشرق کی سیاحت کے لیے تشریف لے گئے، واپسی میں مصر میں ۴۹۳ھ میں انتقال ہوگیا، ان

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۳۹۲ بستان المحدثین ص ۱۳۷ (۲) ایضاً والدیباج المذہب ص ۲۸۱۔

کی پیدائش ۴۲۵ھ میں ہوئی تھی۔(۱)

وطن: بلادِ مغرب میں اقلیم اندلس کے مشہور اور بڑے شہر اشبیلیہ کو ان کے مولد ومنشا ہونے کا فخر حاصل ہے، یہ شہر آل عباد کا پایہ تخت اور ایک زمانہ میں قرطبہ کے بجائے یہی اندلس کا دارالسلطنت تھا، اس کی نسبت سے وہ اشبیلی اور اندلس اور بلادِ مغرب سے تعلق کی وجہ سے اندلسی اور مغربی کہلاتے ہیں۔(۲)

اساتذہ: اپنے والد ابومحمد اور ماموں ابوالقاسم حسن ہوزنی کے علاوہ انھوں نے بے شمار اساتذہ فن سے تحصیلِ علم اور روایت حدیث کی ہے، بعض شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن خلعی، ابوالحسن بن مشرف، ابوالحسن محمد بن عبداللہ بن داؤد الفارسی، ابونصر مقدسی، ابوالفتح نصر بن ابراہیم قرشی، ابوسعید زنجانی، ابوسعید رہاوی، ابوالقاسم بن ابوالحسن القدسی، ابومحمد ہبۃ اللہ احمد اکفانی، فضل بن فرات دمشقی، ابوالحسن مبارک بن عبدالجبار صیرفی المعروف بابن الطیوری، ابوالحسن علی بن ایوب بزاز، ابوبکر بن طرفان ابوالفوارس طراد بن محمد زینبی، جعفر بن احمد سراج، ابوالحسن بن عبدالقادر، ابوالمعالی ثابت بن بندار مکی بن عبدالسلام رملی، ابوعبداللہ حسین طبری، ابوعبداللہ بن طلحہ نعالی، ابوعبداللہ سرقسطی، ابوعبداللہ کلاعی، ابوالحسن بن حداد خولانی، مہدی وراق۔

امام ابوحامد غزالی، ابوبکر شاشی، ابوبکر طرطوسی، اور ابوزکریا تبریزی وغیرہ کی صحبت میں زیادہ رہے اور ان سے فقہ واصول اور ادب وغیرہ کی تحصیل کی۔(۳)

تلامذہ: ان کے تلامذہ کی تعداد بھی زیادہ ہے، چند کے نام یہ ہیں:

''محمد بن یوسف بن سعادہ، حافظ ابوالقاسم سہیلی، شحنہ بن یحیٰ رعینی، عبدالخالق

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۹۲، بستان المحدثین ص ۱۳۷، الدیباج المذہب ص ۲۸۱ (۲) الدیباج المذہب ص ۲۸۱ ومعجم البلدان ج ۱ ص ۲۵۴ واللباب ج ۱ ص ۴۹ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۰ والدیباج المذہب ص ۲۸۱، ۲۸۲ ونفح الطیب ج ۱ ص ۳۳۶۔

بن احمد یوسفی ابن صابر دمشقی، احمد بن خلف اشبیلی، حسن بن علی قرطبی، ابوبکر محمد بن عبداللہ بن الجد فہیری، محمد بن ابراہیم بن فخار، محمد بن علی کتانی، محمد بن جابر ثعلبی، عبدالمنعم بن یحییٰ بن خلوف غرناطی، علی بن احمد شریشی، ابوالحسن علی بن احمد سقوری اور احمد بن عمر خزرجی وغیرہ۔

قاضی ابوالفضل عیاض جیسے صاحب کمال اور ابن بشکوال کو بھی ان سے تلمذ کی نسبت حاصل ہے۔(۱)

رحلت وسفر: سترہ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ بلاد مشرق کی سیاحت کے لیے روانہ ہوئے اور شام، بغداد وحجاز تشریف لے گئے، دوبارہ پھر بغداد ہوتے ہوئے مصر واسکندریہ پہنچے اور ان مقامات کے ارباب کمال اور ائمہ فن سے مستفید ہوئے، بلاد مشرق کی روانگی سے قبل وہ اپنے وطن میں فن قرأت وادب وغیرہ میں کمال حاصل کر چکے تھے۔(۲)

حدیث میں درجہ: ابن العربی اندلس کے محدثین اور نامور حفاظ میں تھے، ابن بشکوال نے لکھا ہے کہ وہ متبحر حافظِ حدیث اور اندلس کے ائمہ اور خاتمۃ المحدثین میں تھے، ان کی بدولت اندلس میں احادیث واسناد کے علم کو بڑا فروغ ہوا صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ انھوں نے حدیثیں قلم بند کیں اور وہ بڑے وسیع الروایت اور کثیر الخبر تھے، ابن ناصرالدین کہتے ہیں کہ ''وہ ثقات واثبات اور مشہور ائمہ میں تھے۔'' دوسرے مورخین واصحابِ سیر نے ان کے حفظ وضبط اور ذکاوت وذہانت کا اعتراف کیا ہے اور ان کو متبحر عالم حدیث بتایا ہے۔(۳)

فقہ: حدیث سے پہلے وہ فقہ کی تحصیل کر چکے تھے اور اس میں ان کو بڑا درک تھا، اصولِ فقہ اور فنِ خلاف کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور ان فنون کا درس بھی دیتے تھے، ذہبی کا بیان ہے کہ وہ ان لوگوں میں تھے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے، تفقہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۴ص۹۰ والدیباج المذہب ص۲۸۱و۲۸۲ونفح الطیب ج۱ص۳۳۶ (۲) الدیباج المذہب ص۲۸۱ (۳) ایضاونفح الطیب ج۱ص۳۳۶وتذکرۃ الحفاظ ج۴ص۹۰۔

واجتہاد میں کمال کی بنا پر محکمۂ قضا ان کے سپرد کیا گیا تھا۔(۱)

تفسیر: علم تفسیر اور قرآنیات پر بھی اچھی نظر تھی اور اس میں ان سے بعض اہم کتابیں یادگار ہیں(۲)

ادب وبلاغت نحو وکلام اور علم تاریخ وغیرہ میں مہارت: خالص اسلامی علوم کے علاوہ اور نوعیت کے بھی متعدد علوم میں ان کو مہارت اور دسترس تھی، ادب و بلاغت میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور نحو وکلام اور فن تاریخ سے شغف تھا اور ان علوم میں ان سے بعض مفید کتابیں یادگار ہیں۔

شعروسخن: موزوں طبع اور شعروسخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے، فی البدیہہ اشعار کہہ لیتے تھے، ایک دفعہ ایک خوش رو امیر زادہ کے ساتھ شکار کو گئے، راستے میں اس نے تفریحاً ابن العربی کی جانب نیزہ کر کے ہلانا شروع کیا تو انھوں نے فی الفور یہ قطعہ کہا:

یھز علی الرمح ظبی مھفھف — لعوب بالباب البریة عابث

فلوکان رمحا واحدا الاتقیتہٗ — ولکنه رمح ثان فثالث

ترجمہ: مجھ پر ایک پھد کنے والے چھریرے بدن کا ہرن نیزہ کو حرکت دے رہا ہے، اگر ایک ہی نیزہ ہوتا تو میں اس سے بچتا لیکن یہاں تو دوسرا اور تیسرا نیزہ بھی تھا۔

شارحین کا اختلاف ہے کہ ثانی اور ثالث سے کیا مراد ہے؟ بعض نے اس سے قد وقامت اور نگاہ مراد لی ہے اور بعض لوگوں نے کچھ اور مراد لیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ واحد سے نیزہ کی ایک بار کی تحریک اور ثانی وثالث سے اس کی تکرار مراد ہے۔(۳)

نفح الطیب، مطمح الانس اور مسرح التانس اور بستان المحدثین وغیرہ میں ان کے

(۱) ایضاو نفح الطیب ج ا ص ۳۴۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۰ (۲) ایضاً۔ (۳) بستان المحدثین ص ۱۳۷۔

اور بھی متعدد اشعار نقل کیے گئے ہیں جن سے ان کی قوتِ طبع اور شعروسخن سے مناسبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جامعیت اور اعتراف کمال: ان متنوع علوم اور گوناگوں فنون میں ان کے درک ومہارت سے ان کی جامعیت کا پتہ چلتا ہے، اسی بنا پر اہل سیر نے ان کو جامع کمالات، متبحر عالم، علوم ومعارف میں متقدم، فنون اور انواعِ علوم میں بحث وکلام کرنے والا اور تصحیح وثواب کے امتیاز میں ثاقب الذہن قرار دیا ہے، صاحب نفح الطیب فرماتے ہیں کہ وہ اصول وفروع میں امام تھے، ان کے تمام سوانح نگار ان کے فضل وکمال پر متفق ہیں، مورخین نے ان کو علم وفن میں یکتا، علامہ، حافظ متبحر، احد الاعلام، مسند وعالمِ اندلس لکھا ہے، ابن سعید نے ان کو امام، قاضی اور فخرِ مغرب کہا ہے، صاحبِ نفح الطیب لکھتے ہیں کہ وہ فضل وکمال سے متصف تھے، ابن بشکوال نے ان کی بڑی توصیف کی ہے، ابو یحیی یسع بن حزم نے ان کا تذکرہ غیر معمولی تعظیم وتوقیر کے ساتھ کیا ہے، حجازی کا بیان کہ انھوں نے شام وعراق وغیرہ کو اپنے فوائد اور امتیازی کمالات سے معمور کر دیا تھا، مورخین کا متفقہ بیان ہے کہ علمائے مغرب میں مشرق کی سیاحت کرنے والوں میں ان سے زیادہ علم سے مالا مال ہوکر آنے والا کوئی اور شخص نہ تھا۔(۱)

درس وتدریس اور شہرت ومقبولیت: مشرق کی سیاحت سے اپنے وطن اشبیلیہ میں واپس آئے تو ان کی ذات طلبۂ علم وفن کا مرکز بن گئی تھی، لوگ دور دراز سے ان کے پاس سماع کے لیے آتے اور استفادہ کرتے، عہدۂ قضا سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ محض تصنیف وتالیف اور درس وتدریس کا کام انجام دیتے تھے، درس وتدریس اور گوناگوں کمالات کی وجہ سے وہ نہایت مشہور ومقبول ہوگئے تھے اور مسلمانوں کے امام کہلاتے تھے۔(۲)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۴ ص۹۰و۹۱، الدیباج ص۲۸۱و۲۸۲ ونفح الطیب ج۱ص۲۳۶ (۲) الدیباج المذہب ص۲۸۲۔

فقہی مذہب: بلادِ مغرب کے علما وفضلا کی طرح وہ بھی امام دارالہجرت کے فقہی مذہب ومسلک سے وابستہ تھے۔

اخلاق وعادات: سیرت وشمائل اور اخلاق وعادات میں ممتاز تھے، ضبط وتحمل، نرمی ومروت، شرافتِ نفس، حسنِ عہد، خلوص ووفا اور دوستوں سے بہتر اور عمدہ سلوک کے لیے مشہور تھے، حسنِ اخلاق اور عمدہ خصائل وعادات کی وجہ سے وہ لوگوں میں نہایت مقبول اور ہردلعزیز تھے۔(۱)

ظرافت: خوش طبع اور ظریف تھے، اس لیے مجلس میں تفنن اور مزاح کی باتیں بھی کرتے تھے۔(۲)

ثروت وامارت: اللہ تعالیٰ نے ان کو علم وفضل کی طرح دنیوی اعزاز ووجاہت اور مال ودولت سے بھی نوازا تھا، اور وہ نہایت فارغ البال تھے، طبیعت میں سخاوت اور فیاضی تھی اس لیے داددہش بھی کرتے رہتے تھے اور خیر خیرات کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ اشبیلیہ کی فصیل انھوں نے اپنے خرچ سے بنوائی تھی، دولت وثروت کی فراوانی اور جود وسخاوت کی عادت نے بھی ان کو لوگوں کا گرویدہ بنادیا تھا۔(۳)

زہد وعبادت: زہد وتقویٰ اور ورع وتدین کے بھی جامع تھے، ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ وہ عابد وزاہد تھے،(۴) حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے۔

منصب قضا: تفقہ واجتہاد میں کمال کی وجہ سے وہ اشبیلیہ کے قاضی مقرر کیے گئے، انھوں نے اس ذمہ داری کو اس قدر خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ وہ عوام وخواص میں نہایت مقبول ہوگئے لیکن چوں کہ ان کے فیصلے بے لاگ ہوتے تھے اور وہ معاملات قضا میں شدت بھی برتتے تھے، اس لیے غالباً اس منصب سے معزول کردیے گئے۔(۵)

(۱) ابن خلکان ج۲ ص۲۹۳ (۲) نفح الطیب ج۱ ص۲۳۷ (۳) ایضاً ص۲۳ وتذکرہ ج۴ ص۹۱
(۴) البدایۃ والنہایۃ ج۲ ص۲۲۸ (۵) تذکرہ ج۸ ص۹۱ والدیباج ص۲۸۳ ونفح الطیب ج۱ ص۳۳۶۔

ابتلاو آزمائش: غالباً وہ اپنے کمالات کی وجہ سے محسود ہو گئے تھے، اس لیے ان کو شدائد ومحن سے بھی دو چار ہونا پڑا اور بعض مورخین کا بیان ہے کہ موحدین نے ایک سال تک ان کو مراکش میں قید و بند میں رکھا تھا، ان کے ابتلاو آزمائش کی کئی وجہیں بیان کی گئی ہیں:

۱- علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ بعض فقہائے اشبیلیہ ابن مرجیٰ وغیرہ اور ابن عربی کسی مجلس میں یکجا تھے، ایک حدیث کا ذکر آیا تو ابن مرجیٰ نے کہا کہ یہ اس کے محض ایک ہی طریق کو جو مالک عن الزہری سے مروی ہے، جانتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ ہم لوگوں کو بھی مستفید کیجیے، انھوں نے وعدہ کیا مگر وہ وفا نہ کر سکے، اسی لیے ایک شاعر نے کہا ہے:

یااهل حمص ومن بها اوصيكم　　بالبر والتقوىٰ وصية مشفق
فخذوا عن العربی اسمار الدجیٰ　　وخذوا الرواية عن امام متقی
ان الفتی حلوا الكلام مهذب　　ان لم يجد خبرا صحيحا يخلق (۱)

ترجمہ: اے اہل حمص! میں آپ لوگوں کو ایک مشفق کی طرح نیکی اور تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، ابن العربی سے رات کے قصے کہانیاں سنو اور صاحب زہد و اتقا امام سے احادیث و روایات نقل کرو، شیریں سخن نوجوان صحیح اور معتبر خبر و روایت نہ پانے کی صورت میں خود ہی روایتیں گڑھ لیتا ہے۔

۲- صاحب نفح الطیب لکھتے ہیں:

''وہ بڑے مکرم و معظم تھے، منصب قضا پر فائز کیے گئے، اسی زمانہ میں اشبیلیہ کی فصیل کی مرمت و اصلاح کی ضرورت پیش آئی، عید قربان کا زمانہ تھا ابن العربی نے لوگوں سے جبراً قربانی کی کھالیں جمع کرائیں، اس کی وجہ سے عوام میں شورش اور ہیجان برپا ہو گیا اور انھوں نے ان کا گھر لوٹ لیا اور وہ قرطبہ چلے گئے۔''

---

(۱) تذکرہ حضرت ج ۲ ص ۱۹۲۔

۳- ایک اور وجہ قاضی عیاض سے یہ منقول ہے کہ کثرتِ حدیث واخبار اور غریب حکایات وروایات کی وجہ سے اکثر لوگوں نے ان پر نکتہ چینی کی ہے۔

مگر یہ وجہیں صحیح نہیں معلوم ہوتیں، پہلی وجہ کی صحت میں علامہ ذہبی نے کلام کیا ہے، دوسری وجہ اس لیے غلط ہے کہ مورخین کا عام بیان یہ ہے کہ انھوں نے فصیل کی مرمت خود اپنی رقم سے کرائی تھی، آخری وجہ ممکن ہے صحیح ہو مگر اس میں قید ومحن کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

مورخین کے متفقہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شدائد ومحن کا سامنا کرنا پڑا مگر انھوں نے اس کی کوئی صحیح وجہ نہیں لکھی ہے، قرینِ قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقدمے اور فیصلوں میں غیر معمولی شدت برتنے کی وجہ سے بعض لوگ ان کے درپئے آزار ہوئے ہوں گے، علاوہ ازیں امرا وسلاطین سے ان کے توسل کو بھی پسند نہیں کیا جاتا تھا، چنانچہ ابوعبداللہ بن مجاہد اشبیلی تقریباً تین ماہ تک مسلسل ان کی خدمت میں رہے، اس کے بعد انھوں نے وہاں جانا موقوف کر دیا، لوگوں نے وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ ابن العربی درس دیتے ہیں اور اُن کے دروازے پر سلطان کے یہاں جانے کے لیے سواری کھڑی رہتی ہے،(۱) حافظ ذہبی نے بھی لکھا ہے کہ سلاطین سے وابستگی کی وجہ سے لوگ ان کے خلاف برافروختہ رہتے تھے اور وہ دوسرے علما ومحدثین کی طرح ان کے سامنے جرأت وبے باکی سے کام نہیں لیتے تھے، بلکہ نرمی اور مداہنت برتتے تھے۔(۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہوں کے تقرب اور معاملات قضا میں شدت اور غریب حکایات وروایات کے نقل نے ان کی مقبولیت کو کم اور بعض لوگوں میں محسود بنا دیا تھا، ان ہی باتوں کی وجہ سے ان کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

وفات: شاہ عبدالعزیز صاحب نے ۵۵۳ھ سن وفات لکھا ہے لیکن یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، ۵۴۶ھ، ۵۴۵ھ اور ۵۴۴ھ کی روایتیں بھی کی گئی ہیں مگر صحیح قول یہ ہے کہ وہ

(۱) نفح الطیب ج۱ص ۳۴۶ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۱۔

۵۴۳ھ میں فوت ہوئے، بیان کیا جاتا ہے کہ مراکش سے اپنے وطن واپس آرہے تھے کہ فاس کے قریب ان کا انتقال ہوگیا، ان کی لاش فاس لائی گئی اور باب المحروق کے قریب دفن کیے گئے، بعض لوگوں کا بیان ہے کہ مقبرہ جیلانی میں دفن کیے گئے، ان کے ایک شاگرد ابوالحکم بن حجاج نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔(۱)

تصنیفات: ابن العربی کثیر التصانیف تھے، ان کی کتابیں مفید اور بلند پایہ ہیں جن کتابوں کے نام معلوم ہوسکے ہیں ذیل میں ان کی فہرست درج کی جاتی ہے:

۱- انوار الفجر: یہ فن تفسیر میں عمدہ کتاب ہے، ان کا خود بیان ہے کہ میں نے اسے بیس سال میں مرتب کیا تھا، اور یہ اسی ہزار ورقوں پر مشتمل ہے، ابوعیان فارس بن علی بن یوسف کے کتب خانہ میں جو مراکش میں ہے اس کا ایک نسخہ بیس جلدوں میں تھا۔(۲)

۲- کتاب احکام القرآن: یہ فن تفسیر میں ایک اچھی کتاب ہے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں ہے، ۱۹۱۳ء میں مطبع سعادۃ سے دو جزوں میں شائع ہوئی ہے۔(۳)

۳- کتاب الناسخ والمنسوخ، ۴- قانون التاویل: یہ دونوں بھی فن تفسیر کی کتابیں ہیں اور قرآنیات کے موضوع پر عمدہ خیال کی جاتی ہیں۔(۴)

۵- کتاب المشکلین: اس میں کتاب وسنت کے بعض مشکلات کا ذکر ہے۔(۵)

۶- کتاب شرح حدیث الافک، ۷- کتاب شرح حدیث ام زرع، ۸- کتاب شرح حدیث جابر فی الشفاعۃ: یہ سب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، بعض حدیثوں کی شرح میں

(۱) ایضاً ص۹۲، وابن خلکان ج۲ ص۲۹۳ والدیباج المذہب ص۲۸۴ (۲) بستان المحدثین ص۱۳۸، الدیباج المذہب ص۲۸۳ ونفح الطیب ج۱ ص۳۳۹ (۳) معجم المطبوعات کالم ۱۷۵ (۴) کشف الظنون (۵) بستان المحدثین ص۱۳۸ ونفح الطیب ص۳۳۹۔

مستقل رسالے ہیں۔

۹- کتاب الکلام علی مشکل حدیث السحاب والحجاب۔

۱۰- کتاب السبا، ۱۱- کتاب السلسلات یا المسلسلات: یہ دونوں بھی فن حدیث سے متعلق رسائل معلوم ہوتے ہیں۔

۱۲- کتاب النیرین فی شرح الصحیحین: یہ صحیحین کی شرح ہے۔

۱۳- کتاب ترتیب المسالک: یہ مؤطا امام مالکؒ کی شرح ہے۔(۱)

۱۵- کتاب القبس: یہ بھی مؤطا کی شرح ہے، اس میں مصنف نے مؤطا کے متعلق لکھا ہے کہ یہ شرائع اسلام میں اول وآخر کتاب ہے، ایسی کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی، کیوں کہ امام مالکؒ نے اس کو فروغ کے اصول کے لیے تمہید بتایا ہے، اوراس میں انھوں نے فقہ کے ایسے اہم اور بڑے اصولوں پر متنبہ کیا ہے جن کی جانب مسائل وفروع میں رجوع کیا جاتا ہے، شرح ترمذی میں لکھتے ہیں کہ موطا ہی اولین اصل اور خلاصہ ہے اور صحیح بخاری اصل ثانی اوران ہی دونوں کتابوں پر تمام کتب حدیث مسلم وترمذی وغیرہ کی بنیادیں رکھی گئی ہیں، امام خطابی نے اس کا انتخاب اورابوالحسن فاسی نے ملخص ترتیب دیا تھا جو ملخص المؤطا کے نام سے موسوم ہے۔(۲)

۱۶- عارضۃ الاحوذی: یہ جامع ترمذی کی مشہور ومقبول شرح ہے، اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ علامہ سیوطیؒ کے زمانہ تک اس کے علاوہ ترمذی کی کوئی مکمل شرح متداول نہ تھی، وہ فرماتے ہیں کہ:

لانعلم انه شرحه احد كاملا	ہم کو ابوبکر بن العربی کی عارضۃ
الا القاضی ابوبکر بن	الاحوذی کے علاوہ ترمذی کی اور کسی

(۱) ان سب کتابوں کے لیے بھی مذکورہ بالا حوالہ ملاحظہ ہو (۲) کشف الظنون جلد۲ ص ۵۷۲، مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۸۴، ۸۵۔

العربی فی کتابه عارضة الاحوذی۔ کامل شرح کا علم نہیں۔

مولانا عبدالرحمن مبارک پوریؒ رقم طراز ہیں:

''یہ ترمذی کی مشہور شرحوں میں ہے، حافظ ابن حجرؒ وغیرہ مشاہیر علمائے اسلام نے اپنی کتابوں میں اس سے استفادہ کیا ہے اور اس کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔''

ٹونک کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ ہے، اس کا ایک جز ترمذی اور اس کے بعض شروح کے ساتھ ہند کے مطبع نظامی نے شائع کیا تھا اور مصر سے یہ مکمل شرح چھپ چکی ہے۔(۱)

۱۷-شرح غریب الرسالۃ، ۱۸-الانصاف فی مسائل الخلاف: یہ بیس جلدوں میں ہے۔

۱۹-تخلیص یا تخلیص التخلیص: صاحب کشف الظنون نے اس کا بھی علم الخلاف کے ضمن میں تذکرہ کیا ہے۔

۲۰-المحصول فی اصول الفقہ یا کتاب المحصول فی علم الاصول، نام سے موضوع ظاہر ہے۔

۲۱-کتاب المتکلمین، ۲۲-تبیین الصحیح فی تعیین الذبیح، ۲۳-تفصیل التفصیل بین التحمید والتہلیل، ۲۴-کتاب التوسط فی المعرفۃ لصحۃ الاعتقاد والرد علی من خالف السنۃ من ذوی البدع والالحاد، ۲۵-سراج المریدین، ۲۶-سراج المہتدین، ۲۷-عواصم وقواصم، ۲۸-نواہی ودواہی، ۲۹-کتاب ملجاء المتفقہین الی معرفۃ غوامض النحویین (۲) جیسا کہ نام

---

(۱) کشف الظنون ج ۱ص ۳۷۵ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۸۳ (۲) ان سب کتابوں کے لیے الدیباج ص ۲۸۲ ونفح الطیب ص ۳۴۰ وبستان المحدثین ص ۱۳۸ ملاحظہ ہو۔

سے ظاہر ہے، یہ فن نحو کی کتاب ہے۔

۳۰- کتاب الرحلۃ یا کتاب ترتیب الرحلۃ: اس کے بعض دلچسپ اور مفید اقتباسات صاحب نفح الطیب اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ دہلوی نے نقل کئے ہیں، ان میں سے بعض کو دلچسپی کے خیال سے یہاں بھی درج کیا جاتا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں ایک دن بغداد میں ابوالوفا کی مجلس میں حاضر تھا، قرآن کی تفسیر ہو رہی تھی، قاری نے یہ آیت تلاوت کی کہ (تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ) میں نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک شخص سے آہستہ سے کہا کہ یہ آیت عالم آخرت میں رویت الٰہی کی صریح دلیل ہے، کیوں کہ اہل عرب (لقيت فلانا) رویت ہی کے موقع پر کہتے ہیں، ابوالوفا نے یہ سن لیا اور مذہب اعتزال کی تائید میں یہ آیت تلاوت کی:

(فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ .... يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ الخ) اور کہا کہ منافقین کے بارے میں اجماع ہے کہ ان کو رویت نہ حاصل ہوگی، میں اس وقت پاسِ ادب اور مجلس عام کی وجہ سے کچھ عرض نہ کر سکا، حالانکہ کتاب المتکلمین میں اس آیت کے ضمن میں میں نے لکھا ہے کہ (يَلْقَوْنَهُ) کی ضمیر کا مرجع نفاق ہے، جس کی تقدیر جزاء نفاق ہے''

ایک اور موقع پر رقم طراز ہیں کہ:

''محدثین کا قول ہے کہ حدیث کی طلب وتحصیل کرنے والے شخص کے چہرے پر شادابی اور تازگی ہوتی ہے، کیوں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

نضر الله امرأ سمع مقالتي فوعاها فاداها كما سمعها۔	اللہ تعالیٰ اس آدمی کو تروتازہ کرے جس نے میری بات کو سن کر محفوظ کیا اور اس کو اسی طرح جس طرح سنا تھا دوسرے کو پہنچایا۔

حاملین علم کے لیے یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے، اس لیے اللہ کے فضل وکرم سے یہ برکت ضرور حاصل ہوگی۔(۱)

مندرجہ ذیل کتابوں کا صرف نفح الطیب کے مصنف نے ذکر کیا ہے:

۳۱- کتاب الخلافیات: یہ غالباً وہی کتاب ہے جس کا ذکر نمبر ۱۸ میں ہوا ہے۔

۳۲- کتاب الامد الاقصیٰ باسماء اللہ الحسنیٰ وصفاتہ العلا، ۳۳- کتاب العقد الاکبر للقلب الاصغر، ۳۴- کتاب اعیان الاعیان، ۳۵- رسالۃ الکافی فی ان لا دلیل علی النامی۔

۳۶- کتاب ستر العورۃ: صاحب کشف الظنون نے ابوعبداللہ احمد بن سلیمان زبیری (م ۳۱۷ھ) کی اسی نام کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔

۳۷- کتاب مراقی الزلف: صاحب کشف الظنون نے مراقی الزلفی کے نام سے امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔

☆☆☆

(۱) نفح الطیب ج ۱ ص ۳۴۰ تا ۳۴۳ و بستان المحدثین ص ۱۳۸ و ۱۳۹۔

قاضی عیاض

(المتوفی ۵۴۴ھ)

نام ونسب: عیاض نام، ابوالفضل کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرو بن موسیٰ بن عیاض بن محمد بن موسیٰ بن عیاض، (۱) بعض لوگوں نے عمرو کا نام عمرون لکھا ہے۔ (۲)

ولادت وخاندان: یہ وسط شعبان ۴۴۶ھ میں پیدا ہوئے، بعض نے ۴۷۶ھ سنہ ولادت لکھا ہے، یمن کے مشہور قبیلہ حمیر سے خاندانی تعلق تھا، اس خاندان کے ایک شخص یحصب ابن مالک کی نسبت سے یحصبی کہلاتے ہیں۔ (۳)

قاضی عیاض کا خاندان علمی حیثیت سے ممتاز تھا، اس میں ان سے پہلے اور ان کے بعد کئی اصحابِ علم وفن گذرے ہیں۔

وطن: قاضی صاحب کے اجداد بسطہ سے فاس منتقل ہوگئے تھے اور پھر سبتہ آئے یہیں ان کی ولادت ہوئی، یہ ساحل سمندر پر واقع مغرب کا ایک مشہور شہر ہے، اس کے تعلق سے وہ سبتی کہے جاتے ہیں۔ (۴)

اساتذہ: مشہور استادوں کے نام یہ ہیں:

(۱) المعجم فی اصحاب القاضی ابوعلی الصدفی لابن ابار ص ۲۹۴ وابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۶ (۲) الدیباج ص ۱۶۸ وبستان المحدثین ص ۱۳۱ (۳) ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۷ و ۱۱۸ (۴) ایضاً والمعجم ص ۲۹۴ وکتاب الانساب ورق ۲۸۹ والدیباج ص ۱۶۸۔

قاضی ابوالولید بن رشد، قاضی ابوعبداللہ بن حمید بن ابومحمد بن عتاب عتابی محمد بن احمد بن الحاج ، ابوعلی بن حسین محمد صدفی ، عبداللہ بن محمد بطلیوسی ، عبداللہ بن محمد خشنی ، ابوعلی حسن بن محمد بن سکرہ ، ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن بقی بن مخلد ، ابوالحسین ابن سراج بن عبدالملک ، ابومحمد بن عثمان ، ہشام بن احمد ، قاضی ابوبکر بن عربی ، ابوعلی حسن بن علی طریف ، ابوالقاسم خلف بن ابراہیم بن نحاس ، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ مسبل ، عبدالرحمٰن بن محمد بن عجوز ، ابوعبداللہ محمد بن عیسیٰ تمیمی ، ابوحامد محمد بن اسماعیل ، سفیان بن عاص فقیہ ، قاضی ابوعبداللہ تمیمی ، ابوالولید ہشام بن احمد المعروف ابن العواد اور ابن مغیث وغیرہ۔

جن شیوخ سے ان کو شرف اجازت حاصل تھا ان کے نام یہ ہیں:

ابوعلی غسانی ، شیخ ابوبکر طرطوشی ، خلیص بن عبداللہ ، ابوزید بن منتال ، ابن السید ابوزید بن وراق ، ابوعبداللہ خولانی ، ابوالولید بن طریف ، ابوالاصبغ بن عیسیٰ بن ابی البحر الشتر ینی ، ابونصر نہاوندی ، ابوطاہر احمد بن محمد سلفی اور ابوعبداللہ مازری وغیرہ۔

تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ ان کے اساتذہ اور اجازت دینے والے شیوخ کی تعداد سو سے متجاوز ہے۔(۱)

تلامذہ: ان کے تلامذہ کا حلقہ بھی بڑا وسیع تھا، چند مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:

ابوالقاسم خلف بن بشکوال ، ابوجعفر بن قصیر غرناطی ، عبداللہ بن احمد عصیری ابومحمد عیسیٰ بن الحجری ، محمد بن حسن الحائری ۔(۲)

طلب علم کیلئے رحلت وسفر: اپنے وطن کے علماومشائخ سے استفادہ کرنے کے بعد ۵۰۷ھ میں اندلس تشریف لے گئے ، اور قرطبہ کے علمائے فن سے کسب فیض کیا، علم کی تحصیل کیلئے انھوں نے بلادِ مشرق کا بھی سفر کیا۔(۳)

(۱) المعجم ص ۲۹۵ و تذکرۃ الحفاظ جلد۴ ص ۹۹، ۱۰۰ والدیباج ص ۱۶۹ (۲) تذکرہ ج۴ ص ۱۰۱ (۳) ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۷ و تذکرہ جلد ۴ ص ۱۰۰ والدیباج ص ۲۹ و بستان المحدثین ص ۱۳۱۔

حفظ وذکاوت: قاضی عیاض کے حفظ وضبط، فہم وتیقظ اور ذکاوت وذہانت کا علمائے سیر نے ذکر واعتراف کیا ہے، ان کی غیر معمولی فطانت کا یہ حال تھا کہ ۳۰ سال کی عمر میں ارباب فن سے مناظرہ اور ۳۵ سال کی عمر میں عہدۂ قضا پر متمکن ہو چکے تھے۔ (۱)

علم حدیث میں درجہ: ان کو علم حدیث سے بڑا شغف اور خاص اشتغال تھا، اور اس فن میں مکمل مہارت اور درک رکھتے تھے، ابن خلکان کا بیان ہے کہ حدیث اور علوم حدیث میں یکتائے روزگار اور امامِ وقت تھے، اور حدیثوں کے ضبط وتحریر اور جمع وکتابت پر پوری توجہ مبذول کرتے تھے، اسلئے ان کے پاس روایات واحادیث کا وسیع ذخیرہ تھا۔ (۲)

تفسیر وفقہ: علوم قرآن اور فقہ وخلاف میں بھی ممتاز تھے، صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ ''وہ تفسیر اور اس کے متعلقہ علوم وفنون کے عالم، مبصر، فقیہ اور احکام وشرائع کے بڑے واقف کار تھے۔'' (۳)

دیگر علوم: وہ خالص دینی علوم ہی میں ممتاز اور فائق نہ تھے، بلکہ نحو، لغت، کلامِ عرب اور انساب ووقائع کے بھی نامور عالم تھے، علامہ ابن خلکان نے بھی علوم حدیث کے علاوہ نحو، لغت، کلامِ عرب، انساب اور ایام ووقائع میں ان کو امام العصر قرار دیا ہے۔ (۴)

شعر وسخن: شعر وسخن کا عمدہ ذوق تھا، ان کے جو اشعار اربابِ سیر نے نقل کئے ہیں وہ فراق وجدائی کی بے قراری، حکیمانہ مضامین اور مناظر قدرت کی مصوری وغیرہ پر مشتمل ہیں، تذکرہ نگاروں نے ان کے اشعار کی بلندی کا اعتراف کیا ہے۔ (۵)

خطابت: صاحب دیباج لکھتے ہیں، وہ بلیغ خطیب تھے۔ (۶)

قضا: ان کے کمسنی ہی میں قضا جیسے اہم اور ذمہ دارانہ منصب پر فائز ہونے کا ذکر اوپر

(۱) الدیباج ص ۱۶۹ وتذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰ (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۶ و ۱۰۷ والدیباج ص ۱۶۸ و ۱۶۹

(۳) الدیباج ص ۱۶۸ (۴) ایضاً وابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۶ وتذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰ وبستان ص ۱۳۱ (۵) ایضاً وابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۶ وتذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰ وبستان ص ۱۳۱ (۶) الدیباج ص ۱۶۹۔

گذرا ہے، پہلے اپنے وطن سبتہ کے برسوں قاضی رہے، پھر غرناطہ میں اس عہدہ پر مامور کیے گئے، مگر جلد ہی وہاں سے سبکدوش ہوکر دوبارہ سبتہ کے قاضی ہوئے، اس عہدہ پر مدتوں متمکن رہنے کی وجہ سے قاضی ان کے نام کا جز ہوگیا تھا۔

وہ محکمۂ قضا کے فرائض نہایت خوش اسلوبی اور ذمہ داری سے انجام دیتے تھے اور عدل وانصاف سے سرمو انحراف نہیں کرتے تھے۔ (۱)

جامعیت واعتراف کمالات: قاضی صاحب گوناگوں اوصاف وکمالات سے متصف، مختلف علوم وفنون کے جامع، امام وقت، علامۂ دہر اور عالم مغرب تھے، ابن خلکان کا بیان ہے کہ ''وہ اکابر ائمہ حفاظ ومحدثین اور افاضل فقہا وادبا میں تھے ان کی تصنیفات اور اشعار اس پر شاہد ہیں۔'' صاحب معجم لکھتے ہیں، قاضی عیاض کے علمی خدمات متنوع اور گوناگوں ہیں، فن حدیث میں ان کا انہماک غیر معمولی اور بے مثال تھا، وہ مختلف علوم اور معانی واصطلاحات کی فہم ومعرفت میں یکتا، نظم ونثر دونوں پر قادر اور فقہ، لغت، عربیت وادب کے ماہر تھے، درحقیقت ان کی ذات لائقِ فخر اور سرمایۂ کمال تھی اور وہ نہ صرف اندلس بلکہ مغرب کے علما اور رجال کے صدر الصدور تھے۔ (۲)

شہرت ومقبولیت: ان اوصاف وکمالات کی بدولت ان کی شہرت ومقبولیت میں بڑا اضافہ ہوگیا تھا، صاحب دیباج فرماتے ہیں کہ ان کی شہرت عظیم تھی، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ خود اپنے شہر میں جو بلند مرتبہ، غیر معمولی عظمت اور عظیم الشان وقار ان کو حاصل ہوا وہ یہاں کے کسی اور شخص کو نہ ان سے پہلے حاصل ہوا تھا اور نہ ان کے بعد ہوا۔ (۳)

فقہی مذہب: مالکی مذہب کے اکابر میں شمار کیے جاتے تھے، اس کے اصول وفروع پر ان کی نظر وسیع تھی اور وہ اس مذہب کی جزئیات کے حافظ تھے۔ (۴)

(۱) الدیباج ص ۱۶۹ و ابن خلکان ج ۲ ص ۱۷ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰ (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۱۷ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰ و المعجم ص ۲۱۶ (۳) الدیباج ص ۱۷۰ و تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۰۰ (۴) الدیباج ص ۱۶۹۔

اخلاق وعادات: انکسار، تواضع، نرم خوئی، خوش معاملگی، صبر وضبط، عفو وتحمل اور سخاوت وفیاضی وغیرہ عمدہ خصائل کے مالک تھے، صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ وہ لوگوں سے اچھا سلوک اور خوب صدقہ وخیرات کرتے تھے۔(۱)

خشیت وحق پسندی: خوف وخشیت الٰہی، عمل صالح میں مداومت اور حق کے معاملہ میں شدت پسندی کے لیے مشہور تھے، ذہبی کا بیان ہے کہ ان کے شہر میں ایسی عظیم الشان شہرت کا حامل کوئی نہ تھا، مگر اس چیز نے عجب وکبر کے بجائے ان کے عجز وانکسار اور خوف وخشیتِ الٰہی میں مزید اضافہ کر دیا تھا، ان پر خوفِ الٰہی اس قدر غالب تھا کہ قضا کے معاملات میں کبھی ناانصافی نہیں کرتے اور نہ اپنے اور پرائے کے معاملہ میں انصاف اور حق پسندی سے دامن کش ہوتے۔(۲)

اس طرح نہایت متقی، زاہد، عبادت گذار اور صحیح العقیدہ اور بدعات سے سخت متنفر رہتے۔(۳)

جلاوطنی اور وفات: موحدین (۴) کی تحریک کا ظہور ہوا تو قاضی صاحب بھی اس میں شامل ہوگئے، ۵۴۳ھ کے انتشار اور طوائف الملوکی کے زمانہ میں ان کو جلاوطن ہوکر مراکش جانا پڑا، یہیں ان کا جمعہ کے دن جمادی الاخریٰ ۵۴۴ھ میں انتقال ہوا اور باب ایلان میں

(۱) الدیباج ص ۱۶۹ (۲) الدیباج ص ۱۱۹ تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۰۰ (۳) مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۹

(۴) اس تحریک کے بانی محمد تومرت سوس میں پیدا ہوئے، یہ نہایت لائق وقابل اور عالم وفاضل شخص اور امام غزالیؒ کے تلامذہ میں تھے، ۵۱۵ھ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی دعوت کا آغاز کیا، جب ان کا حلقۂ اثر زیادہ ہوا تو انھوں نے مہدویت کا دعویٰ کر دیا، عبدالمومن کو جوان کا خاص معتقد ومرید تھا، ۵۲۰ھ میں اپنی وفات سے پہلے اپنا جانشین مقرر کر گئے، اس نے اندلس اور بلادِ مغرب سے مرابطین کی حکومت کا خاتمہ کر کے ان کو اپنے زیر نگیں کر لیا، ۶۲۰ھ تک الموحدین کی حکومت ان علاقوں میں رہی۔

سپرد خاک کیے گئے۔(۱) بعض لوگوں کا بیان ہے کہ کسی یہودی کے زہر دیدینے سے ان کی وفات ہوگئی تھی۔(۲)

اولاد واحفاظ: قاضی عیاض کے خاندان کی بدولت اندلس اور بلادِ مغرب میں مدتوں علم وفن کی قندیلیں فروزاں رہیں اوران کی اولاد احفاد میں بڑے ممتاز اور بلند پایہ اصحابِ علم وکمال پیدا ہوئے، فرزند ابوعبداللہ دانیہ کے قاضی اور مشہور صاحب علم تھے اور پوتے عیاض بن محمد ممتاز ادیب وشاعر تھے۔(۳)

تصنیفات: قاضی عیاض صاحب کمال اور نامور مصنف بھی تھے اوران کی تصنیفات کیت وکیفیت دونوں اعتبار سے اہم، بلند پایہ اور علم وفن کے ذخیرہ میں بیش قیمت خیال کی جاتی ہیں، اس لیے ان کو بڑی شہرت واعتبار حاصل ہوا اور وہ ہر زمانہ کے اہل علم میں مقبول ومتداول رہی ہیں، مورخین نے ان کو مفید، معلومات افزا اور تحریر وانداز بیان کے لحاظ سے انوکھی اور دلکش بتایا ہے، ابن الانباری لکھتے ہیں ان کی مفید کتابوں کو نقل کر کے لوگ ان سے خوب فیض یاب ہوئے اور وہ ہر طبقہ کے لوگوں میں نہایت مقبول ہوئیں، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ان کی اہم تصنیفات کا چار دانگِ عالم میں شہرہ ہے، ان کی بدولت مصنف کا نام روشن ہوا اوران کی دور دور شہرت ہوئی، ان کے وطن سبتہ میں ان کے زمانہ میں کسی شخص نے اتنی زیادہ کتابیں نہیں لکھی تھیں۔"(۴)

جن کتابوں کے ناموں کا علم ہوا ہے، ان کی فہرست اور بعض اہم کتابوں کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱-کتاب اجوبة القرطبيين، ۲-کتاب الاجوبة المجهرة على

(۱) الدیباج ص۱۷۰، تذکرۃ الحفاظ ج۴ ص۱۰۱، ابن خلکان ج۴ ص۱۱۸، الرسالة المستطرفہ ص۸۹

(۲) المعجم ص۲۹۶ والدیباج ص۱۷۱و۱۷۲ (۳) ابن خلکان ج۲ ص۱۱۷ و۱۱۸ والدیباج ص۱۷۲

(۴) المعجم ص۲۹۶ وتذکرۃ الحفاظ ج۴ ص۱۰۰۔

الاسئلة المتخيره يا عن الاسئلة المحيرة، ۳-كتاب الاعلام بحدود قواعدالاسلام يا الاعلام فى حدود الاحكام، ۴-كتاب سرالسراة فى ادب القضاة، ۵- كتاب العقيده ۔ ۶-كتاب العيون الستة فى اخبار سبتہ، ۷-كتاب مسئلة الاهل المشروط بينهم التزاور، ۸-مطامح الافهام فى شرح الاحكام، ۹-معجم شيوخ ابى على الصدفى، ۱۰-المقاصدلحسان فيمايلزم الانسان، ۱۱-كتاب نظم البرهان على صحة، (ياحجة) جزم الاذان۔

۱۲-كتاب اجوبة عمانزل فى ايام قضائه من نوازل الاحكام: ایک سفر میں ہے(۱) اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ان کے عہدۂ قضا کے زمانہ میں پیش آنے والے حوادث ومسائل کے بارے میں استفسارات کے جوابات اور فیصلوں پر مشتمل ہے۔

۱۳-كتاب الالماع فى ضبط الرواية وتقييدالسماع: یہ اصول حدیث میں ہے،(۲) اس کا ایک قلمی نسخہ مکتبہ سندیہ میں اور دوسرا کتب خانہ ایا صوفیہ میں ہے۔(تذکرۃ النوادر ص ۴۶)

۱۴-كتاب بغية الرائد لما تضمنه حديث ام زرع من الفوائد یا کتاب شرح حدیث ام زرع: یہ حدیث مذکور کی مبسوط شرح ہے۔(۳)

۱۵-كتاب ترتيب المدارك وتقرير المسالك لمعرفة اعلام مذهب مالك یاکتاب ترتيب المدارك وتقريب المسالك فى ذكر فقهاء مذهب مالك: اس میں مذہب مالکی کے مشاہیر واعلام کا ذکر ہے اور یہ بڑی عمدہ اور انوکھی کتاب ہے، اس سے پہلے ایسی عمدہ کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، (۴) اس کا ایک قلمی نسخہ دو جلدوں

(۱) الدیباج ص ۱۷۱ (۲) فہرست لباب المعارف پشاور ص ۶۱ و ۶۲ (۳) ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱ و کشف الظنون ج ۲ ص ۵۵ (۴) کشف الظنون ج ۱ ص ۲۷۶۔

میں کتب خانہ خدیویہ مصر میں اور دوسرا کتب خانہ ٹونک میں ہے۔ (تذکرۃ النوادر ص ۹۹)

۱۶-كتاب التنبيهات المستنبطه على الكتب المدونه یا المستنبط في شرح كلمات مشكله و الفاظ مغلقه مما اشتملت عليه الكتب المدونه و المختلط: مذہب مالکی کی مشہور کتاب مدونہ کے مشکل و مغلق الفاظ و کلمات کی شرح اور نادر و غریب فوائد کا خزانہ ہے، (۱) اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی ہے، یہ اصل نام کے بجائے تنبیہات ستہ کے نام سے زیادہ مشہور ہے، بعض لوگوں نے اس کی اشعار میں تعریف کی ہے۔

۱۷-جامع التواريخ : اس مبسوط اور جامع تاریخ میں اندلس اور بلاد مغرب کے ملوک اور سرزمین سبتہ کے واقعات اور اس کے علما کے حالات درج ہیں۔ (۲)

۱۸-كتاب الخطب: مصنف کے بلیغ خطبوں کا مجموعہ ہے۔ (۳)

۱۹- كتاب الغنيه في شيوخه: اس میں اپنے شیوخ کا ذکر کیا ہے۔ (۴)

۲۰-کتاب غنیۃ الکاتب وبغیۃ الطالب فی الصدور والترسل (۵) یا غنیۃ الکاتب وبغیۃ الطالب فی صدور الرسائل (۶) یا علۃ الکاتب وبغیۃ الطالب۔ (۷)

۲۱-کتاب المعجم فی شیوخ ابن سکرہ: ابو علی حسین بن محمد سرقسطی صدفی المعروف بابن سکرہ کے مشائخ کے ناموں کی تخریج کی ہے، شروع کے چند صفحے میں ابو علی کا ترجمہ اور اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ انھوں نے ۱۶۰ شیوخ سے اخذ واستفادہ کیا تھا۔ (۸)

۲۲-اکمال المعلم فی شرح صحیح المسلم : یہ صحیح مسلم کی شرح اور ابو عبداللہ محمد بن علی مازری (م ۵۳۶ھ) کی مشہور شرح مسلم کتاب المعلم بفوائد کتاب مسلم کا تکملہ ہے۔ (۹)

(۱) ایضاً ج ۲ ص ۴۱۱ (۲) تذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰ (۳) الدیباج ص ۱۷۱ (۴) الدیباج ص ۱۷۱ وکشف الظنون ج ۲ ص ۱۶۱ وبستان المحدثین ص ۱۳۱ (۵) الدیباج ص ۱۷۱ (۶) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۶۰ (۷) بستان المحدثین ص ۱۳۱ (۸) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۶۵ واتحاف النبلاء ص ۱۵۶ (۹) کشف الظنون ج ۱ ص ۴۷۴۔

صحیح مسلم کی مشہور و معتبر شرحوں میں اس کا شمار ہوتا ہے اور متاخرین نے اس سے اپنی شرحوں میں بڑا استفادہ کیا ہے، ابوعبداللہ محمد بن خلفہ وشتانی (م ۶۲۷ھ) نے اپنی شرح اکمال اکمال المعلم میں مازری، عیاض، قرطبی اور نووی کی شرحوں کو بعض اضافوں اور تنبیہات کے ساتھ جمع کیا ہے، اسی طرح ابوالفرج عیسیٰ بن مسعود زواری (م ۷۴۴ھ) نے بھی اپنی شرح معلم، اکمال اور مفہم ومنہاج کی مدد سے مرتب کی ہے۔(۱) اس کی اہمیت مالک بن مرجل کے ان اشعار سے ظاہر ہے۔

من قرأ الاکمال کان کاملاً — فی علمه وزین الحافلا

وکتب العلم کنوز انها — تفید نفعا عاجلاً وآجلاً

ولیس من کتب عیاض عوض — فانه کان اماما فاضلا (۲)

ترجمہ: جس نے اکمال کو پڑھا وہ اپنے علم میں کامل ہوگیا اور اس نے محفلوں کو مزین کردیا اور علمی کتابیں درحقیقت خزانہ ہیں جو جلد یا بدیر ضرور ضرور فائدہ دے گا، مگر عیاض کی کتابوں کا بدل نہیں ہے کیوں کہ وہ امام فن اور فاضل یگانہ تھے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں ہے۔(۳)

۲۳- مشارق الانوار: اس کا پورا نام مشارق الانوار علی صحاح الآثار ہے، یہ حدیث کی تین اہم اور طبقۂ اولیٰ کی کتابوں مؤطا امام مالک، صحیح بخاری وصحیح مسلم کی شرح ہے، اس میں ان کی حدیثوں کے مشکل اور غریب الفاظ کی تحقیق وتشریح، معانی ومطالب کی توضیح، راویوں کے ناموں کا ضبط اور ان کے اغلاط، اوہام اور تصحیفات وغیرہ پر تنبیہ کی گئی ہے۔(۴)

۲۴- کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ: یہ قاضی عیاض کی بڑی مفید، مقبول

---

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۳۷۴ (۲) بستان المحدثین ص ۱۳۰ (۳) فہرست وکشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۵۔ (۴) الدیباج ص ۱۷۰

اور بے نظیر کتاب ہے، اس کی جدت وندرت، ہر طبقہ ومسلک کے لوگوں میں شہرت ومقبولیت اور انداز تحریر کی دلکشی ودلآویزی وغیرہ کا قاضی عیاض کے معاصرین، ارباب سیر اور علمائے فن نے اعتراف کیا ہے، صاحب دیباج لکھتے ہیں:

''مصنف کی انفرادیت، جدت اور سبقت وتقدم کا شرف ومزیت مسلم ہے، لوگوں نے اس کتاب کی نقل وروایت کر کے اس سے بڑا استفادہ کیا ہے اور شرق وغرب ہر جگہ اس کا غلغلہ بلند ہے۔''(۱)

صاحب کشف الظنون فرماتے ہیں:

''یہ نہایت بیش قیمت اور مفید کتاب ہے، اس سے پہلے ایسی عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔''(۲)

صاحب روضات کا بیان ہے:

''ہمارے اصحاب یعنی فرقہ امامیہ کے لوگوں نے بھی اس کے بکثرت اقتباسات نقل کئے ہیں، درحقیقت اس میں بے شمار فوائد، بلند تحقیقات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے وفات تک کے حالات وواقعات کے متعلق حدیثیں شامل ہیں، مصنف نے اس میں اکابر شیوخ سے روایتیں نقل کی ہیں۔''(۳)

شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''غرض یہ بڑی اہم، عجیب اور نہایت مقبول کتابوں میں ہے، بعض شاعروں نے اس کی منظوم تعریفیں کی ہیں۔''(۴)

کتاب الشفا میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان اور آپ کے جلیل

(۱) الدیباج المذہب ص۱۷۰ (۲) کشف الظنون ج۲ ص۶۲ (۳) روضات الجنات ص۵۱۶ (۴) بستان المحدثین ص۳۰ واتحاف النبلاء ص۱۰۰۔

القدر منصب ومقام کو قرآن مجید، حدیث نبوی اور ائمہ کے اقوال کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے، مصنف کا بیان ہے کہ:

> ''تم نے مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر ومنزلت، آپ کے اوصاف ومحامد، آپ کی توقیر واحترام کا تذکرہ کرنے اور ان امور میں کمی اور کوتاہی کرنے والوں کے احکام بیان کرنے کے لیے مسلسل اصرار کیا ہے، یہ بڑا دقت طلب اور مشکل کام ہے اور اس میں لغزش کا بھی اندیشہ ہے لیکن چوں کہ اس سے ثواب اور اللہ کے فضل وانعام کی توقع ہے اور اس کو ترک کرنا کتمانِ علم کا موجب ہے، جس کے متعلق سخت وعیدیں آئی ہیں، اس لیے میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔''(۱)

یہ چار حصوں میں ہے اور ہر حصہ کئی ابواب وفصول پر مشتمل ہے۔

پہلے حصہ میں آپؐ کی اس ثنا وتوصیف، عظمتِ شان، فضائل وکمالات میں جامعیت اور معجزات وکرامات وغیرہ کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں۔

دوسرے حصہ میں دکھایا گیا ہے کہ لوگوں پر آپؐ کے کیا حقوق عائد ہوتے ہیں، جیسے آپ پر ایمان لانا، آپ کی مکمل اطاعت، آپ سے محبت وعقیدت رکھنا، آپ کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھنا اور آپ پر درود وسلام بھیجنا وغیرہ۔

تیسرے حصہ میں یہ بحث کی گئی ہے کہ کن بشری اوصاف وخصائل کی نسبت آپ کی جانب صحیح ومناسب ہے اور کیا اوصاف آپ کی شان وعظمت کے منافی ہیں غرض ان تمام باتوں کی اس میں تفصیل کی گئی ہے جو آپ کی شان میں روا اور جائز ہیں اور ان کی بھی جو ناروا اور ممنوع ہیں۔

چوتھا حصہ آپ کی تنقیص اور سب وشتم کرنے والوں کے احکام پر مشتمل ہے،

(۱) مقدمہ الشفاء۔

اس کے آخر میں اللہ تعالیٰ، ملائکہ، عام انبیا و رسل اور رسولؐ اللہ کے آل واصحاب کی شان میں گستاخی اور سب وشتم کرنے والوں کے احکام کا ذکر ہے۔

مصنف نے تیسرے حصے کو سب سے اہم مہتم بالشان اور اس کتاب کے لکھنے کی اصل غرض وغایت بتایا ہے جو شروع کے حصوں کا دیباچہ وتمہید اور آخر کے مباحث کا تکملہ ہے۔(۱)

قرآنی آیات کی تفسیر وتاویل کے ضمن میں اعراب وقرأت کے اختلافات اور مفسرین کے تفسیری اقوال بھی نقل کیے ہیں۔

کتاب الشفا بڑی بابرکت کتاب سمجھی جاتی ہے، قاضی عیاض کے برادرزادہ کہتے ہیں کہ میں نے خواب دیکھا کہ میرے چچا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سونے کے ایک تخت پر فروکش ہیں، یہ منظر دیکھ کر مجھ پر ہیبت ودہشت طاری ہوگئی، انھوں نے میری پریشانی اور گھبراہٹ دیکھ کر فرمایا کہ کتاب الشفاء کو مضبوطی سے اختیار کرو۔ یہ گویا اس امر کی جانب اشارہ تھا کہ یہ بلند مرتبہ واعزاز اسی کتاب کی کرامت کا نتیجہ ہے۔"(۲)

مختصرات وشروح: اس کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے اس کی شرحیں، تعلیقات اور مختصرات وغیرہ لکھے گئے ہیں، ذیل میں ان کا اور ان کے مصنفین کا نام درج کیا جاتا ہے:

۱- المنهل الاصفى فى شرح ما تمس الحاجة اليه من الفاظ الشفاء لابی عبداللہ محمد بن ابی شریف حسنی تلمسانی، یہ الشفا کی بہترین شرحوں میں ہے، ۹۱۷ھ میں اس کی تصنیف سے مصنف فارغ ہوئے۔

۲- الاصطفا لبيان معانى الشفا: لشیخ شمس الدین محمد بن محمد دلجی شافعی عثمانی، (م ۹۴۷ھ) یہ ۹۳۵ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

۳- شیخ امام ابوالحسن علی بن محمد بن اقبرس شافعی متوفی ۸۶۲ھ نے شرح لکھی۔

---

(۱) مقدمہ کتاب الشفاء۔ (۲) بستان المحدثین ص ۱۳۰۔

۴- عمر عرضی نے ۴ جلدوں میں شرح لکھی۔

۵- ابوذر احمد بن ابراہیم حلبی (م ۹۸۴ھ) کی شرح، یہ نا تمام ہے۔

۶- مناہل الصفائی تخریج احادیث الشفاء: اس میں حافظ جلال الدین سیوطی نے شفا کی حدیثوں کی تخریج کی ہے۔

۷- مزیل الخفاعن الفاظ الشفا: شیخ تقی الدین ابوالعباس احمد بن محمد شمنی (م ۸۷۶ھ) نے اس میں شفا کے حواشی وتعلیقات لکھے ہیں، ۸۴۷ھ میں اس کی تالیف سے فارغ ہوئے تھے۔

۸- برہان الدین ابراہیم بن محمد حلبی سبط ابن العجمی نے ایک جلد میں تعلیق لکھی اور ۷۹۷ھ میں مکمل کی۔

۹- المقتفی فی حل الفاظ الشفا: یہ سبط ابن العجمی کے ایک شاگرد محمد بن خلیل حنفی کی شرح ہے، اس میں انھوں نے اپنے استاد کے افادات مذکورہ بالا نام سے اور اس پر اضافے زبدۃ المقتفی فی تحریر الفاظ الشفا کے نام سے جمع کیے ہیں، اس کی تالیف ۸۱۰ھ میں ہوئی۔

۱۰- شہاب الدین احمد بن حسین بن رسلان رملی شافعی (م ۸۴۴ھ) نے ایک مفید تعلیق لکھی۔

۱۱- عمادالدین ابوالفداء اسماعیل بن ابراہیم بن جماعہ کنانی قدسی (م ۸۶۷ھ) نے شفا کے بعض الفاظ کی تشریح کی ہے۔

۱۲- شیخ ابوعبداللہ محمد بن حسن بن مخلوف راشدی کی شرح۔

۱۳- کمال الدین محمد بن ابی شریف قدسی (م ۸۱۷ھ) کی شرح۔

۱۴- ابوعبداللہ احمد بن محمد بن مرزوق تلمسانی مالکی (م ۸۱۷ھ) کی شرح۔

۱۵- شیخ عبداللہ قرشی یمانی کے حواشی۔

۱۶- الشفا المسمیٰ بالوفا: ابن الاخضر کی تلخیص ہے۔

۱۷- القفا تحریر الشفا: قطب الدین محمد بن محمد بن خیضری (م ۸۹۴ھ) کی تلخیص۔

۱۸- الاکتفا فی شرح الفاظ الشفا: امام ابوالمحاسن عبدالباقی یمانی کی شرح۔

۱۹- نسیم الریاض فی شرح شفاء القاضی عیاض: یہ مبسوط، ضخیم اور محققانہ شرح شہاب الدین احمد خفاجی (م ۱۰۱۹ھ) نے لکھی ہے اور ۴ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

۲۰- ملا علی قاری (م ۱۰۱۶ھ) نے دو جلدوں میں شرح لکھی۔

۲۱- شیخ الاسلام مولیٰ اسحاق بن شیخ الاسلام اسماعیل آفندی (م ۱۱۴۷ھ) نے شفا کا ترکی میں ترجمہ کیا ہے۔

۲۲- حرمین کے مفتش مولیٰ ابراہیم جف نے بھی ترکی ترجمہ کیا ہے۔(۱)

۲۳- المدد الفیاض بنور الشفا: شیخ ہمام حسن عدوی خمراوی (م ۱۲۷۶ھ) کی شرح (۲)

۲۴- بعض مصنفین نے اس کی ساٹھ مسند حدیثوں کو ایک علاحدہ جز میں جمع کیا ہے۔(۳)

ایک اعتراض: علامہ ذہبی نے الشفا کے متعلق لکھا ہے کہ یہ موضوع اور واہی روایتوں اور حدیثوں سے پُر ہے، مصنف نے اس کی روایات میں زیادہ چھان بین اور نقد و تحقیق سے کام نہیں لیا ہے۔

شہاب الدین نے اس اعتراض کو تسلیم نہ کرنے کے باوجود اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس میں بعض ضعیف اور موضوع حدیثیں ہیں، حافظ سیوطی نے اپنی کتاب مناہل الصفا فی تخریج احادیث الشفا میں ان سب کی نشاندہی کر کے تنبیہ کی ہے۔(۴)

ذہبی کا بیان گو غلو پر مبنی ہے تاہم اس کی صداقت یک گونہ مسلم ہے، قاضی عیاض نے احادیث و اخبار کے نقد و تحقیق پر پورا دھیان نہیں دیا ہے۔

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۶۳ و ۶۴ (۲) ہادی المسترشدین ص ۳۸۷ (۳) الرسالۃ المستطرفہ ص ۸۹

(۴) مقدمۂ الشفا۔

ابو السعادات مبارک بن اثیر جزری

(متوفی ۶۰۶ھ)

نام ونسب: مبارک نام، ابو السعادات کنیت، مجد الدین لقب اور نسب نامہ یہ ہے:
مبارک بن محمد بن محمد بن عبد الکریم بن عبد الواحد۔(۱)

ان کے والد محمد اثیر کہلاتے تھے، اس لیے ان کی اور ان کے دو اور بھائیوں کی ابن اثیر کے نام سے شہرت ہوئی۔

ولادت ووطن: ربیع الاول یا ربیع الثانی ۵۴۴ھ میں جزیرۂ ابن عمر میں پیدا ہوئے اور یہیں نشوونما پائی، پھر اپنے بھائی اور دیگر خاندانی متعلقین کے ساتھ موصل تشریف لائے اور وہاں مستقل بود وباش اختیار کرلی، واقدی کا بیان ہے کہ اہل برقعید میں سے ایک شخص عمر بن عبد العزیز نے اس کو آباد کرایا تھا، اس لیے اس کو جزیرۂ ابن عمر کہا جاتا ہے، ابن خلکان لکھتے ہیں کہ مجھ کو ابن عمر کے بارے میں واقفیت نہیں ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جزیرہ امیر عراقین یوسف بن عمر ثقفی کی جانب منسوب ہے، بعد میں مجھ کو معلوم ہوا کہ اس کا تعلق برقعید کے عمر بن عبد العزیز سے ہے، بعض تاریخوں میں اس کو عمر نامی ایک شخص کے دو بیٹے اوس وکامل کا جزیرہ بتایا گیا ہے لیکن ان دونوں کے متعلق بھی مجھ کو کوئی تحقیق نہیں ہوسکی، ابن المتوفی اپنی تاریخ میں عز الدین ابن اثیر کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ اوس وکامل کے جزیرہ سے تعلق رکھتے تھے اور وہ دونوں عمر بن ارس ثغلبی کے بیٹے تھے،(۲) یاقوت کا بیان ہے کہ اس

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۳۰۲ وطبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۵۲۔ (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۵ و ۳۰۶۔

کے اولین بانی حسن بن عمر بن خطاب تھے۔(۱)

خاندان: ابن اثیر کا خاندان علم وفضل کا گہوارہ تھا، ان کے والد ماجد کو علم وفن سے اشتغال تھا اوران کے دو بھائی بھی ان ہی کی طرح علمی حیثیت سے ممتاز اورصاحبِ کمال تھے، ضیاء الدین بن اثیر صاحب المثل السائرہ نامور ادیب وانشاپرداز اورعزالدین صاحبِ ''تاریخ کامل'' بے نظیر مورخ تھے۔

نسبتیں: شیبانی، اربلی، موصلی اور جزری ان کی نسبتیں ہیں، (۲) ان میں اول الذکر خاندان کی جانب اور باقی شہروں کی جانب ہیں لیکن جزری سب نسبتوں سے زیادہ مشہور ہے، یہ جزیرۂ ابن عمر کی جانب نسبت ہے۔

اساتذہ: چند مشہور استادوں کے نام یہ ہیں:

ابو القاسم صاحب ابن الخل بغدادی، ابومحمد سعید بن مبارک بن ذہان، ابوالفضل عبداللہ بن احمد الخطیب الطوسی موصلی، عبدالمومن بن کلیب، عبدالوہاب بن سکینہ یحییٰ بن سعدون قرطبی۔(۳)

تلامذہ: ان کے فرزندوں کے علاوہ شہاب قوصی اورفخر الدین بن بخاری وغیرہ کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے۔(۴)

طلب علم کے لیے سفر: ان کے بغداد اور مختلف ولایات میں جانے اور وہاں کے علما وفضلا سے استفادہ کرنے کا ذکر ملتا ہے۔(۵)

حدیث میں بلند پائیگی: ابن اثیر نامور محدث اورفقہ ومعرفت حدیث میں یکتا تھے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ انھوں نے بے شمار حدیثیں سنیں اوران کی روایت کی حدیثوں کے نقد وتمیز کے ماہر اور رجال وعلل کے واقف کار تھے، تذکرہ نگاروں نے اس فن اوراس کے متعلقہ

---

(۱) معجم البلدان ج ۳ ص ۱۰۳ (۲) شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲ وبغیۃ الوعاۃ ص ۳۸۵ (۳) و (۴) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳ وطبقات ابن سبکی ج ۵ ص ۵ بغیۃ الوعاۃ ص ۳۸۵۔

علوم میں ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔(۱)

قرآنی علوم: تفسیر اور قرآنی علوم کے بھی ماہر تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وقرأ القران واتقن علومه وحرّرها.(۲)	قرآن مجید کا مطالعہ کیا اور اس کے علوم میں مہارت بہم پہنچائی اور ان کو قلم بند کیا

فقہ: ان کے چھوٹے بھائی مورخ ابن اثیر نے ان کو فقہ کا عالم بتایا ہے اور دوسرے ارباب سیر نے بھی اس میں ان کے کمال و امتیاز کا ذکر کیا ہے۔(۳)

لغت، عربیت اور نحو: لغت، عربیت اور نحو وغیرہ میں بھی صاحب کمال تھے، مورخ ابن اثیر لکھتے ہیں:

وكان عالما فى عدة علوم منها الفقه والاصولان والنحو والحديث واللغة.	وہ متعدد علوم جیسے فقہ، اصول، نحو، حدیث اور لغت وغیرہ کے متبحر عالم تھے۔

ابن عماد فرماتے ہیں، انھوں نے حدیث کا سماع اور فقہ و حدیث اور ادب کی تحصیل کی۔(۴)

ادب و انشا: ادب و انشا کے فن سے خاص مناسبت تھی اور ان کا شمار مشہور و ممتاز ادیبوں اور انشاپردازوں میں ہوتا ہے، ان کے بھائی مورخ ابن اثیر کا بیان ہے کہ وہ ماہر کاتب اور انشاپرداز تھے، ابن سبکی نے ان کو انشاپردازی میں بارع کہا ہے، ابن خلکان وغیرہ نے بھی انشاپردازی میں ان کی جودت کا ذکر کیا ہے، اس کمال کی بنا پر مدتوں امرا کے دربار میں کتابت و انشا کے فرائض ان کے متعلق رہے۔(۵)

(۱) الکامل ج ۱۲ ص ۱۳ والبدایہ ج ۳ ص ۵۴ (۲) البدایہ ج ۱۳ ص ۵۴ (۳) الکامل ص ۱۳ ج ۱۲ وابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲ (۴) شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲ (۵) الکامل ج ۱۲ ص ۱۱۳ وابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۲۲۔

شعر وسخن: موزوں طبع بھی تھے اور کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔

حساب وریاضی: حساب وریاضی جیسے خشک فن سے بھی ان کو اشتغال تھا اور اس میں کئی رسائل وتصنیفات ان سے یادگار ہیں، علامہ ابن خلکان کا بیان ہے کہ وہ فن حساب وانشا کے عالم تھے۔(۱)

جامعیت واعتراف کمالات: مندرجہ بالا تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گوناگوں علوم وفنون کے جامع تھے، مورخ ابن اثیر لکھتے ہیں کہ ان کو متعدد علوم سے واقفیت تھی، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ وہ سارے علوم میں جامع اور مختلف فنون میں صاحب تصنیفات تھے، علمائے فن اور ارباب سیر نے ان کی جامعیت، فضل وکمال، عظمت وبلند پائیگی اور گوناگوں علوم میں مہارت وغیرہ کا اعتراف کیا ہے، ابوالبرکات بن مستوفی کا بیان ہے کہ وہ معتمد ترین علمائے مشاہیر ویگانۂ روزگار فضلا، نامور ارباب فن اور جلیل القدر اصحاب کمال میں تھے، ان کے انہی کمالات اور گوناگوں محاسن نے ان کی ذات کو مرجع خلائق اور شائقین علوم کا مرکز بنادیا تھا، ابن خلکان کا بیان ہے کہ گوشہ نشینی اور معذوری کے زمانہ میں ان کے گھر پر علما وفضلا کا ازدحام رہتا تھا۔(۲)

فقہی مذہب: شافعی المذہب تھے، علامہ ابن سبکی نے ان کا اپنی کتاب طبقات میں ذکر کیا ہے۔

تدین وتقویٰ: علمی کمالات کے ساتھ ہی وہ زہد واتقا سے بھی متصف تھے، حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، ان کے بھائی کا بیان ہے کہ وہ متدین اور جادۂ مستقیم پر گامزن تھے اور ان کا گھر صوفیہ کی سرائے اور عبادت گذاروں کے لیے وقف رہتا تھا۔(۳)

حسن خلق: اوصاف حمیدہ اور اخلاق فاضلہ کے پیکر تھے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی

---

(۱) الکامل ج ۱۲ص ۱۱۳ وابن خلکان ج ۲ص ۲۰۳ وشذرات الذہب ج ۲ص ۲۲ (۲) ایضاً۔(۳) الکامل ج ۱۲ص ۱۱۳۔

اور حسنِ سلوک سے پیش آتے تھے، ابن عماد لکھتے ہیں:

وکان ذابرواحسان (۱) وہ لوگوں کے ساتھ نیک اور عمدہ برتاؤ کرتے تھے۔

امرا سے تعلقات اور شاہی درباروں سے توسل: ابن اثیر امرا وسلاطین کے دربار سے بھی متوسل رہے اور ان کو اپنے زمانہ کے موصل کے تمام امرا کے یہاں رسوخ حاصل تھا، پہلے وہ امیر مجاہد الدین قایماز (۲) کے دربار سے وابستہ اور اس کے منشی رہے، امیر کی وفات تک اس خدمت پر مامور رہنے کے بعد صاحب موصل عزالدین مسعود بن مودود نے ان کو دیوان رسائل کا محکمہ دیا، جب عزالدین کی وفات ہوئی اور اس کا لڑکا نورالدین ارسلان امیر ہوا تو وہ اس کے دربار سے متعلق ہوگئے، ارسلان ان کو بہت مانتا اور انعام واکرام سے نوازتا رہا، اس کے یہاں بھی وہ کتابت وانشا کے محکمہ پر فائز تھے لیکن جب معذور ہوگئے اور کام کرنے کے لائق اور چلنے پھرنے کی سکت نہ رہ گئی تو اس خدمت سے سبکدوش ہوگئے۔ (۳) ابن کثیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نورالدین کی امارت کے شروع زمانہ ہی میں انھوں نے سبکدوشی حاصل کرلی تھی، چنانچہ پہلے اس نے اپنے غلام لولو سے کہلایا کہ وہ وزارت انشا کے محکمہ کا چارج لے لیں، انکار کرنے پر وہ خود گیا، مگر انھوں نے معذرت کی کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں اور اس کام کے لیے ایک گونہ سخت گیری اور شدت سے کام لینا پڑتا ہے، جواب میرے لیے ممکن نہیں ہے، اس عذر کی بنا پر اس نے ان کو معاف کردیا۔ (۴)

(۱) شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲ (۲) قایماز گو امیر موصل سیف الدین غازی بن مودود کا نائب تھا، مگر عملاً وہی سلطان تھا، کیونکہ سیف الدین نے اس کی قابلیت ولیاقت، حسن خدمت اور عمدہ کارگذاری کی وجہ سے تمام معاملات اسی کو سپرد کردیے تھے (دیکھو ابن خلکان ج ۳ ص ۱۷۷) (۳) ایضا ص ۲۰۴۔

(۴) البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۵۴۔

غالباً آخر عمر میں وہ امرا کی صحبت سے متنفر اور کنارہ کش ہو گئے تھے۔

سرائے کی تعمیر: موصل کے قریب ایک گاؤں میں انھوں نے ایک سرائے بنوائی، اس کا نام قصر حرب تھا، اس پر انھوں نے اپنی املاک اور جائداد کا بڑا حصہ وقف کر دیا۔(۱)

بیماری اور خانہ نشینی: آخر عمر میں ان کو ایک مزمن مرض نقرس (گھٹیا) لاحق ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے ہاتھ پاؤں مفلوج اور بیکار ہو گئے تھے، اور وہ چلنے پھرنے اور لکھنے پڑھنے سے بھی بالکل معذور ہو گئے تھے، بعض مورخین کا بیان ہے کہ پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا، اس سے ان کا نصف جسم شل ہو گیا، پھر گھٹیا کی بیماری ہوئی اور ہاتھ پاؤں حرکت اور جنبش کے لائق نہیں رہ گئے، اس زمانہ میں وہ مستقل خانہ نشین ہو گئے تھے، علماء اور طلبہ فن ان سے استفادہ کے لیے یہیں تشریف لاتے تھے، اگر کہیں جانا ہوتا تو ڈولی میں بیٹھ کر جاتے۔

ان کے بھائی عزالدین کا بیان ہے کہ بیماری کے ایام میں بلاد مغرب سے ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہنے لگا میں آپ کا علاج کروں گا، اور دوا کی قیمت اس وقت لوں گا جب آپ کو مکمل فائدہ ہو جائے گا، ہم لوگ اس پر راضی ہو گئے، چنانچہ اس نے ایک تیل تیار کر کے علاج شروع کیا، جب قدرے افاقہ ہوا اور ہاتھ پاؤں میں کچھ لچک اور نرمی ہو گئی اور وہ پھیلنے لگے تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ "اسے کچھ معاوضہ دیکر واپس کر دو" میں نے عرض کیا کہ جب علاج سے فائدہ ہو رہا ہے تو ایسا کیوں کیا جائے؟ انھوں نے کہا کہ "اس بیماری کی وجہ سے مجھے بڑا آرام و سکون ملا ہے، امراء و رؤسا کے یہاں آمد و رفت سے نجات مل گئی ہے، اس سے پہلے ان لوگوں کے یہاں حاضری دینی پڑتی تھی اور خودداری اور عزت نفس کے خلاف کام کرنا پڑتا تھا، مگر اب میں اپنے گھر میں راحت سے بیٹھا ہوں اور نفس کی ذلت و رسوائی سے چھٹکارا مل گیا ہے، حکام و امرا کو ضرورت پڑتی ہے تو خود آ کر مجھ سے صلاح و مشورہ کر جاتے ہیں، میرے اس آرام و سکون کا سبب یہی بیماری ہے، اس لیے

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۴ و طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۵۴۔

میں اس کا ازالہ اور علاج کرانا پسند نہیں کرتا، اب عمر ہی کتنی باقی ہے جو کچھ رہ گئی ہے، اسے تو آزادی اور اطمینان کے ساتھ بسر کرنے دو، مجھے اپنی ذلت ومحکومی کا پورا پورا بدلہ اور فائدہ مل چکا ہے، ان کی اس تقریر کو سن کر مجھے قائل ہو جانا پڑا اور میں نے ان کے علاج کا ارادہ ترک کر کے اور معالج کو صلہ دے کر واپس کر دیا۔ (۱)

وفات: اسی معذوری اور خانہ نشینی کے زمانہ میں ۶۰۶ھ میں ذی الحجہ کی آخری تاریخ جمعرات کو موصل میں انتقال کیا اور اپنی رباط میں دفن کیے گئے۔ (۲)

تصنیفات: علامہ ابن اثیر نے متعدد کتب ورسائل تالیف کیے، ان کی تمام تصنیفات اسلوب بیان اور حسن تحریر کے لحاظ سے دلکش ہیں، بعض مورخین کا بیان ہے کہ انھوں نے اپنی تمام کتابیں معذوری اور خانہ نشینی کے زمانہ میں تالیف کیں، اس زمانہ میں ان کو پوری یکسوئی حاصل تھی، اور طلبہ کا جم غفیر رہتا تھا، ان کو وہ املا کرا دیتے تھے، اور طلبہ کتابوں کی مراجعت اور حوالوں کے نقل واقتباس میں ان سے پورا تعاون کرتے تھے۔ (۳)

ابن اثیر کی کتابوں کے نام یہ ہیں۔

۱- کتاب الاذواد الذوات: اس کا نام کتاب البنین والبنات والآباء والامہات والاذواد الذوات اور المرصع وغیرہ بھی ہے، فن رجال کی کتاب ہے، اس میں ان ناموں کا ذکر اور تشریح ہے جن کی جانب اب، ابن اور ذو وغیرہ منسوب ہیں۔

یہ کتاب ۱۸۹۶ء میں ویما سے مفصل فہرست کے ساتھ شائع ہوئی ہے، سیوطی نے اس کی تلخیص کی تھی۔ (۴)

۲- کتاب الانصاف فی الجمع بین الکشاف: یہ چار جلدوں میں کلام مجید کی ضخیم تفسیر ہے، اس میں ابواسحٰق احمد بن ابراہیم ثعلبی (م ۴۳۰ھ) کی تفسیر الکشف والبیان اور

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۴ (۲) ایضاً وشذرات الذہب ج ۵ ص ۲۳ (۳) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۴ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۲۳ (۴) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۳ ص ۱۰۱ ومعجم المطبوعات کالم ۳۴

ابوالقاسم جار اللہ محمود بن عمر (زمخشری (م ۵۲۸ھ) کی الکشاف عن حقائق التنزیل کا ماحصل جمع کر دیا ہے۔(۱)

۳- **کتاب الباہر فی الفروق فی النحو**: یا الفروق والابنیہ، فن نحو میں ہے۔

۴- **کتاب البدیع**: یہ بھی فن نحو میں ہے اور تہذیب فصول ابن الدہان یا شرح فصول ابن الدھان بھی اس کے نام ہیں، ابومحمد سعید بن مبارک نحوی نے ایک مختصر اور دوسری ضخیم اور مبسوط کتاب لکھی تھی، ابن اثیر نے ان کی تہذیب وتشریح کی ہے، یہ واقعی اسم بامسمی ہے اور اس کی ترتیب وتبویب نہایت عمدہ اور عجیب ہے،(۲) طاش کبریٰ زادہ نے البدیع اور تہذیب فصول الدہان کو دو کتابیں بتایا ہے۔(مفتاح السعادہ ج۱ص۱۱۰)

۵- **تحفۃ الرسائل**: یہ غالباً فکاہات اور ادبی ظرائف وغیرہ سے متعلق رسائل ہیں جو مختلف النوع اجتماعی وتاریخی فوائد ومعلومات پر مشتمل ہیں، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں ۳۵۲ صفحے کا ہے۔(۳)

۶- **دیوان رسائل**: غالباً یہ اور تحفۃ الرسائل ایک ہی رسالہ ہے۔

۷- **رسائل فی الحساب**: حساب وریاضی میں رسالوں کا مجموعہ ہے۔

۸- **کتاب الشافی فی شرح مسند الشافعی**: امام شافعی کی مسند کی حدیثوں کی شرح، ان کے معانی کی وضاحت، ان سے مستنبط ہونے والے احکام ومسائل اور لغوی تحقیق اور نحوی مباحث وغیرہ کا ذکر ہے اور تقریباً ایک سو کراسہ پر مشتمل ہے۔(۴)

۹- **شرح غریب الطوال**: صرف ابن سبکی نے اس کا نام لکھا ہے۔

۱۰- **کتاب صنعۃ الکتابۃ**: فن انشا میں ہے۔

۱۱- **کتاب المختار فی مناقب الاخیار**: یہ چار جلدوں میں ہے اور غالباً ابرار واخیار

(۱) کشف الظنون ج۱ص۱۵۹ وابن خلکان ج۲ص۲۰۳ (۲) کشف الظنون ج۲ص۱۹۳ (۳) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج۲ص۱۰۱ (۴) کشف الظنون ج۲ص۴۳۳۔

کے مناقب وحالات پر مشتمل ہوگی۔

۱۲- کتاب المصطفیٰ والمختار فی الادعیۃ والاذکار: اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ادعیہ واذکار کا مجموعہ ہے ممکن ہے اس میں وہ دعائیں اور کلماتِ اذکار ذکر کیے گئے ہوں جو حدیثوں میں وارد ہیں۔

۱۳- النہایہ فی غریب الحدیث والاثر: یہ غریب الحدیث میں مشہور اور بلند پایہ کتاب ہے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ اس فن کی مشہور ومتداول اور عمدہ وجامع کتابوں میں النہایہ بھی ہے۔"(۱) طاش کبریٰ زادہ لکھتے ہیں کہ "اس موضوع پر ایسی عمدہ اور بے نظیر کتاب نہیں لکھی گئی۔"(۲) اس میں متقدمین کی کتابوں کا ماحصل جمع کر کے اس پر مفید اضافہ کیا گیا ہے، خصوصاً ہروی اور ابوموسیٰ مدینی اصفہانی کی کتابوں سے جو اس فن کی امہات کتب میں ہیں، یہ ماخوذ ومنقول ہے، ابن اثیر نے ان کتابوں کے حوالے بھی دیئے ہیں۔

النہایہ کو لغت کی کتابوں کے انداز پر حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق مرتب کیا گیا ہے اور اس میں حدیثوں کے مشکل اور غریب الفاظ کو ذکر کر کے ان کے معانی بیان کیے گئے ہیں اور ہر لفظ کی تشریح سے پہلے حدیث کا وہ ٹکڑا بھی نقل کیا گیا ہے جس میں یہ لفظ آیا ہے، لغات کی تحقیق وتشریح کے لیے دوسری حدیثوں سے نظائر اور ائمہ لغت اور شارحین حدیث کے بیانات بھی نقل کیے گئے ہیں۔

اس میں صرف صحاح کی حدیثوں ہی کے مشکل الفاظ کی تشریح نہیں کی گئی ہے بلکہ سنن، جوامع، مسانید اور مصنفات وغیرہ کی حدیثوں کے غریب الفاظ بھی درج ہیں، شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں الفاظ حدیث کی معرفت کی ضرورت رسول اکرمﷺ کی فصاحت وبلاغت، فتوحات کے بعد اہل عرب کے دوسری قوموں سے اختلاط کے نتیجہ میں غیر زبانوں کے الفاظ کے عربی زبان میں داخل ہونے اور اس فن کی مشہور اور اہم کتابوں کی خصوصیات وغیرہ کا ذکر ہے۔(۳)

(۱) تدریب الراوی ص۱۹۳ (۲) مفتاح السعادۃ ج۱ ص۱۱۰ (۳) مقدمہ النہایہ ص۲ تا۴۔

النہایہ ۱۲۶۹ھ میں طہران سے ایک ضخیم جلد میں چھپی تھی، ۱۳۰۸ھ میں قاہرہ سے چار جلدوں میں شائع ہوئی، اس ایڈیشن میں حاشیہ پر امام راغب اصفہانی کی مفردات اور ابو احمد عسکری کی تصنیفات المحدثین بھی شامل تھیں، ۱۳۱۱ھ میں مصر کے مطبع عثمانیہ نے اس کو چار جلدوں میں عبدالعزیز بن اسماعیل طہطاوی انصاری کی تصحیح کے بعد شائع کیا ہے، اس کے حاشیہ پر علامہ سیوطی کی تلخیص الدر النثیر بھی چھپی ہے اور ۱۳۲۲ھ میں مطبع خیریہ نے اس کو چار جلدوں میں شائع کیا ہے،(۱) اس کی بعض تلخیصوں اور مختصر کے نام یہ ہیں:

۱- محمود بن ابوبکر ارموی (م ۷۲۳ھ) نے اس کا ذیل لکھا جو دراصل النہایہ کا تکملہ ہے۔

۲- جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے اس کی تلخیص کی، اس کا نام الدر النثیر ہے، یہ النہایہ کے حاشیہ پر مطبع عثمانیہ سے ۱۳۱۱ھ میں شائع ہو چکی ہے، اس میں اصل کے حشو و زوائد اس طرح حذف کیے گئے ہیں کہ متن کی کوئی بات چھوٹنے نہیں پائی ہے، علاوہ ازیں ابن اثیر نے جن باتوں کو نظر انداز کر دیا تھا، اس میں ان کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔

۳- علامہ سیوطی نے النہایہ کا ذیل بھی لکھا تھا۔

۴- عیسیٰ بن محمد صفوی (م ۹۵۳ھ) نے مختصر لکھا تھا جو اصل کتاب کے نصف حجم کے برابر ہے۔

۵- شیخ علی بن حسام الدین الہندی المعروف بالمتقی نے مختصر لکھا۔(۲)

۱۴- **جامع الاصول فی احادیث الرسول:** یہ علامہ ابن اثیر کی سب سے مشہور و مقبول کتاب ہے، اس میں انھوں نے حدیث کی چھ امہاتِ کتب کی روایتوں کو جمع کیا ہے، اور یہ دس جزوں پر مشتمل ہے، ان سے پہلے رزین بن معاویہ نے بھی اسی نوعیت کی کتاب مرتب کی تھی اور اس کو بڑی شہرت و قبولیت بھی حاصل ہوئی تھی، ابن اثیر کی کتاب دراصل

(۱) معجم المطبوعات ج ۱ کالم ۳۵ و اکتفاء القنوع ص ۱۳۱ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۲۶۱۔

اس کا تکملہ ہے، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں، اس میں صحاح ستہ کی روایتوں کو جمع کیا گیا ہے، یہ اگرچہ رزین بن معاویہ کی کتاب کی طرح ہے، مگر اس میں بے شمار اضافے کئے گئے ہیں،(۱) خود ابن اثیر لکھتے ہیں

''امام رزین کی کتاب بڑی جامع اور نہایت مفید ہے، کیونکہ انھوں نے اس میں امہات کتب یعنی صحاح ستہ کی روایات کو جمع کیا ہے، اس لئے مجھ کو اس سے بڑا اشتغال ہو گیا، لیکن تتبع سے معلوم ہوا کہ اس میں بعض حدیثیں ایسے ابواب میں ذکر کی گئی ہیں جن کو دوسرے باب میں ذکر کرنا زیادہ بہتر تھا اور بعض حدیثوں کے نقل میں تکرار سے کام لیا گیا ہے اور بعض کو سرے سے نقل ہی نہیں کیا گیا ہے، علاوہ ازیں بعض ایسی حدیثیں بھی مجھ کو ملیں جو اصل مآخذ یعنی صحاح میں موجود نہیں ہیں، اس کی وجہ نسخوں کا فرق، حدیثوں کے طرق کا اختلاف اور مصنف کا اپنی کتاب کی ترتیب میں صحیح بخاری پر اعتماد ہے، ان ہی اسباب کی بنا پر مجھ کو رزین کی کتاب کی ترتیب وتہذیب اور اس میں صحاح کی ان روایتوں کا اضافہ کر دینے کا خیال ہوا جو اس میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔''(۲)

اس لحاظ سے اس کی نوعیت گویا خود ایک مستقل کتاب کی ہو گئی ہے اور گو رزین کو تقدم کا شرف ضرور حاصل ہے مگر ابن اثیر کی کتاب اس کے مقابلہ میں زیادہ جامع اور مستند ہے، چنانچہ صاحب تیسیر الوصول لکھتے ہیں:

''میں قدیم وجدید ائمہ فن کی اکثر کتب حدیث سے واقف ہوں مگر مجھ کو جامع الاصول سے زیادہ جامع اور عمدہ کوئی کتاب نظر نہیں آئی، مصنف نے اس کو بڑی خوبی اور عمدہ ڈھنگ سے مرتب کیا ہے اور یہ گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے۔(۳)

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۵۹۔ (۳) مقدمہ تیسیر الاصول۔

جامع الاصول کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ یہ حدیث کی چھ مستند و معتبر کتابوں کی جامع ہے، یعنی مؤطا امام مالک (۱) صحیحین، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور سنن نسائی وغیرہ کی روایات واحادیث کا یہ مجموعہ ہے، اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کو اسلامیات کی اہم اور حدیث کی بنیادی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے، بعض علما کا خیال ہے کہ اس طرز پر ایسی عمدہ کتاب نہ پہلے لکھی گئی ہے اور نہ آئندہ لکھی جائے گی۔ (۲)

ابن اثیر نے محض صحاح ستہ کی حدیثوں کو جمع کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کی شرح بھی کی ہے اور ان کے فنی مسائل و مشکلات اور ان سے متعلقہ مباحث کی جانب بھی اعتنا کیا ہے اور حدیثوں سے مستنبط ہونے والے احکام بھی تحریر کیے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''ابن اثیر نے جامع الاصول میں صحاح ستہ کی حدیثوں کو جمع کیا ہے اور غریب الفاظ کی شرح اور مشکلات کو ضبط بھی کیا ہے، اور روایان حدیث کے ناموں اور دوسرے متعلقات فن کو بھی بیان کیا ہے، اس لحاظ سے یہ گویا صحاح ستہ کی شرح ہے جس طرح کہ مشارق الانوار طبقۂ اولیٰ کی تینوں کتابوں (مؤطا اور صحیحین) کی شرح ہے۔'' (۳)

خود ابن اثیر فرماتے ہیں:

''رزین کی کتاب کی تہذیب وترتیب ابواب اور اس پر اضافے کے علاوہ اس میں غریب الفاظ کی شرح اور اعراب و معانی کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔'' (۴)

---

(۱) ابن اثیر نے سنن ابن ماجہ کے بجائے مؤطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں والحق معہٗ یعنی صحیح قول ابن اثیر کا ہے، اس کے متعلق مفصل بحث اس کتاب کی پہلی جلد میں امام ابن ماجہ کے تذکرہ میں گذر چکی ہے (۲) مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۱۱۰ (۳) عجالہ نافعہ مع فوائد ص ۴ (۴) کشف الظنون ج ۱ ص ۳۵۹۔

جامع الاصول مندرجہ ذیل تین حصوں میں ہے،۱-مبادی، ۲-مقاصد، ۳-خاتمہ۔

پہلے حصہ میں چار فصلیں اور ایک مقدمہ ہے، مقدمہ میں علم حدیث کے اصول وقواعد اور اصطلاحات وغیرہ کا ذکر ہے اور فصلوں میں علم حدیث کی نشر واشاعت اور جمع وتدوین کتب حدیث کی تصنیف وتالیف کے اغراض ومقاصد، متاخرین کے متقدمین محدثین کی کتابوں کے خلاصے مرتب کرنے اور جامع الاصول کے مقصد تصنیف وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کی تبویب وترتیب کے متعلق مصنف کا خود بیان ہے کہ:

''میں نے مسانید کے بجائے اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے اور ابواب معانی کے لحاظ سے قائم کیے گئے ہیں، پس جو حدیث کسی ایک ہی معنی پر دلالت کرتی ہے اس کو میں نے اسی کے باب میں شامل کیا ہے لیکن اگر حدیث گوناگوں معانی پر مشتمل ہے تو اس کو میں نے آخر میں ایک مستقل کتاب کے اندر ذکر کیا ہے اور اس کا نام کتاب اللواحق رکھا ہے، میں نے جملہ کتب کو ابواب وفصول میں احادیث کے معانی کے اختلاف کے اعتبار سے تقسیم کردیا ہے اور چوں کہ کتب کی تعداد زیادہ ہے، اس لیے ان کو میں نے حروف پر مرتب کیا ہے، چنانچہ کتاب الایمان والاسلام اور کتاب الایلا کو الف کے بیان میں رکھا ہے، حرفوں کے آخر کے لحاظ سے ایک ایسی فصل قائم کی گئی ہے جس سے کتاب کے ابواب کے مواضع ومقامات پر استدلال کیا جاسکتا ہے، ہر اثر وحدیث کے راوی کا نام بھی کتاب کے حاشیہ پر حدیث کے مقابل میں اس کے شروع ہی میں دیدیا ہے، پھر ائمہ صحاح میں سے جس نے اس روایت کی تخریج کی ہے، اس کے نام کو ظاہر کرنے والی علامت بھی دیدی ہے، متن کے محتاج تشریح الفاظ وکلمات کو حاشیہ پر ذکر کرکے

ان کی تشریح کردی ہے، میں نے حدیثوں کی سندوں کو حذف کردیا ہے اور محض صحابی کے نام لکھنے پر اکتفا کیا ہے اور آثار کے سلسلہ میں اس شخص کا نام ذکر کیا ہے جس نے صحابی سے اس کی روایت کی ہے، ہر کتاب کے آخر میں ایک علاحدہ باب کے اندر تمام مذکورین کے ناموں کو حروفِ تہجی کے مطابق جمع کیا گیا ہے، رہا متن تو اس میں صرف حدیث یا اثر ہی کو درج کیا گیا ہے، تابعین اور ائمہ کے اقوال شاذ و نادر ہی نقل کیے گئے ہیں، البتہ امام رزین نے اپنی کتاب میں امام مالک کی فقہ کا ذکر کیا ہے۔(۱)

جامع الاصول کی اہمیت کی وجہ سے اس کے کئی مختصرات لکھے گئے ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ ابو جعفر محمد مروزی استر آبادی نے ۶۸۲ھ میں جامع الاصول کو مختصر کیا تھا، اس وقت ان کی عمر ۶۹ سال تھی، اس کی ترتیب اصل کتاب ہی کے نہج کے مطابق ہے۔

۲۔ شرف الدین ابوالقاسم ہبۃ اللہ بن عبدالرحیم بازری حموی شافعی (م ۷۳۸ھ) کا مختصر جو تجرید جامع الاصول کے نام سے موسوم ہے، مصنف نے اس میں غریب کی شرح، اعراب کی وضاحت اور تکرار وغیرہ کو حذف کردیا ہے، یہ ربع کتاب کے بقدر ہوگی اور حسنِ اختصار اور قابل استناد ہونے کی وجہ سے طلبہ فن میں متداول ہے۔

۳۔ شیخ صلاح الدین خلیل بن کیکلدی علائی دمشقی (م ۷۶۱ھ) کا مختصر جو تہذیب الاصول کے نام سے مشہور ہے۔

۴۔ شیخ عبدالرحمٰن بن علی الشہیر بابن الربیع الشیبانی (م ۹۴۴ھ) نے تیسیر الوصول الٰی جامع الاصول کے نام سے اس کا مختصر لکھا یہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت عمدہ ہے، مصنف کا خود بیان ہے کہ "یہ اصل کے ثلث کے بقدر ہے اور اختصار کے ساتھ

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۳۵۹۔

ساتھ حسنِ بیان اور لطفِ عبارت کو مدنظر رکھا گیا ہے، مصنف نے جن مباحث کو مفصل اور زیادہ شرح وبسط کے ساتھ لکھا تھا، ان کا میں نے خلاصہ بیان کر دیا ہے۔'' اس کی تالیف سے ۹۱۶ھ میں فراغت ہوئی، یہ دو جلدوں میں ہے اور اس کو حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق مرتب کیا گیا ہے، کلکتہ سے ۱۲۵۲ھ میں چھپی تھی، لکھنو کے مطبع منشی نولکشور سے بھی یہ کئی دفعہ چھپی ہے اور ۱۸۹۶ء میں مطبع نولکشور کانپور نے اس کو شائع کیا تھا، نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

''غرض یہ مختصر تعریف وتوصیف سے مستغنی ہے، میرا ارادہ ہے کہ اس کی شرح فارسی زبان میں لکھوں تاکہ اس بہانہ سے پروانہ نجات حاصل کروں اور اللہ کے ہاتھ میں توفیق ہے۔''(۱)

لیکن غالباً نواب صاحب کو اس کی شرح لکھنے کا موقع نہیں ملا۔

(۵و۶) شیخ احمد بن رزق اللہ انصاری حنفی اور علامہ محمد بن طاہر پٹنی نے بھی اس کے مختصر لکھے تھے۔

۷- شیخ مجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ) نے اس کے زوائد مرتب کئے، اس کا نام تسہیل طریق الوصول الی الاحادیث الزائدہ علی جامع الاصول ہے، اس کو ناصر بن اشرف صاحب یمن کے لیے تالیف کیا تھا۔

۸- جامع الاصول کے غریب کے متعلق ایک کتاب محب الدین احمد بن عبداللہ طبری (م ۶۹۴ھ) نے لکھا تھا۔(۲)

---

(۱) اتحاف النبلاء ص ۴۷ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۶۰۳ والرسالۃ المستطرفہ ص ۱۴۳۔

امام ضیاء مقدسی

(م ۶۴۳ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوعبداللہ کنیت اور ضیاء الدین لقب تھا، نسب نامہ یہ ہے: محمد بن عبدالواحد بن احمد بن عبدالرحمٰن بن اسماعیل بن منصور۔(۱)

ولادت ووطن: ۵ جمادی الاخریٰ ۵۶۹ھ کو بیت المقدس میں پیدا ہوئے، اسی لیے مقدسی کہلاتے تھے، وہ سعدی اور صالحی کی نسبتوں سے بھی مشہور ہیں مگر اس کی تحقیق نہیں ہوسکی کہ یہ قبائل واشخاص کی جانب نسبتیں ہیں یا مقامات کی طرف۔(۲)

اساتذہ: شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابن الاخضر، ابن جوزی، ابن سکینہ، ابوجعفر صیدلانی، ابوالقاسم بوصیری، ابوالمجد البانیاسی، ابوالمظفر سمعانی، ابوالمعالی بن صابر، احمد بن موزینی، عبدالباقی بن عثمان، حافظ عبدالغنی، عبدالمعز بن محمد بزاز، عمر بن علی جوینی، فاطمہ بنت سعد الخیر، مبارک بن معطوس، موید طوسی، یحییٰ ثقفی۔

حافظ عبدالغنی کے خاص شاگردوں اور حافظ سلفی، شہدہ اور ابن بری وغیرہ نے ان کو روایت کی اجازت دی تھی۔(۳)

تلامذہ: ابن نجار، ابن نقطہ، شرف بن نابلسی، عمر بن حاجب اور فخر بخاری وغیرہ ان کے تلامذہ میں تھے۔(۴)

رحلت وسفر: بغداد، دمشق، مصر، ہمدان، اصبہان، مرو، حلب، حران، موصل اور مکہ معظمہ

---

(۱) شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۴ (۲) ایضاً (۳) ایضاً وتذکرہ ج ۴ ص ۱۹۷ و اتحاف النبلاء ص ۳۶۷ و ۳۶۸

(۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۹۷ و شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۶۵۔

وغیرہ کا سفر کیا اور ان جگہوں کے علما واصحاب کمال سے استفادہ کیا، اصبہان دو دفعہ گئے اور وہاں کے علما سے فیضیاب ہوئے، بے شمار اہم کتابیں نقل کیں اور گوناگوں اصول وفوائد کی تحصیل کی۔(۱)

علم وفن سے اشتغال: ضیاء مقدسی کو علم وفن سے غیر معمولی اشتغال تھا، ابن نجار کا بیان ہے کہ میں نے علم کی طلب وتحصیل کا ان سے زیادہ شوقین کسی کو نہیں پایا، ابن رجب فرماتے ہیں کہ انھوں نے پانچ سو سے زیادہ شیوخ کی کتابیں نقل کیں، علم وفن سے غیر معمولی انہماک کی بنا پر انھوں نے کتب خانہ اور ایک مدرسہ قائم کیا تھا، اس کا ذکر آگے آئے گا۔(۲)

حفظ وضبط: ان کے حافظ وضابط اور ثقہ وثابت ہونے پر علما فن کا اتفاق ہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ''محدثین نے ان کے حافظہ کی تعریف کی ہے اور زکی برزالی نے ان کو ثقہ، ابن نجار نے متقن، ثابت، ثقہ، حجت، صدوق اور نبیل کہا ہے، ان کے شاگرد عمر بن حاجب کا بیان ہے کہ وہ حفظ وثقاہت میں یکتائے روزگار تھے۔(۳)

حدیث میں درجہ: ضیاء مقدسی کا پایہ حدیث میں اس قدر بلند تھا کہ محدث الشام اور شیخ السنۃ کہلاتے تھے، ابن عماد لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے صاحب کمال محدثین اور ائمہ فن میں تھے، متعدد مجموعے اور تخریجات ان سے یادگار ہیں، شریف ابوالعباس حسینی فرماتے ہیں کہ وہ عرصہ دراز تک حدیث کے درس وتدریس کی مسند پر متمکن رہے، اور بے شمار حدیثیں روایت کیں، عمر بن حاجب کہتے ہیں کہ ہمارے استاذ ابوعبداللہ شیخ وقت اور حدیث سے واقفیت میں یکتائے روزگار تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ انھوں نے روایت حدیث میں غیر معمولی طلب وتحری سے کام لیا، مزی کا بیان ہے کہ وہ حافظ عبدالغنی سے حدیث ورجال کے بڑے عالم تھے اور ان کے زمانہ میں ان کے مثل کوئی نہ تھا۔(۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۹۷ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۴ (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) تذکرہ ج ۴ ص ۱۹۷ و ۱۹۸ وشذرات ج ۵ ص ۲۲۴۔

جرح وتعدیل: حدیث میں مہارت اور بلند پائیگی کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ جرح وتعدیل کے امام، فن رجال کے ماہر اور احادیث کے علل واسقام اور صحیح وغلط روایات میں نقد وامتیاز کی پوری صلاحیت رکھتے تھے، ابن نجار کا بیان ہے کہ وہ حدیث وفن رجال کے عالم اور رواۃ کے حالات سے باخبر تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ضیاء جرح وتعدیل کے ممتاز عالم، رواۃ ورجال کے احوال کے واقف کار اور روایات واحادیث کے مبصر تھے۔'' (۱)

فقہ وعلوم قرآن: فقہ اور قرآنی علوم کا ذوق بھی تھا، اہل سیر نے ان کو فقیہ ومجتہد لکھا ہے، قرآنیات میں انھوں نے بعض کتابیں بھی لکھیں۔

فضل وکمال: ضیاء مقدسی علم وفضل میں نہایت ممتاز تھے، تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ ''وہ یگانۂ وقت اور ہم عصروں میں فائق وبرتر تھے، عمر بن حاجب ان کے بعض علمی کمالات بیان کر کے لکھتے ہیں کہ ''میں ان جیسے بلند پایہ شخص کے کمالات بیان کرنے سے قاصر ہوں۔'' شرف بن نابلسی کہتے ہیں کہ ہمارے استاذ ضیاء کے مانند کوئی شخص صاحب فضل وکمال نہ تھا، صاحب شذرات کا بیان ہے کہ ''وہ یکتائے روزگار تھے، ان کی شہرت محتاجِ بیان نہیں۔'' (۲)

زہد وورع: زہد وورع، تدین وتقویٰ اور عبادت وریاضت میں بھی ممتاز تھے، محدثین اور علمائے رجال نے ان کے زہد واتقاء، تدین وانقطاع الی اللہ کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ ان علمائے ربانیین میں تھے جو ذکر وعبادت میں اکثر مشغول رہتے تھے، زکی برزالی کا بیان ہے کہ وہ متدین تھے، ابن حاجب فرماتے ہیں کہ وہ ورع وتقویٰ، زاہد، عابد، اکلِ حلال میں محتاط اور مجاہد فی سبیل اللہ تھے، میری آنکھوں نے عفت، نزاہت اور پاکبازی میں ان کے جیسا آدمی نہیں دیکھا۔ (۳)

سیرت واخلاق: ان کی طبیعت میں بڑی سادگی اور بے تکلفی تھی اور وہ نہایت متواضع

---

(۱) تذکرہ ج ۴ص ۱۹۷و۱۹۸ وشذرات ج ۵ ص ۲۲۴ (۲) شذرات ج ۵ ص ۲۲۴ (۳) ایضاً والبدایہ ج ۱۳ص ۱۷۰۔

اور حلیق تھے، ابن نجار کا بیان ہے کہ وہ حسنِ سیرت میں ممتاز اور بے نظیر تھے۔(۱)

مدرسہ کا قیام: دمشق میں انھوں نے کوہ قاسیون کے دامن میں جامع مظفری کے دروازے پر ایک مدرسہ کی داغ بیل ڈالی، ایک روایت کے مطابق اس مدرسہ کی بناء وتعمیر میں وہ خود کام کرتے اور اس کے لیے تو رّعاً کسی سے کوئی چیز قبول نہ کرتے، انھوں نے اپنے کتب خانہ کی کتابیں اس پر وقف کر دی تھیں۔ یہ مدرسہ حدیث کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا تھا اور محتاج وضرورت مند طلبہ اور دور دراز سے آنے والے اس میں تعلیم حاصل کرتے تھے، ان کے بعد بھی یہ قائم رہا اور بعض لوگوں نے اس کے لیے اپنی جائدادیں وقف کر دی تھیں۔(۲)

فقہی مسلک: حافظ ابن رجب نے طبقات حنابلہ میں ان کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حنبلی المذہب تھے۔

وفات: ۷۴ سال کی عمر میں دوشنبہ ۱۸/ جمادی الاخریٰ ۶۴۳ھ کو انتقال کیا اور جبل قاسیون کے اندر دفن کئے گئے۔(۳)

تصنیفات: ضیاء مقدسی جلیل القدر مصنف تھے، انھوں نے متعدد مفید، عمدہ اور بلند پایہ کتابیں لکھیں، جو ان کے وسعتِ علم ونظر اور علومِ حدیث میں تبحر کی دلیل ہیں جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

۱- کتاب الاحکام: تین جلدوں میں ہے مگر ناتمام ہے، ۲- الحکایات المستطرفہ: کئی جزوں میں ہے، ۳- الرواۃ عن البخاری ایک جز میں ہے، ۴- الطب والرقیات کئی جزوں میں ہے، ۵- افراد الصحیح ایک جز میں ہے، ۶- الموبقات کئی جزوں میں ہے، ۷- النہی عن سب الصحابہ، ۸- الہجرۃ الی الارض الحبشۃ ایک جز میں ہے، ۹- دلائل النبوۃ والالہیات

---

(۱) ایضاً والبدایہ ج ۱۳ ص ۱۷۰ (۲) ایضاً وشذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۵ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۹۸ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۶۔

تین جزوں پر مشتمل ہے، ۱۰-ذم المسکر ایک جز، ۱۱-سیر المقادسۃ چند جلدوں میں ہے، صاحبِ شذرات نے غالبًا اسی کتاب کا نام سبب ہجرۃ المقادسۃ الی دمشق وکرامات مشائخہم لکھا ہے اور تصریح کی ہے کہ تقریبًا دس جزوں میں ہے، اس میں وہاں کے اکابر علما کے حالات وتراجم درج ہیں۔

۱۲-شفاء العلیل (ایک جز) ۱۲-صفۃ الجنۃ (تین جزوں میں، ۱۳-صفۃ النار (۲ جزوں میں)، ۱۴-غرائب الحدیث (۹ جزوں میں)، ۱۵-فضائل الاعمال (ایک جلد اور چار جزوں میں ہے، اس میں احادیث کی سندیں حذف کر کے ان کے لیے ائمہ کی کتابوں کا حوالہ دیدیا ہے) ۱۶-فضائل الشام (تین جزوں میں ہے)، ۱۷-فضائل القرآن، ابن عماد نے غالبًا اسی کا نام فضائل القرأۃ لکھا ہے، ۱۸-قصہ موسیٰ (ایک جز)، ۱۹-کلام الاموات (ایک جز)، ۲۰-مناقب اصحاب الحدیث (۱) (۴ جزوں میں ہے)، ۲۱-المختارة فی الحدیث، اصل نام الاحادیث الجیاد المختارة ممالیس فی الصحیحین اواحدھما ہے، یہ بڑی ضخیم کتاب اور تقریبًا نوے ۹۰ اجزاء پر مشتمل ہے، مگر مصنف اس کی تکمیل نہیں کر سکے تھے، یہ صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان اور صحیح مستدرک کی طرح کی کتاب اور ان صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے جو صحیحین میں درج نہیں ہیں، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں اس میں صحت کا التزام اور ان صحیح روایتوں کو نقل کیا گیا ہے، جن کی پہلے تصحیح نہیں کی گئی تھی، شاہ عبدالحق صاحب کا بیان ہے کہ ائمہ صحاح کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی صحیح حدیثوں کے مجموعے مرتب کیے، ضیاء مقدسی کی المختارہ اسی نوعیت کی کتاب ہے، اس میں ان صحیح حدیثوں کی تخریج کی گئی ہے، جو صحیحین میں نہیں ہیں۔

اس کی ترتیب ابواب کے بجائے حروف معجم کے مطابق مسانید پر کی گئی ہے، گو ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم کی کتابوں کی جیسی شہرت المختارہ کو حاصل نہیں ہوئی مگر اس

(۱) شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۵ بعض کتابوں کا اتحاف النبلاء اعلام اور کشف الظنون میں بھی ذکر ہے۔

کا نام ان کتابوں کے ساتھ ہی لیا جاتا ہے، بعض علماء کے نزدیک مستدرک سے زیادہ اہم اور بلند پایہ ہے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ " یہ عمدہ علوم اور حدیثی فوائد پر مشتمل ہے اور مستدرک حاکم سے بھی بڑھ کر ہے، ہمارے بعض مشائخ اس کو اس پر ترجیح دیتے ہیں کاش یہ مکمل ہوگئی ہوتی۔"

حافظ ابن تیمیہ اور علامہ زرکشی سے منقول ہے کہ ضیاء مقدسی کی تصحیح حاکم کی تصحیح سے عمدہ واعلیٰ ہے، اور زرکشی نے یہ بھی کہا ہے کہ ان کی تصحیح ترمذی وابن حبان کی تصحیح کے قریب قریب ہے۔

علامہ ابن عبدالہادی سے بھی اسی طرح کا بیان منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "المختارہ میں غلطیاں کم ہیں وہ حاکم کی مستدرک کی طرح نہیں ہے جس میں بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جن کا کذب وموضوع ہونا ظاہر ہے، اسی وجہ سے اس کا درجہ دوسری کتابوں سے کمتر ہے۔" صحت کے التزام کے باوجود بھی مختارہ میں ضعیف اور کم درجہ کی حدیثیں شامل ہوگئی ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے، صاحبِ الرسالۃ المستطرفہ لکھتے ہیں:

> "اس کی اکثر روایتیں مسلّم ہیں، اور بہت کم حدیثوں پر تعقب کیا گیا ہے۔"

علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ "المختارہ کی جو روایتیں صحیحین یا ان میں سے کسی ایک کتاب میں نہیں ہیں اسی طرح صحیح ابوعوانہ میں جو صحیح مسلم پر مستخرج ہے، بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جو اصل کتاب میں نہیں ہیں چونکہ ان زائد حدیثوں میں صحیح حسن بلکہ ضعیف حدیثیں بھی شامل ہیں اس لیے ان زوائد کے بارے میں حکم لگانے میں احتیاط کرنی چاہیے۔ المختارہ کا قلمی نسخہ ابن کثیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ (۱)

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۹۸، البدایہ ج ۱۳ ص ۱۷۰، الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۲ و ۲۳ فتح المغیث ص ۱۴ مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۷۹ و ۱۶۶۔

امام نووی

(متوفی ۶۷۶ھ)

نام ونسب: یحییٰ نام، ابوزکریا کنیت اور لقب محی الدین تھا، ان کا نسب نامہ یہ ہے: یحییٰ بن شرف بن مری بن حسن بن حسین بن جمعہ بن حزام۔(۱)

ولادت ووطن: وہ محرم ۶۳۱ھ میں نوا میں پیدا ہوئے، یہ ملک شام میں حوران کا ایک گاؤں تھا، (۲) اسی کی نسبت سے وہ نواوی اور نووی مشہور ہیں اور حوران کے تعلق سے حورانی کہلاتے ہیں، حزامی ان کے جداعلیٰ حزام کی جانب نسبت ہے۔(۳)

اساتذہ: امام نووی نے جن ارباب کمال سے مختلف علوم کی تحصیل کی تھی ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابن مالک، ابواسحاق ابراہیم بن عیسیٰ مرادی، شیخ احمد مصری، تقی الدین بن ابی الیسر، جمال الدین بن صیرفی، رضی بن برہان، زین الدین خلف بن یوسف، زین الدین بن عبدالدائم، شمس الدین بن ابی عمر، شمس الدین عبدالرحمٰن بن نوح، عبدالعزیز بن محمد انصاری حموی، عبدالغنی علاء الدین، عزالدین بن خالد، عزالدین عمر بن سعد اربلی، عمادالدین عبدالکریم الخرستانی، شیخ کمال بن احمد، قاضی نفیسی۔(۴)

تلامذہ: ان سے سماع اور تخریج کرنے والے کچھ مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں:

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۲۷۸ (۲) ایضاً وتذکرہ ج ۴ ص ۲۶۰ (۳) اتحاف النبلاء المتقین ص ۴۲۹

(۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۰ و ۲۶۱۔

ابن ابی الفتح، شیخ ابوالحجاج مزی، شہاب الدین احمد بن جعوان، خطیب صدر سلیمان جعفری، شمس الدین بن نقیب، شہاب الدین اربدی، علاء الدین بن عطار شیخ مبارک تاسک، جبریل کردی، قاضی محی الدین مزرعی۔(۱)

سیر وسیاحت: امام نووی پہلے (۶۴۹ھ) میں دمشق تشریف لے گئے اور رواحیہ میں قیام کر کے باقاعدہ علم وفن کی تحصیل شروع کی، دو سال بعد وہ اپنے والد کے ہمراہ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے اور ڈیڑھ ماہ تک مدینہ کے فضلا سے استفادہ کرتے رہے، پھر وہ وہاں سے واپسی کے بعد اپنے وطن میں پورے انہماک کے ساتھ تعلیم میں مشغول ہو گئے، آخر میں بیت المقدس کی زیارت کی۔(۲)

حفظ وضبط: ائمہ فن اور تذکرہ نگاروں نے ان کے حفظ وضبط اور عدالت وثقاہت کا اعتراف کیا ہے اور ان کو متقن، حجت اور ثقہ وثابت لکھا ہے۔

حدیث میں بلند پائیگی: امام نووی کو علم حدیث اور اس کے متعلقات سے غیر معمولی شغف تھا اور وہ اکابر محدثین اور ممتاز شُراحِ حدیث میں شمار کیے جاتے ہیں، علمائے طبقات وتراجم نے ان کو حدیث میں ماہر فن اور امام وغیرہ بتایا ہے۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ''وہ حدیث، فنونِ حدیث کے حافظ وتبحر عالم، رجال واسناد اور صحیح وسقیم حدیثوں کی پرکھ کے ماہر تھے، یافعی نے انھیں حدیث میں وسیع النظر اور کثیر المعرفت لکھا ہے، حدیث میں ان کی بلند پائیگی اور عظمت کی بنا پر ان کو حافظ ابوشامہ جیسے جلیل القدر محدث کا جانشین مقرر کیا گیا اور ان کی وفات کے بعد دار الحدیث دمشق کی تولیت وصدارت کے منصب پر فائز کیا گیا، اس ذمہ داری کو وہ عمر بھر انجام دیتے رہے۔(۳)

فقہ وافتاء: حدیث ہی کی طرح فقہ وافتاء میں بھی ممتاز تھے اور اس میں ان کے معلومات

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۰ (۲) ایضاً (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۲ ومرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۴، ۱۸۲۔

وسیع اور نظر گہری تھی، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے اکابر فقہا اور شوافع کے شیوخ میں تھے، یافعی کا بیان ہے کہ ان کو فقہ کی معرفت میں امتیاز حاصل تھا اور وہ معتمد اور لائق اعتبار مفتی تھے، ابن ناصر الدین نے ان کو فقیہ الامت کہا ہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ''امام شافعی کے مذہب کی انھوں نے گوناگوں خدمات انجام دی ہیں، اس کی تحقیق وتصحیح، ضبط وتنقیح، تحریر وتدوین اور ترتیب وتہذیب میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے اور اس مذہب کے وہ چوٹی کے علما میں تھے، رافعی کے بعد اس مذہب میں ان سے زیادہ صاحب کمال اور ممتاز شخص کوئی نہیں گذرا۔''

امام نووی شافعی المذہب ہونے کے باوجود درجہ اجتہاد پر فائز تھے اور بعض مسائل مین ان کے اقوال اپنے مذہب کے علما سے مختلف ہوتے تھے، جن مسائل میں انھوں نے رافعی سے اختلاف کیا ہے، ان میں سے اکثر میں ابن سبکی اور یافعی نے ان کو مصیب بتایا ہے۔(۱)

قرآنیات: بچپن ہی سے ان کو کتاب الٰہی سے خاص انس تھا اور انھوں نے اسے زبانی یاد کرلیا تھا، ہر وقت اس کی تلاوت کرتے اور دنیوی کاموں میں مشغولیت کے وقت بھی قرآن مجید زبانی پڑھا کرتے تھے، قرأت وتجوید اور علم تفسیر کی مشاہیر فضلا سے تحصیل کی تھی۔(۲)

لغت، عربیت اور نحو وصرف: گو امام نووی کی اصل توجہ حدیث وفقہ اور ان سے متعلقہ علوم کی جانب مرکوز رہی لیکن لغت وعربیت، نحو وصرف اور منطق وفلسفہ وغیرہ سے بھی اشتغال رکھتے تھے اور ان فنون کے ماہرین سے ان کی تحصیل کی تھی۔

جامعیت: اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جامع کمالات اور متعدد علوم پر دسترس رکھتے تھے، فخر

(۱) ایضاً وطبقات الشافعیہ سبکی ج ۵ ص ۳۵۷ والبدایہ ج ۱۳ ص ۲۷۸ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۳۵۷ البدایہ ج ۱۳ ص ۲۷۱۔

حنبلی کا بیان ہے کہ وہ تمام علوم میں پختہ تھے، یافعی کا بیان ہے کہ فقہ وحدیث کے علاوہ دیگر فنون کے بھی وہ ماہر وواقف تھے۔(۱)

انہماک فی العلم: وہ شب وروز علم کی تحصیل اوردرس وتدریس، تصنیف وتالیف اور اشاعتِ علم وفن میں مشغول رہتے، ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتے، راستہ چلتے وقت بھی پڑھنے کا سلسلہ موقوف نہ کرتے، مدتوں اس حال میں گذرا کہ پہلو زمین پر رکھ کر اطمینان اور چین سے سونا نصیب نہ ہوا، بچپن میں بھی ان کو لکھنے پڑھنے کی دھن کے سوا اور کسی چیز سے کوئی رغبت نہ تھی، ان کے ہم سن لڑکے ان کو کھیلنے کے لیے مجبور کرتے تو وہ بھاگنے کی کوشش کرتے اوراگر مجبوراً ان کے ساتھ رہنا پڑتا تو قرآن مجید زبانی پڑھا کرتے، ایک دفعہ ان کے والد نے انھیں ایک دوکان پر کردیا مگر بیع وشرا کی مشغولیت کے باوجود ان کے علمی ذوق وشوق میں کمی نہ آئی، ان کے اسی شوق اوردلچسپی کی وجہ سے یاسین بن یوسف زرکشی نے بچپن ہی میں ان کے متعلق یہ پیشین گوئی کی تھی کہ آئندہ یہ بچہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا عالم وزاہد ہوگا اورلوگوں کو اس سے بڑا فیض پہنچے گا، ان کے علمی انہماک کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ امام نووی روزانہ بارہ فنون کا سبق لیتے تھے، پہلا سبق حدیث کی شرح وتحقیق کا ہوتا اور بقیہ اسباق کی تفصیل یہ ہے:

دوسبق کتاب الوسیط کا، ایک سبق مہذب کا، ایک الجمع بین الصحیحین کا، چھٹا سبق صحیح مسلم کا، ساتواں ابن جنی کی کتاب اللمع کا، آٹھواں ابن السکیت کی اصلاح المنطق کا، نواں صرف کا، دسواں اصول فقہ کا، گیارہواں اسماء الرجال کا اور بارہواں اصول دین کا ہوتا تھا۔

اسباق اس شوق ومحبت سے پڑھاتے کہ کسی قسم کا کوئی اشکال باقی نہیں رہ جاتا تھا۔

---

(۱) تذکرہ ج ۴ص ۲۶۴ ومرآۃ الجنان ج ۴ص ۱۸۴۔

اس سے ان کی غیر معمولی ذہانت وفطانت کا بھی پتہ چلتا ہے، ان کے کثرتِ اشتغال اور ذہانت وفطانت ہی کی وجہ سے ان کے کاموں میں بڑی برکت ہوئی اور ۴۵ سال کی مختصر عمر میں انھوں نے متنوع علمی کمالات اور گوناگوں اہم خدمات انجام دیئے، ساڑھے چار مہینہ کے اندر شافعی مذہب کی اہم اور جامع کتاب التنبیہ کو نہ صرف ختم کردیا بلکہ زبانی یاد بھی کر ڈالا۔(۱)

درس وتدریس: انھوں نے مختلف مدارس میں درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دیئے اور دارالحدیث اشرفیہ کے منصب صدارت پر بھی فائز رہے، اسی طرح مدرسہ اقبالیہ میں ابن خلکان کے جانشین مقرر کیے گئے اور ان کی وفات کے بعد درس وتدریس کی خدمت انجام دی۔(۲)

زہد واتقاء: امام نووی بڑے متدین اور عابد وزاہد شخص تھے، برابر عبادت، ذکرِ الٰہی اور اوراد ووظائف میں مشغول رہتے تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ انھوں نے مجاہدہ وتزکیہ نفس، مراقبہ وتصفیۂ باطن تقویٰ، طہارت اور معمولی اور جزئی باتوں میں احتیاط کو اپنے اوپر لازم کرلیا تھا اور اپنی خواہشاتِ نفس کو یکسر پامال کردیا تھا، یافعی کا بیان ہے کہ وہ عابد وزاہد، متورع، باعمل، شب بیدار، حامیِ دین اور ناصرِ سنت تھے، عبادت وطاعت، تلاوتِ قرآن اور تصنیف وتالیف میں ان کا تمام وقت بسر ہوتا، دنیا اور اس کے تعیشات سے بالکل دست کش رہتے اور تمام تر توجہ دین بنانے پر مرکوز رکھتے تھے، زہد وقناعت، اتباع سنت، اقتدائے سلف، نیکی وصلاح اور خیر خیرات کے کاموں میں لگے رہنا ان کی زندگی کا دستور تھا، ورع وتقویٰ میں بے مثال تھے، راتیں عبادت میں گذرتیں اور اس قدر روتے کہ داڑھی اور چہرہ تر بتر ہوجاتا ان کی طرح کسی شخص کو زہد وعبادت، حزم واحتیاط

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۰ و ۲۶۱ و ۲۳۰، مرأۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۳ طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۶۶ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۳۵۵ و ۳۵۰ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۲۷۹۔

اور لوگوں سے حذر واجتناب پر قابو نہیں ہوسکتا، فخر حنبلی کا بیان ہے کہ وہ بڑے متقی اور پرہیز گار تھے، اکثر روزے رکھتے اور دوبار حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، اسی دینی جذبہ اور تورع کی وجہ سے انھوں نے اپنی زندگی اسلامی علوم خصوصاً حدیث وسنت کی خدمت واشاعت میں گذاری اور ان کی اصل دلچسپی کا مرکز فقہ وحدیث تھا، دوسرے علوم سے عدمِ رغبت ہی نہیں ایک گونہ انقباض ہوتا تھا جیسا کہ وہ خود بیان کرتے ہیں۔

ایک دفعہ مجھ کو طب پڑھنے کا خیال ہوا، اس لیے میں نے شیخ کی قانون خریدی مگر میرے دل پر ایسی ظلمت چھائی اور میرا حال ایسا ہوا کہ مجھ کو اس سے کسی قسم کا اشتغال ہی نہ ہوسکا، میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا سبب میرا طب کی جانب اعتنا ہے، یہ خیال آتے ہی میں نے کتاب قانون فروخت کر دی اور پھر میرا قلب منور ہوگیا۔ (۱)

سادگی وقناعت: زہد واتقاء کی بنا پر وہ نہایت صبر وقناعت کی زندگی گذارنے کے عادی ہوگئے تھے، کھانے، پینے رہنے سہنے، لباس اور پوشاک ہر چیز میں سادگی پسند کرتے تھے، تکلف، آرائش اور دنیاوی تعیشات سے ان کو سخت نفرت تھی، حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

''وہ بڑی عسرت ومشقت کی زندگی گذارتے اور بالکل موٹا جھوٹا کھاتے پہنتے تھے، ان کی پوشاک کورالٹھا اور چھوٹا سا شیخانہ عمامہ تھا۔''

ابن عماد کا بیان ہے کہ وہ نہایت قانع اور تھوڑے پر گذر اوقات کرنے والے تھے، اللہ کا دیا جو کچھ میسر آجاتا اسی پر راضی رہتے، معمولی لباس، موٹا جھوٹا کھانا اور مختصر ساز وسامان پر اکتفا کرلیتے تھے، قطب الدین یونینی فرماتے ہیں کہ تقلیل وقناعت اور عسرت وتنگی میں ان کی کوئی مثال نہ تھی۔

کم خوری کے اس قدر عادی تھے کہ اکثر روزے رکھتے اور شب وروز میں صرف ایک دفعہ عشا بعد کھانا کھاتے اور سحر کے وقت پانی پیتے، کبھی ان کے کھانے میں دو قسم کا سالن

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۰ و ۲۶۱ و مرأۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۱ تا ۱۸۶۔

نہیں ہوتا تھا، پھل اور میوہ جات اہلِ دمشق کی مرغوب غذا تھی، مگر بعض قباحتوں کی وجہ سے وہ تورعاً ان کا استعمال پسند نہیں کرتے تھے، دارالحدیث کے منصب صدارت پر فائز ہونے کے باوجود اس کے معاوضہ میں ایک حبہ بھی نہیں لیا بلکہ ان کے والد جو روٹی اور انجیر وغیرہ بھیج دیتے اسی پر قناعت کرتے تھے، فخر حنبلی کا بیان ہے کہ مرغوب اور لذیذ کھانا چھوڑ کر محض اپنے والد کی بھیجی ہوئی روٹی اور انجیر کھاتے تھے، کسی کا ایک درہم بھی قبول نہ کرتے، معمولی اور پیوند لگے کپڑے پہنتے اور پھل نہیں کھاتے تھے، کم خوری کے اس لیے عادی تھے کہ رات میں نیند نہ آئے اور اطمینان وسکون کے ساتھ خدا کی عبادت کر سکیں، علامہ ذہبی اپنے شیخ رشید ابن معلم سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے شیخ محی الدین کو حمام میں نہ جانے، موٹا جھوٹا کھانے اور پہننے اور سخت کوشی اور تنگی وترشی کی زندگی بسر کرنے پر ملامت کی اور کہا کہ اس سے آپ کو بیماری لاحق ہو جائے گی اور آپ علمی اشغال کے لائق نہ رہ سکیں گے تو وہ کہتے کہ اللہ کے فلاں بندے کا بھی تو مسلسل روزہ رکھنے کی وجہ سے جسم زرد ہو گیا تھا۔

نووی کا بیان ہے کہ میں جسم کی تروتازگی اور نیند کی زیادتی کے ڈر سے پھل، ترکاری، سبزی اور عمدہ کھانے سے پرہیز کرتا ہوں، ابن عطار نے فواکہ استعمال نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ دمشق کی آراضی کے بارے میں مجھ کو بعض شبہے ہیں، اس لیے ان کے استعمال میں تردد ہوتا ہے۔

چوں کہ ان کی زندگی بڑی سادہ تھی اور وہ کوئی اہتمام وتکلف پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے ان کو دوسرے لوگوں کو اپنے یہاں کھانے کے لیے مدعو کرنے میں زحمت اور تکلف ہوتا تھا، چنانچہ ایک دفعہ شیخ برہان الدین اسکندرانی نے ان کے یہاں افطار کرنے کی خواہش کی تو انھوں نے ان سے بڑی صفائی اور بے تکلفی سے کہہ دیا کہ آپ اپنے یہاں سے کھانا لے کر آجایئے گا، ہم سب لوگ مل کر افطار کرلیں گے۔ (۱)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۱ تا ۲۶۴، مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۴ شذرات الذہب ج ۵ ص ۳۵۶۔

ہدیے اور تحفے نہ قبول کرنا: ہدایا اور تحائف قبول نہ کرتے تھے، خصوصاً غیر متعلق لوگوں کے ہدیے لینے میں انھیں سخت پس وپیش ہوتا تھا، البتہ جن لوگوں سے واقفیت ہوتی تھی اور ان کے ہدایا کے بارے میں اطمینان ہوتا، ان کو لینے میں زیادہ پرہیز نہ کرتے، چنانچہ ایک دفعہ ایک فقیر نے ہدیہ کیا تو اس کو قبول کرلیا، احتیاط اور تورع کی بنا پر ہدیے کی طرح معاوضہ لینے سے بھی پرہیز تھا، مدرسہ کی ملازمت کے باوجود وہاں سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔(۱)

صبر واستقلال: صبر واستقلال میں بے مثال تھے، مصائب اور مشقتوں کو خندہ پیشانی سے انگیز کرتے اور زبان سے اُف نہ کرتے، جن چیزوں کو انھوں نے اپنا معمول بنالیا تھا ان پر ہمیشہ سختی سے قائم رہے اور ان میں کبھی کوئی فرق نہ آنے دیا، انھوں نے سخت تکلیفیں جھیلیں مگر ان کے شوق وانہماک اور علم کی طلب وجستجو میں کوئی کمی نہ آئی۔(۲)

اخلاق وعادات: سیرت وکردار کے لحاظ سے بھی بڑے ممتاز تھے، یافعی فرماتے ہیں کہ بخدا وہ بہترین اوصاف وخصائل اور پاکیزہ سیرت واخلاق سے متصف اور محاسن وکمالات میں عدیم النظیر تھے۔(۳)

تصوف: امام نووی بادۂ معرفت کے لذت شناس اور مشہور صوفی یٰسین بن یوسف زرکشی کے حلقہ بگوش اور عقیدمند تھے، سلوک کے آداب اور طریقت کے اشارات ان ہی سے سیکھتے تھے، صوفیہ ومشائخ سے بڑی محبت وعقیدت رکھتے تھے، پورے شوق سے ان کی صحبتوں میں حاضر ہوتے تھے، تصوف اور صوفیہ کے مخالفین پر برہمی کا اظہار کرتے تھے، کتاب الاذکار میں صوفیہ کی جماعت کے گوناگوں فضائل بیان کرکے دکھایا ہے کہ یہی اس امت کے منتخب اور عمدہ لوگ ہیں، نووی کی کرامت اور بزرگی کے بعض واقعات بھی منقول ہیں۔(۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۴ ص۲۶۲ (۲) ایضاً (۳) مرآۃ الجنان ج۴ ص۱۸۲و۱۸۵ (۴) ایضاً ص۱۸۵و۱۸۶۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر: وہ فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ادائیگی سے کبھی غافل نہیں رہے، امراء وسلاطین کو بھی معروف کی تلقین کرتے اور منکر سے روکتے تھے، اس معاملہ میں بڑے جری اور بے باک تھے اور اس میں کسی مصلحت ومداہنت کے قائل نہ تھے، حق گوئی کی پاداش میں ان کو امرا کے غیظ وغضب کا نشانہ بھی بننا پڑا، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ''وہ گوناگوں مصروفیتوں اور علمی اشتغال کے باوجود اصلاحِ خلق اور امر بالمعروف کا فریضہ بھی انجام دیتے، بادشاہوں اور ظلم وجفاپرور لوگوں کے روبرو حق بات کہتے اور ان کے ملط کاموں پر سخت ردونکیر فرماتے، انھوں نے سلاطین وامرا کو خطوط لکھ کر امورِ خیر کی تلقین اور معاصی سے بچنے کی دعوت دی۔'' ایک دفعہ ملک ظاہر کو ایک خط لکھا تو وہ سخت برہم ہوا اور گرفتار کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے تشدد سے ان کو بچالیا، بعد میں یہی ملک ظاہر ان کا معتقد ہوگیا اور بڑی تعظیم وتکریم کرنے لگا۔(۱)

متانت ووقار: بڑے سنجیدہ وباوقار تھے، بچپن ہی سے نہایت متین اور شائستہ تھے، کھیل کود اور لہوولعب سے کوئی رغبت نہ تھی، یاسین بن یوسف فرماتے ہیں کہ میرے دل میں نووی کی عظمت کا نقش اس وقت سے ثبت ہے جب وہ دس سال کے تھے، بچے ان کو کھیل کود کے لیے مجبور کرتے مگر یہ بھاگنے کی فکر میں رہتے، بحث ومبالغہ اور مناظرہ وغیرہ میں بھی متانت، اور وقار سے کام لیتے۔(۲)

اعترافِ فضل وکمال: امام نووی کی عظمت وکمال اور جامعیت کے بارے مین علمائے فن اور مورخین کا اتفاق ہے، حافظ ذہبی نے ان کو امام، حافظ، یکتائے روزگار، قدوہ، شیخ الاسلام اور سرتاج اولیاء وغیرہ کہا ہے، ابن فرح فرماتے ہیں، ان میں تین خوبیاں تھیں، جن میں سے اگر ایک بھی کسی کے اندر ہوتو لوگ اس کے پاس سفر کرکے آئیں اور وہ مرجع خلائق بن

---

(۱) مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۵ وتذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۳ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۳۵۶

(۲) طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۶۶ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۳۵۶ واتحاف النبلاء ص ۴۴۰۔

جائے، یعنی علم، زہد اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر، امام نووی میں یہ تینوں خصوصیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں، شیخ قطب الدین یونینی کا بیان ہے، وہ علم وورع، ریاضت وعبادت کم خوری اور پر مشقت زندگی بسر کرنے میں بے مثال تھے، شمس الدین ابن فخر حنبلی فرماتے ہیں، وہ ماہر فن امام، زبردست حافظِ حدیث اور گوناگوں علوم میں پختہ تھے، انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں اور بڑے متقی وزاہد تھے، مرغوبات ولذائذ سے بالکل دست کش ہو گئے اور معمولی پیوند لگے کپڑے پہنتے تھے، علامہ ابن سبکی نے شیخ، علامہ، شیخ الاسلام، متاخرین کے استاذ، اللہ کی حجت وبرہان، طریقۂ اسلاف کے داعی اور سید وحصور کے شاندار القاب سے ان کا تعارف کرانے کے بعد لکھا ہے کہ وہ مختلف علوم فقہ، متن حدیث، اسماء الرجال اور لغت وصرف وغیرہ کے جامع تھے، یافعی ان کے کمالات کا ان الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں ''شیخ الاسلام المحقق، المدقق، النجیب، الحبر، المفید، گوناگوں فضائل ومحاسن کے جامع، علوم میں متبحر، حدیث، فقہ اور لغت میں واسع المعرفت عالم وفاضل، یگانہ، ولی کبیر، سید شہیر، تمام معاصرین سے فائق وبرتر، ہرسو اُن کے محاسن کا چرچا اور فضائل کی شہرت ہے، ابن کثیر ان الفاظ میں ان کی ثنا خوانی کرتے ہیں، شیخ محی الدین علامہ وقت، مذہب شافعی کے شیخ اور اپنے زمانہ کے جلیل القدر فقیہ اور زہد واتقاء میں بے مثال تھے، ابن عماد اور ابن ہبۃ اللہ لکھتے ہیں'' وہ نامورانِ اسلام اور عظیم الشان لوگوں میں تھے، انھوں نے کئی سال تک اس قدر ذوق وشوق اور ایسے غیر معمولی انہماک اور دلچسپی سے علم وفن کی تحصیل کی کہ اپنے تمام اہل زمانہ اور معاصرین سے آگے ہو گئے تھے، طاش کبریٰ زادہ لکھتے ہیں، نووی اپنے زمانہ کے امام اور فاضل وعالم تھے، حافظ سید مرتضیٰ زبیدی رقمطراز ہیں، شیخ الاسلام استاذ المتأخرین بعد کے لوگوں پر اللہ کی حجت وبرہان، اپنے زمانے کے قطب، سید دوراں اور اللہ کی مخلوقات کے درمیان اس کا راز تھے۔ (۱)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۵۹، ۲۶۳، ۲۶۴، طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۶۶، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

فقہی مذہب اور انصاف پسندی: جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، وہ شافعی المذہب تھے، ان کا شمار اس مذہب کے اساطین اور اکابر میں ہوتا ہے، ان کے مزاج میں حق پسندی اور انصاف تھا، اس لیے ان کو اپنے مذہب کے علماء سے اختلاف کرنے اور دوسرے مذہب کے ائمہ کے اقوال نقل کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہوتا تھا۔

عقیدہ و مسلک: وہ سلف صالحین اور اہلِ سنت والجماعت کے مذہب پر سختی سے عمل پیرا تھے، حدیث وسنت کی اتباع اور سلف کے مسلک کی ہم نوائی اور اس کی دعوت وتلقین ان کا اصلی طغرائے امتیاز تھا، ابن سبکی و یافعی کا بیان ہے کہ ''طریقۂ اسلاف کے داعی اور متقدمین اہلِ سنت والجماعت کے متبع تھے۔(۱)

خلوت پسندی: وہ طبعاً خلوت پسند تھے، زہد وتقشف اور دنیا بیزاری نے ان کو اور زیادہ عزلت گزیں بنا دیا تھا، جلوت سے نفرت تھی، اور ہجوم وازدحام قطعاً پسند نہیں کرتے تھے، زندگی تجرد میں گذاری، اور شادی نہیں کی، اس لحاظ سے وہ اپنے ہم نام پیغمبر حضرت یحییٰؑ کے مثنیٰ تھے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں ''امام نووی سید وحصور تھے۔''(۲)

وفات: ۴۵ سال کی عمر میں چہارشنبہ ۲۴ رجب ۶۷۶ھ کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے وطن میں دفن کئے گئے، ان کی قبر ایک زمانہ میں زیارت گاہ تھی، متعدد شعراء نے ان کے مرثیے کہے ہیں۔(۳)

تصنیفات: امام نووی نے اگرچہ کم عمر پائی تھی، مگر اللہ نے ان کے علمی کاموں میں برکت دی، علاوہ ازیں وہ زندگی بھر علم وفن کی خدمت میں لگے رہے، اس لیے ان سے متعدد مفید،

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۸۵، البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۲۷۸، شذرات الذہب ج ۵ ص ۳۵۴، ۳۵۵، طبقات الشافعیہ ابن ہبۃ اللہ ص ۸۷ و تاج العروس۔

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۶۶ و مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۶۴ (۲) ایضاً (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۶۳ ۴ و مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۶ و مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۳۹۸۔

عمدہ اور بلند پایہ کتابیں یادگار ہیں، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں:

''اہل بصیرت سے یہ مخفی نہیں کہ امام نووی اور ان کی تصنیفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت اور توجہ شامل رہی ہے۔''

یافعی کا بیان ہے کہ ''امام نووی پر خدا کی برکتیں ان کی کتابوں کے ذریعہ ظاہر ہوئیں، چنانچہ ان سب کو بڑا قبول حاصل ہوا اور ہر ملک میں ان کی شہرت ہوئی اور لوگ ان سے خوب متمتع اور فیض یاب ہوئے۔''

طاش کبریٰ زادہ کا بیان ہے کہ ''نووی سے بے شمار مشہور اور بیش قیمت کتابیں یادگار ہیں اور فن حدیث میں ان کی کتابوں کی تعداد زیادہ ہے۔(۱)

امام نووی کی کتابوں کے ناموں کی فہرست اور بعض کا مختصر تعارف ملاحظہ ہو:

۱- التحقیق والترخیص فی الاکرام بالقیام لذوی الفضل والمزیۃ من اہل الاسلام

غالباً اسی کتاب کا نام الترخیص فی الاکرام بالقیام لذوی الفضل والمزیۃ من اہل الاسلام اور فضل القیام لاہل العلم والحدیث والزہاد والعباد والصلحاء والفقرا من اہل الاسلام بھی لکھا گیا ہے، یہ مصر میں چھپ گئی ہے۔(۲)

۲- بستان العارفین، ۳- تحفۃ الوالد وبغیۃ الرائد، ۴- خلاصۃ الاحکام فی مہمات السنن وقواعد الاسلام، ۵- روح المسائل فی الفروع: یہ دو متوسط جلدوں میں ہے، اس میں مسائل کی اصلوں اور دلائل کا ذکر ہے،(۳) ۶- غیث النفع فی القرآت السبع، ۷- مناقب الشافعی، ۸- عمل الیوم واللیلہ، اس میں اوراد ماثورہ کا بیان ہے۔(۴)

۹- مرآۃ الزمان فی تاریخ الاعیان: مختصر ہونے کے باوجود اس حیثیت سے اہم

---

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۶۷ و مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۵ و مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۳۹۸ (۲) معجم المطبوعات کالم ۱۸۷۷ (۳) کشف الظنون ج ۱ ص ۵۷۸ (۴) فہرست کتب خانہ پشاور ص ۵۵۔

ہے کہ اس میں ابتدائے آفرینش سے واقعات درج کیے گئے ہیں۔(۱)

۱۰- عیون المسائل المہمہ : یہی مجموعہ فتاویٰ یا فتاوی النووی کے نام سے بھی مشہور ہے، اس میں امام نووی سے جو فقہی سوالات کیے گئے تھے، ان کا جواب مذکور ہے، شیخ علی بن ابراہیم عطار دمشقی (م ۷۲۴ھ) نے اس کو فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے، امام نووی کی ترتیب میں فقہی ابواب کا لحاظ نہیں کیا گیا تھا، مصر اور حیدر آباد کے کتب خانہ آصفیہ میں قلمی نسخے موجود ہیں۔(۲)

۱۱- المنثورات وعیون المسائل المہمات: صاحب کشف الظنون کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عیون المسائل المہمہ کے بجائے ایک مستقل کتاب ہے۔(۳)

۱۲- طبقات الشافعیہ علامہ ابن صلاح کی کتاب طبقات الشافعیہ کا مختصر ہے مصنف نے اس میں کسی قدر اضافے بھی کیے ہیں۔(۴)

۱۳- الاصول والضوابط فی المذہب: ان اہم فقہی اصول وقواعد اور مفید مطالب ومقاصد پر مشتمل ہے، جو اس فن کے طلبہ کے لیے ضروری ہیں۔(۵)

۱۴- الارشاد فی علوم الحدیث: یہ اصول حدیث میں ہے اور علامہ ابن صلاح کی مشہور و معتبر کتاب مختصر علوم الحدیث کا خلاصہ ہے، اس کی مندرجہ ذیل شرحیں لکھی گئیں۔

۱- شرح علامہ ابن ابی شریف المقدسی، ۲- شرح برہان جوہری، ۳- شرح ابوالقاسم انصاری۔(۶)

۱۵- التقریب والتیسیر فی مصطلح الحدیث: یہ کتاب الارشاد کا مختصر ہے، اسی لیے اس کا نام تقریب الارشاد بھی ہے، اس کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔

۱- حافظ زین الدین عبدالرحیم بن حسین عراقی (م ۸۰۶ھ) کی شرح۔

(۱) الکشف الظنون ج ۲ ص ۲۱۳ (۲) ایضاً ص ۴۵، وتذکرۃ النوادر ص ۴۲ و ۴۳ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۵۴۲ (۴) ایضاً ص ۹۲ واعلام ج ۳ ص ۱۱۵۰ (۵) کشف الظنون ج ۱ ص ۱۱۷ (۶) ایضاً ص ۸۷۔

۲- برہان الدین ابراہیم بن محمد حلبی (م ۸۵۱ھ) کی شرح۔

۳- شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی (م ۹۰۲ھ) کی شرح۔

۴- شیخ عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی (۹۱۱ھ) نے تدریب الراوی کے نام سے شرح لکھی، یہ بہت مشہور و متداول اور گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے، سیوطی نے اس کے علاوہ التذنیب فی الزوائد علی التقریب بھی لکھی۔(۱)

۱۶- الاشارات الی بیان اسماء المبہمات: خطیب بغدادی کی کتاب کا خلاصہ ہے، نووی نے حدیثوں کے اسناد حذف کر کے اس میں بعض اضافے کیے ہیں اور اس کو صحابہ کے ناموں کے اعتبار سے حروف معجم پر مرتب کیا ہے، خطیب کی کتاب کے مقابلہ میں اس سے استفادہ سہل ہے، اس میں متنِ حدیث کے مبہم ناموں کا ذکر ہے۔(۲)

۱۷- الایضاح فی المناسک۔ یہ آٹھ ابواب پر مشتمل اور ابن صلاح کی مبسوط کتاب المناسک کا خلاصہ ہے، تاہم اس میں مناسک کے جملہ ضروری مسائل و مقاصد کا ذکر آ گیا ہے، البتہ دلائل حذف کر دیئے گئے ہیں، رجب (۶۶۷ھ) میں وہ اس کی تالیف و تصنیف مکمل کر چکے تھے، نورالدین علی سمہودی نے اس کی شرح لکھی تھی، بعض اہل سیر نے مناسک میں نووی کی تین اور بعض نے چار کتابیں بتائی ہیں۔(۳)

۱۸- شرح البخاری: اس کو وہ صرف کتاب الایمان ہی تک لکھ سکے تھے، شرح صحیح مسلم میں اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں "میں نے شرحِ بخاری مین گوناگوں معلومات جمع کیے ہیں، یہ مختصر ہونے کے باوجود مفید و متنوع علوم و فوائد پر مشتمل ہے۔(۴)

۱۹- کتاب التبیان: یہ دس ابواب میں ہے، اس کا نام التبیان فی آداب حملۃ القرآن بھی ہے، اس میں قرآن کی تلاوت کے فضائل، قرأت و تجوید کے آداب، قرآن

(۱) کشف الظنون ص ۳۱۸ والرسالۃ المستطرفہ ص ۴۷ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۱۰۴ و ج ۲ ص ۱۸۶
(۳) ایضاً ج ۲ ص ۱۸۶ (۴) مقدمہ شرح مسلم للنووی ص ۴۔

واہلِ قرآن کی عظمت وجلالت، معلم ومتعلمِ قرآن کے آداب اور قرآنی الفاظ کے ضبط وتحقیق وغیرہ کے گوناگوں مسائل ومباحث بیان کیے گئے ہیں، مصنف نے مختصر البیان یا مختار البیان کے نام سے اس کا خلاصہ اور شیخ محمد بن محمد ابوسعید ایجی نے حدیقۃ البیان کے نام سے فارسی ترجمہ کیا تھا،(۱) احمد بن عبدالکریم اشمونی کی کتاب منارالہدیٰ فی بیان الوقف والابتدا کے حاشیہ پر یہ کتاب ۱۳۰۷ھ میں قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے۔

۲۰- مقاصد النووی: توحید، عبادت اور تصوف پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، ۱۳۲۴ھ میں بیروت سے اور پھر مصر سے شائع ہوا ہے۔(۲)

۲۱- ریاض الصالحین: ترغیب وترہیب اور زہد وریاضتِ نفس سے متعلق صحیح حدیثوں کا مختصر مجموعہ ہے،(۳) معتبر اور مفید ہونے کی وجہ سے اس کو بڑی شہرت نصیب ہوئی اور یہ مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

۲۲و۲۳- التحریر فی شرح التنبیہ: یہ شیخ ابواسحاق ابراہیم بن محمد شیرازی، (م ۴۷۶ھ) کی کتاب التنبیہ کی شرح ہے، التنبیہ فروع وجزئیات پر مشتمل اور فقہِ شافعی کی پانچ مشہور ومتداول کتابوں میں ہے،(۴) اس کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں، امام نووی نے دو شرحیں لکھی تھیں جو اہم ہیں، ایک میں مفتیٰ بہ اور متروک مسائل کی توضیح اور مصنف کے غلط بیانات کی تصحیح کی گئی ہے اور دوسری میں الفاظ ولغات کے ضبط وحل کی جانب خاص توجہ کی گئی ہے، غالبًا اسی لیے اس کو تصحیح التنبیہ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، امام نووی نے اس میں تنبیہ کی حدیثوں کے مفید نکات بھی بیان کیے ہیں، دوسری شرح ۱۳۲۹ھ میں مصر سے کتاب التنبیہ کے حاشیہ پر شائع ہو چکی ہے۔(۵)

---

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۲۴۶ (۲) معجم المطبوعات کالم ۱۸۷۸ (۳) ایضاً (۴) تنبیہ کے قلمی نسخے لیڈن اور آکسفورڈ میں موجود ہیں اور ۱۸۷۹ء میں لیڈن سے جوینبول کے اہتمام میں چھپ چکی ہے، اکتفاء القنوع ص ۱۵۵ (۵) ملاحظہ ہو مقدمہ شرح ص ۲۔

۲۴-شرح المہذب: یہ بھی امام ابواسحاق شیرازی کی مشہور اور عظیم الشان کتاب المہذب فی الفروع کی شرح ہے، المہذب کی اہمیت کی بنا پر اکثر فقہا نے اس کی جانب اعتنا کیا اور شرحیں لکھیں، امام نووی کی شرح گونا مکمل ہے تاہم احکام و مسائل میں یہ بڑی جامع اور پراز معلومات ہے، امام نووی نے شرح مسلم میں جا بجا اس کا حوالہ دیا ہے، علامہ ابن کثیر کا بیان ہے کہ مصنف نے اس میں غیر معمولی جدت واختراع اور نقد و تحقیق سے کام لیا ہے، غریب الفاظ کی تحقیق، فقہی وحدیثی معلومات اور گوناگوں دوسرے اہم امور ومسائل ایسے جمع کر دیئے ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتے، مجھے اس سے بہتر فقہی کتاب کا علم نہیں، امام نووی نے ایک علاحدہ جز میں اس کی حدیثوں کی تلخیص بھی کی تھی، یہ الخلاصہ فی الحدیث کے نام سے موسوم ہے۔(۱)

۲۵-اربعین: اس حدیث کے بموجب جس میں چالیس حدیثوں کے جمع کرنے کی فضیلت وارد ہے، اکثر محدثین نے چالیس حدیثوں کے مجموعے مرتب کرنے کی جانب اعتنا کیا ہے، گو یہ روایت پایۂ اعتبار سے ساقط ہے تاہم فضائل وترغیبات میں توسع کی بنا پر اس نوعیت کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں اور اربعییات بھی کتب حدیث کی ایک مشہور قسم ہے۔

مختلف علما نے مختلف اغراض ومقاصد کے تحت اربعییات مرتب کیے ہیں، بعض نے توحید وصفات الٰہی کی چالیس حدیثوں کو جمع کیا، بعض نے اصول ومہماتِ دین کی روایتیں اکٹھا کیں، بعض نے جہاد کی اور بعض نے زہد ومواعظ اور بعض نے آداب واخلاق اور فضائلِ اعمال وغیرہ کے متعلق چالیس حدیثیں جمع کیں، امام نووی نے اپنی اربعین میں ان سب امور کا لحاظ رکھا ہے، اس لیے ان کا مجموعہ اربعین ان گوناگوں اغراض وامور کا جامع ہے، نووی کا خود بیان ہے:

علی جمیع ذالك وكل حديث — یہ چالیس حدیثیں ان سب امور کو شامل

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۵۷۵؛ البدایہ ج ۱۳ ص ۲۷۹ و شذرات الذہب ج ۵ ص ۳۵۶۔

منها قاعدة عظيمة من قواعد الدين۔	ہیں اور ان میں سے ہر ہر حدیث دین کے کسی عظیم الشان قاعدہ پرمبنی ہے

امام نووی نے اپنی اربعین میں صحیح وثابت حدیثوں ہی کو جمع کرنے کا التزام کیا ہے، ان کی اکثر روایات صحیح بخاری وصحیح مسلم سے ماخوذ ہیں، اختصار کے خیال سے سندیں حذف کردی ہیں اور چالیس کے بجائے بیالیس حدیثوں پر مشتمل ہے۔

اربعین نووی کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس کی بے شمار شرحیں لکھی گئی ہیں، ایک شرح خود انھوں نے بھی لکھی تھی، (۱) اس کا قلمی نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں ہے، (۲) دوسری شرحوں اور ان کے شارحین کے نام یہ ہیں:

۲- امام زین الدین عبدالرحمٰن بن احمد المعروف بابن رجب بغدادی حنبلی متوفی ۹۵۰ھ نے ایک طویل شرح لکھی اس کا نام جامع العلوم والحکم ہے۔

۳- نجم الدین سلیمان بن عبدالقوی طوفی حنبلی (م ۷۱۰ھ) کی شرح۔

۴- تاج الدین عمر بن علی فاکہی (م ۷۳۱ھ) کی شرح۔

۵- جمال الدین یوسف بن حسن بن محمود سرائی اشبیلی (م ۶۹۹ھ) کی شرح۔

۶- ابوحفص عمر البلبیسی شافعی کی شرح فیض المعین کے نام سے موسوم ہے۔

۷- برہان الدین ابراہیم بن احمد خجندی (م ۸۵۱ھ) کی شرح۔

۸- شہاب الدین احمد بن محمد ابی بکر الشیرازی الکازرونی کی ممزوج شرح کا نام ہادی المسترشدین ہے۔

۹- شیخ زین الدین سریجا بن محمد ملطی (م ۷۸۸ھ) کی شرح نشر فوائد الاربعین النوویہ، چار جزوں میں ہے۔

۱۰- شیخ ولی الدین کی شرح کا نام الجواہر البہیہ ہے۔

---

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۸۰ (۲) فہرست کتب عربیہ ج ۲ ص ۱۰۹۔

۱۱- حافظ مسعود بن منصور بن امیر سیف الدین عبداللہ علوی کی شرح کا نام الکافی ہے، یہ ممزوج شرح ہے۔

۱۲- معین بن صفی کی شرح مختصر ہے۔

۱۳- مصلح الدین محمد سعدی عبادی (م ۹۷۹ھ) نے وزیر علی پاشا کے لیے ایک شرح مرتب کی تھی۔

۱۴- شہاب الدین احمد بن حجر ہیثمی مکی (۹۷۳ھ) کی ممزوج شرح فتح المبین کے نام سے مشہور ہے اور قاہرہ سے ۱۳۰۷ھ میں چھپی ہے، اس پر حسن علی مدابغی کا حاشیہ ہے۔

۱۵- نور الدین محمد بن الایجی کی شرح سراج الدین الطالبین ومنہاج العابدین فارسی میں ہے۔

۱۶-۱۷- ملا علی قاری: (م ۱۰۴۴ھ) نے دو شرحیں لکھیں، ان میں ایک نہایت مبسوط، جامع اور گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے، صاحب کشف الظنون نے اس کو سب میں بہتر اور عمدہ شرح بتایا ہے۔

۱۸- شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن شافعی (۸۰۴ھ) کی شرح۔

۱۹- شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی (م ۸۵۳ھ) نے اربعین نووی حدیثوں کی تخریج کی تھی۔(۱)

۲۰- ابراہیم بن مرعی بن عطیہ الشبر خیتی مالکی کی شرح الفتوحات الوہبیہ قاہرہ سے ۱۳۰۷ھ میں شائع ہوئی۔(۲)

۲۱- علامہ عبدالہادی بن عبداللہ بن احمد کی شرح کا قلمی نسخہ رام پور میں ہے، یہ ۱۱۹۹ھ کا لکھا ہوا ہے،(۳) اربعین نووی بولاق سے ۱۲۹۴ھ میں چھپی ہے اور مصر سے بھی شائع ہوئی ہے، مصری ایڈیشن میں شیخ ہاشم شرقاوی کی شرح بھی ہے۔(۴)

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۸۰ و ۸۱ (۲) اکتفاء القنوع ص ۱۳۱ و ۱۳۲ (۳) فہرست عربیہ مجلد دوم ص ۱۷۴
(۴) معجم المطبوعات العربیہ جلد ۲ کالم ۱۸۷۷۔

۲۴- کتاب الاذکار: کتاب الاذکار المنتخب من کلام سید الابرار امام نووی کی مفید اور مشہور کتابوں میں ہے، یہ ایک جلد میں ساڑھے تین سو سے زیادہ ابواب پر مشتمل ہے، اس میں حدیث کی کتابوں سے شب وروز کے اشغال واذکار اور دعائیں نقل کی گئی ہیں، ابتدا میں چند اہم اور ضروری فصلیں ہیں، ان میں اخلاص عمل اور حسن نیت کی اہمیت کا تذکرہ اور بطور تمہید اذکار کے عام اور مطلق فضائل بیان کئے گئے ہیں، پھر اصل کتاب اور خاتمہ پر استغنا کا بیان ہے، سب سے آخر میں تیس اہم حدیثیں درج ہیں۔

امام نووی نے احادیث وروایات سے اذکار وادعیہ نقل کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ان سے متعلق آیتیں اور متقدمین کے اقوال بھی نقل کیے ہیں۔

اس موضوع پر پہلے جو کتابیں لکھی گئی تھیں، ان سے تکرار وطوالت وغیرہ کی بنا پر استفادہ آسان نہیں تھا، امام نووی نے تکرار وطوالت سے بچ کر اس کو عمدہ اور آسان پیرایہ میں اس جذبہ سے لکھا ہے کہ ان کے بقول:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (بقرہ:۱۵۱) سو مجھ کو یاد کرو تو میں تم کو یاد کروں گا۔

نیز دوسری جگہ ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَ. (ذاریات:۵۶) اور میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ بندہ کی سب سے عمدہ اور بہتر حالت وہی ہے جب وہ اللہ رب العالمین کو یاد کرتا اور ان اذکار واعمال میں مشغول رہتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وارد ہیں...... اس لیے میں نے یہ مختصر کتاب تالیف کی۔"(۱)

اس میں اختصار وسہولت کے خیال سے عموماً سندیں حذف کر دی گئی ہیں اور

(۱) کتاب الاذکار ص۲۔

حدیثوں کے حسن، ضعیف اور منکر ہونے کی نشاندہی کر دی گئی ہے اور کم علم و واقفیت رکھنے والوں کی رعایت سے غیر معروف صحابہ کے صحابی ہونے کی تصریح کر دی گئی ہے، نیز علم حدیث کے عمدہ مسائل، فقہی مباحث اور اہم اصول و آداب وغیرہ اس قدر واضح انداز میں لکھے گئے ہیں کہ عوام اور اہلِ علم وفقہ سب کے لیے ان کی معرفت آسان ہوگئی ہے۔

کتاب الاذکار کی زیادہ حدیثیں صحاح خمسہ (صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داؤد، ترمذی ونسائی) سے ماخوذ و مستنبط ہیں، اجزاء و مسانید وغیرہ میں موطاء امام مالک، مسند احمد بن حنبل، مسند ابی عوانہ، سنن ابن ماجہ، دارقطنی و بیہقی کی حدیثیں بھی کہیں کہیں نقل کی گئی ہیں اور صحاح کی ضعیف روایتیں بھی شاذ و نادر آگئی ہیں، مگر ضعیف کی تصریح کے ساتھ، اس لیے صحت، وثوق اور اعتبار وغیرہ کی حیثیت سے کتاب الاذکار کا پایہ بلند ہے۔

اس کی حسب ذیل شرحیں لکھی گئیں:

[۱] الفتوحات الربانیۃ علی الاذکار النوویہ۔ یہ شیخ محمد بن علی محمد بن علان مکی شافعی (م ۱۰۵۷ھ) کی شرح ہے۔

[۲، ۳] اذکار الاذکار۔ شیخ جلال الدین سیوطی کی تلخیص اور دو کراسوں کے بقدر ہے، اس خلاصہ کی سیوطی نے شرح بھی لکھی تھی۔

[۴] تحفۃ الابرار بنکت الاذکار: یہ بھی سیوطی کی تالیف ہے۔

[۵] مختصر الاذکار: شیخ شہاب الدین احمد بن حسین رملی (م ۸۴۴ھ) کی تصنیف ہے۔

[۶] اتحاف الاخبار فی نکت الاذکار: یہ تعلیق شمس الدین محمد بن طولون دمشقی کی ہے۔

[۷] اذکار کے فارسی ترجمے بھی کیے گئے، ایک ترجمہ ۶۷۷ھ کا کیا ہوا ہے، اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں۔(۱)

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۴۵۲۔

۲۵-تہذیب الاسماء واللغات: اس میں ان اسماء واعلام کے الفاظ ولغات کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے، جو مندرجہ ذیل چھ کتابوں میں مذکور ہیں، ۱-مختصر مزنی، ۲-مہذب، ۳-تنبیہ، ۴-وسیط، ۵-وجیز، ٦-اور روضہ۔

مزید افادہ کے خیال سے مصنف نے بعض ایسے ناموں اور لفظوں کا ذکر بھی کر دیا ہے جو ان کتابوں میں موجود نہیں ہیں، یہ کتاب دو قسموں میں ہے، پہلی میں اسماء اور دوسری میں لغات واماکن کا ذکر ہے، اس اعتبار سے پہلی قسم کی حیثیت ابتدائی اسلامی عہد کے مشاہیر واصحابِ کمال کے سیر وتراجم کی اور دوسری قسم کی نوعیت لغوی قاموس کی ہے۔

دونوں قسموں کو حروف معجم پر مرتب کیا گیا ہے، مگر قسم اول میں تبرک کے خیال سے محمد نام کے لوگوں کا پہلے ذکر کیا گیا ہے، اس قسم میں ذکور واناث کا علاحدہ علاحدہ ذکر ہے، اسی طرح جو لوگ کنیتوں یا انساب وقبائل کی نسبتوں سے مشہور ہیں، ان کا بھی ناموں سے الگ ذکر کیا گیا ہے۔

اسماء والفاظ کی حرکات وغیرہ کو ضبط کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

تہذیب الاسماء واللغات بڑی تحقیق سے لکھی گئی ہے اور اس میں مندرج تمام چیزیں معتبر ومستند کتابوں سے ماخوذ ہیں، گو مصنف نے مشہور باتوں اور عام اقوال کے حوالے تو نہیں دیے ہیں مگر غیر معروف اور غریب اقوال کے حوالے دیدیے ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب وتالیف میں تاریخ، طبقات، رجال، تراجم، انساب، مغازی، سیر، تفسیر، حدیث اصول وشروح حدیث، فقہ وکلام، لغت وادب اور صرف واشتقاق وغیرہ گوناگوں فنون کی کتابوں سے مدد لی ہے، ان میں سے اکثر کتابوں کا اس کے دیباچہ میں ذکر بھی ہے، اس لیے یہ عظیم فوائد ومطالب اور گوناگوں مسائل ومباحث کا مجموعہ ہے اور اس میں رجال وطبقات اور لغت کے علاوہ حدیث وتفسیر وغیرہ متعدد علوم بھی شامل ہوگئے ہیں۔

تہذیب الاسماء کی دونوں قسمیں مصر کے مطبع منیریہ نے دو، دو جزوں میں شائع کی ہیں اور اہل علم نے نووی کی بعض اور کتابوں کی طرح اس کی جانب بھی اعتنا کیا ہے، ملاحظہ ہو:

[۱، ۲] شیخ کمال الدین محمد بن محمود حنفی (م ۷۸۶ھ) اور شیخ محی الدین عبدالقادر بن محمد قرشی حنفی (م ۷۷۵ھ) نے اس کو نئے ڈھنگ اور انداز پر مرتب کیا ہے۔

[۳، ۴] شیخ عبدالرحمٰن بن محمد بسطامی نے الفوائد السنیہ کے نام سے تلخیص اور شیخ جلال الدین سیوطی نے اس کا مختصر لکھا۔(۱)

۲۶-الروضہ: یہ فقہی فروع وجزئیات پر مشتمل ہے، بعض مصنفین نے اس کا نام روضۃ الطالبین وعمدۃ المتقین فی الفروع لکھا ہے، اس میں رافعی کی وجیز کی شرح وتلخیص کی گئی ہے، یہ کتاب بڑی اہم اور شوافع میں نہایت مقبول ہے، اس کی جانب بڑا اعتنا کیا گیا ہے، صاحب کشف الظنون نے اس کی دو درجن سے زیادہ شروح ومختصرات اور حواشی کا ذکر کیا ہے۔

۲۷-منہاج الطالبین وعمدۃ المفتین: محرر، امام ابوالقاسم عبدالکریم بن محمد رافعی قزوینی (م ۶۲۳ھ) کی فروع شافعیہ میں نہایت مشہور ومقبول اور بڑی معتبر ومستند کتاب خیال کی جاتی ہے، امام نووی کی یہ کتاب اس کا مختصر ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "ہمارے ہم مسلک علما نے متعدد کتابیں لکھی ہیں لیکن محرر کا متن گوناگوں فوائد کا حامل اور تحقیق مذہب کے باب میں نہایت معتبر ومستند ہے مگر اس کا حجم اس قدر زیادہ ہے کہ موجودہ زمانے کے تن آسان اور سہولت پسند لوگوں کے لیے اس سے استفادہ آسان نہیں تھا، اس لیے میں نے اس کا مختصر لکھا جو اصل کتاب کے نصف کے بقدر ہے، میں نے اس میں بعض مفید اور عمدہ مسائل ومباحث کا اضافہ بھی کیا ہے۔"(۲)

---

(۱) کشف الظنون ص ۴۵۰ والرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۶۷ (۲) کشف الظنون ج ۳ ص ۵۵۰ تا ۵۵۲۔

منہاج بڑی اہم کتاب ہے اور یہ شوافع میں مشہور و متداول بھی ہے، اس کی جانب بڑا اعتنا کیا گیا اور پچاس سے زیادہ شرحیں اور حواشی لکھے گئے۔

۲۸- شرح صحیح مسلم: اس کا اصل نام المنہاج شرح صحیح مسلم ہے مگر یہ شرح صحیح مسلم کے نام سے مشہور اور علامہ نووی کی سب سے اہم اور شہرہ آفاق تصنیف ہے، صحیح مسلم کی متعدد شرحیں لکھی گئیں مگر ان میں سے کوئی بھی شہرت و مقبولیت اور اعتبار و وثوق کے لحاظ سے اس کے ہم پایہ نہیں، شوافع میں جو علما و محدثین حدیث کی شرح و تحقیق میں بے نظیر خیال کیے جاتے ہیں، ان میں ایک علامہ نووی بھی ہیں، ان کی یہ شرح نہ مطول و مفصل ہے اور نہ بہت مختصر و مجمل، بلکہ متوسط ہے، اس کے شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں صحیحین خصوصاً صحیح مسلم کی اہمیت و خصوصیت، امام مسلم کی حدیث میں عظمت و بلند پائیگی، غیر معمولی احتیاط و کاوش اور دقتِ نظر وغیرہ کے علاوہ اصول روایت اور فن حدیث کے مباحث و مصطلحات تحریر کیے گئے ہیں، اس شرح کی بعض اہم خصوصیات یہ ہیں:

۱- یہ متوسط اور جامع شرح ہے، اس لیے حشو و زوائد اور تکرار و اطناب سے خالی اور فنی نکات و متنوع مطالب و حقائق اور مختلف احکام و آداب، نیز حدیث سے مستنبط ہونے والے مفید مسائل و مباحث پر مشتمل ہے۔

۲- یہ تحریر و تصنیف کی خوبی و دلکشی سے بھی معمور ہے، عبارت میں سلاست و روانی اور پیرایۂ بیان میں دلآویزی ہے۔

۳- جو حدیثیں بظاہر مختلف و متضاد نظر آتی ہیں، ان میں جمع و تطبیق کی صورتیں بیان کی گئی ہیں اور سند و متن ہر ایک کے فرق و اختلاف کو دور کیا گیا ہے۔

۴- حدیثوں کے مصالح و حکم اور ان سے مستنبط احکام کے اسرار و علل بیان کیے گئے ہیں۔

۵- اسناد و رجال کی دقیق بحثیں، ان کے لطائف اور رواۃ کے متعلق گوناگوں

معلومات تحریر کیے گئے ہیں۔

۶- ایک حدیث کی شرح اسی نوعیت کی دوسری حدیثوں سے کی گئی ہے اور کہیں کہیں قرآن مجید کی آیتوں سے بھی مدد لی ہے اور دکھایا ہے کہ حدیث فلاں آیت کے موافق ہے، جن حدیثوں میں قرآن مجید کی آیات مذکور ہیں، ان کی شرحیں وتفسیر بھی کی ہے اوراس سلسلہ میں مفسرین کے آرا بھی تحریر کیے ہیں، الفاظ حدیث کی وضاحت کے لیے قرآنی آیات سے استدلال بھی کیا گیا ہے۔

۷- مشکل الفاظ کے ضبط وتحقیق، دقیق فقروں اور جملوں کی وضاحت اور کلام کے اسالیب وغیرہ کا ذکر بھی ہے۔

۸- متقدمین علما کے اقوال نقل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کا محققانہ جائزہ لے کر ان کی قوت وضعف اور صحت وسقم کی نشاندہی کی گئی ہے اور جو اقوال قوی ومرجح معلوم ہوئے ہیں ان کے وجوہِ ترجیح بھی تحریر کیے ہیں، امام نووی، ابن صلاح اور قاضی عیاض جیسے اکابرفن پر بھی جن کی کتابوں سے انھوں نے بڑا استفادہ کیا ہے، نقد وجرح کرتے ہیں اور محدثین وشارحین حدیث کے علاوہ فقہا اور دوسرے طبقہ وفن کے علما پر بھی انھوں نے نقد وتعقب کیا ہے، خود امام مسلم بھی ان کی گرفت سے نہیں بچ سکے ہیں، چنانچہ کہیں کہیں ان کے خیالات اور لغوی وفنی مسامحات کا بھی ذکر کیا ہے۔(۱)

(۱) اس سے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اکابر علما اور امام مسلم وغیرہ کی عظمت کے قائل نہ تھے، بلکہ ان کو ان حضرات کی جلالتِ قدر کا پورا اعتراف تھا اور انھوں نے امام مسلم کی مہارت وحذاقتِ فن، دقتِ نظر اور حدیث میں احتیاط وحیقظ کی جابجا تحسین کی ہے، جمہور امت کی طرح وہ بھی امام بخاری کی عظمت اور ان کی صحیح کی تمام کتب حدیث میں برتری کے قائل ہیں، اس شرح میں انھوں نے جابجا صحیح بخاری کے افضل وبرتر ہونے کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کے نزدیک بعض مغاربہ کا خیال صحیح نہیں ہے کہ صحیح مسلم حدیث کی سب سے بہتر اور صحیح کتاب ہے مگر اس کے باوجود وہ یہ کہتے ہیں کہ ۔ (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

۹- حدیثوں کا مفہوم ایسے عمدہ اور دلنشیں پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ کوئی اشتباہ واشکال باقی نہیں رہ گیا ہے، امام نووی کی بحث کا طریقہ اور شرح کا انداز یہ ہے کہ پہلے وہ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ع : ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مجموعی حیثیت سے نہ سہی لیکن بعض حیثیتوں سے صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر ترجیح حاصل ہے، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> صحیح مسلم کی بعض منفرد اور امتیازی خصوصیات بھی ہیں، مثلاً سہل اور آسان ہونے کی وجہ سے استفادہ میں سہولت، امام مسلم ہر حدیث کو اس کے مناسب موقع ومحل اور موزوں جگہ پر بیان کرتے ہیں اور اس کے تمام مختار طرق، متعدد سندیں اور مختلف الفاظ وغیرہ بھی نقل کرتے ہیں، اس سے طالبینِ فن کے لیے اس کے تمام وجوہ پر نظر کرنا اور استفادہ سہل ہو گیا ہے، اس کے بر خلاف امام بخاریؒ مختلف وجوہ وطرق کو جدا جدا ابواب میں بیان کرتے ہیں اور اکثر حدیثیں ایسے ابواب میں لاتے ہیں جن کی طرف ذہن منتقل بھی نہیں ہوتا، گو اس سے ان کے پیش نظر ایک خاص غرض وحکمت ہوتی ہے، مگر طلبۂ حدیث کے لیے اس کے جملہ طرق کو جمع کرنا دشوار ہوتا ہے، اسی بنا پر متاخرین محدثین کی ایک جماعت کو غلط فہمی ہوئی، اور انھوں نے صحیح بخاری کی بعض حدیثوں کے بارہ میں یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ اس میں نہیں ہیں، حالانکہ وہ موجود ہوتی ہیں'' (مقدمہ بر شرح مسلم ص ۱۴، ۱۵)

نیز لکھا ہے کہ کوئی شخص بھی علم الاسناد کی ان دقیق باتوں میں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے امام مسلم کا شریک وسہیم نہیں ہے..... ان کی کتاب میں صنعت اسناد کی بعض ایسی خصوصیات ہیں جو اس کو صحیح بخاری سے بھی ممتاز کر دیتی ہیں۔''

جس طرح امام مسلم کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اس طرح جہاں ان کو امام مسلم پر کیے جانے والے اعتراضات غلط اور بے وزن معلوم ہوئے ہیں، ان کی پرزور تردید کر کے امام مسلم کے نقطۂ نظر کی حمایت کی ہے، اس سے ان کے زور استدلال اور نقد ونظر کی قوت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

زیر بحث ابواب کی روایتوں کے مختلف وجوہ وطرق نقل کر کے ان کے اور متن کے فرق واختلاف کی تصریح، رجال وروایت پر گفتگو، مشکل اسماولغات کی ضبط وتحقیق، راویوں کے مختصر حالات اورفن حدیث میں ان کا درجہ ومرتبہ واضح کرتے ہیں اور حدیث کے اہم نکات اوراس سے مستنبط ہونے والے احکام وآداب وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں، جن امور ومسائل میں اہل فن اورائمہ فقہ وحدیث کا نقطہ نظر مختلف ہوتا ہے، ان کے متعلق اختلافات ذکر کر کے دلائل وشواہد سے مختار ومرجح قول ومسلک کی نشاندہی کرتے ہیں۔

فن حدیث کے علاوہ اس میں اصول وشروح میں حدیث، فقہ واحکام، تفسیر وتاریخ، کلام وعقائد، سیر وتراجم، رجال وانساب، لغت وادب، صرف ونحو، اعراب وامالی اور قرأت وتجوید کے مسائل ومباحث بھی تحریر کیے گئے ہیں اوران میں سے ہر ہرفن کی کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں، فنی مباحث سے قطع نظر دوسرے امور ومسائل پر بھی نووی کی بحثیں محققانہ اور پرمغز ہوتی ہیں، یہ کتاب متعدد بار چھپ چکی ہے اوراس کے بعض خلاصے بھی لکھے گئے ہیں۔

بعض اعتراضات: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کو شافعیت میں غلو تھا، اس لیے وہ مذہب شافعی کو شرح میں زیادہ اہتمام سے نقل کرتے ہیں اوراسی کو قوی اور مرجح بھی قرار دیتے ہیں، مگرنووی کے حامیوں نے اس الزام کو سراسر غلط قرار دیا ہے، چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں:

منزہ بود از تعصب شافعیت ومتصف بانصاف ونقل می کرد در کتب خود از اقوال ابوحنیفہؒ۔	شافعی مذہب کی عصبیت سے پاک اور انصاف پسند تھے اوراپنی کتابوں میں امام ابوحنیفہؒ کے اقوال ومسالک بھی بیان کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے فقہی مذہب کا ذکر زیادہ اہتمام سے کرتے ہیں اور

عموماً اسی کو مرجح بھی ثابت کرتے ہیں، ممکن ہے زمانہ کے عام اثر کی وجہ سے ان میں یک گونہ عصبیت بھی رہی ہو تاہم ان میں رواداری اور حق پسندی بھی تھی، اس لیے وہ اپنے مرجح مسلک کے دلائل وشواہد بھی بیان کرتے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ ہی کسی مسلک کے قوی اور ضعیف ہونے کے قائل رہے ہوں گے، وہ دوسرے اربابِ مذہب اور ائمہ فقہ کے مسالک نقل کرنے سے اغماض بھی نہیں برتتے، مشہور فقہائے صحابہ وتابعین اور ائمہ ثلاثہ کے علاوہ انھوں نے فقہائے امصار کے مذاہب بھی نقل کیے ہیں، بلکہ ان کی وسیع النظری اور رواداری نے فرقِ ضالہ، خوارج، معتزلہ اور روافض کے مذاہب واقوال نقل کرنے سے بھی ان کو باز نہیں رکھا ہے، اس لیے وہ ان کے اقوال ذکر کر کے ان کی تردید کرتے ہیں۔

امام ابو محمد عبد المومن دُمیاطی

(متوفی ۷۰۵ھ)

نام و نسب: عبد المومن نام، ابو محمد کنیت، شرف الدین لقب اور نسب نامہ یہ ہے:

عبد المومن بن خلف بن ابی الحسن بن شرف بن خضر بن موسیٰ۔(۱)

ولادت و وطن: ۶۱۳ھ کے اواخر میں تونہ میں پیدا ہوئے اور دمیاط میں نشو و نما پائی،(۲) مگر بعض لوگوں نے ان کا مولد بھی دمیاط ہی بتایا ہے،(۳) اس لیے وہ تونی اور دمیاطی دونوں کہلاتے ہیں، تونہ، دمیاط اور تینس کے قریب ایک گاؤں کا نام ہے اور دمیاط ساحلِ سمندر کے کنارے مصر کا ایک بڑا مشہور اور سرسبز و شاداب شہر ہے، بعض لوگوں نے اس کا تلفظ دال مہملہ کے بجائے ذال معجمہ سے (ذمیاط) لکھا ہے، مگر یہ خود دمیاطی کی تصریح کے خلاف ہے اور علامہ سمعانی نے بھی اس کی تردید کی ہے۔(۴)

اساتذہ: دمیاطی کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ابن قمیرہ، ابن مسلمہ، ابن مقیر، ابوالقاسم بن رواحہ، ابونصر بن علیق، ابراہیم بن خیر، زکی الدین عبد العظیم منذری، صفیہ قرشی، ظافر بن شحم، عبد الخالق البسری، علم بن صابونی، علی بن زید انساری، علی بن مختار، عیسیٰ خیاطی، منصور بن دباغ،، موہوب بن جوالیقی، یوسف بن خلیل، یوسف بن عبد المعطی المحلی وغیرہ، حافظ زکی الدین منذری اور یوسف بن

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۴۰ وشذرات الذہب ج ۶ ص ۱۲ (۲) الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۱۷ (۳) بستان المحدثین ص ۹۳ (۴) ایضاً و کتاب الانساب ورق ۲۳۰

خلیل سے ان کو زیادہ اور خاص تعلق تھا۔(۱)

تلامذہ: تلامذہ کی تعداد بھی بے شمار ہے، چند کے نام یہ ہیں:

ابوالحسین یونینی ابوحیان اندلسی، شیخ تقی الدین سبکی، صاحب کمال الدین بن عدیم، قاضی علم الدین اخنائی، علم الدین برزالی، فتح الدین ابوالفتح بن سیدالناس یعمری، فخرالدین نویری قطب الدین عبدالکریم، شیخ محمد بن محمد ابیوردی، محی الدین نووی۔

دمیاطی کے تلامذہ کی فہرست میں ان کے معاصرین واقران اور بعض شیوخ بھی شامل ہیں، اور ان کے بعض تلامذہ جیسے شیخ ابیوردی اور ابن عدیم وغیرہ ان سے سن و سال میں کافی بڑے تھے، اور دمیاطی سے مدتوں پہلے ان کی وفات بھی ہوگئی تھی۔(۲)

طلب علم کے لیے سفر: دمیاط میں علم کی تحصیل کے بعد انہوں نے مصر، اسکندریہ، بغداد، حلب، حماۃ، ماردین حران، دمشق، عراق، حرمین، اور جزیرہ کا سفر کیا، عراق دوبار تشریف لے گئے، اور دمشق میں عرصۂ دراز تک قیام کیا۔

شوق علم: ان کو علم وفن سے انہماک و تعلق تھا اور اس کے لیے مشقت جھیل کر متعدد شہروں کا سفر کیا اور ابن خلیل اور صغانی کی بے شمار کتابیں لائے، انھوں نے علوم وفنون کی تحصیل کے بعد ان کی نشر و اشاعت کا کام بھی بڑی دلچسپی اور شوق سے انجام دیا۔(۳)

حفظ وثقاہت: ان کے ضبط وثقاہت، حفظ واتقان اور عدالت ودیانت پر سب کا اتفاق ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ”صدق ودیانت اور حفظ واتقان میں سرآمد روزگار تھے“ سیوطی کا بیان ہے کہ ”وہ حاذق، حافظ اور متقن تھے، ذہبی نے ان کو ”الحافظ الحجۃ“ ابن کثیر نے ”الحافظ الکبیر“ ابن حجر نے ”حافظ للحدیث“ اور یافعی وابن عماد نے ”حافظ الوقت“ کہا ہے، ابوالحجاج مزی فرماتے ہیں کہ ”میں نے حفظِ حدیث میں ان سے بلند پایہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۸ والدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۱۷ (۲) ایضاً (۳) تذکرہ ج ۴ ص ۲۶۸، الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۱۷ والبدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۴۰۔

شخص نہیں دیکھا۔" ابوحیان جب ان کے واسطہ سے کوئی روایت بیان کرتے تو کہتے کہ "ہم سے حافظ مشرق ومغرب نے روایت کی ہے۔"(۱)

حدیث میں درجہ ومرتبہ: حدیث میں دمیاطی کی بلند پائیگی اور عظمت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ سیوطی نے مصر کے اکابر حفاظ وناقدینِ حدیث میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور علامہ ذہبی نے ان کو شیخ المحدثین لکھا ہے، حافظ ابن کثیر نے ان کے کمالات گناتے ہوئے ان کے علوِ اسناد، کثرتِ روایت اور جودتِ درایت وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحب صاحبِ فوات کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ "علامہ دمیاطی کثرتِ روایت اور حسنِ مذاکرہ وغیرہ میں ممتاز تھے۔" برزالی کا بیان ہے کہ "وہ بلند پایہ اصحابِ روایت ودرایت اور نامور حفاظ ومحدثین میں آخری شخص تھے۔" صاحبِ شذرات نے ان کو "بقیۃ نقاد الحدیث" بتایا ہے، حافظ ابن حجر حدیث میں ان کی امامتِ فن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس فن میں ان کے کمالِ پختگی، تبحر اور عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ وہ حدیثوں کی طلب وجستجو اور جمع وتخریج کرنے کے بعد مسند درس پر متمکن ہوئے اور اپنے شیوخ واساتذہ کی زندگی ہی میں درس واملا کرانے لگے تھے اور ان کے رفقا ومعاصرین کی ایک بڑی تعداد نے ان سے حدیثیں لکھی اور روایت کی ہیں۔(۲)

فقہ: تفقہ واجتہاد میں ممتاز اور اکابر فقہائے شافعیہ میں شمار کئے جاتے تھے، تمام مورخین نے ان کے فقہی کمالات اور اجتہادشان کا ذکر کیا ہے، انہوں نے پہلے اپنے وطن میں اس فن کی تحصیل کی اور اس میں مہارت بہم پہنچانے کے بعد علم حدیث کی جانب اعتنا کیا، مزی کا بیان ہے کہ ان کا مطالعۂ فقہ اور فقہی معلومات وسیع تھے۔(۳)

---

(۱) البدایہ ج ۱۴ص ۴۰ وحسن المحاضرہ ج ۱ص ۱۵۰ وبستان المحدثین ص ۹۳ (۲) تذکرۃ ج ۴ص ۲۶۸ والدرر الکامنہ ج ۲ص ۴۱۷ والبدایۃ والنہایہ ج ۱۴ص ۴۰ وحسن المحاضرہ ج ۱ص ۱۵۰ وبستان المحدثین ص ۹۳ (۳) ایضاً۔

قرأت: علوم قرأت وتجوید میں بھی درک رکھتے تھے اور قراآتِ سبعہ کے ماہر تھے، ان کی تحصیل مشہور صاحب فن کمال ضریر سے کی تھی، صاحب فوات کا بیان ہے کہ وہ مقری سریع القرأۃ اور مجود بارع تھے۔(۱)

نحو، لغت وعربیت: ان کو نحو، لغت اور عربیت میں بھی عبور حاصل تھا، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ عربیت میں صاحبِ کمال وجید اور الفاظ ولغات کے وسیع النظر عالم تھے، صفدی کا بیان ہے کہ ''وہ لغوی، نحوی اور فصیح تھے۔''(۲)

انساب: نسب دانی میں بھی معروف وممتاز تھے، مورخین نے ان کو النسابہ اور رأس فی النسب لکھا ہے، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ ''علم انساب میں علامہ دمیاطی متقدمین پر فوقیت رکھتے تھے۔''(۳)

شعروسخن: نثر کی طرح اقلیم شعروسخن کے تاجدار بھی تھے، علم حدیث کی فضیلت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

علم الحدیث له فضل ومنقبة — نال العلاء به من کان معتنیا

علم حدیث کی بڑی فضیلت واہمیت ہے، اس کی جانب اعتنا کرنے والا بلندی سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔

ماحازہ ناقص الاوکمله — او حازہ عاطل الا به حلیا

ناقص اور زیورِ کمال سے عاری شخص بھی اس کی جمع وتدوین کر کے کامل اور مزین ہو جاتا ہے۔

کتاب وسنت کے علم کی برتری اور منطق وکلام کی مذمت میں فرماتے ہیں:

وماالعلم الافی کتاب وسنة — وما الجهل الافی کلام ومنطق

---

(۱) تذکرج ۴ص ۲۶۹ والدررالکامنہ ج ۲ص ۴۱۸ واتحاف النبلا ص ۳۰۸ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۹ والدررالکامنہ ج ۲ص ۴۱۸ واتحاف النبلا ص ۳۸۰ (۳) الدررالکامنہ وحسن المحاضرہ ج ۱ص ۱۵۰

علم صرف کتاب وسنت کے اندر ہے، اور کلام ومنطق تمام تر جہالت کا نام ہے۔

وماالخیر الا فی سکوت بحسبة   وماالشر الافی کلام ومنطق (۱)

بھلائی اس خاموشی میں ہے جو نیکی کے خیال سے اختیار کی جائے اور شر وفساد گفتگو اور گویائی میں ہے۔

جامعیت: غرض وہ علامۂ دہر اور مختلف علوم وفنون کے ماہر د جامع تھے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''وہ مختلف چیزوں میں یگانہ ویکتا اور بے مثل تھے'' اور صفدی کا بیان ہے کہ ''وہ کثیر الفنون تھے'' ابن عماد لکھتے ہیں کہ ''ان کے کمالات نہایت متنوع اور گوناگوں تھے۔''(۲)

امامت ومرجعیت: ان گوناگوں کمالات اور مختلف علوم میں جامعیت نے ان کی شخصیت کو بڑی پُرعظمت اور نہایت جلیل القدر بنادیا تھا، اس لیے وہ مقبول ومرجعِ انام ہوگئے تھے اور امام ومقتدا کہلاتے تھے، ابن عماد کہتے ہیں کہ وہ ائمہ اعلام میں تھے، مزی کا بیان ہے کہ عالی قدر اور بلند پایہ تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''دور دراز علاقوں سے علم وفن کے شائقین اور طلبہ ان کی خدمت میں جوق در جوق آکر ان سے فیض یاب ہوتے تھے۔'' حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ ''وہ طلبۂ فن کے محبوب اور ہر دلعزیز اور بڑی محترم، باوقار اور پُر جلال شخصیت کے مالک تھے۔''(۳)

تدین وتقویٰ: علم وفضل کے ساتھ زہد واتقا اور تدین میں بھی ممتاز تھے، ان کی دیانت اور دینداری کا اہل سیر نے ذکر کیا ہے، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، اکثر روزہ رکھتے اور ابن کثیر کا بیان ہے کہ اسی حالت میں ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی تھی۔(۴)

---

(۱) الدرر الکامنہ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۰ (۲) بستان المحدثین ص ۱۳ (۳) شذرات الذہب ج ۶ ص ۱۲ والبدایہ ج ۱۴ ص ۴۰ وتذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۸ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۸ والدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۱۸ والبدایہ ج ۱۴ ص ۴۰۔

اخلاق وعادات: وہ بڑے خلیق، متواضع اور ہنس مکھ تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کی خوش خلقی، شرافتِ نفس، حسن اخلاق اور تواضع کا ذکر کیا ہے، (۱) ان کی مقبولیت ومرجعیت میں ان کی شرافت خوش معاملگی اور پاکیزہ خوئی کا بھی دخل تھا۔

لطافت وظرافت: مزاج میں خشکی اور تقشف نہ تھا، اس لیے مزاح وتفنن کی باتیں بھی کرتے تھے، ان کی خوش طبعی اور ظرافت کا ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ کسی مجلس میں تشریف لے گئے، لوگ حدیثیں پڑھ رہے تھے، کسی مقام پر عبداللہ ابن سلام کا نام آیا تو قاری نے اس کو سلام کی تشدید کے ساتھ پڑھا، دمیاطی نے فوراً کہا: سلام علیکم، سلام، سلام'' اس طرح قاری کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوگیا۔ (۲)

آسائش وفراغت: اللہ تعالیٰ نے ان کو فارغ البالی اور کشادگی عطا کی تھی اور وہ بعض اہم عہدوں پر فائز تھے۔ (۳)

فقہی مسلک: پہلے ذکر آچکا ہے کہ وہ اکابر شوافع میں شمار کیے جاتے تھے، لیکن ان کو اس مذہب میں غلو نہ تھا، بلکہ ان کے مزاج میں بڑی انصاف پسندی تھی، سنن شافعی کا وہ اکثر درس دیتے تھے، مگر ان کو اس کے متعلق یہ کہنے میں تامل نہ ہوتا کہ اس کے اکثر الفاظ صحیحین کی روایات کے مطابق نہیں ہیں، امام شافعیؒ کے مذہب ومسلک سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ دوسرے ائمہ کی عظمت واحترام کا پورا خیال رکھتے تھے، امام مالک کی مدح وتوصیف میں اس قدر رطب اللسان رہتے کہ بعض لوگ ان کو مالکی المذہب خیال کرتے تھے۔ (۴)

منطق وکلام سے نفرت وبیزاری: وہ نہایت راسخ العقیدہ مسلمان اور اہلسنت والجماعت کے مسلک کے ہمنوا تھے، اسی لئے منطق وکلام میں انہماک وتوغل کو سخت ناپسند

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ص ۲۶۸ والدررالکامنہ ج ۲ص ۴۱۸ والبدایہ ج ۱۴ص ۴۰ واتحاف النبلاء ص ۳۰۸

(۲) الدررالکامنہ ج ۲ ص ۴۱۸ وبستان المحدثین ص ۹۳ (۳) الدررالکامنہ ج ۲ ص ۴۱۸ وبستان المحدثین ص ۹۳ (۴) بستان المحدثین ص ۹۳۔

کرتے تھے، ان کے زمانہ میں عالم اسلام خصوصاً مصر میں یونانی علوم اور منطق وکلام کا طوطی بول رہا تھا اور کتاب وسنت کے بجائے انہی علوم کے مسائل ومباحث کی جانب لوگوں کی توجہ مرکوز ہوکر رہ گئی تھی، تاتاریوں کے حملہ اور سقوط بغداد کے بعد نصیر الدین طوسی اور ان کے تلامذہ نے منطق وفلسفہ کا غلغلہ اس قدر زور وشور سے بلند کیا کہ کتاب وسنت سے بُعد وبے گانگی بڑھنے لگی اور لوگ مذہب کے متعلق شک وتذبذب میں مبتلا ہونے لگے، عام محدثین وفقہا میں اس کے مقابلہ کی قوت نہ تھی، اس کی سرکوبی کے لیے اللہ نے اس صدی کے عظیم الشان عبقری، نامور مجتہد اور مجدد اعظم شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ ؒ کا انتخاب کیا، جنھوں نے یونانی حکمت وفلسفہ کی مدلل تردید وتنقید کو اپنا خاص موضوع بنایا اور ان کے پُر زور قلم نے اس فتنہ کی دھجیاں بکھیر دیں۔

جن گنے چنے محدثین نے یونانی افکار وعلوم کی آمیزش سے اسلامی علوم کو اور غیر اسلامی عناصر سے اسلام کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ان میں امام دمیاطی کا نام بھی ہے، ان کو منطق وکلام سے بڑی نفرت تھی، اس کا نمونہ ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے، اس کی مثال پہلے گذر چکی ہے، یہاں منطقیین اور فلاسفہ کے رد میں ان کی ایک تحریر کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

> ''منطقیوں پر علمائے حق نے اس لیے نکیر کی ہے کہ انھوں نے علومِ عقلیہ کو اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے، وہ ان فضول عقلی علوم میں پڑ کر کتاب وسنت اور علومِ عقلیہ سے غافل اور بے پرواہو گئے ہیں، ان لوگوں کی منطق وفلسفہ سے اس قدر الفت ودلچسپی کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سے واقفیت کے بغیر آدمی خوش اسلوبی سے گفتگو ہی نہیں کرسکتا، حالاں کہ یہ سراسر مضحکہ خیز بات ہے، کیا امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے اس فن کی تحصیل کی تھی؟ کیا امام ابوحنیفہؒ اور ایاس بن معاویہؒ کی ذہانت وطباعی اور عمرو بن عاصؓ کی سیاست

وفراست منطق ہی کی بدولت تھی، کیا سفیان ثوریؒ کے کمالات اس کے رہینِ منت تھے اور کیا قس وسحبان کی فصاحت وطلاقتِ لسانی اس میں مشق ومہارت ہی کا نتیجہ تھی؟ کیا کوئی کوئی شخص ان حضرات کو غبی اور بحث وگفتگو میں عاجز وقاصر تصور کرسکتا ہے؟ حالانکہ ان لوگوں کو اس فن میں کوئی دخل نہیں تھا، پھر اس لایعنی اور بے سود فن کے درپے ہوکر اس کے لیے غیر معمولی ریاضت ومشقت انگیز کرنا کس قدر حیرت انگیز ہے؟ یقیناً شیطان نے ان لوگوں کو دھوکے اور فریب میں مبتلا کردیا ہے، اس میں شک نہیں کہ بعض اہل علم کو اس کے مطالعہ میں غلو وانہماک نہیں ہوتا، مگر اس کے باوجود کیا یہ اس کی کم مضرت ہے کہ انسان بے سود باتوں میں الجھ کر رہ جائے جن سے اللہ تعالیٰ نے اس کو مستغنی اور بے نیاز بنایا ہے۔‘‘

عام منطقیوں کا خاص منتہائے نظر اور اہم مرکزِ توجہ یہی غیر مفید فن ہے اور اس کو ثابت شدہ حقائق ومسلمات کا آلہ وذریعہ بنائے ہوئے ہیں، اس لیے وہ اس میں سعی بلیغ سے کام لیتے ہیں اور اس کی تحصیل میں اپنی عمریں ضائع کرتے ہیں، کیا ان لوگوں کو ہادیٔ برحق کے اس ارشاد کی خبر نہیں کہ آپؐ نے حضرت عمرؓ کو تختیوں پر توراۃ لکھ کر محفوظ کرتے دیکھا تو غضبناک ہوکر فرمایا کہ اگر حضرت موسیٰؑ بھی اس وقت زندہ ہوتے تو ان کے لیے میری اتباع سے مفر کی کوئی صورت نہ ہوتی، جب آپؐ نے حضرت موسیٰؑ کی سرتاپا نور کتاب میں حضرت عمرؓ کے توغل اور غیر معمولی انہماک کو پسند نہیں فرمایا تو آخر اس فن کی کیا اہمیت ہوسکتی ہے جو متشککین اور گم کردہ راہ لوگوں کی وضع واختراع کا نتیجہ اور تمام تر کذب وافترا کا مجموعہ ہے، کس قدر افسوس اور تعجب ان منطقیوں پر ہے جو ضلالت وتاریکی میں بھٹک رہے ہیں۔‘‘(۱)

وفات: امام دمیاطی کا انتقال کبرسنی میں اچانک ہوا، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز درس

(۱) بستان المحدثین ص۹۴۔

دینے کے بعد ہی ان پر غشی طاری ہوئی، ان کے شاگردان کو گھر لائے، یہاں پتہ چلا کہ ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے، ابن کثیرؒ کا بیان ہے کہ وہ اس دن روزے سے تھے، تاریخِ وفات ۱۰/ یا ۱۵/ ذی قعدہ ۷۰۵ھ بتائی جاتی ہے، دوسرے دن باب النصر کے مقبرہ میں دفن کیے گئے، جنازہ میں بڑا مجمع شریک تھا۔(۱)

حلیہ: وہ نہایت شکیل وجمیل اور بڑے وجیہ تھے، اس لیے ان کو ابن الماجد کہا جاتا تھا، خوبصورتی کے اظہار کے موقع پر دمیاط میں یہی کہا جاتا تھا، چنانچہ اگر کسی دلہن کے غیر معمولی حسن وجمال کی تعریف کی جاتی تھی تو کہتے تھے، کانها ابن الماجد (گویا وہ ابن الماجد ہے)(۲)

تصنیفات: دمیاطی کثیر التصانیف تھے، حدیث، عوالی، فقہ اور لغت وغیرہ میں ان سے عمدہ اور بیش قیمت کتابیں یادگار ہیں، ان سب کو ان کے زمانہ میں بڑی شہرت ومقبولیت حاصل تھی مگر اب غالباً سب نایاب ہیں۔

۱-كتاب التسلی والاغتباط بثواب من تقدم من الافراط: یہ ایک کراسہ کے بقدر ہے، اس میں حدیثوں کے اسناد ومتون دونوں ذکر کیے گئے ہیں۔

۲-تساعیات مطلقه، ۳-كتاب ذكر ازواج النبی واولاده واسلافه، ۴-كتاب الذكر والتسبيح اعقاب الصلوٰة، ۵-العقد المثمن فيمن اسمه عبدالمومن (ایک جلد)

۶-كتاب فضل الخيل: محدثین کے طریقہ پر ایک جلد میں مرتب کی گئی ہے، مدینہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام میں اس کا قلمی نسخہ ہے۔(۳)

۷-كتاب فضل صوم ست من شوال: حافظ ابن کثیرؒ نے اس کو مفید،

---

(۱) بستان المحدثین ص ۹۴ وتذکرہ ج ۴ ص ۲۶۹ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۰ والبدایہ ج ۱۴ ص ۴۰ (۲) بدر الطالع ج ۱ ص ۴۰۳۔ (۳) مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۵۸۔

جید اور بے نظیر کتاب بتایا ہے۔

۸- قبائل الخزرج والاوس (ایک جلد میں)

۹-کشف المغطی فی تبیین الصلوٰۃ الوسطیٰ یاکتاب الصلوٰۃ الوسطیٰ: ایک جلد میں عمدہ کتاب ہے۔

۱۰-المنجر الرابح فی ثواب العمل الصالح، ۱۱-مجالس بغدادیہ، ۱۲-مجالس دمشقیہ۔

۱۳-مختصر السیرۃ النبویہ: (یا سیرت مشہورہ) ایک جلد میں سیرت پر عمدہ کتاب ہے، اس کے بعد اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ ان میں سے اکثر کا ماخذ ہے، اہل تذکرہ کا بیان ہے کہ یہ جمیع علمائے سیرت کے لیے رہبر کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۴- معجم: اس میں تیرہ سو سے زائد شیوخ کے ناموں کو چار جلدوں میں جمع کیا گیا ہے مگر صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ یہ ایک ہزار شیوخ کے ناموں پر مشتمل ہے۔

علامہ دمیاطی کی تصنیفات میں چند اربعیات بھی ہیں۔

۱۵-اربعین تساعیات الاسناد والابدال، ۱۶-اربعین حلبیہ فی احکام النبویہ، ۱۷-اربعین فی الجهاد، ۱۸-اربعین متباینۃ الاسناد، ۱۹-اربعین موافقات عوالی۔

ان کی بعض تصنیفات سو حدیثوں پر مشتمل ہیں۔

۲۰-مأۃ تساعیہ فی الموافقات وابدال العلیہ۔(۱)

☆☆☆

(۱) بستان المحدثین ص ۹۳ تا ۹۵۔

امام ولی الدین خطیب تبریزی

(متوفی بعد ۷۳۷ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوعبداللہ کنیت اور ولی الدین لقب تھا لیکن خطیب تبریزی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں، باپ کا نام عبداللہ اور دادا کا محمد تھا۔

خاندان ووطن: آذربائیجان کے مشہور اور بڑے شہر تبریز کو ان کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے، اس کی نسبت سے وہ تبریزی کہلاتے تھے اور خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ فاروق سے نسبی تعلق تھا، اس بنا پر عمری بھی کہلاتے تھے۔

اساتذہ: ان کے ایک ہی شیخ علامہ حسین بن محمد بن عبداللہ طیبی کا نام معلوم ہوسکا، جن کے مشورہ اور ایماء سے خطیب نے مشکوٰۃ المصابیح مرتب کی تھی، جس کی خود طیبی نے ایک مبسوط شرح لکھی، حافظ ابن حجر طیبی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

امر بعض تلامذته باختصار	طیبی نے اپنے ایک شاگرد کو امام بغوی
المصابیح علی طریقة نهجها	کی مصابیح کو اسی نہج پر مختصر کرنے کا حکم
له وسماه بالمشكوة وشرح	دیا اور اس کا نام مشکوٰۃ رکھا اور اس کی
وشرحا حافلا۔(۱)	ایک مبسوط شرح لکھی۔

تلامذہ: شاگردوں میں بھی صرف ایک ہی نام، امام الدین علی بن مبارک شاہ ساؤجی کا ملتا ہے، حافظ مزی کے خاص شاگرد تھے اور مشکوٰۃ ان ہی کی روایت سے رائج اور مشہور

(۱) الدرر الکامنہ جلد۲ ص ۶۹۔

ہوئی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خلف رشید حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اپنی مشکوٰۃ کی سندیں بیان کرتے ہوئے ان کا نام تحریر کیا ہے۔(۱)

علم وفضل: ملا علی قاری فرماتے ہیں ''وہ علم وفضل اور حقائق ودقائق کا بحرِ بیکراں تھے، ان کی کتابیں ان کے وسعتِ علم ونظر اور غیر معمولی فضل وکمال پر شاہد ہیں۔''(۲) بلاشبہ مشکوٰۃ تبریزی کے فضل وکمال، علمی تبحر اور حدیث میں عظمت وبرتری کا ثبوت ہے۔

زہد وورع: جن مصنفین نے خطیب تبریزی کا ذکر کیا ہے، وہ ان کے علم وفضل کی طرح صلاح وتقویٰ کے بھی معترف ہیں، ان کے استاذ علامہ طیبی نے ان کو ''بقية الاولياء قطب الصلحا'' اور ملا علی قاری نے ''تقی نقی'' لکھا ہے۔(۳)

فقہی مسلک: مشکوٰۃ کی ترتیب وتبویب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شافعی المذہب تھے۔

وفات: خطیب تبریزی کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں، اس لیے ان کے سنہ ولادت کی طرح سنہ وفات کا بھی علم نہ ہوسکا مگر یہ مسلم ہے کہ ۷۳۷ھ کے بعد ان کا انتقال ہوا تھا، کیوں کہ اسی سال وہ مشکوٰۃ کی ترتیب وتالیف سے فارغ ہوئے تھے۔

تصنیفات: ان سے دو کتابیں یادگار ہیں، ممکن ہے انھوں نے اور کتابیں بھی لکھی ہوں جو اَب ناپید ہیں۔

۱۔ مشکوٰۃ المصابیح: یہ حدیث کی بڑی اہم اور مقبول کتابوں میں ہے اور صحاحِ ستہ اور دوسری مستند کتب حدیث کا مجموعہ ہونے کی بنا پر خود بھی بہت معتبر سمجھی جاتی ہے، اس کی ترتیب اور تالیف میں امام بغوی کی مشہور کتاب مصابیح السنہ پر اعتماد کیا گیا ہے اور یہ دراصل اس کا تکملہ اور ذیل ہے، تبریزی نے اپنے استاذ علامہ طیبی کے مشورہ وایما سے اس کو مرتب کیا تھا، علامہ طیبی فرماتے ہیں:

---

(۱) اتحاف النبیہ ص ۷۹ وعجالہ نافعہ ص ۲۳ (۲) مقدمہ مشکوٰۃ از ابوبکر شاویش (۳) مقدمہ مشکوٰۃ از ابوبکر شاویش۔

''مجھ میں اور میرے دینی بھائی محمد بن عبداللہ خطیب میں ایک مجموعۂ احادیث مرتب کرنے کے لیے مشورہ ہوا اور طے پایا کہ مصابیح کا تکملہ لکھا جائے اور اس کو از سرنو مرتب کیا جائے، چنانچہ انھوں نے میری خواہش کے مطابق پوری محنت و جانفشانی سے یہ مجموعہ مرتب کیا۔(۱)

خود خطیب تبریزی کو بھی اعتراف ہے کہ انھوں نے یہ کتاب اپنے استاذ کی مدد اور مشورہ سے لکھی۔

گو مشکوٰۃ المصابیح مصابیح السنہ کا تکملہ ہے، تاہم اس میں کہیں کہیں حذف و اضافہ سے کام لیا گیا ہے، اس کی وجہ سے دونوں میں کسی قدر فرق بھی ہو گیا ہے اور مشکوٰۃ کی حدیثوں کی تعداد بھی مصابیح سے زیادہ ہو گئی ہے، مشکوٰۃ کے اضافے کی نوعیت حسب ذیل ہے:

۱- امام بغوی نے اختصار کے خیال سے سندیں حذف کر دی تھیں اور کتابوں کے حوالے بھی نہیں دیئے تھے، خطیب تبریزی نے حوالے بھی دیدیئے ہیں اور ان صحابہ کے نام بھی تحریر کیے ہیں، جن سے حدیثیں مروی ہیں، اس کی وجہ سے ہر حدیث کا ماخذ بھی معلوم ہو جاتا ہے اور اس کی صحت و قوت اور درجہ و مرتبہ کا بھی پتہ چل جاتا ہے، چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''امام ابو محمد حسین بن مسعود فراء بغوی کی کتاب المصابیح اپنے موضوع پر بہت جامع کتاب ہے، اس میں مختلف و متفرق حدیثوں کو نہایت خوبی سے ضبط کیا گیا ہے، مگر اختصار کی بنا پر سندیں حذف کر دی گئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا ہے، حالانکہ بغوی جیسے مستند شخص کا نقل کرنا ہی سند کی حیثیت رکھتا ہے۔(۲)

۲- امام بغوی نے ہر ہر باب میں دو ہی فصلیں قائم کی تھیں لیکن امام تبریزی نے

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۳ (۲) دیباچہ مشکوٰۃ۔

عموماً تین فصلیں قائم کی ہیں، پہلی فصل میں تو بغوی کی طرح صرف صحیحین کی روایتیں درج کی ہیں اور دوسری میں ان ائمہ کے علاوہ جن سے بغوی نے روایتیں نقل کی ہیں، بعض دوسرے ائمہ فن کی کتابوں کی حدیثیں بھی شامل کردی ہیں اور تیسری فصل میں جو بغوی کے یہاں نہیں ہے، مرفوع حدیثوں کے علاوہ ابواب کے مناسب آثارِ صحابہ وتابعین نقل کر کے راویوں کے نام اور کتابوں کے حوالے دے دیئے ہیں، جیسا کہ لکھتے ہیں:

"ترتیب وتبویب میں صاحب مصابیح کی پیروی کی گئی ہے، البتہ ہر باب کو عموماً تین فصلوں میں منقسم کیا گیا ہے، پہلی فصل میں شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی حدیثیں جمع کی گئی ہیں اور دوسری فصل میں ائمہ صحاح (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی) کے علاوہ جن سے شیخ نے روایتیں نقل کی ہیں، امام مالک، شافعی، احمد، دارقطنی، بیہقی اور رزین بن معاویہ وغیرہ کے مرویات بھی شامل کیے گئے ہیں، تیسری فصل مین مقررہ شرطوں (۱) کے مطابق اس کے ابواب کے ہم معنی سلف وخلف سے منقول مناسب الحاقات درج ہیں۔" (۲)

۳- صاحب مصابیح نے جن حدیثوں کی غرابت یا ضعف ونکارت کی جانب صرف اشارہ کیا ہے، صاحبِ مشکوٰۃ نے ان کی غرابت یا ضعف ونکارت کے وجوہ بھی بتادیئے ہیں اور جن کے بارے میں انھوں نے سکوت اختیار کیا ہے، ان کے سلسلہ میں صاحبِ مشکوٰۃ نے بھی سکوت سے کام لیا ہے، البتہ بعض جگہ کسی خاص مصلحت وضرورت کے تحت بعض وضاحتیں کی ہیں، جیسے ان روایتوں کے سلسلہ میں جن پر کوئی طعن کیا گیا ہے اور امام بغوی نے ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے تو ان کے سکوت کے باوجود امام تبریزی نے ان کی اصل حقیقت واضح کر کے یہ بتایا ہے کہ وہ حسن ہیں یا ضعیف؟

۴- جن حدیثوں کو صاحب مصابیح نے مکمل نہیں نقل کیا ہے، امام تبریزی نے کسی

(۱) مقررہ شرطوں سے صحابہ یا تابعین کے ناموں اور حوالوں کی تخریج مراد ہے۔ (۲) دیباچہ مشکوٰۃ۔

خاص مصلحت کے تحت ابواب کی مناسبت سے ان کو مکمل ذکر کیا ہے۔

حذف واختصار اس طور پر کیا گیا ہے۔

۱۱-مصابیح کی مکرر حدیثوں کو مشکوٰۃ میں تکرار کی وجہ سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

۱۲-مفصل اور طویل روایتوں کی غیر ضروری طوالت وتفصیل کو حذف کر کے مختصر روایتیں نقل کی گئی ہیں۔

۱۳-امام بغوی نے جن طویل حدیثوں کو کسی ایک ہی باب میں تحریر کیا ہے، امام تبریزی نے ان کے کچھ حصے تو اسی باب میں نقل کیے ہیں، مگر دوسرے حصوں کو ان کے مناسب دوسرے باب میں نقل کیا ہے۔

استدراک: مشکوٰۃ میں کہیں کہیں بغوی پر استدراک بھی کیا گیا ہے، جیسے مصابیح کی پہلی فصل میں بعض ایسی حدیثیں شیخین کی جانب منسوب کی گئی ہیں، جو درحقیقت ان کے بجائے دوسرے محدثین کی کتابوں میں مذکور ہیں، اسی طرح دوسری فصل کی بعض حدیثیں جو شیخین کے بجائے اور ائمہ حدیث کی جانب منسوب کی گئی ہیں، حالانکہ وہ شیخین کی کتابوں میں درج ہیں، امام تبریزی نے ان دونوں قسموں کی غلطیوں کی تصحیح کر دی ہے، اس کی وجہ سے مشکوٰۃ کی پہلی فصل میں بعض دوسرے ائمہ کی اور دوسری فصل میں شیخین کی حدیثیں بھی شامل ہوگئی ہیں لیکن تبریزی نے اس طرح کے مواقع پر تصریح ووضاحت کر دی ہے۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ امام تبریزی نے امام بغوی ہی کی تحقیق پر اعتماد کر لینے کو کافی نہیں سمجھا ہے، بلکہ خود بھی مراجعت کر کے حدیثوں کے بارے میں چھان بین کی ہے، جیسا کہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''اگر تم کو مشکوٰۃ کی پہلی اور دوسری فصلوں میں اصل کتاب (مصابیح)
> سے کوئی فرق واختلاف نظر آئے مثلاً پہلی فصل میں شیخین کے علاوہ اور ائمہ
> حدیث کی یا دوسری فصل میں شیخین کی روایتیں درج ملیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ

میں نے خود بھی تحقیق وکاوش کی ہے اور حمیدی کی الجمع بین الصحیحین اور ابن اثیر کی جامع الاصول کا تتبع کر کے صحیحین کے متن پر اعتماد کیا ہے۔(۱)

ایک اور جگہ اپنی تلاش وتفحص کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

''میں نے حدیثوں کی تلاش وجستجو اور تحقیق وتفتیش میں اپنے امکان بھر پوری جدوجہد کی ہے۔''(۲)

شروح وحواشی: مشکوٰۃ المصابیح کی اہمیت ومقبولیت کا یہ بھی ثبوت ہے کہ محدثین اور علمائے فن نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے اور اس کی متعدد شرحیں، تعلیقات اور حواشی لکھے گئے ہیں اور فارسی، اردو، انگریزی اور ترکی زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے ہیں۔

شرحوں اور حواشی کے نام یہ ہیں:

۱- الاکمال فی اسماء الرجال: یہ رسالہ خود خطیب تبریزی کی تصنیف ہے، اس میں انھوں نے مشکوٰۃ کے رجال پر گفتگو کی ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کو لکھ کر انھوں نے جب اپنے استاذ علامہ طیبی کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے مشکوٰۃ کی طرح اس کو بھی بہت پسند کیا تھا، اس کے قلمی نسخے کئی خانوں میں ہیں اور یہ چھپ بھی گیا ہے۔

۲- الکاشف عن حقائق السنن: یہ علامہ طیبی کی شرح ہے، خطیب تبریزی کی اس سے بڑھ کر خوش نصیبی اور مشکوٰۃ کی مقبولیت اور اہمیت اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود ان کے استاذ نے شرح لکھی، چنانچہ فرماتے ہیں:

''جب وہ مشکوٰۃ کی تالیف مکمل کر چکے تو میں اس کی شرح لکھنے کے لیے کمربستہ ہوا، اس میں مشکوٰۃ کے مشکل مباحث اور غریب الفاظ کو حل کیا گیا ہے اور نکات ولطائف مستنبط کیے گئے ہیں اور نحوی مشکلات اور معانی وبیان کے مسائل سے بھی بقدر ضرورت تعرض کیا گیا ہے، ان مباحث کی تحقیق کے لیے جن

(۱) دیباچہ مشکوٰۃ (۲) ایضاً۔

ائمہ فن کی کتابوں کا تتبع کیا گیا ہے، ان کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں، حوالے کے لیے مخصوص علامتیں اور نشان مقرر کیے گئے ہیں، جہاں حوالے نہیں دیئے گئے ہیں وہ میرے اپنے نتائج فکر ہیں جو لوگ اس کو انصاف کی نظر سے دیکھیں گے وہ اس کو نہایت مختصر، جامع اور محققانہ کتاب پائیں گے۔''(۱)

شروع میں حدیث کے اصول واصطلاحات اور اس کے اقسام وانواع، نیز جرح وتعدیل پر مفید بحث کی گئی ہے، یہ مشکوٰۃ کی اہم اور مفید شرح ہے جو شرح طیبی کے نام سے مشہور ہے غالباً ابھی تک چھپی نہیں۔

۳- حاشیہ سید شریف: علامہ سید شریف علی بن محمد بن علی جرجانی (م۸۱۶ھ) نے مشکوٰۃ پر ایک مفید حاشیہ قلمبند کیا تھا، اس کا ایک قلمی نسخہ خدابخش خاں لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔(۲)

۴- هداية الرواة الى تخريج المصابيح والمشكوٰة: یہ حافظ ابن حجر (م۸۵۲ھ) کی تصنیف ہے، اس میں مصابیح ومشکوٰۃ دونوں کی حدیثوں کی تخریج کی گئی ہے،(۳) اور یہ دراصل مناوی کی لباب الصدر کا خلاصہ ہے۔(۴)

۵- منهاج المشكوٰة: عبدالعزیز بن محمد بن عبدالعزیز ابہری (م۸۹۵ھ) نے امیر علی شیر کے لئے یہ شرح لکھی تھی۔(۵)

۶- فتح الاله فی شرح المشكوٰة: یہ علامہ شہاب الدین احمد بن محمد بن محمد بن علی بن حجر ہیثمی شافعی (م۹۷۴ھ) کی شرح ہے۔(۶)

۷- مرقاة المفاتيح: یہ احادیث کے مشہور خادم اور نامور حنفی عالم شیخ نورالدین علی بن سلطان بن محمد ہروی المعروف ملا علی قاری (م۱۰۱۴ھ) جو چار جلدوں پر

(۱) کشف الظنون ج۲ص ۳۴۳ (۲) فہرست ج اص ۴۹ (۳) کشف الظنون ج۲ص ۶۴۷ (۴) ایضاً ص ۳۵۰ (۵) کشف الظنون ج اص ۴۴۳ (۶) ایضاً۔

مشتمل ہے، اس میں پہلے کی تمام شرحوں اور حواشی کے مباحث کے علاوہ دوسرے مفید اور ضروری معلومات تحریر کیے گئے ہیں، اس حیثیت سے اس کو بہت جامع اور اہم خیال کیا جاتا ہے۔(۱) ملا صاحب اس کے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں:

''چونکہ مشکوٰۃ المصابیح احادیث نبوی کی ایک جامع کتاب ہے، اس لیے مجھ کو اس کے مطالعہ کا شوق ہوا اور میں نے حرم کے شیوخ سے اس کو پڑھا مگر ان لوگوں کے پاس کوئی صحیح اور مستند نسخہ نہ تھا اور شارحین نے محض بعض لفظوں کو ضبط کیا تھا، اس لیے میں نے مختلف نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کر کے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور پھر ایک لطیف شرح لکھی، اس میں الفاظ کو بھی ضبط کیا گیا ہے اور روایتوں کی فنی بحث و تحقیق کر کے ان کے معانی و مطالب کی تشریح بھی کی گئی ہے۔''(۲)

۸- انوار المشکوٰۃ: یہ ملا علی قاری کے بعد کے کسی فاضل کی تصنیف ہے، اس میں مشکوٰۃ کی تین فصلوں پر ایک اور فصل کا اضافہ کر کے چار فصلیں قائم کی گئی ہیں، چوتھی فصل میں ان سات ائمہ حمیدی، ابن اثیر، صغانی، قضاعی، اقلیشی، نووی، اور مدینی کی کتابوں سے ایسی روایتیں درج کی گئی ہیں جو مجتہدین فی المذہب کی مستدل بہا ہیں اور اس طرح یہ مشکوٰۃ اور مرقاۃ دونوں کی شرح ہے۔(۳)

۹- لمعات التنقیح: ہندوستان کے نامور محدث حضرت شاہ عبدالحق دہلویؒ (م ۱۰۵۲ھ) نے مشکوٰۃ پر بڑا کام کیا ہے، یہ ان کی عظیم الشان تصنیف اور مشکوٰۃ کی اہم شرح ہے، ان کا بیان ہے کہ:

''حرمین سے واپسی اور وہاں کے شیوخ سے روایتِ حدیث کی اجازت لینے کے بعد جب حدیث نبویؐ کی خدمت کی سعادت بندہ کو میسر آئی تو

---

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۴۴۳ (۲) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۴۱۶ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۴، ۴۴۳۔

خواہش ہوئی کہ مشکوٰۃ المصابیح کی جس کی غیر معمولی شہرت ہے، شرح لکھی جائے اور اس میں علما نے اپنی کتابوں میں جو فوائد لکھے ہیں یا جو شیوخِ وقت سے ہم نے سنے ہیں، یا جو ہمارے دل میں ہیں، ان کو طلبہ کے سامنے بیان کر دیا جائے، بعض مخلص دوستوں کی رائے ہوئی کہ فارسی مین شرح لکھنا زیادہ بہتر اور مفید ہوگا لیکن آغاز کرنے اور اس کے لیے معلومات جمع کرنے کے بعد محسوس ہوا کہ اس کو فارسی میں تحریر کرنا مناسب نہیں تاہم دوستوں کی بات بھی ٹالی نہیں جا سکتی تھی، اس لیے عربی و فارسی دونوں میں ساتھ ساتھ شرح لکھنا شروع کیا، عربی کی شرح پہلے مکمل ہوگئی۔"

لمعات التنقیح دو جلدوں میں عربی شرح ہے، جو بڑی فکر و کاوش اور تحقیق و تدقیق سے لکھی گئی ہے اور گوناگوں علمی مباحث، لطیف تحقیقات اور مفید معلومات کا مجموعہ ہے، یہ متوسط اور عمدہ شرح ہے، اس میں نہ زیادہ تفصیل سے کام لیا گیا ہے اور نہ اختصار سے، لغوی ونحوی مشکلات اور فقہی مسائل کو بڑی خوبی سے حل کیا گیا ہے اور احادیث کی فقہ حنفی سے مطابقت دکھانے کی پوری کوشش کی گئی ہے، ۱۰۲۵ھ میں اس کی تالیف مکمل ہوئی تھی، (۱) شروع میں ایک مفید و جامع مقدمہ میں شاہ صاحب نے اصول حدیث کے مباحث تحریر کیے ہیں، یہ مقدمہ مشکوٰۃ کے متن کے ساتھ اور علاحدہ بھی طبع ہو کر بہت مقبول ہوا لیکن اصل شرح ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ (۲) قلمی نسخے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

۱۰- اشعة اللمعات : یہ حضرت محدث دہلویؒ کی فارسی شرح اور چار جلدوں پر مشتمل ہے، اس کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ متعدد بار چھپی، گو عربی شرح میں شاہ صاحب نے زیادہ کدوکاوش کی ہے، تاہم یہ بھی نہایت جامع اور بے نظیر ہے، ۱۰۳۷ھ میں اس کی ترتیب سے فارغ ہوئے تھے، پہلی جلد میں ایک مقدمہ بھی ہے، اس

(۱) اتحاف النبلاء ص ۱۴۹ (۲) ایضاً۔

میں فن حدیث اور اس کے مصطلحات کے علاوہ متعدد اکابر محدثین کا مختصر تذکرہ ہے جو اعظم پریس جونپور سے علاحدہ بھی چھپا تھا، شرح میں لغات ومطالب کو عمدہ طور پر حل کیا گیا ہے اور وہ مفید معلومات پر مشتمل ہے، فقہ حنفی کے مسائل کی وضاحت کے سلسلہ میں یہ بہت عمدہ شرح ہے۔

۱۱- جامع البرکات منتخب شرح المشکوٰۃ: شاہ صاحب نے اس کی دو جلدوں میں اپنی شرح مشکوٰۃ کا خلاصہ تحریر کیا ہے۔ (۱)

۱۲- اسماء الرجال والرواۃ المذکورین فی کتاب المشکوٰۃ: یہ اسماء الرجال پر حضرت شیخ کی مشہور تصنیف ہے، اس میں مشکوٰۃ کے تمام رواۃ کی فہرست اور خلفائے راشدین اور اہل بیت کے حالات ومناقب بیان کیے گئے ہیں، اس کا قلمی نسخہ بانکی پور پٹنہ کی لائبریری میں موجود ہے، مگر ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ (۲)

۱۳- مظاھر حق: یہ اردو میں مشکوٰۃ کا ترجمہ اور اس کی مختصر شرح ہے، ترجمہ کی ابتدا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلویؒ نے کی تھی مگر پھر ان کے ایما اور مشورے سے مولانا قطب الدین خاں دہلوی (۱۲۸۹ھ) نے اس کو شرح کی شکل دی، اردو میں ہونے کی وجہ سے ایک زمانے میں اس سے عوام کو بڑا فیض پہنچا، مظاہر حق کی زبان وطرز بیان کی قدامت کی بنا پر دارالعلوم دیوبند کے بعض فضلا نے اس کو موجودہ دور کی سہل اور سلیس زبان میں معارف مشکوٰۃ کے نام سے شائع کیا ہے، پہلی جلد کے جو ۱۹۶۰ء میں چھپی ہے، آغاز میں اصول حدیث کے مسائل ومباحث پر ایک مقدمہ بھی ہے۔

۱۴- تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث المشکوٰۃ: یہ مشکوٰۃ پر مختصر مفید حاشیہ ہے، شارح مولانا ابوالوزیر سید احمد حسن دہلوی (م ۱۳۲۸ھ) علامہ میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد تھے، اس کا صرف ابتدائی نصف حصہ ۱۳۳۵ھ میں دہلی کے

---

(۱) حیات شیخ عبدالحق دہلوی ص ۱۷۰ (۲) ایضاً ص ۱۷۱ و ۱۷۲۔

مطبع انصاری سے شائع ہوا ہے۔

۱۵- التعلیق الصبیح علیٰ مشکوٰۃ المصابیح: یہ شرح مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے تحریر کی ہے، اس کی چار نامکمل جلدیں دمشق سے ۱۳۵۴ھ میں شائع ہوئی ہیں۔

۱۶- مشکوٰۃ مع حاشیہ وتعلیق: ۱۳۸۰ھ میں ابوبکر شاویس نے مشکوٰۃ کا متن کئی نسخوں سے مقابلہ وتصحیح کر کے ناصر الدین البانی کے تحشیہ وتعلیقات کے ساتھ دمشق سے شائع کیا ہے، اس میں حدیثوں پر ہندسہ کے دو طرح کے نمبر دیئے گئے ہیں، ایک تو کتاب کی مسلسل حدیثوں کے لحاظ سے ہے اور دوسرے سے ابواب کی حدیثوں کی تعداد ظاہر ہوتی ہے، حواشی میں حدیث کے غریب اور مشکل الفاظ اور وضاحت طلب امور کی تشریح کے علاوہ صاحبِ مشکوٰۃ کی مسامحتوں کا بھی ذکر ہے، جیسے غلط حوالوں کی تصحیح کی گئی ہے اور جہاں سرے سے حوالے نہیں دیئے گئے ہیں وہاں حوالوں کی تخریج کی گئی ہے اور جہاں ایک ہی حوالہ تحریر کیا گیا ہے، وہاں مزید دوسرے حوالے بھی تحریر کیے گئے ہیں، بعض جگہ مشکوٰۃ میں دو حوالے دے کر الفاظ کو ان میں سے کسی ایک کا بتایا گیا ہے لیکن محشی نے اس کے بجائے دوسری کتاب کے الفاظ بتائے ہیں، بعض حدیثوں کو مشکوٰۃ میں مرفوع، متصل اور مسند بتایا گیا ہے لیکن حاشیہ میں ان کے موقوف، منقطع اور مرسل ہونے کا ذکر ہے، اسی طرح اس میں جن کو موقوف وغیرہ کہا گیا ہے، اس میں ان کے اس کے برعکس ہونے کی تصریح کی گئی ہے، اسی طرح مشکوٰۃ میں اگر امام ترمذیؒ کی روایتیں نقل کر کے ان کی تصحیح وتحسین یا تضعیف وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے تو اس میں اس کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے، جن حدیثوں کو مصنف نے نامکمل نقل کیا ہے، محشی نے اس کو مکمل نقل کر دیا ہے اور جن حدیثوں کے بعض الفاظ اور جملے نقل ہونے سے رہ گئے ہیں یا ان میں کسی طرح کا تغیر ہو گیا ہے تو حاشیہ میں ان کو اصل کے مطابق ٹھیک نقل کیا گیا ہے، اسی طرح جن حدیثوں کی

سندیں ضعیف نقل ہوئی ہیں ان کے یا تو صحیح طرق بیان کیے گئے ہیں یا ان کی تقویت کے لیے شواہد و متابعات بھی ذکر کر دیے گئے ہیں۔

یہ خوب صورت اور دیدہ زیب اڈیشن تین جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں کئی فہرستیں بھی دی گئی ہیں، شروع میں امام بغوی اور امام تبریزی کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں اور مصابیح و مشکوٰۃ پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔

۱۷- زجاجة المصابيح: یہ مولانا سید ابوالحسنات عبداللہ شاہ حیدر آبادی کی تصنیف ہے، اس کو مشکوٰۃ ہی کی طرز پر فقہی ابواب کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے اور عموماً کتب و ابواب بھی اسی سے لیے گئے ہیں، البتہ مشکوٰۃ میں جہاں عنوانات میں شافعی مسلک کی رعایت کی گئی ہے، اس میں وہاں فقہ حنفی کی رعایت مدنظر رکھی گئی ہے اور ساتھ ہی حواشی میں حدیثوں کی مختصر تشریح بھی کی گئی ہے، اصل کتاب عربی میں لکھی گئی ہے، بعد میں اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا گیا ہے۔

۱۸- مرعاة المفاتيح: جمعیۃ اہل حدیث ہند کے ممتاز عالم و محدث مولانا ابوالحسن عبید اللہ رحمانی مبارک پوری بھی مشکوٰۃ کی ایک مبسوط شرح لکھ رہے ہیں، اس کی تین جلدیں اب تک شائع ہوئی ہیں، اس میں پہلے کی اکثر شرحوں کا خلاصہ آ گیا ہے، لائق شارح نے حدیثوں کی مفصل تشریح کر کے ان کے معانی و مطالب کی پوری وضاحت کی ہے، اس ضمن میں حدیث کے منکرین اور محدثین پر طعن و تشنیع کرنے والوں اور حدیثوں سے غلط نتائج مستنبط کرنے والوں کا جواب بھی دیا گیا ہے اور ان کے نقض و تضاد کو رفع بھی کیا گیا ہے۔ فقہی اختلافات نقل کرنے اور ائمہ فقہ و اجتہاد کے مذاہب و دلائل بیان کر کے مرجح و قوی مسلک کی تعیین کی گئی ہے، شارح نے عموماً محدثین کے مذہب کی تصویب کی ہے اور مرجوح اقوال پر بعض جگہ رد و کد بھی کی ہے، حدیثوں کی مشکلات لغوی و نحوی مسائل کو حل کرنے پر خاص دھیان دیا گیا ہے اور ان پر نقد و بحث کر کے ان کا درجہ و مرتبہ اور قوت

وضعف کی وضاحت بھی کی گئی ہے، رواۃ کے مختصر ترجمے اور بلاد واماکن کے متعلق ضروری معلومات تحریر کیے گئے ہیں، مشکوٰۃ کی پہلی اور تیسری فصل میں صحیحین کی جو حدیثیں نقل کی گئی ہیں اگر ان کی تخریج دوسرے محدثین نے بھی کی ہے تو اس کا ذکر کر دیا گیا ہے، اسی طرح دوسری فصل کی حدیثوں کے لیے جو حوالے دیئے گئے ہیں اگر ان کی تخریج ان کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی کی ہے تو اس کی تصریح کر دی گئی ہے، جہاں مصنف نے حوالے تحریر نہیں کیے ہیں وہاں حوالوں کی تخریج کی گئی ہے، اگر مصنف سے الفاظ حدیث کے نقل کرنے میں کوئی مسامحت ہوئی ہے تو اس کی تصحیح کر دی گئی ہے، یا اگر انھوں نے صحیحین کی جو حدیثیں پہلی فصل کے بجائے دوسری فصل میں اور دوسرے محدثین کی حدیثیں دوسری کے بجائے پہلی فصل میں بیان کی ہیں تو ان پر تنبیہ کی گئی ہے اور جن حدیثوں کو مصنف نے مختصر نقل کیا ہے، ان کو اس میں پوری نقل کر دیا گیا ہے، مسلسل حدیثوں پر نمبر دیئے گئے ہیں اور ابواب کی حدیثوں پر علاحدہ بھی نمبر دیا گیا ہے، شروع میں کئی مفصل فہرستیں اور ایک مقدمہ ہے، اس میں اصول حدیث پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

☆☆☆

امام جمال الدین زیلعی

(متوفی ۷۶۲ھ)

نام ونسب: نام عبداللہ، کنیت ابومحمد اور لقب جمال الدین تھا، سلسلۂ نسب یوں ہے: عبداللہ ابن یوسف بن محمد بن ایوب بن موسیٰ۔ (۱)

نام میں اختلاف ہے، بعض نے والد کا نام عبداللہ اور ان کا یوسف لکھا ہے۔ (۲)

ولادت ووطن: زیلعی کے سنہ ولادت کا علم نہیں ہوسکا مگر ان کا وطن زیلع نام کا ایک گاؤں ہے جو بحر حبشہ کے ساحل پر ایک بندرگاہ ہے، اس کو دوسرے اکابرِ علم وفن کا وطن ہونے کا فخر بھی ہے۔ (۳) امام فخر الدین زیلعی شارحِ کنز کا وطن بھی یہی سرزمین ہے، امام جمال الدین اسی کی نسبت سے زیلعی کہلاتے ہیں۔

اساتذہ وشیوخ: بعض اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابن عقیل، شہاب احمد بن محمد بن فتوح تجیبی، شہاب احمد بن محمد بن قیس انصاری، اسکندر ابن تاج الدین، محمد بن عثمان، تقی الدین بن عبدالرزاق لخمی، جمال الدین عبداللہ بن احمد بوری، ابومحمد فخر الدین عثمان بن علی شارح کنز، قاضی علاؤالدین بن ترکمانی، جلال الدین ابوالفتوح علی بن عبدالوہاب جریری۔ شیخ محمد بن احمد بن عثمان۔ (۴)

حفظ وضبط: علمائے فن نے زیلعی کے حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان کا اعتراف کیا ہے، ہے، علامہ سیوطی نے مصر کے حفاظ حدیث اور نقادانِ فن میں ان کا تذکرہ کیا ہے، ارباب

(۱) لحظ الالحاظ ذیل طبقات الحفاظ ص ۱۲۸ (۲) الرسالۃ المستطرفہ ص ۵۱، (۳) معجم البلدان الفوائد البھیہ، ص ۹۵ (۴) لحظ الالحاظ ص ۱۶۹،

سیر و تذکرہ نے ان کو حافظ متقن اور احد حفاظ الحدیث وغیرہ لکھا ہے۔(۱)

حدیث میں درجہ: وہ حدیث میں بہت باکمال تھے، اس فن کی طلب و تحصیل اور کتب حدیث کی جمع و تالیف اور ہدایہ و کشاف کی حدیثوں کی تخریج سے ان کے علمی تبحر، وسعتِ نظر، حدیث میں کثرت اشتغال اور اس کے مباحث و مطالب پر دسترس اور متون وغیرہ سے مکمل واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وہ حدیثوں کے متون و مطالب کی طرح ان کے طرق و اسناد پر بھی اچھی نظر رکھتے تھے، اور فن جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کے ماہر تھے، اس پر ان کی تخریج شاہد ہے، مولانا عبدالحئ لکھنوی فرماتے ہیں، زیلعی کی تخریج سے فن حدیث اور اس کی جزئیات وفروع میں ان کی وسعتِ علم و نظر اور اسماء الرجال میں تبحر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔(۲)

فقہ: فقہ میں بھی نہایت بلند پایہ تھے، اہل تذکرہ نے ان کی فقہی بصیرت اور تفقہ کا اعتراف کیا ہے، ان کی تخریج سے بھی ان کے فقہی کمال اور علمی جلالت کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا انور شاہ کشمیری سے منقول ہے، کہ ابن ہمام ہدایہ کی شرح الفتح القدیر میں حنفی مذہب کے جو دلائل تحریر کیے ہیں وہ زیادہ تر زیلعی کی تخریج سے ماخوذ ہیں۔(۳)

حدیث و فقہ دونوں میں امتیاز کی بناء پر اصحاب طبقات و تراجم نے ان کو امام لکھا ہے، سیوطی نے ان کو "الامام الفاضل المحدث" اور ابن فہد نے "الفقیہ الامام" کہا ہے، حافظ ابن حجر فقہی مسلک میں اختلاف کے باوجود ان کو امام کے لقب سے موسوم کرتے ہیں۔(۴)

علم و فن سے اشتغال: زیلعی اصلاً حدیث و فقہ میں زیادہ ممتاز تھے، مگر دوسرے علوم سے بھی ان کی دلچسپی کم نہ تھی، ان کے علمی اشتغال و انہماک کا ذکر تمام ارباب سیر نے کیا ہے۔(۵)

---

(۱) حسن المحاضرہ ج۱ ص ۱۵۱ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۳۸ (۲) الفوائد البہیہ ص ۹۵ (۳) مقدمہ نصب الرایہ ص ۸ (۴) ملاحظہ ہو ذیول تذکرۃ الحفاظ ص ۱۲ و تلخیص نصب الرایہ ص ۲ (۵) ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۸ و الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۳۱۰ و البدر الطالع ج ۱ ص ۴۱۰۔

فقہی مذہب: وہ مسلکاً حنفی تھے، اور ان کا شمار اجلۂ احناف میں ہوتا ہے، اسی بنا پر وہ حنفی کی نسبت سے بھی مشہور ہیں، لیکن جیسا کہ آگے معلوم ہوگا ان کو اس مذہب میں غلو نہ تھا۔

سیرت واخلاق: بڑے ستودہ سیرت اور پاک خو تھے، طبیعت میں نرمی، مروت اور شرافت تھی، اس لئے دوسرے مسلک کے لوگوں کے لئے بھی ان کے قلب میں نہ صرف گنجایش تھی بلکہ وہ ان سے میل جول بھی رکھتے تھے، تواضع اور خاکساری کا یہ حال تھا کہ اپنے سے کمتر درجہ کے لوگوں کے ساتھ مل کر حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کرنے میں ان کو کوئی تکلف نہ ہوتا تھا، سیرت واخلاق کی بلندی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حنفی مذہب سے وابستہ ہونے کے باوجود ان کی طبیعت میں انصاف پسندی تھی، حدیثوں کی شرح وتوجیہ اور ان کے مباحث ومسائل کی تحقیق میں فقہی وجماعتی عصبیت کو راہ نہ دیتے تھے، حافظ ابن حجر کو بھی اعتراف ہے کہ "امام زیلعی نہایت حق گو وانصاف پسند تھے، ہر باب میں اپنے مذہب کے مخالفین کے دلائل بھی نہایت فراخ دلی سے بیان کرتے ہیں اور ان کو جو کچھ معلوم ہوتا تھا، اس کو بلا ردوکد نقل کرتے تھے۔ (۱)

مقبولیت: اپنی اسی شرافت، حسنِ اخلاق، میانہ روی اور عدل پسندی کی وجہ سے ہر طبقہ ومسلک کے لوگوں میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔

عبادت وریاضت: علمی کمالات کی طرح عبادت وریاضت اور تقویٰ وتدین میں بھی ممتاز تھے، کہا جاتا ہے کہ وہ مشائخ صوفیہ میں تھے اور عبادت وریاضت اور مجاہدات سے بڑا شغف رکھتے تھے، ان کا دل رذائل سے پاک صاف تھا۔

وفات: مورخین کا اتفاق ہے کہ محرم ۷۶۲ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، بعض نے تاریخ وفات ۱۱ محرم لکھی ہے، قاہرہ میں انتقال ہوا اور یہیں تجہیز وتکفین بھی ہوئی۔ (۲)

تصنیفات: اوپر گذر چکا ہے کہ زیلعی کو علم وفن سے بڑا اشتغال تھا اور ان کا زیادہ وقت

(۱) الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۳۱۰ (۲) الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۳۱۰۔

کتابوں کے مطالعہ اور حدیثوں کی جمع و تخریج میں گذرتا تھا، اس لیے ان سے متعدد کتابیں یادگار رہی ہوں گی مگر افسوس کہ ان کے حالاتِ زندگی بہت کم معلوم ہو سکے اور ان کی چند ہی کتابوں کا پتہ چل سکا جو یہ ہیں:

۱۔مختصر معانی الآثار: یہ امام طحاوی کی مشہور اور بے نظیر کتاب معانی الآثار کا مختصر ہے، کوثری صاحب کا بیان ہے کہ ازہر کے کتب خانہ رواق اتراک اور آستانہ کے کتب خانہ کوبریلی میں اس کے نادر قلمی نسخے موجود ہیں۔

۲۔تخریج احادیث الکشاف: اس میں علامہ زمخشری کی مشہور تفسیر کشاف کی حدیثوں اور آثار کی تخریج کی گئی ہے، مگر حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ ''جن مرفوع حدیثوں کو زمخشری نے اشارۃً ذکر کیا تھا، ان کی تخریج نہیں کی گئی ہے اور موقوف آثار و روایات سے بھی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔''(۱) اس کمی کے باوجود اس کے استیعاب کا انھوں نے اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ مرفوع حدیثوں کی تخریج اور ان کے اسناد و طرق کی وضاحت میں خصوصیت سے بڑا اہتمام کیا گیا ہے اور نہایت دقتِ نظر سے کام لیا گیا ہے، انھوں نے ''الکافی الشاف فی تحریر احادیث الکشاف'' کے نام سے ایک جلد میں اس کا خلاصہ لکھا تھا اور ایک جلد میں اس پر استدراک بھی لکھا تھا، آخر الذکر میں ان مرفوع حدیثوں کی جن کو صاحب کشاف نے اشارۃً ذکر کیا تھا اور ان موقوف آثار کی جن سے زیلعی نے کوئی تعرض نہیں کیا تھا، تخریج کی گئی ہے، یہ پتہ نہیں کہ اصل و تلخیص چھپیں یا نہیں؟ لیکن کتب خانہ خدیویہ مصر میں ان کے قلمی نسخے موجود ہیں۔(۲)

۳۔نصب الرایہ فی تخریج احادیث الهدایہ: یہ زیلعی کی بڑی مفید اور سب میں اہم اور مشہور کتاب ہے، اگر انہوں نے کوئی اور کتاب نہ لکھی ہوتی تو تنہا یہی کتاب ان کے فضل و کمال اور شہرت و مقبولیت کے لئے کافی تھی، اس میں انہوں نے فقہ حنفی کی مشہور

(۱) الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۳۱۰ و کشف الظنون ج ۲ ص ۳۱۴ (۲) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱۔

ومعرکۃ الآرا کتاب الھدایہ کی حدیثوں کی تخریج کی ہے اس کی بعض نمایاں اور اہم خصوصیات یہ ہیں:

۱- یہ ہدایہ کی سب سے اہم اور پہلی تخریج ہے، اس کی اس سے عمدہ اور بہتر کوئی تخریج نہیں لکھی گئی، پس اس کو ہدایہ کی تمام تخریجات میں مزیت اور اولیت کا شرف حاصل ہے، بعض لوگوں نے علاؤالدین ترکمانی کی بھی جو زیلعی سے پہلے گذرے ہیں، ایک تخریج ہدایہ کا ذکر کیا ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے، انھوں نے ہدایہ کی تخریج کے بجائے اس کی شرح اور خلاصہ لکھا تھا، البتہ ان کے ہم عصر حافظ عبدالقادر قرشی صاحبِ جواہر مضیہ کی تخریج کا ضرور ثبوت ملتا ہے، مگر یہ نہ تو متداول ہے اور نہ اس کا کوئی مکمل نسخہ ہی موجود ہے، علاوہ ازیں قرشی کا طبقہ زیلعی سے متاخر ہے، اس لیے ان کی تخریج بھی زیلعی کے بعد لکھی گئی ہوگی، اسی طرح حافظ ابن حجر کا زمانہ بھی زیلعی کے بعد کا ہے، ان کی کتاب درایہ دراصل نصب الرایہ کا ملخص ہے۔

۲- یہ تخریج لکھ کر مصنف نے جس طرح حنفی مذہب کی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اسی طرح دوسرے فقہی مذاہب کی بھی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے، کیوں کہ انھوں نے صرف حنفی مسلک اور اس کے دلائل بیان کرنے ہی پر اس میں اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ دوسرے ائمہ کے مذاہب اور ان کے دلائل، تخریجات وتفریعات بھی تفصیل ووضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں، اس اعتبار سے یہ محض حنفی مذہب ومسلک ہی کا عمدہ اور بیش قیمت ذخیرہ نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت دائرۃ المعارف اور انسائیکلو پیڈیا کی ہے جس میں تمام ائمہ مجتہدین وفقہائے امصار کے مسالک و دلائل کی مکمل تفصیل موجود ہے۔

مصنف نے جہاں اس میں حنفی ائمہ کی امہات کتب سے معلومات ومسائل نقل کیے ہیں وہیں شوافع میں بیہقی، نووی اور ابن دقیق العید، مالکیہ میں ابن عبدالبر اور حنابلہ میں ابن جوزی اور ابن عبدالہادی وغیرہ اساطینِ مذہب کی کتابوں کے مباحث ومندرجات کا

بھی منتخب حصہ شامل کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ علمائے احناف کی طرح دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اس سے نقل و استفادہ کرتے رہے ہیں، زرکشی اور ابن حجر کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

۳- اس میں فقہ و حدیث اور رجال کی اکثر کتابوں کے مباحث و مطالب درج ہیں، اس لیے اس کو دیکھنے کے بعد ان کتابوں کی احتیاج باقی نہیں رہتی، متعدد ایسی کتابوں کے مندرجات بھی جمع کیے گئے ہیں جو دستبردِ حوادث سے معدوم ہو گئی ہیں، یا اگر ہیں تو اتنی کمیاب اور نادر الوجود ہیں کہ ان کا حصول و دسترس ہر شخص کے لیے ممکن نہیں، جیسے صحیح ابو عوانہ، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن السکن اور معاجم، مسانید اور سنن کے دوسرے متعدد مجموعے، ابن عبدالبر کی کتاب الاستذکار والتمہید یا بیہقی، خطیب، ابن عدی ابو حاتم اور ابن جوزی وغیرہ کی علل و رجال کی ناپید کتابیں۔

۴- احکامی احادیث و روایات کے استقصا کے لحاظ سے یہ بے نظیر کتاب ہے، علاوہ ازیں حدیثوں سے مستنبط مسائل اور فقہی فوائد و مطالب پر مصنف نے بڑی عالمانہ گفتگو کی ہے اور بحث و تحقیق اور تلاش و جستجو کا حق ادا کر دیا ہے۔

۵- اس کی ایک اہم خصوصیت مصنف کی انصاف پسندی اور غیر جانبداری ہے، ان کا اصل مقصد ہدایہ کی حدیثوں کی تخریج اور حنفیہ کے نقطۂ نظر کے دلائل و شواہد پیش کرنا ہے مگر جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، انھوں نے دوسرے فقہی مذاہب اور ائمہ مجتہدین کے اقوال و دلائل بھی نہایت دیانتداری کے ساتھ بیان کیے ہیں، نہ کسی طرح کی عصبیت اور جانبداری سے کام لیا ہے اور نہ اپنے مذہب و مسلک کی بے جا حمایت اور تائید کی ہے۔

۶- صرف فقہی حیثیت ہی سے اس کی اہمیت نہیں ہے، بلکہ یہ حدیثِ نبوی کی بھی نہایت مفید اور عظیم الشان خدمت ہے کیوں کہ یہ حدیث کے مباحث و مطالب، متون و اسناد اور اصول حدیث کے بعض مسائل پر نادر تحقیقات' در پُر مغز معلومات کا بھی ایک خزانہ ہے، چنانچہ حدیثوں کی صحت و عدمِ صحت اور اسناد و رجال کی قوت و ضعف کا اس سے مکمل

اندازہ ہو جاتا ہے کیوں کہ مصنف نے یہ تصریح کر دی ہے کہ اس سند میں فلاں راوی مجروح یا متکلم فیہ ہے، اسی طرح اگر کسی حدیث کے ہم معنی دوسری حدیثیں بھی ہوتی ہیں تو وہ ان کو بھی مع سند ومتن ذکر کر دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جرح وتعدیل کے موضوع پر ائمہ فن، جہابذہ محدثین اور علمِ رجال واسناد کے ماہرین کے اقوال کا یہ ایسا عظیم الشان ذخیرہ ہے جو اصول حدیث اور اسماء الرجال کی موجودہ مروج ومتداول کتابوں میں بھی موجود نہیں ہے، اگر ان سب بحثوں کو اکٹھا کر لیا جائے تو یہ فنِ جرح وتعدیل کا ایک ضخیم مجموعہ بن جائے گا۔

۷- اس سے حدیثوں کے ماخذ ومرجع کا علم ہو جاتا ہے کیوں کہ زیلعی نے ہر ہر حدیث کے بارے میں یہ تحریر کر دیا ہے کہ اس کو کس محدث نے اپنی کس کتاب میں نقل کیا ہے۔

ان خصوصیات سے نصب الرایہ کی عظمت واہمیت کا کسی قدر اندازہ کیا جا سکتا ہے، درحقیقت یہ فقہ وحدیث، اصولِ حدیث اور رجال کا ایسا مفید اور مستند ذخیرہ ہے جس کے مطالعہ سے کوئی محدث وفقیہ بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

حافظ ابن حجر نے الدرایہ فی تلخیص نصب الرایہ کے نام سے اس کا ایک مختصر لکھا تھا، جو ہندوستان میں دوبارہ چھپا ہے اور قاسم بن قطلوبغا حنفی نے ''منیۃ الالمعی فیما فات من تخریج احادیث الہدایہ للزیلعی'' کے نام سے ذیل تحریر کیا تھا۔

تخریج زیلعی کا پہلا اڈیشن ۱۳۰۱ھ میں مطبع علوی لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اور دوسرا ۱۳۵۷ھ (مطابق ۱۹۳۸ء) میں مجلس علمی ڈابھیل نے مصر سے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپا ہے، یہ محققانہ مقدمہ اور مفید حواشی پر مشتمل ہے۔

نَضَّرَ اللّٰهُ اَمْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِيْثًا فَبَلَّغَهُ (حدیث)

تذکرۃ المحدثین

حصہ سوم

اس میں چھٹی صدی ہجری سے خانوادہ شیخ عبد الحق دہلوی تک کے ممتاز اور صاحب تصانیف ہندوستانی محدثین کرام کے حالات زندگی وسوانح اور ان کی علمی و دینی اور محدثانہ خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

الحمدللّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی محمد الامین وعلی الہ واصحابہ اجمعین

قرآن مجید کے بعد مسلمانوں کا اصلی دارومدار ان احادیث نبوی پر ہے جو آنحضرت ﷺ کے واسطہ سے صحیح اور مستند طریقہ پر ان تک پہنچی ہیں، قرآن مجید میں جو اصول وکلیات، بنیادی تعلیمات و ہدایات اور مجمل احکام بیان کیے گئے ہیں، رسول اکرم ﷺ نے اپنے اقوال واعمال کے ذریعہ ان کی تشریح وتفصیل کی ہے، اس لیے مسلمانوں کا اصل سرمایہ اور رأس المال یہی دونوں چیزیں ہیں، آپؐ نے فرمایا ہے کہ ''اگر میرے بعد تم لوگ ان دونوں چیزوں کو مضبوطی سے اختیار کرو گے تو ضلالت میں نہیں پڑو گے۔''

آنحضرت ﷺ کے ساتھیوں اور جاں نثاروں نے آپؐ کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اور آپؐ کی ایک ایک بات کو نہ صرف یاد رکھا بلکہ آپؐ کی تعلیم وتلقین کے مطابق اسے دوسروں تک بھی پوری احتیاط اور ذمہ داری سے پہنچایا، اس طرح برابر چراغ سے چراغ جلتا رہا اور ہر دور میں احادیث سے مسلمانوں کا شغف وانہماک قائم رہا، جس کی بنا پر آپؐ کے اقوال واعمال اور سیرت وزندگی کا کوئی پہلو لوگوں سے مخفی ومستور نہیں رہا۔

ابتدا میں گو تحریر و کتابت کا زیادہ رواج نہیں تھا، کیوں کہ عربوں کا حافظہ قوی ہوتا تھا نیز قرآن مجید سے احادیث کے خلط ملط ہو جانے کا اندیشہ تھا، تاہم احادیث کی جمع و تدوین کا سلسلہ آپؐ کے عہد مبارک ہی میں شروع ہو گیا تھا اور بعض صحابہ کرامؓ کے پاس ایسے صحائف اور نوشتے موجود تھے جن میں حدیثیں قلم بند تھیں، صحابہؓ کے آخری دور میں احادیث کی نقل و اشاعت کا رواج عام طور پر ہو گیا تھا اور مسلمانوں کی ایک جماعت صرف اسی کام کے لیے مخصوص ہو گئی تھی جس کو محدثین کہا جاتا ہے، ان لوگوں نے صرف احادیث کو نقل و جمع کرنے ہی کا کام انجام نہیں دیا بلکہ ان کا مہتم بالشان کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حالات و واقعات کو پوری صحت کے ساتھ جمع کیا، حدیثوں اور ان کے راویوں کی مکمل تحقیق اور پوری چھان بین کی۔

احادیث کی باقاعدہ جمع و تدوین کا کام لگ بھگ پہلی صدی ہجری کے آخر میں شروع ہوا، مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں کہ دوسری قوموں کے یہاں جب کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلم بند کیے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلم بند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام و نشان تک نہیں معلوم ہوتا اور ان افواہوں میں وہ واقعات انتخاب کر لیے جاتے ہیں جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں، یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں، لیکن اس معاملہ میں مسلمانوں نے جو معیار قائم کیا وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول روایت کا تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟ کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بیں؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا

پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا، سیکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کردیں، ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے، جولوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کیے، ان تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال (بیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہوگیا جس کی بدولت آج کم ازکم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہوسکتے ہیں۔

تحقیق واقعات کا دوسرا اصول درایت کا تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہیں، اصول روایت ودرایت پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں، سیرۃ النبیؐ کے مقدمہ اور خطبات مدراس میں بھی اس کی پوری تفصیل موجود ہے، یہاں صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ احادیث کی جمع وتدوین اور راویوں کی چھان بین میں محدثین نے کس قدر کدوکاوش اور محنت وجانفشانی کی ہے جس کی بدولت احادیث اور روایات کے صحیح و مستند مجموعے مرتب ہوئے۔

دارالمصنفین نے مسلمانوں کے علوم وفنون کی تاریخ مدون کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں اس کے پیش نظر محدثین کرام کے حالات وکارناموں پر مبسوط کتاب لکھنا بھی تھا، یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس کی دو جلدیں الحمدللہ اس سے پہلے چھپ کر مقبول ہوچکی ہیں، مگر ان دونوں جلدوں میں ہندوستان کے باہر کے محدثین کا ذکر تھا، غیر ہندوستانی محدثین کا سلسلہ ابھی نامکمل ہی تھا کہ اہل علم کی جانب سے اس کا تقاضا ہونے لگا کہ پہلے ہندوستانی محدثین کا تذکرہ قلم بند کیا جائے، یہ اصرار وتقاضا بیجا نہیں تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس کے بھروسے پر ہندوستان کے مشہور صاحب تصانیف محدثین پر کام شروع کردیا گیا اور خدا خدا کرکے اس کی ایک جلد مکمل ہوگئی۔

ہندوستان کے محدثین کے حالات کو ایک ہی جلد میں سمیٹنا ناممکن تھا، اندازہ ہے کہ کم ازکم ابھی دو جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل ہوگا، اس کتاب کو اس سلسلہ کی پہلی جلد سمجھنا

چاہیے ، ناظرین اس پورے سلسلہ کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں جو یقیناً ان اوراق کے مرتب کے لیے بھی بڑی خوش قسمتی اور دینی و دنیاوی سعادت کی بات ہوگی۔

یہ جلد محدثین ہند کے لیے مخصوص ہے ، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث کی اجمالی تاریخ یہاں بیان کر دی جائے۔

مسلمانوں کی علمی تاریخ نہایت زریں اور درخشاں ہے، انہوں نے جس چپہ زمین پر قدم رکھا وہاں علم و ہنر کا ایک تازہ جہاں آباد ہو گیا، ہندوستان بھی ان کے علم و فن کی برکتوں سے مالا مال ہے۔

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان حملہ آور اور فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور اس سے ان کے تعلق کا آغاز محمود غزنوی کے حملہ یا محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے زمانہ سے ہوتا ہے لیکن یہ خیال سراسر غلط ہے، دراصل ہندوستان سے عربوں اور مسلمانوں کا تعلق بہت قدیم ہے، عرب تاجروں اور سواحل ہند کے سوداگروں میں تجارتی تعلقات عرصہ سے چلے آرہے تھے، شمالی ہندوستان میں درۂ خیبر سے آنے والے مسلمان ترکوں اور افغانوں کا زمانہ چوتھی صدی ہجری کا آغاز ہے، لیکن جنوبی ہندوستان میں ملیبار اور کارومنڈل سے گجرات تک کے علاقہ میں عربوں کی آمد و رفت اور تجارت کا سلسلہ اسلام سے بہت پہلے شروع ہو گیا تھا اور وہ ان علاقوں میں آباد ہو گئے تھے جن کی اولاد آج تک وہاں موجود ہے، اسی طرح ہندوستان کی بعض قومیں اور جماعتیں بھی عرب کے بعض علاقوں میں مستقل طور سے آباد ہو گئی تھیں جن کے ناموں سے اہل عرب واقف تھے، خود رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ بھی ان کو جانتے تھے، احادیث و سیر کی کتابوں میں ان کے تذکرے بھی پائے جاتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کا بیان ہے کہ مسلمان ہندوستان کو اپنا مفتوحہ ملک نہیں بلکہ اپنا موروثی پدری وطن سمجھتے ہیں ، کیوں کہ بعض ضعیف روایتوں میں اس کا ذکر ہے کہ حضرت آدمؑ جب آسمان کی جنت سے نکالے گئے تو وہ اسی زمین کی جنت میں جس کا نام

ہندوستان ہے، اتارے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت آدمؑ لنکا میں اترے تھے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''دجنا'' میں اترے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق یہ دراصل دکھن کا علاقہ ہے جہاں سے ملک عرب میں متعدد قسم کی خوشبوئیں اور مسالے بھیجے جاتے تھے اور پھر عربوں کے ذریعہ وہ تمام دنیا میں پھیلتے تھے۔

ترکوں، پٹھانوں اور مغلوں کے آنے سے صدیوں پہلے جو اہل عرب اور مسلمان تاجر کی حیثیت سے سندھ اور ملیبار سے لے کر گجرات اور موجودہ مہاراشٹر تک بحر ہند کے پورے سواحل پر پھیل چکے تھے، وہ اپنے ساتھ اپنا دین، اپنا قرآن اور اپنے علوم وفنون بھی لائے تھے اور یہاں کی مختلف آبادیاں اور مسجدیں بھی تعمیر ہوگئی تھیں جو اسلام کی ابتدائی درس گاہیں تھیں، ان میں بیٹھ کر ان کے علماومحدثین قال اللّٰہ و قال الرسول کا آوازہ بلند کرتے تھے۔

۹۳ھ میں سندھ فتح ہوا جس کے بعد سے تیسری صدی ہجری کے شروع تک یہ علاقہ مسلمانوں کے زیرنگیں رہا، لیکن سندھ پر مسلمانوں کی تاخت کا سلسلہ حضرت عمرؓ کے عہد ہی سے شروع ہوگیا تھا، اس لیے اسی زمانہ سے یہاں مسلمان بھی آنا شروع ہو گئے جن میں بعض صحابہ کرامؓ بھی تھے، انہوں نے اور ان کے بعد تبع تابعین نے بھی اس ملک میں اس عہد کے دستور اور طریقہ کے مطابق حدیث کی روایت کی ہوگی۔

عربوں کے حکومت کے قیام کے بعد سندھ، دیبل، منصورہ اور ملتان وغیرہ علم و فن کا مرکز اور اصحاب علم و درس سے معمور تھے، لیکن اس زمانہ کی علمی و دینی سرگرمیوں اور اشخاص و رجال کا ذکر کم ملتا ہے، تاہم علم حدیث سے شغف رکھنے والے بعض علما و محدثین کے نام یہاں تحریر کیے جاتے ہیں، ان میں سے بعض عرب سے ہندوسندھ میں آئے اور بعض اپنے وطن ہندوسندھ کو چھوڑ کر ملک عرب میں جا بسے تھے۔

ربیع بن صبیح سعدی بصری (م ۱۶۰ھ)، ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندھی (۱) (م ۱۷۰ھ)، اسرائیل بن موسیٰ بصری (دوسری صدی ہجری)، ابوخالد یزید بن عبداللہ بیسری سندھی (دوسری صدی ہجری)، عباس بن عبداللہ سندھی (دوسری صدی ہجری)، عبدالرحمٰن ابوامیہ سندھی (دوسری صدی ہجری)، ابراہیم بن محمد دیبلی مکی (اوائل تیسری صدی ہجری)، ابومحمد (۲) رجا بن سندھی اسفرائنی (۲۲۱ھ)، ابومحمد خلف بن سالم سندھی بغدادی (م ۲۳۱ھ)، ابوالحسن محمد بن عبداللہ سندھی بصری (تیسری صدی ہجری)، ابومحمد موسیٰ سندھی (تیسری صدی ہجری)، ابوجعفر سندھی (تیسری صدی ہجری)، ابومحمد عبداللہ المنصوری، ابوالعباس احمد بن محمد المنصوری (چوتھی صدی ہجری)، شعیب بن محمد دیبلی (۳۱۵ھ کے بعد)، ابوجعفر محمد بن ابراہیم دیبلی مکی (۳۲۲ھ)، ابوالعباس احمد بن عبداللہ دیبلی نیشاپوری (۳۴۳ھ)، ابوالفوارس احمد بن محمد صابونی سندی مصری (م ۳۴۹ھ)، ابوالقاسم منصور بن محمد (۳۸۶ھ)، ابوبکر محمد بن علی بامیانی (م ۳۹۰ھ)، علی بن موسیٰ دیبلی بغدادی (چوتھی صدی ہجری)، خلف بن محمد دیبلی بغدادی (چوتھی صدی ہجری) وغیرہ۔

عربوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد غزنوی اور غوری سلاطین برسر اقتدار آئے، اس دور میں اور اس کے بعد کئی صدی تک گجرات اور ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر ہندوستان خصوصاً شمالی ہند میں معقولات کی گرم بازاری رہی اور دینی علوم تفسیر و حدیث سے لوگوں کا اشتغال بہت کم رہا، ایران، خراسان اور ماوراء النہر سے آنے والے اصحاب علم و درس کی ساری توجہ فقہ و خلاف، تصوف و کلام اور معقولات کی جانب مرکوز رہی اور فقہ میں بھی اصل زور فقہ حنفی کے فروغ و جزئیات ہی پر دیا جاتا تھا، علم دانائی و دانش مندی کی جانب رغبت بڑھ جانے کی وجہ سے حدیث کی امہات کتب کے بجائے امام صغانی کی مشارق الانوار

---

(۱) ابومعشر مشہور صاحب مغازی ہیں، ان کے خاندان میں متعدد علما و محدثین گزرے ہیں۔ (۲) اس خاندان میں بھی کئی اہل علم و فن پیدا ہوئے۔

داخل درس تھی، اگر کوئی امام بغوی کی مصابیح السنۃ اور مشکوۃ المصابیح بھی پڑھ لیتا تھا تو وہ محدث کامل سمجھا جاتا تھا، اس دردناک صورت حال کا ذکر نواب صدیق حسن خاں، مولانا حکیم سید عبدالحی رائے بریلوی سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور استاذ العلما مولانا سید سلیمان ندوی سابق ناظم دارالمصنفین نے اپنے اپنے مضامین وکتب میں دکھ کے ساتھ کیا ہے۔

درۂ خیبر سے آنے والے مسلمانوں نے اپنا قدم شمالی ہند کی طرف بڑھایا، سلاطین غزنہ کا دارالسلطنت لاہور تھا، اس لیے اس عہد میں لاہور میں زیادہ اصحاب علم وفن جمع ہوئے، ذیل میں علم حدیث سے شغف رکھنے والے اس دور کے بعض علما کے نام پیش کیے جاتے ہیں:

ابوالفتح عبدالصمد بن عبدالرحمٰن اشعثی لاہوری، سمرقندی (م ۴۲۹ھ)، شیخ اسماعیل لاہوری (۱) (م ۴۴۸ھ)، ابوالحسن علی بن عمر بن حکم لاہوری (م ۵۲۹ھ)، ابوالقاسم محمود بن خلف لاہوری اسفرائنی (م ۵۴۰ھ)، ابو محمد بختیار بن عبداللہ ہندی (م ۵۴۳ھ) ابوالحسن بختیار بن عبداللہ ہندی (م ۵۴۳ھ)، ابوالمکارم فضل اللہ بن محمد بوقانی سندھی (م ۶۰۰ھ)، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (م ۶۶۶ھ)۔

امام صغانی بھی اسی دور میں لاہور میں پیدا ہوئے اور ان کی تصنیف مشارق الانوار کو بڑی مقبولیت نصیب ہوئی، لیکن ان کا فیوض ہندوستان سے باہر زیادہ جاری رہا، ان کے بعد گوسناٹا رہا تاہم کوئی کلیہ مستثنیات سے خالی نہیں ہوتا، نویں صدی ہجری تک جو محدثین گزرے ہیں اور جن کو حدیث سے اشتغال رہا ہے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ (۷۲۵ھ)، مولانا شمس الدین یحییٰ اودھی (م ۷۴۷ھ)، عمر غزنوی (م ۷۷۳ھ)، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (م ۷۸۲ھ)، امیر کبیر سید علی ہمدانی (م ۷۸۶ھ)، مولانا فخر الدین زرادی، مولانا برہان الدین محمود دہلوی (۷۸۸ھ)، مولانا

---

(۱) یہ تفسیر وحدیث دونوں میں ممتاز اور مشہور واعظ تھے، جن کے ہاتھ پر بے شمار لوگ مسلمان ہوئے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پہلے شخص ہیں جو حدیث وتفسیر کا علم لاہور میں لائے۔

کمال الدین زاہد دہلوی (شاگرد مولانا برہان الدین دہلوی) وغیرہ۔

یہ کساد بازاری نویں صدی ہجری تک قائم رہی، آٹھویں صدی کے اواخر میں دکن کی بہمنی سلطنت قائم ہوئی، اس نے علم حدیث کی اشاعت کی طرف توجہ کی، گجرات کا علاقہ علم حدیث کے لیے کسی قدر شروع ہی سے زرخیز رہا ہے، نویں صدی کی ابتدا میں جب مظفر شاہ نے گجرات کی مستقل حکومت قائم کی تو علم حدیث کا تخم عرب سے ہندوستان کو منتقل ہونے لگا، اکبر کے دور میں گجرات، پھر ممالک محروسہ کا جزو بن گیا، اس کی وجہ سے اس کا فیض پورے ہندوستان میں پھیلنے لگا لیکن مرکزیت گجرات ہی کو حاصل رہی۔

غرض نویں صدی کے بعد ہندوستان میں نئے سرے سے علم حدیث کا آغاز ہوا، اس زمانہ میں حافظ محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی کے تلامذہ نے ہندوستان میں علم حدیث کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا، اس سلسلہ میں مولانا راجح بن داوٗد گجراتی (۹۰۴ھ)، مولانا وجیہ الدین محمد مالکی (م ۹۲۹ھ)، جمال الدین محمد بن عمر حضرمی (م ۹۳۱ھ) اور مولانا علاء الدین احمد نہروالی (م ۹۴۹ھ) کے نام قابل ذکر ہیں، حافظ سخاوی کے ایک اور شاگرد شیخ رفیع الدین شیرازی (م ۹۵۴ھ) سے شمالی اور جنوبی ہند دونوں جگمگا اٹھے، وہ سکندر لودی کے زمانہ میں دہلی آئے اور آگرہ میں درس و تدریس کا بازار گرم کیا، انہی کے شاگرد شیخ ابوالفتح تھانیسری تھے، میر سید عبدالاول زید پوری جونپوری (م ۹۶۵ھ) نے سب سے پہلے صحیح بخاری کی شرح لکھی، جن کے شاگرد شیخ طیب محدث سندھی تھے، مولانا عبدالمالک عباسی گجراتی (۹۷۷ھ) کو صحیح بخاری زبانی یاد تھی، حافظ ابن حجر اور ابن حجر مکی کے تلامذہ نے بھی حدیث کے نور سے ہندوستان کی سرزمین کو منور کیا، اس عہد کے باکمال لوگوں کی ایک نامکمل فہرست یہاں دی جاتی ہے:

شیخ محمد بن محمد عبدالرحمٰن مالکی مصری (م ۹۱۹ھ)، رکن الدین مخدوم متوٹھٹھوی (م ۹۴۹ھ)، شیخ احمد فیاض امیٹھوی (م ۹۸۱ھ)، ملا علی محدث سمرقندی (م ۹۸۱ھ)، شیخ بھکاری کاکوروی (م ۹۸۱ھ)، مولانا میر کلاں محدث اکبر آبادی (م ۹۸۳ھ)، شیخ عبدالمعطی

ابن حسن مکی (۹۸۹ھ) سید عبداللہ عیدروس (۹۹۰ھ)، شیخ سعید شافعی (م۹۹۱ھ)، شیخ محمد بن احمد بن علی فاکہی (م۹۹۲ھ)، شہاب الدین احمد بن بدرالدین مصری (م۹۹۲ھ)، حاجی ابراہیم محدث اکبرآبادی، مولانا عبدالرحمٰن محدث سرہندی (استاذ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی)، شیخ بہلول بدخشی دہلوی، شیخ ابراہیم بن احمد بن حسن بغدادی، شیخ ضیاء الدین مدنی، شیخ حمید سندھی، شیخ عبداللہ بن سعداللہ سندھی، شیخ رحمت اللہ بن عبداللہ سندھی (تینوں بھائی تھے، مؤخرالذکر دونوں شیخ علی متقی (م۹۷۵ھ) کے تلمیذ تھے)، شیخ برخوردار سندھی، یہ بھی شیخ علی متقی کے شاگرد تھے، شیخ عبداللہ لاہوری اور شیخ محمد بن طاہر پٹنی کا زمانہ بھی یہی ہے جن کا اور شیخ علی متقی کا تذکرہ اس جلد میں درج ہے، گیارہویں صدی کے اوائل میں جن لوگوں نے علم حدیث کی نشر واشاعت کی، ان کے نام یہ ہیں:

شیخ یعقوب صرفی کشمیری (م۱۰۰۳ھ) شیخ جوہرناتھ کشمیری (م۱۰۲۶ھ)، حاجی محمد کشمیری، ملا محمد شگرف محدث کشمیری، شیخ عبدالنبی گنگوہی، شیخ عبداللہ بن شمس الدین سلطان پوری، قطب الدین عباسی نہروالی، شیخ احمد بن اسماعیل مندوی اور شیخ علیم الدین مندوی وغیرہ۔

خزاں کے بعد بہار آتی ہے، چنانچہ اکبر کے آخری دور میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی پیدا ہوئے اورانہوں نے عہد جہانگیری میں اپنی جہانگیری کا سکہ بٹھا دیا، ان کی اور ان کے خاندان کی بدولت شمالی ہند میں حدیث کا عام چرچا ہوگیا جن کے اولیات اور کارناموں پر اس جلد میں مفصل بحث ملے گی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہی کے معاصر حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی بھی تھے جن کے اصلاحی وتجدیدی کارناموں کی گونج آج تک پورے ہندوستان میں سنائی دیتی ہے ان کا پایۂ علم حدیث میں بھی بہت بلند تھا، مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں کہ ان کی تعلیم کی بنیاد اتباع سنت پر تھی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ علم حدیث اور شمائل کی طرف

لوگوں کی توجہ زیادہ مبذول ہوگئی اور ان کے بعد صوفی محدثوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ ہندوستان میں قائم ہوگیا۔

گیارہویں صدی کے خاتمہ کے بعد عبداللہ لاہوری محدث مکہ معظمہ میں، ابوالحسن سندھی (م ۱۱۳۹ھ) مدینہ منورہ میں مسند نشین تھے، اسی زمانہ میں جب کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا دریائے فیض جاری تھا، ہندوستان کی سرزمین پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی جامع کمالات ہستی نمودار ہوئی، انہوں نے اسلامی علوم وفنون کی از سرنو تجدید کا اہم کارنامہ انجام دیا، ان کا اور ان کی اولاد کا فیض آج تک اس برصغیر ہی نہیں پوری دنیا میں جاری ہے، انشاء اللہ اس کی تفصیل آئندہ جلد میں بیان ہوگی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی بدولت ہندوستان کا کوئی گوشہ بھی قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صدا سے خالی نہیں رہا، اس لیے علم حدیث کی مرکزیت بھی کسی مخصوص علاقہ تک محدود نہیں رہی بلکہ ہر صوبہ اور ہر مقام اس کا مرکز ہوگیا، اس کی تفصیل بھی آئندہ جلدوں میں آئے گی، جن کی تکمیل کے لیے ناظرین سے مکرر دعا کی درخواست ہے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا ج اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

ناچیز

ضیاء الدین اصلاحی

۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۰ء مطابق ۴ر ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام حسن صغانی

(المتوفی ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء)

نام ونسب: حسن نام، رضی الدین لقب، ابوالفضائل کنیت اور نسب نامہ یہ ہے:
حسن بن محمد بن حسن بن حیدر بن علی۔(۱)

عبدالقادر قرشی (متوفی ۷۷۵ھ/۱۳۷۳ء) نے علی کے بعد اسماعیل کے نام کا اضافہ کیا ہے۔(۲)

خاندان: امام صغانی عربی النسل تھے، ان کا تعلق قبیلۂ قریش کی اس شاخ سے تھا جس میں خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ پیدا ہوئے تھے، اسی لیے عمری وقرشی کی نسبت سے مشہور ہوئے، وہ عدوی بھی کہلاتے تھے، یہ حضرت عمرؓ کے دادا عدی بن کعب بن لوی کی طرف نسبت ہے۔(۳)

---

(۱) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷ والفوائد البہیہ، ص ۲۹۔ (۲) الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ، ج ۱، ص ۲۰۱۔
(۳) کتاب الانساب، ورق ۳۸۶۔

ولادت: عام مؤرخین کے بیان کے مطابق ان کی ولادت ۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء میں ہوئی (۱) بعض نے ۱۰ رصفر (۲) اور بعض نے ۱۵ رصفر (۳) تاریخ لکھی ہے، عبدالقادر قرشی نے روز پیدائش پنجشنبہ لکھا ہے (۴) نزہۃ الخواطر میں سنہ پیدائش ۵۵۷ھ/۱۱۶۱ء درج ہے (نزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۱۲۷) جو اغلب ہے کہ کتابت کی غلطی ہوگی۔

اس زمانہ کے ایک فاضل مولانا عبدالحلیم چشتی نے جمہور کے بیان پر اپنی بے اطمینانی ظاہر کی ہے اور ثبوت میں تاج العروس (للسید مرتضٰی زبیدی) کے حوالہ سے خود صغانی کا حسب ذیل بیان نقل کیا ہے جو ان کی تصنیف العباب الزاخر سے ماخوذ ہے:

سمعت والدی المرحوم بغزنة فی	میں نے ۵۸۰ھ (۵) میں غزنہ میں اپنے
شهور نیف وثمانین وخمس مائة	والد مرحوم سے سنا تھا، وہ فرماتے تھے کہ
یقول کنت اقرء کتاب الحماسة لابی	جس زمانہ میں اپنے استاد سے ابوتمام کا
تمام علی شیخی بغزنة ففسرلی	حماسہ پڑھتا تھا، مجھے یاد ہے (۶) کہ انہوں
هذا البیت :	نے اس شعر:
بیض مفارقنا تغلی مراجلنا ناسوا	''ہمارے سر کے بال مشک کے استعمال کی
باموالنا آثار ایدینا، واول لی فی قوله	وجہ سے سفید ہوگئے ہیں، ہماری دیگیں
بیض مفارقنا مائتی تاویل فاستغربت	(مہمانوں کے لیے) جوش کھا رہی ہیں،
ذلک حتی وجدت الکتاب الذی	ہمارے ہاتھوں کے زخموں کا علاج ہم اپنے

(۱) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷ والفوائد البہیہ، ص ۲۹۔ (۲) الجواہر المضیہ، ص ۲۰۱ وتاج التراجم فی طبقات الحنفیہ، ص ۱۸۔ (۳) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۸۱ واتحاف النبلاء المتقین، ص ۲۴۳ وتذکرہ علمائے ہند، ص ۴۸۔ (۴) تاج التراجم، ص ۱۸ والجواہر المضیہ، ص ۲۰۱۔ (۵) مولانا نے شہور نیف وثمانین وخمس مائۃ کا ترجمہ ۵۸۰ھ کیا ہے۔ (۶) مولانا نے اپنے خیالات کو درست ثابت کرنے کے لیے کہیں کہیں ترجمہ میں اصل کی رعایت نہیں کی ہے۔

يبين فيه هذه الوجوه ببغداد في حدود سنة اربعين و ستمائة والحمدلله على نعمه

اموال سے کرتے ہیں، یعنی ہم سردار ہیں، دیت دیتے ہیں، ہم سے قصاص نہیں لیا جاتا" کا مطلب بتایا، پھر شاعر کے اس قول بیض مفارقنا کی دو سو تاویلیں بیان کیں، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ کہیں اتنے سے جملہ کی دو سو تاویلیں کی جاسکتی ہیں تا آنکہ مجھے ۶۴۰ھ میں بغداد میں وہ کتاب مل گئی جس میں اس کے یہ وجوہ مذکور تھے۔

صغانی کے اس بیان کی وجہ سے مولانا کے نزدیک یہ ثابت ہے کہ "یہ واقعہ سن شعور کا ہے، لہٰذا سنہ ولادت ۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء ہرگز صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا" (۱) وہ مزید فرماتے ہیں کہ "صغانی نے اپنے قیام غزنہ ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء کا ایک نہایت علمی واقعہ اپنے والد کی زبانی نقل کیا ہے، جمہور مؤرخین کے قول پر اس وقت صغانی کی عمر مشکل سے تین سال کی ہوتی ہے، تین برس کا جو اچھی طرح سے بول بھی نہیں سکتا، وہ عربی ادب کی بلند پایہ کتاب حماسہ کو کیا سمجھ سکتا ہے اور اس کے اشعار کو کیوں کر یاد رکھ سکتا ہے۔" (۲)

تعجب ہے کہ مولانا نے نیف ثمانین وخمس مأۃ کا ترجمہ ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء کس طرح کیا ہے، ان کی بے اطمینانی اور جمہور کی رائے سے اختلاف میں خود ان کی مسامحت کو بڑا دخل ہے۔

ان کے نزدیک صغانی کا سنہ پیدائش ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء ہے، انہوں نے علامہ ذہبی کا یہی قول بتایا ہے جسے مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں ذہبی کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور تیرہویں صدی ہجری کے عالم و مؤرخ اسماعیل پاشا بن محمد امین البغدادی نے بھی ہدیۃ العارفین میں یہی سنہ پیدائش نقل کیا ہے، مولانا نے اس کی تائید میں بعض اور قرائن بھی پیش کیے ہیں

(۱) معارف، جلد ۸۳، عدد ۱، ص ۱۲۔ (۲) ایضاً۔

اور لکھا ہے کہ ان سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ جو سال ولادت سید مرتضیٰ زبیدی نے نقل کیا ہے وہی صحیح ہے۔(۱)

ان مختلف بیانات کی وجہ سے صغانی کے سنہ ولادت کی صحیح تعیین مشکل ہے، تاہم اس قدر مسلم ہے کہ وہ آخری غزنوی فرماں رواخسرو ملک (۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء تا ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء) کے دور حکومت میں پیدا ہوئے۔

مولد ووطن: ان کے آباء واجداد صغان میں آباد تھے جو ماوراء النہر میں ترمذ کے قریب دریائے دخش (سرخ آب) کے مغربی اور دریائے جیحون کے جنوبی علاقہ میں واقع تھا، یہ ایک سرسبز وشاداب اور زرخیز مقام تھا(۲) صغان اور صغانیان، چغان اور چغانیان کا معرب ہے، اہل عجم اسے چغان و چغانیان ہی کہتے تھے، مگر اہل عرب عموماً جیم فارسی (چ) کو صاد سے بدل دیتے ہیں، اس لیے وہ صغان اور صغانیان کہتے تھے، صغانی اسی کی جانب نسبت ہے، بعض لوگ صاخان (چاغان) بھی کہتے ہیں اور صغانی کے بجائے صاغانی کی نسبت سے منسوب کرتے ہیں(۳) موجودہ جغرافیہ میں اس جگہ کو سرآسیا کہا جاتا ہے۔

صغانی کے بزرگ صغان سے ترک سکونت کر کے لاہور میں آباد ہوئے، مؤرخین نے اس کی صراحت نہیں کی ہے کہ امام صغانی کے بزرگوں میں سے کون پہلے لاہور آیا، تاہم اس پر سب متفق ہیں کہ وہ لاہور میں پیدا ہوئے جو غزنویوں کا دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے ایک بڑا سیاسی، تمدنی اور علمی مرکز تھا، لیکن صغانی کی پیدائش کے زمانہ میں اس سلطنت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں، چنانچہ چند ہی سال بعد غوریوں نے غزنویوں کا خاتمہ کر کے اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالی اور اس کا مرکز لاہور کے بجائے دہلی کو بنایا، اس لیے صغانی اپنے بچپن ہی میں غزنہ چلے آئے اور یہیں ان کی نشوونما ہوئی۔

---

(۱) معارف، جلد۸۳، عدد۱، ص۱۲-۱۲۔ (۲) معجم البلدان، ج۵، ص۳۶۱ ومآثر الکرام، ص۱۸۱ واتحاف النبلاء المتقین، ص۲۴۳۔ (۳) بغیۃ الوعاۃ، ص۲۲۷، الفوائد البہیہ، ص۳۰ ونزہۃ الخواطر، ج۱، ص۱۳۷۔

صغانی کے مولد ووطن کے بارے میں مؤرخین اور تذکرہ نگاروں کے متفقہ بیان کے برخلاف خواجہ نظام الدین اولیا نے ان کا وطن بدایوں بتایا ہے، فرماتے ہیں ''او از بداؤں افتاد''(۱) اس کی وجہ سے مولانا حکیم عبدالحیؒ صاحب نزہۃ الخواطر کو خیال ہوا کہ یہ صغانی دوسرے شخص ہیں، چنانچہ انہوں نے ان دونوں کا علاحدہ علاحدہ تذکرہ لکھا ہے۔

مولانا عبدالحلیم چشتی نے بجاطور پر مولانا کے اس خیال کی تردید کی ہے، ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ایک نام کے بیک وقت کئی صاحب کمال ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں، لیکن دو ہم عصر مصنف نے ایک ہی موضوع پر کئی کتابیں لکھیں اور نام بھی ایک ہی رکھیں ایسا نہیں ہوا ہے۔

۲۔کتاب کی اندرونی شہادتوں سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ رضی الدین نام کی کوئی دوسری شخصیت بھی تھی۔

الف: امیر حسن سنجری حضرت نظام الدینؒ سے ناقل ہیں۔

بعد ازاں نسبت حدیث سخن در فضیلت مولانا رضی الدین صغانی صاحب مشارق الانوار افتاد رحمۃ اللہ علیہ وآنچہ نوشتہ است کہ ایں کتاب حجت است میان من وخدائے۔(۲)	اس کے بعد حدیث کی مناسبت سے مولانا رضی الدین صغانی صاحب مشارق الانوار کی فضیلت اور ان کی اس تحریر کے متعلق گفتگو ہونے لگی یہ کہ یہ کتاب میرے اور خدا تعالیٰ کے درمیان حجت ہے۔

صغانی نے مشارق الانوار کے مقدمہ میں لکھا ہے:

هذا الكتاب حجة بيني وبين الله	یہ کتاب صحت وثبوت، اتقان ومتانت میں

(۱) فوائد الفواد، ص۱۰۳، مطبع اودھ لکھنؤ، ۱۸۸۵ء، وص۱۷۹، مطبوعہ لاہور ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء۔ (۲) فوائد الفواد، ص۱۰۳۔

تعالیٰ فی الصحة والرصانة والاتقان والمتانة (۱)	میرے اور خدا کے درمیان حجت ہے۔

ب: خواجہ نظام الدین اولیاؒ فرماتے ہیں:

اگر چہ حدیث براو مشکل شدے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام را در خواب دیدے وصحیح کردے۔ (۲)	اگر انہیں کوئی حدیث مشکل معلوم ہوتی تھی تو رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھتے اور آپ سے اس کی صحت فرما لیتے۔

اس وصف میں بھی حسن صغانی لاہوری منفرد ہیں، مشارق الانوار میں مندرجہ ذیل حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

عن ابن عمر رضی الله عنهما ان الفتنة هٰهنا من حيث يطلع قرن الشيطان قال الصغانی مؤلف هذا الكتاب سمعته عن النبی صلی الله عليه وسلم قاله وهو يشير الی المشرق (۳)	حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا فتنہ وفساد ادھر ہے جہاں سے شیطان کا سینگ یعنی آفتاب نکلتا ہے، اس کو کتاب کا مؤلف صغانی کہتا ہے کہ میں نے خواب میں یہ حدیث آنحضرت ﷺ سے سنی اور آپ پورب کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

مولانا عبدالحلیم چشتی نے اس طرح کی متعدد حدیثیں نقل کی ہیں اور آخر میں سید مرتضیٰ زبیدی کی تاج العروس کے حوالہ سے مکہ معظمہ کے کنوئیں ادام کے متعلق یہ نقل کیا ہے:

ادام اسم بئر علی مرحلة من مكة حرسها الله تعالیٰ علی طريق السرين كما فی العباب قال الصاغانی رايت	ادام براہ سرین مکہ سے ایک منزل کی مسافت پر واقع ایک کنوئیں کا نام ہے جیسا کہ العباب میں مذکور ہے، صغانی کا بیان ہے

(۱) مشارق الانوار، مطبع رشادیہ استنبول ۱۳۲۶ھ ص ۴۔ (۲) فوائد الفواد ص ۱۰۳۔ (۳) مشارق الانوار ص ۲۱۔

النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یقول ادام من مکۃ — میں نے رسالت مآب ﷺ کو خواب میں دیکھا، آپؐ فرمارہے تھے ادام مکہ کے حدود میں داخل ہے۔

۳۔ حسن صغانی علم کے مقابلہ میں ہندوستان میں لقب سے زیادہ مشہور رہے ہیں، اس وجہ سے اس دور کی کتابوں میں حسن کے رضی الدین کے نام سے یاد کیے جاتے تھے، لہٰذا رضی الدین کو علم کی حیثیت دے کر بدایونی کہنا صحیح نہیں، چنانچہ سرورالصدور میں جو فوائد الفواد کے دور کی تالیفات میں ہے، شیخ فرید الدین ناگوری نے حسن صغانی کا جہاں بھی ذکر کیا ہے ان کے لقب رضی الدین ہی سے یاد کیا ہے۔

۴۔ مشارق الانوار کی نسبت سے نے تو صغانی کو لقب تک سے مستغنی کر دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ شیخ کمال الدینؒ نے مشارق الانوار کی جو سند خواجہ نظام الدین اولیا کو دی تھی اس میں لقب تک کا ذکر ضروری نہیں خیال کیا بلکہ صرف اتنا ہی لکھنا کافی سمجھا:

وھما یرویانہ عن مؤلفہ — اور مذکورہ بالا ہر دو شیخ اس کتاب (مشارق الانوار) کو اس کے مؤلف سے روایت کرتے ہیں۔

چشتی صاحب آخر میں تحریر فرماتے ہیں ''ہمارے خیال میں یہ دلائل اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ فوائد الفواد کے رضی الدین صغانی دراصل ابوالفضائل رضی الدین حسن صغانی ہی ہیں نہ کہ رضی الدین بدایونی۔''(۱)

گو مولانا عبدالحیٔ نے رضی الدین بدایونی کو رضی الدین حسن لاہوری سے علاحدہ ایک شخصیت قرار دیا ہے، مگر انہوں نے رضی الدین حسن صغانی کو بدایونی تسلیم نہیں کیا ہے،

(۱) معارف، جلد ۸۳، نمبر ۱، ص ۲۰ تا ۲۷۔

مگر اس دور کے بعض فاضل مؤرخین اور اہل قلم نے قدیم محققین اور مستند مؤرخین کے اقوال کو نظر انداز کر کے محض خواجہ نظام الدینؒ کے ایک مختصر و مبہم جملہ کی بنیاد پر ان کا مولد و وطن لاہور کے بجائے بدایوں قرار دیا ہے، مولوی سید ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں:

''وہ سلطان نظام الدین کی طرح بدایوں میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔''(۱)

اس متن کی مزید وضاحت حاشیہ میں اس طرح کی ہے:

''امام صغانی کے حالات اور تصانیف کا مآثر الکرام میں ذکر موجود ہے اور اس میں انہیں غلطی سے لاہوری لکھ دیا ہے لیکن سب سے واضح اور معتبر حالات وہ ہیں جنھیں سلطان نظام کی زبانی صاحب فوائد الفواد نے نقل کیا ہے۔''(۲)

حالانکہ صغانی کے لاہوری لکھنے کی غلطی صرف غلام علی آزاد بلگرامی ہی نے نہیں کی ہے بلکہ ان کے تقریباً تمام سوانح نگاروں نے کی ہے، یہاں تک کہ خود صغانی نے بھی کی ہے جیسا کہ علامہ احمد آفندی نے ان کے حوالہ سے تحریر کیا ہے:

قرأت في نسخة من العباب انه ولد في لوهور احدى مدن الهند الكثيرة الخيرات ويقال ايضًا لهاور (۳)	میں نے العباب کے نسخہ میں (خود مصنف کا یہ بیان) پڑھا ہے کہ وہ لاہور میں پیدا ہوئے تھے جو ہندوستان (موجودہ پاکستان) کے شہروں میں سے ایک نہایت عمدہ اور آباد شہر ہے، اسے لہاور بھی کہتے ہیں۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بھی ہاشمی صاحب کی بات دہرائی ہے، لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا رضی الدین حسن صغانی صاحب مشارق الانوار جن کا نام ہندوستان

(۱) تاریخ ہند کتاب دوم، ص ۲۶۲۔ (۲) ایضاً، ص ۲۶۳۔ (۳) الجاسوس علی القاموس مطبعۃ الجوائب قسطنطنیہ ۱۲۹۹ھ، ص ۳۴، بحوالہ معارف، ج ۸۳، نمبر ۱، ص ۱۹۔

کے علمائے حدیث میں سرفہرست آتا ہے، محمد غوری کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہونے سے تقریباً دس سال قبل بدایوں میں پیدا ہوئے تھے، وہیں انہوں نے دینی تعلیم حاصل کی اور وہیں اپنا ابتدائی زمانہ گزارا، جب بدایوں کا یہ عظیم المرتبت فرزند بغداد پہنچا تو بڑے بڑے عالموں کی گردنیں اس کے آگے جھک گئیں۔'' (۱)

اس سے زیادہ پرزور انداز میں انہوں نے دوسری جگہ لکھا ہے:

''مولانا رضی الدین حسن صغانی صاحب مشارق الانوار کے متعلق نظام الدین اولیا کا بیان ہے ''اواز بداؤں بود۔'' (۲)

اس کے حاشیہ میں رقم طراز ہیں:

''شیخ نظام الدین اولیا کا بیان ان وجوہات کی بنا پر ان سب لوگوں سے زیادہ قابل اعتبار ہے جنہوں نے ان کا وطن لاہور بتایا ہے:

۱۔ شیخ نظام الدین خود بدایوں کے تھے اور بدایوں کے متعلق اچھی معلومات رکھتے تھے۔

۲۔ ان کے استاد مولانا کمال الدین زاہد، مولانا برہان الدین بلخی تلمیذ شیخ رضی الدین حسن صغانی تھے، اس بنا پر استاذ الاستاذ کے متعلق ان کا بیان زیادہ معتبر ہے۔'' (۳)

اس دور کے ایک اور فاضل مولوی ضیاء احمد بدایونی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

حضرت محبوب الٰہی کی شہادت اور امیر حسن کی روایت کے بعد علامہ کی وطنیت میں شک اوران کے بدایونی ہونے میں تامل کرنا ایک ایسا وہم ہے جس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔'' (۴)

---

(۱) تاریخ مشائخ چشت، ج ۱، شائع کردہ ادارہ ادبیات دلی، ص ۲۰۰۔ (۲) حیات عبدالحق، ص ۱۲۔

(۳) ایضاً۔ (۴) مباحث ومسائل (مجلس اشاعت ادب دہلی) ص ۶۰۔۴

مولانا عبدالحلیم چشتی نے صغانی پر جو مبسوط مقالہ سپرد قلم کیا ہے، اس میں شبہ کی بھی مدلل تردید کی گئی ہے جس کو یہاں نقل کر دینا کافی ہوگا، وہ خواجہ صاحب کے بیان ''اوّاز بداؤں بود'' کے متعلق فرماتے ہیں:

ا۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہاں تصحیف ہوگئی ہے، فوائد الفواد کے اصل نسخہ میں غالباً ''اوّاز لاہور بود'' تھا، جس کو ناقل نے خط شکست میں ہونے کے باعث ''اوّاز بداؤں بود'' پڑھا اور چوں کہ خود نظام الدین اولیا کا وطن بھی بداؤں تھا، اس کو بداؤں سمجھنے میں کوئی تردد نہ ہوا، خط شکست میں لاہور کو بداؤں یا بدایوں سے ایک گونہ تجنیس خطی کی وجہ سے ان میں تصحیف ہو جانا چنداں مستبعد نہیں، کیوں کہ لا کی بد سے اور ہو کی او رسے اور ر کی ن سے مشابہت خط شکست میں ایسی قوی اور اتنی قریب تر ہے کہ اس تصحیف کے قبول کرنے میں انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی، جن لوگوں کی نظر سے مخطوطات کا ذخیرہ گزرا ہے وہ ہماری اس رائے کی تائید کریں گے، یہ ایسی قابل قبول توجیہ ہے کہ اس پر حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی شہادت بھی غلط قرار نہیں پاتی اور امیر حسن پر بھی خلط ملط اور سہو کا الزام عائد نہیں ہوتا، دراصل امیر حسن پر خلط ملط یا سہو ہونے کا الزام کسی طرح درست نہیں، کیوں کہ یہ کتاب بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی ایک زمانہ تک صوفیا کا دستور العمل رہ چکی ہے۔

۲۔ خلیق صاحب کو حسن صغانی کو بدایونی قرار دینے کے متعلق جو یہ شبہے ہوئے کہ ''شیخ نظام الدین اولیا خود بدایوں کے تھے اور بدایوں کے متعلق اچھے معلومات رکھتے تھے'' اس سے ہمارے اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے کہ لاہور کو بداؤں سمجھنے میں کاتب کو بھی یہی شبہے ہوئے ہوں گے اور بہت ممکن ہے کہ وہ بھی بدایوں کا ہو۔

۳۔ خواجہ نظام الدین اولیا بلا شبہ بدایوں میں پیدا ہوئے تھے اور بارہ برس تک بدایوں میں رہے، مگر پھر بدایوں سے زیادہ وابستگی نہیں رہی، بدایوں کے متعلق معلومات فراہم کرنا ان کے موضوع اور مسلک سے خارج تھا، نیز یہ حقیقت ہرگز فراموش نہیں کرنی

چاہیے کہ فوائد الفواد تذکرہ یا تاریخ کی کتاب نہیں ہے، پھر خواجہ نظام الدین صغانی کے بد واسطہ شاگرد ہیں، شمس الدین ذہبی مشہور مؤرخ اور حافظ الحدیث دمیاطی کے شاگرد ہیں جو صغانی کی جملہ مرویات اور مصنفات کے نہایت ثقہ اور نامور راوی ہیں، خود شمس الدین ذہبی عالم اسلام کے فن رجال اور تاریخ کے نادرۂ روزگار ناقد اور وسیع النظر عالم تھے، ان کا بیان ہر لحاظ سے قابل ترجیح تھا اور ہے۔(۱)

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا بیان بھی اس ضمن میں نقل کرنے کے لائق ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''شاید فوائد الفواد کے مرتب امیر حسن سنجری نے سہواً حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات کو کچھ خلط ملط کر دیا ہو اور اگر خلط ملط نہیں ہوا اور اس کو صاحب مشارق الانوار ہی کا ذکر سمجھا جائے تو پھر ''او (یعنی صاحب مشارق) از بداؤں بود'' کے اجمالی بیان سے وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ بداؤں ہی ان کا مولد تھا۔(۲)
>
> غرض بداؤں کو صغانی کا مولد منشا ماننا صحیح نہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ولادت کی طرح ان کی نشو ونما بھی لاہور میں ہوئی (۳) یہ خیال اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب یہ مانا جائے کہ ان کی ولادت ۵۵۵ھ میں ہوئی تھی، لیکن یہ ثابت نہیں ہے۔''

اس تفصیل سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔رضی الدین حسن صغانی اور رضی الدین بدایونی کو دو شخصیتیں قرار دینا درست نہیں۔

۲۔رضی الدین حسن صغانی کا وطن لاہور کے بجائے بدایوں ماننا غلط ہے۔

---

(۱) ماہنامہ معارف، جلد ۸۳، نمبر ۱، صفحات ۳۰ تا ۳۸۔ (۲) بزم مملوکیہ، ص ۴۴۔ (۳) تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۸۔

۳۔ بدایوں کو صغانی کا منشا سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے۔

اساتذہ: پہلے انہوں نے اپنے والد ماجد محمد سے علم وفن کی تحصیل کی، جو اپنے دور کے متبحر عالم اور لغت وعربیت میں یکتا تھے، مؤرخین اور ارباب سیر کا خیال ہے کہ وہ اپنے والد ہی سے علوم کی تحصیل وتکمیل کر چکے تھے، پھر مزید شوق وجستجوئے علم کی خاطر مختلف جگہوں کے سفر پر روانہ ہوئے اور وہاں کے شیوخ سے احادیث کا سماع اور کسب فیض کیا جن کے نام یہ ہیں:

بغداد: ابومنصور سعید بن محمد رزاز۔

مکہ معظمہ: برہان الدین ابوالفتوح نصر بن ابی الفرح محمد بن علی حصری، ان کی ولادت بغداد میں ہوئی مگر مکہ معظمہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اسی لیے امام الحرم اور امام الحطیم کہلاتے تھے، ۶۱۹ھ میں وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد۴، ص۱۷۵ و۱۷۶)

عدن: قاضی ابواسحاق ابراہیم بن احمد قرمطی (خطیب عدن)

ہندوستان: قاضی سعد الدین خلف بن محمد کروری حسنابادی، جو سلطان شمس الدین ایلتتمش کے دور کے سب سے بڑے قاضی تھے۔(۱)

نظام محمد بن حسن مرغینانی، نظام الدین عمر بن علی، صاحب ہدایہ کے فرزند، فقہ وفتاوی میں مرجع اور شیخ الاسلام کہلاتے تھے، جواہر الفقہ، الفواد اور کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔(۲)

تلامذہ: صغانی کے دامن فیض سے جو لوگ وابستہ رہے، ان کے نام یہ ہیں:

شرف الدین ابومحمد عبدالمومن دمیاطی، (۳) نظام الدین محمود بن عمر ہروی، محی الدین ابوالبقا صالح بن عبداللہ بن جعفر بن علی بن صالح اسدی کوفی معروف بہ ابن صباغ، شیخ برہان الدین محمود بن ابی الخیر اسعد البلخی (شارح آثار النیرین فی اخبار السمیین) محمد بن احمد بطال (۴)

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۱، ص۱۶۲۔ (۲) الفوائد البہیہ، ص۶۰۔ (۳) تذکرۃ المحدثین جلد دوم میں ان کا مفصل تذکرہ لکھا جا چکا ہے۔ (۴) صغانی کو ان سے استاذی اور شاگردی دونوں حاصل تھی۔

ابو الربیع سلیمان بن بطال، منصور بن حسن، احمد بن علی سرودی، ابو محمد سعد بن مسعود المنجوی، عز الدین ابن الوزیر علقمی۔

شیخ برہان الدین کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے ''امام صغانی کے شاگرد مولانا برہان الدین محمود دہلوی تھے، وہ امام مرغینانی صاحب ہدایہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے، سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے اور مشارق الانوار کا درس دینا شروع کیا، ۷۸۷ھ میں وفات پائی اور دہلی میں حوض شمسی کے پورب میں دفن ہوئے، ان کے خاص شاگرد مولانا کمال الدین زاہد دہلوی تھے، انہوں نے مشارق الانوار کی سند پر مولانا برہان الدین محمود سے حاصل کی اور علم حدیث میں یگانہ روزگار تھے اور دہلی میں اس کا درس دیتے تھے، بڑے متقی اور پرہیزگار تھے، سلطان غیاث الدین بلبن نے چاہا کہ ان کو اپنا امام مقرر کرے، مگر انہوں نے قبول نہیں کیا، حضرت نظام الدین سلطان الاولیا نے حدیث ان ہی سے پڑھی تھی اور مشارق الانوار کا درس بھی انہیں سے لیا اور اس کو زبانی یاد کیا۔ (مقالات سلیمان، ج ۲ ص ۳۹ و ۳۰، بحوالہ اخبار الاخیار، ص ۶۸)

جامعیت: امام حسن مختلف علوم وفنون میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، مولانا آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

وفنون کثیرہ تحصیل نمودو استعداد عالی بہم رسانده (مآثر الکرام، ج ا ص ۱۸۱)	متعدد علوم وفنون کی تحصیل کی اور ان میں عالی استعداد بہم پہنچائی۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی ان کی جامعیت کا ان لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں:

ذا مشارکة تامة فی العلوم	علوم میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے۔

(الفوائد البهیه، ص ۲۹)

لیکن حدیث، فقہ، لغت اور ادب میں زیادہ ممتاز اور صاحب کمالات تھے اور حدیث ولغت میں درجۂ امامت پر فائز تھے، آگے ان سب کی تفصیل قلم بند کی جائے گی۔

فقہ: فقہ میں درک وکمال حاصل تھا، صاحب ہدایہ کے فرزند عمر بن علی سے اس کی تحصیل کی تھی جو نہایت با کمال فقیہ تھے، اس فن میں شہرت وامتیاز کی وجہ سے سلطان قطب الدین ایبک نے انہیں لاہور کا قاضی مقرر کرنا چاہا تھا مگر ان کی طبیعت میں استغنا و بے نیازی تھی اور عہدہ منصب اور جاہ وحشمت سے ان کو کوئی رغبت نہ تھی، اس لیے انہوں نے منصب قضا کی پیشکش ٹھکرا دی اور وہاں سے غزنہ چلے گئے(۱) فقہ میں ان کی مہارت اور وسعت نظر کا دمیاطی نے بھی اعتراف کیا ہے(۲) اور مولوی رحمٰن علی لکھتے ہیں ''فقیہ کامل بود''(۳) یعنی فقہ میں صاحب کمال تھے، ابن عماد اور یافعی نے بھی ان کی فقہی بصیرت کا ذکر کیا ہے۔(۴)

حدیث: حدیث سے خاص اشتغال تھا، ہندوستان کے علمائے حدیث میں سرفہرست ان کا نام آتا ہے، جب یہ بغداد پہنچے تو اس فن کے بڑے بڑے علما کی گردنیں ان کے آگے جھک گئیں، صغانی کی غیر معمولی شہرت وعظمت کا ایک سبب اس فن میں ان کی بالغ نظری اور امتیاز وکمال بھی ہے، مورخین اور تذکرہ نگار حدیث میں ان کی بلند پائیگی اور نقد ونظر کے معترف ہیں، دمیاطی کا بیان ہے کہ وہ فن حدیث کے امام تھے، حدیث کے متعلقہ علوم رجال، جرح وتعدیل اور توثیق وتضعیف میں بھی یکتا تھے، حدیث کے علاوہ ان فنون میں بھی ان کی تصنیفات یادگار ہیں، موضوعات حدیث پر انہوں نے دو رسالے تحریر کیے تھے، آزاد بلگرامی رقم طراز ہیں ''درفقہ وحدیث وعلوم دیگر پایہ عالی داشت''(۵) مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا بیان ہے کہ وہ ابن جوزی اور صاحب سفر السعادہ کی طرح حدیث کے باب میں متشدد تھے(۶) اصحاب سیر نے ان کو محدث کے لقب سے موسوم کیا ہے(۷) مولوی رحمٰن علی لکھتے ہیں ''محدث عامل بود۔''(۸)

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۱ ص ۱۳۷۔ (۲) الجواہر المضیہ، ج ۱ ص ۲۰۱۔ (۳) تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۸۔ (۴) شذرات الذہب، ج ۵ ص ۲۵۰۔ (۵) مآثر الکرام، ص ۱۸۱۔ (۶) الفوائد البہیہ، ص ۳۰۔ (۷) ایضاً الجواہر المضیہ، ص ۲۰۱، واتحاف النبلا، ص ۲۴۳۔ (۸) تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۸۔

مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں "لغت وحدیث میں امام قرار پائے۔"(۱)

خواجہ نظام الدین نے فوائد الفواد میں ایک واقعہ بیان کیا ہے، اس سے بھی ان کی حدیث میں بلند پائیگی اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

"جب وہ بغداد سے دہلی پہنچے تو اس زمانہ میں دہلی مختلف فنون کے علمائے کبار اور منتخب لوگوں سے معمور تھی، لیکن حدیث میں کوئی شخص صغانی سے زیادہ ممتاز یا ان کے ہم پایہ نہ تھا، یہاں سے وہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے، اس سے فارغ ہوکر پھر بغداد تشریف لائے، اس وقت بغداد میں ایک عالم تھے جو بڑے بلند پایہ محدث تھے، انہیں لوگ ابن زہری کہتے تھے، ان کے لیے ایک منبر تیار کیا گیا تھا جس پر بیٹھ کر وہ حدیث کا درس دیتے تھے، جس میں لوگ درجہ بدرجہ شریک ہوتے تھے، یعنی لائق اور ذی استعداد لوگ آگے ان کے سامنے ہوتے، اس کے بعد ان لوگوں سے کمتر لوگوں کی صف ہوتی، اسی طرح اس کے بعد اور لوگوں کا حلقہ ہوتا۔

اسی طور پر وہ حدیث بیان کرتے اور لوگ اسے ضبط وتحریر میں لاتے، ایک روز مولانا رضی الدین بھی اس مجلس میں حاضر ہوئے اور بعید تر حلقہ میں نشست فرمائی، ابن زہری ایک حدیث بیان کررہے تھے جس کا مفہوم یہ تھا کہ مؤذن جس طرح جو الفاظ کہے سننے والے کو بھی اسی طرح وہی الفاظ کہنے چاہیے، شیخ نے حدیث کی ابتدا (اذا سکب المؤذن) کے لفظ سے کی، سکوب کے اصل معنی اوپر سے پانی گرانا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب مؤذن کی آواز تمہارے کانوں میں پڑے تو تم لوگوں کو بھی اسی طرح کہنا چاہیے جیسے وہ کہہ رہا ہے، جب ابن زہری نے یہ حدیث بیان کی تو مولانا رضی الدین نے اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے آہستہ سے دوسرے لوگوں سے کہا کہ یہ اذا سکت المؤذن ہے، یعنی جب مؤذن اپنا لفظ کہہ کر

(۱) مقالات سلیمان، ج۲، ص۴۔

خاموش ہو جائے تو اس کی موافقت کرنی چاہیے، جس شخص سے انہوں نے یہ بات کہی تھی اس نے دوسرے سے کہا، دوسرے نے تیسرے سے کہا، شدہ شدہ یہ بات ابن زہری تک پہنچ گئی، انہوں نے کہا یہ بات کس نے کہی ہے، صغانی نے کہا میں نے کہی ہے، ابن زہری نے فرمایا کہ دونوں باتوں کا مفہوم نکلتا ہے، اس لیے کتاب سے مراجعت کرنی چاہیے، کتاب دیکھی گئی تو اس میں دونوں توجیہات ملیں مگر واذا سکت کو زیادہ صحیح بتایا تھا، یہ خبر جب خلیفۂ وقت کو ہوئی تو اس نے صغانی کو دربار میں طلب کیا اور ان کا بڑا اعزاز و اکرام کیا۔ (فوائد الفواد، ص ۱۰۳ تا ۱۰۵)

لغت وادب: لغت وادب میں وہ خصوصیت سے بہت ممتاز تھے، عالم اسلام میں امام لغت کی حیثیت سے زیادہ روشناس اور متعارف ہوئے، اپنے زمانہ میں لغت کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے، دمیاطی کا بیان ہے کہ وہ لغت میں امام تھے، سیوطی لکھتے ہیں کہ ''لغت کی معرفت ان پر تمام ہوگئی'' اس میں انہوں نے عظیم الشان کتابیں یادگار چھوڑیں، وہ لغت کا پرچم سربلند کیے ہوئے تھے اور اپنے شاگردوں کو مشہور امام لغت ابوعبید قاسم بن سلام کی غریب یاد کرنے کی تلقین فرماتے تھے اور جو شاگرد اسے یاد کر لیتا اس کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک ہزار دینار انعام دیا کرتے تھے۔ (۱)

وہ عربی زبان کے مستند ادیب بھی تھے اور شعر بھی موزوں کر لیتے تھے، ان کی نثر و نظم مشکل الفاظ پر مشتمل ہونے کے باوجود سلیس اور تکلف و تصنع سے بری ہوتی تھی، درحقیقت ان کے نہاں خانہ میں الفاظ و لغات کا وسیع ذخیرہ تھا، جسے وہ روانی اور بے تکلفی سے استعمال کرتے تھے، اس لیے ان کے قلم سے نکلنے والی تحریروں اور اشعار میں خوبی اور دلکشی ہوتی تھی، اس کا اندازہ مشارق الانوار کے دیباچہ سے بھی ہوتا ہے، علامہ سیوطی نے ان کی ایک مناجات کے چند ابیات نقل کیے ہیں جس کا قافیہ مرتجی ہے، اس میں نظم کے ہر شعر میں انہوں نے اس

(۱) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷ و شذرات الذہب، ج ۵، ص ۲۵۰۔

لفظ کو جدا گانہ معنوں میں استعمال کیا ہے، لغت وعربیت کی تحصیل اور محاورات عرب پر عبور حاصل کرنے کے لیے انہوں نے برسوں نجد میں قیام کیا۔

شعر و سخن: امام صغانی کو شعر و سخن کا اچھا ذوق تھا، وہ خود بھی شعر موزوں کرتے تھے اور برجستہ اشعار بھی کہتے تھے، ان کے اشعار میں بڑی روانی اور آمد بھی ہوتی تھی اور وہ صنائع و بدائع اور شعری محاسن سے بھی پر ہوتے تھے، اوپر ان کی مناجات کا ذکر آ چکا ہے، جو یہ ہے:

یا ارحم الطفل الرضیع المزعج　　یا فاتح الباب المنیع المرتج

(اے طفل شیر خوار وزار پر رحم فرمانے والے! اے دشوار اور بند دروازہ کھولنے والے!)

ان کان غیری مبلسا مستیئسا　　فانا الفقیر المستکین المرتجی

(اگر میرے سوا کوئی نادار، شکستہ دل اور مایوس ہوسکتا ہے تو میں بھی فقیر و مسکین اور خوف زدہ ہوں۔)

او کان غیری آمنا فی سربد　　فان المتیح المستجیر المرتجی

(اگر میرے سوا کوئی ایسا ہو جس کی پناہ اپنے سوا کہیں نہیں تو میں بھی ایسا ہی بے نصیب پناہ جو اور امیدوار ہوں۔)

استاء ت الراحات عنی وانتاء ت　　یا من یقرب کل ناء مرتجی

(راحتیں مجھ سے دور ہوگئی ہیں، اے وہ ذات جو تمام دور اور مشکل (مقاصد) کو قریب کرتی ہے۔)

انت الذی فیه شفاء السقم لا　　قصب الذرینی ولا دواء المرتجی (۱)

(خداوندا! تو ہی ان بیماروں کو شفا بخشتا ہے جن کا علاج نہ نیشکر کرسکتا ہے اور نہ کوئی دوسری مفید دوا۔)

انہوں نے ایک طویل قصیدہ میں اپنے ناموافق حالات اور زمانے کی ناسازگاری وغیرہ کا ذکر کیا ہے، یہ پورا قصیدہ صنعت تجنیس میں اور منفرد نوعیت کا ہے، اس کے چند اشعار

(۱) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷ و ۲۲۸۔

ملاحظہ ہوں:

انسانی الدھر اعطانی واوطانی ‏ ‏ ‏ ‏ وحطنی وھاد الخسف اوطانی

(زمانہ نے میرے وطن اور میری قیام گاہ کو میرے دل سے محو کر دیا ہے اور مجھے فقر و ندامت میں گرا کر دھنسا دیا۔)

وکنت افنیت عمری فی رفاھیة ‏ ‏ ‏ ‏ فغطنی ولذیذ العیش انسانی

(حالانکہ میں نے اپنی زندگی عیش و فراغت میں گزاری تھی مگر پھر زمانہ نے مجھے اذیت میں ڈال دیا اور خوش حالی کی زندگی سے غافل کر دیا۔)

وکان دوحة عیشی غضة زمنا ‏ ‏ ‏ ‏ غضیرة ذات اغصان وافنان

(میرے عیش و عشرت کا درخت جو برگ و بار والا تھا مدتوں سر سبز و شاداب رہا۔)

حتی اذا ماجنی الدھر الملم فنا ‏ ‏ ‏ ‏ قدی و قدادیم العمر افنانی

(یہاں تک کہ جب مصائب پہنچانے والے زمانہ کی زیادتی شروع ہوئی تو میرا قد و قامت فنا ہو گیا اور عمر کے بندھن نے مجھے ہلاک کر دیا۔)

فقلت یا دھر سالمنی مسالمة ‏ ‏ ‏ ‏ فاننی عمری ثم صاغانی

(میں نے زمانہ سے کہا میرے ساتھ صلح کر لے، کیوں کہ میں حضرت عمرؓ کی اولاد ہوں اور میرا وطن صغان ہے۔)

فانصاع ینقاد اذعانا وسالمنی ‏ ‏ ‏ ‏ ومد ضبعی وناغانی وصاغانی

(چنانچہ وہ میرا مطیع ہو گیا اور اس نے مجھ سے صلح کر لی اور میرے بازو پھیلا دیے اور مجھ سے قریب ہوا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑے قادر الکلام شاعر تھے، مگر افسوس کہ ان کا کوئی مجموعہ یادگار نہیں اور کلام کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا، صرف متفرق اشعار تذکرہ و تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

فضل وکمال: صغانی اپنے دور کے بہت ممتاز علما میں تھے اور علم وفن اور ادب ولغت میں امامت کے درجہ پر فائز تھے (۱) آزاد بلگرامی تحریر فرماتے ہیں کہ ''عالم ربانی ودانائے غوامض معانی بود'' (۲) صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں کہ ان کی تصنیفات بہت مشہور ومقبول ہوئیں اور ان کے علم وکمال کے سامنے علمائے زمانہ سرنگوں ہوگئے (۳) عراق وحجاز کے علما بھی ان کے علم وفضل کا لوہا مانتے تھے۔

ہندوستان میں صغانی کی اہمیت واولیت: ہندوستانی علما میں امام صغانی پہلے محدث ہیں جن کی بدولت ہندوستان میں علم حدیث کی خدمت واشاعت کی داغ بیل پڑی اور انہوں نے اس فن میں باقاعدہ تصنیف وتالیف کا کام انجام دیا، مولانا سید سلیمان ندوی کے مندرجہ ذیل بیان سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔

''شیخ اسماعیل کے بعد یہاں ڈیڑھ سو برس تک اندھیرا گھپ چھایا رہتا ہے، بالآخر ساتویں صدی کے شروع میں مشارق الانوار کے مصنف صغانی نے یہاں علم حدیث کی روشنی پھیلائی .... الغرض امام صاغانی غزنوی لاہوری تنہا محدث ہیں اور مشارق الانوار اس دیار کی تنہا خدمت حدیث ہے جو اس عرصہ دراز میں انجام کو پہنچی۔'' (۴)

گو امام صغانی کا قیام ہندوستان میں کم رہا، اس لیے باہر کی طرح ہندوستان میں ان کا فیض واثر بھی کم رہا، سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''ساتویں صدی کے شروع میں مشارق الانوار کے مصنف صغانی نے یہاں علم حدیث کی روشنی پھیلائی، مگر یہ روشنی گھر میں کم اور گھر سے باہر زیادہ پھیلی ...... چوں کہ امام ممدوح کا تعلق زیادہ تر ملک عرب وعراق سے رہا، اس لیے ان کا اثر اس ملک کے علما پر بہت کم پڑا اور اگر پڑا بھی تو صرف اسی قدر کہ ان کو اپنے نصاب تعلیم کے لیے حدیث میں ایک

(۱) الجواہر المضیہ، ص ۲۰۱۔ (۲) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۸۱۔ (۳) نزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۱۳۸۔ (۴) مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۴ و ۵۔

اپنے ہم وطن کی کتاب مل گئی اور وہ بدستور اپنے علم دانش مندی وعلم دانائی میں مصروف رہے، منطق وفلسفہ اور علم کلام کے بعد فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور وہ بھی عقلی طریق سے، یہی سبب ہے کہ اصول فقہ جیسا ضروری علم بھی معقولات اور کلامیات کا ایک ضمیمہ ہو کر رہ گیا۔(۱)

اس کے باوجود صغانی کی ہندوستان میں اولیت واہمیت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

تدین: علم وفضل کی طرح زہد واتقا، دیانت وامانت اور خیر وصلاح کے بھی جامع تھے، حج بیت اللہ سے کئی بار مشرف ہوئے اور برسوں خانہ کعبہ کے جوار میں قیام پذیر رہے (۲) اسی لیے اپنے کو ملتجی الی حرم اللہ کہتے تھے، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں ''مولانا حسن صغانی لاہوری ایسے فرشتہ خصال بشر تھے کہ گویا ان کی طینت عناصر فلکی سے ممزوج، عالم تھے، ربانی اور صاحب کمالات تھے، نورانی۔ (معارف مئی ۴۷ء، ص ۳۷۹، بحوالہ المرجان)

متانت: بہت خاموش، متین، سنجیدہ اور باوقار شخص تھے، فضول اور بیکار باتیں نہیں کرتے تھے (۳) یاوہ گوئی سے سخت نفرت کرتے تھے، جو بات کہتے صحیح کہتے۔

اخلاق وعادات: طبیعت میں بڑی شرافت اور مزاج میں انکسار اور حلم تھا، ان کے اخلاق وعادات نہایت بلند تھے۔

رحلت وسفر: امام صغانی کی پیدائش لاہور اور نشو ونما غزنہ میں ہوئی تھی، مگر انہوں نے عراق وعرب کو اپنا اصلی وطن بنالیا تھا، اس لیے ان کا زیادہ تر قیام ہندوستان سے باہر ہی رہا، اوپر مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ بیان گزر چکا ہے۔

ساتویں صدی کے شروع میں مشارق الانوار کے مصنف صغانی نے یہاں علم حدیث کی روشنی پھیلائی، مگر یہ روشنی گھر میں کم اور گھر سے باہر زیادہ پھیلی۔(۴)

---

(۱) مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۴و۵۔ (۲) شذرات الذہب، ج ۵، ص ۲۵۰ وبغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷۔

(۳) نزہۃ الخواطر، جلد ۱، ص ۱۳۸۔ (۴) مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۴۔

دوسری جگہ رقم طراز ہیں:

لیکن چوں کہ امام ممدوح کا تعلق زیادہ تر ملک عرب وعراق سے رہا، اس لیے ان کا اثر اس ملک (ہندوستان) کے علما پر بہت کم پڑا۔(۱)

انہیں سفر و سیاحت کا بھی بڑا شوق تھا اور چونکہ ان میں علم وفن اور تحقیق وجستجو کا فطری داعیہ بھی تھا، اس لیے وہ اکثر سفر و سیاحت میں رہتے تھے۔

۲۸ برس کی عمر میں ۶۱۵ھ (۱۲۱۸ء یا ۱۲۱۹ء) میں بغداد کی کشش ان کو وہاں لے گئی، گو اس زمانہ میں عباسیوں کے عروج واقبال کا ستارہ ماند پڑ گیا تھا اور تاتاریوں کے سیلاب نے عالم اسلام کو تہہ وبالا کر دیا تھا، مگر بغداد ان کی زد سے محفوظ تھا اور اس کی قدیم شان وشوکت باقی تھی، امام صغانی کئی برس تک یہاں مقیم رہ کر درس وتدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے، مکہ معظمہ بھی پہنچے اور حج وزیارت کعبہ سے مشرف ہونے کے علاوہ برسوں بیت اللہ کے جوار میں قیام کی سعادت حاصل کی، مؤرخین نے عدن ویمن جانے کی صراحت بھی کی ہے (۲) عرب وعراق کے قیام کے زمانہ میں ہندوستان آنے کا اتفاق بھی ہوا، ان کا خود بیان ہے کہ میں ہندوستان اور سندھ کے مشرق ومغرب میں چالیس برس سے زیادہ سیر وسیاحت کرتا رہا، اس کی مزید تفصیل آگے آ رہی ہے۔

سفارت اور دوسرے عہدے: امام صغانی مختلف عہدوں پر فائز رہے، سب سے پہلے سلطان قطب الدین ایبک نے ان کو لاہور میں عہدۂ قضا پیش کیا مگر انہوں نے انکار کر دیا اور غزنہ چلے گئے، ۶۱۵ھ/ ۱۲۱۸ء میں بغداد میں احتساب کا محکمہ انہیں سپرد کیا گیا جس کی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے انجام دیں، اس کے ساتھ ہی درس وتدریس کی خدمت پر بھی مامور رہے، خلیفہ ناصر لدین اللہ نے آپ سے حدیث پڑھی تھی اور آپ کو خلعت سے بھی

(۱) مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۵۔ (۲) الجواہر المضیۃ، ج ۱، ص ۲۰۱، اتحاف النبلاء، ص ۲۴۳، مآثر الکرام، جلد ۱، ص ۱۸۱۔

سرفراز کیا تھا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، خلیفہ نے ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء میں آپ کو سفیر کی حیثیت سے ہندوستان بھیجا، یہ سلطان شمس الدین التتمش کا دور تھا، ۶۲۴ھ/ ۱۲۲۶ء میں بغداد واپس آئے لیکن اسی سال شعبان میں دوبارہ عباسی خلیفہ مستنصر باللہ نے سفیر بنا کر انہیں ہندوستان بھیجا، وہاں ۶۲۵ھ/ ۱۲۲۷ء میں پہنچے، اس وقت رضیہ بنت التتمش فرمانروائے ہند تھی، اس دفعہ بھی ان کے درس سے تشنگان علوم سیراب ہوئے مگر اس باران کی طبیعت ہندوستان میں نہیں لگی اور وہ برابر واپسی کے لیے فکرمند رہے اور جلد ہی بغداد آ گئے۔(۱)

فوائد الفواد میں ان کے کول (علی گڑھ) جانے اور نائب مشرف (سررشتہ دار) ہونے کا ذکر ہے۔(۲)

صغانی کے امراو سلاطین سے اچھے تعلقات تھے خصوصاً خلیفہ مستنصر باللہ اور اس کے علم و ادب نواز وزیر ابن العلقمی سے ان کو بڑا تعلق تھا، یہ دونوں ان کا بڑا اعزاز کرتے اور خوب انعام و اکرام سے بھی نوازتے تھے، تاکہ وہ دلجمعی اور جمعیت خاطر کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام انجام دیں، انہوں نے اپنی اکثر کتابیں ابن العلقمی ہی کے نام سے معنون کی تھیں۔(۳)

وفات: ۷۳ برس کی عمر میں جمعہ کے روز ۱۹ شعبان ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء کو بغداد میں وفات ہوئی، ان کا مکان بغداد میں حریم الظاہری میں واقع تھا، پہلے وہیں دفن کیے گئے مگر پھر ان کی وصیت کے مطابق نعش مکہ معظمہ لائی گئی اور وہیں دفن کی گئی۔(۴)

اولاد: مصنفین اور تذکرہ نگاروں نے صغانی کی اولاد کا تذکرہ نہیں کیا ہے، لیکن ان کے ایک صاحبزادے محمد کا نام اس حیثیت سے معلوم ہوا کہ مشارق الانوار کا جو قلمی نسخہ ٹونک کے کتب خانہ میں ہے اس کی محمد نے اپنے والد حسن کے سامنے قرأت کی تھی (۵) اشعار میں

(۱) الجواہر المضیہ، جلد ۱ ص ۲۰۲ و شذرات الذہب، جلد ۵ ص ۲۵۰ و نزہۃ الخواطر، ج ۱ ص ۱۳۷-۱۳۸۔ (۲) فوائد الفواد ص ۱۰۳۔ (۳) مجلۃ المجمع العلمی العربی دمشق، ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ، تشرین ۱۹۲۵ء، ج ۱۵، نمبر ۱۱، ص ۵۲۴۔ (۴) مآثر الکرام، جلد ۱ ص ۱۸۱ و اتحاف النبلاء ص ۲۴۳۔ (۵) قصر علم (فہرست کتب خانہ ٹونک) ص ۳۰۱۔

بھی کہیں کہیں انہوں نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی ہے، مثلاً ایک شعر میں انہیں یہ تلقین کرتے ہیں:

حاکوا اباکم واحکموا عقدة الادب   ترقوا مراقی یهواها ذو الرتب

ترجمہ:''اخلاق وعادات میں اپنے والد کے مشابہ بنو اور ادب کی گرہ مضبوطی سے باندھ لو، (فنون ادب میں کمال حاصل کرو) تو تم لوگ بلندی کے ایسے زینوں پر چڑھ جاؤ گے جن پر پہنچنے کے لیے بڑے بڑے صاحبان قدر ومنزلت کے خواہاں ہوتے ہیں۔''

اس سے ثابت ہوتا ہے ان کے کئی لڑکے تھے۔

تصنیفات: امام صغانی ممتاز اور بلند پایہ محدث تھے، ان کی تصنیفات کمیت وکیفیت دونوں حیثیتوں سے عمدہ اور ان کے فضل وکمال کی شاہد ہیں، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

وتصانیف غرا پرداخت (۱)   شاندار اور عمدہ کتابیں تصنیف کیں۔

نواب صدیق حسن خاں مرحوم ان کی تصنیفات کا نام گنانے کے بعد لکھتے ہیں:

دورائے ایں تصانیف دیگر است کہ دلیل برکمال علم وے است۔ (۲)   ان کتابوں کے علاوہ ان کی دوسری تصنیفات بھی ہیں جو ان کے کمال علم کا ثبوت ہیں۔

یافعی کا بیان ہے کہ ''لغت میں بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑیں'' (۳) ان کی تصنیفات کی تعداد ۳۲ سے متجاوز تھی لیکن ان میں ایک ثلث کے بقدر بالکل نایاب، صغانی کی سب سے اہم اور عظیم الشان کتاب مشارق الانوار ہے جس کا آخر میں تذکرہ آئے گا، باقی کتابوں کے نام حروف تہجی کے مطابق درج ذیل ہیں اور بعض کا مختصر تعارف بھی کرایا جاتا ہے۔

۱۔ اسماء الاسد: اس موضوع پر مختلف اصحاب علم وادب نے کتابیں لکھی ہیں، ان کی فہرست میں امام صغانی کا نام بھی شامل ہے۔ (۴)

۲۔ اسماء الذئب: یہ خود ایک مستقل رسالہ ہے (۵) مگر بعض مصنفین کے بیان سے

(۱) مآثر الکرام، ج ۱ ص ۱۸۱۔ (۲) اتحاف النبلاء ص ۲۴۳۔ (۳) مرآۃ الجنان، ج ۴ ص ۱۲۱۔ (۴) کشف الظنون، ج ۱ ص ۹۷۔ (۵) بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷۔

پتہ چلتا ہے کہ یہ اسماء الاسد ہی کا ایک جز ہے۔(۱)

۳۔اسماء الفارہ: سیوطی نے اس کا نام اسماء الغادہ لکھا ہے(۲) ممکن ہے یہ تصحیف یا کتابت کی غلطی ہو۔

۴۔بغیۃ الصدیان: بعض نے اس نام نقعۃ الصدیان لکھا ہے(۳) جو غالباً صحیح ہے۔

۵۔التجرید وجمل الصغانی، ۶۔تعزیر بیتی الحریری: مولوی سید حسن برنی نے اپنے مضمون میں دونوں کا ذکر کیا ہے، مؤخر الذکر کا بعض اور مصنفین نے بھی تذکرہ کیا ہے۔(۴)

۷۔دارالسحابہ فی وفیات الصحابہ: اس میں تقریباً آٹھ سو صحابہؓ کے مقامات رحلت اور محل وفات کا ذکر ہے، اسی لیے اس کا نام دارالسحابہ فی بیان مواضع وفیات الصحابہ بھی لکھا گیا ہے (ماہنامہ برہان اگست ۵۳ء، ص ۸۵) صحابۂ کرامؓ کے نام حروف تہجی کے مطابق درج ہیں، صحابہؓ کے حالات وتراجم میں علامہ ابن عبدالبر (م ۴۶۳ھ/۱۰۷۱ء) کی الاستیعاب کے علاوہ علامہ ابن اثیر جزری (م ۶۳۰ھ/۱۲۳۳ء) کی اسد الغابہ اور حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء) کی الاصابہ نہایت مشہور ہیں، صغانی کی کتاب چاہے ان کتابوں کے ہم پایہ نہ ہو تاہم وہ ابن اثیر کے ہم عصر اور حافظ ابن حجر سے زمانا متقدم ہیں، اس لیے ان کی کتاب کی اہمیت مسلم ہے، عام خیال یہ ہے کہ یہ ایک مختصر رسالہ ہے، جرجی زیدان نے اسے ۶۴ صفحے کا بتایا ہے(۵) مگر بعض لوگوں کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک مبسوط کتاب تھی جس میں صغانی نے اپنی ایک مختصر کتاب اور اس کے ذیل میں جس میں صحابۂ کرامؓ کے مقام وفات کو بیان کیا تھا، بترتیب حروف تہجی یکجا کر دیا تھا(۶) اس کے قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ مصر، مکتبہ شیخ الاسلام اور برلن میں موجود ہیں۔

---

(۱) الجواہر المضیہ، ج۱، ص ۲۰۲، کشف الظنون، ج۱، ص ۹۷ ونزہۃ الخواطر، ج۱، ص ۱۴۱۔ (۲) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷۔ (۳) ایضاً ومفتاح السعادۃ، ج۱، ص ۹۸۔ (۴) معارف جولائی، ۲۹ء، ص ۱۲۔ (۵) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، جلد۳، ص ۴۹۔ (۶) معارف جولائی ۲۹ء، ص ۱۳۔

۸۔الدر الملتقط فی تبیین الغلط :اس کتاب میں صغانی نے ''الشہاب'' و ''النجم'' کی موضوع حدیثوں کو بیان کیا تھا۔(۱)

۹۔شرح ابیات المفصل: علامہ سیوطی وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے(۲) معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مشہور معتزلی مفسر علامہ جاراللہ ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشری (م ۵۳۸ھ/ ۱۱۴۳ء) کی فن نحو کی مشہور کتاب المفصل میں وارد اشعار کی شرح کی ہے۔

۱۰۔شرح البخاری: یہ امام بخاریؒ کی صحیح کی مختصر شرح ہے جو ایک جلد میں تھی۔

۱۱۔شرح درالسحابہ: معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اپنی کتاب درالسحابہ کی شرح لکھی ہے، آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں اس کا ذکر کیا ہے۔(معارف، جنوری ۴۸ء، ص ۶۱)

۱۲۔شرح القلادۃ السمطیہ فی توشیح الدریدیہ: بعض مصنفین نے اس کا نام صرف توشیح الدریدیہ ہی لکھا ہے۔(۳)

۱۳۔الشمس المنیرۃ من الصحاح الماثورہ: فن حدیث میں ہے، آزاد بلگرامی نے اسے صحیح بخاری کی شرح بتایا ہے۔(۴)

۱۴۔کتاب الشوارد: لغت کی اہم کتاب ہے، تمام ارباب سیر وفہارس نے اس کا ذکر کیا ہے(۵) بعض لوگوں نے اس کا نام الشوارد فی اللغات (۶) اور بعض نے الشوارد فی اللغۃ لکھا ہے۔(معارف مئی ۴۷ء، ص ۳۸۰)

۱۵۔العباب الزاخر: یہ بھی لغت میں مہتم بالشان کتاب تھی، سید حسن برنی نے اس کا نام العباب الزاخر واللباب الفاخر لکھا ہے اور اس کو صغانی کی تصانیف لغت میں سب سے زیادہ

(۱)بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷ واعلام جلد ا، ص ۲۳۹۔(۲) معارف جولائی ۲۹ء، ص ۱۳۔(۳) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷ ومفتاح السعادۃ، ج ا، ص ۹۸۔(۴) مآثر الکرام، ج ا، ص ۱۸۱۔(۵) الجواہر المضیئہ، جلد ا، ص ۲۰۲، بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷، کشف الظنون، جلد ۲، ص ۷۱، مفتاح السعادۃ، ج ا، ص ۹۸، الاعلام، ج ا، ص ۲۳۹، مآثر الکرام، ج ا، ص ۱۸۱، الفوائد البہیہ، ص ۲۹، اتحاف النبلاء ص ۲۴۳۔(۶) معارف جولائی ۲۹ء۔

ممتاز اور قیمتی کتاب بتایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''عربی لغت کے متعلق متقدمین ائمہ لغت نے بڑے بڑے عظیم الشان کارنامے انجام دیے جو فی الواقع حیرت انگیز ہیں، امام صغانی کی یہ کتاب ان مہتم بالشان کارناموں میں بھی امتیاز خاص رکھتی ہے، قاموس کے مصنف امام مجد الدین فیروز آبادی (۷۲۹ھ/۱۳۲۹ء - ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء) نے جو عربی لغت کے بہت بڑے امام ہیں، عربی لغات میں ایک ضخیم کتاب ساٹھ جلدوں میں لکھی تھی جو زیادہ تر امام صغانی کی العباب اور اندلس کے نابینا علامہ لغت امام ابن سید کی کتاب المحکم پر مبنی تھی، اس کتاب کا نام فیروز آبادی نے ''اللامع المعلم العجاب الجامع بین المحکم والعباب'' رکھا اور اسی کا خلاصہ دو جلدوں میں ''قاموس'' میں کر دیا تھا، کتاب اللامع موجودہ کتاب قاموس سے ضخامت میں تیس گنا زیادہ تھی، فیروز آبادی نے امام صغانی اور ابن سیدہ کی کتاب المحکم کے متعلق قاموس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''فن لغت میں یہ دونوں کتابیں بہتر ہیں لیکن افسوس کہ فیروز آبادی کی اللامع اور امام صغانی کی العباب متقدمین کی بعض دیگر نفیس و بیش بہا تصانیف کی طرح ناپید ہیں، کاش آج العباب بھی ہمارے ہاتھوں میں ہوتی تا کہ ہم دنیا کو بتا سکتے کہ ہندوستان کے اس علامہ متبحر نے عربی لغت میں کیسے نمایاں کارنامے سرانجام دیے تھے۔'' (معارف جولائی ۲۹ء، ص ۹)

تاج الدین ابن مکتوم احمد بن عبدالقادر حنفی (۷۴۹ھ/۱۳۴۸ء) نے اسے اور ابن سیدہ کی محکم کو یکجا کر دیا تھا، یہ کتاب خلیفہ مستنصر کے امیر ابن العلقمی کی فرمائش پر مرتب کرنی شروع کی تھی اور اس میں اصحاب معجم کے تراجم بھی لکھے تھے (۲) صحاح جوہری یا قاموس

(۱) معارف جولائی، ۲۹ء۔ (۲) کشف الظنون، ج ۲، ص ۱۰۵ و تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، ج ۳، ص ۴۹۔

کے انداز پر اسے حروف معجم کے اواخر پر مرتب کیا گیا تھا مگر صغانی اسے مکمل نہیں کر سکے تھے، وہ بیس جلدیں لکھ چکے تھے اور حرف میم تک پہنچے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا، آخری لفظ جو اس میں درج ہے وہ "کم" تھا، کسی کا شعر ہے ؎

ان الصغانی الذی　　حاز العلوم والحکم
کان قصاری امرہ　　ان انتھی الی بکم (۱)

ترجمہ: بیشک امام صغانی علوم وحکم پر حاوی تھے، مگر ان کے کام کی انتہا لفظ کم (کتنا) پر ہوئی۔

العباب کے غیر مکمل رہ جانے کا اکثر لوگوں نے تذکرہ کیا ہے، مگر صاحب قاموس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مکمل ہو گئی تھی، ممکن ہے اس کے اجزا بعد میں تلف ہو گئے ہوں اور حاجی خلیفہ کی نظر سے نامکمل کتاب گزری ہو، صغانی نے اسے لغت کی مشہور کتابوں کی مدد سے مرتب کیا تھا اور اپنے اقوال کی تائید وصحت کے لیے قرآن وحدیث سے اس میں ثبوت وشواہد بھی پیش کیے تھے، العباب کا ایک قلمی نسخہ چھ جلدوں پر مشتمل مصر کے کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہے، یہ ۶۴۲ھ/۱۲۲۴ء کا لکھا ہوا ہے (۲) گویا مصنف کی زندگی ہی کا ہے، پاکستان کے ڈاکٹر پیر محمد حسن کے کتب خانہ میں بھی اس کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ (۳)

۱۶۔ فرائض الصغانی (۴): معلوم ہوتا ہے یہ رسالہ علم الفرائض میں تھا۔

۱۷۔ فعال ۱۸۔ فعلان ۱۹۔ فعول: یہ تینوں ایک ہی طرح کے رسالے ہیں، غالباً ان میں تینوں کے ہم وزن الفاظ لکھ کر ان کی تشریح کی ہو گی، اول الذکر کے متعلق حال کے بعض اہل قلم نے لکھا ہے کہ اس میں صغانی نے اس کے ہم وزن ۱۳۰؍الفاظ جمع کیے تھے۔ (۵)

---

(۱) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷ وکشف الظنون، ج ۲، ص ۱۰۵۔ (۲) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، ج ۳، ص ۳۹۔
(۳) کتاب خانہ ہائی پاکستان، جلد یکم، ص ۶۷۔ (۴) معارف جولائی ۲۹ء، ص ۱۳۔ (۵) الجواہر المضیہ، ص ۲۰۲، بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷ ومجلہ المجمع العلمی العربی دمشق، ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ مطابق اکتوبر ۱۹۲۵ء۔

۲۰۔ کتاب الاثر ۲۱۔ کتاب اسماء الدین ۲۲۔ کتاب اسماء السعادۃ ۲۳۔ کتاب الاصفار: اول الذکر تینوں کا نام صاحب مفتاح (۱) السعادۃ نے اور آخر الذکر کا صاحب الجواہر المضیہ (۲) نے لکھا ہے، سید حسن برنی نے الاصفار کے بجائے الاصفاد لکھا ہے (۳)

۲۴۔ کتاب الاضداد: یہ ایک صغیر الحجم لیکن کثیر المنافع رسالہ ہے جو ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں عربی کے ۳۳۶ لغات اضداد کے معانی بیان کیے گئے ہیں، یعنی وہ الفاظ جمع کیے ہیں جن کو دو مختلف معنی آتے ہیں، جیسے الابض کا لفظ لکھ کر اس کے یہ معنی بتاتے ہیں السکون والحرکۃ، اسی طرح الارز کے معنی لکھا ہے القوۃ والضعف، صغانی کا خود بیان ہے کہ محمد بن المستنیر قطرب (م ۲۰۶ھ/۸۲۱ء) کے دور سے خلیفہ عباسی مستنصر کے زمانہ تک کے مختلف مصنفین جو لغات اضداد تحریر کیے تھے ان سب کو میں نے اس کتاب میں بہ ترتیب حروف ہجا نہایت جستجو کے بعد جمع کر دیا ہے، آسٹریا کے استاذ کلیۃ الشبروک ڈاکٹر ہنفز کی سعی سے ۱۹۱۳ء میں بیروت سے یہ رسالہ چھپ گیا ہے، اس کے ساتھ ابن السکیت کی کتاب الاضداد بھی چھپی ہے (۴) اس کا قلمی نسخہ برلن میں موجود ہے۔ (۵)

شیخ محمد ابن ابی بکر بن عبدالقادر رازی متوفی ۶۶۰ھ/۱۲۶۲ء نے ۹ صفحے میں کتاب الاضداد کا مختصر تیار کیا تھا، اس کا قلمی نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں ہے۔ (۶)

۲۵۔ کتاب الافتعال (۷): غالباً صرف واشتقاق یا لغت کی کتاب ہے۔

۲۶۔ کتاب الافعال (۸)۔

۲۷۔ کتاب الانفال: یہ کتاب حال میں ڈاکٹر احمد خاں نے ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد سے ایڈٹ کر کے شائع کی ہے مگر ہماری نظر سے نہیں گزری، ممکن ہے یہ

(۱) مفتاح السعادۃ، ج ۱، ص ۹۸۔ (۲) الجواہر المضیہ، ج ۱، ص ۲۰۲۔ (۳) معارف جولائی ۲۱ء، ص ۱۲۔
(۴) معجم المطبوعات، ج ۲، کالم ۱۲۰۹۔ (۵) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، ج ۳، ص ۵۰۔ (۶) کتب خانہ عربیہ رامپور، جلد اول، ص ۵۱۷۔ (۷) کشف الظنون، ج ۲، ص ۲۶۳۔ (۸) الجواہر المضیہ، ج ۱، ص ۲۰۲۔

اور اول الذکر دونوں کتابیں ایک ہی ہوں۔

۲۸۔ کتاب التکملہ: اس کا پورا نام تکملہ والذیل والصلہ ہے، یہ لغت کی کتاب ہے، صغانی کا بیان ہے کہ غریب القرآن، غریب الحدیث، لغت، نحو، اخبار، ایام واشعارِ عرب نیز حیوانات اور اسلحہ وغیرہ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے تقریباً ایک ہزار کتابوں کی مدد سے میں نے اسے مرتب کیا ہے، یہ دراصل جوہری کی صحاح کا ذیل وتکملہ ہے، اس میں اس کی غلطیوں کی تصحیح کے علاوہ مافات کو بھی شامل کرلیا ہے، آخر میں کتاب کے مراجع ومصادر کی فہرست دی ہے، کتب خانہ خدیویہ مصر کوپریلی اور مکتبہ شیخ الاسلام مدینہ میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔(۱)

۲۹۔ کتاب التراکیب۔(۲)

۳۰۔ کتاب درجات العلم والعلما۔(۳)

۳۱۔ کتاب زبدۃ المناسک(۴): سید حسن برنی نے مناسک الصغانی نام لکھا ہے۔(۵)

۳۲۔ کتاب الضعفا: فن رجال کی کتاب ہے، اس میں ضعیف ومتروک راویوں کا تذکرہ ہے۔(۶)

۳۳۔ کتاب العروض۔(۷)

۳۴۔ کتاب عقلۃ العجلان۔(۸)

۳۵۔ کتاب یفعول: اس میں امام صغانی نے اس وزن کے تقریباً ۴۰۰ الفاظ جمع

---

(۱) کشف الظنون، ج ۲، ص ۷۵، الاعلام، ج ا، ص ۲۳۹، تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، ج ۳، ص ۵۰، تذکرۃ النوادر، ص ۱۲۰۔ (۲) الجواہر المضیہ، ج ا، ص ۲۰۲، بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷، مفتاح السعادۃ، ج ا، ص ۹۸، معارف جولائی ۲۹ء، ص ۱۲۔ (۳) اتحاف النبلا، ص ۲۴۳۔ (۴) ایضاً۔ (۵) معارف جولائی ۲۹ء، ص ۱۳۔ (۶) ایضاً والجواہر، ج ا، ص ۲۰۲ وکشف الظنون، ج ۲، ص ۸۴۔ (۷) ایضاً وبغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷۔ (۸) اتحاف النبلا، ص ۲۴۳۔

کیے ہیں، اس کی ترتیب حروف معجم پر ہے، مصنف نے اس میں لفظوں کی تشریح بھی کی ہے اور عربی نظم ونثر میں ان کے استعمالات کی نشاندہی بھی کی ہے، خلدونیہ کے تاریخ اسلام اور تونس کے مدرسہ علیا کے عربی زبان وادب کے استاد حسن حسنی عبدالوہاب نے اسے تصحیح و مقابلہ کے بعد اپنے مفید محققانہ حواشی وتعلیقات کے ساتھ شائع کیا ہے، شروع میں ان کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں مصنف کے حالات اور شاعری پر بحث وگفتگو کے علاوہ ان کی کتابوں کے نام لکھے ہیں اور ہر کتاب کے موضوع کی نشان دہی بھی کی ہے، انہوں نے آخر میں ایک استدراک بھی لکھا ہے، اس میں یفعول کے وزن پر مزید ۱۴/الفاظ نقل کر کے ان کی تشریح کی ہے، امام صغانی نے ان لفظوں کو چھوڑ دیا تھا، یہ کتاب مطبعۃ العرب تونس سے سے شائع ہوئی ہے۔(۱)

۳۶۔کشف الحجاب عن احادیث الشہاب: اس کا نام تخریج الاحادیث للقضاعی بھی ہے، اس میں ابوعبداللہ محمد بن سلامہ قضاعی (م ۴۵۴ھ/۱۰۶۲ء) کی کتاب شہاب الاخبار فی الحکم والامثال والآداب کو از سرنو مدون کیا ہے اور مشارق الانوار کی طرح اسے بھی ابواب پر مرتب کیا ہے اور صحیح، ضعیف اور مرسل حدیثوں کی تصریح علامتوں سے کر دی ہے۔(۲)

۳۷۔مجمع البحرین: یہ لغت کی ضخیم کتاب ہے جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہے، اس میں مصنف نے جوہری کی صحاح اور اپنی کتاب التکملہ والذیل والصلہ کو جو دراصل صحاح جوہری کا ذیل وتتمہ ہے، جمع کر دیا ہے اور آخر میں اپنے حواشی کا اضافہ بھی کیا ہے، جوہری کی کتاب کے لیے ''ص'' کا، تکملہ کے لیے ''ت'' کا اور حواشی کے لیے ''ح'' کا رمز واشارہ دیا ہے(۳) ابن مالک نے اس کی شرح لکھی تھی۔(۴)

(۱) مجلۃ المجمع العربی دمشق، ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ/اکتوبر ۱۹۲۵ء ومعجم المطبوعات، ج ۲، کالم ۱۲۰۹۔ (۲) کشف الظنون، ج ۲، ص ۲۷ ومعارف جولائی ۱۹۲۹ء، ص ۱۳۔ (۳) کشف الظنون، ج ۲، ص ۳۸۳ ومفتاح السعادۃ، ج ۱، ص ۹۸ وتاریخ آداب اللغۃ العربیہ، ج ۳، ص ۵۰۔ (۴) معجم المطبوعات، ج ۱، کالم ۲۵۳۔

۳۸۔مصباح الدجیٰ من صحاح احادیث المصطفیٰ: یہ مصباح الدجیٰ فی حدیث المصطفیٰ اور مصباح الدجیٰ بھی کہلاتی ہے، حدیث کی مفید اور بلند پایہ کتاب ہے، اس میں مصنف نے بلاسند حدیثیں جمع کی تھیں (۱) آزاد بلگرامی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صحیح بخاری کی شرح ہے (۲) مصر کے کتب خانہ خدیویہ اور برلن میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔(۳)

۳۹۔موضوعات امام حسن صغانی: امام صغانی نے موضوعات میں دو رسالے لکھے تھے، مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھتے ہیں کہ صغانی کا شمار ابن جوزی وغیرہ جیسے متشدد محدثین میں ہوتا ہے، اس لیے انہوں نے اپنے رسائل میں بہت سی غیر موضوع حدیثوں کو بھی موضوع قرار دے کر شامل کر لیا ہے، علامہ سخاوی کا بیان ہے کہ انہوں نے قضاعی کی الشہاب، اقلیشی کی النجم اور ابن ودعان کی اربعین وغیرہ کی حدیثیں نقل کی ہیں اور ان کے رسالے صحیح وحسن حدیثوں پر بھی مشتمل ہیں اور ان میں ضعیف روایتیں کم ہیں۔(۴)

مولوی سید حسن برنی نے رسالة فی الاحادیث الموضوعات کے نام سے صغانی کے ایک رسالے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ مکتبہ خدیویہ مصر میں اس نام کے دو رسالے موجود ہیں (۵) الموضوعات کا ایک مخطوطہ رام پور کے کتب خانہ میں ۱۴ صفحے کا ہے۔(۶)

موضوعات میں امام صغانی کا ایک رسالہ ۱۲ صفحے کا شیخ محمد ابی المحاسن قاوقجی کی کتاب ''اللولؤ المرصوع فیما لا اصل له او باصله موضوع'' کے آخر میں شائع ہو گیا ہے (۷) حال میں موضوعات صغانی نجم عبدالرحمٰن خلف کی تحقیق وتحشیہ کے ساتھ قاہرہ کے دار النافع للطباعة والنشر سے ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹۸۱ء میں بھی شائع ہوئی ہے۔(۸)

---

(۱) کشف الظنون، ج ۲، ص ۱۷۴۷۔ (۲) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۸۱۔ (۳) تذکرۃ النوادر، ص ۵۲ ومعارف مئی ۴۷ء، ص ۳۸۰۔ (۴) الفوائد البہیہ، ص ۳۰۔ (۵) معارف جولائی ۲۹ء، ص ۱۳۔ (۶) فہرست کتب عربیہ، ج ۱، ص ۱۲۰۔ (۷) رجال السند والہند، طبع اول، ص ۱۰۳۔ (۸) مجلۃ الجامعۃ السلفیہ بنارس، فروری ۱۹۸۵ء، ص ۳۲۔

۴۰۔ النوادر فی اللغۃ یا نوادر فی اللغۃ: صغانی کی کتاب الشوارد کا پہلے ذکر آ چکا ہے، ممکن ہے دونوں ایک ہی کتاب ہوں۔

۴۱۔ مشارق الانوار: یہ امام صاحب کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف ہے، وہ حدیث سے زیادہ لغت میں ممتاز اور بلند پایہ خیال کیے جاتے ہیں اور انہوں نے فن لغت میں بیش قیمت اور بے نظیر کتابیں یادگار چھوڑی ہیں مگر ان کی تمام تصنیفات میں ''مشارق الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ'' جیسی شہرت، قبول اور اعتبار کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔

اب تو اس کا چرچا کم ہو گیا ہے لیکن ایک زمانہ میں یہ کافی مروج تھی اور ہندوستان میں نویں صدی ہجری تک صرف یہی کتاب متداول تھی، اس کے سوا دوسری کتب حدیث یہاں تقریباً عنقا تھیں، درس و تدریس میں سارا زور معقولات کی کتابوں پر صرف کیا جاتا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی کی زبانی یہ صورت حال سننے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:

> ''نویں صدی ہجری تک صرف مشارق الانوار کا نسخہ ہندوستان میں نظر آتا ہے..... محمد تغلق جس کے براہ راست تعلقات مصر کی عباسی خلافت سے تھے اور اس کی طرف سے اس کو حکومت کا فرمان اور خلعت اور علم بھی ملا تھا اور عباسی خلیفہ سے اس نے بیعت بھی کی تھی، اس کا قاعدہ تھا کہ جب لوگوں سے بیعت لیتا تھا تو مصر کے خلیفہ عباسی کے فرمان کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور مشارق الانوار کا نسخہ سامنے رکھ لیتا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک ہندوستان میں قرآن پاک کے بعد احادیث میں صرف مشارق الانوار کا وجود تھا، جب شاہی کتب خانہ کا یہ حال تھا تو عام لوگوں کی دسترس کا کیا پوچھنا ہے۔

الغرض شیخ عبدالحق محدث سے پہلے صرف مشارق الانوار للصاغانی

الملا ہوری التوفی ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء کے نسخے اور مصابیح (اصل مشکوٰۃ) للبغوی التوفی ۶۱۵ھ/۱۲۱۸ء کے نسخے دستیاب ہوتے تھے اور یہی دو کتابیں علما کے درس میں تھیں۔"(۱)

اس لیے ہندوستان میں مدت دراز تک حدیث کی جو کتاب سب سے زیادہ مقبول و متداول اور نصاب درس میں داخل اور عام طور پر پڑھی اور پڑھائی جاتی رہی، وہ یہی مشارق الانوار ہے، مولوی سید حسن برنی کا خیال ہے:

"امام صغانی ایک بلند پایہ مصنف تھے، ان کی تصانیف میں مشارق الانوار جس کا متن اور اردو ترجمہ شائع ہو چکے ہیں بہت زیادہ مشہور و متداول ہے...... یہ مجموعۂ احادیث نہایت مقبول ہوا اور ہندوستان میں تو عرصہ دراز تک حدیث کی انتہائی تعلیم کا دارو مدار ہی اس کتاب پر رہا۔"(۲)

ہندوستان کی طرح اس کی شہرت کی گونج دنیائے اسلام میں بھی سنائی دیتی تھی اور وہاں کے علما و فضلا بھی امام صغانی کے فضل و کمال کے معترف اور ان کی اس کتاب کی بلند پائیگی کے قائل تھے، مولانا سید سلیمان ندوی اس کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بغداد میں بیٹھ کر خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کے نام سے مشارق الانوار نام حدیث کی کتاب تصنیف کی.......... علمائے حدیث نے اس کتاب کی بڑی قدر کی اور بے شمار لوگوں نے شرحیں لکھیں اور خود یہ کتاب مدارس کے نصاب میں داخل ہوگئی۔"(۳)

اللہ تعالیٰ کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا، صغانی نے یہ کتاب بڑی کدو کاوش اور نہایت محنت اور دیدہ ریزی سے لکھی تھی جس کا صلہ انہیں اس کی غیر معمولی مقبولیت اور حسن

(۱) مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۴۷ و ۵۷۔ (۲) معارف ماہ جولائی ۱۹۲۹ء، ص ۷۰۱۔ (۳) مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۴ و ۵۔

قبول کی صورت میں دیا۔

صغانی اپنی عرق ریزی اور محنت شاقہ کا خود یہ حال بیان کرتے ہیں:

کفی باللہ الذی ھو............عالما	اللہ کافی ہے، وہ......جانتا ہے کہ اس کی
بما عانیت فی تالیفه و ترتیبه و قاسیت	ترتیب و تالیف اور تصنیف و تہذیب میں
فی تصنیفه و تهذیبه (۱)	میں نے کس قدر ریاضت کی ہے۔

شہرت، رواج اور قبول ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ صحیح اور مستند حدیثوں کا مجموعہ ہونے کی بنا پر بھی بڑی اہم اور معتبر کتاب خیال کی جاتی ہے، مولانا خرم علی بلہوری نے ترجمہ و تحشیہ کے لیے مشارق الانوار کا انتخاب اسی لیے کیا تھا، وہ رقم طراز ہیں:

''سو سب کتابوں سے مشارق الانوار حسن صغانی کی بہت پسند آئی، اس واسطے کہ مختصر کتاب ہے اور اس کی احادیث کی صحت پر اتفاق ہے، کوئی اس کی ایسی حدیث نہیں جو غیر معتبر ہو، بخلاف مشکوٰۃ کے کہ اس میں ہر جنس کی روایت ہے، صحیح بھی اور ضعیف بھی۔''(۲)

خود مصنف کو بھی یہ کتاب بہت پسند تھی اور وہ اسے صحت و وثوق کے لحاظ سے بڑی اہم اور مستند خیال کرتے تھے، فرماتے ہیں:

ھذا کتاب ارتضیه و استضیئ بضیائه	یہ کتاب مجھے اس قدر پسند ہے کہ میں اس سے
و العمل بمقتضاہ (۳)	روشنی حاصل کرتا ہوں اور اس پر عمل کرتا ہوں۔

مشارق الانوار کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

ھذا الکتاب حجة بینی و بین اللہ	یہ کتاب صحت و وثوق اور اعتنا و استناد میں
تعالیٰ فی الصحة و الرصانة و الاتقان	میرے اور اللہ کے درمیان حجت ہے اور یہ
و المتانة و ھو انیسی مدة حیاتی فی	دنیا میں مدۃ العمر میری رفیق و انیس ہوگی
الدنیا و شفیع المشفع انشاء اللہ	اور انشاء اللہ عقبیٰ میں میرے لیے موجب

(۱) مقدمہ مشارق الانوار۔ (۲) تحفۃ الاخیار طبع نولکشور کانپور ۱۳۹۱ھ، ص ۲۔ (۳) اتحاف النبلاء المتقین، ص ۱۴۷۔

فی القیامۃ (۱) شفاعت بنے گی۔

فن حدیث میں الفاظ کی بحث وتحقیق کی طرح معانی کی بحث وتحقیق بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے، جن محدثین نے اس باب میں احتیاط وکاوش سے کام لیا ہے اور احادیث کے متن کی طرح ان کے معنی ومفہوم کی تحقیق میں بھی زیادہ کدوکاوش کی ہے، ان میں امام صغانی بھی تھے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس حیثیت سے ان کی تالیف مشارق الانوار کو بڑی اہم کتاب بتایا ہے، فرماتے ہیں:

وامر ثانی یعنی احتیاط درفہم معانی احادیث پس مواد آں نیز از تحقیق امر اول معلوم شد زیرا کہ مشارق الانوار در توضیح معانی احادیث صحیحین ومؤطا کافی است۔ (۲)

رہا دوسرا معاملہ یعنی احادیث کے معانی کی فہم میں احتیاط تو اس کی حقیقت بھی پہلے معاملہ کی تحقیق سے واضح ہوگئی کیونکہ مشارق الانوار صحیحین اور مؤطا کی احادیث کے معانی کی توضیح کے لیے کافی ہے۔

یہ کتاب عباسی خلیفہ مستنصر باللہ (۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء-۶۴۰ھ/۱۲۴۳ء) کی فرمائش پر بغداد میں لکھی گئی تھی، مصنف کا بیان ہے:

الفته لخزانة (۳) المستنصر بن الظاهر بن المستضیء العباسی (۴)

میں نے اسے مستنصر بن ظاہر بن مستضی عباسی کے کتب خانہ میں مرتب کیا۔

اس میں ۲۲۴۶ حدیثیں جمع کی ہیں (۵) اور یہ بارہ ابواب پر مشتمل ہے، اکثر ابواب کے ذیل میں فصول وانواع بھی شامل ہیں جن کی مختصر کیفیت اور مشمولات کا حال ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:

پہلا باب: دو فصلوں کا مجموعہ ہے، فصل اول میں وہ حدیثیں درج ہیں جن کی ابتدا

---

(۱) مقدمہ مشارق الانوار۔ (۲) عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ، ص۱۶۔ (۳) لخزانۃ تصحیف ہے، صحیح بخزانۃ ہوگا، یہ ترجمہ اسی لحاظ سے کیا گیا ہے۔ (۴) کشف الظنون، ج۲، ص۴۳۶ واتحاف النبلاء، ص۱۴۷۔ (۵) ایضاً۔

مَنْ موصولہ یا شرطیہ سے ہوئی ہے اور فصل دوم کی حدیثوں کا آغاز مَنْ استفہامیہ سے ہوا ہے۔

دوسرا باب: دس فصلوں پر مرتب ہے، ان میں حرف اِنَّ اور اس سے ملحق ضمیروں سے شروع ہونے والی حدیثیں نقل کی گئی ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ اِنَّ ۲۔ اِنّیْ ۳۔ اِنّا ۴۔ اِنَّهٗ ۵۔ اِنَّهُمْ ۶۔ اِنَّها ۷۔ اِنَّک

۸۔ اِنَّکُمْ ۹۔ اِنَّکُنَّ ۱۰۔ اِنَّما

تیسرا باب: اس میں حرف لا سے شروع ہونے والی حدیثوں کا ذکر ہے۔

چوتھا باب: اس کی فصل اول میں اِذا سے اور فصل ثانی میں اِذ سے شروع ہونے والی حدیثیں نقل کی ہیں۔

پانچواں باب: دو فصلوں کا مجموعہ ہے، پہلی فصل پانچ انواع پر مشتمل ہے، ان میں جن کلمات سے شروع ہونے والی حدیثیں ذکر کی گئی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ ما نافیہ ۲۔ ما استفہامیہ ۳۔ ما خبریہ ۴۔ ما شرطیہ ۵۔ ما بین

دوسری فصل میں چار انواع ہیں:

۱۔ اس میں وہ حدیثیں ہیں جو حرف ندا ''یا'' سے شروع ہوئی ہیں اور منادی وہ اشخاص ہیں جن کی کنیتوں یا ناموں کا ذکر ہے، جیسے یا ابا المنذر، یا ابا بکر اور یا ابن الخطاب، یا علی وغیرہ۔

۲۔ اس میں بھی حرف ندا ''یا'' مذکور ہے اور منادی جگہوں یا گروہوں یا قبائل کی طرف مضاف ہو کر آیا ہے، جیسے یا اهل الخندق، یا اهل المدينة، یا معشر الانصار، یا معشر المسلمين، یا معشر الشباب وغیرہ۔

۳۔ یہ نوع متفرق اجناس پر مشتمل ہے، یعنی اس میں بھی حرف ندا کا ذکر ہے اور منادی کہیں مفرد اور کہیں مضاف و مرکب ہے۔

۴۔ اس نوع میں منادی عورتوں کی کنیتوں یا ناموں کے لحاظ سے ہے، جیسے

یا ابنة ابی امیہ، یاام حارثة اور یا بریرۃ، یا عائشة وغیرہ۔

چھٹا باب: بارہ فصلوں پر مرتب ہوا ہے، ہر فصل میں جو حدیثیں درج ہیں ان کی ابتدا مندرجہ ذیل لفظوں سے ہوئی ہے:

۱۔ لیس ۲۔ نعم و بئس ۳۔بینا و بینہ ۴۔ لعن اللّٰہ ۵۔ لو ۶۔ لولا
۷۔ ان شرطیہ ۸۔ لفظ خیر ۹۔ افعل کے وزن پر صیغہ تفضیل ۱۰۔ کل
۱۱۔ قد ۱۲۔ لقد

ساتواں باب: اس میں سترہ فصلیں ہیں جن کی ابتدا درج ذیل صورتوں میں ہوئی ہے۔

۱۔مبتدا معرف باللام جیسے الآن، الارواح، الاسلام وغیرہ ۲۔ایما ۳۔ایکم
۴۔ای ۵۔ أ (ہمزۂ استفہام) ۶۔الا ۷۔الم ۸۔ افلا ۹۔الیس نیز
او ۱۰۔أما (مخففہ) ۱۱۔مثل (بفتح الثاء) ۱۲۔ ایاکم ۱۳۔ انا ۱۴۔اسم الفعل
جیسے دونک، علیک وغیرہ ۱۵۔لک ۱۶۔ لم حازمة ۱۷۔أمّا (مشددہ)

آٹھواں باب: چھ فصلوں کا مجموعہ ہے، ہر فصل کے شروع کی حدیث اس طور پر ہے:

۱۔اعداد (گنتیاں) ۲۔''واو قسم'' جس کے بعد الذی آیا ہے (جیسے والذی نفس محمد بیدہ) ۳۔''حرف قسم'' جس کے بعد اللّٰہ مذکور ہے، مثلاً واللّٰہ ۴۔فعل مستقبل ۵۔مضارع معلوم ۶۔مضارع مجہول۔

نواں باب: ۵ فصلیں بہ تفصیل ذیل ہیں:

۱۔فعل ماضی معلوم ۲۔فعل ماضی مجہول ۳۔فعل ماضی صیغہ متکلم کے ساتھ
۴۔ ھل ۵۔فعل امر۔

دسواں باب: ۲ فصلیں اس طرح ہیں:

۱۔لام ابتدا ۲۔مختلف النوع۔ (اس کی حدیثیں مختلف لفظوں اور حرفوں سے شروع ہوئی ہیں جن کو کسی خاص قاعدہ میں منضبط نہیں کیا جاسکا)

گیارھواں باب: یہ باب احادیث قدسی کے لیے خاص ہے۔

بارھواں باب: ادعیہ پر مشتمل ہے۔

اس تفصیل سے کتاب کے مباحث ومندرجات کی نوعیت کے علاوہ اس کی قدر و قیمت اور اس کی ترتیب وتبویب میں امام صغانی کی جودت طبع اور دقت آفرینی کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اہل نظر اور ارباب فن نے بھی اس کی ترتیب وتہذیب کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے، عزیز الدین عبداللطیف بن عبدالعزیز لکھتے ہیں:

رتب الشیخ ھذا الکتاب بترتیب انیق وانتخبه بتھذیب ذلیق (۱)
شیخ صغانی نے اسے نہایت خوبی سے مرتب کیا ہے اور اس کا بہت عمدہ انتخاب کیا ہے۔

صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ ورتبه بترتیب انیق صغانی نے اس کو بہت عمدہ طور پر مرتب کیا ہے (۲) نواب صدیق حسن خان تحریر فرماتے ہیں:

وترتیب ایں کتاب بسیار خوب وانیق واقع شدہ (۳)
اس کتاب کی ترتیب بہت اچھے اور خوبصورت طریقہ پر کی گئی ہے۔

کتب حدیث میں اس کی نوعیت مشکوۃ اور مصابیح جیسی ہے، فرق یہ ہے کہ مشکوۃ مختلف کتابوں کی احادیث کا مجموعہ ہے اور اس کی ترتیب فقہی ابواب پر کی گئی ہے، مگر مشارق الانوار اصلاً صحیحین کی حدیثوں کا انتخاب یا انڈکس ہے اور اس کی ترتیب احادیث کے ابتدائی الفاظ پر ہے جس کی کیفیت اوپر بیان کی جاچکی ہے۔

ترتیب سے امام صغانی کی خاص جودت طبع ، دقت آفرینی اور ندرت وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے، جیسے اس میں احادیث قدسی ، دعاؤں اور قسموں کے علاحدہ ابواب قائم کیے گئے ہیں اور اس ضمن میں والذی نفس محمد بیدہ یا والذی نفسی بیدہ کی الگ فصل قائم کی گئی ہے، اسی طرح اعداد کا علاحدہ تذکرہ کرنا بھی امام صغانی کی جودت طبع کا نتیجہ ہے۔

(۱) مبارق الازہار، ص ۱۹۔ (۲) کشف الظنون، ج ۲، ص ۴۳۶۔ (۳) اتحاف النبلا، ص ۱۴۷۔

صغانی کی یہ ندرت بھی قابل ذکر ہے کہ مشارق الانوار میں صرف قولی حدیثوں کو جمع کیا ہے۔

مشارق الانوار کی ترتیب کے متعلق ایک شبہ اور اس کا ازالہ: مشارق الانوار کی ترتیب حروف ہجا پر کی گئی ہے، اس کا اقتضا تو یہ تھا کہ اس میں پہلے حرف الف کی حدیثیں لاتے، مگر اس کے برعکس اس میں پہلے حرف من سے شروع ہونے والی حدیثیں بیان کی گئی ہیں، اس کے بعد ان اور لا کی حدیثیں نقل کی گئی ہیں، ایسی صورت میں حروف تہجی کے مطابق ترتیب کا دعویٰ درست نہیں معلوم ہوتا، مولانا خرم علی اس اشکال کو ذکر کرکے اس کا یوں جواب دیتے ہیں:

''جن حدیثوں کے سرے پر حرف من ہے اول باب میں لایا اور ان کی حدیثوں کو دوسرے باب میں اور جن پر حرف لا ہے ان کو تیسرے باب میں اور باوجود اس کے پھر حروف تہجی کی رعایت ہے، خلاصہ یہ کہ اس میں ترتیب معنوی نہیں، ترتیب لفظی ہے...... لیکن جامع رحمہ اللہ نے باب اول میں من کو مقصود نہیں بلکہ من کے بعد وہ لفظ آئے گا جس کے شروع میں الف ہو، چنانچہ پہلی حدیث ہے:

ابو هريرة من آمن بالله ورسوله	ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لایا۔

اور دوسری حدیث یہ ہے:

زيد بن خالد الجهني من آوى ضاله فهو ضال مالم يعرفها (۱)	زید بن خالدؓ سے مروی ہے کہ جس نے کسی گم شدہ جانور کو پناہ دی تو جب تک اس کی تشہیر نہ کرے وہ اس کا ضامن رہے گا۔

پہلی حدیث میں من کے بعد لفظ آمن اور دوسری میں لفظ آوی کا اعتبار ہے،

(۱) تحفۃ الاخیار باب اول، ص ۶ و ۷۔

حروف تہجی کی رعایت کا التزام تمام کتاب میں اسی طرح ہے جیسا کہ حدیث ا و ۲ کے بعد ہے کہ الف ممدودہ کے بعد الف مقصورہ آیا ہے۔"

حوالے: مشارق الانوار میں حدیثوں کے حوالے بھی ہر حدیث کے ساتھ دیے گئے ہیں، جس کے لیے "خ"، "م" اور "ق" کی علامتیں اور رموز مقرر کیے گئے ہیں، "خ" سے "بخاری" کی جانب اور "م" سے "مسلم" کی طرف اشارہ ہے اور "ق" سے مراد یہ ہے کہ وہ حدیث "متفق علیہ" ہے، یعنی بخاری و مسلم دونوں نے اس کی تخریج کی ہے۔

اختصار: مشارق الانوار کی ایک اہم خوبی اختصار ہے، مصنف نے طوالت سے بچنے کے لیے سندیں حذف کر دی ہیں اور صرف اس صحابی کا نام دیا ہے جو اس حدیث کے اولین راوی ہیں، اس کے بعد اصل مضمون شروع کر دیا ہے اور غایت اختصار کی بنا پر قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں کہا ہے، اس سلسلہ میں مولانا خرم علی کا بیان ملاحظہ ہو:

"مصنف نے اختصار کے واسطے احادیث کے اسناد یعنی راویوں کے نام کو حذف کیا، فقط صحابی کا نام جو اس حدیث کا اول راوی ہے مذکور کیا، اس طرح ہر حدیث میں اول کتاب کا اشارہ کیا، پھر صحابی کا نام لیا، پھر حدیث کو بیان کیا اور اختصار کے واسطے ہر حدیث پر قال رسول اللہ نہیں کہا۔"(۱)

مشارق الانوار کی بعض اور خصوصیات یہ ہیں:

۱: کہیں کہیں حدیثوں کے موقع و محل کی صراحت کر دینے سے ان کا مفہوم اچھی طرح واضح ہو گیا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس موقع پر یا کس سے مخاطب ہو کر یہ بات فرمائی تھی، نیز اگر آپؐ نے کسی خاص شخص کے سوال کے جواب میں کوئی بات فرمائی تھی تو اس کا بھی وضاحت سے پتہ چل جاتا ہے، مثلاً ایک حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

---

(۱) تحفۃ الاخیار، باب اول، ص ۶ و ۷، بحوالہ معارف جون ۵۷ء، ص ۴۴۶۔

قالہ منصرفہ من تبوک (مشارق الانوار، ص۴۲)	آپؐ نے تبوک سے واپسی کے وقت یہ ارشاد فرمایا تھا۔

ایک حدیث یہ نقل کی ہے:

یا ام سلیم ان اللّٰہ قد کفیٰ واحسن	اے ام سلیمؓ! اللہ ہمارے لیے (دشمنوں کے شر سے) کافی ہے اور اس نے ہمارے ساتھ اچھا کیا۔

اس کی توضیح میں تحریر کرتے ہیں:

قالہ یوم حنین (شرح مبارق الازہار، ص۳۶)	رسولؐ اللہ نے حنین کے روز یہ بات فرمائی تھی۔

ام ہانیؓ کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

قد آجرنا من آجرت و آمنا من آمنت	(اے ام ہانیؓ) جسے تو نے پناہ دی، امان دی، اسے ہم نے بھی پناہ اور امان دی۔

اس کی توضیح اس طرح کی ہے:

قالہ لہا یوم فتح مکہ (مبارق الازہار، ج۲، ص۱۸۳)	آپؐ نے ام ہانی سے فتح مکہ کے روز یہ فرمایا تھا۔

گو پوری کتاب میں اس کا التزام نہیں کیا ہے، چنانچہ مولانا خرم علی بلہوری لکھتے ہیں:

''مصنف نے ہر جگہ قصہ حدیث کا نہیں بیان کیا کہ حضرت نے یہ حدیث کس وقت، کس تقریب سے فرمائی۔''(۱)

۲: اوپر گزر چکا ہے کہ مصنف نے اختصار کی وجہ سے سندیں حذف کر دی ہیں اور صرف صحابی کا نام دیا ہے، مگر اس کے باوجود اگر کسی حدیث کے متعلق اس کے کسی

(۱) تحفۃ الاخیار بحوالہ معارف جون ۵۷ء، ص۴۴۶۔

راوی نے کوئی تشریح ووضاحت کی ہے تو اسے نقل کر دیا ہے، جیسے ایک جگہ لکھتے ہیں:

قال حماد (حماد نے یہ بات کہی)

اسی طرح روایت کے الفاظ میں اگر راوی نے شک وتردد کا اظہار کیا ہے تو اسے بھی ظاہر کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ یہ شک واشتباہ راوی کا ہے، جیسے قربانی کے گوشت کے متعلق آپؐ نے فرمایا:

کلوا واطعموا واحبسوا و ادخروا — قربانی کا گوشت خود کھاؤ اور دوسروں کو کھلاؤ اور اسے روک یا جمع کر کے رکھ لو۔

اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ شک من الراوی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احبسوا (روک لو یا ادخروا (جمع کرلو) میں سے کون سا لفظ فرمایا تھا، راوی کو اس میں شک وشبہ ہو گیا ہے۔(۱)

۳: مصنف نے اس میں کہیں کہیں منامی حدیثیں نقل کی ہیں۔

۴: بعض حدیثیں دو صحابیوں کی سندوں سے ذکر کی ہیں۔

۵: احادیث کے سلسلہ میں مختلف قسم کی وضاحتیں کی ہیں، مثلاً .... کہیں کہیں ان کی مبہم باتوں کی توضیح کی ہے، بعض جگہ کی صراحت کی ہے کہ حدیث منسوخ ہو گئی ہے، اسی طرح روایت کے اختلاف الفاظ ومتون کی نشاندہی کی ہے، لفظوں کے اختلاف کی صورت میں بعض جگہ اپنی تصویب، توثیق اور ترجیح دلائل کے ساتھ لکھی ہے، نیز دو راویوں کے یہاں الفاظ کی روایت میں جو کمی بیشی یا حذف واضافہ پایا جاتا ہے اسے بھی بتا دیا ہے۔

۶: رواۃ واسناد کے سلسلہ میں بھی مختلف توضیحات کی گئی ہیں، مثلاً راویوں کے ناموں میں فرق واختلاف کی صراحت، ان میں غموض، خفا یا ابہام کی وضاحت، راوی سے حدیث کے بیان میں کوئی چیز ترک ہو گئی یا اس نے اپنی عدم یادداشت یا سوئے حفظ کا

(۱) مبارق الازہار، ج ۲، ص ۳۷۔

اعتراف کیا ہے تو اسے بھی نقل کیا ہے، اسی طرح سندوں کے ارسال و عدم واتصال کا بھی ذکر کیا ہے۔

۷: متفق علیہ حدیثوں میں جس محدث کے سیاق کا تتبع کیا ہے، اس کی صراحت کی ہے، اس سلسلہ میں دونوں کی روایتوں کے فرق واختلاف یا اضافہ وکمی کی نشاندہی بھی کی ہے، کسی روایت کو امام مسلم نے مسند اور امام بخاری نے معلق بیان کیا ہے تو اسے بھی بیان کردیا ہے، اسی طرح قضاعی کے شیخین سے اختلاف کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

مشارق الانوار متعدد بار طبع ہوچکی ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی اکثر کتب خانوں میں موجود ہیں، ٹونک کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف کے فرزند محمد بن حسن نے ان کے سامنے اس کی قرأت کی تھی۔(۱)

مشارق الانوار کی شرحیں: مشارق الانوار کی شہرت ومقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس کے بہ کثرت شروح وحواشی لکھے گئے، اس کی تلخیص کی گئی اور اس کے کئی مختصرات مرتب کیے گئے، مولوی سید احمد ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں:

''ان کی تالیف مشارق الانوار حدیث کی نہایت مشہور ومعتبر کتاب مانی جاتی ہے اور اس کی مقبولیت کا اس ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ دسویں صدی ہجری تک (تقریباً ساڑھے تین سو برس میں) اس کتاب کی ۲۴، ۲۵ شرحیں اور حواشی ایسے لکھے جاچکے تھے جو بجائے خود مستقل اور بلند پایہ کتابیں ہیں۔''(۲)

مولوی امام ابویحییٰ امام خاں نوشہروی رقم طراز ہیں:

''صحاح ستہ کے بعد سب سے زیادہ اس کی شرحیں لکھی گئیں۔''(۳)

ہندوستان میں اس کتاب کے رواج وقبول کا اوپر ذکر آچکا ہے، اس لیے ہندوستانی علمانے بھی اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا اور اس کی متعدد شرحیں، فوائد اور مختصرات بھی لکھے اور

(۱) قصر علم، ص ۳۰۱۔ (۲) تاریخ ہند، کتاب دوم، ص ۲۶۲۔ (۳) معارف دسمبر ۱۹۴۷ء، ص ۴۳۹۔

اس کے اردو ترجمے بھی کیے گئے، بلکہ حدیث کی یہی وہ کتاب ہے جس کا غالباً سب سے پہلے اردو ترجمہ ہوا اور جس کی حدیثوں کی سب سے پہلے اردو میں شرح وتوضیح کی گئی، ذیل میں شرحوں کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے، ہندوستانی شرحوں کا ذکر آخر میں آئے گا۔

۱۔تحفۃ الابرار: شارح کا نام شیخ اکمل الدین محمد بن محمود البابرتی الحنفی (م۷۸۶ھ/ ۱۳۸۴ء) ہے۔(۱)

۲۔شوارق الاسرار العلمیہ: یہ صاحب قاموس شیخ مجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی (م۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء) کی شرح ہے جو چار جلدوں پر مشتمل تھی۔(۲)

۳۔کشف المشارق: خیر الدین خضر بن عمر طوفی شارح کا نام ہے، وہ دولت عثمانیہ کے علما میں تھے، انہوں نے ۳ جلدوں میں مشارق الانوار کی شرح لکھی تھی۔(۳)

۴۔المطالع المصطفویہ: مشہور اور اہم شرح ہے جو شیخ امام سعید بن محمد بن مسعود گارزونی (م۷۵۸ھ/۱۳۵۶ء) نے لکھی تھی، ان کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ انہوں نے مشارق الانوار کے ہر باب وفصل کے آخر میں اس باب وفصل کی احادیث کی تعداد بھی لکھی ہے اور آخر میں ان کی مجموعی میزان ۲۲۴۶ دی ہے(۴) مشارق کے موجودہ متداول نسخہ پر گارزونی ہی کے شمار کردہ اعداد ثبت ہیں۔(۵)

۵۔مبارق الازہار: یہ مشارق الانوار کی بڑی مشہور ومتداول شرح ہے جو عز الدین عبد اللطیف بن عبد العزیز المعروف بابن الملک نے دو جلدوں میں لکھی تھی اور دولت عثمانیہ سے ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی ہے، دور حاضر کے مشہور ہندوستانی محدث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

"عبد اللطیف بن ملک یا ابن فرشتہ ایک مشہور مصنف اور نامور عالم ہیں، مشارق الانوار کی شرح مبارق الازہار کو بہت شہرت ومقبولیت حاصل ہے، یہ شرح استنبول سے چھپ کر

(۱) کشف الظنون، ج۲، ص۶۳۳۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً۔ (۴) ایضاً۔ (۵) معارف دسمبر ۱۹۴۷ء، ص۴۳۹۔

شائع ہو چکی ہے، مصنف کی اس کے سوا تصنیفات میں شرح مجمع البحرین فقہ میں اور شرح منار اصول فقہ میں بھی بہت مستند اور علما میں متداول رہی ہے۔"(۱)

مبارق الازہار ان خوبیوں اور خصوصیات سے آراستہ ہے جو قدما کی شرحوں میں پائی جاتی ہیں، ابتدا میں شارح کا مقدمہ ہے پھر مقدمہ، مشارق کی شرح کرنے کے بعد دو جلدوں میں اس کے متن کی شرح کی ہے، ابن الملک کے پیش نظر مشارق الانوار کا جو نسخہ تھا اس میں جہاں کہیں انہیں تصحیف یا غلطی نظر آئی، اس کو انہوں نے درست کر دیا ہے، لکھتے ہیں:

''میں نے التزام کیا ہے کہ شیخین میں اگر کوئی صاحب کسی حدیث میں منفرد ہیں تو اس کا ذکر کروں اور اگر دونوں متفق علیہ ہیں تو اسے لکھ دوں کیوں کہ مشارق الانوار کے متداول نسخے میں علامات کے لحاظ سے فرق و اختلاف ہے اور ان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ زیادہ صحیح کون ہے اور بعض جگہ مصنف کی علامتیں واقعہ کے مطابق نہیں ہیں تو ان پر بھی متنبہ کیا ہے، مثلاً مصنف نے حدیث کو صحیحین کی طرف منسوب کیا ہے، حالانکہ ان میں سے صرف ایک ہی کتاب میں وہ درج ہے یا اس کی تخریج ان دونوں کے علاوہ کسی کتاب میں کی گئی ہے یا راوی کے نام میں صحیحین سے عدم مطابقت ہے(۲) گویا مبارق الازہار میں شرح کے ساتھ مشارق الانوار کی صحت و تخریج بھی کی گئی ہے، یعنی اگر حدیث بخاری میں ہے تو اس کا ماخذ کتاب و باب لکھ دیا اور مسلم میں ہے تو اس کی کتاب و باب کا ذکر کر دیا اور دونوں میں ہے تو ہر دو کا حوالہ کتاب و باب ضبط فرما دیا ہے" مولوی ابو یحییٰ امام خان نوشہروی تحریر فرماتے ہیں:

''معلوم ہوتا ہے کہ ابن الملک نے مشارق کی ایک ایک حدیث کا صحیحین سے مقابلہ کیا ہے اور جو حدیث مقابلہ کے بعد انہیں نہیں ملی، اس کے متعلق صراحت کر دی کہ وہ حدیث بخاری میں یا مسلم میں یا ان دونوں میں سے کسی میں نہیں ملی، ایسی حدیثیں جو صحیحین میں سے کسی میں نہیں ہیں ابن الملک کو بے شمار ملی ہیں نہیں کہا جا سکتا کہ مؤلف مشارق ہی کے

(۱) معارف جنوری ۵۴ء، ص ۶۱۔ (۲) مبارق الازہار بحوالہ کشف الظنون، ج ۲، ص ۴۳۷۔

پیش نظر صحیحین کے نسخوں میں کوئی کمی تھی یا انہوں نے بخاری ومسلم کے سوا کسی اور کتاب سے لیا، یا امام صغانی کے بعد کے محدثین نے مشارق میں ایسی احادیث کا اضافہ کر دیا جو صحیحین میں نہ تھیں، یا ناسخین نسخ کی بے پروائی سے ماخذ کا اندراج غلط ہوتا گیا اور یا ابن الملک صاحب مبارق ہی کے پیش نظر نسخوں میں تصحیف ہو چکی تھی جن پر اعتماد کر کے انہیں لم نجدہ (نہیں ملی) ولم نجدہ لکھنا پڑا"(۱) استنبول کا مجموعہ نسخہ الحاج الحافظ ابو مظہر احمد طاہر قنوجی مدرس جامع سلطان بایزید کی تصحیح وتحشیہ کے بعد چھپا ہے، فاضل مصحح نے شرح کے حواشی پر مشارق الانوار کی حدیثوں کے اصل مراجع یعنی صحیحین کے کتب وابواب کی صراحت کر دی ہے۔

مبارق الازہار کا مصنف: اوپر گزر چکا ہے کہ شارح کا نام عز الدین عبداللطیف ابن عبدالعزیز المعروف بہ ابن الملک ہے مگر قاضی سید نور الدین حسین صاحب نے معارف جولائی ۴۹ء میں اور ڈاکٹر سید باقر علی استاد شعبہ عربی اسماعیل کالج بمبئی نے معارف اکتوبر ۵۰ء میں یہ انکشاف فرمایا ہے کہ وہ ایک ہندوستانی عالم کی تصنیف ہے جو احمد آباد کے باشندے تھے، ان کے والد کا نام عبدالملک جنانی تھا اور ان کی وفات ۹۱۵ھ/ ۱۵۰۹ء میں ہوئی، ان کے صاحبزادے بھی عالم تھے اور ان کا نام خلیل محمد عباسی تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے نزدیک یہ انکشاف معیار تحقیق پر پورا نہیں اترتا، مولانا نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ مبارق الازہار عبدالملک بن عبدالعزیز بن امین المعروف بہ فرشتہ یا عبداللطیف بن عبدالملک کی تصنیف ہے، مولانا نے یہ تحقیق سنہ وفات ۹۱۵ھ/ ۱۵۰۹ء کو بھی غلط قرار دیا ہے اور استنبول کے نسخہ پر درج سنہ وفات ۷۹۷ھ/ ۱۳۹۵ء کو بھی صحیح تسلیم نہیں کیا ہے اور ابن العماد کے بیان پر اعتماد کر کے لکھا ہے کہ ابن فرشتہ کی وفات تقریباً ۸۸۵ھ/ ۱۴۸۰ء میں ہوئی ہے، مولانا کے نزدیک مصنف کا ہندوستانی ہونا محقق نہیں ہے، انہوں نے علامہ شوکانی کی البدر الطالع کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مصنف ایک رومی عالم تھے

(۱) معارف دسمبر ۴۷ء ص ۴۴۱۔

جو سلطان مراد کے زمانہ میں موجود تھے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو معارف جنوری ۱۹۵۴ء مضمون مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی بعنوان ''مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے'')

مبارق الازہار کی اہمیت کی وجہ سے اس کے بھی حواشی لکھے گئے ہیں:

۱۔ حاشیہ مبارق الازہار: اس کے محشی کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔(۱)

۲۔ حاشیہ بر حاشیہ مذکور: از مولانا ابراہیم بن احمد بن احمد المعید، اس کا نام صواب الافکار تھا۔(۲)

۳۔ ایک اور حاشیہ: از محمد بن الارنیقی الشہیر بوحی زادہ (م ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء)(۳)

۴۔ انوار البوارق فی ترتیب المشارق، از مولی ابراہیم بن مصطفی، اس میں مبارق الازہار کی ترتیب (مع مشارق) مشکوۃ المصابیح کی طرح کردی ہے، مصنف لکھتے ہیں:

''میں نے بلا ضرورت کہیں کوئی ترمیم وتغیر نہیں کیا ہے البتہ اس میں کہیں کہیں مصابیح سے بھی کچھ چیزیں شامل کردی ہیں۔''(۴)

۶ و ۷ مشارق الانوار کی دو شرحیں مولی شمس الدین احمد بن سلیمان المعروف بہ ابن کمال پاشا (م ۹۴۰ھ/۱۵۳۳ء) نے لکھی تھی مگر انہیں زیادہ شہرت نصیب نہیں ہوئی۔(۵)

۸۔ حدائق الازہار از وجیہ الدین عمر بن عبدالمحسن الارزنجانی: اس میں حسب ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا تھا، شرح السنۃ، نوادر الاصول، الفائق، النہایہ، مجمع الغرائب، مطالع الانوار، شرح البیضاوی، التحفہ لبدر الدین الاربلی۔(۶)

۹۔ شرح از شمس الدین ابن صائغ محمد بن عبدالرحمٰن الزمردی، حنفی (۷)(م ۷۷۶ھ/۱۳۷۵ء) مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھتے ہیں کہ:

''مصنف متبحر اور جامع العلوم والفنون تھے، مصر وشام میں حدیث کی تحصیل کی اور

(۱) کشف الظنون، ج۲، ص۴۳۷۔(۲) ایضاً۔(۳) ایضاً۔(۴) ایضاً۔(۵) ایضاً۔(۶) ایضاً۔(۷) ایضاً۔

اور اس میں بارع وفائق ہوئے، درس وافادہ کے علاوہ صاحب تصانیف بھی تھے، مشارق کی شرح لکھی۔''(۱)

۱۰۔ شرح از مولی محمد بن مصلح الدین قوجوی المعروف بشیخ زادہ محشی (م ۹۵۱ھ/ ۱۵۴۴ء)(۲)

۱۱۔ شرح از جلال الدین رسول بن احمد التبانی (م ۷۹۳ھ/ ۱۳۹۰ء) یہ نا مکمل رہ گئی تھی ۔(۳)

۱۲۔ شرح وحید الدین۔(۴)

۱۳۔ دقائق الآثار از محمد بن محمد اسدی قدسی (م ۸۰۸ھ/ ۱۴۰۵ء) یہ مشارق الانوار کی تلخیص ہے۔(۵)

۱۴۔ ضیاء المشارق الجدیر بالوضع علی المفارق از ضیاء الدین علی بن محمود کرمانی، یہ متعدد جلدوں میں تھی۔(۶)

۱۵۔ شرح از شمس الدین عطابی، ابن ملک کا بیان ہے کہ ''طلبہ فن کو اس شرح سے اغماض برتنا مناسب نہیں ہے، یہ گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے جو اکثر کتابوں سے استفادہ کر کے لکھی گئی ہے۔(۷)

۱۶۔ حاشیہ از قاسم بن قطلو بغا حنفی (۸۷۶ھ/ ۱۴۷۱ء)۔(۸)

۱۷۔ مبارق الازہار از علی بن حسن، یہ ۹۳۶ھ/ ۱۵۲۹ء میں مرتب کی گئی، ابن الملک کی شرح اس سے پہلے لکھی گئی تھی، علی بن حسن نے پہلے مشارق الانوار کو مبوب کیا ہے، اس کے بعد ابن الملک کی شرح کو از سر نو مرتب کیا۔(۹)

۱۸ و ۱۹۔ علاء الدین یحیٰ بن عبد اللطیف طاؤسی قزوینی نے دو شرحیں لکھی تھیں، ایک شرح صغیر اور دوسری کبیر تھی، شرح صغیر کی تالیف سے ۷۷۵ھ/ ۱۳۷۳ء میں بغداد میں

(۱) الفوائد البہیہ۔ (۲ تا ۷) کشف الظنون، ج ۱، ص ۴۳۷۔ (۸) ایضاً، ج ۲، ص ۴۳۷۔ (۹) ایضاً۔

مستنصریہ میں فارغ ہوئے، اس میں کہیں کہیں شرح کبیر کے حوالے دیے ہیں۔(۱)

۲۰۔ تحفۂ حسنا از عبدالباقی معروف بہ طورسون زادہ، مصنف جس زمانہ میں مشارق الانوار کا درس دیتے تھے اس وقت اکمل الدین اور ابن الملک کی شرحیں ان کے پیش نظر رہتیں اور ان سے بکثرت استفادہ کرتے، پھر وہ اسکندریہ کے قاضی مقرر کیے گئے تو انہوں نے مشارق کی سو حدیثوں کی تحفۂ حسنا کے نام سے شرح لکھی، بعد میں اس میں ۱۵/ اور حدیثوں کی شرحیں بھی شامل کردی تھیں۔(۲)

ہندوستانی شروح وتراجم: مشارق الانوار کی جو شرحیں ہندوستان میں لکھی گئیں، وہ یہ ہیں:

(۱/۲۱) شرح مشارق الانوار از مولانا شمس الدین یحییٰ اودھی (م ۷۴۷ھ/ ۱۳۴۶ء)

مصنف خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے اجل خلفا میں تھے، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے شرح مشارق تالیف کی تھی۔(۳)

(۲/۲۲) شرح مشارق الانوار از مولانا مظفر بلخی بہاری (م ۸۰۳ھ/ ۱۴۰۰ء) مولانا مظفر مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مرید و جانشین اور متبحر عالم تھے، حضرت مخدوم الملک انہیں امام کہا کرتے تھے، مکتوبات بست وہشت (۲۸) کے مکتوب دوازدہم (۱۲) سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا امام مظفر بلخی نے مشارق الانوار کی شرح لکھی تھی۔(۴)

(۳/۲۳) مدارج الاخبار از خواجہ ارزانی محدث جونپوری (م ۹۸۱ھ/ ۱۵۷۳ء)

حضرت شیخ مخدوم ارزانی کے لڑکے اور مرید تھے، صاحب زہد وتقویٰ اور تمام علوم وفنون میں ماہر تھے، اپنے زمانہ کے مشہور علمائے محدثین میں سے تھے، احادیث مشارق کی بہ ترتیب حروف تہجی ہیں، حسب ترتیب مصابیح الانوار تالیف کرکے اس کا نام مدارج الاخبار رکھا، شارح

(۱و۲) کشف الظنون، ج ۲، ص ۲۴۷۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۹۷ وتذکرہ علمائے ہند، ص ۸۶۔ (۴) معارف ج ۲۲، ص ۲۹۵ تا ۲۹۹۔

عہد شیر شاہی میں درجۂ وزارت میں پہنچے، سنہ وفات ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء ہے۔(۱)

مولانا حکیم حبیب الرحمٰن (ڈھاکہ) نے ان کا نام شیخ مبارک بن ارزانی الرجتکی البناری لکھا ہے اور بتایا ہے کہ مدارج کا ایک ناقص قلمی نسخہ بانکی پور کے کتب خانہ میں، صحاح ستہ سے مصابیح کی طرح برعایت ابواب فقہی لکھی ہے(۲) مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے بھی بہ تحقیق ان کا نام مبارک اور والد کا نام شیخ ارزانی لکھا ہے۔ (برہان فروری ۱۹۵۴ء)

مدارج الاخبار و معارج الآثار من مشارق الانوار کے نام سے ایک کتاب کتب خانہ ٹونک میں بھی موجود ہے جس میں مشارق کو فقہی تبویب پر مرتب کیا گیا ہے لیکن غالباً اس پر مصنف کا نام درج نہیں ہے یا فہرست نگاروں نے اس کا نام نہیں دیا (۳) خیال ہے کہ یہ مدارج ہی کی شرح ہوگی۔

مولانا اعظمی نے بھی مدارج کی ایک شرح معدن الاسرار کا ذکر کیا ہے اور اسے خود خواجہ مبارک کی شرح قرار دیا ہے۔ (برہان فروری ۵۴ء)

(۴/۲۴) تبصرۃ الاخبار فی تخریج الآثار، اس کا تاریخی نام شوارق المشارق ہے، مصنف مولوی الٰہی بخش خاں بڑاکری بہاری (م ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵ء) تھے، انہوں نے کتاب کے ناشر مولوی محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن علی خاں کی فرمائش پر مشارق کو فقہی ترتیب پر کیا تھا، مصنف صاحب کمالات اور جامع الفنون تھے، درس و تدریس سے مدۃ العمر وابستہ رہنے کے باوجود صاحب تصانیف کثیرہ تھے، علاوہ ازیں نہایت متدین تھے، اشاعت سنت و تردید بدعت ہمیشہ شعار رہا۔(۴)

(۵/۲۵) ملتقط مشارق الانوار، یہ علامہ عبدالمغنی کی تلخیص ہے جو ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء میں کی گئی تھی، اسی سنہ کا خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا قلمی نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں ہے،

(۱) تجلی نور، حصہ دوم، ص ۵۵ بحوالہ گنج رشیدی، ص ۵۵۔ (۲) معارف فروری ۴۴ء، ص ۲۲۱۔ (۳) معارف فروری ۴۸ء، ص ۱۳۹ و قصر علم، ص ۵۹۔ (۴) معارف جنوری ۴۸ء، ص ۵۵۔

فہرست نگار کے بیان کے بموجب محمد جعدی نے اس کی تصحیح کی تھی، آخر میں قدرے آب رسیدہ ہے۔(۱)

(۶/۲۶) مشکوٰۃ الانوار لتسہیل مشارق الانوار، یہ شرح مولوی عبدالغفور غزنوی امرتسری (۱۳۵۴ھ/۱۹۲۵ء) نے اردو میں لکھی تھی اور مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوئی تھی، مصنف نے اس میں مشارق کو مشکوٰۃ کے نہج پر مرتب کیا تھا اور اسے کتابۃً بھی فہرست مدونہ کے مطابق بدل دیا تھا، اس کے متعلق ان کا خود بیان ہے کہ:

''.....مناسب بلکہ واجب معلوم ہوا کہ اس کتاب کو ترتیب معنوی پر بنالیا جائے تاکہ سب مسلمان بھائی اس سے بآسانی تمام فائدہ اٹھا سکیں اور جس حکم کی احادیث مطلوب ہوں بآسانی نکال سکیں، چچا مولوی عبداللہ (۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء) سے مشورہ کیا تو پسند فرمایا، اللہ نے ذہن عالی اور فکر بلند دیا تھا، انہوں نے ترکیب یہ بتائی کہ اس کے ابواب موافق مشکوٰۃ کے ہونے چاہئیں اور ہر باب میں تین فصلیں ہوں، فصل اول میں بخاری اور مسلم دونوں کی حدیثیں ہوں اور دوسری فصل میں حدیث بخاری کی اور تیسری میں فقط مسلم کی حدیثیں ہوں اور جس باب میں تینوں میں سے کوئی فصل نہ ہو اس میں اس طرح رکھنا چاہیے کہ اس باب میں فلاں فصل نہیں، چنانچہ مشکوٰۃ والے کا بھی یہی قاعدہ ہے، غرض چچا کے ارشاد کے مطابق یہ کتاب بنائی تو گویا یہ کتاب ایک چھوٹی مشکوٰۃ بن گئی ہے بلکہ اس پر بھی فوقیت لے گئی، اس واسطے کہ یہ مختصر ہے اور اس کی تمام حدیثوں کی صحت پر اتفاق ہے، اس میں کوئی حدیث ایسی نہیں جو غیر معتبر ہو، بخلاف مشکوٰۃ کے کہ اس میں ہر قسم کی حدیثیں مذکور ہیں، صحیح بھی اور ضعیف بھی......۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں حسب دل خواہ کتاب تمام ہوئی۔''(۲)

(۷/۲۶) ترجمہ مشارق الانوار از مولانا محمد احسن نانوتوی، محمد عبدالباقی سہسوانی لکھتے ہیں:

''حافظ سید غلام جیلانی نے.....مولانا محمد احسن نانوتوی مرحوم مترجم

---

(۱) فہرست کتب خانہ عربیہ رامپور، ج ۲، ص ۱۷۔ (۲) معارف جنوری ۴۸ء، ص ۵۹ و ۶۰۔

درمختار و مشارق الانوار سے دینیات کی تکمیل فرمائی۔"(۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نے درمختار کی طرح مشارق الانوار کا بھی اردو ترجمہ کیا تھا مگر یہ شاید طبع نہیں ہوسکا، اسی لیے کسی نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، جناب محمد ایوب قادری مرحوم نے مولانا کے حالات وسوانح میں ایک کتاب لکھی ہے لیکن انہوں نے بھی مولانا کے اس ترجمہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

(۸/۴۸) تحفۃ الاخیار، یہ مشارق الانوار کا اردو ترجمہ اور اس کی شرح ہے جو ایک دوسرے سے ممزوج ہیں لیکن شرح وفوائد کو ظاہر کرنے کے لیے "ف" کی علامت مقرر کردی ہے، یہ ترجمہ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں مکمل ہوا اور سنہ تالیف کے تین سال بعد مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، یہ ایڈیشن ایسا خوبصورت چھپا تھا کہ اس زمانہ میں اس کی قیمت پندرہ روپئے تھی، مترجم وشارح مولانا خرم علی بلہوری ہیں۔

اردو میں حدیث کا پہلا ترجمہ: اس ترجمہ کی خاص اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ اردو میں حدیث کا پہلا ترجمہ ہے، مولوی ابویحییٰ امام خاں نوشہروی لکھتے ہیں:

> "کتب حدیث کا سب سے پہلا اردو ترجمہ یہی تحفۃ الاخیار ہے، اس کے بعد نواب قطب الدین خان دہلوی نے مشکوٰۃ المصابیح کا اردو ترجمہ وشرح بنام مظاہر حق کیا (مظاہر حق اصلاً شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر مکی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء کا تھا، نواب صاحب نے بادنی تغیر مہذب فرمایا اور اس کا اعتراف بھی کیا) مولانا خرم علی کی وفات کے بعد ۳ سال تک متواتر تین مرتبہ طبع ہوا، اس سے اس کی مقبولیت ظاہر ہوتی ہے۔"(۲)

مولوی عبدالحلیم چشتی بھی اردو میں حدیث کا پہلا ترجمہ اسی کو بتاتے ہیں:

(۱) حیوۃ العلما طبع نولکشور ۱۹۱۲ء، ص ۱۱۰ بحوالہ معارف جون ۱۹۵۷ء، ص ۴۴۴۔ (۲) معارف دسمبر ۱۹۴۷ء، ص ۴۴۷۔

''ہندوستان میں اس سے پہلے نہ اردو میں کوئی کتاب چھپی تھی اور نہ عوام میں حدیث کا کچھ چرچا تھا، موصوف نے سب سے پہلے مسلمانوں کو تعلیمات نبوی سے باخبر کرنے کے لیے اس کتاب کا ترجمہ کیا جو بے حد مقبول ہوا۔''(۱)

اور چوں کہ ترجمہ کی اصل غرض یہ تھی کہ عام لوگوں کو اس سے فائدہ ہو، اس لیے زبان وطرز بیان اس زمانہ کے لحاظ سے نہایت عام فہم اور آسان اختیار کی گئی تھی اور زیادہ دقیق اور پیچیدہ بحثوں سے صرف نظر کیا گیا تھا تاہم اکثر دینی حقائق ومطالب کو اس میں مؤثر پیرایہ اور دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا تھا، مترجم خود لکھتے ہیں:

''اصل غرض اس سے یہ ہے کہ اہل اسلام کو فائدہ عام ہو، یہاں تک کہ حرف شناس عوام بھی محروم نہ رہیں، اس واسطے نہایت مشکل مسائل نہیں لکھے...... اس کتاب کے خطبے کا ترجمہ نہیں کیا، عوام کو اس سے کچھ فائدہ نہ تھا۔''(۲)

آگے لکھتے ہیں کہ:

''یہ کتاب اہل اسلام کے واسطے عجیب تحفہ ہے، کیونکہ یہ اکثر مطالب دینی کو شامل ہے، جس کے دریافت سے جاہل عالم بنے اور عالم تازہ لطف اٹھائے، حضرت مولانا عبدالقادر دہلوی ؒ کی ہندی تفسیر اور یہ کتاب طالب خدا کے واسطے کافی ہیں، دیندار کے حق میں یہ دونوں کتابیں گویا دو آنکھیں ہیں جن سے دو جہاں کا انجام نظر پڑے، یا دو پر ہیں جن سے عرش تک اڑ سکے۔''(۳)

مولانا خرم علی نے ابتدا میں حدیث کی اہمیت، ہندوستان میں اس سے بے اعتنائی اور اردو ترجمہ کے لیے اس کتاب کے انتخاب کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

(۱) معارف جون ۵۷ء، ص ۴۴۴۔ (۲) ایضاً، ص ۴۴۶۔ (۳) ایضاً، ص ۴۴۶ و ۴۴۷۔

''علم حدیث اشرف العلوم ہے، اس واسطے کہ اشرف الناس کا کلام ہے، مثل مشہور ہے کہ کلام الملوک ملوک الکلام اور سب علوم دینی اس کے محتاج ہیں، علم تفسیر بدون حدیث کے معتبر نہیں اور علم عقائد اور علم فقہ وعلم سلوک اور علم تاریخ بدون اس کے کچھ پسند نہیں، لیکن باوجود اس کے ہندوستان میں اس علم شریف کا چرچا نہیں، عوام کا تو کیا ذکر، اکثر علما کو خبر نہیں، اس واسطے نہایت مناسب معلوم ہوا کہ کسی حدیث کی کتاب کا ترجمہ عام فہم اردو زبان میں کیجیے، سو سب کتابوں سے مشارق الانوار حسن صغانی کی بہت پسند آئی، اس واسطے کہ مختصر کتاب ہے اور اس کی احادیث کی صحت پر اتفاق ہے، کوئی اس کی ایسی حدیث نہیں جو غیر معتبر ہو بخلاف مشکوٰۃ کے کہ اس میں ہر جنس کی روایت ہے، صحیح بھی اور ضعیف بھی۔''(۱)

مقدمہ میں احادیث کے اقسام اور ان کی تعریف بیان کی ہے، اس کے بعد امام بخاری وامام مسلم کے حالات وکمالات کا تذکرہ ہے، پھر حسن صغانی کے حالات وتصنیفات کا ذکر ہے، پھر اپنے ترجمہ کی بابت کچھ ضروری باتیں لکھی ہیں، اصل کتاب کے آغاز سے پہلے حدیث کی اہمیت پر ایک بصیرت افروز نظم ہے، اس کے بعد کتاب کا مع متن ترجمہ ہے، اس کے بعد فوائد کے تحت حدیث کا پورا واقعہ اور اہم امور کی وضاحت ہے، فوائد اگرچہ مختصر ہیں لیکن بڑے کام کے ہیں۔(۲)

امام صغانی نے اختصار کی وجہ سے سندیں چھوڑ دی ہیں اور قال رسول اللہ کو بھی حذف کر دیا ہے، مگر ترجمہ میں یہ لکھ دیا ہے کہ آنحضرتؐ نے یوں فرمایا، مصنف نے ہر حدیث میں اول کتاب کا اشارہ کیا ہے، مترجم نے بھی کتاب کا نام ہر حدیث میں پہلے دے دیا ہے، اختصار کی بنا پر مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ یہ حدیث کس وقت سے تقریب سے فرمائی جس سے

(۱) معارف جون ۵۷ء، ص ۴۴۵۔ (۲) ایضاً۔

اس کا مطلب بخوبی نہیں معلوم ہوتا، اس واسطے مترجم نے فائدے میں اس کا پورا قصہ لکھ دیا ہے اور جہاں مطلب مجمل اور مشکل تھا اس کو مفصل کر دیا (۱) ترجمہ تحت اللفظ نہیں ہے، مترجم رقم طراز ہیں:

> ''حدیث کا ترجمہ تحت اللفظ نہیں کیا، اس واسطے کہ عرب کا محاورہ ہند کے محاورے سے اکثر مطابق نہیں ہوتا، بلکہ محاورہ مقدم رکھا ہے، مرادی مطلب جا بجا لکھا اور باوجود اس کے حتی المقدور تحت اللفظ ترجمے کی بھی رعایت کی ہے۔'' (۲)

ترجمہ وفوائد کی زبان اس زمانہ کے لحاظ سے گو نہایت سادہ و عام فہم تھی، مگر اس زمانہ کے لحاظ سے اب اس میں قدامت آگئی ہے، مترجم کا مآخذ حدیث اور شروح حدیث کی بے شمار کتابیں ہیں مگر انہوں نے علامہ گازرونی کی شرح مشارق اور علامہ ابن اثیر جزری کی جامع الاصول سے اس میں زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔

مترجم وشارح نے اس میں مصنف کے اغلاط و مسامحات کی نشاندہی کی ہے، چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

> ''اکثر مشارق کی حدیثوں میں اس حدیث پر قاف کی علامت ہے یعنی بخاری ومسلم دونوں میں یہ حدیث بالاتفاق ہے، حالانکہ یہ صاف خطا ہے، اس واسطے کہ صاحب جامع الاصول اور شارح گازرونی نے لکھا ہے کہ حدیث صرف مسلم میں ہے، بخاری میں نہیں اور اس عاجز نے بھی صحیح بخاری میں دیکھا، زید بن خالد سے اس میں اس مضمون کی حدیث نہیں پائی، معلوم ہوا کہ کاتب کی غلطی ہے۔'' (۳)

---

(۱) تحفۃ الاخیار بحوالہ معارف جون ۵۷ء، ص ۴۴۶۔ (۲) ایضاً۔ (۳) تحفۃ الاخیار نولکشور، ص ۱۲۸، جون ۵۷ء، ص ۴۵۰۔

مترجم وشارح نے اس میں شیعہ اور اہل بدعت کے شبہات بھی جا بجا دفع کیے ہیں اور چاروں ائمہ کے مذاہب بھی مناسب جگہوں پر لکھے ہیں، لیکن فقہی مذاہب تحریر کرنے میں بالکل بے تعصبی سے کام لیا ہے۔(۱)

ذیل میں شرح وترجمہ کے دو نمونے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ان کی اہمیت و خصوصیت کا اچھی طرح اندازہ ہو سکے۔

خ ابوھریرۃ من آمن باللّٰہ ورسولہ واقام الصلوٰۃ وصام رمضان کان حقاً علی اللّٰہ ان یدخلہ الجنۃ ھاجر فی سبیل اللّٰہ او حبس فی ارضہ التی ولد فیھا (۲)

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ جس نے سچے دل سے خدا کو اور اس کے پیغمبر کو مانا، نماز کو ٹھیک سے ادا کیا اور رمضان کا روزہ رکھا، کرم اور فضل کی راہ سے ضرور ہو گیا خدا پر اس کو بہشت میں لے جانا، خواہ اپنا وطن اس نے خدا کی راہ میں جہاد کے واسطے چھوڑا ہو یا اسی زمین میں ٹھہرا رہا ہو جس میں پیدا ہوا۔

اس حدیث پر یہ فائدہ تحریر کیا ہے:

''اس حدیث کی پوری روایت بخاری میں ہے کہ اصحاب نے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو ہم لوگوں کو خوش خبری سنا دیویں کہ بہشت، جہاد اور ہجرت پر موقوف نہیں، حضرتؐ نے فرمایا بہشت میں ایک سو بلند درجے ہیں کہ خدا نے نمازیوں کے واسطے مقرر کیے ہیں، ہر ایک درجے میں اتنا فرق ہے کہ جتنا آسمان و زمین میں، سو جب تم خدا سے مانگو تو فردوس مانگا کرو کہ

(۱) تحفۃ الاخیار نولکشور، ص ۱۲۸، بحوالہ معارف ۵۷، ص ۴۵۰۔ (۲) تحفۃ الاخیار، ص ۷ بحوالہ معارف جنوری ۴۸، ص ۵۴۔

فردوس سب بہشتوں کے درمیان ہے اور سب سے اونچی اور اس کے اوپر خدا کا عرش ہے، اسی سے..... بہشت کی سب نہریں نکلی ہیں، یعنی ہر چند جہاد پر بہشت موقوف نہیں، اصل نجات کے واسطے ایمان اور نماز روزہ کفایت کرتا ہے لیکن تم ہمت کو پست نہ کرو کہ صرف نجات پر قناعت کرو بلکہ ہمت کو بلند رکھو، جہاد کرو تا کہ فردوس پاؤ جس کے آگے سب بہشتیں پست ہیں۔

اس حدیث میں فرشتوں اور خدا کی کتابوں کا اور تقدیر و قیامت کا ایمان لانا بیان نہیں فرمایا اس واسطے کہ جب آدمی رسول کا ایمان لایا تو ان کا بھی ضرور ایمان لاوے گا کہ تمام قرآن و حدیث میں ان کا بیان موجود ہے اور نماز روزہ کے ساتھ زکوٰۃ و حج کا ذکر نہیں فرمایا، اس واسطے کہ زکوٰۃ و حج صرف مالدار پر فرض ہے، محتاج پر نہیں اور نماز روزہ سب پر فرض ہے مالدار ہو یا محتاج، خلاصہ یہ ہے کہ یہاں حکم عام بیان فرمانا منظور ہوا جو سب مسلمانوں کو شامل ہے، مصنف نے ایمان کی حدیث مقدم کی اس واسطے کہ ایمان سب نیکیوں اور عبادت کی جڑ ہے، بدون ایمان کے کوئی عبادت اور نیکی درست نہیں۔"(۱)

ایک اور حدیث کا ترجمہ اور شرح ملاحظہ ہو:

م سمرة بن جندب والمغيرة بن شعبة من حدث عني بحديث وهو يرى انه كذب فهو احد الكاذبين

مسلم میں روایت ہے سمرہ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ سے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ جو میری طرف سے روایت کرے اور وہ جانتا ہو کہ وہ جھوٹی حدیث ہے تو دو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔

(۱) تحفۃ الاخیار، ص ۷ و ۸ بحوالہ معارف جنوری ۴۸ء، ص ۵۴ و ۵۵۔

ف: ''دو جھوٹے یعنی مسیلمہ کذاب اور مختار یا اسود عنسی جنھوں نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا، یا یہ مطلب کہ ایک جھوٹا وہ جس ناپاک نے حضرتؐ پر جھوٹ باندھا، دوسرا جھوٹا یہ کہ اس جھوٹی حدیث کو روایت کرتا ہے، جان بوجھ کے اکثر لوگ جو علم حدیث سے ناواقف ہیں، واہی تباہی حدیثیں نقل کیا کرتے ہیں جن کی کچھ اصل نہیں، مسلمان کو لازم ہے کہ حدیث میں بہت احتیاط کیا کرے، ہر ایک کتاب کی حدیث کو سچا نہ جانے، جو حدیث کی معتبر کتابوں میں ہو اس کو مانے، جیسے کہ یہ کتاب مشارق الانوار ہے کہ سب علمائے اہل سنت اس کو بہت صحیح جانتے ہیں۔'' (۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محشی وشارح نے حدیث مافی الباب کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو کس خوبصورتی کے ساتھ جوڑ دیا ہے، اس پر فائدہ سونے پر سہاگہ، یہ فوائد دراصل علم حدیث کی بے نظیر شرح ہے، شارح ناقل نہیں، صاحب بصیرت ہے، جس طرح ترجمہ تحفۃ الاخیار میں شرح کو سمو دیا ہے، اسی طرح شرح میں احادیث متذکرہ فی الباب کے ساتھ ان ٹکڑوں کو جوڑ دیا ہے جو ایک دوسرے سے علاحدہ ہونے کی وجہ سے بکھرے پڑے تھے۔ (۲)

مولانا خرم علی نے اپنے ترجمہ وفوائد کی مقبولیت کے لیے خداوند قدوس کی بارگاہ میں دعا کی تھی، ان کی ایک منظوم دعا بھی تحفۃ الاخیار میں شامل ہے جو اس کے حسن قبول کے لیے کہی گئی تھی، اس کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

یارب ان اوراق کو مقبول کر
ہند کو اس فیض سے کر بہرہ ور
خرم افسردہ کو پرورد کر
الفت دنیا سے اسے سرد کر

---

(۱) مشارق الانوار، ترتیب فقہی والا ایڈیشن نور محمد، اصح المطابع کراچی، ص ا، بحوالہ معارف جون ۵۷ء، ص ۴۴۸۔ (۲) معارف جنوری ۴۸ء، ص ۵۵۔

تیری ہی دھن روح کو ہردم رہے
تیرے غم عشق میں خرم رہے
یارب اس عاجز کی دعا کر قبول
خاتمہ بالخیر بحق رسول(۱)

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا جو دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی، قبول فرمائی اور تحفۃ الاخیار کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کتاب کے اب تک بیسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں، ذیل میں بعض کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ سب سے پہلا ایڈیشن سنہ تالیف ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء کے تین سال بعد ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء میں مطبع محمدی لکھنؤ سے محمد حسین کے اہتمام میں چھپا جو نہایت دیدہ زیب تھا اور جس کی قیمت اس زمانہ میں ۱۵ روپے تھی۔

۲۔ ۱۲۳۶ھ/۱۸۴۶ء میں عبدالملک بن محمد صادق نے مطبع محمدی بمبئی سے اسے شائع کیا، انہوں نے بمبئی سے اس کو تین مرتبہ طبع کرایا، جس کی صراحت خود انہوں نے تحفۃ الاخیار کے بمبئی ایڈیشن میں کی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مطبع محمدی لکھنؤ کا نسخہ بھی ختم ہوا تو نواب ذوالفقار علی مرحوم نے جو مولانا خرم علی کے قدر شناسوں میں تھے اس کو چھپوا کر مفت تقسیم کرایا۔

۳۔ ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں محمد مصطفیٰ خان (م ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء) نے اپنے مطبع مصطفائی کانپور سے اسے چھاپا، اس کی قیمت سات روپے تھی۔

۴۔ ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء میں مطبع مصطفائی کانپور سے دوبارہ دو جلدوں میں طبع ہوا۔

۵۔ ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء میں مشکوٰۃ المصابیح کے ترجمہ کے حاشیہ پر مطبع محمدی مدراس سے شائع ہوئی۔

(۱) تحفۃ الاخیار بحوالہ معارف جون ۵۷ء، ص ۴۴۹۔

۶۔ ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں ایک ایڈیشن مطبع مخدومی بمبئی سے شائع ہوا۔

۷۔ ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۶ء میں محمد عبدالرحمٰن خان نے اپنے مطبع نظامی کانپور سے یہ ترجمہ مع فہرست فوائد شائع کیا۔

۸۔ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء میں انہوں نے پھر اسے شائع کیا۔

۹۔ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں مطبع حیدری سے طبع ہوا۔

۱۰۔ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں مطبع نظامی کانپور سے تیسری دفعہ شائع ہوا، ابتدا میں فہرست تبصرۃ الابصار بھی منسلک تھی۔

۱۱۔ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں یہ کتاب مطبع نولکشور کانپور سے چھپی۔

۱۲۔ ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء میں محمد تیغ بہادر کے زیر اہتمام مطبع انوار محمدی لکھنؤ میں شائع ہوئی۔

۱۳۔ ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں مطبع نولکشور سے دوبارہ چھپی۔

۱۴۔ ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء میں فخر المطابع لکھنؤ نے شائع کیا۔

۱۵۔ ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء میں مطبع نولکشور سے شائع ہوئی۔

۱۶۔ حال میں نور محمد اصح المطابع کارخانہ تجارت کتب کراچی نے اسے شائع کیا ہے۔(۱)

مولانا حکیم سید عبدالحیٰ نے مشارق الانوار کی مندرجہ ذیل ہندوستانی شرحوں کا ذکر کیا ہے۔

۲۸ و ۲۹۔ شرح محمد بن یوسف حسینی دہلوی، یہ صوفیانہ طرز کی ایک شرح ہے جو عربی میں لکھی تھی، انہوں نے فارسی میں بھی ایک شرح لکھی تھی۔

۳۰۔ منور بن عبدالمجید لاہوری نے بھی ایک شرح لکھی تھی۔

۳۱۔ ایک فارسی شرح محی الدین احمد بن محمد حسینی کردی نے تحریر کی تھی۔

(الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، ص ۱۵۵)

---

(۱) ان ایڈیشنوں کا مولانا عبدالحلیم چشتی نے اپنے مضمون مولانا خرم علی شائع شدہ جون ۵۷ء میں کیا ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو صفحات ۴۵۰ تا ۴۵۳۔

شیخ علی متقی

(متوفی ۹۷۵ھ/ ۱۵۶۷ء)

نام ونسب: علی نام اور علاء الدین لقب تھا، نسب نامہ یہ ہے: علی بن حسام الدین ابن عبدالملک ابن قاضی خاں۔(۱)

عبداللہ محمد بن عمر آصفی نے علاء الدین کے بجائے نور الدین لقب تحریر کیا ہے۔(۲)

ولادت ووطن: ان کے آباؤ اجداد کا وطن شیراز ہند جونپور تھا، اسی لیے ارباب تذکرہ انہیں جونپوری الاصل لکھتے ہیں (۳) مگر ان کا خاندان ان کی ولادت سے قبل برہان پور منتقل ہوگیا تھا، یہیں ۸۸۸ھ میں ان کی ولادت ہوئی، بعض مؤرخین نے ان کی سنہ پیدائش ۸۸۵ھ لکھا ہے(۴) آخر میں وہ مکہ معظمہ چلے آئے اور بیت اللہ کے جوار میں قیام پذیر ہوئے۔(۵)

اساتذہ: شیخ کی ابتدائی تعلیم کا حال معلوم نہیں ہوسکا اور اس کا بھی پتہ نہیں چل سکا کہ برہان پور کے کن لوگوں کے سامنے انہوں نے زانوئے تلمذ تہ کیا، مؤرخین نے جن استادوں کے نام لکھے ہیں وہ یہ ہیں:

شیخ حسام الدین متقی ملتانی: یہ شیخ علی متقی کے مرشد بھی تھے جو بڑے عابد وزاہد شخص اور ممتاز عالم تھے، شیخ ان کی خدمت میں دو برس رہے اور ان سے ظاہری وباطنی علوم کی

---

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۴۱ والنور السافر، ص۳۱۵۔ (۲) ظفر الوالہ، ج۱، ص۳۱۵۔ (۳) مآثر الکرام، ج۱، ص۱۹۲۔ (۴) النور السافر، ص۳۱۷۔ (۵) اخبار الاخیار، ص۲۴۱۔

تحصیل کی، تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ شیخ حسام الدین سے انہوں نے تفسیر بیضاوی اور کتاب عین العلم کا درس لیا۔(۱)

شیخ ابوالحسن بکری، شافعی: اپنے زمانہ کے مسلمہ ولی وعارف باللہ تھے، شیخ علی متقی نے مکہ معظمہ میں ان سے استفادہ کیا اور حدیث کا درس لیا، ان سے انہیں خلافت بھی ملی تھی۔(۲)

شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیثمی مکی: یہ اپنے دور میں مکہ کے مفتی، بلند پایہ فقیہ اور مشہور عالم تھے، ابتدا میں شیخ علی نے ان سے کسب فیض کیا مگر آخر میں یہ خود شیخ علی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے تھے، اہل تذکرہ لکھتے ہیں:

''مولانا علی متقی نے ابتدا میں شیخ ابن حجر صاحب صواعق محرقہ سے درس لیا مگر آخر میں خود شیخ ابن حجر نے ان سے استفادہ کیا اور ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔''(۳)

ابن حجر کو ان سے ارادت وبیعت کا تعلق بھی ہو گیا تھا، آزاد بلگرامی کا بیان ہے:

شیخ ابن حجر مکی مفتی حرم محترم صاحب صواعق محرقہ در ابتدا حال استاد شیخ بود آخر خود را تلمیذ می خواند ورسم ارادات بجا آورد وخرقۂ خلافت پوشید۔(۴)	شیخ ابن حجر مکی مفتی حرم وصاحب صواعق محرقہ ابتدا میں شیخ کے استاد تھے مگر آخر میں وہ اپنے کو ان کا شاگرد کہنے لگے تھے نیز ارادت کی رسم بھی بجالائے اور شیخ سے خرقۂ خلافت بھی پہنا۔

شیخ عبدالحق دہلوی فرماتے ہیں:

دبارہا خود را نسبت بخدمت شیخ تلمیذ حقیقی	شیخ ابن حجر مکی نے بارہا اپنے کو شیخ علی متقی کا

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۱۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً۔ (۴) مآثر الکرام، ج۱، ص ۱۹۳۔ ☆ عین العلم وزین الحلم تصوف کی مشہور کتاب ہے، یہ دراصل امام غزالی کی مشہور کتاب احیاء علوم الدین کا مختصر ہے، مصنف محمد بن عثمان بن عمر بلخی تھے، بعض لوگوں نے مصنف کو ہندی الاصل بتایا ہے، ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ/ ۱۶۰۵ء) نے اس کی شرح لکھی تھی جو اصل کے ساتھ قسطنطنیہ سے چھپ گئی ہے۔

می خواند و در آخر مرید شد و خرقۂ خلافت پوشید۔(۱)	شاگرد کہا ہے اور آخر میں وہ ان کے مرید بھی ہو گئے تھے اور ان سے خرقہ خلافت بھی پہنا تھا۔

ان لوگوں کے علاوہ مکہ میں اس وقت جو اصحاب علم وکمال تھے، ان سے بھی استفادہ کیا، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں:

ودیگر علما ومشائخ عصر را کہ دراں دیار شریف بودند دریافت استفادہ نمود۔(۲)	ان کے علاوہ اس متبرک علاقہ میں جو علما و مشائخ تھے ان کا پتہ لگا کر ان سے استفادہ کیا۔

تلامذہ: شیخ علی متقی کے شاگردوں اور مریدوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا، تذکرہ نگاروں نے صرف چند لوگوں کے نام لکھے ہیں جو یہ ہیں:

شیخ شہاب الدین احمد بن حجر مکی: ان کا نام استادوں کی فہرست میں گزر چکا ہے۔

شیخ عبدالوہاب متقی: یہ شیخ علی متقی کے خاص مسترشد وخلیفہ تھے جنہوں نے علم ظاہر و باطن دونوں کی ان سے تحصیل کی تھی، شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

> ''شیخ علی متقی کے خیر و برکت کی سب سے بڑی نشانی اور ان کے کمالات کی زبردست دلیل ان کے سچے خلیفہ اور حقیقی دوست شیخ کامل اور عارف باللہ عبدالوہاب بن ولی اللہ حنفی، متقی، قادری ہیں، اللہ انہیں سلامت رکھے، یہ دائرۂ استقامت کے مرکز اور آسمان ولایت کے قطب ہیں، اس زمانہ میں یمن سے شام تک کے فقرا و مشائخ کا اتفاق ہے کہ وہ ولایت کبریٰ کے درجہ پر فائز ہیں۔''(۳)

شاہ عبدالحق صاحب کو ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا تھا اور انہوں نے ان کے حوالہ سے اخبار الاخیار میں شیخ کے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔

---

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۴۲۔ (۲) ایضاً، ص۲۴۱۔ (۳) ایضاً، ص۲۴۳۔

محمد بن طاہر پٹنی: یہ مشہور محدث اور بحار الانوار جیسی عظیم الشان کتاب کے مصنف تھے، ان کا مستقل تذکرہ اس کتاب میں آگے آئے گا، شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

''علم کی تحصیل کے لیے مکہ معظمہ گئے تو شیخ علی متقی کی صحبت میں رہے، ان کے مرید ہوئے اور ان سے خیر و برکت لے کر وطن واپس آئے۔''(۱)

شیخ چیلہ: آصفی نے تاریخ گجرات میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ'' یہ شیخ علی متقی کے خاص شاگرد اور معتمد علیہ مرید تھے۔(۲)

عبدالصمد: آصفی نے ان کا بھی تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ شیخ نے گجرات میں انہیں اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا۔(ظفر الوالہ، ج۱، ص ۳۱۸)

رحلت وسفر: شیخ اپنے وطن برہان پور سے علوم وفنون کی تحصیل اور تصوف وسلوک میں حصول کمال کے لیے پہلے ملتان گئے، پھر حرمین شریفین تشریف لے گئے اور مکہ معظمہ میں مستقل بود و باش اختیار کر لی، اس کے بعد وہ کئی بار ہندوستان میں گجرات کے علاقہ میں تشریف لائے اور لوگوں کو فیضیاب کیا۔

بعض تذکرہ نگاروں نے تصریح کی ہے کہ وہ ۹۵۳ھ میں حرمین کے لیے روانہ ہوئے تھے، آزاد بلگرامی کا بیان ہے:

آنجناب در ۹۵۳ھ شریفین خرامید و در مکہ معظمہ رحل اقامت افگند۔(۳)	شیخ علی متقی ۹۵۳ھ میں حرمین تشریف لے گئے اور مکہ معظمہ میں مستقل قیام پذیر ہو گئے۔

مگر یہ درست نہیں ہے، اس لیے کہ شیخ عبدالوہاب شعرانی صاحب طبقات نے ۹۴۷ھ میں مکہ معظمہ میں ان سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

نزيل مكة اجتمعت به فيها سنة سبع	شیخ علی متقی مکہ میں بود و باش اختیار کیے ہوئے

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۶۴ تذکرہ میاں محمد طاہر۔ (۲) ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۳۱۶۔ (۳) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۳۔

وار بعین و تسع ماۃ (۱)	تھے، میں نے وہاں ان سے ۹۴۷ھ میں ملاقات کی تھی۔

یہ تو مسلم ہے کہ وہ مکہ معظمہ سے کئی بار گجرات تشریف لائے، شاہ عبدالحق صاحب دہلوی مکہ معظمہ میں ان کے قیام اور مشاغل کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

بعد ازاں بدیار گجرات قدوم آوردند (۲)	اس کے بعد علاقہ گجرات میں تشریف لائے۔

پہلی دفعہ وہ سلطان بہادر کے زمانہ میں گجرات وارد ہوئے تھے، شاہ صاحب کا بیان ہے:

وسلطنت ایں دیار دراں زماں بدست تصرف سلطان بہادر بود۔ (۳)	اس زمانہ میں یہ علاقہ سلطان بہادر کے زیر تصرف تھا۔

اس کے بعد اس بادشاہ کا بھتیجا محمود شاہ دوم تخت نشین ہوا جس کے عہد میں شیخ علی متقی دوبار ہندوستان تشریف لائے (۴) سلطان بہادر جس کے زمانہ میں پہلی دفعہ گجرات آئے ۹۴۳ھ میں شہید کر دیا گیا تھا (۵) اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۹۴۳ھ سے بھی پہلے مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے، ممکن ہے آزاد بلگرامی کے بیان میں کچھ تصحیف ہوگئی ہو۔

شاہ عبدالحق صاحب نے ان کے ملتان کے قیام کے زمانہ کا ایک معمول یہ بیان کیا ہے کہ وہ اس کے گرد ونواح کے بعض ایسے شہروں میں چلے جاتے تھے جو نیک لوگوں کا مسکن ہوتا اور جو جگہ مناسب اور بہتر ہوتی اور جہاں آسانی سے عبادت کر سکتے تھے چند روز قیام فرماتے، سفر میں دو تھیلے ان کے ساتھ ہوتے تھے، ایک میں عام ضرورت کی چیزیں اور کھانے پینے کا سامان چاول، دال، تیل، گھی اور نمک نیز کھانا پکانے کے برتن ہوتے، لکڑیاں خود جنگل سے جا کر لاتے اور دو دن کا سامان تین دن تک اور تین دن کا چار دن تک

(۱) الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۶۷۔ (۲) اخبار الاخیار، ص ۲۴۴۔ (۳) ایضاً۔ (۴) ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۳۱۶۔ (۵) ایضاً ص ۲۲۰۔

استعمال کرتے، کبھی مسجد میں نہ ٹھہرتے بلکہ کرایہ کے مکان میں رہتے، چقماق جلا کر آگ سلگاتے اور ایک لوٹا بھی ساتھ ہوتا جس میں ایک مشک پانی آتا تھا، اس سے کھانا پکاتے، وضو اور ضرورت کے وقت غسل فرماتے۔

معمول تھا کہ پاک پانی سے پہلے برتن دھوتے، پھر خود ہی کھانا پکاتے اور کسی سے کوئی خدمت نہ لیتے، اگر کسی سے کام لینے کی ضرورت پڑ ہی جاتی تو پہلے اسے اجرت دے دیتے، تب کام کراتے۔

دوسرے تھیلے میں قرآن مجید اور بعض ضروری کتابیں رہتی تھیں، غرض اسی خوبی اور صفائی سے سفر کرتے تھے، اگر کوئی شخص صحبت میں رہنا چاہتا یا خدمت کرنا چاہتا تو اس سے معذرت کر دیتے۔ (اخبار الاخیار، ص ۲۴۳ و ۲۴۴)

مجلس درس وافادہ: شیخ علی متقی دینی علوم کے فاضل و ماہر بھی تھے اور سلوک و تصوف میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، ان کا بیشتر وقت علم کی اشاعت اور افادہ و فیضان میں بسر ہوتا تھا، ان کے خاص شاگرد و مسترشد شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں:

غالب اوقات ایشاں بنشر وافادہ علم (۱)	ان کا زیادہ وقت علم کی نشر و اشاعت اور دوسروں کو علمی فائدہ پہنچانے میں صرف ہوتا۔

آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ ''شیخ علی متقی کی علوم ظاہر و باطن کی نشر و اشاعت کا غلغلہ ملاء اعلیٰ تک پہنچا ہوا تھا۔'' (۲)

مکہ میں ان کی مجلس درس ظاہری و باطنی علوم کا سرچشمہ تھی، شاہ عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

و بآثار اضافت علوم دینی و افاضت معارف یقینی مستنیر و مستفید ساخت۔ (۳)	انہوں نے دینی علوم اور یقین و معرفت سے (ایک عالم کو) منور اور فیضیاب کیا۔

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۵۔ (۲) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۳۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔

طالبین کا جم غفیر ان کے بحر علم و معرفت سے سیراب ہونے کے لیے ہر وقت ان کی خدمت میں موجود رہتا تھا، شیخ عبدالوہاب شعرانی مکہ میں ان کی قیام گاہ پر طلبہ کی کثرت اور سالکین کے ہجوم کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ مجھے اپنے گھر لوا گئے تو میں نے درویشوں اور طالبین کی ایک جماعت دیکھی جو ان کے گھر کے اردگرد صحن کے کناروں پر بنے ہوئے جھونپڑوں میں رہتی تھی، ہر درویش کے لیے ایک ایک جھونپڑا تعمیر کیا گیا تھا، جس میں وہ یادِ الٰہی میں مشغول رہتا تھا، کچھ لوگ تلاوت کرتے نظر آئے، بعض ذکر و فکر میں لگے ہوئے تھے، چند لوگ مراقبے میں تھے اور بعض حضرات علمی مطالعہ میں منہمک تھے، میں نے مکہ میں اس سے اچھا اور بہتر منظر نہیں دیکھا۔''(۱)

آصفی تاریخ گجرات میں لکھتا ہے:

> ''گجراتی بادشاہ محمود شاہ ثانی نے مکہ میں اپنی رباط کے قریب شیخ علی متقی کی رہائش کے لیے ایک گھر تعمیر کرایا تھا جس کے سامنے ایک وسیع، کشادہ اور بڑا صحن تھا، اس کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے، بعد میں ان کے مریدین اور سندھ سے سلوک و طریقت کی تعلیم و تربیت کے لیے آنے والے قیام کرتے تھے۔''(۲)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا حلقۂ درس اور دائرۂ فیض کتنا وسیع تھا اور ان کا گھر دینی علوم کی تحصیل کرنے والوں اور سلوک و تصوف کے طالبین کا مرکز بنا ہوا تھا۔

ان کے درس کا انداز بہت باوقار تھا، وہ متانت اور سنجیدگی سے مجلس درس میں رونق افروز ہوتے تھے، ان کے شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی کا بیان ہے کہ:

---

(۱) الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۶۷۔ (۲) ظفر الوالہ، ص ۳۱۶۔

"اگر مجلس درس میں حاضرین میں باہم کوئی بحث چھڑ جاتی تب بھی
وہ خاموش رہتے اور بلا ضرورت ایک فقرہ بھی زبان سے نہیں کہتے تھے،
ہاں جب ضرورت محسوس کرتے تو بقدر ضرورت کچھ ارشاد فرما دیتے۔"(۱)

درس میں کتب حقائق و اسرار اور توحید وغیرہ کے مشکل مسائل کی توضیح و تفہیم میں وہی طریقہ و انداز اختیار کرتے جو بزرگوں کا تھا۔(۲)

علم حدیث سے شغف: شیخ علی متقی بلند پایہ محدث تھے اور اس حیثیت سے ان کو بڑی شہرت نصیب ہوئی، تذکرہ نگاروں نے انہیں المحدث لکھا ہے، انہوں نے اپنے زمانہ کے کبار محدثین سے اس فن کی تحصیل کی تھی اور خود ان کے درس حدیث سے بے شمار لوگوں کو فیض پہنچا، حدیث سے ان کا اشتغال مدۃ العمر قائم رہا، بڑھاپے میں آدمی کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ نقل و حرکت سے بھی معذور ہو جاتا ہے..... مگر وہ اس عمر میں بھی کتب حدیث کی مراجعت، مقابلہ، تصحیح، مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں شب و روز منہمک رہتے تھے، اس لیے فن حدیث پر ان کی نظر نہایت وسیع اور گہری تھی اور اس فن کے نکتوں اور باریکیوں سے انہیں مکمل واقفیت تھی، شاہ عبدالحق صاحب دہلوی نے احادیث سے ان کے اشتغال اور اس میں مہارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وہ سنن و احادیث نبویؐ کے تتبع میں آخر عمر تک مشغول رہے، ایام
پیری میں جب کہ بتقاضائے عمر جنبش کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا، وہ شب و روز
کتب احادیث کی تالیف، تصحیح اور مقابلہ کے کام میں منہمک رہتے تھے،
لوگ بیان کرتے ہیں کہ دقائق کے فہم و معرفت اور معانی و نکات کے استنباط و
استخراج میں ایسے بلند درجے پر فائز تھے کہ ماہرین اور علمائے فن بھی حیرت و
تحسین ظاہر کیے بغیر نہیں رہتے تھے، شیخ ابن حجر مکی کو جو اپنے زمانہ میں مکہ کے

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۵۔ (۲) ایضاً۔

بڑے فقہا و علما میں شمار کیے جاتے تھے اور ابتدا میں شیخ علی متقی کے استاد
بھی تھے، اگر کسی حدیث کے مفہوم میں تردد و تامل ہوتا تو شیخ کے یہاں
کہلا بھیجتے کہ جمع الجوامع کی تبویب میں اس حدیث کو کس باب میں رکھا
ہے تا کہ اس نشان دہی کے بعد قرینہ و قیاس سے انہیں حدیث کا مطلب
اخذ کرنے میں آسانی ہو۔" (۱)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث نبویؐ کی خدمت کے لیے ان کی زندگی وقف تھی، اس کے درس و مطالعہ کتب حدیث کی تصحیح و مقابلہ نادر و نایاب کتابوں کی تلاش و جستجو اور ان کی اشاعت کے لیے سعی و کوشش کے علاوہ وہ اس فن میں تصنیف و تالیف کا کام بھی برابر انجام دیتے تھے، علم الحدیث میں ان کی تصنیفات کا ذکر آگے آرہا ہے۔

علم و فضل: وہ نہایت فاضل اور یکتائے روزگار تھے، اصول و فروع اور معقولات و منقولات میں دسترس رکھتے تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے، علامہ آزاد بلگرامی فرماتے ہیں:

"مکہ معظمہ کے عوام و خواص ان کے غیر معمولی فضل و کمال کے معترف تھے۔" (۲)

شاہ عبدالحق صاحب رقم طراز ہیں:

"ان کے دور کے تمام اکابر و مشائخ کو ان کے کمال فضل کا اعتراف تھا۔" (۳)

محی الدین عیدروسی لکھتے ہیں:

"علما میں جو ان سے ملتا اور جس سے یہ خود ملتے وہ ان کی مدح و تصنیف میں
رطب اللسان رہتا تھا۔" (۴)

حقیقت یہ ہے کہ شیخ علی متقی اپنی علمی عظمت، فضل و کمال اور جامعیت کی بنا پر

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔ (۲) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۳۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔ (۴) النور السافر، ص ۳۱۷۔

"سرمایۂ نازش ہندوستان" تھے۔(۱)

علما وزہاد سے تعلق اور اہل علم، مشائخ وطلبہ کی امداد وتکریم: وہ علما اور دینداروں سے بڑا تعلق رکھتے تھے، ان کی ملاقات کے لیے خود بھی تشریف لے جاتے اور انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دیتے، شیخ عبدالوہاب شعرانی مشہور صوفی اور صاحب علم تھے، ان کا بیان ہے کہ مکہ معظمہ میں جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو ہم دونوں کی ایک دوسرے کے یہاں آمد ورفت رہتی تھی۔

ترددت الیہ وتردد الیّ (۲) میں ان کے گھر جاتا اور وہ میری قیام گاہ پر تشریف لاتے۔

ان کے ایک مسترشد خاص عبدالوہاب متقی کا بیان ہے:

> "ایک دفعہ مکہ معظمہ میں شیخ کی زندگی میں بلاد مغرب کے دو شخص وارد ہوئے، یہ دونوں باپ بیٹے تھے اور بڑے عبادت گزار اور زاہد مرتاض تھے، شیخ نے جب ان کی تعریف سنی تو ان سے ملنے کا قصد وارادہ کیا مگر اس زمانہ میں ان پر ایسا ضعف طاری تھا کہ پیدل چلنے کی قوت نہ تھی، اس لیے فرمایا کہ اگر ہمارا کوئی دوست ہم کو اپنے کندھوں پر بیٹھا کر لے جائے تو ہم وہاں جاسکتے ہیں، یہ سن کر ایک مضبوط اور توانا آدمی اس کے لیے تیار ہو گیا چنانچہ اسی کے دوش پر سوار ہو کر ان دونوں حضرات کے پاس گئے اور مجھے بھی حکم دیا کہ ان کی کتاب حکم کبیر کا نسخہ لے کر ساتھ چلوں۔"(۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصحاب علم وزہد سے ملنے کے لیے کس قدر بے چین اور مشتاق رہتے تھے، انہیں علما اور طلبہ کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کا بھی خیال رہتا تھا اور ان کی ہر قسم کی امداد واعانت بھی کرتے رہتے تھے، شاہ عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) النور السافر، ص۳۱۹۔ (۲) الطبقات الکبریٰ، ج۲۔ (۳) اخبار الاخیار، ص۲۴۶۔

''علم کی نشر و اشاعت اور اہل علم کی امداد و اعانت کے لیے ان کی زندگی وقف تھی، وہ طلبہ کے لیے کتابیں مہیا کرتے اور ان کی نقل و کتابت کا بندوبست کرتے، اپنے ہاتھ سے روشنائی بناتے اور انہیں دیتے، ملک عرب میں جو مفید، نادر اور کمیاب کتاب دستیاب ہو جاتی، اس کی نقلیں کرا کے جسے مناسب خیال کرتے مرحمت فرماتے اور جن شہروں میں وہ کتاب موجود نہ ہوتی وہاں بھی اسے بھجواتے۔''(۱)

بیعت و ارادت: وہ ابھی سات آٹھ برس ہی کے تھے کہ ان کے والد بزرگوار انہیں شاہ باجن چشتی کی خدمت میں لے گئے جو برہان پور ہی میں مقیم تھے اور شیخ علی متقی کو ان کا مرید کرادیا، تھوڑے عرصہ بعد والد کا انتقال ہوگیا، اس وقت عمر کے تقاضے کی بنا پر طبیعت دنیوی لذتوں کی جانب کسی قدر مائل ہوئی مگر توفیق الٰہی نے یاوری کی اور دنیا کی حقارت اور ناپائیداری کا نقش دل میں ایسا جاگزیں ہوا کہ شیخ عبدالحکیم بن شاہ باجن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مشائخ چشت کا خرقہ پہنا، اس کے بعد ملتان گئے اور شیخ حسام الدین ملتانی متقی کی صحبت اختیار کی اور ان کی برکت سے ورع و تقویٰ، سلوک و معرفت اور طریقت کے درجات و مراتب طے کیے، دو برس بعد یہاں سے تقویٰ کا زاد راہ لے کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور شیخ ابوالحسن بکری کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کی ولایت اور بزرگی پر اس زمانہ کے لوگ متفق تھے، ان سے اور ایک اور بزرگ شیخ محمد بن محمد سخاوی سے سلسلۂ عالیہ قادریہ و شاذلیہ میں بیعت ہوئے۔(۲)

شیخ علی نے خود اپنی بیعت و ارادت کا حال اس طرح لکھا ہے:

''میرے والد نے مجھے بچپن ہی میں شیخ باجن رحمۃ اللہ کا مرید کرادیا تھا، جن کا طریقہ سماع و صفا اور اہل ذوق و وجد کا تھا، مشائخ کے نزدیک اگر

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۵۔ (۲) ایضاً، ص ۲۴۱۔

کوئی شخص بچپن میں کسی کا مرید ہو جائے تو سن تمیز و رشد کو پہنچنے کے بعد اسے اختیار ہے کہ چاہے تو اسی شیخ سے وابستہ رہے اور چاہے تو کسی اور شیخ کا انتخاب کرلے، میں نے اپنے والد کی موافقت کی مگر جب ان کا اور میرے شیخ کا انتقال ہو گیا تو میں نے ان کے صاحبزادے شیخ عبدالحکیم سے مشائخ چشت کا خرقہ پہنا، اس کے بعد مجھے ایسے مرشد اور شیخ کی تلاش ہوئی جو راہ حق و حقیقت کے اہم معاملات میں میری راہنمائی کرے، اس غرض سے میں نے ملتان کا سفر کیا اور شیخ عارف حسام الدین متقی کی خدمت وصحبت میں ایک مدت تک رہا، ان کا طریقہ ارباب تقویٰ کا تھا، اس کے بعد میں حرمین شریفین کے سفر پر روانہ ہوا اور عارف باللہ شیخ ابوالحسن بکری کی خدمت میں پہنچا جن سے سلاسل قادریہ، شاذلیہ اور مدینیہ کے خرقے پہنے، میں نے ان تینوں کے سلسلوں کے خرقے شیخ بن محمد سے بھی پہنے۔"(۱)

غرض شیخ علی متقی کو تصوف کے مختلف سلسلوں میں بیعت واجازت حاصل تھی، پہلے تو وہ شیخ عبدالحکیم بن باجن سے چشتیہ سلسلہ میں بیعت ہوئے، پھر قادریہ، شاذلیہ، مدینیہ سلسلوں سے وابستہ ہوئے جن کے دو خرقے بزرگوں شیخ ابوالحسن بکری اور شیخ محمد بن محمد سخاوی سے پہنے۔(۲)

تصوف کے سلاسل میں قادریہ اور چشتیہ بہت مشہور ہیں، شاذلیہ سلسلہ کی نسبت قطب الوقت شیخ نورالدین ابوالحسن علی حسن شاذلی کی طرف ہے اور مدینیہ سلسلہ شیخ ابومدین شعیب مغربی پر منتہی ہوتا ہے(۳) اسی بنا پر وہ شاذلی، مدینی، چشتی اور قادری کی نسبتوں سے مشہور ہیں، متقی کی نسبت ان کے ملتانی شیخ اور عارف باللہ حضرت حسام الدین متقی کی جانب ہوگی، وہ اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں:

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۴۲و۲۴۳ والنور السافر، ص۳۱۸و۳۱۹۔ (۲) اخبار الاخیار، ص۲۴۳۔ (۳) ایضاً، ص۲۴۱۔

فلما وصلت الی الملتان صحبت الشیخ حسام الدین و کان طریقه طریق المتقین (۱)	میں جب ملتان پہنچا تو شیخ حسام الدین کی صحبت اختیار کی، ان کا طریقہ متقیوں کا تھا۔

صاحب ظفر الوالہ لکھتے ہیں کہ وہ متقی کے لقب سے مشہور تھے اور:

الالقاب تنزل من السماء (۲)	(ناموں کی طرح) لقب (بھی) آسمان (خدا کی طرف سے) اترتا ہے۔

تصوف وسلوک: شیخ کا اصلی طغرائے امتیاز تصوف وسلوک میں امتیاز وکمال ہے، ان کی زیادہ شہرت اسی حیثیت سے ہے، تصنیف وتالیف وغیرہ میں تو علمائے ظاہر بھی ممتاز اورصاحب کمال ہوتے ہیں لیکن کشف وکرامات، باطنی کمالات، عبادت وریاضت اور زہد واتقا میں وہ اپنی مثال آپ تھے، تمام تذکرہ نگاروں نے ان کی اس خصوصیت کا ذکر کیا اور تصوف میں ان کے درجۂ کمال کا اعتراف کیا ہے، عبدالوہاب شعرانی نے انہیں ''الشیخ الکامل'' لکھا ہے۔ (۳)

صاحب النور السافر رقم طراز ہیں:

العالم الصالح الولی الشهیر العارف بالله تعالیٰ (۴)	عالم صالح، مشہور ولی اور عارف باللہ تھے۔

صاحب ظفر الوالہ کا بیان ہے کہ:

وامامهم فی وقته العابد الزاهد المتصوف الافقه (۵)	وہ اپنے زمانہ کے امام، عابد وزاہد اور صوفی و فقیہ تھے۔

آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

''مکہ معظمہ کے عوام وخواص ان کی ولایت کے معترف تھے۔'' (۶)

(۱) النور السافر، ص ۳۱۵۔ (۲) ظفر الوالہ، ص ۳۱۵۔ (۳) الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۶۷۔ (۴) النور السافر، ص ۳۱۵۔ (۵) ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۳۱۵۔ (۶) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۳۔

شاہ عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

جمیع مشائخ واکابر آں وقت بکمال فضل و ولایت وے معترف ودر رعایت تعظیم وتکریم وے متفق بودند واآن نیز خواص وعوام آں دیار چنانچہ مشائخ سلف را یاد کنند اورا نیز یادمی کنند۔(۱)	اس زمانہ کے تمام مشائخ اور اکابر علما ان کے فضل وولایت میں کمال کے معترف اور ان کی تعظیم وتکریم کی رعایت اور اعتراف میں متفق تھے اور اب بھی مکہ معظمہ وغیرہ کے عوام وخواص انہیں اسی طرح یاد کرتے ہیں جس طرح بزرگانِ سلف کو یاد کرتے ہیں۔

ان کی ولایت اور سلوک ومعرفت میں عظمت کے ان کے اساتذہ، شیوخ، معاصرین اور مرشدین بھی پوری طرح معترف تھے، شیخ ابن حجر مکی ان کے استاد ہونے کے باوجود ان کی ولایت کے ایسے معترف ہوئے کہ انہی سے بیعت وخلافت حاصل کی جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

شیخ حسام الدین متقی مشہور شیخ طریقت بھی تھے اور صاحب علم وکمال بھی، جن کی خدمت میں شیخ علی متقی دو برس تک رہ کر ظاہری وباطنی علوم کی تحصیل کرتے رہے، ان کی نسبت شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں:

> ''ان کے یہاں قیام کے زمانہ میں شیخ علی متقی جب خلوت میں رہتے تو شیخ حسام الدین اپنے سر پر کتابیں اٹھائے ہوئے ان کے کمرے کے دروازے تک آتے اور اندر داخل ہونے کے لیے اس طرح اجازت طلب کرتے ''حسام الدین آیا ہے، کیا فرماتے ہیں؟'' دو ایک بار اسی طرح فرماتے، اگر کمرے کا دروازہ کھلتا تو نشست فرماتے اور اس وقت تک تفسیر بیضاوی کا باہم مذاکرہ کرتے جب تک شیخ کے وقت میں گنجائش ہوتی،

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔

لیکن اگر دروازہ نہ کھلتا تو واپس تشریف لے جاتے۔''(۱)

یہ بالکل ابتدائی دور کا واقعہ ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ زہد واتقا ان کی سرشت میں داخل تھا اور رشد و ہدایت اور صلاح وتقویٰ سے انہیں فطری دلچسپی تھی، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں''ان کے مزاج میں ورع وتقویٰ کا غلبہ تھا اور صلاح ان کی فطرت میں داخل تھا''(۲) اس لیے شروع ہی سے خیر وصلاح اور ورع وتقویٰ کے آثار ان میں نمایاں رہے ہوں گے، اس بنا پر ان کے مرشد بھی ان کا اس قدر خیال کرتے تھے اور احترام سے پیش آتے تھے۔

شیخ عبدالوہاب متقی شیخ حاجی نظر بدخشی کے بارہ میں فرماتے ہیں:

''یہ مرد کامل علم وریاضت کی تحصیل اور ماوراء النہر، شام اور مصر کے مشائخ کی دریافت وملاقات کے بعد اصلاح وتربیت نفس کی تکمیل کے لیے حرمین شریفین پہنچے، میرے خیال میں یہ اکابر اولیاء اللہ میں تھے جو نہایت بلند درجات ومراتب پر فائز تھے اور ان سے آثار کمال بھی نمایاں تھے، ایسے بزرگ اور اس پایہ کے ولی اللہ بھی شیخ علی متقی سے محبت وعقیدت کا تعلق رکھتے تھے اور بڑی خصوصیت برتتے تھے۔''(۳)

یہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ بلاد مغرب سے آئے ہوئے دو اشخاص سے ملنے کے لیے وہ معذوری کی وجہ سے اپنے ایک عقیدت مند کے کندھے پر سوار ہو کر گئے تھے، جب ان لوگوں کو پتہ چلا کہ اس پایہ کے مشہور بزرگ تشریف لائے ہیں تو اس خیال سے کہ ان کی وجہ سے ہماری شہرت ہو جائے گی اور ملاقات کے لیے لوگوں کا تانتا بندھ جائے گا، جس سے وقت برباد ہوگا اور عبادت وریاضت میں خلل آئے گا، اس لیے شروع میں یہ دونوں حضرات شیخ سے زیادہ انشراح وانبساط کے ساتھ نہیں ملے اور کسی قدر بے توجہی بھی اختیار کی، شیخ نے

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۳۔ (۲) ایضاً، ص ۲۴۱۔ (۳) ایضاً، ص ۲۴۷۔

اسے محسوس کرلیا اور فرمایا کہ میں نے ایک کتاب جمع کی ہے جو مشائخ کے اقوال کا مجموعہ ہے پھر شیخ عبدالوہاب متقی کو اس کا کوئی حصہ پڑھنے کا حکم دیا، انہوں نے ابھی تھوڑا ہی سا پڑھا تھا کہ اس کی گرمی و تاثیر سے یہ دونوں حضرات بے اختیار ہو گئے اور فرحت و انبساط ظاہر کرنے لگے، اس کے بعد وہ دونوں حضرت شیخ علی متقی کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ان کی خدمت میں برابر استفادہ کے لیے حاضر ہوتے اور بالآخر ان کے مرید بھی ہو گئے۔(۱)

قاضی عبداللہ سندھی اہل علم وتقویٰ اور اصحاب صلاح میں تھے، حوادث روزگار کی بنا پر وہ اپنے اہل وعیال اور متعلقین سمیت سندھ کی سکونت ترک کر کے مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے تھے، چندے گجرات میں بھی رہے اور شیخ سے بڑی محبت ومودت اور عقیدت مندی کا تعلق رکھتے تھے۔(۲)

غرض ان کے شیوخ، اساتذہ اور معاصرین اور وہ تمام لوگ جن سے وہ ملے یا جو ان سے ملے، سب ہی ان کے گرویدہ اور مداح تھے، محی الدین عیدروسی کا بیان ہے:

> ''عارفین اور علمائے ربانی میں سے جو بھی ان سے ملا یا جس سے وہ خود ملے وہ سب ان کی بے حد تعریف کرتے تھے، جیسے ہمارے شیخ تاج العارفین ابوالحسن بکری، امام الحرمین شہاب بن حجر شافعی، فقیہ مصر شمس الدین رملی انصاری اور ہمارے شیخ اور فصیح العصر شمس بکری وغیرہ ان کے مداح تھے اور ان لوگوں سے جو کچھ منقول ہے وہ شیخ علی متقی کی خدمت میں ان کی مدح اور غیر معمولی توصیف ہے۔''(۳)

عیدروسی ان کے اوصاف ومحامد بیان کرنے کے بعد آخر میں یہ لکھتے ہیں:

وبالجملة فما كان هذا الرجل الا من حسنات الدهر وخاتمة اهل الورع	خلاصہ یہ ہے کہ یہ شخص زمانہ کی خوبیوں اور نیکیوں کا مجموعہ تھا، اس کی ذات پر ورع وتقویٰ

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۶۔ (۲) ایضاً، ص ۲۲۴۔ (۳) النور السافر، ص ۳۱۷۔

ومفاخر الهند وشهرته تغني عن ترجمته و تعظيمه في القلوب يغني عن مدحه (۱)	کا خاتمہ ہوگیا اور اس کی شخصیت ہندوستان کے لیے سرمایۂ فخر و ناز تھی ، اس کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے اور لوگوں کے دلوں میں اس کی جو عظمت و برتری پیوست ہے وہ اس کی مدح وتوصیف سے بالاتر ہے۔

وہ تصوف میں ممتاز ہونے کے باوجود اس کی بے اعتدالیوں سے پاک تھے، اسی لیے وحدۃ الوجود کے بارہ میں افراط وتفریط پر مبنی خیالات کی اصلاح کی اور شیخ غوث گوالیاری کے رسالہ معراجیہ کی مخالفت بھی کی۔ (رودکوثر ،ص ۳۵۳ و ۳۵۴)

اصلاح وتربیت کا طریقہ: طالبین اور مریدین کی تربیت وارشاد اور ان کی اصلاح و تزکیہ کے طریقہ سے بھی شیخ کے تصوف میں کمال کا اندازہ ہوتا ہے، ان کے مرید خاص شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں:

> ’’بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ طالبین کے نقائص اور اندرونی خرابیوں کو دور کرنے کے بجائے انہیں ان کے حال پر چھوڑے ہوئے ہیں، مگر باطنی طور پر وہ ان کی تربیت کے کام میں مشغول رہتے تھے اور پوری توجہ اور اہتمام سے اس طرح تربیت فرماتے تھے کہ انہیں اس کا کوئی پتہ بھی نہیں چلتا تھا، یہاں تک کہ ایک مدت کے بعد بالکل نمایاں اور بدیہی طور پر یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ اب ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں پہلے نہیں تھے، خود اس فقیر کے ساتھ بھی اس طرح کا معاملہ پیش آچکا ہے، جب وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو دو برس تک اسے سرے سے معلوم ہی نہیں ہوسکا کہ وہ اس کی جانب متوجہ ہیں، اذکار واوراد اور مجاہدات وغیرہ کسی چیز کی

(۱) النور السافر، ص ۳۱۹۔

تلقین نہیں فرمائی، البتہ جو وقت ان کی خدمت میں گزرتا اس میں زیادہ تر اپنی تصنیفات کی کتابت ونقل اور مقابلہ کا حکم دیتے، لطف یہ ہے کہ سالک ان کے کام میں لگا ہوتا اور وہ خود سالک کا کام کرتے رہتے تھے، اس طرح دو سال کے بعد ہمیں اس وقت اپنے اندر تبدیلی کا احساس ہوا جب ہم ایسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں پہلے نہیں پہنچے تھے۔

دراصل مریدین وطالبین کی اصلاح وتربیت کے معاملہ میں صوفیہ ومشائخ کے دو طریقے ہیں، بعض صوفیہ کرام سالکین کو ان کے پرانے طور وطریق سے ہٹا کر انہیں دوسرے کاموں کی تعلیم وتلقین کرتے ہیں، لیکن یہ طریقہ مشکل ہے، سلوک وتصوف کے ابتدائی مراحل میں خاص طور پر اس سے دشواری پیش آتی ہے، اس لیے دوسرے صوفیہ کا اصول یہ ہے کہ وہ مریدین کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور خود ان کے کام، ان کی اصلاح وتزکیہ اور ان کے عادات واطوار کو تبدیل کرنے میں لگ جاتے ہیں، یہاں تک کہ سالک کے کام میں ایسی جلا اور صفائی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ مقصود ومطلوب تک پہنچ جاتا ہے، یہ طریقہ سہل اور آسان ہے۔"(۱)

ورع وتقویٰ اور کثرت عبادت وریاضت: تصوف وسلوک میں ان کی عظمت اور بلند پایگی اس سے بھی ظاہر ہے کہ وہ بڑے زاہد، متورع، متقی اور عبادت گزار شخص تھے، عبادت وریاضت اور مجاہدہ سے انہیں خاص شغف تھا، ورع وتقویٰ، طہارت وعفت ان کے مزاج میں داخل تھی، عبدالوہاب شعرانی نے انہیں صاحب ورع اور زاہد لکھا ہے(۲) محی الدین عیدروسی کا بیان ہے کہ "وہ عالم باعمل، اللہ کے مقبول اور صالح بندے اور ورع وتقویٰ میں نہایت عظیم المرتبت تھے، غیر معمولی عبادت وریاضت ان کا شعار تھی اور وہ برائیوں

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۴۴و۲۴۵۔ (۲) الطبقات الکبریٰ، ج۲،ص۱۶۷۔

سے کنارہ کش رہتے تھے، علامہ فاکہی نے **القول النقی فی مناقب المتقی** کے نام سے ایک مستقل رسالہ میں ان کی سیرت حمیدہ اور ریاضت عظیمہ کا ذکر کیا ہے اور ان کے ایسے مجاہدات شاقہ بیان کیے ہیں جو عقل کو مبہوت اور حیران کردیتے ہیں، اس میں بھی انہوں نے یہ کیسی عمدہ بات لکھی ہے کہ ''ہمارے شیخ کا نام علی اور لقب متقی واقعی اسم بامسمیٰ اور ان کے عظیم درجہ ومرتبہ کا آئینہ دار ہے۔''(۱)

شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں:

''تصنیف وتالیف اور علوم وفنون کی نشر واشاعت میں تو وہ علمائے ظاہر بھی جن کو خدا توفیق وبرکت عطا کرتا ہے ممتاز ہوتے ہیں لیکن اس سے قطع نظر ریاضات، مجاہدات، کرامات، محاسن اخلاق، محامد اوصاف، رزانت افعال، متانت احوال، ظاہر وباطن کے آداب کی رعایت اور ورع وتقویٰ کے سلسلہ میں ان کے بارے میں جو کچھ نقل وبیان کیا جاتا ہے وہی دراصل ان کے باطنی کمالات اور حقیقی احوال کی اصلی دلیل ہے۔''(۲)

آزاد بلگرامی نے بھی ان کی کثرت ریاضت وتقویٰ کا ذکر کیا ہے۔(۳)

وہ عبادت وریاضت کی کثرت کی وجہ سے بڑھاپے میں بہت کمزور ہو گئے تھے، اس کی وجہ سے خواہش وحوصلہ کے مطابق اور پہلے کی طرح عبادت نہیں کر سکتے تھے جس کا انہیں بڑا قلق رہتا تھا، تاہم شاہ عبدالحق صاحب نے ان کے شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی سے اس زمانہ کی ریاضت وعبادت کا حال اور نفل نماز کی تعداد دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ:

''جوانی میں بکثرت نفل نماز پڑھتے تھے لیکن آخر عمر میں زیادہ تر ذکر خفی، تفکر اور دینی علوم پر کتابوں کی تصنیف وتالیف سے سروکار رکھتے تھے، علاوہ ازیں ضعف اور بول کا عارضہ بھی لاحق تھا جس کی وجہ سے پیشاب

(۱) النور السافر، ص ۳۱۵ و ۳۱۷۔ (۲) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔ (۳) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۳۔

کے لیے رات میں دس یا بارہ مرتبہ اٹھنا پڑتا تھا اور جب پیشاب کے لیے اٹھتے تو وضو کر کے ہر ہر دفعہ دو یا چار یا حسب توفیق اس سے زیادہ رکعتیں نماز ادا کرتے تھے۔''(۱)

دنیا سے نفرت اور بے رغبتی: شیخ علی متقی کی نگاہ میں دنیا کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی، انہوں نے اس کی طلب اور مال وزر کی تحصیل کو کبھی مقصود نہیں بنایا، ابتدا میں کسب معاش کی کچھ فکر دامن گیر رہی اور عمر کے اقتضا سے دنیاوی لذتوں سے بھی کسی قدر رغبت ہوئی، نوجوانی میں مانڈو میں ایک بادشاہ کے یہاں ملازمت کر کے بھی کچھ کمایا مگر بہت جلد خدا کی محبت کی کشش اور اس کی توجہ وعنایت سے دنیا کی نفرت وحقارت اور اس کی بے اعتباری اور ناپائیداری نظر میں رچ بس گئی (۲) چنانچہ دنیا کے مال و متاع سے بے رغبتی کا یہ حال تھا کہ سلطان بہادر گوان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا، مگر وہ ملنے سے پہلو تہی کرتے رہے، یہاں تک کہ قاضی عبداللہ سندھی کے کہنے سننے سے اس کے لیے تیار ہوئے، بادشاہ جب مل کر واپس گیا تو اس نے دوسرے روز ایک کروڑ تنکہ؎ بھیجا مگر شیخ نے یہ ساری رقم قاضی عبداللہ کو دے دی اور فرمایا کہ ''سلطان سے ملاقات اور اس رقم کے حصول کا ذریعہ آپ ہی تھے، اس لیے آپ ہی اس کے حق دار ہیں۔'' (۳)

اس سے بڑھ کر دنیا سے نفرت اور بیزاری کیا ہو سکتی ہے۔

تصوف کی چار خصوصیات: کہا جاتا ہے کہ تصوف کا دار و مدار چار چیزوں پر ہے:

قلة الطعام، قلة الكلام، قلة المنام و	کم کھانا، کم بولنا، کم سونا اور لوگوں سے الگ
اعتزال الانام	تھلگ رہنا۔

حضرت سہل کا ارشاد ہے کہ ابدال کی چار خصلتیں ہیں:

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۵۔ (۲) ایضاً، ص ۲۴۱۔ (۳) ایضاً، ص ۲۴۴۔ ؎ یہ سکہ اس زمانہ میں گجرات میں رائج تھا۔

اخماص البطون والسهر والصمت	پیٹ کا خالی اور پچکا ہوا ہونا، جاگنا، خاموشی
والاعتزال عن الناس	اور لوگوں سے علاحدہ رہنا۔

ابدال کے یہ اوصاف بیان کیے جاتے ہیں:

ان اكلهم فاقة ونومهم غلبة وكلامهم ضرورة	فاقہ، نیند کا غلبہ اور ضرورۃً بات چیت۔

گو صوفیہ کے نزدیک غذا میں تقلیل اور کمی مستحسن ہے لیکن یہ مقصود نہیں ہے، دراصل غذا میں افراط اور کثرت سے ایسی آفتیں رونما ہوتی ہیں جو اصل مقصود میں خلل انداز ہوتی ہیں، تقلیل کا مقصد نفس کشی، قلب کی تقویت اور اس کی جلا اور صفائی ہے، بھوک سے قلب کی چربی پگھلتی اور خون کم ہوتا ہے جس سے قلب میں جلا، صفائی اور گداز پیدا ہوتا ہے اور وہ ذکر کا نور قبول کرتا ہے، نیز اس کے اندر شرعی معاملات اور غیبی واردات کے انوار کا فیضان ہوتا ہے، پھر قلب کے آئینہ سے ان انوار کا پرتو نفس کی زمین پر پڑتا ہے اور وہ نور خداوندی سے جگمگا اٹھتا ہے اور اس کی آلائشیں اور ظلمتیں کافور ہو جاتی ہیں۔(۱)

ذیل میں ان چاروں امور کے بارہ میں شیخ علی متقی کا حال بیان کیا جاتا ہے:

قلت طعام: شیخ کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کی غذا بہت کم ہوتی تھی، فاکہی کا بیان ہے کہ وہ اتنا کم کھاتے تھے کہ اس کا لوگوں کو مشکل سے یقین ہوگا اور اس قدر کم خوری کا کسی شخص کے بارہ میں خیال بھی نہیں کیا جا سکتا مگر شیخ اس قدر کم غذا کے اس لیے عادی ہو گئے تھے کہ طول ریاضت کی وجہ سے انہیں اس کا ملکہ حاصل ہو گیا تھا اور اگر انہیں معمول سے کچھ بھی زیادہ غذا دی جاتی تھی تو وہ اسے ہضم نہیں کر سکتے تھے (۲) شعرانی کا بیان ہے کہ وہ نحیف البدن تھے اور بھوک کی ..... شدت کی وجہ سے ان کے جسم پر گوشت معلوم نہیں ہوتا تھا (۳) شیخ عبدالوہاب متقی سے منقول ہے کہ ان کا کھانا تو صرف اس لیے

(۱) النور السافر، ص ۳۱۶ و ۳۱۷۔ (۲) ایضاً ص ۳۱۶۔ (۳) الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۶۷۔

ہوتا تھا کہ ان کا جسم بحال رہے اور وہ عبادت کر سکیں، ان کے لیے جو شوربا بنتا اس میں سے تھوڑا سا چکھ کر وہ دوسروں کو دے دیتے تھے۔(۱)

قلت کلام: وہ کم سخن بھی تھے (۲) فضول اور لایعنی باتوں سے پرہیز کرتے اور بلا ضرورت کوئی بات چیت نہیں کرتے تھے مجلس درس میں بھی عموماً خاموش رہتے، شعرانی کا بیان ہے کہ وہ بہت زیادہ خاموش رہتے تھے۔(۳)

قلت منام: شیخ سوتے بھی کم تھے (۴) اور شب کا زیادہ وقت ذکر وفکر اور یاد الٰہی میں گزارتے تھے۔

خلوت پسندی اور عزلت گزینی: خلوت پسند تھے اس لیے لوگوں سے الگ تھلگ اور کنارہ کش رہتے تھے، محی الدین عیدروسی کا بیان ہے کہ:

موثر العزلة من الانام (۵) لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں:

> ''بڑے گوشہ نشین آدمی تھے، اپنے گھر سے صرف جمعہ کی نماز کے لیے حرم جاتے اور صفوں کے کنارے کھڑے ہوتے اور بہت جلد گھر واپس آجاتے۔''(۶)

شیخ جس زمانہ میں گجرات تشریف لے گئے تھے اس وقت ان کی حالت یہ تھی کہ جس طرف بھی نکلتے خلقت ان پر اس طرح ٹوٹی پڑتی تھی جس طرح شمع پر پروانے گرتے ہیں مگر خود ان کی عزلت پسندی کا حال یہ تھا کہ ہجوم سے کنارہ کش رہنے کے لیے اپنے کمرہ کا دروازہ بند رکھتے اور کسی کو اندر آنے کا موقع نہ دیتے بلکہ پوری خاموشی اور یکسوئی سے اپنے

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۵۔ (۲) النور السافر، ص ۳۱۶۔ (۳) الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۶۷۔ (۴) النور السافر، ص ۳۱۶۔ (۴) ایضاً۔ (۵) ایضاً (۶) الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۶۷۔

کاموں میں مشغول رہتے۔(۱)

خوارق وکرامات: شیخ کی مختلف کراماتیں بیان کی جاتی ہیں، ان کے حالات کے ضمن میں اس طرح کی باتیں پہلے بھی گزر چکی ہیں اور آئندہ بھی آئیں گی، یہاں چند واقعات تحریر کیے جاتے ہیں:

عبدالوہاب شعرانی کا بیان ہے کہ مکہ میں میری معذوری دیکھ کر انہوں نے چاندی کا ایک ٹکڑا مجھے دیا، اس کی وجہ سے حج میں اللہ نے مجھے ایسی وسعت اور برکت دی کہ میں بے دریغ پیسے خرچ کرتا تھا، مجھے خود بڑی حیرت تھی کہ یہ سب کہاں سے آ رہا ہے۔(۲)

ان کے ایک شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں:

> ''ایک روز شیخ کے مخصوص خدام میں سے ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ شیخ از سر نو جوان ہو گئے ہیں اور نہایت حسین اور دلکش دکھائی دے رہے ہیں، اس وقت ان پر عجیب عمدہ اور اچھی حالت طاری ہے، آپ کو طلب فرمایا ہے، فقیر حکم کی تعمیل اور اس حالت کا مشاہدہ کرنے کے شوق میں چلا، مگر جب پہنچا تو شیخ کی حالت تبدیل ہو چکی تھی، تاہم اب بھی سکر کے اثرات موجود اور باقی تھے، میرا بڑا پر تپاک خیر مقدم کیا اور مخصوص توجہ بھی فرمائی، فرمانے لگے کہ آج مجھ پر عجیب وغریب کیفیت طاری تھی، چوں کہ حاضرین کو مزید اطمینان ویقین درکار تھا اس لیے بعض خوارق کا ظہور بھی ہوا، تم کو اس حالت کے مشاہدہ کے لیے بلایا تھا مگر تم ارباب یقین میں ہو تمہیں خوارق کی ضرورت نہیں اس لیے حالت تبدیل ہوگئی اور میں اُس عالم سے اس عالم میں چلا آیا۔''(۳)

کہتے ہیں کہ سلطان محمود گجراتی کو پانی کے بارے میں بڑا وسوسہ اور شک لاحق

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۴۔ (۲) الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۶۷۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۲۴۷۔

رہتا تھا جو کسی طرح دور نہیں ہوتا تھا، شیخ نے ایک طشت منگوا کر اس میں اپنی ٹوپی دھوئی اور پانی پھینک دیا، اسی طرح انہوں نے تین بار کیا، چوتھی مرتبہ اسی طشت میں نیا اور پاک و صاف پانی رکھوا کر فرمایا، بابا محمود! یہ پانی از روئے شریعت پاک وصاف ہے، اس میں کسی قسم کا شک وشبہ کرنا وسوسہ ہے جو شیطانی کام ہے، تم اس پانی کو پیو اور کوئی وسوسہ اور شک دل میں نہ لاؤ، سلطان شیخ کے ارشاد کے موافق وہ تمام پانی پی گیا جس کے بعد اس کا شک ایسا زائل ہو گیا کہ پھر کبھی اس کے دل میں وسوسہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ (۱)

وجد وحال: شیخ صاحب وجد وحال بھی تھے، اس کی ایک مثال اوپر نقل ہو چکی ہے، وفات سے پہلے بھی ان پر عجیب جذبہ وحال طاری ہوا جس کی کیفیت ان کے شاگرد عبدالوہاب متقی نے اس طرح بیان کی ہے ''ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے تمام حرکات وسکنات میں ایک تغیر وانقلاب رونما ہو گیا ہے، اسی عالم میں انتقال سے تقریباً تین چار ماہ پیشتر ماہ صفر ۹۷۵ھ کی ایک رات مجھ فقیر سے فرمایا کہ فلاں شاعر کا شعر پڑھو، میں اپنی فراست سے تاڑ گیا کہ وہ کون سا شعر پڑھنے کے لیے کہہ رہے ہیں، چنانچہ میں نے شعر پڑھا ۔

ہرگز نیامد در نظر نقشے زرویت خوبتر

شمسے ندانم یا قمر حورے ندانم یا پری

یہ سن کر ان کی حالت عجیب ہو گئی اور زور زور سے فرمانے لگے کہ پڑھتے جاؤ، پڑھتے جاؤ، چنانچہ فقیر نے یہ شعر کئی بار پڑھا اور وہ محبت آمیز باتیں کہتے اور شور انگیز نالے کرتے رہے، اسی اثنا میں ملازم نے آ کر کہا کھانا حاضر ہے، ان کا طریقہ یہ تھا کہ کھانے کو کوٹ اور پیس کر اتنا باریک کرا دیتے تھے کہ اس کے تمام اجزا ایک دوسرے سے اس قدر مل جاتے تھے کہ ان کو پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا، چنانچہ جب ملازم نے کھانے کی خبر دی تو اس سے فرمایا کہ اسے پیس کر اتنا باریک کرو کہ اس کی تمام چیزیں اس میں گھل مل جائیں اور اس کا ہر ہر ذرہ باہم

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۸۔

اس طرح مل جائے کہ شناخت نہ ہو سکے اور اس کی دوئی اس طرح ختم ہو جائے جیسا کہ اس دھرے سے معلوم ہوتا ہے۔

من سہیلی پرم کی باتا
یوں مل رہے جیون دودھ نباتا

تمام رات یہی حالت رہی کہ آپ محبت انگیز کلمات فرماتے رہے اور ہم لوگ بھی ان کے ساتھ جاگتے رہے۔(۱)

شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ:

''مجھ سے شیخ عبدالوہاب فرماتے تھے کہ شیخ زمانہ قبل از مرگ میں اکثر بار ذکر بالجہر پوری قوت اور ذوق وشوق سے کرتے تھے، حالانکہ اس وقت ان میں حس وحرکت تک نہ باقی تھی اور وہ بالکل نحیف ہو گئے تھے، ذکر کے وقت ان کی حالت یہ ہو جاتی تھی کہ گویا کوئی مانع اور حائل ہے جسے وہ دفع کرتے جاتے ہیں، اسی حالت میں فرمایا کہ جنت معلیٰ میں قبر کی جگہ تیار کر لینی چاہیے تاکہ رحلت سے پہلے منزل متعین ہو جائے مگر پھر فرمایا کہ یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ہماری حیات مستعار کب تک باقی ہے؟ اور ہمیں کب موت آئے گی اور یہ مقبرہ عام مسلمانوں کا ہے، انتقال سے پہلے ہی قبر کی جگہ پر قبضہ کر کے لوگوں کے لیے تنگی پیدا کرنا مناسب نہیں ہے، وفات کے بعد لوگ جہاں چاہیں دفن کریں۔''(۲)

مہدویت سے تعلق وانقطاع: فرقہ مہدویت (۳) سے بھی شیخ کا تعلق بتایا جاتا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ وہ صاحب حال بزرگ تھے، اس کیفیت کے طاری ہونے کے

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۹۔ (۲) ایضاً، ص ۲۴۹ و ۲۵۰۔ (۳) مہدویت یا فرقہ مہدوی سید محمد جونپوری، متوفی ۹۱۰ھ/۱۵۰۵ء کی طرف منسوب ہے۔

وقت وہ اس طرح کی باتیں بھی کہہ جاتے تھے، چنانچہ مرض الموت میں انہوں نے قطبیت کا دعویٰ کیا تھا(۱) اسی طرح وہ فرقہ مہدویہ سے بھی متاثر ہو گئے تھے، مگر ان کا یہ تاثر عارضی اور وقتی تھا۔

نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں:

وازغریب حالات ایشاں دعویٰ مہدویت ست کہ بجہت غلبہ وقت وسکر حال بوجود آمدہ و مدت بقائے آں پنج روز بود۔

من نمی گویم انا الحق یار می گوید بگو
چوں بگویم چوں مرادلدار می گوید بگو

ان کے عجیب حالات میں مہدویت کا دعویٰ بھی ہے جو غلبہ حال اور سکر کا نتیجہ تھا مگر اس کی مدت پانچ روز رہی۔

میں خود انا الحق نہیں کہتا بلکہ یہ دوست کہلاتا ہے، میں اسی وقت یہ کہتا ہوں جب میرا محبوب مجھ سے یہ کہنے کے لیے کہتا ہے۔

مگر بعد میں وہ مہدویت کے مخالف ہو گئے تھے اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس کے قلع قمع کرنے میں اپنی زندگی صرف کر دی، ان کی تصنیف البرھان فی علامات المھدی آخر الزمان دراصل مہدویت کا رد تھی۔

ردمہدویت کے علاوہ شیخ نے اپنے زمانہ کی مختلف بے اعتدالیوں اور فتنوں کی بھی سرکوبی کی اور صوفیہ کے افراط وتفریط پر مبنی بعض نظریات وخیالات کی بھی اصلاح کی، اس کی تفصیل شیخ محمد اکرام نے تحریر کی ہے، ذیل میں اس کے بعض اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

"شروع شروع میں یہ (مہدویت) کی تحریک گجرات، خاندیش اور احمد نگر میں زوروں پر تھی اور بڑے قابل اور مخلص لوگ اس میں شامل تھے، لیکن شیخ علی متقی کی علمی مخالفت اور مخدوم الملک کی سیاسی کوششوں نے اسے شمالی ہند میں پھلنے پھولنے نہ دیا، گجرات سے یہ تحریک دکن میں منتقل ہو گئی۔"(۳)

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۸۔ (۲) اتحاف النبلا، ص ۳۲۶۔ (۳) رود کوثر، ص ۴۸۔

شیخ صاحب آگے لکھتے ہیں:

''بلکہ شیخ علی متقی جنہوں نے بالآخر گجرات میں مہدویت اور دوسری غیر راسخ تحریکوں کے قلع قمع میں سب سے زیادہ گرم جوشی دکھائی، بعض روایات کے مطابق ایک زمانے میں مہدوی ہو گئے تھے لیکن جب مکہ معظمہ میں پہنچ کر انہوں نے زیادہ تحقیق کی تو ان خیالات کو ترک کیا اور ان کے خلاف ٹھوس، مدلل کتابیں لکھیں۔''(۱)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''شیخ علی متقی نے سو سے زیادہ کتابیں لکھیں، آپ کی زیادہ دلچسپی علم حدیث اور تصوف سے تھی، لیکن آپ نے معاصرانہ بے اعتدالیوں پر بھی بڑی توجہ دی، شیخ غوث گوالیاری کے رسالہ معراجیہ کی مخالفت کے علاوہ آپ نے مہدی جونپوری کے خیالات کی بڑی مخالفت کی اور نہ صرف اس مقصد کے لیے حکام وقت کی اعانت حاصل کی بلکہ مہدویت کی تردید میں دو مبسوط رسائل لکھے اور ظہور مہدی کے نشانوں کی تفصیلات اور علمائے مکہ کے فتاویٰ درج کر کے مہدی جونپوری کے دعاوی کی تردید کی، یہ آپ کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ گجرات میں جو مہدویت کا مرکز بن گیا تھا یہ تحریک بالآخر ناکام ہوئی اور اسے اپنا مرکز دکن میں منتقل کرنا پڑا۔

آپ کے شاگردوں میں دوسرے اکابر علما کے علاوہ مشہور محدث محمد بن طاہر پٹنی تھے جنہوں نے اپنے استاد کی متابعت میں مخالفت بدعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور بالآخر اسی کوشش میں شہید ہوئے۔''

(رود کوثر، ص ۳۵۴)

(۱) رود کوثر، ص ۲۹۔

شیخ کے ممتاز مسترشد اور خلیفہ و جانشین شیخ عبدالوہاب متقی نے بھی ردمہدویت کے کام کو نہ صرف جاری و باقی رکھا بلکہ اسے وسعت بھی دی، ان کے متعلق شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> "شیخ عبدالوہاب متقی شاید پہلے باا ثر ہندوستانی عالم ہیں جنہوں نے وحدت الوجودیوں کی افراط و تفریط کے خلاف با قاعدہ آواز اٹھائی اور شیخ عبدالحق محدث اور شیخ محمد طاہر پٹنی جیسی ہستیوں پر اثر ڈالا۔"
>
> (رود کوثر، ص ۳۵۲)

شیخ محمد غوث گوالیاری کی تکفیر: اوپر ذکر آچکا ہے کہ شیخ علی متقی نے شیخ محمد غوث گوالیاری کے رسالہ معراجیہ کی سخت مخالفت کی تھی، ان کو شیخ کی بعض اور تصنیفات اوراد غوثیہ وغیرہ پر بھی اعتراض تھا، ان کی مخالفت میں وہ اس قدر سرگرم ہو گئے تھے کہ ان کی تکفیر اور قتل کا فتویٰ بھی دے دیا تھا، ملا عبدالقادر بدایونی نے ان واقعات کی تفصیل لکھی ہے، فرماتے ہیں:

> "شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری سلسلہ کے مشہور صوفی تھے اور ان کی بدولت اس سلسلہ کو بڑی شہرت نصیب ہوئی، وہ شیخ فریدالدین عطار کی نسل سے تھے اور سلوک و باطن کی تکمیل شیخ ظہور حاجی حمید سے کی تھی، ان کے ایما سے کوہ چنار کے جنگلات میں تیرہ برس تک بڑی ریاضتیں کرتے اور درختوں کے پتے کھا کر یادالٰہی کرتے رہے۔"(۱)

ہمایوں ان کا بڑا معتقد تھا لیکن شیر شاہ کا جب بول بالا ہوا تو وہ ان کے پیچھے پڑ گیا تھا، اس کی وجہ سے شیخ غوث گوالیار سے ہجرت کر کے گجرات تشریف لائے، یہاں شیخ علی متقی نے ان کے کفر و قتل کا فتویٰ دیا۔

سلطان محمود گجراتی نے اس دور کے ایک اور مشہور عالم و صوفی شیخ وجیہ الدین گجراتی سے جب اس مسئلہ میں استصواب کیا تو وہ تحقیق حال کے لیے شیخ محمد غوث کے پاس گئے اور

(۱) منتخب التواریخ، جلد سوم، ص ۴ تا ۶۔

پہلی ہی ملاقات میں ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ فتوے کو چاک کر دیا، شیخ علی متقی کو معلوم ہوا تو انہوں نے شیخ وجیہ الدین سے کہا تم کیوں بدعت کے رواج پر راضی ہو گئے، شرع میں رخنہ ڈالتے ہو، انہوں نے کہا "ہم ارباب قال ہیں اور شیخ اہل حال ہیں، ہمارا ذہن ان کے کمالات کو نہیں سمجھ سکتا اور ظاہر شریعت میں کوئی اعتراض ان پر نہیں آتا" غرض ان کے اثر سے تمام گجرات کے حکام شیخ محمد غوث کے معتقد ہو گئے اور شیخ نے اس بلا سے نجات پائی۔ (۱)

معراج نامہ جس پر شیخ علی متقی کو اس قدر شدید اعتراض تھا اس کی تفصیل ملا عبدالقادر بدایونی نے دوسری جگہ تحریر کی ہے:

> "جب دوبارہ مغل حکومت قائم ہوئی اور شیخ گجرات سے اکبر آباد (آگرہ) کے لیے روانہ ہوئے تو اس وقت ہمایوں کی وفات ہو چکی تھی اور اکبر اس کا جانشین تھا، امور ملکی بیرم خان کے سپرد تھے اور عہد اکبری کا پہلا صدر شیخ گدائی شیخ کے خلاف تھا، اس نے بیرم خان سے کہا کہ رسالہ معراجیہ میں شیخ نے اپنی معراج کا دعویٰ کیا ہے اور کہا ہے کہ مجھے اللہ سے ہم نشینی اور ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا ہے اور اس نے مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت دی ہے، چنانچہ جب علما و مشائخ کے جلسہ میں اس پر بحث ہوئی اور شیخ پر اعتراضات کیے گئے تو بالآخر وہ آزردہ ہو کر گوالیار چلے گئے۔" (۲)

مگر شیخ وجیہ الدین نے جیسا کہ اوپر گزرا اس میں شیخ علی متقی کی نہ صرف یہ کہ تائید نہیں کی بلکہ مسئلہ تکفیر پر ایک مستقل رسالہ بھی تحریر کیا جس میں ابتداء فقہی کتابوں سے مسئلہ تکفیر پر روشنی ڈالی ہے، پھر احادیث سے سند اسب کو مشرح بیان کیا ہے، آخر میں صوفیائے کرام کے احوال سے بحث کی ہے کہ حالت سکر میں جو کہہ جاتے ہیں وہ قابل مؤاخذہ نہیں ہوتا۔ (۳)

(۱) منتخب التواریخ، جلد سوم، ص ۴۴۔ (۲) منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی، جلد دوم، ص ۳۴ و ۳۵۔
(۳) معارف ج ۳۱، ص ۱۲۴، فروری ۳۳ء۔

اتباع سنت: ان کے کسی شاگرد نے مکہ معظمہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو آپؐ سے عرض کیا کہ "اے اللہ کے رسولؐ! مجھے کس بات کا حکم دے رہے ہیں" ارشاد ہوا کہ "شیخ علی متقی کی اقتدا کرو، وہ جو کچھ کریں تم بھی وہی کرو" محی الدین عیدروسی یہ خواب نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> "یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شیخ علی متقی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں سے حصۂ وافر ملا تھا، اسی لیے آپؐ نے اس زمانہ کے اور لوگوں کے بجائے خاص طور پر ان کا نام لیا اور خواب دیکھنے والے کو ان کی اقتدا کا حکم دیا، اس خواب میں ان کی عظمت کے اور بھی کئی پہلو ہیں، ایک تو یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں شیخ کے نام سے موسوم کیا ہے۔"(۱)

اس ضمن میں وہ خواب بھی نقل کرنے کے لائق ہے جسے شیخ کے بعض سوانح نگاروں نے ان کے مناقب میں بیان کیا ہے کہ "انہوں نے ۲۷ رمضان بروز جمعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی تھی، اس وقت انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اس زمانہ میں سب سے افضل شخص کون ہے؟ ارشاد ہوا تم، پوچھا پھر کون افضل ہے، ارشاد ہوا ہندوستان میں محمد بن طاہر۔

کہا جاتا ہے کہ اسی شب میں شیخ کے شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی نے بھی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو یہی سوال کیا جس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا:

شیخک ثم محمد بن طاهر بالهند سب سے افضل تمہارے شیخ ہیں، پھر ہندوستان کے محمد بن طاہر۔

وہ جب شیخ متقی کے پاس یہ خواب بیان کرنے کے لیے حاضر ہوئے تو شیخ نے ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فرمایا کہ جو کچھ تم نے خواب میں دیکھا ہے وہی میں نے بھی دیکھا ہے۔(۲)

---

(۱) النور السافر، ص ۳۱۸۔ (۲) ایضاً، ص ۳۱۵ و ۳۱۶۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر: اہل حق اور علمائے ربانی کی طرح وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ سے غافل نہ رہتے، قاضی عبداللہ سندھی نے جب سلطان بہادر گجراتی کی ملاقات کے لیے سفارش کرتے ہوئے ان سے کہا کہ ''اگر آپ اس سے بات کرنا پسند نہ کریں گے تو ہم لوگ اسے ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول رکھیں گے'' شیخ نے فرمایا ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کا لباس اور وضع قطع غیر اسلامی ہو اور مجھے اس کے اندر کھلا ہوا منکر دکھائی دے پھر بھی میں چپ رہوں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض سے باز رہوں (۱) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کس قدر خیال تھا اور وہ کسی منکر اور غیر شرعی فعل وعمل کو دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ جب بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو جو نصیحت مناسب سمجھی اسے کی۔ (۲)

سخاوت وفیاضی: طبیعت میں سخاوت اور فیاضی تھی، ان کی خانقاہ میں بڑی تعداد میں طالبین مستقل قیام پذیر رہتے، شیخ ان کی کفالت فرماتے تھے اور طلبہ کے کھانے پینے کے علاوہ کتاب، کاغذ اور روشنائی تک وہی مہیا کرتے تھے، جو سائل بھی ان کے پاس آتا اس کی بروقت مدد فرماتے اور کسی کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے، اوپر گزر چکا ہے کہ بہادر شاہ نے ایک کروڑ تنکہ بھیجا تھا مگر انہوں نے یہ پوری رقم قاضی عبداللہ سندھی کو دے دی۔ (۳)

داد ودہش میں نام ونمود اور ناموری کے لیے پر تکلف دعوتوں کا اہتمام پسند نہ تھا، جو کچھ کسی کو دیتے مخفی طریقہ سے دیتے، آخر عمر میں بزرگوں کے عرس میں کھانا کھلانے کے بجائے اندازاً جو رقم اس پر خرچ ہوتی اسے زر نقد کی صورت میں فقرا میں تقسیم کردیتے تھے اور ہر فقیر کو جتنی رقم مناسب سمجھتے خاموشی سے اس طرح دیتے کہ کسی اور کو پتہ نہیں چلتا، فرماتے تھے کہ مجلس طعام کا اہتمام وآرائش اور لوگوں کا جمگھٹا موجب تکلیف اور باعث زحمت ہے۔ (۴)

معیشت میں سادگی اور قناعت: ان کی زندگی سادہ اور تکلفات سے بری تھی

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۴۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً۔ (۴) ایضاً، ص ۲۴۶۔

اوران کا دل مال وزر کی ہوس سے خالی تھا، جو کچھ جائز اور حلال طریقہ پر میسر ہوتا اسی پر قناعت کرتے، ابتدا میں اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے کتابت کرتے تھے اور اسی سے گزر بسر کرتے تھے، عسرت کے باوجود بیوہ عورتوں کی مدد بھی کرتے اور کسی سائل کو محروم نہ کرتے، اگر کہیں سے فتوحات ملتے تو قرض ادا کرتے، کیوں کہ اس میں وسعت ہے، مگر فتوحات اپنی ذات پر خرچ نہ کرتے جن فتوحات کے بالکل حلال ہونے کا یقین ہوتا اسی میں سے اپنی ذات پر خرچ کرتے۔(۱)

بہادر شاہ اور محمود شاہ دونوں کو شیخ متقی سے بڑی عقیدت تھی اور وہ ان کے اخراجات کے لیے بڑی بڑی رقمیں نذر کرتے، مگر شیخ سادہ زندگی کے عادی تھے اس لیے نہ یہ رقم اپنی ذات پر خرچ کرتے اور نہ پس انداز کرتے بلکہ فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیتے یا اہل علم، طلبہ اور سلوک و معرفت کے طالبین کی ذات پر خرچ کرتے۔

سادگی کا یہ حال تھا کہ سفر میں دو تھیلے لے کر چلتے تھے ایک میں کھانے پینے کی چیزیں اور برتن ہوتے تھے، کھانے کی جنس کم سے کم مقدار میں خرچ کرتے، دو تین روز کی خوراک تین چار روز کام آتی، پانی کا استعمال بھی کم کرتے اور سارا کام بھی خود ہی کرتے تھے۔(۲)

رزق کے معاملہ میں توکل: سادگی کی بنا پر رزق کے معاملہ میں بڑے متوکل اور اللہ کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرتے تھے، ان کے خیال میں سبب و واسطہ کے بغیر بھی روزی فراہم ہو جاتی ہے، فرماتے تھے کہ:

اللہ یرزق من حیث لا یحتسب — اللہ وہاں سے روزی دیتا ہے جہاں سے بندے کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔

صحرا و بیابان میں اکثر اس کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ کنوئیں کے کنارے پیاسے ہرن آتے ہیں اور پانی کی طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کنوئیں کے اندر گہرائی میں

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۵ و ۲۴۶۔ (۲) ایضاً، ص ۲۴۷۔

ہوتا ہے، دفعۃً کنوئیں میں جوش آتا ہے اور پانی ابلنے، اوپر بہنے لگتا ہے اور ہرن اور دوسرے جانور پانی پی کر خوب سیراب ہو جاتے ہیں اور کلیلیں کرنے لگتے ہیں، ہم نے بھی خود اس طرح پانی پیا ہے۔(۱)

حلال کمائی ضائع نہیں ہوتی: ان کے استاد اور شیخ طریقت شیخ حسام الدین رزق حلال کے معاملہ میں بہت محتاط تھے، اس بارے میں ذرا بھی شبہ ہوتا تو اس کے استعمال سے پرہیز کرتے، ان کی غایت احتیاط کے بعض واقعات مشہور ہیں (۲) شیخ علی متقی کا عمل بھی یہی رہا ہوگا اور وہ اکل حلال کا بڑا لحاظ کرتے رہے ہوں گے، ان کا عقیدہ تھا کہ حلال کمائی رائیگاں نہیں جاتی، چنانچہ ان کے مشہور شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی کا بیان ہے کہ جو چیز کسب حلال سے حاصل ہوتی ہے وہ کبھی ضائع نہیں ہوتی، یہ اگر گم بھی ہو جاتی ہے تو بالآخر مل جاتی ہے، اس کی تائید میں وہ اپنا یہ واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک دفعہ بحری سفر میں طوفان آ گیا، ہم لوگ جس کشتی پر سوار تھے وہ ٹوٹ پھوٹ گئی، کئی روز تک ایک تختہ پر بیٹھے رہنے کے بعد جب ہم ساحل پر پہنچے تو ہمارے ساتھ جو کتابیں تھیں وہ بھیگ گئی تھیں، آگے ہم لوگوں کو پیدل چلنا تھا اس لیے کتابیں ڈھو کر لے جانے کی ہم میں طاقت نہ تھی، چنانچہ ایک صحرا میں انہیں دفن کر دیا گیا اور وہاں نشان بھی بنا دیا گیا، پھر مکہ کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں پیاس کی شدت سے دوچار ہوئے، صحرائے عرب میں پانی کا نام ونشان نہیں ہوتا، دوستوں نے کہا کہ پانی کے لیے دعا کرنی چاہیے، ممکن ہے اللہ پانی بھیج دے، میں نے کہا میں دعا کرتا ہوں آپ لوگ آمین کہیں، اللہ نے ہماری سن لی اور بارش ہوئی جس سے ہم لوگ سیراب بھی ہوئے اور اپنے اپنے مشکیزے بھی بھر لیے، کچھ روز کے بعد مکہ پہنچے، طواف وعمرہ کیا اور سعی بین الصفا والمروہ بھی کی، اتفاقاً ایک روز چند بدو گٹھری لیے ہوئے ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہمارے پاس چند کتابیں ہیں، آپ لوگ خریدنا چاہیں تو خرید لیں، انہوں نے جب

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۷۔ (۲) اخبار الاخیار، تذکرہ حسام الدین ملتانی، ص ۲۰۱۔

گٹھری کھولی تو اس میں ہماری وہی کتابیں تھیں جنہیں ہم نے صحرا میں دفن کیا تھا، ہم نے بدوؤں کو قیمت دے کر کتابیں لے لیں، ان کے اوراق خشک ہونے کے بعد ایک دوسرے سے ایسا چپک گئے تھے کہ انہیں پھر پانی میں تر کرنا پڑا تا کہ چپکے ہوئے اوراق کھل جائیں، مگر ان سب کے باوجود نہ کتابوں کا کوئی ورق محو ہوا اور نہ ان سے استفادہ کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش آئی۔(۱)

اپنے کام خود کرنا: وہ اپنا کام خود ہی کرتے تھے، اوپر گزر چکا ہے کہ سفر میں دو تھیلے ان کے ساتھ ہوا کرتے تھے جنہیں خود ہی لے کر چلتے تھے اور کھانا پکانے کے لیے خود ہی جنگل سے لکڑیاں بھی لایا کرتے تھے، اسی طرح کھانا بھی خود پکاتے اور خود ہی برتن بھی دھوتے، اپنے کام کے لیے دوسروں کو زحمت نہ دیتے تھے، انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کا عہد کیا تھا کہ دوسرے سے کوئی مدد نہ لیں گے اور جو کام خود کر سکتے تھے اس کے لیے کسی اور سے کچھ نہ کہتے اور اگر بالفرض ایسی کوئی ضرورت پیش آ جاتی جس میں دوسروں کی مدد واحتیاج کی ضرورت ہوتی تو پہلے انہیں کچھ پیسے بطور اجرت دے دیتے تب ان سے کام لیتے اور خدمت کراتے۔(۲)

نوکروں سے اچھا برتاؤ: اپنے ملازمین اور خادموں سے بھی اچھا برتاؤ کرتے اور ان کی غلطی اور کج خلقی کو نظر انداز کر دیتے، شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں کہ کمال نام کا ان کا ایک نوکر تھا جو نہایت بے ہنگم اور کج خلق تھا، اس کے جو جی میں آتا کرتا اور انہیں جو چاہتا کہہ دیتا اور ان کی مرضی کی مطلق پروا نہ کرتا، مگر اس کے باوجود اسے عزیز رکھتے، اس کے معاملہ میں ضبط وتحمل سے کام لیتے اور اس کی کج خلقی اور ایذا رسانی کو برداشت کرتے، ایک روز وہ ان کے لیے شوربا بنا کر لایا جس میں بہت نمک تھا مگر کوئی برہمی ظاہر کرنے کے بجائے اسے بلا کر یہ کہا میاں کمال! ذرا بیٹھو، پھر تھوڑا سا شوربا دے کر اس سے کہا اسے چکھو، دیکھو

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۷۔ (۲) ایضاً، ص ۲۴۴۔

کیسا پکا ہے، اس نے بڑی ڈھٹائی سے درشت لہجہ میں کہا ہاں کچھ نمک تو ضرور زیادہ ہے مگر یہ کتنا عمدہ پکا ہے، آپ اسے کھایئے کوئی حرج نہیں ہے، شیخ نے فرمایا بہت خوب! پھر پانی منگوا کر شوربا میں ڈالا اور تھوڑا سا کھالیا۔(۱)

پاکیزہ زندگی اور عمدہ سیرت: شیخ کے حالات و واقعات زندگی بیان کیے گئے ہیں وہ ان کی عظمت، پاکیزہ شخصیت، بے داغ زندگی اور عمدہ سیرت کی دلیل ہیں، ارباب سیر نے اعتراف کیا ہے کہ ان کے محاسن ومناقب گوناگوں ہیں اور ان کی سیرت پاکیزہ اور واقعات زندگی نہایت محمود اور قابل ستائش ہیں۔(۲)

اپنی پاکیزہ زندگی اور عمدہ سیرت واخلاق کی بنا پر وہ مذہبی و دینی حیثیت سے بڑے ممتاز شخص سمجھے جاتے تھے، شیخ محمد اکرام تحریر فرماتے ہیں:

> ''شیخ علی متقی جن کا فیض شیخ عبدالحق کو شیخ عبدالوہاب کی وساطت سے پہنچا، خود ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں اور ایک خاص شان اور پایہ کے بزرگ تھے۔'' (رود کوثر، ص۳۵۳)

شیخ عبدالوہاب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ اور ان کے استاد شیخ علی متقی ہماری مذہبی تاریخ میں بڑی باعزت جگہ کے مستحق ہیں۔'' (رود کوثر، ص۳۵۲)

غیر معمولی شہرت ومقبولیت: اپنے گوناگوں اوصاف ومحامد، پاکیزہ زندگی، عمدہ سیرت، علمی کمالات اور تصوف واحسان میں بلند درجہ ومرتبہ کی وجہ سے شیخ علی متقی کو چہار دانگ عالم میں بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہوگئی تھی، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ ان کا آوازۂ شہرت ملاءِ اعلیٰ تک بلند تھا(۳) ان کے سیرت نگار فاکہی کا بیان ہے کہ مکہ معظمہ میں ان کی ایسی دھوم مچی ہوئی تھی کہ لوگ مشعر حرام اور صفا کی طرح ان کے قصد وارادہ سے ان کے پاس

---

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۴۵۔ (۲) النور السافر، ص۳۱۵ و ۳۱۷۔ (۳) مآثر الکرام، ج۱، ص۱۹۳۔

آتے تھے اور ان پر پروانوں کی طرح نچھاور ہوتے تھے، یہاں تک کہ سلطان روم تک ان کا آوازۂ شہرت پہنچ گیا تھا۔(۱)

مکہ سے کہیں زیادہ وہ ہندوستان .... میں مشہور تھے، سلطان بہادر گجراتی کے زمانہ میں جب انہوں نے سرزمین ہند میں قدم رکھا تو جس طرف جاتے لوگ ان پر اسی طرح پلے پڑتے اور ٹوٹے پڑتے تھے جیسے شمع پر پروانے گرتے اور ٹوٹتے ہیں۔(۲)

امراوسلاطین سے تعلقات: پہلے کئی بار ذکر آچکا ہے کہ سلطان بہادر اور سلطان محمود شیخ علی متقی سے بڑا عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے اور ان کی ہر قسم کی مالی امداد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے، جب مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہاں ان کی شہرت بڑھی تو رومی بادشاہ سلیمان ابن سلیم بن بایزید کو بھی اس کی خبر ہوئی جو اس وقت پوری دنیائے اسلام کا فرمانروا تھا، اس نے شیخ کے پاس خط لکھ کر دعا کی درخواست کی اور مدۃ العمران سے روابط وتعلقات قائم رکھے۔(۳)

جب شیخ پہلی دفعہ گجرات آئے تو اس وقت سلطان بہادر وہاں کا فرمانروا تھا، وہ شیخ کے اوصاف وکمالات سن چکا تھا اس لیے ان کا بہت گرویدہ تھا اور ملاقات وحاضری کے لیے بے قرار تھا، مگر وہ اس سے ملنے سے گریز کرتے رہے، اس لیے اس نے ان کے عقیدت مند قاضی عبداللہ سندھی کو درمیان میں ڈالا، ان کی سعی وسفارش کے بعد بادشاہ کی تمنائے ملاقات برآئی (۴) اس کے بعد اس نے جو عزت افزائی اور قدردانی کی، اس کا حال پہلے تحریر کیا جاچکا ہے۔

سلطان محمود ثانی تو ان کا مرید ہی تھا، اس کے دور حکومت میں وہ دو بار گجرات تشریف لائے، اس نے مکہ معظمہ میں شیخ کے لیے مکان تعمیر کرایا تھا اور خانقاہ کے مصارف بھی وہی پورا کرتا تھا، اس نے اس پر ایک جائداد وقف کی تھی جس سے خانقاہ کے واردین و

(۱) النور السافر، ص ۳۱۷۔ (۲) اخبار الاخیار، ص ۲۴۴۔ (۳) ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۳۱۶۔ (۴) اخبار الاخیار، ص ۲۴۴۔

صادرین کا خرچ چلتا تھا۔(۱)

سلطان محمود شیخ کا اس قدر عقیدت مند تھا کہ ان کے لیے خود وضو کا پانی لاتا اور ان کے ہاتھوں اور قدموں کو دھلاتا (۲) شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں کہ وہ برابر ان کی خدمت میں آیا کرتا لیکن غیر مسنون لباس میں ہوتا اس لیے شیخ اس کی جانب نہ نگاہ اٹھاتے اور نہ التفات ہی فرماتے، ایک روز وہ صلحا کے لباس میں آیا تو شیخ کو خوشی ہوئی اور انہوں نے اس کی طرف نگاہ التفات فرمائی، بادشاہ نے اپنی طرف میلان دیکھ کر گھر تشریف لے چلنے کی درخواست کی جسے انہوں نے منظور کرلیا، بادشاہ خود ڈولا اپنے کندھے پر رکھ کر انہیں گھر لایا اور اعزاز واکرام کیا۔(۳)

بعض عہدوں پر متمکن ہونا اور الزامات سے متہم ہونا: شیخ عبدالوہاب متقی کا بیان ہے کہ ایک بار شیخ علی متقی کو خیال ہوا کہ عدل وانصاف کا بہت ثواب ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اسی نیت سے منصب عدالت پر فائز ہونا چاہا، اس سے یہ امتحان اور تجربہ بھی مقصود تھا کہ دنیا کی مشغولیت کے ساتھ باطن کی اصلاح وتربیت کا کام سکون اور دلجمعی کے ساتھ انجام پاسکتا ہے یا نہیں؟ سلطان محمود گجراتی چوں کہ ان کا نہایت معتقد تھا اس لیے اسے جب اس ارادہ کی خبر ہوئی تو اس نے بہت غنیمت جانا اور اسے اپنے نظام سلطنت کی سعادت خیال کیا، چنانچہ شیخ کرسی عدالت پر رونق افروز ہوگئے مگر پاجی ملازمین نے اس کی وجہ سے ان پر رشوت کا الزام عائد کردیا اور بادشاہ کو بھی اس کی خبر کردی کہ شیخ دیانت وتقوی کے باوجود رشوت لیتے ہیں، عدل وانصاف کے بجائے افراط وتفریط سے کام لیتے ہیں مگر اس نے باور نہیں کیا تو مخالفین نے یہ کہنا شروع کیا کہ شیخ کے ساتھی رشوت لیتے ہیں اور وہ اس سے واقف ہونے کے باوجود کوئی داروگیر نہیں کرتے، جب شیخ کو پتہ چلا کہ بادشاہ کو اس قسم کی خبریں پہنچی ہیں تو وہ کچھ روز تک تو اس معاملہ کو درست کرنے میں لگے رہے مگر جب

(۱) ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۳۱۶۔ (۲) النور السافر، ص ۱۴۷ و ظفر الوالہ، ج ۱۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۲۴۷ و ۲۴۸۔

مگر جب انہیں اندازہ ہوا کہ معاملہ سلجھ نہیں رہا ہے تو ایک روز عدالت کے چبوترے سے اپنا عصا لیے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے، دوستوں کو سلام کیا اور دوڑتے ہوئے چل دیے اور فرمایا کہ یہ دونوں کام ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے، عاقبت بخیر ہونی چاہیے۔(۱)

اسی قسم کا ایک اور واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

شیخ علی متقی جب دوسری مرتبہ گجرات تشریف لائے اور سلطان محمود سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت مسرور ہوا، چند روز بعد شیخ نے اس سے کہا تمہیں معلوم ہے کہ میں یہاں کس لیے آیا ہوں، اس نے کہا ارشاد ہو، شیخ نے فرمایا مجھ پر کشف ہوا ہے کہ تمہارے امور و احکام کو میزان شریعت پر تولوں، جو اس کے موافق ہوں وہ باقی رہیں، سلطان اس کے لیے رضامند ہو گیا اور وزیروں کو حکم دیا کہ تمام معاملات میں شیخ کی جانب رجوع کریں، شیخ نے کئی دنوں کے غور و فکر کے بعد ان احکام و اعمال کو باقی رکھا جو شریعت کے مطابق تھے اور جو خلاف شریعت تھے انہیں موقوف کر دیا، اس کی وجہ سے تعطل اور ابتری پیدا ہو گئی اور نظام سلطنت بھی درہم برہم ہونے لگا۔(۲)

شیخ نے پرانے عمال و امرا کو نظر انداز کر کے ان کے معاملات سے واقفیت اور پیش آمدہ امور کی تحقیق اور چھان بین کا کام شیخ چیلہ کے سپرد کر دیا جو ان کے بہت قابل اعتماد مرید اور ان کی دانست میں نہایت عفیف، پاک دامن، زاہد و مرتاض شخص تھے مگر بالآخر صحبت کے اثر نے اپنا کام کیا اور وزیروں کی سازش رنگ لائی، چنانچہ ایک وزیر کے ایما سے ایک عورت نے شیخ چیلہ کی موجودگی میں ان کی بیوی کو رشوت میں زیور دیا جس کی خبر دینے

(۱) اشعۃ اللمعات فی شرح المشکوٰۃ از شاہ عبدالحق، ج ۳، ص ۲۴۷۔ (۲) مورخ الفی نے شیخ کے طرز عمل اور اس کی وجہ سے کاروبار مملکت میں تعطل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''وہ شیخین (حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ) کے اصول طریقہ کو ایسے زمانہ میں رائج کرنا چاہتے تھے جو شیخین کے زمانہ کی طرح نہ تھا، نیز جن لوگوں سے ان کا سابقہ تھا وہ بھی شیخین کے دور کے لوگوں کی طرح نہ تھے۔'' (ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۳۱۶)

کے لیے وزیر بادشاہ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا آئین و دستور معطل ہو چکا ہے اور معاملات بھی درہم برہم ہوتے جارہے ہیں مگر رشوت جاری ہے، شیخ کی ذات بابرکت ضرور ہے مگر وہ نظم ونسق کے آدمی نہیں ہیں کہ نظام حکومت چلا سکیں، ایک عورت نے ان کے وکیل اور نائب کو رشوت دی ہے، سلطان ٹیک لگائے ہوئے تھا، یہ سنتے ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، پھر عورت سے واقعہ کے متعلق دریافت کیا، اس نے اقرار کیا مگر جب شیخ چیلہ سے پوچھا تو انہوں نے انکار کیا، بادشاہ نے انہیں اور عورت کو آمنے سامنے بلا کر دریافت کیا، عورت نے اس قدر وثوق سے بات کہی کہ سلطان کو پورا یقین ہو گیا، اس کے بعد اس نے سب معاملات سابق بدستور وزیر کے سپرد کر دیے۔

جب یہ سارا واقعہ شیخ کو معلوم ہوا تو انہوں نے مکہ واپس جانے کا قصد کیا اور اسی وقت سر کیج روانہ ہو گئے، بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے واپسی کے لیے بار بار آدمی بھیجے مگر شیخ نے واپس آنے سے انکار کر دیا، جب امرائے کبار بھی بادشاہ کی طرف سے بلانے کے لیے پہنچے تو انہوں نے ان کے سامنے دنیا کے بارہ میں وارد حدیثیں اور بزرگوں کے اقوال بیان کرنا شروع کیا، یہ امرا وہاں موجود ہی تھے کہ خود بادشاہ بھی پہنچ گیا اور اس نے قیام کے لیے اصرار کیا اور کہا کہ اس سے ملک میں بھی برکت ہوگی اور وہ خود بھی برکت اندوز ہوگا، جواب میں ارشاد فرمایا کہ مکہ کو اللہ نے شرف بخشا ہے، دعا کی قبولیت کے لیے وہ زیادہ موزوں اور مناسب جگہ ہے، تمہارے لیے بھی یہاں کے مقابلہ میں وہاں کی دعا زیادہ سازگار اور نفع بخش ہوگی، یہ پرانا مقولہ ہے کہ:

ان الدین والدنیا ضرتان لا تجمعان — دین ودنیا سوکنیں ہیں جو یکجا نہیں رہ سکتیں۔

میں نے اسے ممکن خیال کر لیا تھا، اس لیے یہ تجربہ کرنا چاہا تھا اور اسی لیے مکہ سے یہاں آیا تھا لیکن تجربہ وامتحان نے ثابت کر دیا کہ یہ سوکنیں جمع نہیں ہوں گی، میرے آنے کا مقصد پورا ہو چکا ہے، اس لیے اب بیت اللہ کا قصد اور اس کے جوار میں عمر گزارنا ضروری ہو گیا ہے۔

یہاں میری نیابت کے لیے عبدالصمد موجود ہیں، اللہ نے انہیں رشد وہدایت کی توفیق بھی بخشی ہے اوران میں دعا کی اہلیت بھی ہے، تم لوگ ان سے دعا کرانا، میں تم کو انابت الی اللہ اور سارے معاملات میں اسی کی جانب رجوع ہونے کی وصیت کرتا ہوں، قانون شریعت کو نافذ کرنے اور ارباب شریعت کا اعزاز کرنے اور صلحا کی صحبت اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں۔

اس کے بعد رخصت ہوکر اور الوداعی سلام کر کے کھوکہ کے بندرگاہ گئے اور وہاں سے مکہ چلے آئے۔(۱)

غیرت وخودداری اور عدم مداہنت: سلاطین وامرا سے ربط وتعلق کے باوجود شیخ نہ ان کی بیجا رعایت اور نامناسب لحاظ کرتے تھے اور نہ ان کی وجہ سے دین وشریعت کے معاملہ میں کوئی مداہنت کرتے تھے بلکہ ان کے غیر شرعی اعمال، منکرات اور غیر مسنون لباس پر نکیر اور ناگواری بھی ظاہر کرتے تھے جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

شیخ میں بڑی غیرت وخودداری اور حد درجہ استغنا وبے نیازی تھی، اس لیے امرا کے ہاں جانے سے گریز کرتے مگر وہ خود حصول برکت کے لیے ان کی خدمت میں آتے، ایک دفعہ گجرات کے ایک وزیر نے انہیں برکت کے لیے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی، فرمایا کہ ہمیں اس سے معاف رکھو، ہم یہیں سے تمہارے لیے برکت کی دعا کریں گے، مگر جب زیادہ اصرار ہوا تو ارشاد ہوا کہ تین شرطیں منظور ہوں تو میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔

۱۔ میں جہاں چاہوں گا بیٹھوں گا، مخصوص اور نمایاں جگہ بیٹھنے کی فرمائش نہ کی جائے۔

۲۔ کسی خاص چیز کو کھانے کے لیے مجبور نہ کیا جائے، ہمیں جو پسند ہوگا وہی کھائیں گے۔

---

(۱) ظفر الوالہ، ج۱، ص۳۱۶ تا ۳۱۹۔

۳۔ جب میرا جی چاہے گا اٹھ کر چلا آؤں گا، مزید رکنے کے لیے اصرار نہ کیا جائے۔

اس نے یہ تینوں شرطیں منظور کر لیں تو فرمایا کہ انشاء اللہ کل آؤں گا، چنانچہ دوسرے روز اکیلے تھیلے میں اپنے یہاں کے نانپارے لے کر اس کے گھر تشریف لے گئے اور دروازے کے قریب بیٹھ گئے، اس نے شاہی اہتمام کیا تھا اور پر تکلف فرش بچھائے تھے، اس لیے وسط میں نمایاں جگہ بیٹھنے کے لیے اصرار کیا، فرمایا میں نے تو پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ جہاں چاہوں گا بیٹھوں، وزیر چپ ہو گیا، اس نے انواع واقسام کے کھانے پکوائے تھے مگر شیخ نے انہیں تناول فرمانے کے بجائے اپنے تھیلے سے نان پارے نکالے اور انہی کو کھانا شروع کیا، اس نے پھر اصرار کیا کہ فلاں کھانا چکھ لیں، فرمایا میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ جو چاہوں گا وہی کھاؤں گا، کسی چیز کے کھانے کے لیے مجھے مجبور نہ کیا جائے گا، اس کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے اور رخصت ہو کر چلے آئے اور کہا کہ یہ بھی پہلے ہی طے ہو چکا ہے کہ جب چاہوں گا چلا آؤں گا۔(۱)

وفات: ۲ جمادی الاولی ۹۷۵ھ کو منگل کے دن طلوع سحر کے وقت مکہ معظمہ میں وفات پائی، اس وقت عمر تقریباً ۹۰ برس کی تھی اور معلاۃ میں ایک پہاڑ کے دامن میں حضرت فضیل بن عیاضؒ کی قبر کے بالمقابل دفن ہوئے، دونوں قبروں کے درمیان ایک عام شاہراہ تھی اور یہ جگہ ناظر الجیش کہلاتی تھی۔(۲)

وفات اور مرض الموت کے زمانہ کے متعدد خوارق بیان کیے جاتے ہیں، یہاں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے، شاہ عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''مکہ میں مردے کو کسی ولی یا صالح بزرگ کی قبر میں دفن کرنے کا دستور تھا، چنانچہ امام عبداللہ یافعی حضرت فضیل بن عیاض کی قبر میں مدفون ہیں، شیخ کی وفات کے بعد یا چودہ برس بعد ان کے بھتیجے کے لڑکے شیخ احمد کا

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۶۔ (۲) النور السافر، ص ۳۱۵۔

انتقال ہوا تو انہیں شیخ کی قبر میں دفن کیے جانے کی تجویز کی گئی، اس غرض سے ان کی قبر کھودی گئی تو جسم مبارک کفن میں اپنی اصلی خشک حالت میں جوں کا توں موجود تھا، حالانکہ مکہ کی زمین کی خصوصیت یہ ہے کہ تین یا چار مہینے میں مردہ خاک ہو جاتا ہے اور اس کے جسم کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔''(۱)

تصنیفات: شیخ علی متقی کا بیشتر وقت درس و تدریس اور لوگوں کی اصلاح و تربیت میں بسر ہوتا تھا، اس کے علاوہ تصنیف و تالیف سے بھی انہوں نے مدۃ العمر سروکار رکھا، حدیث اور تصوف سے ان کو خاص مناسبت تھی، ان کی اکثر کتابوں کا تعلق انہی فنون سے ہے، شاہ عبدالحق صاحب تصنیف و تالیف میں ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کی تصنیفات دیکھ کر عقل حیران اور ششدر رہ جاتی ہے اور اس بات پر یقین محکم ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کی خاص برکت اور توفیق کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا..... ان کی بعض کتابیں سالکان طریقت اور طالبان آخرت کے لیے بیش قیمت سرمایہ اور ان کے حال کے لیے معین و مددگار ہیں۔''(۲)

شیخ کی تصنیفات کی تعداد سو سے متجاوز بتائی جاتی ہے مگر اب اکثر ناپید اور معدوم ہیں، جن کتابوں کا علم ہو سکا ہے ذیل میں ان کے بارہ میں دستیاب معلومات پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ **البرهان في علامات المهدي آخر الزمان:** اس میں حضرت مہدی موعود کے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں، علامہ سیوطی نے اس موضوع پر ایک کتاب ''العرف الوردی فی اخبار المهدی'' لکھی تھی جو امام ابونعیم کی کتاب الاربعین کا خلاصہ ہے، شیخ علی متقی کی یہ تصنیف سیوطی کی کتاب کی تلخیص اور اس کی از سرِ نو تہذیب و تدوین ہے جس میں کچھ نیا مواد بھی بڑھایا ہے اور اضافہ میں سیوطی کی جمع الجوامع اور عقد الدرر فی اخبار المهدی المنتظر سے امام مہدی کے بارہ میں روایتیں نقل کی ہیں جن کا رمز ''ج'' اور ''ع'' مقرر کیا ہے۔

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۵۰۔ (۲) ایضاً، ص ۲۴۲۔

شیخ علی متقی نے یہ کتاب اس زمانہ میں لکھی تھی جب ہندوستان میں محمد جونپوری نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا تھا، اس کی وجہ سے عرب و ہند میں یہ مسئلہ معرکۃ الآرا بنا ہوا تھا، شیخ مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

''محمد جونپوری یقیناً مہدی نہیں ہیں، وہ ایک خدا رسیدہ بزرگ اور ولی ہو سکتے ہیں، بعض اوقات ولی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے، معصوم صرف پیغمبر ہوتے ہیں۔''

یہ کتاب مندرجہ ذیل تیرہ فصلوں میں منقسم ہے:

۱۔معجزات حضرت مہدی ۲۔ان کا سلسلۂ نسب ۳۔شکل وصورت ۴۔کن حالات میں حضرت مہدی کا ظہور ہوگا ۵۔علامات ۶۔کس طرح ان کی اطاعت و بیعت کی جائے گی ۷۔ان کے انصار ۸۔فتوحات ۹۔حضرت عیسیٰ سے ملاقات ۱۰۔مدت قیام ۱۱۔موت ۱۲۔ان لوگوں کا ذکر جنہوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ۱۳۔علمائے مکہ ومدینہ کا فتویٰ۔

علامہ سیوطی کی کتاب ترتیب ابواب وغیرہ سے معرا تھی، شیخ علی نے اس کو ابواب وتراجم پر مرتب کیا ہے، اس نئی تہذیب وتدوین کے بعد کتاب نے دوسرا جامہ پہن لیا ہے۔(۱)

ریاست رام پور کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا جو کرم خوردہ تھا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے اسے ۹۲۴ھ میں مرتب کیا تھا۔(۲)

۲۔**تبیین الطرق الی اللہ تعالیٰ:** مصنف کے بیان کے مطابق یہ ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے(۳) شاہ عبدالحق صاحب محدث فرماتے ہیں کہ اس کی تصنیف کے وقت انہیں غیب سے الہام ہوتا تھا(۴) حافظ محمود خاں شیرانی کے کتب خانہ میں اس کا ایک مخطوطہ موجود ہے۔(۵)

---

(۱) معارف دسمبر ۴۷ء، ص ۴۲۸۔(۲) فہرست کتب عربیہ ریاست رام پور، جلد دوم، ص ۱۳۹۔(۳) النور السافر، ص ۳۱۹۔(۴) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔(۵) مخطوطات شیرانی، ص ۲۰۶۔

۳۔**جوامع الکلم فی المواعظ والحکم:** یہ سلف صالحین کے پند ونصائح اور مواعظ و حکم پر مشتمل ایک مفید رسالہ ہے، اس میں درج حکم و مواعظ کی تعداد تین ساڑھے تین ہزار بتائی جاتی ہے، اس کے قلمی نسخے مندرجہ ذیل کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

بانکی پور پٹنہ میں اس کے تین نسخے ہیں، رام پور کے کتب خانہ میں دو قلمی نسخے ہیں جس میں ایک مصنف کے قریب العہد ۹۸۷ھ کا اور دوسرا ۱۲۶۱ھ کا ہے، اول الذکر ۳۵۶ صفحے کا اور مؤخر الذکر ۳۸۰ صفحے کا ہے (۱) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی سبحان اللہ اورنٹیل لائبریری میں ۱۷۵ اوراق کا ایک نسخہ ہے جو ۱۰۳۹ھ کا لکھا ہوا ہے (۲) حیدرآباد اور پشاور کے کتب خانوں میں بھی اس کے قلمی نسخے موجود ہیں (۳) اس کی ابتدا مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتی ہے:

الحمد للّٰہ الذی نور قلوب العارفین فاقتبسوا من لوامع کلامہ (۴)

۴۔**غایۃ الکمال فی بیان افضل الاعمال:** مصنف کے بیان کے مطابق یہ ان کی آخری تصنیف ہے، انہوں نے اس کی اور اپنی پہلی تصنیف تبیین الطرق کے متعلق خاص طور پر یہ تلقین وتاکید کی ہے کہ ''جن طالبین کو دونوں میں سے کوئی ایک رسالہ میسر آجائے تو انہیں دوسرے کو بھی حاصل کر کے ان کا ساتھ ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے (۵) اس سے اور کتاب کے نام سے رسالہ کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

۵۔**مجموعہ حکم کبیر:** یہ تصوف کی اہم اور معرکۃ الآرا کتاب ہے جس پر شیخ علی متقی کو خود فخر تھا، شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

> ''یہ بڑی مفید اور نافع کتاب ہے جس میں تصوف کے بارہ میں اس فن کی کتابوں میں جس قدر مواد و مسائل موجود تھے ان کا خلاصہ تحریر کر دیا گیا ہے، خود شیخ اپنے دوستوں سے فرماتے تھے کہ تصوف کا جو مشکل

---

(۱) فہرست کتب عربیہ ریاست رام پور، جلد دوم، ص ۳۳۴۔ (۲) فہرست نسخ قلمی، ص ۱۱۵۔ (۳) محبوب الالباب، ص ۴۷ وفہرست لباب المعارف العلمیہ، ص ۱۸۲۔ (۴) محبوب الالباب، ص ۱۴۸۔ (۵) النور السافر، ص ۳۱۹۔

مسئلہ بھی تمہارے سامنے آئے اس کا اس میں جواب ڈھونڈ لو اور تم لوگوں
سے جو مشکل مسائل دریافت کیے جائیں ان کا جواب بھی اس میں دیکھ لو(۱)
اس سے کتاب کی اہمیت، قدر و قیمت اور جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۶۔ **مختصر النهاية في اللغة:** علامہ ابن اثیر جزری نے حدیث کے مشکل الفاظ ولغات کی تحقیق میں "النهاية في غريب الحديث" کے نام سے بڑی مفید، اہم اور عمدہ کتاب لکھی تھی، بعض اصحاب علم نے اس کے مختصرات تحریر کیے تھے، شیخ علی متقی نے بھی اس کا مختصر لکھا تھا۔(۲)

۷۔ **الوسيلة الفاخرة في سلطنة الدنيا والآخرة:** اس میں سلاطین اور والیان ملک کے واسطے نصائح اور آداب مملکت بہت خوبی سے تحریر کیے گئے ہیں، رسالہ مختصر مگر مفید ہے، رام پور کے کتب خانہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے، ابتدا کی عبارت ملاحظہ ہو:

"الحمدلله رب العالمين...... اما بعد هذه رسالة في نصائح الملوك"(۳)

مولانا حکیم سید عبدالحی رائے بریلوی نے ان کی مندرجہ ذیل تین کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے(۴) ان میں اول الذکر فارسی میں ہے۔

۸۔ **البرهان الجلي في معرفة الولي:**

۹۔ **النهج الاتم في ترتيب الحكم:**

۱۰۔ **رسالة في ابطال دعوىٰ السيد محمد بن يوسف الجونپوري:**

"**الثقافة الاسلاميه في الهند**" میں مولانا نے ردمہدویت کے ضمن میں شیخ علی متقی کی بھی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے، غالباً یہ وہی رسالہ ہے اور اسی میں مہدویت کی تردید کی ہوگی۔

ان کی چند اور کتابوں کے نام بھی بروکلمن وغیرہ نے تحریر کیے ہیں۔

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔ (۲) کشف الظنون، ج ۲، ص ۲۶۔ (۳) فہرست کتب عربیہ، جلد اول، ص ۳۷۷ وجلد دوم، ص ۴۴۰۔ (۴) نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۴۴۔

۱۱۔شئون المنزلات (تفسیر) ۱۲۔الفصول شرح جامع الاصول (حدیث) اس کا قلمی نسخہ بانکی پور میں ہے (برہان فروری ۵۴ء،ص ۸۴) ۱۳۔شمائل النبیؐ (حدیث) اس کا قلمی نسخہ علی گڑھ میں ہے (برہان فروری ۵۴ء،ص ۸۴) ۱۴۔العنوان فی سلوک النسوان (تصوف) ۱۵۔المواہب العلمیہ فی الجمع بین الحکم القرانیہ والحدیثیہ (تصوف) ۱۶۔تبویب الحکم العطائیہ (تصوف) ۱۷۔ زاد الطالبین (تصوف) ۱۸۔ اسرار العارفین (تصوف) ۱۹۔نعم معیار القیاس لمعرفۃ مراتب الناس ۲۰۔فتح الجواد (تصوف) ۲۱۔نظم الدرر (تصوف) ۲۲۔ھدایۃ ربی عند فقد المربی (تصوف) ۲۳۔خلاصۃ الحقائق فی الحکم الدقائق (تصوف) ۲۴۔عمدۃ الوسائل۔

فن حدیث میں ان کی مندرجہ ذیل کتابیں متداول ہیں، یہ سب دراصل علامہ سیوطی کی کتابوں کی ترتیب وتہذیب ہیں۔

۲۵۔ کنز العمال: علامہ سیوطی نے احادیث نبویؐ کے استیعاب کی غرض سے جمع الجوامع کے نام سے ایک ضخیم مجموعہ مرتب کیا تھا جو صحاح ستہ اور مسانید عشرہ پر مشتمل ہے، یہی مجموعہ جامع کبیر کے نام سے بھی مشہور اور دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں حدیث کے اصل الفاظ نقل کیے ہیں اور اس کے ماخذ اور راوی کے نام کی نشاندہی کی ہے، اسے لغوی ترتیب کے موافق حروف معجم پر مرتب کیا تھا اور ایک باب میں ایک سے لے کر دس یا اس سے بھی زیادہ حدیثیں نقل کی ہیں، دوسرے حصہ میں یا تو محض فعلی حدیثیں درج کی ہیں یا قولی اور فعلی دونوں طرح کی حدیثیں درج کی ہیں، یہ حصہ صحابہ کے مسانید پر مرتب کیا گیا ہے اور پہلے اس میں عشرہ مبشرہ کی حدیثیں ذکر کی ہیں، پھر باقی صحابہ کرام کی حدیثیں ناموں اور کنیتوں وغیرہ کے لحاظ سے دی ہیں اور آخر میں مرسل حدیثیں نقل کی ہیں۔

علامہ سیوطی نے جامع صغیر میں اس کے متعلق تحریر کیا ہے کہ میں نے اس میں تمام

حدیثیں جمع کی ہیں لیکن اہل علم نے ان کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ تمام احادیث کا استقصا و استیعاب سخت مشکل ہے، خود جامع صغیر میں ایسی حدیثیں ہیں جو اس میں نہیں آسکی ہیں، اسی لیے بعض لوگوں نے یہ توجیہ کی ہے کہ مصنف اپنے ارادہ کے مطابق اسے مکمل نہ کر سکے ہوں اور ان کی وفات ہوگئی ہو، تاہم یہ واقعہ کہ انہوں نے یہ مجموعہ بڑی محنت شاقہ سے تیار کیا ہے اور اس کے لیے انہوں نے بے شمار کتب احادیث کا مطالعہ کیا تھا۔

شیخ علی متقی کی عظیم الشان کتاب ''کنز العمال'' دراصل علامہ سیوطی کی ''جمع الجوامع'' (جامع کبیر) کی ترتیب و تنقیح اور ماخذ سے نیز جامع صغیر سے ماخذ ہے، ان کا بیان ہے کہ میں نے متعدد ائمہ فن کی کتابیں دیکھیں لیکن ان میں سے کسی کی کتاب کو بھی سیوطی کی جمع الجوامع سے بہتر اور جامع نہیں پایا، انہوں نے صحاح ستہ اور دوسری کتابوں کی حدیثیں بہت عمدہ طریقہ پر جمع کی ہیں اور اس میں گوناگوں فوائد کا اضافہ بھی کیا ہے، مگر اس کے باوجود وہ کچھ بڑے اور اہم فوائد سے خالی رہ گئی تھی، جیسے:

۱۔ اگر کسی شخص کو کسی حدیث کی تلاش ہو اور وہ اس کے مفہوم سے بھی واقف ہو لیکن قولی حدیث کا سرا معلوم نہ ہو اور فعلی حدیث کے راوی کا علم نہ ہو تو اس وقت تک اس کے لیے اس کی تلاش بہت دشوار اور مشکل ہے۔

۲۔ اگر کسی شخص کو بیوع یا نماز یا زکوۃ وغیرہ ابواب کی تمام حدیثوں کا احاطہ مقصود ہو اور وہ ان سے مطلع ہونا چاہے تو ایسا اس کے لیے اسی وقت ممکن ہوگا جب وہ پوری کتاب کا ایک ایک ورق الٹے، ظاہر ہے یہ کس قدر دشوار، مشکل اور وقت طلب امر ہے۔

۳۔ ابواب، تراجم اور فصول وغیرہ کی حیثیت احادیث کی شرح جیسی ہوتی ہے، کیوں کہ بعض حدیثیں مجمل اور بعض مفصل ہوتی ہیں، بعض میں حدیث کا قصہ مذکور ہوتا ہے اور بعض میں اس کا ذکر نہیں ہوتا، چنانچہ جب

میں نے علامہ سیوطی کی کتاب جمع وتبویب کی تو مفصل سے مجمل کی توضیح ہوگئی اور جن حدیثوں میں قصہ وسبب کا ذکر تھا انہوں نے ان حدیثوں کی تبیین ووضاحت کردی جن میں قصہ مذکور نہیں تھا۔

ان ہی امور کو مدنظر رکھ کر میں نے جمع الجوامع کو مرتب ومبوب کیا تا کہ ان فوائد کو بھی ان میں قلم بند کردوں جن سے وہ خالی رہ گئی تھی، میں نے اپنے مجموعہ کا نام کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال رکھا ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ایک بہتر اور کارآمد مجموعہ ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ یہ لوگوں میں بہت مشہور ومقبول بھی ہوا۔ (۱)

شیخ علی متقی نے کنز العمال کو فقہی ابواب پر جامع الاصول (ابن کثیر) کے انداز و اسلوب پر اس قدر خوش اسلوبی سے مرتب کیا ہے کہ یہ احادیث نبوی کا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) بن گئی ہے، ان کی ترتیب وتنقیح کی وجہ سے سیوطی کی کتاب کے مقابلہ میں اس کا فائدہ بھی دو چند ہوگیا ہے اور اس سے استفادہ بھی آسان ہوگیا ہے، اسی بنا پر شیخ ابوالحسن بکری فرماتے تھے کہ:

للسیوطی منة علی العالمین وللمتقی منة علیه (۲)	سیوطی نے (جامع کبیر مرتب کرکے) دنیا والوں پر احسان کیا تھا اور شیخ علی نے کنز العمال ترتیب دے کر خود سیوطی پر احسان کیا۔

شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ:

"کتاب دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ نے اتنا عظیم الشان کام کیسے حیرت انگیز طریقہ پر انجام دیا ہے۔" (۳)

ترتیب وتبویب میں جامعیت وافادیت کو مدنظر رکھنے کے باوجود انہوں نے بڑی احتیاط اور دیانت داری سے کام لیا ہے، یہاں تک کہ علامہ سیوطی کی کتاب کے خطبہ اور

(۱) منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد جلد اول، ص ۳ تا ۵۔ (۲) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔ (۳) ایضاً۔

دیباچہ کو بھی انہوں نے بعینہٖ باقی و برقرار رکھا ہے اور اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی اور بیشی نہیں کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''جو یہ کتاب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے اسے گویا مرتب ومبوب جمع الجوامع حاصل ہوگئی، اس کے علاوہ اسے اس میں بہ کثرت ایسی حدیثیں بھی ملیں گی جو جمع الجوامع میں نہیں ہیں، کیوں کہ مصنف نے خود جامع صغیر اور اس کے ذیل میں ایسی حدیثیں نقل کی ہیں جو اس میں درج نہیں ہیں، اب میں وہ دیباچہ نقل کرتا ہوں جو مصنف نے جامع صغیر، اس کے تکملہ اور جامع کبیر کے شروع میں لکھے تھے تاکہ میں نہ کسی چیز کو ترک کروں اور نہ کسی میں ردوبدل کروں۔''(۱)

فن حدیث میں شیخ علی متقی کی جن تصنیفات کا ذکر آگے آرہا ہے، دراصل کنز العمال ان سب کا مجموعہ ہے، مصنف کا خود بیان ہے کہ:

> ''پھر میں نے اپنی دونوں کتابوں ''غاية العمال في سنن الاقوال'' اور ''مستدرك الاقوال بسنن الافعال'' کو ایک مجموعہ میں اکٹھا کردیا مثلاً کتاب الایمان کو پہلے ''غاية العمال'' سے لکھا جو اسے مستدرک الاقوال سے بھی لکھا اور یہی روش کتاب کے آخر تک قائم اور باقی رکھی ہے اور اس نئے مجموعہ کا نام میں نے ''كنز العمال في سنن الاقوال والافعال'' رکھا ہے۔''(۲)

وہ کنز العمال کی تحریر وتسوید سے ۹۵۷ھ میں فارغ ہوئے اور یہ بڑی تقطیع کی آٹھ جلدوں میں حیدرآباد کے دائرۃ المعارف النظامیہ سے ۱۳۱۲ھ تا ۱۳۱۵ھ میں مولانا وحید الزماں نواب وقار نواز جنگ کی تصحیح کے بعد پہلی دفعہ شائع ہوئی تھی اور اب دوبارہ بھی

(۱) کشف الظنون۔ (۲) منتخب کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد جلد اول، ص ۵۔

وہیں سے چھوٹی تقطیع میں اس کے اجزا شائع ہو رہے ہیں، اس ایڈیشن کی ۱۳ تا ۱۸ جلدیں دارالمصنفین کے کتب خانہ میں آگئی ہیں۔

۲۶۔ منتخب کنز العمال: شیخ علی متقی نے خود اپنی کتاب کنز العمال کا ایک خلاصہ مرتب کیا تھا جس کا انہوں نے ''منتخب کنز العمال'' نام رکھا، یہ منتخب بھی حدیث کا ایک مفید، عمدہ اور پاکیزہ مجموعہ ہے، گو اس میں زوائد اور مکررات حذف کر دیے گئے ہیں (۱) تاہم اس میں بھی ہر باب کی حدیثیں آگئی ہیں۔ (۲)

انہوں نے منتخب کنز العمال مرتب کرنے کی یہ وجہ تحریر کی ہے:

> ''کنز العمال کی ترتیب کے وقت مجھے اندازہ ہوا کہ سیوطی کی جامع کبیر کی حدیثیں حروف و مسانید پر مرتب کیے جانے کی وجہ سے بہ کثرت مکرر ہوگئی ہیں اور قولی و فعلی حدیثوں کے اضافے ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط بھی ہو گئے ہیں، اس کی وجہ سے حدیث کے طالب علموں کو مکررات اور اضافوں کا پتہ نہیں چلتا، گو بسط و فضل کے جویا لوگوں کے لیے یہ زبانی اور تکرار فائدہ سے خالی نہیں ہے، تاہم عام لوگوں کی کم ہمتی وغیرہ کی وجہ سے میں نے ارادہ کیا کہ ان کو اس طرح حذف کر دوں کہ کوئی اہم بنیادی اور معنی خیز بات ترک نہ ہونے پائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ کے بعد جب میں نے انتخاب و تلخیص کا کام شروع کیا تو تقریباً پندرہ ہزار حدیثیں حذف ہوگئیں جو اصل کتاب کا ایک تہائی حصہ تھیں۔
>
> حذف و اختصار میں یہ امر مدنظر رہا ہے کہ جس قولی حدیث کو مصنف نے کسی سبب یا مراجعت وغیرہ کے خیال سے فعلی حدیثوں میں ذکر کیا ہے تو میں نے اس کو قسم اقوال کے بجائے صرف قسم افعال میں نقل کیا ہے لیکن

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔ (۲) محبوب الالباب، ص ۲۰۱۔

ایسا اسی وقت کیا ہے جب حدیث کا معنی و مفہوم اسی سبب یا مراجعت وغیرہ پر موقوف رہا ہو اور اگر معنی اس پر موقوف نہیں تھا تو میں نے اسے قسم الافعال میں اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ اس کے لفظ و معنی قسم اقوال میں مذکور ہو چکے ہیں اور اگر دو حدیثیں معنی و مفہوم کے لحاظ سے مجھے برابر اور یکساں ملی ہیں تو میں نے ان میں سے صرف مختصر کو لے لیا ہے اور اگر وہ اختصار میں بھی یکساں ہیں تو میں نے ان میں سے زیادہ صحیح حدیث کو نقل کرنا پسند کیا ہے۔

بعض جگہ مکرر اور معنی حدیثیں اس لیے نقل کی گئی ہیں کہ اس باب میں حدیثوں کی تعداد کم تھی یا لوگوں کو ان حدیثوں کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔

اس طرز انتخاب کی وجہ سے یہ مجموعہ اصل کتاب یعنی کنز العمال سے فائق اور بہتر ہو گیا ہے کیوں کہ اس میں تکرار باقی نہیں رہی اور قولی و فعلی حدیثیں ساتھ ساتھ جمع ہو گئی ہیں۔''(۱)

صاحب کشف الظنون کو بھی منتخب کی اس خوبی کا اعتراف ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''شیخ علی متقی نے کنز العمال کو جو انتخاب کیا تھا وہ خود ایک جامع، بہتر اور کار آمد چیز ہے۔''(۲)

منتخب کنز العمال مسند احمد بن حنبل کے حواشی پر مطبع میمنہ مصر سے شائع ہو گیا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں چار جلدوں میں موجود ہے۔''(۳)

۲۷۔ **منهج العمال فی سنن الاقوال:** علامہ سیوطی نے جامع کبیر کی طرح جامع صغیر کے نام سے بھی احادیث کا ایک مجموعہ ایک جلد میں مرتب کیا تھا جو دراصل جامع کبیر کا ملخص تھا اور پھر خود ہی اس کا اضافہ و تکملہ بھی ایک جلد میں لکھا، جس کے متعلق وہ یہ تصریح کرتے ہیں کہ:

''میں نے اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزاروں کلمات اور

---

(۱) منتخب کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد بن حنبل، جلد اول صفحات ۶ و ۷۔ (۲) کشف الظنون، ج ۱، ص ۳۹۹۔

(۳) فہرست کتب عربیہ، ج ۱، ص ۱۱۸۔

پند و حکمت پر مشتمل باتیں جمع کی ہیں اور ان کی تخریج میں غیر معمولی کدوکاوش کی ہے مگر اختصار کی وجہ سے چھلکے چھوڑ کر صرف مغز ہی لیا ہے اور اس کو وضعی اور جعلی حدیثوں سے بھی محفوظ رکھا ہے، اس اعتبار سے یہ کتاب اس نوع کی دوسری کتابوں سے بہت بڑھ گئی ہے اور یہ گوناگوں فنی وحدیثی فوائد پر مشتمل ہے، اسے میں نے طلبہ کی آسانی کے خیال سے حدیث کے ابتدائی الفاظ کے لحاظ سے حروف معجم کی ترتیب پر مرتب کیا ہے اور اس کا نام الجامع الصغیر اس لیے رکھا ہے کہ یہ جمع الجوامع (جامع کبیر) کا مقتضب ہے۔''(۱)

شیخ علی متقی نے منہج العمال میں جامع صغیر اور اس کے زوائد کو ابواب وفصول پر اچھے طرز پر مرتب کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ:

''جامع صغیر اور اس کا ضمیمہ وتکملہ چوں کہ قولی حدیثوں کا عمدہ، کارآمد اور جامع ذخیرہ ہے، اس لیے مجھے اس کی حدیثوں کو ابواب وفصول پر مرتب کرنے کا خیال ہوا، اس کی ترتیب بھی حروف تہجی کے مطابق جامع الاصول کے اسلوب پر کی ہے اور کنز العمال کی طرح اس میں بھی مکمل احتیاط ودیانت ملحوظ رکھی ہے، چنانچہ اصل اور ضمیمہ دونوں کے دیباچے اور رموز بعینہٖ اسی طرح ذکر کیے ہیں جس طرح سیوطی نے املا کرائے ہیں، غرض حتی الامکان اس کی پوری کوشش کی ہے کہ دونوں کی کوئی چیز چھوٹنے نہ پائے۔''(۲)

اہل نظر نے شیخ علی متقی کے اس کارنامے کی بھی بڑی تحسین کی ہے، ان کا خیال ہے کہ ''یہ کتاب اتباع سنت کے لیے نہایت عمدہ راہنما ہے۔''(۳)

منہج العمال کا ایک قلمی نسخہ ۱۲۴۲ھ کا لکھا ہوا ۶۰۹ صفحے کا رام پور کی رضا لائبریری

(۱) منتخب کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد، ج۱، ص۴و۵ وکشف الظنون، ج۱، ص۳۷۶ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی، ص۱۳۷۔ (۲) اتحاف النبلاء، ص۱۶۲۔ (۳) لباب المعارف العلمیہ پشاور، ص۶۵۔

میں موجود ہے جو ابتدا سے باب النذر تک ہے اور حدیثوں کی تعداد ۱۵۷۵۸ ہے۔(۱)

اس کے بعض حواشی بھی لکھے گئے ہیں، رام پور کے کتب خانہ میں بھی اس کا ایک قلمی حاشیہ موجود ہے جو ۳۸۸ صفحہ کا ہے مگر اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں، یہ نسخہ کسی قدر کرم خوردہ ہے، اس میں قولہ سرخی سے اور باقی تمام کتاب سیاہی سے لکھی ہوئی ہے، منہج کی عبارت قولہ کے بعد کے نقل کی گئی ہے، محشی نے حمد و نعت کے بعد مشکل مقامات کو حل اور مجمل اقوال کی تشریح کی ہے، رام پور کی فہرست کتب عربیہ میں اس کے آغاز و اختتام کی عبارتیں بھی درج کی ہیں۔(۲)

مولانا نجیب بن قاسم چندراوتی احمد آبادی نے بھی اس کا حاشیہ لکھا تھا جس کی اس کے مقدمہ میں صراحت کی ہے کہ ''میں ۲۹ رمضان المبارک ۹۵۶ھ کو احمد آباد میں اس کی تحریر و کتابت سے فارغ ہوا'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حواشی مصنف کی زندگی میں لکھے گئے تھے، کچھ بعید نہیں کہ وہ مصنف کے شاگرد بھی ہوں۔

منہج العمال کا قلمی نسخہ جس پر یہ حواشی ہیں جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں ہے، یہ نسخہ محشی کے بھانجے قاضی عبداللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کا سنہ کتابت ۹۸۶ھ ہے۔(۳)

۲۸۔الاکمال: اس میں جوامع الجوامع (جامع کبیر) کی بقیہ قولی حدیثوں کو مبوب کیا ہے، اسی لیے اس کا نام الاکمال لمنہج العمال بھی ہے۔(۴)

۲۹۔غایۃ العمال فی سنن الاقوال: یہ منہج العمال اور الاکمال دونوں کا مجموعہ ہے۔(۵)

۳۰۔مستدرک الاقوال بسنن الافعال: اس میں جامع کبیر کی فعلی حدیثوں (قسم الافعال) کی ترتیب و تبویب کی گئی ہے۔(۶)

---

(۱) فہرست کتب عربیہ رام پور، ج۱ص۱۱۹۔ (۲) ایضاً، ج۲ص۱۹۷۔ (۳) رسالہ برہان فروری ۱۹۵۴ھ مضمون ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات از مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی۔ (۴) منتخب کنز العمال بر حاشیہ احمد، ج۱ص۴ وفہرست کتب خانہ خدیویہ مصر، ج۱ص۴۳۳۔ (۵) کشف الظنون، ج۱ص۳۹۹۔ (۶) ایضاً۔

شیخ محمد بن طاہر

(متوفی ۹۸۶ھ/ ۱۵۷۸ء)

نام: محمد نام اور جمال الدین یا مجد الدین لقب تھا (۱) تذکروں میں ان کا نام محمد بن طاہر اور محمد طاہر دو طرح سے لکھا ہے، حضرت شاہ عبدالحق دہلویؒ جو شیخ محمد بن طاہر کے ہم عصر ہیں اور بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے ان کا نام محمد طاہر لکھا ہے لیکن ان کے دوسرے معاصر علامہ محمد غوثی شطاری، آزاد بلگرامی اور کئی دوسرے ارباب تذکرہ نے محمد بن طاہر لکھا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ صرف طاہر کسی تذکرہ نگار نے نہیں لکھا ہے، اس سے اس قدر تو واضح ہو ہی جاتا ہے کہ ان کا نام طاہر نہیں تھا، اب جہاں تک محمد طاہر کے مرکب نام کا سوال ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ واقعۃً مرکب نام ہے کیوں کہ ناموں کے ساتھ تبرکاً محمد لکھنے کا جو رواج اب ہو گیا ہے وہ پہلے یا کم از کم دسویں صدی ہجری تک نہیں تھا، پہلے محمد اور احمد وغیرہ خود مستقل نام ہوتے تھے، اس بنا پر شیخ کا اصلی نام محمد ہی ہے اور طاہر ان کے باپ کا نام ہے، اس مسئلہ پر مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم نے اچھی طرح بحث کی ہے، ذیل میں اس کا خلاصہ ملاحظہ ہو:

۱۔ عرب قوم میں مرکب نام کا دستور نہیں تھا اور ہوتا بھی تھا تو عبدالوہاب، عبداللہ اور عبدالرشید کے طرز کا اور اب تک بوہروں میں اس کا رواج نہیں ہے، البتہ ہندوستانی مسلمان

(۱) النور السافر، ص ۳۶۱ و شذرات الذہب، ج ۸، ص ۴۱۰ والرسالۃ المستطرفہ، ص ۱۴۴۔

اپنے ناموں کے ساتھ محمد کا لفظ برکت کے خیال سے لگا دیتے ہیں، بخلاف اس کے بوہروں میں اگر کسی کے نام کے ساتھ محمد اضافہ کر دیا جائے تو اصل نام تو اس کے باپ کا سمجھا جائے گا اور محمد جو تبرکاً لگایا گیا ہے خود اسی کا نام سمجھا جائے گا، یعنی جیسے محمد طاہر کہنے پر محمد ان کا اور طاہر ان کے باپ کا نام متصور ہوگا، اس لیے جن تذکرہ نگاروں نے ان کا نام محمد طاہر لکھا ہے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ محمد طاہر ان کا مرکب نام ہے بلکہ محمد ان کا اور طاہر ان کے والد کا نام ہوا۔

۲۔ تاریخ فرشتہ میں محمد بختیار خلجی کا نام موجود ہے جس نے بہار و بنگال کو فتح کیا تھا، حالانکہ اس کا صحیح نام محمد بن بختیار ہے، ٹھیک اسی طرح فاتح سندھ محمد بن قاسم کا صحیح نام محمد بن قاسم ہے مگر عموماً اسے محمد قاسم ہی لکھا جاتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن کو حذف کر کے باپ بیٹوں کا نام لکھنے کا رواج غیر عربوں میں موجود ہے، چنانچہ گجرات میں آج بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ باپ اور بیٹوں کے نام بغیر ابن کے ہوتے ہیں جیسے احمد اسماعیل بوٹا والا، عبداللہ احمد نتھا میاں ولی اللہ وغیرہ۔ (۱)

اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ شیخ نے خود اپنی کتابوں میں اپنا نام محمد بن طاہر ہی لکھا ہے۔ (۲)

ان وجوہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا اصل نام محمد تھا اور طاہر ان کے والد بزرگوار کا نام تھا، پس جن لوگوں نے محمد طاہر لکھا ہے اس کی حیثیت محمد قاسم اور محمد بختیار جیسے ناموں کی ہے۔

نسب وقومیت: عام تذکرہ نگاروں نے ان کا نسب صرف دادا تک لکھا ہے، یعنی محمد بن طاہر بن علی، مگر تاریخ گجرات کے مشہور عالم مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم نے ان کا حسب ذیل شجرۂ نسب تحریر کیا ہے جو خود شیخ کے ایک خاندانی بزرگ سے ان کو دستیاب ہوا تھا:

”محمد بن طاہر بن علی بن الیاس بن ابوالنصر داؤد بن ابوعیسیٰ عبدالملک بن

---

(۱) مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی، ص ۱۱۱ و ۱۱۲۔ (۲) دیباچہ تذکرۃ الموضوعات، ص ۳ و دیباچہ قانون الموضوعات، ص ۲۳۰۔

ابوالفتح یونس شامی مؤلف جامع القصص ابن عمر شامی صاحب البدایہ والنہایہ
بن عبداللہ بن ابوالعطا حسین مفتی بن ابوالحامد احمد غریب بن ابوقاسم محمد بن
ابوالصلاح محمد بن ابوالفیض عبداللہ بن ابوالرضا عبدالرحمٰن بن ابوالبقا قاسم
البر (؟) محمد عباس بن ابوالنصر محمد طیفور شامی بن ابوالمجد خلف بن ابوالمجد
احمد بن ابوالوجود شعیب بن ابوطلحہ بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر صدیق
صاحب رسول اللہ۔(۱)

اس شجرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نسباً صدیقی تھے اور ان کے آباواجداد کا تعلق عرب سے تھا، اس کے ثبوت میں چند اشعار بھی پیش کیے جاتے ہیں جو ان کے پوتے اور ممتاز عالم وفقیہ شیخ عبدالقادر بن شیخ ابوبکر (متوفی ۱۱۳۸ھ) کے استاذ شیخ عبداللہ طرفہ انصاری نے کہے تھے، وہ فرماتے ہیں:

قد کان جد ابیک بل ضریحه
من اوحد العلماء و الفضلاء
اعنی محمد بن طاهر من منجی
الصدیق حقه بغیر مراء (۲)

ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے پردادا کی قبر کو خدا سیراب کرے، وہ یکتائے روزگار علما وفضلا میں تھے، یعنی محمد بن طاہر بلا شک وشبہ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی نسل سے تھے۔

لیکن انہیں عام طور پر ہندنژاد اور بوہرہ قوم کا فرد خیال کیا جاتا ہے، ان کے معاصر شاہ عبدالحق دہلویؒ کا یہی خیال ہے، علامہ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

''جمہور کا اتفاق ہے کہ شیخ محمد بن طاہر کا تعلق بوہرہ قوم سے تھا،

(۱) مقدمہ تذکرہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص۱۰،۱۱۔ (۲) اتحاف النبلاء، ص۳۹۸۔

شیخ عبدالحق دہلویؒ نے بھی اخبار الاخیار میں اسی کی تصریح کی ہے۔''(۱)

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ صدیقی کیوں کہلاتے ہیں؟ اس کے جواب میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ نسبت عقیدہ کے اعتبار سے ہے، کیوں کہ فرقہ شیعہ اپنے کو حیدری کہتا تھا، اس کے مقابلہ میں یہ اپنے کو صدیقی کہتے تھے۔(۲)

نواب صدیق حسن خاں صاحب نے جمہور کے خیال کو مرجح بتایا ہے اور اس کی خاص وجہ یہ بتائی ہے کہ نسب ماں کی طرف سے نہیں چلتا بلکہ باپ کی جانب سے چلتا ہے، مگر وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ طرح کے اشعار سے قطعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن طاہر ماں یا باپ کسی ایک جانب سے صدیقی ضرور تھے، تاہم ان کے نزدیک صحیح ترین بات یہی ہے کہ وہ بوہرہ تھے، حالات الحرمین میں درج ہے کہ شیخ محمد طاہر بوہروں میں سے تھے۔(۳)

شیخ محمد بن طاہر نے خود اپنی کتاب تذکرۃ الموضوعات میں اپنے کو ہندی نژاد قرار دیا ہے:

فقد قال اضعف عباد القوی الولی	قوی اللہ کے بندوں میں سب سے ضعیف
محمد بن طاهر بن علی الفتنی الهندی	محمد بن طاہر عرض کرتا ہے جو سکونت اور نسب
مسکنًا و نسبًا (۴)	کے لحاظ سے پٹنی اور ہندی ہے۔

قانون الموضوعات کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں:

فیقول افقر عباد اللّٰه الغنی محمد بن	غنی اللہ کے بندوں میں زیادہ محتاج محمد بن
طاهر بن علی الهندی الفتنی (۵)	طاہر بن علی ہندی پٹنی عرض کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ خود اپنے کو ہندی الاصل اور بوہرہ قوم کا فرد سمجھتے تھے، آزاد بلگرامی اور بعض دوسرے اہل علم نے ان کو نومسلم ہندوستانی بتایا ہے۔

(۱) مآثر الکرام، ج۱، ص۱۹۶۔ (۲) ایضاً۔ (۳) اتحاف النبلا، ص ۳۹۸، ۳۹۹۔ (۴) دیباچہ تذکرۃ الموضوعات، ص۳۔ (۵) ایضاً، ص۲۳۰۔

وكان رحمه الله من البوهرة المتوطنين بگجرات الذين اسلم اسلافهم على يدا الشيخ على الحيدرى المدفون بكنبايت ومضى لاسلامهم نحو سبع مائة سنة (١)	شیخ محمد بن طاہر ان بوہروں کی نسل سے تھے جو گجرات میں آباد تھے اور جن کے اسلاف شیخ علی حیدری کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے، شیخ حیدری کھمبایت میں دفن ہیں اور بوہرے تقریباً سات سو برس سے مسلمان ہیں۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے شیخ کی نسل وقومیت کے بارہ میں دو مختلف رائیں سامنے آتی ہیں، پہلی رائے کے مطابق وہ عربی النسل اور صدیقی النسب تھے اور دوسری رائے یہ ہے کہ وہ نومسلم ہندی الاصل اور گجرات کے بوہروں کی قوم سے تعلق رکھتے تھے، ان کا عربی النسل ہونا ثابت نہیں۔

گو یہ رائیں بظاہر مختلف معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقۃً ان میں تضاد نہیں، شیخ کا بوہرہ ہونا ان کے صدیقی النسل اور عربی الاصل ہونے میں مانع نہیں ہے کیوں کہ بوہروں میں خالص ہندوستانی اور نومسلم بھی تھے اور بعض عرب کے بجائے دوسرے ملکوں سے آکر ان میں شامل ہو گئے تھے اور بعض بوہرے خالص عربی بھی تھے، مولانا ابوظفر ندوی مرحوم گجرات کی تاریخ کے ماہر اور مشہور مسلم عالم ہیں، انہوں نے بوہرہ قوم کی اصلیت پر طویل بحث کر کے آخر میں لکھا ہے:

> ''خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بوہرہ قوم ایک ایسی جماعت ہے جو مختلف نسلوں اور قوموں کا مجموعہ ہے، اس میں سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی، خالص عرب بھی ہیں اور خالص ہندی بھی، ایرانی بھی ہیں اور عراقی بھی، قدیم الاسلام بھی ہیں اور جدید الاسلام (نومسلم) بھی، تاجر بھی ہیں اور غیر تاجر بھی، غرض یہ بوہرہ مختلف قوموں اور نسلوں کا مجموعہ ہے۔'' (۲)

(۱) بحوالہ مقدمہ بحار الانوار از مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ص ب۔ (۲) مقدمہ تذکرہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۲۷۔

اس توجیہ کے بعد شیخ کو بوہرہ قوم کا فرد ہونے کے باوجود صدیقی اور عربی بھی کہا جاسکتا ہے۔

گجرات میں بوہرہ قوم کی بڑی آبادی تھی، ان لوگوں کا ذریعہ معاش تجارت اور صنعت وحرفت تھا، اس لیے انہیں بوہرہ کہتے ہیں جو ہندی لفظ بیوپار سے بنا ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ بوہرہ عربی لفظ ہو، قاموس میں ہے:

بهراء قبيله وبهرة بالفم بنواحي المدينة باليمامة	بہراء ایک قبیلہ کا نام ہے اور بہرہ مدینہ اور یمامہ کے نواح میں رہتے ہیں۔

صراح میں ہے کہ بہرا قبیلہ قضاعہ کی ایک شاخ کا نام ہے، مشہور مؤرخ مسعودی ۳۰۳ھ میں بھروچ اور کھمبایت کی سیاحت کے لیے آیا تھا، اس کا بیان ہے کہ چیمور (متصل بمبئی) میں علاوہ بغداد اور بصرہ کے دس ہزار بیاسرہ مسلمان ہیں اور قاموس میں بیاسرہ کے یہ معنی لکھے ہیں کہ ''بیاسرہ سندھ میں ایک قوم ہے جن کو ناخدا کرایہ پر دشمنوں سے لڑنے کے لیے رکھتے تھے اس کا واحد بیسرہ ہے۔''

ابتدا میں جو تاجر جہازوں پر ان لوگوں کو نوکر رکھ کر ہندوستان لاتے تھے ممکن ہے انہی کو بیاسرہ کہنے لگے ہوں اور پھر یہ لفظ صرف ان لوگوں کے لیے مستعمل ہونے لگا ہو جو عرب سے آکر یہاں مقیم ہو جاتے ہوں اور رفتہ رفتہ ان کی اولاد (ہند میں پیدا ہونے والی) کے لیے مخصوص ہو گیا ہو۔

غرض بوہرہ کے معنی عام تاجر کے لیے جائیں یا اس سے مراد عرب سے آنے والے تاجر ہوں یا ان کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے ہو، ہر صورت میں بلا تفریق مذہب ونسل یہ لفظ زیادہ تر مسلمان تاجروں کے لیے استعمال ہوا اور عرب تاجر (مسلمان) کا ہندوستان میں پہلی صدی ہجری سے آنا مسلم ہے۔(۱)

(۱) مقدمہ تذکرہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۱۷ تا ۱۹۔

بوہرہ قوم کے دو مشہور فرقے تھے، چھوٹی جماعت کو شیعہ اور بڑی کو سنی کہتے تھے، شیعہ بوہرے اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، یہ فرقہ اسماعیل بن امام جعفر صادق کو امام مانتا ہے اور دوسرے ائمہ کا منکر ہے، یہ لوگ تقیہ کرتے ہیں اور اپنے عقائد کو انتہائی حد تک پوشیدہ رکھتے ہیں، شیخ محمد بن طاہر کا تعلق بڑی جماعت یعنی اہل سنت والجماعت سے تھا۔(۱)

ولادت ووطن: مشہور قول کے مطابق شیخ محمد بن طاہر ۹۱۳ھ میں پٹن میں پیدا ہوئے (۲) مگر شیخ کے پوتے شیخ عبدالوہاب نے لکھا ہے کہ ۹۱۴ھ میں پیدا ہوئے (۳) پٹن کی نسبت وہ فتنی (پٹنی) کہلاتے ہیں، یہ گجرات کا قدیم دارالخلافت تھا جو نہروالہ بھی کہلاتا تھا، مؤرخ مکہ صاحب الاعلام بالاعلام بیت اللہ الحرام قطب الدین محمد بن احمد النہروالی (متوفی ۹۹۰ھ) اسی کی جانب منسوب ہیں (۴) یہ قدیم آبادی جو احمد آباد سے پہلے گجرات کے بادشاہوں اور راجاؤں کا پایۂ تخت تھا، اس کی پرانی آبادی جو شہر پناہ کے اندر تھی ویران ہوگئی، قلعہ بھدر کا دروازہ اور برج بطور آثار کے باقی رہ گئے ہیں، جدید آبادی احمد آباد سے تقریباً نوے میل پر مغرب اور شمال کے درمیان ہے۔(۵)

عام مؤرخین کا خیال ہے کہ پٹن کے بانی بن راج چوڑا کے ایک ساتھی انہل نامی شخص کے انتخاب پر یہ زمین پسند کی گئی تھی اور اسی کے نام پر انہل واڑا مشہور ہوئی جسے عربی مصنفین نے اپنے لہجہ کے مطابق نہروالہ کر دیا، مگر آخری عہد میں لوگ اسے صرف پٹن کہتے تھے کیوں کہ ہندو راجدھانی یا بڑے شہر کو پٹن کہتے تھے، جیسے پاک پٹن، سومناتھ پٹن وغیرہ، پنجاب میں پاک پٹن موجود ہے اس لیے اس کو لوگ گجرات پٹن کہتے تھے۔(۶)

شیخ کا زمانہ: شیخ کی ولادت سے سو برس قبل ہی پٹن سے تعلق خاندان کی حکمرانی کا

(۱) اتحاف النبلاء، ص۳۹۹۔(۲) النور السافر، ص۳۶۱۔(۳) رسالہ مناقب، اردو ترجمہ، ص۸۹۔(۴) الرسالۃ المستطرفہ، ص۱۲۴ ومقدمہ بحار الانوار مولانا اعظمی ۔(۵) تاریخ احمدی، ص۲۳۲۔(۶) مقدمہ تذکرۂ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص۱۴۱ بحوالہ مرآۃ احمدی، ج۱، ص۲۶، کلکتہ۔

خاتمہ ہو چکا تھا اور پٹن کی سلطنت آزاد ہو چکی تھی، شیخ کی ولادت کے وقت پٹن کا حکمران محمود اعظم عرف بیگرہ تھا(۱)، ۹۱۸ھ میں اس کی وفات ہوگئی، اس کے بعد متعدد فرمانروا یکے بعد دیگرے تخت حکومت پر متمکن ہوتے رہے، یہاں تک کہ ۹۸۰ھ میں اکبر بادشاہ دہلی نے گجرات فتح کر کے اسے اپنے ممالک محروسہ میں شامل کرلیا، اس طرح پٹن کی آزاد سلطنت ختم ہوگئی اور گجرات بھی ہندوستان کا ایک صوبہ بن گیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ کا دور بڑا پر آشوب تھا، وہ سلطان محمود بن لطیف خاں کے زمانہ میں مکہ معظمہ سے واپس آئے تھے، یہ خانہ جنگی کا زمانہ تھا، سلطان تخت نشینی کے وقت بہت کم سن تھا اس لیے زمام حکومت امرائے دولت کے ہاتھ میں تھی اور ان میں اقتدار کے لیے باہم سخت رسہ کشی جاری تھی اور ہر طرف شورش وانتشار برپا تھا، ملک میں امن وامان مفقود تھا، اہل علم ان حالات سے سخت پریشان تھے کیوں کہ سکون و جمعیت خاطر کے ساتھ علمی و تعلیمی کام انجام دینے کا موقع میسر نہیں تھا، علامہ محمد بن طاہر نے اس زمانہ کے ابتر حالات اور ارباب حکومت کے ظلم وجور کا اپنی بعض تصنیفات میں کہیں کہیں ذکر کیا ہے، لیکن جب گجرات ممالک محروسہ میں شامل ہوگیا تو سیاسی استحکام پیدا ہوا اور خانہ جنگی وانتشار کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

شیخ کے زمانہ میں ہندوستان میں اسلامی علوم کے چھ بڑے مرکز تھے:

۱۔ دہلی ۲۔ پنجاب ۳۔ پورب یعنی جونپور، الٰہ آباد اور لکھنؤ کا علاقہ ۴۔ گجرات ۵۔ سندھ ۶۔ برہان پور۔

گجرات میں سب سے زیادہ شہرت شیخ محمد بن طاہر پٹنی (۱۵۷۸ء) اور علامہ وجیہ الدین گجراتی (متوفی ۱۵۹۰ھ) نے پائی۔(۲)

تحصیل علم: ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، بلوغ سے قبل ہی قرآن مجید حفظ کرلیا تھا، اس کے

(۱) تاریخ گجرات کے مشہور فاضل مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم نے صحیح لفظ بیگوو بتایا ہے (تذکرہ محمد بن طاہر، ص ۴۳)۔(۲) رود کوثر، ص ۳۹۰، ۳۹۲۔

بعد دوسرے فنون کی جانب متوجہ ہوئے، انہوں نے طلب علم میں بڑی سعی و محنت کی اور اس میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا، پندرہ برس کی عمر میں معقول و منقول اور اصول و فروع میں اس درجہ کمال حاصل کیا کہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے فاضل و کامل خیال کیے جانے لگے، اسی زمانہ سے درس بھی دینے لگے تھے، مؤرخین کا بیان ہے کہ گجرات میں شیخ محمد بن طاہر اور شیخ وجیہ الدین سے زیادہ ممتاز کوئی آدمی نہ تھا۔(۱)

اساتذہ: شیخ محمد بن طاہر کے زمانہ میں گجرات ایک بڑا علمی مرکز تھا، خود ان کے وطن نہروالہ (پٹن) میں علوم و فنون کا چشمہ جاری تھا، قدیم پایہ تخت ہونے کی وجہ سے یہاں اصحاب علم و فن اور صوفیہ و مشائخ کی بڑی تعداد موجود تھی، اس لیے سب سے پہلے شیخ نے اپنے وطن ہی کے علما و فضلا اور ارباب کمال کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، ان کے یہاں کے اساتذہ میں سے جن لوگوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

مولانا شیخ ناگوری۔ شیخ برہان الدین سمہودی۔ مولانا یداللہ سوہی۔ ملا متھ یا مٹھ

یہ چاروں بزرگ گجرات کے علمائے کبار میں رہے ہوں گے، شیخ محمد بن طاہر نے ملا مٹھ کی خدمت میں تعلیم ختم کی، ان کا لقب استاد الزماں تھا، یہ پٹن کے ایک بہت بڑے عالم تھے، ان کا اصلی نام معلوم نہ ہو سکا، انہوں نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔

علامہ محمد بن طاہر پٹنی اسی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے، ان کے علاوہ اور بہت سارے لوگ اس مدرسہ سے فیض یاب ہوئے تھے، شیخ عبدالوہاب کا بیان ہے کہ جب عارف ربانی شیخ متھ کا انتقال ہوا جو شیخ محمد بن طاہر کے ہندوستانی استاد تھے اور جن سے آخری درجہ کی سب کتابیں پڑھی تھیں تو ان کے کوئی لڑکا نہ تھا جو جانشین ہوتا، اس بنا پر شیخ ہی کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا۔(۲)

---

(۱) النور السافر، ص ۳۶۱ و ۳۶۲ و ترجمہ رسالہ مناقب، ص ۸۹۔ (۲) تذکرہ شیخ محمد بن طاہر، ص ۲۹، حاشیہ یاد ایام، ص ۵۵، گجرات کی تمدنی تاریخ، ص ۱۹۸، ترجمہ رسالہ مناقب، ص ۹۴۔

شیخ محمد بن طاہر اپنے وطن میں تعلیم مکمل کرنے اور کتب متداولہ سے فراغت کے بعد حرمین تشریف لے گئے اور وہاں کے مندرجہ ذیل بزرگوں سے فن حدیث کی تحصیل کی:

شیخ ابوالحسن بکری، علامہ احمد بن حجر ہیثمی، شیخ احمد بن حجر مصری مکی صاحب صواعق محرقہ، شیخ علی بن عراق، شیخ جاراللہ بن فہد مکی، شیخ عبداللہ عیدروس مدنی، شیخ علی مدنی، شیخ برخوردار سندھی، شیخ عبیداللہ حضرمی، شیخ ابی عبیداللہ زبیدی۔

مکہ معظمہ ہی میں شیخ اجل علی متقی ہندی کی بارگاہ فضل وکمال میں بھی ان کی رسائی ہوئی اور ان سے خاص طور پر استفادہ کیا، اپنی کتاب مجمع بحارالانوار کی ابتدا میں ان کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا ہے، یہ عقیدت اور تعلق اس قدر بڑھا کہ ان سے بیعت بھی ہوئے۔(۱)

تلامذہ: شیخ کا دائرۂ فیض بھی بہت وسیع تھا اور وہ طلبہ کی مالی امداد بھی کرتے تھے، ان کے فیاضانہ سلوک کی وجہ سے ان کے یہاں طالب علموں کا ہجوم لگا رہتا تھا، ان کے پوتے شیخ عبدالوہاب نے ان کے حالات میں رسالہ مناقب لکھا تھا، اس میں ان کے حسب ذیل شاگردوں کے نام درج ہیں:

ابوالبشر محمد فضل، شیخ ضیاء الدین بن شیخ محمد غوث گوالیاری، ابوالفتح میاں احمد خاں پٹنی، شیخ داؤد بن شیخ حسن، برہان الدین واعظ محمد اسحٰق، میاں جلال ......بن جھن (شاہ عالم) محمد حسن، نور محمد حسن، عبدل بن فتح اللہ سارنگپوری، شیخ محمد شطاری، شیخ جیون سورتی، شیخ حسین سورتی، شیخ عبدالہادی احمد آبادی، شیخ فرید کاسب پٹنی، شیخ عبدالنبی صدرالصدور (بعہد محمد اکبر بادشاہ دہلی)

ان ناموں کے گنانے کے بعد وہ لکھتے ہیں "ان کے علاوہ بے شمار دوسرے بزرگ بھی شاگردوں میں داخل ہیں جن میں سے کچھ مشہور کچھ غیر معروف ہیں، طوالت کے خیال سے حذف کردیا۔(۲)

---

(۱) اخبارالاخیار، ص۲۶۴، مآثر الکرام، ص۱۹۴، النورالسافر، ص۳۶۲، اتحاف النبلاء، ص۳۹۸۔ (۲) رسالہ مناقب اردو ترجمہ، ص۹۳و۹۴۔

حرمین کا سفر اور حج بیت اللہ: اوپر گزر چکا ہے کہ کتب متداولہ کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے حرمین تشریف لے گئے، مؤرخین کے بیان کے مطابق یہ سفر ۹۴۴ھ میں ہوا جب کہ ان کی عمر ۳۰ یا ۳۱ برس تھی، شیخ پہلے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کے بعد قبر نبویؐ کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ گئے، اس کے بعد مکہ معظمہ واپس آ کر علما و مشائخ سے استفادہ کے لیے وہاں مدتوں قیام کیا۔(۱)

ذہانت و فطانت: شیخ نہایت ذہین اور تیز طبع تھے، اس کی وجہ سے انہیں تحصیل علم میں ابتلا اور مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا، تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ "تحصیل علم کے زمانہ میں انہیں طلبہ کی جانب سے سخت صعوبتیں جھیلنا پڑیں، جس مدرسہ میں جاتے وہاں کے طلبہ اور ہم عصر لوگ انہیں دق کرتے، یہ لوگ شیخ سے مباحثہ کی تاب نہ لانے کی وجہ سے ان سے جلتے اور رشک و حسد کرتے اور انہیں طرح طرح سے ایذا دینے کی فکر میں رہتے تھے، بعض اساتذہ کا برتاؤ بھی ان سے اچھا نہ تھا، اس ناگوار صورت حال کی بنا پر انہوں نے اسی زمانہ میں یہ طے کر لیا تھا کہ اگر اللہ نے مجھ کو علم سے بہرہ ور کیا اور درس دینے کے لائق بنایا تو میں رضائے الٰہی کے لیے علم کی نشر و اشاعت کروں گا اور تعلیم میں کسی قسم کے بخل سے کام نہ لوں گا، طالب علموں کی عزت کروں گا اور ان کے ساتھ لطف و شفقت کا برتاؤ کروں گا، کسی کو علم سے محروم نہ رکھوں گا بلکہ بہتے ہوئے چشمہ کی طرح سے ہر شخص کو فیض یاب ہونے کا موقع دوں گا۔(۲)

طلبہ کی امداد اور حسن سلوک: چنانچہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی جب درس و تدریس کے منصب پر فائز ہوئے تو انہیں نذر کی تکمیل کا موقع ملا اور انہیں استفادہ کے معاملہ میں کسی

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۶۴، آثار الکرام، ج ۱، ص ۱۹۴، النور السافر، ص ۳۶۲۔ (۲) النور السافر، ص ۳۶۲ و ترجمہ اردو رسالہ مناقب، ص ۹۲۔

کسی طالب علم کے ساتھ بخل سے کام نہ لیا بلکہ ایسا فیاضانہ سلوک کیا کہ ان کے یہاں علم کے شائق لوگوں کا اژدحام رہتا تھا اور بے شمار طلبہ ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہوتے تھے، وہ طلبہ کے وظائف پر بے دریغ خرچ کرتے تھے، انہیں اپنے والد سے کافی ترکہ ملا تھا، وہ سب طالب علموں کے لیے نچھاور کر دیا تھا۔

شیخ کا یہ بھی طریقہ تھا کہ ذہین اور ذی استعداد طلبہ سے ان کے حالات دریافت کرتے، جو طالب علم غنی اور مالدار ہوتے ان سے کہتے کہ مستعدی اور محنت سے علم حاصل کرو اور جو طلبہ محتاج اور ضرورت مند ہوتے ان سے فرماتے ''معاش کی طرف سے بے فکر رہو، میں تمہاری اور تمہارے متعلقین کی پوری کفالت کروں گا تاکہ تم سرگرمی اور انہماک سے علم حاصل کرو'' غرض جو بھی محتاج اور نادار طالب علم ہوتا اس کے ساتھ وہ یہی معاملہ کرتے تھے اور اس کے لیے باقاعدہ وظیفہ مقرر کر دیتے تھے، اس کی وجہ سے طلبہ کی ایک بڑی جماعت فراغت اور بے فکری سے مختلف علوم وفنون کی ماہر ہو کر نکلتی۔ (۱)

طلبہ کی عام کفالت اور ان کی ضروریات کی فراہمی کے علاوہ شیخ محمد بن طاہر ان کے لیے روشنائی بھی بناتے، اس کی تلقین ان کے شیخ علی متقی نے انہیں کی تھی، چنانچہ پڑھاتے وقت بھی سیاہی بنانے کا سلسلہ جاری رکھتے اور جب تیار ہو جاتی تو اسے طلبہ میں تقسیم کر دیتے۔ (۲)

درس وتدریس: حجاز میں کئی برس قیام کے بعد جب وہ وطن واپس تشریف لائے تو پورے طور پر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہو گئے (۳) انہوں نے اپنے وطن نہر والہ (پٹن) میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس میں ہر قسم کے علوم پڑھائے جاتے تھے، مگر یہ حدیث کی تعلیم کے لیے زیادہ مشہور تھا، وہ اس کے خود مدرس اعلیٰ تھے، ان کے بعد

---

(۱) النور السافر، ص ۳۶۲، رسالہ مناقب، ص ۹۳، شذرات الذہب، ج ۸، ص ۴۱۰۔ (۲) تاریخ احمدی، ص ۱۳۷، اخبار الاخیار، ص ۲۶۴، مآثر الکرام اول، ص ۱۹۴۔ (۳) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۴۔

ان کے لڑکے اور پوتے کے زیر اہتمام یہ مدرسہ عرصۂ دراز تک چلتا رہا، عہد عالمگیر میں جب نیا مدرسہ قائم ہوا تو یہ مدرسہ اسی میں منضم ہو گیا۔(۱)

احمد آباد میں سلطان احمد کی مسجد میں بھی انہوں نے درس دیا تھا، جہاں دوسرے علما و فضلا بھی درس دیتے تھے، اس زمانہ میں دوسرے مدرسوں کے طلبہ بھی حل مشکلات اور بعض مسائل کی تحقیق کے لیے شیخ محمد بن طاہر کے حلقۂ درس میں آتے اور وہ ان لوگوں کی پوری طرح تشفی فرماتے تھے، سلطان محمود ثانی کے ایک وزیر کو ان کے درس کی خبر ہوئی تو وہ بھی ملاقات کے لیے آیا اور چند مشکل امور دریافت کیے جن کا شافی جواب پا کر مطمئن ہو گیا۔(۲)

ان کے درس کی مقبولیت اور شہرت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جب ان کے استاد شیخ مٹھ کا انتقال ہوا جن کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے ان کی جانشینی کا مسئلہ پیش ہوا، لوگوں کا کسی خاص شاگرد پر اتفاق نہ ہوتا تھا، بالآخر لوگوں نے طے کیا کہ ان کی جگہ پر مصلیٰ خالی چھوڑ دیا جائے اور پھر جس کی طبیعت مائل ہو وہ آگے بڑھ کر نماز پڑھا دے، چنانچہ اس وقت شیخ محمد بن طاہر بھی موجود تھے بغیر کسی اشارے کے وہ خود بڑھ کر مصلے پر کھڑے ہو گئے اس سے لوگوں نے یہ سمجھا کہ انہی کو استاد کا جانشین بنانا اللہ تعالیٰ کو منظور ہے، اسی وجہ سے کسی اور شاگرد کو قدم آگے بڑھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔(۳)

ملا مٹھ کی مسند درس پر بیٹھ کر انہوں نے ان کی جانشینی کا حق ادا کر دیا۔

شیخ کا کتب خانہ: شیخ نے اپنے علمی ذوق اور علم وفن سے غیر معمولی اشتغال کی بنا پر ایک بڑا کتب خانہ بھی قائم کیا تھا جو نادر، بیش قیمت اور اہم کتابوں پر مشتمل تھا، اس میں عرب وعجم سے کتابیں منگوا کر جمع کی تھیں، جب تک اس خاندان کے لوگوں کو علم سے اشتغال رہا، کتابیں محفوظ رہیں، پھر آہستہ آہستہ ضائع ہونے لگیں، اب بھی اس کا کچھ حصہ شیخ کے

---

(۱) گجرات کی تمدنی تاریخ، ص ۱۹۹۔ (۲) اردو ترجمہ رسالہ مناقب، ص ۹۹۔ (۳) مقدمہ تذکرہ محمد بن طاہر، ص ۳۳ بحوالہ رسالہ مناقب۔

اہل خاندان اور ورثہ کے پاس باقی رہ گیا ہے مگر کتابیں نہایت خراب حال میں ہیں، اس کتب خانہ میں ان کی تصنیف مجمع بحارالانوار کا ایک قلمی نسخہ بھی موجود ہے جس کو خود انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے مگر کتاب کی کسی اندرونی شہادت سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔(۱)

علم حدیث میں بلند پائیگی: شیخ محمد بن طاہر مروجہ علوم میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، ارباب تذکرہ نے ان کو متعدد فنون میں ماہر و فائق قرار دیا ہے(۲) ان کے علمی تبحر اور فضل و کمال کے متعلق شاہ عبدالحق محدث دہلوی کا یہ بیان نقل کرنا کافی ہوگا کہ ''حق سبحانہ وتعالیٰ اوراعلم وفضل داد'' (۳) لیکن حدیث میں وہ خصوصیت سے بہت ممتاز اور بلند پایہ اور اس فن کے امام تھے، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں ''تکمیل علوم خصوصاً تکمیل علم حدیث پورے طور پر کی (۴) گجرات میں ان کے درجہ ومرتبہ کا کوئی محدث نہ تھا، ان کے اس فضل وکمال کے تمام لوگ معترف ہیں۔

دراصل انہوں نے فن حدیث میں بے نظیر کمال حاصل کیا تھا (۵) اور اپنی زندگی اس مفید اور بابرکت علم کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی، ان کا شمار ہندوستان کے اکابر علما اور افاضل محدثین میں ہوتا ہے، رئیس المحدثین اور ملک المحدثین کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے (۶) ان کے فضل وکمال اور علم حدیث میں خصوصیت و امتیاز کا آوازۂ شہرت ہندوستان سے گزر کر دنیائے اسلام میں بھی بلند ہوگیا تھا۔(۷)

حدیث کے علاوہ لغت اور عربی زبان کے بھی ماہر تھے اور لغوی کہلاتے تھے، اپنے اس کمال کی وجہ سے بھی انہوں نے علم حدیث کی بڑی مفید خدمت انجام دی اور اس کے مشکل الفاظ ولغات کا ایک جامع لغت مجمع بحارالانوار مرتب کی جس کی حیثیت احادیث شرح کی ہے۔

(۱) گجرات کی تمدنی تاریخ، ص۳۲۳ و ۳۲۴۔ (۲) النور السافر، ص ۳۶۲۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۲۶۴۔ (۴) ایضاً۔ (۵) اذکار ابرار، ص ۳۲۲، ترجمہ گلزار ابرار بحوالہ معارف مارچ ۵۵ء۔ (۶) النور السافر، ص ۳۶۱ و الرسالۃ المستطرفہ، ص ۱۲۴۔ (۷) یاد ایام، ص ۵۵۔

انہوں نے صرف احادیث کی شرح وتوضیح اور اس کی علمی خدمت ہی انجام نہیں دی ہے بلکہ حدیث وسنت کی خدمت اور اس کا فروغ واشاعت بھی زندگی کا خاص مقصد تھا، آزاد بلگرامی تحریر فرماتے ہیں:

''خادم حدیث نبوی وناصر سنن مصطفوی است۔''(۱)

حدیث وسنت نبوی کے فروغ وترقی اور بدعات وخرافات کا قلع قمع کرنے کے لیے وہ ہر وقت مستعد اور سرگرم رہتے، اپنی قوم کی اصلاح اور اسے بدعات کی آلودگی سے پاک کرنے اور جادۂ سنت پر استوار رکھنے کے لیے انہوں نے جو مہم چلائی تھی اور جس میں ان کی جان بھی چلی گئی، اس کا ذکر آگے آئے گا۔

مسلک ومذہب: اوپر گزر چکا ہے کہ شیخ کا بوہرہ قوم کے کلاں فرقہ (سنیوں) سے تعلق تھا اور فقہی مذہب حنفی تھا۔(۲)

فیاضی وسخاوت: شیخ کی اخلاقی خوبیوں کے ذکر سے تذکرے خالی ہیں لیکن ان کی جود وسخا، داد ودہش اور فیاضی وسخاوت کا سب ہی تذکرہ نگاروں نے ذکر کیا ہے، ان کے جد بزرگوار علی پٹن کے ایک بڑے تاجر تھے، انتقال کے وقت ان کے پاس اتنی کافی دولت تھی کہ اسے اپنے دو حقیقی لڑکوں میں انہوں نے ترازو میں تول کر تقسیم کیا، شیخ کے والد بھی ایک کامیاب تاجر تھے اور ساری عمر اسی شغل میں مصروف رہے(۳) اس طرح شیخ محمد بن طاہر کو بھی ترکہ میں کافی دولت ملی مگر وہ اسے اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے طلبہ کی امداد واعانت میں صرف کرتے، خود فقر وفاقہ سے گزر اوقات کرتے مگر مخلوق کے ساتھ داد ودہش میں کمی نہ کرتے (۴) اس معاملہ میں ان کے جذبۂ خیر اور فیاضی کا پہلے ذکر آچکا ہے، اس لیے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

---

(۱) مآثر الکرام، دفتر اول، ص۱۹۴۔ (۲) ترجمہ اردو، رسالہ مناقب، ص ۸۸۔ (۳) مقدمہ تذکرۂ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۲۷ و ۲۸۔ (۴) ترجمہ اردو رسالہ مناقب، ص ۹۴۔

صلاح وتقویٰ: وہ صلاح وتقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ تھے، ارباب تذکرہ نے ان کے ورع وصلاح کا ذکر کیا ہے، دینی حیثیت سے ان کے بلند مرتبہ ہونے کا ثبوت وہ خواب بھی ہیں جن کو اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کے اور ان کے شیخ علی متقی کے حال میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے جمعہ ۲۷/رمضان کو خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ سے پوچھا کہ اس زمانہ میں سب سے افضل کون ہے تو آپؐ نے فرمایا تم یعنی شیخ علی متقی! انہوں نے دریافت کیا پھر کون افضل ہے، فرمایا محمد بن طاہر ہندی۔

اسی شب میں شیخ علی متقی کے شاگرد شیخ عبدالوہاب کو بھی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور انہوں نے بھی آپ سے یہی بات دریافت فرمائی تو آپؐ نے ان کو بھی وہی جواب دیا جو شیخ علی متقی کو دیا تھا، شیخ عبدالوہاب اپنا خواب بیان کرنے کے لیے جب اپنے استاد علی متقی کی خدمت میں آئے تو انہوں نے ان کو کچھ کہنے سے پہلے ہی یہ فرمایا کہ میں نے بھی وہی خواب دیکھا ہے جو تم نے دیکھا ہے۔(۱)

رسالہ مناقب میں اس قسم کے اور بھی خواب مذکور ہیں۔

شیخ محمد بن طاہر میں بڑی دینی حمیت اور ایمانی غیرت بھی تھی، سنت کا اتباع اور اس کی ترویج اور رد بدعت ان کی زندگی کا مقصد تھا اور اس معاملہ میں ان کو جس درجہ تشدد تھا اس کا ذکر آگے آئے گا، ان کے پوتے شیخ عبدالوہاب لکھتے ہیں:

> ''حضرت شیخ شرعی احکام اور حدود دین کو قائم رکھنے میں اپنی ہمت صرف فرماتے تھے، کسی حاکم وقت یا طاقتور امیر کا خوف نہ کرتے تھے، وہ خالص خدا کے لیے محبت اور خالص خدا کے لیے عداوت کے قائل تھے، اس بنا پر وہ رسول اللہ کی سنت اختیار کرنے والے سے دوستی اور بدعتیوں سے دشمنی رکھتے تھے۔''(۲)

(۱) النور السافر، ص ۳۱۵ و ۳۱۶ و ۳۶۱۔ (۲) ترجمہ رسالہ مناقب اردو، ص ۹۸۔

مخالفین کا حملہ اور زخم لگنا: شیخ محمد بن طاہر فرقہ مہدویہ کے سخت مخالف تھے اور مہدوی مذہب کو ماننے والے بھی شیخ سے بڑی نفرت کرتے تھے اور ان کے اور اہل سنت مسلمانوں کے در پے آزار رہتے تھے، چنانچہ موسیٰ خاں اور شیر خاں طالب علم بن کر ان کے مدرسہ میں آتے اور موقع کے منتظر رہتے کہ اگر کبھی ان کو تنہا پا جائیں تو قتل کر دیں، چنانچہ ایک روز کوٹھے پر تنہا دیکھ کر وہ دونوں وہاں پہنچ گئے اور تلوار سے ان کے شانہ پر حملہ کیا جس سے شیخ زخمی ہو گئے، یہ لوگ اتر کر بھاگ گئے مگر گھبراہٹ اور جلدی میں ایک شخص زینہ سے اترتے وقت گر گیا اور اس کا سر نالی میں چلا گیا، شیخ کے ایک شاگرد نے بڑھ کر اس کا کام تمام کر دیا اور بھاگ گیا مگر شیر خاں کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس کے پیچھے سوار لگا دیے، سواروں نے احمد آباد کے قریب ایک گاؤں میں اسے پکڑ لیا اور قتل کر دیا۔(۱)

شیخ اس حادثہ کی وجہ سے زخمی ہو گئے لیکن جلد ہی ٹھیک ہو گئے، انہوں نے اپنی کتاب مجمع البحار میں بھی اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''اس وقت جب کہ اسلام کے دشمنوں کے ہاتھوں زخمی ہوا تو ٹانکہ دیتے وقت جراح نے سولہ دفعہ سوئی سے کام لیا اور زخمی ہونے کے دن سے تندرست ہونے تک بیس بائیس روز کے اندر تین دفعہ کے سوا کبھی تکلیف نہیں ہوئی۔''(۲)

جراح روزانہ آ کر مرہم پٹی کر جاتا اور ہر طرح سے خدمت انجام دیتا تھا جس سے بیس پچیس روز میں بالکل ٹھیک ہو گئے۔

قوم کی اصلاح اور رد مہدویت: شیخ محمد طاہر سنت کی اتباع واشاعت اور بدعات کی تردید میں خاص شہرت و امتیاز رکھتے تھے اور اس معاملہ میں بڑے سرگرم تھے، ان کی قوم بوہرہ سنی اور شیعہ دو گروہوں میں بٹی ہوئی تھی، سنی بوہروں میں بھی زمانہ کے اثر اور شیعہ بوہروں

---

(۱) ترجمہ رسالہ مناقب اردو، ص ۹۸۔ (۲) ایضاً، ص ۹۹۔

کے اختلاط کی وجہ سے گوناگوں بدعتیں پھیل گئی تھیں اور دینداری مفقود ہوتی جا رہی تھی، اس زمانہ میں مہدویت کا زور واثر بھی بہت بڑھ گیا تھا، اس کے پیش نظر شیخ بڑی سرگرمی اور نہایت جانفشانی سے بدعت اور مہدویت کے قلع قمع کرنے اور سنت و دینداری کے فروغ اور بول بالا کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئے جس کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے:

شیخ محمد طاہر مکہ معظمہ سے واپسی کے بعد ہمہ تن درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے کام میں لگے ہوئے تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ہر طرف بدعتیں پھیلتی جارہی ہیں اور سنی بوہروں میں بھی غلط رسم ورواج اور خلاف سنت امور جڑ پکڑتے جارہے ہیں اور سیاسی انتشار اور امرائے گجرات کی خانہ جنگی کی وجہ سے مہدویت کا اثر ورسوخ بھی بڑھتا جارہا ہے، یہاں تک کہ پٹن کا حاکم شیر خاں فولادی اور اس کا پورا خاندان مہدویت کا پشت پناہ ہو گیا ہے تو انہوں نے اس کے خلاف جد و جہد شروع کی، وعظ، تقریر اور تحریر ہر طریقہ سے قوم کی اصلاح اور بدعت و مہدویت کے استیصال پر کمربستہ ہو گئے، عقلی ونقلی ہر قسم کی دلیلوں سے عقائد حقہ کا اثبات کیا اور عقائد باطلہ کی تردید کی، اس سلسلہ میں ایک رسالہ نصیحۃ الولاۃ بھی لکھا اور اسے شیر خاں کے پاس بھیجا، اس کے اثر سے کچھ دنوں کے لیے سکون ہو گیا، لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد مہدویوں نے پھر سر اٹھایا جس میں شیر خاں کے خاندان والے زیادہ پیش پیش تھے، اس نے اور موسیٰ خاں نے شیخ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

شیخ بھی چپ رہنے والے نہ تھے، زخمی ہونے کے بعد بھی ان کی سرگرمی میں کمی نہیں ہوئی اور وہ اسی جوش وخروش کے ساتھ برابر مہدویت اور بدعت کے استیصال میں منہمک رہے، بالآخر مہدویوں کی شورش سے تنگ آ کر انہوں نے اپنے سر سے دستار فضیلت اتار دی اور یہ عہد کیا کہ جب تک میری قوم تمام بدعتوں اور ضلالتوں سے تائب نہ ہو جائے گی اس وقت تک میں سر پر عمامہ نہ باندھوں گا۔

وہ اپنی ان کوششوں میں پوری طرح سرگرم عمل تھے کہ ۹۸۰ھ میں اکبر بادشاہ نے گجرات فتح کیا، جب علامہ شیخ محمد بن طاہر سے بادشاہ کی ملاقات ہوئی تو اس نے ان سے برہنہ سر رہنے کا سبب پوچھا، انہوں نے اس کے سامنے حقیقت حال بیان کی تو بادشاہ نے خود ان کے سر پر عمامہ باندھا اور کہا کہ دین کی حفاظت میرا فرض ہے، آپ اپنا کام جاری رکھیں، میں بھی اس میں آپ کی پوری مدد کروں گا، چنانچہ اس نے اپنے رضائی بھائی خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کو گجرات کا گورنر مقرر کیا، یہ راسخ العقیدہ سنی تھا، اس نے اپنے ایام حکومت میں شیخ کی پوری مدد کی اور مہدویت کا زور واثر ختم کرنے میں ان کی مکمل امداد کی، اس کے نتیجہ میں پٹن میں امن وامان ہو گیا اور شیخ محمد بن طاہر مطمئن ہو کر درس وتدریس، رشد وہدایت اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہو گئے مگر کچھ عرصہ بعد خان اعظم تبدیل ہو گیا اور اس کی جگہ عبدالرحیم خانخاناں گورنر ہوا جس کے عہد حکومت میں شیعہ بوہرے پھر دلیر ہو گئے اور ان کی سرگرمیاں بھی تیز ہو گئیں، شیخ نے یہ صورت حال دیکھی تو پھر اپنا عمامہ سر سے اتارا اور آگرہ کا رخ کیا تاکہ بادشاہ کے حضور عرض حال کریں۔

اس ارادہ سے ۹۸۶ھ میں وہ آگرہ کے لیے روانہ ہوئے، پہلے مالوہ پہنچے اور مشہور شہر سارنگ پور میں تین روز قیام کیا، جب وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک گاؤں سوجی پہنچے جو اجین کے قریب تھا۔

دوسری طرف شیخ کی روانگی کی اطلاع پا کر مہدوی فرقہ کے لوگ بھی ان کے تعاقب میں نکلے تاکہ کہیں موقع پا کر ان کا کام تمام کر دیں، چنانچہ ۶ رشوال ۹۸۶ھ کو اسی گاؤں میں جب شیخ تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے تو مہدویوں نے نہایت بے رحمی سے انہیں شہید کر دیا۔(۱)

شاہ عبدالحق صاحب نے اس واقعہ کا اختصار سے ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

”بوہرہ قوم میں مروج بعض بدعتوں کی اصلاح کی اور اس قوم کے

(۱) ترجمہ اردو رسالہ مناقب، ص ۱۰۵ و ۱۰۶ و مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۵۔

اہل سنت و بدعت میں تفریق و امتیاز پیدا کر دیا۔ انہوں نے ازالہ بدعات اور اس علاقہ کے اہل بدعت کی سرکوبی میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، بالآخر انہیں مبتدعین کے ہاتھوں ان کی شہادت واقع ہوئی۔''(۱)

علامہ محمد بن طاہر نے جب آگرہ جانے کا ارادہ کیا تھا تو شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی نے انہیں اشارۃً و کنایۃً مختلف طریقوں سے اس ارادہ سے روکنا چاہا لیکن محمد بن طاہر اپنے ارادہ سے باز نہ آئے، شیخ وجیہ الدین گجرات کے علمائے کبار اور صوفیائے عظام میں تھے، ان کی عظمت و بلند پایگی کا یہ حال تھا کہ حضرت سید محمد غوث گوالیاریؒ کے قتل کا فتویٰ جب سلطان محمود ثالث کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اس کو صرف اس لیے قبول نہیں کیا کہ اس پر علامہ وجیہ الدین کے دستخط نہ تھے، وہ علامہ طاہر کے معاصر تھے اور دونوں میں مخلصانہ تعلقات تھے مگر وہ علامہ طاہر کے اصلاحی خیالات کو مصالح اور تقاضائے وقت کے خلاف سمجھتے تھے اور فرماتے تھے ''اے برادر من! سیاست، فراست کی بات نہیں ہے اور مشغولی حق کے ساتھ ہی ہونا زیبا ہے، نہ خلق کے ساتھ۔''

هذا وان السكوت والتزام البيوت (۲) یہ زمانہ خاموشی اور مکان میں بیٹھ رہنے کا ہے۔

مہدویت کی سرکوبی اور ازالہ بدعات کے علاوہ شیخ کی آگرہ کی روانگی کا یہ سبب بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اکبر بادشاہ کی گمراہی اور بے دینی کی اصلاح کے خیال سے وہاں جارہے تھے، کیوں کہ انہیں پتہ چلا تھا کہ ابوالفضل اور فیضی نے بادشاہ کو گمراہ اور بے دین کر دیا ہے، اسی لیے ان کے قتل کے بارہ ایک روایت یہ بھی منقول ہے کہ جب ابوالفضل اور اس کی پارٹی کو معلوم ہوا کہ علامہ محمد بن طاہر ہمارے جتھے کو منتشر کرنے اور اکبر کو قدیم دینداری کے طریقہ پر لانے کے لیے آگرہ تشریف لا رہے ہیں تو یہ سب لوگ بہت گھبرائے

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۶۴۔ (۲) مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۳۸ و ۳۹ بحوالہ تذکرہ ابرار، ص ۳۲۴۔

کیوں کہ انہیں شیخ کے غیر معمولی فضل و کمال کا اندازہ تھا اور وہ جانتے تھے کہ بحث و مناظرہ میں ان سے پیش نہیں آسکتے اس لیے ان لوگوں نے علامہ موصوف کے قتل کے لیے کچھ لوگوں کو مقرر کردیا جنہوں نے موقع پا کر ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔(۱)

تجہیز و تکفین: اوپر گزر چکا ہے کہ شیخ محمد بن طاہر کی شہادت کا واقعہ ۶ /شوال ۹۸۶ھ کو اجین اور سارنگ پور کے درمیان پیش آیا تھا، لاش وہاں سے پٹن لائی گئی اور آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شیخ نے اپنے جن مرید کے یہاں سارنگ پور میں تین روز قیام کیا تھا ان کا نام شیخ حاجی محمد تھا، انہوں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے مجھ کو شہید کر دیا تم آ کر کفن دفن کرو، چنانچہ وہ اپنے عزیزوں کو لے کر وہاں پہنچے اور جسد مبارک کو سارنگ پور میں لا کر تجہیز و تکفین کی، جنازہ کی نماز بڑی شان سے ہوئی اور کئی دفعہ ہوئی اور شیخ بھکاری کے قبہ میں دفن کیے گئے، اکبر بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے لاش پٹن میں منتقل کر دینے کا حکم دیا، چنانچہ لاش پٹن لائی گئی اور ان کی اولاد نے ایک مشہور تعمیر شدہ گنبد خرید کر اس میں دفن کیا جہاں آج تک لوگ زیارت اور فاتحہ خوانی کے لیے جاتے ہیں۔(۲)

اولاد و احفاد: تاریخ گجرات کے مشہور محقق و فاضل مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم نے شیخ محمد بن طاہر کا مختصر شجرۂ نسب تحریر کیا ہے(۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل چار حضرات ان کی جسمانی یادگار تھے

۱۔ ابراہیم: شیخ محمد بن طاہر کے خلف اکبر تھے۔

۲۔ احمد: رسالہ مناقب کے مصنف قاضی القضاۃ شیخ عبدالوہاب کے والد ماجد تھے۔

---

(۱) مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۷۳ تا ۷۶ (۲) مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی، ص ۷۵-۷۶ و ترجمہ رسالہ مناقب، ص ۱۰۵ و ۱۰۶، مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۵، النور السافر، ص ۳۶۱۔

(۳) مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۸۵۔

۳۔ابوبکر

۴۔نورالحق

ان لوگوں کے حالات نہیں ملے ، البتہ احفاد میں بعض کے نام اور حالات معلوم ہوئے ہیں جن کو یہاں اس خیال سے پیش کیا جاتا ہے کہ شاید آئندہ پھر ان پر لکھنے کا موقع نہ مل سکے۔

شیخ عبدالوہاب: یہ احمد کے بیٹے اور شیخ کے پوتے تھے،ان کی پیدائش اور تعلیم پٹن میں ہوئی ،اصول اور فقہ کی جانب ان کا میلان زیادہ تھا،شاہجہاں کے دور میں پٹن کے قاضی مقرر ہوئے ، عالمگیر کے ایام شاہزادگی میں دکن پہنچے،اس نے بڑی عزت افزائی کی اور جب خود تخت نشین ہوا تو قاضی عسکر بنایا، یہاں ان کا اثر واقتدار بڑھتا گیا،وہ عرصہ تک قاضی کے عہدہ پر فائز رہے، پھر قاضی القضاۃ اور آخر میں اقصی القضات کے عہدہ پر پہنچ گئے۔

شیخ عبدالوہاب دینی معاملہ میں سخت تھے اور کبھی رشوت نہیں لیتے تھے ، بلکہ اپنے مال سے تجارت کے ذریعہ گزربسر کرتے تھے،امراان سے حسد کرتے تھے مگر ان کے غیر معمولی رسوخ واقتدار کی بنا پر ان سے خوف بھی کھاتے تھے،رسالہ مناقب انہی کی تصنیف ہے جس میں اپنے دادا کے حالات وکمالات تحریر کیے ہیں،آخر عمر میں علالت کی وجہ سے پنجاب سے دہلی آئے اور ۱۸ر رمضان المبارک ۱۰۸۶ھ کو وفات پائی (۱) ان کے چار لڑکے تھے جو فضل وکمال اور زہد واتقا میں یگانہ وبے مثال تھے۔

شیخ الاسلام بن شیخ عبدالوہاب: بڑے لڑکے کا خطاب شیخ الاسلام تھا، یہ ابتدا میں دہلی کی قاضی پھر قاضی عسکر ہوئے ، بڑے دیانت دار تھے،اپنے باپ کے ترکہ میں سے کچھ نہ لیا اور اپنا حصہ باپ کے دوسرے وارثوں میں تقسیم کردیا،ان کے حصہ کی مقدار جواہرات اور اثاث البیت کے علاوہ ایک لاکھ اشرفی اور پانچ لاکھ روپے نقد تھی ،باپ کے انتقال کے بعد

---

(۱) مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی ،ص ۷و۸۔

۱۰۸۶ھ میں عالمگیر نے مجبور کر کے انہیں اقضی القضات کا عہدہ عنایت کیا، اس بڑے منصب کے فرائض بھی انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیے، وہ بادشاہ کے سامنے بھی حق کہنے میں دریغ نہ کرتے، مقدمات میں اکثر یہ کوشش کرتے کہ فریقین صلح کر لیں، انہوں نے اکثر مقدمات کا تصفیہ اسی طرح کیا، ۱۰۹۶ھ میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے، واپس آ کر گھر پر بیٹھ رہے اور ملازمت ترک کر دی، عالمگیر ان کی خوبیوں کی وجہ سے ان کا بہت گرویدہ تھا اور ملازمت کی پیشکش بھی کرتا رہتا تھا مگر وہ ہمیشہ انکار کر دیتے تھے، ۱۱۰۹ھ میں اس نے ملاقات کے لیے طلب کیا، اس کا خیال تھا کہ سامنے آنے پر جب کوئی خدمت سپرد کی جائے گی تو انکار نہ کر سکیں گے۔

بادشاہ کی طلب پر وہ روانہ ہوئے مگر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ خداوندا میری اور بادشاہ کی ملاقات نہ ہو، چنانچہ راستہ ہی میں انتقال فرما گئے، شیخ الاسلام کے بھی چار لڑکے تھے:

سراج الدین، اکرام الدین یا اکرام الحق، نورالحق، عبدالحق۔ (۱)

اکرام الحق: یہ صوبہ احمد آباد کے صدر ہوئے، شیخ الاسلام خاں ان کا خطاب تھا، اچھی عمر پائی اور اللہ نے دولت و ثروت سے بھی نوازا، احمد آباد میں کافی صرفہ سے ایک مدرسہ قائم کیا، جس کے ساتھ دارالاقامہ اور مسجد بھی تھی جواب بھی احمد آباد کے محلہ استوریہ قاضی دھابہ میں موجود ہے، یہ مدرسہ اپنے استاد شیخ نورالدین کے سپرد کیا جن کی قبر اسی احاطہ میں آج بھی موجود ہے، شیخ الاسلام آخر عمر میں حج کے لیے تشریف لے گئے، واپسی کے بعد ابتر سیاسی حالات اور مارواڑیوں اور مرہٹوں کے گجرات پر قابض ہو جانے کی وجہ سے وہاں آنے کے بجائے سورت ہی میں مقیم ہو گئے اور یہیں وفات بھی پائی، لاش احمد آباد لائی گئی اور اپنے تعمیر کردہ مدرسہ میں دفن ہوئے۔ (۲)

---

(۱) مقدمہ، تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۸۔ (۲) ایضاً، ص ۸و۹ بحوالہ مآثر الامراو خاتمہ مرأۃ احمدی، مطبوعہ بمبئی۔

نورالحق: قاضی عبدالوہاب کے دوسرے صاحبزادے نورالحق بھی صاحب فضل وکمال اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تھے، عالمگیر کے زمانہ میں محتسب عسکر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔(۱)

عبدالحق: یہ بھی قاضی صاحب کے صاحبزادے اور عہد عالمگیری میں باریاب حضور تھے، وقتاً فوقتاً مختلف عہدوں پر فائز رہے، زیادہ تر شاہی کارخانوں کی داروغگی کے منصب پر مامور رہے، داروغگی انہی امرا کو دی جاتی تھی جن پر بادشاہ کو اعتماد ہوتا تھا۔(۲)

محی الدین: قاضی عبدالوہاب کے بیٹے اور عہد عالمگیری میں عہدہ دار تھے، قاضی القضاۃ بھی ہوئے، ۱۱۰۰ھ میں وفات پائی۔(۳)

شیخ عبدالقادر: یہ ملا محمد بن طاہر کے پوتے اور ان کے صاحبزادے ابوبکر کے بیٹے تھے، علم وفضل، فصاحت وبلاغت اور بالخصوص فقہ وافتا میں یکتائے روزگار تھے، برسوں حرم کے مفتی رہے، ان کی تصنیفات میں چار جلدوں پر مشتمل فتاویٰ کا ایک مجموعہ تھا، وفات ۱۱۳۸ھ میں ہوئی، شیخ عبداللہ طرفہ انصاری ان کے استاد تھے اور انہوں نے ان کی وفات پر مرثیہ بھی کہا تھا، جس میں شیخ محمد بن طاہر کے صدیقی ہونے کی صراحت کی ہے۔(۴)

تصنیفات: گو شیخ محمد بن طاہر آخر عمر میں اپنے وطن کے پرآشوب حالات، بدعتوں کے فروغ اور مہدویت کے زور کی وجہ سے کافی پریشان رہے اور انہیں وہ سکون، دلجمعی اور فراغ خاطر نصیب نہ تھا جو تصنیف وتالیف کے لیے درکار ہوتا ہے، تاہم وہ جب علوم کی تحصیل کے بعد حجاز سے اپنے وطن تشریف لائے تو ان کی تمام تر توجہ علمی کاموں کی جانب ہی مبذول رہتی تھی، مؤرخین کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے علاوہ ان کا مشغلہ کوئی اور نہ تھا(۵) اس سے قطع نظر وہ فطری مصنف تھے، اس لیے انہوں نے بہت سے علمی رسائل اور بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، فن حدیث سے ان کو زیادہ شغف تھا اور اس موضوع پر ان کی کتابیں بے نظیر اور عظیم الشان ہیں جن کی اہمیت ومقبولیت

(۱) یادایام، ص ۷۱۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً۔ (۴) اتحاف النبلاء، ص ۳۹۸۔ (۵) اخبار الاخیار، ص ۲۶۴۔

میں اب بھی فرق نہیں آیا ہے اور ان سے ہندوستان کی طرح حجاز، یمن اور دوسرے عرب ملکوں کے لوگ بھی فیض یاب ہو رہے ہیں، ذیل میں ان کی تصنیفات کے نام دیے جاتے ہیں اور اہم کتابوں پر مختصر تبصرہ بھی قلم بند کیا جاتا ہے:

۱۔ توسل (فن رجال میں ہے)

۲۔ چہل حدیث

۳۔ حاشیہ توضیح وتلویح (نام سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مشہور فقہی کتاب توضیح و تلویح پر یہ حاشیہ لکھا تھا)

۴۔ حاشیہ صحیح بخاری

۵۔ حاشیہ صحیح مسلم

۶۔ حاشیہ مشکوٰۃ المصابیح

(۴ تا ۶) ناموں سے ظاہر ہے کہ صحیحین اور مشکوٰۃ پر مصنف نے حواشی تحریر کیے تھے۔

۷۔ حاشیہ مقاصد الاصول

۸۔ خلاصۃ الفوائد (علم صرف میں ہے)

۹۔ دستور الصرف (یہ بھی صرف میں ہے)

۱۰۔ رسالہ احکام بیر فقہی رسالہ معلوم ہوتا ہے جس میں کنوئیں کے احکام و مسائل درج ہوں گے۔

۱۱۔ رسالہ امساک مطر

۱۲۔ رسالہ فضیلت صحابہ

۱۳۔ رسالہ تحکیہ

۱۴۔ رسالہ نہر دالہ (دشمنوں کے خوف سے رسالہ یکیہ کے نام سے مشہور ہے)

۱۵۔ سوانح نبویؐ عربی زبان میں یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں رسول اللہؐ کی ولادت سے وفات تک کے حالات سال بسال تحریر کیے ہیں۔

۱۶۔ سوانح نبویؐ — اسی قسم کا رسالہ فارسی زبان میں بھی تحریر کیا ہے۔

۱۷۔ شرح عقیدہ — (علم کلام میں ہے)

۱۸۔ طبقات حنفیہ

۱۹۔ عدۃ المتعبدین

۲۰۔ کفایۃ المفرطین — (شافیہ کی شرح اور علم صرف میں ہے) اس کا ایک نسخہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد کے کتب خانہ میں ہے، یہ ۹۶۱ھ کی تصنیف ہے، یہ شرح طالب علموں کے لیے آسان زبان میں لکھی گئی ہے، اس میں اصل میں مذکور مشکل لفظوں کے معنی اور پیچیدہ جملوں کو آسان لفظوں میں حل کیا گیا ہے اور جہاں مصنف نے غیر معروف مثالیں دی ہیں شارح نے ان کو واضح کر دیا ہے۔(۱)

۲۱۔ مختصر اتقان — (علامہ سیوطی کی مشہور تصنیف اتقان کا مختصر ہے)

۲۲۔ مختصر مستظہر

۲۳۔ مقاصد جامع الاصول — (صحاح ستہ کی حدیثوں پر مشتمل ہے)

۲۴۔ منہاج السالکین — (راہ سلوک میں سالکین کو جن احادیث کی ضرورت ہوتی ہے انہیں اس میں پیش کیا ہے۔)

۲۵۔ نصاب البیان — (علم معانی میں)

۲۶۔ نصاب المیزان — (علم منطق میں)

۲۷۔ **نصیحۃ الولاۃ والرعاۃ والرعیۃ:** سلطان محمود حاکم گجرات کی وفات کے بعد شیر خان اور موسیٰ خان فولادی حاکم پٹن خود مختار ہو بیٹھے، یہ دونوں فرقہ مہدویہ کے پیرو تھے اور اہل سنت کو بہت ایذا دیتے اور نقصان پہنچاتے تھے، ان کو اس ظلم و جور سے باز رکھنے کے لیے شیخ نے

(۱) مقدمہ تذکرہ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۸۲۔

یہ رسالہ تحریر فرما کر اس کا حاکموں کے پاس ایک ایک نسخہ بھیجا، اس میں خدا کا خوف، عدل، ظلم وغیرہ کے بعد میٹھے الفاظ میں پندونصائح بھی تحریر کیے۔

یہ تحریر لکھی جا چکی تھی کہ پاکستان کے ایک فاضل محقق ڈاکٹر سلیم اختر کا ایک مقالہ ہماری نظر سے گزرا، ان کو ۱۹۷۹ء میں خط مہران کے ایک مطالعاتی دورے کے دوران خیر پور پبلک لائبریری میں شیخ محمد بن طاہر پٹنی کی مذکورہ بالا کتاب کا ایک قدیم مخطوطہ دیکھنے میں آیا، اس مقالہ میں اس نسخہ کا تعارف اور محمد بن طاہر کے حالات قلم بند کرنے کے علاوہ کتاب کا پورا متن بھی شائع کیا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اسے محمد بن طاہر کی ایک نو دریافت تالیف بتایا ہے اور لکھا ہے کہ:

''شیخ محمد بن طاہر کے آثار کی فہارس میں اس کتاب کا نام تو کجا اس بات کا بھی ذکر نہیں ملتا کہ انہوں نے اس موضوع پر کبھی قلم بھی اٹھایا تھا'' تاہم ان کے شائع کردہ متن میں رسالہ کا نام 'تحفة الولاة ونصيحة الرعية والرعاة '' دیا ہے، ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ خیر پور کی پبلک لائبریری کا مخطوطہ $\frac{1}{2}$ ۱۸ × $\frac{1}{2}$ ۱۰ سم سائز کے ۸۱ صفحات پر محیط ہے اور ہر صفحے پر ۶ سم لمبی تیرہ سطریں ہیں، کتابت خط نستعلیق میں ہے اور عناوین سرخ روشنائی میں مرقوم ہیں، اہم الفاظ وعبارات کی نشاندہی سرخ خطوط سے کی گئی ہے، املا کی بعض خصوصیات بھی ہیں، یہ نسخہ ۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۵ء کا لکھا ہوا ہے، گویا مصنف کی وفات ۹۸۶ھ/ ۱۵۷۸ء کے نصف صدی کے بعد کا نسخہ ہے۔

کتاب کی ابتدا میں حمد ونعت اور منقبت کے بعد مصنف لکھتے ہیں:

''جب اس شاہ شیران اعظم وخانخانان معظم'' نے اپنے بھائی قطب بخوانین مرحوم طاب ثراه وجعل الجنة مثواه کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خلق خدا کے سروں پر سے جباروں اور غمازوں کے دبدبے کو ختم کر کے ان کی آسودگیِ خاطر کے لیے عدل کو عام کرنے، شرعی قوانین کو رواج دینے

وغیرہ کا فیصلہ کیا اور اولوالامر و قضات کی دوستی اور نصیحت کے جذبے نے مجھے اس بات پر ابھارا کہ اس موضوع سے متعلق نبی کریمؐ کی چند احادیث اور ماضی کے فضلا کے کچھ اقوال کو الگ سے لکھا جائے تاکہ وہ متذکرۂ بالا سعی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور قطب مرحوم کی مرضی کے اجرا میں مفید و مددگار ثابت ہوسکیں اور پھر اس مجموعے کے ساتھ علم فراست پر مبنی چند لطائف کا بھی اضافہ کر دیا جائے جو امور سلطنت کی تفویض اور مستحقین کو مختلف مناصب کے اعطا میں ایک ناصح وزیر اور واضح دستور کا کام دیں اور ان سے تمام ارباب نظم و نسق کو فائدہ پہنچے اور وہ ان پر عمل پیرا ہو کر آخرت کی ابدی اور دنیا کی عارضی زندگی کے ثمرات سے بیک وقت کماحقہ بہرہ ور ہوسکیں۔''

مقدمہ کے علاوہ کتاب کے مباحث و مشمولات کی فہرست یہ ہے:

۱۔ فصل در مکارم اخلاق ۲۔ فصل فی فضلہ (عام لوگوں کے مقابلے میں سلطان عادل کی فضیلت) ۳۔ فصل فی خطرہ (اس میں یہ دکھایا ہے کہ اقتدار و بادشاہی جہاں اعزاز کی چیز ہے وہاں اس کے کچھ لوازم بھی ہیں جن کی بجا آوری میں کوتاہی قیامت کے دن سلطان کو گرفتار عذاب بھی کرا سکتی ہے) ۴۔ فصل در سیرت سلاطین سلف (نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ اور خلفائے راشدین کے ذکر میں) ۵۔ فی شرائط السلطنت (بادشاہوں کو کن چیزوں کو کرنا اور کن چیزوں سے بچنا چاہیے) ۶۔ فصل در حقوق رعایا (مسلم و غیر مسلم رعایا کے بادشاہ پر کیا حقوق ہوتے ہیں) ۷۔ فصل در بعض نصائح (سلطان محمد ملک شاہ کے نام امام غزالی کا ایک خط درج کیا ہے)

علامہ محمد بن طاہر کے پوتے شیخ عبدالوہاب نے رسالہ مناقب میں مذکورۂ بالا کتب و رسائل کا ذکر کیا ہے، اب ہم ان کی تصنیفات کا ذکر کریں گے، ان کتابوں کا اکثر مصنفین نے بھی ذکر کیا ہے اور انہی کی وجہ سے علامہ کا درجہ حدیث اور اسماء الرجال وغیرہ

میں بہت بلند ہے۔

۲۸۔المغنی: اسماء الرجال کی مفید اور عمدہ کتاب ہے، تذکروں اور فہرستوں میں اس کا مکمل نام مختلف طور پر درج ہے لیکن خود مصنف نے مجمع بحار الانوار کے مقدمہ میں اس کا نام المغنی فی ضبط الرجال لکھا ہے، اس میں رواۃ و رجال کے ناموں کو ضبط کیا گیا ہے اور ان کی تصحیح کی گئی ہے، شاہ عبدالحق دہلوی فرماتے ہیں:

در رسالہ دیگر مسمی بمغنی کہ تصحیح اسماء الرجال کردہ بے تعرض بہ بیان احوال بغایت مختصر و مفید۔(۱)	دوسرا مختصر رسالہ جو مغنی کے نام سے موسوم ہے، اس میں اسماء الرجال کے ناموں کی تصحیح کی گئی ہے اور ان کے حالات سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے، نہایت مختصر مگر مفید ہے۔

شیخ محمد بن طاہر مجمع بحار الانوار میں رواۃ و رجال کے ناموں اور مقامات کو مکمل طور پر ضبط نہ کرنے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اس پر اصل بحث المغنی میں ہو چکی ہے (۲) اس لطیف و عالمانہ اور عمدہ تصنیف کا اصل مقصد رواۃ کے ناموں کا صحیح تلفظ حروف وحرکات کے ذریعہ ظاہر کرنا ہے، اس لیے اس میں ان کے حالات سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے، آخر میں رسم کتابت پر ایک فصل سپرد قلم کی گئی ہے اور ایک فصل میں علما کی تاریخ پیدائش و وفات کی نشاندہی کی گئی ہے، یہ کتاب متعدد بار چھپ چکی ہے، بعض کتابوں کے ساتھ بھی اور علاحدہ بھی، دہلی سے ابن حجر عسقلانی کی تقریب التہذیب کے حاشیہ پر بھی طبع ہوئی تھی۔

تذکرۃ الموضوعات: یہ کتاب بھی اہم اور محققانہ ہے جو امام شعر کانی اور ملا علی قاری کی اس فن کی تصنیفات سے ضخامت اور حجم میں زیادہ ہے، یہ ۹۵۸ھ کی تصنیف ہے، اس میں موضوع حدیثوں کے علاوہ ان کے بارے میں محدثین اور نقادان فن کے اقوال بھی اس لیے نقل کیے ہیں تاکہ لوگ احادیث کو موضوع، ضعیف یا صحیح قرار دینے میں افراط و تفریط

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۶۴۔ (۲) مقدمہ مجمع بحار الانوار۔

کے بجائے احتیاط سے کام لیں، کیوں کہ غالی اور مفرط قسم کے لوگ محض سنی سنائی باتوں کی وجہ سے حدیث کے موضوع ہونے کا فیصلہ کر دیتے ہیں اور خود غور وفکر سے کام نہیں لیتے، اسی لیے شیخ محمد بن طاہر نے اس کے مقدمہ میں متنبہ کیا ہے کہ اگر کوئی مصنف کسی حدیث کو موضوع بتائے تو جب تک دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق وتائید نہ ہو جائے اس حدیث کو موضوع نہ سمجھا جائے، حافظ ابن جوزی اس فن کے امام سمجھے جاتے ہیں مگر انہوں نے حدیثوں کو موضوع قرار دینے میں افراط سے کام لیا ہے، اسی لیے علمائے فن نے ان پر نقد و تعاقب کیا ہے، علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ ان کی کتاب موضوعات میں ضعیف تو در کنار بہت سی صحیح اور حسن روایتوں کی بھی تخریج کی گئی ہے، علامہ ابن صلاح نے ابن جوزی کی کتاب کی تین سو حدیثوں کے متعلق بتایا ہے کہ یہ موضوع نہیں ہیں، ان میں ایک حدیث صحیح مسلم اور صحیح بخاری کی بھی ہے جو حماد بن شاکر سے مروی ہے اور بقیہ حدیثیں صحاح وسنن کی دوسری کتابوں کی ہیں، احمد بن ابی المجد سے منقول ہے کہ ابن جوزی کا ان روایتوں کو موضوع بتانا درست نہیں ہے، جن کے کسی راوی پر اس قسم کا نقد کیا گیا ہے کہ ''وہ ضعیف یا لین ہے، یا قوی نہیں ہے'' کسی راوی کے بارے میں اس قسم کے کلام کی وجہ سے اس کی روایت کو موضوع سمجھ لینا زیادتی ہے، اس افراط اور تشدد کے مقابلہ میں بعض کوتاہ اور سہولت پسند قسم کے لوگ ہر اس چیز کو جو حدیث کے نام سے بیان کی جاتی ہے صحیح باور کر لیتے ہیں۔(۱)

اس کتاب میں مختلف عنوانات قائم کر کے ان کے تحت موضوع حدیثیں نقل کی گئی ہیں، مصنف نے یہ کتاب بڑی کاوش اور تحقیق سے لکھی ہے اور اس کی تالیف میں متعدد کتابوں سے مدد لی ہے جن کا ذکر بھی دیباچہ میں کیا ہے، مصر سے یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

۳۰۔قانون الموضوعات: یہ کتاب بھی مفید اور اہم ہے، اس میں غیر صحیح، وضاع اور کذاب راویوں کا ذکر ہے، مصنف نے اس میں حروف تہجی کی ترتیب سے ان راویوں کو جمع کیا ہے

(۱) دیباچہ تذکرۃ الموضوعات، ص۳۔

جو موضوع حدیثیں بناتے تھے یا بیان کرتے تھے، آخر میں دو فصلیں کنیت اور نسب میں ہیں، انہوں نے راویوں کے نام کے ساتھ ان کے اوصاف بھی بیان کیے ہیں جن سے ان کا غیر معتبر ہونا واضح ہو جاتا ہے اور کتابوں کے حوالے بھی دیے ہیں، اسے تذکرۃ الموضوعات کے بعد مرتب کیا تھا، وہ خود لکھتے ہیں کہ ''تذکرۃ الموضوعات سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ ضعیف، کذاب، وضاع اور مفتری راویوں کو جمع کر دوں تاکہ اس کی حیثیت موضوع روایات کی معرفت اور ضعیف اور گڑھی ہوئی حدیثوں کے ضبط کے بارے میں ایک کلی قاعدہ وقانون کی ہو جائے۔(۱)

یہ کتاب بھی محنت وتحقیق کا نتیجہ ہے اور تذکرۃ الموضوعات کے ساتھ یہ بھی طبع ہو چکی ہے۔

۳۱۔ مجمع بحار الانوار: اس کتاب کا اصل اور مکمل نام مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل الاخبار ہے، مگر اختصار اور عرف کی بنا پر عموماً لوگوں نے پورا نام لکھنے کے بجائے صرف مجمع البحار لکھا ہے، یہ مصنف کی سب سے اہم اور مہتم بالشان کتاب ہے، ان کا بیان ہے کہ اس کی بنیاد نہایہ ابن اثیر اور ناظر عین الغریبین پر رکھی ہے، یہ ایک جامع لغت ہے جس میں کلام مجید اور حدیث کے مشکل الفاظ کی لغوی تحقیق کی گئی ہے، یہ کتاب اگرچہ مشکل اور غریب الفاظ حدیث کی توضیح کے لیے لکھی گئی ہے اور اس لحاظ سے یہ واقعہ عدیم المثال ہے مگر مصنف نے چونکہ ان حدیثوں کو بھی نقل کر دیا ہے جن میں یہ الفاظ مذکور ہیں، اس طرح یہ حل لغات کے علاوہ حدیثوں کی عمدہ شرح وتفسیر بھی ہے، اسی لیے علمائے فن نے اس کو صحاح ستہ کی شرح بھی کہا ہے، حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

از آنجملہ کتابے است کہ متکفل شرح صحاح است مسمٰی بہ مجمع البحار۔(۲)	ان کی تصنیفات میں ایک کتاب جو صحاح کی شرح کی ضامن ہے اس کا نام مجمع البحار ہے۔

(۱) دیباچہ تذکرۃ الموضوعات، ص۴ و دیباچہ قانون الموضوعات، ص۲۳۰۔ (۲) اخبار الاخیار، ص۲۶۴۔

گلزار ابرار کے مصنف لکھتے ہیں:

''ایک مشکل شرح احادیث کی صحاح ستہ پر ہے۔''(۱)

تاریخ احمدی میں ہے:

''صحاح ستہ کی شرح کو حاوی ہے۔''(۲)

شیخ عبدالوہاب کا بیان ہے:

''جو ایک طرح سے حدیث کی شرح ہے۔''(۳)

اور احادیث کی طرح یہ قرآنی الفاظ کا بھی جامع لغت ہے، اس کی ترتیب مادہ کے حروف پر کی گئی ہے جو اس فن کی کتابوں میں فائق اور عمدہ ہے، نواب صدیق حسن خان صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''یہ عمدہ اور پاکیزہ کتاب قرآن وحدیث کے غرائب کی جامع ہے جس کے پاس یہ کتاب موجود ہو اسے اس فن کی دوسری کتاب کی احتیاج نہیں رہتی۔''(۴)

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی لکھتے ہیں:

''اس میں کلام مجید اور حدیث کے مشکل لغات کا حل اس انداز سے کیا ہے کہ صحاح ستہ کی شرح بھی ضمناً ہوگئی ہے۔''

(مقالات شروانی، ص ۳۹۸)

ڈاکٹر زبید احمد صاحب رقم طراز ہیں:

''شیخ محمد بن طاہر پٹنی کی تصنیف لطیف ہے، اس کو اپنے مرشد کامل شیخ علی متقی کے نام گرامی سے معنون کیا ہے، یہ تصنیف قرآن وحدیث کا

(۱) اذکار ابرار اردو ترجمہ گلزار ابرار، ص ۳۲۲، بحوالہ معارف مارچ ۵۵ء۔ (۲) تاریخ احمدی، ص ۱۳۷۔

(۳) رسالہ مناقب، ص ۹۹۔ (۴) اتحاف النبلاء، ص ۱۳۴۔

جامع لغت ہے، الفاظ کی ترتیب مادہ کے حروف پر ہے، ایک مادہ کے جس قدر حروف قرآن وحدیث میں آئے ہیں ان سب کو ایک جگہ بیان کرتے ہیں اور جن احادیث میں وہ الفاظ آئے ہیں ان کو بھی نقل کرتے ہیں، اس سے پہلے غرائب قرآن وحدیث پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن میری ناقص رائے میں یہ سب سے بہتر اور جامع تر ہے۔''(۱)

صاحب معجم المطبوعات تحریر کرتے ہیں:

''آیات وحدیث کے مطالب کے کشف اور کتاب وسنت کے معانی کی توضیح کے لیے یہ بڑی جامع کتاب ہے۔''(۲)

غالباً طوالت کے خوف سے حدیثیں بلا سند نقل کی ہیں لیکن ان کی کتابوں کے حوالے دیے ہیں جن سے حدیثیں ماخوذ ہیں کتاب کے شروع میں ان رموز واشارات کا ذکر بھی کیا ہے جو کتابوں اور مصنفوں کے دیے گئے ہیں۔(۳)

کتاب کی اس عظمت واہمیت کی بنا پر اسے غیر معمولی شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی اور جب سے یہ تصنیف ہوئی ہے اسی زمانہ سے اسے اہل علم میں بڑا حسن قبول حاصل ہے، خود مصنف کی زندگی ہی میں اسے بڑی شہرت ومقبولیت ہوگئی تھی اور اس کی نقلیں اور نسخے دور دراز کے شہروں میں پھیل گئے تھے، اسے مرتب کر کے مصنف نے دراصل علما پر بہت بڑا احسان کیا ہے، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''علمائے اعلام نے اس کی جانب غیر معمولی اعتنا کیا، یہی وجہ ہے کہ مصنف کی زندگی ہی میں یہ کتاب پورے طور پر مقبول ہوگئی اور اس کی نقلیں دور دراز کے شہروں میں پھیل گئیں، انہوں نے اس کی نقل میں ایسی رغبت دکھائی کہ ہندوستان کے شہروں کا شاید ہی کوئی قابل ذکر کتب خانہ

---

(۱) معارف دسمبر ۴۲ء۔ (۲) معجم المطبوعات کالم ۱۶۷۱۔ (۳) اکتفاء القنوع، ص ۱۳۵۔

ایسا ہو جس میں اس کا نسخہ موجود نہ ہو، یہ کتاب علوم دینیہ سے شغف رکھنے والے تمام اصحاب علم کے پیش نظر رہتی ہے، ان کے حوالہ و ماخذ کا کام دیتی ہے اور وہ اس سے مشکلات میں استفادہ کرتے ہیں۔"(۱)

شیخ محمد بن طاہر کے پوتے شیخ عبدالوہاب فرماتے ہیں:

"اس یگانہ روزگار کی کتابیں بے حد مقبول ہوئیں، چنانچہ قدرۃ المحققین شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس فقیر سے خود فرمایا کہ میں مکہ معظمہ میں تھا اور ہندوستان آنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ عارف کامل حضرت مولانا شیخ علی متقی کو خواب میں دیکھا کہ حضرت فرما رہے ہیں کہ گھر جاتے وقت پٹن کی طرف سے جانا کہ وہاں تم کو ایک بڑی نعمت حاصل ہوگی، چنانچہ اپنے مرشد اور استاد کے علم کے بموجب اس ارادہ سے واپس ہوا، جب موضع کجیہ پہنچا جو پٹن سے دو کوس پر واقع ہے تو شیخ کریم یعنی محمد بن طاہر کے بڑے لڑکے شیخ محمد ابراہیم جو میرے استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے مجھے ملے اور وہ مجھ سے اس طرح ملے جیسے مخلص اور شناسا آدمی کے ساتھ ملتا ہے، پھر مجمع البحار مجھے عنایت کی اور باوجود اس کے کہ ہماری ان کی کبھی کی ملاقات نہ تھی پھر بھی صداقت، خلوص اور محبت ایسی دکھائی جو دوستوں کے شایان شان ہے، اس لیے ان سے اس کا سبب پوچھا، انہوں نے فرمایا کہ اس رات کو حضرت شیخ نے مجھے خواب میں فرمایا کہ شیخ عبدالحق مکہ سے روانہ ہو کر اس ملک کے اطراف میں آئے ہیں، تم جا کر ان کا استقبال کرو اور کتاب مجمع البحار ان کو دے دو، اس کے بعد عرصہ تک پٹن میں مقیم رہا اور چونکہ اس کتاب کے سوا کوئی دوسری چیز مجھے نہیں ملی، سمجھا کہ "نعمت عظمیٰ"

(۱) مقدمہ مجمع البحار مطبوعہ حیدر آباد۔

سے مراد یہی کتاب ہے۔"(۱)

کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے علم حدیث کی اہمیت بیان کی ہے اور غرائب پر قدیم مصنفین اور علمائے اسلام کے اعتنا اور کتابیں لکھنے کا ذکر کیا ہے، پھر خود اس موضوع پر یہ کتاب لکھنے کی وجہ، اس کی نوعیت اور وہ اصول تحریر کیے ہیں جن کو اس کتاب میں مدنظر رکھا ہے، کتاب کے آخر میں مصطلحات حدیث کی وضاحت اور سادات کی تاریخ درج ہے، ذیل میں اس کی نمایاں خصوصیات پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ یہ اپنے موضوع پر اہم اور حاوی ہونے کے علاوہ احادیث کی تشریح وتفسیر کے لحاظ سے بھی نہایت مفید، کارآمد اور بلند پایہ کتاب ہے۔

۲۔ ابن اثیر کی نہایہ اس موضوع پر بے نظیر کتاب خیال کی جاتی ہے، مجمع البحار میں اس کے تمام مباحث سمیٹ لیے گئے ہیں، اس کی کوئی اہم بحث شاذ ونادر ہی اس میں شامل ہونے سے رہ گئی ہو، البتہ جو باتیں زیادہ مشہور ہیں انہیں اس میں قلم انداز کردیا گیا ہے، النہایہ کے علاوہ بھی اس فن کی اہم تصانیف کے مندرجات اور مفید بحثوں کو بھی اس میں نقل کیا گیا ہے۔

۳۔ اس موضوع پر اس سے پہلے جو کتابیں لکھی گئی ہیں یہ ان سب کی جامع بھی ہے اور ان پر اضافہ بھی ہے کیوں کہ اس میں متعدد ایسے امور سے بھی تعرض کیا گیا ہے جن کے ذکر سے اس فن کی دوسری کتابیں خالی ہیں۔

۴۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ ابن اثیر کی النہایہ اس فن کی مہتم بالشان تصنیف ہے جس کے مباحث کو مجمع البحار میں سمیٹ لیا گیا ہے، اس کے علاوہ اس کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس میں اس پر متعدد اضافے بھی کیے ہیں جیسے ابن اثیر نے عموماً کلمات کو ضبط نہیں کیا ہے مگر علامہ پٹنی ان کے ضبط کا بڑا اہتمام کرتے ہیں اور طلبہ کی سہولت کے خیال سے لفظوں کو اسی

(۱) رسالہ مناقب، ص ۹۲۔

ہیئت میں نقل کرتے ہیں جس میں وہ حدیث میں آئے ہیں، اسی طرح صاحب النہایہ مادہ کے ذکر میں حدیث میں وارد اس کے دوسرے صیغوں اور مشتقات کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں مگر صاحب مجمع البحار صیغوں اور مشتقات کا بھی ذکر کرتے ہیں، انہوں نے بعض شارحین کے حوالہ سے بھی ابن اثیر کے بیان پر اضافے کیے ہیں۔

۵۔ یہ کتاب شرحوں کی کتابوں کے مباحث کی جامع بھی ہے، اس موضوع کی کتابوں میں لفظوں کے جو وضعی معنی بیان کیے گئے ہیں ان سے واقفیت کے بعد بھی حدیث کے مفہوم میں اشکال باقی رہتا ہے جس کے حل کے لیے کتب شروح کی احتیاج رہ جاتی ہے لیکن اس کتاب کا مطالعہ شروح سے بے نیاز کر دیتا ہے کیوں کہ مصنف ان امور کو بھی بیان کرتے ہیں جو شرحوں میں مذکور ہیں۔

٦۔ غریب الحدیث کے مصنفین نے ان لفظوں کے معنی نہیں لکھے ہیں جن کے وضعی معنی معلوم و مشہور ہیں لیکن مجمع البحار میں اسے اس لیے نقل کیا گیا ہے کہ زیر بحث حدیث میں اس لفظ کی تاویل کسی خاص نوعیت کی ہوتی ہے۔

۷۔ معنی حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے وہ شارحین کے بیان پر اضافہ بھی کرتے ہیں، اس لحاظ سے یہ عام شرحوں پر بھی یک گونہ اضافہ ہے۔

ذیول، تکملے اور تعلیقات: مصنف نے خود اس کتاب کا تکملہ اور ذیل بھی لکھا تھا، ان میں اصل پر بعض مفید اور قیمتی اضافے ہیں، تکملہ اور ذیل دونوں اصل کتاب کے آخر میں شامل ہیں۔

پٹن میں مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا جو قلمی نسخہ اب تک محفوظ ہے، اس کے حاشیہ پر مفید تعلیقات بھی درج ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مصنف ہی کی تحریر کی ہوئی ہیں۔

مجمع البحار کی اہمیت کی وجہ سے مصنف کی زندگی ہی میں اہل علم نے اس کی بے شمار نقلیں تیار کی تھیں، اس لیے مختلف کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں، خود مصنف

کے کتب خانہ کی جو کتابیں ابھی تک محفوظ رہ گئی ہیں ان میں مجمع البحار کا ایک قلمی نسخہ بھی ہے جو خاص مصنف ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، مولانا ابوظفر ندوی مرحوم نے اسے ملاحظہ فرمایا تھا ان کے خیال میں اس کی کسی اندرونی شہادت سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ یہ مصنف ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔(۱)

شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی نظر سے بھی لکھنؤ اور حیدر آباد میں اس کے دو قلمی نسخے گزرے ہیں جن کے بارہ میں ان کا خیال ہے کہ ''دونوں مصنف کی زندگی میں لکھے گئے تھے۔''

اسلامی علوم وفنون کی کتابوں کی اشاعت میں منشی نولکشور کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں، انہوں نے اپنی سعی بلیغ سے اس کے چھ نسخے حاصل کر کے اور مولانا محمد مظہر سے مقابلہ وتصحیح کرا کے ۱۲۸۳ھ میں غالباً پہلی دفعہ اسے لکھنؤ سے شائع کیا تھا، اس مطبوعہ ایڈیشن میں شاہ عبدالحق دہلوی کے قلمی نسخہ کو بنیاد بنایا گیا ہے جسے شیخ کے صاحبزادے شیخ ابراہیم نے دیا تھا اور جو ۱۰۱۹ھ کا لکھا ہوا ہے، منشی جی کے اہتمام میں مجمع البحار کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے مگر اس کے بعد یہ کتاب کمیاب ہوگئی تھی اس لیے مصنف کے بعض اہل خاندان نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے اس کی اشاعت کی درخواست کی، انہوں نے ندوۃ العلما کے سابق استاذ ادب مولانا عبدالحفیظ بلیاوی مرحوم کو اس کے مقابلہ وتصحیح کے کام پر مامور کیا جس کی نگرانی مشہور محدث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے کی، چنانچہ ان کی نظر ثانی کے بعد مجمع البحار کا نیا ایڈیشن ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد سے شائع ہوا جو شاندار اور موجودہ دور کے طباعتی معیار کے مطابق ہے، اس ایڈیشن میں مولانا اعظمی کا فاضلانہ مقدمہ اور عالمانہ حواشی بھی شامل ہیں جن سے اس کی اہمیت دوچند ہوگئی۔

☆☆☆

(۱) گجرات کی تمدنی تاریخ، ص۲۲۳، ۲۲۴۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

(المتوفی ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء)

نام ونسب: عبدالحق نام، ابوالمجد کنیت، حقی تخلص اور محدث دہلوی عرف ہے، نسب نامہ حسب ذیل ہے:

''عبدالحق بن سیف الدین بن سعداللہ بن فیروز بن ملک موسیٰ بن ملک معزالدین بن آغا محمد ترک بخاری۔''(۱)

خاندان: عبدالحق ایک سربرآوردہ اور ذی وجاہت خاندان کے فرد تھے، وہ نسلاً ترک تھے، ان کے آباواجداد کا تعلق ماوراء النہر سے تھا، سب سے پہلے اس خاندان کے آغا محمد ترک بخاری سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ میں بخارا سے دہلی آئے، وہ اپنے خاندان کے سرداراور سربراہ تھے، اس لیے ان کے ہمراہ بہت سے ترک بھی اپنا اصل وطن چھوڑ کر دہلی چلے آئے جن میں ان کے اعزہ واقربا کے علاوہ مریدین ومتوسلین اور خدم بھی تھے۔(۲)

آغا محمد ترک اوران کے بیٹے ملک معزالدین: آغا محمد ترک پر سلطان علاء الدین خلجی کی خاص نظر عنایت رہی اور وہ بلند مراتب پر فائز ہوئے، یہ جس وقت دہلی تشریف لائے تھے اس وقت گجرات کی مہم کی تیاری ہورہی تھی، بادشاہ نے اپنے امرا واعیانِ حکومت کے ساتھ انہیں بھی وہاں روانہ کیا اور گجرات فتح ہوجانے کے بعد وہیں مقیم رہنے کا حکم دیا، مگر

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۷۹ و ما بعد مطبع ہاشمی، میرٹھ مطبوعہ ۱۲۷۸ھ۔ (۲) ایضاً، ص۲۷۹۔

کسی امیر سے کسی بات پر ان سے کچھ ان بن ہوگئی، اس لیے وہ گجرات سے دہلی واپس آ گئے اس دفعہ بادشاہ نے پہلے سے زیادہ ان کا اعزاز کیا اور بلند عہدے تفویض کیے۔

سلطان علاء الدین کے قطب الدین اور تغلق شاہ کے زمانہ میں بھی وہ اپنے خاندان کے ساتھ عزت وفراغت سے زندگی بسر کرتے رہے، دولت وثروت کے ساتھ اللہ نے ان کو اولاد کی کثرت سے بھی نوازا تھا مگر دفعتاً ایک حادثہ میں سب سے بڑے صاحبزادے ملک معز الدین کے علاوہ سب فوت ہو گئے، اس جاں گداز سانحہ نے آغا محمد ترک کا سارا عیش ونشاط ختم کر دیا اور انہیں امارت ودولت، لاؤلشکر اور خیل وحشم کسی چیز سے بھی دلچسپی نہیں رہی، چنانچہ ایک سیاہ ماتمی لباس پہن کر شیخ صلاح الدین سہروردی کی خانقاہ میں مقیم ہو گئے، ایک مدت کے بعد شیخ نے ان کو اہل وعیال کے پاس واپس جانے کی ترغیب دی اور یہ بشارت بھی سنائی کہ ان شاء اللہ اسی ایک باقی ماندہ فرزند سے تمہاری نسل قیامت تک باقی رہے گی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ملک معز الدین کو پوری طرح سے نوازا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تنہا ان کی ذات میں فوت ہونے والے تمام فرزندوں کی خوبیاں جمع ہوگئی ہیں۔

۱۷/ربیع الآخر ۷۳۹ھ کو آغا محمد ترک کی وفات ہوئی، ان کا مقبرہ عیدگاہ شمسی کے عقب میں ہے، اس کے بعد ملک معز الدین کے یہاں ایک فرزند تولد ہوا جس کا نام موسیٰ ملک رکھا گیا، مگر کچھ ہی عرصہ بعد ملک معز الدین بھی دولت وثروت اور دنیوی جاہ وحشمت چھوڑ کر عالم آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئے۔(۱)

ملک موسیٰ: ملک موسیٰ بھی نجابت وسعادت اور فضائل وکمالات سے متصف اور بڑی عزت وشہرت کے مالک تھے، فیروز تغلق کی وفات کے بعد ملک میں بدامنی اور شورش بڑھ گئی تو انہوں نے ماوراء النہر کی راہ لی، مگر امیر تیمور گورگان کے لاؤلشکر کے ساتھ پھر دہلی واپس آ کر مستقل طور پر یہیں فروکش ہو گئے اور نہ صرف وہ بلکہ اس خاندان کے کسی اور فرد نے بھی

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۷۹ و ۲۸۰ مطبوعہ مطبع ہاشمی میرٹھ، مطبوعہ ۱۲۷۸ھ۔

اس کے بعد دہلی سے باہر قدم نہیں نکالا۔(۱)

شیخ فیروز: ملک موسیٰ کے کئی بیٹے ہوئے، ان میں ایک کا نام شیخ فیروز تھا جو بڑے جامع کمالات شخص تھے، فن حرب اور سپہ گری میں خاص طور پر یکتا ہونے کے علاوہ علم و فن، شعروشاعری، شجاعت وسخاوت، ظرافت و لطافت طبع اور دوسرے اوصاف وکمالات میں اپنی مثال آپ تھے، انہوں نے دولت وحشمت اور عزت وعظمت میں بھی ناموری حاصل کر کے خاندان کی شہرت میں چار چاند لگا دیے، خاندان میں شاعری، سخنوری، خوش طبعی اور ظرافت کی بنیادیں انہی کی ذات سے استوار ومحکم ہوئیں، شیخ فیروز سلطان بہلول لودی کی حکومت کے ابتدائی دور میں موجود تھے، انہوں نے سلطان حسین شرقی کے دہلی آنے اور سلطان بہلول سے جنگ کرنے کے واقعہ کو نظم کیا تھا جس کے دو شعر شیخ عبدالحق نے اخبار الاخیار میں نقل کیے ہیں، حسین شرقی بہلول لودی کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

ایا قابض شہر دہلی شنو
حیاتت چو خواہی ازیں جا برو
منم قابض ملک و ماراست ملک
خدا داد مارا خدا راست ملک

ترجمہ: اے دہلی پر قابض شخص سنو! اگر اپنی زندگی کے خواہش مند ہو تو یہاں سے چلے جاؤ، اب اس ملک پر میں قابض ہوں گا اور یہ میرا ملک ہوگا، کیوں کہ خداوند قدوس نے اسے مجھے عطا کیا ہے اور ملک تو دراصل خدا ہی کا ہے۔

شیخ فیروز کسی جنگ میں بہرائچ گئے اور ۸۶۰ھ میں جام شہادت نوش کیا، ان کی تدفین بہرائچ ہی میں ہوئی، جب گھر سے روانہ ہو رہے تھے تو ان کی بیوی نے کہا ''میں امید سے ہوں'' فرمایا میں نے خدا سے دعا کی ہے کہ نرینہ اولاد پیدا ہو اور اس کی نسل خوب پھلے پھولے

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۸۰۔

اور اس سے بکثرت اولاد ہو، اس کو اور تم کو خدا کے سپرد کرتا ہوں، آئندہ معلوم نہیں کیا پیش آئے۔(۱)

شیخ سعد اللہ: شیخ فیروز کی دعا اللہ نے سن لی اور ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام شیخ سعد اللہ تھا، یہی شیخ عبدالحق کے حقیقی دادا تھے، یہ بڑی خوبیوں سے متصف اور اپنے والد بزرگوار کے کمالات کے وارث تھے، بچپن ہی سے رشد و ہدایت کے آثار ان کی پیشانی سے نمایاں تھے، علم و فضل کی تحصیل کر چکے تو شیخ محمد منکن سے بیعت ہوئے جو اپنے زمانہ کے مرد کامل اور مصباح العاشقین کے لقب سے مشہور تھے، شیخ سعد اللہ نے ان کی خدمت میں رہ کر بڑی ریاضت کی اور انہی کی رہنمائی میں سلوک و معرفت کی راہیں طے کر کے ان سے اجازت و خلافت حاصل کی، شیخ سعد اللہ نے اپنے بڑے صاحبزادے شیخ رزق اللہ کو بھی اپنے مرشد سے بیعت کرایا، ان کے بیٹے اور شیخ عبدالحق کے والد شیخ سیف الدین کا بیان ہے کہ ''میرے والد ہمیشہ ذوق و شوق، ریاضت و مجاہدہ اور طلب فقر و فنا میں سرگرداں رہتے تھے، راتوں کو جاگتے، گریہ وزاری کرتے اور عاشقانہ اشعار پڑھتے'' ان کی وفات جمعہ ۲۲ ربیع الاول ۹۲۸ھ کو ہوئی۔(۲)

شیخ سعد اللہ کی اولاد: شیخ سعد اللہ کو اللہ نے کئی بیٹے عطا کیے تھے، اس شہر کے تمام لوگ اس پر متفق ہیں کہ دہلی انہیں بھائیوں (شیخ سعد اللہ کی اولاد) سے عبارت ہے، حصول معاش کے لیے گو یہ لوگ امرا سے بھی متوسل رہے لیکن اہل دربار اور مصاحبین ان لوگوں کے فقر و فنا سے واقف نہ تھے، شہر والوں میں بھی کم ہی لوگ ان سب بھائیوں کے فقر و معرفت کے حالات سے باخبر تھے کیوں کہ یہ لوگ اخفائے حال سے کام لیتے تھے اور ان کا ظاہری فضل و کمال ان کی باطنی کیفیات کے لیے حجاب بن گیا تھا، ان کے ظاہری حالات کی وجہ سے اکثر لوگ صرف ان کے علم و فضل، شعر و شاعری اور ظرافت و خوش طبعی کو دیکھتے اور

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۸۰۔ (۲) ایضاً، ص ۲۸۱۔

انھی چیزوں کا ذکر کرتے، مگر جن لوگوں کو ان حضرات کی خلوتوں کے مشاہدہ کا موقع ملا ہوگا وہی ان کے فقر و معرفت سے کسی قدر واقف رہے ہوں گے۔(۱)

ان سب بھائیوں میں دو کو زیادہ زیادہ شہرت نصیب ہوئی، اس لیے ان کے مختصر حالات بیان کیے جاتے ہیں:

شیخ رزق اللہ مشتاقی: یہ ۸۹۷ھ میں پیدا ہوئے، بڑے کامل و فاضل اور عارف شخص تھے جو اپنے زمانہ میں یکتائے روزگار اور یادگار سلف خیال کیے جاتے تھے، ان کی ذات گوناگوں ظاہری و باطنی کمالات کا مجموعہ تھی، عشق و محبت، سلامتی عقل، وسعت ظرف، مصائب پر صبر کرنے والے اور استقامت و دوام حضور میں یگانہ تھے، ان کے مرشد مصباح العاشقین شیخ محمد منکن کی ان پر خاص نظر عنایت تھی، شیخ رزق اللہ کو ان سے سوز و درد کا وافر حصہ ملا تھا، بانوے برس کی عمر میں بھی ان کے ذوق و محبت اور درد و سوز میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی، اگر کوئی شخص ان کی خدمت میں پہنچ جاتا تو ان کی ان باتوں کو جو معارف و حقائق اور محبت کے اسرار و دقائق سے پر ہوتی تھیں، سن کر محظوظ ہوئے بغیر نہ رہتا۔

طبیعت کی سلامتی اور قلب کی پاکیزگی کی دولت بھی حصہ میں آئی تھی، بات نہایت اطمینان سے کرتے اور اس میں بڑی لطافت و شیرینی ہوتی، دوسروں سے گفتگوئے محبت کرتے یا سنتے تو ان پر بھی یہی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، سفر و سیاحت بہت کی اور لوگوں سے مل کر تجربے حاصل کیے، بہت سارے مشائخ و فقرا کی صحبت میں بھی رہے۔

شیخ رزق اللہ سنسکرت، ہندی، فارسی اور عربی کے فاضل اور شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے، ہندی اور فارسی دونوں میں داد سخن دیتے، ہندی میں راجن اور فارسی میں مشتاقی تخلص تھا، تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی، ہندی میں متعدد رسالے لکھے جن میں پیمان جودت نرجن بہت مشہور ہوئے، بزرگوں کی حکایتیں اور سلاطین ہند کے تاریخی واقعات

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۸۱۔

وقصص بہت دلچسپی اور شوق و ذوق کے ساتھ سناتے تھے، ان حکایات و واقعات کا ایک مجموعہ بھی ''واقعات مشتاقی'' کے نام سے مرتب کیا تھا، یہ سلطان بہلول لودیوں کے حالات وواقعات پر مشتمل ہے، اس کے قلمی نسخے برٹش میوزیم میں موجود ہیں (۱) لودھیوں کی تاریخ کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے، ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، ایلیٹ نے اپنی تاریخ ہند میں اس کے کچھ حصہ کا ترجمہ کیا ہے۔ (۲)

شیخ سیف الدین: یہ شیخ سعد اللہ کے چھوٹے لڑکے اور حضرت شیخ عبدالحق محدث کے والد ماجد تھے، ۹۴۰ھ/۱۵۱۴ء میں پیدا ہوئے، والد کے وفات کے وقت ان کی عمر آٹھ برس تھی، جب ان کی رحلت کا زمانہ قریب ہوا تو ایک روز سحر کے وقت شیخ سیف الدین کو لے کر بالا خانہ پر گئے، تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر انہیں قبلہ رو کھڑا کیا اور بارگاہ خداوندی میں یہ دعا کی:

> ''خداوندا تو جانتا ہے کہ میں اپنے سب بچوں کی تربیت سے فارغ اور ان کے حقوق ادا کر چکا ہوں لیکن اس لڑکے کو یتیم و بے کس چھوڑ رہا ہوں، اس کے حقوق میرے ذمہ رہ گئے ہیں، اسے تیرے سپرد کرتا ہوں، تو اس کو اپنی تولیت، سرپرستی اور نگرانی میں لے لے۔'' (۳)

والد کی دعا کے اثرات سے ان میں روز بروز رشد و ترقی کے آثار نمایاں ہونے لگے، موانع و مشکلات کے باوجود انہوں نے علم و فضل کی تحصیل میں کسی طرح کی کمی اور کوتاہی نہیں کی، شاعری، علمی فضیلت، مقبولیت، ذوق و شوق، محبت، ظرافت، لطافت، زہد، دنیا سے بے رغبتی، دل کی پاکیزگی، حضور قلب، نکتہ سنجی اور فہم و دقائق و اشارات میں بے مثال اور یگانہ تھے۔ (۴)

---

(۱) فہرست مخطوطات، ج ۳، ص ۹۲۱۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق از پروفیسر خلیق احمد نظامی، ص ۶۱۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۲۸۱۔ (۴) ایضاً۔

شیخ سیف الدین ایک صاحب دل بزرگ تھے ، ابتدا میں سلسلہ سہروردیہ کے ایک عالم سے بیعت ہوئے ، پھر شیخ امان اللہ پانی پتی (م ۹۵۷ھ) کی صحبت میں سلوک کی منزلیں طے کیں اور انہی سے خلافت بھی پائی ، قدرت نے انہیں نگاہ کیمیا اثر اور فقر وفنا ، توحید ، تجرید اور تفرید میں سے وافر حصہ عطا کیا تھا ، ان کو نہ دولت دنیا کی ہوس تھی اور نہ کبھی اس کی طلب کا کوئی داعیہ ان میں پیدا ہوا ، صرف فقر ومحبت کی جانب ان کی توجہ رہی ، مشرب توحید کا ان پر شدید غلبہ تھا جس کو شیخ امان اللہ کی تربیت نے خوب چمکا دیا۔

شیخ امان اللہ کے دل میں عشق حقیقی کی آگ ہر وقت بھڑکتی رہتی تھی اور ان کو نظریۂ وحدت الوجود پر پورا عبور تھا ، وہ اس مسئلہ پر بڑی مدلل تقریر کرتے اور نہایت برملا طور پر توحید کے اسرار وحقائق بیان کرتے تھے ، انہوں نے تصوف وتوحید میں بہت سی کتابیں لکھی تھیں ، درس وتدریس کا شغل بھی تھا۔

شیخ سیف الدین پر ان کی تربیت کا بڑا اثر تھا ، وہ گو خود صاحب علم تھے مگر فرماتے تھے کہ متقی کم علم اس عالم سے بہتر ہے جو جاہ کا طلب گار ہو ، ایک دفعہ شیخ عبدالحق سے فرمایا کہ جب میں نے اس زمانہ کے اکابر علما کا جاہ کا طلب گار ، مال ودولت کا حریص ، دنیوی لذتوں میں منہمک اور بحث وجدال میں مشغول دیکھا تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہم نے تھوڑا علم حاصل کیا اور ہمارا شمار اکابر علما میں نہیں ہوتا ، وہ اپنے فرزند کو برابر تاکید کرتے تھے کہ ''علم کے معاملہ میں نہ کسی سے بحث ونزاع کرو اور نہ کسی کو تکلیف واذیت دو ، اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ حق دوسری جانب ہے تو فوراً اسے مان لو اور اگر اس کے برخلاف یہ یقین ہو کہ تم ہی حق پر ہو تو دو تین دفعہ اپنے فریق کو سمجھانے کی کوشش کرو ، اگر مان لے تو فبہا ورنہ بحث نہ کرو اور یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو جاؤ کہ مجھے تو یہی معلوم ہے ممکن ہے جو تم کہہ رہے ہو وہی صحیح ہو ، اس میں جھگڑنے کی کیا بات ہے۔

(۱) اخبار الاخیار ، ص ۲۸۲۔

شیخ سیف الدین کو شعر و سخن کا عمدہ ذوق تھا اور سیفی تخلص کرتے تھے، اخبار الاخیار میں ان کی دو غزلیں درج ہیں جن سے ان کے شاعرانہ کمالات کا پتہ چلتا ہے، ان کی ایک مثنوی سلسلۃ الوصال کا پتہ بھی چلتا ہے جو تقریباً پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے، شیخ سیف الدین کو تصنیف و تالیف سے زیادہ مناسبت نہ تھی، ان کے پیرومرشد شیخ امان اللہ اپنے مریدوں کو تقریر کرنے کا حکم دیتے تھے تاکہ اس سے اندازہ ہو کہ وہ شیخ کے ارشادات و تعلیمات کو پوری طرح اخذ کر سکے ہیں کہ نہیں، اس مقصد سے جب انہوں نے شیخ سیف الدین کو بھی تقریر کا حکم دیا تو انہوں نے عرض کیا کہ فقیر کو آپ کے سامنے تقریر کی مجال نہیں ہے، اگر حکم ہو تو لکھ کر پیش کروں، شیخ نے اجازت دی، اس طرح جو رسالے مرتب ہوئے ان میں سے ایک کا نام مکاشفات ہے (۱) جس کے اقتباسات شیخ عبدالحق نے اخبار الاخیار میں نقل کیے ہیں۔

شیخ سیف الدین کو دینی علوم سے بڑا شغف تھا، انہوں نے شیخ عبدالحق کی علمی تربیت پر پوری توجہ کی تھی، ان کے خانوادہ کے علمی سلسلہ کا نقطۂ آغاز ان کے فرزند حضرت شیخ عبدالحق دہلوی کو مانا جاتا ہے مگر مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

> ''آج تک شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے علمی خانوادہ کا آغاز انہی کی ذات سے کیا جاتا ہے مگر حکیم (حبیب الرحمٰن) صاحب (ڈھاکہ) کے پاس ایک دستاویز ایسی ہے جو اس آغاز کو ایک پشت اوپر تک لے جاتی ہے، یعنی علامہ ذہبی کی الکاشف جو اسماء الرجال کی ایک کتاب ہے، اس کا ایک ایسا نسخہ حکیم صاحب کی ملکیت میں ہے جس کے پہلے صفحہ پر مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے والد ماجد مولانا سیف الدین ترک کے قلم کی عبارت تحریر ہے۔'' (۲)

دراصل شیخ سیف الدین ایک صوفی بزرگ منش تھے، ان کا خود بیان ہے کہ مجھے

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۸۶ و ۲۸۷۔ (۲) معارف فروری ۱۰۲۹، ص ۸۷ و مقالات سلیمان جلد دوم، ص ۷۷۔

سات برس کی عمر کی عمر سے جس میں ادراک، شعور اور عقل کی ابتدا ہوتی ہے، درد و محبت، طلب الٰہی اور معرفت کا شوق دامنگیر تھا اور اسی ذکر و فکر میں عمر بسر ہوئی، مجاہدہ و ریاضت کے زمانہ میں میں نے وہ حالات دیکھے ہیں جن کا اظہار نہ کرنا ہی مناسب ہے کیوں کہ ستر و اخفا فقر کے لیے لازم اور ضروری ہے۔ (۱)

وہ فرماتے تھے کہ طریقت کے کئی راستے ہیں جن لوگوں نے اختیار کیا ہے لیکن اصل حقیقت صرف اس قدر ہے کہ معیت حق کو ہر حال میں پیش نظر رکھا جائے، دنیا کے کام میں لگے رہو مگر دل کو یار کی طرف لگائے رکھو، انسان کا ظاہر و باطن یکساں ہونا چاہیے اور اصل معاملہ تو اللہ کے ساتھ راستی اور راست بازی کا ہے جو ہمیشہ ٹھیک رہنا چاہیے۔ (۲)

شیخ سیف الدین پر بڑھاپے میں محویت و فنا کا غلبہ تھا، کھانے پینے، پہننے، عیش و فراغت، صحبت و ملاقات اور ادب و شاعری وغیرہ سے کوئی رغبت باقی نہیں رہ گئی تھی، اگر ان کے علاج کی سعی کی جاتی تو فرماتے کہ میں نے کون سے اچھے کام کیے ہیں جو صحت و تندرستی کی خواہش کروں، میرا وجود اور عدم برابر ہے، غرض ہر وقت خوف و خشیت کا غلبہ رہتا اور کبھی اس حال سے فارغ نہ رہتے، مگر جب وفات کا وقت قریب آیا تو ذوق و شوق کی کیفیت طاری رہنے لگی، اسی حالت میں اپنے فرزند عبدالحق محدث سے فرمایا کہ دعا کرو کہ خدا مجھے جلد یہاں سے لے جائے، مجھے جس چیز کی طلب تھی وہ اب حاصل ہوئی ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ ہاتھ سے چلی جائے، میں تمام عمر دعا کرتا رہا کہ ''خداوندا آخر وقت میں ذوق و شوق کے عالم میں مجھے اس جگہ سے لے جائیو'' اب یہ مراد اچھی طرح بر آئی ہے اگر اس حالت میں میرا مولیٰ مجھے اپنے سامنے بلا لے تو اس کی بڑی عنایت اور انتہائی کرم ہوگا، عیادت کے لیے آنے والے اگر ان کے لیے دعائے صحت کرتے تو آزردہ خاطر ہوتے اور فرماتے کہ اللہ سے اس کی دعا کرو کہ وہ مجھے یہاں سے بلا لے۔ (۳)

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۸۲۔ (۲) ایضاً، ص ۲۸۳۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۲۸۸و ۲۸۹۔

بالآخر ۲۷ شعبان ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کو واصل بحق ہو گئے **ولی تحت القباب** سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔(۱)

ولادت: شیخ عبدالحق محدث دہلوی اسی ذی حیثیت اور ممتاز گھرانے کے فرد اور ایسے مرد کامل بزرگ کے بیٹے تھے، جو محرم ۹۵۸ھ (مطابق جنوری ۱۵۵۱ء) میں منتخب روزگار شہر دہلی میں پیدا ہوئے، ''شیخ اولیا'' سے ان کی تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے۔

تعلیم و تربیت: حضرت شیخ عبدالحق کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں ان کے والد بزرگوار کے سایہ عاطفت میں ہوئی، بڑھاپے میں ان کے والد کی ساری توجہ انہی کی جانب مرکوز ہو گئی تھی اور ہر وقت ان کو اپنے ساتھ رکھ کر ان کی تعلیم و تربیت میں مشغول رہتے، خود شیخ بیان کرتے ہیں:

> ''آخر عمر میں جب والد بوڑھے اور ضعیف ہو گئے تھے تو خصوصیت کے ساتھ میری جانب ان کی توجہ اور دلبستگی بہت زیادہ ہو گئی تھی، میں تین یا چار برس کا تھا کہ ان کو ایام جوانی گزر جانے اور غمگسار دوستوں کی رحلت کی وجہ سے ایک سخت بیماری لاحق ہوئی، اس بیماری میں ان کی دلجوئی اور ضعف پیری کی کلفتوں کو دور کرنے کے لیے یہ فقیر شب و روز ان کی خدمت میں رہتا تھا اور ان کی آغوش شفقت میں برابر تربیت پاتا تھا، اسی زمانہ طفولیت میں والد حضرات صوفیہ کے اقوال و ارشادات میرے دل و دماغ میں ڈال کر میری باطنی تربیت بھی کرتے تھے، میں خود بھی فطرۃً ان باتوں کا دلدادہ تھا، وہ جب ذرا دیر کے لیے خاموش ہوتے تو میں بھی خود فراموشی کی حالت میں ہو جاتا اور پھر واقفان حال کی طرح ان حقائق کو دوبارہ بیان کرنے کے لیے کہتا، اس زمانہ کی بعض باتیں میرے حافظہ خیال میں

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۹۰۔

محفوظ رہ گئی ہیں اور اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ فقیر کو اپنے دودھ
چھوڑنے کے وقت کی باتیں بھی اس طرح یاد ہیں گویا یہ کل کی بات ہے،
حالاں کہ اس وقت میری عمر دو ڈھائی برس کی رہی ہوگی۔''(۱)

شیخ کے والد نے بہت نرالے انداز اور انوکھے انداز سے ان کی تعلیم کی ابتدا کی تھی، لکھتے ہیں:

''بغیر سابقہ تعلیم اور قواعد ہجی کے جو عام بچوں کے پڑھنے پڑھانے کا طریقہ ہے، پہلے قرآن مجید کے دو تین جز بلکہ اس سے بھی کم کی تعلیم دی، وہ سبق لکھ دیتے تھے اور میں پڑھ لیتا تھا، قرآن حکیم کی یہی مقدار میں نے ان سے سبقاً پڑھی، اس کے بعد ان کی تربیت وشفقت سے اس قدر استعداد ہوگئی کہ روزانہ قرآن کی ایک مقدار خود سے پڑھتا اور جو مقدار پڑھتا اسے ان کے سامنے دہرا دیتا، اس طرح میں نے دو تین ماہ میں قرآن مجید ختم کر دیا، معلم جس طرح بچوں کو سبق رٹا کے یاد کراتے ہیں وہ میں نے نہیں کیا اور نہ یہ مفید ہے۔

والد بزرگوار نے مجھے بچوں کے طریقہ پر فا اور قاف تک تختی لکھائی تھی، اس کے بعد تھوڑی مدت میں اگر ایک ماہ کہوں تو جھوٹ نہ ہوگا کتابت وانشا کا سلیقہ پیدا ہوگیا، اللہ تعالیٰ نے ان کی توجہ اور نظر میں ایسا اثر اور ایسی خاصیت رکھی تھی کہ غبی اور قوت اخذ واستعداد میں بہت کمتر شخص بھی ان کی توجہ وتربیت سے چمک اٹھتا تھا اور اس کی مخفی صلاحیتیں بہت ظاہر ہونے لگتی تھیں، مجھے جو کچھ بھی ملا وہ انہی کی توجہ وعنایت کا اثر و نتیجہ ہے، ان کے پدری اور تعلیم وتربیت کے تمام حقوق اس نامراد کے ذمہ ثابت ومسلم ہیں۔

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۹۰۔

اسی زمانہ میں تحصیل علم میں مشغول ہوا، شب و روز والد محترم کی خدمت میں رہتا اور بحث وتکرار میں مصروف رہتا، اسی میں راتیں گزر جاتی تھیں، وہ بندہ کو ہم زبانی کا شرف عطا کر کے بہت خوش ہوتے تھے، خاص طور پر علم توحید کی تلقین اور مسئلہ وحدۃ الوجود کی تحقیق اس طرح فرماتے تھے کہ گویا آنکھوں دیکھی باتیں کر رہے ہیں، اگر کبھی ان علوم ومسائل کے سمجھنے میں شکوک وشبہات پیدا ہوتے تو فرماتے کہ ہم کو بھی اسی طرح کے مسائل میں بہت سے شکوک وشبہات پیش آتے تھے، انشاءاللہ رفتہ رفتہ یہ سب دور ہو جائیں گے اور تم جمال یقینی کا مشاہدہ کرلو گے مگر شرط یہ ہے کہ ہمیشہ اسی خیال اور دھن میں لگے رہو اور جہاں تک ہو سکے اس کے سمجھنے کی فکر وکوشش کرتے رہو۔"(۱)

اعلیٰ تعلیم: اپنی آگے کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے شیخ بیان کرتے ہیں کہ:

"جن منظوم کتابوں کی تعلیم کا اس ملک میں رواج تھا ان میں سے والد نے شاید گلستاں و بوستاں کے چند جزو اور دیوان حافظ کی تعلیم دی، لڑکپن ہی میں ختم قرآن کے بعد میزان الصرف سے مصباح وکافیہ تک خود پڑھایا، اسی زمانہ میں اکثر یہ ارشاد فرماتے تھے کہ انشاءاللہ تم جلد ہی عالم بن جاؤ گے، یہ بھی فرماتے کہ مجھے اس تصور سے بڑی مسرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس درجۂ کمال تک پہنچا دے جس کا مجھے خیال ہے اور میں تمہارے حلقۂ درس وافادہ میں اپنے بڑھاپے میں اعتماد کر کے بیٹھا رہوں اور کبھی چند کتابوں کا نام لے کر فرماتے کہ بس ان کو پڑھ لو تو عالم ہو جاؤ گے۔

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۹۰۔

میرے والد بزرگوار فرماتے کہ ہر علم میں سے ایک مختصر پڑھ لو، یہ تمہارے لیے کافی ہے، اس کے بعد انشاء اللہ برکت وسعادت کے دروازے تم پر کھل جائیں گے اور تم تمام علوم بلا تکلف حاصل کر لو گے، ان کے ان پاکیزہ ارشادات کا یہ اثر ہوا کہ میں نے علوم کی تحصیل اتنی جلدی کر لی کہ جسے طے زمان ومکان کہتے ہیں، فن نحو کے مختصرات جیسے کافیہ اور ادب و ارشاد کے ایک ایک جز بلکہ اس سے بھی زیادہ بعض اوقات پڑھ لیتا، علوم کی تحصیل سے فراغت اور تکمیل کا شوق وحرص اس قدر تھا کہ اگر ان مختصرات میں کسی کا صحیح اور حاشیہ والا کوئی نسخہ ہاتھ آ جاتا تو اسے استاد سے پڑھنے کی ضرورت نہ پیش آتی اور دوران مطالعہ متن سمجھ لینے کے لیے محض حواشی دیکھ لینا کافی ہوتا اور پھر دوسرے جز کے مطالعہ میں منہمک ہو جاتا اور اگر کوئی آسان بحث ہوتی یا وہ مضمون پڑھا ہوا پہلے سے معلوم ہوتا تو میری طبیعت اس میں غور وفکر پر آمادہ نہ ہوتی بلکہ آگے بڑھ جاتا، خدا ہی جانتا ہے کہ میں ان دنوں کیا پڑھتا اور کیا سمجھتا تھا، تاہم ہر کتاب کے متن اور حاشیہ سے پورا فائدہ حاصل کرتا اور انہیں اچھی طرح سمجھ لیتا تھا، جو کتابیں بھی میری نظر سے گزرتی یا اس کا کوئی جز بھی کسی وقت ہاتھ لگ جاتا خواہ وہ شروع کا ہوتا یا آخر کا، اسے پڑھ کر اس پر عبور حاصل کرنا اس وقت کا اہم مشغلہ ہوتا، میں اس کا پابند نہیں تھا کہ کتاب کو اول سے شروع کرنا اور آخر میں ختم کرنا چاہیے بلکہ جو حصہ جہاں کامل جاتا اسی کو پڑھنا شروع کر دیتا کیونکہ میرا مقصد تحصیل علم تھا خواہ یہ جیسے بھی ممکن ہو۔

بارہ یا تیرہ برس کی عمر میں شرح شمسیہ اور شرح عقائد پڑھی اور پندرہ یا سولہ برس کی عمر میں مختصر ومطول ختم کر لی، پھر میں نے علوم عقلیہ ونقلیہ کی

پوری تحصیل کر لی۔"(۱)

قرآن مجید کا حفظ: "الحمد للہ کہ اس کے بعد قرآن مجید کے حفظ کی توفیق بھی نصیب ہوئی اور میں اس طرح اللہ کے کلام کی حفاظت میں آ گیا، یہ نعمت مجھے ایک برس سے کچھ زیادہ عرصہ میں حاصل ہوگئی جس کے ایک حرف کا شکر سو برسوں میں بھی ادا نہیں ہو سکتا۔"(۲)

ماوراء النہر کے علما سے استفادہ: "اس طرح میں نے تمام کتابوں پر عبور حاصل کر لیا اور ادب وعربیت اور منطق وکلام کی کتابوں میں مکمل دستگاہ ہو جانے کے بعد سات آٹھ برس بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ تک ماوراء النہری علما سے اس طرح درس لیا کہ شب وروز میں دو تین ساعت کے لیے مطالعہ، غور وفکر اور مشغولیت سے فرصت ملتی۔"

شوق علم اور مطالعہ سے شغف: شیخ کی تعلیم وتربیت کی جو تفصیل ان کی زبان سے پیش کی گئی ہے اس سے ان کے شوق وطلب علم اور مطالعہ میں غیر معمولی انہماک اور دلچسپی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، ذیل میں اس سلسلہ کی کچھ مزید باتیں بھی خود ان ہی کے حوالہ سے قلم بند کی جاتی ہیں، شیخ عبدالحق علمائے ماوراء النہر سے اپنے استفادہ اور ان کے یہاں قیام کے زمانہ کے علمی اشغال وغیرہ کا حال بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کیا شوق تھا اور کیسی طلب تھی، اگر اس قدر شوق وذوق طلب مولیٰ اور باطنی ریاضت کے لیے ہوتا تو معاملہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا، ایک مرتبہ چند طالب علم بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے دریافت کر رہے تھے کہ تحصیل علم کا کیا مقصد ہے؟ بعض نے تکلف وتصنع سے کام لے کر کہا کہ ہمارا مقصد معرفت الٰہی کی طلب ہے اور بعض نے

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۹۱۔ (۲) ایضاً، ص ۲۹۲۔

سادگی اور سچائی سے بتایا کہ ہماری غرض دنیا طلبی ہے، میں نے اس زمانہ میں کافیہ بلکہ اس سے بھی نیچے کی کتابیں پڑھتا تھا، ان لوگوں نے مجھ سے بھی پوچھا کہ تم بھی تو بتاؤ کہ علم حاصل کرنے سے تمہارا کیا مقصد وارادہ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے قطعاً معلوم نہیں کہ تحصیل علم کا نتیجہ معرفت الٰہی کی صورت میں ظاہر ہوگا یا اس سے لہو ولعب کے اسباب مہیا ہوں گے، مجھے اس وقت صرف یہی شوق دامنگیر ہے کہ یہ جان جاؤں کہ جو علما وفضلا گزرے ہیں انہوں نے کیا کہا ہے اور کشف وحقیقت اور معلومات مسائل میں کیا موتی پروئے ہیں، حصول علم کے بعد کیا صورت پیش آئے گی، نفس کو لذت وسرور حاصل ہوگا یا مولیٰ کی محبت ملے گی، دنیا کی طلب وتحصیل کی طرف دل مائل ہوگا یا عقبیٰ کا طلب گار رہوگا۔

زمانۂ طفولیت ہی سے مجھے پتہ نہیں کہ کھیل کود کیا چیز ہے؟ نیند کیسی ہوتی ہے؟ مصاحبت اور لطف کس کو کہتے ہیں، آرام وآسائش کیا ہے اور سیر وتفریح کیا ہوتی ہے ۔

شب خواب چہ سکون کدام است
خود خواب بعاشقان حرام است

روزانہ سخت ٹھنڈی ہوا اور گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں دو بار دہلی کے مدرسہ میں جاتا تھا جو غالباً میرے گھر سے دو میل کے فاصلہ پر تھا، دوپہر کو گھر میں بس چند لقمے کھانے کے لیے رکتا تا کہ جسم وجان میں حرکت و قوت باقی رہے، اس سے زیادہ اس وقت گھر پر نہ رہتا، ایک مدت تک صبح ہونے سے پہلے ہی مدرسہ پہنچ جاتا اور چراغ کی روشنی میں ایک جز لکھ لیتا، اس سے بھی عجیب بات یہ تھی کہ گو سارا وقت مطالعہ اور پڑھی ہوئی کتابوں

کی بحث و تکرار میں گھرا رہتا تھا مگر اس کے باوجود میں ان شروح و حواشی کو جو نظر و مطالعہ سے گزرتے تھے لکھ لینا بھی ضروری سمجھتا تھا، رات کا زیادہ حصہ اور دن کا کچھ حصہ مطالعہ میں صرف ہوتا تھا اور رات کا تھوڑا اور دن کا بڑا حصہ لکھنے میں گزرتا تھا۔

میرے والدین برابر اس کے آرزومند رہے کہ تھوڑی دیر محلہ کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں شریک ہو جاؤں اور رات کو وقت پر سو جایا کروں، میں ان سے عرض کرتا کہ آخر کھیل کود کا مقصد تو دل کو خوش کرنا ہے اور میرا دل اس سے خوش ہوتا ہے کہ کچھ پڑھوں یا لکھوں، عموماً ماں باپ اپنے بچوں کو مدرسہ جانے اور پڑھنے کے لیے تاکید و تنبیہ کیا کرتے ہیں، اس کے برعکس مجھے کھیل کود کی تاکید کی جاتی تھی، کبھی اثنائے مطالعہ میں آدھی رات ہو جاتی تو والد ماجد پکار کر فرماتے بابا کیا کرتے ہو؟ میں اس خیال سے فوراً لیٹ جاتا کہ جھوٹ نہ بولنا پڑے اور کہتا کہ میں سویا ہوں، آپ کیا فرماتے ہیں؟ اس کے بعد پھر اٹھ جاتا اور پڑھنے میں مشغول ہو جاتا، کئی دفعہ تو ایسا ہوا کہ عمامہ اور سر کے بالوں میں چراغ سے آگ لگ گئی لیکن مجھے اس وقت پتہ چلا جب اس کی حرارت دماغ کو پہنچی۔"(۱)

اساتذہ: شیخ عبدالحق نے زاد المتقین، اجازات الحدیث فی القدیم والحدیث اور اسماء الاستاذین کے نام سے جو کتابیں لکھی تھیں ان میں ان کے استاذوں کا ذکر ہے، غالباً ان کے تذکرہ نگاروں نے ان کے استاذوں کا اسی لیے کوئی ذکر نہیں کیا کہ خود شیخ ان کے بارے میں مستقل رسالے لکھ چکے ہیں مگر اب شیخ کی یہ کتابیں دستیاب نہیں ہیں اس لیے ان کے عام استاذوں کا نام معلوم نہیں ہو سکا، تاہم جن کا نام تلاش و تفحص سے

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۹۲۔

معلوم ہوا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ **شیخ سیف الدین:** اوپر گزر چکا ہے کہ شیخ عبدالحق نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی تھی، نحو، منطق، عقائد، معانی اور بلاغت کی مروج کتابوں اور فارسی ادب گلستاں، بوستاں اور دیوان حافظ کا درس انہی سے لیا تھا۔ (۱)

والد سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مدرسہ دہلی میں داخل ہوئے (۲) جہاں کئی برس تک درس لیتے رہے، انہوں نے درسیات سے باقاعدہ فراغت اور تکمیل یہیں کی تھی، ظاہر ہے اس مدرسہ میں انہوں نے متعدد استاذوں سے تعلیم پائی ہوگی مگر تذکروں میں صرف ایک کا نام ملتا ہے۔

۲۔ **محمد مقیم:** یہ امیر محمد مرتضیٰ شریفی کے شاگرد تھے۔ (۳)

مدرسہ دہلی کے بعد انہوں نے ماوراء النہر کے علما وفضلا کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، اس کا ذکر خود شیخ نے اخبار الاخیار میں کیا ہے (۴) لیکن ان لوگوں کے نام نہیں لکھے ہیں، اس کے بعد جب حرمین شریفین تشریف لے گئے تو وہاں کے فضلا سے بھی استفادہ کیا جن میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں:

۳۔ **شیخ عبدالوہاب متقی:** یہ شیخ علی متقی کے خاص شاگرد اور جانشین تھے، ان کا حال شیخ علی متقی کے تذکرہ میں گزر چکا ہے، شیخ عبدالحق نے ان کی خدمت میں دو برس گزارے اور ان سے بہت استفادہ کیا، ظاہری و باطنی دونوں طرح کے علوم ان سے حاصل کیے۔

بعض تذکرہ نگاروں نے شیخ علی متقی اور شیخ احمد بن حجر مکی سے بھی ان کے تلمذ کا ذکر کیا ہے جو صحیح نہیں ہے کیوں کہ اول الذکر کا انتقال ۹۷۵ھ میں اور مؤخر الذکر کا ۹۷۴ھ میں ہوا، اس وقت شیخ عبدالحق ہندوستان میں تھے اور غالباً مدرسہ دہلی میں زیر تعلیم تھے اور

---

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۹۱۔ (۲) ایضاً، ص۲۹۲۔ (۳) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص۲۰۱۔ (۴) اخبار الاخیار، ص۲۹۲۔

۹۹۶ھ میں حجاز میں تشریف لے گئے تھے، اسی طرح ملا علی قاری سے بھی ان کا تلمذ کا ذکر کیا جاتا ہے جو محل نظر ہے۔(۱)

مکہ اور مدینہ کے چند اور شیوخ کے نام یہ ہیں:

۴۔ قاضی علی بن جار اللہ بن ظہیرہ قرشی مخزومی مکی۔

۵۔ شیخ احمد بن محمد بن محمد ابی الحزم مدنی۔

۶۔ شیخ حمید الدین بن عبداللہ سندی مہاجر۔(۲)

تعلیم سے فراغت اور دانش مندان ماوراء النہر سے استفادہ کا زمانہ: شیخ عبدالحق نے اپنی تعلیم کی جو سرگزشت بیان کی ہے اس میں بتایا ہے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شرح شمسیہ و شرح عقائد ان کے زیر درس تھی اور پندرہ سولہ برس کی عمر میں وہ مطول و مختصر ختم کر چکے تھے، پھر ایک دو برس کے اندر وہ علوم عقلیہ سے اپنی فراغت و تکمیل کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ علوم کی تحصیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو حفظ قرآن کی سعادت بخشی اور اس میں برس سوا برس لگے(۳) اس طرح تعلیم اور حفظ قرآن مکمل کر لینے کے وقت ان کی عمر انیس بیس برس رہی ہوگی جیسا کہ عبدالحمید لاہوری نے بھی لکھا ہے۔(۴)

شیخ عبدالحق کی ولادت محرم ۹۵۸ھ میں ہوئی تھی، اس طرح گویا وہ ۹۷۷ھ تک جملہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہو چکے تھے، گو اب وہ تعلیم مکمل کر چکے تھے، اس کے باوجود شوق و طلب علم میں کوئی کمی نہ آئی تھی، چنانچہ لکھتے ہیں:

غیر آنکہ مدت ہفت ہشت سال بلکہ زیادہ	ادب و عربیت اور منطق و کلام کی کتابوں پر
بعد از رسیدن بکتب عربیت و منطق و کلام و	عبور اور مکمل دستگاہ حاصل کرنے کے بعد

(۱) ان حضرات سے تلمذ کا ذکر سید محمد مرتضیٰ زبیدی نے کیا ہے (ملاحظہ ہو تاج العروس، ج ۷، ص ۳۲۸)۔

(۲) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۲، شیخ حمید الدین سندی سے مشکوٰۃ کی اجازت کا ذکر خود شیخ عبدالحق نے لمعات شرح مشکوٰۃ کے دیباچہ میں کیا ہے۔(۳) اخبار الاخیار، ص ۲۹۱۔(۴) بادشاہ نامہ، جلد اول، حصہ دوم، ص ۳۴۱۔

حصول نوعے از قوت اکمال واتمام ملازمت	ساتھ آٹھ برس بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ
درس بعضے از دانش مندان ماوراء النہر بطوری	تک بعض ماوراء النہری علما کے حلقۂ درس
نمودہ شد کہ در تمامی شب وروز شاید کہ دو سہ	میں اس طرح سے شریک رہا کہ شب وروز
ساعت از مطالعہ وتعقل و اشتغال فرصتے	میں شاید دو تین گھنٹہ کے لیے مطالعہ، غور و
دست نمی دادہ باشند۔(۱)	فکر اور علمی اشغال سے فرصت ملتی تھی۔

گویا ۹۸۵ھ تک یا اس سے پہلے کا زمانہ انہوں نے دانش مندان ماوراء النہری کی خدمت میں گزارا، اس کے بعد کے واقعات کا ذکر آگے آرہا ہے۔

شیخ موسیٰ سے بیعت: شیخ کو تصوف سے طبعاً بھی مناسبت اور دلچسپی تھی اور اپنے والد سے بھی ان کو اس کا ذوق ورثہ میں ملا تھا جس کی تفصیل آگے آئے گی، جب وہ رسمی اور ظاہری تعلیم سے فارغ اور دانش مندان ماوراء النہر سے استفادہ اور کسب فیض حاصل کر چکے تو ان کو اصلاح باطن کی فکر دامنگیر ہوئی جس کے لیے مرشد کامل کی تلاش ہوئی تا کہ اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے سکیں، بخت نے یاوری کی اور یہ نعمت خداداد بھی میسر آگئی، چنانچہ ۶ شوال ۹۸۵ھ کو شیخ موسیٰ بن حامد جیلانی اچی سے بیعت کا شرف حاصل کیا، اخبار الاخیار میں اس واقعہ اور شیخ موسیٰ کا بہت والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے(۲) اپنے وصیت نامہ میں لکھا ہے کہ اپنے والد کے حکم سے حضرت شیخ موسیٰ گیلانی کا مرید ہوا۔(۳)

شیخ موسیٰ قادریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ مخدوم سید حامد گیلانی (م ۹۷۸ھ/۱۵۷۰ء) کے فرزند وخلیفہ تھے، شیخ حامد بلند مرتبہ ومقام کے حامل تھے، باوجودیکہ ہر قسم کا مال واسباب ان کو میسر تھا مگر کبھی صاحب نصاب نہیں ہوئے جو زکوٰۃ واجب ہونے کی شرط ہے، وہ اپنے دادا شیخ عبدالقادر ثانی کے مرید تھے جن کو قبول عظیم حاصل تھا، شیخ حامد نے اپنے نیک بخت فرزند شیخ موسیٰ کو اپنی زندگی ہی میں خلافت وسجادہ نشینی اور سلسلہ کے جملہ امور تفویض کر دیے تھے

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۹۲۔ (۲) ایضاً، ص۲۹۵و۲۹۶۔ (۳) بحوالہ حیات عبدالحق، ص۱۳۰۔

کیوں کہ وہ ان سے ہر طرح راضی اور خوش تھے اور بڑی محبت بھی کرتے تھے، اس کے علاوہ ان میں خود بھی اس کی مکمل اہلیت واستعداد تھی (۱) ملا عبدالقادر بدایونی تحریر فرماتے ہیں:

"شیخ حامد کے انتقال کے بعد شیخ موسیٰ اور ان کے بڑے بھائی شیخ عبدالقادر میں مدت دراز تک سجادہ نشینی کا جھگڑا رہا (۲) اس کی وجہ سے شیخ موسیٰ اچہ چھوڑ کر دربار سے متوسل ہو گئے تھے اور اکبر نے ان کو پانسو کا منصب دیا۔" (۳)

ان کی وفات ۱۰۰۱ھ میں ہوئی، مزار پرانوار ملتان میں ہے۔ (۴)

درس وتدریس کا آغاز: ۹۸۵ھ کے بعد اور حجاز کو روانگی سے پہلے انہوں نے درس وتدریس کا کام بھی انجام دیا، گو شیخ کے عام سوانح نگاروں نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے مگر عبدالحمید لاہوری لکھتے ہیں:

"وچوں سنین عمرش بعشرین رسید از پایۂ تحصیل بدرجہ تدریس وچندے ہنگامہ افادہ گرم داشتہ بپائے طلب بادیہ پیمائی سفر حجاز گمردید۔" (۵)	جب ان کی عمر بیس برس کی ہوئی اور تحصیل علم سے فارغ ہو چکے تو منصب تدریس پر فائز ہوئے اور کچھ دنوں یہ شغل اختیار کرنے کے بعد حجاز روانہ ہوئے۔

محمد صالح کنبوہ کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کو روانہ ہونے سے پہلے "روزے بتدریس وتعلیم گزرانید" لیکن اوپر گزر چکا ہے کہ تکمیل علوم کے بعد وہ سات آٹھ برس سے زیادہ عرصہ تک دانشوران ماوراء النہر سے استفادہ کرتے رہے، جیسا کہ شیخ عبدالحق نے بھی اخبار الاخیار میں لکھا ہے، اس لیے بیس برس ہی کی عمر میں منصب درس و تدریس پر فائز ہو جانے کی بات محل نظر ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ علمائے ماوراء النہر سے استفادہ

(۱) اخبار الاخیار، ص ۱۹۳ و ۱۹۴۔ (۲) منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۹۱۔ (۳) ایضاً، ج ۲، ص ۴۰۴۔ (۴) خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۱۳۸۔ (۵) بادشاہ نامہ، جلد اول، حصہ دوم، ص ۳۴۱۔

اور شیخ موسیٰ سے بیعت کے بعد ۹۸۶ھ میں وہ درس وتدریس کی مسند پر متمکن ہوئے ہوں، اس کی تائید اخبار الاخیار کی اس تصریح سے بھی ہوتی ہے جس میں شاہ صاحب نے تعلیم سے فراغت اور ماوراء النہر کے علما اور شیخ موسیٰ سے بیعت ہونے کے بعد تعلیم وافادہ میں اپنے مشغول ہونے کا ذکر کیا ہے:

تا الآن کہ بفضل باتناہی الٰہی وما توفیقی الا باللہ جزائے وافر وقسطے کامل کہ من غریب شکستہ درخور ایں ہمہ انعام واکرام از حضرت غریب نواز شکستہ پرور حاصل وقت شدہ است زیادہ تر ازاں محنت وریاضت می کشم وبمشغولی تعلیم وافادہ معاذ اللہ بلکہ تعلیم واستفادہ بسر می برم(۱)	(ذوق سحر خیزی کی وجہ سے) مجھ غریب و مسکین کو اللہ کے فضل نا متناہی اور اس کی توفیق کے تحت کافی نعمتیں ملی ہیں اور اب بھی حضرت غریب نواز کے فیض سے پہلے سے زیادہ محنت وریاضت اور تعلیم وافادہ میں مشغول ہوں، معاذ اللہ تعلیم وافادہ نہیں بلکہ تعلیم واستفادہ میں بسر کر رہا ہوں۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ شیخ عبدالحق نے حج بیت اللہ کو جانے سے پہلے بھی درس وتدریس کی خدمت انجام دی تھی۔

فتح پور سیکری میں قیام: حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی طبعاً عزلت پسند اور گوشہ نشین قسم کے آدمی تھے اور وہ اپنے علمی ذوق وانہماک کی وجہ سے بھی لوگوں سے زیادہ ربط وضبط اور میل جول رکھنا پسند نہ کرتے تھے کیوں کہ اختلاط اور میل جول کی کثرت، یکسوئی، جمعیت قلب اور سکون خاطر کو ختم کر کے ذہن کو منتشر کر دیتی ہے اور علمی کاموں میں خلل انداز ہوتی ہے، علاوہ ازیں لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر آدمی ان کے ضرر سے محفوظ رہتا ہے اور لوگ اس کے ضرر سے مامون رہتے ہیں، شیخ نے اپنی ابتدائی تعلیم اور مطالعہ سے شغف کا حال بیان کرتے ہوئے اپنی طبیعت کی اس افتاد اور مزاج کے رنگ کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۹۳۔

''ایام طفلی ہی سے میں لطف صحبت اور ہم نشینی سے نا آشنا ہوں'' (۱) پھر تعلیم سے فراغت کے بعد بھی ان کی یہی کیفیت رہی، چنانچہ لکھتے ہیں:

''دنیا کے نیک و بد سے الگ تھلگ گوشہ غربت میں پڑا رہوں، کسی کے خلاف دل میں کوئی کدورت نہیں ہے اور ان کی اور ان کی مصاحبت سے بھی بے نیاز اور دستکش ہوں بلکہ نحوی ترکیب میں زید و عمر کا جو ذکر مثالاً آیا کرتا ہے اس کے قصوں سے بھی پاک ہوں۔

صد شکر کہ با ہیچ کم کارے نیست
وازمن بدل ہیچکس آزارے نیست
گر بر دل دشمنان من بارے نیست
بر خاطر دوستان من بارے نیست

خداوند عالم نے جس کی نعمتوں کا شمار نہیں ہوسکتا اس نے مجھ غریب کو اپنے لطف سے مالا مال کیا ہے اور مجھے یہ مخصوص حالت و کیفیت عطا کی ہے، میرا دل اور میرا وقت اس کے حضور میں مشغول رہتا ہے اور لوگوں کے میل سے کنارہ کش رہ کر اپنے خیال میں مست اور مگن رہتا ہے۔'' (۲)

مگر تعلیم مکمل کر لینے اور غالباً اپنے والد کے انتقال کے بعد اہل تعلق و حقوق کے اصرار پر انہیں دہلی کے گوشۂ عزلت کو چھوڑ کر فتح پور سیکری جانا پڑا جو اس وقت اکبر کا دار السلطنت اور علمی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔

ملک الشعراء فیضی سے ان کے تعلقات پہلے سے تھے، اس کی کشش اور تحریک بھی فتح پور آنے کا باعث بنی ہوگی۔

دربار اکبری میں شیخ کا پرتپاک خیر مقدم ہوا، خود اکبر نے بھی بڑی قدر دانی کی،

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۹۲۔ (۲) ایضاً، ص۲۹۳۔

شیخ کو خود بھی اعتراف ہے کہ:

''جب اللہ کے فضل و کرم سے مجھے علم کا خاصہ حصہ مل گیا تو بعض اہل حقوق نے مجھے اہل دنیا کی طرف بلایا اور میں بادشاہ وقت اور امرا کے پاس گیا، انہوں نے میری طرف بہت توجہ کی۔ میرا رتبہ بلند کیا۔''(۱)

ملا عبدالقادر شیخ کے دربار میں پہنچنے کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

وچندگاہے در فتح پور بنا برالفت قدیم با شیخ فیضی و میرزا نظام احمد مصاحب بود وفقیر نیز بتقریب ایشاں شرف خدمتش را دریافتہ پیوستہ از فوائد صحبتش محظوظ بودم۔(۲)

شیخ فیضی سے قدیم محبت و تعلق کی بنا پر کچھ عرصہ تک فتح پور میں قیام کیا اور فیضی اور میرزا نظام احمد کی مصاحبت کی، مجھ کو بھی اسی تقریب سے ان کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا اور میں ان کی صحبت سے فیض یاب اور لطف اندوز ہوا۔

دربار میں اس وقت دانشور امرا کا اچھا مجمع تھا، ان کی کشش اور علمی ماحول کی وجہ سے شیخ نے وہاں کا قصد فرمایا ہوگا، ان کے سفر کا مقصد سلطان کا تقرب، دنیوی جاہ و منزلت کی طلب، جلب منفعت اور حصول مال و زر نہ تھا، یہ باتیں ان کے ذوق و مزاج کے سراسر خلاف تھیں اور انہوں نے ان کو اپنا مطمح نظر نہیں بنایا، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم فرماتے ہیں:

''لیکن علم و اصحاب علم کا مرکز ہمیشہ دہلی مرحوم ہی رہی، علی الخصوص وہ علمائے حق جو بادشاہی تعلقات کی ابتلاؤں سے بچنا چاہتے تھے اور حرص وطمع دنیا کی آلودگی سے پاک دامن تھے، اس گوشۂ علم کے سکون کو دارالحکومت کے شور و غوغا پر ترجیح دیتے تھے، حضرت شاہ عبدالحق محدث اسی عہد میں تھے،

(۱) زاد المتقین بحوالہ رود کوثر، ص ۳۴۹۔ (۲) منتخب التواریخ، جلد سوم، ص ۱۱۳۔

فرماتے ہیں ۔

حقی از گوشہ دہلی نہ نہم پا بیروں
خود گرفتیم کہ ملک گجراتم دادند

لیکن جب خاندان مبارک کو دربار حکومت میں عروج ہوا اور دربار شاہی کی مذہبی حالت دگرگوں نظر آئی تو ہندوستان سے قطع تعلق کر کے مکہ معظمہ چلے گئے ۔''(۱)

زمانہ حال کے بعض محقق اہل قلم کا بھی یہی خیال ہے، ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''اپنے والد کی وفات ۹۹۰ھ کے بعد وہ اکبر بادشاہ کے دربار میں فتح پور میں پہنچے، اس زمانہ میں یہاں کے دانشوروں کا اچھا مجمع تھا، اس نے شیخ کا بڑھ کر استقبال کیا اور بادشاہ کی جانب سے بھی بڑی پذیرائی ہوئی ۔''(۲)

مگر شیخ کو جلد ہی متنبہ ہو گیا کہ وہ غلط جگہ آ گئے ہیں، اس ماحول میں دین وایمان سلامت نہیں رہ سکتا کیوں کہ دربار کی دینی حالت روز بروز دگرگوں ہوتی جارہی ہے اور وابستگان دولت ان کو استعمال کر کے اپنے اثر ورسوخ کو بڑھانا اور اپنے غلط مقاصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس لیے ان کو یہاں گھٹن محسوس ہونے لگی اور وہ یہاں سے بالکل ہی دل برداشتہ ہو گئے، چنانچہ مکہ پہنچ کر وہ اپنے پیرومرشد شیخ عبدالوہاب سے اس کی اس طرح فریاد کرتے ہیں:

''سیدی! صغر سنی ہی سے علم وعبادت گزاری کی محنت وریاضت میں میری نشوونما ہوئی ہے، میں نے عام لوگوں کے اختلاط اور میل جول سے اپنے کو الگ رکھا اور جب فضل خداوندی سے مجھے علم کا اچھا خاصہ حصہ مل گیا اور میں نے یہاں کی اپنی ضرورتیں پوری کر لیں تو بعض اہل حقوق نے مجھے اہل دنیا کی طرف بلایا، چنانچہ میں بادشاہ وقت اور امرا کے یہاں گیا،

---

(۱) تذکرہ مرتبہ مالک رام مطبوعہ ساہتیہ اکاڈمی، ص۳۴۔ (۲) مقدمہ رسالہ نوریہ سلطانیہ، ص۲۔

انہوں نے میری جانب بہت اعتنا کیا، میرا رتبہ بلند کیا اور یہ چاہا کہ میرے ذریعہ سے اپنی جماعت بڑھائیں اور مجھ ناتواں سے اپنی قوت مستحکم کریں لیکن اللہ نے مجھے محفوظ رکھا اور ان کے ساتھ مجھے نہیں چھوڑا، اپنے بندہ کے دل میں ایک جذبہ پیدا کیا جس نے اس مقام شریف تک پہنچایا۔''(۱)

اس بیان سے درباری لوگوں کے ذہن و مزاج اور شیخ کی جانب ان کے غیر معمولی اعتنا و اعزاز کے اسباب بھی معلوم ہو جاتے ہیں، ان چیزوں کی وجہ سے ان کی طبیعت اچاٹ ہوگئی اور ان پر ایسی وحشت و گھبراہٹ طاری ہوئی کہ وہ دنیاوی جاہ و منزلت کو ٹھکرا کر اپنے گوشۂ عزلت میں پناہ گیر ہو جانے کے لیے مجبور ہو گئے۔

دربار میں شیخ کب پہنچے، کتنے روز وہاں مقیم رہے، کب واپس ہوئے اور وہاں ان کی سرگرمیاں اور مشغولیتیں کیا تھیں؟ ان چیزوں کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، لیکن ان کے علمی ذوق و شغف کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دربار میں بھی انہوں نے درس و افادہ اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا ہوگا، شیخ محمد اکرام رقم طراز ہیں:

''یہاں آپ نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کیا لیکن علمی اور روحانی ترقیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا اور ایک برگزیدہ اور نذر بزرگ سے اسی زمانہ میں بیعت ہوئی۔''(۲)

حجاز جانے سے قبل شیخ کے درس و افادہ کا غلغلہ بلند کرنے کا ذکر بہت پہلے آ چکا ہے اس لیے ممکن ہے یہ سلسلہ یہاں بھی قائم رہا ہو مگر دربار میں پہنچ کر بیعت ہونے کی بات درست نہیں معلوم ہوتی کیوں کہ شیخ اپنے والد کے ایما سے ان کی زندگی ہی میں ۹۸۵ھ میں بیعت ہو چکے تھے اور ان کے انتقال ۹۹۰ھ کے بعد دربار سے متوسل ہوئے، گو اس کا کوئی متعین ثبوت نہیں ہے تاہم مؤرخین کے اشارات اور بعض قرائن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

(۱) المکاتیب والرسائل، ص۲۷۹، بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۹۲۔ (۲) رود کوثر، ص۳۴۸۔

اب رہا یہ سوال کہ دربار میں کس زمانہ میں پہنچے اور کب تک رہے تو اس کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ وہ اپنے والد کے انتقال ۹۹۰ھ کے بعد وہاں تشریف لے گئے تھے۔

یہ بات بھی ثابت ہے کہ شیخ دربار سے دل برداشتہ ہو کر ۹۹۵ھ ہی میں حج کے قصد سے روانہ ہو گئے تھے، اس لحاظ سے ۹۹۰ھ کے بعد اور ۹۹۵ھ کے درمیان انہوں نے کچھ عرصہ کے لیے فتح پور میں قیام کیا، کیوں کہ ملا عبدالقادر بدایونی کے الفاظ '' وچندگاہے در فتح پور '' سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ فتح پور میں زیادہ مدت تک نہیں رہے، اس بنا پر شیخ محمد اکرام کا یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا کہ '' سیکری میں شیخ عبدالحق کا قیام کوئی دس بارہ برس رہا ہوگا '' (۱) کیوں کہ دس بارہ برس کی مدت کو '' چندگاہے '' نہیں کہہ سکتے، معلوم ہوتا ہے کہ صاحب رود کوثر شیخ کی بیعت ۹۸۵ھ ہی سے ان کو فتح پور میں مقیم خیال کر بیٹھے ہیں جب کہ قوی بات یہ ہے کہ وہ ۹۹۰ھ کے بعد وہاں تشریف لے گئے، اس لیے اگر ۹۹۰ھ اور ۹۹۵ھ تک کے تمام درمیانی عرصہ کو بھی شیخ کے فتح پور کا زمانہ مان لیا جائے تب بھی دس بارہ برس فتح پور میں قیام کرنا درست نہیں معلوم ہوتا۔

سفر حجاز: شیخ عبدالحق دربار اکبری میں شریعت محمدی کی بے حرمتی اور پامالی نیز علمائے سو اور مفاد پسند امرا کی دنیا طلبی کے لیے ہنگامہ آرائی اور ریشہ دوانی سے گھبرا کر اپنے وطن دہلی واپس آ گئے مگر یہاں بھی ان کو سکون و قرار نہ ملا بلکہ ان کی وحشت و بیزاری میں برابر اضافہ ہوتا رہا، غالباً وہ یہ سمجھتے تھے کہ اکبر کے عروج و اقبال اور مستحکم اقتدار کی موجودگی میں دین کی خدمت و اشاعت اور شریعت محمدی کی حفاظت و صیانت ممکن نہیں، ایسے ماحول اور ناسازگار حالات میں آدمی کے لیے دین و ایمان پر قائم رہنا بھی مشکل ہے، اس لیے انہوں نے وطن چھوڑ کر دربار خداوندی میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا، اس موقع پر توفیق الٰہی نے دستگیری کی اور ان کا جذبہ صادق دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے گھر کی طرف بلا لیا، اس کا ذکر کرتے ہوئے

(۱) رود کوثر ص ۳۴۹۔

وہ خود رقم طراز ہیں:

''اللہ کی طرف رجوع و انابت کرنے والا خائب و خاسر نہیں ہوتا، جس نے اس کی پناہ طلب کی اس کو نجات ملی، چنانچہ دفعتاً بے کسوں کے چارہ گر اور پریشان حال لوگوں کے راہ نما نے مجھے اپنی طرف لیا اور مجھ بے خانماں کی گردن میں زنجیر شوق ڈال کر اپنے گھر کی طرف کھینچ لیا اور مجھ نامراد کو منزل مراد تک پہنچا دیا، یعنی اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی درگاہ میں جگہ دی اور حریم مرحمت وعنایت سے محروم واپس نہیں کیا۔''(۱)

اپنے شیخ و مرشد عبدالوہاب متقی سے بھی اس خاص فضل خداوندی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا''لیکن اللہ نے مجھے محفوظ رکھا اور ان (امرا) کے ساتھ مجھے نہیں چھوڑا، اپنے بندہ کے دل میں ایک جذبہ پیدا کیا جس نے اس مقام شریف تک پہنچا دیا۔''

شیخ عبدالحق نے زاد المتقین اور جذب القلوب وغیرہ میں بھی ہندوستان کے ماحول سے اپنی وحشت و بیزاری اور غیب سے حج و زیارت کے جذبہ خالص پیدا ہو جانے کا ذکر کیا ہے، ملا عبدالقادر بدایونی کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے:

''جب زمانہ اور ابنائے زمانہ کی فتنہ سامانی اور مکروہات نیز واقف و آشنا لوگوں کی وضع وروش سے تنگ آ گئے اور فلاں وفلاں اشخاص کی صحبت سازگار نہ دکھائی دی تو کعبہ شریف جانے کی توفیق ان کے شامل حال ہوئی اور جذبہ کے عالم میں بغیر کسی ساز وسامان کے وہ دہلی سے گجرات کو روانہ ہوئے اور مرزا نظام الدین احمد مرحوم کی مساعی جمیلہ اور امداد سے جہاز میں بیٹھ کر حجاز کے سفر پر روانہ ہوئے۔''(۲)

شیخ عبدالحق حج وزیارت کعبہ کے ارادہ سے دہلی سے روانہ ہوئے تو پہلے اجین و

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۹۴۔ (۲) منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۱۱۳۔

مالوہ میں وہاں کے امیر و حاکم خان اعظم میرزا عزیز کوکہ کے یہاں قیام کیا، یہ اکبر کا رضاعی بھائی اور بڑا لائق شخص تھا، علمی فضائل کے ساتھ ہی حسن سیرت اور حسن اخلاق سے بھی متصف تھا، اس نے شیخ کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا، اسی نے زاد و راحلہ مہیا کیا تو احمد آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ (۱)

مالوہ سے مانڈو پہنچے، یہاں محمد غوثی شطاری صاحب گلزار ابرار نے ان سے ملاقات کر کے استفادہ کیا (۲) ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مالوہ ہوتے ہوئے ۹۹۵ھ میں گجرات پہنچے تھے، احمد آباد میں مرزا نظام الدین احمد صاحب طبقات اکبری نے ان کا استقبال کیا، یہ ان دنوں یہاں کے بخشی تھے، ان کے اصرار پر شیخ آئندہ موسم حج تک کے لیے یہاں رکے رہے۔ (۳)

گجرات کے قیام کے زمانہ میں وہ حضرت شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور ان کے طریقہ قادریہ کے بعض اشغال واذکار بھی سیکھے، شیخ وجیہ الدین جید عالم اور جامع کمالات کے بزرگ تھے، علم ظاہر کی طرح علم باطن کی دولت سے بھی مالا مال تھے، ان کو مختلف بزرگوں کی صحبت نصیب ہوئی اور آخر میں سید محمد غوثی گوالیاری شطاری کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے، احمد آباد میں ان کا حلقۂ درس مدتوں قائم رہا، وہ صاحب تصنیف کثیرہ بھی تھے، شیخ عبدالحق ان سے اپنے فیض یاب ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''راقم سطور جس وقت سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے قصد سے اس دیار (گجرات) میں پہنچا تو اس نے یہاں کے متاخرین مشائخ میں شیخ وجیہ الدین کی ملاقات کی سعادت حاصل کی اور سلسلۂ عالیہ قادریہ کے کچھ اذکار واشغال بھی ان سے سیکھے۔'' (۴)

---

(۱) گلزار ابرار، اردو ترجمہ، ص ۵۵۹، بحوالہ حیات شیخ عبدالحق، ص ۹۲۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً۔ (۴) اخبار الاخیار، ص ۱۵۳۔

مؤرخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عبدالحق نے گجرات میں بڑی مشغول زندگی بسر کی، اس کی کسی قدر تفصیل شیخ محمد اکرام نے بھی تحریر کی ہے، ملاحظہ ہو:

''پھر احمد آباد پہنچے اور اپنے قدیمی دوست مرزا نظام الدین صاحب طبقات اکبری کے پاس قیام کیا جو ان دنوں صوبہ گجرات کے بخشی تھے، یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جہاز کا موسم گزر چکا ہے، چنانچہ کوئی ایک سال تک رکنا پڑا، اس دوران میں علمی اور روحانی مشاغل برابر جاری رہے بلکہ شاید آپ کے مشہور تذکرۃ الاولیا، اخبار الاخیار کے زیادہ وسیع نقطہ نظر اور زیادہ صحیح معلومات کا ایک سبب یہ ہے کہ آپ نہ صرف دہلی کے اہل علم یا ان بزرگوں سے جو اپنی ضروریات کے سلسلے میں دارالخلافہ میں آتے تھے، واقف تھے بلکہ آپ نے (حجاز کے علاوہ) پنجاب، بندیل کھنڈ، مالوہ اور گجرات کا سفر کیا تھا، وہاں کی زیارتیں دیکھی تھیں، اہل علم سے ملاقاتیں کی تھیں اور اطراف ملک کی روحانی زندگی سے ذاتی واقفیت تھی، احمد آباد میں آپ کو وہاں کے سب سے برگزیدہ عالم شیخ وجیہ الدین علوی سے ملنے اور فیض پانے کا موقع ملا اور اخبار الاخیار میں آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے ان سے قادریہ سلسلہ کے کئی اذکار و اشغال بھی حاصل کیے، مولانا سلیمان کردی نے (جن کے صاحبزادے مولانا احمد کردی احمد آبادی گجرات کے مشہور فاضل شیخ نورالدین احمد آبادی کے استاد تھے) آپ سے احمد آباد میں حدیث پڑھی۔''(۱)

گجرات سے روانہ ہو کر مکہ معظمہ تشریف لائے تو یہاں کے علما سے اپنی تشنگی بجھائی اور ان سے احادیث کی سند کی، یہاں سب سے زیادہ حضرت شیخ عبدالوہاب متقی کی ذات گرامی

(۱) رود کوثر، ص ۳۵۱، ۳۵۲۔

ان کی عقیدت و شیفتگی کا مرکز رہی، ان سے علم و فن کی تکمیل بھی کی اور سلوک و احسان کی راہیں بھی طے کیں۔

شیخ عبدالحق نے پہلے ان سے مشکوٰۃ کا درس لیا اور آخر میں صحیح مسلم پڑھی، ان کی خدمت میں رہ کر خلوت و ذکر الٰہی سے لذت آشنا ہوئے اور تصوف کے سلسلہ قادریہ شاذلیہ مدنیہ و چشتیہ کی ان سے اجازت بھی پائی، ان کی رہنمائی میں تصوف کے اسرار و آداب بھی سیکھے اور اس کی متعدد کتابیں بھی پڑھیں، منهج السالک الی اشرف المسالک اور قواعد الطریقة فی الجمع بین الشریعة والحقیقة کا خاص طور پر ان سے درس لیا، شیخ عبدالوہاب کی تعلیم و تربیت نے دراصل ان کی زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا جس کی تفصیل حسب موقع آگے آئے گی۔

حج و زیارت مدینہ: غرض حجاز کے قیام میں انہوں نے بڑے علمی و روحانی مراتب طے کیے، مگر شیخ نے یہ مقدس اور بابرکت سفر اپنی وحشت دل اور اضطراب و بیزاری دور کرنے کے لیے کیا تھا، اس لیے خیال ہے کہ انہوں نے زیادہ عرصہ حرمین میں گزارا ہوگا تاکہ ہر سال حج و زیارت کعبہ سے مشرف ہوکر بیش از بیش اس کی روحانی برکتیں اور سعادتیں حاصل کریں، وہ عشق نبوی میں بھی سرشار تھے، اس لیے دربار نبوت میں حاضر ہوکر مدینہ کے انوار و برکات سے بھی متمتع ہونے کے لیے بھی نہایت بے تاب تھے، وہ تین برس سے زیادہ حرم میں مقیم رہے، ظاہر ہے یہ موقع انہوں نے غنیمت سمجھا ہوگا اور ہر سال حج و زیارت سے مشرف ہوئے ہوں گے مگر تذکرہ نگاروں نے ایک یا دو بار حج کرنے کا ذکر کیا ہے۔

یہ پہلے گزر چکا ہے کہ وہ اپنے گھربار اور اعزہ و اقارب کو ۹۹۵ھ ہی میں چھوڑ کر اس مقدس سفر کے لیے دہلی سے روانہ ہوئے تھے، مگر یہ پورا برس گجرات ہی میں گزارنا پڑا اور وہ ۹۹۶ھ میں مکہ معظمہ تشریف لے جا سکے۔

شیخ کی حجاز سے ہندوستان سے واپسی ۱۰۰۰ھ میں ہوئی مگر مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ

۹۹۹ھ کے ختم ہونے سے پہلے ہی اپنے پیر و مرشد شیخ عبدالوہاب متقی کے حکم سے مکہ معظمہ چھوڑ چکے تھے، اس طرح گویا تین حج کا زمانہ ان کو مکہ میں ملا مگر بعض مؤرخین کے خیال کے مطابق انہوں نے ایک دفعہ اور بعض کے بیان کے مطابق دو دفعہ حج کیا۔

کہا جاتا ہے کہ ۹۹۶ھ میں مکہ معظمہ پہنچے تو اس سال فریضۂ حج ادا کیا، مکہ پہنچنے کے دس ماہ بعد ۲۳ ربیع الثانی ۹۹۷ھ کو مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے اور رجب ۹۹۸ھ کے آخر تک وہیں رہے، اس کے بعد دوبارہ مکہ معظمہ تشریف لائے اور اس سال دوسری دفعہ حج کیا، شعبان ۹۹۹ھ کے آخری ایام میں طائف تشریف لے گئے، پھر مکہ معظمہ آکر تھوڑی مدت تک قیام کرنے کے بعد اسی سال ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے۔(۱)

دوسرے مؤرخین کا خیال ہے کہ ان کا تمام وقت علوم کی تحصیل میں گزرا اور انہوں نے صرف ایک بار فریضۂ حج ادا کیا، خافی خاں لکھتے ہیں:

بعد ادائے حج واجب مدت مدید محض برائے تحقیق صحت احادیث دراں مکاں بسر بردہ۔(۲)	فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد وہ مدت مدید تک صحت و تحقیق احادیث کی غرض سے اسی جگہ مقیم رہے۔

اس سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف ایک بار فریضۂ حج ادا کیا، اس کے علاوہ انہوں نے سارا وقت علمی مشاغل اور احادیث کی طلب و تحصیل میں گزارا۔

سب سے زیادہ حیرت ناک بیان ملا عبدالقادر بدایونی کا ہے، وہ حضرت شیخ کے معاصر اور اہل تعلق تھے، انہوں نے ان کی مدینہ طیبہ کی حاضری کی تردید کی ہے، لکھتے ہیں:

وبجہت تیغ بعضے موانع طبیعی بمدینہ طیبہ سکینہ علی ساکنہا السلام والتحیات نتوانست مشرف شد۔(۳)	بعض طبعی اسباب و مواقع کی وجہ سے مدینہ طیبہ کی زیارت سے مشرف نہیں ہو سکے۔

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۰۲ و فوائد جامعہ، ص۱۴۔ (۲) منتخب اللباب حصہ اول، ص۲۴۰۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

ہمارے خیال میں ملا صاحب کا یہ بیان محل نظر ہے۔ حضرت شیخ تو مدینہ طیبہ پہنچنے اور دربار نبوی میں حاضری کے لیے سراپا شوق واضطراب بنے ہوئے تھے، ایسی صورت میں تین برس تک وہاں قیام کرنے کے باوجود بھلا وہ کس طرح زیارت مدینہ سے محروم رہتے، پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

"شیخ عبدالحق دہلوی کو رسول اکرم ﷺ کی ذات پاک سے عشق تھا، دیار حبیب میں داخل ہوتے تو برہنہ پا ہو جاتے تھے، تحفۃ الکرام میں لکھا ہے:

درمدینہ برہنہ پا گردیدے۔(۱)   مدینہ میں ننگے پاؤں پھرتے تھے۔"

خود شیخ نے مدینہ طیبہ کے انوار و برکات اور فتوحات وانعامات کا جس والہانہ و سرشارانہ انداز میں ذکر کیا ہے وہ بھی ملا صاحب کے بیان کو مشکوک اور نامعتبر بنا دیتا ہے، فرماتے ہیں:

"مجھ فقیر حقیر کو حضرت بشیر نذیر صلی اللہ علیہ وسلم کے اکرام وانعام سے جو بشارتیں ملیں ان کی جانب اشارہ بھی نہیں کیا جا سکتا، مجھے امید ہے کہ اس کے آثار وانوار ظاہر ہوتے رہیں گے۔"(۲)

ایک اور جگہ درگار سید المرسلینؐ کے اپنے اوپر مخصوص انعام واکرام کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی صراحت بھی کی ہے کہ انہیں خواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ولقا کا شرف دو بار حاصل ہوا، آپ سے بلا واسطہ حدیث کا سماع کیا اور مقصود ومراد پا لینے کی بشارت پائی۔(۳)

حجاز سے واپسی کے بعد کے بعض واقعات: شیخ عبدالحق حرمین چھوڑ کر ہندوستان

سابقہ حاشیہ: (۳) منتخب التواریخ، جلد سوم، ص۱۱۳۔

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۱۲۔ (۲) اخبار الاخیار، ص۲۹۴۔ (۳) فہرس التوالیف بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۴۰۔

واپس آنے کے لیے آمادہ نہ تھے مگر مرشد و مربی کے حکم کے آگے ان کی کچھ نہ چل سکی، ان کی طرف سے جس قدر حجاز میں قیام کے لیے اصرار ہو رہا تھا مرشد کی جانب سے اسی قدر شدت سے ہندوستان واپسی پر زور دیا جا رہا تھا، بالآخر ۹۹۹ھ کے آخر میں انہوں نے حجاز چھوڑ دیا اور ۱۰۰۰ھ میں دہلی واپس آ گئے۔

شیخ جن حالات سے دل برداشتہ ہو کر ہندوستان سے گئے تھے وہ ان کی واپسی کے بعد بھی برقرار تھے لیکن اب ان کی علمی و روحانی تعلیم و تربیت ہر طرح سے مکمل ہو چکی تھی اور وہ حرمین کے انوار و برکات کا مشاہدہ بھی کر چکے تھے، اس لیے وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تازہ دم ہو گئے تھے، چنانچہ انہوں نے دینی علوم کی خدمت و اشاعت کے لیے اپنی مسند درس و ارشاد بچھائی اور علم دین اور رشد و ہدایت کی شمع روشن کر کے الحاد، بے دینی اور بدعات کا قلع قمع کرنے کا فیصلہ کیا، ان کی سرگرمیوں کا ذکر آگے حسب موقع کیا جائے گا۔

شیخ کی حج سے واپسی کے بعد فیضی نے متعدد خطوط لکھ کر شوق ملاقات ظاہر کی اور لاہور تشریف لانے کی دعوت کی، مگر غالباً گزشتہ تلخیوں کی وجہ سے شیخ اس کے پاس جانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور انہوں نے معذرت لکھ بھیجی (۱) ملا عبدالقادر بدایونی کو بھی شیخ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا، چنانچہ کچھ وقت نکال کر وہ بدایوں سے دہلی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جب اس کے بعد لاہور گئے تو ان کے اور شیخ کے درمیان خط و کتابت بھی رہی۔ (۲)

اتفاق سے شیخ کی واپسی کے وقت حضرت خواجہ باقی باللہ بھی دہلی آئے ہوئے تھے، شیخ عمر میں ان سے بڑے تھے، اس کے باوجود انہوں نے ان سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور ان کے دامن تربیت سے وابستہ ہو کر نقشبندیہ طریقہ کی تحصیل کی، محمد صادق دہلوی ان دونوں بزرگوں کے معاصر تھے، وہ کلمات الصادقین میں لکھتے ہیں کہ شیخ محدث حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے روحانی اشارے پر حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت ہوئے تھے اور

(۱) منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۱۱۵۔ (۲) ایضاً ص ۱۱۴۔

خواجہ صاحب ان سے لطف وکمال تواضع کے ساتھ پیش آئے۔(۱)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مجموعہ مکاتیب میں خواجہ صاحب کے نام سات خطوط ہیں جن میں متعدد اہم معاملات میں ان سے رہنمائی طلب کی گئی ہے، ان مکاتیب سے شیخ محدث کی ان سے عقیدت وشیفتگی اور دونوں کی باہمی محبت وخصوصیت اور اخلاص کا پتہ چلتا ہے، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ''ہمارے شہر میں نسبت نقشبندیہ کے داعی اور طالبین کے مرشد عارف کامل مولانا خواجہ محمد باقی قدس سرہ ہیں، وہ اس طریقہ سے ہمارے بھی شیخ ہیں'' اور رسالہ وصیت میں لکھا ہے کہ:

''جب ہندوستان واپس آیا تو خواجہ محمد باقی نقشبندی کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، ان سے عرصہ تک خواجگان کی نسبت کی مشق وتربیت حاصل کی اور ذکر، مراقبہ، رابطہ، حضور اور یادداشت کی تعلیم پائی۔''(۲)

شیخ عبدالوہاب متقی کی وصیت وہدایت: شیخ عبدالحق محدث نے حجاز پہنچ کر شیخ عبدالوہاب متقی کو اپنی قلبی کشمکش اور ہندوستان سے بیزاری کے جو اسباب بتائے اس کی بنا پر شیخ متقی نے ہندوستان واپس ہوتے وقت انہیں خاص طور پر گوشہ گیری اور عدم اختلاط کی تلقین اور مکمل یکسوئی وانہماک کے ساتھ علم ودین کی خدمت اور رشد وہدایت کا کام انجام دیتے رہنے کا مشورہ دیا تاکہ اہل دنیا انہیں دربار وغیرہ سے وابستہ کرکے ان کے اصلی کاموں اور علمی ودینی مشاغل سے منحرف وغافل نہ کرسکیں، شیخ عبدالحق ان کی اس تلقین اور حجاز سے واپسی کے بعد مشاغل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انہوں نے فرمایا سبحان اللہ! کیا بہتر ہوتا اگر وہ ایک پیر سے معذور ہوجاتا اور گمنامی اور گوشہ عزلت میں بیٹھا رہتا، کیوں کہ وہ وصول وقبول کے مرتبہ کو پہنچا ہوا ہے، پھر فرمایا لیکن یہ عزلت نشینی بڑا دشوار کام ہے اور

(۱) مرآۃ العالم، بختاور خان، ج۲، ص۴۴۴۔ (۲) بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۳۶ و ۱۳۷۔

اس میں ثابت قدم رہنا آسان نہیں، اس معاملہ میں اصل بات یہ ہے کہ انسان لوگوں سے اشتراک عمل کرے، امور خیر میں ان کے ساتھ رہے اور ان کی بری باتوں سے بچے، بس اسی وجہ سے بندہ نے لوگوں سے میل جول نہیں رکھا، حج سے واپسی کے بعد حریص، لالچی اور جھگڑالو حاجیوں کی طرح بلاد دکن، بیجاپور، برہان پور کی طرف نہیں گیا اور نذرانے وصول نہیں کیے، جو درویشوں اور اس طریقہ کے رہبروں پر لازم ہے، پس الحمدللہ وہ آفتوں سے بچ کر اور خدا کی مقدور کی ہوئی برکتیں لے کر اپنے وطن مالوف دہلی کو واپس آ گیا، جو فقرا اور درویشوں کا ٹھکانا اور عشاق محبین کا مسکن ہے اور اللہ پر بھروسہ اور اس کے فضل و کرم کا طالب ہو کر فقر کے دروازے پر بیٹھ گیا، شیخ نے مجھے خلوت، عزلت اور الگ تھلگ رہنے کا حکم دیا تاہم انہوں نے اس معاملہ میں آزمائش کا خیال کر کے نرمی اور رخصت سے کام لیا، تاکہ دشواری اور زحمت کا باعث نہ بنے، چنانچہ یہ بندہ ناتواں اللہ کی توفیق کے مطابق اپنے تمام اوقات اعمال و اشغال کو انجام دینے میں بسر کرتا ہے لیکن بعض اوقات اور بعض حالات میں کہیں کہیں جاتا بھی رہتا ہے اور بعض احباب و اصحاب خیر کی خدمت میں حاضر ہونے کی اور ان کی زیارت کا شرف بھی حاصل کرتا ہے، اس طرح اغیار کے اختلاط اور نقصان اٹھانے کی داغ سے محفوظ رہتا ہے۔"(۱)

لاہور کا سفر اور شاہ ابو المعالی سے استفادہ: شیخ عبدالحق شیخ عبدالوہاب متقی کی تاکید و وصیت کے مطابق دہلی میں فروکش رہ کر یکسوئی کے ساتھ علمی خدمت میں مشغول رہے مگر ان کی سہولت اور رخصت سے بھی فائدہ اٹھایا، اس لیے اہل علم کی خدمت میں حاضری

(۱) فوائد جامعہ، ص۱۹ و ۲۰۔

اور مشائخ کے پاس جانے کا وقتاً فوقتاً موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے، خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں فیض حاصل کرنے کے لیے جانے کا اوپر ذکر آیا تھا، اب ان کے لاہور جا کر مشہور شیخ طریقت حضرت شاہ ابوالمعالی سے ملاقات کا حال بیان کیا جاتا ہے۔

شاہ ابوالمعالی سلسلۂ قادریہ کے صاحب کمال بزرگ اور شیخ داؤد کے مرید وخلیفہ تھے، شیخ عبدالحق ان کے بڑے قدرداں اور عقیدت مند تھے، شاہ صاحب بھی ان کے اور ان کی تصنیفات کے بڑے مداح تھے، وہ فرماتے تھے کہ ''ہم نے تمہاری کتابوں سے دینی و دنیاوی فائدے حاصل کیے ہیں۔''

انہوں نے شیخ عبدالحق کو مشکوٰۃ کی شرح کی تکمیل کی خاص طور پر ہدایت کی تھی، وہ جب ان سے رخصت ہو کر دہلی واپس ہو رہے تھے انہوں نے فرمایا کہ ''مشکوٰۃ کی شرح مکمل کر دو، انشاء اللہ اس سے ایک عالم مستفید ہوگا'' شیخ نے کتاب کی تکمیل کے لیے دعا کی درخواست کی تو ارشاد ہوا کہ وہ پوری ہو جائے گی، انہوں نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ شرح میں جا بجا اشعار بھی درج کریں تا کہ انداز بیان دلچسپ ہو۔(۱)

فتوح الغیب کی شرح بھی شاہ ابوالمعالی کے اصرار سے لکھی تھی۔(۲)

شاہ ابوالمعالی صاحب تصنیفات بھی تھے، شعرا کے کلام پر بھی ان کی اچھی نظر تھی، خود بھی مشقِ سخن فرماتے تھے، غربتی تخلص تھا، شیخ عبدالحق کو ان سے غیر معمولی عقیدت تھی اور انہوں نے تصوف وسلوک میں ان کے بلند مرتبہ، بکثرت ریاضت ومجاہدہ اور مقبولیت وغیرہ کا نہایت وسعت قلب سے اعتراف کیا ہے(۳) وہ ان کی غیر معمولی عظمت ہی کی وجہ سے ان سے اصلاح اور رہنمائی کے بھی طالب ہوئے تھے، شاہ صاحب کا ان پر اس قدر اثر تھا کہ وہ کچھ عرصہ کے لیے ان کی مرضی سے لاہور میں مقید ہو گئے تھے، حضرت شاہ ابوالمعالی نے بھی ان لوگوں کے اختلاط اور میل جول سے سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا اور وہ ہر طرف سے

(۱) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۵۴۔ (۲) شرح فتوح الغیب، ص ۴۲۱۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۱۹۵۔

یکسو ہو کر محنت و توجہ سے اپنا کام انجام دیتے رہنے کی ہدایت فرمائی تھی، اس معاملہ میں انہوں نے شیخ عبدالوہاب متقی کی طرح کوئی رخصت اور نرمی نہیں برتی تھی، یہاں تک تاکید کی تھی کہ وہ دہلی سے باہر قدم نہ نکالیں۔

درس و تدریس اور مدرسہ: شیخ عبدالحق کے کارناموں، علمی و دینی مشاغل اور عملی سرگرمیوں کی باقاعدہ ابتدا حجاز کے سفر سے واپسی کے بعد ہوتی ہے، اس زمانہ میں انہوں نے گوناگوں دینی، علمی اور تعلیمی خدمات انجام دیے، اس سلسلہ میں ان کا ایک نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ وہ حجاز سے آنے کے بعد مدۃ العمر درس و تدریس کی مسند پر فروکش رہے، اس کے لیے انہوں نے جو دینی مدرسہ قائم کیا تھا اس میں ایک نیا اور عام حلقہ ہائے درس سے مختلف نصاب تعلیم داخل کیا تھا۔

گو حجاز کی روانگی سے پہلے ان کے علمی فیضان کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، مگر حجاز سے واپسی کے بعد دینی علوم کی نشر و اشاعت اور کتب دینیہ خصوصاً احادیث کی تعلیم کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور تقریباً ۵۲ برس تک درس و تدریس کے مشغلہ میں پوری یکسوئی، انہماک اور سرگرمی سے لگے رہے، اس کے لیے اپنا خواب و خور حرام کر دیا، ساری دلچسپیاں اور لذتیں ترک کر دیں، سیر و سفر اور لوگوں سے ملنا جلنا سب چھوڑ دیا جس کی شیخ عبدالوہاب متقی اور شاہ ابوالمعالی نے ان کو خاص طور پر ہدایت بھی کی تھی۔

ان کے حلقۂ درس و تدریس اور تعلیمی اصلاح و انقلاب کی خصوصیت و اہمیت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کے عہد کے علمی و تعلیمی حالات کا مرقع بھی پیش نظر رہے۔

ہندوستان میں دینی علوم بالخصوص قرآن و حدیث کی تعلیم و تعلم کی جانب کم توجہ رہی، چنانچہ سندھ اور ملتان وغیرہ سے عربوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد جب غزنوی اور غوری سلاطین برسر اقتدار آئے تو ان کے زمانے میں ایران، خراسان اور ماوراء النہر کے علاقوں سے جو اصحاب علم و درس ہندوستان آئے ان کو دینی علوم و تفسیر و حدیث میں زیادہ

درخور نہ تھا، اس کی وجہ سے یہاں علم حدیث عنقا کی طرح معدوم ہوگیا اور نجوم، فلکیات، ریاضی اور منطق و فلسفہ پر ساری توجہ مرکوز کر دی گئی، قرآن مجید اور سنت نبوی کو پڑھنے پڑھانے کے بجائے دینی علوم میں صرف فقہ و تصوف سے سروکار باقی رہ گیا تھا، فقہ میں سارا زور فقہ حنفی کے فروع و جزئیات پر صرف کیا جاتا تھا، علم حدیث کی کسمپرسی اور غربت کا یہ حال تھا کہ اس سے صرف اس بنا پر اور اس حد تک سروکار رہ گیا تھا کہ فقہی بحثوں میں کہیں کہیں حدیثوں کا ذکر آ جاتا تھا، حدیث کی امہات کتب کے بجائے صرف صغانی کی مشارق الانوار درس و تدریس میں داخل تھی، اگر کسی نے اس سے سوا توجہ دی تو مصابیح السنۃ بغوی اور مشکوٰۃ المصابیح کو بھی دیکھ لیا، محدث بننے کے لیے بس اسی قدر کافی تھا، نواب صدیق حسن خاں اور مولانا حکیم سید عبدالحیٔ دونوں نے ہندوستان کے اسلامی مدارس اور علما کے درس کی اس دردناک حالت کا ذکر کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''علم حدیث کا سرے سے کوئی چرچا نہ تھا، لوگ نہ خود اس کی جانب مائل تھے اور نہ دوسروں کو اس کے حصول کی کوئی ترغیب دیتے تھے، وہ اس فن کی کتابوں سے ناواقف اور محدثین کے ناموں سے ناآشنا تھے، بہت تھوڑے لوگ صرف مشکوٰۃ پڑھ لیتے تھے اور وہ بھی محض حصول برکت کے لیے، اس پر عمل کرنا اور اس کو سمجھنا ان کا مقصد نہ ہوتا، فقہ میں صرف فقہ حنفی اور علمائے ماوراء النہر کے فتووں اور اجتہادات پر قانع ہو گئے تھے اور محض فروع و جزئیات میں الجھے رہتے تھے، ان کا راس المال فقہ تھی وہ بھی تقلیدی رنگ و انداز میں، تحقیق سے معدودے چند لوگوں کو ہی دلچسپی تھی۔'' (۱)

مولانا سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

> ''محمد تغلق المتوفی ۷۵۲ھ جس کے براہ راست تعلقات مصر کی

(۱) الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ، ص ۷۰ و الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، ص ۱۳۵ تا ۱۳۸۔

عباسی خلافت سے تھے اور اس کی طرف سے اس کو حکومت کا فرمان، خلعت اور علم بھی ملتا تھا اور خلیفہ عباسی سے اس نے بیعت بھی کی تھی، اس کا قاعدہ تھا کہ جب لوگوں سے بیعت لیتا تھا تو مصر کے خلیفہ عباسی کے فرمان کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور مشارق الانوار کا نسخہ سامنے رکھ لیتا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک ہندوستان میں قرآن پاک کے بعد احادیث میں صرف مشارق الانوار کا وجود تھا، جب شاہی کتب خانہ کا یہ حال تھا تو عام لوگوں کی دسترس کا کیا پوچھنا ہے۔

الغرض شیخ عبدالحق محدث سے پہلے صرف مشارق الانوار للصاغانی اللاہوری (متوفی ۶۵۰ھ) کے نسخے اور کہیں کہیں مصابیح (اصل مشکوٰۃ) البغوی (المتوفی ۵۱۶ھ) کے نسخے دستیاب ہوتے تھے اور یہی دو کتابیں یہاں کے علما کے درس میں تھیں۔''(۱)

علما اور اصحاب درس کی حالت یہ تھی کہ وہ نہ نصوص کی پروا کرتے تھے اور نہ بحث و استدلال میں احادیث کو حجت و بنیاد بناتے تھے، اجتہاد و تحقیق کا دروازہ ہی سرے سے بند تھا، فقہی اقوال کو قرآن و حدیث کی کسوٹی پر تولنے کے بجائے خود قرآن و حدیث کی کسوٹی فقہ کو بنا لیا گیا تھا، نصوص کی بے دھڑک توجیہ و تاویل کی جاتی تھی یا سرے سے ان کو ترک ہی کر دیا جاتا تھا، معقولات کی جانب بڑھتے ہوئے رجحان اور فلسفہ و کلام سے کثرت اشتغال کی وجہ سے دین کی حقیقت و صورت مسخ اور شریعت محمدی کی روح غائب ہوتی جا رہی تھی اور بدعتوں اور گمراہیوں کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔

حدیث نبوی سے بے اعتنائی و بے رغبتی اور منطق و فلسفہ سے غیر معمولی شغف کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ ایران سے آنے والے علما نے علوم عقلیہ کو خاص طور پر بڑا رواج اور

(۱) مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۷۴ و ۷۵۔

فروغ دیا، شیخ فتح اللہ شیرازی نے متاخرین علمائے ایران محقق دوانی، میر صدر الدین، میر غیاث الدین منصور اور مرزا جان وغیرہ کی تصانیف کو ہندوستانی مدارس کے نصاب میں داخل کر کے ان کی نشر و ترویج کی، چنانچہ طلبہ و متعلمین انہی کا درس لیتے اور انہی میں الجھے رہنے کی بنا پر قرآن و حدیث کے علوم سے ناآشنا اور بے خبر رہتے، ان کی ساری زندگی حکما و فلاسفہ کے نظریات کے مطالعہ و تحقیق میں بسر ہوتی، صوبہ گجرات کے مشہور زمانہ عالم و فاضل ابوالفضل گازرونی اکثر و بیشتر طوسی کی کتاب التجرید شیخ ابو علی سینا کی شفا و اشارات اور بطلیموس کی مجسطی کا درس دیا کرتے تھے، طلبہ ان کے پاس سفر کر کے آتے تھے، پنجاب میں علامہ کمال الدین کشمیری اور ان کے شاگرد ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے درس کا غلغلہ مچا ہوا تھا، یہ دونوں بزرگ مختلف علوم کا درس دیتے تھے مگر نہ مدارس کی اصلاح کر سکے اور نہ ان کے نصاب میں حدیث کو داخل کر سکے۔(۱)

اس زمانہ کے امرا و سلاطین کو رموز مملکت کی گتھیاں سلجھائے اور شورشوں اور بغاوتوں کو فرو کرنے سے ہی فرصت نہ ملتی تھی وہ تعلیم و تعلم کا نظم و اہتمام کیا کرتے، دہلی سے دور بعض علما کے علوم دینی کے مرکز قائم تھے لیکن جیسا کہ اوپر گزرا، ان میں سے اکثر و بیشتر میں کتاب و سنت کے بجائے معقولات اور متاخرین علمائے ایران کی تصنیفات زیر درس تھیں۔

یہی حالات تھے جن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی مسند درس پر رونق افروز ہوئے اور انہوں نے ایک دینی مدرسہ کی دہلی میں داغ بیل ڈالی، وہ علم دین سے پوری طرح بہرہ ور تھے اور انہوں نے ہند و حجاز کے علمائے کاملین سے مکمل استفادہ کیا تھا، ان کے نزدیک بگڑے ہوئے مذاق و ماحول کی اصلاح اور فتنوں اور گمراہیوں کا انسداد علم دین کے فروغ و اشاعت ہی سے ہو سکتا تھا، اس لیے انہوں نے تیرہ و تار ماحول میں علم دین کی قندیل روشن کی اور علما کو فضول مذہبی مناقشوں، تکفیر و تفسیق کے ہنگاموں اور معقولات کی پر پیچ بحثوں کو چھوڑ کر

(۱) الحد ثان، ص ا تا ۵، ڈاکٹر محمد احمد صدیقی۔

کتاب وسنت کی تعلیم کی جانب راغب ہونے کی دعوت دی اور فقہ وفروع میں الجھنے کے بجائے مہمات دین کی طرف متوجہ ہونے کی تلقین کی۔

ان کے فیض سے دینی علوم خصوصاً علم حدیث کو بڑا فروغ نصیب ہوا جس کی مزید تفصیل آگے آئے گی، حقیقت یہ ہے کہ شمالی ہند میں ان کی بدولت کتاب وسنت کے علم کا عام چرچا ہوگیا، ہندوستان میں درس وافادہ اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ بڑی حدتک انہی کی ذات سے شروع ہوا اور دہلی سلطنت وحکومت کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ علم دین کا بھی دارالسلطنت ہوگیا۔

شیخ محدث کا مدرسہ دہلی ہی میں نہیں تمام شمالی ہند کا پہلا مدرسہ تھا جس میں دینی علوم خصوصاً حدیث کی اہم کتابوں کا درس ہوتا تھا، انہوں نے دینی تعلیم کا ایسا مستحکم نظام قائم کیا تھا جس سے ہندوستان میں ایک علمی انقلاب رونما ہوگیا اور جس سے مسلمانوں کے معاشرہ کو ایک نئی توانائی اور زندگی مل گئی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

> ''مولانا جمال الدین کے آخری عہد میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے، اللہ نے ان کی عمر مبارک میں بڑی برکت دی اور ان کی تدریس و تصنیف نے ایک پورا سلسلۂ تعلیم ملک میں قائم کردیا۔''(۱)

شیخ عبدالحق کے مدرسہ اور نصاب درس میں دینی علوم خصوصاً علم حدیث کو مرکزیت واولیت حاصل تھی، انہوں نے مسند درس اسی لیے بچھائی تھی کہ علم دین کا صحیح اور خالص ذوق پیدا کرکے دوسرے علوم سے مستغنی کردیں، کتاب وسنت کی تعلیم کو فروغ دے کر معقولات ومنظومات کی طرف سے رخ پھیر دیں، عقلی علوم کی کتابوں کو درسیات سے خارج کرکے احادیث کی کتابوں کو نصاب درس میں شامل کردیں، ان کی درس گاہ کا نصاب اس زمانہ کی دوسری درس گاہوں سے مختلف تھا، اس نصاب درس میں قرآن وحدیث کو تمام علوم کا

(۱) تذکرہ، ص ۳۰۱۔

مرکزی نقطۂ نظر قرار دیا گیا تھا اور اس کا اصل مقصد حدیث نبوی کی اس سرزمین اور اس ملک میں ترویج و اشاعت تھا، آزاد بلگرامی کا بیان ہے:

"حج سے واپسی کے بعد ۵۲ برس تک استقلال و دلجمعی کے ساتھ درس و تدریس کے مشغلہ میں منہمک رہے، اپنے فرزندوں اور دوسرے طلبہ کو پڑھاتے رہے، علوم و فنون بالخصوص حدیث کی ترویج و اشاعت کا کام انجام دیتے رہے، انہوں نے تعلیم و تدریس کا نیا انداز اور ایسا نہج اختیار کیا جس کو ممالک عجم کے متقدمین و متاخرین علما نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا، ان کا طریقہ درس امتیازی خصوصیات کا حامل تھا اور مدرسہ عام مدرسوں سے ممتاز و مستثنیٰ تھا۔" (۱)

شیخ عبدالحق کے مدرسہ سے سینکڑوں طلبہ اور کئی اساتذہ وابستہ تھے، طلبہ ملک کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

تلامذہ: شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے درس و تعلیم کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اس کی شہرت کی گونج ہندوستان سے باہر عرب ملکوں میں بھی سنائی دیتی تھی، ان سے استفادہ کے لیے ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے طلبہ ان کی خدمت میں آتے تھے، کشمیر سے بنگال اور دہلی سے جونپور تک ان کے تلامذہ پھیلے ہوئے تھے (۲) جن کی بدولت آج تک شیخ محدث کا سلسلہ چل رہا ہے، انہوں نے طویل عمر پائی تھی اور نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک وہ مسند درس پر فروکش رہے، اس طرح ہزاروں اہل علم اور طلبہ نے ان سے کسب فیض کیا ہوگا اب اتنی مدت گزرنے کے بعد ان سب کا پتہ لگانا بھی مشکل ہے، تاہم جن تلامذہ کا نام معلوم ہوسکا ہے ان کا ذکر سطور ذیل میں کیا جاتا ہے:

۱۔ شیخ نور الحق دہلوی: (م ۱۰۷۳ھ) یہ حضرت شیخ کے فرزند اور علمی جانشین تھے،

(۱) مآثر الکرام، جلد اول، ص ۲۰۱۔ (۲) مقدمہ نوریہ سلطانیہ، ص ۵ و ۶، از ڈاکٹر سلیم اختر۔

اس کتاب میں ان کا مستقل تذکرہ آگے ہوگا۔

۲۔ شیخ ہاشم۔

۳۔ رضی الدین ابوالمناقب شیخ علی محمد۔

۴۔ شیخ ابوالبرکات ولی الدین عبدالنبی: اول الذکر دونوں بزرگ شیخ عبدالحق کے فرزند تھے اور تینوں حضرات ان کے اجازت یافتہ تھے، رسالہ مثبت الشیخ عبدالحق دہلوی میں اس اجازت نامہ کی نقل ہے جس میں ان سب حضرات کے نام بہت بلند مدحیہ الفاظ کے ساتھ درج ہیں اور حدیث کی جو کتابیں ان لوگوں نے شیخ دہلوی کے پاس پڑھی ہیں ان کے نام بھی درج ہیں۔(۱)

۵۔ شیخ ابوالسعادت کمال الدین ابوالرضا بابارتن بن اسماعیل دہلوی:

(م۱۰۶۳ھ) یہ شیخ دہلوی کے نواسے تھے۔(۲)

۶۔ مولانا عبدالحکیم: (التوفی ۱۰۶۷ھ) ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، انہوں نے بھی شیخ محدث سے استفادہ کیا تھا اور شیخ نے ان کو اپنی کتابوں کی روایت کی اجازت دی تھی اور ان سے ان کے فرزند عبداللہ لبیب نے ان کتابوں کی روایت کی ہے، عبداللہ لبیب سے عبداللہ بن سعداللہ لاہوری (م۱۰۸۳ھ) نے اور ان سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے شیخ الحدیث ابوطاہر کردی نے روایت کی ہے، حضرت شاہ صاحب شیخ ابوطاہر کے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ازاں جملہ شیخ عبداللہ لاہوری وکتب ملا عبدالحکیم سیالکوٹی از وے روایت کند عن الشیخ عبداللہ اللبیب عن مولانا عبدالحکیم وکتب شیخ	ان کے استاذوں میں شیخ عبداللہ لاہوری بھی تھے، شیخ ابوطاہر ان سے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی کتابوں کی روایت کرتے تھے، وہ شیخ

(۱) ماہنامہ برہان، مارچ ۱۹۵۴ء، ص ۱۵۷، مضمون مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی بعنوان حیات عبدالحق۔ (۲) ایضاً و فوائد جامعہ، ص ۳۹۔

عبدالحق بہمیں واسطہ از مولانا عبدالحکیم روایت کند ودوے از شیخ عبدالحق اجازت روایت۔(۱)

عبداللہ لبیب سے اور عبداللہ لبیب مولانا عبدالحکیم سے روایت کرتے تھے، شیخ عبدالحق کی کتابوں کی روایت بھی شیخ ابو طاہر اسی واسطہ اور سند سے کرتے تھے، یعنی عبداللہ لبیب مولانا عبدالحکیم سے اور مولانا عبدالحکیم شیخ عبدالحق سے اجازۃ روایت کرتے تھے۔

۷۔ مولانا محمد حیدر دہلوی: مذکورہ بالا اجازت نامہ کے ساتھ ایک مستقل اجازت نامہ مولانا محمد حیدر بن مولانا محمد صادق بن مولانا حاجی علی کے نام سے بھی ہے جس کے آخر میں ۲۲ ذی قعدہ ۱۰۴۷ھ کی تاریخ درج ہے، اس رسالہ کے آخر میں ایک اور اجازت نامہ ہے جس میں مولانا حیدر نے شیخ مولانا احمد بن شاہ محمد بن ابراہیم کو حدیث کی سند اور روایت کی اجازت دی ہے اور اس پر مولانا حیدر نے اپنا دستخط اس طرح کیا ہے:

محمد حیدر بن محمد صادق بن میر محمد الدہلوی مولد الہمدانی اصلاً والجعفری نسباً۔(۲)

۸۔ شیخ محمد حسین خانی نقشبندی: اس رسالہ کے سرورق پر ایک تحریر شیخ احمد ابوالخیر مکی کی ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مؤلف (شیخ عبدالحق دہلوی) سے شیخ محمد حسین نقشبندی اور ان سے شیخ حسن عجیمی المدنی روایت کرتے ہیں اور میں متعدد طرق سے بواسطہ شیخ عبدالحق روایت کرتا ہوں جن میں سب سے عمدہ اور صحیح طریق وہ ہے جو میرے شیوخ کی ان استاذوں سے ہے جو شیخ حسین عجیمی سے متصل ہوتی ہیں (۳) شیخ محمد حسین صاحب تصانیف تھے، ان کی کتاب "الطریقة المحمدیة فی بیان الطریقة النقشبندیة" مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ عرب میں ان کے اور بعض دوسرے شاگردوں کے واسطہ سے

(۱) انسان العین، ص ۱۳، بحوالہ برہان، مارچ ۵۴ء، ص ۱۶۰ و ۱۶۱، مضمون مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی۔ (۲) رسالہ برہان، مارچ ۵۴ء، ص ۱۵۸۔ (۳) ایضاً۔

شیخ عبدالحق کا سلسلہ پھیلا۔(۱)

۹۔خواجہ خاوند معین الدین بن خواجہ خاوند محمود المعروف بحضرت ایشاں:
شیخ دہلوی کے نامور شاگرد اور سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ تھے، انہوں نے علوم حدیث، تفسیر، فقہ اور اصول میں شیخ سے کسب کمال کیا اور اپنے والد بزرگوار سے خرقۂ خلافت پایا، کتاب رضوانی ان کی تصنیف ہے۔(۲)

۱۰۔خواجہ حیدر بن خواجہ فیروز کشمیری (م۱۰۵۶ھ): شیخ دہلوی کے نامور شاگرد، عالم، عارف و عامل کامل اور علمائے کشمیر کے استاد تھے، پہلے اپنے وطن کے علما ملا جوہر ناتھ اور بابا قطب الدین سے فنون کی تحصیل کی، آخر میں دلی آکر شیخ عبدالحق محدث کے حلقہ درس میں داخل ہوئے، ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور حدیث، فقہ اور تفسیر کی تکمیل کی، ان سے ان علوم کی اجازت بھی پائی، یہاں سے واپس جاکر درس و تدریس اور ہدایت وارشاد میں مصروف ہوئے، والی کشمیر نے ہر چند چاہا کہ وہ قضا کا عہدہ قبول کرلیں مگر وہ راضی نہ ہوئے۔

خواجہ حیدر کو قرآن مجید بہت اچھا یاد تھا اور حفظ کے بعد مدۃ العمر ہر سال پورا قرآن شریف تراویح میں پڑھتے رہے، جس زمانہ میں یہ شیخ عبدالحق کے یہاں تحصیل علم میں مصروف تھے، شیخ کی فرمائش پر ایک سال شب برات کو پورا قرآن سنایا، کسی ایک جگہ بھی لقمہ دینے کی ضرورت پیش نہ آئی، صبح کو شیخ نے فرمایا ''تم نے بہت اچھا پڑھا اور خوب یاد رکھا لیکن اگر تھوڑا علم مخارج اور قواعد قرأت بھی حاصل کرلو تو بہتر ہو، چنانچہ اس کے بعد انہوں نے شیخ سے علم مخارج اور اصول قرأت کی تحصیل کی۔

بابا داؤد مشکوتی مصنف اسرار الابرار ان کے شاگرد ہیں۔(۳)

۱۱۔شاہ طیب ظفرآبادی: یہ سادات سیوانہ کی نسل سے تھے، علوم کی تکمیل

(۱)فوائد جامعہ، ص۳۹۔(۲)خزینۃ الاصفیا، ص۶۴۳ بحوالہ مقالات سلیمان، ج۲،ص۲۵۔(۳)اسرار الابرار بحوالہ برہان، مارچ ۵۴ء، ص۱۵۸و۱۵۹ و تذکرہ علمائے ہند، ص۵۴ بحوالہ مقالات سلیمان، ج۲، ص۲۵۔

مولانا شاہ عبدالحق دہلوی سے کی، فراغت کے بعد مدت تک درس وتدریس کا مشغلہ جاری رکھا، اس کے بعد خدا طلبی کی دھن پیدا ہوئی اور حضرت شیخ تاج الدین جھونسوی سے بیعت کی اور خلافت پائی تھوڑے عرصہ تک جھونسی اور بنارس کے اطراف میں قیام رہا، پھر ظفر آباد آ کر محلہ مخدوم پور میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں انتقال فرمایا، مزار ظفر آباد ضلع جونپور میں ہے (۱) مصنف بحر زخار کے جد اعلیٰ شیخ محمد محمود قلندران کے ارشد خلفا میں تھے، قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ طیب کا انتقال گیارہویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ (۲)

۱۲۔ مخدوم دیوان محمد رشید بن مصطفیٰ جونپوری: یہ ممتاز عالم اور صاحب سلسلہ شیخ وصوفی تھے، مناظرہ رشید یہ ان کی مشہور تصنیف ہے، حدیث میں شیخ نور الحق دہلوی کے شاگرد تھے اور سند حدیث بھی انہی سے حاصل کی تھی، جب یہ حدیث کی تعلیم کے لیے دہلی پہنچے تو شیخ عبدالحق اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے مسند درس پر اپنے صاحبزادے شیخ نور الحق کو بٹھا چکے تھے مگر دیوان محمد رشید کی خاطر سے یہ منظور فرمایا کہ میری موجودگی میں تم نور الحق سے حدیث کا درس لو، چنانچہ شیخ عبدالحق کی موجودگی میں وہ شیخ نور الحق سے حدیث کا درس لیتے رہے، یہاں تک کہ فراغت حاصل کی۔ (۳)

دیوان محمد رشید کے صاحبزادے دیوان محمد ارشد اپنے والد کی سند حدیث کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

واجازت حدیث از صحیح بخاری ومصابیح ومشکوۃ	کتب حدیث صحیح بخاری، مصابیح اور مشکوۃ
از حضرت شیخ نور الحق ولد قدوۃ المحدثین	کی اجازت حضرت شیخ نور الحق سے حاصل کی
اسوۃ العارفین حضرت شیخ عبدالحق الدہلوی	جو قدوۃ المحدثین حضرت شیخ عبدالحق دہلوی
البخاری یافتہ (۴)	کے فرزند تھے۔

(۱) تجلی نور، حصہ دوم، ص ۲۷۔ (۲) برہان ۵۴ء، ص ۱۶۱ و ۱۶۲۔ (۳) سمات الاخیار مؤلفہ حکیم مولوی عبدالمجید کاتب مصطفیٰ آبادی بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی از سید احمد عروج قادری، ص ۱۶۲۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

مگر تذکرہ علمائے حنفیہ میں مذکور ہے:

> ''دیوان صاحب نے سند حدیث شریف کی حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی، وقت پڑھنے حدیث شریف کے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میاں نور الحق! دیوان صاحب حدیث شریف پڑھتے ہیں، ہم سنتے ہیں تم بھی سنتے جانا، دیوان صاحب نے کتب صحاح ستہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا، اس کے بعد شیخ نے آپ کو سند حدیث شریف کی دی، اس کے بعد دیوان صاحب دہلی سے جونپور تشریف لائے۔''(۱)

دیوان صاحب ملا محمود جونپوری کے ہم عصر و ہم سبق اور استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری اور ملا شمس نور بردنوی کے شاگرد رشید تھے اور حضرت مخدوم طیب بنارسی کے چشتی سلسلہ میں خلیفہ تھے، دوسرے بزرگوں سے بھی اجازت و خلافت حاصل کی تھی، ۱۰۸۳ھ میں وفات پائی، سال ولادت ۱۰۰۰ھ ہے۔ (۲)

۱۳۔ مولانا شیخ ابو احمد سلمان کردی: یہ اصلاً کرد کے باشندے تھے لیکن آخر میں احمد آباد (گجرات) میں متوطن ہو گئے تھے، اسی لیے احمد آبادی اور گجراتی کی نسبتوں سے بھی مشہور ہوئے، یہ اپنے وطن کرد سے نکلے، سیر و سیاحت کرتے ہوئے خراسان اور پھر لاہور میں کچھ دنوں قیام کرتے ہوئے دلی آئے اور یہاں آ کر حضرت شیخ کے حلقہ درس میں داخل ہوئے، مولوی رحمان علی کا بیان ہے کہ شیخ عبدالحق دہلوی کی خدمت میں فیوض حاصل کیے اور متبحر فاضل ہوئے، متعدد بلند تصنیفات ان کی یادگار ہیں (۳) انہوں نے شیخ محدث سے صرف حدیث کی سند ہی حاصل نہیں کی تھی بلکہ ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ان کے خلیفہ اور روحانی جانشین بن کر دہلی سے نکلے اور احمد آباد گجرات جا کر بس گئے، حضرت شیخ کا علمی و

سابقہ حاشیہ: (۴) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث، ص ۱۶۲۔

(۱) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث، ص ۱۶۲۔ (۲) ماہنامہ برہان، مارچ ۵۴ء، ص ۱۶۲۔ (۳) تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۔

روحانی سلسلہ انہی کے واسطے سے گجرات میں پہنچا، سیدنا عبدالقادر جیلانی کے حالات میں ایک مثنوی منبع الخیرات لکھی، اس کا نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے، مولانا سلیمان کے صاحبزادے مولانا احمد بھی اپنے وقت کے یگانۂ روزگار عالم تھے اور حدیث کی اجازت اپنے والد سے پائی تھی (۱) علوم میں اچھی دسترس رکھتے تھے، تصنیفات بھی ان سے یادگار ہیں، ازاں جملہ علم کلام میں ایک تصنیف فیوض القدس ہے، ۱۱۱۲ھ میں وفات پائی، ان کا اور ان کے والد مولانا سلیمان کا مزار احمد آباد میں ہے۔ (۲)

مولانا احمد کے ایک شاگرد مولانا شیخ نورالدین احمد آبادی تھے جو بلند پایہ محدث تھے، انہوں نے نورالقاری کے نام سے صحیح بخاری کی ایک شرح لکھی تھی جس کا قلمی نسخہ بھڑوچ کے محکمہ قضاۃ کے کتب خانہ میں موجود ہے، ۱۱۵۵ھ میں وفات پائی، ان کے علوم و معارف کے وارث ان کے فرزند شیخ محمد صالح عرف پیر بابا تھے مگر ان کی وفات ۱۱۴۷ھ میں اپنے والد کی حیات ہی میں ہوگئی تھی۔ (۳)

۱۴۔ مولانا شاہ عبدالجلیل الٰہ آبادی: یہ ایک عارف کامل اور حضرت شیخ محمد صادق گنگوہی کے مرید و خلیفہ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔ (۴)

۱۵۔ شیخ عبدالقادر مفتی: رسالہ مثبت الشیخ عبدالحق الدہلوی کے سرورق پر ان کو بھی شیخ محدث دہلوی کا شاگرد بتایا ہے مگر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے نزدیک شیخ عبدالقادر مفتی مکہ (المتوفی ۱۱۳۸ھ) کا سماع یا لقا شیخ دہلوی سے مستبعد ہے، اس کے انہوں نے بعض قوی اسباب بھی بیان کیے ہیں، اس بنا پر مولانا اعظمی ان کو شیخ عبدالحق کا بلاواسطہ شاگرد نہیں تسلیم کرتے اور یہ فرماتے ہیں کہ غالباً ان کے اور شیخ محدث دہلوی کے درمیان ایک واسطہ چھوٹ گیا ہے۔ (۵)

---

(۱) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث، ص۱۶۴۔ (۲) تذکرہ علمائے ہند، ص۱۲و۱۳۔ (۳) ایضاً، ص۲۱۵۔ (۴) انوار العاشقین، ص۱۰۱، بحوالہ برہان مارچ، ص۵۴، ص۱۶۳۔ (۵) ماہنامہ برہان مارچ ۵۴ء، ص۱۵۸۔

۱۶۔ شیخ عنایت اللہ بن الہداد صدیقی بلگرامی۔(۱)

۱۷۔ شیخ شاکر محمد بن وجیہ الدین حنفی دہلوی(۲)(م۱۰۶۳ھ)

شیخ محدث اور دینی علوم: شیخ عبدالحق محدث کی توجہ کا اصل مرکز دینی علوم تھے، خصوصاً احادیث سے ان کو زیادہ شغف رہا اور اپنے زمانہ کے حالات کی وجہ سے انہوں نے علم حدیث ہی کی جانب زیادہ توجہ مبذول فرمائی اور دوسرے علوم کی جانب زیادہ اعتنا نہ کر سکے، تاہم ان کو تمام دینی علوم میں مکمل دستگاہ حاصل تھی اور سب میں انہوں نے مفید کتابیں بھی لکھی ہیں، اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

تفسیر وعلوم قرآن: قرآن مجید کے علوم ومعارف اور تفاسیر پر وسیع نظر رکھتے تھے، گو اس کی جانب زیادہ اعتنا نہیں کر سکے مگر اس فن پر ان کو عبور حاصل تھا اور انہوں نے اس کی باقاعدہ تحصیل کی تھی، مفتی غلام سرور لاہوری کا بیان ہے کہ:

> ''علم حدیث کی مکمل طور پر تحصیل کی تھی اور وہ اس میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔''(۳)

وہ قرآن مجید کی اہمیت ومرکزیت کے پوری طرح قائل تھے، فلسفیانہ اور کلامی تفسیروں کی خرابیوں پر بھی ان کی نظر تھی، خصوصاً متاخرین کی تفسیروں میں جن پہلوؤں سے نقائص راہ پا گئے ہیں وہ ان کی نظر میں تھے، اس سے تفسیر قرآن کے بارے میں ان کے درست اور صائب نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے، انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر کو منطق وفلسفہ کے دلائل سے مخلوط اور گڈمڈ کر دینے پر ناگواری ظاہر کی ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے کتاب وسنت کے اصلی دلائل ان کے نیچے دب گئے ہیں، اپنی کتاب نکات الحق میں ایک جگہ فلسفہ کی مذمت اور متکلمین کی کج روی کا تذکرہ کیا ہے، اسی سلسلہ میں تفسیر بیضاوی کے متعلق یہ اظہار خیال بھی کیا ہے:

---

(۱) فوائد جامعہ، ص ۳۹۔ (۲) ایضاً۔ (۳) خزینۃ الاصفیا، ج۱، ص۱۶۴۔

"قرآن مجید کی تفسیر اور اس باب کی حدیثوں کی شرح میں امام
بیضاوی سے بہت سی قباحتیں ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے،
اگر ان ساری جگہوں کو شمار کیا جائے تو گفتگو طویل ہو جائے گی۔"(۱)

اس مختصر بیان سے اس فن پر ان کی عمیق نظر اور اس کے متعلق صحیح نقطۂ نظر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اور جب بیضاوی کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا کہ تفسیر کبیر وغیرہ کے بارے میں ان کی رائے کیا کچھ رہی ہوگی۔

شیخ عبدالحق نے اپنی تفسیری ذوق کی بنا پر بیضاوی کے ربع اول کا حاشیہ اور بعض سورتوں کی تفسیریں بھی لکھی تھیں جن کا ذکر تصنیفات میں آگے آئے گا۔

فقہ: شیخ عبدالحق دہلوی فقہ واصول میں بھی بڑی بصیرت ومہارت رکھتے تھے اور وہ فقیہ کی حیثیت سے بھی ممتاز تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کو فقیہ لکھا ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحب حدیث سے زیادہ ان کی فقہی معرفت وبصیرت کے قائل تھے، ایک جگہ لکھتے ہیں "حدیث میں مہارت سے زیادہ ان کو فقہ میں دستگاہ حاصل تھی"(۲) دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں "حنفی فقہ کی کتابوں پر ان کو جس قدر عبور حاصل تھا وہ حیطۂ بیان سے باہر ہے"(۳) اوپر ذکر آچکا ہے کہ شیخ کے زمانہ میں فقہی فروع وجزئیات اور عقلی علوم کا عام چرچا تھا، اس کی وجہ سے لوگ کتاب وسنت کے علوم سے ناآشنا اور ان کے دلائل سے ناواقف تھے اور تقلید عام تھی، بعض ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر پورے ملک میں حنفی فقہ کا رواج تھا، سلاطین بھی اسی مذہب سے وابستہ تھے اور علما ومشائخ بھی جمود وتعطل کا شکار رہتے تھے، ایسے دور میں شیخ عبدالحق نے کتاب وسنت سے براہ راست استفادہ کی دعوت دی اور درس نصاب میں حدیث کی کتابیں داخل کیں تاکہ فقہی جمود کا خاتمہ ہو جائے، وہ خود حنفی تھے مگر مقلد نہ تھے بلکہ محقق حنفی تھے، ان

(۱) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی از سید احمد قادری، ص ۱۴۰۔ (۲) تقصار جیود الاحرار، ص ۱۱۴۔
(۳) اتحاف النبلاء، ص ۳۰۴۔

کی نظر احادیث پر بڑی گہری تھی، اس لیے انہوں نے اس عام رجحان کو مدلل طور پر تردید کی کہ "فقہ حنفی مجرد رائے وقیاس پر مبنی ہے" اور ثابت کیا کہ یہ مذہب کتاب وسنت کے مطابق اور روح دین کے موافق ہے، ایک محقق کی طرح انہوں نے اس مذہب کا دوسرے مذاہب فقہ سے مقابلہ وموازنہ کیا اور اس کی تائید میں دلائل وشواہد پیش کر کے دکھایا کہ حنفی مذہب کا دارومدار عقلی ونقلی دونوں طرح کے دلائل پر ہے، مگر اس تائید وترجیح میں انہوں نے غالی و متعصب مقلدین کی طرح دوسرے مذاہب کا کوئی استخفاف نہیں کیا بلکہ انہیں بھی قرآن و حدیث سے ماخوذ بتایا، اس کی وجہ سے ان پر غلو اور تعصب کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

تصوف وسلوک: حضرت شیخ عبدالحق پر تصوف وسلوک کا رنگ بہت غالب اور نمایاں تھا، ان کی جس ماحول میں پرورش ہوئی تھی وہ بھی تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، ان کے پدر بزرگوار ایک صاحب دل بزرگ تھے، انہوں نے اپنے فرزند کو بھی بچپن ہی سے تصوف کا لذت شناس بنا دیا تھا، جن بزرگوں سے انہوں نے بیعت وارادت کا تعلق رکھا اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے، یہاں ہم ترتیب سے سب کے ناموں کی فہرست درج کر رہے ہیں جن کی رہنمائی میں انہوں نے سلوک کی راہیں طے کی تھیں اور جن سے تصوف کے اذکار واشغال سیکھے تھے۔

۱۔ شیخ موسیٰ بن شیخ حامد سے سب سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہوئے اور خلافت پائی۔

۲۔ شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی سے طریقہ قادریہ کے بعض اشغال واذکار سیکھے۔

۳۔ شیخ عبدالوہاب متقی سے سلسلۂ قادریہ، شاذلیہ، مدنیہ، چشتیہ میں بیعت کی اور اجازت پائی۔

۴۔ خواجہ باقی باللہ نقشبندی سے نقشبندیہ سلسلہ کی تکمیل کی۔

۵۔ شیخ ابو المعالی لاہوری سے بھی بڑا تعلق رہا اور ان کے ارشادات وہدایات پر پورے طور پر کاربند رہے۔

شیخ عبد الحق کو سلسلہ عالیہ قادریہ سے زیادہ مناسبت تھی اور ان پر اسی نسبت کا غلبہ تھا، ان کو اور ان کے والد محترم کو شیخ عبد القادر جیلانی سے والہانہ عقیدت وشیفتگی تھی اسی لیے اس سلسلہ میں ایک بزرگ حضرت موسیٰ سے اپنے والد کے ایما سے بیعت ہوئے جن کا نسبی تعلق بھی حضرت شیخ عبد القادر سے تھا، مفتی غلام سرور کا بیان ہے:

اعتقاد کامل بجانب غوثیہ اعظمیہ بہم رسانیدہ بود۔ (۱)	حضرت غوث اعظم کے سلسلہ کی جانب مکمل عقیدہ رکھتے تھے۔

شیخ نے خود لکھا ہے کہ ''مجھے خواب میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ پر مرید کیا تھا (۲) اپنی کتابوں میں ان کا ذکر نہایت عقیدت و محبت سے کرتے ہیں، ان کی شاید ہی کوئی تصنیف ان کے ذکر سے خالی ہو، ان کا نام آتے ہی ان پر عجیب وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اخبار الاخیار ہندوستانی صوفیہ کا تذکرہ ہے لیکن غایت عقیدت کی بنا پر اس کا آغاز حضرت شیخ ہی کے تذکرہ سے کیا ہے۔

تصوف کا ذوق شیخ عبد الحق کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا، ان کے والد نے بچپن ہی میں صوفیہ ومشائخ کی پاکیزہ باتیں ان کے کانوں میں ڈال رکھی تھیں اور وہ اپنی فطرت وطبیعت کے اقتضا سے ان باتوں کے سننے میں خاص لذت وخوشی محسوس کرتے تھے اور زمانہ طفولیت ہی سے بزرگوں اور صلحا کے والہ وشیدا تھے، بچپن میں جب والد محترم توحید اور وحدت الوجود کے مسائل ونکات ان کو سمجھاتے اور وہ ان کی سمجھ میں نہ آتے اس لیے کچھ شک وتردد ظاہر فرماتے تو والد فرماتے کہ حقائق ودقائق کے بارے میں اس قسم کے شکوک وشبہات پیدا ہو جاتے ہیں لیکن انشاء اللہ رفتہ رفتہ حجاب اٹھ جائے گا، اصل چیز یہ ہے کہ اس کا خیال اور جهل

(۱) خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۱۶۴۔ (۲) زبدۃ الآثار قلمی نسخہ بحوالہ حیات، شیخ عبد الحق، ص ۱۴۲۔

نہ ہونے پائے بلکہ اس کی دریافت کی سعی و کاوش میں برابر لگے رہنا چاہیے(۱) چنانچہ شیخ کی محنت اور طلب صادق سے سارے حجابات اٹھ گئے اور حقیقت کا روئے روشن پوری طرح بے نقاب ہو گیا۔

تصوف کا ذوق عمر کے ساتھ ان میں زیادہ پختہ ہوتا اور بڑھتا گیا، چنانچہ اس میں ان کے فضل و مرتبہ کا اعتراف تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، ملا عبدالقادر بدایونی فرماتے ہیں کہ ''وہ تصوف میں بلند مرتبہ رکھتے تھے'' (۲) مرزا نظام الدین احمد رقم طراز ہیں ''وہ دہلی میں صوفیوں کی وضع قطع میں زندگی گزارتے تھے'' (۳) نورالدین جہانگیر کا بیان ہے کہ ''ایک مدت سے شیخ عبدالحق دہلی کے ایک گوشہ میں توکل و تجرید کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں، بزرگ آدمی ہیں، ان کی صحبت بے ذوق نہیں'' (۴) عبدالحمید لاہوری تحریر فرماتے ہیں ''وہ صوری و معنوی کمالات کے جامع، زاہد و صوفی مشرب، صوری و معنوی فضائل سے آراستہ اور اسرار غیبی سے واقف تھے..... نوے برس کی عمر میں بھی ان کی عبادت و ریاضت اور اوراد و وظائف اور ذکر و تلاوت کے التزام میں کوئی فرق نہیں آیا (۵) طبقات شاہجہانی کے مصنف لکھتے ہیں ''شیخ عبدالحق سے طلب علم کرنے والے اور دہلی کے عام و خاص عارفین ان کے متبرک انفاس سے محظوظ ہوتے تھے...... ان کی ذات فیض حق کا مظہر اور نور مطلق کا مہبط ہے (۶) بختاور خان کا خیال ہے کہ ''وہ صاحب مقامات رفیعہ و سالک درجات منیعہ تھے'' (۷) شاہ نواز خان کے نزدیک ''شیخ عبدالحق کو مشائخ سے بڑی نعمتیں ملیں، عین جوانی میں مکہ معظمہ گئے اور دربار رسالت سے تربیت پا کر گم گشتگان بادیہ ضلالت کی رہنمائی پر مختار ہوئے'' (۸) غلام علی آزاد بلگرامی مولوی رحمٰن علی، نواب صدیق حسن خان

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۹۰۔ (۲) منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۱۱۴۔ (۳) طبقات اکبری، ج ۲، ص ۴۶۴۔ (۴) توزک جہانگیری، ص ۱۸۵۔ (۵) بادشاہ نامہ، جلد اول، دفتر دوم ص ۳۴۱۔ (۶) عمل صالح، ج ۳، ص ۳۷۷۔ (۷) مرآۃ العالم، ج ۲، ص ۲۴۳۔ (۸) مرآۃ آفتاب نما بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۶۷۔

اور حکیم مولانا سید عبدالحیٔ وغیرہ نے بھی ان کو علوم ظاہر و باطن میں ممتاز و صاحب کمال، صوری و معنوی فضائل کا جامع اور تصوف و سلوک میں بلند پایہ قرار دیا ہے، مفتی غلام سرور لاہوری فرماتے ہیں کہ:

> ''اپنے زمانہ میں علم و عمل اور زہد و ریاضت میں یکتا اور بے مثال تھے..... ظاہری و باطنی علوم میں کامل و اکمل تھے اور شریعت و طریقت میں مقتدائے وقت تھے۔''(۱)

مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

> ''بعض اولیاء اللہ ایسے بھی گزرے ہیں کہ خواب میں یا حالت غیبت میں روز مرہ ان کو دربار نبوی میں حاضری کی دولت نصیب ہوتی تھی، ایسے حضرات صاحب حضوری کہلاتے ہیں، انہی میں سے ایک حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہیں کہ یہ بھی اس دولت سے مشرف تھے اور صاحب حضوری تھے۔''(۲)

تصوف میں اس درجۂ بلند پر فائز ہونے کے باوجود شیخ اخفائے حال سے کام لیتے تھے، ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کے علمی و درسی اشغال کو ستر احوال پر محمول کیا ہے تاکہ لوگ سلوک و احسان میں ان کی عظمت و برتری سے ناواقف رہیں، ملا صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

ستر حال خویش بافادہ و استفادہ علوم رسمیہ می کند۔(۳)	اپنی حالت کو پوشیدہ رکھنے کے لیے انہوں نے ظاہری و رسمی علوم کے افادہ و استفادہ کا مشغلہ اختیار کیا تھا۔

ملا صاحب کے خیالات کی بازگشت شاہ نواز خاں کے یہاں بھی سنائی دیتی ہے، فرماتے ہیں:

(۱) خزینۃ الاصفیا، ج۱، ص۱۶۴۔ (۲) الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ، ج۷، ص۹۔ (۳) منتخب التواریخ، ج۳، ص۱۱۴۔

بشہر دہلی مراجعت نمود و تربیت ارباب ارادت بتدریس کتب احادیث مشغول۔(۱)	(حرمین سے) دہلی واپس ہوئے اور کتب احادیث کے درس میں مشغول رہ کر مریدین کی تربیت فرماتے رہے۔

مندرجہ بالا تحریروں سے تصوف وسلوک میں شیخ کی عظمت و بلند پائیگی پوری طرح ظاہر ہوگئی لیکن ان کی ذات گرامی طریقت کی طرح شریعت کی بھی جامع تھی اور ان کی یہی جامعیت ان کے علم وتصوف دونوں میں نظر آتی ہے، وہ حقیقت میں تصوف کو تزکیہ باطن، اصلاح نفس اور علم وعمل کی تطہیر کا ذریعہ سمجھتے تھے، اس لیے وہ متقشف علمائے ظاہر اور فقہا کی طرح تصوف کے نہ مخالف تھے اور نہ بے راہ رو صوفیہ ومشائخ کی طرح ان کا تصوف فرائض واعمال سے غافل کرنے والا تھا، ان کے علم نے ان کو تصوف کی بے راہ روی سے محفوظ رکھا اور تصوف نے علم میں اخلاص کی شان پیدا کی، ان کے نزدیک شریعت طریقت پر مقدم ہے اور طریقت شریعت کے تابع ہے، ان کی کتابوں میں جن صوفیہ کے اقوال وعبارتیں منقول ہیں وہ علمی حیثیت سے بھی ممتاز دونوں طریقوں کے جامع اور ارباب شریعت واہل طریقت دونوں گروہوں کے متفق علیہ ہیں، فقہا وصوفیہ کے جو الگ الگ حلقے اور طبقے بن گئے ہیں اور یہ دونوں برابر ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہتے ہیں، شیخ اس تقسیم اور طبقہ واریت کے خلاف تھے، اس بنا پر انہوں نے دونوں جماعتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی پوری کوشش کی اور اس معاملہ میں ان کو اپنے مرشد شیخ عبدالوہاب متقی سے بڑی رہنمائی ملی، ان کی خاص تاکید تھی کہ تم شریعت وتفقہ کے عمل کو اولیت واہمیت دو، پھر اس کے بعد حقیقت و طریقت کے مراتب طے کرو، شیخ نے اس ہدایت پر عمل کر کے تصوف وتفقہ کی دوئی اور تضاد کو رفع کیا اور بتایا کہ تصوف کو فقہ کی احتیاج ہے مگر فقہ تصوف سے بے نیاز ہے، تصوف کا درجہ اعلیٰ ہے مگر عام ضرورتیں اور مصلحتیں فقہ سے وابستہ ہیں، شیخ عبدالوہاب کی تلقین یہ بھی تھی کہ

(۱) مرآۃ آفتاب نما بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق، ص ٦٧۔

''تم فقیہ صوفی بنو اور صوفی فقیہ نہ بنو'' اس کا مطلب یہ ہے کہ فقہ، عمل شریعت اور ظاہر کی حفاظت کو مقدم خیال کرو، اس کے بعد تصوف طریقت اور تصفیہ باطن کے مقامات طے کرو، یہی سلامتی اور کمال کی راہ ہے۔

دین وشریعت اور تصوف وطریقت کے رمز آشنا اور ہر ایک کے حدود ومراتب سے واقف ہونے کی بنا پر وہ ائمہ اسلام فقہا ومجتہدین اور صوفیہ ومشائخ سب کے عظمت شناس تھے۔

دراصل شیخ عبدالحق کے نزدیک بنیادی کتاب وسنت نبوی اور شریعت محمدی ہے اور وہ علما وصوفیہ دونوں جماعتوں کے اقوال کی کسوٹی انہی کو مانتے تھے اور ان حضرات کے یہاں جو چیزیں ان کو نصوص کے خلاف معلوم ہوتی تھیں انہیں وہ رد فرماتے تھے، بعض صوفیائے خام شریعت پر عمل نہیں کرتے اور شریعت وطریقت میں تفریق کرتے ہیں، شیخ محدث اس طرح کے لوگوں کو صوفی نہیں مانتے بلکہ گمراہ سمجھتے ہیں، ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ ''جس حقیقت کو شریعت مردود قرار دے وہ زندقہ ہے، وہ حضرت شیخ جنید بغدادی کے حوالہ سے بتاتے ہیں کہ ''کتاب وسنت طریقت کی بنیاد ہے اور جو چیز ان کے مخالف ہو وہ مردود وباطل ہے۔''(۱)

اس تفصیل سے تصوف کے معاملہ میں ان کے محتاط ومعتدل مسلک وروش کا اندازہ ہوتا ہے، ان کے زمانہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے وحدت الوجود کی شد ومد سے مخالفت کی، شیخ کے والد پر اس کا غلبہ تھا مگر شیخ نے احتیاط کی وجہ سے وحدت الوجود کی تردید وحمایت سے پرہیز کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان پر شیخ عبدالوہاب متقی کا زیادہ اثر تھا جو وحدۃ الوجود کے معاملہ میں افراط وتفریط کے بڑے مخالف تھے، ان کی تعلیم وتربیت کو بھی تصوف کے معاملہ میں شیخ عبدالحق کی روش کو معتدل بنانے میں بڑا دخل تھا، تصوف میں ان کا درجہ بلند تھا لیکن

(۱) یہ تمام باتیں شیخ کی بعض کتابوں اور مکاتیب ورسائل سے ماخوذ ہیں۔

ان کا اصل میدان علم و تحقیق ہے، اس لیے اندیشہ تھا کہ اگر وہ غلبہ حال کی بنا پر تصوف کی زبان میں گفتگو کریں گے تو عام لوگوں کی فہم و استعداد سے بالاتر ہوں گی اور ان سے فائدہ سے زیادہ نقصان ہوگا، اس بنا پر شیخ عبدالوہاب نے اس قسم کی باتیں کرنے کی ممانعت کر دی تھی، چنانچہ شیخ عبدالحق فرماتے ہیں:

''اس بندہ کو حقائق و اسرار کے متعلق کلام کرنے سے منع کیا گیا اور یہ اس بات پر مامور ہے کہ حدیثوں کے سلسلہ میں آداب شریعت کے سوا کچھ نہ بیان کرے، ہمارے شیخ نے اس کی وصیت فرمائی ہے کہ دین وملت ہی کے مسائل و ابواب اور ان امور میں بحث و کلام پر اکتفا کروں جن سے دین کی ترویج، شریعت کی تجدید، عقائد دین کی حفاظت ہوتی ہو، دائرۂ احتیاط و اعتدال اور جادۂ استقامت سے باہر قدم نہ رکھوں اور وجودیوں کے اشارات اور باطنیوں کی تاویلات میں نہ پڑوں، کیوں کہ ان چیزوں سے حسرت وندامت کے سوا کچھ حاصل نہیں، انہوں نے یہ ہدایت بھی فرمائی تھی کہ'' مشائخ کی کتابوں کا مطالعہ اور ان سے استفادہ بہتر و مبارک ہے لیکن سب مقدور مبہم اور مشتبہ باتوں میں پڑنا، اگر اہل طریقت کی باتیں ظاہر شریعت کے خلاف معلوم ہوں تو یا تو ان بزرگوں کی جانب ان کی نسبت ہی نفی کر دو یا ان کی تاویل کر کے ظاہر شریعت و دین حق سے ان کی مطابقت بیان کر دو اور اگر تطبیق و تاویل کی صورت ممکن نہ ہو تو احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں سکوت اختیار کرو۔''(۱)

انہوں نے ان ہدایات کی پوری پابندی کی اور حقائق و اسرار میں گفتگو سے احتراز کیا، اپنے کلام کو ایہام، ابہام اور شطحیات سے پاک رکھا اور کشف و کرامات کے اظہار سے باز رہے۔

(۱) بحوالہ فوائد جامعہ، ص۲۲ تا ۲۴۔

شیخ عبدالحق اصلاً علمی شخص تھے، مولانا حکیم عبدالحیٔ کا بیان ہے کہ مشائخ کرام میں وہ علم کا پرچم اٹھائے ہوئے تھے (۱) اس لیے علمی حیثیت سے انہوں نے تصوف کی گوناگوں مفید خدمات انجام دیں، اس فن میں ان کی متعدد بلند پایہ تصنیفات ہیں اور انہوں نے تصوف کی کئی اہم کتابوں کے مطالب و مسائل کی دلآویز شرح و توضیح کی ہے، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی ذات سے ان کو جو والہانہ عقیدت و تعلق تھا، اس کی بنا پر ان کی کتابوں کی شرح اور فارسی ترجمہ کی جانب انہوں نے زیادہ اعتنا کیا، ان کی ان کوششوں کی وجہ سے ہندوستان میں تصوف کے مسائل و حقائق سے عام لوگوں کو بھی واقفیت ہوگئی اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے افکار و خیالات کی بھی عام اشاعت ہوئی۔

تصوف میں ان کا یہ کارنامہ بھی ہے کہ ان کے زمانہ کے صوفیہ و مشائخ لوگوں کی اصلاح و تربیت اور رشد و ہدایت کے بنیادی اور ضروری کام سے غافل ہو گئے تھے، شیخ نے اس کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی اور انہیں اس کی ضرورت و اہمیت سے آگاہ کرایا۔

علم حدیث: شیخ عبدالحق کو علم حدیث میں خاص عبور حاصل تھا، اس فن میں ان کی نمایاں خدمات اور عظیم الشان کارناموں کی وجہ سے ''محدث'' ان کے نام کا جز ہو گیا ہے، داراشکوہ نے انہیں ''امام محدثان وقت'' کہا ہے (۲) خافی خان کا بیان ہے کہ ''وہ اپنے زمانہ کے مشہور محدث تھے، پورے ہندوستان میں تفسیر و حدیث میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔'' (۳)

انہوں نے اس فن سے عمر بھر اشتغال رکھا اور اس کی گوناگوں مفید خدمات انجام دی ہیں، اس میں عمدہ اور کثیر ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، ان کی غیر معمولی اہمیت کی حامل کتب حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ وہ احادیث کی مشکلات و غوامض کو حل کرنے میں ید طولیٰ و مافوق العادت مہارت رکھتے تھے، مولانا غلام معین الدین عبداللہ کا بیان ہے کہ ''انہوں نے علم حدیث میں شیخ عبدالوہاب متقی اور شیخ علی متقی کا مکمل تتبع کیا اور اس علم کی تحقیقات کو انتہائی

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۱۔ (۲) (۲) بحوالہ سکینۃ الاولیاء، ص ۱۱۵۔ (۳) منتخب اللباب، ج ۱، ص ۲۴۰۔

حد کمال تک پہنچا دیا ہے۔"(۱)

فن حدیث میں شیخ کی خدمات وکمالات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، ان کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں علم حدیث کو غیر معمولی فروغ دیا اور حجاز سے واپسی کے بعد وہ عمر بھر اسی علم کی آبیاری کرتے رہے، شیخ نے اس علم کی جانب خصوصیت سے اس لیے زیادہ اعتنا کیا کہ ان کے زمانہ میں کتاب وسنت کے بجائے دوسرے علوم وفنون لوگوں کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنے ہوئے تھے، چنانچہ دین کے اصلی سرچشمہ سے غفلت اور دوری کی بنا پر حق وصداقت کی روشنی ماند پڑ گئی تھی اور بے دینی، ضلالت اور بدعت کی تیرگی ہر طرف چھائی ہوئی تھی اس لے انہوں نے دین کی اصل حقیقت کو روشن کرنے کے لیے احادیث کی جانب شدت سے اعتنا کیا اور اس کی ترویج واشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی، حدیث کے درس وتدریس کا غلغلہ بلند کر کے لوگوں کو اس کی اہمیت وضرورت کا احساس دلایا، اس کے رجال واسناد اور اصول ومتون کی تدوین وتحقیق، اس کے حقائق ؛ معارف کی جستجو ودریافت اس کے اسرار وغوامض کی عقدہ کشائی اور اس کی کتابوں کے شروح وحواشی لکھ کر اس کے خزانے کو سب کے لیے عام کر دیا، ان کی اس سعی وبلیغ کے نتیجہ میں حدیث نبویؐ کی طرف لوگوں کا رجحان بہت بڑھ گیا اور اس کا ہر طرف عام چرچا اور بول بالا ہو گیا، ہندوستان میں علم حدیث کے احیاء وترقی اور اس کی نشر واشاعت کی جو سعادت وفضیلت ان کے حصہ میں آئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی، غلام علی آزاد بلگرامی کا بیان ہے "شیخ نے علوم وفنون کی اشاعت بالخصوص حدیث کی نشر واشاعت اور اس کی ترویج وترقی میں جو کارنامہ انجام دیا وہ متقدمین ومتاخرین میں سے کسی نے بھی ہندوستان میں انجام نہیں دیا۔"(۲)

شیخ کا یہ بھی زریں کارنامہ ہے کہ انہوں نے حدیث کے درس وتدریس اور اس کی ترقی وتوسیع کا ایک ایسا وسیع نظام وسلسلہ قائم کر دیا جو ان کے بعد بھی مدت دراز تک جاری تھا،

(۱) معارج الولایت قلمی بحوالہ مقدمہ نوریہ سلطانیہ، ص ۴ و ۵۔ (۲) سبحۃ المرجان، ص ۵۲۔

ہندوستان میں ان کی اور ان کے خانوادہ کی یہ بڑی اہم خصوصیت ہے کہ اس کی بدولت صدیوں علم حدیث کا چشمہ ابلتا رہا، دراصل انہوں نے علم حدیث کے سلسلہ میں متعدد ایسے اہم اور بنیادی کام انجام دیے جن کی بنیادوں پر آگے چل کر نہایت عظیم الشان عمارتیں تعمیر ہوئیں، ہندوستان کی علمی تاریخ اور احادیث کی ترویج واشاعت میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا نام بہت ممتاز ہے لیکن ان کے کاموں کی داغ بیل شیخ عبدالحق محدث ہی نے ڈالی تھی، شاہ صاحب نے انہی کی قائم کردہ روایات کو آگے بڑھایا اور پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا، اس لیے جہاں تک ہندوستان میں حدیث کے فروغ واشاعت کا معاملہ ہے اس کا اصل سہرا شیخ عبدالحق ہی کے سر بندھتا ہے، اسی لیے ایک زمانہ تک یہ مشہور رہا کہ ہندوستان میں علم حدیث کی داغ بیل ڈالنے اور یہاں اس کی تخم ریزی کرنے والے پہلے شخص وہی ہیں، نواب صدیق حسن خان صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کے بعد ہی سے علم حدیث معدوم تھا یہاں تک کہ اللہ نے اس سرزمین پر اپنا فضل واحسان کیا اور یہاں کے بعض علما جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ کو اس علم سے نوازا، شیخ ہندوستان میں علم حدیث کو لانے اور اس کے باشندوں پر اس کا فیض عام کرنے والے پہلے شخص ہیں۔''(۱)

مولانا حکیم سید عبدالحی لکھتے ہیں:

> ''شیخ عبدالحق ہندوستان کے باشندوں میں علم حدیث کا فیض جاری کرنے والے پہلے آدمی ہیں، انہوں نے دارالحکومت دہلی میں اس کے درس وافادہ کا سلسلہ قائم کیا اور اپنی ساری محنت وتوجہ اسی کام پر مرکوز کردی، اس فن میں کتابیں تصنیف کیں، حدیثوں کی تخریج کی اور نہایت جانفشانی

(۱) الحطہ، ص ۷۰۔

سے اس کی نشر واشاعت کی۔"(۱)

یہ بات چاہے اس تفصیل کے ساتھ صحیح نہ ہو مگر ہندوستان کی سرزمین پر علم حدیث کے درس کا ایک منظم نظام اور تصنیف وتالیف کا باقاعدہ سلسلہ شروع کرنے کا شرف شیخ عبدالحق ہی کو حاصل ہے، ان سے پہلے گجرات اور بعض ساحلی علاقوں میں حدیث کی تعلیم و تعلم کا انفرادی طور پر رواج تھا مگر نہ تو اس کا کوئی باقاعدہ نظم داہتمام تھا اور نہ اس کو پڑھنے پڑھانے کا کوئی خاص رواج ودستور تھا، خصوصاً شمالی ہند میں حدیث کا علم کبریت احمر کی طرح نایاب ہو گیا، مگر شیخ نے گجرات کے بجائے دہلی کو علم حدیث کا مرکز بنا دیا اور ان کی بدولت درس وتدریس کا منظم سلسلہ شمالی ہند میں بھی جاری ہو گیا، مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

"اکبر کے آخری عہد میں وہ بزرگ ہستی نمایاں ہوئی جس نے عہد جہانگیری میں اپنی جہانگیری کا سکہ بٹھا دیا اور جس نے دہلی کے شاہی دارالسلطنت کو ہمیشہ کے لیے علوم دین کا دارالسلطنت بنا دیا اور جس کی نسبت اہل علم کا اعتراف ہے کہ "اول کسے کہ تخم حدیث در ہند کشت او بود ملا" گو نئی تاریخ کی روشنی میں بزرگوں کا یہ پرانا مقولہ صحیح نہیں تاہم معنوی حیثیت سے اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں، مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی ذات وہ ذات ہے جس نے ہندوستان میں رہ کر حدیث کے سربمہر خزانہ کو وقف عام کیا اور دل پسند محققانہ تصنیفات کے ذریعہ سے علمائے ظاہر و باطن دونوں کی محفلوں سے تحسین وآفرین کی داد وصول کی۔"(۲)

مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم رقم طراز ہیں:

"مجدد صاحب کے کارناموں کے ساتھ ان کے معاصر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی خدمات کا ذکر بھی ضروری ہے، ان کی ذات سے شمالی ہند

(۱) الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، ص ۱۳۷۔ (۲) مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۲۳۔

میں علم حدیث کو زندگی ملی اور سنت نبوی کا خزانہ ہر خاص و عام کے لیے ہو گیا، ہمارے نزدیک کی خدمت اور کتب حدیث کی مزاولت خود بخود دین کی سچی روح سے قریب کرتی ہے، اگلے علما اور صوفی بس متاخرین کی فقہ اور معقولیت میں الجھ کر رہ گئے اور کم از کم شمالی ہند میں حدیث کا عام چرچا نہ ہو سکا، بد دینی اور بد عقیدگی کا بڑا سبب یہی ہے، شیخ عبدالحق نے اس جہل کو دور کرنے کی کوشش کی اور اس لیے ہم آج ان کے شکر گزار ہیں اور ان کی علمی خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔''(۱)

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''سندھ اور گجرات کے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر شمالی ہند میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م۱۰۵۲ھ) بلکہ امام ولی اللہ دہلوی (م۱۱۷۶ھ) سے پہلے سنت کی گرم بازاری نہیں ہوئی۔''(۲)

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کتاب التمهيد في ائمة التجديد کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان میں اشاعت حدیث بارہویں صدی ہجری میں اس وقت ہوئی جب گیارہویں صدی کی ابتدا میں شیخ عبدالحق دہلوی (حرمین سے) تشریف لائے اور دہلی میں قیام پذیر ہو کر تقریباً ۵۰ برس تک حدیث کا درس دیا۔''(۳)

شیخ محدث کے سوانح نگار پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اگرچہ اس کی شدومد سے تردید کی ہے کہ ''شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ دہلوی سے پہلے ہندوستان کے مسلمان علم حدیث سے ناآشنا تھے اور مشارق الانوار کے علاوہ کسی حدیث کی کتاب سے واقفیت نہ رکھتے تھے'' تاہم وہ بھی شمالی ہند میں ان کی فیض رسانی، اولیت اور ان کے دورس

(۱) الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، ص ۳۷۔ (۲) ایضاً ص ۲۰۔ (۳) ایضاً، ص ۲۶۸۔

اثرات کا اس طور پر اعتراف کرتے ہیں:

''بہر حال حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جس وقت مسند درس بچھائی تھی اس وقت شمالی ہندوستان میں حدیث کا علم تقریباً ختم ہو چکا تھا، انہوں نے اس تنگ وتاریک ماحول میں علوم دینی کی ایسی شمع روشن کی کہ دور دور سے لوگ پروانوں کی طرح کی طرح کھنچ کر ان کے گرد جمع ہونے لگے، درس حدیث کا ایک نیا سلسلہ شمالی ہندوستان میں جاری ہو گیا، علوم دینی خصوصاً حدیث کا مرکز ثقل گجرات سے منتقل ہو کر دہلی آ گیا، گیارہویں صدی ہجری کے شروع سے تیرہویں صدی کے آخر تک علم حدیث پر جتنی کتابیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں ان کا بیشتر حصہ دہلی یا شمالی ہند میں لکھا گیا ہے، یہ سب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا اثر تھا۔''(۱)

شیخ عبدالحق سے پہلے ہندوستان کی سرزمین میں جو ائمہ فن اور محدثین پیدا ہوئے انہوں نے دوسرے عرب اور اسلامی ملکوں میں بود و باش اختیار کر لی اور وہیں اپنے علم وفن کے جوہر بھی چمکائے، اسی لیے وہ ہندوستان کے بجائے ان ملکوں کی نسبت سے زیادہ مشہور ہوئے مگر شیخ عبدالحق غالباً پہلے ہندوستانی محدث ہیں جنہوں نے حرمین کا سفر کر کے وہاں کے علما سے استفادہ تو بہت کیا مگر وہ ہندوستان ہی میں مقیم رہے اور اسی کو اپنی درسی اور تصنیفی سرگرمیوں کا مرکز ومحور بھی بنایا لیکن اس کے باوجود پوری دنیائے اسلام میں ان کا غلغلہ بلند ہوا اور ہر جگہ کے علما نے ان کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا اور معانی حدیث کی فہم میں ان کے ممنون ہوئے، مولانا احمد سعید دہلوی لکھتے ہیں ''شیخ عبدالحق محدث دہلوی دہلی بلکہ ہندوستان کے پہلے محدث ہیں جو اپنی علمی خدمات اور ذوق وتصوف اور کثرت تصانیف کے اعتبار سے بلاد اسلامیہ میں مشہور ومعروف ہیں۔''(۲)

---

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۳۲۳۔ (۲) مقدمہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۔

شیخ عبدالحق کے اولیات: حدیث کے سلسلہ میں شیخ عبدالحق کی چند نمایاں خصوصیات اور اہم امتیازات ہیں جن کو ہم ان کی اولیات سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، گو اوپر ان کا ذکر آ چکا ہے تاہم ذیل میں ہم ان کو نمبر وار تحریر کرتے ہیں:

۱۔ وہ مسلسل ۵۲ برس تک حدیث کے درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، انہوں نے کتب حدیث کو اپنے زمانہ کے نصاب درس میں شامل کیا جس کا اس زمانہ میں کوئی رواج نہ تھا، مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

> ''الغرض شیخ عبدالحق محدث سے پہلے صرف مشارق الانوار للصاغانی اللاہوری المتوفی ۶۵۰ھ کے نسخے اور کہیں کہیں مصابیح (اصل مشکوٰۃ) للبغوی المتوفی ۵۱۶ھ کے نسخے دستیاب ہوتے تھے اور یہی دو کتابیں علما کے درس میں تھیں، شیخ عبدالحق دہلوی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ عرب سے کم سے کم مشکوٰۃ، موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے نسخے لائے اور ان کو درس میں داخل کیا۔''(۱)

نظامی صاحب لکھتے ہیں ''کتب حدیث کو اپنے زمانے کے نصاب ومنہاج کا ایک لازمی جز بنا دیا، خود انہوں نے اپنے مدرسہ میں کتب احادیث کے باقاعدہ درس کی ابتدا کی، ان کے بیٹے اور پوتوں نے اپنے مدرسہ کی اس خصوصیات کو برقرار رکھا۔''(۲)

۲۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ خود زندگی بھر حدیث کا درس دیا بلکہ اس کی تعلیم و تعلم کا ایک باقاعدہ سلسلہ جاری کر دیا جس کو ان کے بعد ان کی اولاد و احفاد نے بھی قائم اور باقی رکھا، ہندوستان میں ان کے خاندان کو سات آٹھ پشتوں تک فن حدیث کی خدمت کا شرف نصیب ہوا، نظامی صاحب لکھتے ہیں:

۳۔ ہندوستان میں علم حدیث کے اکثر اصول و روایات شیخ عبدالحق ہی نے

(۱) مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۷۵۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۸۴۔

قائم کیے ہیں جن کو بعد کے لوگوں نے مزید ترقی واستحکام بخشا۔

۴۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث کو لانے والے اور اس کی داغ بیل ڈالنے والے شیخ عبدالحق محدث دہلوی پہلے شخص ہیں، یہ بات چاہے کلیۃً صحیح نہ ہو مگر اس میں شبہ نہیں کہ احادیث کے درس وافادہ اور ان پر باقاعدہ تصنیف وتالیف کا سلسلہ انہی کی ذات سے شروع ہوا، اس طرح درس وتصنیف کے ذریعہ ہندوستان میں علوم حدیث کو رائج ونشر کرنے میں ان کو اولیت ضرور حاصل ہے، مولوی رحمان علی لکھتے ہیں "علم حدیث بہ محروسہ ہندوستان از وشیوع یافتہ"(۱) مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا بیان ہے:

> "مولانا جمال الدین کے آخری دور میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے، اللہ نے ان کی عمر مبارک میں بڑی برکت دی اور ان کے درس وتصنیف نے ایک پورا سلسلۂ تعلیم ملک میں عام کیا۔"(۲)

مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم فرماتے ہیں:

> "وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے باشندگان ہند پر حدیث کا فیض عام کیا اور دہلی کے دارالسلطنت میں درس وافادہ کی مسند پر متمکن ہوئے اور اپنی ساری توجہ اسی کام کے لیے مرکوز کر دی۔"(۳)

یہ واقعہ ہے کہ شمالی ہند میں علم حدیث کے احیا کا سہرا انہی کے سر ہے، انہوں نے پہلی مرتبہ دہلی کے دارالسلطنت کو علم حدیث کا مرکز بنا دیا اور گھر گھر میں حدیث کا عام چرچا کر دیا، مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم ہندوستان میں حدیث کی عام ترویج کو ان کے فیوض وبرکات کا نتیجہ بتاتے ہوئے انہیں اول المحدثین قرار دیتے ہیں، پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> "ایک ایسے دور میں جب کہ علم حدیث شمالی ہندوستان میں تقریباً

---

(۱) تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۹۔ (۲) تذکرہ مرتبہ مالک رام، ص ۳۰۱۔ (۳) الثقافة الاسلامية في الهند، ص ۱۳۷۔

ختم ہو چکا تھا انہوں نے اپنی مسلسل اور پر خلوص جدو جہد سے اس کو از سر نو زندہ کیا۔"(۱)

۵۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علمائے ہند میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے حرمین کا سفر کیا، وہاں سے حدیث کی کتابیں اپنے ساتھ ہندوستان لائے اور انہیں داخل درس کیا، پورے ہندوستان کی نسبت سے اس بات کو اگر درست نہ مانا جائے تب بھی شمالی ہند اور دہلی کی حد تک اس کے صحیح ہونے میں کلام نہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

"شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ عرب سے کم سے کم مشکوٰۃ، موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے نسخے لائے اور ان کو درس میں داخل کیا...... بہر حال شیخ عبدالحق کے ذریعہ مشکوٰۃ کے نسخے حجم کے کم ہونے کی وجہ سے عام ہو گئے اور بخاری کا نام اور حوالہ بھی کتابوں میں آنے لگا۔"(۲)

سید صاحب دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"بہر حال رفتہ رفتہ عرب سے کتابیں ہندوستان آنے لگیں اور اس بارۂ خاص میں سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کے بعد مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی فیوض حرمین کا ممنون ہونا چاہیے۔"(۳)

پروفیسر خلیق احمد نظامی تحریر کرتے ہیں:

"علم حدیث کی ترقی کے لیے ضروری تھا کہ حجاز اور وہاں کے محدثین سے براہ راست تعلق پیدا کیا جائے، شیخ عبدالحق نے علم حدیث حجاز میں حاصل کیا، ان کے بعد ہندوستان میں محدث بننے کے لیے حجاز میں قیام اور علمائے حجاز سے استفادی ضروری سمجھا جانے لگا۔"(۴)

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۴۸۳۔ (۲) مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۷۵۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق مدراسی کا بیان ہے:

"اکبری دور کے ملحدانہ خیالات کی رو میں جاہ پرست علما کے قدم ڈگمگا گئے تھے لیکن شاہ صاحب کے خاندانی ماحول اور تربیت اور سفر حرمین شریفین کی وجہ سے ان میں وہ وہ ودیعتیں ابھر آئی تھیں جن کی بدولت ہندوستان میں علوم حدیث کے احیاو ترویج و اشاعت کا سہران کے سر رہا۔"(۱)

۶۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے عربی زبان کی کتابوں کا فارسی ترجمہ کر کے ان کے فوائد کو عام کیا، اس سلسلہ میں احادیث کی کتابوں کے بھی فارسی زبان میں ترجمہ کرنے اوران کے متون کی فارسی میں شرحیں لکھنے کی سعادت سب سے پہلے انہی کی حصہ میں آئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت شاہ عبدالحق محدث جس دور علم و تعلم کے بانی ہوئے اس کی ایک عام خصوصیت یہ بھی ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی تصنیف و تراجم کی بنیاد ڈالی، خود شاہ صاحب نے مشکوٰۃ وغیرہ کا ترجمہ کیا، پھر ان کے صاحبزادے شیخ الاسلام نورالحق نے صحیح بخاری کا۔"(۲)

مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں:

"ان کا اوران کے سلسلہ کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان کتابوں (حدیث کے متعلق) کا فارسی میں ترجمہ کیا اور فارسی میں ان کی شرحیں لکھیں۔"(۳)

سابقہ حاشیہ: (۳) ایضاً، ص ۷۹۔ (۴) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۸۵۔

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، پیش لفظ، ص ط۔ (۲) تذکرہ، ص ۳۰۳و۳۰۴۔ (۳) مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۷۵۔

ذوق علم ومطالعہ اور شیخ کا کتب خانہ: شیخ عبدالحق کو علم ومطالعہ سے بڑا شغف تھا اور ان کا علم ومطالعہ وسیع اور گہرا تھا، علم وفن سے ان کا اشتغال اور مطالعہ وکتب بینی کا شوق و ذوق مدۃ العمر قائم رہا، چوں کہ شیخ کا علمی ذوق عمدہ اور بلند تھا اس لیے امہات فن اور منتخب و معیاری اور اعلیٰ کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں جن کے حوالے انہوں نے اپنی تصنیفات میں بکثرت دیے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کا کتب خانہ بھی بڑا وسیع اور عظیم الشان تھا اور وہ بیش قیمت، اہم، نادر اور نایاب کتابوں پر مشتمل تھا، حجاز کے قیام کے زمانہ میں انہوں نے کتابوں کا بڑا ذخیرہ اکٹھا کرلیا تھا جن کو وہ اپنے ساتھ ہندوستان بھی لائے تھے، وہ جن کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے ان پر نوٹ یادداشت اور حواشی بھی قلم بند کرتے تھے، پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> ''شیخ محدث کے کتب خانہ کی جس کتاب پر بھی خاکسار کی نظر پڑی ہے اس پر شیخ کے دست مبارک سے تصحیح ومقابلہ کے نشانات ضرور ملے ہیں، اس سے ان کے کتب خانہ کی افادیت اور علمی حیثیت بہت بڑھ جاتی ہے۔''(۱)

شیخ کی اولاد بھی علم وفن کی شیدائی تھی اور ان کے خاندان میں کئی پشتوں تک علم سے اشتغال رکھنے والے موجود تھے، اس لیے ان کے بعد بھی عرصہ تک ان کا کتب خانہ اچھے حال میں باقی رہا لیکن اٹھارہویں صدی عیسوی میں جب دہلی کی حالت دگرگوں ہوئی اور مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں کی مسلسل ہنگامہ آرائی اور شورش سے یہ کتب خانہ بھی تباہ وبرباد ہوگیا، شیخ محدث کے پرپوتے شیخ الاسلام نے اپنی تصنیف شرح بخاری کے خاتمہ پر کتب خانہ کی بربادی کا نہایت درد وقلق سے اس طرح ذکر کیا ہے:

> ''اس ہنگامہ، لوٹ مار اور غارت گری کے زمانہ میں ہنگامہ پردازوں اور سرکشوں نے پرانی دہلی کو تاراج کرڈالا اور وہ قدیم وجدید کتب خانہ بھی

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۵۴۔

ضائع ہو گیا جس کی اکثر کتابیں اس علاقہ میں کمیاب و نایاب ہیں، ان میں سے بعض کتابیں تو ایسی تھیں جو شیخ المحدثین شیخ اجل محقق دہلوی کی تصحیح و تحشیہ سے مزین تھیں اور انہوں نے ان کا درس بھی دیا تھا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، اپنے گھر کے اندر گوشوں میں چند کتابیں شکستہ اور خستہ حالت میں پڑی رہ گئی ہیں۔"(۱)

شعر و سخن کا ذوق: شیخ محدث دہلوی کا ادبی و شعری ذوق بھی بہت عمدہ تھا، ان کی تصنیفات سے ان کے ادبی ذوق کی پختگی اور طرز نگارش کی سلاست و روانی کا پتہ چلتا ہے جس پر آگے بحث آئے گی، یہاں ان کی موزونی طبع اور شعر و سخن میں کمال پر گفتگو مقصود ہے۔

شیخ کو شعر و سخن سے فطری مناسبت تھی اور انہیں اس کا موروثی ذوق بھی تھا، ان کے جد امجد شیخ فیروز شعر و شاعری میں صاحب کمال تھے، ان کے چچا شیخ رزق اللہ مشتاقی بھی فارسی اور ہندی کے کامیاب شاعر تھے اور والد بزرگوار کے متعلق شیخ کا خود یہ بیان ہے کہ "وہ سیفی تخلص کرتے تھے اور اپنے دور میں اپنے ہندوستانی معاصرین واقران سے سلاست سخن اور زبان کی درستی میں بہت ممتاز و فائق تھے۔"

حضرت شیخ عبدالحق جیسے یگانہ روزگار فاضل و صاحب کمال کے لیے شعر و شاعری کچھ زیادہ افتخار و امتیاز کی چیز نہیں لیکن وہ اس میں بھی ممتاز تھے، ان کے معاصر نظام الدین بخشی نے "زبان شعر دارد" (۲) کہہ کر ان کی موزونی کا اعتراف کیا ہے اور صاحب معارج الولایت لکھتے ہیں "شعر سے بھی پوری طرح رغبت رکھتے تھے...... ہر طرح کی نظمیں، ہر بحر و وزن میں کہنے پر قدرت تھی، ان کا تخلص حقی تھا، ان کے کتب و رسائل میں ان کے اشعار مرقوم ہیں۔"(۳)

(۱) شرح بخاری، قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری بحوالہ تذکرۂ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۵ و ۲۰۶۔ (۲) طبقات اکبری، حصہ دوم، ص ۴۶۴۔ (۳) بحوالہ شیخ عبدالحق دہلوی، ص ۲۱۱۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ شعر وسخن کا مشغلہ جوانی ہی تک جاری رہا، بعد میں اپنی سرگرمیاں درس وتصنیف اور علمی مسائل کی تحقیق وتدقیق کے لیے وقف کردی تھیں، بختاور خان رقم طراز ہیں ''ان ظاہری وباطنی کمالات کے ساتھ ہی ایام جوانی میں شعر گوئی کا بھی پورا ذوق رکھتے تھے اور حقی تخلص فرماتے تھے''(۱) ان کا دیوان اب ناپید ہے مگر نواب علی حسن خان کی نظر سے گزرا تھا، وہ فرماتے ہیں ''دیوان مختلف اصناف سخن وانواع نظم کا مجموعہ اور بیشتر حصہ نعتیہ کلام پر مشتمل تھا۔''(۲)

ان کی تصنیفات میں جو بکثرت اشعار درج ہیں ان میں اکثر خود انہی کے معلوم ہوتے ہیں، انہوں نے اپنی تصنیفات کی فہرست میں اپنے مجموعہ حسن الاشعار کا ذکر کیا ہے، اس کا اور ان کے دوسرے شعری رسائل کا ذکر تصنیفات کے ضمن میں آئے گا، نواب علی حسن خان نے بھی گلشن سخن میں حقی کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے، ان سب سے ان کے حسن ذوق اور کلام کے درد واثر سے معمور ہونے کا پتہ چلتا ہے، ان کو نعت گوئی سے زیادہ مناسبت تھی، نواب صاحب کا بھی بیان ہے کہ دیوان بیشتر نعتیہ قصائد پر مشتمل ہے، ان کا ایک طویل اور مؤثر نعتیہ قصیدہ اخبار الاخیار میں بھی نقل کیا ہے(۳) اس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

بیا اے دل دمے از ہستی خود ترک دعوی کن
میفکن چشم برصورت نظر درعین معنی کن

چند اشعار میں دوسرے انبیاء پر نبی اکرمؐ کی فضیلت بیان کی ہے، اس سلسلہ کا ایک شعر ہے:

قیاس رتبہ ومقدار فضل از انبیا تا وے
زقطرہ تا بدریا یا ز ذرہ تا بہ بیضا کن

یہ قصیدہ ہندوستان میں لکھا گیا تھا مگر جب شیخ زیارت نبویؐ کے لیے گئے تو اس کو خدمت اقدس میں نذر کیا، زاد المتقین میں ہے کہ اس شعر پر پہنچے تو گریہ طاری ہوگیا۔

(۱) مرآۃ العالم، ج ۲، ص ۴۴۴۔ (۲) صبح گلشن، ص ۱۴۱۔ (۳) حیات عبدالحق دہلوی، ص ۱۱۲ تا ۱۲۰۔

خرابم در غم ہجر جمالت یا رسول اللہ
جمال خود نما، رحمے بجان زار شیدا کن

ہندوستان کے مکدر حالات اور یہاں کی ابتر دینی فضا کا ذکر اس شعر میں ہے۔

جہاں تاریک شد از ظلمت سیہ کاراں
بیاد عالمے را روشن از نور تجلی کن(۱)

شیخ شعر وسخن کے اچھے نکتہ شناس اور بڑے سخن فہم تھے، دہلی اور اطراف دہلی کے شعرا پر اگرچہ جچے تلے مختصر فقروں میں تبصرے کیے ہیں لیکن ان سے پتہ چلتا ہے کہ شعرا کے کلام پر آپ کی کتنی اچھی نظر تھی اور شعر کے حسن وقبح، اس کی نزاکتوں اور باریکیوں سے آپ کا ذوق کس درجہ آشنا تھا، آپ نے اپنی تصانیف میں بکثرت اشعار استعمال کیے ہیں اور ان کا استعمال نہایت برمحل اور برجستہ ہے۔(۲)

شیخ کی عظمت ومقبولیت اور اعتراف جامعیت وکمال: شیخ عبدالحق جامع کمالات تھے، قدرت نے ان کی ذات میں گوناگوں اوصاف وفضائل جمع کر دیے تھے، متعدد علوم وموضوعات ان کا مرکز توجہ رہے اور انہوں نے مختلف فنون میں مفید کتابیں لکھیں، علمی حیثیت سے ان کا پایہ نہایت بلند تھا اور وہ اپنے معاصرین میں اپنے علم وفضل کے اعتبار سے نہایت فائق وبرتر تھے، تجوید وقراءت، تفسیر وحدیث، فقہ وتصوف، تاریخ، تذکرہ اور شعر وادب وغیرہ تمام علوم میں ان کو مکمل دستگاہ تھی، ان کا حافظہ نہایت قوی تھا، سرعت استحضار، جودت ذہن، وسعت علم اور مذاہب سلف سے واقفیت واطلاع میں بہت ممتاز تھے، اپنی ان خوبیوں اور خصوصیات نیز دوسرے خدمات وکمالات کی بدولت ان کو غیر معمولی شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی، فارسی اردو اور انگریزی میں ہندوستان کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں یا اردو وفارسی میں علما ومشائخ کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان سب میں حضرت شیخ کا ذکر عقیدت اور

(۱) حیات عبدالحق دہلوی، ص۱۱۲ تا ۱۲۰۔ (۲) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۵۵۔

اعتراف فضل وکمال کے ساتھ موجود ہے، اللہ نے انہیں ایسا قبول عام عطا کیا تھا کہ امراء سلاطین، علما وفضلا اور صوفیہ ومشائخ سب ہی ان کی تعریف وتحسین میں رطب اللسان ہیں اور کسی کو نہ ان کے فضل وکمال کے اعتراف میں تامل ہوا اور نہ کسی نے ان کے خلاف کسی قسم کی لب کشائی کی ہے، شہنشاہ ہند نورالدین جہانگیر نے ان کو اہل فضل وارباب سعادت میں بتایا ہے(۱) ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ ''وہ مجموعۂ کمالات ومنبع فضائل تھے اور تمام عقلی ونقلی علوم میں درس دیتے تھے''(۲) مرزا نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں ذی کمال لوگوں کی جو فہرست دی ہے ان میں ان کا بھی تذکرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں ''ملا عبدالحق حقی علوم کے اقسام میں مشاق وماہر ہیں''(۳) خافی خان لکھتے ہیں کہ ''شیخ عبدالحق اس زمانہ کے فاضل ترین شخص اور مشہور محدث ہیں''(۴) حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرید خاص محمد صادق ہمدانی کا بیان ہے کہ '' آج کل دہلی کی برکت وسعادت اور رونق وخوبی حضرت شیخ محدث ہی کی ذات والا صفات سے قائم ہے، وہ علوم متداولہ وفنون متعارفہ کے عالم اور عارف ہیں، مختصر یہ کہ فضلائے روزگار میں ہیں''(۵) محمد صالح کنبوہ لکھتے ہیں ''جملہ علوم کے جامع، فقہ، حدیث اور تفسیر میں یکتا تھے''(۶) عبدالحمید لاہوری رقم طراز ہیں'' وہ صوری ومعنوی فضائل سے آراستہ، وہبی وکسبی کمالات سے پیراستہ اور فہم دقیق کے مالک تھے، علوم دین کے کاشف اور نامور فاضل ومحقق تھے، عربیت، فقہ، حدیث، تصوف، تاریخ اور سیر وغیرہ اکثر فنون کے ماہر تھے اور ہر ایک میں ان کی تصنیفات مشہور ہیں''(۷) شاہ نواز خان فرماتے ہیں کہ ''ان کے صوری، معنوی اور کسبی کمالات کا اندازہ ان کی تصنیفات سے ہو جاتا ہے جن کی خوب ترویج ہوئی''(۸) مولانا آزاد بلگرامی نے بھی انہیں صوری ومعنوی کمالات کا حامل قرار

(۱) تزک جہانگیری، ص ۳۸۵۔ (۲) منتخب التواریخ، جلد سوم، ص ۱۱۳۔ (۳) طبقات اکبری، ج ۲، ص ۴۶۳۔ (۴) منتخب اللباب، ج ۲، ص ۲۳۹۔ (۵) کلمات الصادقین، بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۶۸۔ (۶) عمل صالح، ج ۲، ص ۶۸۔ (۷) بادشاہ نامہ، جلد اول، ص ۳۴۱۔ (۸) مرأۃ آفتاب نما، بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق۔

دیا ہے(۱) علامہ زبیدی نے انہیں اکابر محدثین وفضلا میں بتایا ہے۔(۲)

مفتی غلام سرور نے انہیں اپنے زمانہ کے نادر المثال فضلا اور ذی کمال علما میں بتایا ہے(۳) سرسید احمد خان لکھتے ہیں ''آپ بڑے محدثوں میں ہیں، کمالات آپ کے آفتاب سے سوا روشن ہیں، کہ غایت شہرت سے احتیاج مجھ خاکسار کے بیان کی نہیں رکھے'' (۴) مولوی رحمان علی فرماتے ہیں ''ان کو خداداد مقبولیت حاصل تھی، کسی بھی معقولیت وانصاف پسند کو اس کے انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی'' (۵) نواب صدیق حسن خان مرحوم ارشاد فرماتے ہیں ''ظاہری و باطنی کمالات سے متصف تھے (۶) ان کو بڑی شہرت نصیب ہوئی'' (۷) ان کے صاحبزادہ والا تبار نواب علی حسن خان رقم طراز ہیں ''فرط شہرت کی بنا پر ان کے فضائل و کمالات محتاج شرح و بیان نہیں'' (۸)

شیخ عبدالحق کے اساتذہ نے جن الفاظ میں اور جس طرح ان کی تحسین فرمائی ہے اس سے بڑھ کر اور کیا سند ہوسکتی ہے، دانش مندان ماوراء النہر کا قول پہلے نقل کیا جاچکا ہے، یہاں سے پھر اس کا اعادہ کیا جاتا ہے، شاہ عبدالحق خود تحریر فرماتے ہیں:

در اثنائے درس بحثہا و سخنان مفید از طبع فاتر ایں حقہ می زائید اکثر ایں عزیزان می گفتند کہ ما از تو مستفیدیم و مارا بر تو منتے نیست۔(۹)	اثنائے درس میں جب میری طرف سے مفید بحث اور اچھی گفتگو ہونے لگتی تو یہ لوگ فرماتے تھے کہ ہم لوگ تم سے استفادہ کرتے ہیں اور ہمارا تم پر کوئی احسان نہیں ہے۔

مولانا حکیم سید عبدالحی شیخ کے مکی و مدنی اساتذہ کا نام گنانے کے بعد لکھتے ہیں:

''ان سب نے ان کی مدح وتحسین کی ہے اور قاضی علی بن جار اللہ نے

---

(۱) سبحۃ المرجان، ص ۵۲۔ (۲) تاج العروس، ج ۷، ص ۳۲۸۔ (۳) خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۱۶۴۔ (۴) آثار الصنادید، ص ۹۴، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق کراچی۔ (۵) تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۹۔ (۶) تقصار جیود الاحرار، ص ۱۱۴۔ (۷) ابجد العلوم، ص ۹۰۰۔ (۸) صبح گلشن، ص ۱۴۱۔ (۹) اخبار الاخیار، ص ۲۹۲۔

خاص طور پر ان کی بڑی ستائش کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "یہ خطۂ ہند میں علم میں یکتا اور منفرد شخص ہیں، اللہ نے انہیں طلب وتحصیل میں کے لیے ہمت بلند اور منزل مقصود تک پہنچانے والی سعی جدو جہد کی توفیق عطا کی ہے، علم حدیث کی خدمت میں انہوں نے نمایاں اور بہت ممتاز حصہ لیا ہے کچھ عرصہ تک انہوں نے مجھ کو اپنی حاضری سے مفتخر اور مشرف فرمایا اور مسجد حرام میں صحیح بخاری اور الفیہ عراقی کے کچھ حصوں کا مجھ سے درس لیا لیکن وہ خود ایک بحر زخار تھے، اس لیے انہوں نے مجھ سے جتنا استفادہ کیا اس سے زیادہ میں نے ان سے استفادہ کیا، درس کے درمیان جب وہ بحث میں حصہ لیتے تو نہایت عمدہ بحث کرتے اور بڑی خوبی سے پڑھتے، اس سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ استفادہ سے زیادہ افادہ کے اہل ہیں اور انہیں معتاد طریقوں کے مطابق اشتغال علم میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔" (۱)

صلاح وتقویٰ اور عبادت میں انہماک: شیخ کے ابتدائی واقعات میں اس کا ذکر آچکا ہے کہ بچپن اور طالب علمی کے زمانے ہی سے عبادت وریاضت سے ان کی دلچسپی بڑھی ہوئی تھی اور وہ اسی زمانے سے اوراد وظائف اور سحر خیزی اور شب بیداری کے عادی تھے، اس طرح شروع ہی سے علم کی طرح ان کو عمل سے بھی شغف تھا اور وہ زہد وتقویٰ میں بھی امتیازی شان کے مالک تھے، انہوں نے خود لکھا ہے کہ تحصیل علم میں غیر معمولی شغف وانہماک کے باوجود زمانہ طفولیت ہی سے نماز وظائف کی کثرت، شب خیزی اور دعا ومناجات میں بھی اپنی فطرت کی اقتضا کے مطابق برابر اس قدر مشغول رہتا تھا کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ (۲)

عبادت سے یہ شغف آخر عمر تک قائم رہا اور بڑھاپے میں بھی وہ اسی ذوق وشوق کے ساتھ طاعت الٰہی میں سرگرم عمل رہتے تھے، عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ:

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۲، ۲۰۳۔ (۲) ایضاً، ص ۲۹۳۔

''نوے برس کی عمر ہو جانے کے بعد بھی اطاعت الٰہی میں انہماک اور عبادات کے التزام کا وہی عالم تھا اور وہ اسی شان سے ریاضت و ورد میں مشغول رہتے تھے جس طرح جوانی میں مشغول رہتے تھے۔''(۱)

خافی خان لکھتے ہیں:

''شیخ عبدالحق صلاح و تقویٰ میں جو علم باعمل کے لیے لازم اور ضروری ہے، ممتاز و فائق تھے، دم واپسیں تک فرائض و سنن کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔''(۲)

غلام سرور لاہوری فرماتے ہیں:

''علم وعمل اور زہد و ریاضت میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔''(۳)

اصلاحی و دینی خدمات: شیخ عبدالحق اپنے دور کے مصلح و مرشد بھی تھے، سترہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، علمی، تعلیمی اور سماجی اصلاح و تربیت کا سہرا حضرت مجدد الف ثانی کی طرح ان کے سر بھی بندھتا ہے، البتہ دونوں کا انداز مختلف اور طریقۂ کار جدا تھا، شیخ عبدالحق نے زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا ہے اور نہ بہت مجاہدانہ اور سرفروشانہ انداز میں اصلاح و تجدید کا کام کیا مگر وقت کے فتنوں اور گمراہیوں کا سد باب، باطل افکار و نظریات کی سرکوبی اور مسلمانوں کی معاشرتی و دینی اصلاح ان کے بھی پیش نظر رہی اور انہوں نے اسی کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی، وہ علمی آدمی تھے اور ان کی طبیعت اعتدال و سکون پسند تھی اس لیے تصادم اور ٹکراؤ سے کنارہ کش رہ کر انہوں نے اصلاح و تربیت کا کام انجام دیا، منکر پر نکیر سے زیادہ معروف کی تلقین و اشاعت پر زور دیا۔

اکبر کی غلط روش اور نادرست مذہبی پالیسی کی وجہ سے اس وقت جو خرابیاں رونما ہو رہی تھیں ان کے بارہ میں دو طرح کے رجحانات پائے جاتے تھے، ایک گروہ تو اکبر کے

(۱) بادشاہ نامہ، ج ۱، حصہ دوم، ص ۳۴۴۔ (۲) منتخب اللباب، ج ۱، ص ۱۴۰۔ (۳) خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۱۶۴۔

مبتدعانہ اعمال اور گمراہ کن طریقوں کو نہ صرف جائز اور روا بتاتا تھا بلکہ ان کی پرزور حمایت اور تائید بھی کرتا تھا مگر دوسرا گروہ ان باتوں کو شریعت اسلامی کے بالکل منافی سمجھتا تھا اور نہایت جوش وشدت سے ان کی مخالفت ومقابلہ کے لیے کمربستہ رہتا تھا، شیخ عبدالحق کی روش ان دونوں گروہوں سے الگ تھی، انہوں نے اپنی سرگرمیاں علم ہی کی اشاعت وفروغ تک محدود رکھیں اور ارباب حکومت سے کشمکش ومزاحمت کو پسند نہیں کیا، ان کی خاموش مگر ٹھوس تحریک کے اثرات نہایت دوررس اور گہرے نکلے، جو لوگ شیخ عبدالحق کے کاموں کو اس نوعیت وحیثیت سے محسوس نہیں کرتے وہ ان کی قدر وقیمت کو بالکل ختم کر دیتے ہیں، حالاں کہ شیخ کی علمی سرگرمیوں، حدیثی خدمات، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا تمام تر مقصد اعلائے کلمۃ اللہ، احیائے دین وشریعت، ترویج سنت اور اپنے زمانہ کی گمراہیوں اور خرابیوں کی اصلاح تھا، انہوں نے کتاب وسنت کے علم وتعلیم کا نظام قائم کر کے ان کی صحیح روح لوگوں میں پھونک دی اور دین کی اصل حقیقت واضح کر کے لوگوں کے عقائد واعمال کی اصلاح وتصحیح کر دی اور باطل افکار وخیالات اور بدعات ومنکرات کے فروغ کو روک دیا، اس لیے مسلمانوں کی مذہبی ودینی اصلاح کے سلسلہ میں ان کا نام اور کارنامہ بھی بڑا اہم ہے، ڈاکٹر سید معین الحق نے بجا طور پر لکھا ہے:

> ''شیخ عبدالحق ان بزرگوں میں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اکبری عہد کے الحاد کو روکنے کی مؤثر کوشش کی، اس سلسلہ میں ان کی تصانیف ہی اہم نہیں ہیں بلکہ ان کے مکاتیب بھی قابل ذکر ہیں، جوانی میں آپ کو اس گروہ میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی جس کی سرکردگی ابوالفضل کرتا تھا لیکن باوجودیکہ آپ کے فیضی سے ذاتی تعلقات تھے آپ نے اس پیشکش کو قبول نہ کیا اور ساری زندگی درس وتدریس اور اصلاح معاشرہ کے لیے وقف کر دی، مسلمانان برصغیر کی دینی اور معاشرتی تاریخ میں شیخ عبدالحق کی

دینی اور معاشرتی تاریخ میں شیخ عبدالحق کی شخصیت بہت نمایاں مقام پر نظر آتی ہے۔''(۱)

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کا بیان پہلے نقل کیا گیا تھا کہ مجدد صاحب کے کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کے معاصر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں، حدیث کی خدمت اور کتب حدیث کی مزاولت خود بخود دین کی سچی روح سے قریب کرتی ہے، اگلے علما اور صوفیہ بس متاخرین کی فقہ و معقولات میں الجھ کر رہ گئے، بددینی اور بدعقیدگی کا بڑا سبب یہی ہے، شیخ عبدالحق نے اس جہل کے دور کرنے کی کوشش کی اور اس لیے آج ہم ان کے شکر گزار ہیں اور ان کی علمی خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔(۲)

ذیل میں ہم شیخ عبدالحق کے علمی، دینی اور سماجی اصلاح کے بعض پہلوؤں کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

دین کی غلط تعبیر اور بے جا تاویل وتحریف کی مخالفت: شیخ کے زمانہ میں کتاب وسنت کی تعلیم کو نظر انداز کر دینے اور کلام اور فقہی جزئیات سے سروکار رکھنے کی وجہ سے فلسفہ کا ذوق اور عقلیت پسندی کا رجحان اتنا بڑھ گیا تھا کہ نصوص دین کی غلط تعبیر اور بے جا تاویل وتوجیہ ہی نہیں ان میں تحریف وتلبیس بھی کی جانے لگی تھی، اس طرح گوناگوں باطل افکار وخیالات پرورش پانے لگے تھے اور متعدد خرابیاں اور گمراہیاں رونما ہو رہی تھیں، شیخ کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کتاب وسنت کے درس وتعلیم کی جانب لوگوں کا رجحان پیدا کر کے انہیں دین کی اصل حقیقت اور صحیح روح سے واقف کر دیا، ان کے نزدیک باطل خیالات اور گمراہ کن نظریات کا علاج اور مداوا یہی تھا، اس لیے انہوں نے اس کی جانب اپنی مکمل توجہ مرکوز کر دی اور فلسفہ وکلام میں غور وخوض کو مذموم قرار دے کر عقلیت پسندی اور تاویل وتحریف کے دروازے کو مسدود کرنے کی فکر وسعی کی، ان کی متعدد تصنیفات اپنے دور کے رجحانات کے

(۱) حاشیہ آثار الصنادید، ص۹۴، ۹۵۔ (۲) الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر، ص ۳۷۔

ردعمل کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں، ان میں اس قسم کے شکوک وشبہات اور باطل افکار ونظریات کی بڑی خوبی سے تردید کی گئی ہے۔

عقیدۂ نبوت کے منافی امور کا ردوابطال: اکبری عہد کے فتنوں سے عقیدۂ نبوت و رسالت پر براہ راست زد پڑتی تھی، انہوں نے مدارج النبوۃ تصنیف کر کے عقیدۂ نبوت و رسالت کا اثبات کیا ہے، وحدت ادیان کا فتنہ بھی اسی سلسلہ کا شاخسانہ تھا، چنانچہ یہ کہا جاتا تھا کہ خدا پر ایمان ہی اصل ہے، اس کے تقاضے مجرد عقیدۂ توحید کو مان لینے سے پورے ہو جاتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، شیخ نے مدارج النبوۃ میں آپ کے حقوق، مراتب ومناصب پر مفصل بحث کر کے بتایا کہ اسلام وایمان کی تکمیل کے لیے توحید ہی کی طرح نبوت محمدی پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

نظریۂ الفی بھی اسی دور کی پیداوار ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام صرف ہزار برس کے لیے تھا، اب یہ مدت پوری ہوگئی اس لیے احکام دین اور شریعت محمدی بھی متروک ہوگئی اور اس کے اتباع کی ضرورت نہیں رہ گئی، شیخ نے اپنی اصلاحی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اس غلط نظریے اور گمراہ کن خیال کی بھی پرزور تردید کی اور ثابت کیا کہ احکام دین اور شریعت محمدی دائمی ہیں جن کی اتباع ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر قوم کے لیے ضروری ہے اور ایک ہزار سال کے بعد بھی ان میں کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا۔

مہدوی تحریک کا ردوابطال: مہدوی تحریک سے بھی نبوت کے عقیدہ پر ضرب پڑ رہی تھی، شیخ عبدالحق کی ولادت جس زمانہ میں ہوئی اس وقت مہدوی تحریک پورے عروج پر تھی اس کا ذکر اس سے پہلے تذکروں میں آچکا ہے، اس کے بانی سید محمد جونپوری اور ان کے پیروؤں کی اولین جماعت بڑے پاک نفس اور خدا پرست لوگوں کی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ اس کی بنیاد صداقت وحق پرستی پر پڑی تھی، یعنی

دعوت و تبلیغ حق و احیائے شریعت و قیام فرض، امر بالمعروف و نہی عن المنکر
اس کا مقصد اصلی تھا اور خود سید محمد اور ان کے پیروؤں کی پہلی جماعت کے
اکثر بزرگ بڑے ہی پاک نفس اور خدا پرست لوگ تھے۔‘‘(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ ابتدا میں یہ ایک اصلاحی و دعوتی تحریک تھی جس کا مقصد احیائے شریعت اور امر بالمعروف کا قیام تھا اور یہ اس دور کے علمائے سو اور جاہ پسند لوگوں کی دنیا طلبی اور جاہل صوفیہ کی بدعات و منکرات کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی، مگر سید محمد نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو علمائے سو اور دنیا پرست مشائخ کی طرف سے اس کی مخالفت کا ایک طوفان امنڈ پڑا، سلیم شاہ کے دور میں شیخ علائی اور شیخ عبداللہ نیازی وغیرہ مہدوی تحریک کے خاص داعی و مبلغ تھے، دوسری جانب مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری شیخ الاسلام وغیرہ نے اس کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا تھا، انہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں سے بادشاہ کو بھی ورغلایا، اس کی وجہ سے اس تحریک کے حامیوں کو بڑے دشوار گزار اور سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

آگے چل کر مہدوی تحریک کی اصلی خصوصیات باقی نہیں رہیں اور اس کے پیروؤں میں بھی بڑی شدت اور غیر معمولی غلو پیدا ہو گیا اور اس کے عقائد و نظریات میں بھی گوناگوں خرابیاں رونما ہو گئیں، مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

’’یہ فرقہ سید محمد جونپوری کی طرف منسوب ہے جن کی نسبت بیان
کیا جاتا ہے کہ مہدی ہونے کے مدعی تھے، اگرچہ آگے چل کر اس فرقہ کے
عقائد میں بہت سی نئی نئی باتیں اور حد غلو سے بھی گزرے ہوئے اعتقادات
شامل ہو گئے ...... اس قسم کے معاملات ہمیشہ ابتدا میں کچھ ہوتے ہیں اور
آگے چل کر کچھ اور بن جاتے ہیں اور فتنۂ غلو و تاویل پچھلی امتوں کی طرح

(۱) تذکرہ مرتب مالک رام، ص ۴۷۔

اس امت کی ہر جماعت کے لیے بھی ایک بڑا فتنہ رہا ہے، یہی حالت اس جماعت کو بھی پیش آئی اور رفتہ رفتہ اس کی بنیادی صداقت اخلاق کے غلو و محدثات میں گم ہوگئی۔"(۱)

یہاں تک کہ اس کے نظریات عقیدہ نبوت کے منافی ہوگئے، اس بنا پر علمائے حق اور محدثین کو بھی اس سے اختلاف ہوا اور شیخ علی متقی، شیخ ابن حجر مکی اور علامہ محمد بن طاہر وغیرہ اس کی مخالفت میں بہت پیش پیش رہے، شیخ عبدالحق نے بھی اپنے ان بزرگوں کی روش کے مطابق مہدوی تحریک کی مخالفت کی مگر وہ علمی شخص اور اعتدال پسند آدمی تھے، اس لیے اپنے دور کے فتنوں کے استیصال کے لیے وہ علمی انداز اختیار کرتے تھے اور ان کی مخالفت اعتدال پر مبنی ہوتی تھی، عقیدۂ نبوت کے باب میں مہدوی تحریک کی بے اعتدالی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ "سید محمد کا یہ عقیدہ کہ جو کمال محمد ﷺ کو حاصل تھا وہی مجھ کو بھی حاصل ہے، فرق صرف یہ ہے کہ آپ کو وہ کمال اصالتاً ملا تھا اور مجھے تبعیتاً ملا ہے۔"

علما و مشائخ کی فتنہ سامانی سے بیزاری: یہ ساری مصیبت اکبری عہد کے نام نہاد علما و مشائخ کی لائی ہوئی تھی جو دنیا کی طمع اور مال و زر کی حرص میں دیوانہ ہوگئے، یہ خود فسق و فجور میں ملوث تھے مگر دوسروں کی تفسیق، تضلیل اور تکفیر کا ہنگامہ برپا کیے رہتے تھے، ان کے گھر میں مال و دولت کا انبار جمع رہتا تھا مگر اپنے فتووں اور حیلوں کا سہارا لے کر ہمیشہ زکوٰۃ نکالنے سے اپنے کو بچا لیتے تھے، سال کے ختم ہونے سے پہلے اپنا سارا اثاثہ اپنی بیویوں کے نام کر دیتے اور جب بیویوں کی ملکیت میں حولان حول کی نوبت آتی تو اسے اپنے نام منتقل کر لیتے تھے، یہ لوگ ڈاڑھی منڈواتے، فریضۂ حج ساقط ہو جانے اور اکبر کو سجدہ کرنے کا حکم دیتے تھے، گمراہ صوفیہ و مشائخ نے اپنے خود ساختہ اعمال و اشغال اور مجاہدات کو تصوف کا نام دے رکھا تھا، انہوں نے طریقت کو شریعت سے علاحدہ کر کے بہت سی عبادات و احکام سے

(۱) تذکرہ مرتبہ مالک رام، ص ۴۷۔

اپنے کو دستکش کر لیا تھا۔

اس عہد کا سب سے بڑا فتنہ اکبر کا متوازی دین الٰہی تھا مگر اس کے مذہبی انحراف کا باعث بھی یہی علما وصوفیہ تھے، وہ ابتدا میں مذہب سے برگشتہ نہ تھا بلکہ صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا اور شعائر دین کا احترام کرتا تھا مگر جب علمائے سو کے فتووں اور اجتہادات، گمراہیوں، بدعتوں اور فسق وفجور کا بازار گرم ہو گیا اور اس کی موشگافیوں اور کج بحثیوں نے دین کو بازیچۂ اطفال بنا دیا تو اکبر نہ صرف ان کے طرز عمل سے بلکہ رفتہ رفتہ دین ہی سے متنفر ہو گیا۔

ان لوگوں نے ہر کس وناکس اور اہل وغیر اہل تمام لوگوں کو اجتہاد کا حق دے دیا، اس طرح ہر شخص مذہبی امور ومسائل میں دخل دینے اور رائے زنی کرنے لگا، اکبر کو بھی اجتہاد کا حق درباری علما نے دے دیا تھا، یہی نہیں بلکہ اس کی حیثیت شارع اور مطاع کی ہو گئی تھی، اس کے دربار میں مختلف مذاہب کو ماننے والے جمع ہوتے تھے، اس نے ہر مذہب ومسلک کے لوگوں کے لیے عام کر دیا تھا، ان مجلسوں میں کھل کر اسلام اور شریعت محمدی کو تختۂ مشق اور بحث وتنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا اور جو چیز بھی خلاف عقل معلوم ہوتی اس کو بے تکلف رد کر دیا جاتا تھا، امراو حکام دین کے بارے میں کج بحثی کرتے اور من مانی تاویل کر کے بادشاہ کو خوش کرنے کی فکر میں رہتے، اس کی خوشنودی کے لیے دین میں ہر قسم کی کتر بیونت جائز قرار دے دی گئی تھی، شیخ عبدالحق محدث ان رجحانات کی اصلاح میں بھی لگے، ان کے اس زمانہ کے بعض امرا سے اچھے تعلقات تھے جس کی تفصیل آگے آئے گی، شیخ نے ان لوگوں کو خطوط لکھ کر انہیں دین وشریعت کی حفاظت وپاسبانی کی دعوت دی اور شرور وفتن سے باز رہنے کی تلقین فرمائی، اس طرح ان کی مساعی سے دین وشریعت بازیچۂ اطفال بننے اور بے جا تاویل وتحریف کی زد میں آنے سے محفوظ رہی۔

عقلیت پسندی اور فلسفہ کی تردید: کتاب وسنت سے انحراف وبرگشتگی اور عقلیت وفلسفہ کا زور اس قدر بڑھا کہ امت کے اندر بڑا اختلاف وانتشار پیدا ہو گیا اور لوگ اس دین

وشریعت کو بھول گئے جو خیر القرون میں رائج تھا، اس کی جگہ انہوں نے جو دین اختیار کر رکھا تھا، اس میں عجمی رنگ آمیزیاں اور فلسفہ وکلام کی موشگافیاں شامل ہوگئی تھیں، شیخ عبدالحق نے عقلیت پسندی کے اس رجحان اور فلسفیانہ قیل وقال کی سخت مذمت کی اور دین کی صحیح حقیقت ونوعیت واضح کر کے اس کو اختیار کرنے کی دعوت دی، اس موقع پر ان کی تحریروں کے اقتباس نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا، فرماتے ہیں:

''صحابہ وتابعین وتبع تابعین کے زمانوں کے بعد جو بمصداق حدیث نبوی خیر القرون تھے، عقائد واصول میں نزاع اور اختلافات پیدا ہوئے، چوں وچرا پیدا ہوا، سنت کا نور بجھنے لگا اور بدعت کی تاریکیاں دنیا پر چھانے لگیں، ہر شخص کے سر میں نیا سودا اور ہر ایک کے دل میں نئی رائے نے قدم جمایا، تاویل کے دروازے کھل گئے، ظواہر نصوص متروک ہوئے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طریقہ اور مذہب سلف عزیز الوجود اور اجنبی ہوگیا، بدء الاسلام غریبا وسیعود غریبا الخ (اسلام شروع میں اجنبی تھا اور پھر اجنبی ہو جائے گا تو خوش خبری ہو ان کے لیے جو اس اجنبی اسلام پر جمے رہیں) کا منظر سامنے آگیا۔

سخت ترین حادثہ اور عظیم ترین مصیبت جو دین اسلام اور اعتقاد سلف پر آئی وہ علم فلسفہ کا ظہور اور عربی میں اس کا ترجمہ تھا جو بعض خلفائے عباسیہ کے زمانے میں واقع ہوا، اس سے مخالفوں اور دشمنوں کے ہاتھ میں جنگ وجدال کا حربہ آگیا، بعضوں نے علم ودانش اور خصوصاً جدید ونادر علم کے حرص میں اور بعضوں نے عقائد اسلام اور قواعد ملت کو برباد وتباہ کرنے کے ارادے سے فلسفہ یونان میں توغل کیا اور اس دریا میں غوطے لگائے، علمائے دین اور اساطین امت کی ایک جماعت نے بھی مذہب سلف کی

حفاظت اور سنت کی پاسبانی کے قصد سے اس کو حاصل کیا اور عقائد شرعیہ کے اثبات اور فلسفیات کے ردو ابطال کے لیے مستعد ہوئے کیوں کہ کسی چیز کو جانے بغیر اس کا رد نہیں کیا جا سکتا، نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفیات خوب شائع ہوئے، جنگ و جدال اور قیل و قال کا دائرہ وسیع ہوا اور بازار سخن گرم ہو گیا، یہیں سے علم کلام کی پیدائش ہوئی، اگر چہ اہل اسلام اور ارباب علم کلام گمراہ فرقوں کے ردو ابطال کے قصد سے اس میدان میں داخل ہوئے تھے لیکن اس کے ضمن میں خود انہیں بھی نقصان عظیم پہنچا اور ان کی یہ مشغولیت عقائد اور قواعد دین میں تذبذب کا سبب بن گئی، تشکیک و تردید کا دروازہ کھل گیا، کم ہی کوئی ایسا ہوگا جو علم کلام میں خوض و غلو کے بعد گرداب حیرت سے سلامت نکلے اور اپنے سرمایہ یقین کو محفوظ رکھ سکے، ہاں بس اللہ ہی جسے بچائے تو بچائے اور یہ بہت نادر ہے انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

راہ سلامتی کے رہرو اور طریق استقامت کے طالب پر لازم ہے کہ فلسفیات اور علم کلام میں توغل نہ کرے اور دلائل کلامیہ کی کج بحثیوں سے اپنا دامن بچائے، اہل سنت والجماعت کے اعتقاد کو دل میں جمائے اور ان کے اجمالی دلائل پر اکتفا کرے، منقول کو معقول کے تابع نہ کرے اور بے جا تاویل و تشکیک کے دروازے بند کر دے۔

دین کے بہت سے اصولی عقائد ایسے ہیں کہ وحی الٰہی کے سوا کوئی انہیں حل نہیں کر سکتا اور عقل انسانی وہاں سپر انداز ہو جاتی ہے، جب آج تک عقل انسانی ''انا'' کی حقیقت دریافت نہ کر سکی تو پھر خالق انا کی حقیقت کا پتہ کیا پائے گی، انسان کی ہستی سے قریب اس کا لطیفہ انانیت ہے کہ اسی سے وہ ''انا'' کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے ''میں نے کہا'' لیکن کیا

آج تک کوئی عاقل اور کوئی فلسفی اس کا فیصلہ کر سکا کہ ''انا'' کی حقیقت کیا ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

آنکہ خود را شناخت نتواند
آفرینندہ را کجا داند
تو کہ در ذات خود زبوں باشی
عارف کردگار چوں باشی''(۱)

متکلمین کو فساد کا سرچشمہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس فساد کی بنیاد متکلمین ہیں اور اس کا باعث و سرچشمہ فتنۂ فلسفہ ہے، گو ان کو اس کی احتیاج و ضرورت تھی اور ان کے لیے سکوت کی گنجائش نہ تھی تاہم اس سے بڑا نقصان ہوا، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد تحقیق دین اور حکمت و شریعت کی تطبیق ہے، یہ محض ان کی سخن طرازی اور لفاظی ہے، یہ لوگ فلسفہ و کلام کے جال میں پھنس کر جادۂ حق سے باہر ہو جاتے ہیں اور حق کو باطل کے تابع اور اس میں مخلوط و ممزوج کر دیتے ہیں، یہ شروع ہی سے دین اور مسلمانوں کے عقائد کو اختیار کر کے کیوں نہیں اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔''(۲)

ان اقتباسات سے ان کی دینی غیرت و حمیت اور فلسفہ و کلام سے اس بنا پر ان کی نفرت و بیزاری کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان سے اسلام کو نقصان عظیم پہنچا اور حیرت و درماندگی کے علاوہ ان کا کوئی حاصل نہیں۔

اسی طرح دوسرے باطل افکار و نظریات اور گمراہ فرقوں کے عقائد و خیالات کی

(۱) مرج البحرین قلمی نسخہ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۹۶ تا ۹۸۔ (۲) نکات الحق مطبع احتشامیہ، مراد آباد، ص۱۱۳، بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۹۹۔

اصلاح و درستگی کو بھی انہوں نے اپنی مہم میں شامل کر لیا اور ان کی تردید اپنی تحریروں کے ذریعہ کی، مثلاً جبریہ وقدریہ دونوں کی نفی کر کے اس سلسلہ میں حق واعتدال کے مسلک کی اس طرح توضیح کی ہے:

''اہل حق کے نزدیک جبریہ وقدریہ دونوں کا مسلک باطل ہے، نہ جبر ہے نہ قدر اور حق یہ ہے کہ عامل کو اپنی جانب منسوب کرے اور اس کے ساتھ یہ اعتقاد بھی رکھے کہ وہ اللہ کے خلق وتوفیق سے ہوا ہے، قضا وقدر اور اختیار کا مسئلہ غوامض واسرار میں ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس میں بحث لاطائل ہے، کیوں کہ حقائق واعمال میں سے کوئی چیز ان اسرار کے کشف پر موقوف نہیں ہے، عمل میں سعی واجب ہے، کیوں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندوں سے اوامر ونواہی کے متعلق سوال کرے گا، اپنی ذات وصفات کے بارہ میں نہیں پوچھے گا۔''(۱)

شیعیت کے زور واثر کو مٹانے کے لیے بھی وہ سرگرم رہے، محرم میں رائج اعمال و اشغال اور بدعات واحداث کی تردید کے لیے انہوں نے **ماثبت بالسنۃ** لکھی اور **تکمیل الایمان** میں مسئلہ خلافت پر بحث کر کے شیعہ فرقہ کے اعتراضات واعتقادات کا معقول و مدلل رد لکھا۔(۲)

افراط وتفریط سے اجتناب اور اعتدال وسلامت روی: وہ دینی امور ومسائل میں حد درجہ محتاط ومعتدل روش پر گامزن تھے اور ان میں کسی طرح کی بے اعتدالی اور بے راہ روی کو پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ عموماً الوہیت ونبوت کے فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اسی طرح نبوت اور ولایت کے حدود ومراتب بھی ایک دوسرے میں گڈمڈ کر دیے جاتے ہیں، حالانکہ ان چیزوں میں ادنیٰ لغزش اور معمولی بے احتیاطی بھی کفر وضلال کا موجب ہوتی ہے،

(۱) المحدث ان الدکتور محمد احمد صدیقی الٰہ آباد، ص ۱۶ و ۱۷۔ (۲) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۳۸۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے والہانہ عقیدت وشیفتگی تھی اور وہ عشق رسول میں دیوان رہتے تھے مگر اس کے باوجود الوہیت ونبوت کے دقیق ونازک فرق کو کبھی نظر انداز نہ کرتے تھے، اسی طرح تصوف سے بھی ان کو بچپن ہی سے دلچسپی تھی اور اولیا وصوفیہ سے بڑی عقیدت ومحبت رکھتے تھے مگر کبھی کسی ولی کا درجہ انبیائے کرام کے مساوی قرار دینے کی غلطی ان سے سرزد نہ ہوئی، اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''اس باب میں یہ ضابطہ نگاہ میں رہنا چاہیے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا ادب واحترام یہ ہے کہ جو چیزیں مرتبہ الوہیت اور حق تعالیٰ کے صفات میں داخل ہیں ان کے سوا اور ان سے کمتر جو کمال ومنقبت بھی ہوسکتی ہے وہ سب آپ کے لیے ثابت ہے، تمام مرتبے اور صوری ومعنوی کمالات اللہ کے بندے اور اس کے رسول میں موجود ہیں مگر عبادت وبندگی جو صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے وہ اس کامل اور حقیقی بندہ کے لیے بھی نہیں کی جاسکتی کیوں کہ خدا خدا ہے اور آپ اس کے بندے ہیں، رہے دوسرے لوگ تو وہ سب کے سب اللہ کے طفیلی بندے ہیں۔''(۱)

الوہیت ونبوت کی نکتہ شناسی اور اس بارہ میں عدم افراط وتفریط کا ثبوت ان کے اس شعر میں بھی ملتا ہے۔

مخواں اورا خدا از بہر امر شرع وحفظ دیں
دگر ہر وصف کش میخواہی اندر مدحش انشا کن(۲)

سلاطین وامراء سے تعلقات اور ان کی اصلاح کے لیے سعی وکوشش: شاہ عبدالحق محدث دہلوی کو کئی سلاطین کا زمانہ ملا، وہ سلیم شاہ سوری کے عہد میں پیدا ہوئے اور شاہجہاں کے سنہ جلوس میں وفات پائی، اکبر اور جہانگیر کے دور کو انہوں نے اچھی طرح دیکھا تھا مگر وہ

(۱) مکتوب نمبر ۹ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۰۴۔ (۲) اخبار الاخیار، ص ۳۰۲۔

اپنی طبعی عزلت گزینی اور گوشہ پسندی نیز علمی ذوق ومشغلہ کی وجہ سے سلاطین وامرا سے دور رہنا چاہتے تھے، جوانی میں اکبر کے دربار میں فتح پور بھی غالباً اپنے علمی ذوق کی تسکین ہی کے لیے گئے تھے لیکن وہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر ایسے کبیدہ خاطر ہوئے کہ حجاز ہی میں جاکر سکون ملا، وہاں سے واپسی کے بعد بھی درباری ماحول سے وحشت و بیزاری کم نہ ہوئی، چنانچہ فیضی کی طلب واصرار کے باوجود وہاں جانا پسند نہ کیا۔

اس طرح اکبر کے دور میں وہ دربار سے نہ کسی طرح متوسل ہوئے اور نہ اس سے کوئی واسطہ وتعلق رکھا، البتہ فتح پور میں قیام کی وجہ سے بعض امرا سے ان کے ذاتی مراسم و تعلقات ہو گئے تھے جو آخر تک باقی رہے، ان امرا سے تعلق اس لیے بھی رکھا کہ یہ اکبر کی بے دینی کے باوجود دیندار تھے اور بادشاہ کی بے دینی کے مخالف تھے مگر اس کے دباؤ کی وجہ سے خاموش رہتے تھے، شیخ نے ان لوگوں کی جانب توجہ دینے کی ضرورت محسوس کی اور ان کی اصلاح اور ان کے عقائد کی تصحیح کی فکر میں لگ گئے، انہیں خطوط لکھ کر ترویج دین پر آمادہ کرتے اور حکومت کی بے دینی کے خلاف سرگرم عمل ہونے کی ترغیب دیتے، انہوں نے خواجہ باقی باللہ کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں بھی اس عہد کے فتنوں کا ذکر کر کے ان کے بارہ میں تشویش ظاہر کی ہے۔

عہد اکبری کے امرا میں نواب مرتضیٰ خان فرید سے شیخ کے نہایت مخلصانہ روابط تھے، ان کے مجموعۂ مکاتیب میں ان کے نام کے متعدد خطوط ہیں جن میں ان کو فرائض منصبی بجالانے اور ان کی دینی حمیت کو برانگیختہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے، اسی طرح نواب عبدالرحیم خانخاناں کو بھی انہوں نے متعدد اصلاحی خطوط لکھے، خانخاں بھی اپنے عقائد پر سختی سے قائم رہے اور اکبری الحاد سے کنارہ کش تھے، ان دونوں کے علاوہ شیخ عبداللہ نیازی، ملا عبدالقادر بدایونی اور مرزا نظام الدین احمد بخشی سے بھی انہوں نے اصلاح معاشرت اور اشاعت دین کے جذبہ کے ماتحت تعلق رکھا، اس طرح وہ امرا کی اصلاح اور اکبر کی بے دینی

کے خلاف انہیں اکسانے کے لیے پوری طرح سرگرم عمل تھے مگر ان کی یہ اصلاحی سرگرمیاں احتیاط واعتدال کے ساتھ ہوتی تھیں، وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں ''سخن مبالغہ گفتہ نہ شود واز حیطہ احتیاط کہ روش ایں فقیر است بیرون نیفتم۔''(۱)

شیخ کی یہ کوششیں رائیگاں نہ گئیں، فیضی اور ابوالفضل کی وفات کے بعد الحاد اور بے دینی کا اثر کم ہونے لگا اور اکبر کا دین الٰہی کے لیے جوش وخروش بھی زیادہ نہیں رہا، اس طرح اس کے آخری دور میں دیندار امرا کا اثر بڑھنے لگا، شیخ فرید اس کے خیالات میں تبدیلی لانے میں بھی کامیاب ہوئے، اس کی موت کے بعد ان کے خاص اثر کی وجہ سے جہانگیر تخت نشین ہوا تو اکبر کے دور کی بے دینی کا خاتمہ ہو گیا۔

جہانگیر کے دور میں ''دین الٰہی'' نے دم توڑ دیا(۲) اور بہت کچھ حالات میں بھی اصلاح وتغیر رونما ہوا مگر اکبر کے دور میں ملحد فلسفیوں، دین فروش علما اور مکار صوفیہ نے جو فتنے پھیلا رکھے تھے وہ آسانی سے ختم ہونے والے نہ تھے، ان کی سرکوبی کے لیے اس وقت جو لوگ میدان عمل میں زیادہ سرگرم عمل رہے، ان میں حضرت مجدد الف ثانی کے ساتھ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا نام بھی ہے جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، شیخ نے کتاب وسنت کا نور پھیلانے اور روشن کرنے کے لیے ایسی مفید کتابیں لکھیں جن سے لوگوں کے عقائد واعمال کی اصلاح ہوئی، ان کے ذہن وفکر بدلے اور ان کے خیالات ونظریات کا رخ صحیح سمت میں ہو گیا۔

جہانگیر عملاً جیسا بھی رہا ہو مگر الحاد اور بے دینی سے اس کو واسطہ نہ تھا، اس لیے شیخ کے اس سے یک گونہ روابط رہے، شیخ کا حضرت خواجہ باقی باللہ سے بھی تعلق تھا، حضرات نقشبندیہ کا اصول ودستور یہ ہے کہ خرابیوں کی اصلاح کے لیے ارباب اقتدار سے الگ تھلگ رہنے کے بجائے ان سے ربط وضبط پیدا کیا جائے، چنانچہ اس اصول کے مطابق شیخ عبدالحق

(۱) بحوالہ تاریخ ادبیات، ج ۴، ص ۲۲۵۔(۲) تاریخ ادبیات مسلمان پاکستان وہند، جلد دوم، عربی ادب مضمون مولانا عبدالقدوس ہاشمی، ص ۲۲۳و۲۲۴۔

نے بھی جہانگیر سے کنارہ کش رہنا پسند نہیں کیا، اس کے لیے رسالہ نوریہ سلطانیہ تصنیف کیا، جس میں قواعد وارکان سلطنت پر مفصل بحث کی ہے اور اسے اس کی ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہ کیا ہے، جہانگیر کی تخت نشینی میں نواب مرتضیٰ خان فرید کو بڑا دخل تھا، اس بنا پر شیخ محدث نے جہانگیر کے تخت نشین ہونے کے بعد ہی نواب صاحب کو ایک مکتوب لکھا جس میں اصلاح احوال کی طرف خاص توجہ دلائی اور یہ تاکید بھی کی کہ اسے بادشاہ کی نظر سے گزارا جائے (۱) جہانگیر نے تزک میں جس انداز سے شیخ کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے شیخ سے عقیدت تھی اور وہ ان کی عظمت، بزرگی اور علمی بلند پائیگی کا معترف تھا اور اس سے متاثر ہو کر ملاقات کے وقت اس نے ان کو بہت سی عنایات و نوازشات کے ساتھ رخصت کیا اور جاگیر کے طور پر ایک گاؤں بھی نذر کیا۔ (۲)

جہانگیر کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا تو شیخ نے اس کی رہنمائی اور خیر خواہی کے لیے بھی ایک رسالہ ''ترجمة الاحاديث الاربعين فى نصيحة الملوك والسلاطين'' تالیف کیا، شاہجہاں کا لڑکا شہزادہ داراشکوہ بھی شیخ کا معتقد تھا اور اس نے ان سے فرمائش کی کہ زبدۃ الآثار کو فارسی میں لکھیں۔ (۳)

مولانا غلام معین الدین عبداللہ کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر اور شاہجہاں کے دربار میں شیخ کو اس قدر رسوخ اور تقرب حاصل تھا کہ وہ ضرورت مند لوگوں کی ان بادشاہوں سے سفارش کر کے ان کی حاجت روائی بھی کرتے تھے اور مجرم لوگوں کو سزا بھی دلاتے تھے۔

چوں درزمان جہانگیر وشاہجہاں بادشاہ قبولیت   جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں چونکہ ان کو

(۱) مرآۃ الحقائق، ص ۶۵ بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۴۰ و تاریخ ادبیات مسلمان پاکستان و ہند، جلد دوم، عربی ادب، ص ۱۷۳۔ (۲) مرآۃ الحقائق، ص ۸۹ بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۴۸۔ (۳) مقدمہ نوریہ سلطانیہ ڈاکٹر سلیم اختر، ص ۱۴۔

تمام داشت اکثر حاجات فقرا و مساکین بعرض می رسانید و بانجاح مرادات و اسعاف مقتضیات واصل می گردانید و در دفع زندقہ و الحاد بسیاری کوشید و قائل شطحیات را بحد و تعزیری رسانید۔(۱)

بڑی مقبولیت حاصل تھی اس لیے اکثر فقرا و مساکین کی ضرورتوں کے لیے ان لوگوں کی خدمت میں عرض گزار ہوتے اور ان کی حاجت روائی اور مطلب برآری کرتے، شیخ زندقہ والحاد کو دفع کرنے کے لیے بھی بہت کوشاں رہتے تھے، چنانچہ شطحیات کی طرف مائل لوگوں پر حد و تعزیر بھی جاری کراتے۔

اتباع سنت کی دعوت: فلسفہ و عقلیت پسندی اور دوسرے باطل افکار و رجحانات کی مذمت و تردید کے ساتھ ہی انہوں نے اتباع سنت اور طریقۂ محمدی کو اختیار کرنے کی تلقین و ترغیب بھی دی، وہ خود اتباع سنت کے جذبہ سے سرشار تھے اور اسی کی اشاعت و دعوت ان کی زندگی کا مقصد رہا، ان کی تصنیفات و مکاتیب میں بھی اس پر خاص زور دیا گیا ہے، ان کے نزدیک تصوف کا مقصد و منشا بھی یہی ہونا چاہیے، اس میں اصلی کمال سنت و طریقۂ محمدی کے اتباع ہی کے ذریعہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے، اس کے بغیر سلوک و طریقت بے حقیقت و لاحاصل ہے، ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں:

> ''اصلی اور بنیادی بات اصول کے ساتھ تعلق، اس منبع انوار سے اقتباس نور، اس کی محبت میں استغراق اور اس کی سنت کی متابعت کا اہتمام کرنا تاکہ سالک فروع میں الجھ کر اصل سے باز نہ رہ جائے اور وسایط اصل مقصود کو اس کی نظر سے اوجھل نہ کر دیں اور یہ کہ اپنے افعال، اقوال اور احوال کی ترازو رسول کی سنت اور صحابہ و تابعین کے طریقہ کو بنائیں اور اپنی تمام چیزوں کو اس کے مطابق کریں، نہ یہ کہ اس کی طلب ہی

(۱) مقدمہ نوریہ سلطانیہ، ڈاکٹر سلیم اختر، ص ۱۴۔

نہ کریں، اس کی تحصیل میں کوشاں نہ ہوں اور اس کا اہتمام نہ کریں بلکہ
اس سے بے خبر ہوں اور اصل کو فرع کا تابع بنائیں اور فرع کے مقابلے میں
اصل کی تاویل کریں، یہ طریقہ یا تو بطالت ہے یا الحاد و بے دینی ہے۔"(۱)

ایک اور مکتوب گرامی میں رقم طراز ہیں:

"اور لازم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن سنت کا اتباع
کرنا، عبادات میں بھی، عادات میں بھی اور اعتقادات میں بھی اور اس
بات کا اعتقاد کرنا چاہیے کہ جو کچھ ان کی سنت اور طریقے کے خلاف ہے وہ
باطل ہے۔"(۲)

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

"انسان دین وملت کی تقویت، سنت کی تائید وترویج واشاعت
میں کوشش کرے اور سنت کی اشاعت کرنے والوں کی اعانت کرے، خواہ
وہ اکیلا اور تنہا ہی کیوں نہ ہو۔"(۳)

ان کے نزدیک عبادت کی اصل حقیقت بھی امر خداوندی کی تعمیل اور سنت کی موافقت ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ سنت کی موافقت اور اقتدار کے خیال سے قیلولہ کے وقت قیلولہ کرنا ذکر اور نفل نماز پڑھنے سے افضل وبہتر ہے۔(۴)

وہ اس پر بھی خاص زور دیتے ہیں کہ قرآن وحدیث کی تفسیر وتشریح سنت نبوی کے موافق کرنی چاہیے اور اہل سنت والجماعت کے عقائد کو مضبوطی سے اختیار کرنا چاہیے اور اس معاملہ میں کسی شک وتذبذب کو راہ نہ دینی چاہیے۔

حدیث نبوی ما احدث قوم بدعة الا رفع مثلها من السنة کی تشریح کرکے

---

(۱) مکتوب نمبر ۵ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۰۲۔ (۲) مکتوب نمبر ۹ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۰۳۔ (۳) المحدثان، ص ۱۷ و ۱۸۔ (۴) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۱۰۔

واضح کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اختیار کرنا نئی نئی باتیں پیدا کرنے سے بہتر ہے، فرماتے ہیں:

''جب احداث بدعت (دین کی نئی باتیں وضع کرنا) رافع سنت (سنت کو ختم کرنا) ہے تو اس پر یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اقامت سنت (سنت کو قائم وزندہ کرنا) قامع بدعت (بدعت کا قلع قمع کرنا) ہے، مثلاً چنگ کو توڑنا سنت اور بہتر ہے اور اس کی مرمت کرنا بدعت اور غلط ہے، اتباع سنت سے نور پیدا ہوتا ہے اور بدعت میں گرفتاری سے ظلمت پیدا ہوتی ہے، پس خلا وا ستنجا کے آداب کی سنت کے مطابق رعایت کرنا سرائے اور مدرسہ کی تعمیر سے بہتر ہے۔ جب سالک سنت کے آداب کی رعایت و اہتمام میں ترقی کرتا ہے تو وہ مقام قرب حاصل کر لیتا ہے اور اس کو چھوڑنے سے وہ انحطاط وتنزل کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ چیز ہلاکت کا باعث ہوتی ہے، افضل کے ترک سے قساوت قلب میں مبتلا ہوتا ہے، اسی کو ''دین''، ''ختم'' اور ''طبع'' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور آدمی ترک افضل سے ان سب حالتوں تک پہنچ جاتا ہے، نعوذ باللہ من ذلک۔''(۱)

رد بدعت: اتباع سنت کی دعوت وتلقین کے ساتھ ہی وہ رد بدعت میں بھی پیش پیش تھے، اوپر کی تحریروں سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اس لیے یہاں دو ایک مثالیں پیش کرنے ہی پر اکتفا کی جاتی ہے، شیخ عبدالحق کا ارشاد ہے:

''اور اس بات کا اعتقاد کرنا چاہیے کہ جو کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقے کے خلاف ہے وہ باطل ہے اور جس شخص نے بھی کوئی ایسی نئی بات پیدا کی ہے جس سے سنت رسول کی مخالفت ہوتی ہے یا

(۱) تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار، ص۱۱۲و۱۱۳۔

اس میں تغیر پیدا ہوتا ہے، چاہے یہ مخالفت وتغیر قول میں ہو یا عمل میں یا
اعتقاد میں وہ گمراہی ہے اور مردود ہے۔"(۱)

۔ مشہور حدیث "جس نے ہمارے اس امر (دین) میں وہ بات پیدا کی جو اس سے نہیں ہے وہ مردود ہے" نیز آپؐ نے فرمایا کہ "ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے" کو نقل کر کے اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"ارباب دین نے کہا ہے کہ اس دل میں جو گرفتار بدعت ہے ولایت
کا نور داخل نہیں ہوتا۔"(۲)

بعض اعمال واشغال جو صوفیہ ومشائخ کے حلقوں میں رائج اور عام ہو گئے ہیں گو ان کی حلت وحرمت کا کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں تاہم ان کو جس شکل وطور سے اور جن جذبات ومیلانات کے تحت انجام دیا جاتا ہے، شیخ ان کی بھی مذمت کرتے ہیں اس سے بھی ان کے اتباع سنت ورد بدعت کے جوش وجذبہ کا اندازہ سے ہے، اس لیے یہاں مسئلہ سماع کے بارہ میں ان کے خیالات پیش کیے جاتے ہیں:

"مسئلہ سماع میں مشائخ طریقت کے افعال واقوال متعارض ہیں، جو جماعتیں اس کو جائز سمجھتی ہیں ان کے داعیے واسباب مختلف ہیں، بعض جماعتیں تو اس کام میں اس لیے مشغول ہیں کہ ان پر خواہش نفس کا غلبہ ہے، وہ نہ تو احکام شریعت کی پروا کرتی ہیں نہ انہیں صدق نیت کی دولت ملی ہے اور نہ انہیں احسن الامر کے اتباع اور اولیٰ وارجح کے اخذ کی طرف کوئی توجہ ہے، یہ جماعت خارج از بحث ہے، اس لیے کہ اس کے افعال و احوال میں کوئی ضبط وقید نہیں، یہ جانوروں کے حکم میں داخل ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہے، نفس پرستوں کی دوسری جماعت وہ ہے جو طاعت و

(۱) مکتوب نمبر ۹ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۰۳۔ (۲) ایضاً، ص ۱۰۴۔

عبادت کے ذوق، ذکر و تلاوت کی لذت اور خلوت و مناجات کی دولت سے محروم ہے، نغمہ بالطبع جذبات باطن کا محرک اور پریشان خیالی کو یکسو کرنے ولا ہے، ان لوگوں کو سماع نغمہ سے لذت و سرور اور مطلوب کا ایک شعور حاصل ہوتا ہے بس اسی چیز پر یہ اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں، اس حالت کو غنیمت سمجھتے ہیں اور تسویلات نفس و شیطان کی وجہ سے اس کو عبادت و ریاضت پر ترجیح دیتے رہتے ہیں اور عابدوں زاہدوں کے فضل کا انکار کرتے ہیں اور ان کو ذوق ولذت عشق سے محروم سمجھتے ہیں، اس فریب نفس کی جزا ان کو یہ ملتی ہے کہ روز بروز یہ لوگ دین و دیانت کے طریقے سے بیگانہ اور دور ہوتے جاتے ہیں اور جس کام میں یہ مشغول ہیں اس میں ان کا انہماک بڑھتا جاتا ہے، نماز سے ان کو بجز نشست و برخاست اور کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ نمازیں محض مخلوق کے زجر و تشنیع کے خوف سے دکھاوے اور تکلف کی پڑھتے ہیں، نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ان کی مجلسوں میں گانے والی خوبصورت عورتیں راہ پاتی ہیں اور حسن صوت کے ساتھ حسن صورت کے انضمام سے ان کا ذوق وشوق حد کمال تک پہنچ جاتا ہے۔''(۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ کی نظر مفاسد کے سرچشموں پر کیسی گہری تھی، جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے اس کے بارہ میں اپنے مرشد و شیخ عبدالوہاب سے ایک مرتبہ انہوں نے دریافت کیا کہ ''ہمارے علاقہ میں سماع کی رسم عام ہے، اس موقع پر لوگ جمع ہوتے ہیں جس میں اہل و نا اہل، فاسق و صالح ہر قسم کے لوگ اکٹھا ہوتے ہیں اور اس طرح کے کام کرتے ہیں، سماع کی یہ صورت جو ہندوستان میں رائج ہے اس کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ شیخ نے جواب میں ارشاد فرمایا ''اس طرح پر یہ کام اصلاً جائز نہیں، اس کو نہیں کرنا چاہیے بلکہ

(۱) مکتوب نمبر، بنام حضرت خواجہ باقی باللہ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۰۸و۱۰۹۔

اس سے اجتناب وقت کا ضروری تقاضا ہے، طالب حق کو اس صورت میں قطعاً سہولت و مسامحت سے کام نہیں لینا چاہیے۔''(۱)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور حضرت شیخ احمد سرہندیؒ: حضرت شیخ عبدالحق کے عہد میں حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی شخصیت علمی و دینی حیثیت سے بڑی اہم اور ممتاز تھی، ان کے مہتم بالشان اصلاحی وتجدیدی کارنامے کسی تفصیل و بیان کے محتاج نہیں، ڈاکٹر محمد اقبال کا ایک شعر ہی ان کی عظمت وعلوئے مرتبہ کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار (۲)

حضرت شیخ عبدالحق کے متعلق اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ علمی و دینی حیثیت سے ان کا پایہ بھی کم نہ تھا، اسی لیے یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے مداح وقدردان بھی تھے مگر اس کے باوجود دونوں میں اختلاف رائے بھی ہوا، چنانچہ مکتوبات امام ربانی کے بعض مندرجات پر شیخ عبدالحق کو اعتراضات وشبہات ہوئے تو انہوں نے بڑے غور وتامل اور بار بار استخارہ کرنے کے بعد ان شبہات واعتراضات کو ایک طویل مکتوب میں قلم بند کر کے حضرت مجدد صاحب کے پاس دریافت وتحقیق کی غرض سے بھیجا تا کہ جن خیالات کے بارے میں ان کو اعتراض ہے مجدد صاحب اس کا ازالہ کر دیں اور ان کے متعلق ان کی خلش دور کر کے ان کی تسلی وتشفی فرما دیں، چنانچہ مکتوب کے شروع ہی میں لکھتے ہیں:

دردِ دل دارم بسے از خوئے آں زیبا نگار
فرصتے یارب کہ دل را پیش وے خالی کنم

سالہا است کہ بعضے از کلمات ومکالمات کہ برسوں سے مکتوب شریف میں مذکور بعض

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۵۶۔ (۲) ضرب کلیم۔

در مکتوب شریف مذکور است واز قبیل موہمات است می خواہد کہ استفسار کند و استکشاف نماید میسر نشد۔ (۱)

اقوال و بیانات کے بارہ میں استفسار کرنا اور ان کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی سہولت میسر نہ آئی، یہ باتیں بڑی اہم اور وہم و شک میں مبتلا کرنے والی ہیں۔

آخر میں اس کے متعلق مزید وضاحت سے تحریر فرماتے ہیں:

ایں کلمات بقصد استفسار و استکشاف حال و دفع تالم عارض بال تسکین فرقہ صدر نوشتہ شد، قصد آں داشت کہ چیزے بنویسد و بالزام نفس راضی باشد ...... وایں را از چند مجلس املا نمودہ ہر بار استخارہ بجناب سعادۃ از شر نفس۔ (۲)

یہ باتیں استفسار اور کشف حال کی وضاحت چاہنے کے لیے لکھی گئی ہیں تاکہ دل کو جو خلش اور الم لاحق ہو گیا ہے وہ رفع ہو جائے اور قلب کو قرار و سکون حاصل ہو جائے، آپ جو کچھ تحریر فرما کر نفس قبولیت و رضا کے لیے مجبور کر دیں ..... اس مکتوب کو کئی نشستوں میں املا کیا اور ہر دفعہ درگاہ الٰہی میں شرور نفس سے بچنے کے لیے استخارہ کیا ہے۔

یہ مکتوب بد نیتی یا کسی غلط جذبہ کی وجہ سے نہیں لکھا گیا ہے اور نہ اس کا مقصد حضرت مجدد صاحب کی ذات سے کدورت و عداوت کا اظہار ہے بلکہ یہ تمام تر خیر خواہانہ اور اچھے جذبہ کے ماتحت لکھا گیا ہے اور اس کا مقصد اطمینان و شرح صدر اور زیر بحث مسئلہ کی حقیقت معلوم کرنا ہے جیسا کہ تحریر فرماتے ہیں:

اصل غرض نصیحت و خیر خواہی و کشف حال است الدین النصیحۃ (۳)

خط کی اصل غرض نصیحت و خیر خواہی اور کشف حال ہے کیوں کہ دین نصیحت ہے۔

(۱) حیات عبدالحق شیخ محدث دہلوی، ص ۳۱۳، مکتوب شیخ عبدالحق بنام شیخ احمد سرہندی۔ (۲) ایضاً ص ۳۴۳۔

(۳) حیات عبدالحق شیخ محدث دہلوی، ص ۳۱۳۔

یہاں اس کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ اعتراض واختلاف کے باوجو نہ حضرت مجدد صاحب سے شیخ عبدالحق کے اخلاص ومحبت میں کوئی کمی آئی تھی اور نہ ان کی عظمت ومنزلت اور علاوے مقام میں کوئی فرق آیا تھا بلکہ خط تحریر کرنے کے وقت بھی ان کے دل میں حضرت شیخ احمد سرہندی کا مقام ومرتبہ پوری طرح جاگزیں تھا، خط کی عبارت ان عربی کلمات سے کرتے ہیں:

ایها الشیخ العالم الفاضل العارف الذی اجتباه الیه وخصه بفضله واعطاه من المعارف مالم یعط غیره من العالمین (۱)	اے شیخ! عالم وعارف فاضل جس کو اللہ نے اپنے فضل سے برگزیدہ ومخصوص کیا ہے اور اسے وہ معارف عطا کیے ہیں جن سے دنیا کے کسی اور شخص کو نہیں نوازا ہے۔

اور آخر میں ان سے اپنے حسن ظن اور غیر معمولی محبت و یگانگت کا ذکر ان لفظوں میں فرماتے ہیں:

ظن فقیر بشیخ جمیل است ایں مقدار کہ مرا بشما نسبت محبت و اتحاد است کم کسے را خواہد بود...... نزد ایں فقیر شما ہم عزیزید و ہم طریقہ شما۔ (۲)	فقیر کو شیخ سے حسن ظن ہے اور ان سے جس قدر محبت والفت اور اتحاد و یگانگت کا تعلق ہے کم ہی کسی سے ہوگا...... اس فقیر کے نزدیک آپ بھی عزیز ہیں اور آپ کا طریقہ بھی عزیز ہے۔

اس محبت واخلاص اور اعتراف فضل وکمال کے باوجود انہوں نے خیر خواہی کے جذبہ سے حضرت مجدد صاحب کے مکتوب میں مجددیت ونبوت کے متعلق ظاہر کیے گئے خیالات کے بارہ میں وضاحت طلب کر کے اور استفسار فرما کر اپنے شکوک وشبہات کا ازالہ کرنے کے لیے یہ طویل مکتوب لکھا، ان کے خیال میں مجدد صاحب کی باتوں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہمیت کم ہوتی ہے اور ان کی عظمت مجروح ہوتی ہے نیز ان کے خیالات

(۳) حیات عبدالحق شیخ محدث دہلوی، ص۳۱۳۔ (۲) ایضاً ۳۴۳۔

کے ڈانڈے مہدویت کے عقائد سے بھی جا ملتے ہیں، اس کے علاوہ ان کو اس پر بھی اعتراض تھا کہ مجدد صاحب کے اقوال و بیانات سے بعض بزرگوں کی تنقیص و تحقیر ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ کسی مرید کا درجہ چاہے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو جائے اور وہ اپنے پیر سے برتر ہی کیوں نہ ہو جائے مگر ادب و احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان سے اپنے کو کمتر ہی تصور کرے اور اس کی عظمت و احترام کو نظر انداز نہ کرے۔

اگرچہ بایں اصطلاح ایں قوم ممکن است کہ مریدے در کمال از پیر درگزرد لیکن در رعایت ادب و بندگی و نیازمندی و فروتنی و حق شناسی باقیست شیخ علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کہ در کشف تحقیقات معاملات و وقائع آیتے بود و معلوم می شود کہ دریں باب از پیران خود گزرانیدہ است می گوید کہ اگر سر من بآسماں ساید ہنوز خاک آستانہ شیخ عبدالرحمٰن اسفرائنی و شیخ علی بالا شد۔	گو ان لوگوں کی اصطلاح میں یہ ممکن ہے کہ کمال میں کوئی مرید پیر سے آگے نکل جائے لیکن پھر بھی ادب و بندگی اور نیازمندی و فروتنی کی رعایت کرنی چاہیے، شیخ علاء الدولہ سمنانی معاملات و وقائع کی تحقیقات کے کشف میں خدا کی ایک نشانی تھے اور یہ معلوم ہے کہ اس حیثیت سے وہ اپنے پیروں سے بڑھے ہوئے تھے مگر اس کے باوجود فرماتے تھے کہ اگر میرا سر آسمان پر بھی ہو جائے تو بھی شیخ عبدالرحمٰن اسفرائنی اور شیخ علی کے آستانہ کی خاک اس سے بلند و بالا رہے گی۔
بلند مرتبہ زیں خاک آستاں شدہ ام غبار کوئے تو ام گر بر آسماں شدہ ام (۱)	

شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ ایسے مقدس بزرگوں کی شان میں بے ادبی و گستاخی کو طبیعت پر جبر کر کے گوارا کیا جا سکتا ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ظاہر کیے گئے خیالات کو برداشت کرنا طاقت سے باہر ہے۔

اما سخنان کہ نسبت بحضرت کائنات ﷺ	سرور کائنات ﷺ کے متعلق مکتوب شریف

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۳۴۳۔

می گویند آنہارا تاب ندارد وانچہ نسبت بمشائخ	میں جو باتیں کہی گئی ہیں انہیں برداشت
گفتند کرہاً وجبراً برداشتہ شدہ است اما برداشت	کرنے کی کوئی تاب و طاقت نہیں، خواہ
ایں کلمات از طاقت حال ایں فقیر بیرونست	مشائخ کے تعلق سے جو کچھ کہا گیا ہے اسے
و ہمیشہ دعائے فقیر در خلوت وجلوت بعد از	کرہاً وجبراً برداشت کرلیا جائے البتہ نبوت
صلوٰۃ درسائر اوقات ایں بودہ است اللّٰھم	کی شان میں نازیبا کلمات کو گوارا کرنا اس
ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا	فقیر کی طاقت سے باہر ہے، اس فقیر کی تمام
الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه اللّٰهم	وقتوں کی نماز کے بعد خلوت وجلوت میں
اجب(۱)	ہمیشہ یہ دعا رہتی ہے کہ اے اللہ تو ہمیں حق
	کو حق اور باطل کو باطل دکھا اور ہمیں حق کے
	اتباع اور باطل سے اجتناب کی توفیق عطا فرما!
	اے اللہ تو ہماری یہ دعا قبول فرمالے۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دونوں بزرگوں کا اختلاف علمی و دینی تھا، اس میں ذاتی عناد، مخالفت اور بدنیتی کا کوئی شائبہ نہ تھا اور یہ معاصرانہ رشک وحسد سے پاک اور اخلاص وللٰہیت پر مبنی تھا مگر متاخرین اور تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس اختلاف کی وجہ سے دونوں بزرگوں کے تعلقات خراب ہو گئے تھے، ان لوگوں نے ان واقعات کو ایسے رنگ میں پیش کیا ہے جس سے شیخ عبدالحق کی شخصیت مجروح ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت مجدد صاحب کے خیالات پر گرفت کر کے بڑی غلطی کی تھی، حالاں کہ عموماً ایک ہی عہد کے نادرۂ روزگار اشخاص میں اکثر علمی و دینی مسائل میں اختلافات رہے ہیں، تاریخ کی کتابیں اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہیں، اس بنا پر حضرت شیخ دہلوی اور حضرت مجدد صاحب میں اختلاف رائے کا ہونا نہ تو تاریخ کا کوئی نادر واقعہ ہے اور نہ تعجب انگیز، اس کی

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۳۴۳۔

وجہ سے شیخ عبدالحق کو مطعون کرنا اور دونوں بزرگوں کے تعلقات کو کشیدہ بتانا غلط ہے کیوں کہ حضرت شیخ کے مکتوب سے پوری طرح عیاں ہے کہ اسے تحریر کرنے کے وقت بھی ان کے دل میں مجدد صاحب کی عظمت و اہمیت کارفرما تھی اور مجدد صاحب بھی شیخ کے معترف و مداح رہے۔

یہاں یہ بات ضرور تحقیق طلب ہے کہ حضرت شیخ عبدالحق کو حضرت مجدد صاحب کی جانب سے جو شکوک وشبہات ہو گئے تھے کیا وہ دور ہوئے یا نہیں؟ اور شیخ نے اپنے خیالات سے رجوع کیا تھا یا نہیں؟

اس کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے شیخ عبدالحق کو غلط فہمی ہوگئی تھی مگر جب وہ رفع ہوگئی تو انہوں نے اپنی رائے تبدیل کر لی اور اپنے خیالات سے رجوع کر لیا، مولانا ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں:

> ''شیخ عبدالحق کی مخالفت کسی غلط بیانی کی بنیاد پر یا کسی غلط فہمی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی اور اس کا پردہ چاک ہونے یا غلط فہمی کے دور ہو جانے کے بعد رفع ہوگئی۔''(۱)

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم رقم طراز ہیں:

> ''معاصرت کی وجہ سے دونوں کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں جو بشریت کا تقاضا ہے اور ہر زمانہ میں ہوتا ہے...... یہاں تو معمولی سوئے تفاہم ہوا تھا جو بعد کو رفع ہوگیا اور تعلقات استوار ہوگئے۔''(۲)

مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی فرماتے ہیں:

> ''حضرت شیخ کی مخالفت چوں کہ بدنیتی کے ساتھ نہ تھی، لہٰذا حق تعالیٰ نے ان کو بہت جلد تنبیہ عطا فرمایا اور مخالفت سے رجوع کی توفیق دی بالآخر

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت جلد چہارم، ص ۳۳۶۔ (۲) الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر، ص ۳۸۔

وہ بھی حضرت امام ربانی کے غایت درجہ معتقد ہو گئے۔‘‘(۱)

شیخ کے سوانح نگار پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے:

’’عارضی طور پر شیخ محدث کو مجدد صاحب کے نظریات سے کچھ اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور انہوں نے مجدد صاحب کی تردید میں ایک رسالہ بھی لکھا تھا جو ضمیمہ کے طور پر اس کتاب میں شامل ہے، اختلاف کی نوعیت کا اندازہ اس رسالہ کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے، بعد کو جب شیخ مجدد نے اپنے خیالات کی وضاحت کی اور ان کے متعلق سب شبہات دور ہو گئے تو شیخ محدث کی رائے بھی بدل گئی، ان کا اختلاف نیک نیتی اور تحفظ شرع وسنت پر مبنی تھا، چنانچہ مشکوک وشبہات رفع ہو جانے کے بعد انہوں نے انتہائی وسعت قلب کے ساتھ حضرت کے کارناموں کا اعتراف کیا۔‘‘(۲)

اس کے برخلاف شیخ محمد اکرام کے نزدیک غلط فہمی دور ہو جانے اور شیخ کے اپنے خیالات سے رجوع کر لینے کی بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی، وہ فرماتے ہیں:

’’ابھی تک جو مواد ہمیں ملا ہے اس کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ شیخ عبدالحق نے رسالے کے مضامین سے رجوع نہیں کیا بلکہ جس مقصد سے انہوں نے یہ رسالہ لکھا تھا اسی کی تکمیل کے لیے اپنی ضخیم کتاب مدارج النبوۃ لکھی اور فی الواقع یہ مقصد شیخ کی علمی زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔‘‘(۳)

دوسری جگہ وہ مدلل طور پر لکھتے ہیں:

’’رجوع کی روایت کے متعلق یہ امر قابل غور ہے کہ یہ روایت صرف مجددی حلقوں میں مشہور ہے یا شیخ کی (بعد کی) کتابوں سے ملتی ہے،

(۱) الفرقان، مجدد الف ثانی نمبر، ص ۷۷۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱: ۲۲۔ (۳) رود کوثر ص ۳۶۹۔

شیخ محدث کی کسی تصنیف میں اس کا ذکر نہیں، ان کے خاندان میں بیسیوں صاحب علم، صاحب تصنیف گزرے ہیں، ان کے صاحبزادے شیخ نورالحق ممتاز اہل قلم تھے، ان کی کسی تحریر کا حوالہ نہیں دیا جاتا، آج سے ساٹھ ستر سال پہلے ان کے خاندان کے ایک بزرگ نے شیخ محدث کی ایک مبسوط سوانح عمری مرأۃ الحقائق کے نام سے شائع کی، اس میں شیخ کی تصنیفات کے ضمن میں رسالے کا اندراج بالوضاحت ہے، ''جواب بعض کلمات حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ'' (ص ۴۶، ۴۷) لیکن رجوع کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔''(۱)

مجددی سلسلہ کے لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت شیخ عبدالحق کے مکتوب میں حضرت مجددؒ کی جو باتیں نقل کی گئی ہیں وہ محرف اور غلط ہیں، یہ ایک نجی مکتوب تھا، حضرت شیخ نے اس کو اپنی کتاب المکاتیب والرسائل میں درج نہیں کیا، حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے ارشاد کے مطابق شیخ نے اس مکتوب کو ضائع کرنے کی وصیت کی لیکن اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مکتوب کے مندرجات غلط و محرف تھے اور شیخ نے واقعی اپنے اعتراف سے رجوع کر لیا تھا تو پھر مجددی حضرات کو اس مکتوب کے جواب میں کتب و رسائل تالیف کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''اس مکتوب کے جواب میں بکثرت رسالے لکھے گئے جن میں شیخ بدرالدین سرہندی شیخ محمد یحییٰ (فرزند اصغر حضرت مجدد) شیخ محمد فرخ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور حضرت شاہ غلام علی دہلوی کا نام لیا جا سکتا ہے، مولانا وکیل احمد سکندر پوری نے ''ہدیہ مجددیہ'' کے نام سے ایک مستقل کتاب اسی کے رد میں لکھی ہے جو ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔''(۲)

جن لوگوں کے خیال میں حضرت شیخ عبدالحق نے مجدد صاحب کے بارہ میں اپنی

---

(۱) رود کوثر، ص ۳۷۵۔ (۲) تاریخ دعوت و عزیمت، جلد چہارم، ص ۳۴۷ حاشیہ۔

رائے سے رجوع کرلیا تھا ان کی اہم دلیل وہ مکتوب ہے جو انہوں نے حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرید و خلیفہ حضرت خواجہ حسام الدین دہلوی کو تحریر فرمایا تھا اور جو اخبار الاخیار کے آخر میں درج ہے مگر اس سے بھی رجوع کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مجدد صاحب سے آج کل ان کا قلبی تعلق بہت بڑھ گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بعض اسباب کی بنا پر یا مکتوبات امام ربانی کے مندرجات پر شیخ کے اعتراضات کی وجہ سے کچھ لوگوں کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ دونوں بزرگوں میں صلح و صفائی نہیں ہے، شیخ عبدالحق اس کے ازالہ کی غرض سے فرماتے ہیں کہ میرے ان کے درمیان اس طرح کی کوئی بات ہی نہیں ہے بلکہ آج کل تو میرا دل ان کی جانب سے ہر قسم کے غل و غش سے پاک اور صاف ہے، میرے قلب کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ:

دریں ایام صفائی فقیر بخدمت میاں شیخ احمد سلمہ اللہ تعالیٰ از حد متجاوز است واصلاً پردۂ بشریت وغشاوہ جبلیت بمیان نماند قطع از رعایت طریقہ وانصاف وحکم عقل کہ با ایں چنیں عزیزاں و بزرگان بد نہ باید بود و در باطن بطریق ذوق و وجدان وغلبہ چیزے افتادہ است کہ زبان از تقریر آں لال است سبحان اللہ مقلب القلوب ومبدل الاحوال شاید ظاہر بیناں استبعاد کنند من نمی دانم کہ حال چیست و بچہ منوال است۔"(۱)	میاں شیخ احمد سلمہ اللہ کی طرف سے آج کل فقیر کے دل میں صفائی بہت زیادہ ہے، بشریت کا کوئی پردہ اور افتاد طبع کا کوئی شائبہ درمیان میں حائل نہیں رہا، اس سے قطع نظر انصاف و معقولیت کی رعایت اور عقل کے فیصلہ کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ برا خیال نہیں ہونا چاہیے، میرے دل میں ذوق و وجدان اور غلبہ کی بنا پر ایسی کیفیت ہوگئی ہے کہ اس کے بیان سے زبان قاصر ہے، دلوں کو پلٹنے اور احوال کو تبدیل کرنے والا اللہ پاک ہے، شاید

(۱) خاتمہ اخبار الاخیار، ص ۳۰۵۔

ظاہر بینوں کو اس پر یقین نہ ہو، میں خود بھی
نہیں جانتا کہ کیا حال ہے اور کیوں ہے۔

شیخ محمد اکرام نے اس مسئلہ پر بہت مفصل اظہار خیال کیا ہے اور دکھایا ہے کہ اس واقعہ میں رجوع کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے، ان کے تین نکات قابل توجہ ہیں لکھتے ہیں:

''یہ روایت مجددیہ سلسلے میں کافی پرانی ہے لیکن معاصرانہ اور معتبر تذکروں میں یعنی زبدۃ المقامات اور حضرات القدس میں نہیں، اس کا سب سے قدیمی بیان جو ہماری نظر سے گزرا ہے روضۃ القیومیہ میں (دفتر اول ص ۲۱۱ پر) ہے جہاں حضرت خواجہ کلاں (خلف ارشد حضرت خواجہ باقی باللہ) کی کلیات کے حوالے سے شیخ محدث کا ایک رقعہ خواجہ حسام الدین کے نام کا درج ہے جس کا مضمون تمہ اخبار الاخیار والے مندرجہ بالا رقعہ سے ایک حد تک ملتا ہے چونکہ حضرت خواجہ کلاں نے خواجہ حسام الدین کی سوانح عمری لکھی تھی اس لیے ان کی کلیات میں موصوف کے نام کے رقعات کا ہونا مستبعد نہیں (ممکن ہے کلیات خواجہ کلاں کا کوئی نسخہ دستیاب ہو جائے اور حقیقت حال پر زیادہ روشنی پڑ سکے) روضۃ القیومیہ میں مندرجہ رقعہ میں صرف ایک حد تک اشتراک ہے (شاید اختلاف مضمون کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے سامنے روضۃ القیومیہ کا صرف اردو ترجمہ ہے) لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ روضۃ القیومیہ میں یہ رقعہ کسی ''رجوع'' کی تائید میں نقل نہیں ہوا بلکہ مصنف نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شیخ محدث آنجناب (یعنی حضرت مجدد الف ثانی) کی تجدید اور قیومیت کے معترف تھے۔

''اس کے بعد ''رجوع'' کی روایت عام ہونی شروع ہوئی اور شیخ عبدالحق محدث کے رقعہ بنام خواجہ حسام الدین کو اس روایت کی تائید میں

پیش کیا گیا، تتمہ اخبار الاخیار (مجتبائی) میں لکھا ہے" رجوع شیخ مشہور د برالسنۃ ثقات مذکور" مجتبائی پریس سے اخبار الاخیار ۱۳۳۲ھ (یعنی ۱۹۱۳ء) میں شائع ہوئی، اس کے بعد عام طور پر اس روایت کو دہرا دیا جاتا ہے، چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تذکرہ میں اسی خیال کا اظہار کیا۔"(۱)

آگے اس کو مزید صراحت سے لکھتے ہیں:

"جہاں تک خواجہ حسام الدین کے نام کا رقعہ ہے، روضۃ القیومیہ کی عبارت دیکھنے کے بعد یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ جو رقعہ تتمہ اخبار الاخیار میں نقل کیا گیا اس سے ملتا جلتا کوئی رقعہ شیخ محدث نے کسی وقت خواجہ حسام الدین کے نام لکھا، یہ رقعہ ہم نقل کر چکے لیکن اس رسالے سے "رجوع" اخذ نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ صفائی کا خیال ہو سکتا ہے ..... شیخ محدث نے جس طرح کا رسالہ لکھا تھا اور مشتہر کیا تھا، اگر اس کو وہ غلطی سمجھتے تھے تو اعتراف سہو بھی علانیہ ہونا چاہیے تھا، اس کے علاوہ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ رقعہ رسالے کی تالیف کے بعد لکھا گیا۔"(۲)

پھر تحریر فرماتے ہیں:

"اخبار الاخیار (مجتبائی) والے رقعہ کی نسبت یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں حضرت مجدد سے جتنی ارادت کا ذکر ہے اس سے زیادہ شیخ محدث رسالہ لکھتے وقت ظاہر کر چکے تھے لیکن یہ ارادت رسالہ لکھنے میں مانع نہ ہوئی، اس خط میں بھی "میاں احمد سرہندی" کو مجدد نہیں کہا گیا اور بہرکیف اگر کسی باطنی اشارے کی بنا پر حضرت شیخ مجدد سے شیخ کی عقیدت بڑھ گئی ہو تب بھی رسالے میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے شیخ عبدالحق جیسا

(۱) رود کوثر، ص ۳۶۳، طبع چہارم۔ (۲) ایضاً، ص ۳۶۶۔

عاشق رسول ''رجوع'' کرے۔''(۱)

شیخ محمد اکرام کا خیال یہ بھی ہے کہ شیخ عبدالحق کے اس رسالہ کی تالیف کا جو مقصد ہے اسی کی تکمیل کے لیے انہوں نے مدارج النبوۃ بھی لکھی تھی، ان کے زمانے میں مہدویت قیومیت اور عقلیت کے طرف داروں نے عقائد و خیالات میں الجھنیں ڈال رکھی تھیں، شیخ نے ان سب کا علاج یہی سوچا کہ نبوت کی عظمت وحقیقت کو نمایاں کیا جائے، شیخ محمد اکرام نے مدارج النبوۃ کے بعض اقتباسات نقل کر کے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ان کا روئے سخن حضرت مجدد صاحب ہی کی طرف ہے گویا اس کی تصنیف کا مقصد بھی حضرت مجدد صاحب کے خیالات کی تردید تھا۔

رجوع کے مسئلہ سے قطع نظر اب بھی یہ ایک اہم اور ضروری سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا شیخ عبدالحق کے اعتراضات بجا تھے؟ اور واقعی مجدد صاحب کے اقوال و بیان میں قابل اعتراض اور لائق تردید باتیں تھیں اور ان سے عقیدۂ نبوت ورسالت پر زد پڑتی تھی۔

عام خیال یہی ہے کہ شیخ عبدالحق کو اس معاملہ میں غلط فہمی ہوگئی تھی جس کا باعث مجدد صاحب کا ''اظہار مقامات'' تھا، ان کے خیال میں ''مکاشفات باطنی'' کا اس طرح اظہار نامناسب اور خلاف مصلحت تھا، حضرت شاہ غلام علی کا خیال ہے کہ شیخ محدث نے اعتراضات بطریق علمائے ظاہر کیے تھے، حضرت مجدد کے متعلقہ بیانات بطور اہل باطن کے تھے۔(۲)

لیکن یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ حضرت شیخ عبدالحق کا پایہ تصوف وسلوک میں بھی بہت بلند تھا اس لیے ان کو اس طرح کے مکاشفات اور اظہار مقامات کی وجہ سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے تھی، اس لیے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ایک اور انداز ہ سے اس کی توجیہ کی ہے حالانکہ شیخ عبدالحق کی شریعت وطریقت اور علم ظاہر و باطن دونوں کی جامع تھی، مولانا فرماتے ہیں:

(۱) رودکوثر، طبع چہارم، ص ۳۶۹۔ (۲) ایضاً، ص ۳۶۸۔

''نیز انہوں نے جن نئے علوم وتحقیقات کا اپنے مکتوبات اور مجالس کے ذریعہ افاضہ فرمایا، جن میں بہت سے عوام تو عوام خواص کے لیے بھی نامانوس اور ایک حد تک (اگر موجب وحشت نہیں تو) موجب حیرت ضرور تھے اور ان میں بہت سے ان حلقوں کے مسلمات کے خلاف تھے جو نسل در نسل منتقل ہوتے چلے آرہے تھے اور یہ معاملہ اکثر ان نادرۂ روزگار شخصیتوں کے ساتھ پیش آیا ہے جو کسی علم وفن کی مجتہد اور کسی سلسلہ وطریق کی بانی اور اپنے زمانہ عام علمی، ذہنی وباطنی سطح سے بلند ہوتی ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ علوم وکمالات وہبی سے نوازتا ہے اور وہ عام اصطلاحات اور قدیم تعبیرات کے دائرہ سے باہر قدم نکالتی ہیں۔''(۱)

تقلید میں شدت اور حنفیت میں غلو وتعصب کا الزام: نواب صدیق حسن خان مرحوم نے اپنی مختلف کتابوں میں حضرت شیخ محدث کا تذکرہ کیا ہے اور گو عموماً انہوں نے ان کے کمالات کا اعتراف کیا ہے مگر ہر جگہ حنفیت میں ان کے غلو وتعصب کا ذکر بھی کیا ہے، باوجودیکہ انہیں اس کا اعتراف ہے کہ حضرت محدث ہی کی بدولت ہندوستان میں احادیث کی عام نشر واشاعت ہوئی (۲) مگر پھر بھی وہ انہیں حدیث میں قلیل البضاعت بتاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شیخ کو زیادہ دستگاہ اور اصل مہارت فقہ حنفی میں تھی، ہم حدیث میں شیخ عبدالحق محدث کی بلند پائیگی پر مفصل بحث کر چکے ہیں، اس سے اس اعتراض کی مکمل تردید ہو جاتی ہے، اس بنا پر یہاں صرف فقہی عصبیت ہی کے بارہ میں مختصر بحث وگفتگو کی جائے گی، نواب صاحب فرماتے ہیں:

''حنفی مذہب کے معاملہ میں وہ متعصب تھے.....تقلید میں شدت

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت، ج۴، ص ۳۳۵و۳۳۶۔ (۲) الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ، ص ۷۰، مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۳ھ۔

اور مجرد رائے سے اپنے مذہب و مسلک کے تحفظ کی خاطر احادیث کی
تاویل کرنے پر اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔''(۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں ان کی تصنیفات نہایت مشہور ہیں اور یہ سب کی
سب مفید اور نافع ہیں مگر مذہبی تعصب سے خالی نہیں ہیں۔''(۲)

یہاں تک کہ وہ حضرت مجدد صاحب سے ان کے اختلافات کو بھی تقلید مذہب اور ان کے غیر معمولی تعصب ہی کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں، ملاحظہ ہو:

''اختلاف کا سبب یہ تھا کہ حضرت شیخ فقہی مذہب کی تقلید میں بڑے
متعصب تھے اور حضرت مجدد صاحب اتباع سنت، رد بدعت اور شریعت و
طریقت کے معاملہ میں متعصب اور سخت تھے، یہ دونوں چیزیں ایک ہی
موڑ پر کیسے یک جا ہو سکتی ہیں۔''(۳)

تقصار جیود الاحرار میں بھی انہیں اہل رائے کے معاملہ میں جانبداری کرنے والا اور پیچ سے کام لینے والا بتایا ہے۔(۴)

ان اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ شیخ عبدالحق متشدد و متصلب، مقلد اور غالی و متعصب حنفی تھے۔

۲۔ اپنے مذہب کی حمایت کے جوش میں محض قیاس و رائے سے حدیث کی بیجا تاویل و توجیہ کرتے تھے۔

۳۔ اسی غلو اور حنفی عصبیت کی بنا پر انہوں نے مجدد الف ثانی کی مخالفت کی تھی۔

۱۔ اس میں شبہ نہیں کہ شیخ عبدالحق دہلوی مسلکاً حنفی تھے اور وہ تقلید کے بھی قائل تھے، انہوں نے حنفی مذہب کو عقلاً و نقلاً قوی، مرجح اور حدیث کے موافق ثابت کرنے کی بھی

(۱) ابجد العلوم، ص ۹۰۱۔ (۲) اتحاف النبلا، ص ۳۰۴۔ (۳) ایضاً، ص ۳۰۵۔ (۴) ایضاً، ص ۱۱۲۔

کوشش کی ہے اور اس عام خیال کی تردید بھی کی ہے کہ فقہ حنفی مجرد رائے اور ظن وقیاس پر مبنی ہے اور یہ بتایا کہ وہ کتاب وسنت کی روح کے مطابق اور ان سے قریب تر ہے۔

شیخ عبدالحق نے حنفی مذہب کی تائید وترجیح کے باوجود دوسرے ائمہ ومجتہدین کے مذاہب اقوال اور دلائل بیان کرنے میں کوتاہی نہیں کی ہے بلکہ بعض مسائل میں انہوں نے حنفی مذہب ہی کی طرح دوسرے مذاہب کے دلائل کی قوت ووزن کو بھی تسلیم کیا ہے، ان کے نزدیک تمام فقہی مذاہب کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں اور برحق ہیں، وہ جن مسائل میں حنفی مذہب کی پرزور تائید کرتے ہیں ان میں بھی اعتدال وتوازن کی شاہراہ پر قائم رہتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اور فقہائے احناف کی طرح دوسرے ارباب فقہ اور فقہی مذاہب کے ائمہ واساطین کا ذکر بھی بڑے ادب واحترام سے کرتے ہیں، انہوں نے ان ائمہ کے تذکرے بھی اپنی کتابوں میں قلم بند کیے ہیں۔

اپنے مذہب کی تائید وترجیح کے باوجود جب وہ دوسرے بزرگوں کی تنقیص وتحقیر نہیں کرتے تو ان کو متشدد وغالی قرار دینا بیجا ہے۔

اسی طرح شیخ کی جانب تقلید کے مسئلے میں شدت کی نسبت بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ جزئی وفقہی مسائل پر بحث وگفتگو کرتے وقت آنکھ بند کرکے حنفی مذہب کی تائید نہیں کرتے بلکہ ہر موقع پر کتاب وسنت کے دلائل کا بھی انبار لگا دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ شیخ کے زمانہ میں جو فقہی تعصب وجمود عام تھا اور جس کی وجہ سے حدیث وسنت کا علم تھا پس پردہ ہو گیا اور اس سے بعد بہت بڑھ گیا تھا، شیخ نے کتب حدیث کے درس ومطالعہ کو رواج دے کر اور ان کے شروح وحواشی قلم بند کر کے اس جمود وتعطل کو ختم کرنے کی کوشش کی، اس طرح وہ مقلد ہونے کے بجائے جامد اور متشدد مقلد نہ تھے۔

۲۔ حدیثوں کی من مانی تاویل کی بات بھی صحیح نہیں ہے، شیخ عبدالحق نے اس کی کوشش تو ضرور کی ہے کہ حنفی مذہب کو نقلی حیثیت سے بھی مدلل کر کے پیش کریں اور یہ

دکھائیں کہ وہ حدیث کے خلاف نہیں ہے مگر اسے کھینچ تان کر حدیث کو اپنے مذہب کے موافق بنانا نہیں کہا جاسکتا، اگر کہیں غیر شعوری طور پر بلا قصد و ارادہ ایسا وقوعہ ہوا بھی ہو تو چونکہ شیخ کا عام طریقہ اس کے برعکس ہے اس لیے محض چند مثالوں کی وجہ سے یہ الزام عائد نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مجرد رائے و قیاس سے حدیث کی تاویل کرتے تھے اور یہ ان کا عام شیوہ تھا، نواب صاحب خود ایک مذہب و مسلک سے وابستہ تھے ممکن ہے ان کا یہ تاثر اسی مذہب سے وابستگی کا نتیجہ ہو۔

۳۔ حضرت مجدد صاحب خود مسلکاً حنفی تھے، ان سے شیخ کا اختلاف حنفیت میں غلو و تعصب کی بنا پر نہیں تھا بلکہ دراصل مجدد صاحب کے نظریہ قیومیت اور نبوت کے متعلق ان کے بعض آراء و خیالات کی وجہ سے انہیں اختلاف تھا، معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے مکتوب کا علم نواب صاحب کو نہ تھا ورنہ وہ اس طرح کا بے بنیاد الزام عائد نہ کرتے۔

وفات اور مقبرہ: شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی وفات دوشنبہ ۲۳ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کو دارالسلطنت دہلی میں ہوئی، فخر العالم سے تاریخ وفات نکلتی ہے، وفات کے وقت آپ کی عمر چورانوے (۹۴) برس تھی، بختاور خان لکھتے ہیں:

در سنہ یک ہزار و پنجاہ و دو رحلت فرمود، فخر العالم تاریخ وفات ست، علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل نیز از انتقال آنصاحب کمال خبر میدہد۔(۱)	۱۰۵۲ھ میں شیخ عبدالحق نے رحلت فرمائی ......فخر العالم تاریخ وفات ہے "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" سے بھی اس صاحب کمال کے انتقال کا پتہ چلتا ہے۔

شاہنواز خان نے بھی مرأۃ آفتاب نما میں یہی تاریخ لکھی ہے، متاخر تذکرہ نگاروں نے بھی یہی لکھا ہے(۲) مگر مفتی غلام لاہوری کا بیان ہے:

وفات شیخ عبدالحق بقول صاحب مخبر الواصلین   صاحب مخبر الواصلین کے قول نیز دوسرے

(۱) مرأۃ العالم، ج ۲، ص ۴۴۴۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۱۰۔

ودیگر اقوال صحیح در سال یک ہزار و پنجاہ و یک است بعہد شاہجہانی (۱)	صحیح اقوال کے مطابق شیخ عبدالحق کی وفات شاہجہاں کے دور میں ۱۰۵۱ھ میں ہوئی۔

صاحب مخبر الواصلین کے علاوہ (۲) مولوی کبیر احمد صاحب پھلواروی نے شیخ محدث کی تاریخ وفات میں جو اشعار کہے ہیں ان سے ۱۰۵۱ھ ہی نکلتا ہے۔ (۳)

خافی خان نے سب کے برخلاف "زیادہ از صد سال مرحلہ عمر طے نمودہ" (۴) لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتقال کے وقت ان کا سن ۱۰۰ برس سے بھی زیادہ تھا مگر بختاور خاں کے بیان ہی کو عام طور پر صحیح اور مرجح مانا جاتا ہے۔

ان کی وصیت کے مطابق ان کے فرزند شیخ نور الحق نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور حوض شمسی کے قریب پاک اور مغفور لوگوں کے پہلو میں دفن کیے گئے، قبر پر ایک لوح لگانے کی وصیت بھی فرمائی تھی، شیخ نور الحق نے یہ تختی بھی لگائی اور اس میں تاریخ وفات اور مختصر حالات بھی جامعیت کے ساتھ تحریر فرمائے، ان کی قبر آج بھی زیارت گاہ خلائق ہے، نواب صدیق حسن خاں نے دوبارہ اس کی زیارت کی تھی اور انہیں اس جگہ عجیب کشش اور دلبستگی حاصل ہوئی تھی (۵) لکھتے ہیں:

ولما وردت بدهلي حضرت على مزاره وزرته فوجدت موضع القبر مونسا بردا (٦)	میں دہلی گیا تو ان کے مزار پر حاضر ہوا اور قبر کی زیارت کی، قبر کی جگہ پر مجھے بڑی انسیت اور ٹھنڈک نصیب ہوئی۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

بندہ عاجز در دہلی بر تربت شریف او رسیدہ نمی تواند گفتن کہ کدام روح و ریحان بر کاتش	یہ عاجز بندہ دہلی میں ان کی تربت پر پہنچا تو کہہ نہیں سکتا کہ ان کی برکتوں کی کیسی

(۱) خزینۃ الاصفیا، ج۱، ص۱۶۴۔ (۲) مخبر الواصلین، ص۲۷۔ (۳) تاریخ الکملا، ص۴۰۔ (۴) منتخب اللباب، ج۱، ص۲۴۰۔ (۵) اتحاف النبلا، ص۳۰۴۔ (۶) ابجد العلوم، ص۹۰۱۔

مشاہدہ نمودہ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ (۱) فرحت بخش خوشبو اور لذت مشاہد میں آئی۔

الیٹ نے اپنی تاریخ ہند میں تحریر کیا ہے کہ شیخ عبدالحق نے اپنا مقبرہ خود ہی تعمیر کرایا تھا اور وہ اسی میں دفن ہوئے مگر سر سید احمد خان کا بیان ہے کہ یہ مقبرہ آپ کے انتقال کے بعد بنا ہے (۲) مرأۃ الحقائق میں ہے کہ مہابت خان سپہ سالار افواج شاہجہانی نے یہ مقبرہ شیخ کی زندگی ہی میں تعمیر کرایا تھا۔(۳)

اولاد واحفاد: شیخ محدث کی نسل کے ذریعہ ان کے بعد بھی ان کا علمی فیض جاری رہا ان میں متعدد ایسے اصحاب فضل وکمال ہوئے جنہوں نے تصنیف وتالیف اور درس وافادہ کا سلسلہ شیخ کے بعد مدتوں جاری رکھا، سات پشتوں تک مسلسل ان کی اولاد علمی ودینی خدمات انجام دیتی رہی اور اس کی بدولت ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں دینی علوم خصوصاً حدیث کی اشاعت وترویج ہوئی، عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے''از اعقاب او ہفت تن تحصیل علوم نمودہ بافادہ مشغول اند''(۴) ذیل میں ان کے اولاد واحفاد کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے، ان میں جولوگ علم حدیث میں زیادہ ممتاز اور صاحب تصنیفات تھے، ان کا علاحدہ سے آگے تذکرہ ہوگا۔

شیخ محدث کی جسمانی یادگار تین فرزند تھے جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ شیخ نور الحق: یہ حضرت شیخ عبدالحق کے سب سے بڑے صاحبزادے اور ان کے علمی کمالات کے وارث اور جانشین تھے، ان کا شیخ کے تذکرہ کے بعد علاحدہ سے کسی قدر مفصل ذکر آئے گا اور اسی ضمن میں ان کے اولاد واحفاد کا تذکرہ بھی ہوگا۔

۲۔ شیخ علی محمد: یہ شیخ عبدالحق کے دوسرے فرزند تھے جو اپنے زمانہ کے فضلا میں شمار کیے جاتے تھے، ان کی ولادت ونشو ونما دہلی میں اپنے والد بزرگوار کے زیر سایہ ہوئی، یہ

---

(۱) تقصار جیود الاحرار، ص۱۱۳۔ (۲) آثار الصنادید، ص۹۵، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی۔ (۳) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۷۲۔ (۴) بادشاہ نامہ، جلد اول، حصہ دوم، ص۳۴۴۔

برابران کے ساتھ رہتے تھے اورانہوں نے ان سے بڑا فیض بھی حاصل کیا تھا، درسی کتابیں بھی اپنے والد ہی سے پڑھی تھیں، ان کی مندرجہ ذیل تین کتابیں متداول رہی ہیں:

۱۔ خزائن الدرر، عربی فارسی اورترکی زبانوں کا لغت ہے۔

۲۔ رسالہ احوال پنج پیران چشت: اس میں مندرجہ ذیل پانچ بزرگان چشت کے حالات تحریر کیے ہیں: ۱۔ خواجہ معین الدین چشتی ۲۔ قطب صاحب ۳۔ بابا فرید ۴۔ محبوب الٰہی ۵۔ چراغ دہلوی

۳۔ نجات المریدین: مرأۃ الحقائق کی صراحت کے مطابق یہ رسالہ شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات پر مشتمل ہے۔(۱)

شیخ علی محمد کے بیٹے شیخ ابوالمفاخر تھے، ان کے تین بیٹے ہوئے۔(۲)

۳۔ ابوالمکارم تقی الدین محمد ہاشم: یہ شیخ محدث کے تیسرے صاحبزادے تھے جو جید عالم اور زاہد مرتاض بزرگ تھے، علم کی طرح عمل میں بھی بلند تھے، دارالسلطنت دہلی میں ولادت اور نشوونما ہوئی، اپنے والد کی صحبت میں رہ کر علم وفن کی تحصیل کی، فقہ وحدیث میں بڑی مہارت تھی، والد ہی نے ان کو اجازت وسند عطا کی تھی (۳) شیخ عبدالحق محدث نے اپنی تصنیف تالیف القلب الالیف میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"فرزند عزیز محمد ہاشم بھی علم وفضل میں اپنے بھائی نورالحق کے پیچھے پیچھے ہیں، جودت وسلامتی طبع کے علاوہ علم وعمل خصوصاً حدیث شریف کے علم میں موصوف وممتاز ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں بلند مراتب پر فائز کرے۔"(۴)

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۸۸۔ (۲) پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شیخ علی محمد کے اولاد واحفاد کا شجرہ دیا ہے، ملاحظہ ہو حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۵۵۔ (۳) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۳۹۴۔ (۴) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۲۷۔

شیخ محمد ہاشم کے ایک فرزند محمد عاصم کے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے ایک گرامی نامہ میں شیخ نورالحق کو جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اپنے پوتے سے خاص تعلق اور دل بستگی تھی۔(۱)

محمد عاصم سے محمد محتشم اور ان سے محمد معتصم تولد ہوئے۔(۲)

تصنیفات: شیخ عبدالحق کو اللہ تعالیٰ نے تصنیف و تالیف کا بڑا اچھا ذوق عطا کیا تھا، ان کی زندگی کا زیادہ حصہ تصنیف و تالیف میں بسر ہوا، بڑھاپے میں بھی ان کے علمی انہماک اور تصنیفی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی، عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ ''جلوس کے دسویں سال ۱۰۴۷ھ میں ان کی عمر ۹۰ سال کی ہوگئی تھی لیکن اس کے باوجود ان کے ظاہری و باطنی حالات میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا تھا، عبادات، اوراد، ذکر و تلاوت نیز تعلیم و تصنیف اور تصحیح کتب کا التزام اسی نہج پر جاری تھا جیسے جوانی میں تھا'' اسی لیے انہوں تصنیفات کا بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے جن کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو بتائی جاتی ہے، گو ان میں سے بعض کتابوں کا نام اب بھی معلوم نہیں ہے اور متعدد کتابیں ناپید اور معدوم ہیں، تاہم اس سے ان کے تصنیفی کام کی وسعت و کثرت کا اندازہ ہوتا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ اللہ نے ان کو کیسی غیر معمولی قوت و صلاحیت بخشی تھی اور ان کے وقت میں کتنی برکت عطا کی تھی، اسی لیے وہ مصنفین اور علمائے اسلام میں تصانیف کی کثرت کے لحاظ سے منفرد اور یکتا خیال کیے جاتے ہیں۔

شیخ عبدالحق کی تصنیفات علمی و تحقیقی حیثیت سے بلند پایہ ہیں، ان میں بڑی تلاش و جستجو کافی محنت و کاوش اور پوری تحقیق و تدقیق سے مواد فراہم کیا گیا ہے، انہوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس کا حق ادا کر دیا ہے، زیر بحث موضوع کی تمام کتب اور اس سے متعلق سارا مواد ان کے پیش نظر ہوتا تھا اور جو کچھ لکھتے تھے بڑے غور و مطالعہ کے بعد لکھتے تھے

---

(۱) کتاب المکاتیب والرسائل مکتوب آخر بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۲۸۔(۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شجرہ ۲۵۵۔

اس لیے ان کی تصنیفات موضوع کے تمام پہلوؤں اور گوشوں کا احاطہ کر لیتی تھیں، خصوصاً فن حدیث سے متعلق انکی تصنیفات بڑی محنت و تحقیق اور کدو کاوش کا نتیجہ ہیں، ان کی کوئی بھی کتاب علمی و تحقیقی حیثیت سے کمتر اور ساقط الاعتبار نہیں ہے۔

شیخ نے بکثرت موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں، جن کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے ہی سے ان کے ذوق کے تنوع، علمی تبحر، ذہن رسا، جودت طبع اور تصنیف و تالیف کے سلیقہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کی کتابوں کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ ان میں ان کے عہد کے میلانات ور جحانات کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور جو شکوک و شبہات دین کے بارہ میں اس عہد میں پیدا ہو رہے تھے ان کی تردید کی گئی ہے، اسی لیے ان کی تصنیفات میں اکبر کے فتنوں اور اس زمانہ کے باطل افکار کا جواب بھی دیا گیا ہے اور مشائخ و صوفیہ کو ان کے احکام و فرائض بھی یاد دلائے گئے ہیں اور یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ مریدوں کی باطنی اصلاح و تزکیہ پر پوری توجہ مبذول کریں، امراء و حکام کو بھی احیائے دین اور بدعات کے سدباب کی تلقین کی گئی ہے۔

شیخ کا طرز نگارش باوقار، عالمانہ اور سلیس و شگفتہ ہے، مضمون کے مناسب زبان ہوتی ہے، وہ اگرچہ مواد پر زیادہ زور دیتے ہیں تاہم طرز تحریر کو بھی نظر انداز نہیں کرتے، کتابوں کی ترتیب و تبویب میں بھی بڑے سلیقہ سے کام لیتے ہیں، عربی الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا استعمال قارئین کو گراں نہیں گزرتا بلکہ اس سے فارسی عبارت کے زور و وقار میں اضافہ ہوتا ہے، ان کو عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے میں بڑی مہارت اور کمال حاصل تھا اور اس حیثیت سے وہ اپنے زمانہ میں یکتا اور منفرد تھے، ان کی تصنیفات کی تین نوعیتیں ہیں:

۱۔ خود براہ راست کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ ۲۔ کتابوں کے شروح و حواشی لکھے۔ ۳۔ ترجمے کیے یعنی فارسی میں عربی کتابیں منتقل کیں۔

ان کی تحریریں ماقل و مادل اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھیں اور ان میں بڑی

سلاست وروانی ہوتی تھی، کہیں کوئی الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں ہوتی تھی، وہ کم سے کم لفظوں میں اختصار کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرتے ہیں، اتنی ساری کتابیں لکھنے کے باوجود کہیں بیجا اطناب اور نامناسب طول بیان نہیں ہوتا، ان خوبیوں کی وجہ سے ان کی تصنیفات کو بڑی شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی اور اہل علم نے بھی ان کو بہت پسند کیا اور ان کی جانب خاص توجہ واعتنا کی، ان کے فرزند شیخ نور الحق لکھتے ہیں ''فنون علمیہ بالخصوص فن حدیث میں معتبر کتابیں تصنیف کیں، علمائے زمانہ نے ان کی جانب اس قدر اور اس حد تک اعتنا کیا کہ اس کو اپنا دستور العمل بنایا اور خاص وعام لوگوں نے ان کو حرز جان بنایا۔

بعد کے مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے بھی ان کی تصنیفات کی مقبولیت اور حسن قبول کا اعتراف کیا ہے، ذیل میں حروف تہجی کی ترتیب سے ان کے نام نقل کیے جاتے ہیں اور ان کا مختصر تعارف بھی کرایا جاتا ہے، مشکوٰۃ کی شرحوں کا ذکر آخر میں آئے گا۔

۱۔ **اجازۃ الحدیث فی القدیم والحدیث:** اس رسالہ میں اپنی اسناد حدیث درج کی ہیں مگر یہ دستیاب نہیں، مرأۃ الحقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قلمی نسخہ مولوی انوار الحق کے کتب خانہ میں تھا، بعض لوگوں نے اسی رسالہ کا نام ذکر **اجازات الحدیث فی القدیم والحدیث** لکھا ہے(۱) مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی مرحوم نے اسماء الاساتذہ کے نام سے بھی ان کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔(۲)

۲۔ **اجوبۃ الاثنا عشر فی توجیہ الصلوٰۃ علی سید البشر:** یہ مختصر رسالہ شیخ نے ایک ہی نشست میں سحر کے وقت تحریر کیا تھا، اس میں درود شریف **اللّٰھم صل علی محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم** کی تشبیہ پر بحث وگفتگو کی ہے، اس کا قلمی نسخہ بھی مولوی انوار الحق دہلوی کے کتب خانہ میں ۱۹۰۲ء تک موجود تھا۔(۳)

۳۔ **احوال الائمۃ الاثنا عشر:** یہ رسالہ حضرت خواجہ محمد پارسا کی مشہور کتاب

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۵،ص۲۰۴۔ (۲) ایضاً۔ (۳) بحوالہ مرأۃ الحقائق،ص ۴۸۔

فصل الخطاب سے ملخص ہے (۱) اس کا قلمی نسخہ بانکی پور کے کتب خانہ میں موجود ہے، اس میں بارہ ائمہ کے حالات درج ہیں، اس کا تاریخی نام ''دم خاندان کرم'' ہے جس سے ۱۰۱۰ھ تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ (۲)

۴۔ اخبار الاخیار: یہ ہندوستان کے علماو مشائخ کا ایک مستند تذکرہ ہے، اس میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے زمانہ سے لے کر اپنے دور تک کے صوفیہ واخیار کے حالات لکھے ہیں، ابتدا میں تبرکاً اور عقیدت کی وجہ سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا تذکرہ بھی کیا ہے جن کے سلسلۂ قادریہ میں شیخ کئی بزرگوں سے بیعت تھے، اخبار الاخیار میں ہندوستانی بزرگوں کے حالات تاریخی ترتیب سے لکھے ہیں اور اس کی ترتیب مندرجہ ذیل تین طبقوں پر ہے، پہلے طبقہ میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری اور ان کے معاصرین اور مریدین وخلفا کے حالات دیے ہیں، دوسرے میں بابا فرید گنج شکر اور ان کے ہم عصر بزرگوں اور مریدوں کا تذکرہ ہے اور تیسرے طبقہ میں حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی اور ان کے سلسلہ کے بزرگوں اور معاصرین کے تراجم قلم بند کیے ہیں، پھر مجاذیب اور اصحاب عرفان خواتین کا ذکر کیا ہے، آخر میں ایک تکملہ ہے، اس میں اپنے آباواجداد اور خود اپنے نجی وذاتی حالات لکھے ہیں۔

اخبار الاخیار کو شیخ عبدالحق نے بڑی محنت وتحقیق اور غیر معمولی کاوش اور دیدہ ریزی سے لکھا ہے اور اس سے ان کے وسعت مطالعہ اور علمی تبحر کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اس کی بعض نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ حتی المقدور مستند واقعات لکھے ہیں اور کشف وکرامات کے قصوں اور خرافات سے پرہیز کیا ہے، بزرگوں کے حالات وواقعات کے بیان میں عموماً غلو وافراط سے کام لیا ہے لیکن شیخ نے اس سے اپنے کو محفوظ رکھا ہے، عقیدت کے باوجود انہوں نے واقعات کی تحقیق

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۵۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۴۔

اور چھان بین میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔

۲۔ مصنف نے صرف سادہ حالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ صاحب تصانیف صوفیہ کی کتابوں کے اقتباسات بھی دیے ہیں اور بعض بزرگوں کے اقوال وملفوظات اور مکتوبات وغیرہ بھی نقل فرمائے ہیں، اس کی وجہ سے جہاں مصنف کے ذوق ورجحان کا اندازہ ہوتا ہے وہاں ان کے تذکرہ کے مستند اور بلند پایہ ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

۳۔ یہ ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے اور مختلف علاقوں کے صوفیہ کا تذکرہ ہے۔

۴۔ یہ کتاب محض بزرگان دین کا تذکرہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے علم ومعرفت کی گوناگوں مفید باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں اور تصوف وسلوک کی دقیق اصطلاحات اور رموز و اسرار کے بارہ میں واقفیت ہوتی ہے۔

۵۔ عبارت سلیس وفصیح اور طرز ادا نہایت بلیغ ومؤثر ہے۔

۶۔ غیر ضروری تفصیل اور جزئی واقعات کو نظر انداز کرنے کے باوجود کوئی اہم اور ضروری بات چھوڑی نہیں گئی ہے۔

اخبار الاخیار شیخ کی اہم، کامیاب اور مقبول کتابوں میں ہے، اس کی شہرت ان کے زمانہ ہی میں پورے طور پر ہو گئی تھی، جہانگیر جیسے نکتہ شناس بادشاہ نے بھی ان کی اس کاوش کو پسند کیا تھا اور اس کی داددی تھی، اب تک اس کے کئی ایڈیشن چھپ گئے ہیں اور اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی کئی کتب خانوں میں موجود ہیں۔

بعض مصنفین کا خیال ہے کہ یہ شیخ کی سب سے پہلی تصنیف ہے(۱) اور خود شیخ نے بھی اپنی کتاب تالیف القلب الالیف میں اس کی صراحت کی ہے مگر وہ اس کی تالیف میں اس کے بعد بھی برسوں محنت شاقہ فرماتے رہے اور اس میں برابر حک واضافہ بھی کرتے رہے،

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۳۰۵۔

یہی وجہ ہے کہ پہلے اس کی ضخامت زیادہ تھی، بعد میں برابر کمی ہوتی رہی، غالباً اسی وجہ سے اخبار الاخیار کے بعض نسخوں میں عبارت مختلف ہے۔

۵۔ **آداب الصالحین:** شیخ محدث کے زمانہ میں اخلاقی و معاشرتی حیثیت سے جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ان کو دور کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس لیے اس میں اسلامی طرز حیات اور اصول اخلاق کو پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب امام غزالی کی احیاء العلوم کے اکل وشرب اور منام ومعاشرت وغیرہ چند ابواب کا خلاصہ ہے (۱) اس کا فارسی متن اور اردو ترجمہ ہادی الناظرین کے نام سے چھپ گیا ہے (۲) مگر دستیاب نہیں ہے۔

۶۔ **آداب اللباس:** اس میں رسول اللہ ؐ کے ملبوسات کی تفصیل لکھی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ مکروہ ممنوع لباس کیا ہیں، رسالہ کے قلمی نسخے بانکی پور برٹش میوزیم اور برلن وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، اردو ترجمہ بھی شائع ہوا ہے (۳) بعض لوگوں نے اس کا نام رسالہ فی آداب اللباس اور رسالہ آداب رسول اللہ ؐ بھی لکھا ہے۔

۷۔ **آداب المطالقه والمناظره:** یہ ایک منظوم مثنوی ہے، اس میں گفتگو اور مناظرہ کے آداب بتائے ہیں۔ (۴)

۸۔ **اسماء الرجال والرواۃ:** اس کا پورا نام **اسماء الرجال والرواۃ المذکورین فی کتاب المشکوٰۃ** ہے، بعض لوگوں نے اس کا نام **کتاب اسماء الرجال المشکوٰۃ المصابیح** بھی لکھا ہے (۵) اور بعض نے **الاکمال فی اسماء الرجال** لکھا ہے، یہ رسالہ عربی میں ہے، اس میں مشکوٰۃ شریف کی تمام احادیث کے راویوں کا مختصر تذکرہ ہے پھر آل رسول کا، اس کے بعد دیگر صحابہ کرام اور راویان حدیث کا حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر ہے، علاوہ ازیں بعض اکابر محدثین اور ائمہ اربعہ نیز امام اعظم کے چند مشہور وممتاز تلامذہ کا حال،

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۵۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۸۔ (۳) ایضاً۔ (۴) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۵۔ (۵) معارف دسمبر ۴۲ء، ص ۴۳۱۔

بھی لکھا ہے، اس کا قلمی نسخہ خدا بخش خان لائبریری پٹنہ میں ہے۔ (۱)

۹۔ **استیناس انوار القبس فی شرح دعاء انسؓ:** یہ رسالہ شیخ کے مکتوبات کے مجموعہ میں طبع ہو چکا ہے۔ (۲)

۱۰۔ **افکار الصافیہ فی ترجمۃ کتاب الکافیہ:** اس کا نام بعض لوگوں نے صرف افکار لکھا ہے، یہ فن نحو کی کتاب ہے، اسے شیخ نے طالب علمی کے زمانہ میں ۱۵یا۱۶ برس کی عمر میں لکھا تھا، وہ خود فرماتے ہیں ''بچپن میں طالب علمی کے ابتدائی دور میں ایک شخص کی تقریب سے جس سے معنوی نسبت اور قوی رابطہ تھا، منصوبات کے آخر تک اس کی تسوید مکمل ہوگئی تھی اور مرفوعات کی بحث بیاض تک پہنچ چکی تھی، راقم کی عمر اس وقت ۱۵یا۱۶ برس تھی۔'' (۳)

۱۱۔ **التعلیق الحاوی علی تفسیر البیضاوی:** قاضی بیضاوی کی مشہور ومقبول تفسیر بیضاوی کی جز اول کے ربع کی شرح وتعلیق ہے، اس میں تفسیر کے بعض اغلاط ونقائص دکھائے ہیں، یہ تعلیق ناپید ہے۔ (۴)

۱۲۔ **الجواھر المضیہ فی شرح الدرۃ البھیہ:** فن منطق میں آٹھ صفحے کا مختصر رسالہ ہے جو چھپ گیا ہے اور کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔ (۵)

۱۳۔ **الفوائد:** فقہ وعقائد سے متعلق یہ رسالہ ہے، قلمی نسخہ بانکی پور کے کتب خانہ میں بتایا جاتا ہے۔ (۶)

۱۴۔ **انتخاب المثنوی المولوی المعنوی:** یہ مولانا روم کی مشہور ومقبول مثنوی کا انتخاب ہے (۷) شیخ نے فہرس التوالیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔

---

(۱) معارف دسمبر ۴۲ء، ص ۴۳۱ وتذکرہ شیخ عبدالحق محدث، ۱۸۴و۱۸۵، نیز The Contribution of Inida in arbic litrature. P256 (۲) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۱۔ (۳) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۱۳ ونزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۶۔ (۴) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۶۱و۱۶۲۔ (۵) ایضاً، ص ۲۰۴۔ (۶) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی (باقی اگلے صفحہ پر)

۱۵۔الانوار الجلیه فی احوال المشائخ الشاذلیه: اس فارسی رسالہ میں سلسلۂ شاذلیہ کے مشائخ کا ذکر ہے، اس کا قلمی نسخہ مولوی انوار الحق دہلوی کے کتب خانہ میں تھا۔(۱)

۱۶۔ایراد العبارات لبیان اهل الاشارات: فوائد جامعہ میں اس کا ذکر ہے۔(۲)

۱۷۔البناء المرفوع فی ترصیص مباحث الموضوع: فن منطق کی کتاب ہے جس میں شرح شمسیہ و شرح مطالع اور ان کے حواشی سے عمدہ مباحث بھی نقل کیے ہیں اور جا بجا اپنی جانب سے بھی کچھ دلچسپ نکات شامل کر دیے ہیں۔(۳)

۱۸۔تالیف القلب الالیف بذکر فهرس التوالیف: اس میں شیخ محدث نے اپنی تصانیف کی فہرست درج کی ہے، اس کی ابتدا میں دہلی کے بعض شعراء و مصنفین کے حالات بھی دیے ہیں، یہ پہلے مطبع عزیزی رامپور سے، پھر مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۰۹ھ میں شائع ہوئی تھی، سید شمس اللہ قادری نے حیدر آباد سے اس کا ابتدائی حصہ تذکرہ مصنفین دہلی کے نام سے شائع کیا تھا اور ایلیٹ نے بھی اپنی تاریخ میں اس کے کچھ حصوں کا ترجمہ دیا ہے۔(۴)

۱۹۔تجلية القلوب القدس الملکوت بشرح دعاء التضوت:

۲۰۔تحصیل البرکات والطیبات ببیان معنی التحیات: یہ دونوں شیخ کے مکتوب ہیں جو ان کے المکاتیب والرسائل میں طبع ہو چکے ہیں۔(۵)

۲۱۔تحصیل التعریف فی معرفة الفقه والتصوف: یہ شیخ کا اہم علمی کارنامہ ہے، اس میں فقہ و تصوف یا شریعت و طریقت میں تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔(۶)

سابقہ حاشیہ: ص۱۸۱۔(۷) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۰۶۔

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۰۴۔(۲) ایضاً، ص۱۴۳۔(۳) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۰۴ و تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۰۳۔(۴) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص...... و حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۰۸ و رود کوثر، ص۳۸۵۔(۵) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۸۴۔(۶) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۸۱۔

۲۲۔ **تحصیل الغنائم والبرکات بتفسیر سورہ والعادیات:** یہ سورہ والعادیات کے فوائد و برکات پر مختصر نوٹ ہے جو ان کے مجموعہ مکاتیب میں شامل ہے۔(۱)

۲۳۔ **تحقیق الاشارۃ الی تعمیم البشارۃ:** اس میں ان حدیثوں کو نقل کیا ہے جن میں عشرۂ مبشرہ کے علاوہ دوسرے بزرگوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جنت کی بشارت صرف عشرۂ مبشرہ کے لیے مخصوص نہیں، اس ضمن میں اس سے متعلق بعض اور امور و مباحث بھی قلم بند کیے گئے ہیں، کتاب کے مقدمہ میں اہل بیت کے فضائل اور اصول حدیث کے بعض قاعدے بھی بیان کیے گئے ہیں۔(۲)

۲۴۔ **ترجمۃ غنیۃ الطالبین:** غنیۃ الطالبین حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی مشہور تصنیف ہے جو مختلف دینی مسائل پر ہے، شیخ عبدالحق نے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تھا مگر وہ ناپید ہے۔(۳)

۲۵۔ **ترجمہ مکتوب النبی الامی فی تعزیۃ ولد معاذ بن جبل:** یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مکتوب گرامی کا ترجمہ ہے جو حضرت معاذ بن جبلؓ کے نام آپ نے ان کے فرزند کی تعزیت کے سلسلہ میں لکھا تھا، شیخ کا ترجمہ مجموعہ مکاتیب میں شامل اور چھپ چکا ہے۔(۴)

۲۶۔ **ترجمہ منہج السالک الی اشرف المسالک:** یہ نایاب ہے، اصل کتاب منہج السالک کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں ہے۔(۵)

۲۷۔ **ترغیب اہل السعادات علی تکثیر الصلوٰۃ علی سید الکائنات:** اس رسالہ میں درود شریف کے فضائل فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں، اس کا ذکر شیخ نے

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۶۲۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۵ و معارف دسمبر ۴۲ء، ص ۴۲۹۔ (۳) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۳۔ (۴) ایضاً ص ۱۶۵ و تذکرہ شیخ عبدالحق، ص ۱۸۴۔ (۵) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق، ص ۲۰۰۔

فہرس التوالیف میں بھی کیا ہے اور اس کا قلمی نسخہ بانکی پور پٹنہ لائبریری میں بھی ہے۔(۱)

۲۸۔تسلیۃ المصاب لنیل الاجر والصواب فی الصبر: مصائب وآفات میں صبر کی تلقین وتاکید سے متعلق رسالہ ہے، اس کا نام بھی شیخ نے اپنی تصنیفات کی فہرست میں گنایا ہے۔(۲)

۲۹۔تکمیل الایمان وتقویۃ الایمان: یہ عقائد کے موضوع پر اہم اور مشہور کتاب ہے، مصنف پہلے عربی عبارت نقل کرتے ہیں، پھر فارسی میں اس کی شرح تحریر فرماتے ہیں، علاوہ ازیں خود بھی عمدہ فوائد اور دلچسپ نکات لکھے ہیں، اس طرح اہل سنت والجماعت کے اصول پر اس میں تفصیل سے اسلامی عقائد کا ذکر ہے اور مسئلہ خلافت پر بھی مبسوط گفتگو کی گئی ہے، اس کے دیباچہ میں شیخ نے خود لکھا ہے کہ یہ کتاب ہر طالب صادق مومن کے لیے لکھی گئی ہے اور اس میں مذہب حق اور قول صحیح کے بیان پر اختصار کیا گیا ہے اور مذاہب رائغہ اور اقوال باطلہ کے ذکر سے پرہیز کیا گیا ہے اور بحث وجدال کا راستہ اور قیل وقال کا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے، کلامی دلائل اور فلسفیانہ موشگافیاں بھی اس میں نہیں آنے پائی ہیں تاکہ طالب ورطہ حیرت وتذبذب میں نہ پڑے، یہ کتاب متنوع مضامین کا مجموعہ اور نہایت جامع ہے، سلیس اور سلجھے ہوئے انداز بیان کی وجہ سے اس کو بڑی شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی اور یہ متعدد بار طبع ہوئی، اس کا اردو ترجمہ بھی سبیل الجنان کے نام سے مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔(۳)

۳۰۔تنبیہ العارف بما وقع فی العوارف: یہ کتاب عربی زبان میں ہے، اس میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے اس قول کہ ''قدمی علی رقبۃ کل ولی اللہ'' (میرا قدم ہر ولی اللہ کے گردن پر ہے) کے متعلق حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے

---

(۱) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق، ص۲۰۰ وحیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۹۰۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۹۰۔ (۳) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۹۰ ونزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۰۶۔

اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ یہ حالت سکر میں کہا گیا ہے، شیخ عبدالحق دہلوی کا خیال ہے کہ یہ حالت صحو تھا اور انہوں نے بحکم الٰہی یہ ارشاد فرمایا تھا، اس سلسلہ میں صوفیہ سکر وصحو اور غلبہ حال سے تحدیث نعمت کے طور پر جو باتیں کہتے ہیں یا جو احوال واخبار ان سے ظہور میں آتے ہیں ان کا حکم بھی بیان کیا ہے، یہ رسالہ رضا لائبریری رام پور میں ''الرسالة في بيان قول قدمي هذا على رقبة كل ولي الله'' کے نام سے موجود ہے۔(۱)

۳۱۔توصيل المريد الى المراد ببيان احكام الاحزاب والاوراد : فارسی میں ایک مفید رسالہ ہے، فہرس التوالیف میں شیخ نے اس کے متعلق خود تصریح کی ہے کہ اس میں اوراد و وظائف اور احزاب کے علوم وقواعد بیان کیے گئے ہیں اور محدثین ومشائخ کے مذہب کی توثیق کی گئی ہے کیوں کہ اس سلسلہ کے بعض اعمال کی تصحیح وتصنیف میں دونوں گروہوں کا اختلاف ہے، یہ رسالہ ۱۲۹۹ھ میں مطبع مفید عام آگرہ سے طبع ہوا تھا اور اس کا قلمی نسخہ بانکی پور پٹنہ کی لائبریری میں موجود ہے۔(۲)

۳۲۔جامع البركات: اس میں اپنی کتاب شرح مشکوٰۃ کا خلاصہ کیا ہے جو دو جلدوں میں ہے، ہر باب میں صرف ایک یا دو حدیثیں نقل کی ہیں اور باقی حدیثوں کے صرف مضمون بیان کرنے پر اقتضا کیا گیا ہے، یہ کتاب گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے، اس کے بعض قلمی نسخے مولوی انوار الحق دہلوی کے کتب خانہ میں موجود تھے۔(۳)

۳۳۔جذب القلوب الى ديار المحبوب : یہ فارسی زبان میں مدینہ منورہ کی تاریخ ہے اسی لیے ملا عبدالقادر بدایونی نے اس کا نام ترجمہ تاریخ ہند سکینہ لکھا ہے، اس کی تالیف میں نورالدین سمہودی کی مشہور کتاب وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ سے خاص مدد لی ہے اور اپنے دلکش اور موثر انداز بیان کی وجہ سے مخصوص کیفیت اور تازگی پیدا کردی ہے، مدینہ منورہ

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۰۴ وحیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۸۱۔(۲) ایضاً باختلاف صفحات۔

(۳) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۰۴ وحیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۷۰۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے انہیں جو والہانہ تعلق تھا، اس کا اظہار اس کتاب سے پوری طرح ہوتا ہے اس کی ابتدا ان اشعار سے کی ہے۔

صد شکر کہ از تشنگی غم رستم
چوں قطرہ بدریائے کرم پیوستم
برکشتی توفیق ازل نیشتم
و زمزم قدس چہرہ دل شستم

اس کتاب کو بڑی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی اور یہ کلکتہ، لکھنؤ اور دہلی وغیرہ سے متعدد بار طبع ہو چکی ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی تاریخ مدینہ منورہ کے نام سے نولکشور پریس سے شائع ہوا ہے، اس کے قلمی نسخے بھی متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، بانکی پور پٹنہ کا قلمی نسخہ ۱۰۴۸ھ کا ہے، گویا یہ مصنف کی زندگی ہی کا ہے۔

شیخ عبدالحق نے اس کی تالیف کا سلسلہ ۹۹۸ھ میں مدینہ منورہ ہی میں شروع کر دیا تھا اور ۱۰۰۱ھ میں اس کو دہلی میں مکمل کیا تھا۔(۱)

۳۴۔ جواب بعض کلمات شیخ احمد سرہندی: یہ رسالہ نایاب اور غیر مطبوعہ تھا، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب حیات شیخ عبدالحق میں اسے بطور ضمیمہ شائع کیا ہے، مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم نے اس کو **رسالہ فی الرد علی بعض اقوال الشیخ احمد بن عبدالاحد السرهندی** کہا ہے۔(۲)

۳۵۔ **حاشیه الفوائد الضائیه**: علم نحو سے متعلق رسالہ ہے۔(۳)

۳۶۔ **الدرة البهیه فی اختصار الرسالة الشمسیه**: منطق میں مختصر و جامع رسالہ ہے(۴) برٹش میوزیم میں قلمی نسخہ ہے۔(۵)

---

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۹۳ و ۱۹۴۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۲۰۹۔ (۳) ایضاً ص ۲۰۶۔ (۴) ایضاً۔ (۵) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۹۱۔

۳۷۔الدرۃ الفرید فی بیان قواعد التجوید: فن تجوید میں ہے،اس میں متن،شرح ممزوج ہے۔(۱)

۳۸۔دفاتر: اوراد پر مشتمل رسالہ ہے،فہرست کتب خانہ رامپور میں اس کا ذکر ملتا ہے۔(۲)

۳۹۔ذکر سلوک: اس کا نام تاریخ حقی اور تاریخ سلاطین ہند بھی ہے،یہ ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ ہے،اس میں ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی دور کے اپنے زمانہ تک کے واقعات وحالات قلم بند کیے ہیں،اس کا آغاز معزالدین بن حسام کے دور سے اور اختتام اکبر کے عہد پر کیا ہے،یہ ۱۰۰۵ھ میں مکمل ہوئی اور اس میں اکبر کے چالیسویں جلوس ۱۰۰۴ھ تک کے حالات درج ہیں،بہلول لودھی کے زمانہ تک کے واقعات طبقات ناصری اور تاریخ فیروز شاہی وغیرہ کی مدد سے لکھے ہیں،اس کے بعد سے اپنے دور تک کے واقعات سماعی اور ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں،اس کی ابتدا میں ایک دیباچہ ہے جو اَللّٰهُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ الی قولہ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ سے شروع ہوا ہے اور اختتام اس شعر پر ہوا ہے۔

مقصود اہل ذوق ز د گذشتگان
تنبیہ عبرت است چہ مسکیں چہ بادشاہ

یہ ابتدائی عبارت اور شعر دونوں اہم اور پر معنی ہیں۔

پہلے باب میں اکبر کے زمانے تک کی دہلی کی تاریخ دی ہے،پھر جونپور،بنگال، مانڈو،دکن،ملتان،سندھ اور کشمیر کے سلاطین کے حالات اختصار سے لکھے ہیں۔

نواب مرتضی خاں شیخ فرید نے ان سے فرمائش کی کہ بعد کے واقعات کا بھی اس میں اضافہ کر دیں مگر شیخ عبدالحق کو دوسرے علمی کاموں میں مشغولیت کی وجہ سے اس کا موقع

(۱) نزہۃ الخواطر،ج۵،ص۲۰۶و تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی،ص۱۷۸۔(۲) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی،ص۲۰۱۔

نہیں ملا اس لیے انہوں نے اپنے فرزند شیخ نور الحق سے اس کو مکمل کرایا، انہوں نے زبدۃ التواریخ کے نام سے اکبر کے دور کے مزید حالات اور بعد کے واقعات کا اضافہ کیا، اس کے بعد بھی اس کتاب کے تکملے اور تتمے لکھے گئے، ایک تکملہ مولوی حاجی رفیع الدین خاں مراد آبادی کا لکھا ہوا ہے، اس میں ۱۱۹۴ھ تک کے واقعات درج ہیں، یہ کتاب طبع نہیں ہوئی ہے، ہندستان کے متعدد کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے ہیں۔(۱)

۴۰۔ **رسالہ اثبات توقیت:** یہ غالباً علم الفقہ میں ہے، بروکلمن نے اس کا ذکر کیا ہے۔(۲)

۴۱۔ **رسالہ اقسام الحدیث :** یہ اصول حدیث میں ہے اور اس میں حدیث کی اصطلاحات اور اقسام وغیرہ پر عام فہم انداز میں گفتگو کی ہے، یہ نہایت مفید و مقبول رسالہ ہے، شیخ نے عربی میں مشکوۃ کی جو شرح لکھی ہے یہ غالباً اس کے مقدمے کے طور پر ہے، مشکوۃ کے ساتھ یہ بھی عربی مدارس کے نصاب میں شامل ہے، اس کے کئی اردو ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں اور مشکوۃ کے ساتھ اس کا عربی متن بھی کئی دفعہ چھپا ہے۔(۳)

۴۲۔ **رسالہ تنبیہ اهل الفکر برعایة آداب الذکر۔**

۴۳۔ **رسالہ ذکر الاحوال والاقوال بهته علی رعایة طریق الاستقامة والاعتدال :** دونوں رسالہ کا ذکر عجالہ نافعہ کے حواشی فوائد جامعہ میں مولانا عبدالحلیم چشتی نے کیا ہے۔(۴)

۴۴۔ **رسالہ شب برات:** فارسی زبان میں شب برات پر مختصر رسالہ ہے۔(۵)

۴۵۔ **رسالہ عقد انامل:** اوراد کو انگلیوں پر شمار کرنے کے متعلق یہ رسالہ لکھا تھا۔(۶)

---

(۱) رود کوثر، ص ۳۸۶ و ۳۸۷، حیات شیخ عبدالحق محدث، ص ۱۹۶، نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۵۔ (۲) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۶۔ (۳) ایضاً، ص ۱۸۵ و نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۹۔ (۴) فوائد جامعہ، ص ۱۴۔ (۵) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۹۔ (۶) ایضاً۔

۴۶۔رسالہ فی اسرار الصلوٰۃ۔ ۴۷۔رسالہ فی الوظائف: مولانا حکیم سید عبدالحی نے دونوں رسالوں کا ذکر کیا ہے۔(۱)

۴۸۔رسالہ نوریہ سلطانیہ، یہ سیاست مدن سے متعلق رسالہ ہے جو اصلاً شہنشاہ ہند نورالدین جہانگیر کے لیے لکھا گیا تھا، اس میں اس کے لیے سلطنت کے قواعد وضوابط، حکمرانی کے اصول وآداب اور دوسرے مفید امور ومسائل بیان کیے گئے ہیں، مصنف نے خود دیباچہ میں لکھا ہے:

کلمہ چند از احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واخبار وآثار سلف کرام وحکایات ومآثر سلاطین عظام وبرائے انچہ متضمن خیر وصلاح دنیا وآخرت باشند ترجمہ نمودہ است۔	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ، اسلاف کرام کے ارشادات بڑے بڑے بادشاہوں کے واقعات وحالات اور دین و دنیا کے خیر وصلاح سے متعلق دوسری کچھ مفید باتوں کا اس رسالہ میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

یہ رسالہ حال ہی میں ڈاکٹر سلیم اختر نے پاکستان سے اپنے عالمانہ مقدمہ اور محققانہ حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے، اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نے اس کی تالیف میں متعدد کتابوں سے مدد لی ہے، جیسے سیرت ابن ہشام، تاریخ آل برمک، جوامع الحکایات عوفی، تاریخ گزیدہ حمداللہ مستوفی، گلستاں بوستاں ونصیحۃ الملوک شیخ سعدی اور اخلاق محسنی، ملا حسین واعظ کاشفی سے بھی پورا استفادہ کیا گیا ہے لیکن یہ صرف اخذ واقتباس ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ ہر جگہ بقدر ضرورت حذف واختصار اور انتخاب سے بھی کام لیا ہے اور صفحوں پر پھیلے ہوئے مواد کو مختصر عبارت میں سمیٹ لیا ہے اور اپنی جودت طبع اور حسن ذوق سے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ مضمون اچھوتا اور دلکش ہو گیا ہے، ایک جگہ دادرسی کے لیے سلاطین کے زنجیر بنانے کا ذکر بھی کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کے بادشاہوں میں

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۰۹۔

میں بھی اس کا رواج تھا، ممکن ہے جہانگیر کو زنجیر عدل بنانے کا خیال شیخ کے اسی رسالہ کی وجہ سے ہوا ہو۔

۴۹۔ رسالہ وجودیہ: مرآۃ الحقائق میں اس کا ذکر ہے اور مولوی انوار الحق دہلوی کے کتب خانہ میں موجود تھا۔(۱)

۵۰۔ زاد المتقین: اس مفید اور دلچسپ کتاب میں اپنے ان اساتذہ وشیوخ کا ذکر کیا ہے جن سے سفر حجاز میں استفادہ کیا تھا اور خصوصیت سے شیخ علی متقی اور ان کے شاگرد اور اپنے استاذ شیخ عبدالوہاب کا تذکرہ لکھا ہے، علاوہ ازیں مکہ معظمہ میں قیام کے دوران کے واقعات بھی درج کیے ہیں، اس کے دیباچہ میں خود تحریر فرماتے ہیں کہ:

"میں دو سال سے زیادہ عرصہ تک مکہ معظمہ میں رہا، اس میں وہاں جو کچھ دیکھا اور سنا اسے اس میں ضبط کیا ہے۔"

اور فہرس التوالیف میں لکھا ہے کہ "اس کے احوال مکہ معظمہ میں ضبط کیے گئے تھے اور ۱۰۰۳ھ میں اس کو تفصیل سے لکھا" وہ فرماتے ہیں کہ "اگر اس کا نام صراط مستقیم اور منہج قویم بھی رکھوں تو مناسب ہو اور میزان، عدل و دین حق اس کا لقب رکھوں تو درست ہو، اگر سالک اس رفتار پر چلے تو منزل مراد کو پہنچ جائے اور اگر حاکم وقت اسے دستور حال بنائے تو جادہ سے تجاوز نہ کرے، اس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد اور برٹش میوزیم میں ہیں۔(۲)

۵۱۔ زبدۃ الآثار منتخب بھجۃ الاسرار: بہجۃ الاسرار حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات میں ایک مفید و مستند کتاب ہے، اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس کے مصنف شیخ نور الحسن ابو الحسن علی بن یوسف (۶۴۴ھ تا ۷۱۳ھ) ایک جید عالم اور سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے اور ان کے اور عبدالقادر جیلانی کے درمیان صرف دو واسطے ہیں، شیخ عبدالحق کو شاہ جیلانی سے والہانہ عقیدت و تعلق تھا، اس لیے انہوں نے زبدۃ الآثار کے نام سے

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۶۔ (۲) بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۸۔

یہ خلاصہ عربی زبان میں لکھا جس میں اصل کتاب کا عطر کھینچ لیا ہے، یہ کتاب بمبئی سے ۱۳۰۴ھ میں شائع ہوئی تھی اور اس کا اردو ترجمہ بھی کحل الابصار کے نام سے چھپا تھا، اس کے قلمی نسخے بھی بعض کتب خانوں میں موجود ہیں (۱) داراشکوہ کی فرمائش پر خود شیخ نے اس کا فارسی ترجمہ بھی کیا تھا۔ (۲)

۵۲۔ شرح اسماء الرجال بخاری: مولوی رحمٰن علی نے تذکرہ علمائے ہند میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (۳)

۵۳۔ شرح سفر السعادۃ: سفر السعادۃ شیخ محمد بن یعقوب مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس کی تصنیف ہے جو دراصل حافظ ابن قیم کی شہرہ آفاق تصنیف زاد المعاد کا خلاصہ ہے، شیخ عبدالحق نے اس کی یہ مبسوط شرح لکھی، اس کا نام الطریق القویم فی شرح صراط مستقیم بھی، حافظ ابن قیم کی تصنیف اپنے موضوع پر بے نظیر ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادات، حالات، معمولات زندگی اور معاش و معاشرت کے آداب وغیرہ بہت خاص انداز میں پیش کیے گئے ہیں، اس کی اہمیت کی وجہ سے فیروز آبادی نے اس کا خلاصہ تیار کیا، ائمہ اربعہ وغیرہ کے یہاں جو باتیں ان کو صحیح احادیث اور آپؐ کے معمولات کے برخلاف نظر آئیں ان کی تصریح و وضاحت بھی کی ہے، شیخ نے جہاں تک ممکن ہوا ہے ائمہ اور خصوصاً حنفی مذہب کا دفاع کیا ہے، فہرست التوالیف میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا مجد الدین کا مقصد اس کتاب میں یہ ہے کہ ذات نبوی کے عبادات و عادات سے متعلق اعمال شریفہ کو حدیث سے ثابت کریں، اس کے مخالف اگر مذاہب اربعہ کا مذہب ہوتا ہے تو اس کی تصریح کر کے اس کا رد و انکار کرتے ہیں، شرح میں مذاہب اربعہ خصوصاً حنفی مذہب کی تاکید کی گئی ہے اور مصنف کے کلام سے معارضہ کیا گیا ہے جو ان کے دعوے کے

(۱) بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۸۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۹۔ (۳) تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۱۰۔

مطابق احادیث کے موافق ہے، راقم نے اس کے برخلاف ثابت کیا ہے۔"(۱)

اس کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں حنفی مذہب کی بے جا تائید کی گئی ہے، صاحب دراسات اللبیب اور نواب صدیق حسن خاں وغیرہ نے اسی حیثیت سے اس پر ردوکد کی ہے۔(۲)

شیخ عبدالحق نے شرح کو تین حصوں میں مرتب کیا ہے، پہلے میں علامہ فیروز آبادی کی نقل کردہ حدیثوں پر محدثانہ کلام کیا ہے اور ان کی تحقیق وتوضیح فرمائی ہے، ان کے ماخذ واسناد پر بھی گفتگو کی ہے، دوسرے میں ائمہ ومجتہدین کو موضوع بحث بنایا ہے اور خاص طور پر حنفی مذہب کی بھی تائید وتقویت فرمائی ہے، یہی کتاب کا خاص حصہ ہے، تیسرے حصہ میں شرعی احکام کو مفصل طور پر بیان کیا ہے، ہر مبحث میں گوناگوں فوائد اور علمی نکات بھی تحریر کیے ہیں۔

یہ شرح بھی بڑی تحقیق وکاوش سے لکھی گئی ہے اور اس میں اسماء الرجال، تاریخ وسیر، تفسیر وحدیث اور شروح حدیث سے پوری مدد لی ہے، یہ کتاب بھی شیخ کی اہم اور مفید کتابوں میں ہے، مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

"فیروز آبادی کی فارسی سفر السعادۃ کی فارسی شرح لکھی جو حافظ ابن القیم کی زاد المعاد کے لگ بھگ ہے۔"(۳)

اس کے متعدد قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، بانکی پور پٹنہ کے نسخہ کو مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے اور یہ کلکتہ اور لکھنؤ سے چھپ بھی گئی ہے۔

۵۴۔شرح الشمسیہ: منطق میں ہے اور تصور وتصدیق کے مباحث پر مشتمل ہے۔(۴)

۵۵۔شرح الصدور بتفسیر اٰیۃ النور: یہ کتاب سورۂ نور کی آیت اَللّٰہُ نُوْرُ

(۱) بحوالہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۷۲۔ (۲) اتحاف النبلاء، ص ۸۸۔ (۳) مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۲۳۔ (۴) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۶۔

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ کی تفسیر ہے(۱) اس کا نسخہ مولوی انوار الحق دہلوی کے کتب خانہ میں موجود تھا مگر اب پتہ نہیں۔(۲)

۵۶۔ **شرح فتوح الغیب** : شیخ عبدالقادر جیلانی کے ملفوظات و مواعظ کو ان کے صاحبزادے شرف الدین ابو عبدالرحمٰن عیسیٰ نے فتوح الغیب کے نام سے جمع کیا تھا جو تصوف کی مشہور و مقبول کتابوں میں ہے، شیخ عبدالحق کو ان کی ذات سے جو والہانہ عقیدت تھی اس کی بنا پر انہوں نے اس کی یہ عمدہ شرح لکھی اور فرط ادب و احترام سے نہ اس پر اپنا نام دیا اور نہ مقدمہ تحریر فرمایا، شیخ نے شرح بڑی شستہ و سلیس زبان میں اور نہایت موثر انداز میں لکھی ہے، اس کے متعلق خود ان کا بیان ہے کہ ''مقالات دین اور اہل یقین کے کمالات کی تحقیق میں لسان رسالت و زبان نبوت کے موافق ہے کہ صدیقین کے معارف کی شان ہوتی ہے۔''(۳)

فتوح الغیب سے ان کو رغبت سے اور دلچسپی اپنے مرشد شیخ عبدالوہاب متقی کی اس تاکید کی وجہ سے بھی ہوئی تھی کہ انہوں نے فرمایا تھا کہ اس کو حاصل کر کے بغور پڑھو اور جہاں تک ممکن ہو اس پر عمل کرو، چنانچہ حجاز سے ہندوستان آنے کے بعد انہوں نے اس کا نسخہ حاصل کیا اور مرشد کی ہدایت کے مطابق اسے بغور ملاحظہ فرمایا، اس کے بعد شاہ ابوالمعالی کے حکم سے اس کی شرح و ترجمہ کا کام کیا اور ۱۰۲۳ھ میں اس کو مکمل کیا اور مفتاح الفتوح تاریخی نام رکھا، یہ شرح بھی نولکشور پریس سے چھپ چکی ہے اور اس کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

۵۷۔ **شرح القصیدہ الجزریہ** : یہ فن تجوید میں ایک رسالہ ہے اور اس کا قلمی نسخہ پشاور کے کتب خانہ میں ہے۔(۴)

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۰۶۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق، ص۱۶۲۔ (۳) فہرس التوالیف قلمی بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث، ص۱۸۱۔ (۴) فہرست لباب المعارف الاسلامیہ۔

۵۸۔ **صحیفة المودة**: یہ مجموعہ خطوط اصل میں ایک مثنوی ہے مگر نایاب ہے، مولانا حکیم سید عبدالحی نے اس کا نام **ارجوزة فی المکاتبات الیٰ اعزته واحبابه** لکھا ہے۔(۱)

۵۹۔ **فصول الخطب لنیل اعالی الرتب**(۲): خطبات کا مجموعہ ہے جو نایاب ہے۔

۶۰۔ **کتاب الفوائد والصلوٰة**: فارسی زبان میں اوراد پر ایک کتاب ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام، علما و اولیا سے منقول دعائیں جمع کی ہیں اور تعویذات بھی دیے ہیں۔(۳)

۶۱۔ **ماثبت بالسنة فی ایام السنة**: یہ تصنیف عربی میں ہے، اس میں سال کے بارہ مہینوں سے متعلق احادیث جمع کی گئی ہیں، اس کی ابتدا ماہ محرم سے کی ہے اور محرم و عاشورہ، محرم کے مذہبی اعمال و مناسک کے بارہ میں صحیح حدیثیں اکٹھا کی ہیں، پھر ان کے بارہ میں جو غلط رسوم و توہمات رائج ہو گئے ہیں ان کی تردید کی ہے، مثلاً یہ خیال کہ عاشورے کے دن سرمہ لگانے سے درد نہیں ہوتا یا اس روز غسل کرنے سے آدمی بیمار نہیں ہوتا، اسی طرح شہادت حسینؓ سے متعلق احادیث پر بھی نقد و تبصرہ کیا ہے، ماہ صفر کے ذکر میں اس خیال کی تردید کی ہے کہ یہ نامبارک مہینہ ہے، ماہ ربیع الاول کا تذکرہ کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر ایک مختصر نوٹ تحریر کیا ہے، ربیع الثانی کی بحث میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا مختصر حال لکھا ہے، اسی طرح شعبان، رمضان، شوال اور ذی الحجہ کے سلسلہ میں روزہ، تراویح، عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ اور حج و قربانی سے متعلق احادیث یکجا کی گئی ہیں(۴) اس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں اور یہ کلکتہ و لاہور سے شائع بھی ہوئی ہے اور دہلی سے مع ترجمہ چھپی ہے۔(۵)

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۰۶۔ (۲) ایضاً، ص۲۰۴۔ (۳) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۰۱۔
(۴) معارف دسمبر۴۲ء، ص۴۲۸۔ (۵) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۷۱۔

۶۲۔مدارج النبوۃ: یہ فن سیر کی معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں سیرت نبویؐ پر محققانہ بحث کی گئی ہے، یہ کتاب شیخ محدث کا مہتم بالشان علمی کارنامہ اور رسول کریمؐ کی حیات طیبہ کا مکمل مرقع ہے، اس کا مقصد اس زمانہ کے فتنوں کا استیصال اور نظریہ الفی وغیرہ کی تردید ہے، ان کے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کے تعلق کو توڑنے اور ختم کرنے کی جو مختلف النوع سازشیں ہورہی تھیں ان کا پردہ چاک کرکے آپؐ کی ذات سے مسلمانوں کا تعلق توڑنے اور ختم کرنے کی جو مختلف النوع سازشیں ہورہی تھیں ان کا پردہ چاک کرکے آپؐ کی ذات سے مسلمانوں کا تعلق برقرار رکھنے اور جوڑنے کی مکمل کوشش کی گئی ہے، چنانچہ اس کے ایک باب ''حقوق مصطفیٰ'' میں رسالت محمدی پر ایمان کی ضرورت و اہمیت واضح کی گئی ہے اور اس امر کی تردید کی گئی ہے کہ ایمان کی تکمیل کے لیے صرف خدا پر ایمان لانا کافی ہے، شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> ''حدیث کے علاوہ شیخ عبدالحق نے سب سے زیادہ توجہ سیرت اور مدینۃ النبی کی تاریخ پر (جسے سیرت کا تکملہ کہنا چاہیے) مبذول کی، مقصد ساری کوششوں کا یہ تھا کہ مہدویہ تحریک، بعض درویشان مغرور کے دعاوی اور مقام اقدس محمدی کے عدم ادراک، نظریہ الفی، دربار اکبری میں توحید بلکہ عقلیت کے مقابلہ میں نبوت سے کم نگہی، رسول اکرمؐ کے صحیح واقعات زندگی سے عام ناواقفیت ان تمام اسباب کی بنا پر عوام جادۂ محمدی سے دور جارہے تھے اس کا سدباب ہوجائے، چنانچہ شیخ نے اسلامی ہندوستان کی پہلی مبسوط سیرت نبوی مدارج النبوۃ کے نام سے بارہ سو صفحات میں ترتیب دی جواب بھی مقبول ہے۔''(۱)

ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر میں اس کتاب کو غیر معمولی اہمیت حاصل

(۱) رود کوثر، ص ۳۸۴۔

ہے، اس نے پہلے نہ صرف ہندوستان بلکہ فارسی زبان میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر ایسی مفصل اور جامع کتاب نہیں لکھی گئی تھی شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''مدارج النبوۃ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، سیرت شامیہ اور مواہب لدنیہ سیرت کی کتابوں میں سب سے بڑی کتابیں ہیں۔''(۱)

اس کتاب کو شیخ نے مواہب لدنیہ اور دوسری کتب سیر کی مدد سے لکھا تھا اور یہ پانچ حصوں میں منقسم اور دو جلدوں پر مشتمل ہے، یہ متعدد بار چھپ چکی ہے اور منہاج النبوۃ کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اس کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، دارالمصنفین کے کتب خانہ میں بھی اس کی جلد اول کا ایک قلمی نسخہ ہے، اس کے آخر میں کاتب کا نام صاحب خاں لکھا ہوا ہے، غالبًا بارہویں صدی ہجری میں اس کی کتابت ہوئی ہے، کتاب کے آخر میں رمضان ۴۱ھ کتابت کا سنہ دیا ہے، تاریخ بھی لکھی ہے، مگر روشنائی پھیل جانے کی وجہ سے پڑھی نہ جا سکی، پھر تصحیح کا سال ۴۲ھ دیا ہے اور تاریخ ۱۸ / رمضان لکھی ہے مگر صدی دونوں جگہ نہیں تحریر ہے، خیال یہی ہے ہوتا ہے کہ یہ ۱۱۴۲ھ ہوگا۔

۶۳۔ مرج البحرین: اس کا پورا نام مرج البحرین فی الجمع بین الطریقین ہے، یہ دراصل قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ کی شرح ہے جو حضرت شیخ احمد المغربی معروف بہ شیخ رزق اللہ کی تصنیف ہے، شیخ نے شرح کے علاوہ اس کا ترجمہ بھی کیا ہے، اس کے مطالعہ کی ہدایت انہیں خاص طور پر ان کے شیخ عبدالوہاب متقی نے کی تھی، اس کے متعلق انہوں نے خود یہ تحریر فرمایا ہے کہ:

''یہ رسالہ جامع طریقین ہے، یعنی فقہ وتصوف اور شریعت وطریقت، ظاہر وباطن، صورت ومعنی، قشر ولب، علم وخال، صحو وسکر، مذہب ومشرب اور عقیل وعشق، اگر اسے صراط مستقیم وطریق قویم کہیں تو جائز ہے، دین خالص

(۱) عجالہ نافعہ مع فوائد، ص ۴۸۔

اور سبیل اسلم اس کا لقب رکھا جائے تو روا ہے، دعوت حق و منہج ارشاد کہنا
درست ہے اور میزان عدل و دستور العمل گردانا ٹھیک ہے۔''(۱)

اس کے متعلق مزید لکھتے ہیں:

''یہ ایک عجیب کتاب ہے جو فقہ، تصوف، علم اور حال کی جامع ہے، اس سے وہ فقیہ فائدہ اٹھائے گا جو اللہ سے محبت کرنے والا اور اپنے احوال کی نگرانی کرنے والا ہو اور وہ صوفی بھی جو محقق اور مقید بہ اعمال ہو، اس سے وہ فقیہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو راہ اعتدال سے ہٹ جانے والا اور معاند ہے اور نہ وہ صوفی جو راہ اعتدال سے ہٹ جانے والا اور اعمال و طاعات سے بے نیاز ہو۔''(۲)

مرج البحرین مختصر ہونے کے باوجود ایک مفید کتاب ہے، شیخ نے شریعت و طریقت تصوف و فقہ اور علم و عقل پر نہایت دلنشیں بحث کی ہے، قرآن و حدیث اور کتب تصوف کے بکثرت حوالے دیے ہیں، ان کے شگفتہ انداز بیان کی وجہ سے موضوع کی خشکی تری میں بدل گئی ہے۔

مرج البحرین کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے جو اس لحاظ سے قیمتی اور اہم ہے کہ اس کی تصحیح خود حضرت شیخ نے کی ہے، اس کی پشت پر شیخ کی یہ تحریر بھی ثبت ہے۔(۳)

هذه سبع رسائل تالیف الفقیر الحقیر	یہ سات رسالے فقیر حقیر اور ضعیف ترین
اضعف عباد اللہ القوی عبدالحق	بندۂ خدا عبدالحق بن سیف الدین دہلوی
بن سیف الدین الدهلوی عفا عنهما	عفا اللہ عنہما کی تصنیف ہیں۔

مرج البحرین ۱۲۶۵ھ میں مطبع عبدالرحمٰن سے اور ۱۲۷۴ھ میں مطبع محمدی کلکتہ سے شائع ہوئی تھی، وصال السعدین کے نام سے اس کا اردو ترجمہ مولوی غوث محمد فرخ آبادی نے

(۱) مرج البحرین، ص ۳ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق۔ (۲) تذکرہ شیخ عبدالحق، ص ۱۹۴۔ (۳) ایضاً، ص ۱۸ و ۱۹۔

کیا تھا جو مطبع نامی لکھنؤ سے ۱۳۱۴ھ میں چھپا تھا، مولوی شیخ عبدالقادر صدیقی نے اس کی شرح فارسی زبان میں شرح البحرین کے نام سے کی تھی۔ (۱)

۶۴۔ **مکتوبات و رسائل:** اس کا نام کتاب المکاتیب والرسائل بھی ہے، یہ اڑسٹھ ۶۸ خطوط کا مجموعہ ہے جو حضرت باقی باللہ، شیخ عبداللہ نیازی، شاہ ابوالمعالی، نواب مرتضیٰ خان (شیخ فرید)، نواب خانخاناں، شیخ ابوالخیر مبارک اور فیضی وغیرہ کے نام لکھے گئے تھے جن میں شرح وبسط کے ساتھ بعض اہم مسائل و مباحث پر گفتگو کی گئی ہے اور جس موضوع پر گفتگو کی ہے اس میں بڑی تلاش و تحقیق سے کام لیا ہے، اس حیثیت سے ہر مکتوب بڑا اہم ہے جو قدر و قیمت میں ایک رسالہ سے کم نہیں ہے، مکتوبات کا یہ مجموعہ ۱۳۳۲ھ میں چھپا تھا، اس کے قلمی نسخے کم ہیں اور جو ہیں ان میں مضامین کی کمی بیشی ہے۔ (۲)

۶۵۔ **نکات الحق والحقیقۃ من معارف الطریقۃ:** یہ فارسی زبان میں ایک مختصر لیکن بیش قیمت تصنیف ہے، اس کی تقسیم نکات پر کی گئی ہے اور ہر نکتہ لطیف خیالات سے پر ہے، اس کو مولوی سید محمد لطیف مرادآبادی نے مطبع احتشامیہ مرادآباد سے ۱۸۹۱ء میں شائع کیا تھا، مولوی انوارالحق صاحب نے جو شیخ کے ہم خاندان تھے ۱۳۱۹ھ میں اس کا ایک مطبوعہ نسخہ دہلی سے خان بہادر خدا بخش خان کو ہدیۃً بھیجا تھا جو ان کی لائبریری میں موجود ہے، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں مطبوعہ اور قلمی دونوں نسخے موجود ہیں۔ (۳)

۶۶۔ **نکات العشق والمحبۃ فی تطیب قلوب الاحبۃ:** شیخ نے اپنی فہرست میں اس ادبی کتاب کا ذکر کیا ہے۔ (۴)

۶۷۔ **وصیت نامہ:** اس میں شیخ کی وصیتیں درج ہیں (۵) اس کا ایک قلمی نسخہ

---

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۵۔ (۲) ایضاً، ص ۲۱۔ (۳) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۶ و تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۹۹ و ۲۰۰۔ (۴) تذکرہ شیخ عبدالحق دہلوی، ص ۲۰۴۔ (۵) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۱۰۔

مولوی انوار الحق حقی دہلوی کے کتب خانہ میں موجود تھا۔(۱)

۶۸۔ هداية الناسك الى طريق المناسك: اس رسالہ میں زیارت حرمین اور مناسک واعمال حج پر بحث کی گئی ہے، شیخ فہرس التوالیف میں اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''اس راہ کے سالکوں اور اس درگاہ کے قاصدوں کے لیے مناسک حج وآداب زیارت کا خلاصہ پیش کیا ہے۔(۲)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا سب سے اہم اور قابل ذکر کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مشکوٰۃ المصابیح کی فارسی اور عربی زبان میں شرحیں لکھ کر حدیث وسنت کو فروغ دیا، اس کتاب کی شرح لکھنے کا خیال انہیں اسی لیے ہوا ہوگا کہ اس میں صحاح کی حدیثیں جمع کی گئی ہیں، اس لیے وہ صحیح حدیثوں کا منتخب مجموعہ ہے اور اس کو پڑھ لینے کے بعد آدمی یک گونہ دوسری کتابوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اس لیے اس کی شرح دراصل صحاح ہی کی شرح ہے، کتب حدیث میں مشکوٰۃ جامعیت وترتیب کے لحاظ سے بھی اہم ہے، اس میں اسناد حذف کر کے صرف صحابی کا نام دیا ہے اور آخر میں مآخذ کی نشان دہی بھی کر دی ہے۔

پہلے ہم شیخ کی فارسی شرح کا اور آخر میں عربی شرح کا ذکر کرتے ہیں:

۶۹۔ اشعۃ اللمعات: یہ فارسی زبان میں مشکوٰۃ المصابیح کی جامع ومکمل شرح ہے اس کی تالیف کی تقریب بیان کرتے ہوئے شیخ نے دیباچہ میں لکھا ہے:

''حرمین کے اساتذہ وشیوخ حدیث سے استفادہ کے بعد ہندوستان واپس ہوا تو اللہ نے حدیث شریف کے علم کی خدمت کی توفیق عطا فرمائی، اس کی بدولت مشکوٰۃ المصابیح کی شرح لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا، کیوں کہ اس وقت یہ ایک متبرک کتاب ہے، شرح لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے جو

---

(۱) مرآۃ الحقائق، ص۶۰ بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۸۔ (۲) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۵و۱۸۶۔

فوائد مشائخ وقت سے سنے ہیں یا ان کی کتابوں میں دیکھے یا جو اپنے خیال میں آئیں انہیں طلبہ تک پہنچا دوں، بعض جلیل القدر اصحاب صفا اور اہل تعلق و محبت نے فرمایا کہ اگر شرح فارسی میں ہو تو اس کا نفع زیادہ عام ہوگا، شروع کرنے پر ایسی باتیں مطالعہ میں آئیں کہ جن کو فارسی شرح میں لکھنا مناسب نہ تھا، لیکن لوگوں کی فرمائش سے ہاتھ اٹھا لینے کی بھی گنجائش نہ تھی، اس لیے عربی شرح بھی اسی کے ساتھ شروع کر دی جو پہلے مکمل ہو گئی اور فارسی درمیان میں ہی رک گئی، پھر امر ہوا کہ فارسی بھی پوری کروں، اس طرح جو کچھ تحریر ہو چکی تھی وہ بیاض میں لایا اور باقی کی تکمیل شروع کی۔"(۱)

کہا جاتا ہے کہ شرح کی تکمیل کے لیے شیخ کے مرشد حضرت شاہ ابوالمعالی کی جانب سے برابر تقاضا اور اصرار ہو رہا تھا، ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا "شرح مشکوۃ کو مکمل کیجیے انشاء اللہ اس سے ایک عالم مستفید ہوگا" (۲) شاہ صاحب نے انہیں اس کی بھی ہدایت کی تھی کہ "شرح میں موقع کی مناسبت سے اشعار بھی لکھے جائیں" (۳) شیخ نے اس پر بھی عمل کیا۔

اس طرح چھ برس میں یہ شرح مکمل ہوئی، ابتدا ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء میں کی تھی اور ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، گو عربی شرح دقیق علمی و فنی بحثوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے زیادہ اہم اور فائق ہے مگر خود شاہ صاحب کا بیان ہے کہ:

"مشکوۃ کی یہ فارسی شرح گو قدر و منزلت میں عربی شرح سے فروتر ہے لیکن تنقیح و ترتیب اور ضبط و ربط میں اس سے فائق اور قابل ترجیح ہے، حجم و ضخامت میں بھی اس سے بڑھ گئی ہے، تائید الٰہی اور نصرت باری سے نفیس، عمدہ، مرتب، پسندیدہ اور مقبول کتاب تیار ہو گئی۔" (۴)

---

(۱) دیباچہ ج ۱ ص ۲۔ (۲) کتاب المکاتیب والرسائل، ص ۳۰۶ بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۶۵۔

(۳) حیات عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۶۵۔ (۴) نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۲۰۴ بحوالہ تالیف القلب الالیف۔

اس میں مشکل لفظوں اور دقیق بحثوں کی عمدہ شرح کی گئی ہے اور یہ شرح ترتیب و تہذیب میں عربی شرح سے بہتر اور اختصار و جامعیت اور افادیت میں اس سے سوا ہے، نواب صدیق حسن خان رقم طراز ہیں:

> ''یہ شرح تنقیح وتہذیب اور معانی کے ضبط وربط کے لحاظ سے عربی شرح کے مقابلہ میں فائق و برتر، اس سے زیادہ مفصل اور ضخامت میں بڑھ کر ہے، اخذ واستفادہ کی سہولت، غریب کی شرح، مشکل کے ضبط اور فقہ حنفی کے مسائل کے بیان میں اشعۃ اللمعات بے نظیر کتاب ہے، اس کی شہرت ومقبولیت بیان سے مستغنی ہے۔''(۱)

ہندوستان میں اس شرح کی وجہ سے علم حدیث کا چرچا ہوا، حدیث کا ذوق پیدا ہوا اور اس سے اشتغال بڑھا۔

ترتیب وتبویب: اشعۃ اللمعات چار حصوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد کی ابتدا میں ایک مقدمہ ہے، اس میں فن حدیث کے اصول ومصطلحات اور علم حدیث کے اقسام وغیرہ پر مفید بحث کی ہے اور بعض کبار محدثین کے مختصر حالات بھی تحریر کیے ہیں، چاروں جلدوں کے مندرجات کی تقسیم اس طرح کی ہے:

پہلی جلد میں ۵ کتب کا ذکر ہے: کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجنائز، دوسری جلد چھ کتب پر مشتمل ہے: کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم، کتاب فضائل القرآن، کتاب الدعوات، کتاب اسماء اللہ تعالیٰ، کتاب المناسک۔

تیسری جلد ۹ کتب کا مجموعہ ہے، کتاب البیوع، کتاب العتق، کتاب الحدود، کتاب الامارۃ والقضاء، کتاب الجہاد، کتاب الصید والذبائح، کتاب الاطعمہ، کتاب اللباس، کتاب الطب والرقی۔

(۱) اتحاف النبلاء۔

چوتھی جلد میں کتاب الآداب اور کتاب الفتن کے ابواب درج ہیں:

شرح کی قدر و قیمت اور اصل نوعیت معلوم کرنے کے لیے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں، محدثین نے کتاب الایمان میں یہ مشہور حدیث نقل کی ہے:

"عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ"

مشکوٰۃ میں یہ حدیث مذکور ہے، شیخ عبدالحق نے اس کی شرح کرتے ہوئے پہلے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث کی روایت کرنے والے صحابی کے متعلق یہ تحریر کیا ہے:

> "عبداللہ بن عمرو بن عاص بن وائل سہمی، سہمی بن عمر کی جانب نسبت ہے جو قبیلہ قریش کا ایک بطن ہے، حضرت عبداللہ عابد و عالم تھے، دن میں روزہ رکھتے تھے اور رات میں قیام کرتے تھے، وہ اپنے والد سے ۱۲ سال چھوٹے تھے، وہ آنحضرت کی حدیثوں کو قلم بند کر لیتے تھے۔"(۱)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے تھے کہ میرے اور ان کے درمیان یہ فرق تھا کہ وہ احادیث کو قلم بند کرتے تھے اور میں حدیثیں نقل نہیں کرتا تھا۔

حضرت عبداللہ اہل بیت سے بھی محبت کرتے تھے، گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے والد کی رضا جوئی کی خاص طور پر وصیت اور تاکید کی تھی، اس وجہ سے اہل بیت سے تعلق و محبت کے باوجود حضرت امیر معاویہؓ اور اپنے والد بزرگوار کی صحبت میں بھی رہتے تھے، ان کا اصل نام عاص تھا جو ان کے دادا کا بھی نام تھا مگر رسول اللہؐ نے ان کا نام عبداللہ رکھا تھا، شیخ محدث نے حدیث کا جو ترجمہ کیا وہ قابل توجہ ہے، فرماتے ہیں:

"کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے عام مسلمان سلامت رہیں" حدیث کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

---

(۱) حضرت عبداللہؓ نے حدیثوں کا ایک مجموعہ قلم بند کیا تھا جو صحیفۂ عمرو بن عاص کہلاتا تھا۔

''مسلمان زبان سے گالی نہیں دیتا، غیبت نہیں کرتا، ناروا اور ناگفتنی باتیں نہیں کرتا اور ہاتھ سے مارتا نہیں، رنج نہیں دیتا اور غصب نہیں کرتا، حدیث میں زبان اور ہاتھ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے آیا ہے کہ ایذا کی اکثر صورتوں کا باعث یہی دونوں عضو ہوتے ہیں، انسان کے اندرون اور باطن کی تعبیر و ترجمانی بھی زبان ہی کرتی ہے اور ہاتھ سے بہت سارے کام انجام پاتے ہیں، زبان کا پہلے اسی لیے ذکر کیا ہے کہ اس کی ایذا زیادہ تکلیف دہ اور سخت ترین ہوتی ہے اور اس کی زد گذشتہ، موجودہ اور آئندہ آنے والے سب ہی لوگوں پر پڑتی ہے مگر ہاتھ کی ایذا صرف حاضر اور موجود لوگوں ہی پر اثر انداز ہوتی ہے، تحریر و کتابت کی ایذا کا تعلق بھی زبان ہی سے ہوتا ہے بلکہ اس کے موجب ہاتھ اور زبان دونوں ہوتے ہیں، مسلمان کی تخصیص باعتبار غالب ہے ورنہ ذمی اور فرماں بردار غیر مسلم بھی اس حکم میں شامل ہیں، چنانچہ ابن حبان کی روایت میں من مسلم الناس (کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے عام لوگ سلامت رہیں) کے الفاظ وارد ہیں جو اس روایت کے مقابلہ میں زیادہ عموم کو شامل ہے جیسا کہ سیوطی نے بیان کیا ہے۔

یہاں مراد ناحق ایذا سے ہے ورنہ جو ایذا شریعت کے حکم کے مطابق ہو وہ جائز ہے اور ایسی صورت میں زجر، ضرب اور شتم وغیرہ بالکل روا ہے بلکہ بعض اوقات واجب بھی ہے۔

بے حکم شرع آب خون خطا است
واگر خون بفتوی بریز در رواست

حدیث کا مقصود و منشا یہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں کے اوصاف و خصائص

یہ ہیں کہ وہ لوگوں کو ایذا نہیں دیتے اور ہر مسلمان کو اسی وصف کا حامل ہونا چاہیے اور جس کے اندر یہ وصف نہ پایا جائے وہ گویا مسلمان نہیں ہے، اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ محض یہ وصف رکھنے والا ہی کامل مسلمان ہے خواہ دین کے باقی احکام وارکان میں وہ کمی اور کوتاہی ہی کیوں نہ کرے جیسا کہ کہا گیا ہے ۔

مباش درپے آزار و ہرچہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو شخص حقوق اللہ کو ادا کرنے کے ساتھ ہی حقوق العباد کو بھی ادا کرتا ہے وہ کامل مسلمان ہے۔"(۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وشمائل کے باب کی فصل اول کی پہلی روایت یہ ہے:

عن انس قال خدمت النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشر سنین فما قال لی اف ولا لم ضعتہ ولا لا اضعت	حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دس برس تک خدمت کی مگر آپ نے نہ مجھ سے اف کہا اور نہ یہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا اور کیوں نہیں کیا۔

اس حدیث کا مطلب خیز ترجمہ جس طرح کیا ہے اس سے اس کا مفہوم اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے، لکھتے ہیں:

"حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دس برس تک خدمت کی، آپ جب مدینہ ہجرت کر کے تشریف لائے تو حضرت انسؓ کی والدہ اور قبیلہ انصار کے ان کے بعض اعزہ نے انہیں

(۱) اشعۃ اللمعات مطبوعہ کلکتہ، ج۱، ص۲۷و۲۸۔

آنحضرتؐ کی خدمت کے لیے پیش کیا، ان کی عمر اس وقت آٹھ یا دس برس تھی، اس میں اختلاف ہے، البتہ وہ دس سال تک جو آپ کے قیام مدینہ کی مدت سے آپ کی خدمت میں رہے لیکن اس طویل زمانہ میں جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گزارا آپؐ نے ان سے اف نہیں کہا۔

اف میں الف کو پیش ہے اور ف مشدد و مکسور ہے جو تنوین کے ساتھ بھی ادا کیا جاتا ہے اور بلا تنوین بھی، یہ لفظ کراہت پر دلالت کرتا اور کسی ناگوار امر کو دیکھنے پر اس کے ذریعہ زجر و توبیخ کی جاتی ہے یا چیخ کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی طرح کبھی آپ نے مجھ سے یہ نہیں فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا اور نہ ہی یہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا، یعنی جو دنیوی خدمت ان کے سپرد تھی یا دینی امور کے بارے میں بھی آپ نے ان کو کچھ نہیں فرمایا۔

اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال سماحت اور حسن خلق کا اندازہ ہوتا ہے مگر مشکوٰۃ کے شارح علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ''اس سے حضرت انسؓ کا مقصد خود اپنی مدح و تحسین بھی ہے کہ میں نے ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے آپ مجھ پر اعتراض و نکیر فرماتے، مگر یہ بات اہل نظر سے مخفی نہیں ہے کہ پہلا مفہوم موقع و محل کے لحاظ سے زیادہ مناسب و موافق ہے جو آپؐ کی مدح و ستائش اور شرافت و کرامت نیز حضرت انسؓ پر لطف و شفقت کا متضمن ہے۔''(۱)

تسویۃ الصفوف کے باب میں جماعت کی صفوں کو درست نہ کرنے پر اس وعید کا ذکر ہے:

(۱) اشعۃ اللمعات، ج۴، ص۲۶۸۔

او لیخالفن اللّٰہ بین وجوھکم — اللہ تمہارے اندر مخالفت پیدا کردے گا۔

اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے شیخ رقم طراز ہیں:

''حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں بھی اس قسم کی بات بیان ہوئی ہے کہ اختلاف نہ کرو کہ تمہارے دل مختلف ہو جائیں، یہ اس وجہ سے کہ اختلاف یا بعض لوگوں کے اظہار تفوق سے قلوب میں باہم نفرت پیدا ہوتی ہے، کینہ کپٹ اور عداوت بھڑکتی ہے اور اس کے نتیجہ میں دین کے کلمہ میں اختلاف ہوتا اور اسلام کی شوکت میں ضعف و انحلال واقع ہوتا ہے، یا خدا اور رسول کے حکم کو ترک کرنے اور اس کی نافرمانی کی وجہ سے قلوب پر ظلمت و کدورت طاری ہوتی ہے جو انسان کے ظواہر میں بھی سرایت کر جاتی ہے اور یہ غالباً اختلاف کی خصوصیت ہے۔

حدیث کے سیاق سے یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ مخالفتِ وجوہ سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے چہروں کو ان کی پشت کی جانب کردے گا یا ان کی شکل مسخ کر کے حیوانات کی صورت کا بنا دے گا جیسا کہ امام کی مخالفت کے سلسلہ میں وارد ہے کہ امام سے پہلے اپنا سر اٹھانے والا کیا اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ اس کے سر کو گدھے کے سر کی طرح کردے گا۔''(۱)

اس حدیث کی تشریح میں جس دوسری حدیث کا حوالہ ہے اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

اما یخشی الذی یرفع راسه قبل الامام ان یحول اللّٰہ راسه راس الحمار (۲)	کیا وہ شخص جو امام سے پہلے (رکوع وسجدہ) میں اپنا سر اٹھاتا ہے اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ اس کے سر کو گدھے کے سر سے پلٹ دے گا۔

(۱) اشعۃ اللمعات، ج۱، کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف، ص۲۳۳۔ (۲) ایضاً باب ما یجب علی الماموم۔

بعض روایتوں میں ہے کہ ایسے آدمی کی صورت کو اللہ تعالیٰ گدھے کی صورت جیسا بنا دے گا، شیخ عبدالحق اس روایت کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

''امام غزالی فرماتے ہیں کہ یہ آدمی کی نافہمی اور بلادت سے کنایہ ہے اور اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ وہ کس قدر نافہم اور بلند ہے کہ امامت کا مفہوم بھی نہیں سمجھتا، ان کی نزدیک حدیث کی یہی تاویل متعین ہے، چنانچہ وہ یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم برابر یہ دیکھتے ہیں اور مشاہدہ کرتے ہیں کہ امام سے سبقت کرنے والے کسی شخص کا چہرہ یا صورت گدھے کے چہرے یا صورت میں تبدیل نہیں ہوتا، حدیث سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ تحویل کی خشیت ہے نہ کہ اس کا وقوع، طیبی کا بیان ہے کہ گدھے کی صورت میں تبدیل کیے جانے سے مراد بلادت اور بیوقوفی ہے، مسخ اس امت میں روانہیں ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ تحویل کا تعلق دنیا کے بجائے آخرت سے ہے اس امت میں مسخ کے وقوع کے بارے میں اختلاف ہے۔''(۱)

ان مثالوں سے ترجمہ وتشریح کی نوعیت وخوبی کا اندازہ ہوا ہوگا، اب ہم اس کی بعض نمایاں خصوصیات تحریر کرتے ہیں۔

خصوصیات: اس کی چند نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ ترجمہ وتشریح میں سہل، عام فہم اور دلنشیں انداز و پیرایہ اختیار کیا گیا ہے لیکن اس کی وجہ سے حدیث کا مطلب ومفہوم اچھی طرح واضح ہوگیا ہے اور عام لوگوں کے لیے بھی اس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہوگیا ہے۔

۲۔ اس میں اہم مباحث ومسائل سے بقدر ضرورت تعرض کیا گیا ہے لیکن ان پر اس طرح بحث کی ہے کہ پڑھنے والا دقیق امور میں الجھے بغیر حدیث کی روح ومنشا سے واقف

(۱) اشعۃ اللمعات باب مایجب علی الماموم۔

ہو جاتا ہے، ایسے موقع پر تفصیل واطناب اور غیر متعلق مباحث سے بھی پرہیز کیا گیا ہے تاکہ قاری کو اکتاہٹ اور گھبراہٹ نہ ہو۔

۳۔ اختصار کے باوجود مطلب ومفہوم کو سمجھنے میں خلل اور دشواری نہیں ہوتی۔

۴۔ مصنف نے احادیث سے دلچسپ استنباط کیا ہے۔

۵۔ دفع تعارض بھی کیا ہے اور مختلف یا متضاد حدیثوں میں جمع وتطبیق کی ہے۔

۶۔ تشریح وتفہیم کے لیے آیات قرآنی واحادیث نبوی سے استشہاد کیا ہے اور ائمہ دین، محدثین اور شراح کے اقوال بھی پیش کیے ہیں۔

۷۔ حنفی مذہب کو شرح وبسط سے بیان کیا ہے اور اس کے دلائل نقل کیے ہیں اور اسے حدیث کے مطابق قرار دیا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ دوسرے فقہا ومجتہدین کے اقوال ودلائل بھی ذکر کیے ہیں۔

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور راویوں کے بارہ میں معلومات تحریر کیے ہیں۔

۹۔ یہ جس طرح عام لوگوں کے لیے کارآمد اور مفید شرح ہے، اسی طرح اہل علم اور خواص کے لیے بھی مفید ہے، اس بنا پر اساتذہ وطلبہ سب اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے یہ اہل علم میں ہمیشہ قدر وعظمت کی نگاہ سے دیکھی گئی، چونکہ مشکوٰۃ اکثر مدارس کے نصاب میں داخل ہے، اس لیے اس شرح سے بھی خاص طور پر استفادہ کیا جاتا ہے اور شیخ کا مقدمہ تو عموماً مدارس کے نصاب کا جزہی ہے۔

اس شرح کی اہمیت ومقبولیت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں اور یہ متعدد بار شائع بھی ہو چکی ہے، پہلے کلکتہ کے مطبع احمدی سے ۱۲۵۱ھ کے لگ بھگ چار ضخیم جلدوں میں چھپی، پھر بمبئی سے طبع ہوئی اور مطبع نول کشور سے اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔

۷۰۔ لمعات التنقیح علی مشکوٰۃ المصابیح: شیخ عبدالحق محدث دہلوی

کو حدیث کی کتابوں میں مشکوٰۃ المصابیح سے خاص دلچسپی تھی، اس لیے انہوں نے فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں اس کی شرح لکھی، یہ پہلے گزر چکا ہے کہ فارسی شرح لکھتے وقت چند ایسے اہم علمی مسائل و نکات ان کے سامنے آئے جن کو فارسی زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لیے انہوں نے عربی میں شرح لکھنا شروع کیا (۱) اور فارسی سے پہلے یہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔

یہ شیخ کی تالیف انیق اور شرح احادیث میں ایک مکمل، جامع، مفید و نافع اور عظیم و جلیل کتاب ہے جو مفید تحقیقات، لطیف نکات، دقیق مباحث اور گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے (۲) اس میں لغوی و نحوی مشکلات اور فقہی مسائل کو بہت خوبی سے حل کیا ہے، علاوہ ازیں احادیث سے فقہ حنفی کی مطابقت بھی کامیابی سے دکھائی ہے، خود فرماتے ہیں کہ اس شرح کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ حضرت امام شافعیؒ اصحاب رائے میں سے ہیں اور حضرت امام اعظم اصحاب ظواہر میں سے، انہوں نے شرح میں ایک ہی حدیث کے مختلف طرق روایات بھی جا بجا بیان کر دیے ہیں اور راویوں کے اسماء والقاب صحت کے ساتھ منضبط کیے ہیں، شروع کا مقدمہ نہایت جامع و مفید ہے جو مشکوٰۃ کے متن کے ساتھ اور علاحدہ رسالہ کی صورت میں بھی شائع کیا گیا ہے (۳) اس کے چند اردو تراجم بھی ہوئے ہیں، یہ مقدمہ حدیث کے اقسام و اصطلاحات اور اصولی مباحث پر مشتمل اور نہایت مقبول ہے، افسوس ہے کہ شیخ کی یہ تالیف ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے مگر اس کے قلمی نسخے بانکی پور پٹنہ، رام پور، حیدرآباد، پشاور، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، دہلی، علی گڑھ اور دیوبند وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

شیخ کی اولاد و احفاد: شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد بھی ان کے خاندان میں علمی روایات باقی رہیں اور ان کی اولاد و احفاد علم کی خدمت اور احادیث کی نشر و اشاعت

---

(۱) تعارف مخطوطات دارالعلوم دیوبند، ص ۱۱۵، بحوالہ دیباچہ لمعات۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۴، بحوالہ تالیف قلب الالیف۔ (۳) معارف دسمبر ۴۲ء مضمون ڈاکٹر زبید احمد صاحب۔

میں مشغول رہی، ان کے کارنامے بھی اہم ہیں، عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے:

''از اعقاب او ہفت تن تحصیل علم رسیدہ نمودہ بافادہ مشغول اند۔''(۱)

ہم ان سب کا مفصل حال تحریر کرنا چاہتے تھے مگر افسوس کہ تلاش و تفحص کے باوجود ان کے زیادہ حالات دستیاب نہیں ہو سکے، تاہم اس نسل و خانوادہ کے لوگوں کے جس قدر حالات معلوم ہو سکے ہیں ذیل میں وہ پیش کیے جاتے ہیں۔

☆☆☆

(۱) بادشاہ نامہ، جلد اول نصف آخر، ص ۳۴۲، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۷ء۔

شیخ نور الحق دہلویؒ

(المتوفی ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۳ء)

نام، خاندان، پیدائش، وطن اور تعلیم: یہ شیخ عبدالحق کے سب سے بڑے بیٹے تھے، ان کا نام نور الحق، کنیت ابو السعادات اور لقب جمال تھا، ان کا خاندان بخارا (ترکستان) سے دہلی آیا تھا اس لیے ترکی، بخاری اور دہلوی کی نسبتوں سے مشہور ہوئے، شیخ نور الحق شاعر تھے اور مشرقی تخلص کرتے تھے، اس لیے اس نسبت سے بھی مشہور ہیں۔

ان کی ولادت ۹۸۳ھ میں دہلی میں ہوئی، انہوں نے ساری تعلیم از ابتدا تا انتہا اپنے والد بزرگوار شیخ عبدالحق محدث سے حاصل کی اور حدیث کی سند بھی انہی سے لی۔(۱)

درس و تدریس: اپنے والد کے انتقال کے بعد سرکاری عہدہ سے مستعفی ہوکر ان کی مسند درس پر فروکش ہوئے اور اپنے خاندانی مدرسہ میں درس حدیث کی خدمت اور فرائض صدارت انجام دینے لگے، محمد صالح کنبوہ کا بیان ہے:

وپس از رحلت آں جناب نور الحق خلف الصدق کہ در علم وفضل شہرۂ آفاق بود مدت مدید صدر آرائی مدرسہ استفادہ گشتہ۔(۲)	آنجناب (عبدالحق) کے رحلت فرمانے کے بعد ان کے خلف الصدق نور الحق جو علم وفضل میں شہرہ آفاق تھے، مدرسہ کے صدر نشین ہوکر

(۱) مآثر الکرام، ج۱، ص۲۰۲ و نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۴۲۲۔ (۲) عمل صالح، ج۳، ص۳۷۸، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

عرصہ دراز تک لوگوں کو مستفید فرماتے۔

مگر اس کا پتہ نہیں چلتا کہ کن لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا، شیخ اکرام نے صرف ایک شاگرد قطب المحدثین مولانا سید مبارک حسین واسطی بلگرامی (متوفی ۱۷۰۵ء) کا نام تحریر کیا ہے۔(۱)

شیخ مبارک کے والد کا نام فخر الدین تھا، یہ شعبان ۱۰۳۳ھ میں بلگرام میں پیدا ہوئے، یہیں تعلیم کی ابتدا ہوئی اور بعض درسی کتابیں پڑھنے کے بعد دہلی تشریف لے گئے اور خواجہ عبداللہ بن عبدالباقی نقش بندی کے حلقہ درس سے وابستہ ہوئے، یہیں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند رشید شیخ نورالحق اور نواسے شیخ ابورضا بن اسماعیل سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۰۶۴ھ میں اپنے وطن واپس آئے اور درس وتدریس کے مشغلہ میں لگ گئے، وہ ایک باوقار اور پر رعب شخص تھے جن کے سامنے کسی کو منکر ومعصیت کے ارتکاب کی جرأت نہیں ہوتی تھی، اچھے مقرر وخطیب اور بڑے خلیق بھی تھے، ربیع الثانی ۱۱۱۵ھ میں انتقال ہوا۔(۲)

جامعیت اور علمی کمالات: شیخ نورالحق اپنے والد ماجد کی طرح علم وفضل میں یکتا اوران کے دینی وعلمی کمالات کے وارث وجانشین تھے، آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ:

> ''یہ یگانہ روزگار حضرت شیخ کے خلف الصدق، ان کے شاگرد اور ان کے صوری ومعنوی کمالات کے وارث تھے۔''(۳)

خود ان کے والد بزرگوار کو بھی ان کے علم وفضل کی بنا پر ان سے بڑا انس تھا اور وہ اپنا خلیفہ وجانشین کہتے تھے، اپنے رسالہ وصیت میں ان کے بارے میں اس کی تلقین فرماتے ہیں کہ:

> ''فرزند عزیز نورالحق کو فقیر کا خلیفہ وجانشین سمجھا جائے اور ان کے ساتھ تعظیم وتقدیم سے پیش آیا جائے۔''(۴)

---

(۱) رود کوثر، ص ۳۶۸۔ (۲) مآثر الکرام، ج۱، ص ۲۰۲۔ (۳) ایضاً۔ (۴) بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۵۸۔

وہ حدیث وفقہ میں یگانہ اور بلند پایہ مؤرخ ہونے کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے، صاحب طبقات شاہجہانی نے انہیں ''جامع علوم متداول'' قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

ولد ارشد مخدوم الانامی شیخ عبدالحق دہلوی است از علوم صوری و معنوی فراواں بہرہ دارد و منظور و مقبول پدر بزرگوار خود است او از برکات آں نظر باعلی مرتبۂ دانش و فضل برآمدہ و مقبول خاص و عام است۔ (۱)

شیخ نورالحق مخدوم الانام شیخ عبدالحق دہلوی کے فرزند رشید ہیں، ان کو صوری و معنوی علوم سے بہرہ وافر ملا ہے، وہ اپنے پدر بزرگوار کے منظور نظر اور مقبول ہیں، ان کی نظر کی برکتوں کی وجہ سے فضل و دانش کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز اور خاص و عام ہر طبقہ میں مقبول ہیں۔

محمد صالح کنبوہ کا بیان اوپر گزرا ہے کہ ''در علم و فضل شہرۂ آفاق بود'' صاحب فرحت الناظرین رقم طراز ہیں:

فاضل محدث و عالم متبحر بود خلیفہ و جانشین پدر خود شیخ عبدالحق دہلوی است۔ (۲)

شیخ نورالحق متبحر عالم و فاضل محدث اور اپنے والد شیخ عبدالحق کے جانشین ہیں۔

بختاور خاں نے بھی ان کو ''فاضل محدث و عالم متبحر'' لکھا ہے (۳) مولوی فقیر محمد جہلمی لاہوری رقم طراز ہیں:

''شیخ نورالحق بن شیخ عبدالحق دہلوی فقیہ محدث جامع کمالات صوری و معنوی فاضل متبحر عالم تھے اور تلمیذ و مرید و مقبول اپنے والد بزرگوار یگانہ روزگار کے تھے۔'' (۴)

---

(۱) طبقات شاہجہانی، ص ۲۱۹، مخطوطہ نمبر ۲۲۶، فارسیہ اخبار یونیورسٹی کلکشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ (۲) اقتباس فرحت الناظرین، ص ۵۸ مطبوعہ اورنٹیل کالج میگزین لاہور۔ (۳) مرأۃ العالم، ج ۲، بتصحیح و مقدمہ ساجدہ علوی، ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور۔ (۴) حدائق الحنفیہ حدیقہ یازدہم، ص ۴۱۸ مطبع نول کشور ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام تذکرہ نگاروں نے ان کے فضل وکمال کا اعتراف کیا ہے اوران کی علمی عظمت وبرتری اور جامعیت پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔

فقہی مسلک: اپنے والد کی طرح مسلکاً حنفی تھے،ان کی زندگی اس مسلک کی تائید و ترجیح اوراس کی ترویج واشاعت کے لیے وقف رہی ،اپنی تصنیف شرح بخاری شریف میں بھی اس مذہب کی تائید وتقویت کی ہے،صاحب فرحت الناظرین لکھتے ہیں:

درتقویت مذہب امام ابوحنیفہ جہد بلیغ نمودہ	امام ابوحنیفہ کے مذہب کو قوی قرار دینے
واحادیث مخالف ایں مذہب را تاویلات	میں جہد بلیغ سے کام لیا ہےاوراس مذہب کی
خجستہ فرمودہ۔(۱)	مخالف حدیثوں کی تاویل وتوجیہ کی ہے۔

بختاور خاں کا بھی بیان ہے کہ''درتقویت مذہب امام ابوحنیفہ جہد بلیغ نمودہ۔''

زہدواتقا: علم کی طرح عمل کے جامع ،ورع وتقویٰ میں ممتاز اور پاکیزہ خو تھے، سرکاری عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اس کی خرابیوں سے محفوظ اور قابل ستائش سیرت کے مالک تھے ،ان کے والد بھی ان کی سیرت وپاکیزگی وطہارت اور صلاح وتقویٰ کے معترف تھےاورانہیں اپنی نجات کا وسیلہ خیال کرتے تھے،فرماتے تھے کہ:

> ''مجھ سے کوئی عمل ایسا نہیں ہوا جو عاقبت میں میری نجات کا سبب و واسطہ ہے،سوائے اس فرزند مسعود کے وجود کے،کیوں کہ لڑکا باپ کے اعمال خیر میں شمار ہوتا ہے۔''(۲)

خافی خان کا بیان ہے کہ:

از فضلائے نیک سیر آں عہد بود۔(۳)	اس زمانہ کے نیک سیرت فضلا میں تھے۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے محمود السیرۃ فی القضا تحریر کیا ہے۔(۴)

---

(۱)اقتباس فرحت الناظرین،ص۵۸و۵۹۔(۲)مکتوب شیخ عبدالحق بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۸۸۔(۳)منتخب اللباب،حصہ اول،ص۵۵۱،کلکتہ۱۸۶۹ء۔(۴)نزہۃ الخواطر،ج۵،ص۴۲۴۔

سلوک و معرفت: شیخ نور الحق کا درجہ سلوک و عرفان میں بھی اونچا تھا، اپنے والد سے بیعت تھے، ان سے خلافت بھی پائی تھی، علم کی طرح تصوف و معرفت میں بھی ان کی جانشینی کی، سرکاری عہدہ سے سبکدوش ہو کر گو ہمہ تن حدیث کے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے تھے مگر اسی کے ساتھ ارشاد و ہدایت کا کام بھی انجام دیتے تھے۔

تصوف سے اشتغال کی وجہ سے وہ صوفیوں اور درویشوں کے بارے میں حسن ظن اور اچھا اعتقاد رکھتے تھے، صاحب طبقات شاہجہانی کا بیان ہے:

اعتقادے صاف اخلاق درست بدرویشاں و عارفاں دارد علی الخصوص بقدوۂ عارفاں و زبدۂ خداشناساں خواجہ محمد باقی نقشبندی اوی قد س سرہ و حضرت خواجہ نیز بوئے التفاتے خاص و توجہے تمام داشتہ چندگاہ در خانقاہ پدر بزرگوار خود بدرس قیام می نمودہ۔(۱)	درویشوں اور عارفوں کے بارے میں صاف عقیدہ رکھتے تھے خصوصاً عارفوں اور خداشناسوں کے نمونہ خواجہ محمد باقی نقشبندی سے انہیں بڑا اخلاص تھا اور حضرت خواجہ بھی ان کے ساتھ بڑا اعتنا فرماتے تھے۔ شیخ نور الحق کچھ عرصہ تک اپنے والد کی خانقاہ میں درس میں بھی مشغول رہے۔

مولوی رحمٰن علی نے ان کو خواجہ محمد معصوم مجددی کا مرید بتایا ہے (۲) مگر بعض اہل علم کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، دراصل وہ اپنے والد ہی کے مرید و خلیفہ تھے اور ان کی وفات کے بعد حضرت عاشق محمد نبیرہ حضرت خواجہ شاہ نظام الدین نارنولی سے عقیدت و ارادت رکھنے لگے تھے۔ (۳)

عہدۂ قضا: اپنے علمی و دینی کمالات، ورع و تقویٰ، علوم و فنون میں مہارت خصوصاً فقہ و حدیث میں امتیاز کی بنا پر عہد شاہجہانی میں اکبر آباد کے قاضی مقرر ہوئے، شاہجہاں کو

(۱) طبقات شاہجہانی قلمی، ص ۲۱۹، ۲۲۰ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ (۲) تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۶۔ (۳) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۵۸۔

اپنے ایام شاہزادگی ہی سے شیخ نورالحق کے علم و کمال سے واقفیت تھی، اس لیے وہ ان کے ساتھ بڑی خصوصیت کا معاملہ کرتا تھا اور جب دکن روانہ ہونے لگا تو اکبرآباد کا محکمۂ قضا سپرد کیا، وہ اس عہدہ پر والد کی زندگی تک فائز رہے، انہوں نے اس نازک اور بھاری ذمہ داری کو بڑی خوش اسلوبی اور نہایت دینداری کے ساتھ انجام دیا، طبقات شاہجہانی کے مصنف کا بیان ہے:

چوں حضرت صاحبقران ثانی از جوہر استعداد عالی وے از ایام شاہزادگی مطلع بودند وقتیکہ متوجہ دکن شدند اورا قاضی اکبرآباد کردند الیوم بقضائے قیام دارد وحق قضا چنانکہ باید ادا کردہ۔(۱)	چونکہ بادشاہ شاہزادگی کے زمانہ ہی سے شیخ نورالحق کی بلند استعداد سے واقف تھے، اس لیے جب دکن روانہ ہونے لگے تو انہیں اکبرآباد کا قاضی مقرر کیا، اس وقت شیخ قضا کے منصب پر فائز ہیں اور اس ذمہ داری کو جیسا چاہیے تھا ادا کررہے ہیں۔

آزاد بلگرامی رقم طراز ہیں:

وھو ادی ھذا المنصب العالی فی نہایۃ الدیانۃ والسداد (۲)	اور شیخ نورالحق نے اس بڑے عہدہ کو نہایت دیانت داری اور بڑی خوبی سے ادا کیا۔

مولوی فقیر محمد جہلمی کا بیان ہے:

"شاہجہاں اہم شاہزادگی سے آپ کے جوہر استعداد عالی سے اطلاع رکھتا تھا جب دکن کو جانے لگا تو آپ کو اکبرآباد کا قاضی مقرر کردیا گیا، چنانچہ آپ نے ایک مدت تک قضا کے منصب کو جیسا کہ چاہیے ادا کیا۔" (۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور وہ اس بارے میں

(۱) طبقات شاہجہانی، ص ۶۱۹ و ۶۲۰، مخطوطہ علی گڑھ۔ (۲) سبحۃ المرجان، ص ۱۴۱ تحقیق الدکتور فضل الرحمن ندوی معہد الدراسات الاسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ (۳) حدائق الحنفیہ، ص ۴۱۸۔

حق وانصاف سے کام لیتے تھے اور کسی کی رورعایت نہیں کرتے تھے۔

سلاطین سے تعلقات اوران کی قدردانی: شیخ نورالحق اپنے فضل وکمال اور حسن سیرت کی بنا پر علماء ومشائخ کی طرح سلاطین میں بھی مقبول ومحبوب تھے، اوپر بتایا جا چکا ہے کہ شاہجہاں اپنے بچپن ہی سے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں سے واقف تھا اس لیے انہیں اس نے عہدۂ قضا پر مامور کیا، وہ ان پر بڑا اعتماد کرتا تھا اور ان کا بہت قدرداں تھا، شیخ عالمگیر کے دربار میں بھی باریاب ہوتے اور انعامات سے نوازے جاتے، صاحب فرحت الناظرین لکھتے ہیں:

بار بابہ ملازمت اقدس عالمگیر بادشاہ رسیدہ بعنایات پادشاہانہ ممتاز گردیدہ بود۔(۱)	کئی بار عالمگیر بادشاہ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور شاہی انعامات سے ممتاز ومفتخر ہوئے۔

شعروسخن: شیخ نورالحق شعروادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے، خود بھی موزوں طبع تھے اور نثر ہی کی طرح نظم پر بھی ان کو بڑی قدرت تھی، بختاور خاں کا بیان ہے کہ نظم ونثر دونوں میں یکتا تھے، مگر ان کی خاص توجہ نثر ہی کی طرف رہی، البتہ بمقتضائے طبیعت کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، مشرقی تخلص تھا، ان کے والد محترم کو بھی ان کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف تھا، اپنی کتاب اخبار الفضلا میں لکھتے ہیں:

> ''ان کی طبیعت میں جودت تھی اور انہیں ذوق سلیم ملا تھا، بڑے صاحب ذوق اور ذی فضل وکمال تھے، کبھی کبھی شعر کہتے اور مشرقی لقب تھا، اگر ساری توجہ شعر ہی کی طرف ہوتی تو نظامی وخسرو کے خمسہ کا تتبع کر سکتے تھے لیکن انہوں نے علم وصلاح سے اصل سروکار رکھا اور یہی اصلی اور بنیادی چیز بھی ہے۔''(۲)

صاحب طبقات شاہجہانی لکھتے ہیں:

---

(۱) اقتباس فرحت الناظرین، ص ۵۸و۵۹۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۲۴۔

ازشعر وانشا نیز بکطے اوفر حظی است (۱)   انہیں شعر وانشا میں سے بھی بڑا وافر حصہ ملا ہے۔

ایک مثنوی تحفۃ العراقین اور ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل تھا، تذکرہ نگاروں نے ان کی بعض رباعیاں اور اشعار نقل کیے ہیں، ایک رباعی ملاحظہ ہو:

از شیوہ ہمداں ایں دور خلاف
گویم رمزی اگر نگیری بگزاف
چوں شیشہ ساعت اند پیوستہ بہم
دلہا ہمہ پر غبار و رہا ہمہ صاف

ان کا ایک شعر یہ ہے:

باآنکہ مشرقی ہمہ تن دیدہ چوں گل است
باہیچ کس چو چشم حباب آشنا بود (۲)

صاحب طبقات شاہجہانی نے بھی چند اشعار نقل کیے ہیں۔ (۳)

وفات: نوے برس کی عمر میں ۹ شوال ۱۰۷۳ھ کو انتقال کیا، فیض العلم سے تاریخ وفات نکلتی ہے، بعض تذکروں میں ۱۰۸۳ھ لکھ گیا ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، اپنے والد کے مقبرہ میں ان کے جوار میں دفن ہوئے۔ (۴)

اولاد واحفاد: شیخ نورالحق کے ایک ہی بیٹے تھے جن کا نام نوراللہ تھا، ان کے چار فرزند تھے۔

تصنیفات: شیخ نورالحق اپنے والد ہی کی طرح بلند پایہ مصنف تھے اور اس حیثیت سے بھی وہ الولد سرلابیہ کا مصداق تھے، ان کی تحریر سلیس اور زبان شستہ ہوتی تھی، اس کا اندازہ اس کتبہ سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے والد کے مقبرہ کے لیے لکھا تھا، ان کی بحث و

---

(۱) طبقات شاہجہانی، مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ص ۶۱۹ و ۶۲۰۔ (۲) فرحت الناظرین، ص ۱۰۵۔ (۳) طبقات شاہجہانی، ص ۶۱۹ و ۶۲۰۔ (۴) اقتباس فرحت الناظرین، ص ۵۸ و ۵۹ و مآثر الکرام، ج ۱، ص ۲۰۲۔

استدلال میں قوت اور زور ہوتا تھا، ان کی تصنیفات کو بڑا حسن قبول نصیب ہوا، مولانا حکیم سید عبدالحی کا بیان ہے کہ ان کی کتابوں سے فیض ربانی کی تاثیر ظاہر ہوتی ہے۔(۱)

جن کتابوں کا علم ہو سکا ہے ان کا حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔اثبات رفع المسبحة فی التشهد: یہ ایک مختصر رسالہ ہے(۲) موضوع نام سے ظاہر ہے۔

۲۔تحفة العراقین: یہ شیخ نور الحق کی مثنوی کا نام ہے۔(۳)

۳۔تعلیقات علی شرح المطالع:

۴۔تعلیقات علی شرح هداية الحكمة۔

۵۔تعلیقات علی العضدیه: یہ سب درسی کتابوں کے شروح وحواشی ہیں۔(۴)

۶۔تفسیر سورہ فاتحه: اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ہے۔(۵)

۷۔حاشیه علی شرح الجامی: پشاور اور حیدر آباد میں قلمی نسخے موجود ہیں، پشاور کا نسخہ خوش خط ہے۔(۶)

۸۔دیوان مشرقی: پانچ ہزار اشعار پر مشتمل دیوان تھا۔(۷)

۹۔رساله در بیان رویا:(۸)

۱۰۔زبدة التواریخ: یہ کتاب نواب مرتضیٰ خان کی فرمائش پر لکھی گئی، بعض تذکرہ نگاروں نے اسے ان کے والد کی تصنیف بتایا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ نواب صاحب نے ان کے والد سے اس کے لکھنے کی فرمائش کی تھی مگر وہ اپنی مشغولیتوں کی بنا پر اس کے لیے فرصت نہیں نکال سکے اس لیے شیخ نور الحق نے نواب صاحب کی فرمائش کی تکمیل کی اور یہ کتاب

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۵،ص ۴۲۵۔(۲) ایضاً۔(۳) فرحت الناظرین،ص ۱۰۵۔(۴) ایضاً،ص ۵۸و۵۹۔
(۵) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی،ص ۲۶۰۔(۶) لباب المعارف الاسلامیہ پشاور،ص ۲۵۲۔(۷) فرحت الناظرین،ص ۱۰۵۔(۸) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی،ص ۲۶۰۔

لاھی، شیخ اکرام کے خیال میں یہ کتاب فی الحقیقت شیخ عبدالحق کی کتاب ذکر الملوک کا ترمیم شدہ نسخہ ہے لیکن اس میں عہد اکبری کے حالات اضافہ کیے گئے ہیں(۱) سی، اے، اسٹوری کا بیان ہے کہ معزالدین محمد بن سام غوری کے عہد سے لے کر جہانگیر کی تخت نشینی ۱۶۰۵ء تک کے حالات ان کے والد نے لکھے، اس کے بعد کا حصہ شیخ نورالحق نے لکھا۔(۲)

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ ہے اور اس میں محمد غوری کے زمانہ سے جہانگیر کے زمانہ تک کے حالات درج ہیں اور نواب مرتضیٰ خان کا حال بھی تحریر کیا گیا ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ شیخ نورالحق نے اس میں اپنے والد کی تصنیف ذکر الملوک کے بڑے حصہ کا خلاصہ دے دیا ہو اور کہیں کہیں معمولی ردو بدل بھی کیا ہو، باقی آخری دور کے حالات خودان کے قلم سے ہوں گے، اسی بنا پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دراصل ان کے والد کی تاریخ حقی کا ایک بڑا ایڈیشن ہے(۳) اس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد اور برلین میں موجود ہیں(۴) ایلیٹ نے اپنی ہسٹری آف انڈیا میں اس کا کچھ حصہ شامل کیا ہے۔(۵)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں دکن کی تاریخ بہت مختصر ہے اور بعض علاقوں کی تاریخ سرے سے غائب ہے، صرف دہلی، مالوہ، گجرات، دکن، کشمیر، سندھ، ٹھٹھ، ملتان، بنگال اور جونپور کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔(۶)

۱۱۔شرح بخاری: اس کا ذکر آگے آئے گا۔

۱۲۔شرح شمائل: یہ فارسی میں شمائل ترمذی کی شرح ہے(۷) قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہے۔(۸)

---

(۱) رودکوثر، ص ۳۸۸۔(۲) پرشین لٹریچر، جلد اول، ص ۴۲۲۔(۳) تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، ج ۴، ص ۵۰۴، فارسی ادب دوم۔(۴) اسٹوری، ص ۴۴۲۔(۵) حواشی تذکرہ علمائے ہند محمد ایوب قادری ص ۵۳۵۔(۶) اسٹوری، ص ۴۴۱ و ایلیٹ، ج ۶ ص ۱۸۳۔(۷) الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، طبع دوم، ص ۱۵۳۔ (۸) حیات شیخ عبدالحق، ص ۲۵۹۔

۱۳۔**شرح صحیح مسلم**: اس کا ذکر مولوی رحمٰن علی نے کیا ہے(۱) اور استوری نے بھی کیا ہے اور نام منبع العلوم بتایا ہے مگر یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے لڑکے فخر الدین محب اللہ نے اس کو ترتیب دیا(۲) معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیخ نور الحق ہی کی تصنیف ہے۔ جس کو فخر الدین نے از سر نو مرتب کیا اور اس میں کچھ اضافے بھی کیے۔

۱۴۔ **محی القلوب**:(۳)

۱۵۔**نور العین شرح قران السعدین**: یہ خسرو کی مشہور مثنوی قران السعدین کی شرح ہے(۴)۔ جس میں کیقباد اور بغرا خان کی ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے، شیخ نور الحق نے اس کی شرح لکھی جس کو ان کے والد نے بھی ملاحظہ فرمایا تھا اور اس میں انہوں نے بعض اضافے بھی کیے تھے(۵) اس کے قلمی نسخے برٹش میوزیم اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے کتب خانے میں موجود ہیں۔(۶)

مولانا یوسف بنوری نے شیخ نور الحق کو شارح مؤطا بھی لکھا ہے(۷) مگر کسی اور تذکرہ نگار نے ان کی شرح مؤطا کا ذکر نہیں کیا ہے، دراصل شیخ شارح بخاری تھے، غالباً یہ مولانا کا وہم ہے۔

تیسیر القاری: اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے لیکن چونکہ یہ شیخ نور الحق کی سب سے اہم اور ممتاز تصنیف ہے اس لیے اس پر کسی قدر تفصیل سے اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

شیخ کے والد بزرگوار شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مشکوٰۃ المصابیح کا ترجمہ و تشریح کر کے فارسی زبان میں احادیث نبوی کی شرح و ترجمے کے جس کام کی ابتدا کی تھی ان کے

---

(۱) تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۶۔(۲) بحوالہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، ج ۴ ص ۵۰۴، فارسی ادب دوم۔(۳) حیات شیخ عبدالحق، ص ۲۶۰۔(۴) استوری، ص ۲۴۲۔(۵) معارف اکتوبر ۴۶ء، ص ۲۸۷۔(۶) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۶۰۔(۷) المقدمات البنوریہ، ص ۲۸، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء کراچی۔

فرزند اور خلف الرشید نے اس سلسلہ کو مزید آگے بڑھایا اور فارسی زبان میں بخاری شریف کا ترجمہ اور اس کی شرح لکھی جس کو شہنشاہ ہند اورنگ زیب عالمگیر کے نام سے معنون کیا، اس کا وہی طرز و انداز ہے جو ان کے والد کی تصنیف شرح مشکوٰۃ کا ہے، یہ شرح دراصل انہی کے ایما سے لکھی گئی تھی، مولانا نور الحق تحریر فرماتے ہیں:

> ''والد ماجد چاہتے تھے کہ صحیح بخاری کی شرح و تعلیق بھی اسی رنگ کی فارسی زبان میں لکھی جائے جیسی کہ وہ خود مشکوٰۃ المصابیح کی لکھ چکے تھے اور جس کو بڑی شہرت اور غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور تمام مسلمان اس کے فیوض سے بہرہ مند ہوئے لیکن چونکہ ہر کام کا وقت مقرر ہوتا ہے اس لیے ان کی زندگی میں اس اہم اور عظیم الشان کام کو انجام دینے کی توفیق میسر نہیں ہوئی اور ان کے انتقال کے بعد استخارہ کر کے ان کے حکم کی تعمیل میں کمر ہمت باندھی گئی۔''(۱)

شیخ نور الحق نے بخاری کی مروج و متداول شرحوں کرمانی، فتح الباری، عینی، سیوطی اور قسطلانی وغیرہ کو اپنا ماخذ بنایا اور ان سے مکمل استفادہ کیا، لیکن اس میں ان شرحوں کی طرح زیادہ اطناب و تفصیل سے کام نہیں لیا ہے بلکہ فارسی زبان میں ضروری مقاصد و مطالب مکمل طور پر اس طرح بیان کر دینے کی کوشش کی ہے کہ پایہ کمال دانش سے قاصر طالبین کے لیے بھی مطالعہ بخاری سہل اور آسان ہو جائے، مولانا عبدالحی فرنگی محلی مرحوم لکھتے ہیں:

> ''گو بخاری شریف کی مفصل و مختصر شرحیں لکھی جا چکی تھیں لیکن زبان کے فرق کی وجہ سے اہل عجم صحیح بخاری کی تحصیل اور اس کے اسرار و دقائق سے کما حقہ واقفیت سے قاصر و مرحوم تھے، تا آنکہ مولانا نور الحق نے اس کی فارسی شرح لکھی جس کا نام انہوں نے تیسیر القاری رکھا جس میں مفید مطالب،

---

(۱) تیسیر القاری، ج۱ص۲۔

عمدہ فوائد، لطیف مباحث اور دقیق غرائب بیان کیے، اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو مشکور بنائے اور انہیں جزائے خیر دے کیونکہ انہوں نے تمام لوگوں کے لیے صحیح بخاری کی تحصیل کو آسان کر دیا اور ہر قاری و سامع کے لیے اسے سہل بنا دیا۔''(۱)

شرح کے شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں امام بخاری کے حالات وسوانح، حدیث میں ان کے علوئے مرتبت اور دوسرے کمالات وغیرہ پر بحث وگفتگو کی گئی ہے، اس کے بعد پہلے بخاری شریف کی مرویات کا معنی خیز ترجمہ کیا ہے، پھر ان کی مختصر اور جامع تشریح کی ہے، یہ شرح وترجمہ متن کے ساتھ نواب محمد علی خاں بہادر صولت جنگ والی ریاست ٹونک کی توجہ سے مطبع علوی محمد علی بخش لکھنؤ سے ۵ جلدوں میں شائع ہوا ہے جن کی تصحیح و تہذیب کی خدمت مولوی محمد معشوق علی نے انجام دی ہے، حواشی پر اسی خانوادہ کے ایک بزرگ شیخ الاسلام کی شرح بخاری، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا رسالہ ترجمۃ الابواب اور ایک رسالہ اسماء الرجال بھی درج ہے، پہلی جلد کے شروع میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور بعض دوسرے حضرات کی تقریظیں بھی دی گئی ہیں، دوسری جلدوں کے آخر میں میں منثور ومنظوم تقریظیں شامل ہیں، ذیل میں اس شرح کی خوبیوں اور خصوصیات کو پیش کیا جاتا ہے۔

کتب کی ابتدا کے نوٹ: تیسیر القاری میں بخاری شریف کی کتب وابواب کے شروع میں بطور تمہید شارح نے مختصر نوٹ تحریر کیے ہیں جو عموماً قابل غور اور لائق توجہ ہیں اور ان سے اس شرح کی خصوصیتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔

امام بخاری نے اپنی صحیح کے ابتدائی باب **کیف کان بدء الوحی** سے کی ہے اور کتاب الوحی کا عنوان نہیں قائم کیا ہے، مولانا نور الحق اس کے شروع میں یہ نوٹ تحریر فرماتے ہیں:

''مؤلف نے کتاب کی ابتدا میں وحی اور اس کے آغاز کے بارے میں

---

(۱) تیسیر القاری، جلد اول آغاز۔

جو حدیثیں نقل کی ہیں ان کی حیثیت کتاب کے مقدمہ کی ہے، انہوں نے اس کو پسند نہیں کیا کہ خطبہ یا کسی اور قسم کی بات کو ابتدا میں لا کر دوسرے لوگوں کی طرح کلام رسول پر اپنے کلام کو مقدم کریں، انہوں نے بہت سے ابواب میں یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا ہے کہ حدیثوں ہی کو ان کا عنوان بنایا ہے اور ان کی تائید کے لیے یا ان سے ربط کی بنا پر آیتیں نقل کی ہیں، اس باب کے عنوان میں بھی انہوں نے آیت نقل کی ہے اور اس کے تحت جو حدیثیں لائے ہیں ان میں آپؐ کی جانب کی جانے والی وحی کی صورت و کیفیت اور آپؐ تک اس کے پہنچنے اور اترنے کی شکل بیان کی گئی ہے، علاوہ ازیں مصنف نے اس سے بھی آگاہ کیا ہے کہ وحی تمام انبیا و رسل کی ایک مستمر خصوصیت و امتیاز ہے۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح حدیث کا آغاز حدیث الاعمال بالنیات سے کر کے یہ واضح کیا ہے کہ صحیح نیت اور تقرب الی اللہ کے جذبہ کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کا یہ مجموعہ مرتب کرنے میں خود ان کی نیت پاکیزہ اور ارادہ صحیح رہا ہے، اس طرح حدیث کی طلب و تحصیل کرنے والوں کو انہوں نے بتایا ہے کہ وہ درست اور صحیح ارادہ سے اس کتاب کو شروع کریں۔"(۱)

شارح کے اس نوٹ میں جن نکتوں کی نشاندہی کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اس میں صحیح بخاری کے ابواب و کتب کی بعض منفرد اور انوکھی نوعیتیں اور خصوصیتیں بتائی گئی ہیں۔

۲۔ شروع میں خطبۂ کتاب نہ تحریر کرنے کی وجہ بتائی ہے۔

---

(۱) تیسیر القاری، ج ۱، ص ۶۔

۳۔ صحیح بخاری کا آغاز وحی سے متعلق روایتوں سے کیوں کیا گیا ہے؟ نیز ان حدیثوں میں کس امر کا ذکر ہے؟

۴۔ الاعمال بالنیات سے صحیح بخاری کے آغاز کی وجہ کیا ہے؟

کتاب الایمان اور کتاب العلم کے شروع میں بھی مختصراً نوٹ قلم بند کیا گیا ہے اور کتاب الوضو کی ابتدا میں جو نوٹ تحریر کیا گیا ہے اس میں پہلے اور بعد کی کتب وابواب سے صحیح بخاری کی باہمی مناسبت اس طرح واضح کی ہے:

> ''مصنف نے کتاب کو احادیث وحی سے شروع کیا تھا جو دینی احکام کی اصل الاصول اور بنیادی سرچشمہ ہے، اس کے بعد ایمان کی حدیثیں لائے ہیں کیونکہ تمام احکام کی اصل وبنیاد یہی ہے، اس کے بعد احادیث علم کو بیان کیا ہے کیوں کہ احکام اسی سے وابستہ ہوتے ہیں اور جب احکام وعبادات کا بیان شروع کیا تو نماز کا ذکر دوسری عبادتوں سے پہلے اس لیے کیا ہے کہ وہ تمام عبادتوں میں سب سے افضل ہے اور نماز سے پہلے طہارت کی حدیثیں اس لیے بیان کی ہیں کہ نماز کی سب سے اہم اور بڑی شرط یہی ہے اور قاعدہ ہے کہ شرط مشروط پر مقدم ہوتی ہے۔'' (ج اول، ص ۷)

بعض کتب کے شروع کا نوٹ قدرے طویل ہے، ان میں مختلف لغوی، فقہی اور علمی مسائل زیر بحث آئے ہیں، اس سلسلہ میں کتاب التہجد کا نوٹ لائق مطالعہ ہے مگر طوالت کے سبب سے اس کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

استنباط واخذ نتائج: شارح نے احادیث کی شرح وتوضیح کرتے ہوئے ان سے کہیں کہیں مفید استنباط اور دلچسپ نتائج اخذ کیے ہیں ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہوگا۔

صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں ہے کہ:

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حضرت عدیؒ کو لکھا کہ ایمان کے فرائض، شرائع،

حدود و اور سنن ہیں، جس نے ان کو کمال تک پہنچایا اس نے ایمان کو کمال تک پہنچایا اور جس نے ان کو تمام و کمال تک نہیں پہنچایا اس نے ایمان کو تمام و کمال تک نہیں پہنچایا، اس سے شارح کا یہ استنباط ملاحظہ ہو:

''حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ قول اس پر دلالت کرتا ہے کہ تصدیق واعمال ایمان کامل میں داخل ہیں جیسا کہ معمولی فہم و دانش سے یہ بات ظاہر ہے۔'' (ج اول، ص ۱۷)

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اس قول کے بعد مصنف حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

اجلس بنا نؤمن ساعة	ہمارے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھو تا کہ ہم امور آخرت واحکام دین کا ذکر کر کے ایمان کی زیادتی کا سامان کریں۔

مولانا نورالحق فرماتے ہیں:

''اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امور دین ایمان میں داخل ہیں، نؤمن سے ظاہر ہے کہ تجدید ایمان مراد ہے۔'' (ص ۱۷)

آگے امام بخاری حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ ''بندۂ مومن کی رسائی تقویٰ کی حقیقت تک اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ ان چیزوں کو بھی نہ چھوڑ دے جو اس کے سینہ میں کھٹکیں اور خلجان پیدا کریں'' اس کے متعلق حضرت شیخ نورالحق فرماتے ہیں کہ:

''اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض مومنین ایمان کی حقیقت اور کنہ تک پہنچ جاتے ہیں اور بعض نہیں پہنچتے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایمان متجزی ہے، اس کے اجزا ہو سکتے ہیں۔'' (ص ۱۷)

امام بخاریؒ نے تحویل قبلہ کے بیان میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ ''نبی صلی اللہ علیہ

وسلم نے کعبہ کی جانب رخ کر کے سب سے پہلے عصر کی نماز پڑھی، آپؐ کے ساتھ اس نماز کو پڑھنے والے لوگوں میں سے ایک صاحب کسی اور مسجد کے پاس سے گزرے جہاں لوگ رکوع میں تھے تو انہوں نے فرمایا کہ میں اللہ کی گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کی جانب رخ کر کے نماز پڑھی ہے، شیخ نور الحق اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

''یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ دیانات میں خواہ وہ فرائض ہی کیوں نہ ہو ایک شخص کی بات پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔'' (ج ۱، ص ۳۰)

امام بخاریؒ نے کتاب الایمان میں ایک باب یہ قائم کیا ہے کہ ''فتنہ اور آزمائش کی جگہ سے فرار اختیار کرنا بھی دین و ایمان میں داخل ہے'' اس سلسلہ میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی یہ حدیث درج کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''قریب ہے کہ مسلمان کا بہترین مال بکریوں کا وہ گلہ ہو جس کو لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور پانی کی جگہوں میں گوشوں اور صحراؤں میں بھاگ جائے تا کہ وہ اپنے دین کو فتنوں اور آزمائشوں سے بچا لے۔''

شیخ نور الحق اس کی شرح میں ان نکتوں کی نشاندہی کرتے ہیں:

''اس میں سلف کا اختلاف ہے کہ خلق سے عزلت و انزوا بہتر ہے یا ان کے درمیان رہنا، بعض لوگوں نے عزلت کے فائدوں کو مدنظر رکھ کر کہا ہے کہ خلق سے انقطاع میں شر و فساد سے سلامتی رہتی ہے اور طاعت و عبادت، جمعیت باطن اور ذکر الٰہی کے لیے وقت فارغ رہتا ہے، اس میں آدمی کو اپنی حالت کے لحاظ سے اخلاص و عمل کا موقع ملتا ہے، اس لیے عزلت ہی بہتر ہے لیکن جن لوگوں کی نظر اختلاط و صحبت کے ان فوائد پر ہے کہ اس میں علم دین کو سیکھنے اور سکھانے کی توفیق ملتی ہے، لوگوں کی داد و تحسین نصیب ہوتی ہے، ان کی جفا و ایذا پر صبر و تحمل کا اجر ملتا ہے اور ان کے ساتھ تواضع سے پیش آنے، بیماروں کی عیادت، جنازہ میں شرکت و مشایعت،

جمعہ اور فرض نمازوں کی جماعت میں حاضری کا موقع میسر آتا ہے وغیرہ وغیرہ، تو وہ لوگ ان دینی فوائد ومصالح کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ اختلاط اور خلق کے اندر رہنا ہی پسندیدہ اور بہتر ہے، کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ'' (ج ا ص ۲۱ و ۲۲)

دفع تعارض: شیخ نور الحق نے اپنی شرح میں احادیث کے ظاہری تضاد کو بھی رفع کیا ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب حضرت جبرئیلؑ پہلی بار وحی لے کر آئے تو آپؐ پر جو اضطرابی کیفیت طاری ہوئی اس کے ازالہ کے لیے حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دینے اور آپ کی وحشت کو دور کرنے والی جو باتیں فرمائیں ان میں آپ کے ان مکارم اخلاق اور عمدہ اوصاف کا خاص طور پر ذکر کیا جو آپؐ میں بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے اور جن کا انہوں نے اچھی طرح مشاہدہ کیا تھا، حضرت خدیجہؓ کا استدلال اس طور پر تھا کہ آپ کے ان اوصاف حمیدہ کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ ہرگز آپ کو بے سہارا نہ چھوڑے گا اور نہ آپ جیسے عمدہ اطوار و عادات کے آدمی کو وہ ذلیل و خوار اور بے یار و مددگار چھوڑے گا، شیخ نور الحق اس حدیث سے اولاً تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ واقعی اگر کسی کے اندر مدح و ستائش کے لائق باتیں ہوں تو انہیں اس کے سامنے بیان کرنا روا ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، رہی وہ حدیث جس میں اس کے برعکس یہ کہا گیا ہے کہ:

''اپنی تعریف کرنے والے کے منہ میں خاک ڈال دو۔''

تو یہ حکم ایسے شخص کے ساتھ مخصوص ہے جو مدح و ستائش کو اپنا شیوہ اور شعار بنا لے یہ بلا شبہ ایک نامناسب فعل ہے۔ (جلد اول، ص ۹)

صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں حضرت ابو سعید خدریؓ کے واسطہ سے یہ حدیث بیان کی گئی ہے کہ ''ایک نیکی کا بدلہ دس سے لے کر سات سو گنا تک ملتا ہے'' شارح فرماتے ہیں کہ عدد کی اس صراحت وقطعیت سے اس کے سوا کی نفی مقصود نہیں ہے، اس بنا پر یہ حدیث

اس حدیث کے معارض نہیں ہے جس کو مصنف باب رقاق میں لائے ہیں کہ ''سات سو سے بہت زیادہ گنا تک اجر ملتا ہے کیوں کہ تضعیف کا معاملہ اللہ کے فضل وارادہ سے جڑا ہوا ہے، وہ جس کو جس قدر چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ (ص ۳۰)

مشہور حدیث ہے کہ جبرئیلؑ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان، اسلام اور احسان کے بارہ میں سوال کیا، امام بخاریؒ نے اسلام کے متعلق ایک ایسی روایت نقل کی ہے جس میں حج کا ذکر نہیں ہے جب کہ دوسری حدیثوں میں اور عبادات کی طرح اس کا بھی ذکر ہے، اس کو بعض لوگوں نے راوی کے سہو ونسیان کا نتیجہ بتایا ہے، شیخ نور الحق فرماتے ہیں:

> ''بخاری کے رواۃ میں اس طرح کے احتمال کو راہ دینا نامناسب اور بعید ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس وقت آپ نے یہ فرمایا تھا اس وقت حج فرض نہیں ہوا تھا، اس سے ابن مندہ کی وہ تصریح باطل ہو جاتی ہے جس کو انہوں نے ایسی سند سے بیان کیا ہے جو امام مسلم کی شرط کے مطابق ہے اور جس میں وضاحت کے ساتھ یہ مذکور ہے کہ حضرت جبرئیلؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے آخری زمانہ میں تشریف لائے تھے، حضرت جبرئیلؑ کے اس واقعہ سے متعلق بعض روایتوں میں کچھ مزید اعمال کا ذکر بھی ہے لیکن بعض میں ان سے کم اعمال کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف سائل کے سوال اور مقتضائے حال کے اعتبار سے تھا، واللہ اعلم۔'' (ج ۱، ص ۳۵)

اشکالات کے جواب: شیخ نور الحق نے بعض جگہ شکوک وشبہات اور اشکالات کے جواب بھی دیے ہیں جس میں وہ عام شارحین کی رائے سے یک گونہ اختلاف کرتے ہیں، مثلاً حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی سچے دل سے گواہی دینے والا کوئی شخص ایسا نہیں جس پر اللہ آگ کو حرام نہ کر دے۔

حضرت معاذؓ نے آپ کا یہ ارشاد سن کر فرمایا ''اے اللہ کے رسول کیا میں اس سے لوگوں کو مطلع نہ کر دوں تا کہ وہ بشارت سن لیں'' آپؐ نے فرمایا تب تو لوگ اسی پر بھروسہ کر لیں گے اور عمل سے دستکش ہو جائیں گے'' اس کے بعد اسی روایت میں ہے کہ حضرت معاذؓ نے اپنی وفات کے وقت کتمان علم کے گناہ کے اندیشہ سے یہ بات بیان کر دی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبر کے حکم کی تعمیل نہ کرنا بھی تو ایک گناہ ہے، حضرت معاذؓ نے جب اس کی خبر دے دی تو وہ اس گناہ کے مرتکب ہو گئے، شیخ نور الحق اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ آپؐ کی نہی تحریمی کے بجائے تنزیہی تھی اور کتمان علم کی نہی تحریمی ہے، حضرت معاذؓ مجتہدین صحابہ میں تھے اس لیے آخر میں انہوں نے اس کو ترجیح دے کر اس پر عمل کیا۔

شارحین کہتے ہیں کہ امر ایجابی ہے اور نہی اتکال (تکیہ اور بھروسہ کرنے) سے مقید و مشروط ہے، حضرت معاذ چونکہ دین میں کوہ راسخ تھے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ مژدۂ جانفزا سنایا اور ہر شخص کو اسے سنانے سے منع فرمایا، چنانچہ انہوں نے اس کی خبر ایسے شخص کو دی ہوگی جس کے بارے میں انہیں اس کا اندیشہ نہ رہا ہوگا کہ وہ اس پر بھروسہ کرے گا مگر شیخ نور الحق کے نزدیک یہ جواب پر از تکلف ہے وہ فرماتے ہیں کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ آخر حضرت معاذ نے کیوں مدۃ العمر اس سے ان لوگوں کو مطلع نہیں کیا جن کے بارے میں بھروسہ کر لینے کا وہم و گمان نہیں تھا، ظاہر بات ہے کہ اس طرح کے لوگ ان کے زمانے میں بے شمار رہے ہوں گے، دوسری بات یہ ہے کہ بالآخر یہ اطلاع خاص و عام ہر شخص کو ہو ہی گئی، پس جس نے بھی اس کو مشتہر کیا ہو اس نے گویا اس ایجابی حکم کی خلاف ورزی کی۔'' (ج ۱، ص ۶۹)

شارحین کے اقوال سے بے اطمینانی: اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نور الحق نے اپنی شرح میں صرف شارحین کے اقوال و آرا ہی نہیں تحریر کیے ہیں بلکہ ان پر بحث و تبصرہ کیا ہے اور ان کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور جہاں ان کی رائے سے اختلاف کیا ہے وہاں اپنی

رائے و تحقیق کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے، مثلاً امام بخاری نے کتاب التیمم میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ:

اعطیت خمسًا لم یعطھن احد قبلی — مجھے ایسی پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں۔

مولانا نور الحق فرماتے ہیں کہ کتب سیر میں آپ کے بے شمار خصائص مذکور ہیں، ان پانچوں کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ شارحین کہتے ہیں کہ کسی چیز کو عدد کے ساتھ متعین کرنے سے ماسوا کی نفی و تردید نہیں ہوتی، پس یہ حدیث ان حدیثوں کے معارض نہیں ہے جن میں آپ کی مزید خصوصیات کا ذکر ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسری خصوصیات کی اطلاع آپ کو اس کے بعد ہوئی ہو۔

شیخ نور الحق کو ان دونوں باتوں سے تشفی نہیں ہوتی، وہ فرماتے ہیں کہ پانچ ہی چیزوں پر اکتفا کی یہ کوئی مناسب توجیہ نہیں ہے۔ (ج؛ص ۱۲۹)

کتاب الجنائز کی ایک حدیث کا فقرہ ہے:

واللہ ما ادری وانا رسول اللہ ما یفعل بی — بخدا اللہ کا رسول ہوتے ہوئے بھی مجھ کو معلوم نہیں ہے کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔

شیخ فرماتے ہیں کہ یہ بات محض جذبہ عبودیت اور تقاضائے ادب و بندگی کی وجہ سے آپؐ نے فرمائی ہے اور اس واسطے بھی کہ دوسرے لوگ متنبہ ہو جائیں اور فضول کاموں کے مرتکب نہ ہوں، ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علوئے شان و منزلت، وحی متلو و غیر متلو دونوں میں وارد ہے اور آپؐ بالیقین جانتے تھے کہ آپؐ قیامت کے دن تمام نبیوں سے معزز اور شافع و مشفع ہوں گے۔

شارحین کا خیال ہے کہ یہ بات سورۂ فتح کی آیت لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ سے پہلے کی ہے جب آپؐ کو اپنے اچھے برے انجام کی خبر نہیں تھی،

بعد میں تو آپ کو نہ صرف اپنے عشرۂ مبشرہ کے حسن انجام کا بھی علم ہوگیا تھا لیکن جس وقت آپؐ نے یہ فرمایا تھا اس زمانے میں آپ اپنی مغفرت کے بارے میں متردد تھے۔

شیخ نورالحق اس توجیہ پر بے اطمینانی ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بات اہل ایمان کے عقیدت مند دل میں کبھی متمکن نہیں ہوسکتی کہ آپؐ کے آخری دور میں ہونے والی صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہونے والی اس آیت سے پہلے آپ اپنے انجام کے بارے میں متردد رہے ہوں، باوجودیکہ آپؐ خدا کے مقرب اور اس کے گوناگوں انعامات کے مورد تھے، آپؐ سے اس قسم کا سوئے ظن رکھنے والا ہی اس توجیہ کو پسند کرسکتا ہے، کرمانی وغیرہ کا یہ خیال بھی بے معنی ہے کہ یہ بات سورۂ فتح کی آیت سے منسوخ ہوگئی ہے کیوں کہ اس حدیث میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ خبر ہے جس میں نسخ نہیں ہوتا۔

قرطبی وغیرہ نے کہا ہے کہ آپؐ کی مراد یہ ہے کہ مجھے خبر نہیں کہ میرے اور تمہارے ساتھ دنیا میں نفع وضرر کا کیا معاملہ ہوگا، واضح رہے کہ اس توجیہ سے حدیث کا سیاق ابا کر رہا ہے، بیضاوی کے نزدیک اس سے دارین کے احوال کی تفصیل مراد ہے کیوں کہ آپ کو تفصیل کے بارے میں کوئی واقفیت نہ تھی، اس بنا پر کہ غیب کی تمام باتوں کا علم اللہ کے لیے مخصوص ہے، بعض روایتوں میں **ما یفعل بی** کے بجائے **بہ** آیا ہے، اس صورت میں ضمیر کا مرجع حضرت عثمانؓ کی طرف ہوگا، فتح الباری میں لیث کے واسطہ سے اس روایت کی صحت میں کچھ کلام کیا گیا ہے، غرض اس کی متعدد تکلف پر مبنی توجیہات کی گئی ہیں، **واللہ اعلم** (ج۱، ص۳۱۶)

فقہی اختلاف کا ذکر اور حنفی مذہب کی تائید وترجیح: وہ اس شرح میں فقہا کے اقوال وآرا اور مختلف فقہی مذاہب کو بھی جابجا بیان کرتے ہیں اور چونکہ خود حنفی المذہب تھے اس لیے اس مذہب کو دلائل سے مرجح وافضل بتاتے ہیں، چند مثالوں سے اس کی وضاحت ہوگی۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوایوب انصاریؓ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ

''قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پیٹھ نہیں کرنی چاہیے'' اس کے متعلق شیخ نورالحق ارشاد فرماتے ہیں:

''یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ اس حدیث میں نہی عام ہے جس میں صحرا وغیرہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے، اسی کو امام ابوحنیفہ، مجاہد، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری اور ایک روایت کے مطابق امام احمد نے اختیار کیا ہے اور قیاس بھی اسی کا متقاضی ہے کہ نہی قبلہ کی تعظیم کی وجہ سے ہے جس کا استقبال و استدبار صحرا میں بھی ہوتا ہے اور عمارت کے اندر بھی اگر اس میں حائل کا اعتبار کیا جائے تو صحرا میں بھی پہاڑ اور عمارتیں حائل ہوسکتی ہیں۔

امام شافعی و امام مالک نے اس عموم کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث سے خاص کر دیا ہے جس سے مکانوں میں اس کا لحاظ نہ کیے جانے کی گنجائش ملتی ہے لیکن عروہ بن زبیرؓ اور ابوداؤ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث کو منسوخ مانتے ہیں۔'' (تیسیر القاری، جلد اول، ص۷۴، ۷۵)

تیمم کے بیان میں شارح لکھتے ہیں:

''مصنف اس کتاب میں جو حدیثیں لائے ہیں ان میں ایک ہی ضربہ اور مسح کفین (ایک مرتبہ مٹی پر ہاتھ مار کر اسی سے منہ اور دونوں ہتھیلیوں کو پوچھ لینے) کا ذکر ہے، محدثین اور امام احمد کا یہی مذہب ہے، ان حضرات کے نزدیک دوسری ضرب اور مسح ذراعین واجب نہیں ہے لیکن مشہور مسلک یہ ہے کہ تیمم میں دو ضربہ ہے، ایک منہ کے لیے اور دوسری کلائیوں سے کہنیوں تک کے لیے ہے، اس کے ثبوت میں بہت سی صحیح حدیثیں موجود ہیں، بعض ناقدین فن کا خیال ہے کہ پہلا مذہب دلیل کے لحاظ سے اور دوسرا قیاس کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے، امام خطابی فرماتے ہیں

کہ کفین پر اکتفا کرنا حسب روایت صحیح ہے اور اصول و قیاس کے اعتبار سے تیمم میں ذراعین کا وجوب اشبہ ہے۔

اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ قیاس کو نص کے مساوی قرار دینا غلط اور فاسد ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو ہمارا دارو مدار صرف قیاس پر نہیں ہے بلکہ وہ محض ایک وجہ ترجیح ہے، کیوں کہ جو روایت قیاس کے موافق ہو اس کو اس روایت پر ترجیح حاصل ہو گی جو قیاس کے موافق نہ ہو، ثانیاً یہ کہ حضرت عمارؓ کی حدیث مضطرب ہے جو لائق احتجاج نہیں، ان کی ایک روایت میں کفین اور دوسری میں ذراعین کا ذکر ہے، ابوداؤد نے ان سے جو روایت کی ہے اس میں یدین سے نصف ذراع تک کا ذکر ہے اور وہ مرفق (کہنی) کے ذکر سے خالی ہے مگر دوسری میں مرفقین (دونوں کہنیوں) تک کا ذکر ہے، ابوداؤد اور نسائی کی ایک روایت میں ابطین (بغلوں) اور مناکب (کندھوں) تک کا ذکر بھی ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ تیمم کے مسئلہ میں جس قدر حدیثیں مروی ہیں ان میں ابوجہیم اور عمار کی حدیثوں کے سوا سب ضعیف اور مختلف فیہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً اسی قدر مذکور ہے، شرح سفر السعادۃ میں اس پر زیادہ شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے اور ضربتین کے بارے میں حدیثیں صحاح سے منقول ہیں۔" (ص ۱۳۱)

شیخ نور الحق غالی حنفی نہ تھے: عموماً شیخ عبدالحق اور ان کے خلف الصدق شیخ نور الحق کو غالی اور متشدد حنفی کہا جاتا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اس میں شبہ نہیں کہ یہ دونوں بزرگ حنفی المذہب تھے اور اپنے مذہب کی تائید و حمایت بھی کرتے تھے اور دلائل و شواہد سے دوسرے مذاہب پر اسے ترجیح دیتے تھے مگر عام اہل تقلید اور مذاہب کے معاملہ میں غلو اختیار

کرنے والوں کی طرح نہ اپنے مذہب کی جا و بے جا حمایت کرتے تھے اور نہ اس شدت و تصلب کا مظاہرہ کرتے تھے جو مقلدین اور عام اہل مذاہب کا شیوہ ہے۔

ذیل میں ہم ایک ایسی مثال پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ اپنے مذہب و مسلک سے ان کا شغف و انہماک چاہے جتنا بھی بڑھا ہو مگر اس کے باوجود وہ حق و انصاف پسند تھے۔

رکوع سے پہلے اور اس کے بعد میں رفع یدین (دونوں ہاتھوں کو اٹھانے) کے بارے میں احناف اور دوسرے مذاہب کا اختلاف بہت مشہور ہے، امام بخاریؒ نے رفع یدین کے ثبوت میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث نقل کر کے صراحت کی ہے کہ وہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعا بیان کرتے تھے، شیخ نورالحق اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں:

> ''معلوم ہونا چاہیے کہ رکوع میں جاتے اور اس سے اٹھتے وقت ہاتھوں کو اٹھانے کے متعلق جو صحیح حدیثیں وارد ہیں ان میں سے اکثر حضرت ابن عمرؓ کے واسطہ سے مروی ہیں لیکن ہاتھ نہ اٹھانے کے بارے میں بھی صحیح حدیثیں بیان کی گئی ہیں، شیخ نورالحق اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہ کی اس روایت کو پیش کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے شیوخ سے بیان کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول بتایا ہے کہ آپ صرف نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے، اس کے سوا کسی موقع پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، امام طحاوی صحیح سندوں سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی صرف نماز کی ابتدا میں دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے۔

> امام ترمذی نے اپنی جامع میں اس مسئلہ کے متعلق دو ابواب قائم کیے ہیں، ایک میں امام بخاری کی طرح حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ کبار صحابہ کی ایک بڑی جماعت اسی کی قائل ہے،

دوسرے باب میں یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ افتتاح کے علاوہ کسی اور موقع پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے، اس باب میں حضرت بن مسعودؓ کی روایت تحریر کی ہے جس سے صرف افتتاح کے وقت دونوں ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے، امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس کے قائل بھی علمائے صحابہ وتابعین کی ایک بڑی جماعت ہے اور سفیان ثوریؒ اور اہل کوفہ یعنی حنفیہ کا یہی مذہب ہے، جامع الاصول میں ابن مسعودؓ کی حدیث ابوداؤد اور نسائی کے حوالہ سے منقول ہے اور براابن عازبؓ کی حدیث امام ابوداؤدؒ مرفوعاً لائے ہیں، صحیح روایتوں سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے بھی یہی منقول ہے کہ وہ نماز کے شروع میں رفع یدین کرتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ احادیث وآثار صحیحہ دونوں جانب موجود ہیں، علمائے حنفیہ جو عدم رفع کے قائل ہیں یہ کہتے ہیں کہ رفع والی حدیث منسوخ ہوگئی ہے، خود اس کے راوی حضرت ابن عمرؓ کو اس کے برخلاف کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے اور منسوخ حدیث کی روایت کرنا ممنوع نہیں ہے، پس جب راوی ہی اپنی روایت کے خلاف عمل کر رہا ہو تو ایسی حدیث کو حجت قرار دینا مناسب نہیں ہے، یہ ایک طے شدہ اصول ہے، ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ مجھ سے اتنی بڑی جماعت نے بیان کیا ہے جس کے ناموں کو شمار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے ابن عمرؓ کو دیکھا کہ وہ صرف نماز کی ابتدا ہی میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے، امام طحاوی نے مشکل الآثار میں مجاہد سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے ابن عمرؓ کے پیچھے نماز ادا کی وہ صرف تکبیر اولیٰ میں ہاتھ اٹھاتے تھے، نہایہ شرح ہدایہ میں ہے کہ عبداللہ بن زبیرؓ نے مسجد حرام میں ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ وہ رکوع میں

جاتے اور اس سے اٹھتے ہوئے رفع یدین کر رہا ہے، جب وہ نماز سے فارغ ہو گیا تو انہوں نے اس سے کہا کہ ایسا نہ کرو کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہلے کیا تھا مگر بعد میں ترک کر دیا تھا، مجاہد کہتے ہیں کہ میں بیس برس تک حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں رہا لیکن میں نے انہیں تکبیر اولیٰ کے سوا اور نماز میں کسی موقع پر ہاتھوں کو اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

شیخ نور الحق ان سب اقوال وتوجیہات کو بیان کرنے کے بعد جو کچھ تحریر فرماتے ہیں اس سے ان کی بے تعصبی اور حق پسندی ظاہر ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

''ان تمام آثار واعمال میں صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے نسخ کا جو قول منقول ہے وہ اشکال سے خالی نہیں، اس باب میں اس سے زیادہ آسان تر بات اور کوئی نہیں ہے کہ رفع (ہاتھ اٹھانے) اور عدم رفع (ہاتھ نہ اٹھانے) دونوں کی سنیت کا قائل ہونا چاہیے، واللہ اعلم، یہ بحث **فتح المنان فی تائید مذهب النعمان** سے منقول ہے جس میں شیخ المحدثین عبدالحق نے شرح وسط سے گفتگو کی ہے۔''

شافعیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ رکوع میں جاتے ہوئے اور اس سے سر اٹھاتے ہوئے رفع یدین کرنا چاہیے، یہ لوگ تشہد سے اٹھتے وقت رفع یدین کے قائل نہیں ہیں اور یہ حدیث جسے امام بخاری باب کے آخر میں لائے ہیں اس کے موافق بہت سی صحیح حدیثیں حضرت ابن عمرؓ اور دوسرے حضرات سے مروی ہیں، اسی بنا پر بعض شوافع اس کو بھی سنت سمجھتے ہیں لیکن یہ امام شافعیؒ سے منقول نہیں ہے، ان کی وصیت یہ تھی کہ اگر میرے فیصلہ کے خلاف کوئی حدیث موجود ہو تو میرے قول کو چھوڑ کر اسی حدیث پر عمل کرو، اکثر شافعیہ کے برخلاف امام نوویؒ نے اس کی سنیت کو صحیح

قرار دیا ہے۔" (جلد اول، ص ۲۵۴ و ۲۵۵)

بعض اہم بحثیں: امامت و خلافت کا مسئلہ بڑا اہم ہے، اس کی وجہ سے مسلمان دو فرقوں میں بٹ گئے اور اس سے ان کو شدید نقصانات پہنچے، اس نزاع کا ایک اہم باعث واقعہ قرطاس بھی ہے، اس کو بعض لوگوں نے جس طرح سے پیش کیا ہے اس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت مجروح ہوتی ہے اور نعوذ باللہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی دعوت و تبلیغ پر مامور فرمایا تھا ان کو بیان کرنے میں آپ نے کوتاہی سے کام لیا، اگر آپ کے لیے مسئلہ خلافت میں نامزدگی اور صراحت کرنا ضروری ہوتا تو آپ اس میں اخفا سے کیوں کام لیتے، صوفیہ باطنیہ بھی اسی قسم کی گمراہی میں جا پھنسے ہیں جنہوں نے ظاہر و باطن کی تقسیم کر کے یہ کہا ہے کہ علم باطن صرف حضرت علیؓ کو عطا ہوا تھا اس لیے علم باطن کا منبع انہیں کو قرار دیا جاتا ہے، یہاں موقع نہیں، ورنہ ہم دکھاتے کہ یہ کیسی شدید گمراہیاں ہیں جن کے لیے حضرت علیؓ کی ذات کو استعمال کیا جا رہا ہے۔

واقعۂ قرطاس کے بارے میں شیخ نور الحق نے جو کچھ لکھا ہے وہ اعتدال و توازن کا نمونہ اور بڑے غور و فکر کا نتیجہ ہے، ملاحظہ ہو:

امام بخاریؒ نے کتاب العلم کے باب کتابۃ العلم میں واقعہ قرطاس کے متعلق جو حدیث نقل کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

> "حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شدید ہوگئی تو آپؐ نے فرمایا کہ کاغذ و قلم لاؤ تا کہ میں ایسا نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد تم لوگ گمراہ نہ ہو گے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپ پر وجع والم غالب ہے اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے جو ہمارے لیے کافی ہے، پھر حاضرین جھگڑ پڑے اور شور و ہنگامہ برپا ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس سے تم لوگ چلے جاؤ، میرے

پاس اختلاف ونزاع مناسب نہیں ہے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ وہاں
سے یہ کہتے ہوئے نکل پڑے کہ آپ کے اور آپ کی تحریر کے درمیان حائل
ہونا ہی ساری مصیبت تھی۔'' (تیسیر القاری، جلد اول، ص ۶۱)

شیخ نورالحق فرماتے ہیں کہ یہ حدیث وجہ نزاع اور لوگوں کی گمراہی وکجی کا باعث بن گئی ہے، بعض لوگ نہایت وثوق اور پوری قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ آپ کا مقصود حضرت علیؓ کے لیے خلافت نامہ تحریر کرنا تھا مگر چونکہ حضرت عمرؓ کو ان سے عداوت اور کد تھی اور وہ آپؐ کی منشاومراد کو سمجھ گئے تھے اس لیے انہوں نے آپؐ کو خلافت نامہ تحریر کا موقع نہیں دیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہی چاہتے تھے کہ آپ کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوں تو آپؐ نے انہیں نماز پڑھانے کا حکم کیوں نہیں دیا جب کہ وہ آپ کی خدمت میں موجود تھے اور حضرت ابوبکرؓ اپنے گھر میں فروکش تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اصرار کر کے ان کے گھر سے بلوایا اور نماز پڑھانے کا حکم دیا۔

درحقیقت یہ ایک باطل وہم ہے جس کا سرچشمہ وہ تعصب اور بدگمانی ہے جو اساطین دین وملت کی جانب سے ان لوگوں کے دلوں میں متمکن ہے بلکہ یہ تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی سوئے عقیدت کا نتیجہ ہے، اگر آپ کا مقصود وہی ہوتا تو جب آپ نے دیکھا کہ لوگ کتابت کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں تو آپ نے حق کو پوشیدہ رکھنا کیسے پسند کیا اور کیوں نہیں اپنی زبان مبارک سے یہ فرمادیا کہ میرے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوں گے۔

یہ معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافرین دین کی اصلاح وہدایت کی جانب سے بھی کبھی بے توجہی نہیں کی جو برسہا برس تک آپ سے بحث ومجادلہ کرتے رہے بلکہ آپ ان میں سے ایک ایک کی رہنمائی کے لیے برابر فکرمند اور سرگرداں رہے تو اپنے ان ساتھیوں کے معاملہ میں کیسے تساہل سے کام لیتے جو ہمیشہ آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے بے چین رہتے اور اپنی جان ومال سب کچھ آپ کے لیے نچھاور کردینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے

اور آپؐ زندگی بھر ان سے خوش رہے تو زندگی کے آخری لمحہ میں ان کے اختلاف سے کیسے اس قدر دل برداشتہ ہو سکتے تھے کہ محض ایک لفظ نہ کہنے کی بنا پر سب کو گمراہ چھوڑ جاتے، اس سے بڑھ کر کون سی بداعتقادی آپ کی شان میں ہو سکتی ہے، اللہ ہم سب کو اس سے بچائے۔

دراصل یہ معاملہ مبہم ہے اور اس کا پتہ نہیں چلتا کہ آپ کیا لکھانا چاہتے تھے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قطعی طور سے ضروریات دین، اوامر ونواہی پر استقامت، اولوالامر کی اطاعت اور اہل بیت کی عزت وحرمت کی حفاظت کی تجدید فرمانا چاہتے تھے کیوں کہ ایک بڑی جماعت کے ان امور کی رعایت نہ کرنے کی بنا پر جادۂ مستقیم سے منحرف ہو جانے کا اندیشہ تھا لیکن چونکہ یہ ساری باتیں تاکیداً اور تفصیلاً کتاب اللہ سے معلوم ہو جاتی ہیں، اس لیے حضرت عمرؓ نے اس نور فراست سے جو خدا نے ان کو عطا کیا تھا اور اپنی صائب رائے سے یہ دریافت کر لیا تھا کہ آپؐ کا مقصد و مدعا کیا ہے، اس لیے وہ آپ کی اس شدید تکلیف کی وجہ سے جس میں آپ مبتلا تھے آپ کو مزید زحمت میں ڈالنے کے لیے راضی نہیں ہوئے۔

موقع ومحل اور دوسرے قرائن سے بھی اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی کہ آپ حضرت علیؓ کے لیے خلافت نامہ تحریر فرمانا چاہتے تھے کیوں کہ حضرت ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کا آپؐ حکم دے چکے تھے اور تمام صحابہ نے ان کی اقتدا میں نماز بھی ادا کی تھی، اس سے بطریق لزوم خود ہی ثابت ہو جاتا ہے کہ آپ خلافت کبریٰ کے منصب پر بھی انہیں کو فائز کرنا چاہتے تھے اس لیے اگر آپؐ ان کی خلافت کی صراحت فرمانا یا ان کے لیے وصیت تحریر کرنا چاہتے رہے ہوں تو یہ ایک قریبی احتمال ہے اور وہ احتمال جو بیان کیا جاتا ہے بعید تر ہے، کتاب الجہاد کے باب **هل يستشفع الىٰ اهل الذمة** میں شارح قسطلانی تحریر کرتے ہیں کہ آپ نے کاغذ یہ تحریر فرمانے کے لیے مانگا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی صراحت فرما دیں لیکن چونکہ لوگ آپس میں جھگڑ پڑے اور آپ کو بیماری سے شدید تکلیف تھی اس لیے آپ نے اس کی جانب

سے اس لیے صرف نظر کر لیا کہ آپ حضرت ابوبکرؓ کو نماز میں اپنا جانشین بنا ہی چکے تھے، امام بخاریؒ کتاب الطب کے باب المریض میں آپ کے اس ارشاد گرامی کو نقل کرتے ہیں:

لقد هممت اردت ان ارسل الی ابی بکر وابنه	میں نے قصد یا ارادہ (راوی کو شک ہے کہ هممت فرمایا یا اردت) کیا کہ ابوبکرؓ اور ان کے صاحبزادے (عبدالرحمٰن) کو بلاؤں۔

امام مسلمؒ کی روایت میں اس کی بھی تصریح ہے کہ:

واعهد ان يقول القايلون ويتمنى المتمنون	اور (ان کے لیے خلافت کی) وصیت کر دوں تا کہ کسی کو اس (خلافت) کی طلب وتمنا نہ رہے۔

اللہ تعالیٰ اور تمام مسلمان حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے سوا کسی اور کو میرے بعد خلیفہ بنانے پر راضی نہ ہوں گے، یہ مفہوم چونکہ دوسری حدیثوں کے منطوق کے مطابق ہے، اس لیے اس باب میں یہ مختصر حدیث بیان کرنے پر اکتفا کی ہے:

امام مسلم حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ان سے فرمایا کہ ابوبکرؓ اپنے بھائی کو بلاؤ تا کہ میں ان کے لیے یہ تحریر کر دوں کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ دوسرے لوگ اس کے دعویدار ہو جائیں گے اور اپنے کو خلافت کا زیادہ اہل بتائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ اور تمام مسلمان حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ کسی اور کو خلیفہ بنانے پر راضی نہ ہوں گے، بزارؒ حضرت عائشہؓ کے واسطہ سے یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ جس وقت آپ کے مرض نے شدت اختیار کر لی تھی اس وقت آپؐ نے فرمایا کہ دوات، قلم اور کاغذ لاؤ تا کہ میں ابوبکرؓ کے لیے ایک تحریر لکھ دوں تا کہ لوگ اس معاملہ میں ان سے اختلاف نہ کریں، پھر آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ خدا کی پناہ اس بات سے کہ لوگ ابوبکرؓ سے اس بارے میں اختلاف کریں۔

یہاں یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ جو دو حدیثیں اوپر بیان کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا

ہے کہ صحابہ کرام نے آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کی، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے پاس جو لوگ موجود تھے انہوں نے آپ کے اس حکم کو ایجابی (واجب) نہیں سمجھا، ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ امر ایجابی ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مانعین کتابت پر ناگواری ظاہر فرماتے اور واجب کا مکلف بتانے میں کسی کی بھی پروانہ کرتے، علاوہ ازیں خود حضرت عمرؓ کس طرح امر ایجابی کی تعمیل میں توقف فرماتے جب کہ ان کی رائے عموماً وحی قرآنی کے مطابق ہوتی تھی، شارح نے اس کی متعدد مثالیں دی ہیں جن کو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

کتاب الجہاد کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عمرؓ کی رائے پسند آئی تھی اور آپؑ نے دوسرے لوگوں کی بات سنی ان سنی کر دی تھی اور ان کے اعتراض کو سرے سے نظر انداز فرما دیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں طعن وتشنیع، ذاتی خبث اور طبعی عناد کا نتیجہ ہے، واللہ اعلم بالصواب (جلد ا ص ۶۱ و ۶۲)

اسباب ووجوہ کا ذکر: شیخ نورالحق نے اپنی شرح میں جا بجا کسی حدیث کو لانے کا مقصد اور احادیث میں درج باتوں کے وجوہ واسباب اور مصالح بھی تحریر کیے ہیں، مثلاً امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا آغاز اس مشہور حدیث (**انما الاعمال بالنیات الخ**) سے کیا ہے کہ کتاب کا آغاز اس حدیث سے کیا جانا اس کو ظاہر کرتا ہے کہ سچی نیت اور تقرب الٰہی کے ارادہ کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا۔

آگے وحی کی کیفیت کی تشبیہ آواز جرس سے دیے جانے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ "وحی پیہم آتی تھی اور کلمات ایک دوسرے سے منفصل اور جدا نہیں ہوتے تھے یا اس لحاظ سے تشبیہ دی ہے کہ آسانی سے اس کے معنی سمجھ میں نہیں آتے تھے اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے نفس وحی مراد ہے اور آواز سے فرشتہ کے بال وپر کی آواز مراد ہے جو کہ وحی کا دیباچہ ومقدمہ تھی۔ (ص ۷)

اسی سلسلہ روایت میں حضرت عائشہؓ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ سخت ٹھنڈک کے دنوں میں بھی جب آپ پر وحی آتی تھی تو آپ کی پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا تھا، اس رنج و تعب کی وجہ سے جو احکام الٰہی کی تبلیغ کی ذمہ داری کو محسوس کرنے کی وجہ سے آپ کو پہنچتا تھا۔

وحی کے سلسلہ کی روایت میں آگے یہ بیان ہوا ہے کہ وحی کی جو پہلی نوع آپ پر نازل ہوئی وہ خواب میں رویائے صالحہ تھے، شیخ کا بیان ہے کہ یہ کیفیت چھ ماہ تک رہی اور اس کی حکمت یہ تھی کہ فرشتہ اگر دفعتاً آجاتا اور یکبارگی بار نبوت آپ پر ڈال دیا جاتا تو آپ کے قوائے بشری اس کے متحمل نہ ہوتے اور بیداری کی حالت میں آپ پر جو ہیبت طاری ہوتی اس کا ذکر اسی روایت کے آخر میں ہے۔ (ص ۷)

اس حدیث کے آخر میں حضرت ورقہ بن نوفل کے اس قول کا ذکر ہے کہ ''یہ وہی ناموس ہے جس کو اللہ نے موسیٰ کے پاس بھیجا تھا'' نصرانی ہونے کے باوجود انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے بجائے حضرت موسیٰؑ کا کیوں ذکر کیا، اس کی وجہ شارحین یہ بتاتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی کتاب کا بڑا حصہ احکام پر مشتمل ہے اور یہی حال ہمارے پیغمبرؐ کی کتاب کا بھی ہے، اس کے برعکس حضرت عیسیٰؑ کو جو کتاب دی گئی تھی وہ تمام تر امثال و مواعظ کا مجموعہ ہے، شیخ نور الحق اس توجیہ سے متفق نہیں ہیں کیوں کہ حضرت موسیٰؑ متفقہ طور پر نہایت مشہور و مقرب نبیوں میں تھے، اس کے برخلاف حضرت عیسیٰؑ کی نبوت میں بھی یہود کی ایک جماعت کو اختلاف تھا اور یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت جبرئیلؑ حضرت موسیٰؑ کے پاس حضرت عیسیٰؑ کی بہ نسبت زیادہ آتے تھے کیوں کہ توریت احکام پر مشتمل تھی اور احکام نجماً نجماً اترتے تھے، جس طرح کہ قرآن احتیاج کے وقت اترتا تھا، کشاف میں ہے کہ جنی (جنات) یہودی تھے، اس لحاظ سے حضرت موسیٰؑ کے نام کی تعیین کی گئی ہے اور بیضاوی میں ہے کہ جنیوں کو حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کی خبر نہیں ہوئی تھی، شیخ نور الحق کے نزدیک یہ ساری وجہیں نہایت دور از کار ہیں، جنات تو مشرق و مغرب ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے، انہیں حضرت عیسیٰؑ کی

بعثت کی بھلا کیوں اطلاع نہ ہوتی۔ (جلد اول، ص ۹و۱۰)

صحیح بخاری کے ابواب کی مناسبت کا ذکر: امام بخاریؒ کا ایک خاص فضل و امتیاز ان کی کتاب کے ابواب و تراجم بھی ہیں، ان کے تحت انہوں نے جو حدیثیں نقل کی ہیں ان کی مناسبت کے پہلو نہایت دقیق اور مخفی ہیں جن کی حقیقت امعان نظر کے بغیر معلوم نہیں ہوتی، اسی لیے علمائے فن نے ان کو اپنے غور و فکر کا خاص موضوع بنایا ہے اور اپنی شرحوں میں اس پر مفصل بحث و گفتگو کی ہے، شیخ نور الحق نے بھی ابواب و کتب سے احادیث کی مناسبت جا بجا دکھائی ہے، چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

صحیح بخاری کے باب بدء الوحی کے آخر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے واسطہ سے ابوسفیان و ہرقل کا جو مکالمہ بیان کیا گیا ہے، شیخ نور الحق عنوان باب سے اس حدیث کی مناسبت یوں بیان کرتے ہیں:

> ''قسطلانی کے نزدیک باب مذکور سے حدیث کی مناسبت اس اعتبار سے ہے کہ اس میں آپ کے ابتدائی حالات اور عمدہ صفات و اطوار کا ذکر ہے جن کی وجہ سے آپ وحی و رسالت سے سرفراز کیے گئے، علاوہ ازیں اس روایت میں ظہور نبوت کی ابتدا کا واقعہ درج ہے، ایک جماعت کے نزدیک عنوان میں مذکور آیت سے ابوسفیان و ہرقل کی گفتگو کی مناسبت اس طرح ہے کہ گزشتہ تمام انبیا علیہم السلام کے حالات جن پر وحی نازل ہوتی تھی اسی طرح کے ہیں۔'' واللہ اعلم (ص ۱۶)

کتاب الایمان کے **باب المعاصی من امر الجاهلية ولا يكفر صاحبها** (گناہ جاہلیت کے امور میں داخل ہے اور گناہ گار کی تکفیر نہ کی جائے گی) میں حضرت ابوذرؓ کی یہ حدیث نقل کی ہے جس میں ایک شخص کو ان کے گالی دینے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **انک امرء فيك جاهلية** (تم ایسے شخص ہو جس میں جاہلیت کی خو بو ہے)

اس کے متعلق شیخ لکھتے ہیں:

''عنوان سے حدیث کی مناسبت اس قدر ہے کہ حضرت ابوذرؓ جیسے جلیل القدر شخص سے بھی گناہ سرزد ہوا اور اس کے باوجود وہ مسلمان رہے۔'' (ص ۲۶)

کتاب العلم کے باب المناولہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اپنا نامہ مبارک دے کر بھیجا، اس نے جب نامۂ مبارک کسریٰ کے حوالہ کیا تو اس نے اسے چاک کر ڈالا۔

شیخ نے ترجمۃ الباب سے اس حدیث کی مناسبت اس طرح بیان کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خط قاصد کے سامنے پڑھے بغیر اس کے حوالہ کر دیا اور اسے اس کی اجازت دی کہ وہ یہ کہے کہ یہ نامۂ مبارک ہے جس پر عمل کیا جانا چاہیے، منادلت اور اجازت کا یہی ثمرہ اور حاصل ہے۔ (ج ا، ص ۴۴)

اسی کتاب کے باب **من ترک بعض الاختیار مخافة ان یقصر فھم بعض الناس عنه فیقعوا فی اشد منه** (جو کسی مختار اور پسندیدہ کام کو اس اندیشہ سے ترک کر دے کہ بعض لوگ اسے نہ سمجھنے کی وجہ سے اس سے سخت تربات میں پڑ جائیں) میں امام بخاریؒ یہ حدیث لائے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اگر تیری قوم کا زمانہ جاہلیت کے دور سے قریب تر نہ ہوتا تو میں کعبہ کو توڑ کر اس کے دو دروازے کر دیتا تاکہ ایک سے لوگ اس میں داخل ہوتے اور دوسرے سے نکلتے، شیخ نورالحق فرماتے ہیں کہ عنوان باب سے حدیث کی مناسبت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنائے کعبہ کے سلسلے میں ایک مختار امر کو اس اندیشہ کی وجہ سے ترک کر دیا تھا کہ ضعیف الایمان لوگوں کے فتنہ میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ (جلدا، ص ۶۸)

شیخ نوارالحق نے احادیث سے ترجمہ ابواب کی مناسبت ہی نہیں بیان کی ہے بلکہ

کتب وابواب کی باہم دگر مناسبت بھی بیان کی ہے جس کی مثالیں پہلے گزر چکی ہیں۔

شیخ نور الحق صحیح بخاری کے نسخوں کے فرق واختلاف کو بھی واضح کرتے ہیں، اس سلسلہ میں انہوں نے تراجم ابواب کے اس فرق کو بھی دکھایا ہے جو مختلف نسخوں میں پایا جاتا ہے، اس ضمن میں بھی انہوں نے کہیں کہیں احادیث سے تراجم ابواب کی مناسبت دکھائی ہے، مثلاً امام بخاریؒ نے کتاب الایمان کے **باب علامات الایمان حب الانصار** (ایمان کی علامتوں میں انصار کی محبت بھی ہے) کے بعد جس باب کا ذکر کیا ہے اس کا کوئی عنوان نہیں دیا ہے، شیخ نور الحق کا بیان ہے کہ بعض نسخوں میں یہاں سرے سے باب ہی موجود نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس باب مذکور حدیث کا تعلق سابق باب علامات الایمان سے ہوگا اور پھر حدیث کی اس سے مناسبت واضح کی ہے۔

کتاب الایمان کے ایک باب کا عنوان یہ ہے "**باب المعاصی من امر الجاهلية ولا يكفر صاحبها بارتكابها الا بالشرك**" (گناہ کے کام جاہلیت کے کاموں میں سے ہیں جن کے مرتکب کی تکفیر نہیں کی جائے گی سوائے شرک کے گناہ کے) اس باب کے آخر میں حضرت ابو بکرہؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب دو مسلمان اپنی تلواروں سے قتال کریں تو قاتل ومقتول دونوں آگ میں ہوں گے، میں نے عرض کیا کہ خیر یہ تو قاتل ہے لیکن مقتول کیوں آگ میں جائے گا، آپؐ نے ارشاد فرمایا اس لیے کہ وہ بھی اپنے حریف کو قتل کرنے کا آرزومند تھا۔

شیخ نور الحق اس حدیث کی شرح کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "یہ کتاب کے بعض نسخوں میں علاحدہ باب میں درج ہے جس کا عنوان یہ ہے "**وَإِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا**" (اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑائی کریں تو ان کے درمیان صلح کراؤ) اس شرح میں اس نسخہ پر اعتماد کیا گیا ہے جو ہمارے شیخ وسید ابو المجد عبد الحق کا تصحیح کیا ہوا ہے۔ (ج ۱، ص ۲۷)

شیخ نے نسخوں کے الفاظ وحروف تک کے فرق واختلاف کو بھی بتایا ہے جیسے کتاب الایمان کے شروع ہی میں بتایا ہے کہ صحیح بخاری کے بعض نسخوں کی روایات کے مطابق اس کے بجائے من کتاب الایمان مذکور ہے مگر ان کے نزدیک زیادہ صحیح روایت وہ ہے جس کو انہوں نے اختیار کیا ہے، اس کے معا بعد امام صاحب جو باب لائے ہیں وہ یہ ہے باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم شیخ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ بعض روایات کے مطابق عنوان اس طرح ہے باب الایمان و قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم مگر مختار اول ہے۔

اس باب میں امام بخاریؒ نے جو آیتیں نقل کی ہیں ان میں دوسرے آیت وَزِدْنَاهُمْ هُدًى کے متعلق شیخ دہلوی نے لکھا ہے کہ ''ہم کو کسی نسخہ میں اس آیت سے پہلے قال اللہ نہیں ملا، نیز بعض نسخوں سے یہ آیت ساقط ہے، اس صورت میں اس باب میں یہاں کل سات ہی آیتیں ہوں گی۔ (ص ۱۶ و ۱۷)

امام بخاریؒ نے بعض ابواب میں کوئی حدیث نہیں بیان کی ہے بلکہ چند آیتیں نقل کر دی ہیں مثلاً کتاب العلم کا پہلا باب فضل العلم (علم کی فضیلت) قائم کیا ہے اور اس میں دو آیتیں نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور کوئی حدیث نہیں درج کی ہے، شیخ نورالحق نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ زیر نظر باب میں ان کو اپنی شرائط کے مطابق کوئی حدیث نہیں ملی ہے، اس لیے انہوں بہتر یہی سمجھا کہ آیتوں کو نقل کر دیں کیوں کہ یہ سب سے بڑی دلیل اور صریح ثبوت ہیں۔ (ج ۱ ص ۴۰)

شکوک وشبہات کا جواب: اس سے پہلے اشکالات کے جواب دینے کا ذکر آچکا ہے، ذیل میں یہ دکھایا جائے گا کہ شیخ نورالحق نے شکوک وشبہات کا ازالہ کس طرح کیا ہے۔

منافقین کے استغفار کے مسئلہ پر بڑی مفصل بحث کر کے اس کے متعلق شکوک و شبہات کا جواب دیا ہے، پہلے وہ حدیث ملاحظہ ہو جس کے ضمن میں یہ بحث کی گئی ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ مجھے اپنی قمیص عطا کیجیے تا کہ میں اسے اپنے باپ کا کفن بناؤں اور ان کے جنازہ کی نماز پڑھیے اور ان کے لیے استغفار کیجیے چنانچہ آپؐ نے ان کو اپنی قمیص دے دی اور فرمایا کہ جنازہ تیار ہو جائے تو مجھے بتلانا تا کہ میں نماز پڑھوں، پس جب انہوں نے خبر دی اور آپؐ نے نماز کا ارادہ کیا تو حضرت عمرؓ نے آپؐ کا دامن کھینچ لیا اور کہا کہ اللہ نے آپؐ کو منافقین کی نماز پڑھنے سے منع نہیں کیا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ مجھے دونوں کا اختیار دیا گیا ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْلَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ (توبہ ۹:۸۰)

چنانچہ منافقین کے لیے استغفار کیجیے یا نہ کیجیے اگر آپ ان کے لیے ستر بار بھی استغفار کریں تو اللہ ہرگز ان کی مغفرت نہیں کرے گا۔

چنانچہ آپؐ نے ان کی نماز پڑھی جس پر یہ آیت نازل ہوئی:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓي اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰي قَبْرِهٖ ۭ (توبہ ۹:۸۴)

منافقین میں سے اگر کوئی مر جائے تو آپ کبھی بھی نہ اس کی نماز پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔

شیخ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے متعلق دل میں کچھ خلجان پیدا ہوتا ہے جس کو رفع کرنا ضروری ہے:

ابن ابی کے صاحبزادے اسلام کے مخلص وفدائی تھے، انہیں اپنے والد کے نفاق اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل اسلام سے ان کی شدید عداوت کا علم تھا، ان کو اہل نفاق کی تکفیر وتقبیح اور سوئے عاقبت سے متعلق نصوص سے بھی پوری واقفیت تھی، اسی بنا پر جب ان کے کانوں میں ان کے والد کے یہ الفاظ پڑے کہ ''ہم جیسے ہی مدینہ پہنچیں گے تو ہم عزت والے لوگ ان ذلیل وخوار لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کریں گے'' تو برسرراہ انہوں نے

باپ کو پکڑا اور تلوار کھینچ لی کہ آپ یہ کہیے کہ ہم جیسے لوگ ذلیل وخوار ہیں اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی تمام لوگوں سے زیادہ معزز و برتر ہیں، اگر آپ یہ نہیں کہیں گے تو اسی تلوار سے آپ کا سر آپ کے تن سے جدا کر دوں گا، چنانچہ جب تک ان سے اس کا اقرار نہ کرالیا انہیں نہیں چھوڑا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس منافق کے حال سے قطعی طور پر واقف تھے، اس کے باوجود آپؐ نے کس طرح اس کے لیے درخواست کو منظور کر لیا جب کہ اس کے پہلے ابو طالب کی وفات کے بعد مکہ ہی میں یہ آیت نازل ہو چکی تھی کہ:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ (توبہ ۹:۱۱۳)

نبی اور مسلمانوں کے لیے زیبا نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لیے استغفار کریں۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب تھے، آپؐ عربی زبان کے استعمال کے سب سے بڑھ کر عارف اور اللہ کی مراد ومنشا کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے، ایسی صورت میں اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سے استغفار وعدم استغفار میں تخییر کا مفہوم آپؐ نے کیسے سمجھ لیا، مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں مراد اس برابری سے ہے جو ان دونوں امور کے غیر مفید ہونے میں ہے جیسا کہ آیت میں بتصریح کہا گیا ہے کہ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (اگر ان آپؐ ان کے لیے ستر بار بھی استغفار کریں گے تو بھی اللہ ان کی مغفرت نہیں کرے گا۔)

شیخ فرماتے ہیں کہ قسطلانی نے خلجان کو دور کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارا ہے، ہم اس کے بعض مقدمات کو جو اس وقت ذہن میں اور نوک قلم پر آرہے ہیں اللہ کی توفیق سے قلم بند کرتے ہیں:

ابن ابی کی ظاہری حالت اہل اسلام کے [illegible] تھی اور ان کے صاحبزادے

راسخ العقیدہ مسلمان تھے، ان کو اپنے والد کے عام حالات کی وجہ سے ایک طرح کی پشیمانی اور ندامت رہتی تھی، انہی احساسات وجذبات نے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی خواہش کے اظہار پر آمادہ کیا ہوگا کہ آپ کے ظاہری و باطنی برکات ایمانی اور مغفرت کی دعا سے ان کے والد محروم نہ رہیں، عبدالرزاق نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ خود ان کے والد نے انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ التماس کرنے کے لیے بھیجا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بندگان خدا سے شدید محبت ورافت کی بنا پر ان کی ہدایت کے نہایت حریص اور مشتاق رہتے تھے، نیز آپ کو ابن ابی کے صاحبزادے سے بڑا تعلق خاطر بھی تھا اس لیے آپ تشریف لے جانے کے لیے تیار ہو گئے اور ان کے صاحبزادے سے فرمایا کہ یہودی کی محبت نے تجھے ہلاک کیا، انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول میں تو فرستادہ ہوں، آپ میری خاطر استغفار فرمادیجیے اور اپنا پیراہن مبارک کفن کے لیے عطا کیجیے اور میری سرزنش نہ کیجیے، فتح الباری میں اس حدیث کو مرسل مگر اس کے تمام رجال کو ثقہ کہا گیا ہے، اس کی تائید طبرانی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو حضرت ابن عباسؓ کے واسطہ سے مروی ہے کہ جب ابن ابی بیمار ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھ پر احسان کیجیے، میری تکفین کے لیے اپنا پیراہن عطا کیجیے اور میری نماز جنازہ ادا کیجیے۔

شیخ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان کی ان گزارشات نے ان کی موت کے بعد ان کے لڑکے اور خاندان والوں کے شرم وعار کو ختم کر دیا، کیوں کہ انہوں نے اخبات وانقیاد کا ارادہ کیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ ظاہری حالات دیکھ کر ان کی جانب رغبت ہوگئی مگر جب یہ وحی نازل ہوئی کہ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا تو آپ کو تنبہ ہوا اور آپ پر سارے حالات منکشف ہو گئے، قسطلانی کے خیال میں اس واقعہ کے تعلق سے یہ بہترین جواب ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس وقت حضرت عباسؓ کو غزوۂ بدر میں برہنہ قیدی بنا کر

لایا گیا اور کوئی کپڑا موجود نہ تھا جوان کی قامت پر راست آتا تو عبداللہ بن ابی نے جوان کا ہم قامت تھا انہیں اپنا کپڑا پہنایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بدلے میں اپنا پیراہن اس کو دیا تاکہ منافق کا کوئی احسان آپ پر نہ رہ جائے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی شخص بھی سوال کرتا تھا تو آپ انہیں نہ کہتے تھے اور یہاں تو سوال کرنے والے ایک مخلص مسلمان تھے، پھر پیراہن دینے میں بخل سے کام لینا آپؐ کے کرم وسخاوت کے منافی تھا، اس لیے آپ کو پیراہن دینے میں تامل نہیں ہوا، چنانچہ جو آیت بعد میں نازل ہوئی اس میں آپ کے پیراہن کی بخشش کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ آیت کریمہ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ الخ اس واقعہ سے پہلے نازل ہوئی ہے اور اس میں نماز جنازہ کے بجائے صرف استغفار کی ممانعت ہے تو اوپر بیان کی گئی توجیہ سے خلجان کیسے دور ہوسکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں اس استغفار سے منع کیا گیا ہے جس کی اجابت کی امید ہو اور جو واقعتاً تحصیل مغفرت کی غرض سے کیا گیا ہو، حضرت ابوطالب کے معاملہ میں آپ نے اسی لیے استغفار کیا تھا لیکن اس منافق کے لیے آپ نے جو استغفار کیا تھا اس کا مقصد یہ نہیں تھا، بلکہ یہ اس کے صاحبزادے اور اہل خاندان کی تالیف قلب اور دل جوئی کے لیے کیا تھا، روایت کی گئی ہے کہ اس کریمانہ خلق نبویؐ کا مشاہدہ کر کے خزرج کے ایک ہزار آدمی ایمان سے مشرف ہو گئے تھے اور انہوں نے کہا کہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لطف وکرم اور دعا و استغفار کا یہ حال ایک ایسے شخص کے ساتھ جو زبان سے تو ایمان ظاہر کرتا ہے لیکن اندر سے اس کے برعکس تھا تو جن کا ظاہر و باطن یکساں اور جو واقعی ایمان و اسلام میں مخلص ہوں ان کے ساتھ آپ کا برتاؤ کتنا عمدہ اور اچھا ہوگا۔

جواب میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے اس کی نماز اس لیے پڑھی تھی کہ آپ امت کو یہ تعلیم دینا چاہتے تھے کہ احکام شرع ظواہر حال پر مترتب ہوتے ہیں، چنانچہ جس

نے اقرار شہادت کر لیا اس پر باتفاق احکام جاری ہوں گے، رہی آیت لَا تُصَلِّ عَلٰی اَحَدٍ (الخ) جو اس واقعہ کے بعد نازل ہوئی تو یہ ان منافقین کے لیے مخصوص ہے جن کے کفر کا یقین آپ کو اللہ تعالیٰ کے خبر دے دینے کی وجہ سے ہو گیا تھا۔

آگے شیخ نور الحق نے آیت استغفار سے آنحضرتؐ کے تخییر کا مفہوم لینے پر جس تردد اور خلجان کا اظہار کیا گیا ہے اس کا جواب دیا گیا ہے مگر یہ جواب خود ان کے نزدیک بھی شافی اور دشواری سے خالی نہیں ہے۔

اس طرح کے شکوک وشبہات کا جواب انہوں نے اور جگہوں پر بھی دیا ہے، مثلاً کتاب الایمان کے باب علامات المنافق میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ منافق کی تین علامتیں ہیں: ۱۔ جب کوئی بات کرے تو جھوٹ کہے ۲۔ وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے ۳۔ جب کوئی امانت سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

شیخ نور الحق اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ اوصاف بد تو مومنین میں بھی پائے جاتے ہیں، پس ان کو نفاق کی علامت کیسے مانا جائے، اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ان اوصاف بد کو اپنی عادت بنا لیں اور یہ حالات ان کے لوازم میں داخل ہو جائیں وہ مخلص مومن نہیں ہیں بلکہ پکے منافق ہیں جیسا کہ دوسری حدیث اس مفہوم میں بالکل صریح ہے۔

یہ جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ یہ عادتیں نفاق کی علامت ہیں جس شخص میں یہ جمع ہو جائیں ظاہر حکم کے مطابق اس کے اندر نفاق کی علامتیں جمع ہو گئیں، رہی دل کی تصدیق تو اس کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ نفاق سے عمل میں نفاق مراد ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ لغت میں باطن سے ظاہر کی مخالفت کا نام نفاق ہے، اگر یہ مخالفت ایمان و عقیدہ میں ہو تو اسے نفاق کفر کہا جائے گا، ورنہ یہ نفاق عمل کہلائے گا، اس کے معنی یہ ہوئے کہ عمل عقیدہ کے مطابق نہیں ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حدیث کسی خاص اور متعین

شخص کے بارے میں ہے جو منافقین کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ اشارہ و کنایہ میں گفتگو کرتے تھے، مثلاً فرمایا ما بال اقوام یا اسی طرح کے اور فرمودات بھی ہیں، یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ جس طرح اخلاص کے مقامات و درجات ہیں اسی طرح اس کے مقابل نفاق کے بھی مراتب و درجات ہیں، چونکہ ان صفات کے ہوتے ہوئے آدمی کمال اخلاص کے مرتبہ پر نہیں پہنچ سکتا اور جب ان مذموم باتوں میں وہ بہت آگے نکل جائے گا تو منافق کہلائے گا، اسی کی طرف حدیث نافق حنظلة الخ میں بھی اشارہ ہے۔ (جلد اول، ص ۲۷)

اصول و مصطلحات حدیث کی تشریح: شیخ نورالحق نے جا بجا احادیث کے اصول و مصطلحات پر بھی بحث و گفتگو کی ہے، یہاں ہم بعض مثالوں سے اس کو واضح کریں گے، محدثین کی ایک اصطلاح متابعت ہے، اس کے متعلق شیخ کی وضاحت کو سمجھنے کے لیے یہ پس منظر پہلے جان لینا چاہیے۔

امام بخاریؒ نے کتاب کے پہلے باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم میں جو تیسری حدیث نقل کی ہے اس کی سند ملاحظہ ہو:

"حدثنا یحیٰ بن بکیر قال اخبرنا اللیث عن عقیل بن شهاب عن عروة بن الزبیر عن عائشة ام المومنین رضی اللہ عنها انها قالت اول ما بدیٔ به رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من الوحی الخ

حدیث کو ختم کرنے کے بعد امام بخاری فترة الوحی کے متعلق ابن شہاب کے واسطہ سے جابر بن عبداللہ انصاری کی حدیث کے بعض حصے نقل کر کے لکھتے ہیں:

تابعه عبدالله بن یوسف و ابو صالح عبداللہ بن یوسف اور ابو صالح نے یحیٰ بن بکیر کی متابعت کی ہے۔

پھر لکھتے ہیں:

وتابعه هلال بن رداد عن الزهری زہری سے روایت کرنے میں عقیل کی متابعت ہلال بن رداد نے کی ہے۔

اس کے بعد شیخ نورالحق کی تقریر ملاحظہ ہو:

''اہل حدیث کی اصطلاحات میں ایک متابعت بھی ہے، مصنف نے اپنی جامع میں سے اکثر تعرض کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ راوی نے ایک روایت اپنے شیخ سے کی اور اسے کسی دوسرے شخص سے بھی بیان کیا جس نے اس کے شیخ کے شیخ سے اسی کو روایت کیا ہے، اب اگر یہ دوسرا راوی معتبر ہے اور صحابی تک اس کی سند کے تمام رواۃ متفق علیہ ہیں تو اس قسم کو متابعت تامہ (مکمل متابعت) کہتے ہیں، مثلاً امام بخاری نے اس روایت کو یحییٰ کے واسطہ سے بیان کیا ہے اور انہوں نے اسے لیث کے واسطہ سے بیان کیا ہے اور اس کی تائید عبداللہ و ابوصالح کی روایت سے کی ہے جو معتبر و متفق علیہ ہیں، متابعت کی دوسری قسم یہ ہے کہ جو راوی اس کی روایت کی تائید کرتا ہے وہ شیخ کے شیخ سے روایت کرنے میں اوپر کے راوی کا شریک ہے، اس کو متابعت ناقصہ کہتے ہیں، اگر یہ دور تر ہو تو متابعت انقص کہلائے گی، اس اعتبار سے کہ بعض رجال نے اس کی عدم موافقت کی ہے جیسا کہ مصنف نے دوسری بار اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ عقیل کی متابعت ہلال بن رداد نے کی ہے، یعنی جس طرح عقیل نے ابن شہاب سے روایت کی ہے جو تابعی ہیں، اسی طرح ان سے ہلال بن رداد نے بھی کی ہے اور چونکہ ہلال و عقیل دونوں ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں، اسی لیے بلاشبہ ہلال کی روایت عقیل کی روایت کی متابع ہوئی۔

متابعت میں بعض لوگوں نے یہ شرط بھی عائد کی ہے کہ متابعت

کرنے والے دونوں افراد کے متن کو لفظاً متحد ہونا چاہیے مگر کچھ لوگ
صرف معنی کے اتحاد کو کافی سمجھتے ہیں، متابعت کے شاہد کے نام سے بھی
موسوم کیا جاتا ہے۔'' (جلداول، ص۱۱۰)

محدثین کی ایک اصطلاح تعلیق ہے جس کی مثالیں صحیح بخاری میں بکثرت ملتی ہیں، شارح نے کہیں کہیں اس کی نشاندہی کی ہے، مثلاً کتاب الایمان میں باب الصلوٰۃ من الایمان (نماز ایمان میں شامل ہے) کا باب باندھا ہے اور اس میں جو حدیث نقل کی ہے اس کے خاتمہ سے قبل لکھا ہے ''قال زهير حدثنا ابو اسحاق عن البرانی حدیثه هذا'' اور اس کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ مقولہ بھی اسی حدیث کا جز ہے جو سند مذکور سے وارد ہے مگر ان کے نزدیک اس کا احتمال بھی ہے کہ مصنف اسے زہیر کے واسطے سے بطریق تعلیق لائے ہوں۔ (ج۱، ص۳۰)

ایک جگہ تعلیق کی نشاندہی کر کے اس کا مفہوم مثال سے واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تعلیق کا مطلب ہے کہ راوی حدیث کو ایسے شخص کی طرف
منسوب کرے جس کا زمانہ اسے نہ ملا ہو، چنانچہ امام بخاریؒ نے حدیث
مذکور کی طرف دو دیگر طرق سے جو کہ تعلیقات میں ہیں اشارہ کیا ہے، جیسے
ابومعاویہ نے ۱۹۵ھ یا ۱۹۴ھ میں وفات پائی اور عبدالاعلیٰ نے ۱۸۹ھ میں
جب کہ امام بخاری کی ولادت ۱۹۴ھ میں ہوئی۔'' (جلد۱، ص۱۹)

ایک جگہ وہ امام بخاری کے اس طریقہ تخریج کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی حدیث کو متعدد ابواب میں اس بنا پر لاتے ہیں کہ ہر باب سے اس کی مناسب جزء ہوتی ہے، محدثین کی اصطلاح میں ایک ہی متن اگر متعدد طرق سے آئے اور ایک راوی بھی اس کی پوری سند میں متغائر ہو تو اسے دو حدیث کہا جائے گا، یہ حدیث اسی قبیل سے ہے جس کو مؤلف نے ایک بار قتیبہ اور انہوں نے اسماعیل کے واسطے سے بیان کیا ہے اور دوسری مرتبہ

خالد سے جو اسے سلیمان سے بیان کرتے ہیں لائے ہیں۔

کہیں کہیں ان حدیثوں کو جنہیں امام بخاری نے بلا سند نقل کیا ہے، شیخ نور الحق نے بتایا ہے کہ انہیں کس مصنف نے سنداً نقل کیا ہے، مثلاً کتاب الایمان کے پہلے باب کی اس حدیث **الحب فی اللہ والبغض فی اللہ عز وجل من الایمان** (اللہ کے لیے حب وبغض ایمان میں داخل ہے) کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''مصنف اس حدیث کو سند کے لائے بغیر لائے ہیں لیکن ابوداؤد نے اسے ابوامامہ کے واسطہ سے اور امام ترمذی نے معاذ بن جبلؓ کے واسطے سے بیان کیا ہے۔'' (جلد ۱ص ۱۷)

شارح نے سلسلۂ سند میں مذکور عطف ومعطوف کی وضاحت کی ہے، مثلاً کتاب الایمان کے باب **من الایمان ان یحب لاخیه ما یحب لنفسه** (ایمان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے) کی پہلی سند یہ ہے **حدثنا مسدد قال حدثنا یحی عن شعبة عن قتادة عن انس عن النبی صلی اللہ علیه وسلم وعن حسین المعلم** ''**حدثنا قتادة عن انس عن النبی صلی اللہ علیه وسلم**'' اس میں شیخ نور الحق وعن الحسین المعلم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ظاہر ہے کہ اس کا عطف شعبہ پر ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ یحییٰ کو یہ حدیث دو شیوخ شعبہ وحسین المعلم سے پہنچی ہے اور یہ دونوں حضرات اسے قتادہ سے بیان کرتے ہیں مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا عطف حدثنا مسدد پر ہے، اس طرح یہ حدیث تعلیق کے قبیل کی ہوگی۔ (جلد ۱ص ۱۹، ۲۰)

امام بخاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی وہ حدیث کا متن پہلے بیان کرتے ہیں، اس کے بعد اس کی سندوں کو لاتے ہیں، اس سے ان کا مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ حدیث کی سندیں ضعیف ہیں، مثلاً کتاب العلم کے باب کا عنوان یہ ہے ''**من خص بالعلم**

قوما دون قوم کراھیة ان لا یفھموا ''(جو شخص علم کے معاملہ میں تخصیص سے کام لے اور کچھ لوگوں کو اس سے واقف کرے اور کچھ لوگوں کو اس اندیشہ سے مطلع نہ کرے کہ وہ اسے نہ سمجھنے کی وجہ سے گمراہی میں پڑ جائیں گے)امام بخاری نے اس میں پہلے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

حدثوا الناس بما یعرفون اتحبون ان یکذب اللّٰہ ورسولہ	لوگوں سے وہی باتیں بیان کرو جن سے وہ مانوس اور واقف ہوں اور وہ ان کی فہم سے بالا نہ ہوں ، کیا تم لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کا جھٹلایا جانا پسند ہے۔

اس کے بعد وہ اس کی یہ سند بیان کرتے ہیں ''حدثنا عبید اللّٰہ بن موسی عن معروف بن خربوذ عن ابی الطفیل عن علی رضی اللّٰہ عنہ بذلک۔''

اس کے متعلق مولانا نور الحق تحریر فرماتے ہیں:

''مصنف حدیث مذکور کا متن اس کی سند سے پہلے لا کر یہ متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی سند میں ضعف ہے، ابن معین نے خربوذ کو ضعفا میں شمار کیا ہے، بعض حدیثوں کو انہوں نے ابواب کا عنوان قرار دیا ہے، گو یہ صحیح ہیں مگر ان کی سندیں امام بخاری کی شرطوں کے مطابق نہیں ہیں ، اس لیے انہیں بھی اسی انداز پر لائے ہیں ، یہ حدیث اور اس کی سندیں اسی نوعیت کی ہیں۔'' (جلد اول،ص ۶۸)

بعض جگہ راویوں کے کچھ اہم خصوصیات بھی شیخ نور الحق نے بیان کیے ہیں، مثلاً کتاب الایمان کے باب المعاصی من امر الجاھلیة ولا یکفر صاحبھا(ص ۲۵) کے ضمن میں حضرت ابوذرؓ کے بارہ میں لکھتے ہیں:

''وہ اکابر صحابہ میں تھے اور ان کا مسلک یہ تھا کہ ضرورت سے زیادہ

مال واسباب کا ذخیرہ کرنا حرام ہے۔'' (ج۱،ص۲۶)

آگے چل کر ایک راوی ابوبکرہؓ کے متعلق رقم طراز ہیں ''یہ بھی صحابی ہیں اور مصنف نے ان سے چودہ حدیثیں روایت کی ہیں۔'' (ایضاً)

زبان کے اسلوب، بلاغت اور عربیت کے مباحث: شیخ نورالحق عربی زبان وادب کے بھی ماہر تھے، اس لیے اس شرح میں جا بجا زبان کے اسلوب واستعمال اور بلاغت وعربیت کے نکتوں کو بھی واضح کرتے گئے ہیں جیسے کتاب الایمان کے باب اذا لم یکن الاسلام علی الحقیقة میں حضرت سعدؓ کے واسطہ سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس میں یہ الفاظ وارد ہیں:

ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو
اعطی رھطا و سعد جالس	عطا کیا اس حال میں کہ سعد بھی بیٹھا ہوا تھا۔

شیخ نورالحق فرماتے ہیں کہ سعدؓ جالس'' خود حضرت سعد کا قول ہے، اپنے آپ کو اس طرح ذکر کرنا اور اپنے نام کی صراحت کرنا بطریق التفات ہے۔ (ص۲۴)

تَرِبَتْ یَمِیْنُکَ کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ عربوں کا مالوف طریقۂ استعمال ہے، اس سے مقصود بددعا نہیں بلکہ یہ اسلوب زجر کے لیے آتا ہے۔ (ج۱،ص۶۹)

ابواب الاستسقا کے باب ماقیل فی الزلازل و الآیات میں ایک فقرہ یتقارب الزمان آیا ہے، یعنی قیامت نہ ہوگی یہاں تک کہ زمانہ نزدیک ہونے لگے، اس کے متعلق شیخ نورالحق لکھتے ہیں:

> ''تقارب زمانہ کنایہ ہے بے برکتی و بے فیضی اور اس بات سے کہ لوگ اچھے کاموں سے بے بہرہ ہو جائیں گے، یہ کثرت ہموم اور بہت زیادہ حوادث وشدائد سے بھی کنایہ ہو سکتا ہے......اور یہ جو جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے کہ سال جب ماہ اور ماہ ہفتہ اور ہفتہ دن

اور دن گھنٹہ اور گھنٹہ لحظہ کی طرح ہو جائے تو یہ بھی اسی معنی میں ہے لیکن حقیقت پر اسے محمول کرنا خفا سے خالی نہیں ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ تقارب زماں سے رات اور دن کا برابر ہونا مراد ہے، یعنی دنیا کے آخری دور میں روز و شب میں یہ تفاوت نہ ہوگا اور اس کی کثرت آخرت کی علامتوں میں سے ہے، بعض لوگوں کے نزدیک اس سے مراد دنیا کی مدت کا آخر ہونا ہے۔

کتاب الایمان کی ایک حدیث میں ہے کہ چار باتیں جس کے اندر ہوں وہ خالص منافق ہوگا یعنی اس کے اندر ایمان کی خو بو نہ ہوگی، شیخ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ بظاہر آپ کا یہ ارشاد تہدید و تشدید کے لیے آیا ہے ورنہ اہل ایمان کا حال سخت دشوار ہو جائے۔'' (ص ۲۸)

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ شیخ نے کہیں کہیں لفظوں کی تحقیق بھی کی ہے جس میں ان کے معنی بتانے کے علاوہ ان کے اعراب و حرکات کی وضاحت کی ہے اور جن لفظوں کی روایت یا ان کے معنی میں اختلاف ہے ان میں مرجح کی تصریح کی ہے، مثلاً باب بدء الوحی میں لفظ ''بدء'' کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''بدء میں با موحدہ پر فتحہ اور دال مہملہ پر سکون ہے اور آخر میں ہمزہ جس کے معنی آغاز کے ہیں اور بُدُوّ کے آخر میں واو ہے جو مشدد ہے اور با و دال دونوں مضموم ہیں، اس کے معنی ظہور کے ہیں، بدء کے علاوہ بدو کی روایت بھی کی گئی ہے لیکن مشائخ سے مسموع بدء ہے۔'' (جلد ۱، ص ۶)

ایک ہی مشتق سے بنے ہوئے لفظوں کی حقیقت و خصوصیت بیان کر کے ان کا فرق واضح کیا ہے، مثلاً رویا کے متعلق لکھتے ہیں:

''رؤیا کا لفظ رجعی کی طرح مصدر ہے جو خواب میں دیکھنے کے لیے مخصوص ہے جس طرح رائی دل کے دیکھنے کے لیے اور رؤیت آنکھ سے

دیکھنے کے لیے مخصوص ہے۔" (ج۱،ص ۷)

ناموس اور جاسوس کے معنی کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اول الذکر حضرت جبریلؑ سے کنایہ اور لغت میں صاحب سر خیر (اچھے رازدار) کے لیے آتا ہے جس طرح جاسوس صاحب سر شر (برے رازدار) کے لیے مخصوص ہے۔" (ج۱،ص۹)

جنائز کے بارے میں لکھتے ہیں "یہ جنازہ کی جمع ہے جس کی جیم پر فتحہ اور کسرہ دونوں آتا ہے اور یہ اس مردہ کو کہتے ہیں جو نعش کے اندر ہو، دوسرا قول یہ ہے کہ جب جیم مفتوح ہو تو اس سے مردہ مراد ہوتا ہے اور مکسور کی صورت میں اس سے وہ نعش مراد ہے جس میں میت ہو، بعض لوگوں نے اس کے برعکس کہا ہے، یعنی مفتوح سے نعش اور مکسور سے میت مراد ہے۔

لفظ "عصابہ" کے متعلق لکھتے ہیں کہ "عین مکسور ہے اور اس کا اطلاق ۱۰ سے ۴۰ افراد پر ہوتا ہے، اس لفظ کا واحد نہیں آتا۔" (۲۱)

اسی طرح شہروں اور پہاڑوں وغیرہ کے ناموں کے تلفظ و اعراب بتائے ہیں اور کہیں کہیں نحوی وصرفی بحثیں کی ہیں، نیز معطوف علیہ اور معطوف کی تعیین کی ہے۔

مقدمہ میں شیخ نورالحق نے ان کتابوں کے نام بھی لکھے ہیں جو ان کا ماخذ رہی ہیں اور جن کا ذکر اس تذکرہ کی ابتدا میں ہو چکا ہے، ان کے علاوہ انہوں نے اپنے والد بزرگوار شیخ عبدالحق کی شروح وتحقیقات سے بھی بڑا استفادہ کیا ہے، ان کتابوں میں فتح المنان اور شرح سفر السعادۃ کے بکثرت حوالے دیے ہیں۔

☆☆☆

شیخ نوراللہ

یہ شیخ نورالحق بن شیخ عبدالحق کے اکلوتے بیٹے تھے، ان کے چار بیٹے ہوئے، سیف اللہ، علیم اللہ، محب اللہ اور جار اللہ۔(۱)

ان کے مزید حالات نہ معلوم ہو سکے، البتہ بعض بیٹوں کے بارے میں کچھ معلومات درج کیے جاتے ہیں۔

شیخ سیف اللہ

یہ شیخ نوراللہ کے بیٹے، شیخ نورالحق کے پوتے اور شیخ عبدالحق کے پڑپوتے تھے جو عہد عالمگیری کے ممتاز اور جید عالم تھے، ان کو حدیث وفقہ میں عبور تھا، ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء میں شمائل النبی کی ایک شرح فارسی زبان میں لکھی جس کا نام اشرف الوسائل فی شرح الشمائل ہے۔(۲)

شرح مکمل کرنے کے بعد مصنف نے اسے اورنگ زیب عالمگیر کو پیش کیا تھا۔(۳)

شیخ محب اللہ

یہ بھی شیخ نوراللہ کے بیٹے اور شیخ نورالحق بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے پوتے اور علم فضل میں فائق و برتر تھے، انہوں نے منبع العلم کے نام سے صحیح مسلم کی ایک شرح لکھی تھی

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۵۵۔(۲) نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۰۲۔(۳) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۶۱ حاشیہ۔

مگر آخر عمر میں شروع کرنے کی وجہ سے وہ اس پر نظر ثانی نہیں کر سکے تھے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے یہ کتاب کتب خانہ مولوی انوار الحق میں موجود تھی مگر اس کے بعد مفقود ہوگئی۔(۱)

شیخ محب اللہ کے دو بیٹے ہوئے جن کا ذکر آگے آرہا ہے، شیخ نور اللہ کے اور بیٹوں سے بھی ان کی بڑھی اور پھلی پھولی۔

حافظ فخر الدین

ان کا نام عبدالصمد اور کنیت ابوالمکارم تھی، یہ شیخ نور الحق کے پڑپوتے تھے، شجرۂ نسب اس طرح ہے:

''فخر الدین بن محب اللہ بن نور اللہ بن نور الحق بن عبدالحق۔''

شیخ فخر الدین کو اپنے والد سے فخر تلمذ حاصل ہوا جو اپنے دادا شیخ نور الحق کے براہ راست شاگرد تھے، شیخ فخر الدین نے اپنے والد ہی سے صحاح ستہ کا درس لیا تھا اور ان کو حدیث میں کامل دستگاہ تھی۔(۲)

شیخ فخر الدین کے بعد کی نسل کا ذکر آگے آئے گا، ان کی تصنیفات کے نام یہ ہیں:

۱۔شرح صحیح مسلم: اوپر گزر چکا ہے کہ ان کے والد نے منبع العلوم فی شرح صحیح مسلم کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اس پر وہ نظر ثانی نہیں کر سکے تھے، اس لیے وہ غیر مرتب و غیر مدون تھی، حافظ فخر الدین نے اسے از سر نو مرتب کر کے اس میں مناسب ردو بدل اور حذف و اضافہ کیا، وہ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''والد نے یہ کتاب اپنی عمر کے آخری ایام میں لکھی تھی جس پر وہ نظر ثانی نہیں کر سکے تھے، اس لیے میں نے اس پر نظر ثانی کی اور مناسب

---

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۶۱ بحوالہ مرآۃ الحقائق، ص۱۱۵۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج۶، ص۲۱۸۔

ترمیم واضافہ کیا۔''(۱)

کتب خانہ خدابخش پٹنہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔(۲)

۲۔شرح عین العلم: یہ محمد بن عثمان بلخی کی تصنیف عین العلم کی فارسی شرح ہے، اس میں بحث کا دارومدار قرآن مجید اور احادیث نبوی کو بنایا گیا ہے، اول الذکر کے لیے ق اور مؤخر الذکر کے لیے ح کے رموز استعمال کیے گئے ہیں، شیخ فخر الدین کا بیان ہے کہ:

''شیخ عبدالحق نے اپنے وصایا میں تحریر فرمایا ہے کہ عین العلم کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے اور سفر وحضر میں کبھی اپنے سے دور نہ کیا جائے، اس لیے بچپن ہی سے میں اس کا شیفتہ رہا اور وہ ہمیشہ میرے مطالعہ میں رہی، اب فارسی کا رواج ہے اس لیے عربی سے ہر شخص استفادہ نہیں کرسکتا، اس بنا پر عام فائدہ کے لیے اس کی شرح فارسی میں لکھی۔''(۳)

شرح میں حدیث روایت کرنے والے صحابیوں کے ناموں کے ساتھ ان کتابوں کے نام بھی دیے گئے ہیں جن میں یہ احادیث درج ہیں، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ پٹنہ میں ہے۔(۴)

۳۔شرح حصن حصین: یہ علامہ جزری کی مشہور ومقبول کتاب حصن حصین کی فارسی شرح ہے جو مطبع نولکشور سے چھپ چکی ہے۔(۵)

☆☆☆

---

(۱) علم حدیث میں برعظیم پاک وہند کا حصہ، ص۱۸۵و۱۸۶۔(۲) مقالات سلیمان، ج۲،ص۲۴۔(۳) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۲۸و۲۲۹ بحوالہ قلمی نسخہ، کتب خانہ خدابخش۔(۴) محبوب الالباب، ص۴۳۹۔(۵) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۶۲، ان سب کتابوں کا ذکر نزہۃ الخواطر، ج۶،ص ۲۱۸، حدائق الحنفیہ، ص۴۶۸ اور تذکرہ علمائے ہند، ص۷۶ پر بھی ہے۔

شیخ نورالحق ثانی

یہ بھی شیخ محب اللہ کے بیٹے اور حافظ فخر الدین کے بھائی تھے، گویا شیخ نوراللہ کے پوتے اور شیخ نورالحق بن عبدالحق اول کے پڑپوتے تھے، انہوں نے اپنے والد سے تحصیل علم کی تھی اور تبحر عالم، مفتی اور فقیہ تھے۔

شیخ عبدالحق کی عربی تصنیف ماثبت بالسنة فی ایام السنة کی شرح فارسی میں لکھی تھی (۱) ان کے ایک بیٹے محب اللہ سے ان کی نسل کو فروغ ہوا۔

حافظ محمد محسن دہلوی اور شیخ محمد احسان

(المتوفی ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ء) ...... (المتوفی ۱۲۴۷ھ/۱۷۳۴ء)

ان دونوں کا تعلق بھی خانوادۂ حقی سے تھا، اول الذکر کو صاحب نزہۃ الخواطر نے شیخ عبدالحق کے اسباط (۲) (نواسوں) اور دوسروں نے اولاد (۳) و احفاد (۴) میں بتایا ہے، یہ عالم و فقیہ تھے، ارباب تذکرہ نے جامع منقول میں لکھا ہے (۵) کہ ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی اور یہیں نشو و نما بھی ہوئی، خواجہ محمد معصوم بن شیخ احمد سرہندی سے خلافت پائی، خواجہ کی خدمت میں مدت دراز تک رہنے کی بنا پر مجددی و نقشبندی کی نسبتوں سے مشہور ہوئے (۶) مفتی غلام سرور کا بیان ہے:

"حافظ محمد محسن نے پہلے علوم ظاہری کی تحصیل کی اور اس میں نہایت

---

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۳۸۹، اصل کتاب کا اردو ترجمہ بھی ۱۳۰۹ھ اور ۱۳۲۶ھ میں چھپ گیا ہے جو کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے، فہرست، ج ۱، ص ۵۰ و ۵۱ و فہرست، ج ۳، ص ۲۶۲ و ۲۶۳۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۴۷، (۳) خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۶۶۴۔ (۴) تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۲۔ (۵) ایضاً۔ (۶) ایضاً۔

بلند پایہ اور صاحب کمال ہوئے، دہلی میں کوئی ان کا ہمسر اور ہم پایہ نہ تھا،
اس کے بعد ہدایت ربانی کی کشش سے شیخ محمد معصوم کی خدمت میں
باریاب ہوئے اور علوم باطنی سے مالا مال ہوئے، طریقہ عالیہ مجددیہ میں
کامل و مکمل ہونے کے بعد خرقۂ خلافت پہنا، ورع وتقویٰ اور زہد وریاضت
میں یکتائے روزگار تھے۔"(۱)

شیخ نور محمد بدایونی اور دوسرے حضرات نے ان سے کسب فیض کیا (۲) ۱۱۴۷ھ میں وفات پائی۔ (۳)

شیخ محمد احسان: شیخ محمد محسن کے صاحبزادے اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے کبار خلفا میں تھے، اوائل عمر میں منحرف العقیدہ اور صراط مستقیم سے روگرداں تھے، پھر حضرت میرزا مظہر جان جاناں کی توجہ و برکت سے توبہ وانابت کی توفیق ملی اور اپنی غیر معمولی استقامت اور ثابت قدمی سے اس راہ میں بڑی ترقی کی اور سلسلۂ مجددیہ نقشبندیہ میں بلند مقامات پر فائز ہوئے۔

غایت محبت کی وجہ سے جس وقت اللہ کا نام شیخ محمد احسان کے حق نیوش کانوں میں پڑتا تو بے ہوش ہو جاتے، ان کے مرشد حضرت مظہر جان جاناں فرماتے ہیں:

"احمد شاہ درانی کی غارت گری کے زمانہ میں میں شیخ محمد احسان
اپنے کوچہ کے دروازہ پر پوری ہمت وبہادری سے بیٹھے اور جمے رہے، اللہ
کے فضل سے کوئی غارت گر اس کوچہ میں نہیں آیا اور تمام اہل کوچہ کا جان و
مال سلامت رہا، شیخ محمد احسان کی وفات ۱۲۰۶ھ میں ہوئی۔"(۴)

☆☆☆

(۱) خزینۃ الاصفیا، ج ۱ص ۶۶۴۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۴۷۔ (۳) ایضاً وتذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۲ وخزینۃ الاصفیا، ج ۱ص ۶۶۵۔ (۴) خزینۃ الاصفیا، ج ۱ص ۶۸۸۔

شیخ الاسلام محمد

یہ حافظ فخر الدین کے فرزند تھے، انہی سے تحصیل علم کی اور صحاح ستہ نیز دوسری کتب حدیث کی اجازت پائی، شیخ الاسلام کو علمی فضیلت کے ساتھ دینی وجاہت بھی حاصل تھی، محمد شاہ کے عہد میں صدر الصدور کے منصب پر فائز تھے (۱) جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تھا تو وہ شاہجہاں آباد (دہلی) میں مقیم تھے (۲) یہ بڑا پر آشوب دور تھا، سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں کی شورش نے قیامت بپا کر رکھی تھی، اسی زمانہ میں وہ بخاری کی شرح تحریر فرما رہے تے، انہوں نے شرح کے نصف اول کے آخر میں اپنے زمانہ کے ابتر حالات کا بڑے دکھ سے ذکر کیا ہے۔

شیخ سلام اللہ رامپوری شیخ الاسلام کے فرزند تھے، ان کا ذکر آگے ہوگا۔

تصانیف: شیخ الاسلام کی تصانیف یہ ہیں:

۱۔ **رسالہ کشف الغطا عما لزم للموتی علی الاحیاء:** اس میں تجہیز و تکفین سے متعلق امور کا ذکر ہے، یہ دہلی سے طبع ہو چکی ہے۔ (۳)

۲۔ **رسالہ طرد الاوھام عن اثر الامام الھمام:** امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے اثبات پر ہے۔ (۴)

(۱) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۳۰ بحوالہ خاتمہ شرح بخاری، جلد چہارم بر حاشیہ تیسیر القاری۔

(۲) مقالات سلیمان، جلد ۲، ص ۲۵۔ (۳) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۶۲۔ (۴) نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۸۔

۳۔شرح بخاری: شیخ الاسلام کی یہ سب سے اہم تصنیف ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی اور شیخ نور الحق کی شرح بخاری فارسی تیسیر القاری کے حاشیہ پر چھپی ہے،اس کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں دو جلدوں میں موجود ہے (۱) ان جلدوں میں تقریباً نصف بخاری کی شرح آ گئی ہے، غالباً آخری نصف حصہ وہ اپنے زمانہ کے حالات کی وجہ سے مکمل نہیں کر سکے اور اس کی تکمیل ملا احسن الملقب بحافظ پشاوری نے کی۔(۲)

شرح دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شیخ نور الحق کی شرح کے مقابلہ میں زیادہ مفصل ہے۔

شروع میں ایک مقدمہ،اس میں حدیث کی اصطلاحات،امام بخاری کے حالات، صحیح بخاری کی خصوصیات،وجہ تصنیف،صحیح کے شرائط،تعداد احادیث،تراجم ابواب،تعلیقات، اس کے طرق وروایات اور اسناد وغیرہ پر بحث وگفتگو کی ہے،شرح میں احادیث کے ترجمہ وتشریح کے ضمن میں لفظوں کی تحقیق،قریب المعنی لفظوں کے معنوی فرق کی وضاحت،نحو واعراب کے مسائل،راوی کے ناموں کا صحیح تلفظ اور ان کے سنین وفات دیے گئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک آ گیا ہے تو آپ کا پورا نسب نامہ تحریر کیا ہے،فقہی وکلامی مسائل پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے،ابواب سے احادیث کی مناسبت اور نسخوں کے فرق واختلاف کو جا بجا واضح کیا ہے،شرح کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس میں امام نووی کی شرح مسلم،حافظ ابن حجر کی فتح الباری،شیخ عبدالحق کی شروح مشکوٰۃ اور شیخ نور الحق کی شرح بخاری سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے،وہ شیخ عبدالحق کا ذکر بڑی عقیدت واحترام سے کرتے ہیں،انہیں ''شیخ اجل'' لکھتے ہیں اور ان کے خیالات جا بجا نقل کرتے ہیں۔

شرح کی مزید خصوصیات کا اندازہ دو چار مثالوں سے ہوگا جو ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

---

(۱) مقالات سلیمان،ج ۲،ص ۲۵ و تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی،ص ۲۳۰۔(۲) تقریظ،جلد اول،ص ۲۰۔

حضرت عروہ بیان کرتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا کہ اے اللہ کے رسولؐ آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا کبھی کبھی وہ آواز جرس کی طرح آتی ہے اور یہ مجھ پر بڑی سخت ہوتی ہے اور مجھے چور چور کر دیتی ہے الخ، حدیث کے اس ابتدائی حصہ کی شرح میں شیخ الاسلام نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے نمبر وار ملاحظہ ہو:

ا۔ حضرت عائشہؓ کو ام المومنین کہنا دراصل آیت کریمہ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ سے ماخوذ ہے جس سے مقصود صرف اس قدر ہے کہ ازواج مطہرات مسلمانوں کی مائیں ہیں جن سے ان کا نکاح حرام ہے، یہ مقصد نہیں کہ وہ ان سے خلوت میں مل سکتے ہیں یا انہیں دیکھ سکتے ہیں یا ان کی بیٹیوں سے بھی ان کا نکاح ممنوع ہے، حضرت عائشہؓ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی بیٹی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویوں میں سب سے افضل اور آپ کی چہیتی تھیں سوائے حضرت خدیجہؓ کے، اس بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت عائشہؓ مجتہد تھیں اور خلفائے اربعہؓ کے زمانہ میں فتوے دیتی تھیں، ان کی وفات ۵۵ھ یا ۵۸ھ میں ہوئی۔

۲۔ حارث بن ہشام ابوجہل کے بھائی تھے، یہ فتح مکہ کے روز اسلام لائے، فضلائے صحابہ میں تھے اور معرکہ یرموک ۱۱ھ میں شہید ہوئے۔

۳۔ حارث نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو ممکن ہے کہ حضرت عائشہؓ وہاں موجود رہی ہوں جیسا کہ مشہور اور اکثر لوگوں کا معتمد قول ہے مگر دوسرا احتمال یہ ہے کہ انہوں نے اسے حارث سے سنا ہو اور جمہور کے نزدیک مرسلِ صحابی وصل کے حکم میں ہے۔

۴۔ حدیث میں آواز کے لیے صلصلہ کا لفظ آیا ہے، لوہے پر مارنے سے جو آواز ہوتی ہے اسے صلصلہ کہتے ہیں، بعد میں اس کا اطلاق ہر اس آواز پر ہونے لگا جس میں

طنین (ٹن ٹن) ہو، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ پیہم آنے والی آواز کو کہتے ہیں، پہلے قول کے مطابق مفہوم تامل و تحقیق کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے۔

جرس ایک مشہور آلہ (گھنٹی) ہے جو جانوروں کی گردن میں باندھا جاتا ہے، اس سے وحی کی تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ عام لوگ اسے سمجھ لیں کہ کانوں میں اس کی آواز پیہم پڑتی ہے اور یہ یا تو وحی کی آواز ہوتی ہے یا حضرت جبرئیلؑ کی آواز۔

۵۔ اس طور پر وحی کے سخت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مقصود کو سمجھنا میرے لیے مشکل ہوتا ہے کیونکہ خطاب کے معروف طریقوں کے برخلاف اس کی آواز سے مطلب سمجھنا دشوار ہوتا ہے، اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جسمانی حیثیت سے آپ شدید کرب اور بے چینی میں پڑ جاتے تھے اور بشریت کے تقاضے سے ان اوقات میں ایسا مغلوب ہو جاتے تھے کہ سخت ٹھنڈک میں بھی آپ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے دکھائی دیتے تھے۔

پہلے اس آواز کے آنے کی حکمت یہ ہے کہ آپ وحی سننے کے لیے متنبہ اور ہوشیار ہو جائیں اور تمام تر اس کی جانب متوجہ ہو جائیں اور جو کچھ سنیں اس کو ذہن نشین کر لیں۔

۶۔ حدیث میں فصم سے مضارع کا جو صیغہ استعمال ہوا ہے وہ معروف و مجہول دونوں طرح سے ہے، صیغہ مجہول کی صورت میں فصم ثلاثی مجرد سے ہے جو شکستن اور بریدن کے معنی میں ہے اور معروف کی صورت میں یہ ثلاثی مزید افصام سے ہوگا جس کے معنی باز ماندن اور رفع دفع کرنا ہوں گے اور یہ تینوں معنی روا ہیں۔ (شرح بخاری، شیخ الاسلام، ص ۲۹ و ۳۰)

ایک مشہور حدیث ہے کہ **الایمان بضع وستون شعبة** (ایمان کے ساٹھ اور چند شعبے ہیں) اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

''بعض روایتوں میں ستر اور چند آیا ہے، مطلب یہ ہے کہ ایمان کے شعبے جیسے اخلاص، اعمال، واجبات، سنن، مستحبات اور آداب وغیرہ حد و شمار سے باہر ہیں، جس طرح ملائکہ د

انبیا کی تفصیل کا علم غیر ضروری ہے اسی طرح اس کی تفصیل کا علم بھی ضروری نہیں ہے، اس کے ذکر کا مقصد حصر و تعیین کے بجائے کثرت و تعدد کو بیان کرنا ہے، مبالغہ اور کثرت کے موقع پر اس طرح سے اعداد کو لانا متعارف ہے، غالباً قواعد و احکام کے اصول کا مجموعہ یہی عدد ہو۔

روایتوں میں عدد کا اختلاف مختلف چیزوں کے اعتبار کی وجہ سے ہے، کبھی ایک بات کا اعتبار کر کے ایک عدد کی صراحت فرمائی ہے اور کبھی دوسری بات کا اعتبار کر کے دوسرے عدد کا ذکر کیا ہے، بعض لوگوں نے اس میں تکلف کی راہ اختیار کی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ اس سے حصر ہی مقصود ہے۔'' (جلد اول، ص ۵۸)

اس کے بعد شعب ایمان پر طویل اور اچھی بحث کی ہے۔

ایک اور مشہور حدیث ہے کہ'' مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں جب تک کہ وہ اس کی گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، پس جب وہ یہ (باتیں) کرنے لگیں تو مجھ سے ان کے جان و مال محفوظ ہو جائیں گے سوائے اسلام کے حق کے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہوگا۔''

اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

''نماز و زکوٰۃ کا ذکر ان کی عظمت شان کی بنا پر اور یہ بتانے کے لیے ہوا ہے کہ عبادات بھی کلمہ شہادت کے حکم میں ہیں، پس دوسرے واجبات و فرائض کے ترک پر بھی قتال ثابت ہوگا، یہاں تک کہا گیا ہے کہ وہ سنتیں جو اسلام کے شعائر میں داخل ہیں جیسے اذان اور ختنہ وغیرہ، اگر ان کو چھوڑا جائے اور ان کے ترک پر اصرار کیا جائے تو ایسے لوگوں سے قتال کیا جائے گا، بصورت دیگر ان لوگوں کے جان و مال محفوظ رہیں گے سوائے اسلام کے حق کے کہ ایک شخص دوسرے کو قتل کر دے یا زنا و سرقہ کرے یا دوسرے کا

مال تلف کردے یا اللہ و رسول کے حقوق یعنی عبادات کی ادائیگی اور شریعت کی تعظیم سے باز رہے تو اس وقت یہ عظمت وحرمت اٹھ جائے گی اور شریعت کے حکم کے مطابق اسے سزادی جائے گی۔

ان کا حساب ان کی جزاوسزا اوران کے ظاہر و باطن کا معاملہ خدا کے حوالے ہوگا، ہم لوگ احکام ظاہری ہی کے مکلف و مامور ہیں، یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ ظاہری اعمال کے قبول پر معاملہ کیا جائے گا اور مقتضائے ظاہر کے مطابق حکم وفیصلہ عائد ہوگا اوران اہل بدع کی تکفیر نہ کیا جائے گی جو توحید کو ضرر پہنچانے والے کاموں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اس حدیث کے فوائد کے ضمن میں نووی نے تحریر کیا ہے کہ وجوب کا اعتقاد رکھنے کے باوجود قصداً نماز ترک کرنے والا قتل کردیا جائے گا، یہی جمہور کا نظریہ ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ وہ فوراً قتل کیا جائے گا یا تین روز کی مہلت دینے کے بعد اسے قتل کیا جائے گا، زیادہ صحیح پہلا قول ہے اور صحیح یہ ہے کہ ایک نماز ترک کرنے پر بھی جب اس کا وقت ختم ہوجائے گا وہ قتل کردیا جائے گا، امام احمدؒ کے نزدیک یہ قتل کفر وارتداد کی وجہ سے ہوگا مگر دوسروں کے نزدیک عدوان وبغاوت کی بنا پر قتل کیا جائے گا امام ابوحنیفہؒ قتل وتکفیر کے بجائے اسے محبوس کیے جانے کے قائل ہیں، روزہ ترک کرنے پر حبس وقید کے ساتھ کھانے سے بھی روکا جائے گا اور زکوٰۃ ترک کرنے پر اس سے زبردستی لیا جائے گا۔

یہ بات مخفی نہیں رہنی چاہیے کہ حدیث کا مقتضا یہ ہے کہ نماز وزکوٰۃ اوراس طرح کے دوسرے اعمال کو ترک کرنے والے سے قتال مباح ہے، اس میں قتل کے مباح ہونے کا پہلو نہیں ہے چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ

نے مانعین زکوٰۃ سے قتال کیا تھا اور انہیں قتل نہیں کیا تھا۔

قتال جو دو فریقوں کی جانب سے ہوتا ہے اس کی اباحت سے قتل کی اباحت لازم نہیں آتی۔"

شیخ الاسلام کی بحث و تحقیق کا اندازہ کرنے کے لیے ایک اور مثال پیش کی جاتی ہے:

امام بخاریؒ نے کتاب الصلوٰۃ میں ایک باب یہ قائم کیا ہے کہ "حالت نماز میں چھوٹی لڑکی کو اپنی گردن پر اٹھانے کا بیان" اس باب میں انہوں نے عمرو بن سلیم زرقی کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضرت ابوقتادہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور اسی حالت میں وہ اپنی صاحبزادی زینب کی بیٹی امامہ کو اٹھائے ہوئے تھے، یہ ابوالعاص بن ربیعہ بن عبدشمس کی لڑکی تھیں، آپؐ جب سجدہ کرتے تو انہیں اتار دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو انہیں اٹھا لیتے۔

شیخ الاسلام نے اس باب اور حدیث کے رواۃ و متن کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ ملاحظہ ہو:

۱۔ باب میں مذکور صورت میں نماز فاسد نہیں ہوگی، ابن بطال فرماتے ہیں کہ اس موقع پر اس باب کو لانے سے امام بخاری کا منشا یہ ہے کہ جب نماز پڑھنے والے کا بچی اٹھانا مضر نہیں ہے تو اس کے آگے سے بچی کا گزرنا بطریق اولیٰ مضر نہ ہوگا لیکن مصنف نے صغیرہ (چھوٹی) کی قید لگا کر یہ بتایا ہے کہ کبیرہ (بڑی) کی صورت میں یہ بات نہیں ہوگی۔

۲۔ سُلیم کو مصغر اور زُرَقی کا تلفظ بیان کرنے کے بعد وہ حضرت زینب کے بارے میں بتاتے ہیں کہ یہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے تھیں اور حضرت امامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں صغیر السن تھیں، حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق حضرت علیؓ کے عقد میں آئیں۔

آگے ابوالعاص، ربیعہ اور عبدشمس وغیرہ کے بارے میں تحریر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

۳۔ مختار قول کے مطابق ابو العاص کا نام مقسم (بکسر میم وسکون قاف وفتح سین) ہے، ان کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب سے ظہور نبوت سے پہلے کیا تھا، ظہور اسلام کے بعد وہ کافروں کے ساتھ تھے اور بدر میں قیدی ہو کر جب آپؐ کے پاس لائے گئے تو آپؐ نے ان سے عہد لیا کہ زینب کو بھیج دیں، چنانچہ انہوں نے حضرت زینب کو آپؐ کے پاس بھیج دیا اور خود مکہ ہی میں رہے، بعد ازاں وہ اسلام لائے اور ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ سے ان کا نکاح دوبارہ کیا، عہد صدیقی میں یمامہ کی لڑائی میں وفات پائی۔

۴۔ حدیث میں صرف سجدہ کے وقت حضرت امامہ کو رکھنے کا ذکر ہے، اس سے مقصود مطلق جھکنا اور پست ہونا ہے، اس لیے رکوع بھی اس میں شامل ہے جیسا کہ بعض روایتوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔

۵۔ یہاں یہ خیال ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امامہ کو اس طرح اٹھانا اور پھر رکھنا فعل کثیر (۱) میں داخل ہے اور یہ فعل قلیل بھی ہو تو اس کو یقیناً مکروہ ہونا چاہیے، اسی لیے علما نے اس حدیث کی تاویل میں اختلاف کیا ہے، امام خطابی فرماتے ہیں کہ یہ فعل آنحضرت صلی اللہ کی جانب سے نہیں ہوا تھا بلکہ حضرت امامہ خود آپؐ سے لپٹ جاتی تھیں اور رکوع وسجدہ کے وقت گر پڑتی تھیں اور آپ ان سے شدید تعلق ومحبت کی وجہ سے انہیں دور نہیں کرتے تھے، گویا اس فعل کی نسبت آپ کی جانب مجازاً کی گئی ہے لیکن مسلم، ابوداؤد اور احمد کی روایتوں میں صراحتاً یہ موجود ہے کہ اٹھانا اور اتارنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہوتا تھا نہ کہ امامہ کی جانب سے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ فعل کثیر وہ ہوتا ہے جو متواتر اور پے در پے کیا جائے، یہاں

---

(۱) فعل کثیر سے مراد نماز کے اندر غیر متعلق اعمال واشغال ہیں جن کو فقہا نے ممنوع قرار دیا ہے، البتہ فعل قلیل کو جائز کہا ہے مگر دونوں کی تعیین وتحدید میں اختلاف ہے۔

یہ صورت نہیں تھی، علاوہ ازیں آپ کی طمانینت اور ارکان کی ادائیگی میں اس کی وجہ سے کوئی فرق نہیں آیا تھا، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ آپؐ نے نفل نماز میں ایسا کیا تھا حالانکہ ابوداؤد کی روایت میں ظہر وعصر اور امامت کی صراحت موجود ہے، امام مسلم کی روایت میں بھی امامت کی تصریح ہے، امام نووی فرماتے ہیں کہ بعض مالکیہ نے حدیث کو منسوخ اور بعض نے اسے آپؐ کے خصائص میں بتایا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایسا آپؐ نے ضرورتاً کیا تھا کیوں کہ اس وقت کوئی ایسا شخص آپ کو نہیں ملا جس کے حوالہ آپ امامہ کو کر دیتے۔

یہ سب دعوے مردود و باطل اور بلا دلیل ہیں، حدیث میں کوئی بات شریعت کے اصول وقواعد کے منافی نہیں، اس لیے کہ آدمی پاک ہوتا ہے اور بچوں کے کپڑوں اور بدن کو بھی طہارت ہی پر محمول کرنا چاہیے تا آنکہ نجاست ظاہراً معلوم ہو۔

اعمال سے نماز فاسد نہیں ہوتی جب کہ وہ قلیل ہوں یا متفرق طور پر کیے جائیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا صرف بیان وجواز کے لیے کیا تھا۔

(جلد اول ص ۴۴۷ و ۴۴۸)

شیخ الاسلام کی شرح بخاری کی نوعیت وخصوصیت جاننے کے لیے یہ مثالیں کافی ہیں۔

☆☆☆

مولانا سلام اللہ محدث رامپوری

(المتوفی ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء)

مولانا سلام اللہ محدث کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان کا آخری نامور عالم بتایا جاتا ہے، یہ شیخ الاسلام محمد کے فرزند تھے مگر صاحب نزہۃ الخواطر (۱) کے تتبع میں بعض حضرات نے انہیں حافظ فخر الدین کا بیٹا لکھا ہے (۲) جو صحیح نہیں ہے، شیخ الاسلام کے زمانہ ہی میں دہلی کے حالات نہایت ابتر ہو گئے تھے، غالباً ان حالات سے بددل ہو کر مولانا سلام اللہ نے دہلی کی سکونت ترک کر کے رامپور میں بود و باش اختیار کر لی تھی، اس وقت نواب فیض اللہ خاں کا زمانہ تھا، انہوں نے ان کی اچھی پذیرائی کی اور صلہ و اکرام سے نوازنے کے علاوہ صدارت کے منصب پر فائز کیا۔ (۳)

مولانا شیخ سلام اللہ نے حدیث اور دوسرے مروجہ علوم کی تعلیم اپنے والد شیخ الاسلام اور دوسرے علمائے عصر سے حاصل کی تھی، مولوی رحمان علی کا بیان ہے کہ "علوم متداولہ کی تحصیل اپنے والد سے کی تھی، انہی سے حدیث کی اجازت وسند پائی تھی۔ (۴)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی ولادت ونشو ونما اور تعلیم دہلی ہی میں ہو چکی تھی لیکن سن ولادت کا علم نہیں ہو سکا۔

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۰۱۔ (۲) تعارف مخطوطات دار العلوم دیو بند از مفتی ظفیر الدین، ص ۱۱۶۔

(۳) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۰۱ وتاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، جلد دوم، باب ششم، ص ۳۷۰۔

(۴) تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۶۔

فضل وکمال: علم وفن سے شغف ان کو اپنے آبا واجداد سے وراثتاً ملا تھا، شرح مؤطا میں خود لکھا ہے کہ ''مجھے اپنے دادا شیخ عبدالحق کی مصنفات سے بڑا گہرا شغف تھا، میں نے یہیں سے فن حدیث میں استفادہ کیا'' وہ عقلی ونقلی دونوں طرح کے علوم میں فائق تھے، تفسیر، حدیث اور فقہ میں پوری دستگاہ رکھتے تھے، حدیث میں زیادہ ممتاز اور صاحب کمال ہونے کی بنا پر محدث اور محدث رامپور کہے جاتے تھے، مولوی رحمان علی لکھتے ہیں:

> ''فن حدیث میں خاص امتیاز رکھتے تھے اور محدث کی حیثیت سے بڑی شہرت پائی۔''(۱)

تذکرہ نگاروں نے ان کی علمی جامعیت اور فضل وکمال کا مکمل اعتراف کیا ہے، مولوی محمد فقیر جہلمی لکھتے ہیں:

> ''فقیہ فاضل، محدث کامل، مفسر متبحر، علامہ عصر، محقق ومدقق تھے۔''(۲)

نواب صدیق حسن خان مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

کان جامعا للمعقول والمعقول عارفا بالحدیث مشهورا به (۳)	عقلی ونقلی علوم کے جامع اور حدیث کی معرفت میں مشہور تھے۔

حافظ احمد علی خاں شوق رامپوری کا بیان ہے:

> ''جملہ علوم سے مناسبت تام تھی اور تمام کتب غیر درسیہ پر مثل کتب درسیہ کے قادر تھے، علوم منقول حدیث، رجال، تاریخ لغت، ادب سب میں کامل تھے اور عربی زبان میں مطالب علمیہ کو لکھنے میں یدطولیٰ تھا۔''(۴)

مولوی رحمان علی نے بھی ان کو فقیہ، محدث اور مفسر لکھا ہے۔(۵)

درس وافادہ: علوم کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد اپنے نامور اسلاف کی طرح

---

(۱) تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۶۔ (۲) حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۸۔ (۳) ابجد العلوم، ج ۳، ص ۹۲۷۔ (۴) تذکرہ کاملان رامپور، ص ۱۵۸ و ۱۵۹۔ (۵) تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۶۔

مسند درس کو رونق بخشی اور علوم کی نشر و اشاعت فرمانے لگے (۱) رامپور میں مدۃ العمر ان کے درس و تدریس کا کام اعلیٰ پیمانے پر جاری رہا۔ (۲)

وفات: سنہ وفات میں اختلاف ہے، ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء (۳) صحیح معلوم ہوتی ہے، ''شیخ شہید'' (۴) سے یہی تاریخ نکلتی ہے مگر بعض اہل علم نے ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء بھی لکھا ہے۔ (۵)

ان کا مدفن رامپور میں بغدادی صاحب کے مزار کے احاطہ میں مسجد کے قریب جانبِ جنوب واقع ہے۔ (۶)

اولاد: شیخ سلام اللہ کی جسمانی یادگار دو فرزند تھے، ان کا مختصر حال ہم آگے بیان کریں گے۔

تصنیفات: ان کی معنوی یادگار حسب ذیل کتابیں ہیں:

۱۔ ترجمہ شمائل ترمذی:

۲۔ ترجمہ صحیح بخاری (۷): بعض مصنفین نے اول الذکر کا نام ترجمہ فارسی شمائل ترمذی (۸) لکھا ہے اور بعض لوگوں کے خیال میں مولانا نے فارسی میں جامع ترمذی کا ترجمہ کیا تھا، اس اعتبار سے اس کا نام ترجمہ ترمذی ہوگا (۹) گویا انہوں نے صحیح بخاری کی طرح سنن ترمذی کا بھی ترجمہ کیا تھا مگر پہلا نام صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ خلاصۃ المناقب: یہ مناقب اہل بیت پر ایک رسالہ تھا۔ (۱۰)

۴۔ رسالہ اصول حدیث (۱۱):

---

(۱) تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۶۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۶۳۔ (۳) مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۲۵۔ (۴) حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۸ و تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۶۔ (۵) ایضاً۔ (۶) تذکرہ کاملان رامپور، ص ۱۵۹۔ (۷) مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۲۵۔ (۸) حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۸ و تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۶۔ (۹) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد دوم، ص ۳۷۱۔ (۱۰) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۰۱۔ (۱۱) مقالات سلیمانی، ج ۲، ص ۲۵۔

۵۔ رسالة فی الاشارة بالسبابة عند التشهد فی الصلوٰة: نزہۃ الخواطر میں اس کا ذکر ہے (۱) اور غالباً اسی کی بنیاد پر مولوی محمد ایوب قادری نے تذکرہ علمائے ہند کے اردو ترجمہ میں اس کا ذکر کیا ہے (۲) شیخ نور الحق دہلوی کی تصنیفات کے ضمن میں اسی طرح کے ایک رسالہ اثبات رفع المسبحة فی التشهد کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ (۳)

۶۔ کشف القناع عن اباحة السماع: اس کا ذکر صرف ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے اپنے مقالہ سلطنت مغلیہ کے زوال میں کیا ہے۔ (۴)

۷۔ کمالین: یہ عربی کی مشہور و متداول تفسیر جلالین کا عربی میں حاشیہ ہے، کتب تفسیر میں جلالین اپنے اختصار و جامعیت کی بنا پر بڑی اہم خیال کی جاتی ہے اور وہ اکثر عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے، مولانا سلام اللہ نے اپنا حاشیہ جلالین ہی کے طرز و اسلوب میں مختصر اور جامع لکھا ہے، اس بنا پر اصل تفسیر کی طرح اس کا یہ حاشیہ بھی بہت مقبول ہوا جو مولانا سلام اللہ کی اہم تصانیف میں خیال کیا جاتا ہے، کمالین کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں، ۱۲۸۷ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے تفسیر جلالین کے حاشیہ پر جو نسخہ چھپا تھا وہ رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے (۵) ۱۳۱۰ھ میں بھی یہ جلالین کے ساتھ طبع ہوا ہے، یہ نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں ہے۔ (۶)

۸۔ المحلی بحل اسرار الموطا: یہ شیخ سلام اللہ محدث رامپوری کی سب سے اہم کتاب ہے جو موطا امام مالکؒ کی دو جلدوں پر مشتمل ایک مبسوط شرح ہے، اس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں حدیث کی اصطلاحات کا بیان اور امام مالک کا تذکرہ اور موطا کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے (۷) جس سے اس کی اہمیت و خصوصیت ظاہر ہوتی ہے، ان کے

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۰۲۔ (۲) ترجمہ اردو تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۹۔ (۳) تذکرۃ المحدثین، جلد سوم، ص ۳۲۹۔ (۴) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد دوم، ص ۳۷۰۔ (۵) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۳۳۔ (۶) فہرست کتب خانہ آصفیہ، ج ۳، ص ۲۲۴ و ۲۲۵۔ (۷) معارف دسمبر ۴۲، ص ۴۲۲۔

بیان کے بموجب انہیں یہ شرح لکھنے کا خیال اس بنا پر ہوا کہ:

''مؤطا امام مالک حدیث کی اہم اور سب سے قدیم کتاب ہے اور وہی ساری کتب حدیث کی اصل و بنیاد ہے گو اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں جن میں علامہ زرقانی کی شرح عمدہ ہے مگر وہ ہمارے دیار میں رائج نہیں، علامہ سیوطی کی شرح لوگوں میں متداول ضرور ہے مگر وہ زیادہ قیمتی نہیں، اس لیے میں نے یہ شرح لکھنے کا تہیہ کیا اور اس میں ائمہ فقہ کے مذاہب کے دلائل تحریر کیے اور جن کو میں نے راجح سمجھا مرجح کر کے بتایا، اس سلسلہ میں چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں مطالعہ کیں اور ان سے کام کی باتیں منتخب کر کے اس میں سمو دینے کی کوشش کی، اپنی فہم نے جو کام کیا اسے بھی شامل کر دیا مگر کہیں تعصب کو دخل نہیں دیا۔'' (۱)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے یہ شرح کس قدر محنت اور کد و کاوش سے لکھی ہے، نیز اس شرح کی نوعیت اور غرض و غایت کیا تھی، معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پیشتر لکھی جانے والی شرحوں کا انہیں علم نہیں تھا حالانکہ ان سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے مسوی و مصفی کے ناموں سے عربی و فارسی میں مؤطا کی بلند پایہ شرحیں لکھی تھیں مگر ان کا اور یعقوب لاہوری (متوفی ۱۰۹۸ھ) کی شرح کا بھی انہیں علم نہ تھا۔

سب سے پہلے فہرست مضامین دی ہے اس کے بعد اصل شرح شروع ہوتی ہے جو دو جلدوں میں تمام ہوئی ہے، پہلی جلد میں ابتدا سے کتاب الزکوٰۃ تک کی حدیثوں کی شرح کی گئی ہے اور دوسری میں کتاب الحج سے آخر تک کی شرح ہے۔

محلی مؤطا امام مالک کی ایک محققانہ شرح ہے (۲) جو زرقانی کی شرح کی طرح ضخیم ہے، اس میں مشکل الفاظ کی لغوی تشریح اور مطالب کو حل کر کے فقہی مسائل سے بھی

(۱) بحوالہ تعارف مخطوطات دار العلوم دیوبند، حصہ اول، ص ۱۱۶۔ (۲) حیات امام مالک، ص ۱۰۲۔

تعرض کیا گیا ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ مشہور فاضل ڈاکٹر زبید احمد کے اس بیان سے بخوبی ہو جاتا ہے:

> ''مجلی مسوی سے زیادہ جامع ہے مگر مسوی کی ترتیب مجلی کی ترتیب سے بہتر ہے۔''(۱)

ممکن ہے اس بیان میں کسی قدر مبالغہ ہو، عام اہل نظر کے نزدیک شاہ صاحب کی شرح حسن ترتیب اور عمق نظر کے اعتبار سے مجلی سے بدرجہا بہتر ہے(۲) تاہم یہ مسلم ہے کہ شیخ سلام اللہ کی شرح اہمیت ... مدہ سے خالی نہیں، مصنف کو اس کی تالیف سے ۱۲۱۵ھ میں فراغت ملی، پہلے ... پر ھو الفضل الکبیر مادۂ تاریخ درج ہے جس ۱۲۱۵ھ تاریخ تالیف برآمد ہوتی ہے۔(۳)

اس شرح کے قلمی نسخے بعض کتب خانوں میں موجود ہیں(۴) خدا بخش خان لائبریری کا مخطوطہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ خاص مصنف کا نسخہ ہے۔(۵)

☆☆☆

---

(۱) معارف دسمبر ۱۹۴۲ء، ص ۴۲۲۔ (۲) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد دوم، ص ۳۷۱۔ (۳) حیات امام مالک، ص ۱۰۲ و حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۸۔ (۴) مثلاً کتب خانہ دار العلوم دیوبند۔ (۵) حیات امام مالک، ص ۱۰۲۔

مولانا نور الاسلام

یہ شیخ سلام اللہ محدث رامپوری کے صاحبزادے اور جانشین تھے، خود بھی صاحب کمالات تھے، حافظ احمد علی خاں شوق تحریر فرماتے ہیں:

''مولوی نور الاسلام ان (شیخ سلام اللہ) کے جانشین تھے، سلامتِ طبع، رسائی فکر اور اصابت رائے میں مغتنمات روزگار ہیں۔''(۱)

عقلی ونقلی دونوں علوم میں ممتاز اور اچھی دسترس کے مالک تھے، طب وریاضی میں درجۂ کمال پر فائز تھے، نواب صدیق حسن خان صاحب فرماتے ہیں:

برع فی العلوم العقلية والنقلية لاسيما علم الرياضی (۲)	وہ علوم عقلیہ ونقلیہ خصوصاً علم ریاضی کے ماہر تھے۔

حکیم مولانا سید عبدالحی رقم طراز ہیں:

وصار بارعا فی الهيئة والهندسية والحساب وغيرها من الفنون الرياضية (۳)	ہیئت، ہندسہ اور حساب وغیرہ فنون ریاضی میں ماہر وکامل تھے۔

حافظ احمد علی خاں شوق کا بیان ہے:

''اس وقت رامپور میں ان کے مثل کوئی ریاضی داں نہ تھا، فن ریاضی

(۱) تذکرہ کاملان رامپور، ص۱۵ و ۴۲۲۔ (۲) ابجد العلوم، ج۳، ص۹۲۷۔ (۳) نزہۃ الخواطر، ج۷، ص۵۱۰۔

ان کی وجہ سے رامپور میں شائع ہوا۔"(۱)

صاحب نزہۃ الخواطر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ولادت ونشو ونما رامپور میں ہوئی تھی لیکن حافظ احمد علی خان شوق فرماتے ہیں کہ "نواب سید احمد علی صاحب بہادر کے عہد میں دہلی سے رامپور آئے اور سو روپے ماہانہ کے ملازم ہوئے"(۲) نیز "رامپور کے مفتی عدالت رہے۔"(۳)

تعلیم: کتب متداولہ اور طب کا درس اپنے والد اور ملا حسن بن غلام مصطفیٰ اور ملک العلما عبدالعلی بن نظام الدین فرنگی محلی سے لیا۔(۴)

ان کی عظمت اور علمی جامعیت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ متعدد کامل الفن حضرات ان کے حلقۂ درس سے وابستہ تھے، چند نام یہ ہیں:

حکیم محمد اعظم خان: رامپور کے اچھے طبیب تھے، ان کے آبا واجداد سوات سے پہلے بدایوں اور پھر رامپور میں وارد ہوئے، شعر وشاعری سے بھی شغف تھا، اکسیر اعظم اور دوسری تصانیف یادگار چھوڑیں، ۱۳۲۰ھ میں اندور میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔(۵)

مولانا غیاث الدین: انہوں نے مولانا نور الاسلام سے علم طب حاصل کیا تھا، غیاث اللغات اور دوسری کئی کتابوں کے مصنف تھے، نواب سید یوسف علی خان بہادر فردوس مکاں اور نواب سید کلب علی خان بہادر خلد آشیاں کے استاد تھے، ان کا مولد ومدفن رامپور ہے، ۲۲ ذی الحجہ ۱۲۶۸ھ کو انتقال ہوا۔(۶)

مولوی حافظ حبیب النبی رقت: ۱۳۰۸ھ میں رامپور میں پیدا ہوئے، تفسیر وحدیث کی سند پہلے مولانا نور الاسلام سے لی، پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ سے لی اور وہاں درس وتدریس کی خدمت بھی انجام دی، کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، نمونہ کلام انتخاب یادگار میں درج ہے، اردو

(۱) تذکرہ کاملان رامپور، ص ۴۳۶۔ (۲) ایضاً، ص ۴۳۷۔ (۳) ایضاً، ص ۴۱۵۔ (۴) ایضاً، ص ۴۳۶ و نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۱۰۔ (۵) تذکرہ کاملان رامپور، ص ۴۳ و ۴۷ و ۴۴۷۔ (۶) ایضاً، ص ۳۰۶۔

میں قصیدہ طحاویہ کی مبسوط شرح لکھی، ترپن برس کی عمر میں ۴ رجب ۱۲۶۱ھ کو کلکتہ میں وفات ہوئی۔(۱)

مولوی نصیر الدین خان صابر: علوم عربیہ کی تحصیل مولانا نور الاسلام سے کی، نہایت ذہین شخص تھے، حافظ احمد علی خان شوق کا بیان ہے کہ ''علم ادب میں بڑے ذی کمال، علم معقول میں بے عدیل اور نثر عربی لکھنے میں بے مثال تھے، فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے، انتخاب یادگار میں کلام کا نمونہ دیا ہے، عربی میں کئی رسالے لکھے تھے، حکمائے یونان کے عقائد کی تردید میں بھی ایک کتاب لکھی تھی، چون ۵۴ برس کی عمر میں ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۶۶ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے دادا مولوی غلام جیلانی کی قبر کے متصل ہی مدفون ہوئے۔

مولوی نصیر الدین کے تلامذہ میں رامپور کے مشہور محدث مولانا ارشاد حسین مجددی عالم متبحر حافظ غلام نبی اور نواب خلد آشیاں جیسے لوگ شامل تھے۔(۲)

مولوی عبدالعلی خان: یہ ریاضی میں مولانا نور الاسلام کے شاگرد تھے (۳) انہوں نے دہلی جا کر شاہ اسحٰق صاحب سے حدیث کا درس لیا، ان کی ولادت رامپور میں ہوئی، نواب سید کلب علی خان بہادر اور نواب سید یوسف علی خان بہادر ان کے شاگرد تھے، مدرسہ عالیہ رامپور میں مدرس اول رہے، مدرسہ کے علاوہ مکان پر بھی ریاضیات کا درس جاری رہتا تھا، صاحب تصانیف تھے، سرکار سے وظیفہ ملتا تھا، ۱۳۰۳ھ میں انتقال ہوا۔(۴)

وفات: وفات کا سال معلوم نہیں، تاہم ۱۲۴۷ھ تک زندہ رہنے کا ثبوت ملتا ہے، ان کی قبر رامپور میں شاہ بغدادی صاحب کے احاطہ مزار میں ہے جہاں ان کے والد ماجد بھی دفن ہیں۔

تصنیفات: شیخ نور الاسلام کی تصنیفات کے نام یہ ہیں:

---

(۱) تذکرہ کاملان رامپور، ص ۱۰۱۔ (۲) ایضاً، ص ۴۱۵، ۴۱۶ و ۴۱۷۔ (۳) ایضاً، ص ۴۲۷۔ (۴) ایضاً، ص ۲۲۸ و ۲۲۹۔

۱۔رسالہ اسطرلاب: فارسی زبان میں ۲۸ صفحات پر مشتمل اس رسالہ کو نواب نصر اللہ خان بہادر کے نام معنون کیا تھا، ۲۷ ربیع الثانی ۱۲۲۰ھ کو اس کی تالیف سے فارغ ہوئے، کتب خانہ رامپور میں قلمی نسخہ موجود ہے۔(۱)

۲۔رسالہ بحث زماں: یہ ایثار الحق کے نام سے بھی موسوم ہے۔(۲)

۳۔رسالہ بحث مکاں: یہ ۲۴ صفحے کا عربی رسالہ جس کی تالیف سے ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۴۷ھ کو فارغ ہوئے، کتب خانہ رامپور میں قلمی نسخہ موجود ہے۔(۳)

۴۔رسالہ اصول حدیث(۴):

۵۔حاشیہ علی میر زاھد علی الرسالۃ القطبیۃ: اس کا قلمی نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں ہے۔(۵)

۶۔حاشیہ علی شرح السلم(۶):

☆☆☆

---

(۱) تذکرہ کاملان رامپور، ص ۴۳۷۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۱۰۔ (۳) ایضاً و تذکرہ کاملان رامپور، ص ۴۳۷۔ (۴) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۱۰۔ (۵) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۳۶۔ (۶) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۱۰۔

شیخ محمد سالم

ابو الخیر محمد سالم، شیخ سلام اللہ کے فرزند اور شیخ نور الاسلام کے بھائی تھے، اپنے عہد کے علما سے کسب فیض کیا، تعلیم مکمل کرنے کے بعد حج وزیارت کے لیے حرمین شریفین لے گئے، پھر وطن واپس آکر درس وتدریس میں لگ گئے، ان کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

۱۔ رسالہ اصول الایمان: یہ ایک مقدمہ اور پانچ فصلوں پر مشتمل ہے جو دہلی سے ان کی زندگی میں ۱۲۵۹ھ میں چھپا تھا۔

۲۔ رسالہ در بیان سماع:

۳۔ رسالہ عذب نہر: یہ حزب البحر کا فارسی ترجمہ ہے۔

۴۔ رسالہ نور الایمان:

۵۔ طریق السالم:

۶۔ لطائف الاسرار: یہ تعویذ اور عملیات پر مشتمل رسالہ ہے۔(۱)

ان دونوں بھائیوں کے بعد شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان کی علمی حیثیت باقی نہیں رہی، حدیث سے شغف وانہماک کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا، البتہ آخری دور میں دو بزرگ مولانا انوار الحق حقی اور مولانا برکت علی حقی دہلوی ایسے پیدا ہوئے کہ جن کو اپنی خاندانی روایات نہایت عزیز تھیں اور انہوں نے شیخ محدث اور دوسرے بزرگوں کے حالات

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۴۱، بحوالہ مرأۃ الحقائق۔

کی اشاعت اوران کی تصنیفات کی حفاظت پر بڑی توجہ مبذول کی۔

اول الذکر ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے، دہلی میں تراہہ بہرام خان میں رہتے تھے، انہوں نے مولانا صہبائی سے فارسی، مولانا مملوک علی کے تلمیذ مولوی مشتاق احمد سے حساب و ہندسہ، مفتی صدرالدین خان سے منطق، مولانا حیدرعلی فیض آبادی سے علم کلام اور مولانا عبدالرزاق سے شرح وقایہ اور ہدایہ کا درس لیا، شروع میں علم سے اشتغال رہا اور شیخ محدث کی کتابوں کو جمع کیا مگر غدر کے بعد زندگی بدل گئی اور میرٹھ میں سرکاری ملازمت اختیار کرلی اور خان بہادر کا خطاب ملا، شیخ محدث کے مکتوبات کی اشاعت کا سہرا انہی کے سر ہے، شاہ کلیم اللہ دہلوی کے حالات میں ان کا ایک مختصر رسالہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانہ کے ذخیرہ سرشاہ سلیمان میں موجود ہے جس کے ساتھ میر حسن علا سجزی صاحب فوائد الفواد کی ایک مختصر لیکن نایاب تصنیف مخ المعنی بھی شامل ہے جو شیخ نظام الدین اولیا کو بہت پسند تھی۔

دوسرے بزرگ مولانا برکت علی حقی نے مرأۃ الحقائق لکھی جو شیخ محدث کے حالات پر مشتمل ہے۔(۱)

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا فیضان ان کے اولاد واحفاد کے ذریعہ کئی صدی تک جاری رہا اسی طرح ان کے اور ان کے سلسلہ کے تلامذہ کی بدولت بھی ان کے علوم وافکار کی اشاعت مدتوں ہوتی رہی، یہاں ان لوگوں کے ناموں کی ایک مختصر فہرست پیش کی جاتی ہے، طوالت کے خوف سے ان کے حالات و خدمات کی تفصیل قلم انداز کردی گئی ہیں۔

۱۔ خواجہ حیدر چلو ربن فیروز کشمیری (۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء)

۲۔ خواجہ خواند معین الدین (م ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء)

---

(۱) یہ معلومات پروفیسر خلیق احمد نظامی کی تصنیف حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے ماخوذ ہیں۔ (دیکھیے ص ۲۶۴)

۳۔ بابا داؤد مشکاتی کشمیری (م ۱۰۹۷ھ/ ۱۶۸۵ء)

۴۔ میر سید مبارک بلگرامی (۱۰۳۳ھ تا ۱۱۱۵ھ/ ۱۶۲۴ء تا ۱۷۰۳ء)

۵۔ میر عبدالجلیل بن احمد حسینی بلگرامی (۱۰۷۱ھ تا ۱۱۳۸ھ/ ۱۶۶۰ء تا ۱۷۲۵ء)

۶۔ شیخ عنایت اللہ شال کشمیری (م ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۱۳ء)

۷۔ غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۶ھ/ تا ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۰۴ء، ۱۷۸۵ء)

☆☆☆

گلستانِ حدیث کے مہکتے گلاب

کیا ہی شاندار اور قابل رشک زندگیاں تھیں ان جلیل القدر اور قسمت کے دھنی انسانوں کی! کہ جنہوں نے اپنی زندگی کا محور و مرکز حدیث رسول مقبول ﷺ کو بنائے رکھا۔ ان کی صبحیں اور شامیں قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ کی دلنواز صداؤں میں بسر ہوتیں۔ رسول اللہ سے عملی محبت کا ثبوت یہ ہوتا کہ ان کو آپ کے فرامین بمعہ سند سینکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں حفظ ہوتے۔ دنیا ان کے حافظے سے انگشت بدنداں تھی، وہ حدیث رسول کی تلاش و جستجو میں قریہ قریہ بستی بستی چلے پھرتے، جہاں سے حدیث رسول اور فرمانِ رسول، حکم رسول ملتا تحقیق تفتیش کے بعد اسے محفوظ کر لیتے اور امت محمدیہ تک آپ کے فرامین پہنچانے کا بندوبست کرتے۔ یوں جستجوئے حدیث میں ان کی زندگیاں گزر جاتیں اور وہ امت محمد کے ہاتھوں میں فرامین رسول کا گرانقدر مجموعہ دے کر اگلے جہان جا پہنچتے۔ ان کی زندگیوں کا لمحہ لمحہ اس شعر کا مصداق ہوتا:

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار را تکرار می کنیم

گلشن حدیث کے ان مہکتے گلابوں کی خوشبو سے امت محمدیہ کے ہر ہر فرد کی سانسیں مہکی ہوئی ہیں۔ ان رجال عظیم کی زندگیاں کیسے اور کن عظیم کاموں میں گزریں۔ انہوں نے آقائے دو جہاں سے عملی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے خدمت حدیث کے لیے کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ محدثین کرام کی زندگیوں کے روشن مگر پردہ اخفا میں سنہرے گوشوں کو آشکار کرنے اور آپ کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

محمد طاہر نقاش

دار الابلاغ
کتاب و سنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ